

# مَقَرَاتُ الْقُرْآنِ (۱۰ جلد)

مفتی  
امام غلام غفران اعظمی

ترجمہ و تفسیر  
شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد عظیم الرحمن فیضی مدظلہ العالی

جلد اول

اسلامی اکادمی

۱۰، اردو بازار لاہور فون: ۳۵۸۷۷۷-۳۵۸۷۷۸

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

## معزز قارئین توجہ فرمائیں!

کتاب وسنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب .....

← عام قاری کے مطالعے کے لیے ہیں۔

← مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق و اجازت کے بعد آپ لوڈ (Upload)

کی جاتی ہیں۔

← دعوتی مقاصد کی خاطر ڈاؤن لوڈ، پرنٹ، فوٹو کاپی اور الیکٹرانک ذرائع سے محض مندرجات نشر و اشاعت کی مکمل اجازت ہے۔

### ☆ تنبیہ ☆

← کسی بھی کتاب کو تجارتی یا مادی نفع کے حصول کی خاطر استعمال کرنے کی ممانعت ہے۔

← ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کے لیے استعمال کرنا اخلاقی، قانونی و شرعی جرم ہے۔

﴿اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں﴾

← نشر و اشاعت، کتب کی خرید و فروخت اور کتب کے استعمال سے متعلقہ کسی بھی قسم کی معلومات کے لیے رابطہ فرمائیں۔

[kitabosunnat@gmail.com](mailto:kitabosunnat@gmail.com)

[www.KitaboSunnat.com](http://www.KitaboSunnat.com)



# مُفْرَدَاتُ الْقُرْآنِ (اردو)

www.KitaboSunnat.com

جلد دوم

تصنیف  
امام راہِ اصفہانی

ترجمہ و حواشی  
شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد عبید اللہ فیروز پوری

شیخ شمس الحق  
۷۸۸ کشمیر بلاک، اقبال ٹاؤن، لاہور



اس کتاب کے جملہ حقوق نقل و اشاعت محفوظ ہیں

نام کتاب:  
منقذات القرآن

مصنف:  
امام ر. ا. اصفہانی

ترجمہ و حواشی:  
شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد عبید فیروز پوری

نظر ثانی:  
مولانا عبد الصمد ریالوی

اہتمام: محمد رمضان محمدی، محمد سلیم جلالی

www.KitaboSunnat.com

تعداد: 1000

ناشر: شیخ شمس الحق

مطبع: عرفان افضل پریس

ملنے کا پتہ:

اسلامی اکیڈمی، الفضل مارکیٹ، اردو بازار لاہور

Phone: 042-7357587

## کتاب الصاد

### (ص ب ح)

الصُّبْحُ وَالصَّبَاحُ: دن کا ابتدائی حصہ جب کہ افق طلوع آفتاب کی وجہ سے سرخ ہو۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿الْبَسَ الصُّبْحُ بِقَرِيبٍ﴾ (۱۱-۱۸) کیا صبح کچھ دور ہے فَسَاءَ صَبَاحُ الْمُنْذِرِينَ (۳۷-۱۷۷) تو جن کو ڈر سنا یا گیا ہے ان کے لیے برا دن ہوگا۔

التَّصْبُحُ صبح کے وقت سونا۔ الصُّبُوحُ صبح کی شراب کو کہتے ہیں اور صَبَحْتُهُ کے معنی صبح کی شراب پلانے کے ہیں۔

الصَّبْحَانُ: صبح کے وقت شراب پینے والا (مؤنث صَبَحِي) (المصباح) (۱) پیالہ جس میں صبحی پی جائے (۲) وہ اونٹ جو صبح تک بیٹھا رہے (۳) قدیل جس میں چراغ رکھا جاتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿مَثَلُ نُورِهِ كَمِشْكَاةٍ فِيهَا مِصْبَاحٌ﴾ (المصباح فَيُزْجَا جَاةً) (۲۳-۳۵)

اس کے نور کی مثال ایسی ہے گویا ایک طاق ہے جس میں چراغ اور چراغ ایک قدیل میں ہے۔

اور چراغ کو مصباح کہا جاتا ہے اور صَبَاحُ کے معنی بتی کی لو کے ہیں۔ اَلْمَصَابِيحُ چمکدار ستارے جیسے فرمایا:

﴿وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحٍ﴾ (۶۷-۵۰) اور ہم نے قریب کے آسمان کو (تاروں کے) چراغوں سے زینت دی۔

صَبَحْتُهُمْ مَاءً كَذًّا: میں صبح کے وقت ان کے پاس فلاں

### (ص ب ب)

صَبَّ الْمَاءِ کے معنی اوپر سے پانی گرانا کے ہیں۔ محاورہ ہے: صَبَّ الْمَاءُ فَانْصَبَّ وَصَبْتُهُ فَتَصَبَّبَ: یعنی اس نے اوپر سے پانی گرایا چنانچہ پانی گر گیا، قرآن پاک میں ہے:

﴿أَنَّا صَبَبْنَا الْمَاءَ صَبًّا﴾ (۸۰-۲۵) ”بے شک ہم نے ہی (اوپر سے) پانی برسایا۔“

﴿فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ﴾ (۸۹-۱۳) تو تمہارے پروردگار نے ان پر عذاب کا کوڑا برسایا۔

﴿يُصَبُّ مِنْ فَوْقِ رُءُوسِهِمُ الْحَمِيمُ﴾ (۲۲-۱۹) ان کے سروں پر کھولتا ہوا پانی گرایا جائے گا۔

صَبَّ إِلَيَّ كَذًّا صَبَابَةً: عاشق ہونا۔ اور صفت کا صیغہ خاص کر صَبَّ (بروزن فَعْلٌ) آتا ہے۔

چنانچہ محاورہ ہے۔

فُلَانٌ صَبَّ بِكَذَا: فلاں اس پر فریفتہ ہے۔ اور صِرْمَةٌ کی طرح صَبَّة کے معنی بھی جانوروں کی ٹکڑی یا جماعت کے ہیں۔ اَلصَّبِيبُ: بارش کا پانی۔ کسی چیز کا عصارہ۔ بہایا ہوا خون۔ اَلصَّبَابَةُ وَالصُّبَّةُ: کسی چیز کا باقی ماندہ جو گرانے کے لائق ہو تَصَابَيْتُ الْإِنَاءَ (تَفَاعَلٌ) میں نے برتن سے باقی ماندہ پانی بھی پی لیا۔ تَصَبَّبَ (تَفَعَّلَ) کسی چیز کا باقی ماندہ بھی ختم ہو جانا۔

کُشْمَان کہتے ہیں اس کی ضد مَذَلَّ (مجبور ہو کر راز فاش کر دینا) ہے۔ قرآن پاک نے ان تمام صفات کو صبر کے لفظ سے یاد کیا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿وَالصَّبْرِينَ فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ﴾ (۲-۱۷۷)

سختی اور تکلیف کے وقت ثابت قدم رہیں۔

﴿وَالصَّبْرِينَ وَالصَّابِرَاتِ﴾ (۳۳-۳۵) صبر کرنے والے مرد اور صبر کرنے والی عورتیں۔

اور روزہ کو صَبْرُ کہا گیا ہے کیونکہ یہ بھی ضبط نفس کی ایک قسم ہے چنانچہ آنحضرت نے فرمایا: ﴿(۱) صِيَامُ شَهْرِ الصَّبْرِ وَثَلَاثَةُ أَيَّامٍ فِي كُلِّ شَهْرٍ يَذْهَبُ وَحَرَّ الصَّدْرِ: ماہ رمضان اور ہر ماہ میں تین روزے سینہ سے بغض کو نکال ڈالتے ہیں اور آیت کریمہ:

﴿فَمَا أَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ﴾ (۲-۱۷۵) یہ آتش (جہنم) کی کیسی برداشت رکھنے والے ہیں۔ کی تفسیر میں ابو سعید نے کہا ہے۔ ﴿کہ لغت میں صبر کے معنی جرات بھی آتے ہیں۔ جیسا کہ ایک اعرابی نے اپنے خصیم سے کہا۔ ﴿

مَا أَصْبِرَكَ عَلَى اللَّهِ كَمَا تَمُودُ عَلَى الْخَيْلِ جَرِيءٌ هُوَ۔

پانی پر جا بیچنا ﴿اور کبھی صُبْحُ يَا صَبَاحُ کی مناسبت سے بالوں کی سخت سرخی کو بھی صُبْحُ کہا جاتا ہے۔ صَبَحَ فَلَانٌ خوبصورت اور حسین ہونا۔ ﴿

## (ص ب ر)

الصَّبْرُ کے معنی ہیں: کسی کو تنگی کی حالت میں روک رکھنا چنانچہ صَبَرْتُ الدَّائِيَّةَ کے معنی ہوں گے: میں نے جانور کو کھلائے بغیر باندھ رکھا۔

صَبَرْتُ فَلَانًا: میں نے اسے زبردستی قسم کھائی۔ لہذا الصَّبْرُ کے معنی ہوئے: عقل و شریعت دونوں یا ان میں سے کسی ایک کے تقاضا کے مطابق اپنے آپ کو روک رکھنا پس صبر ایک عام لفظ ہے جو مختلف مواقع استعمال کے اعتبار سے مختلف ناموں سے پکارا جاتا ہے چنانچہ کسی مصیبت پر نفس کو روک رکھنے کو صبر کہا جاتا ہے۔ یہ جَزَعُ کی ضد ہے اور جنگ میں نفس کو روک رکھنا کو شجاعت کہا جاتا ہے اس کی ضد جُبُنُ (بزدلی) ہے۔ یہی صبر اگر کسی پریشان کن حادثہ کو برداشت کرنے کی صورت میں ہو تو اسے رَحْبُ الصَّدْرِ (کشاوہ دلی) کہتے ہیں جس کی ضد ضَجْرُ ہے۔ اگر کسی بات کو روک رکھے تو اسے

① راجع الآية (۴-۳۸)۔

② واصبح يأتي بمعنى صار كما في الآية (۵-۳۰) (۲-۱۰۲)۔

③ وقد فصل الغزالي في الاحياء (۴-۶۶-۶۷) احسن تفصيل و ايسط من هذا فليراجع اليه وقد كان المؤلف معاصراً للغزالي والغزالي مع فضله كان يستفيد من كتب المؤلف كما ذكرنا في المقدمة۔

④ وفي الكنز عن اعرابي مرفوعاً: صم شهر الصبر وصوم ثلاثة ايام من كل شهر ينهين و حرا الصدر و بمعناه راجع ابن جرير عن علي موقوفاً (رقم ۲۰۲، ۱۶۳، ۳۰۱، ۲۱۳)۔

⑤ لم اجد في مجاز بل قاله ابن قتيبة في مشكله (۶۹) وحكى عن الفراء من الاصمعي قول الاعرابي فابن قتيبة تصحف بابي عبدة و نسب الطبري هذا المعنى الى قتادة واختاره (۲-۹۱-۹۲) وايضاً قارن حجاز ابى عبدة (۱-۴۶) ولحكاية الاعرابي معاني القرآن للفراء (۱-۱۰۳) والكشاف (۱-۱۰۸)۔

⑥ حكاة و الاصمعي عن قاضي اليمن (المشكل ۶۹)۔

(۱۹-۳۴) اس میں ہر صابر شاکر کے لیے نشانیاں ہیں۔ اور چونکہ انتظار میں صبر لازم ہے بلکہ یہ صبر ہی کی ایک قسم ہے اس لیے کبھی صبر کا لفظ بول کر انتظار کے معنی مراد لے لیتے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ﴾ (۲۸-۲۷) تم اپنے پروردگار کے حکم کے انتظار میں صبر کیے رہو۔ یعنی کفار پر خدا کے حکم کا انتظار کیجئے۔

### (ص ب غ)

الصَّبْغُ: یہ صَبَغْتُ (ص) کا مصدر ہے اور صَبَغُ بمعنی مَصْبُوعُ آتا ہے اور آیت کریمہ:

﴿صَبَّغَهُ اللَّهُ﴾ (۲-۱۳۸) (کہہ دو کہ ہم نے) خدا کا رنگ اختیار کر لیا ہے۔ میں اس عقل کی طرف اشارہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر پیدا کی ہے اور وہ اس کے ذریعہ بہائم سے ممتاز ہوتا ہے جیسا کہ فطرت انسانیہ۔

نصاری کے ہاں دستور یہ تھا کہ جب بچہ پیدا ہوتا تو وہ ساتویں روز اسے ”عمودیہ“ (زرورنگ کے پانی) میں غوطہ دیتے اور اس کا نام صَبَّغَہ یعنی دین رکھتے اس لیے اللہ تعالیٰ نے دین کو صَبَّغَہ اللہ کہا اور فرمایا۔

﴿وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللَّهِ صَبَّغَهُ﴾ (۲-۱۳۸) خدا سے بہتر رنگ یعنی دین کس کا ہو سکتا ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَصَبَّغْنَا لَكُمُ الْكِلِينَ﴾ (۲۳-۲۰) اور کھانے والے کے لیے سالن۔ میں صَبَّغُ کے معنی سالن کے ہیں اور یہ أَصْبَغْتُ بِالْحَلِّ کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی سرکہ میں روٹی ڈبو کر کھانے کے ہیں۔

لیکن یہاں مجاز بصورت حقیقت ہے کیونکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ تو نے گناہ پر جرأت کر کے اللہ تعالیٰ کے عذاب کو کیسے برداشت کیا اور جن لوگوں نے اس کے معنی مَا أَفْقَاهُمْ عَلَى النَّارِ يَا مَا أَعْمَلَهُمْ بِعَمَلِ أَهْلِ النَّارِ کیے ہیں ۵ تو اس کا بھی یہی مفہوم ہے کیونکہ کبھی صبر کے ساتھ وہ شخص بھی متصف ہوتا ہے جو درحقیقت تو صابر نہ ہو لیکن بظاہر دیکھنے میں صابر نظر آتا ہو لہذا اس موقع پر صیغہ تعجب کا استعمال مخلوق کے لحاظ سے ہے نہ کہ باری تعالیٰ کے لحاظ سے اور آیت کریمہ ہے:

﴿إِصْبِرُوا وَصَابِرُوا﴾ (۳-۲۰۰) ثابت قدم رہو اور استقامت رکھو۔

کے معنی ہیں کہ عبادت الہی پر اپنے آپ کو روک رکھو اور خواہشات نفسانی کے خلاف جہاد کرو اور آیت کریمہ:

﴿وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهِ﴾ (۱۹-۶۵) اور اس کی عبادت پر ثابت قدم رہو، میں اصْطَبِرْ کے معنی مشقت کے ساتھ صبر کرنے کے ہیں اور آیت کریمہ:

﴿أُولَئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوا﴾ کے معنی یہ ہیں کہ رضائے الہی حاصل کرنے کے لیے جو تکالیف انہوں نے برداشت کیں اس کے بدلے انہیں جنت میں بالا خانے دیئے جائیں گے اور آیت:

﴿فَصَبِّرْ جَمِيلٌ﴾ (۱۲-۱۸) اچھا صبر (کہ وہی) خوب ہے۔ میں صبر کا حکم اور اس کی تلقین ہے۔

الصَّبُورُ: صبر پر قدرت رکھنے والا۔ صَبَّارُ کے معنی تکلیف اور مجاہدہ سے صبر کرنے والے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُورٍ﴾



﴿وَالصَّابِئِينَ وَالنَّصَارَى﴾ (۲۲-۱۷) اور ستارہ

پرست اور عیسائی۔

﴿وَالنَّصَارَى وَالصَّابِئِينَ﴾ (۲-۶۲) اور عیسائی یا

ستارہ پرست۔

اور ایک قرأت میں صَابِئِينَ (بدوں ہمزہ کے) ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ ہمزہ تخفیف کے لیے حذف کر دیا گیا

ہے جیسا کہ آیت کریمہ:

﴿لَا يَأْكُلُهُ إِلَّا الْخَاطُونَ﴾ (۶۹-۳۷) جس کو

گنہگاروں کے سوا کوئی نہیں کھائے گا۔

میں الْخَاطُونَ اصل میں خَاطِطُونَ ہے۔ اور بعض نے

کہا: نہیں بلکہ یہ صَبَا يَصْبُونَ مشتق ہے جس کے معنی

مائل ہونا اور جھکنا کے ہیں۔<sup>①</sup>

www.KitaboSunnat.com (ص ح ب)

الصَّاحِبُ کے معنی ہیں: ہمیشہ ساتھ رہنے والا۔

خواہ وہ کسی انسان یا حیوان کے ساتھ رہے یا مکان یا زمان

کے اور عام اس سے کہ وہ مصاحبت بدنی ہو جو کہ اصل اور

اکثر ہے یا بذریعہ عنایت اور ہمت کے ہو، جس کے متعلق

کہ شاعر نے کہا ہے (الطویل) ② (۲۷۲) لَسْتُ غَبْتُ

عَنْ عَيْنِي لَمَّا غَبْتُ عَنْ قَلْبِي (اگر تو میری نظروں

سے غائب ہے تو دل سے تو غائب نہیں ہے) اور عرف میں

”صاحب“ صرف اسی کو کہا جاتا ہے جو عام طور پر ساتھ

رہے اور کبھی کسی چیز کے مالک کو بھی ”هُوَ صَاحِبُهُ“ کہہ

دیا جاتا ہے اسی طرح اس کو بھی جو کسی چیز میں تصرف

## (ص ب و)

الصَّبِيُّ: نابالغ لڑکا۔ رَجُلٌ مُصْبٍ: عیال دار جس

کے بچے نابالغ ہوں۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿كَيْفَ تَكْلِمُ مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا﴾ (۱۹-۲۹)

(وہ بولے کہ) ہم اس سے جو کہ گود کا بچہ ہے کیونکر بات

کریں۔

صَبَا فُلَانٌ يَصْبُو صَبْوًا وَصَبَوَةً: کسی چیز کی طرف

مائل ہو کر بچوں کے سے کام کرنے لگا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿أَصْبُ إِلَيْهِنَّ وَأَكُنْ مِنَ الْجَاهِلِينَ﴾ (۱۲-۳۳)

تو میں ان کی طرف مائل ہو جاؤں گا اور نادانوں میں داخل

ہو جاؤں گا۔

أَصْبَانِي فَصَبَوْتُ اس نے مجھے گرویدہ کیا چنانچہ میں

گرویدہ ہو گیا۔

الصَّبَا: پروائی ہوا۔ صَابَيْتُ السَّيْفَ: الٹی تلوار نیا

میں ڈالی۔ صَابَيْتُ الرُّمَحَ: نیزہ مارنے کے لیے جھکا

دیا۔

الصَّابِئُونَ: ایک فرقے کا نام ہو جو نوح علیہ السلام کے

دین پر ہونے کے مدعی تھا اور ہر وہ آدمی جو ایک دین کو

چھوڑ کر دوسرے دین میں داخل ہو جائے اسے صابی

کہا جاتا ہے۔ یہ صَبَا نَابُ الْبَعِیْزِ کے محاورہ سے ماخوذ

ہے جس کے معنی ہیں: اونٹ کے پگھل نکل آئی۔ قرآن

پاک میں ہے:

① وکذا ذکر المؤلف تحت (ص ب و)۔

② وصدرة: انا والذى لو شاء لم يخلق الهوى۔ والبيت فى الامالى (۱۹۲:۲) وقال انشدنا منصور بن بشر وفيه النوى، بدل

الهوى والحصرى فى زهره (۱۹۳:۱) بغير عزوفيه فما بدل لما وبعده: يوهمنيك الشوق حتى كانما انا حيك عن قرب وان لم

تكن قريبا وفى رواية تربنيك ولم اجد من عزاه الى قائله.

میں ہنسبت لفظ اَلْاِجْتِمَاع کے مبالغہ پایا جاتا ہے کیونکہ مُصَاحِبَةٌ کا لفظ عرصہ دراز تک ساتھ رہنے کو مقتضی ہے۔ اور لفظ اجتماع میں یہ شرط نہیں ہے۔ لہذا اِصْطِحَابُ کے موقعہ پر اجتماع کا لفظ تو بول سکتے ہیں مگر اجتماع کی جگہ پر ہر مقام میں اِصْطِحَابُ کا لفظ نہیں بول سکتے۔ اور آیت کریمہ:

﴿مَا بِصَاحِبِكُمْ مِّنْ جِنَّةٍ﴾ (۳۳-۳۶) تمہارے رفیق کو سودا نہیں۔ میں آنحضرت کو صَاحِبُکُمْ کہہ کر متنبہ کیا ہے کہ تم نے ان کے ساتھ زندگی بسر کی ہے ان کا تجربہ کر چکے ہو اور ان کے ظاہر و باطن سے واقف ہو چکے ہو پھر بتاؤ کہ ان میں کوئی دماغی خلل یا دیوانگی پائی جاتی ہے.....؟ یہی معنی آیت:

﴿وَمَا صَاحِبُكُم بِمَجْنُونٍ﴾ (۸۱-۲۲) کے ہیں۔ اَلْاِصْطِحَابُ لَشَيْءٍ کے معنی ہیں: وہ فرمانبردار ہو گیا اصل میں اس کے معنی کسی کا مصاحب بن کر اس کے ساتھ رہنے کے ہیں۔ چنانچہ اَصْحَبُ فُلَانٍ اس وقت بولتے ہیں جب کسی کا بیٹا بڑا ہو کر اس کے ساتھ رہنے لگے۔ اور اَصْحَبُ فُلَانٍ فُلَانَا کے معنی ہیں: وہ اس کا ساتھی بنا دیا گیا قرآن میں ہے:

﴿وَلَا هُمْ مَتَّاعُونَ﴾ (۲-۴۲) اور نہ ہم سے پناہ ہی دیئے جائیں گے۔

یعنی ہماری طرف سے ان پر سکینہ، تسلی کشائش وغیرہ کی صورت میں کسی قسم کا ساتھ نہیں دیا جائے گا جیسا کہ اس قسم کی چیزوں سے اولیاء اللہ کی مدد کی جاتی ہے۔

اَدِينُمْ مُصْحَبٌ: کچا چمڑہ جس سے بال نہ اتارے

کا مالک ہو۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿اِذْ يَقُولُ لِصَاحِبِهِ لَا تَحْزَنْ﴾ (۹-۴۰) اس وقت پیغمبر اپنے رفیق کو تسلی دیتے تھے کہ غم نہ کرو۔

﴿قَالَ لَهُ صَاحِبُهُ وَهُوَ يُحَاوِرُهُ﴾ (۱۸-۳۷) تو اس کا دوست جو اس سے گفتگو کر رہا تھا کہنے لگا۔

﴿اَمْ حَسِبْتَ اَنَّ اَصْحَابَ الْكَهْفِ وَالرَّقِيمِ﴾ (۱۸-۱۱۹) کیا تم خیال کرتے ہو کہ غار اور لوح والے۔

﴿وَاَصْحَابُ مَدْيَنَ﴾ (۲۲-۴۴) اور مدین کے رہنے والے بھی۔

﴿اَصْحَابُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ﴾ (۲-۸۲) وہ جنت کے مالک ہوں گے (اور) ہمیشہ اس میں (عیش کرتے) رہیں گے۔

﴿وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوتِ﴾ (۶۸-۴۷) اور مچھلی (کا لقمہ ہونے والے یونس) کی طرح نہ ہونا۔ اور آیت کریمہ:

﴿مِّنْ اَصْحَابِ السَّعِيرِ﴾ (۳۵-۶۰) (تاکہ وہ) دوزخ والوں میں ہوں۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَمَا جَعَلْنَا اَصْحَابَ النَّارِ اِلَّا مَلَائِكَةً﴾ (۴۳-۳۱) اور ہم نے دوزخ کے داروغہ فرشتے بنائے ہیں۔

میں اَصْحَابِ النَّارِ سے دوزخی مراد نہیں ہیں بلکہ دوزخ کے داروغے مراد ہیں۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

پھر ”صاحب“ کا لفظ کبھی ان کی طرف مضاف ہوتا ہے جو کسی کے زیر نگرانی ہوتے ہیں جیسے صَاحِبُ الْجَبِشِ (فوج کا حاکم) اور کبھی حاکم کی طرف جیسے: صَاحِبُ الْاَمِيرِ (بادشاہ کا وزیر) اَلْمُصَاحِبَةُ وَالْاِصْطِحَابُ

گئے ہوں۔

کی طرف کہ آیت کریمہ:

﴿يَوْمَ يَنْفَخُ فِي الصُّورِ﴾ (۲۰-۱۰۲) میں اشارہ پایا جاتا ہے اور اسی سے اصْاخُ يُصْنِخُ مقلوب ہے جس کے معنی آواز کی تختی سے کسی کو بہرہ کر دینا کے ہیں۔

### (ص خ ر)

الصَّخْرُ کے معنی سخت پتھر یا چٹان کے ہیں قرآن پاک میں ہے:

﴿فَتَكُنْ فِي صَخْرَةٍ﴾ (۳۱-۳۱) اور ہو بھی کسی پتھر کے اندر ﴿وَتَسْمُودَ الَّذِي جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ﴾ (۸۹-۹) اور ثمود کے ساتھ (کیا کیا) جنہوں نے وادی (قری) میں چٹانیں تراش کر (مکان بنائے)

### (ص د د)

الصُّدُودُ وَالصَّدُّ: کبھی لازم ہوتا ہے جس کے معنی کسی چیز سے روگردانی اور اعراض برتنے کے ہیں جیسے فرمایا:

﴿وَيَصُدُّونَ عَنْكَ صُدُودًا﴾ (۳-۶۱) کہ تم سے اعراض کرتے اور رکے جاتے ہیں۔

اور کبھی متعدی ہوتا ہے یعنی روکنے اور منع کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جیسے فرمایا:

﴿وَزَيْنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ أَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيلِ﴾ (۲۹-۳۸) اور شیطان نے ان کے اعمال ان کو آراستہ کر دکھائے اور ان کو سیدھے راستے سے روک دیا۔

﴿الَّذِينَ كَفَرُوا وَصَدُّوا عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ﴾ (۱۲-۱۸۸) جن لوگوں نے کفر کیا اور (لوگوں کو) خدا

### (ص ح ف)

الصَّحِيفَةُ کے معنی پھیلی ہوئی چیز کے ہیں جیسے صَحِيفَةُ الْوَجْهِ (چہرے کا پھیلاؤ) اور وہ چیز جس میں کچھ لکھا جاتا ہے اسے بھی صحیفہ کہتے ہیں اس کی جمع صَحَائِفُ و صُحُفٌ آتی ہے قرآن پاک میں ہے:

﴿صُحُفَ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَى﴾ (۸۷-۱۹) یعنی ابراہیم اور موسیٰ علیہ السلام کے صحیفوں میں اور آیت کریمہ: ﴿يَتْلُوا صُحُفًا مُطَهَّرَةً فِيهَا كُتِبَ قِيمَةٌ﴾ (۹۸-۳۰) پاک اوراق پڑھتے ہیں جن میں مستحکم (آیتیں) لکھی ہوئی ہیں، میں بعض نے کہا ہے کہ صُحُفٌ سے قرآن پاک مراد ہے اور اس کو صُحُفًا اور فِيهَا كُتِبَ اس لیے کہا ہے کہ قرآن پاک کتب سابقہ کی نسبت بہت سے زائد احکام اور نصوص پر مشتمل ہے۔

الْمُصْحَفُ متعدد صحیفوں کا مجموعہ اس کی جمع مَصَاحِفُ آتی ہے اور التَّصْحِيفُ کے معنی اشباعہ حروف کی وجہ سے کسی صحیفہ کی قراءت یا روایت میں غلطی کرنے کے ہیں۔ اور صَحْفَةٌ (چوڑی رکابی) چوڑے پیالے کی طرح کا ایک برتن۔<sup>۱</sup>

### (ص خ خ)

الصَّاخَةُ یہ صَخَّ يَصْنُ صَخَّ فَهُوَ صَاخٌ سے اسم ہے جس کے معنی کسی ذی نطق کی آواز کی تختی اور کرخت پن کے ہیں۔ اور آیت کریمہ:

﴿فَإِذَا جَاءَتِ الصَّاخَةُ﴾ (۸۰-۲۲) تو جب (قیامت کا) غل بجے گا۔ میں صَاخَةٌ سے مراد قیامت ہے جس

ہیں۔ پھر بطور استعارہ ہر چیز کے اعلیٰ (اگلے) حصہ کو صَدْرُ کہنے لگے ہیں جیسے صَدْرُ الْقَنَآةِ (نیزے کا بھالا) صَدْرُ الْمَجْلِسِ (رئیس مجلس) صَدْرُ الْكِتَابِ اور صَدْرُ الْكَلَامِ وغیرہ صَدْرَہ کے معنی کسی کے سینہ پر مارنے یا اس کا قصد کرنے کے ہیں جیسا کہ ظَهَرُہ و كَتَفُہ کے معنی کسی کی پیٹھ یا کندھے پر مارنا کے آتے ہیں۔ اور اسی سے رَجُلٌ مَصْدُورٌ کا محاورہ ہے یعنی وہ شخص جو سینہ کی بیماری میں مبتلا ہو پھر جب صَدْرُ کا لفظ عَنْ کے ذریعہ متعدی ہو تو معنی اِنْصَرَفَ کو متضمن ہوتا ہے جیسے۔ صَدَرَتِ الْإِبِلُ عَنِ الْمَاءِ صَدْرًا وَ صَدْرًا: اونٹ پانی سے سیر ہو کر واپس لوٹ آئے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿يَوْمَئِذٍ يَصْدُرُ النَّاسُ أَشْتَاتًا﴾ (۹۹-۶) اس دن لوگ گروہ گروہ ہو کر آئیں گے۔

اور مَصْدَرُ کے اصل معنی پانی سے سیر ہو کر واپس لوٹنا کے ہیں یہ ظرف مکان اور زمان کے لیے بھی آتا ہے اور علمائے نحوی اصطلاح میں مَصْدَرُ اس لفظ کو کہتے ہیں جس سے فعل ماضی اور مستقبل کا اشتقاق فرض کیا گیا ہو اور صَدَارٌ بروزن دَنَارٌ وَ لِبَاسٌ اس کپڑے کو کہتے ہیں جس سے سینہ ڈھانپا جائے اور اسے صُدْرَہ بھی کہا جاتا ہے اور صَدَارُ اس داغ کو کہتے ہیں جو اونٹ کے سینہ پر نمایاں ہوتا ہے۔

صَدْرُ الْفَرَسِ: گھوڑے کا دوز میں اول آنا۔

بعض حکماء نے کہا ہے کہ قرآن پاک میں جہاں کہیں قلب کا لفظ استعمال ہوا ہے وہاں صرف علم و عقل کی طرف اشارہ

کے رستے سے روکا۔

﴿وَيَصْدُورَنَّ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ﴾ (۸-۳۷) اور خدا کی راہ سے روکتے ہیں۔

﴿قُلْ قِتَالٌ فِيهِ كَبِيرٌ وَصَدٌّ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ﴾ (۲-۳۱۷) (اے پیغمبر) کہہ دو کہ ان میں لڑنا بڑا گناہ ہے اور خدا کی راہ سے روکنا۔

﴿وَلَا يَصْدَنُكَ عَنْ آيَاتِ اللَّهِ بَعْدَ إِذْ أَنْزَلْتُ إِلَيْكَ﴾ (۲۸-۸۷) اور وہ تمہیں خدا کی آیتوں (کی تبلیغ) سے بعد اس کے کہ وہ تم پر نازل ہو چکی ہیں روک نہ دیں۔

علیٰ ہذا القیاس اور بھی بہت سی آیات ہیں جن میں یہ لفظ روکنے اور منع کرنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

اور صُدُودٌ وَ صَدٌّ دونوں مصدر ہیں۔ نیز پہاڑ کی روک کو بھی صَدٌّ کہا جاتا ہے۔<sup>۱</sup>

الصَّدِيدُ: پیپ کیونکہ وہ چمڑے اور گوشت کے درمیان حائل ہو جاتی ہے اور دو زخیوں کے طعام کو بطور مثال کے صدید کہا گیا ہے چنانچہ فرمایا:

﴿وَيُسْقَى مِنْ مَّاءٍ صَدِيدٍ﴾ (۱۳-۱۶) اسے پیپ کا پانی پلایا جائے گا۔

## (ص د ر)

الصَّدْرُ: سینہ کو کہتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿رَبِّ اشْرَحْ لِي صَدْرِي﴾ (۲۰-۲۵) میرے پروردگار! اس کام کے لیے میرا سینہ کھول دے۔ اس کی جمع صُدُورٌ آتی ہے جیسے فرمایا:

﴿وَلَكِنْ نَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ﴾ (۲-۳۶) بلکہ دل جو سینوں میں ہیں وہ اندھے ہوتے

۱ وایضاً صَدٌّ (ض) يَصْدُ صَدِيدًا (۴۳-۵۷)۔



سے استعارہ کے طور پر صَدَعَ الْأَمْرَ کا محاورہ ہے جس کے معنی کسی امر کے ظاہر اور واضح کر دینے کے ہیں۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿فَاَصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ﴾ (۹۳-۱۵) پس جو حکم تم کو (خدا

کی طرف سے) ملا ہے اسے کھول کر بیان کرو اور اسی سے

صَدَاعُ کا لفظ مستعار ہے جس کے معنی در دسر کے ہیں

جس سے گویا سر پھٹا جا رہا ہو۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿لَا يُصَدِّعُونَ عَنْهَا وَلَا يُنْزِفُونَ﴾ (۱۹-۵۶)

اس سے نہ تو در دسر ہوگا اور نہ ان کی عقلیں زائل ہوں گی۔

اور اسی صَدِيعُ بمعنی فجر ہے۔ اور صَدَعْتُ الْفَلَاحَةَ

کے معنی بیاباں طے کرنے کے ہیں۔ تَصَدَعَ الْقَوْمُ:

لوگ منتشر ہو گئے۔ قرآن میں ہے:

﴿يَوْمَئِذٍ يَصْدَعُ غُؤْنُ﴾ (۴۳-۳۰) اس روز سب لوگ

الگ الگ ہو جائیں گے۔

### (ص د ف)

صَدَفَ عَنْهُ کے معنی سخت اعراض برتنے کے ہیں

اور الصَّدْفُ: اصل میں (۱) پہاڑ کے کنارہ (۲) سیپ

اور (۳) اونٹ کی ٹانگوں میں کچی کو کہتے ہیں پھر ٹانگوں کے

ٹیڑھے پن یا پہاڑ اور سیپ کی سختی کے اعتبار سے شدت

اعراض کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے قرآن پاک میں

ہے:

﴿فَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَبَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَصَدَفَ

عَنْهَا سَنَجْزِي الَّذِينَ يَصْدِفُونَ..... بِمَا كَانُوا

يَصْدِفُونَ﴾ (۱۵۷-۶) تو اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا

جو خدا کی آیتوں کی تکذیب کرے اور ان سے منہ پھیر لے

ہے جیسے فرمایا:

﴿إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَذِكْرٍ لِّمَنْ كَانَ لَهُ

قَلْبٌ---﴾ (۵۰-۳۷) جو شخص دل آگاہ رکھتا ہے اس

کے لیے اس میں نصیحت ہے۔

اور جہاں صَدُورُ کا لفظ ذکر کیا گیا ہے وہاں علم و عقل کے

علاوہ شہوت، ہوائے نفس اور غضب وغیرہ قوی نفسانیہ کی

طرف بھی اشارہ کرنا مقصود ہوتا ہے۔ چنانچہ آیت کریمہ:

﴿رَبِّ اشْرَحْ لِي صَدْرِي﴾ (۲۵-۲۰) میں نفسانی

قوی کی اصلاح کا ہی سوال ہے اسی طرح آیت کریمہ:

﴿وَشِفَاءٌ لِّمَا فِي الصُّدُورِ﴾ (۵۷-۱۰) میں بتایا

ہے کہ قرآن پاک نفسیاتی امراض کے لیے شفا ہے اور

آیت کریمہ:

﴿وَشِفِّ صُدُورَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِينَ﴾ (۴-۹) میں اشارہ

ہے کہ مومن ہی اس سے نفسیاتی شفا حاصل کرتے ہیں۔

اور آیت کریمہ: ﴿فَإِنَّهَا لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَلَكِنْ

تَعْمَى الْقُلُوبَ الَّتِي فِي الصُّدُورِ﴾ (۴۲-۲۲) بات

یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ دل جو سینوں میں

ہیں وہ اندھے ہو جاتے ہیں۔

میں قلوب سے مراد وہ عقول ہیں جو جذبات نفسانی سے

مغلوب ہو کر ان میں گم ہو کر رہ جاتی ہیں اور صحیح راستے کی

طرف ہدایت نہیں پاسکتیں۔

### (ص د ع)

الصَّدْعُ: کے معنی ٹھوس اجسام۔ جیسے شیشہ لوہا

وغیرہ میں شکاف ڈالنا کے ہیں۔ ۱۔ صَدَعَ (ف)

وَصَدَعَ متعدی ہے اور اِنْصَدَعَ وَتَصَدَعَ لازم اسی

ایک شرط نہ پائی جائے تو کمال صدق باقی نہیں رہتا۔ ایسی صورت میں یا تو وہ کلام صدق کے ساتھ متصف ہی نہیں ہو گی اور یا وہ مختلف حیثیتوں سے کبھی صدق اور کبھی کذب کے ساتھ متصف ہوگی۔ مثلاً: ایک کافر جب اپنے ضمیر کے خلاف مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللّٰہِ کہتا ہے تو اسے نفس واقعہ کے مطابق ہونے کی حیثیت سے صدق (سچ) بھی کہہ سکتے ہیں اور اس کے دل و زبان کے ہم آہنگ نہ ہونے کی وجہ سے کِذْبٌ (جھوٹ) بھی کہہ سکتے ہیں چنانچہ اس دوسری حیثیت سے اللہ نے منافقین کو ان کے اس اقرار میں کہ:

﴿نَشْهَدُ اَنْتَ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ﴾ (۶۳-۱) ہم اقرار کرتے ہیں کہ آپ اللہ کے پیغمبر ہیں۔ جھوٹا قرار دیا ہے کیونکہ وہ اپنے ضمیر کے خلاف یہ بات کہہ رہے تھے۔

الصَّٰدِقُ: بہت سچ بولنے والا۔ بعض نے کہا ہے: نہیں بلکہ صِدِّیقُ اسے کہتے ہیں ”جس نے کبھی جھوٹ نہ بولا ہو“ اور بعض نے کہا ہے: بلکہ صِدِّیقُ وہ ہے جو سچ کا اس قدر خوگر ہو کہ اس سے جھوٹ بن ہی نہ آتا ہو۔ اور بعض کے نزدیک صدیق وہ ہے جو قول و اعتقاد میں سچا ہو اور پھر اپنی سچائی کی صِدِّیقِ اپنے عمل سے بھی کر دکھائے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَ اذْكُرْ فِی الْكِتَابِ اِبْرٰهٖمَ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّیقًا نَّبِیًّا﴾ (۱۹-۴۱) اور کتاب میں ابراہیم علیہ السلام کو یاد کرو بے شک وہ نہایت سچے پیغمبر تھے۔

﴿وَاُمُّہٗ صِدِّیقَةٌ﴾ (۵-۷۵) اور ان کی والدہ (مریم علیہا السلام) خدا کی ولی تھی۔ اور آیت:

﴿مِّنَ النَّبِیِّیْنَ وَالصِّدِّیْقِیْنَ وَالشُّہَدَآءِ﴾ (۴-۲۹)

جو ہماری آیتوں سے اعراض برتتے ہیں اس اعراض کے سبب ہم ان کو..... سزا دیں گے۔

## (ص د ق)

الصِّدْقُ: یہ الْکِذْبُ کی ضد ہے۔ اصل میں یہ دونوں قول کے متعلق استعمال ہوتے ہیں خواہ اس کا تعلق زمانہ ماضی کے ساتھ ہو یا مستقبل کے وعدہ کے قبیل سے ہو یا وعدہ کے قبیل سے نہ ہو الغرض بالذات یہ قول ہی کے متعلق استعمال ہوتے ہیں۔ پھر قول میں بھی صرف خبر کے لیے آتے ہیں اور اس کے ماسوا دیگر اصناف کلام میں استعمال نہیں ہوتے۔ اسی لیے ارشاد ہے:

﴿وَمَنْ اٰصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِیْلًا﴾ (۴-۱۲۲) اور خدا سے زیادہ بات کا سچا کون ہو سکتا ہے۔

﴿اِنَّہٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ﴾ (۱۹-۵۴) وہ وعدے کے سچے..... تھے۔

مگر کبھی بالعرض یعنی ضمنی طور پر دیگر اصناف کلام مثلاً استفہام امر دعا وغیرہ کے لیے بھی آجاتے ہیں مثلاً: اَزِیْدُ فِی الدَّارِ؟ (کیا زید مکان کے اندر موجود ہے؟) بظاہر استفہام کلام ہے مگر ضمناً اس میں خبر کے معنی بھی پائے جاتے ہیں یعنی یہ کہ متکلم زید کی حالت سے بے خبر ہے اسی طرح وَاٰسِیْنِ (میرے ساتھ ہمدردی کیجئے) اصل میں درخواست ہے مگر ضمناً معنی خبر مفہوم ہوتا ہے یعنی یہ کہ میں ہمدردی کا محتاج ہوں اسی طرح جب لَا تُؤْذِ (مجھے تکلیف مت دو) کہا جائے تو اس کے ضمن میں یہ معنی پایا جاتا ہے کہ وہ اسے ایذا پہنچاتا ہے۔

الصِّدْقُ کے معنی ہیں: دل و زبان کی ہم آہنگی اور بات کا نفس واقعہ کے مطابق ہونا اگر ان دونوں میں سے کوئی

کی خواب کو عملاً سچ کر دکھایا اسی طرح آیت کریمہ:

﴿وَالَّذِي جَاءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهِ﴾ (۳۹)۔

(۳۳) کے معنی یہ ہیں کہ وہ شخص جو سچائی لوگوں کے پاس

لے کر آئے اور پھر اسے اپنے عمل سے بھی سچ کر دکھایا۔ نیز

ہر وہ فعل جو ظاہر و باطن کے اعتبار سے فضیلت کے ساتھ

متصف ہو اسے صدق سے تعبیر کیا جاتا ہے اس بنا پر ایسے

فعل کو صدق کی طرف مضاف کر دیا جاتا ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿فِي مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِيكٍ مُّقْتَدِرٍ﴾ (۵۴)۔

(۵۵) یعنی سچے مقام میں ہر طرح کی قدرت رکھنے والے

بادشاہ کی بارگاہ میں۔

﴿أَن لَّهُمْ قَدَمٌ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ﴾ (۱۰-۱۲) کہ

ان کے پروردگار کے ہاں ان کا سچا درجہ ہے۔

﴿أَدْخَلْنِي مُدْخَلَ صِدْقٍ وَأَخْرِجْنِي مُخْرَجَ

صِدْقٍ﴾ (۱۷-۱۸) (اور کہو کہ اے پروردگار! مجھے

(مدینے) اچھی طرح داخل کیجیو اور نکلنے سے اچھی

طرح نکالو۔ اور آیت:

﴿وَأَجْعَلْ لِّي لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْآخِرِينَ﴾

(۲۶-۸۴) اور پچھلے لوگوں میں میرا ذکر نیک (جاری) کر۔

میں یہ دعا کی ہے کہ اللہ! مجھے ایسا صالح بنا دے کہ میری

موت کے بعد جب لوگ میری تعریف کریں تو ان کی

تعریف غلط نہ ہو بلکہ ایسی ہو جیسا کہ شاعر نے کہا ۱۰ ہے۔

(۲۷۳) إِذَا نَحْنُ اثْنَيْنَا عَلَيْكَ بِصَالِحٍ

فَأَنْتَ الَّذِي ثَنَيْتَنِي وَفَوْقَ الَّذِي ثَنَيْتَنِي

جب ہم کسی بھی اچھے کام پر تیری تعریف کرتے ہیں تو تم

یعنی انبیاء اور صدیق اور شہداء میں صدیقین سے وہ لوگ

مراد ہیں جو فضیلت میں انبیاء سے کچھ کم درجہ کے ہوتے ہیں

جیسا کہ ہم اپنی کتاب ”الذريعة الى مكارم الشريعة“

میں بیان کر چکے ہیں۔ کبھی صدق و کذب کا استعمال ہر اس

چیز کے متعلق ہوتا ہے جو عقیدہ میں ثابت اور موجود ہو جیسے

صَدَقَ ظَنِّي وَكَذَّبَ (اس نے میرا گمان سچ کر دکھایا یا

جھوٹ کر دکھایا) اور کبھی ان کا استعمال افعال جو ارجح کے

متعلق ہوتا ہے۔ مثلاً: کوئی شخص جنگ میں حق شجاعت ادا

کرے اور جو کچھ اور جیسا کہ اس پر واجب ہو اسے کر دکھائے

تو ایسے شخص کے متعلق کہا جاتا ہے۔ صَدَقَ فِى

الْقِتَالِ (وہ جنگ میں سچا رہا) اور اگر اس کے خلاف کرے تو

كَذَّبَ فِى الْقِتَالِ (یعنی وہ جنگ میں جھوٹا نکلا) کہا جاتا

ہے اسی کے مطابق قرآن پاک میں ہے:

﴿رَجُلًا صَدَقُوا مَا عَاهَدُوا اللَّهَ عَلَيْهِ﴾ (۳۳)

(۲۳) یعنی ایسے شخص بھی ہیں جنہوں نے اللہ سے کیے

ہوئے عہد کو اپنے عمل سے سچ کر دکھایا۔ اور آیت کریمہ:

﴿لَيْسَتِلَّ الصَّادِقِينَ عَنْ صِدْقِهِمْ﴾ (۳۳-۱۷)

کے معنی یہ ہیں کہ زبان سے سچ بولنے والوں سے ان کی

عملی سچائی کے متعلق دریافت کرے۔ اس میں تنبیہ ہے کہ

نجات کے لیے زبان سے حق کا اعتراف ہی کافی نہیں ہے

جب تک کہ انسان عملاً اسے پورا کرنے کی کوشش نہ کرے۔

اور آیت کریمہ:

﴿لَقَدْ صَدَقَ اللَّهُ رَسُولَهُ الرُّؤْيَا بِالْحَقِّ﴾

(۳۸-۲۷) میں صدق فعلی مراد ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے پیغمبر

۱۰ قالہ ابو نواس فی مدح الامین والبیہ فی الوساطة ۳۱۸ و دیوانہ والصناعتین ۲۰۸ والحصری (۷۱: ۴) ومستة و بعده: وان جرت الالفاظ يوماً بعدمة لغيرك انسانا فانت الذى تعني ۱۲۔

کے پاس کتاب آئی جو ان کی (آسمانی) کتاب کی بھی تصدیق کرتی ہے۔

﴿نَزَّلَ عَلَيْكَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ﴾ (۳-۳) اس نے (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) تم پر سچی کتاب نازل کی جو پہلی آسمانی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے۔

﴿وَهَذَا كِتَابٌ مُصَدِّقٌ لِّسَانَا عَرَبِيًّا﴾ (۳-۳) اور یہ کتاب عربی زبان میں ہے اس کی تصدیق کرتی ہے۔ یعنی پہلی کتابوں کی تصدیق کرنے والی ہے یہاں لِسَانًا منصوب علی الحال ہے مثل مشہور ہے۔ (مثل) ﴿صَدَّقْنِي سِنَ بَكْرِهِ﴾ یعنی اس نے اپنے دل کی بات صحیح طور پر بتادی۔

الْصَّدَاقَةُ کے معنی سچی دوستی کے ہیں اور یہ انسان کے ساتھ مخصوص ہے۔ اس کے علاوہ کسی اور کے لیے استعمال نہیں ہوتا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَمَا لَنَا مِن شَافِعِينَ وَلَا صِدِّيقٍ حَمِيمٍ﴾ (۱۰۱-۲۶) (تو آج) نہ کوئی ہمارا سفارش کرنے والا ہے اور نہ گرم جوش دوست۔ اس میں آیت کریمہ:

﴿الْأَخِلَاءُ يَوْمَئِذٍ بَعْضُهُم لِبَعْضٍ عَدُوٌّ إِلَّا الْمُتَّقُونَ﴾ (۴۳-۶۷) جو (آپس میں) دوست (ہیں)، اس روز ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے۔ کے مضمون کی طرف اشارہ ہے۔

الْصَّدَقَةُ: (خیرات) ہر وہ چیز جو انسان اپنے مال سے قرب الہی حاصل کرنے کے لیے دیتا ہے اور یہی معنی

واقعی اس تعریف کے اہل نکلے ہو بلکہ ہماری تعریف سے بھی تم بڑھ کر ہو۔

اور صَدَقَ کبھی دو مفعولوں کی طرف متعدی ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللَّهُ وَعْدَهُ﴾ (۱۵۲-۳) اور خدا نے اپنا وعدہ سچا کر دیا ہے۔

صَدَقْتُ فُلَانًا کے معنی ہیں کسی کو سچائی کی طرف منسوب کرنا اور أَصَدَقْتُهُ کے معنی سچا پانے کے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ دونوں فعل ہم معنی ہیں اور ان ہر دو معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَلَمَّا جَاءَهُمْ رَسُولٌ مِّنْ عِنْدِ اللَّهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ﴾ (۱۰۱-۲) اور جب ان کے پاس خدا کی طرف سے پیغمبر (آخر الزماں) آئے اور وہ ان کی آسمانی کتاب کی بھی تصدیق کرتے ہیں۔

﴿وَوَقَّيْنَا عَلَىٰ أَنَارِهِم بِعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ﴾ (۳۶-۵) اور ان پیغمبروں کے بعد انہی کے قدموں پر ہم نے عیسیٰ بن مریم کو بھیجا۔ جو اپنے سے پہلے (کی) کتاب (توراة) کی تصدیق کرتے تھے۔ اَلتَّصَدِيقُ کا لفظ ہر اس چیز کے متعلق استعمال ہوتا ہے جس میں کسی چیز کی تحقیق پائی جائے محاورہ ہے۔

صَدَّقْنِي فِعْلُهُ وَكِتَابُهُ: اس نے اپنے عمل یا کتاب سے میری تصدیق کر دی۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿وَلَمَّا جَاءَهُمْ كِتَابٌ مِّنْ عِنْدِ اللَّهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ﴾ (۸۹-۲) اور جب خدا کے ہاں سے ان

① انظر للكلمة الميداني رقم (۲۰۸۳، ۲۱۱۰) ومن منصوب علی معنی عرفی دیرنی ی بالرفع علی التوسع قاله علی و ابو عمرو نسبه الى الاحنف حين رجع من عند معاوية والخبر في الميداني واللسان (صدق) ۱۲.



آیت کریمہ:

﴿وَإِنْ كَانَ ذُو عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ إِلَىٰ مَيْسَرَةٍ وَأَنْ تَصَدَّقُوا خَيْرٌ لَّكُمْ﴾ (۲-۲۸۰) اور اگر قرض لینے والا تنگ دست ہو تو اسے کشائش کے حاصل ہونے تک مہلت دو اور اگر زرقرض بخش ہی دو، تو تمہارے لیے زیادہ اچھا ہے۔

میں مُغْسِر یعنی تنگ دست کو معاف کر دینے کو صدقہ کے قائم مقام قرار دیا ہے اور اسی معنی میں آنحضرت سے مروی ہے۔ (۲)

((مَا تَأْكُلُ الْعَافِيَةُ فَهِيَ صَدَقَةٌ)) کہ جو کھیتی جانور کھا جائیں وہ بھی صدقہ ہے۔

اسی بنا پر آیت کریمہ:

﴿فَدِيَّةٌ مُّسَلَّمَةٌ إِلَىٰ أَهْلِهَا إِلَّا أَنْ يَصَّدَّقُوا﴾ (۳-۹۲) اور دوسرے مقتول کے وارثوں کو خون بہادے ہاں اگر وہ معاف کر دیں۔ میں معاف کر دینے کو صدقہ قرار دیا ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿فَقَدْ مَوَّابِينَ يَدِي نَجَوَاكُم صَدَقَةٌ﴾ (۵۸-۱۲) تو بات کہنے سے پہلے (مساکین کو) کچھ خیرات دے دیا کرو۔

﴿أَشْفَقْتُمْ أَنْ تُقَدِّمُوا بَيْنَ يَدِي نَجَوَاكُم صَدَقَاتٍ﴾ (۵۸-۱۳) کیا تم اس سے کہ پیغمبر کے کان میں کوئی بات کہنے سے پہلے خیرات دیا کرو ڈر گئے ہو۔ میں صحابہ کو حکم دیا گیا تھا کہ جو شخص آنحضرت سے سرگوشی

زکوٰۃ کے ہیں مگر صدقہ اسے کہتے ہیں جو واجب نہ ہو اور زکوٰۃ وہ ہے جس کا دینا واجب ہو۔ اور کبھی واجب کو بھی صدقہ سے موسوم کر دیا جاتا ہے۔ جب کہ خیرات دینے والا اس سے صدق یعنی صلاح تقویٰ کا قصد کرے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً﴾ (۹-۱۰۳) ان کے مال میں سے زکوٰۃ قبول کرو۔

﴿إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ﴾ (۹-۶۰) صدقات (یعنی زکوٰۃ و خیرات) تو مفلسوں کا حق ہے۔

صَدَقٌ وَتَصَدَّقَ کے معنی صدقہ دینے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:

﴿فَلَا صَدَقَ وَلَا صَلَّى﴾ (۵-۳۱) تو اس (نا عاقبت اندیش) نے نہ تو زکوٰۃ دی اور نہ نماز پڑھی۔

﴿إِنَّ اللَّهَ يَجْزِي الْمُتَصَدِّقِينَ﴾ (۱۲-۸۸) کہ خدا خیرات کرنے والوں کو ثواب دیتا ہے۔

﴿إِنَّ الْمُتَصَدِّقِينَ وَالْمُصَّدِّقَاتِ﴾ (۵۷-۱۸) جو لوگ خیرات کرنے والے ہیں مرد بھی اور عورتیں بھی۔ اسی طرح اور بھی بہت سی آیات میں اور تَصَدَّقَ بِہ کے معنی اپنے حق سے دست بردار ہو جانا بھی آتے ہیں۔ جیسے فرمایا:

﴿وَالْجُرُوحُ قِصَاصٌ فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهِ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهُ﴾ (۵-۲۵) اور سب زخموں کا اسی طرح بدلہ ہے لیکن جو شخص بدلہ معاف کر دے وہ اس کے لیے کفارہ ہوگا۔ اور

① انظر مجمع البحار (۲/۴۱۳) والنهاية (صدق) وبمعناه متفق عليه من (وحم، ت) حديث انس راجع الفتح (۳۰۲/۵) وفي الدارمی من حديث جابر: وما اكلت العافية منه وای من حاصبل الارض) ایضاً الترمذی وابن حبان، عن جابر (کنز العمال ج ۳، ص: ۵۱۳)

پاک میں ہے:

﴿أَمَّا مَنْ اسْتَغْنَىٰ فَأَنَّ لَهُ تَصَدَّىٰ﴾ (۸-۶۰)  
جو پرواہ نہیں کرتا اس کی طرف تم توجہ کرتے ہو۔

الصَّدَىٰ کے معنی بومہ بادام کے ہیں کیونکہ دماغ بھی بومہ کی شکل پر ہوتا ہے اسی لیے اس کو ہامہ بھی کہا جاتا ہے۔ مشہور محاورہ ہے۔ (مثل)

أَصَمَّ اللَّهُ صَدَا: خدا اسے ہلاک کرے۔ یعنی اس میں آواز ہی نہ رہے حتیٰ کہ اس کی صدائے بازگشت آئے۔

صَدَى: پیاس۔ صَدِيَان: پیاسا آدمی۔ اِمْرَءٌ صَدِيَاءٌ وَصَادِيَةٌ: پیاسی عورت۔

### (ص ر)

الإِصْرَارُ: کسی گناہ پر سختی سے جم جانا اور اس سے باز نہ آنا اصل میں یہ صَرٌّ سے ہے جس کے معنی باندھنے کے ہیں اور صُرَّةً اس تھیلی کو کہتے ہیں جس میں نقدی باندھ کر رکھ دی جاتی ہے اور صِرَارٌ (پستان بند) اس لہ کو کہتے ہیں جس سے اونٹنی کے تھن باندھ دیئے جاتے ہیں تاکہ اس کا بچہ دودھ نہ پی سکے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَلَمْ يُصِرُّوا عَلَىٰ مَا فَعَلُوهُ﴾ (۳-۳۵) اور وہ اپنی غلطی پر اصرار نہیں کرتے۔

﴿ثُمَّ يُصِرُّ مُسْتَكْبِرًا﴾ (۸-۳۵) مگر پھر غرور سے ضد کرتا ہے۔

﴿وَأَصْرُوا وَاسْتَكْبَرُوا وَاسْتَكْبَرُوا﴾ (۷۱-۷۱) اور اڑ گئے اور اڑ بیٹھے۔

﴿وَكَاَنُوا يُصِرُّونَ عَلَىٰ الْحِنثِ الْعَظِيمِ﴾ (۵۶-۴۶) اور گناہ عظیم پر اڑے ہوئے تھے۔

کرنا چاہتا ہے اسے چاہیے کہ سرگوشی سے پہلے حسب توفیق کچھ نذرانہ پیش کرے جس کی قرآن نے کوئی مقدار متعین نہیں کی تھی اور آیت کریمہ:

﴿رَبِّ لَوْلَا أَخَّرْتَنِي إِلَىٰ أَجَلٍ قَرِيبٍ فَأَصَّدَّقُ وَأَكُنْ مِنَ الصَّالِحِينَ﴾ (۶۳-۱۰) اے میرے پروردگار! تو نے مجھے تھوڑی سے اور مہلت کیوں نہ دی تاکہ میں خیرات کر لیتا اور نیک لوگوں میں داخل ہو جاتا۔ میں أَصَّدَّقُ صِدْقٍ سے بھی ہو سکتا ہے اور صَدَقَةٌ سے بھی۔

صَدَاقُ الْمَرْءَةِ (بفتح صاد و کسر آں) وَصَدَقْتُهَا کے معنی عورتوں کے مہر کے ہیں اور أَصَدَقْتُهَا کے معنی ہیں: میں نے اس کا مہر مقرر کیا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَأَتُوا النِّسَاءَ صَدُقَاتِهِنَّ نِحْلَةً﴾ (۴-۴) اور عورتوں کو ان کے مہر خوشی سے دے دیا کرو۔

### (ص د)

الصَّدَى! صدائے بازگشت جو کسی شفاف مکان سے ٹکرا کر واپس آئے اور اَلتَّصَدِيَّةُ (تفعیل) ہر اس آواز کو کہتے ہیں جو صَدَى کی طرح ہو یعنی جس کا کوئی مفہوم نہ ہو۔ اور آیت:

﴿وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ إِلَّا مُكَاءً وَتَصَدِيَةً﴾ (۸-۳۵) اور لوگوں کی نماز خانہ کعبہ کے پاس سیٹیاں اور تالیاں بجانے کے سوا کچھ نہ تھی۔

میں بتایا ہے کہ ان کی نماز بے معنی ہونے میں صدی یا پرند کی چہچہاہٹ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ اَلتَّصَدِيَّةُ: صدائے بازگشت کی طرح کسی چیز کے درپے ہونا۔ قرآن

دی۔ محاورہ ہے:  
عَادَ تَعْرِيفُكَ تَصْرِيحًا: تمہاری تعریف نے تصریح  
کا کام دیا۔  
جَاءَ صُرَاحًا: وہ کھلے بندوں آیا۔

### (ص ر ط)

الَصْرَاطُ: سیدھی راہ۔ قرآن پاک میں ہے:  
﴿وَأَنَّ هَذَا صِرَاطِي مُسْتَقِيمًا﴾ (۶-۱۵۳) اور یہ  
کہ میرا سیدھا راستہ یہی ہے۔  
اسے صِرَاط (بسیں مہملہ) پڑھا جاتا ہے۔ ملاحظہ  
ہو (س ر ط)

### (ص ر ع)

الَصَّرْعُ: (ف) کے معنی ہیں: زمین پر پٹخ دینا، پچھاڑ دینا۔  
صَرَعْتُهُ صَرَعًا: میں نے اسے پچھاڑ دیا۔ الَصَّرَعَةُ:  
پچھڑے ہوئے آدمی کی حالت۔ الَصَّرَاعَةُ کشتی لڑنے کا  
فن۔ رجل صَرِيعٌ: پچھاڑا ہوا آدمی۔ قَوْمٌ صَرَعِي:  
پچھڑے ہوئے لوگ۔ قرآن پاک میں ہے:  
﴿فَتَرَى الْقَوْمَ فِيهَا صَرَعِي﴾ (۶۹-۷۰) یعنی تم  
دیکھو گے کہ لوگ پچھڑے پڑے ہیں۔  
اور قرِبتان کی طرح ہما صِرَعَان کہا جاتا ہے یعنی وہ  
دونوں ایک دوسرے کے برابر اور مثل ہیں۔  
الْمِصْرَعَانِ مِنَ الْبَابِ: دروازے کے دو پٹ۔ پھر  
تشبیہ کے طور پر شعر کے دونوں مصرعوں کو بھی مِصْرَعَانِ  
کہا جاتا ہے۔

الْأَصْرَارُ: پختہ عزم کو کہتے ہیں۔ محاورہ ہے:  
هَذَا مِثْنِي صِرِّي وَأَصْرِي وَصُرِّي وَصَرِّي  
وَصَرِّي وَصُرِّي: وہ مرد یا عورت جو حج نہ کرے وہ  
فخص جسے نکاح کی خواہش نہ ہو۔ ۱ اور آیت کریمہ:

﴿رَبِّحَا صِرَاصًا﴾ (۳۱-۱۶) زور کی ہوا (چلائی)  
میں صِرَاص کا لفظ صِر سے ہے گویا سخت سرد ہونے کی  
وجہ سے اس میں بے گلی پائی جاتی ہے۔

الْصَّرَّةُ جماعت جس کے افراد باہم ملے جلے ہوں گویا وہ  
کسی تھیلی میں باندھ دیئے گئے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:  
﴿فَأَقْبَلَتِ امْرَأَتُهُ فِي صَرَّةٍ﴾ (۵۱-۲۹) ابراہیم  
علیہ السلام کی بیوی چلائی آئی۔

بعض نے کہا ہے کہ صَرَّة کے معنی چیخ کے ہیں۔ ۲

### (ص ر ج)

الَصَّرْحُ: بلند، منفش و مزین مکان۔ ہر قسم کے  
عیب سے پاک ہونے کے اعتبار سے اسے صَّرْح کہا  
جاتا ہے قرآن پاک میں ہے:  
﴿صَّرْحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنْ قَوَارِينِ﴾ (۵-۲۷-۴۳) ایسا  
محل ہے جس کے (نیچے بھی) شے جڑے ہوئے ہیں۔  
﴿وَقِيلَ لَهَا اذْخُلِي الصَّرْحَ﴾ (۲۷-۴۳) (پھر)  
اس سے کہا گیا کہ محل میں چلے۔

لَبَنٌ صَرِيحٌ: خالص دودھ۔ صَرِيحُ الْحَقِّ: خالص  
حق جس میں باطل کی آمیزش نہ ہو صَرَحَ فُلَانٌ فِي  
نَفْسِهِ: فلاں نے اپنے دل کی بات صاف صاف بیان کر

۱ وفی روایۃ عن ابن عباس (لا ضرورة فی الاسلام) رواہ ابو داؤد والحاکم والطبرانی النیل (۶: ۱۰۸) وقال الحافظ فی الحيوان

(۱: ۳۴۸) انه اسم اسلامي وانظر بخصوص الحديث وينسك ۲۹۸ سطر ۱۳ والفائق ۱۰/۲.

۲ هكذا قال المفسرون ونقل ذلك عن ابن عباس ومجاهد وقال ابو عبيدة معناه شدة الصوت وقال الزجاج: أَلْصَرَةُ أَشَدُّ الصَّاحِ  
تكون في الطائر والانسان وغيرهما وما اعلم احدا من المفسرين ذهب الى ان المراد من صرة مهنا الجماعة والله اعلم.

## (ص ر ف)

الْصَّرْفُ: کے معنی ہیں کسی چیز کو ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف پھیر دینا یا کسی اور چیز سے بدل دینا۔

محاورہ ہے: صَرَفْتُهُ فَأَنْصَرَفَ: میں نے اسے پھر دیا چنانچہ وہ پھیر گیا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿ثُمَّ صَرَفْنَا عَنْهُمْ﴾ (۱۵۲-۳) پھر خدا نے تم کو ان کے مقابلے سے پھیر کر ان کو بھگا دیا۔

﴿أَلَا يَوْمَ يَأْتِيهِمْ لَيْسَ مَصْرُوفًا عَنْهُمْ﴾ (۸-۱۱) دیکھو جس روز وہ ان پر واقع ہوگا پھر ملنے کا نہیں۔ اور آیت کریمہ:

﴿ثُمَّ أَنْصَرَفُوا صَرَفَ اللَّهُ قُلُوبَهُمْ﴾ (۱۲-۹) میں بددعا بھی ہو سکتی ہے اور اس حالت کی طرف بھی اشارہ ہو سکتا ہے، جو اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں پیدا کر دی تھی۔ اور آیت کریمہ:

﴿فَمَا تَسْتَطِيعُونَ صَرْفًا وَلَا نَصْرًا﴾ (۱۹-۲۵) کے معنی یہ ہیں کہ تم میں قدرت نہیں ہوگی کہ ہمارے عذاب کو اپنے آپ سے پھیر سکو یا اپنی جانوں کو آگ سے بچا سکو۔

اور بعض نے صَرْفًا کے معنی کیے ہیں کہ تم اپنی حالت کو تبدیل نہیں کر سکو گے۔ اسی سے کہا جاتا ہے۔ ﴿(۳)﴾

مِنْهُ صَرْفٌ وَلَا عَدْلٌ: یعنی نہ ان کا فرض قبول ہوگا اور لَا يَقْبَلُ نَفْلٌ۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَإِذْ صَرَفْنَا إِلَيْكَ نَفَرًا مِنَ الْجِنِّ﴾ (۴۶-۳۹) کے معنی یہ ہیں کہ ہم نے ان کا رخ تیری طرف پھر دیا یعنی

ان کو تمہارے پاس لے آئے کہ تم سے قرآن پاک نہیں۔ اَلتَّصْرِيفُ بمعنی صَرْفٌ ہے، لیکن اس میں تکثیر کے معنی پائے جاتے ہیں اور عام طور پر یہ کسی چیز کو ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف پھیرنے یا ایک امر سے دوسرے امر کی طرف تبدیل کرنے کے لیے آتا ہے اور ﴿تَصْرِيفُ الرِّيحِ﴾ (۱۶۳-۲) کے معنی ہیں: ہواؤں کے رخ کو ایک طرف سے دوسری طرف پھیر دینا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَصَرَفْنَا الْآيَاتِ﴾ (۱۲۷-۳۶) اور آیات کو لوٹا لوٹا کر بیان کر دیا۔

﴿وَصَرَفْنَا فِيهِ مِنَ الْوَعِيدِ﴾ (۱۱۳-۲۰) اور اس میں طرح طرح کے وعید بیان کر دیئے ہیں۔ اور اسی سے محاورہ ہے:

تَصْرِيفُ الْكَلَامِ: یعنی بات لوٹا لوٹا کر بیان کرتا۔ تَصْرِيفُ الدَّرَاهِمِ: دراہم کو پرکھنے کے لیے الٹنا پلٹنا۔ تَصْرِيفُ النَّابِ: دانت پینا کہا جاتا ہے۔ لِنَابِهِ صَرِيفٌ: وندائش باگگ کنند۔

الْصَّرِيفُ: (ایضا) دودھ جس کے جھاگ بیٹھ گئے ہوں۔ گویا وہ جھاگ سے پھیر دیا گیا ہے یا جھاگ اس سے پھیر دیئے گئے ہیں۔

رَجُلٌ صَرِيفٌ وَصَرِيفٌ وَصَرَفٌ: سکہ پرکھنے والے یا ان کا تبادلہ کرنے والے۔ عَتَرٌ صَارِفٌ بکری جسے نر کی خواہش ہو اور اسے صَارِفٌ اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ نر کو اپنی جانب پھیرنے کی کوشش کرتی ہے۔

① متفق علیہ من روایۃ علیؓ و انسؓ و فی مسلم من روایۃ ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ انظر تخریج الکشاف للحافظ، رقم: ۵۰ قالہ صلی اللہ علیہ وسلم فی ذکر المدینۃ و فی الفائق ۱۰/۲ الصرف التوبة والعدل: الفدیۃ.



کا منقطع ہو جانا أَصْرَمَ الرَّجُلُ: وہ آدمی بد حال ہو گیا۔

### (ص ط ر)

صَطَرَ وَطَرَ (ن) کے ایک ہی معنی ہیں یعنی لکھنا

(سیدھی لائنوں میں) اور آیت:

﴿أَمْ هُمُ الْمُصْطِرُونَ﴾ (۵۲-۳۷) یا یہ (کہیں کہ)

داروغہ ہیں۔ میں الْمُصْطِرُونَ سَطَرَ سے مُفْعِلُ

کے وزن پر ہے۔ اور التَّسْطِيرُ، جس کے معنی لکھنے کے

ہیں اور آیت کے معنی یہ ہیں کہ کیا تخلیق سے قبل یہ اپنے

نوشتہ تقدیر کے لکھنے پر مقرر تھے (کہ انہیں ہر بات کا علم ہو

چکا ہے؟ یعنی نہیں) اس میں آیت کریمہ: ﴿إِنَّ ذَٰلِكَ

فِي كِتَابٍ إِنَّ ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ﴾

(۲۲-۷۰) یہ سب کچھ کتاب میں لکھا ہوا ہے۔ بے شک

یہ سب خدا کو آسان ہے۔ اور آیت ﴿كُلُّ شَيْءٍ

أَحْصَيْنَاهُ فِي إِمَامٍ مُّبِينٍ﴾ اور ہر چیز کو ہم نے کتاب

روشن (لوح محفوظ) میں لکھ رکھا ہے کے معنی کی طرف

اشارہ ہے۔ اور آیت:

﴿لَسْتُ عَلَيْهِمْ بِمُصْطِرٍ﴾ (۸۸-۱۲) تم ان پر

داروغہ نہیں ہو۔ کے معنی یہ ہیں کہ تم ان پر لکھنے کے لیے

مقرر نہیں ہو اور نہ ہی اس چیز کو ثابت کرنے کے ذمہ دار ہو

جس کے یہ متولی بنتے ہیں اور عربی میں سَبَطَ طَرْتُ

وَبَيَّطَرْتُ کے علاوہ تیسرا لفظ اس وزن پر نہیں آتا تشریح

کے لیے دیکھئے (س ط ر)

### (ص ع د)

الصَّعُودُ کے معنی اوپر چڑھنے کے ہیں۔ ایک ہی

جگہ کو اوپر چڑھنے کے لحاظ سے صَعُودٌ اور نیچے اترنے کے

الصَّصْرُفُ: خالص سرخ رنگ اور ہر خالص چیز کو جس میں

ملاوٹ نہ ہو۔ صَرَفٌ کہا جاتا ہے گویا اس سے ملاوٹ کو

پھیر دیا گیا ہے۔

الصَّصْرَفَانُ: قلعی یا سکہ۔ گویا وہ چاندی کے برابر ہونے

سے پھیر دیا گیا ہے۔

### (ص ر م)

الصَّصْرَمُ: کے معنی ریوڑ کے ہیں اور الصَّصْرِيْمَةُ کسی

کام کے احکام اور ابرام کو کہتے ہیں اور ریت کے علیحدہ

ٹکڑے کو الصَّصْرِيْمُ کہا جاتا ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿فَأَصْبَحَتْ كَالصَّصْرِيْمِ﴾ (۶۸-۲۰) تو وہ ایسے ہو

گیا جیسے کٹی ہوئی کھیتی۔

کے بعض نے یہ معنی کیے ہیں کہ وہ باغ ان درختوں کی طرح

ہو گیا جن کے پھل کاٹ لیے گئے ہوں یعنی صَّصْرِيْمٌ بمعنی

مَصْرُومٌ ہے بعض نے کہا ہے کہ صَّصْرِيْمٌ رات کو بھی

کہتے ہیں اور آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ وہ یعنی کھیتی سوختہ

ہو کر رات کی طرح سیاہ ہو گئی۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿إِذَا أَقْسَمُوا لِيَصَّصْرِيْمًا مِّنْهَا مُصَّصِيْحِيْنَ﴾ (۶۸-۱۷)

جب انہوں نے قسمیں کھا کھا کر کہا کہ صبح ہوتے ہوتے

ہم اس کا میوہ توڑ ڈالیں گے۔

﴿فَتَنَادَوْا مُصَّصِيْحِيْنَ أَنْ اْعْدُوا عَلَيْنَا حَرْثَكُمْ إِنَّ

كُنْتُمْ صَارِيْمِيْنَ﴾ (۶۸-۲۱) جب صبح ہوئی تو وہ لوگ

ایک دوسرے کو پکارنے لگے: اگر تم کو کاٹنا ہے تو اپنی کھیتی پر

سویرے ہی جا پہنچو۔

الصَّصَارِمُ: تیز تلوار۔ نَاقَةُ مَصْرُومَةٍ: اونٹنی جس کا دودھ

خشک ہو گیا ہو۔ گویا اس کے پستان کاٹ دیئے گئے ہیں۔

تَصَرَّصَتِ السَّنَةُ: سال گزر گیا۔ اِنْصَرَمَ الشَّيْءُ: کسی چیز

طرف جانا بعدہ صرف دور نکل جانے پر اِصْعَادُ کا لفظ بولا جانے لگا ہے جیسا کہ تَعَالٰ کہ اس کے اصل معنی علو یعنی بلندی کی طرف بلانے کے ہیں اس کے بعد صرف آنے کے معنی میں بطور امر استعمال ہونے لگا ہے عام اس سے کہ وہ آنا بالائی کی طرف ہو یا پستی کی طرف۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿اِذْ تَصْعَدُوْنَ وَلَا تَلُوْنَ عَلٰی اَحَدٍ﴾ (۱۵۳-۳)

جب تم لوگ دور نکلے جا رہے تھے اور کسی کو پیچھے پھر کر نہیں دیکھتے تھے۔

بعض نے کہا ہے کہ یہاں اِصْعَادُ سے دور نکل جانا مراد نہیں ہے۔ بلکہ اشارہ ہے کہ انہوں نے بھاگنے میں علُو اختیار کیا یعنی کوئی کسر باقی نہ چھوڑی جیسے محاورہ ہے:

اَبْعَدْتُ فِیْ كَذَا وَاَرْتَقَيْتُ فِیْهِ كُلَّ مَرْتَقٰی: یعنی میں نے اس میں انتہائی کوشش کی لہذا آیت کے معنی یہ ہیں کہ تم نے دشمن کا خوف محسوس کرنے اور لگاتار ہزیمت کھانے میں انتہا کر دی اور استعارہ کے طور پر صُعُوْدًا کا لفظ انسانی اعمال کے متعلق بھی استعمال ہوتا ہے جو خدا تک پہنچتے ہیں جیسا کہ ہر وہ چیز جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے انسان تک پہنچتی ہے اسے نزول سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ﴾ (۱۰-۳۵) اسی طرف پاکیزہ کلمات چڑھتے ہیں۔ اور آیت کریمہ:

﴿يَسْأَلُكَ عَذَابًا صَعَدًا﴾ (۱۷-۷۲) وہ اس کو سخت عذاب میں داخل کرے گا۔ میں صَعَدًا کے معنی شاق یعنی سخت کے ہیں اور یہ تَصَعَّدَ فِیْ كَذَا کے محاورہ سے ماخوذ

لحاظ سے حَذُوْر کہا جاتا ہے۔ اصل میں صَعَدٌ وَصَعِيْدٌ وَصَعُوْدٌ تینوں ہم معنی ہیں، لیکن صَعُوْدٌ وَصَعَدٌ کا لفظ عقبہ یعنی گھائی پر بولا جاتا ہے اور استعارہ کے طور پر ہر دشوار اور گراں امر کو صَعَدٌ کہہ دیتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَمَنْ يُعْرِضْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهِ يَسْلُكْهُ عَذَابًا صَعَدًا.....﴾ (۱۷-۷۲) اور جو شخص اپنے پروردگار کی یاد سے منہ پھیرے گا وہ اس کو سخت عذاب میں داخل کرے گا۔

﴿سَارُ هَٰٓؤُلَآءِ صَعُوْدًا﴾ (۱۷-۷۴) ہم اسے صَعُوْدٌ پر چڑھائیں گے۔

اور صَعِيْدٌ کا لفظ وَجْهُ الْاَرْضِ یعنی زمین کے بالائی حصہ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَتَيَمَّمُوا صَعِيدًا طَيِّبًا﴾ (۴-۴۳) تو پاک مٹی لو۔ اور بعض نے کہا ہے کہ صَعِيْدٌ اس گرد و غبار کو کہتے ہیں جو اوپر چڑھ جاتا ہے لہذا نماز کے تیمم کے لیے ضروری ہے کہ گرد و غبار سے ہاتھ آلودہ ہو جائیں اور آیت کریمہ:

﴿كَأَنَّمَا يَصْعَدُ فِی السَّمَاءِ﴾ (۶-۱۲۶) گویا وہ آسمان پر چڑھ رہا ہے۔ میں يَصْعَدُ اصل میں يَتَصَعَّدُ ہے جس کے معنی اوپر چڑھنے کے ہیں۔

اِلاَصْعَادُ: (افعال) بقول بعض اس کے معنی زمین میں دور تک چلے جانا کے ہیں۔ عام اس سے کہ وہ جانا بلندی کی طرف ہو یا پستی کی طرف۔ گو اس کے اصل معنی بلند جگہوں کی طرف جانا کے ہیں۔ مثلاً بصرہ سے نجد یا حجاز کی

﴿فَاخَذْنَاكُمْ بِالصَّاعِقَةِ﴾ (۵۱-۴۴) سوتم کو موت نے آکھڑا۔

(دوم) بمعنی عذاب جیسے فرمایا:

﴿أَنذَرْنَاكُمْ صَاعِقَةً مِّثْلَ صَاعِقَةِ عَادٍ وَثُمُودَ﴾ (۴۱-۱۳) میں تم کو ہمہلک عذاب سے آگاہ کرتا ہوں جیسے

عاد اور ثمود پر وہ (عذاب) آیا تھا۔

(سوم) بمعنی آگ (اور بجلی کی کڑک) جیسے فرمایا:

﴿وَأَرْسَلْنَا الصَّوَاعِقَ فَيُصِيبُ بِهَا مَنْ يَشَاءُ﴾ (۱۳-۱۳) اور وہی بجلیاں بھیجتا ہے پھر جس پر چاہتا ہے گرا بھی دیتا ہے۔

لیکن یہ تینوں چیزیں دراصل صَاعِقَہ کے آثار سے ہیں کیونکہ اس کے اصل معنی تو فضا میں سخت آواز کے ہیں۔ پھر کبھی تو اس آواز سے صرف آگ ہی پیدا ہوتی ہے اور کبھی وہ آواز عذاب اور کبھی موت کا سبب بن جاتی ہے یعنی دراصل وہ ایک ہی چیز ہے اور یہ سب چیزیں اس کے آثار سے ہیں۔

### (ص غ ر)

الصَّغَرُ: یہ الْكِبَرُ کی ضد ہے جو کہ ایک دوسرے کے اعتبار سے استعمال ہوتے ہیں ایک ہی چیز دوسری چیز کے مقابلہ میں صغیر ہوتی ہے اور وہی کسی چیز کے مقابلہ میں کبیر کہلاتی ہے پھر صغیر و کبیر کا اطلاق کبھی تو باعتبار زمانہ کے ہوتا ہے۔ یعنی ایک شخص دوسرے سے عمر میں چھوٹا ہوتا ہے اور دوسرا بڑا۔ اور کبھی باعتبار جسامت کے اور کبھی بلحاظ

ہے جس کے معنی کسی امر کے دشوار اور مشکل ہونے کے ہیں۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے فرمایا: ﴿(۴)﴾

﴿مَا تَصْعَدُ لِي أَمْرٌ مَا تَصْعَدُ فِي خُطْبَةِ النِّكَاحِ﴾ کہ مجھے کوئی چیز خطبہ نکاح سے زیادہ دشوار محسوس نہیں ہوتی۔

### (ص ع ر)

الصَّعَرُ: کے اصل معنی گردن میں کبکی کے ہیں۔ اور تَصْعِيرُ کے معنی ہیں کبکیر کی وجہ سے گردن کو ٹیڑھا کرنا اور اعراض برتنا۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔ ﴿وَلَا تَصْعَرُ خَذَكُ لِلنَّاسِ﴾ (۳۱-۱۸) اور (کبکیر کی بنا پر) لوگوں سے روگردانی نہ کرو۔

اور ہر مشکل امر کو مُصْعَرُ کہا جاتا ہے شتر مرغ کے متعلق مشہور ہے کہ وہ پیدائشی طور پر اَصْعَرُ یعنی کج گردن ہوتا ہے۔

### (ص ع ق)

الصَّاعِقَةُ اور صَاقِعَةُ دونوں کے تقریباً ایک ہی معنی ہیں یعنی ہولناک دھماکہ لیکن صَقْعُ کا لفظ اجسام ارضی کے متعلق استعمال ہوتا ہے اور صَغَقُ اجسام علوی کے بارے میں بعض اہل لغت نے کہا ہے کہ صَاعِقَةُ تین قسم پر ہے۔ اول بمعنی موت اور ہلاکت جیسے فرمایا: ﴿فَصَغَقَ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ﴾ (۳۹-۶۸) تو جو لوگ آسمان میں ہیں اور جو زمین میں ہیں سب کے سب مرجائیں گے۔

① راجع الغریب للقتبی ۴۹۱ والمجاز لابی عیید ۱۲۔

② انظر لقول عمر الغریب للقتبی ۴۹۱ والقرطبی ۱۸ والکشاف ۴۹۵ والفخر (۳۰-۱۶۲) والنهاية (۲-۲۶۳) والفق (۲-۲۴۰) واللسان (صعد) والبحر ۳۵۲ وفي اللسان (كأق) واضداد ابی الطیب ۶۰۹ ما تكأق فی شیء ما تكأق فی خطبة النکاح والغریب لابی عیید (۳۸۷/۳) عن عروة عن عمرؓ۔

جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے۔ ان کے دل اس کی طرف مائل رہیں۔

اور کلام عرب میں صَغَوْتُ إِلَيْهِ أَصْغَوْ صَغَوْا وَصَغَيْتُ أَصْغَيْ صُغَيًْا: (دونوں طرح) منقول ہے اور بعض نے أَصْغَيْتُ أَصْغَيْ: یعنی باب افعال بھی استعمال کیا ہے اور جو لوگ کسی کے طرفدار اور حمایتی ہوں۔ انہیں صَاغِيَةُ الرَّجُلِ کہا جاتا ہے فَلَانٌ مَصْغِيٌّ إِنَائُهُ: فلاں بدنصیب ہے ۱ اور کبھی یہ ہلاکت سے بھی کنایہ ہوتا ہے۔ عَيْنُهُ صَغَوَّاءُ إِلَى كَذَا: وہ فلاں چیز کی طرف مائل ہے اور الْأَصْغَى کے معنی تالو یا آنکھ میں کچی کے ہیں۔

### (ص ف ف)

الصَّفُّ: (ن) کے اصل معنی کسی چیز کو خط مستوی پر کھرا کرنا کے ہیں، جیسے انسانوں کو ایک صف میں کھرا کرنا یا ایک لائن میں درخت وغیرہ لگانا اور بقول ابو عبیدہ کبھی صَفٌّ بمعنی صاف بھی آ جاتا ہے۔ چنانچہ آیات کریمہ: ﴿إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِهِ صَفًّا.....﴾ (۲۱-۲۲) جو لوگ خدا کی راہ میں (ایسے طور پر)

پرے ہما کر لڑتے ہیں..... وہ بیشک محبوب کردگار ہیں۔

﴿ثُمَّ أَتَوْا صَفًّا﴾ (۲۰-۲۶) پھر قطار باندھ کر آؤ۔

﴿وَجَاءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا﴾ (۲۸۹) اور

فرشتے قطار باندھ کر آ موجود ہوں گے۔ میں صَفًّا مصدر بھی

ہو سکتا ہے اور بمعنی صَافِقِينَ (اسم فاعل) بھی اور آیات:

﴿وَأَنَّا لَنَحْنُ الصَّافُونَ﴾ (۳۷-۱۶۵) اور ہم صف

باندھتے رہتے ہیں۔

﴿وَالصَّافَاتِ صَفًّا﴾ (۳۷-۱) قسم ہے صف بستہ

قدرو منزلت کے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَكُلُّ صَغِيرٍ وَكَبِيرٍ مُنْتَظَرٌ﴾ (۵۳-۵۳) یعنی

ہر چھوٹا اور بڑا کام لکھ دیا گیا ہے۔

﴿لَا يُعَادِرُ صَغِيرَةً وَلَا كَبِيرَةً إِلَّا أَحْصَاهَا﴾

(۱۸-۳۹) نہ چھوٹی بات کو چھوڑتی ہے اور نہ بڑی کو (کوئی

بات بھی نہیں) مگر اسے لکھ رکھا ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَلَا أَصْغَرُ مِنْ ذَلِكَ وَلَا أَكْبَرُ﴾ (۱۰-۶۱) اور نہ

کوئی چیز اس سے چھوٹی ہے اور نہ بڑی۔ میں بلحاظ

قدرو منزلت کے ایک دوسرے کے مقابلہ میں بڑا اور چھوٹا

ہونا مراد ہے۔

صَغِرَ صَغَرًا کے معنی چھوٹا ہونا کے ہیں جو الْكَبِيرُ کی ضد

ہے اور صَغِرَ صَغَرًا وَصَغَرًا کے معنی ذلیل ہونے کے

ہیں اور ذلیل اور کم مرتبہ آدمی کو جو اپنی ذلت پر قانع ہو صَاغِرٌ

کہتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿حَتَّى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَدٍ وَهُمْ صَاغِرُونَ﴾

(۲۹-۹) یہاں کہ ذلیل ہو کر اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں۔

### (ص غ و)

الصَّغْوُ: (ن) کے معنی جھکنے اور مائل ہونے کے ہیں

مثلاً صَغَتِ النَّجْمُ وَالشَّمْسُ: ستاروں یا سورج کا

مائل بہ غروب ہونا۔ صَغَيْتُ الْإِنَاءَ وَأَصْغَيْتُهُ: میں

نے برتن کو مائل کر دیا۔ جھکا دیا۔ وَأَصْغَيْتُ إِلَى فَلَانٍ

میں نے اس کی طرف کان لگایا۔ اس کی بات سننے کے لیے

مائل ہوا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَلِتَصْغَى إِلَيْهِ أَفْئِدَةُ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ﴾

(۱۱۳-۶) اور (وہ ایسے کام) اس لیے بھی (کرتے تھے) کہ

## (ص ف ح)

صَفْحٌ کے معنی ہر چیز کا چوڑا پہلو یا جانب کے ہیں۔ مثلاً: صَفْحَةُ الْوَجْهِ (چہرے کی جانب) صَفْحَةُ السَّيْفِ: (تلوار کا چوڑا پہلو) صَفْحَةُ الْحَجَرِ (پتھر کی چوڑی جانب) وغیرہ۔

الصَّفْحُ: (مصدر) کے معنی ترک ملامت اور غفوَ کے ہیں۔ مگر یہ غفوَ سے زیادہ بلند ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آیت کریمہ: ﴿فَاعْفُوا وَاصْفَحُوا حَتَّىٰ يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ﴾ (۱۰۹-۲) تو تم معاف کرو اور درگزر کرو یہاں تک کہ خدا اپنا دوسرا حکم بھیجے۔ میں غفوَ کے بعد صَفْحُ کا حکم دیا گیا ہے کیونکہ بعض اوقات انسان غفوَ یعنی درگزر تو کر لیتا ہے لیکن صَفْحُ سے کام نہیں لیتا۔ یعنی کسی سے اس قدر درگزر کرنا کہ اسے مجرم ہی نہ گردانا جائے نیز فرمایا:

﴿فَاصْفَحْ عَنْهُمْ وَقُلْ سَلَامٌ﴾ (۸۹-۲۳) اس لیے درگزر کرو اور سلام کہہ دو۔  
﴿فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيلَ﴾ (۸۵-۱۵) تو تم ان سے اچھی طرح درگزر کرو۔

﴿أَفَنَضْرِبُ عَنْكُمُ الذِّكْرَ صَفْحًا﴾ (۵-۲۳) بھلا اس لیے کہ تم حد سے نکلے ہوئے لوگ ہو ہم تم کو نصیحت کرنے سے باز رہیں گے؟

صَفَحْتُ عَنْهُ (۱) میں نے اس سے درگزر کرتے ہوئے اسے صَفْحُ جَمِيلٌ کا والی بنایا یعنی اس کے جرم سے کلیہ اعراض برتا (۲) اس سے دور ہوتے ہوئے ایک جانب سے ملا (۳) میں نے کتاب کے اس صفحہ سے یہ تجاوز کیا جس میں اس کا جرم لکھ رکھا تھا۔ اس صورت میں یہ تَصَفَّحْتُ الْكِتَابَ سے ماخوذ ہوگا۔ جس کے معنی

جماعتوں کی میں صَافُون اور صَافَات سے مراد فرشتے ہیں۔ نیز فرمایا:

﴿وَالطَّيْرُ صَفَّتْ﴾ (۲۴-۴۱) اور پرند بازو پھیلائے ہوئے۔

﴿فَاذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَيْهِ صَوَافٌ﴾ (۲۲-۳۶) تو قربانی کرنے کے وقت قطار میں کھڑے ہوئے اونٹوں پر خدا کا نام لو۔

اور صَفَفْتُ كَذَا کے معنی کسی چیز کی صف لگانا کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿عَلَىٰ سُرُرٍ مَّصْفُوفَةٍ﴾ (۵۲-۲۰) صف میں لگائے تختوں پر۔

صَفَفْتُ اللَّحْمَ کے معنی گوشت کے پارچوں کو بریاں کرنے کے لیے تیج کشید کرنے کے ہیں اور تیج کشید کیے ہوئے پارچوں کو صَفِيفٌ کہا جاتا ہے۔

الصَّفَفَصُفُ: ہموار میدان۔ گویا وہ ایک صف کی طرح ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَيَذَرُهَا قَاعًا صَفْصَفًا لَا تَرَىٰ فِيهَا عِوَجًا وَلَا أَمْتًا﴾ (۲۰-۶-۱) اور زمین کو ہموار میدان کر چھوڑے گا جس میں نہ تم کچی (اور پستی) دیکھو گے اور نہ ٹیلا اور نہ بلندی۔

الصَّفْصَفُ کے معنی سایہ دار چوڑے یا برآمدہ کے ہیں۔ تشبیہ کے طور پر زمین کی گدی کو صَفْصَفُ السَّرَج کہا جاتا ہے۔

الصَّفُوفُ: وہ اونٹنی جو زیادہ دودھ دینے کی وجہ سے دو یا تین برتن بھر دے یا وہ جو دودھ دوہنے کے وقت اپنی ٹانگوں کو ایک قطار میں رکھ کر کھڑی ہو جائے۔

الصَّفْصَافُ: بیدار درخت۔

## (ص ف ر)

الصُّفْرَةُ: (زردی) ایک قسم کا رنگ جو سیاہی اور سفیدی کے مابین ہوتا ہے مگر اس پر چونکہ سیاہی غالب ہوتی ہے اس لیے کبھی اس کے معنی سیاہی بھی آجاتے ہیں۔ اسی بنا پر حسنؓ نے آیت:

﴿بَقَرَةٌ صَفْرَاءُ فَاقِعٌ لَوْنُهَا﴾ (۲-۶۹) اس کا رنگ گہرا زرد ہو، میں صَفْرَاءُ کے معنی سیاہ کیے ہیں۔<sup>①</sup>

مگر بعض نے کہا ہے کہ اگر اس کے معنی سیاہ ہوتے تو اس کی صفت فاقِع نہ آتی بلکہ صَفْرَاءُ کے بعد حَالِکَةٌ کہا جاتا ہے۔<sup>②</sup> نیز فرمایا:

﴿ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرَاهُ مُصْفَرًّا﴾ (۳۹-۲۱) پھر وہ خشک ہو جاتی ہے تو تم اس کو دیکھتے ہو کہ زرد ہو گئی ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿كَأَنَّهُ جِمْلَتٌ صُفْرٌ﴾ (۷۷-۳۳) گویا زرد رنگ کے اونٹ ہیں۔

کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ یہاں صُفْرُ أَصْفَرُ کی جمع ہے۔<sup>③</sup> اور بعض نے کہا ہے کہ صُفْرُ ایک دھات کا نام ہے (جس کے ساتھ زردی میں تشبیہ دی گئی ہے) اسی سے نُحَاسٌ (پتیل) کو صُفْرُ اور خشک بھمی (گھاس) کو صُفْرُ کہا جاتا ہے اور کبھی صُفَيْرٌ کا لفظ ہر اس آواز کی حکایت پر بولا جاتا ہے جو (دور سے) سنائی دے۔ اسی سے صُفَيْرُ الْإِنَاءِ کا محاورہ ہے جس کے اصل معنی تو اس خالی

کتاب کے صفحات کو الٹ پلٹ کر دیکھنے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿إِنَّ السَّاعَةَ آتِيَةٌ فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيلَ﴾ (۸۵-۱۵) اور قیامت تو ضرور آکر رہے گی لہذا تم (ان سے) اچھی طرح درگزر کرو۔

اس آیت میں آنحضرت ﷺ کو حکم دیا گیا ہے کہ ان کے کفر کی وجہ سے غم کھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ جیسا کہ دوسرے مقام پر فرمایا:

﴿وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِي ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُونَ.....﴾ (۱۶-۱۲) اور ان کے بارے میں غم نہ کرو اور جو یہ بداندیش کر رہے ہیں اس سے تنگ دل نہ ہو۔  
الْمَصَافِحَةُ مصافح کرنا، ہاتھ ملانا۔

## (ص ف د)

الْصَّفْدُ وَالصَّفَادُ کے معنی لوہے کی زنجیر یا طوق کے ہیں اس کی جمع أَصْفَادُ ہے یعنی لوہے کے زنجیر جن سے قیدیوں کو جکڑا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿مُقَرَّنِينَ فِي الْأَصْفَادِ﴾ (۳۸-۳۸) جو زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔  
نیز الصَّفْدُ کے معنی عطیہ بھی آتے ہیں جیسا کہ کہا گیا ہے۔  
أَنَا مَغْلُولٌ أَيَادِيكَ وَأَسِيرُ نِعْمَتِكَ: میں تیرے احسانات کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہوں اور تیری انعام کا قیدی بن چکا ہوں وغیر ذالک مِّنَ الْمَحَاوِرِ۔

① راجع لقول الحسن الدر المنثور (۷۸: ۱) و تفسیر الطبری (۳۴۵: ۱) ورد علی الحسن ابن قتیبہ فی غریبہ (۵۳-۵۴) و الطبری والشوکانی (۹۸: ۱) وقال هذا من بدع التفسير ومنكراتها وقال ابو عبيدة في محاربه (۴۴: ۱) فان شئت صفراء وان شئت سوداء و به فسر السجستاني في غریبہ (۱۰۹-۱۱۰) و البخاری قال فی الفتح (۱۲۳: ۸) من الاضداد والسجستاني فی اضدادہ۔

② كذا فی الشوکانی (۹۸: ۱)۔

③ قاله ابو عبيدة في محاربه (۲: ۲۸۱)۔



## (ص ف ن)

الصَّفْنُ: دو چیزوں کو اس طرح اکٹھا کر دینا کہ ان کے کچھ حصے دوسروں کے ساتھ مل جائیں۔ چنانچہ محاورہ ہے: صَفْنَ الْفَرَسُ قَوَائِمَهُ: گھوڑے کا تین پاؤں پر کھڑے ہو کر چوتھے پاؤں کا سم اس طرح اٹھانا کہ اس کا اگلا حصہ زمین پر لگا رہا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿الصَّفْنَتُ الْجِيَادُ﴾ (۳۸-۳۱) خاصے کے گھوڑے پیش کیے گئے۔ اور آیت کریمہ:

﴿فَاذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَيْهَا صَوَافَّ﴾ (۲۲-۳۶) تو قربانی کرنے کے وقت صف بستہ کھڑے اونٹوں پر خدا کا نام لو۔ میں ایک قراءت صَوَافِن بھی ہے۔ اور باطن صلب کی رگ کو جو نایاب قلب کو جمع کرتی ہے بھی صَوَافِن کہا جاتا ہے صَفْنُ کے معنی خصیتین کی تھیلی کے ہیں۔ صَفْنُ وہ ڈول جس کے ساتھ حلقہ بندھا ہوا ہو۔

## (ص ف و)

الصَّفَاءُ کے اصل معنی کسی چیز کا ہر قسم کی آمیزش

برتن کے ہیں جس سے صَفِیْر کی سی آواز سنائی دے پھر عرف میں ہر خالی چیز کو صَفْرُ کہنے لگے ہیں خواہ وہ برتن ہو یا اور کوئی چیز اور پیٹ اور رگوں کے غذا سے خالی ہونے کو صَفْرُ کہا گیا ہے اور ان رگوں کو جو جگر اور معدہ کے مابین پھیلی ہوئی ہیں، جب غذا میسر نہ ہو تو وہ معدہ کے اجزاء کو چوسنے لگتی ہیں اس بنا پر جاہل عربوں نے یہ عقیدہ بنا رکھا تھا کہ صَفْرُ پیٹ میں ایک سانپ کا نام ہے جو بھوک کے وقت پسلیوں کو کاٹتا ہے۔ حتیٰ کہ آنحضرت ﷺ کو لَا صَفْرَ کہہ کر اس عقیدہ کی نفی کرنا پڑی۔ (۵) یعنی پیٹ میں اس قسم کا سانپ نہیں ہوتا جس کے متعلق ان کا یہ عقیدہ ہے اسی معنی میں شاعر نے کہا ہے۔ (ع بیط)

(۲۷۳) وَلَا يَعْصُ عَلَى شُرُوفِهِ الصَّفْرُ: اور نہ اس کی پسلیوں کو صفر (سانپ) کاٹتا ہے۔

اور ماہ صفر کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس مہینہ میں ان کے گھر تو شہ سے خالی ہو جاتے تھے اس لیے اسے صفر کہتے تھے اور جو بچہ ماہ صفر میں پیدا ہوا اسے صَفْرِي کہا جاتا ہے۔

① رواہ البخاری و مسلم و ابو داؤد فی سننہ من حدیث ابی ہریرۃ و السائب بن یزید و الترمذی فی القدر و غریب ابی عیید (۲۵:۱) و الفائق (۶۱:۲)۔

② البيت لا عثی بابلہ و اسمہ عامر بن الحارث برنی المنتشر بن وھب اخیه لامہ و اختلف الروايات فی صدره: ففی اللسان (صفر) و جمهرة اشعار العرب ۲۵۶ صدره: لا يتأسى لمافی القدر یرقبه، و هذا یوفق رواية الامالی (۱۹۷:۲) و رواية المرتضی (۲۲:۲) و ملحقات یوان الاعنی ۲۶۸ لکن بلفظ يتأری بدل يتاسی و خطاه و الصاغانی و روی صدره لا یغمر الساق من این ولا و صب و هذا مطابق لما رواه الطبری فی تفسیر (۱۱۹:۱۴) وھی الروایة فی امالی المرتضی (۲۳۰:۱) و یوافق ما فی اللالی ۷۵ و الکامل بشرح المرتضی (۲۱۲:۸) و المحاضرات للمؤلف (۶۱۹:۴) و رواية جمهرة اشعار العرب ۲۸۲ و المعانی للقمی ۱۲۳۱ و ۴۰۶ ایضاً راجع الاصعيات ۳۳ (طبع برلن) و قبله کما فی الکامل ۱۲۳، لا يتأری لمافی القدر یرقبه و لاتراه امام القوم یفتقر و الرثاء فی الکامل فی ۲۳ بیتاً و المختارات ۹-۱۲ (صنعة هبة الله الحسين) فی ۳۰ بیتاً و البيت فی الفائق (۱۶:۲) و غریب ابی عیید (۲۹:۱) و تهذیب الاصلاح (۳۷:۲) و ادب الکاتب ۳۲ و المعزاة (۹۲:۱) و البغلاء (۱۹) و فی الاقتضاب کلام جید علی البيت (۳۵-۳۴۰)۔

③ وھی قراءة ابن عباس و جماعة من الصحابة و التابعین و فی قراءة صوافی راجع اباحیاک (۳۶۹-۶) و اتحاف الفضلاء ۳۱۵۔

﴿اصْطَفَيْتَكَ عَلَى النَّاسِ﴾ (۴-۱۳۴) میں نے تم کو..... لوگوں سے ممتاز کیا۔

﴿وَأَنَّهُمْ عِنْدَنَا لَمِنَ الْمُصْطَفَيْنَ الْأَخْيَارِ﴾

(۳۸-۴۷) اور یہ لوگ ہمارے ہاں منتخب اور بہتر افراد

تھے۔ اصْطَفَيْتُ كَذَا عَلَى كَذَا: ایک چیز کو دوسری پر

ترجیح دینا اور پسند کرنا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿اصْطَفَى النَّبَاتَ عَلَى الْبَنِينَ﴾ (۳۷-۱۵۲) کیا

اس نے بیٹوں کی نسبت بیٹوں کو پسند کیا۔

﴿سَلَامٌ عَلَى عِبَادِهِ الَّذِينَ اصْطَفَى﴾ (۲۷-۲۷)

(۵۹) اس کے بندوں پر سلام ہے جن کو اس نے منتخب فرمایا:

﴿ثُمَّ أَوْرَثْنَا الْكِتَابَ الَّذِينَ اصْطَفَيْنَا مِنْ

عِبَادِنَا﴾ (۳۵-۳۲) پھر ہم نے ان لوگوں کو کتاب کا

وارث ٹھہرایا جن کو اپنے بندوں میں سے برگزیدہ کیا۔

الصَّفِيُّ وَالصَّفِيَّةُ: مال غنیمت کی وہ چیز جسے امیر اپنے

لیے منتخب کر لے (جمع صفایا) شاعر نے کہا ہے: ﴿الوافر﴾

(۴۷۳) لَكَ الْحِرْبَاعُ مِنْهَا وَالصَّفَايَا: تمہارے لیے

اس سے ربع اور منتخب کی ہوئی چیزیں ہیں۔

نیز صَفِيٌّ وَصَفِيَّةٌ (۱) بہت دودھ دینے والی اونٹنی (۲) بہت

پھلدار کھجور۔ أَصْفَتِ الدَّجَاجَةُ: مرغی انڈے دینے سے

رک گئی۔ گویا وہ انڈوں سے خالص ہو گئی اس معنی کی مناسبت

سے جب شاعر شعر کہنے سے رک جائے تو اس کے متعلق

أَصْفَى الشَّاعِرُ کہا جاتا ہے اور یہ أَصْفَى الْحَافِرُ کے

سے پاک اور صاف ہونا کے ہیں۔ اسی سے الصَّفَا ہے

جس کے معنی صاف اور چمکنا پھر کے ہیں۔ اور آیت کریمہ:

﴿إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللَّهِ﴾

(۲-۱۵۸) بے شک وہ صفا اور مروہ خدا کی نشانیوں میں

سے ہیں۔ میں الصَّفَا ایک پہاڑی کا نام ہے۔

الْإِصْطِفَاءُ کے معنی صاف اور خالص چیز لے لینا کے

ہیں۔ جیسا کہ اخْتِيَارُ کے معنی بہتر چیز لے لینا کے آتے

ہیں اور الْإِجْتِبَاءُ کے معنی جِبَايَہ یعنی عمدہ چیز منتخب کر لینا

آتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا کسی بندہ کو چن لینا۔ کبھی بطور ایجاد کے ہوتا ہے

یعنی اسے ان اندرونی کثافتوں سے پاک و صاف پیدا کرتا

ہے جو دوسروں میں پائی جاتی ہیں اور کبھی بطریق اختیار اور

حکم کے ہوتا ہے گویا یہ قسم پہلے معنی کے بغیر نہیں پائی جاتی۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿اللَّهُ يَصْطَفِي مِنَ الْمَلَائِكَةِ رُسُلًا وَمِنَ

النَّاسِ﴾ (۲۲-۷۵) خدا فرشتوں اور انسانوں میں رسول

منتخب کر لیتا ہے۔

﴿إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَى آدَمَ وَنُوحًا﴾ (۳-۳۳) خدا

نے آدم اور نوح..... کو (تمام جہان کے لوگوں میں) منتخب

فرمایا تھا۔

﴿اصْطَفَاكَ وَطَهَّرَكَ وَاصْطَفَاكَ﴾ (۳-۴۲) خدا

نے تم کو برگزیدہ کیا اور پاک بنایا اور..... منتخب کیا۔

۱ قال عبد الله بن عتبة في مرقية بسطام بن قيس الشيباني راجع شروح سقط الزند ۱۹۷۲ والا شقاق لابن دريد (۲۰۰۶۹۹)

وبسطام هذا احد الفرسان الثلاثة (التبريزي) قتله عاصم بن خليفة الضبي والبيت من ثمانية رواها ابو تمام في الحماصة

(۴۲: ۱) والمرزوي (۳۵۵) وتماصه: وحكمك والنشطة والفضول، والبيت في اللسان (ربع، نشط، صفا، فضل)

والطبرسي (۳۰-۲۸) والنقائص (۲۳۵: ۱۹۲) والعقد الفريد (۳۰: ۳۴۲) الاصمعيات ۶۳ والتمعاني للفتي ۹۴۸ والامالي

(۴۴: ۱) والسمط (۳۸۹: ۱) والحيوان (۲۳: ۱).

مٹی کے ہیں اور یہ صَلَّ اللَّحْمُ سے مشتق ہے جس کے معنی گوشت کے بدبودار ہو جانے کے ہیں صَلَّصَالُ اصل میں صَلَّالٌ ہے۔ ایک لام کو صا سے بدل دیا گیا ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿إِنِّذَا ضَلَلْنَا فِي الْأَرْضِ﴾ (۱۰-۳۲) کیا جب ہم زمین میں ملیا میٹ ہو جائیں گے میں ایک قراءت صَلَّلْنَا بھی ہے۔ یعنی جب ہم گم سڑ جائیں گے اور یہ صَلَّ اللَّحْمُ وَأَصَّلُ کے محاورہ سے مشتق ہے۔

### (ص ل ب)

الصُّلْبُ کے معنی سخت کے ہیں اور پشت کو بھی اس کی صلابت اور سختی کی وجہ سے صُلْبُ کہتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿يَخْرُجُ مِنْ بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَائِبِ﴾ (۸۶-۷) جو پیٹھ اور سینے کے بیچ میں سے نکلتا ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَحَلَّلْنِلْ أَبْنَائِكُمُ الَّذِينَ مِنْ أَصْلَابِكُمْ﴾ (۳-۲۳) اور تمہارے صلی بیٹوں کی بیویاں بھی میں تنبیہ کی گئی ہے کہ اولاد باپ کا جز ہونی ہے چنانچہ شاعر نے کہا ہے۔ (السرلج)

(۲۷۵) وَأَنَّمَا أَوْلَادُنَا بَيْنَنَا

أَكْبَادُنَا تَمْشِي عَلَى الْأَرْضِ:

ہماری اولاد ہمارے جگر گوشے ہیں جو زمین پر چلتے پھرتے ہیں اور دوسرے شاعر نے کہا ہے۔ (الرجز)

محاورہ سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں کنواں کھودنے والا صفا یعنی چٹان تک پہنچ گیا، جس نے اسے آئندہ کھدائی سے روک دیا جیسا کہ اُكْدَى وَأَحْجَرَ کے محاورات اس معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔

اور الصَّفَا کی طرح صَفْوَانُ کے معنی بھی بڑا صاف اور چمکنا پتھر کے ہیں۔ اس کا واحد صَفْوَانَةٌ ہے قرآن پاک میں ہے:

﴿صَفْوَانٌ عَلَيْهِ ثَرَابٌ﴾ (۲-۲۲۳) اس چٹان کی سی ہے جس پر ٹھوڑی سی مٹی پڑی ہو۔

يَوْمَ صَفْوَانٌ: خشک دن میں سورج صاف ہو (یعنی بادل اور غبار نہ ہو)

### (ص ل ل)

اصل میں صَلَّصَالُ کے معنی کسی خشک چیز سے آواز آنا کے ہیں، اسی سے صَلَّ الْمَسْمَارُ کا محاورہ ہے۔ جس کے معنی میخ کو کسی چیز میں ٹھونکنے سے آواز پیدا ہونا کے ہیں اور (کھنکنے والی) خشک مٹی کو بھی صَلَّصَالُ کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿مِنْ صَلَّصَالٍ كَالْفَخَّارِ﴾ (۵۵-۱۴) ٹھیکری کی طرح کھنکناتی مٹی سے.....

﴿مِنْ صَلَّصَالٍ مِنْ حَمَإٍ مَسْنُونٍ﴾ (۱۵-۳۳) کھنکنے والی خشک مٹی۔ یعنی سنے ہوئے گارے سے اور صَلَّصَلَةُ کے معنی باقی ماندہ پانی کے ہیں کیونکہ مشکیہ میں باقی ماندہ پانی کے بٹنے سے کھنکناہٹ کی آواز پیدا ہو جاتی ہے بعض نے کہا ہے کہ صَلَّصَالُ کے معنی سڑی ہوئی

① والبيت مع خمسة أخرى في الامالي (۲: ۱۸۵) ونسبه في اللالي والتبريزي ۴۱ (طبعة اورديا) الى حطان بن المعلى قاله تاسفاً على ريب الزمان راجع المروزي ۲۸۸ والمحاضرات للمؤلف (۱: ۳۲۱) والبحر (۲: ۳۹۶) والمروزي ۳۶۵ والعقد الفريد (۲: ۴۳۸) ونسبه الى المعلى بن الخطاط الطائي وفي العيون (۳: ۹۵) وقال اعرابي.

② قاله العجاج يصف امراءه و قبله سيا العظام فحمة المخدم و بعده: الى سواء قطن مؤكم والبيت من شواهد الكشف ۱۲۵ و ايضاً تهذيب الاصلاح (۱: ۶۴) واللسان (صلب) و اضداد ابی الطيب ۲۳ و فيه بعده: و كفل بنحضة ملكم والارحوزة بتما مها في ديوانه ۱۷۵-۱۸۰).

عام طور پر یہ دونوں لفظ افعال کے متعلق استعمال ہوتے ہیں۔ قرآن کریم میں لفظ صَلَاح کبھی تو فساد کے مقابلہ میں استعمال ہوا ہے اور کبھی سَيِّئَة کے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿خَلَطُوا عَمَلًا صَالِحًا وَآخَرَ سَيِّئًا﴾ (۱۰۲-۹)

انہوں نے اچھے اور برے عملوں کو ملا دیا تھا۔

﴿وَلَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَاحِهَا﴾ (۵۶-۷)

اور قرآن پاک میں اکثر مقامات پر (وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ) آیا ہے جس کے معنی صلاحیت بخش کام کرنا کے ہیں اور الصُّلَح کا لفظ خاص کر لوگوں سے باہمی نفرت کو دور کر کے (امن و سلامتی پیدا کرنے پر بولا جاتا ہے) چنانچہ اصطلَحُوا وَتَصَالَحُوا کے معنی باہم امن و سلامتی سے رہنے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿أَنْ يُصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا وَالصُّلْحُ خَيْرٌ﴾ (۱۲۸-۳)

کہ آپس میں کسی قرارداد پر صلح کر لیں اور صلح ہی بہتر ہے۔

﴿وَإِنْ تُصْلِحُوا وَتَتَّقُوا﴾ (۱۲۹-۳)

موافقت پیدا کرو اور تقویٰ اختیار کرو۔

﴿فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا﴾ (۹۰-۳۹)

تو ان میں صلح کرادو۔

﴿فَأَصْلِحُوا بَيْنَ أَخَوَيْكُمْ﴾ (۱۰-۳۹)

تو اپنے دو بھائیوں میں صلح کر دیا کرو۔

اور اللہ تعالیٰ نے کسی بندے کی اصلاح کرنا کے کبھی تو یہ معنی ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اسے فطرۃ صالح بنایا اور کبھی اس کے معنی اس سے خرابی اور نقص کو دور کرنے کے ہوتے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَأَصْلَحْ بَالَهُمْ﴾ (۲-۳۷)

اور ان کی حالت سنواری۔

(۲۷۶) فِي صَلْبٍ مِثْلَ الْغَنَانِ الْمُؤَدَمِ:

ایسی پشت میں جو چھری ہوئی لگام کی طرح نرم ہے۔

الْصَّلْبُ وَالْإِصْطِلَابُ کے معنی ہڈیوں سے چمکنائی نکالنا کے ہیں اور صَلْب جس کے معنی قتل کرنے کے لیے لٹکا دینا کے ہیں۔ بقول بعض اسے صَلْب اس لیے کہتے ہیں کہ اس میں اس شخص کی پیٹھ لکڑی کے ساتھ باندھ دی جاتی ہے اور بعض نے کہا ہے کہ یہ صَلْبُ الْوُدُك سے ہے جس کے معنی ہڈیوں سے چمکنائی نکالنا کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَمَا قَتَلُوهُ وَمَا صَلَبُوهُ﴾ (۱۵۷-۴)

اور انہوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو قتل نہیں کیا اور نہ سولی پر چڑھایا۔

﴿لَا صَلْبَنَكُمْ فِي جَذُوعِ النَّخْلِ﴾ (۷۱-۲۰)

اور کھجور کے تنوں پر سولی چڑھا دوں گا۔

﴿أَنْ يَقْتُلُوا أَوْ يُصَلَبُوا﴾ (۳۳-۵)

کہ قتل کر دیے جائیں یا سولی پر لٹکوا دیے جائیں۔

الصَّلْبُ: اصل میں سولی کی لکڑی کو کہتے ہیں۔ نیز صلیب اس لکڑی کو بھی کہتے ہیں جو عیسائی بطور عبادت کے گلے میں اس خیال پر باندھ لیتے ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام کو اس پر سولی لٹکایا گیا تھا۔ اور جس کپڑے پر صلیب کے نشانات بنے ہوئے ہوں اسے مُصَلَّب کہا جاتا ہے۔

صَالِبٌ: سخت بخار جو پیٹھ کو چور کر دے یا پسینے کے ذریعہ انسان کی چربی نکال لائے۔

صَلَبَتُ السِّنَانُ: میں نے نیزے کے بھالے کو تیز کیا۔

الصُّلْبِيَّةُ: سان کا پتھر (جس پر اوزار تیز کیے جاتے ہیں)۔

## (صلح)

الصَّلَاحُ: (درست، با ترتیب) یہ فساد کی ضد ہے

صَلَاةُ کے معنی دعا دینے، تحسین و تہریک اور تعظیم کرنے کے ہیں۔ چنانچہ مجاورہ ہے صَلَّيْتُ عَلَيْهِ: میں نے اسے

وعادی، نشوونما دی اور بڑھایا اور حدیث میں ہے۔ ۵ (۶)

((اِذَا دُعِيَ أَحَدُكُمْ إِلَى طَعَامٍ فَلْيُجِبْ وَإِنْ كَانَ

صَائِمًا فَلْيُصَلِّ)) کہ جب کسی کو کھانے پر بلایا جائے تو

اسے چاہیے کہ قبول کر لے اگر روزہ دار ہے تو وہ ان کے

لیے دعا کر کے واپس چلا آئے اور قرآن پاک میں ہے:

﴿وَصَلِّ عَلَيْهِمْ إِنَّ صَلَاتَكَ سَكَنٌ لَهُمْ﴾

(۹-۳۹) اور ان کے حق میں دعائے خیر کرو کہ تمہاری دعا

ان کے لیے موجب تسکین ہے۔

﴿يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا صَلُّوا

عَلَيْهِ﴾ (۳۳-۵۶) (خدا اور اس کے فرشتے) پیغمبر پر

درود بھیجتے ہیں مومنو! تم بھی ان پر درود اور سلام بھیجا کرو۔

﴿وَصَلَّوَاتِ الرَّسُولِ﴾ (۶-۸۹) اور پیغمبر کی

دعاؤں کا..... اللہ تعالیٰ کی طرف سے مسلمانوں کے لیے

دعا کرنے کے معنی ہیں ان کو نشوونما دینا، پڑھانا چنانچہ

قرآن میں ہے:

﴿أُولَئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَّوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ﴾ (۲-۱۵۷)

یہی لوگ ہیں جن پر ان کے پروردگار کی رحمت اور مہربانی

ہے۔

اور انسانوں کی طرح فرشتوں کی طرف سے بھی صَلَاةُ کے

معنی دعا اور استغفار ہی آتے ہیں چنانچہ فرمایا:

﴿إِنَّ اللَّهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ﴾

(۳۳-۵۶) بے شک خدا اور اس کے فرشتے پیغمبر پر درود بھیجتے

﴿يُصَلِّعُ لَكُمْ أَعْمَالَكُمْ﴾ (۳۳-۷۱) وہ تمہارے اعمال درست کو دے گا۔

﴿وَأَصْلَحْ لِي فِي ذُرِّيَّتِي﴾ (۴۶-۱۵) اور میرے لیے

میری اولاد میں صلاح اور (تقویٰ) پیدا کر۔ اور آیت کریمہ:

﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يُصَلِّحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِينَ﴾

(۱۰-۸۱) خدا اشریروں کے کام سنوارا نہیں کرتا۔ کے معنی

یہ ہیں کہ مفسد لوگ چونکہ عملی طور پر اللہ تعالیٰ کی مخالفت کر

کے خرابیاں پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اس کے

برعکس ذات باری تعالیٰ ہر کام میں اصلاح کو پسند کرتی

ہے۔ لہذا یہ ناممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے شخص کے اعمال کو

درست قرار دے اور صالح ایک پیغمبر کا نام بھی ہے۔

قرآن میں ہے:

﴿يَا صَالِحُ قَدْ كُنْتَ فِينَا مَرْجُوًّا﴾ (۱۱-۶۲) صالح

..... ہم تم سے کئی طرح کی امیدیں رکھتے تھے۔

## (صل د)

الصَّلْدُ کے معنی ٹھوس اور چکنا پتھر کے ہیں جس پر

کچھ پیدا نہ ہو سکے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَسَرَّكَهٗ صَلْدًا﴾ (۲-۲۶۴) تو اسے صاف کر ڈالے

اسی سے رَأْسُ صَلْدٌ ہے یعنی وہ سر جس پر بالکل بال نہ

ہوں۔ نَاقَةُ صَلْوْدٌ وَصَلْدٌ: کم دودھ والی اونٹنی فَرْسُ

صَلْوْدٌ: وہ گھوڑا جسے پسینہ نہ آئے صَلْدَ الزَّنْدُ:

چقماق سے آگ نکلنا۔

## (صل و)

الصَّلْوَةُ: بہت سے اہل لغت کا خیال ہے کہ

① مختصر من حدیث ابی ہریرۃ فی (حم، د، ت) وفی روایۃ ابن مسعود (طب) فلیدع انظر کنز العمال (۹: رقم ۱۲۷۳،

۱۲۷۴) و غریب ابی عبید (۱/۱۷۶، ۱۷۷) واستشهد به الزمخشری فی الفائق (۲/۱۷۷) وابن الاثیر فی النہایۃ ۱۲۔

چنانچہ فرمایا:

﴿وَالْمُقِيمِينَ الصَّلَاةَ﴾ (۶۲-۳) اور نماز پڑھتے ہیں۔  
 ﴿وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ﴾ (۱۱۰-۲) اور نماز ادا کرتے رہو۔  
 ﴿وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ﴾ (۲۷۷-۲) اور نماز پڑھتے رہے۔  
 اور محض مُصَلِّينَ کا لفظ صرف منافقین کے متعلق وارد ہوا ہے چنانچہ فرمایا:

﴿قَوْلِ لِلْمُصَلِّينَ الَّذِينَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ﴾ (۵۱۴-۱۰۷) تو ایسے نمازیوں کی خرابی ہے جو نماز کی طرف سے غافل رہتے ہیں۔

﴿وَلَا يَأْتُونَ الصَّلَاةَ إِلَّا وَهُمْ كَسَالَى﴾ (۵۴-۹) اور نماز کو آتے ہیں تو ست اور کال ہو کر۔

اور صَلَاة کے ساتھ لفظ اِقَامَةُ ذکر کرنے سے غرض یہ ہے کہ نماز کو محض بیتِ مخصوصہ کے ساتھ ادا کرنا ہی کافی نہیں ہے بلکہ اس کے حقوق و فرائض کو پورا کرنا بھی ضروری ہے اس بنا پر ایک روایت میں ((أَنَّ الْمُصَلِّينَ كُنُفَرُ وَالْمُقِيمِينَ لَهَا قَلِيلٌ)) کہ محض نماز پڑھنے والے تو بہت ہیں مگر اس کو حقوق و فرائض کے ساتھ ادا کرنے والے بہت کم ہیں اور آیت کریمہ: ﴿لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّينَ﴾ (۴۳-۷۴) ہم مصلین سے نہیں تھے۔ کے معنی یہ ہیں کہ ہم انبیاء کرام کی پیروی نہیں کرتے تھے۔ اور آیت: ﴿فَلَا صَدَقَ وَلَا صَلَّى﴾ (۳۱-۷۵) نہ اس نے تقدیق کی اور نہ نماز پڑھی میں وَلَا صَلَّى سے مراد یہ ہے کہ اس نے محض رکی نماز بھی نہیں پڑھی چہ جائیکہ اس کے حدود و فرائض کے ساتھ اسے ادا کرتا۔ اور آیت کریمہ: ﴿مَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ إِلَّا مَكَاءً وَتَصَدِيَةً﴾ (۳۵-۸) اور ان کی نماز خانہ کعبہ کے پاس

ہیں اور الصَّلَاة جو کہ ایک عبادتِ مخصوصہ کا نام ہے اس کی اصل بھی دعا ہی ہے اور نماز چونکہ دعا پر مشتمل ہوتی ہے اس لیے اسے صَلَاة کہا جاتا ہے۔ اور یہ تَسْوِيَةُ الشَّيْءِ بِاسْمِ الْجُزْءِ کے قبیل سے ہے یعنی کسی چیز کو اس کے معنی مفہوم کے نام سے موسوم کرنا اور صَلَاة (نماز) ان عبادات سے ہے جن کا وجود ہر شریعت میں ملتا ہے گو اس کی صورتیں مختلف رہی ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿إِنَّ الصَّلَاةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ كِتَابًا مَوْقُوتًا﴾ (۱۰۳-۴) بے شک نماز مومنوں پر مقررہ اوقات میں ادا کرنا فرض ہے۔

بعض علماء کا خیال ہے کہ لفظ صَلَاة دراصل صَلَاء سے مشتق ہے لہذا صَلَّى الرَّجُلُ کے معنی ہیں: اس شخص نے اس عبادت کے ذریعہ اپنے آپ کو صَلَاء یعنی دوزخ کی آگ سے دور کیا اور جس طرح مَرَضٌ کا لفظ مرض کو دور کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اسی طرح صَلَّى میں بھی سلبِ ماخذ کے معنی پائے جاتے ہیں اور کبھی عبادت گاہ کو بھی صَلَاة کہہ دیا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں كُنَائِسُ یعنی یہودی عبادت گاہوں کو صَلَاة کہا گیا ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿لَهُدَمَتْ صَوَامِعُ وَبُيعَ وَصَلَوْتُ وَمَسَاجِدُ﴾ (۴۰-۲۲) تو راہبوں کے صومعے عیسائیوں کے گرجے اور یہود کے عبادت خانے اور مسلمانوں کی مسجدیں ویران ہو چکی ہوتیں۔

اور قرآن پاک میں جہاں کہیں بھی نماز ادا کرنے کی تعریف کی گئی ہے یا اس کی ترغیب دی گئی ہے وہاں اسے لفظ اقامت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔



ڈالے جائیں گے، میں ایک قراءتِ ضمہ یا (افعال) کے ساتھ بھی ہے۔ نیز فرمایا:

﴿حَسْبُهُمْ جَهَنَّمُ يَصْلَوْنَهَا﴾ (۵۸-۸) ان کو دوزخ ہی کی سزا کافی ہے (یہ) اسی میں داخل ہوں گے۔

﴿سَأُصْلِيهِ سَقَرَ﴾ (۷۴-۲۶) ہم عنقریب اسے سقر میں داخل کریں گے۔

﴿وَتَصْلِيَةُ جَحِيمٍ﴾ (۹۲-۵۶) اور جہنم میں جلنا۔ اور آیت کریمہ:

﴿لَا يَصْلَاهَا إِلَّا الْأَشْقَى الَّذِي كَذَّبَ وَتَوَلَّى﴾ (۹۲-۱۵-۱۶) اس میں وہی داخل ہوگا جو بڑا بد بخت ہے جس نے جھٹلایا اور منہ پھیرا۔

میں بعض نے کہا ہے کہ یہاں لَا يَصْلَاهَا کے معنی لَا يَصْطَلِي بِهَا ہیں یعنی دوزخ کے ساتھ وابستہ اور چپے نہیں رہیں گے۔ اور خلیل نے کہا ہے کہ صَلَّى الْكَافِرُ النَّارَ کے معنی یہ ہیں کہ کافر نے دوزخ کی تکلیف برداشت کی جیسے فرمایا:

﴿يَصْلَوْنَهَا فَيَنْسُ الْمَصِيرُ﴾ (۵۸-۸) اسی میں داخل ہوں گے اور وہ بری جگہ ہے اور بعض نے کہا ہے کہ صَلَّى النَّارَ کے معنی آگ میں داخل ہونے کے ہیں اور أَصْلَاهَا کے معنی داخل کرنے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَسَوْفَ نُصْلِيهِ نَارًا﴾ (۳۰-۴) ہم اسے عنقریب جہنم میں داخل کریں گے۔ اور آیت کریمہ:

﴿ثُمَّ لَنَنْحَنُّ أَعْلَمُ بِالَّذِينَ هُمْ أَوْلَىٰ بِهَا صِلِيًّا﴾ (۷۰-۱۹) اور ہم ان لوگوں سے خوب واقف ہیں جو اس

سیاہیاں اور تالیاں بجانے کے سوا کچھ نہ تھی۔ میں ان کی نماز کو مگنا اور تَصْدِيْقَہ کہہ کر بتایا ہے کہ ان کی نماز بے روح تھی اور ان کا یہ عمل بے وقعت بلکہ ان کی اس نماز کی حیثیت پرندوں کی چھبھاہٹ اور گنبد کی آواز سے زیادہ نہیں تھی۔ اور آیت کریمہ:

﴿قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ﴾ کے بعد ﴿وَالَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُونَ﴾ (۹۲-۲۳) اور جو نمازوں کی پابندی کرتے ہیں، میں صلوٰۃ کو دوبارہ لانے کی وجہ ہم اس کتاب کے بعد (یعنی تفسیر قرآن میں) ذکر کریں گے۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

## (صلی)

الصَّلَى (س) کے اصل معنی آگ جلانے کے ہیں صَلَّى بِالنَّارِ اس نے آگ کی تکلیف برداشت کی یا وہ آگ میں جلا۔ صَلَّى بِكَذَا: اسے فلاں چیز سے پالا پڑا۔ صَلَّيْتُ النَّارَ: میں نے بکری کو آگ پر بھون لیا اور بھونی ہوئی بکری کو مَصْلِيَّةٌ کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿إِصْلَوْهَا الْيَوْمَ﴾ (۶۳-۳۶) آج اس میں داخل ہو جاؤ۔

﴿يَصْلَى النَّارَ الْكُبْرَى﴾ (۱۲-۸۷) بڑی تیز آگ میں داخل ہوگا۔

﴿تَصْلَىٰ نَارًا حَامِيَةً﴾ (۳۰-۸۰) دھکتی آگ میں داخل ہوں گے۔

﴿وَيَصْلَىٰ سَعِيرًا﴾ (۱۲-۸۳) اور دوزخ میں داخل ہوگا۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَيَصْلَوْنَ سَعِيرًا﴾ (۱۰-۴) اور دوزخ میں

ہوئی ہے کہ اگر اس میں نکر ڈالا جائے تو اس کی حرکت سائی دے۔

ضَرْبَةُ صَمَاءٍ: مہلک ضرب جس کے بعد مضروب کی آواز ہی سائی نہ دے اسی سے اس بہادر کو جتووار کی ایک ہی ضرب سے دوسرے کو ہلاک کر ڈالے صَمَّةٌ کہا جاتا ہے صَمَمْتُ الْقَارُورَةَ: میں نے شیشی پر کاک لگایا جس سے اس کا منہ بند ہو گیا یہ الْأَصَمُّ (بہرے کے ساتھ) تشبیہ کے طور پر بولا جاتا ہے۔

صَمَمَ فِي الْأَمْرِ: اس نے اپنی مرضی کی اور کسی کی نہ سنی صَمَّانٌ: سخت زمین اِشْتَمَالَ الصَّمَاءُ: کپڑے کو اس طرح لپیٹنا کہ جسم کا کوئی حصہ ننگا نہ رہے۔

### (ص م د)

الصَّمَدُ: وہ سردار جس کی طرف ہر معاملہ میں رجوع کیا جائے۔ صَمَدٌ صَمَدٌ کسی کو معتقد سمجھ کر اس کی جانب قصد کرنا۔ بعض نے کہا ہے۔ ۱۰ لَهْ صَمَدٌ ٹھوس اور بے جوف چیز کو کہتے ہیں۔ اور بے جوف چیزیں دو قسم پر ہیں ایک وہ جو انسان سے کم درجہ کی ہیں، جیسے جمادات اور دوم وہ جو انسان سے اعلیٰ درجہ کی ہیں، جیسے باری تعالیٰ اور فرشتے اور آیت کریمہ:

﴿اللَّهُ الصَّمَدُ﴾ (۲-۱۱۲) اللہ بے نیاز ہے۔

میں اللہ تعالیٰ کو صمد کہنے کا اس حقیقت سے آگاہ کر دیا ہے کہ مشرکین نے جن چیزوں کو معبود بنا رکھا ہے۔ ذات الہی

میں داخل ہونے کے زیادہ لائق ہیں۔ میں بعض نے کہا ہے کہ صِلِيًّا، صَالِی کی جمع ہے ۱۰۔ صِلَاءٌ (۱) آگ جلانے کا ایندھن (۲) بجھنی ہوئی چیز۔

### (ص م م)

الصَّمَمُ کے معنی حائے سماعت ضائع ہو جانا کے ہیں (مجازاً) اس کے ساتھ ہر وہ شخص متصف ہوتا ہے جو نہ تو حق کی آواز سنے اور نہ ہی اسے قبول کرے (بلکہ وہ اپنی مرضی کرتا چلا جائے) قرآن پاک میں ہے:

﴿صُمُّ بُكْمٌ عُمًی﴾ (۲-۱۸) یہ بہرے ہیں گوئلے ہیں اندھے ہیں۔ ﴿صُمًّا وَعُمًیَانَا﴾ (۳۵-۷۳) اندھے اور بہرے ہو کر۔

﴿وَالْأَصَمُّ وَالْبَصِيرُ وَالسَّمِيعُ هَلْ يَسْتَوِيَان﴾ (۱۱-۲۳) اور بہرہ ہو اور ایک دیکھتا سنتا، بھلا، دُنووں کا حال یکساں ہو سکتا ہے۔

﴿وَحَسِبُوا أَلَّا يَكُونُ فِتْنَةً فَعَمُوا وَصَمُّوا ثُمَّ تَابَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ ثُمَّ عَمُوا وَصَمُّوا﴾ (۵-۷۱) اور یہ خیال کر کے کہ (اس سے ان پر) کوئی آفت نہیں آنے کی یہ اندھے اور بہرے ہو گئے پھر خدا نے ان پر مہربانی فرمائی لیکن پھر اندھے اور بہرے ہو گئے۔

اور تشبیہ کے طور پر ہر اس چیز کو صَمَمُ کے ساتھ متصف کیا جاتا ہے جس کی آواز سائی نہ دے چنانچہ محاورہ ہے۔ ۱۰ صُمَّتْ حَصَاةٌ بِدَمٍ یعنی خون ریزی اس کثرت سے

۱ وفی القرآن (الامن هو صال المحمید) (۳۷-۱۶۳۰) والصحیح ان صلیبا مصدر صلی و منه اصطلی (افتعال) کما فی آیۃ (۲۷-۷)۔

۲ انظر للكلمة المعیانی رقم: ۲۰۸۵ واللسان والمحكم (صم) والحيوان (۴: ۳۹۲) والمعانی للقتبی ۸۵۷ مثل یقال عند شداد الحرب و كثرة الاراء قال ابن بزی: والصحیح ان یقال بدمی بدل بدم و فی المجالس للعلب (۵۲۱) یقال فی الداهیة۔

۳ وفی الطبریسی ۲۸۰/۳۰ الی الامام الباقر وكذا قال ابن عباس وعكرمة والضحاك والجن علی ما فی القرطبی والطبری وقال القتیبی فی غریبہ (۵۴۲) و علی هذا الدال فیہ مبدلة من تارت قارت ما ذكره ابو الطیب اللغوی فی ابدالہ و (حرف الدال) ۱۲۔

﴿صُنْعَ اللَّهِ الَّذِي أَتَقَنَ كُلَّ شَيْءٍ﴾ (۲۷-۸۸) یہ خدا کی صنعت کاری ہے جس نے ہر چیز کو نہایت مہارت سے محکم طور پر بنایا ہے۔  
 ﴿وَيَصْنَعُ الْفُلْكَ﴾ (۱۱-۳۸) تو نوح علیہ السلام نے کشتی بنانی شروع کر دی۔

﴿وَأَصْنَعُ الْفُلْكَ﴾ (۱۱-۳۷) اور ایک کشتی..... بناؤ۔  
 ﴿أَلَهُمْ يَخْشَوْنَ صُنْعًا﴾ (۱۸-۱۰۴) کہ وہ اچھے کام کر رہے ہیں۔

﴿صُنْعَةَ لُبُوسٍ لَّكُمْ﴾ (۲۱-۸۱) تمہارے لیے نہایت عمدگی سے ایک طرح لباس بنانا۔  
 ﴿مَا كَانُوا يَصْنَعُونَ﴾ (۵-۶۳) جو کچھ وہ کرتے ہیں۔

﴿وَحَبِطَ مَا صَنَعُوا فِيهَا﴾ (۱۱-۱۶) اور جو عمل انہوں نے (دنیا میں) کیے سب برباد۔  
 ﴿تَلَقَّفْ مَا صَنَعُوا، إِنَّمَا صَنَعُوا كَيْدُ سَاحِرٍ﴾ (۲۰-۶۹) کہ جو کچھ انہوں نے بنایا ہے اسے نکل جائے گی جو بھی انہوں نے بنایا وہ تو جادوگر کے ہتھکنڈے ہیں۔  
 ﴿وَاللَّهُ يَعْلَمُ مَا تَصْنَعُونَ﴾ (۲۹-۳۵) اور جو کچھ تم کرتے ہو خدا اسے جانتا ہے۔

اور لفظ صنّع میں چونکہ عمدگی کے ساتھ کسی کام کو سرانجام دینے کا مفہوم پایا جاتا ہے اس لیے کسی کام کے ماہر کاریگر کو جو عمدہ طور پر کام کرتا ہو، صنّع اور ماہر عورت کو صنّاعہ کہا جاتا ہے اور ہر اچھے اور نیک کام کو صنّیعة کہا جاتا ہے فرس صنّیع عمدہ طور پر پرورش کیا ہوا گھوڑا اور معزز اور پر رعب مقامات کو مصانع سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور یہ مَصْنَع کی جمع ہے۔ جیسے فرمایا: ﴿وَتَتَّخِذُونَ

ان سب کے برعکس ہے چنانچہ آیت کریمہ:  
 ﴿وَأَمَّهُ صِدْقَةٌ كَانَا يَأْكُلَانِ الطَّعَامَ﴾ (۵-۷۵) اور ان کی والدہ (مریم خدا کی ولی اور) بچی فرمانبردار تھیں دونوں (انسان تھے اور) کھانا کھاتے تھے۔  
 میں بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔

### (ص م ع)

الصَّوْمَعَةُ: (راہب کی کوٹھری) ہر وہ عمارت جس کا سر لمبا اور نوکدار ہو (جیسے گرجے کا منارہ) اس کی جمع صَوَامِعُ آتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:  
 ﴿لَهَيْدِمَتْ صَوَامِعُ وَبِيعَ﴾ (۲۲-۴) تو (راہبوں کے) صومعے اور (عیسائیوں کے) گرجے..... ویران ہو چکے ہوتے۔

اور اصْمَعُ اس آدی کو کہتے ہیں جس کے کان چھوٹے ہوں گویا وہ سر کے ساتھ پیوست ہیں۔ قَلْبٌ اصْمَعٌ: بہادر گویا اس کی حالت ان لوگوں کے خلاف ہے جو کہ آیت ﴿وَأَفْشَدَتْهُمْ هَوَاءً﴾ (۱۴-۴۳) اور ان کے دل (مارے خوف کے) ہوا ہو رہے ہوں گے کے مصداق ہیں۔  
 الصَّمْعَاءُ: بھیگی گھاس جس کے شکوے تاحال ظاہر نہ ہوئے ہوں کِلَابٌ صُمْعُ الْكُتُوبِ: یعنی چھوٹے اور باریک نائٹوں والے کتے۔

### (ص ن ع)

الصَّنْعُ (ف) کے معنی کسی کام کو کمال مہارت سے اچھی طرح کرنے کے ہیں اس لیے ہر صنّع کو فعل تو کہہ سکتے ہیں مگر ہر فعل کو صنّع نہیں کہہ سکتے اور نہ ہی لفظ فعل کی طرح حیوانات اور جمادات کے لیے بولا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَاجْتَنِبْنِي وَبَنِيَّ أَنْ نَعْبُدَ الْأَصْنَامَ﴾ (۱۳-۳۵)  
مجھے اور میری اولاد کو اس بات سے محفوظ رکھنا کہ ہم اصنام  
کی پرستش اختیار کریں۔

تو اس سے بھی ایسی چیزوں کی پرستش مراد ہے۔ کیونکہ  
حضرت ابراہیم علیہ السلام کو معرفت الہی کے تحقق اور اس  
کی حکمت پر مطلع ہونے کے بعد یہ اندیشہ نہیں ہو سکتا تھا  
کہ وہ اور ان کی اولاد بت پرستی شروع کر دے گی۔

### (ص ن و)

الصَّنُو: کسی درخت کی جڑ سے جو مختلف شاخیں  
پھوٹی ہیں ان میں سے ہر ایک کو صَنُو کہا جاتا ہے۔  
مماورہ ہے فُلَانٌ صَنُوْا بَيْتِهِ: فلاں اس کے باپ کا حقیقی  
بھائی ہے۔<sup>۱</sup> کیونکہ باپ اور چچا ایک ہی اصل کی دو  
شاخیں ہوتی ہیں صَنُو کا تثنیہ صَنَوَان اور جمع صَنَوَانُ  
آتی ہے چنانچہ کہا جاتا ہے هُمَا صَنَوَانُ خَلِيٍّ: وہ دونوں  
ایک ہی بھجور کی دو شاخیں ہیں (یعنی ان کی اصل ایک ہی  
ہے)۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿صَنَوَانٌ وَغَيْرُ صَنَوَانٍ﴾ (۱۳-۴) بعض بھجوریں  
ایسی ہیں جو ایک ہی جڑ سے پھوٹی ہیں اور بعض الگ الگ  
جڑوں سے۔

### (ص ه ر)

الصَّهْرُ: کے معنی اَلْخَتَنُ بھی آتے ہیں یعنی وہ  
رشتہ دار شوہر کی جانب سے ہوں نیز بیوی کے خاندان  
والوں کو اَصْهَارُ کہا جاتا ہے یہ قول ظلیل کا ہے۔ ابن

مَصَانِعُ ﴿ (۲۶-۱۲۹) اور محل بناتے ہو۔ اور کنایہ کے  
طور پر مُصَانَعَةُ کے معنی رشوت دینا بھی آتے ہیں  
اَلْاَضْطِنَاعُ کسی چیز کی نہایت زور اور توجہ سے اصلاح  
کرنا۔ اور آیت کریمہ: ﴿وَاضْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِي﴾  
(۲۰-۴۱) اور میں نے تم کو (اپنے کام کے لیے) بنایا  
ہے۔ اور آیت:

﴿وَلِتُصْنَعَ عَلَىٰ عَيْنِي﴾ (۲۰-۳۹) اور اس لیے کہ  
تم میرے سامنے پرورش پاؤ۔

میں حکماء کے اس قول کی طرف اشارہ ہے کہ جب اللہ  
تعالیٰ کسی بندہ کو اپنا محبوب بنا لیتا ہے تو اس کی اس طرح  
دیکھ بال کرتا ہے جیسے ایک دوست اپنے دوست کی۔

### (ص ن م)

الصَّنَمُ: کے معنی بت کے ہیں جو کہ چاندی، پتیل یا  
لکڑی وغیرہ کا بنا ہوا ہو۔ عرب لوگ ان چیزوں کے مجسمے بنا  
کر (ان کی پوجا کیا کرتے اور انہیں تقرب الہی کا ذریعہ سمجھتے  
تھے) صَنَم کی جمع اَصْنَامُ آتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:  
﴿اتَّخِذْ اَصْنَامًا آلِهَةً﴾ (۶-۷۵) کہ تم بتوں کو  
کیوں معبود بناتے ہو۔

﴿لَا يَكْنِزْنَ اَصْنَامُكُمْ﴾ (۲۱-۵۷) میں تمہارے  
بتوں سے ایک چال چلوں گا۔

بعض حکماء نے کہا ہے کہ ہر وہ چیز جسے خدا کے سوا پوجا  
جائے بلکہ ہر وہ چیز جو انسان کو خدا تعالیٰ سے بیگانہ بنادے  
اور اس کی توجہ کو کسی دوسری جانب منعطف کر دے صَنَم  
کہلاتی ہے۔ چنانچہ ابراہیم علیہ السلام نے دعا مانگی تھی کہ:

۱ وفی الحدیث العباس صنواہی ای شقیفہ الفائق (۲/۲۱)۔

والے کے لحاظ سے یعنی جب کوئی شخص اپنی حسبِ منشا کسی چیز کو حاصل کر لے تو اس کے متعلق أَصَابَ كَذَا کا محاورہ استعمال ہوتا ہے مثلاً: أَصَابَهُ بِالسَّهْمِ (اس نے اسے تیر مارا، پھر اس دوسرے کے معنی کے اعتبار سے اس کی چند قسمیں ہیں۔ (۱) اچھی چیز کا قصد کرے اور اس کرگزرے یہ صواب تام کہلاتا ہے اور قابلِ ستائش۔

(۲) مستحسن چیز کا قصد کرے لیکن اس سے غیر مستحسن فعل سرزد ہو جائے یہ بھی صواب میں داخل ہے کیونکہ اس نے اجتہاد کے بعد اسے صواب سمجھ کر کیا ہے اور آنحضرت ﷺ کے فرمان ((كُلُّ مُجْتَهِدٍ مُصِيبٌ)) (کہ ہر مجتہد مصیب ہوتا ہے) کا بھی یہی مطلب ہے اور یہ بھی مروی ہے کہ ((الْمُجْتَهِدُ مُصِيبٌ وَإِنْ أَخْطَأَ فَهَذَا لَهُ أَجْرٌ)) کہ مجتہد مصیب ہوتا ہے اگر خطا وار بھی ہو تو اسے ایک اجر حاصل ہو جاتا ہے جیسا کہ ایک اور روایت میں ہے۔<sup>①</sup>

((مَنْ اجْتَهَدَ فَأَصَابَ فَلَهُ أَجْرَانِ وَمَنْ اجْتَهَدَ فَأَخْطَأَ فَلَهُ أَجْرٌ)) کہ جس نے اجتہاد کیا اور صحیح بات کو پایا تو اس کے لیے دو اجر ہیں اور جس نے اجتہاد کیا اور غلطی کی تو اس کے لیے ایک اجر ہے۔

(۳) کوئی شخص صحیح بات یا کام کا قصد کرے مگر کسی سبب سے اس سے غلطی سرزد ہو جائے۔ مثلاً: ایک شخص شکار پر تیر چلاتا ہے مگر اتفاق سے کسی انسان کو لگ جاتا ہے اس

الاعرابی نے کہا ہے<sup>②</sup> کہ پڑوس، نسب یا شادی کی وجہ سے جو تعلق پیدا ہو جائے اسے اِصْهَارُ (افعال) کہا جاتا ہے رَجُلٌ مُصْهَرٌ: وہ مرد جسے اس قسم کا تعلق حاصل ہو اور آیت کریمہ:

﴿فَجَعَلَهُ نَسَبًا وَصِهْرًا﴾ (۵۳-۲۵) میں نسب سے وہ رشتے داری مراد ہے جو آباء و اجداد کی جانب سے ہو اور صِہْرُ سے مراد وہ رشتہ جو شادی کی وجہ سے پیدا ہو جائے۔ اَلْصَّهْرُ (ف) کے معنی ہیں چربی وغیرہ کو گرم کر کے پگھلانا قرآن پاک میں ہے:

﴿يُضْهِرُ بِهِ مَافِي بُطُونِهِمْ﴾ (۲۲-۲۰) اس سے جو کچھ ان کے پیٹوں کے اندر ہے گال دیا جائے گا۔ اَلْصَّهَارَةُ: پگھلائی ہوئی چربی۔ ایک اعرابی کا قول ہے کہ لَا ضَهْرَكَ بِسَمِينٍ مُرَّةً: یعنی میں تمہیں پگھلا کر چھوڑوں گا۔<sup>③</sup>

## (ص و ب)

اَلصَّوَابُ: (صحیح بات) کا لفظ دو طرح استعمال ہوتا ہے (۱) کسی چیز کی ذات کے اعتبار سے یعنی جب کوئی چیز اپنی ذات کے اعتبار سے قابلِ تعریف ہو اور عقل و شریعت کی رو سے پسندیدہ ہو۔ مثلاً تَحَرَّى الْعَدْلَ صَوَابٌ (انصاف کو مدنظر رکھنا صواب ہے) اَلْكَرَمُ صَوَابٌ (کرم و بخشش صواب ہے) (۲) قصد کرنے

① ابو عبد اللہ محمد بن زیاد والاعرابی شیخ ابی العباس و ربیب المفضل الضبی ولد سنہ ۱۵۰ ہجری و توفی ۲۳۱ و قد جاور الثمانین۔ ابن الندیم (۱۹۰-۱۳۰) و امالی القالی (۱/۱۶۵، ۲/۲۳۷) والانباء (۱۰-۱۰۹) (۱۳۱/۳) و معجم الادباء (۱۸/۱۹۴) والمذہب (۱/۳۹۴، ۴۳۹، ۵۰۴، ۷۷/۲۰۵، ۷۷/۲۰۵) کشف الظنون (۲/۱۹۸۰) تاریخ بغداد (۵/۲۸۲-۲۸۵) المراجع فی بروکلمن (۲۰۳۰-۲۰۵)۔

② وفی المطبوع بیمنی مرة والتصویب من المعاجم۔

③ الحدیث باختلاف الفاظہ مروی عن ابی ہریرہ و عمرو بن العاص رواہ احمد و أصحاب الکتب السنۃ و ابن عبدالحکم فی فتوح مصر باسانید من طریق ابن الہاد (۲۲۷-۲۲۸) راجع الرسالة للشافعی رقم: (۱۴۰۹-۱۴۰۱) تحقیق احمد شاکر۔

پر (زور کا) بادل برسا ہے۔

اور آیت کریمہ:

﴿أَوْ كَصَيْبٍ مِّنَ السَّمَاءِ﴾ (۱۸-۲) یا ان کی مثال اس بارش کی ہے جو آسمان سے (برس رہی ہو) میں بعض نے کہا ہے کہ صَيْبُ کے معنی بادل ہیں۔ اور بعض نے بارش مراد لی ہے۔ اور بارش کو مجازاً صَيْبُ کہا جاتا ہے جیسا کہ اسے سَحَابُ کہہ دیتے ہیں أَصَابَ السَّهْمُ: تیر ٹھیک نشانہ پر جا لگا۔ اور مُصِيبَةُ: اصل میں تو اس تیر کو کہتے ہیں جو ٹھیک نشانہ پر جا کر بیٹھ جائے اس کے بعد (عرف میں) ہر حادثہ اور واقعہ کے ساتھ یہ لفظ مخصوص ہو گیا ہے۔ قرآن میں ہے:

﴿أَوَلَمَّْا أَصَابَتْكُمْ مُصِيبَةٌ قَدْ أَصَبْتُمْ مِثْلَيْهَا﴾ (۱۶۵-۳) (بھلا یہ) کیا بات ہے کہ جب احد کے دن کفار کے ہاتھ سے تم پر مصیبت واقع ہوئی حالانکہ (جنگ بدر میں) اس سے دو چند مصیبت تمہارے ہاتھ سے انہیں پہنچ چکی تھی۔

﴿فَكَيْفَ إِذَا أَصَابَتْهُمْ مُصِيبَةٌ﴾ (۶۲-۳) تو کیسی (ندامت کی بات) ہے کہ جب..... ان پر کوئی مصیبت واقع ہوتی ہے۔

﴿وَمَا أَصَابَكُمْ يَوْمَ التَّقْيِ الْجَمْعَانِ﴾ (۶۲-۳)

صورت میں اسے مغذور سمجھا جائے گا۔

(۴) ایک شخص کوئی برکام کرنے لگتا ہے مگر اس کے برعکس اس سے صحیح کام سرزد ہو جاتا ہے تو ایسے شخص کے متعلق کہا جائے گا کہ گو اس کا ارادہ غلط تھا مگر اس نے جو کچھ کیا وہ درست ہے۔

الصَّوَابُ: (ن) کے معنی بھی إِصَابَةٌ (افعال) ہی ہیں اور صَابَهُ وَأَصَابَهُ کے ایک ہی معنی ہیں یعنی پہنچنا یا لگانا اور صَوَّبُ اس بارش کو بھی کہتے ہیں جو صرف اسی قدر برے جس حد تک کہ مفید ہو چنانچہ آیت کریمہ:

﴿أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً بِقَدَرٍ﴾ (۱۱-۴۳) ایک اندازے کے ساتھ آسمان سے پانی نازل کیا، میں بِقَدَرٍ سے یہی معنی مراد ہیں۔ شاعر نے کہا ہے۔ (الکامل) (۲۷۷) فَسَقَىٰ دِيَارَكَ غَيْرَ مُفْسِدٍهَا..... صَوَّبُ الرَّبِّيعِ وَدَيْمَةٍ تَهْمِي

موسم ربیع کی بارش اور متواتر برسنے والا پانی تمہارے شہر کو سیراب کرے۔

اور صَيْبٌ خاص کر صَابَ يَصُوبُ سے فَعِيلٌ کے وزن پر (مبالغہ کا صیغہ) ہے جس کے معنی ہیں بارش کا گرنا، اوپر سے نیچے آنا۔ شاعر نے کہا ہے۔ (طویل) (۲۷۸) فَكَانَتْهُمْ صَابَتْ عَلَيْهِمْ سَجَلَةٌ گویا اس

① قاله طرفة والبيت في اللسان (همي) و ديوانه ۶۲ مع شرحه لاحمد شفيطى وفيه بلادك والصناعتين ۳۹۰ في بحث التتميم والتكميل وفي ۴۰۸ بحث الاستثناء والعمدة (۲: ۲۵۰) و مختار الشعر الجاهلي (۱: ۲۵۸) و نقد الشعر ۴۹ والعقد الثمين ۱۷ و في غريب ابى عبيد (۱: ۲۳) و يقال انه لمرقش.

② قاله علقمة بن عبدة وتماحه: صوا عقه ياطر بن وهيب والبيت من كلمة مفضيلته (۲: ۱۹۰) في ۴۳ بيتاً وفي الموشح ۹۱ (في امثله الابيات المستكرمة) و ديوانه من السنة ۱۰۵ والطبري (۱: ۱۴۸) واللسان والتاج (صوب) و مختار الشعر الجاهلي (۱: ۳۲۲) والبحر (۱: ۱۸۴)، (۴: ۴۵۵/۳۲۸) والحيوان (۳: ۱۷۶) مع آخر والمعاني للقتبي ۸۶۰ و شرح السبع لابن الانباري ۵۲۲ والعقد الثمين ۱۰۷ و ايام العرب ۵۸ و في المطبوع فكانما صابت عليه مصحح.

دو قسمیں ہیں (۱) وہ صوت جو ہر قسم کے تنفس سے خالی ہوتا ہے جیسے صوت مہمہ (۲) وہ صوت جو تنفس کے ساتھ ملا ہوتا ہے پھر صوت تنفس دو قسم پر ہے ایک غیر اختیاری جیسا کہ جمادات اور حیوانات سے سرزد ہوتا ہے۔ دوم اختیاری جیسا کہ انسان سے صادر ہوتا ہے۔ جو صوت انسان سے صادر ہوتا ہے پھر دو قسم پر ہے۔ ایک وہ جو ہاتھ کی حرکت سے پیدا ہو، جیسے عود (ستار) اور اس قسم کی دوسری چیزوں کی آواز۔ دوم وہ جو منہ سے نکلتا ہے اس کی پھر دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو نطق کے ساتھ ہو۔ دوم وہ جو بغیر نطق کے ہو۔ جیسے نے یعنی بانسری کی آواز پھر نطق کی دو صورتیں ہیں ایک مفرد، دوم مرکب۔ جو کہ انواع کلام میں سے کسی ایک نوع پر مشتمل ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿لَا تَرْفَعُوْا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ﴾ (۲۰-۲۹) اپنی آوازیں پیغمبر ﷺ کی آواز سے بلند نہ کرو، میں خصوصیت کے ساتھ صوت یعنی آواز بلند کرنے سے منع کیا گیا ہے کیونکہ یہ نطق و کلام سے عام ہے اور ہو سکتا ہے کہ ممانعت کا تعلق صوت یعنی محض آواز کے ساتھ ہو نہ کہ بلند آواز کے ساتھ کلام کرنے سے۔ نیز اس کی وجہ تخصیص یہ بھی ہو سکتی ہے کہ آنحضرت ﷺ کی آواز سے بلند آواز کرنے کی کراہت ظاہر کرنا مقصود ہو اور مطلق بلند آواز کے ساتھ کلام کرنے سے ممانعت مقصود نہ ہو۔ رَجُلٌ صَيِّتٌ: بلند آواز والا آدمی رَجُلٌ صَائِتٌ جِئْتِ وَالْاَصْيَاتُ کے اصل معنی مشہور ہونے کے ہیں مگر استعمال میں اچھی شہرت کے ساتھ مخصوص ہو چکا ہے۔

الْاِنْصَاتُ کے معنی چپ کر کے توجہ کے ساتھ کسی کی بات سننا کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

اور جو مصیبت تم پر دونوں جماعتوں کے مابین مقابلہ کے دن واقع ہوئی۔

﴿وَمَا اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِیْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَیْدِیْكُمْ﴾ (۳۲-۳۰) اور جو مصیبت تم پر واقع ہوتی ہے سو تمہارے اپنے اعمال سے۔

اور اَصَابَ (افعال) کا لفظ خیر و شر دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿اِنْ تُصِیْبَكَ حَسَنَةٌ تَّسُوْهُمُ وَاِنْ تُصِیْبَكَ مُّصِیْبَةٌ﴾ (۹-۵۰) اگر تم کو آسائش حاصل ہوتی ہے تو ان کو بری لگتی ہے اور اگر مشکل پڑتی ہے۔

﴿وَلَیْنِ اَصَابَكُمْ فَضْلٌ مِّنَ اللّٰهِ﴾ (۴-۷۳) اور اگر خدا تم پر فضل کرے۔

﴿فَیُصِیْبُ بِہٖ مِّنْ یَّشَآءُ وَیَصْرِفُہٗ عَن مَّنْ یَّشَآءُ﴾ (۲۳-۲۳) تو جس پر چاہتا ہے اس کو برسات دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے پھیر دیتا ہے۔

﴿فَاِذَا اَصَابَ بِہٖ مِّنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادَہٗ﴾ (۳۰-۲۸) پھر جب وہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے اسے برسات دیتا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ جب اَصَابَ کا لفظ خیر کے معنی میں استعمال ہوتا ہے تو یہ صَوْبٌ بمعنی بارش سے مشتق ہوتا ہے اور جب برے معنی میں آتا ہے تو یہ معنی اَصَابَ السَّهْمُ کے محاورہ سے ماخوذ ہوتے ہیں مگر ان دونوں معانی کی اصل ایک ہی ہے۔

## (ص و ت)

الصَّوْتُ: (آواز) اس ہوا کو کہتے ہیں جو دو جسموں کے ٹکرانے سے مضطرب یعنی دب جائے۔ اس کی



اس نے تمہاری صورتیں بنائیں اور صورتیں بھی نہایت حسین بنائیں۔

﴿فِي آيِ صُورَةٍ مَّا شَاءَ رَكَّبَكَ﴾ (۸۲-۸) اور جس صورت میں چاہا تجھے جوڑ دیا۔

﴿الَّذِي يُصَوِّرُكُمْ فِي الْأَرْحَامِ﴾ (۳-۵) جو ماں کے پیٹ میں..... تمہاری صورتیں بناتا ہے۔

اور حدیث (۷) ((إِنَّ اللَّهَ خَلَقَ آدَمَ عَلَى صُورَتِهِ)) کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو اس کی خصوصی صورت پر تخلیق کیا۔ میں ”صورت“ سے انسان کی

وہ شکل اور ہیئت مراد ہے جس کا بصر اور بصیرت دونوں سے ادراک ہو سکتا ہے اور جس کے ذریعہ انسان کو بہت سی مخلوق پر فضیلت حاصل ہے (اور صُورَتہ میں اگرہ ضمیر کا مرجع ذات باری تعالیٰ ہو تو) اللہ تعالیٰ کی طرف لفظ صورت کی اضافت تشبیہ یا تبعیض کے اعتبار سے نہیں ہے بلکہ اضافت ملک یعنی ملحوظ شرف کے ہے یعنی اس سے انسان کے شرف کو ظاہر کرنا مقصود ہے۔ جیسا کہ بَیِّنَاتُ اللّٰهُ يَا نَاقَةَ اللّٰهِ میں اضافت ہے جیسا کہ آیت کریمہ:

﴿وَنَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُّوحِي﴾ (۲۳۸) میں روح کی اضافت اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف کی ہے اور آیت کریمہ:

﴿يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّورِ﴾ (۲۰-۱۰۲) جس روز صور پھونکا جائے گا۔ کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ صُور سے قرن یعنی زنجیے کی طرح کی کوئی چیز مراد ہے، جس میں

﴿وَإِذَا فُرِئِ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنْصِتُوا﴾

(۲۰۴-۷) اور جب قرآن پاک پڑھا جائے تو توجہ سے سنا کرو اور خاموش رہا کرو۔

بعض نے کہا ہے کہ اِنْصَات کے معنی جواب دینا بھی آتے ہیں۔ لیکن یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ جواب تو انصات یعنی بات سننے کے بعد ہوتا ہے۔ اور اگر اس معنی میں استعمال بھی ہو تو آیت میں اس امر پر ترغیب ہوگی کہ کان لگا کر سنو تا کہ اسے قبول کرنے پر قوت حاصل ہو۔

## (ص و ر)

الصُّورَةُ۔ کسی عین یعنی مادی چیز کے ظاہری نشان اور خدو خال جس سے اسے پہچانا جاسکے اور دوسری چیزوں سے اس کا امتیاز ہو سکے یہ دو قسم پر ہیں۔ (۱) محسوس، جن کا ہر خاص و عام ادراک کر سکتا ہو۔ بلکہ انسان کے علاوہ بہت سے حیوانات بھی اس کا ادراک کر لیتے ہیں جیسے انسان، فرس، حمار وغیرہ کی صورتیں دیکھنے سے پہچانی جاسکتی ہیں۔ (۲) صورۃ عقلیہ، جس کا ادراک خاص خاص لوگ ہی کر سکتے ہوں اور عوام کے فہم سے وہ بالاتر ہوں جیسے انسانی عقل و فکر کی شکل و صورت یا وہ معانی یعنی خاصے جو ایک چیز میں دوسری سے الگ پائے جاتے ہیں، چنانچہ صورت کے ان پر ہر دو معانی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

﴿ثُمَّ صَوَّرْنَاكُمْ﴾ (۷-۱۱) پھر تمہاری شکل و صورت بنائی۔ ﴿وَصَوَّرَكُمْ فَأَحْسَنَ صُورَكُمْ﴾ (۶۳-۳) اور

① کما فی قولہم وعی فانصات (راجع الصحاح والمعاجم) لکن فی الآیۃ من (ن ص ت) معناه السکوت والاستماع للحدیث

لامن (ص و ت) کما ذکرہ المولف قال الثعلب معنی الآیۃ واذا قرء الامام فاستمعوا لقرآء تہ ولا تتکلموا فتدبر ۱۲۔

② الحدیث متفق علیہ عن ابی ہریرۃ راجع کنز العمال (۶ رقم ۵۵۰) وایضاً حم و قط فی الصفات وطب فی السنۃ عن ابی ہریرۃ وعب عن قتادۃ مرسلًا و قط فی الصفات عن بن عمر راجع تعریج العراقی علی الاحیاء ج ۲، ص ۱۶۸ وکنز ج (۱)، ص ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴۔

قطع کرنے کی مناسبت سے بھیڑ بکریوں کے گلہ کو صَوَّارٌ  
 کہا جاتا ہے جیسا کہ صِرْمَةٌ قَطِيعٌ اور فِرْقَةٌ وغیرہ الفاظ  
 ہیں کہ قطع یعنی کاٹنے کے معنی کے اعتبار سے ان کا اطلاق  
 جماعت پر ہوتا ہے۔<sup>①</sup>

### (ص و ع)

الصُّوَّاعُ: اس برتن کو کہتے ہیں جس میں کوئی  
 مشروب ڈال کر پیا جاتا ہے یا اس سے غلہ ماپ کر دیا جاتا  
 ہے اسے صَاع بھی کہتے ہیں۔ اور یہ مذکر اور مؤنث دونوں  
 طرح استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں آیت:  
 ﴿نَقْفُذُ صُّوَّاعَ الْمَلِكِ﴾ (۷۲-۷۱) کہ بادشاہ (کے  
 پانی پینے) کا پیانا کھویا گیا ہے۔ کے بعد ﴿ثُمَّ  
 اسْتَخْرَجَهَا﴾ (۷۲-۷۱) فرمایا ہے (یعنی ہاضمیر  
 مونث اس کی طرف لوٹ رہی ہے)  
 اور حدیث<sup>②</sup>: ((صَاعٌ مِّنْ بَرٍّ وَصَاعٌ مِّنْ شَعِيرٍ))  
 میں صَاعٌ سے وہ چیز مراد ہے جو اس سے ماپی جاتی ہے۔  
 (یعنی ظرف بول کر منظور فرما دیا ہے بعض نے کہا ہے کہ  
 کبھی ”صَاعٌ“ کے معنی بطن ارض یعنی گڑھا کے آجاتے  
 ہیں۔ شاعر نے کہا ہے۔<sup>③</sup> (الکامل)  
 (۲۷۹) تَكَرُّبُكَ فِی صَاعٍ

پھونکا جائے گا۔  
 تو اس سے انسانی صورتیں اور روحیں ان کے اجسام کی طرف  
 لوٹ آئیں گی۔ ایک روایت میں ہے۔<sup>④</sup> ((ان الصور  
 فیہ صورة الناس کلہم)) کہ صُور کے اندر تمام  
 لوگوں کی صورتیں موجود ہیں اور آیت کریمہ:

﴿فَخُذْ أَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ إِلَيْكَ﴾ (۲-  
 ۲۶۰) میں صِرْهُنَّ کے معنی یہ ہیں کہ اپنی طرف مائل کر لو  
 اور بلاؤ اور یہ صُور سے مشتق ہے جس کے معنی مائل  
 ہونے کے ہیں بعض نے کہا ہے کہ اس کے معنی پارہ پارہ  
 کرنے کے ہیں۔<sup>⑤</sup> ایک قراءت میں صِرْهُنَّ<sup>⑥</sup> ہے  
 بعض کے نزدیک صِرْهُنَّ وَصِرْهُنَّ دونوں ہم معنی ہیں اور  
 بعض نے کہا ہے کہ صِرْهُنَّ کے معنی ہیں انہیں چلا کر بلاؤ  
 چنانچہ خلیل نے کہا ہے کہ عَصْفُورٌ صَوَّارٌ اس چڑیا کو  
 کہتے ہیں جو بلانے والے کی آواز پر آ جائے۔

ابو بکر نقاش نے کہا ہے کہ اس میں ایک قراءت فَصُرْهُنَّ  
 ضاد کے ضمہ اور مشدود مفتوحہ کے ساتھ بھی ہے یہ صِرْ  
 سے مشتق ہے جس کے معنی باندھنے کے ہیں اور ایک  
 قراءت میں فَصِرْهُنَّ ہے جو صَریر بمعنی آواز سے  
 مشتق ہے اور معنی یہ ہیں کہ انہیں بلند آواز دے کر بلاؤ اور

① کذا مروی عن علماء التفسیر انظر القرطبی.

② منسوب الی ابن عباس والتابعین کما فی الفتح (۱۵۰/۸).

③ وہی قراءۃ علی و ابن عباس والاكثر و اما الکسر فقراءۃ ابن مسعود وہی لغة سلیم قارن اضدا و ابی الطیب (۴۱۸-۴۲۴) و فی  
 الدانی (۸۲) حمزة بکسر الصاد الباقون بضمها و فی مجاز ابی عبیدۃ (۸۰-۸۱) معناه بالضم: ضمهن الیک و بالکسر قطعهن  
 الاصمعی فی اشداده ۳۳ و ابن السکیت ۵۷ او اللسان (صور).

④ والجماعة النحل الصور و فی الحديث بطاع من تحت هذا الصور رجل من اهل الجنة فالطلع ابو بکر الفائق (۲۱/۲).

⑤ والحديث باختلاف الفاظ فی ابوداؤد و البخاری و مسلم و النسائی و ابن ماجة من حديث ابن عمر و راجع العون (ج ۲،  
 ص ۲۶، ۲۷)۔ و النیل (۱۹۰/۴) و الزرقانی (ج ۲، ص ۱۴۷-۱۴۹).

⑥ قاله المسیب بن علس و اوله: مرحت بداها للنساء کانما و فی المطبوع ذکر و ابدل تکر و مصحف و البیت من کلمة مفضیلة  
 رقم ۱۱ فی ۲۶ بیتا ذکرها القالی کلہافی ۱۳۰-۱۳۲ و فی المرتضیٰ (۵۶: ۱) و فی روايته قاع بدل صاع و ما ققط بدل لاعب  
 وایضا اصلاح یعقوب (۲۴۴) و الفائق (۲۲/۲).

ہے کہ یہ صُوفۃ کی طرف منسوب ہے جس کے معنی خدام کعبہ کے ہیں۔ صوفی لوگ بھی چونکہ ہر وقت عبادت میں مشغول رہتے تھے اس لیے انہیں صوفی کہہ دیا گیا ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ صُوفی صُوفان کی طرف منسوب ہے جس کے معنی نور و سیدہ گھاس کے ہیں اور صوفی لوگ بھی چونکہ زہد سے کام لیتے۔ اور معمولی سی غذا کھاتے تھے جو عدم کفایت میں صوفان گھاس کی مثل ہوتی تھی۔

### (ص و م)

الصَّوْمُ (ن) کے اصل معنی کسی کام سے رک جانا اور باز رہنا کے ہیں خواہ اس کا تعلق کھانے پینے سے ہو یا چلنے پھرنے یا گفتگو کرنے سے۔ اس بنا پر گھوڑا چلنے سے رک جائے یا چارہ نہ کھائے اسے بھی صَائِمٌ کہا جاتا ہے شاعر نے کہا ہے۔ (البسيط)

(۲۸۰) خَيْلٌ صَيَّامٌ وَأُخْرَى صَائِمَةٌ

کچھ گھوڑے اپنے تھان پر کھڑے ہیں اور دوسرے میدان جنگ میں ہیں۔

اور ہوا کے ساکن ہونے اور دوپہر کے وقت پر بھی صوم کا لفظ بولا جاتا ہے اس تصور پر کہ اس وقت آفتاب وسط آسمان میں ٹھہر جاتا ہے اسی اعتبار سے قَامٌ قَائِمٌ الظَّهِيْرَةُ کا محاورہ بھی استعمال ہوتا ہے جس کے معنی دوپہر کے وقت سورج کے خط نصف النہار پر ہونا کے ہیں مَصَامُ الْقَرَسِ أَوْ مَصَامَتُهُ: گھوڑے کے کھڑا ہونے کی جگہ۔ اصطلاح شریعت میں کسی مکلف کا روزہ کی نیت کے ساتھ

جیسا کہ کھینے والا اپنے ہاتھوں سے تیزی کے ساتھ گولی کو گڑھے میں ڈال دیتا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ شعر میں صاع کے معنی چوگان کے ہیں جس سے گیند کھیلی جاتی ہے تَصَوَّعَ النَّبْتُ پودا ہوا سے ہلا اور لہلہایا۔ تَصَوَّعَ الشَّعْرُ: بال پر اگندہ ہو گئے محاورہ ہے: الْكَمْيُ يَصُوعُ أَقْرَانَهُ: کہ بہادر اپنے ہمسروں کو منتشر کر دیتا ہے۔ آیت کریمہ: ﴿صَوَاعُ الْمَلِكِ﴾ میں ایک قرأت صَوْعُ الْمَلِكِ بھی ہے کیونکہ وہ صاع سونے سے ڈھال کر بنایا گیا تھا۔

### (ص و ف)

الصُّوف (اون) کی جمع أَصْوَافُ آتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَمِنْ أَصْوَافِهَا وَأَوْبَارِهَا وَأَشْعَارِهَا أَثَانًا وَمَتَاعًا إِلَىٰ حِينٍ﴾ (۱۶-۸۰) اور ان کی اون اور پشم اور بالوں سے تم سامان اور دیگر مفید چیزیں (بناتے ہو جو) مدت تک کام دیتی ہیں۔

أَخَذَ بِصُوفَةِ قَفَّاهُ: اسے گدی کے بالوں سے پکڑ لیا۔ كَبَشٌ صَافٍ وَأَصُوفٌ وَصَائِفٌ: بہت اون والا مینڈھا اور خانہ کعبہ کے خدام کو بھی صُوفۃ کہا جاتا تھا کیونکہ وہ کعبہ کے ساتھ اس طرح چمٹے رہتے تھے جیسے بھیڑ پر اون جمی رہتی ہے۔ الصُّوفَانُ: ایک قسم کی گھاس جو چھوٹی سی ہوتی ہے بعض نے کہا ہے کہ لفظ صُوفی بھی صوف کی طرف منسوب ہے کیونکہ یہ لوگ اون کا لباس پہنا کرتے تھے اور بعض نے کہا

۱) قاله النابغة الذبياني و تمامه: تحت العجاج و اخرى تعلق اللحماو في اللسان (صوم) و خيل بدل و اخرى و البيت في الصحاح و النجاج و المحكم (صوع، كرا) و الصاحي ۸۱ و الطبري (۱۲۸/۲) و البحر (۲۶: ۲) و محاز القرآن لابي عبيدة (۶: ۲) و ملحوظ ديوانه و العقد الثمين (۱۷۴) و الكامل (۴۸۳).

حج بھی گمراہٹ کا باعث ہوتی ہے۔ لہذا صَبْحَةُ کے معنی فَرَجُ یعنی چنگھاڑ کے بھی آتے ہیں۔ جیسے فرمایا:

﴿فَأَخَذَتْهُمُ الصَّبْحَةُ مُشْرِقِينَ﴾ (۱۵-۷۲) سو ان کو سورج نکلنے ہی چنگھاڑنے آ پکڑا۔

اور صَائِحَةُ کے معنی مجلسِ نوحہ خوانی کی چیخ و پکار کے ہیں۔ محاورہ ہے: مَا يَسْتَنْظِرُونَ إِلَّا مِثْلَ صَبْحَةِ الْجُبَلِ: یعنی وہ شہرِ عاجل کا انتظار کر رہے ہیں۔ الصَّيْحَانِي - ایک قسم کی کھجور۔

### (ص ی د)

الصَّيْدُ: (ض) یہ صاد کا مصدر اور اس کے اصل معنی تو کسی محفوظ چیز پر قدرت حاصل کر کے اسے پکڑ لینے کے ہیں مگر شرعاً ان حیوانات کے پکڑنے پر بولا جاتا ہے جو اپنی حفاظت آپ کریں بشرطیکہ وہ جانور حلال ہوں اور کسی کی ملکیت نہ ہوں اور کبھی مَصِيدُ یعنی شکار کیے ہوئے جانور کو بھی صید کہہ دیتے ہیں چنانچہ آیت کریمہ:

﴿أَحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ﴾ (۵-۹۶) کے معنی ہیں کہ (احرام کی حالت میں) تمہارے لیے سمندری جانوروں کا شکار حلال ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَلَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَأَنْتُمْ حُرُمٌ﴾ (۵-۹۵) جب تم احرام کی حالت میں ہو تو شکار نہ مارنا۔

﴿وَإِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوا﴾ (۵-۲) اور جب احرام اتار دو تو (پھر اختیار ہے کہ) شکار کرو۔

﴿غَيْرَ مُحِلِّي الصَّيْدِ وَأَنْتُمْ حُرُمٌ﴾ (۵-۱) مگر احرام (حج) میں شکار کو حلال نہ جانتا میں فقہانے تصریح کی ہے کہ یہاں الصَّيْدُ سے وہ جانور مراد ہیں جن کا گوشت کھایا جاتا

صبح صادق سے لے کر غروب آفتاب تک کھانے، پینے، منی خارج کرنے اور عہد اُتے کرنے سے رک جانے کا نام صوم ہے۔ اور آیت کریمہ: ﴿إِنَّمَا نَنْذَرُ لِلرَّحْمَنِ صَوْمًا﴾ (۱۹-۲۵) کہ میں نے خدا کے لیے روزے کی منت مانی ہے۔

کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ یہاں صوم سے مراد کلام سے رکنے یعنی خاموش رہنا کے ہیں۔ جیسا کہ بعد میں فَلَئِنْ أَكَلِمَ الْيَوْمَ أَنبِيَاءً (تو آج میں کسی آدمی سے ہرگز کلام نہ کروں گی) سے اس کی تفسیر کی گئی ہے۔

### (ص ی ح)

الصَّيْحَةُ کے معنی آواز بلند کرنا کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿إِنْ كَانَتْ إِلَّا صَيْحَةً وَاحِدَةً﴾ (۳۶-۲۹) وہ تو صرف ایک چنگھاڑ تھی۔ (آتشیں) اور آیت کریمہ:

﴿يَوْمَ يَسْمَعُونَ الصَّيْحَةَ بِالْحَقِّ﴾ (۵۰-۵۲) جس روز لوگ حجِ یقیناً سن لیں گے۔

میں صَبْحَةُ کے معنی صور (ترسکھے) میں پھونکنے کی آواز کے ہیں۔ دراصل صَبْحُ کے معنی آواز پھاڑنا کے ہیں اور یہ انْصَلَحَ الْخَشَبُ أَوِ الثُّوبُ کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں: لکڑی یا کپڑا پھٹ گیا اور اس سے آواز نکلی اور یہی معنی صَبْحِ الثُّوبُ کے ہیں۔ بِأَرْضٍ فُلَانٍ شَجَرٌ قَدْ صَاحَ: یعنی فلاں جگہ ایک درخت ہے جو اپنے طول کی وجہ سے نمایاں نظر آتا ہے۔ گویا وہ اپنی ذات پر ایسے ہی دلالت کرتا ہے جیسا کہ چیخنے والے کی آواز اس کے موجود ہونے پر دال ہوا کرتی ہے۔ پھر

﴿ص﴾، وَالْقُرْآنِ ذِي الذِّكْرِ (۱۳۸) قسم ہے قرآن کی جو نصیحت دینے والا ہے میں ص حروف مقطعات سے ہے بعض نے کہا ہے کہ یہ صَادِیْتُ کَذَا سے امر کا صیغہ ہے جس کے معنی ہیں ”اے لے کر قبول کرو“۔

### (ص ی ر)

الصَّيْرُ: کے معنی ایک جانب یا طرف کے ہیں دراصل یہ صَارَ (ض) کا مصدر ہے۔ اور اسی سے آیت فَصَّرْهُنَّ میں ایک قَرَأْتُ فَصَّرْهُنَّ ہے۔ صَارَ ضِ إِلَى كَذَا کے معنی کسی خاص مقام تک پہنچ جانا کے ہیں اسی سے صَيَّرُ الْبَابِ ہے جس کے معنی دروازہ میں شگاف اور جھروکا کے ہیں اور اسے صَيَّرَ اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ نقل و حرکت کا منتہی ہوتا ہے اور صَارَ کا لفظ ایک حالت سے دوسرے حالت میں منتقل ہونے پر بولا جاتا ہے۔ اسی سے الْمَصِيرُ اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں کوئی چیز نقل و حرکت کے بعد پہنچ کر ختم ہو جاتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَالْيَهُ الْمَصِيرُ﴾ (۵-۱۸) یعنی اللہ تعالیٰ ہی لوٹنے کی جگہ ہے۔<sup>۵</sup>

ہے۔ کیونکہ حدیث میں ہے۔<sup>۱</sup>  
(۸) ((خَمْسَةٌ يَفْتُلُهُنَّ الْمُحْرِمُ فِي الْحِلِّ وَالْحَرَمِ: الْحَيَّةُ وَلِعَقْرَبُ وَالْفَارَةُ وَالذَّنْبُ وَالْكَلْبُ الْعُقُورُ)) پانچ جانور یعنی سانپ، بچھو، چوہیا، بھیڑیا اور کاٹ کھانے والے کتے یعنی درندہ جانور کو محرم حرم کی حدود کے اندر اور باہر جگہ قتل کر سکتا ہے۔

الْأَصِيدُ: وہ شخص جس کی گردن ایک جانب جھکی ہوئی ہو۔ اور متکبر آدمی کے لیے یہ لفظ ضرب المثل کے طور پر استعمال ہوتا ہے اور صَيْدَانِ کے معنی ہنڈیا کے پتھر کے ہیں شاعر نے کہا ہے۔<sup>۲</sup> (الطویل)

(۲۸۱) وَسُوْدٌ مِنَ الصَّيْدَانِ فِيهَا مَذَانِبٌ اور سیاہ دیکھیں جن میں نضار لکڑی کے تچے رکھے ہوئے ہیں۔ اور اسے صَاد بھی کہہ دیتے ہیں۔<sup>۳</sup> جیسا کہ شاعر نے کہا ہے۔<sup>۴</sup> (الطویل)

(۲۸۲) كَرَأَيْتُ قُدُورَ الصَّادِ حَوْلَ بَيُوتِنَا میں نے پتھر کی ہنڈیاں اپنے خیموں کے ارد گرد دیکھیں۔ اور آیت کریمہ:

۱۔ حدیث قتل الخمس من الدواب رواه مالك في موطنه من حديث ابن عمر قال في المستهفي رواه الجماعة الا الترمذی وفيه حديث عائشة متفق عليه والحديث باختلاف الفاظه في النسائي و احمد و مارواه المصنف من الدواب معدودة في خمس الا الذئب قال في الفتح (۴: ۴۰۷) ووقع ذكر الذئب في حديث مرسل أخرجه ابن أبي شيبة و ابو داؤد من طريق سعيد بن المسيب و كذا في احمد من حديث ابن عمر مرفوعاً و موقوفاً راجع النيل (۴: ۲۸۹-۲۹) و الزرقاني (۲: ۲۸۷-۲۸۸) والمعروف في اكثر الروايات الحداة والغراب مكان الحية والذئب والتفصيل في الفتح.

۲۔ قاله ابو ذؤيب الهذلي وتماه..... الذئب اذا لم يستفد حادري والصيادان يروى بفتح الصاد (جمع صيدا روهى البرمة) وبكسر ها (جمع صادو هوا النحاس) راجع اسمط (۱: ۳۵۱) واللسان (صدن، صيد) والاقطصاب (۴۶۲) والكلمة في ديوانه رقم ۵ في ۴۱ بيتاً وفي اللسان نضار بدل النضار (اي بدون اداة التعريف) كذا في المعاني للفتية ۳۶۵ البيت (ابو ذؤيب) ايضاً في "البلغنه في شذور اللغة ۱۳۰۱ كتاب الرجل والمنزل.

۳۔ قال الاصمعي الصاد ويكون للصفروا لحجارة.

۴۔ قاله حسان بن ثابت وتماه: فقال سمحاني المحلة صيماً والبيت في ديوانه (۳۷۰ مع شرح المرزوقي) والصحاح (صدن) وفيه دهما بدل سمحاً واللسان (صيد).

۵۔ وفي القرآن (وَإِلَى اللَّهِ تَصِيرُ الْأُمُورُ) (۴۲-۵۳). وايضاً راجع (۲۵-۱۵) (۲۷-۳) (۲-۱۲۶).

## (ص ی ف)

الصَّيْفُ: گرمی کا موسم یہ الشَّتَاءُ کے بالمقابل ہے جس کے معنی سردی کا موسم کے ہیں۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿رَحَلَةَ الشَّتَاءِ وَالصَّيْفِ﴾ (۲۱۰۶) جاڑے اور گرمی

کے زمانے کا سفر۔

اور گرمی کے موسم میں جو بارش ہوا ہے بھی صَيْفٌ کہا جاتا

ہے جیسا کہ موسم بہار کی بارش کو ربيع کہتے ہیں۔ صَافُوًا:

گرمی کے موسم میں کسی جگہ چلے گئے اور اَصَافُوا موسم گرما

میں داخل ہوئے۔



## (ص ی ص)

الصَّيْصَةُ ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ اپنے آپ کو محفوظ کیا جائے مثلاً حفاظت گاہ اور قلعہ) اس کی جمع الصَّيَاصِيُّ آتی ہے۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿وَأَنْزَلَ الَّذِينَ ظَاهَرُوهُمْ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ مِنْ

صَيَاصِيهِمْ﴾ (۳۳-۲۶) اور اہل کتاب میں سے جنہوں

نے ان کی مدد کی تھی ان کو ان کے قلعوں سے (جن میں وہ

محفوظ ہو گئے تھے) اتار دیا۔

پھر معنی حفاظت کے اعتبار سے گائے کے سینگ کو صَيْصَةُ

کہا جاتا ہے نیز اس کے معنی خارخروں بھی آتے ہیں کیونکہ

اس کے ذریعہ اپنے آپ کی حفاظت کرتا ہے اور دوسروں

سے لڑتا ہے۔

## کتاب الصاد

### (ض و ن)

دوڑنے پر بھی بولا جاتا ہے جیسا کہ سرعت رفتاری میں گھوڑے کو آگ کے ساتھ تشبیہ دی جاتی ہے۔

### (ض ح ک)

الضَّحْكُ: (س) کے معنی چہرہ کے انبساط اور خوشی سے دانتوں کا ظاہر ہو جانا کے ہیں اور ہنستے وقت چونکہ سامنے کے دانت ظاہر ہو جاتے ہیں اس لیے ان کو ضَوَاحِكُ کہا جاتا ہے اور بطور استعارہ ضُحْک بمعنی تمسخر بھی آ جاتا ہے۔ چنانچہ ضَحِكْتُ مِنْهُ کے معنی ہیں: میں نے اس کا مذاق اڑایا اور جس شخص کا لوگ مذاق اڑائیں اسے ضُحْکًا اور جو دوسروں کا مذاق اڑائے اسے ضُحْکَةً (بفتح الحاء) کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَكُنتُمْ مِنْهُمْ تَضَحَكُونَ﴾ (۱۱۰-۲۳) اور تم ان کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔

﴿إِذَا هُمْ مِنْهَا يَضْحَكُونَ﴾ (۳۳-۴۷) تو وہ ان کا مذاق اڑانے لگے۔

﴿تَعْجَبُونَ وَتَضَحَكُونَ﴾ (۵۳-۶۰) کیا تم اس کلام سے تعجب کرتے ہو اور ہنستے ہو۔

اور کبھی صرف خوشی کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے جیسے فرمایا:

الضَّانُّ کے معنی بھیڑ اور دنبہ کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿مَنْ الضَّانِّ اثْنَيْنِ﴾ (۱۳۴-۶) دو (دو) بھیڑیوں میں سے۔

أَضَانُ الرَّجُلُ: بہت بھیڑ والا ہو گیا بعض نے کہا ہے: ضَانُّ کا واحد ضَانَّةٌ ہے۔

### (ض ب ح)

الضَّبْحُ کے معنی سر پٹ دوڑ کے وقت گھوڑے کے ہانپنے کے ہیں۔ چنانچہ آیت کریمہ:

﴿وَالْعَادِيَاتِ ضَبْحًا﴾ (۱۰۰-۱) ان سر پٹ دوڑنے والے گھوڑوں کی قسم جو ہانپ اٹھتے ہیں۔ کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ یہاں ضَبْحًا کے معنی گھوڑوں کے ہانپنے کی آواز کے ہیں۔ کیونکہ وہ ضَبَّاحٌ یعنی لومڑی کی آواز سے یک

گونہ مشابہت رکھتی ہے اور بعض نے کہا ہے کہ اس کے معنی دوڑنے کی آواز کے ہیں اور یہ لفظ سر پٹ دوڑنے پر بھی بولا

جاتا ہے۔ اور بقول بعض ضَبْحٌ اور ضَبْعٌ دونوں لفظ ہم معنی ہیں اور ان کے معنی گھوڑے کا اپنے بازوؤں کو پوری طرح

پھیلا کر دوڑنا کے ہیں۔ اور بعض نے کہا ہے کہ اس کے اصل معنی لکڑی کو جلانا کے ہیں پھر تشبیہ کے طور پر گھوڑے کے

① وَكَذَا لُغَةُ وَلَعْنَةٍ وَهَذَاءُ وَهَزْوَةٌ وَسَحَرَةٌ وَخُدَعَةٌ رَاجِعٌ شَرْحُ كِتَابِ الْفَصِيحِ لَابِي سَهْلٍ الْهَرَوِيُّ وَتَهْذِيبُ إِصْلَاحِ الْمُنْطَلِقِ لِلْبَرْبَرِيِّ وَفَارَانَ الْمَشْكَلِ اللَّقْنِيِّ ۱۲ وَالصَّاحِجِ ۱۹۲۔



﴿تَعَجَّبِينَ مِنْ أَمْرِ اللَّهِ﴾ (۷۳-۱۱) کیا خدا کی قدرت سے تعجب کرتی ہو، سے معلوم ہوتا ہے نیز آیت کریمہ:  
﴿إِنَّا آتَاكَ عِزُّوًّا.....عَجِيبٌ﴾ (۷۲-۱۱)  
اے ہے میرے بچہ ہوگا؟ میں تو بڑھیا ہوں.....

بڑی عجیب بات ہے، بھی اسی معنی پر دلالت کرتی ہے۔ اور جن لوگوں نے یہاں ضَحِکْتُ کے معنی حَاضَتْ کیے ہیں • انہوں نے ضَحِکْتُ کی تفسیر نہیں کی ہے۔ جیسا کہ بعض مفسرین نے سمجھا ہے، بلکہ اس سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بیوی کی حالت کا بیان کرنا مقصود ہے کہ جب ان کو خوشخبری دی گئی تو بطور علامت کے انہیں اسی وقت حیض آ گیا تاکہ معلوم ہو جائے کہ ان کا حاملہ ہونا بھی کچھ بعید نہیں ہے کیونکہ عورت کو جب تک حیض آتا رہے وہ حاملہ ہو سکتی ہے اور شاعر نے سبزہ زار کی صفت میں کہا ہے۔ ﴿الْبَسَاءُ﴾ (۲۸۳) يُضَاحِكُ الشَّمْسُ مِنْهَا كَوَكَبٍ شَرِقٍ اس کے پھول اور کلیاں دھوپ میں چمکتے اور سورج کے ساتھ گھومتے رہتے ہیں۔

یہاں شاعر نے اس روضہ کی چمک دمک کو بطور تشبیہ محکم سے تعبیر کیا ہے اسی سے چمکنے والے بادل، سفید چمکدار پتھر اور گدڑی کھجور کا شگونہ جب گنگفہ ہو جائے تو اس کو ضَاحِكٌ کہا جاتا ہے طَسْرِنَقُ ضَحُوْكَ. واضح راستہ ضَحِکُ

﴿ضَاحِكَةٌ﴾ (۸۰-۳۹) چمک رہے ہوں گے اور خنداں۔  
﴿فَلْيَضْحَكُوا قَلِيلًا﴾ (۸۲-۹) یہ (دنیا میں) تھوڑا خوش ہو لیں۔

﴿فَتَبَسَّ ضَاحِكًا﴾ (۱۹-۲۷) تو وہ اس کی بات سن کر ہنس پڑے۔  
شاعر نے کہا ہے۔ ﴿المدید﴾

(۲۸۳) يَضْحَكُ الضَّبُعُ لِقَتْلِي هَذَا بَلِي..... وَتَرَى الذِّئْبَ لَهَا تَسْتَهْلُ بنی ہذیل کے مقتولوں کی وجہ سے بخوش ہو رہے ہیں۔ اور بھیڑیے خوشی سے چلا رہے ہیں۔

اور کبھی ضَحِكٌ محض تعجب کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اسی معنی کے اعتبار سے بعض لوگوں نے کہا ہے کہ محکم انسان کا خاصہ ہے دیگر حیوانات اس کے ساتھ متصف نہیں ہوتے چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَأَنَّهُ هُوَ أَضْحَكَ وَأَبْكَى﴾ (۵۳-۴۳) اور یہ کہ وہی ہنساتا اور رلاتا ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَأَمْرًا تَهَاقَاتُمُ فَضَحِكًا﴾ (۷۱-۱۱) اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بیوی (جو پاس) کھڑی تھی ہنس پڑی۔  
میں ان کی بیوی کا ہنسا تعجب کی بنا پر تھا جیسا کہ اس کے بعد کی آیت کریمہ:

① البیت فی الحماسة مع المرزوقی (۲: ۱۶۴) منسوب لثاہل شراقالہ فی ثار قتیل حین اخذ الثار من بنی ہذیل والبیث فی البحر (۱: ۳۷۸) والمعانی للقتبی ۹۲۷ والمحكم (ضحک) وفی السمط ۱۱۹ تستهل سالباً، وتضحک بدل یضحک واختلف فی نسبة القصيدة راجع (خلل).

② ذکرہ ابو جعفر البیہقی فی تاج المصادر ونقل عن ثعلب و ابن الاعرابی وهذا قول عکرمہ ومجاهد الفیوضات الالہیة ۴۲۶/۲ والفتح للشوکانی ۱۱۰/۲ وقال الفراء: وأما قولهم فضحکت ای حاضت فلم اسمعه من ثقه و سئل ابو العباس عن هذا فقال لیس من کلام العرب و ایضاً روی ابن درید قول ابن الاعرابی ویلید قول المؤلف ۱۲.

③ قاله الاعشى و تمامه: موزر بعمیم التبت مکھل راجع (کھل) والبیث فی العینی (۲: ۵۰۵) وقانون البلاغة ۴۵۵ ضمن رسائل البلغاء وقبله آخر وفيه صنعة التفریع ۱۲.

أَضْحِيَّةٌ کی جمع أَضْحِیُّ اور ضَحِیَّةٌ کی ضَحَايَا اور أَضْحَاةٌ کی جمع أَضْحِیُّ آتی ہے اور ان سب کے معنی قربانی کے ہیں اور شرعاً قربانی بھی چونکہ نماز عید کے بعد چاشت کے وقت دی جاتی ہے اس لیے اسے أَضْحِیَّةٌ کہا جاتا ہے۔ حدیث میں ہے۔ (۹) (مَنْ ذَبَحَ قَبْلَ صَلَوتِنَا هَلْیُو فلیُعَذِّبُ) کہ جس نے نماز عید سے پہلے قربانی کا جانور ذبح کر دیا وہ دوبارہ قربانی دے۔

### (ض د د)

بعض نے کہا ہے: ضِدَّانِ ان دو چیزوں کو کہا جاتا ہے جو ایک جنس کے تحت ہوں مگر ان میں سے ہر ایک اپنے خصوصی اوصاف کے باعث دوسری سے مخالف ہو اور ان میں انتہائی بعد پایا جائے جیسے سفیدی و سیاہی اور خیر و شر اور جو متغایر چیزیں ایک جنس کے تحت نہ ہوں انہیں ضدان نہیں کہا جاتا جیسے حلاوت اور حرکت۔

علماء نے کہا ہے کہ ضد متقابلات کی ایک قسم کا نام ہے کیونکہ وہ دو چیزیں جن میں ذاتی اختلاف ہو اور یہ دونوں بیک وقت ایک جگہ میں اکٹھی نہ ہو سکتی ہوں انہیں متقابلین کہا جاتا ہے اور تقابل چار قسم پر ہے (۱) تقابل تضاد، جیسے سفیدی اور سیاہی (۲) تقابل تناقض، جیسے ضعف (دو چند) اور نصف (۳) تقابل عدم ملکہ، جیسے بھروگی (۴) تقابل ایجاب و سلب، جو جملہ خبریہ میں ہوتا ہے جیسے کُلُّ إِنْسَانٍ هُهْنًا وَلَيْسَ كُلُّ إِنْسَانٍ هُهْنًا: اکثر متکلمین اور اہل لغت ان سب کو تقابل تضاد کی فہرست میں شامل کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ضد ان ان دو چیزوں کو کہا جاتا ہے جو ایک محل میں جمع نہ ہو سکتی ہوں

الْعَدِيرُ حوض لبریز ہو کر چکنے لگا أَضْحَكْتُهُ: میں نے اسے لبریز کر دیا۔

### (ض ح و)

الضُّحَىٰ کے اصل معنی دھوپ پھیل جانے اور دن چڑھانے کے ہیں پھر اس وقت کو بھی ضُحَىٰ کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَالشَّمْسُ وَضُحَاهَا﴾ (۱-۹۱) سورج کی قسم اور اس کی روشنی کی۔

﴿أَلَا عَشِيَّةٌ أَوْ ضُحَاهَا﴾ (۴۹-۴۶) ایک شام یا صبح۔ ﴿وَالضُّحَىٰ وَاللَّيْلُ إِذَا سَجَىٰ﴾ (۱-۹۳) آفتاب کی روشنی کی قسم اور رات کی تاریکی کی جب چھا جائے۔ ﴿وَأَخْرَجَ ضُحَاهَا﴾ (۴۹-۲۹) اور اس کی روشنی نکالی۔ ﴿وَأَن يُّخْشِرَ النَّاسُ ضُحَىٰ﴾ (۵۹-۲۰) اور یہ لوگ اس دن چاشت کے وقت اکٹھے ہو جائیں۔

ضُحَىٰ يَضْحَىٰ: شمس۔ یعنی دھوپ کے سامنے آتا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَأَنْتَ لَا تَظْمَأُ فِيهَا وَلَا تَضْحَىٰ﴾ (۱۱۹-۲۰) اور یہ کہ نہ پیاسے رہو اور نہ دھوپ کھاؤ یعنی نہ ہی دھوپ سے تکلیف اٹھاؤ گے۔

تَضْحَىٰ ضُحَىٰ کے وقت کھانا کھانا جیسے تَعَذَّى (دوپہر کا کھانا کھانا) اور اس طعام کو جو صبحی اور دوپہر کے وقت کھایا جائے اسے ضُحَاءٌ اور عَدَاءٌ کہا جاتا ہے اور ضاحیۃ کے معنی کسی چیز کی کھلی جانب کے ہیں اس لیے آسمان کو الضَّوْاحِیُّ کہا جاتا ہے۔ لَيْلَةٌ إِضْحِيَّانَةٌ وَضُحِيَّانَةٌ: روشن رات جس میں شروع سے آخر تک چاندنی رہے۔

﴿لَنْ يَضُرَّوْكُمْ إِلَّا أَذًى﴾ (۳-۱۱۱) اور یہ تمہیں خفیف سی تکلیف کے سوا کچھ نقصان نہیں پہنچا سکیں گے۔ میں متنبہ کیا ہے کہ انہیں کفار کی طرف سے معمولی سی تکلیف کے سوا کسی قسم کا ضرر نہیں پہنچے گا اور یہ کہ ان کے ضرر سے بے فکر رہیں، جیسے فرمایا:

﴿لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا﴾ (۳-۱۰) تو ان کا فریب تمہیں کچھ بھی نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔

﴿وَلَيْسَ بِضَارٍّ هُمْ شَيْئًا﴾ (۵۸-۱۰) اس سے انہیں کچھ نقصان نہیں پہنچ سکتا۔

﴿وَمَا هُمْ بِضَارِّينَ بِهِ مِنْ أَحَدٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ﴾ (۲۰-۱۰۲) اور خدا کے حکم کے سوا وہ اس جادو سے کسی کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے تھے۔

﴿وَيَتَعَلَّمُونَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ﴾ (۲-۱۰۲) اور ایسے منتر سیکھتے جو ان کو نقصان ہی پہنچاتے اور فائدہ کچھ نہ دیتے۔ اور ان دونوں آیتوں:

﴿يَدْعُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَضُرُّهُ وَمَا لَا نَفْعَ لَهُ﴾ (۲۲-۱۲) یہ خدا کے سوا ایسی چیز کو پکارتا ہے جو اسے نقصان پہنچائے اور نہ فائدہ دے سکے۔

﴿يَدْعُوا لِمَنْ ضَرُّهُ أَقْرَبُ مِنْ نَفْعِهِ﴾ (۲۲-۱۱۳) بلکہ ایسے شخص کو پکارتا ہے جس کا نقصان فائدے سے زیادہ قریب ہے۔

میں سے پہلی آیت میں نفع اور ضرر کی نفی سے مراد یہ ہے کہ وہ بے جان بُت ہیں جو قصد و ارادہ سے کسی کو فائدہ یا نقصان پہنچانے کی صلاحیت نہیں رکھتے اور دوسری آیت میں جس ضرر کو ثابت کیا ہے اس سے وہ ضرر مراد ہے جو بتوں کی عبادت اور ان سے مدد طلب کرنے کی وجہ سے انسان کو پہنچتا

اور ذات باری تعالیٰ کے متعلق لَا يَضُرُّهُ وَلَا يَنْفَعُهُ کہہ کر دونوں کی نفی کی جاتی ہے۔ کیونکہ نذ شریک فی الجور کو کہتے ہیں اور ان دو متخالف چیزوں کو ایک دوسری کی ضد کہا جاتا ہے جو ایک جنس کے تحت علی سبیل التعاقب پائی جاتی ہوں اور چونکہ ذات باری تعالیٰ جو ہریت اور جنسیت دونوں سے منزہ ہے اس لیے نہ اس کا کوئی نذ ہو سکتا ہے اور نہ ضد اور آیت کریمہ:

﴿وَيَكُونُونَ عَلَيْهِمْ ضِدًّا﴾ (۱۹-۸۲) اور وہ ان کے دشمن اور مخالف ہوں گے۔ میں ضد کے معنی دشمن اور مخالف کے ہیں۔

## (ضُر)

الضُّرُّ: کے معنی بد حالی کے ہیں خواہ اس کا تعلق انسان کے نفس سے ہو، جیسے علم و فضل اور عفت کی کمی اور خواہ بدن سے ہو، جیسے کسی عضو کا ناقص ہونا یا قلت مال و جاہ کے سبب ظاہری حالت کا برا ہونا۔ اور آیت کریمہ:

﴿فَكَشَفْنَا مَا بِهِ مِنْ ضُرٍّ﴾ (۲۱-۸۳) اور جو ان کو تکلیف تھی وہ دور کر دی۔

میں لفظ ضُرُّ سے تینوں معنی مراد ہو سکتے ہیں نیز فرمایا:

﴿وَإِذَا مَسَّ الْإِنْسَانَ الضُّرُّ﴾ (۱۰-۱۲) اور جب انسان کو تکلیف پہنچتی ہے.....

﴿وَأَنَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهُ مَرَّكَانَ لَمْ يَدْعُنَا إِلَى ضُرِّ مَسِّهِ﴾ (۱۰-۱۲) پھر جب ہم اس تکلیف کو اس سے دور کر دیتے ہیں جو اسے پہنچی ہوئی ہے تو (بے لحاظ ہو جاتا ہے اور) اس طرح گزر جاتا ہے گویا کسی تکلیف پہنچنے پر ہمیں پکارا ہی نہیں تھا۔ ضُرُّ ضَرًّا کے معنی کسی کو ضرر (گزند) پہنچانے کے ہیں۔ اور آیت کریمہ:

(۲-۲۳۱) اور اس نیت سے انہیں نکاح میں نہ رہنے دینا چاہیے کہ انہیں تکلیف دو اور ان پر زیادتی کرو۔

ضَرَّهٗ اصل میں اس کام کو کہتے ہیں جس سے دوسرے کو نقصان پہنچے اور ایک مرد کی دو بیویاں ضَرَّتَانِ کہلاتی ہیں کیونکہ ان کا خیال تھا ان میں ہر ایک دوسری کے لیے نقصان دہ ہوتی ہے اسی معنی کے پیش نظر آنحضرت ﷺ نے فرمایا ﴿(۱۰) (لَا تَسْأَلُ الْمَرْءَةَ طَلَاقًا أُخْتِهَا لِتُكْفِيَ مَافِي صَحْفَتَيْهَا)﴾ کہ کوئی عورت اپنی بہن کے برتن کو اٹھ لینے کے لیے اس کی طلاق کا مطالبہ نہ کرے۔

أَلَا ضَرَّارُ: ایک بیوی کی موجودگی میں دوسری بیوی لانا اور جس مرد کی ایک سے زائد بیویاں ہوں اس کو مُضِرُّ کہے ہیں اور ان میں ہر عورت دوسری کی مُضِرَّةٗ کہلاتی ہے۔

أَلَا ضَطرَّارُ کے اصل معنی کسی کو نقصان دہ کام پر مجبور کرنے کے ہیں اور عرف میں اس کا استعمال ایسے کام پر مجبور کرنے کے لیے ہوتا ہے جسے وہ ناپسند کرتا ہو۔ اور اس کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ وہ مجبوری کسی خارجی سبب کی بنا پر ہو، مثلاً مار پٹائی کی جائے یا دھمکی دی جائے حتیٰ کہ وہ کسی کام کے کرنے پر رضامند ہو جائے یا زبردستی پکڑ کر اس سے کوئی کام کروایا جائے جیسے فرمایا:

﴿ثُمَّ أَضْطَرُّهُ إِلَىٰ عَذَابِ النَّارِ﴾ (۲-۱۲۶) پھر اس کو عذاب دوزخ کے دھمکنے کے لیے تاجدار کر دوں گا۔

﴿ثُمَّ نَضْطَرُّهُمْ إِلَىٰ عَذَابِ غَلِيظٍ﴾ (۳۱-۲۳) پھر عذاب شدید کی طرف مجبور کر کے لے جائیں گے۔

دوم یہ کہ وہ مجبوری کسی داخلی سبب کی بنا پر ہو اس کی دو قسمیں ہیں (۱) ایسے جذبہ کے تحت وہ کام کرے جسے نہ کرنے

ہے نہ کہ ان کے قصد و ارادہ سے اور ضَرَّاءُ کا لفظ سَرَّاءُ اور نَعَمَاءُ کے مقابلہ میں استعمال ہوتا ہے اور ضَرَّاءُ کا لفظ نفع کے مقابلہ میں، چنانچہ فرمایا:

﴿وَلَيْسَ أَذَقْنَاهُ نَعْمَاءَ بَعْدَ ضَرَّاءٍ﴾ (۱۱-۱۰) اور اگر تکلیف پہنچنے کے بعد آسائش کا مزہ چکھائیں۔

﴿وَلَا يَمْلِكُونَ لِأَنفُسِهِمْ ضَرًّا وَلَا نَفْعًا﴾ (۳۵-۳) اور نہ اپنے نقصان اور نفع کا کچھ اختیار رکھتے ہیں۔

اور کنایہ کے طور پر جُلُّ ضَرِيرٌ نابینا شخص کو کہتے ہیں اور ضَرِيرُ الْوَادِي، وادی کے اس کنارہ کو کہتے ہیں جسے پانی سے نقصان پہنچا ہو۔

الضَّرَرُ: بمعنی مُضَارٌّ یعنی تنگی ہے اور ضَارٌّ رُثَّہ کے معنی کسی کو نقصان پہنچانے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَلَا تَضَارُّوْهُنَّ﴾ (۶۵-۶) اور ان کو تکلیف نہ دو۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَلَا يُضَارَّ كَاتِبٌ وَلَا شَهِيدٌ﴾ (۲-۲۸۲) اور کاتب دستاویز اور گواہ (معاملہ کرنے والوں کا) کسی طرح نقصان نہ کریں۔ میں يُضَارُّ صیغہ معروف ہونے کی صورت میں اصل میں لَا يُضَارُّ ہوگا۔ اور صیغہ مجهول ہونے کی صورت میں لَا يُضَارَّرُ اور معنی ہوں گے کہ انہیں گواہی کے لیے بلا کر ان کے کاروبار سے روک کر انہیں نقصان نہ پہنچایا جائے اور آیت کریمہ:

﴿لَا تَضَارُّوْا الْوَلَدَ بِوَلَدِهَا﴾ (۲-۲۳۳) اور نہ تومان کر اس کے بچے کے سبب نقصان پہنچایا جائے۔ میں لَا تَضَارُّ کو ضمہ راکہ ساتھ پڑھا جائے تو خبر بمعنی امر ہوگا اور فتح راکہ صورت میں صیغہ امر (یعنی) نَبِیُّ ﴿ضَرَّارًا لِّتَعْتَدُوا﴾

یعنی مارنا کے ہیں اور مختلف اعتبارات سے یہ لفظ بہت سے معانی میں استعمال ہوتا ہے (۱) ہاتھ، لاشی، تلوار وغیرہ سے مارنا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَاضْرِبُوا فَوْقَ الْأَعْنَاقِ وَاضْرِبُوا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ﴾ (۸-۱۲) ان کے سر مار کر اڑا دو اور ان کا پور پور مار کر توڑ دو۔

﴿فَضْرِبَ الرِّقَابِ﴾ (۴۷-۴۸) تو ان کی گردنیں اڑا دو۔ ﴿فَقُلْنَا اضْرِبُوهُ بِبَعْضِهَا﴾ (۲-۷۳) تو ہم نے کہا کہ اس بیل کا سا کٹڑا مقتول کو مارو۔

﴿وَاضْرِبْ بِعَصَاكَ الْحَجَرَ﴾ (۲-۶۱) اپنی لاشی پتھر پر مارو۔

﴿فَرَأَى عَلَيْهِمْ ضَرْبًا بِالْيَمِينِ﴾ (۳۷-۹۳) پھر ان کو دابنے ہاتھ سے مارنا اور توڑنا شروع کیا۔ ﴿يَضْرِبُونَ وَجُوهَهُمْ﴾ (۸-۵۰) ان کے مونہوں پر مارتے ہیں۔

(۲) اور ضَرْبُ الْأَرْضِ بِالْمَطَرِ کے معنی بارش برسنے کے ہیں (۳) اور ضَرْبُ الدَّرَاهِمِ (دراہم کو ڈھالنا) کا محاورہ الضَرْبُ بِالْمَطَرَةِ کی مناسبت سے استعمال ہوتا ہے۔ اور نکال کے سکے میں اثر کرنے کی مناسبت سے طَبْعُ الدَّرَاهِمِ کہا جاتا ہے اور تشبیہ کے طور پر انسان کی عادت کو ضَرْبَةُ اور طَبِيعَةُ بھی کہہ دیتے ہیں۔

ضَرْبَ فِي الْأَرْضِ کے معنی سفر کرنے کے ہیں کیونکہ انسان پیدل چلتے وقت زمین پر پاؤں رکھتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَإِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْأَرْضِ﴾ (۴-۱۰۱) اور جب سفر کو جاؤ۔

سے اسے ہلاک ہونے کا خوف نہ ہو مثلاً شراب یا قمار بازی کی خواہش سے مغلوب ہو کر انکا ارتکاب کرے (۲) کسی ایسی مجبوری کے تحت اس کا ارتکاب کرے جس کے نہ کرنے سے اسے جان کا خطرہ ہو، مثلاً بھوک سے مجبور ہو کر مردار کا گوشت کھانا۔ چنانچہ آیت کریمہ:

﴿فَمَنْ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ﴾ (۲-۱۷۳) ہاں جو ناچار ہو جائے بشرطیکہ خدا کی نافرمانی نہ کرے اور حد (ضرورت) سے باہر نہ نکل جائے اور آیت کریمہ:

﴿فَمَنْ اضْطُرَّ فِي مَخْمَصَةٍ﴾ (۵-۳) ہاں جو شخص بھوک میں ناچار ہو جائے، میں اضطرار کے یہی معنی ہیں اور آیت:

﴿أَمَّنْ يَجِيبُ الْمُضْطَرَّ إِذَا دَعَاهُ﴾ (۲۷-۶۲) بھلا کون بے قرار کی التجا قبول کرتا ہے۔ میں اضطرار کا لفظ اپنے عام مفہوم میں استعمال ہوا ہے یعنی اضطرار داخلی اور خارجی دونوں کو شامل ہے۔

اور الضَّرُورِي کا لفظ تین طرح پر استعمال ہوتا ہے ایک وہ جو کسی دباؤ کی وجہ سے ہو مثلاً سخت ہوا چلنے سے درخت بالضرور ہلتا ہے۔ دوم: وہ جس کے بغیر کوئی چیز باقی نہ رہ سکے۔ مثلاً کہا جاتا ہے کہ حفظ بدن کے لیے غذا ضروری ہے۔ سوم: وہ جس کی جانب مخالف ممکن نہ ہو جیسے کہا جاتا ہے: الْجِسْمُ الْوَاحِدُ لَا يَصِحُّ حَصُولُهُ فِي مَكَانَيْنِ فِي حَالَةٍ وَاحِدَةٍ بِالضَّرُورَةِ: بعض نے کہا ہے کہ ضَرْقَ کے معنی انگلی یا پستان کی جڑ کے ہیں۔ نیز وہ چربی جو ران سے نیچے ڈھلک پڑتی ہے اسے بھی ضَرْقَ کہا جاتا ہے۔

## (ضرب)

الضَرْبُ کے معنی ایک چیز کو دوسری چیز پر واقع کرنا

ضَرَبَ الْخَيْمَةَ کے محاورہ سے مستعار ہے۔ ضَرَبُ الْعُودِ وَالنَّايِ وَالْبُوقِ: عود اور نے بجانا یا زنگھے میں پھونکنا۔

ضَرَبُ اللَّسَنِ: اینٹیں چننا، ایک اینٹ کو دوسری پر لگانا ضَرَبُ الْمَثَلِ کا محاورہ ضَرَبُ الدَّرَاهِمِ سے ماخوذ ہے اور اس کے معنی ہیں: کسی بات کو اس طرح بیان کرنا کہ اس سے دوسری بات کی وضاحت ہو۔ قرآن میں ہے:

﴿ضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا﴾ (۲۹-۳۹) خدا ایک مثال بیان فرماتا ہے۔

﴿وَأَضْرَبَ لَهُمْ مَثَلًا﴾ (۱۳-۳۶) اور ان سے..... قصہ بیان کرو۔

﴿ضَرَبَ لَكُمْ مَثَلًا مِّنْ أَنفُسِكُمْ﴾ (۲۸-۳۰) وہ تمہارے لیے تمہارے ہی حال کی ایک مثال بیان فرماتا ہے۔

﴿وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ﴾ (۵۸-۳۰) اور ہم نے..... ہر طرح مثال بیان کر دی ہے۔

﴿وَلَمَّا ضَرَبَ ابْنُ مَرْيَمَ مَثَلًا﴾ (۵۷-۴۳) جب مریم کے بیٹے (عیسیٰ) کا حال بیان کیا گیا۔

﴿مَا ضَرَبُوهُ لَكَ إِلَّا جَدَلًا﴾ (۵۸-۴۳) انہوں نے عیسیٰ کی جو مثال بیان کی ہے تو صرف جھگڑنے کو۔

﴿وَأَضْرَبَ لَهُمْ مَثَلِ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا﴾ (۴۵-۱۸) اور ان سے دنیا کی زندگی کی مثال بھی بیان کر دو۔

﴿أَفَنَضْرِبُ عَنْكُمُ الذِّكْرَ صَفْحًا﴾ (۵-۴۳) بھلا (اس لیے کہ تم حد سے نکلے ہوئے لوگ ہو) ہم تم کو نصیحت

کرنے سے باز ہیں گے۔

الْمُضَارَبَةُ: ایک قسم کی تجارتی شرکت (جس میں ایک شخص کا

﴿وَقَالُوا لَا اخْوَانَهُمْ إِذَا ضَرَبُوا فِي الْأَرْضِ﴾ (۶۵-۳) اور ان کے مسلمان بھائی جب خدا کی راہ میں سفر کریں..... تو ان کی نسبت کہتے ہیں۔

﴿لَا يَسْتَطِيعُونَ ضَرْبًا فِي الْأَرْضِ﴾ (۲۷-۲) اور ملک میں کسی طرف جانے کی طاقت نہیں رکھتے اور یہی معنی آیت:

﴿فَأَضْرَبَ لَهُمْ طَرِيقًا فِي الْبَحْرِ﴾ (۷۷-۲۰) کے ہیں یعنی انہیں سمندر میں (خشک) راستے سے لے جاؤ۔

ضَرَبَ الْفَحْلُ النَّاقَةَ: (زکا مادہ سے جفتی کرنا) یہ محاورہ ضَرَبَ بِالْمِطْرَقَةِ (ہتھوڑے سے کوٹنا) کی مناسبت سے طَرَقَ الْفَحْلُ النَّاقَةَ کا محاورہ بولا جاتا ہے۔

ضَرَبَ الْخَيْمَةَ: خیمہ لگانا۔ کیونکہ خیمہ لگانے کے لیے میخوں کو زمین میں ہتھوڑے سے ٹھونکا جاتا ہے اور خیمہ کی مناسبت سے آیت: ﴿وَضَرَبْتَ عَلَيْهِمُ الدِّلَّةَ﴾

(۶۱-۲) اور (آخر کار) ذلت..... ان سے چٹا دی گئی۔ میں ذلّۃ کے متعلق ضَرَبَ کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے

معنی یہ ہیں کہ ذلت نے انہیں اس طرح اپنی لپیٹ میں لے لیا جیسا کہ کسی شخص پر خیمہ لگا ہوا ہوتا ہے اور یہی معنی آیت:

﴿وَضَرَبْتَ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةَ﴾ (۱۱۲-۳) اور ناداری ان سے لپٹ رہی ہے۔ کے ہیں اور آیت کریمہ:

﴿فَضَرَبْنَا عَلَىٰ آذَانِهِمْ فِي الْكَهْفِ سِنِينَ عَدَدًا﴾ (۱۱۰-۱۸) تو ہم نے غار میں کئی سال تک ان کے

کانوں پر نیند کا پردہ ڈالے (یعنی ان کو سلائے) رکھا۔ نیز آیت کریمہ:

﴿فَضَرَبَ بَيْنَهُمُ بُسُورًا﴾ (۱۳-۵۷) پھر ان کے بیچ میں ایک دیوار کھڑی کر دی جائے گی۔ میں ضَرَبَ کا لفظ

اظہار کرنے کے ہیں۔ اَلضَّارِعُ وَالضَّرْعُ (صفت فاعلی) کمزور اور نحیف آدمی۔ تَضَرَّعَ: اس نے عجز و تذلل کا اظہار کیا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿تَضَرَّعًا وَخُفْيَةً﴾ (۶۳-۶۲) عاجزی اور نیاز پنہانی سے۔

﴿لَعَلَّهُمْ يَتَضَرَّعُونَ﴾ (۴۲-۶۱) تاکہ عاجزی کریں۔

﴿لَعَلَّهُمْ يَضَرَّعُونَ﴾ (۹۴-۷۹) تاکہ وہ عاجزی (اور

زاری) کریں۔

یہ اصل میں يَتَضَرَّعُونَ ہے تاء کو ضاد میں ادغام کر دیا گیا ہے۔ نیز فرمایا:

﴿قُلُوا لَا إِذْجَاءَ هُمْ بِأَسْنَا تَضَرَّعُوا﴾ (۴۳-۶۱) تو جب

ان پر ہمارا عذاب آتا رہا کیوں نہیں عاجزی کرتے رہے۔

اَلْمُضَارَعَةُ: کے اصل معنی ضَرَاعَةٌ یعنی عجز و تذلل میں باہم شریک ہونے کے ہیں۔ پھر محض شرکت کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے اسی سے علماء نحو نے الفعل المضارع کی اصطلاح قائم کی ہے کیونکہ اس میں دو زمانے پائے جاتے ہیں۔

### (ض ع ف)

اَلضَّعْفُ: (کمزوری) یہ اَلْقُوَّةُ کے بالمقابل آتا ہے۔ ضَعْفٌ فَهُوَ ضَعِيفٌ کمزور ہونا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿ضَعْفَ الطَّالِبِ وَالْمَطْلُوبِ﴾ (۷۳-۲۲)

طالب اور مطلوب یعنی (عابد اور معبود دونوں) گئے گزرے ہیں اور اَلضَّعْفُ: رائے کی کمزوری پر بھی بولا جاتا ہے اور بدن اور حالت کی کمزوری پر بھی۔ اور اس میں ضَعْفٌ اور ضَعْفٌ دو لغت ہیں قرآن پاک میں ہے:

سرمایہ اور دوسرے کی محنت ہوتی ہے اور نفع میں دونوں شریک ہوتے ہیں) اَلْمُضَرَّبَةُ: (دلالی رضائی) جس پر بہت سی سلامتی کی گئی ہو۔ اَلتَّضَرُّبُ: اکسانا۔ گویا اسے زمین میں سفر کی ترغیب دی جاتی ہے۔

اَلْأَضْطِرَابُ: کثرت سے آنا جانا، حرکت کرنا یہ معنی ضَرَبَ فِي الْأَرْضِ سے ماخوذ ہیں۔

اِسْتَضْرَبَ النَّاقَةَ: سانڈھ نے ناقہ پر جھتی کھانے کی خواہش کی۔

### (ض ر ع)

اَلضَّرْعُ: اونٹنی اور بکری وغیرہ کے تھن۔ اَضْرَعَتِ الشَّاةُ: قرب ولادت کی وجہ سے بکری کے تھنوں میں دودھ اتر آیا، یہ اَتَمَرَ وَالْبَنَ کی طرح کا محاورہ ہے جس کے معنی ہیں: زیادہ دودھ یا کھجوروں والا ہونا۔ اور شِائَةُ ضَرِيعٌ کے معنی بڑے تھنوں والی بکری کے ہیں۔ مگر آیت کریمہ:

﴿لَيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ إِلَّا مِنْ ضَرِيعٍ﴾ (۸۸-۶۱) اور

خارجھاڑ کے سوا ان کے لیے کوئی کھانا نہیں ہوگا میں بعض نے کہا ہے کہ یہاں ضَرِيعٌ سے خشک شبرق مراد ہے۔ اور بعض نے سرخ بدبودار گھاس مراد لی ہے جسے سمندر باہر پھینک دیتا ہے۔ بہر حال جو معنی بھی کیا جائے اس سے کسی مکروہ چیز کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے۔

ضَرَعَ الْبُيُوتُ: چوپایہ کے بچہ نے اپنی ماں کے تھن کو منہ میں لے لیا بعض کے نزدیک اسی سے ضَرَعَ الرَّجُلُ ضَرَاعَةً کا محاورہ ہے جس کے معنی کمزور ہونے اور ذلت کا

① قاله مجاهد و نسب بعضهم الى الفراء راجع العيني شرح البخاري: (ص ۲۶۵ ج ۱۹)۔

② كذا قال الحليل العيني شرح البخاري: (ص ۲۶۵ ج ۱۹)۔



اور آیت کریمہ:

﴿اللَّهُ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ ضَعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْ بَعْدِ ضَعْفٍ قُوَّةً ثُمَّ جَعَلَ مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ ضَعْفًا﴾ (۵۴-۳۰) خدا ہی تو ہے جس نے تمہیں (ابتداء میں) کمزور حالت میں پیدا کیا پھر کمزوری کے بعد طاقت عنایت کی پھر طاقت کے بعد کمزوری اور بڑھا پادیا۔

میں پہلے ضَعْف سے نطفہ یا مٹی مراد ہے اور دوسری جگہ اس سے وہ کمزوری مراد ہے جو جنین یا طفولیت کے زمانہ میں پائی جاتی ہے اور تیسرے سے وہ ضعف مراد ہے جو بڑھاپے کی عمر میں انسان کو لاحق ہوتا ہے۔ جس کی طرف کہ آیت اَرْذَلِ الْعُمَرِ میں اشارہ کیا گیا ہے اسی طرح پہلی جگہ قُوَّة سے وہ قوت مراد ہے جو بچے کو حرکت کرنے، ہدایت پانے، دودھ مانگنے اور رو کر اپنے آپ سے تکلیف کو دفع کرنے کے لیے عطا کی جاتی ہے اور دوسری جگہ قُوَّة سے مراد وہ قوت ہے جو بلوغت کے بعد عطا ہوتی ہے اور آیت کریمہ میں ضَعْف کو نکرہ لانا اس بات کی دلیل ہے کہ ہر جگہ ضَعْف سے ایک ایسی حالت کی طرف اشارہ ہے جو پہلی حالت کی غیر ہے کیونکہ قاعدہ یہ ہے کہ اسم نکرہ کو مکرر لا کر اگر پہلا معنی مقصود ہو تو اسے معرّفہ بنالیا جاتا ہے جیسے رَأَيْتُ رَجُلًا فَقَالَ لِي الرَّجُلُ كَذَا۔ مگر جب اس نکرہ کو دوبارہ نکرہ ہی لایا جائے تو پہلے معنی کا غیر مراد ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت ابن

عباس رضی اللہ عنہ نے آیت کریمہ:

﴿فَإِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا - إِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا﴾ (۶-۹۳) کی تفسیر میں فرمایا: لَنْ يَغْلِبَ عُسْرٌ

﴿وَعَلِمَ أَنَّ فِيكُمْ ضَعْفًا﴾ (۸-۶۶) اور معلوم کر لیا کہ ابھی تم میں کس قدر کمزوری ہے۔

خلیل کا قول ہے کہ الضَّعِيفُ عقل ورائے کی کمزوری کو کہتے ہیں اور ضَعْفٌ بدنی کمزوری کو، چنانچہ آیت کریمہ: ﴿فَإِنَّ كَانَ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيهًا أَوْ ضَعِيفًا﴾ کا لفظ ضَعْفٌ سے مشتق ہے اور ضَعِيفٌ کی جمع ضِعَافٌ اور ضِعَافٌ آتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿لَيْسَ عَلَى الضَّعَفَاءِ﴾ (۹-۹۱) کمزوروں پر (کچھ گناہ) نہیں ہے۔

إِسْتَضْعَفْتُهُ: میں نے اسے کمزور سمجھا، حقیر جانا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَنُرِيدُ أَنْ نَمُنَّ عَلَى الَّذِينَ اسْتَضَعُّوا﴾ (۲۸-۵) اور ہم چاہتے تھے کہ جنہیں ملک میں کمزور سمجھا گیا ہے ان پر احسان کریں۔

﴿وَالْمُسْتَضَعِّينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ﴾ (۴-۷۵) اور ان بے بس مردوں عورتوں اور بچوں.....

﴿قَالُوا فِيمَا كُنْتُمْ قَالَوْا كُنَّا مُسْتَضَعِّينَ فِي الْأَرْضِ﴾ (۴-۹۷) تو ان سے پوچھتے ہیں کہ تم کس حال میں تھے؟ تو وہ کہتے ہیں کہ ہم ملک میں عاجز اور ناتواں تھے۔

﴿إِنَّ الْقَوْمَ اسْتَضَعُّوْنِي﴾ (۷-۱۵۰) کہ لوگ تو مجھے کمزور سمجھتے تھے۔ اور آیت کریمہ:

﴿يَقُولُ الَّذِينَ اسْتَضَعُّوا لِلَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا﴾ (۳۳-۳۴) اور کمزور لوگ بڑے لوگوں سے کہیں گے، میں اسْتَضَعَّافِ اسْتِكْبَارُ کے مقابلہ میں استعمال ہوا ہے۔

کو دگنی سزا دی جائے گی۔

اور آیت: ﴿وَإِنْ تَكُ حَسَنَةً يُضَاعِفْهَا﴾ (۴-۳۹) اور اگر نیکی (کی) تو اس کو دو چند کر دے گا، میں یضاعف (مفاعله) پڑھا ہے اور کہا ہے کہ اس سے نیکیوں کے دس گنا ہونے کی طرف اشارہ ہے جیسا کہ آیت: ﴿مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ عَشْرُ مَثَلٍ﴾ (۶-۶۷) سے معلوم ہوتا ہے اور بعض نے کہا ہے کہ ضَعَفْتُهُ ضَعْفًا فَهُوَ مَضْعُوفٌ: تخفیف عین کے ساتھ آتا ہے اس صورت میں ضَعَفٌ مصدر ہوگا۔ اور ضَعْفٌ اس جیسا کہ شیعہ اور شیعی ہے اس اعتبار سے ضَعْفُ الشَّيْءِ کے معنی ہیں: کسی چیز کی مثل اتنا ہی اور جس سے وہ چیز دگنی ہو جائے اور جب اس کی اضافت اسم عدد کی طرف ہو تو اس سے اتنا ہی اور عدد یعنی دو چند مراد ہوتا ہے لہذا ضَعْفُ الْعَشْرِ اور ضَعْفُ الْمِائَةِ کے معنی بلا اختلاف ہیں اور دوسو کے ہوں گے چنانچہ اسی معنی میں شاعر نے کہا ہے: ﴿(القبول)﴾

(۲۸۵) جَزَيْتَكَ ضِعْفَ الْوَدِّ لِمَا اشْتَكَيْتَهُ..... وَمَا ان جَزَاكَ الضَّعْفَ مِنْ أَحَدٍ قَبْلِي جب تو نے محبت کے بارے میں شکایت کی تو میں نے تمہیں دوٹی کا دو چند بدلہ دیا اور مجھ سے پہلے کسی نے تمہیں دو چند بدلہ نہیں دیا۔

یُسْرَينِ کو دو سیر پر ایک عسر غالب نہیں آ سکتا۔ ❶

اور آیت کریمہ: ﴿خُلِقَ الْإِنْسَانُ ضَعِيفًا﴾ (۳-۲۸) اور انسان (طبعاً) کمزور پیدا ہوا ہے، میں ضَعِيفًا کے لفظ سے انسان کی شدت احتیاجی کی طرف اشارہ ہے جس سے کہ ”ملا علی“ مستغنی ہوتے ہیں۔

اور آیت کریمہ: ﴿إِنَّ كَيْدَ الشَّيْطَانِ كَانَ ضَعِيفًا﴾ (۴-۷۶) (ذرومت) کیونکہ شیطان کا داؤ کمزور ہوتا ہے۔ میں شیطانی فریب کے کمزور ہونے کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ کے بندوں پر اس کی تدابیر کارگر نہیں ہو سکتیں جیسے فرمایا: ﴿إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ﴾ (۱۷-۶۵) جو میرے (مخلص) بندے ہیں ان پر تیرا کچھ زور نہیں۔

الضَّعْفُ: یہ اسمائے متضایقہ سے ہے یعنی وہ الفاظ جو اپنے مفہوم و معنی کے تحقق میں ایک دوسرے پر مقوف ہوتے ہیں جیسے نَصْفٌ زَوْجٌ اور ضَعْفٌ (دگنا) کے معنی ہیں ایک چیز کے ساتھ اس کے مثل کامل جانا اور یہ اسم عدد کے ساتھ مخصوص ہے اور اَضْعَفْتُ الشَّيْءَ وَضَعْفْتُهُ وَضَاعَفْتُهُ کے معنی ہیں: کسی چیز کو دو چند کر دینا۔ بعض نے کہا ہے کہ ضَاعَفْتُ (مفاعله) میں ضَعَفْتُ (تفعیل) سے زیادہ مبالغہ پایا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ اکثر قراء نے آیت کریمہ: ﴿يُضَاعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ﴾ (۳۰-۳۳) ان

❶ رواه اصحاب الآثار عن ابن مسعود مرفوعاً راجع الشوكاني (۴۶۳/۵) قال في الكشاف و عن ابن عباس مثله ولم اجد له قال الحافظ في تحريجه: ذكرها الفراء عن ابن الكلبي عن ابي صالح عنه و بمعناه مروى عن انس قال السيوطي و منده ضعيف والصحيح عن الحسن به مراسلاً رواه عبد الرزاق عن معمر و عن طريقه اخرجه الحاكم و البيهقي في الشعب و له طريق اخرى اخرجه ابن مردويه من رواية عطية عن جابر موصولاً و اسناده ايضاً ضعيف و في الموطأ عن زيد بن اسلم عن ابيه ان عمر بن الخطاب كتب اليه و قال في الكتاب و لن يغلب عسر يسرين و هذا اصح طرقه راجع تحريج الكشاف للحافظ (۱۸۵-۱۸۶) رقم ۳۳۲ و تفسير ابن كثير (۴: ۵۲۵-۵۲۶) و الطبري (۳۰/۲۳۵-۲۳۶).

❷ قاله ابو ذؤيب الهذلي و في اللسان (ضعف) لما استنبتهم و البت في ديوان الهذليين (۳۵: ۱) و المحاز لابي عبيدة (۴۹/۱) ۲۳۲: ۲/۳۳۲۶ رقم: ۵۸) و المحكم (ضعف) و في روايتها لما استنبتة اي استغلثته و في المحاز الحب بدل الود و الصاجي ۱۷۳ و فيه شاهد على ان لفظة من ياتي زائدة.

دوسرے کو نظر آ رہا ہے۔

کیونکہ عذاب دوسم پر ہے ظاہری اور باطنی۔ ظاہری عذاب تو ایک دوسرے کو نظر آئے گا مگر باطنی عذاب کا ادراک نہیں کر سکیں گے اور سمجھیں گے کہ انہی اندرونی طور پر کچھ بھی عذاب نہیں ہو رہا ہے۔ حالانکہ وہ باطنی عذاب میں بھی مبتلا ہوں گے۔

اور آیت: ﴿لَا تَأْكُلُوا الرِّبَا أَضْعَافًا مُضَاعَفَةً﴾ (۳-۱۳۰) بڑھ چڑھ کر سود در سود نہ کھاؤ۔

میں بعض نے کہا ہے کہ أَضْعَافًا کے بعد مُضَاعَفَةً کا لفظ بطور تاکید لایا گیا ہے مگر بعض نے کہا ہے کہ مُضَاعَفَةً کا لفظ ضَعْفٌ (بفتح الضاد) سے ہے جس کے معنی کمی کے ہیں پس آیت کے معنی یہ ہیں کہ سود، جسے تم افزونی اور بیشی سمجھ رہے ہو یہ دراصل بڑھانا نہیں ہے بلکہ کم کرنا ہے جیسے فرمایا: ﴿يَمْحَقُ اللَّهُ الرِّبَا وَيُزِيلُ الصَّدَقَاتِ﴾ (۲-۲۷۶) کہ اللہ تعالیٰ سود کو کم کرتا اور صدقات کو بڑھاتا ہے۔

چنانچہ اسی معنی کے پیش نظر شاعر نے کہا ہے۔ (الطویل)  
(۲۸۶) زِيَادَةُ شَيْبٍ وَهِيَ نَقْصُ زِيَادَتَيْ  
کہ بڑھاپے کی افزونی دراصل عمر کی کمی ہے۔

### (ض غ ث)

الضَّغْتُ: ریحان، خشک گھاس یا شاخیں جو انسان کی مٹھی میں آجائیں اس کی جمع اَضْغَاتٌ آتی ہے۔  
قرآن پاک میں ہے:  
﴿خُذْ بِيَدِكَ ضِغْتًا﴾ (۳۸-۴۲) اپنے ہاتھ میں مٹھی بھر گھاس لو۔

اور اَضْعَفُ ضِعْفِي وَاحِد کے معنی یہ ہیں کہ اسے سہ چند دے دو کیونکہ اس کے اصل معنی یہ ہیں کہ ایک اور اس کے ساتھ دو اور دے دو اور یہ کل تین ہو جاتے ہیں مگر یہ معنی اس صورت میں ہوں گے جب ضَعْفٌ کا لفظ مضاف ہو ورنہ بدل اضافت کے ضَعْفَيْن کے معنی تو زوجین کی طرح دو گنا ہی ہوں گے لیکن جب واحد کی طرف مضاف ہو کر آئے تو تین گنا کے معنی ہوتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَأَلَيْكَ لَٰهُمْ جَزَاءُ الضَّعْفِ﴾ (۳۳-۳۷) ایسے لوگوں کو دو گنا بدلہ ملے گا۔

اور آیت کریمہ: ﴿فَاتِيهِمْ عَذَابًا ضِعْفًا مِّنَ النَّارِ﴾ (۷-۳۸) تو ان کو آتش جہنم کا دو گنا عذاب دے۔

میں دو گنا عذاب مراد ہے یعنی دوزخی، باری تعالیٰ سے مطالبہ کریں گے کہ جن لوگوں نے ہمیں گمراہ کیا تھا انہیں ہم سے دو گنا عذاب دیا جائے ایک تو ان کے خود گمراہ ہونے کا اور دوسرے ہمیں گمراہ کرنے کا جیسا کہ آیت کریمہ:

﴿لِيُحْمَلُوا أَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَمِنْ أَوْزَارِ الَّذِينَ يُضِلُّونَهُمْ﴾ (۱۶-۲۵) یہ قیامت کے دن اپنے اعمال کے پورے بوجھ بھی اٹھائیں گے اور جن کو یہ بے تحقیق گمراہ کرتے ہیں ان کے بوجھ بھی اٹھائیں گے۔

سے مفہوم ہوتا ہے پھر اس کے بعد ﴿لِكُلِّ ضِعْفٍ وَلَكِنْ لَا تَعْلَمُونَ﴾ (۷-۳۸) کہہ کر بتایا کہ ان میں سے ہر ایک کو تم سے دو گنا عذاب دیا جائے گا۔

بعض نے اس کے یہ معنی بیان کیے ہیں کہ تم اور ان میں سے ہر ایک کو اس سے دو گنا عذاب ہو رہا ہے جتنا کہ

① قاله المتنبی فی قصیدة له ۳۶ بیتا یمدح فیہا احمد بن الحسین ابو الفرج القاضی المالکی (۷۷-۸۰) مطلعها: لعنہ ام غادۃ رفع السحف لوحشیة لاما لوحشیة شنف و عجزه وقوة عشق وهی من قوتی ضعف والبت فی دیوان (۷۷) (طبعة هندیة مصر ۱۳۴۲)۔

فَإِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ﴿١٥-١٤﴾ جو شخص ہدایت اختیار کرتا ہے تو اپنے لیے اختیار کرتا ہے اور گمراہ ہوتا ہے تو گمراہی کا ضرر بھی اسی کو ہوگا۔

اور ضَلَّالٌ کا لفظ ہر قسم کی گمراہی پر بولا جاتا ہے یعنی وہ گمراہی قصداً ہو یا سہواً معمولی ہو یا زیادہ۔ کیونکہ طریق مستقیم، جو پسندیدہ راہ ہے..... پر چلنا نہایت دشوار امر ہے جیسا کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ﴿١١﴾ ((اَسْتَقِيمُوا وَلَكِنْ تَحْضُوا)) کہ استقامت اختیار کرو اور تم پورے طور پر اس کی نگہداشت نہیں کر سکو گے۔

حکماء نے کہا ہے کہ صحت و راستی کی راہ تو صرف ایک ہی ہے مگر گمراہی کے متعدد راستے ہیں کیونکہ استقامت اور صواب کی مثال تیر کے ٹھیک نشانہ پر بیٹھ جانے کی ہے اور صحیح نشانہ کے علاوہ ہر جہت کا نام ضلالت ہے۔

ہمارے اس قول کی تائید بعض صالحین کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے کہ انہوں نے آنحضرت ﷺ کو خواب میں دیکھا اور عرض کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جناب کے اس فرمان کے کیا معنی ہیں: ﴿١٢﴾ ((مَسِيحِيْنِيْ سُوْرَةَ هُوْدٍ وَاٰخَوَاتِهَا)) کہ سورہ ہود اور اس کی ہم مثل دوسری سورتوں نے مجھے بوڑھا کر دیا ہے۔ تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا: سورہ ہود کی جس آیت نے مجھے بوڑھا کر دیا وہ آیت: ﴿فَاَسْتَقِمْ كَمَا اُمِرْتُ﴾ ﴿١١-١٢﴾ ہے یعنی اے پیغمبر!

اسی سے ایسے خواب کو، جو ملتیس سا ہو اور اس کا مطلب واضح نہ ہو، اَضْغَاثُ اَحْلَامِ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿قَالُوا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ﴾ ﴿١٢-١٣﴾ انہوں نے کہا یہ تو پریشان سے خواب ہیں۔

یعنی پریشان اور بے معنی خوابوں کے پلندے ہیں۔

## (ض غ ن)

الضَّغْنُ وَالضَّغْنُ: سخت کینہ اور انتہائی بغض۔

اس کی جمع اَضْغَانٌ آتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿اِنَّ لَّنْ يُخْرِجَ اللّٰهُ اَضْغَانَهُمْ﴾ ﴿٣٤-٣٩﴾ کہ خدا ان کے کینوں کو ظاہر نہیں کرے گا۔

پھر بطور تشبیہ اس اونٹنی کو جو بدوں مار پٹائی کے صحیح حال نہ چلے اسے نَاقَةٌ ذَاتُ ضِغْنٍ کہا جاتا ہے اسی طرح ٹیڑھے نیزے کو قَنَاطَةٌ ضِغْنَةٌ کہہ دیتے ہیں۔

الْاَضْغَانُ: (افعال) کپڑا یا السحہ وغیرہ پہن کر اس میں مستور ہو جانا۔

## (ض ل ل)

الضَّلَالُ: کے معنی سیدھی راہ سے ہٹ جانا کے

ہیں۔ اور یہ ہدایت کے بالمقابل استعمال ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَمَنْ اهْتَدَىٰ فَإِنَّمَا يَهْتَدِي لِنَفْسِهِ وَمَنْ ضَلَّ

① (حم، ك، حق) عن ثوبان (طب) عن ابن عمرو (طب) عن سلمة ابن الأكوع (الفتح الرباني ج ١، ص ١٨١)۔

② الحديث في ابن مردويه عن انس (وفي الطبراني عن أبي بكر و ابن عساكر عن محمد بن علي مرسل) هود و اخواتها بغير لفظ السورة والحديث ايضاً في الكشاف راجع تخريج الكشاف ٨٧ رقم ١٩٥ وفي تخريج العراقي۔ أخرجه الترمذی فی الشمائل من حديث ابن حنيفة وللحاکم من حديث ابن عباس نحوه قال الترمذی حسن و قال الحاکم صحيح على شرط البخاری (٢٩٧/٢) و ١٧٠/٤) و قد اطلال الكلام عليه الدارقطني في الملل و فی الكامل لابن عدى من رواية يزيد الرقاشي عن انس و ليس فيه ذكر هود و اخواتها بل الواقعة والقارعة وغيرها من السور۔

ایک بھول جائے گی۔ میں تَضَلَّ کے معنی بھول جانا کے ہیں اور یہی وہ نسیان ہے جسے غفور قرار دیا گیا ہے۔<sup>①</sup> ایک دوسرے اعتبار سے ضَلَاۃً کی دو قسمیں ہیں (۱) علوم نظریہ یعنی توحید و نبوت وغیرہما کی معرفت میں غلطی کرنا چنانچہ آیت کریمہ:

﴿وَمَنْ يَكْفُرْ بِاللَّهِ وَمَلٰٓئِكَتِهِ وَرُسُلِهِ وَالْيَوْمِ  
الْآخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰٓا۟لًاۢ بَعِيْدًا﴾ (۳-۱۲۶) اور جو شخص خدا اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور روز قیامت سے انکار کرے وہ رستے سے بھٹک کر دور جا پڑا۔ میں اس قسم کی گمراہی کو ضَلَا۟لًاۢ بَعِيْدًا کہا گیا ہے۔

(۲) علوم عملیہ میں ضلالت ہے جس کے معنی ہیں احکام شرعیہ یعنی عبادات اور معاملات کی معرفت میں غلطی کرنا اور آیت مذکورہ میں ضَلَا۟لًاۢ بَعِيْدًا سے اس کے کفر ہونے کی طرف اشارہ ہے جیسا کہ آیت کے ابتداء وَمَنْ يَكْفُرْ اور آیت:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ قَدْ ضَلُّوْا  
ضَلٰٓا۟لًاۢ بَعِيْدًا﴾ (۴-۱۶) جن لوگوں نے کفر کیا اور دوسروں کو خدا کے رستے سے روکا، وہ رستے سے بھٹک کر دور جا پڑے، سے معلوم ہوتا ہے۔ اور آیت: ﴿فِي الْعَذَابِ  
وَالضَّلٰلِ الْبَعِيْدِ﴾ (۲۳-۸) میں بھی یہی معنی مراد ہیں۔ اور فسی کے معنی یہ ہیں کہ اس گمراہی کی سزا میں گرفتار ہوں گے اور یہی معنی آیت: ﴿اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا ضٰلٰلٍ كٰبِيْرٍ﴾

(۶۷-۹) میں مراد ہیں۔ نیز فرمایا: ﴿قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَاَضَلُّوْا كَثِيْرًا وَّضَلُّوْا عَنْ  
سَوَآءِ السَّبِيْلِ﴾ (۵-۷۷) جو (خود بھی) پہلے خود گمراہ ہوئے اور بھی بہت کو گمراہ کیا اور سیدھی راہ سے بھٹک

ٹھیک اسی طرح سیدھے رہو جیسا کہ تمہیں حکم دیا گیا ہے۔ جب کہ ضلال کے معنی سیدھی راہ سے ہٹ جانا کے ہیں، خواہ وہ ہٹنا عمدہ ہو یا سہواً، تھوڑا ہو یا زیادہ۔ تو جس سے بھی کسی قسم کی غلطی سرزد ہوگی اس کے متعلق ہم ضلالت کا لفظ استعمال کر سکتے ہیں یہی وجہ ہے کہ انبیاء کرام اور کفار دونوں کی طرف ضلالت میں بون بعید پایا جاتا ہے۔ دیکھئے آنحضرت ﷺ کو آیت کریمہ:

﴿وَوَجَدَكَ ضٰلًّا لَا فَهْمٰی﴾ (۹۳-۷) میں ضالا فرمایا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ ہدایت نبوت کے عطا ہونے سے قبل تم اس راہ نمائی سے محروم تھے اور حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارے میں ان کی اولاد کا یہ کہنا: ﴿اِنَّكَ لَفِي ضَلٰلِكَ الْقَدِيْمِ﴾ (۱۲-۹۵) کہ آپ اسی پرانی غلطی میں (بتلا) ہیں۔ یا یہ کہنا: ﴿اِنَّ اَبَانَا لَفِي ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ﴾ (۱۲-۸) کچھ شک نہیں کہ باصرہ غلطی پر ہیں۔ تو ان آیات میں ضلال سے مراد یہ ہے کہ وہ یوسف علیہ السلام کی محبت اور ان کے اشتیاق میں سرگرداں ہیں۔ اسی طرح آیت کریمہ: ﴿قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا اِنَّ لَنَا اَهَا۟ فِی ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ﴾ (۱۲-۳۰) اس کی محبت ان کے دل میں گھر کر گئی ہے ہم دیکھتے ہیں کہ وہ صریح گمراہی میں ہیں۔ میں بھی ضلال مبین سے والہانہ محبت مراد ہے۔

اور آیت کریمہ: ﴿وَاَنَا مِنَ الضَّآلِيْنَ﴾ (۲۶-۲۰) اور میں خطا کاروں میں تھا۔

میں موسیٰ علیہ السلام نے اپنے ضال ہونے کا اعتراف کر کے اشارہ کیا ہے کہ قتل نفس کا ارتکاب مجھ سے سہواً ہوا تھا۔ اور آیت:

﴿اَنْ تَضِلَّ اِحٰدَهُمَا﴾ (۲-۲۸۲) اور اگر ان میں سے

① ای فی الحدیث: رُفِعَ عَنْ اَمْنِیِ الْخَطَا وَالنِّسْيَانِ وَمَا اسْتَكْرَهُ عَلَیْهِ (الطبرانی عن ثوبان).

گئے۔ اور آیت کریمہ:

﴿إِذَا ضَلَلْنَا فِي الْأَرْضِ﴾ (۱۰-۳۲) کے معنی یہ ہیں کہ جب مرنے کے بعد مٹی میں مل کر ضائع ہو جائیں گے۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَالضَّالِّينَ﴾ (۱-۷) کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ اس سے نصاریٰ مراد ہیں۔ اور آیت کریمہ:

﴿لَا يَضِلُّ رَبِّي وَلَا يَنسَى﴾ (۵۲-۲۰) کے معنی ہیں: لَا يَضِلُّ عَنْ رَبِّي وَلَا يَضِلُّ رَبِّي عَنْهُ ہیں یعنی میرے پروردگار کو کوئی چیز غافل نہیں کرتی اور آیت:

﴿أَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِي تَضْلِيلٍ﴾ (۱۲-۱۰۵) کیا ان کی تدبیر کو ضائع نہیں کیا گیا۔

میں فِی تَضْلِيلٍ کے معنی ضائع کر دینا اور غلط راہ پر لگا دینا کے ہیں

الْإِضْلَالُ (یعنی دوسرے کو گمراہ کرنے کی دو صورتیں ہو سکتیں ہیں۔ ایک یہ کہ اس کا سبب خود اپنی ضلالت ہو۔ یہ دو قسم پر ہے:

(۱) ایک یہ کہ کوئی چیز ضائع ہو جائے۔ مثلاً: کہا جاتا ہے أَضَلَلْتُ الْبَعِيرَ: میرا اونٹ کھو گیا۔

(۲) دوم کہ دوسرے پر ضلالت کا حکم لگانا ان دونوں صورتوں میں اِضْلَالُ کا سبب ضلالت ہی ہوتی ہے۔ دوسری صورت اِضْلَالُ کی پہلی کے برعکس ہے، یعنی اِضْلَالُ بذاتہ، ضلالت کا سبب بنے اسی طرح پر کہ کسی انسان کو گمراہ کرنے کے لیے باطل اس کے سامنے پر فریب اور جاذب انداز میں پیش کیا جائے جیسے فرمایا:

﴿لَهُمْ طَائِفَةٌ مِنْهُمْ أَنْ يُضِلُّوكَ وَمَا يُضِلُّونَ إِلَّا أَنْفُسَهُمْ﴾ (۱۱۳-۳) ان میں سے ایک جماعت تم کو بہکانے

کا قصد کر رہی چکی تھی اور یہ اپنے سوا کسی کو بہکا نہیں سکتے۔

یعنی وہ اپنے اعمال سے تجھے گمراہ کرنے کی کوشش میں ہیں مگر وہ اپنے اس کردار سے خود ہی گمراہ ہو رہے ہیں۔ اور شیطان کا قول نقل کرتے ہوئے فرمایا:

﴿وَلَا ضِلَّيْنَهُمْ وَلَا مَنِّينَهُمْ﴾ (۱۱۹-۳) اور ان کو گمراہ کرتا اور امیدیں دلاتا رہوں گا۔

اور شیطان کے بارے میں فرمایا:

﴿وَلَقَدْ أَضَلَّ مِنْكُمْ جِبِلًّا كَثِيرًا﴾ (۶۲-۳۶) اور اس نے تم میں سے بہت سی خلقت کو گمراہ کر دیا تھا۔

﴿وَيُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَنْ يُضِلَّهُمْ ضَلَالًا بَعِيدًا﴾ (۶۰-۳) اور شیطان تو چاہتا ہے کہ ان کو بہکا کر رستے سے دور ڈال دے۔

﴿وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوَىٰ فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ﴾ (۲۶-۳۸) اور خواہش کی پیروی نہ کرنا کہ وہ تمہیں خدا کے رستے سے بھٹکا دے گی۔

اللہ تعالیٰ کے انسان کو گمراہ کرنے کی دو صورتیں ہی ہو سکتی ہیں (۱) ایک یہ کہ اس کا سبب انسان کی خود اپنی ضلالت ہو اس صورت میں اللہ تعالیٰ کی طرف اِضْلَالُ کی نسبت کے یہ

معنی ہوں گے کہ جب انسان از خود گمراہ ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے دنیا میں اس پر گمراہی کا حکم ثبت ہو جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ آخرت کے دن اسے جنت کے راستہ سے ہٹا کر دوزخ کے راستہ پر ڈال دیا جائے گا۔

(۲) اور اللہ تعالیٰ کی طرف اِضْلَالُ کی نسبت کے دوسرے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ باری تعالیٰ نے انسان کی جبلت ہی کچھ اس قسم کی بنائی ہے کہ جب انسان کسی اچھے یا برے راستہ کو اختیار کر لیتا ہے تو اس سے مانوس ہو جاتا ہے اور

طرح خدا کافروں کو گمراہ کرتا ہے۔

﴿وَيُضِلُّ اللَّهُ الظَّالِمِينَ﴾ (۱۳-۲۷) اور خدا بے

انصافوں کو گمراہ کر دیتا ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَنُقَلِّبُ أَفْئِدَتَهُمْ﴾ (۶-۱۱۱) اور ہم ان کے دلوں کو

الٹ دیں گے۔

﴿خَتَمَ اللَّهُ عَلَى قُلُوبِهِمْ﴾ (۲-۷۷) (خدا نے ان کے

دلوں پر مہر لگا رکھی ہے۔

﴿فَنَفَى قُلُوبَهُمْ مَرَضٌ فَزَادَهُمُ اللَّهُ مَرَضًا﴾

(۲-۱۰۷) ان کے دلوں میں (کفر کا) مرض تھا خدا نے ان کا

مرض اور زیادہ کر دیا۔

میں دلوں کے پھیر دینے اور ان پر مہر لگا دینے اور ان کی مرض

میں اضافہ کر دینے سے بھی یہی معنی مراد ہیں۔

### (ض م م)

الْضَّمُّ: (ن) کے معنی دوبارہ سے زیادہ چیزوں کو

باہم ملا دینا کے ہیں قرآن پاک میں ہے:

﴿وَاضْمُمْ يَدَكَ إِلَى جَنَاحِكَ﴾ (۲۰-۲۲) اور تم اپنے

بازو کو اپنی بغل سے لگا لو۔

﴿وَاضْمُمْ إِلَيْكَ جَنَاحَكَ﴾ (۲۸-۳۲) اور بازو کو

سٹائے رکھو۔

الْإِضْمَامَةُ: لوگوں کی جماعت، کتابوں کا بنڈل، گھاس

وغیرہ کا گٹھا۔

أَسَدٌ ضَمَضَمٌ وَضَمَاضِمٌ: اس شیر کو کہتے ہیں جو ہر چیز

کو اپنی ذات کے لیے اکٹھا کرنے والا ہو۔ بعض نے اس

کے معنی قوی اور مضبوط بھی کئی ہیں۔

فَرَسٌ سَبَّاقٌ إِلَّا ضَامِمٌ: وہ گھوڑا جو بیک وقت گھوڑوں

کی ایک جماعت سے سبقت لے جانے والا ہو۔

اسے اچھا سمجھنے لگتا ہے اور آخر کار اس پر اتنی مضبوطی سے جم

جاتا ہے کہ اس راہ سے ہٹانا یا اس کا خود سے چھوڑ دینا دشوار

ہو جاتا ہے اور وہ اعمال اس کی طبیعت ثانیہ بن جاتے ہیں

اسی اعتبار سے کہا گیا ہے کہ عادت ”طبیعہ ثانیہ“ ہے۔

پھر جب انسان کی اس قسم کی فطرت اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی

ہے اور دوسرے مقام پر ہم بیان کر چکے ہیں کہ فعل کی نسبت

اس کے سبب کی طرف بھی ہو سکتی ہے لہذا اضلال کی نسبت

اللہ تعالیٰ کی طرف بھی سکتی ہے اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ اللہ

تعالیٰ نے اسے گمراہ کر دیا ورنہ باری تعالیٰ کے گمراہ کرنے

کے وہ معنی نہیں ہیں جو عوام جہلاء سمجھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ

قرآن پاک نے اللہ تعالیٰ کی طرف گمراہ کرنے کی نسبت

اسی جگہ کی ہے جہاں کافر اور فاسق لوگ مراد ہیں نہ کہ مؤمن

بلکہ حق تعالیٰ نے مؤمنین کو گمراہ کرنے کی اپنی ذات سے نفی

فرمائی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

﴿وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُضِلَّ قَوْمًا بَعْدَ إِذْ هَدَاهُمْ﴾

(۹-۱۱۵) اور خدا ایسا نہیں ہے کہ کسی قوم کو ہدایت دینے کے

بعد گمراہ کر دے۔

﴿فَلَن يَضِلَّ أَعْمَالُهُمْ سَيِّئِهِمْ﴾ (۳۸-۴۰) ان

کے عملوں کو ہرگز ضائع نہ کرے گا بلکہ ان کو سیدھے رستے پر

چلائے گا۔

اور کافر اور فاسق لوگوں کے متعلق فرمایا:

﴿فَتَغْسِلُهُمْ وَاضِلَّ أَعْمَالُهُمْ﴾ (۷۷-۸۰) ان کے

لیے ہلاکت ہے اور وہ ان کے اعمال کو برباد کر دے گا۔

﴿وَمَا يُضِلُّ بِهِ إِلَّا الْفَاسِقِينَ﴾ (۲-۳۶) اور گمراہ بھی

کرتا ہے تو نافرمانوں ہی کو۔

﴿كَذَٰلِكَ يُضِلُّ اللَّهُ الْكَافِرِينَ﴾ (۳۰-۷۴) اسی



**(ض ن ک)**

الْضَّنْكَ (ک) کے معنی کسی مقام یا معیشت کی تنگی کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿مَعِيشَةً ضَنْكًا﴾ (۲۰-۱۲۳) ان کی معیشت تنگ ہو جائے گی۔

کہا جاتا ہے: ضَنْكُ عَيْشَةٍ: اس کی معیشت تنگ ہو گئی۔ اِمْرَأَتُهُ ضَنْكًا کھٹیلے جسم والی عورت۔ نیز ضَنْكُكَ کے معنی زکام بھی آ جاتے ہیں۔ اس سے زکام زدہ آدمی کو مَضْنُوكُ کہا جاتا ہے۔

**(ض ه ی)**

الْمُضَاهَاةُ کے معنی مشابہ اور مشاکلت کے ہیں چنانچہ فرمایا:

﴿يُضَاهُونَ قَوْلَ الَّذِينَ كَفَرُوا﴾ (۹-۳۰) یہ بھی انہی جیسی باتیں کرتے ہیں۔

میں يُضَاهُونَ کے معنی يُشَاكِلُونَ ہیں۔ یعنی دوسروں کے مشابہ اور ہم شکل ہونا۔

بعض نے کہا ہے کہ اس کی اصل مہوز ہے اور اس میں ایک قُرَأْتُ (يُضَاهِئُونَ) ہمزہ کے ساتھ بھی منقول ہے۔<sup>۱</sup>

اِمْرَأَةٌ ضَهِيَاءُ: وہ عورت جسے حیض نہ آتا ہو اس کی جمع ضَهِيَّ آتی ہے۔

**(ض و ع)**

الضُّوءُ: کے معنی نور اور روشنی کے ہیں ضَائِلُ النَّارِ وَأَضَائِلُ: آگ روشن ہو گئی اور أَضَائِلُ (افعال) کے معنی روشن کرنا بھی آتے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَلَمَّا أَضَاءَتْ مَاحُولُهُ﴾ (۲-۱۷) جب آگ نے اس کے ارد گرد کی چیزیں روشن کر دیں۔

**(ض م ر)**

الضَّامِرُ: اس چھریے گھوڑے کو کہتے ہیں جس کا دبلا پن لاغری کی وجہ سے نہ ہو بلکہ اس ریاضت کی وجہ سے ہو جو سدھانے کے لیے اس سے کرائی جاتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿عَلَى كُلِّ ضَامِرٍ﴾ (۲۲-۲۷) دہلی سوار یوں پر۔ ضَمَرَ ضُمُورًا وَاضْطَمَرَ فَهُوَ مُضْطَمَرٌ کے معنی لاغر ہو جانا کے ہیں۔ اور ضَمَرْتُهُ کے معنی لاغر کر دینا کے۔ اَلْجُضْمَارُ: گھوڑ دوڑ کا میدان جہاں گھوڑوں کو دوڑانے کی مشق کرائی جاتی ہے۔

الضَّمِيرُ: وہ بات جو تمہارے دل میں ہو اور اس پر اطلاع پانا دشوار ہو اسی وجہ سے کبھی ضمیر کا لفظ قوت حافظہ پر بھی بولا جاتا ہے۔

**(ض ن ن)**

الضَّنَّةُ (س) کے معنی کسی پسندیدہ اور مرغوب شے سے بخل کرنا کے ہیں۔ اس سے عَلَقٌ مَضْنَةٌ وَمَضْنَةٌ کا محاورہ ہے یعنی وہ نفیس چیز جس پر بخل کیا جائے۔ فَلَانٌ ضَنْيٌ بَيْنَ أَصْحَابِي: میرے ساتھیوں میں سے فلاں اس قابل ہے کہ اس پر بخل کیا جائے اور یہ باب ضَرْبٍ وَسَمِعَ دُونوں سے آتا ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے: ضَنْنْتُ بِالشَّيْءِ ضَنْنًا وَضَنْانَةً وَضَنْنْتُ: اور آیت کریمہ:

﴿وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِينٍ﴾ (۸۱-۲۳) کے معنی یہ ہیں کہ خدا کی طرف سے جو وحی ملتی ہے وہ اس (کے عام لرنے) میں بخل نہیں کرتے۔

### (ض ی ع)

ضَاعَ (ض) اَلشَّيْءُ ضَيَّاهَا كے معنی ہیں: کسی چیز کا ہلاک اور تلف کرنا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿لَا تُضِيعْ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ﴾ (۳-۱۹۵) اور (فرمایا) کہ میں کسی عمل کرنے والے کے عمل کو ضائع نہیں کرتا۔

﴿إِنَّا لَا نُضِيعُ أَجْرَ مَنْ أَحْسَنَ عَمَلًا﴾ (۱۸-۳۰) ہم نیک عمل کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتے۔

﴿وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُضِيعَ إِيمَانَكُمْ﴾ (۲-۱۲۳) اور خدا ایسا نہیں جو تمہارے عمل کو یونہی کھو دے۔

﴿لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ﴾ (۹-۱۲۰) خدا نیک کاروں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔

ضَبْعَةُ الرَّجُلِ: کے معنی جانبدار کے ہیں کیونکہ اگر اس کی نگہداشت نہ کی جائے تو وہ ضائع ہو جاتی ہے اس کی جمع ضِیَاعُ آتی ہے تَضِيعُ الرِّيحِ: ہوا کا اس قدر تند ہونا کہ جس چیز پر سے گزرے تلف کرتی چلی جائے۔

### (ض ی ف)

الضَّيْفُ: (ض) دراصل اس کے معنی کسی جانب مائل ہونا کے ہیں۔ کہا جاتا ہے: ضِفْتُ إِلَى كَذَا میں اس کی طرف مائل ہوا أَضِفْتُ كَذَا إِلَى كَذَا: اسے ایک طرف مائل کر دیا۔

ضَافَتِ الشَّمْسُ لِلْغُرُوبِ وَتَضَيَّفَتْ: سورج مائل بغروب ہو گیا۔ وَضَافَ السَّهْمُ وَتَضَيَّفَ عَنِ الْهَدَفِ: تیر نشانہ سے ایک طرف مائل ہو گیا۔

الضَّيْفُ: اصل میں اسے کہتے ہیں جو تمہارے پاس ٹھہرنے کے لیے تمہاری طرف مائل ہو مگر عرف میں ضیافت

﴿كُلَّمَا أَضَاءَ لَهُمْ مَّشْوَفِيهِ﴾ (۲۰-۲) جب بجلی (چمکتی اور) ان پر روشنی ڈالتی ہے تو اس میں چل پڑتے ہیں۔

﴿يَأْتِيَكُمْ بِضِيَاءٍ﴾ (۲۸-۷۱) جو تم کو روشنی لا دے۔ اور سماوی کتابوں کو جو انسان کی رہنمائی کرنے لیے نازل کی گئی ہیں۔ ضیاء سے تعبیر فرمایا ہے۔ چنانچہ (تورات کے متعلق) فرمایا:

﴿وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَىٰ وَهَارُونَ الْفُرْقَانَ وَضِيَاءَ وَذِكْرَىٰ﴾ (۲۱-۲۸) اور ہم نے موسیٰ اور ہارون کو (ہدایت اور گمراہی میں) فرق کر دینے والی اور (سرتاپا) روشنی اور نصیحت (کی کتاب) عطا کی۔

### (ض ی ر)

الضَّيْرُ: (ض) کے معنی مضرت اور گزند کے ہیں اور ضَارَهُ وَضَرَهُ کے ایک ہی معنی ہیں یعنی کسی کو نقصان اور تکلیف پہنچانا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿لَا ضَيْرَ إِنَّا إِلَىٰ رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُونَ﴾ (۲۶-۵) کچھ نقصان (کی بات) نہیں ہم اپنے پروردگار کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔ اور فرمایا:

﴿لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا﴾ (۳-۱۲۰) ان کا فریب تمہیں کچھ نقصان نہ پہنچا سکے گا۔

### (ض ی ز)

آیت کریمہ: ﴿تِلْكَ إِذَا قِسْمَةُ ضِيزَى﴾ (۲۲-۵۳) میں ضِيزَى کے معنی ناقص اور بے انصافی کے ہیں۔ یہ اصل میں ضِيزَى بروزن فُعْلَى ہے۔ یاء کی مناسبت سے ضاد کو مکسور کر دیا گیا ہے۔ کیونکہ بقول بعض کلام عرب میں فُعْلَى کے وزن پر اسم صفت نہیں آتا۔ ❶

کے دوسرے معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ آیت کریمہ:

﴿وَصَاقَ بِهِمْ ذُرْعًا﴾ (۷۷-۱۱) کے معنی ہیں کہ وہ ان کے مقابلہ سے عاجز ہو گئے اور آیات:

﴿وَصَاقَتْ بِهِمُ صَدْرُكَ﴾ (۱۲-۱۱) اور اس خیال سے تمہارا دل تنگ ہو۔ ﴿وَبَضِيقُ صَدْرِي﴾ (۱۳-۲۶) اور میرا دل تنگ ہوتا ہے۔

﴿يَجْعَلُ صَدْرَهُ ضَيْقًا حَرَجًا﴾ (۱۲۵-۶) اس کا سینہ تنگ اور گھٹا ہوا کر دیتا ہے۔ ﴿حَتَّىٰ إِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ أَنْفُسُهُمْ﴾ (۱۱۸-۹) یہاں تک کہ جب زمین باوجود فراخی کے ان پر تنگ ہو گئی اور ان کی جانیں بھی ان پر دو بھر ہو گئیں۔ ﴿وَلَا تَكُ فِی ضَیْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُونَ﴾ (۱۲۷-۶) اور جو یہ بداندیش کرتے ہیں اس سے تنگ دل نہ ہو، میں ضیق بمعنی غم ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَلَا تُضَارُّوهُنَّ لِتُضَيِّقُنَّ عَلَيْهِنَّ﴾ (۶-۲۵) اور ان کو تنگ کرنے کے لیے تکلیف نہ دو، میں تضیق کا لفظ ثان و نفقہ میں بکل اور ول کی تنگی یعنی غم کو شامل ہے۔ اور ضَاقٌ وَأَصَاقٌ فَهُوَ مُضَيِّقٌ کے معنی محتاج ہونا بھی آتے ہیں اور فقر پر بھی ضیق کا لفظ استعمال ہوتا ہے جیسا کہ اس کے بالمقابل غنا کو وَسْعَةٌ سے تعبیر کر لیتے ہیں۔



مہمان نوازی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اصل میں چونکہ یہ مصدر ہے اس لیے عام طور پر واحد جمع دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے مگر کبھی اس کی جمع أَضْيَافٌ وَضُيُوفٌ وَضِیْقَانٌ بھی آ جاتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿هَلْ أَتَاكَ حَدِيثُ ضَيْفِ إِبْرَاهِيمَ﴾ (۲۳-۵۱) بھلا تمہارے پاس ابراہیم علیہ السلام کے مہمانوں کی خبر پہنچی ہے۔

﴿وَلَا تُخْزُونِي فِي ضَيْفِي﴾ (۷۸-۱۱) اور میرے مہمانوں کے بارے میں میری آبرو نہ کھوؤ۔

﴿إِنَّ هَؤُلَاءِ ضَيْفِي﴾ (۶۸-۱۵) یہ میرے مہمان ہیں۔

إِسْتَضَفْتُ فَلَانًا فَاصْأَفْنِي: میں نے فلاں سے مہمان نوازی طلب کی تو میری مہمانی کی ضیفۃ ضیقاً کے معنی کسی کی مہمانی کرنا کے ہیں اور میزبان کو ضایف اور ضیف بھی کہا جاتا ہے۔

علمائے نحو کے نزدیک الْأَصَافَةُ کا لفظ اس امر مجرور کے متعلق استعمال ہوتا ہے جس سے پہلے کوئی اسم (مضاف) ہو۔ اور بعض کے نزدیک اسم اضافی ہر اسم کو کہتے ہیں جس کا ثبوت یا فہم دوسرے پر موقوف ہو۔ جیسے أَبٌ، ابْنٌ، أَخٌ، صَدِیقٌ کہ ان سب کا وجود دوسرے اسماء کے حصول پر موقوف ہے۔ اس لیے اس قسم کے اسماء کو اسماء متضایفہ کہا جاتا ہے۔

### (ض ی ق)

الضَّيْقُ وَالضَّيْقُ کے معنی تنگی کے ہیں اور یہ سَعَةً کی ضد ہے اور ضِیْقَةٌ کا لفظ فقر، بخل، غم اور اس قسم

## کتاب الطَّاءِ

### (ط ب ع)

یا طَبِيعَةً کہا جاتا ہے کیونکہ وہ بھی دل پر بمنزلہ نقش کے ہوتی ہے۔ عام اس سے کہ پیدا کئی ہو یا عادت ہونے کے اعتبار سے لیکن عام طور پر اس کا استعمال خلقی عادت پر ہوتا ہے۔ اسی بنا پر کہا گیا ہے۔

(۲۸۷) فَنَابَى الطَّبَاعُ عَلَى النَّاقِلِ

کہ طبعیت کا بدلنا ممکن نہیں ہے۔

اور اللہ تعالیٰ نے آگ یا کسی دوا کا جو مزاج بنایا ہے اس خصوصی مزاج کو ان کی طبعیت کہا جاتا ہے۔

اور طَبِيعُ السَّيْفِ کے معنی تلوار کا رنگ اور میل کچیل کے ہیں۔ رَجُلٌ طَبِيعٌ گندے اخلاق والا چنانچہ بعض نے آیات:

﴿طَبَعَ اللَّهُ عَلَى قُلُوبِهِمْ﴾ (۹-۹۳) خدا نے ان کے

دلوں پر مہر کر دی۔ اور ﴿كَذَلِكَ يَطْبَعُ عَلَى قُلُوبِ

الْكَافِرِينَ﴾ (۷-۱۰۱) اسی طرح خدا کافروں کے دلوں پر

مہر لگا دیتا ہے۔

میں طَبِيعُ کے معنی دلوں کو رنگ آلود یعنی گندہ کر دینا کے

ہیں۔ جیسا کہ دوسرے مقام پر فرمایا:

﴿بَلْ رَأَى عَلَى قُلُوبِهِمْ﴾ (۸۳-۱۳) بلکہ ان کے

دلوں پر رنگ بیٹھ گیا ہے۔

﴿أُولَئِكَ الَّذِينَ لَمْ يُرِدِ اللَّهُ أَنْ يَهْدِ قُلُوبَهُمْ﴾

الطَّبِيعُ: (ف) کے اصل معنی کسی چیز کو (ڈھال کر) کوئی شکل دینا کے ہیں۔ مثلاً طَبِيعُ السَّيْفِ وَطَبِيعُ الدَّرَاهِمِ: یعنی سکہ یا دراہم کو ڈھالنا یہ ختم سے زیادہ عام اور نقش سے زیادہ خاص ہے اور وہ آلہ جس سے مہر لگائی جائے اسے طَبِيعٌ وَخَاتَمٌ کہا جاتا ہے اور مہر لگانے والے کو طَبِيعٌ مگر کبھی یہ طَبِيعُ کے معنی میں بھی آ جاتا ہے اور یہ نِسْبَةُ الْفِعْلِ إِلَى الْأَلْثَمَةِ قَبِيل سے ہے۔ جیسے سَيْفٌ قَاطِعٌ۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَطَبِعَ عَلَى قُلُوبِهِمْ﴾ (۶۳-۴) تو ان کے دلوں پر

مہر لگا دی۔

﴿كَذَلِكَ يَطْبَعُ اللَّهُ عَلَى قُلُوبِ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ﴾

(۳۰-۵۹) اسی طرح خدا ان کے دلوں پر جو سمجھ نہیں

رکھتے مہر لگا دیتا ہے۔

﴿كَذَلِكَ نَطْبَعُ عَلَى قُلُوبِ الْمُعْتَدِلِينَ﴾ (۱۰-۷۴)

اسی طرح ہم زیادتی کرنے والوں کے دلوں پر مہر لگا دیتے ہیں۔

اور یہ بحث آیت: ﴿خَتَمَ اللَّهُ عَلَى قُلُوبِهِمْ﴾ میں گزر

چکی ہے۔

اور نقش کرنے کے اعتبار سے سَجِيَّةٌ (خلقی عادت) کو طَبِيعٌ

① راجع (خ ت م)۔

② قاله المتنبي في قصيدة له يمدح فيها سيف الدولة ويذكر استنقاذه ابا وائل من امر الخوارج مطلعها ولي م طماعية العادل ولا رأى في الحب للعادل والبيت في ديوانه ۲۰۷ (طبعة هندية مصر ۱۳۴۲، ۱۹۲۳) وصدر البيت يراد من القلب نسيانكم وانظر للبيت ايضاً محاضرات المؤلف (۲-۱۰۲) في ثلاثة وشرح ادب الدنيا والدين للماوردي ۱۸۲۔

میں استعمال ہونے لگے ہوں۔ جیسے کَأَسْ وَنَادِيَّةٌ  
وَعَبْرُهُمَا چنانچہ آیت کریمہ:

﴿الَّذِي خَلَقَ سَبْعَ سَمَوَاتٍ طِبَاقًا﴾ (۳-۶۷) کے  
معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے سات آسمان اوپر تلے بنائے  
ہیں۔ اور آیت کریمہ:

﴿الَّذِي خَلَقَ سَبْعَ سَمَوَاتٍ طِبَاقًا﴾ (۱۹-۸۴) کے معنی یہ ہوں  
گے کہ تم ایک منزل سے دوسری منزل کی طرف بلند ہوتے  
چلے جاؤ گے اور یہ ان مختلف احوال و مراتب کی طرف اشارہ

ہے جن پر سے انسان گذر کر ترقی کے منازل طے کرتا ہے  
اور اس تدریجی ارتقاء کی طرف آیت: ﴿وَاللَّهُ خَلَقَكُمْ  
مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُطْفَةٍ.....﴾ (۱۱-۲۵) اور خدا

ہی نے تم کو مٹی سے پیدا کیا پھر نطفے سے، میں اشارہ  
فرمایا ہے نیز آخرت میں حشر و نشر، حساب و کتاب اور پل  
صراط سے لے کر جنت اور دوزخ میں پہنچنے تک جو مختلف

حالات انسان کو پیش آنے والے ہیں ان کی طرف بھی اشارہ  
ہو سکتا ہے اور ایک جماعت جو باہم مطابقت اور موافقت رکھتی  
ہو اس کے متعلق کہا جاتا ہے۔ هُمْ فِيْ اُمِّ طَبَقٍ نِيزْ كَمَا جَا تَا

ہے۔ النَّاسُ طَبَقَاتٌ: لوگوں کے مختلف طبقے ہیں طَابَقَتْهُ  
عَلَى كَذَا وَتَطَابَقُوا وَاطْبَقُوا عَلَيْهِ: باہم مطابق ہونا  
اسی سے جَوَابٌ يَطَابِقُ السُّوَالُ کا محاورہ ہے۔ یعنی جواب

سوال کے عین مطابق ہے۔  
الْمُطَابَقَةُ: اس آدمی کی طرح چلنا جس کے پاؤں میں بیڑیاں

(۴۱-۵) یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں کو خدا نے پاک کرنا  
نہیں چاہا۔

بعض نے کہا ہے کہ طَبَعْتُ النَّمِيَّالَ کے معنی ہیں: میں  
نے پیانے کو لبالب بھر دیا کیونکہ اس کا بھر جانا بھی گویا اس  
بات کی علامت ہوتی ہے کہ اس میں اب کوئی اور چیز نہیں  
آ سکتی اور طَبَعُ بمعنی مَطْبُوعٌ بھرا ہوا آتا ہے۔ شاعر نے کہا  
ہے۔ (زل)

(۲۸۸) كَرَوَا يَاطِبْعِ هَمَّتْ بِالْوَحْلِ  
ان کی حالت ان اونٹوں کی سی تھی جن پر پانی کے مشکیزے  
لدے ہوئے ہوں اور وہ لدل میں پھنس جائے۔

### (ط ب ق)

الْمُطَابَقَةُ: اسماء متضایفہ سے ہے جس کے معنی  
ایک چیز کے اوپر اس کے برابر دوسری چیز رکھنا۔ اسی سے  
طَابَقْتُ النَّعْلَ ہے جس کے معنی کسی کے نقش قدم پر چلنا  
کے ہیں۔

شاعر نے کہا ہے۔

(۲۸۹) إِذَا لَا وَذَالِ الظَّلِّ الْقَصِيرِ بِحَقِّهِ..... وَكَانَ  
طِبَاقِي الْخُفِّ أَوْ قُلْ زَائِدًا

پھر طِبَاقَ کا لفظ اس چیز کے متعلق استعمال ہوتا ہے جو  
دوسری کے اوپر ہو اور کبھی اس چیز کو کہتے ہیں جو دوسری کے  
مطابق اور موافق ہو جیسا کہ تمام ان الفاظ کا حال ہے جو  
دو معنوں کے لیے وضع کیے گئے ہیں اور پھر کسی ایک معنی

① قاله ليبيد في اللذين حاجوه عند النعمان بن المنذر فاد حض حجتهم حتى زلقوا فلم يكلموا فشيهم بروايا مثقلة ارتطمت في  
الوحد فلم تستطع العروج و اوله: فتولوا فاترا معهم ..... وقبله: والهابيق قيام معهم كل محمود اذا صب همل- والبيت في  
اللسان والحكم (طبع، روى) ديوانه ۳۸ الاقتضاب ۳۸۴ وتهذيب الالفاظ (۱: ۱۱) والاصلاح يعقوب ۸ والمعاني للقتبي ۴۶۷  
قال في الاصطلاح: الطبع النهر وجمعه اطباع وطبوع قال ليبيد..... كذا قال الاصمعي ۱۲.  
② والبيت ايضا في التاج بغير عزو.

(۲۹۰) طَحَايِكَ قَلْبٌ فِي الْحَسَنِ طَرُوبٌ  
تجھے حسن پرست دل کہاں سے کہاں لے گیا۔

### (ط ر ح)

الطَّرْحُ کے معنی کسی چیز کو پھینکنے اور دور کر دینے کے  
ہیں اور دور دراز مقام کو الطَّرُوحُ کہا جاتا ہے۔ محاورہ ہے:  
رَأَيْتُهُ مِنْ طَرَحٍ: میں نے اسے دور سے دیکھا۔

الطَّرْحُ: پھینکی ہوئی چیز جس کی کسی کو ضرورت نہ ہو  
قرآن میں ہے:

﴿أَقْتُلُوا يُوسُفَ أَوْ اطْرَحُوهُ أَرْضًا﴾ (۱۲-۹) تو  
یوسف کو یا تو جان سے مار ڈالو یا کسی دور دراز ملک میں  
پھینک آؤ۔

### (ط ر د)

الطَّرْدُ: (ن) کسی کو حقیر اور ذلیل سمجھ کر دور کر دینا،  
ہٹا دینا کہا جاتا ہے: طَرَدْتُهُ: میں نے اسے بھگا دیا۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿وَيَقَوْمٌ مَنْ يَنْصُرُنِي مِنَ اللَّهِ إِنْ طَرَدْتُهُمْ﴾  
(۱۱-۳۰) برادران ملت! اگر میں ان کو نکال دوں تو عذاب خدا  
سے کون میری مدد کر سکتا ہے۔

﴿وَلَا تَطْرُدِ الَّذِينَ﴾ (۵۲-۶) اور ان کو مت نکالو۔

﴿وَمَا أَنَا بِطَارِدِ الْمُؤْمِنِينَ﴾ (۲۹-۱۱) اور میں ان

پڑی ہوں الطَّيِّقُ وَالطَّبَاقُ: (۱) تھالی یا طباق جس پر پھل  
رکھتے ہیں۔ (۲) ہر چیز کا ڈھکنا (۳) پیٹھ کے مہروں میں سے  
ہر مہرہ کو طَبَقُ کہا جاتا ہے کیونکہ وہ باہم مطابق ہوتے ہیں اور  
طَبَقَتُهُ بِالسَّيْفِ کا محاورہ بھی مُطَابَقَةُ النُّعْلِ کی مناسبت سے  
استعمال ہوتا ہے اور اس کے معنی ہیں: میں نے ٹھیک اس کے  
جوڑ میں تلوار ماری اور اسے الگ کر دیا۔

طَبَقُ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ: (رات اور دن کی ساعات جو باہم مطابق  
ہوں۔ اُطْبَقْتُ عَلَيْهِ الْبَابُ: میں نے اس پر دروازہ بند کر دیا  
رَجُلٌ عَيَاءٌ طَبَاقًا: آنکھ بروئے رخن بستہ گرد۔ یہ اُطْبَقْتُ  
الْبَابُ کے محاورہ سے ماخوذ ہے اور فَحُلُ طَبَاقًا اس سائنڈھ کو  
کہتے ہیں جو جفتی سے عاجز ہو اور بڑی مصیبت کو بِنْتُ الطَّبَقِ کہا  
جاتا ہے۔ مثل مشہور ہے وَافَقَ شَيْئٌ طَبَقَةً کہ شے طبقہ کے  
موافق ہوگی اور شَيْئٌ وَطَبَقَةٌ دو قبیلوں کے نام ہیں۔<sup>۱</sup>

### (ط ح و) (ی)

طحو اور دحو دونوں ہم معنی ہیں اور ان کے معنی  
کسی چیز کو پھیلانے اور لے جانے کے ہیں۔ قرآن پاک  
میں ہے:

﴿وَالْأَرْضِ وَمَا طَحَاهَا﴾ (۹۱-۶) اور قسم زمین اور  
اس کی جس نے اسے پھیلایا۔

شاعر نے کہا ہے۔ ﴿الطَّوِيلُ﴾

۱ مثل يضرب للمتنوافقين في امرنا نظر لقصة المثل الميداني (۳۰۹/۲) واللسان (طريق) واصلاح يعقوب ۳۲۲ وفي تاريخ الطبري ۱۲ بيتا قالها حبيب بن خدره مولیٰ هلال بن عامر والمثل في المحاضرات (۲۱۵/۳) وبعده: وافقه فاعتقه والصباح.

۲ قاله علقمة بن الفحل وتمامه: بعد الشباب عصر حان مشيب والبيت من كلمة مفضي له في ۳۳ بيتا يمدح فيها الحارث بن جبلة الغساني وكان قد اسره في مأه من تميم وهما من احلى مشهوراته الثلاث راجع العملة لابن رثيق (۱۰۳-۱۰۴) والنظر لبيت شواهد المعنى (۱۰۵: ۴/۱۵: ۳) والشعر ۵۰۲، ۱۱۰ وشواهد الشغية ۴۹۶ والعملة (۵۷: ۱) والمعاهد (۱۷۳: ۱) واخذاد سجستاني ۱۴۹ وابن الاباري ۳۹۴ وابن ابی الطیب ۴۶۰ والعقد الثمين ۱۰۵ وایام العرب ۵۵ والمعلقات بشرح ابن الاباري ۱۷۶ وایامی ابن الشجرى (۲۶۷: ۲) والاعانی (۱۱۲: ۲/۲: ۱۴) والموشح ۹۳ واللسان (طحا) ومختار الجاهلی (۳۱۹: ۱) الطبقات لابن سلام ۵۱ وعلمه من ثلاث روايع لا يفوقهن شعر ۱۲.

﴿قَبْلَ أَنْ يَرْتَدَّ إِلَيْكَ طَرْفُكَ﴾ (۴۰-۲۷) میں آپ کی آنکھ جھپکنے سے پہلے پہلے، اور آیت کریمہ: ﴿فِيهِنَّ قَاصِرَاتُ الطَّرْفِ﴾ (۵۶-۵۵) ان میں سچی نگاہ والی عورتیں ہیں، میں قَاصِرَاتُ الطَّرْفِ کے معنی یہ ہیں کہ عقیف ہونے کی وجہ سے ان کی نگاہیں ہمیشہ نیچے جھکی رہتی ہیں۔

طَرْفُ فَلَانُ اس کی نظر کو صدمہ پہنچا، اور آیت کریمہ: ﴿لَيَقْطَعَ طَرْفًا﴾ (۱۲۷-۳) تاکہ ایک جماعت کو ہلاک کر دے میں قطع کرنے کو ایک طرف کے ساتھ مخصوص کرنے کی وجہ یہ ہے کہ کسی چیز کو نابود کرنے کے لیے اس کی جانب سے شروع ہوا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ آیت:

﴿نَنْقُصُهَا مِنْ أَطْرَافِهَا﴾ (۴۱-۱۳) ہم زمین کو اس کے کناروں سے کم کرتے چلے آتے ہیں میں بھی کم کرنے کو اطراف کے ساتھ مخصوص کیا ہے۔

الْأَطْرَافُ: کے معنی چری خیمہ کے ہیں، جس کے اطراف کو اوپر اٹھا دیا جاتا ہے۔

مِطْرَفُ الْخَزْرِ وَمِطْرَفُ مَنَاقِلَ جَدَارِ جَس کے کنارے ریشمی ہوں۔ ج مَطَارِفُ۔ اَطْرَفْتُ مَا لَا: میں نے تازہ مال حاصل کیا۔

نَاقَةُ طَرْفَةٍ وَمُسْتَرْفَةٌ وہ اونٹنی جو اونٹ کی طرح چراگاہ کے اطراف سے گھاس کھائے اور جو گھاس وہ جانور کھاتا ہے اسے طَرْفٌ کہا جاتا ہے اور طَرْفٌ کے معنی نیا حاصل کردہ مال بھی آتے ہیں۔ نیز جو شخص ایک عورت پر صبر نہ کرے اسے بھی طَرْفٌ کہہ دیتے ہیں۔

الطَّرْفُ: عمدہ نسل کا گھوڑا جس کے حسن کے سبب اس کی طرف نگاہیں اٹھتی ہوں دراصل طَرْفٌ بمعنی مَطْرُوفٌ آتا

مومنین کو حقیر سمجھ کر اپنے پاس سے نکالنے والا بھی نہیں ہوں۔ ﴿فَتَطْرُدْهُمْ فَتَكُونُ مِنَ الظَّالِمِينَ﴾ (۵۲-۶) اگر ان کو نکالو گے تو ظالموں میں ہو جاؤ گے۔

أَطْرَدَهُ السُّلْطَانُ وَطَرَدَهُ: بادشاہ نے اسے شہر بدر کر دیا اور جہاں سکونت پذیر تھا وہاں سے نکال دینے کا حکم صادر فرمایا۔ طَرَدَ وَطَرَيْدَةً: وہ شکار جسے اس کی جگہ سے نکال بھگایا جائے مَطَارِدَةُ الْأَقْرَانِ: ہمسروں کا ایک دوسرے پر حملہ کر کے مدافعت کرنا۔

الْمُطَرَدُ: دور بھگانے کا آلہ اَطْرَادُ الشَّيْءِ: کسی چیز کا پے در پے آنا۔

## (ط ر ف)

الطَّرْفُ: کے معنی کسی چیز کا کنارہ اور سرا کے ہیں اور یہ اجسام اور اوقات وغیرہما کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَسَبِّحْ وَاطْرَافَ النَّهَارِ﴾ (۱۳۰-۲۰) اور اس کی تسبیح بیان کرو اور دن کے اطراف میں۔

﴿اقِمِ الصَّلَاةَ طَرْفَى النَّهَارِ﴾ (۱۱۴-۱۱) اور دن کے دونوں سروں (یعنی صبح اور شام کے اوقات میں) نماز پڑھا کرو۔

اور اس سے بطور استعارہ نجیب الطرفین کو کَرِيمُ الطَّرْفَيْنِ کہا جاتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ طَرْفَيْنِ کے معنی زبان اور ستر کے ہیں اور یہ عفت کی طرف اشارہ ہے۔ طَرْفُ الْعَيْنِ: آنکھ کی پلک۔ اور الطَّرْفُ کے اصل معنی پلک جھپکنے کے ہیں اور پلک جھپکنے کو دیکھنا لازم ہے اس لیے الطَّرْفُ کے معنی دیکھنا بھی آ جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

بطور استعارہ کہا جاتا ہے۔

طَرَفُ الْحَصَى: کاہن کا اپنی کہانت کے لیے نگرمانہ۔

طَرَفُ الدَّوَابِّ: چوپائے، جانوروں کا پانی میں داخل ہو کر

اسے پاؤں سے گدلا کر دینا۔ طَارَفْتُ النَّعْلَ وَطَرَفْتُهَا:

میں نے جوتے کے ایک پرتلہ پر دوسرا رکھ کر اسے سی دیا۔ پھر

طَرَفُ النَّعْلِ کی مناسبت سے طَارَقُ بَيْنَ الدَّرْعَيْنِ کا

معاورہ استعمال ہوتا ہے جس کے معنی ایک زرہ کے اوپر دوسری

زرہ پہننا کے ہیں۔ طَرَفُ الْخَوَافِي: پرند کے اندرونی

پروں کا تہ برتہ ہونا اور الطَّارِقُ: کے معنی ہیں: راستہ پر چلنے

والا مگر عرف میں بالخصوص اس مسافر کو کہتے ہیں جو رات میں

آئے چنانچہ طَرَفُ أَهْلِهِ طُرُوقًا کے معنی ہیں وہ رات کو آیا

اور سترے کو بھی الطَّارِقُ: کہا جاتا ہے کیونکہ وہ بالخصوص

رات کو ظاہر ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَالسَّمَاءِ وَالطَّارِقِ﴾ (۸۶-۱) آسمان اور رات کو آنے

والے کی قسم۔ شاعر نے کہا ہے۔ ﴿(الرجز)

(۲۹۱) نَحْنُ بَنَاتُ طَارِقٍ ہم طارق یعنی سردار کی بیٹیاں ہیں۔

طَوَارِقُ اللَّيْلِ: وہ مصائب جو رات کو نازل ہوں۔ طَرِقَ

فُلَانٌ رات میں صدمہ پہنچا۔

شاعر نے کہا ہے۔ ﴿(الطویل)

ہے۔ یعنی جسے نظر اٹھا کر دیکھا جائے جیسا کہ نَقَضُ بمعنی

مَنْقُضٌ آجاتا ہے اسی اعتبار سے خوبصورت چیز کو جس پر نظر

جم جائے اسے قَيْدُ النَّوَاطِرِ کہا جاتا ہے۔

## (ط ر ق)

الطَّرِيقُ کے معنی راستہ ہیں، جس پر چلا جاتا ہے۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيقًا فِي الْبَحْرِ﴾ (۲۰-۷۷) پھر

ان کے لیے دریا میں راستہ بنا دو۔

اسی سے بطور استعارہ ہر اس مسلک اور مذہب کو طریق کہا

جاتا ہے جو انسان کوئی کام کرنے کے لیے اختیار کرتا ہے

عام اس سے کہ وہ فعل محمود ہو یا مذموم۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَيَذْهَبَا بِطَرِيقَتِكُمُ الْمُثْلَى﴾ (۲۰-۶۳) اور تمہارے

بہتر مذہب کو نابود کر دیں۔

اور امتداد میں راستہ کے ساتھ تشبیہ دے کر کھجور کے لمبے

درخت کو بھی طَرِيقَةً کہہ دیتے ہیں۔

الطَّرِيقُ کے اصل معنی مارنے کے ہیں مگر یہ ضَرْب سے زیادہ

خاص ہے کیونکہ طَرِقُ کا لفظ چٹاخ سے مارنے پر بولا جاتا

ہے جیسے تھوڑے سے لوہے کو کوٹنا بعد ازاں ضَرْب کی

طرح طَرِقُ کے لفظ میں بھی وسعت پیدا ہو گئی ہے چنانچہ

① تمثلت به هند بنت عتبة بن ربيعة يوم احد تحض على المسلمين (ابن هشام ۵۶۲ وابن الانباري ۴۰) والرجز في الاصل لهند بنت ياخته الايادية قالته في حرب الفرس لاياد دوبيده: لانثني لوامق نمشئ على النمارق۔ المسك على المفارق۔ راجع اللسان (طرق)، والاقصاض ۳۱۸ والبحر (۲۳۱:۷) واعراب ثلاثين ۳۸ وايام العرب ۳۱ والسيوطي ۲۷۳ والمعاني للقتبي ۵۳۰ وروض الانف (۱۲۹:۲) وقد جاء بعض هذا الرجز منسوباً لامرأة من بني عجل انشدته يوم ذي قار، راجع التاريخ للطبري (۱۵۳:۲) منسوباً لابنة لفلند الزماني انشدته يوم التحالف من ايام حرب بکسر وتغلب (الاغانى ۱۴۴:۲۰)۔

② قاله امية بن الصلت في قصيده يشكو فيها عقوق ابنه في سبعة الحماسة مع المرزوقي رقم ۲۵۴ واختلف في قائلها قال التبريزي تروى لابن عبد الاعلى وقيل لابي العباس الاعمى قال ابو هلال اور دها ابو عبيدة في اخبار العفقه والبررة ونسبه في العيون (۸۷:۳) ليحيى بن سعيد وليس له لان قائلها تشدين بندي النبي صلى الله عليه وسلم كما في الصغير للطبراني ۱۹۵ فاخذ النبي صلى الله عليه وسلم بتلايب الولد وسلمه لوالدة قتالا له "انت ومالك لايلك" انظر ايضا الاغانى (۱۹۱:۳) وتراجم امية بن ابي الصلت في الاصابة رقم: ۵۵۲ والخزانة (۱۱۹:۱۲۲) و ابن سلام (۶۸-۶۶) والاشتقاق (۱۸۴) والاغانى (۱۷۹:۳-۱۸۵-۱۶۶:۶۷) وابن قتيبة (۴۲۹-۴۳۳)۔



اسی طرح طرائق سے اصحاب طرائق مراد ہیں اور آسمان کے طبقات کو بھی طرائق کہا جاتا ہے قرآن پاک میں ہے:

﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا قَوَّكُم مِّن سَبْعِ طَرَائِقٍ﴾ (۲۳-۱۷) ہم نے تمہارے اوپر کی جانب سات طبقے پیدا کیے ہیں۔ رَجُلٌ مَطْرُوفٌ: نرم اور ست آدمی پر ہو مَطْرُوفٌ کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی مصیبت زدہ کے ہیں یعنی مصائب نے اسے کمزور کر دیا۔ جیسا کہ مصیبت زدہ آدمی کو مَقْرُوعٌ یا مَدْخُوحٌ کہا جاتا ہے۔ یا یہ نَاقَةُ مَطْرُوفَةٍ کے محاورہ سے ماخوذ ہے اور یہ ذلت میں آدمی کے ساتھ تشبیہ دے کر بولا جاتا ہے۔

### (ط ر ی) (و)

الطَّرِیُّ: تروتازہ۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿لَحْمًا طَرِیًّا﴾ (۱۶-۱۳) تازہ گوشت کھاؤ۔ طَرِیًّا کا مصدر طَرَاءٌ وَطَرَاوَةٌ آتا ہے جس کے معنی تروتازہ ہونے کے ہیں۔ محاورہ ہے: طَرِیْتُ كَذَا فَطَرِی: میں نے اسے تازہ کیا چنانچہ وہ تازہ ہو گیا۔ اسی سے نئے اور تازہ کیے ہوئے کپڑوں کو مَطْرَاةٌ کہا جاتا ہے اور اطْرَاءُ اس تعریف کو کہتے ہیں جس سے ممدوح کی یاد تازہ ہو جائے اور (طَرَاءٌ) مہوز کے معنی طَلْعُ یعنی اچانک طلوع ہونے کے ہیں۔

### (ط س)

طس: یہ حروف مقطعات سے ہیں اور طسٌ وَطُسُوسٌ سے مشتق نہیں ہے جس کے معنی تشت ہیں۔

### (ط ع م)

الطَّعْمُ: (س) کے معنی غذا کھانے کے ہیں اور ہر وہ چیز جو بطور غذا کھائی جائے اسے طَعْمٌ یا طَعَامٌ کہتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

(۲۹) كَاتِبِي أَنَا الْمَطْرُوفُ دُونَكَ بِالَّذِي..... طَرِفْتُ بِهِ دُونِي وَعَيْنِي تَهْمُلُ

میں اس طرح بے چین ہوتا ہوں کہ وہ مصیبت جو رات کو تجھ پر آتی ہے مجھے پہنچ رہی ہے اور میری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہوتے ہیں۔

اور معنی ضرب یعنی جھتی کرنے کے اعتبار سے کہا جاتا ہے، طَرَقَ الْفَحْلُ النَّاقَةَ: اونٹ کا ناقہ سے جھتی کرنا۔

أَطْرَفْتُمَا: میں نے ساندھ کو اونٹنی پر چھوڑا۔

إِسْتَطَرَفْتُ فَلَانًا الْفَحْلُ: میں نے فلاں سے جھتی کے لیے ساندھ طلب کیا اور یہ محاورات ضَرْبَهَا الْفَحْلُ وَأَضْرَبَتْهَا وَاسْتَضْرَبَتْہَا کی طرح استعمال ہوتے ہیں اور اس ناقہ کو جو گناہن ہونے کے قابل ہو جائے اسے طَرُوفَةٌ کہا جاتا ہے اور بطور کنایہ طَرُوفَةٌ بمعنی عورت بھی آ جاتا ہے۔

أَطْرَقَ فَلَانٌ فُلَانٌ نے نگاہیں نیچی کر لیں گویا اس کی نگاہ زمین کو مارنے لگی جیسا کہ مَطْرُوفَةٌ (تھوڑے) سے کوٹا جاتا ہے اور طَرِيقٌ بمعنی راستہ کی مناسبت سے جَاءَتْ الْإِبِلُ مَطَارِيقُ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے یعنی اونٹ ایک ہی راستہ سے آئے اور تَطَرَّقَ إِلَى كَذَا کے معنی ہیں: کسی چیز کی طرف رستہ بنانا طَرَفْتُ لَهُ: کسی کے لیے راستہ ہموار کرنا۔

الطَّرِيقُ کی جمع طُرُقٌ آتی ہے اور طَرِيقَةٌ کی جمع طَرَائِقُ چنانچہ آیت کریمہ:

﴿كُنَّا طَرَائِقَ قِدَادٍ﴾ (۲-۱۱) کے معنی یہ ہیں کہ ہم مختلف مسلک رکھتے ہیں اور یہ آیت کریمہ:

﴿هُمْ دَرَجَاتٌ عِنْدَ اللَّهِ﴾ (۳-۱۶۳) ان لوگوں کے خدا کے ہاں (مختلف اور متفاوت) درجے ہیں، کی مثل ہے یعنی جیسا کہ یہاں درجات سے مراد اصحاب الدرجات ہیں

﴿مَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّي وَمَنْ لَمْ يَطْعَمْهُ فَإِنَّهُ مِنِّي﴾ (۲-۲۳۹) جو شخص اس میں سے پانی پی لے گا تو وہ مجھ سے نہیں ہے اور جو شخص اس سے پانی نہ پیے گا تو (اس کی نسبت تصور کیا جائے گا کہ وہ) میرا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ یہاں من لَمْ يَشْرِبْہُ کی بجائے وَمَنْ لَمْ يَطْعَمْہُ کہہ کر اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ جس طرح چلو بھر سے زیادہ محض پانی کا استعمال ممنوع ہے اسی طرح طعام کے ساتھ بھی اس مقدار سے زائد پانی پینا ممنوع ہے کیونکہ جو پانی کھانے کے ساتھ پیا جاتا ہے اس پر بھی طَعْمْتُ کا لفظ بولا جاسکتا ہے۔ لہذا اگر مَنْ لَمْ يَشْرِبْہُ لایا جاتا تو اس سے کھانے کے ساتھ پانی پینے کی ممانعت ثابت نہ ہوتی اس کے برعکس يَطْعَمْہُ کے لفظ سے یہ ممانعت بھی ثابت ہو جاتی ہے اور معین مقدار سے زائد پانی کا پینا بہر حالت ممنوع ہو جاتا ہے اور ایک حدیث میں آنحضرت ﷺ نے زمزم کے پانی کے متعلق اِنَّہُ طَعَامٌ طَعِمٌ وَشِفَاءٌ سَقِیْمٌ (کہ یہ کھانے کا کھانا اور بیماری سے شفا ہے) فرما کر تنبیہ کی ہے کہ بیر زمزم کے پانی میں غذائیت بھی پائی جاتی ہے جو دوسرے پانی میں نہیں ہے۔ اسْتَطْعَمْتُمْ فَأَطْعَمْنِي: میں نے اس سے کھانا مانگا چنانچہ اس نے مجھے کھانا کھلایا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَأَطْعَمُوا لِقَاعٍ وَالْمُعْتَرِّ﴾ (۲۲-۳۶) اور قناعت سے بیٹھے رہنے والوں اور سوال کرنے والوں کو بھی کھلاؤ۔  
﴿وَيُطْعَمُونَ الطَّعَامَ﴾ (۷-۸) اور وہ کھانا کھاتے ہیں۔  
﴿أَنطَلْعُ مَنْ لَوْ شَاءَ اللَّهُ أَطْعَمَهُ﴾ (۳۶-۳۷) بھلا ہم

﴿وَطَعَامُهُ مَتَاعًا لَّكُمْ﴾ (۵-۹۶) اور اس کا طعام جو تمہارے فائدہ کے لیے۔

اور کبھی طعام کا لفظ خاص کر گیہوں پر بولا جاتا ہے جیسا کہ ابوسعید الخدری سے روایت ہے: ﴿(أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَمَرَ بِصَدَقَةِ الْفِطْرِ صَاعًا مِنْ طَعَامٍ أَوْ صَاعًا مِنْ شَعِيرٍ)﴾ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقہ فطر میں ایک صاع طعام یا ایک صاع جو دینے کا حکم دیا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَلَا طَعَامٌ إِلَّا مِنْ غَسْلَيْنِ﴾ (۶۹-۳۶) اور نہ پیپ کے سوا (اس کے) لیے کوئی کھانا ہے۔

﴿وَطَعَامًا ذَا غُصَّةٍ﴾ (۴۳-۱۳) اور گوگیر کھانا ہے۔

﴿طَعَامُ الْأَثِيمِ﴾ (۴۴-۴۴) گناہ گار کا کھانا ہے۔

اور آیت کریمہ:

﴿وَلَا يَحْضُ عَلَى طَعَامِ الْمُسْكِينِ﴾ (۱۰۷-۳) اور فقیر کو کھانا کھلانے کے لیے لوگوں کو ترغیب نہیں دیتا۔

میں طعام بمعنی اطعام یعنی کھانا کھلانے کے ہیں۔

﴿فَإِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوا﴾ (۳۳-۵۳) اور جب کھانا کھا چلو تو چل دو۔

﴿لَيْسَ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ جُنَاحٌ فِيمَا طَعِمُوا﴾ (۵-۵۳) جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کرتے رہے ان پر ان چیزوں کا کچھ گناہ نہیں جو وہ کھا چکے۔

بعض نے کہا ہے کہ کبھی طَعِمْتُ بمعنی شَرِبْتُ آ جاتا ہے۔ جیسے فرمایا:

۱ اخراجہ الاثمة الستة فی كتبہم مختصراً مطو لا و ذکر الحافظ فی الفتح ان ابن المنذر علی من استدلل من هذا الحديث ان المراد من الطعام الحنطة وقال تفسیر ابن سعید مخالف لهذا الاستدلال ولفظه وقال ابو سعید وكان طعامنا الشعير والزبيب والا فط والتمروھی ظاهرة فيما قال لكن فی رواية عطف الشعير علی الطعام وهو يدل علی المغایرة واورد الحافظ هذه الرواية من ثلاث طرق والله اعلم.

## (ط غ و) (ی)

طَعَوْتُ وَطَعَيْتُ طَعَوْنَا وَطَعَيْنَا کے معنی طغیان اور سرکشی کرنے کے ہیں اور أَطَعَاهُ (افعال) کے معنی ہیں: اسے طغیان، سرکشی پر ابھارا اور طغیان کے معنی نافرمانی میں حد سے تجاوز کرنا کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿إِنَّهُ طَغَى﴾ وہ بے حد سرکش ہو چکا ہے۔

﴿إِنَّ الْإِنْسَانَ لِرَبِّهِ لَكَنَاطِغَى﴾ (۹۶-۶) مگر انسان سرکش جاتا ہے۔

﴿قَالَ رَبَّنَا إِنَّا نَخَافُ أَنْ يُفْرِطَ عَلَيْنَا أَوْ أَنْ يَطْغَى﴾ (۲۰-۳۵) دونوں کہنے لگے کہ ہمارے پروردگار! ہمیں خوف ہے کہ وہ ہم پر تعدی کرنے لگے یا زیادہ سرکش ہو جائے۔

﴿وَلَا تَطْغَوْا فِيهِ فَيَحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبِي﴾ (۲۰-۸۱) اور اس میں حد سے نہ لنگنا ورنہ تم پر میرا عذاب نازل ہوگا۔

﴿فَخَشِينَا أَنْ يُرْهِقَهُمَا طُغْيَانًا وَكُفْرًا﴾ (۱۸-۸۰) ہمیں اندیشہ ہوا کہ وہ بڑا ہو کر بدکردار ہوتا، کہیں ان کو سرکشی اور کفر میں نہ پھنسا دے۔

﴿فَنِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ﴾ (۲-۱۵) کہ بے حد سرکشی میں پڑے بہک رہے ہیں۔

﴿أَلَا طُغْيَانًا كَبِيرًا﴾ (۱۷-۶۰) بے حد سرکش۔

﴿وَإِنَّ لِلطَّاغِيْنَ لَشَرَّ مَا بَ﴾ (۳۸-۵۵) اور سرکشوں کے لیے برا ٹھکانا ہے۔

﴿قَالَ قَرِينُهُ رَبَّنَا مَا أَطْعَيْتَهُ﴾ (۵۰-۲۷) اس کا ساتھی (شیطان) کہے گا اے ہمارے پروردگار! میں نے اسے گمراہ نہیں کیا تھا۔

ان لوگوں کو کھانا کھلائیں جن کو اگر خدا چاہتا تو خود کھلا دیتا۔

﴿الَّذِي أَطْعَمَهُمْ مِنْ جُوعٍ﴾ (۱۰۶-۴) جس نے ان کو بھوک میں کھانا کھلایا۔

﴿وَهُوَ يُطْعِمُهُ وَلَا يَطْعَمُهُ﴾ (۶-۱۴) وہی سب کو کھانا کھلاتا ہے اور خود کسی سے کھانا نہیں لیتا۔

﴿وَمَا أَرِيدُ أَنْ يُطْعَمُونِ﴾ (۵۱-۵۷) اور نہ یہ چاہتا ہوں کہ مجھے کھانا کھلائیں۔

اور نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا۔ (۲۱) ﴿إِذَا اسْتَطَعْتُمْكُمُ الْإِمَامُ فَأَطْعِمُوهُ﴾ یعنی جب امام (نماز میں) تم سے لقمہ طلب کرے یعنی بھول جائے تو اسے بتا دو۔ رَجُلٌ طَاعِمٌ: خوش حال آدمی۔ رَجُلٌ مُطْعِمٌ: جس کو وافر رزق ملا ہو۔ وَمُطْعَمٌ نِيكٌ خورندہ۔ وَمُطْعَمٌ: بہت کھلانے والا، مہمان نواز طُعْمَةُ کھانے کی چیز، رزق۔

## (ط ع ن)

الطَّعْنُ: (ف) کے معنی نیزہ، سینگ وغیرہ کسی تیز اور نوکیلی چیز کے ساتھ زخم کرنے کے ہیں۔ تَطَاعَنُوا وَأَطْعَنُوا: انہوں نے ایک دوسرے کو نیزہ مارا۔ پھر استعارہ کے طور پر کسی پر الزام لگانے یا اس کی بدگوئی کرنے کے معنی میں بھی طعن کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَوَطَعْنَا فِي الدِّينِ﴾ (۴-۳۶) اور دین میں طعن کی راہ سے۔

﴿وَوَطَعْنُوا فِي دِينِكُمْ﴾ (۹-۱۲) اور تمہارے دین میں وہ طعن کرنے لگیں۔

① راجع للحديث الفائق (۴۳/۲) وفيه "انها" والعائد لزوم واللسان (طعم) وفي الطيالسي عن أبي ذر: وانها المباركة راجع الفتح الكبير للنبيهاني (۴۴۸/۱). قاله علي راجع النيل (۳۳۹/۲) والفتح الاثر في الفائق (۴۳/۲) قال وهذا من باب التمثيل.

سے اعتقاد نہ رکھے۔

﴿وَالَّذِينَ اجْتَنَبُوا الطَّاغُوتَ﴾ (۳۹-۱۷) اور جنہوں

نے بتوں کی پوجا اجتناب کیا۔

﴿أُولَئِكَ هُمُ الطَّاغُوتُ.....﴾ (۲-۲۵۷) ان

کے دوست شیطان ہیں۔ اور آیت کریمہ:

﴿يُرِيدُونَ أَن يُتَحَاكَمُوا إِلَى الطَّاغُوتِ﴾ (۴-۶۰)

اور چاہتے ہیں کہ اپنا مقدمہ ایک سرکش کے پاس لے جا کر فیصلہ کرائیں۔

میں طاغوت سے حدود شکن مرا ہیں اور نافرمانی میں حد سے تجاوز کی بنا پر ساحر، کاہن، سرکش جن اور ہر وہ چیز جو طریق حق سے پھیرنے والی ہو اسے طاغوت کہا جاتا ہے بعض کے نزدیک یہ فَعْلُوْتُ کے وزن پر ہے جیسے جَبْرُوْتُ وَمَلَكُوْتُ اور بعض کے نزدیک اس کی اصل طَغَوْتُ ہے۔ پھر صَاعِقَةُ اور صَاقِعَةُ کی طرح پہلے لام کلمہ میں قلب کیا گیا اور پھر واؤ کے متحرک اور ماقبل کے مفتوح ہونے کی وجہ سے الف سے تبدیل کیا گیا۔ ❶

## (ط ف ف)

www.KitaboSunnat.com

الطَّوْفِيفُ: کے معنی حقیر اور تھوڑی سی چیز کے ہیں اسی

سے ناقابل اعتناء چیز کو طَفَافَةٌ کہا جاتا ہے اور طَفَفَ

الْكَيْلَ کے معنی ہیں: اس نے پیانے کو پورا بھر کر نہیں دیا۔

اس میں کمی کی قرآن پاک میں ہے:

﴿وَنَزَّلْنَا لَمْطُوفَيْنِ﴾ (۸۳-۱) ناپ تول میں کمی کرنے

والوں کے لیے خرابی ہے۔

الطَّغَوِيُّ: (اسم) طغیان۔ یعنی بے حد سرکشی اور آیت کریمہ:

﴿كَذَّبَتْ ثَمُودُ بِطَغْوَاهَا﴾ (۹۱-۱۱) قوم ثمود نے اپنی

سرکشی کے سبب پیغمبر ﷺ کو جھٹلایا۔

میں اس امر پر تنبیہ ہے کہ قوم ثمود کو جب ان کی سرکشی کی

پاداش سے ڈرایا گیا تو انہوں نے یقین نہ کیا اور آیت کریمہ:

﴿هُمْ أَظْلَمُ وَأَطْغَى﴾ (۵۳-۵۲) وہ لوگ بڑے ہی

ظالم اور بڑے ہی سرکش تھے۔

میں اس امر پر تنبیہ ہے کہ سرکشی کسی حالت میں بھی ہلاکت

سے نجات نہیں بخش سکتی۔ چنانچہ نوح علیہ السلام کی قوم ان

سے بھی زیادہ سرکش تھی لیکن انہیں ہلاک کر دیا گیا اور آیت:

﴿إِنَّا لَمَّا طَغَى الْمَاءُ﴾ (۶۹-۱۱) جب پانی طغیانی پر آیا

تو ہم نے.....

میں پانی کے حد سے تجاوز کر جانے کو مجازاً طغیان سے تعبیر

فرمایا ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿فَاهْلِكُوا بِالطَّغْيَانِ﴾ (۵۹-۵۵) سو..... کڑک سے ہلاک

کر دیے گئے۔

میں طَاعِيَّةٌ سے طوفان کی طرف اشارہ ہے جس کا تذکرہ

آیت ﴿إِنَّا لَمَّا طَغَى الْمَاءُ﴾ میں پایا جاتا ہے۔ ❶

الطَّاغُوتُ: سے مراد ہر وہ شخص ہے جو حدود شکن ہو اور ہر

وہ چیز جس کی اللہ کے سوا پرستش کی جائے اسے طاغوت کہا

جاتا ہے اور واحد جمع دونوں میں استعمال ہوتا ہے۔ ❷ قرآن

پاک میں ہے:

﴿فَمَنْ يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ﴾ (۲-۲۵۶) جو شخص بتوں

❶ الآية متعلق بقوم ثمود ولا تعلق له بالآية: انا لما طغى الماء.

❷ قد ياتي جمعه الى طواغيت كما وروى الحديث ((لا تحلفوا اباءكم ولا بالطواغيت)).

❸ فوزه فعلوت.

## (ط ف ق)

کے نرم و نازک ہونے کے ہیں اور جس ہرنی کے ساتھ اس کا بچہ ہوا سے مَطْفُلُ کہا جاتا ہے طَفَلَتِ الشَّمْسُ اس وقت بولا جاتا ہے جب آفتاب نکلنے کو ہو اور ابھی تک اس کی دھوپ اچھی طرح زمین پر نہ پھیلی ہو۔ شاعر نے کہا ہے۔ ⑤ (الزل)

(۲۹۳) وَعَلَى الْأَرْضِ غَيَابَاتُ الطُّفُلِ

اور زمین پر تاحال صبح کا سوچھا کام موجود تھا۔

اور طَفُلُ جس کے معنی ایسے کھانے میں شریک ہونا کے ہیں جس پر اسے بلایا نہ گیا ہو، کے متعلق بعض نے کہا ہے کہ یہ طَفُلُ النَّهَارِ سے ماخوذ ہے یعنی اس وقت آنا اور بعض نے کہا ہے کہ طَفِيلُ الْعَرَائِسِ ایک مشہور آدمی کا نام ہے ⑥ جو بلا دعوت تقریبات میں شریک ہو جاتا تھا اور اسی سے طَفُلُ ہے جس کے معنی طفیلی بن کر جانے کے ہیں۔

## (ط ل ل)

الَطَّلُ کے معنی بہت ہلکی سی بارش کے ہیں جس کا معمولی سا اثر ہو۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَإِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ﴾ (۲۶۵-۲) اگر مینہ نہ بھی پڑے تو خیر پھو بار ہی سہی۔

اور طَلَّ الْأَرْضَ فَهِيَ مَطْلُوْلَةٌ کے معنی، زمین پر اوس پڑنے کے ہیں اسی سے جس خون کی پرواہ نہ کی جائے اور اسے اوس کی طرح معمولی سمجھا جائے اس کے متعلق کہا جاتا ہے۔ طَلَّ دَمُ فُلَانٍ یعنی فلاں کا خون باطل کر دیا گیا اور شبنم کا چونکہ ہلکا سا اثر ہوتا ہے اس مناسبت سے گھروں کے باقی ماندہ نشانات کو طَلَّلُ کہہ دیتے ہیں اَطَّلَ فُلَانٌ

طَفِقَ يَفْعَلُ كَذَا: وہ ایسا کرنے لگا یہ أَخَذَ يَفْعَلُ کی طرح (کسی کام کے شروع کرنے کا معنی دیتا) ہے اور ہمیشہ کلام مثبت میں استعمال ہوتا ہے لہذا مَا طَفِقَ كَذَا کہنا جائز نہیں ہے۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿فَطَفِقَ مَسْحًا بِالْسُوقِ وَالْأَعْنَاقِ﴾ (۳۸-۳۳) پھر ان کی ٹانگوں اور گردنوں پر ہاتھ پھیرنے لگے۔  
﴿وَوَطَفَقَا يَخْصِفَانِ﴾ (۱۲۷-۷) اور وہ لگے چپکانے۔

## (ط ف ل)

الطُّفُلُ: جب تک بچہ نرم و نازک رہے اس وقت تک اسے طِفْلُ کہا جاتا ہے یہ اصل میں مفرد ہے مگر کبھی بمعنی جمع بھی آتا ہے چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿ثُمَّ يُخْرِجُكُمْ طِفْلًا﴾ (۳۰-۶۷) پھر تم کو نکالتا ہے۔ کہ تم بچے ہوتے ہو۔

﴿وَالطُّفُلُ الَّذِينَ لَمْ يَطْهَرُوا عَلَى عَوْرَاتِ النِّسَاءِ﴾ (۲۳-۳۱) یا ایسے لڑکوں سے جو عورتوں کے پردے کی چیزوں سے واقف نہ ہوں۔

طِفْلُ کی جمع اَطْفَالٌ آتی ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿وَإِذَا بَلَغَ الْأَطْفَالُ مِنْكُمُ الْحُلُمَ﴾ (۲۳-۵۹) اور جب تمہارے لڑکے بالغ ہو جائیں۔

اور نرم و نازک ہونے کے معنی کی مناسبت سے گداز بدن عورت کو طَفْلَةٌ کہا جاتا ہے اور طَفَلْتُ طَفُولَةً وَطَفَالَةٌ

① قاله لييد يصف فرسه وصدرة : فتدليت عليه قفلاً - واليت في السمط ۸۳۳ وديوانه (۱۴: ۲) وتنهذب الالفاظ ۴۰۷ والاشتقاق (۸۴-۱۷۳) وقيله في العالي (۲: ۲۰۱) مليح الارض لمحاً في الندى من مرايع رياض ورجل وايضا راجع اللسان (غيا) وغريب ابى عبيد (۱: ۹۳)۔

② رجل من اهل الكوفة من بني عبد الله ابن غطفان (الصحيح)۔

أَطْلَبَ الْكَلَاءُ

جھانکنا، دور سے نظر آنا۔

## (ط ل ت)

﴿طَالُوتُ﴾ یہ عجمی لفظ ہے ۱ بنی اسرائیل کے ایک بادشاہ کا نام ہے جسے اللہ تعالیٰ نے جالوت کے مقابلہ کے لیے مقرر فرمایا (۲-۲۴۷)

## (ط ل ح)

الطَّلُحُ: (موز) ایک درخت کا نام ہے اس کا واحد طَلْحَةٌ ہے۔ قرآن پاک میں ہے:  
﴿وَطَلْحٍ مَّنْضُودٍ﴾ (۵۶-۲۹) اور تہ بتہ کیلوں..... اور ایل طَلَّاحٍ۔ طَلْحَةٌ کی طرف منسوب ہے اور طَلَّاحٍ وَطَلْحَةٌ ان اونٹوں کو کہا جاتا ہے جو طلحہ درخت کو کھا کر بیمار ہو گئے ہوں۔ نیز طَلْحٌ وَطَلِیحٌ اَسْفَارِ محاورہ ہے یعنی کثرت سفر کی وجہ سے دہلی اونٹنی اور اسی سے الطَّلَّاحُ ہے جو کبھی اَصْلَاحُ کے بالقابل استعمال ہوتا ہے۔

## (ط ل ع)

طَلَعَ (ن) اَلشَّمْسُ طُلُوعًا وَمَطْلَعًا کے معنی آفتاب طلوع ہونے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:  
﴿فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوعِ الشَّمْسِ﴾ (۲۰-۱۳۰) اور سورج کے نکلنے سے پہلے تسبیح و تمجید کیا کرو۔  
﴿حَتَّىٰ مَطْلَعِ الْفَجْرِ﴾ (۵-۹۷) طلوع صبح تک۔  
اور یہ مَطْلَعُ کے معنی ہیں ”طلوع ہونے کی جگہ“ قرآن پاک میں ہے:

﴿حَتَّىٰ إِذَا بَلَغَ مَطْلَعِ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَطْلُعُ عَلٰی قَوْمٍ﴾ (۱۸-۹۰) یہاں تک کہ سورج کے طلوع ہونے کے مقام پر پہنچا تو دیکھا کہ وہ ایسے لوگوں پر طلوع کرتا

## (ط ف ء)

طَفَيْتَ (س) النَّارُ کے معنی آگ بجھ جانے کے ہیں اور أَطْفَأْتُمَا (افعال) کے معنی پھونک سے بجھا دینے کے ہیں قرآن پاک میں ہے:  
﴿يُرِيدُونَ أَن يُطْفِئُوا نُورَ اللَّهِ﴾ (۹-۳۲) یہ چاہتے ہیں کہ خدا کے نور کو اپنے منہ سے (پھونک مار کر) بجھا دیں۔  
﴿يُرِيدُونَ لِيُطْفِئُوا نُورَ اللَّهِ﴾ (۶۱-۸) یہ چاہتے ہیں کہ خدا کے چراغ کی روشنی کو منہ سے (پھونک مار کر) بجھا دیں۔  
اور دونوں آیتوں میں معنوی طور پر یہ فرق پایا جاتا ہے کہ يُرِيدُونَ أَن يُطْفِئُوا کے معنی نور الہی کو بجھانے کا قصد کرنے کے ہیں مگر لِيُطْفِئُوا کے معنی ایسے امر کا قصد کرنے کے ہیں جو اطفاء نور کا سبب بن سکے۔

## (ط ل ب)

الطَّلَبُ: (ن) کے معنی کسی شے کے پانے کی تلاش اور جستجو کرنا کے ہیں عام اس سے کہ وہ چیز اعیان و اجسام سے تعلق رکھتی ہو یا مقال سے قرآن میں ہے:  
﴿فَلَن تَسْتَطِيعَ لَهُ طَلَبًا﴾ (۱۸-۲۸) تم اسے تلاش کے باوجود حاصل نہیں کر سکو گے۔  
﴿ضَعُفَ الطَّلِبُ وَالْمَطْلُوبُ﴾ (۲۲-۷۳) طلب کرنے والا اور جس سے طلب کیا جائے (یعنی عابد اور معبود دونوں) کمزور ہیں۔

أَطْلَبْتُ فُلَانًا (۱) کسی کی حاجت روائی کرنا (۲) کسی کو محتاج کرنا اور جو گھاس پانی سے بہت دور ہو اور اس تک پہنچنے کے لیے تکلیف اٹھانا پڑے تو اس کے متعلق کہا جاتا ہے

کے شگونی لطیف و نازک ہوتے ہیں۔

أَطْلَعَتِ النَّخْلُ: کھجور کا شگونی دار ہونا۔

قَوْسٌ طَلَّاعُ الْكَفِّ: کمان جس سے مٹھی بھر جائے۔

### (ط ل ق)

الطَّلَاقُ: دراصل اس کے معنی کسی بندھن سے

آزاد کرنے کے ہیں محاورہ ہے۔

أَطْلَقْتُ الْبَعِيرَ مِنْ عِقَالِهِ وَطَلَّقْتُهُ: میں نے اونٹ

کا پائے بند کھول دیا طَالِقٌ وَطَلَّقْتُ: وہ اونٹ جو مقید نہ

ہو اسی سے خَلَّتِهَا کی طرح طَلَّقْتُ الْمَرْءَ کا محاورہ

مستعار ہے یعنی میں نے اپنی عورت کو نکاح کے بندھن

سے آزاد کر دیا ایسی عورت کو طَالِقٌ کہا جاتا ہے۔ قرآن

پاک میں ہے:

﴿فَطَلَّقُوهُنَّ لِعَدَّتِهِنَّ﴾ (۱-۶۵) تو ان کی عدت کے

شروع میں طلاق دو۔

﴿الطَّلَاقُ مَرَّتَانِ﴾ (۲-۲۳) طلاق صرف دوبار ہے۔

اور آیت کریمہ:

﴿وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ﴾ (۳-۲۲۸) اور

طلاق والی عورتیں تین حیض تک اپنے تئیں روکے رہیں۔

میں طلاق کا لفظ عام ہے جو رجعی اور غیر رجعی دونوں کو شامل

ہے۔ لیکن آیت کریمہ:

﴿وَيُعَوِّلُتُهُنَّ أَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ﴾ (۲-۲۲۸) اور ان کے

خاوند ان کو اپنی زوجیت میں لے لینے کے زیادہ حق دار

ہیں۔ میں ”واپس لے لینے کا زیادہ حق دار ہونے کا حکم“

رجعی طلاق کے ساتھ مخصوص ہے اور آیت کریمہ:

﴿فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدِ﴾ (۲-۲۳) پھر

اگر شوہر (دو طلاقوں کے بعد تیسری) طلاق عورت کو دے

ہے.....

اسی سے استعارہ کے طور پر طَلَعَ عَلَيْنَا فُلَانٌ وَطَلَعَ

محاورہ استعمال ہوتا ہے جس کے معنی ہیں کسی کے سامنے

ظاہر ہونا اور اوپر پہنچ کر نیچے کی طرف جھانکنا قرآن پاک

میں ہے:

﴿هَلْ أَنتُمْ مُطْلَعُونَ فَاطَّلَعَ﴾ (۵۴-۳۷) بھلا خود

جھانکے گا۔

﴿فَاطَّلَعَ إِلَى آلِهِ مُوسَى﴾ (۴۰-۳۷) پھر اوپر جا کر

موسیٰ کے خدا کو دیکھ لوں۔

﴿أَطْلَعَ الْغَيْبُ﴾ (۱۹-۷۸) کیا اس نے غیب کی خبر پالی

ہے۔

﴿لَعَلِّي أَطْلَعَ إِلَى آلِهِ مُوسَى﴾ (۲۸-۳۸) تاکہ میں

موسیٰ کے خدا کی طرف چڑھ جاؤں۔

إِسْتَطْلَعْتُ رَأْيَهُ: میں نے اس کی رائے معلوم کی۔

أَطْلَعْتُكَ عَلَى كَذَا میں نے تمہیں فلاں معاملہ سے آگاہ

کر دیا۔ طَلَعْتُ عَنْهُ: میں اس سے نہیں ہو گیا۔ (اضداد)

الطَّلَاعُ: (۱) ہر وہ چیز جس پر سورج طلوع کرتا ہو یا (۲)

انسان اس پر اطلاع پائے۔ طَلِيعَةُ الْجَنِّش: ہر اول دستہ

اِمْرَأَةٌ طَلَعَتْ قُبْعَةً: وہ عورت جو بار بار ظاہر اور پوشیدہ ہو

اور طلوع آفتاب کی مناسبت سے طَلَعُ النَّخْلِ کا محاورہ

استعمال ہوتا ہے اور اس کے معنی خرما کے غلاف کے ہیں

جس کے اندر اس کا خوشہ ہوتا ہے قرآن پاک میں ہے:

﴿لَهَا طَلْعٌ نَضِيدٌ﴾ (۵۰-۱۰) جن کا گاہماتہ بتہ ہوتا ہے۔

﴿طَلَعَهَا كَأَنَّهُ رُءُوسُ الشَّيَاطِينِ﴾ (۳۷-۶۵) ان

کے شگونی ایسے ہوں گے جیسے شیطانوں کے سر۔

﴿وَنَخِلٌ طَلَعَهَا هَضِيمٌ﴾ (۲۶-۱۳۸) اور کھجوریں جن

آتا ہے۔

لَيْلَةٌ طَلَقَتْ: وہ رات جس میں اونٹوں کو پانی پر وارد ہونے کے لیے آزاد چھوڑ دیا جائے کہ وہ گھاس کھاتے ہوئے اپنی مرضی سے چلے جائیں۔ چنانچہ محاورہ ہے: أَطْلَقَ الْوَلَّيْلَ: یعنی اس نے پانی پر وارد ہونے کے لیے اونٹوں کو آزاد چھوڑ دیا۔

### (ط م م)

الطَّمَّ کے معنی پانی سے بھرے ہوئے سمندر کے ہیں اور ایسے سمندر کو الطَّمَّ وَالرَّمَّ کہا جاتا ہے اور طَمَّ عَلَى كَذَا کے معنی کسی پر چھا جانے اور اسے ڈھانپ لینا کے ہیں۔ اسی سے قیامت کو طَامَّةٌ کہا گیا ہے کیونکہ اس کی مصیبت سب پر چھا جائے گی۔ چنانچہ فرمایا:

﴿وَإِذَا جَاءَتِ الطَّامَّةُ الْكُبْرَى﴾ (۷۹-۸۳) تو جب بڑی آفت کر آئے گی۔

### (ط م ث)

الطَّمْثُ (ن س) کے معنی (۱) دم حیض اور (۲) کسی عورت کی بکارت کو زائل کرنا کے ہیں اور طَامِثٌ کے معنی حیض والی عورت کے ہیں۔ طَمَثَ الْمَرْثَةُ اس نے عورت کی بکارت زائل کردی قرآن پاک میں ہے:

﴿لَمْ يَطْمِثْهُنَّ إِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَانٌّ﴾ (۵۵-۵۶)

جن کو اہل جنت سے پہلے نہ کسی انسان نے ہاتھ لگایا اور نہ کسی جن نے۔

اور اسی سے استعارہ کے طور پر کہا جاتا ہے، مَا طَمِثَ هَذِهِ الرَّوْضَةَ أَحَدٌ قَبْلَهَا: یعنی ہم سے قبل اس سبززار میں کوئی

دے تو..... اس پہلے شوہر پر حلال نہ ہوگی۔ میں مِنْ بَعْدُ کے یہ معنی ہیں کہ اگر بیہوشی یعنی عدت گزر جانے کے بعد پھر (تیسری) طلاق دے۔ تو اس کے لیے حلال نہ ہوگی تا وقتیکہ دوسرے شوہر سے شادی نہ کرے۔ چنانچہ آیت کریمہ:

﴿فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا أَنْ يَتَرَاجَعَا﴾ (۲-۲۳۱) میں طَلَّقَهَا کے معنی یہ ہیں کہ اگر دوسرا خاوند طلاق دے دے اور وہ پہلے خاوند کے نکاح میں آنا چاہے تو ان کے دوبارہ نکاح کر لینے میں کچھ گناہ نہیں ہے۔ اِنْطَلَقَ فُلَانٌ کے معنی چل پڑنا کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَانْطَلَقُوا وَهُمْ يَتَخَفَتُونَ﴾ (۶۸-۷۳) تو وہ چل پڑے اور آپس میں چپکے چپکے کہتے جاتے تھے۔

﴿اِنْطَلِقُوا إِلَى مَا كُنْتُمْ بِهِ تَكْتَبُونَ﴾ (۷۷-۷۹) جس چیز کو تم جھٹلایا کرتے تھے اب اس کی طرف چلو۔

اور حلال چیز کو طَلَقٌ کہا جاتا ہے کیونکہ اس کے کھالینے پر کسی قسم کی پابندی نہیں ہوتی۔

عَدَا الْفَرْسُ طَلَقًا أَوْ طَلَقَيْنِ: گھوڑے نے آزادی سے ایک دو دوڑیں لگائیں اور فقہ کی اصطلاح میں مُطَلَقٌ اس حکم کو کہا جاتا ہے جس سے کوئی جزئی مخصوص نہ کی گئی ہو۔ طَلَقَ يَدَهُ وَأَطْلَقَهَا: اس نے اپنا ہاتھ کھول دیا۔ طَلَقَ الْوَجْهَ أَوْ طَلِيقُ الْوَجْهِ خندہ رو..... ہنس مکھ۔ طَلِيقُ السَّلِيمِ (مجبول) مارگزیدہ کا صحت یاب ہونا۔ شاعر نے کہا ہے۔ ۵ (الطویل)

(۲۹۳) تُطَلِّقُهُ طَوْرًا وَطَوْرًا تَرَاجَعُ کہ وہ کبھی درد سے آرام پالیتا ہے اور کبھی وہ درد دوبارہ لوٹ

۱ قاله النابغة في وصف السليم واوله تناوزها الراقون من سوء سمها والقصيد طويلة يعتذر فيها الى النعمان بن المنذر وفي ديوانه من سوء سمها والبيت في المعاني الكبير والخزاعة (۱: ۴۳۴) وقد مرفی۔ ۲۹۔



جگہ فرمایا:

﴿وَأَضَلَّهُ اللَّهُ عَلَىٰ عِلْمٍ وَخَتَمَ عَلَىٰ سَمْعِهِ وَقَلْبِهِ﴾ (۲۲-۳۵) اور باوجود جاننے بوجھنے کے گمراہ ہو رہا ہے۔ (تو) خدا نے بھی اس کو گمراہ کر دیا اور اس کے کانوں اور دل پر مہر لگا دی۔

بعض نے کہا ہے کہ وجہ سے قوم کے اعیان و اکابر مراد ہیں اور معنی یہ ہیں کہ ہم بڑے بڑے سرداروں کو رعیت اور محکوم بنادیں، اس سے بڑھ کر اور کون سی ہلاکت ہو سکتی ہے۔

### (ط م ع)

الطَّمْعُ کے معنی ہیں: نفس انسانی کا کسی چیز کی طرف خواہش کے ساتھ میلان۔

طَمِعَ (س) طَمْعًا وَطَمَاعِيَّةً: کسی چیز کی طرف خواہش کے ساتھ مائل ہونا۔ طَمِعَ وَطَمَاعُ: اس طرح مائل ہونے والا قرآن پاک میں ہے:

﴿إِنَّا نَطْمَعُ أَنْ يَغْفِرَ لَنَا رَبُّنَا﴾ (۵۱-۲۶) ہمیں امید ہے کہ ہمارا خدا ہمارے گناہ بخش دے گا۔

﴿فَنَطْمَعُونَ أَنْ يُؤْمِنُوا الْكُفْرَ﴾ (۷۵-۲) (مومنو) کیا تم آرزو رکھتے ہو کہ یہ لوگ تمہارے دین کے قائل ہو جائیں گے۔ ﴿خَوْفًا وَطَمَعًا﴾ (۱۲-۱۳) ڈرانے اور امید دلانے کے لیے۔

اور عموماً چونکہ طمع کی بنا خواہش نفسانی پر ہوتی ہے اس لیے کہا جاتا ہے: الطَّمْعُ طَمِعٌ وَالطَّمْعُ تَدْنِسُ الْاَهَابُ کہ طمع بھی ایک قسم کی آلودگی ہے جو انسان کے نفس کو ملوث کر ڈالتی ہے۔

### (ط م ن)

الطَّمَانِيْنَةُ وَالْاَطْمِيْنَانُ کے معنی ہیں خلجان کے

اور وارد نہیں ہوا مَا طَمِئَتِ النَّاقَةُ جَمَلٌ اس اونٹنی کو کسی اونٹ نے بھی نہیں چھوڑا۔

### (ط م س)

الطَّمَسُ کے معنی کسی چیز کا نام و نشان مٹا دینے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَإِذَا النُّجُومُ طُمِسَتْ﴾ (۷۷-۸) جب ستاروں کی روشنی جاتی رہے گی۔

﴿رَبَّنَا اطْمِسْ عَلَيَّ أَمْوَالِهِمْ﴾ (۸۵-۱۰) اے پروردگار! ان کے مال و دولت کو تباہ و برباد کر دے۔ یعنی ان کا نام و نشان مٹا دے۔

﴿وَلَوْ نَشَاءُ لَطَمَسْنَا عَلَىٰ أَعْيُنِهِمْ﴾ (۶۶-۳۶) اور اگر ہم چاہیں تو ان کی آنکھوں کو مٹا کر اندھا کر دیں۔ یعنی آنکھوں کی روشنی سلب کر لیں اور ان کا نشان مٹا دیں جس طرح کہ کسی نشان کو مٹا دیا جاتا ہے۔

اور آیت کریمہ: ﴿مَنْ قَبْلُ أَنْ نَطْمِسَ وُجُوهًا﴾ (۴۷-۳) قبل اس کے کہ ہم ان کے چہروں کو بگاڑ کر۔

میں بعض نے کہا ہے کہ دنیا میں ان کے چہروں کو بگاڑنا مراد ہے۔ مثلاً ان کے چہروں پر بال اُگادیں۔ ان کی صورتیں بندروں اور کتوں جیسی کر دی جائیں۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ آخرت میں ہوگا جس کی طرف کہ آیت:

﴿وَأَمَّا مَنْ أُوْتِيَ كِتَابَهُ وَرَاءَ ظَهْرِهِ﴾ (۸۴-۱۰) اور جس کا نامہ اعمال اس کی پیٹھ کے پیچھے سے دیا جائے۔ میں اشارہ پایا جاتا ہے اور چہروں کو مٹانے کی ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ان کی آنکھیں گدی پر لگا دی جائیں اور یا ہدایت سے گمراہی کی طرف لوٹا دینا مراد ہے جیسا کہ دوسری

اسے فتحِ حاء کے ساتھ پڑھنا قیاس کے زیادہ مطابق ہے اولاً تو اس لیے کہ یہ طمَّئَتْ کی ضد ہے جس کے معنی حیض آنا کے ہیں اور دوم اس لیے کہ اس سے اسم فاعل طَاهِرَةٌ و طَاهِرٌ آتا ہے جیسے قَائِمَةٌ وَقَائِمٌ وَقَاعِدَةٌ وَقَاعِدٌ ❶ طہارتِ دوئم پر ہے طہارت (۱) جسمانی اور (۲) طہارتِ قلبی قرآن پاک میں جہاں کہیں طہارت کا لفظ استعمال ہوا ہے وہاں بالعموم دونوں قسم کی طہارت مراد ہے، کہا جاتا ہے۔

طَهَّرْتُهُ فَطَهَّرُ وَتَطَهَّرَ وَاطَّهَّرَ فَهُوَ طَاهِرٌ وَتَطَهَّرَ: میں نے اسے پاک کیا چنانچہ وہ پاک ہو گیا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَإِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوا﴾ (۶-۵) اور اگر نہانے کی حاجت ہو تو نہا کر پاک ہو جایا کرو یعنی پانی یا جو چیز اس کے قائم مقام ہو اس کے ذریعہ طہارت کر لیا کرو۔ اور آیت کریمہ: ﴿وَلَا تَقْرَبُوهُنَّ حَتَّى يَطْهَرْنَ فَإِذَا تَطَهَّرْنَ﴾ (۲۲۲-۲) اور جب تک پاک نہ ہو جائیں ان سے مقاربت نہ کرو، میں دو فعل لا کر یہ بتایا گیا ہے کہ عورتیں جب تک حیض سے فارغ ہو کر غسل نہ کر لیں اس وقت تک ان سے مقاربت جائز نہیں ہے اور ایک قرأت میں حَتَّى يَطْهَرْنَ ہے جس سے اس معنی کی تائید ہوتی ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَرُجِبُ الْمُتَطَهِّرِينَ﴾ (۲۲۲-۲) اور پاک صاف رہنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

میں مُتَطَهِّرِينَ سے وہ لوگ مراد ہیں جو گناہوں کو ترک کر کے اصلاحِ نفس میں لگے رہتے ہیں نیز فرمایا:

بعد نفس کا سکون پذیر ہونا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَلِتَطْمَئِنَّ بِهِ قُلُوبُكُمْ﴾ (۱۳۶-۳) یعنی اس لیے کہ تمہارے دلوں کو اس سے تسلی حاصل ہو۔

﴿وَلَكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قُلُوبِي﴾ (۲۶۰-۲) لیکن (میں دیکھتا) اس لیے چاہتا ہوں کہ میرا دل اطمینانِ کامل حاصل کر لے۔ اور آیت کریمہ:

﴿يَا أَيُّهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ﴾ (۷۹-۷۷) میں نفس مطمئنہ سے مراد وہ نفس ہے جسے برائی کی طرف کسی طور بھی رغبت نہ ہو۔ اور آیت کریمہ:

﴿الَا بِذِكْرِ اللَّهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ﴾ (۲۸-۱۳) اور سن رکھو کہ خدا کی یاد سے دل آرام پاتے ہیں۔

میں اس امر پر تنبیہ کی گئی ہے کہ معرفتِ الہی اور کثرتِ عبادت سے ہی قلبی سکون حاصل ہوتا ہے۔ جس قسم کی تسکین کا کہ آیت: ﴿وَلَكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قُلُوبِي﴾ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سوال کیا تھا۔ ارشاد ہے: ﴿وَقَلْبُهُ مُطْمَئِنٌّ بِالْإِيمَانِ﴾ (۱۰۶-۱۶) اور اس کا دل ایمان کے ساتھ مطمئن ہو۔

﴿فَإِذَا أَطْمَأْنَنْتُمْ﴾ (۱۰۳-۳) پھر جب خوف جاتا رہے۔ ﴿وَرَضُوا بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَاطْمَأْنَنُوا بِهَا﴾ (۷-۱۰) اور دنیا کی زندگی سے خوش اور اس پر مطمئن ہو بیٹھے۔

وَاطْمَأْنَنَ وَتَطَأَمَنَ، مادہ اور معنی کے اعتبار سے ایک ہی ہیں۔

## (ط ه ر)

طَهَّرْتَ (ك) الْمَرْئِيَّةُ طَهْرًا وَطَهَارَةً وَطَهَّرَتْ (ن) کے معنی عورت کے حیض سے پاک ہونا کے ہیں۔ اور

❶ وان كان بضم الطاء فلتكن لصفه منه طهير مثل كريم لكن قال ابن جنى: طاهر من طهر مثل شاعر من شعر فلذا نك جمع الشاعر على شعراء لانه على جمع فعيل ۱۲، كذا في ابى السعود انظر (الفتوحات الالهية) (۱/۳۵۵) ۱۲.

لوگوں کو حاصل ہو سکتی ہے جو اپنے نفوس کو آلودگیوں سے پاک و صاف رکھتے ہیں اور دل و دماغ کو ہر قسم کی آلائش سے محفوظ رکھتے ہیں۔ اور آیت کریمہ:

﴿أَنَّهُمْ أَنَاسٌ يَتَطَهَّرُونَ﴾ (۵۶-۲۷) بطور طنز کہا تھا کیونکہ لوط علیہ السلام نے جب قوم کی بیٹیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ﴿هُنَّ أَطْهَرُ لَكُمْ﴾ کہا تو انہوں نے طنزاً یہ جواب دیا تھا اور آیت کریمہ:

﴿وَلَهُمْ فِيهَا أَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ﴾ (۵۲-۲) اور وہاں ان کے لیے یہاں ہوں گی۔

میں مُطَهَّرَةٌ کے معنی ہیں کہ وہ ہر قسم کی دنیاوی کثافتوں اور نجاستوں (یعنی حیض و نفاس وغیرہ) سے پاک ہوں گی اور بعض نے کہا ہے کہ اخلاقِ رزیلہ سے پاکیزہ ہونا مراد ہے جیسا کہ دوسری آیت میں جنتی عورتوں کو ﴿عُرُبًا أَتْرَابًا﴾ (۵۰-۳۷) شوہروں کی پیاریاں اور ہم عمر۔

کہا ہے اور قرآن پاک میں فرمایا:

﴿مَرْفُوعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ﴾ (۸۰-۱۲) جو بلند مقام پر رکھے ہوئے (اور) پاک ہیں۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَيُنَادِيكَ فَطْحَمٌ﴾ (۷۴-۲) اور اپنے کپڑوں کو پاک رکھو، کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے: یہاں نفس کو زائل سے پاک رکھنا مراد ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَطَهَّرَ بَيْتِي﴾ (۲۲-۲۶) اور میرے گھر کو صاف رکھا کرو۔ ﴿وَعَهْدُنَا إِلَىٰ آبَائِهِمْ وَأَسْمَاعِيلَ أَن طَهَّرَ بَيْتِي﴾ (۲-۱۲۵) اور ابراہیم اور اسماعیل علیہ السلام کو کہا کہ میرے گھر کو پاک صاف رکھا کرو۔

میں خانہ کعبہ کو بتوں کی نجاست سے پاک رکھنے کی ترغیب

﴿فِيهِ رِجَالٌ يُحِبُّونَ أَن يَتَطَهَّرُوا﴾ (۹-۱۰۸) اس میں ایسے لوگ ہیں جو پاک رہنے کو پسند کرتے ہیں۔

﴿وَأَخْرَجُوهُمْ مِّن قَرْيَتِكُمْ أَنَّهُمْ أَنَاسٌ يَتَطَهَّرُونَ﴾ (۸۲-۷) ان کے گھر والوں کو اپنے گاؤں سے نکال دو کہ یہ لوگ پاک بننا چاہتے ہیں۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُطَهِّرِينَ﴾ (۹-۱۰۸) اور خدا پاک رہنے والوں ہی کو پسند کرتا ہے۔

میں مُطَهِّرِينَ سے پاکیزہ قلب لوگ مراد ہیں۔

اور آیت کریمہ:

﴿وَمُطَهَّرُكَ مِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا﴾ (۳-۵۲) کے معنی یہ ہیں کہ خدا تجھے ان لوگوں سے نکال کر الگ لے جائے گا اور اس بات سے بلند و بالا رکھے گا کہ ان جیسے کام کرو۔ اسی معنی میں فرمایا:

﴿وَيُطَهِّرُكُمْ تَطْهِيرًا﴾ (۳۳-۳۳) اور تمہیں بالکل صاف کر دے۔

﴿وَوَطَّهَّرَكَ وَاصْطَفَاكَ عَلَىٰ نِسَاءِ الْعَالَمِينَ﴾ (۳-۴۲) اور پاک بنایا اور جہان کی عورتوں میں منتخب کیا۔

﴿ذَٰلِكُمْ أَزْكَىٰ لَكُمْ وَأَطْهَرُ﴾ (۲-۲۳۲) یہ تمہارے لیے نہایت خوب اور بہت پاکیزہ بات ہے۔

﴿ذَٰلِكُمْ أَطْهَرُ لِقُلُوبِكُمْ﴾ (۳۳-۵۳) یہ تمہارے دلوں کے لیے بہت پاکیزگی کی بات ہے۔

اور آیت کریمہ:

﴿لَا يَمَسُّهُ إِلَّا الْمُطَهَّرُونَ﴾ (۵۶-۷۹) اس کو وہی ہاتھ لگاتے ہیں جو پاک ہیں۔

کے معنی یہ ہیں کہ قرآن پاک کے حقائق کی معرفت انہی

صحیح نہیں ہے اس لیے کہ اَفْعَلَ وَفَعَلَ سے فَعُول کے وزن پر صیغہ صفت نہیں آتا بلکہ یہ وزن فَعَلَ کے ساتھ خاص ہے اور بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ لفظ طَهُور (معنوی) اعتبار سے تطہیر کو چاہتا ہے۔ کیونکہ طاہر (پاکیزہ) دو قسم پر ہوتا ہے ایک وہ جو خود تو پاک ہو مگر دوسری چیز کو پاک کرنے کی اس میں صلاحیت نہ ہو جیسے کپڑا کہ گویہ پاک ہے مگر دوسری چیز کو پاک نہیں کر سکتا۔ دوم وہ جو خود بھی پاک ہو اور دوسری چیز کو بھی پاک کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے جیسے پانی۔ چنانچہ قرآن پاک نے پانی کو طَهُور کہہ کر اسی معنی کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

### (ط و د)

الطَّوْدُ: بلند پہاڑ۔ قرآن پاک میں ہے:  
﴿كَالطَّوْدِ الْعَظِيمِ﴾ (۲۶-۴۳) کہ گویا بڑا پہاڑ ہے۔  
الطَّوْدُ کے معنی ہی بڑے بلند پہاڑ کے ہیں۔ مگر اس کے باوجود اس کے وصف میں عظیم کہہ کر اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ وہ پانی بلند پہاڑ کی طرح تھانہ یہ کہ وہ سب پہاڑوں سے بلند تر تھا۔

### (ط و ر)

طَوَارُ الدَّارِ وَطَوَارُهُ کے معنی گھر کی عمارت کے امتداد یعنی لمبا ہونے اور پھیلنے کے ہیں۔ محاورہ ہے:  
عَدَا فُلَانٌ طَوْرَهُ: فلاں اپنی حدود سے تجاوز کر گیا۔  
لَا أَطْوِرُ بِهِ میں اس کے مکان کے صحن کے قریب تک نہیں جاؤں گا۔  
فَعَلَ كَذَا طَوْرًا بَعْدَ طَوْرٍ: اس نے ایک بار کے بعد

دی گئی ہے بعض علماء نے کہا ہے کہ دل کو پاک و صاف رکھنا مراد ہے حتیٰ کہ اس کے اندر وہ سکون پیدا ہو سکے جس کا ذکر کہ آیت:

﴿هُوَ الَّذِي أَنزَلَ السَّكِينَةَ فِي قُلُوبِ الْمُؤْمِنِينَ﴾ (۴۸-۴۹) وہی تو ہے جس نے مومنوں کے دلوں پر تسلی نازل فرمائی۔ میں پایا جاتا ہے۔

الطَّهْوَرُ: یہ کبھی مصدر ہوتا ہے۔ جیسا کہ سیبویہ نے اہل عرب سے تَطَهَّرْتُ طَهُورًا وَتَوَضَّأْتُ وَضُوءًا کا محاورہ نقل کیا ہے۔ لہذا یہ فَعُول کے وزن پر مصدر ہے۔ جیسا کہ وَقَدْتُ وَقُودًا ہے اور کبھی اسم ہوتا ہے جیسا کہ فَطُورٌ، ہر اس چیز کو کہا جاتا ہے جس سے روزہ کھولا جائے اسی طرح وَجُورٌ سَقُوطٌ اور ذُرُورٌ ہیں اور کبھی صیغہ صفت ہوتا ہے جیسا کہ رَسُولٌ اور اس کے ہم وزن دیگر اسمائے صفت ہیں اور اسی معنی کے لحاظ سے فرمایا:

﴿وَسَقَّيْهُمْ رَهُمُ شَرَابًا طَهُورًا﴾ (۷۶-۲۱) اور ان کا پروردگار ان کو نہایت پاکیزہ شراب پلائے گا۔

تو اس میں تنبیہ کی ہے کہ ان کے مشروبات اہل دوزخ کے مشروبات کے خلاف ہوں گے جن کا ذکر کہ آیت:

﴿وَيُسْقَىٰ مِنْ مَّاءٍ صَدِيدٍ﴾ (۱۳-۱۶) اور اسے پیپ کا پانی پلایا جائے گا۔ میں پایا جاتا ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَأَنزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً طَهُورًا﴾ (۲۵-۴۸) اور ہم آسمان سے پاک اور تھرا ہوا پانی برساتے ہیں۔

میں اصحاب شافعی طَهُور بمعنی مُطَهَّر لیتے ہیں لیکن یہ لفظ

① انظر للبحث اصلاح المنطق ۳۳۲-۳۳۰ باب فَعُول ۱۲.

② کما روی فی الحدیث ((الطهور ماء والحل مبتتہ)).

③ قال الزمخشري انه مأخوذ من البناء المنطادای العالی والفاق (ص ۲۶۵ ج ۲).

دوسری بار یہ کام کیا اور آیت کریمہ:

﴿وَقَدْ خَلَقْنَاكُمْ أَطْوَارًا﴾ (۱۷-۱۳) کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ اَطْوَارًا سے ان مختلف منازل و مدارج کی طرف

اشارہ ہے جو کہ آیت:

﴿وَحَلَقْنَاكُمْ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُضْغَةٍ﴾ (۵-۲۲) ہم نے تم کو (پہلی بار بھی) تو پیدا کیا تھا (یعنی ابتداء میں) مٹی سے پھر اس سے نطفہ بنا کر پھر اس سے خون کا لوتھڑا بنا کر پھر اس سے بوٹی بنا کر۔

میں مذکور ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ اس سے مختلف احوال مراد ہیں جن کی طرف آیت:

﴿وَإِخْتِلَافِ السِّيَاقِ وَالْوَأْنِ﴾ (۳-۳۰) اور تمہاری زبانوں اور رنگوں کا جدا جدا ہونا۔

میں اشارہ فرمایا ہے یعنی جسمانی اور اخلاقی تفاوت جو ہر معاشرہ میں نمایاں طور پر پایا جاتا ہے۔

اَلطَّوْرُ (ایلہ کے قریب ایک خاص پہاڑ کا نام ہے) اور بعض نے کہا ہے ہر پہاڑ کو طور کہہ سکتے ہیں۔ اور بعض کے نزدیک طور سے وہ سلسلہ کوہ مراد ہے جو کہ ارض کو محیط ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَالطُّورِ وَكِتَابٍ مَسْطُورٍ﴾ (۵۲-۲۰) کوہ طور کی قسم اور کتاب کی جو لکھی ہوئی ہے۔

﴿وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الطُّورِ﴾ (۲۸-۳۶) اور نہ تم اس وقت طور کے کنارے پر تھے۔

﴿وَطُورِ سِينِينَ﴾ (۹۵-۳) اور طور سینین کی۔ ﴿وَنَادَيْنَاهُ مِنْ جَانِبِ الطُّورِ الْأَيْمَنِ﴾ (۱۹-۵۲) اور

ہم نے ان کو طور کی ذی جانب سے پکارا۔

﴿وَرَفَعْنَا فَوْقَهُمُ الطُّورَ﴾ (۲-۹۳) اور کوہ طور کو تم پر اٹھا کر کھڑا کیا۔

### (طوع)

اَلطَّوْعُ کے معنی (بطیب خاطر) تابعدار ہو جانا کے ہیں اس کے بالمقابل كَرْهُ ہے جس کے معنی ہیں: کسی کام کو ناگواری اور دل کی کراہت سے سرانجام دینا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿إِنِّيَا طَوْعًا أَوْ كَرْهًا﴾ (۱۱-۴۱) آسمان و زمین سے فرمایا: دونوں آؤ دل کی خوشی سے یا ناگواری سے۔

﴿وَلَهُ أَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ طَوْعًا أَوْ كَرْهًا﴾ (۸۳-۳) حالانکہ سب اہل آسمان و زمین بطیب خاطر یا دل کے جبر سے خدا کے فرمانبردار ہیں۔

یہی معنی اَلطَّاعَةُ کے ہیں لیکن عام طور پر طَاعَةُ کا لفظ کسی حکم کے بجالانے پر آ جاتا ہے قرآن پاک میں ہے:

﴿وَيَقُولُونَ طَاعَةُ﴾ (۴-۸۱) اور یہ لوگ منہ سے تو کہتے ہیں کہ ہم دل سے آپ کے فرمانبردار ہیں۔

﴿طَاعَةُ وَقَوْلٌ مَعْرُوفٌ﴾ (۲۷-۲۱) (خوب بات) فرمانبرداری اور پسندیدہ بات کہنا ہے۔

طَاعَ لَهُ يَطُوعُ وَاطَّاعَهُ يُطِيعُهُ: کسی کی فرمانبرداری کرنا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَاطِيعُوا الرَّسُولَ﴾ (۴-۵۹) اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرو۔

﴿وَمَنْ يُطِيعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ﴾ (۴-۸۰) جو

۱ وفی البخاری عن مجاہدان الطور اسم سریانی بمعنی الجبل ولكن القرآن اطلقه علی جبل مخصوص واختلف فی تعینہ معجم البلدان للحموی.

اِسْتِطَاعَةً کی ضد عجز ہے یعنی ان اشیاء میں سے ایک دویا سب کا حاصل نہ ہونا اور جب کسی شخص کو یہ ساری چیزیں حاصل ہو جائیں تو اسے مُسْتَطِيعٌ مطلق کہا جاتا ہے اور جب ان میں سے کوئی بھی حاصل نہ ہو تو اسے عاجز مطلق کہا جائے گا اور جب کچھ حاصل ہوں اور کچھ حاصل نہ ہوں تو گو ایک اعتبار سے وہ مستطیع ہے مگر دوسرے اعتبار سے وہ عاجز ہے اور اسے عاجز کہنا زیادہ بہتر ہے اور استطاعت قدرت سے اخص ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿لَا يَسْتَطِيعُونَ نَصْرَ أَنْفُسِهِمْ﴾ (۲۱-۲۳) وہ نہ تو آپ اپنی مدد کر سکتے ہیں۔

﴿فَمَا اسْتَطَاعُوا مِنْ قِيَامٍ﴾ (۵۱-۵۵) پھر وہ نہ تو اٹھنے کی طاقت رکھتے تھے۔

﴿مَنْ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا﴾ (۳-۹۷) جو اس (گھر) تک جانے کا مقدور رکھے۔

یعنی اس کے پاس یہ چار چیزیں مہیا ہو جائیں اور حدیث میں استطاعت حج کی جو تشریح زاد راہ اور سواری سے کی گئی ہے۔ ﴿(۲۲) تو اس سے صرف ان اسباب و ذرائع کی طرف اشارہ فرمایا ہے جو حج کے لیے لازم ہیں ورنہ ظاہر ہے کہ باقی تینوں چیزوں کا ہونا تو عقلاً ہر کام کے لیے لازم ہے اور شرعاً ان کے بغیر کسی کو مکلف بنانا ہی جائز نہیں ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿لَوْ اسْتَطَعْنَا لَخَرَجْنَا مَعَكُمْ﴾ (۹-۴۲) اگر ہم طاقت رکھتے تو آپ کے ساتھ نکل کھڑے ہوتے۔

میں استطاعت سے سواری، مال اور دیگر ذرائع مراد ہیں اسی طرح آیت کریمہ:

شخص رسول کی فرمانبرداری کرے گا بے شک اس نے خدا کی فرمانبرداری کی۔

﴿وَلَا تَطِيعُ الْكَافِرِينَ﴾ (۳۳-۸) اور کافروں کا کہنا نہ مانو۔

اور حضرت جبریل علیہ السلام کے متعلق فرمایا:

﴿مُطَاعٌ ثُمَّ آمِنٌ﴾ (۸۱-۲۱) سردار اور امانت دار ہے۔  
﴿التَّطَوُّعُ﴾: (تفعل) اس کے اصل معنی تو تکلیف اٹھا کر حکم بجالانا کے ہیں۔ مگر عرف میں نوافل کے بجالانے کو تَطَوُّعٌ کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَهُ﴾ (۲۲-۱۸۴) اور جو کوئی شوق سے نیکی کرے تو وہ اس کے حق میں زیادہ اچھا ہے۔

ایک قرأت میں وَمَنْ يَطْوِعَ خَيْرًا ہے۔

اِلِاسْتِطَاعَةُ: (استفعال) یہ طوع سے استفعال کے وزن پر ہے اور اس کے معنی ہیں: کسی کام کو سرانجام دینے کے لیے جن اسباب کی ضرورت ہوتی ہے ان سب کا موجود ہونا مگر محققین کے نزدیک اِسْتِطَاعَةُ نام ہے ان اسباب و ذرائع اور صلاحیتوں کا جن کے ذریعہ انسان کو کسی کام کے کرنے پر قدرت ہو جائے اور وہ چار چیزیں ہیں۔ (۱) فاعل کا مخصوص ڈھانچہ (۲) فعل کا تصور (۳) مادہ جو فعل کے اثر کو قبول کر سکے (۴) اگر وہ فعل کسی آلہ کا محتاج ہے تو اس آلہ کا فراہم ہونا مثلاً لکھنا کہ کاتب لکھنے کے لیے ان چار چیزوں کا محتاج ہے اور جب کسی شخص کو ان اشیاء میں سے ایک چیز بھی حاصل نہ ہو تو اس کو غیر مستطیع کہا جائے گا۔

① أخرجه الترمذی وابن ماجہ من حدیث ابی ہریرۃ وابن عباس والحاکم من حدیث انس قال فی الکاف اخرجہ الدارقطنی باسانید ضعیفۃ قال البیہقی والمصواب الروایۃ عن الحسن مرسلًا ولا یشیت مرفوعاً راجع تخریج الکشاف.

یہ بات کہی تھی کیونکہ اس وقت ان کو صحیح طور پر اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل نہیں تھی اور بعض نے کہا ہے کہ یہاں استطاعت بمعنی قدرت نہیں ہے بلکہ ان کا مقصد یہ تھا کہ کیا ماندہ کا اتارنا تقاضائے حکمت کے خلاف تو نہیں اور بعض نے کہا ہے کہ یہاں یَسْتَطِيعُ بمعنی يُطِيعُ ہے یعنی کیا تمہارا پروردگار ہماری اس عرض کو قبول فرما سکتا ہے۔ جیسا کہ آیت کریمہ:

﴿مَالِ لِلظَّالِمِينَ مِنْ حَیْمٍ وَلَا شَفِيعٍ يُطَاعُ﴾ (۱۸-۴۰)

اور ظالموں کا کوئی دوست نہیں ہوگا اور نہ سفارشی، جس کی بات قبول کی جائے۔

میں یطاع بمعنی یُجَابُ ہے یعنی ایسا جس کی بات مانی جاسکے۔ اور ایک قرأت میں هَلْ تَسْتَطِيعُ رَبِّكَ بھی ہے یعنی کیا تم اپنے پروردگار سے یہ بات منوا سکتے ہو۔ جیسا کہ محاورہ ہے:

هَلْ تَسْتَطِيعُ الْأَمِيرُ أَنْ يَفْعَلَ كَذَا (کہ کیا تم امیر سے یہ بات منوا سکتے ہو) اور آیت کریمہ:

﴿وَطَوَّعَتْ لَهُ نَفْسُهُ﴾ (۳۰-۵) مگر اس کے نفس نے اسے ترغیب دی۔

میں طَوَّعَتْ کے معنی ہیں کہ نفسانی جذبات نے تسویل سے اسے اس پر آمادہ کر لیا اور وہ اس کام کرنے پر راضی ہو گیا اور طَوَّعَتْ کا صیغہ اَطَاعَتْ سے زیادہ بلیغ ہے اور طَوَّعَتْ لَهُ نَفْسُهُ کا محاورہ تَابَتْ عَنْ كَذَا نَفْسُهُ کا بالمقابل استعمال ہوتا ہے جس کے معنی ہیں کہ اسے یہ کام کرنا گوارا نہیں ہے اور تَطَوَّعَ كَذَا کے معنی ہیں اس نے رضا مندی سے اس کام کے لیے تکلیف اٹھانا گوارا کر لیا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَإِنَّ اللَّهَ شَاكِرٌ عَلِيمٌ﴾ (۱۸۵-۲)

اور جو کوئی نیک کام کرے تو خدا قدر شناس اور دانہ ہے۔

﴿الَّذِينَ يَلْمِزُونَ الْمُطَّوِّعِينَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ﴾ (۴۹-۹)

﴿وَمَنْ لَمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا﴾ (۲۵-۴) اور جو شخص تم میں سے مقدور نہ رکھے۔

﴿لَا يَسْتَطِيعُونَ حِيلَةً﴾ (۹۸-۴) کہ نہ تو کوئی چارہ کر سکتے ہیں۔

میں بھی یہی معنی مراد ہیں۔

اور کبھی فُلَانٌ لَا يَسْتَطِيعُ سے یہ معنی مراد ہوتے ہیں کہ عدم مزاولت کی وجہ سے یہ کام اس پر دشوار ہے یا تو اس لیے کہ جن اسباب و ذرائع کی ضرورت ہے وہ اس کے پاس موجود نہیں ہیں اور یا اس لیے کہ اس کام کا تصور یعنی خاکہ اس کے ذہن میں نہیں ہے اس حالت میں انسان کو مکلف بنانا صحیح ہوتا ہے اور اسے معذور نہیں سمجھا جاتا۔ چنانچہ آیات:

﴿لَنْ تَسْتَطِيعَ مَعِيَ صَبْرًا﴾ (۷۲-۱۸) تم میرے ساتھ رہ کر صبر نہیں کر سکو گے۔

﴿مَا كَانُوا يَسْتَطِيعُونَ السَّمْعَ وَمَا كَانُوا يُبْصِرُونَ﴾ (۲۰-۱۱) کیونکہ یہ شدت کفر سے تمہاری بات نہیں سن سکتے اور نہ تم کو دیکھ سکتے تھے۔ اور

﴿وَكَانُوا لَا يَسْتَطِيعُونَ سَمْعًا﴾ (۱۰۱-۱۸) اور وہ سننے کی طاقت نہیں رکھتے تھے۔

میں استطاعت کی نفی سے یہی معنی مراد ہیں اور آیت کریمہ:

﴿وَلَنْ تَسْتَطِيعُوا أَنْ تَعْدِلُوا﴾ (۱۲۹-۴) اور تم خواہ کتنا ہی چاہو ہرگز برابری نہیں کر سکو گے بھی اسی معنی پر محمول ہے حالانکہ ان تمام آیات میں استطاعت کی نفی کے باوجود انہیں مکلف بنایا گیا ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿هَلْ يَسْتَطِيعُ رَبُّكَ أَنْ يُنْزِلَ عَلَيْنَا﴾ (۱۱۲-۵) کیا تمہارا پروردگار ایسا کر سکتا ہے کہ ہم پر..... نازل کرے۔

کی تفسیر میں بعض نے بیان کیا ہے کہ انہوں نے ازراہ نادانی





عذاب) نے آ پکڑا۔

طَائِفُ الْقَوْمِ: خانہ کمان جو گوشہ اور ابھر کے درمیان ہوتا ہے۔ اَلطَّوْفُ (کنایہ) پلیدی۔

### (طوق)

اَلطَّوْفُ: اس حلقہ کو کہتے ہیں جو پیدائشی طور پر گردن کے گرد بنا ہوتا ہے جیسے کبوتری کی گردن میں یا مصنوعی ہو جیسے سونے چاندی کا حلقہ جو گلے میں ڈالا جاتا ہے پھر بطور توسع کے قَلْدُتْہ کی طرح طَوَفْتْہ کَذَا کا محاورہ بھی استعمال ہوتا ہے اور قرآن مجید میں جو مال کے متعلق: ﴿سَيُطَوَّفُونَ مَا بَخِلُوا بِهِ﴾ (۳-۸۰) وہ جس مال میں بخل کرتے ہیں (قیامت کے دن) اس کا طوق بنا کر ان کی گردنوں میں ڈالا جائے گا۔

فرمایا ہے تو یہ بطور تشبیہ کے ہے۔ جیسا کہ حدیث میں ہے ﴿(بَاتِي أَحَدَكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ شَجَاعٌ أَقْرَعٌ لَهُ زَبِيَّتَانِ فَيَتَطَوَّقُ بِهِ فَيَقُولُ أَنَا الزَّكُوَةُ النَّبِيُّ مَنَعَتِي)﴾ کہ قیامت کے دن تم میں سے کسی ایک کے پاس گنجا سانپ آئے گا۔ اور اس کے گلے میں طوق بن کر پڑ جائے گا اور کہے گا کہ میں تمہارا خزانہ ہوں جس کی تم نے زکوٰۃ ادا نہیں کی تھی۔

اَلطَّاقَةُ: اس مقدرت اور قوت کا نام ہے جس سے کوئی کام بہ مشقت کیا جاسکے جیسے کسی نے اس کی گردن میں طوق ڈال

﴿فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِنْهُمْ طَائِفَةٌ لَيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ﴾ (۱۱۲-۹) تو یوں کیوں نہیں کیا کہ ہر ایک جماعت میں چند اشخاص نکل جاتے تاکہ دین کا علم سیکھتے۔ میں بعض نے کہا ہے کہ کبھی طَائِفَةٌ کا لفظ ایک فرد پر بھی بولا جاتا ہے۔ ﴿چنانچہ آیت کریمہ:

﴿وَرَأَى طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ﴾ (۹-۳۹) اور اگر مومنوں میں سے کوئی دو فریق..... اور آیت کریمہ:

﴿إِذْ هَمَّتْ طَائِفَتَانِ مِنْكُمْ﴾ (۳-۱۲۲) اس وقت تم میں سے دو جماعتوں نے چھوڑ دینا چاہا۔

طَائِفَةٌ سے ایک فرد بھی مراد ہو سکتا ہے مگر جب طَائِفَةٌ سے جماعت مراد لی جائے تو یہ طَائِفُ کی جمع ہوگا اور جب اس سے واحد مراد ہو تو اس صورت میں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جمع بول کر مفرد سے کنایہ کیا ہو اور یہ بھی کہ رَاوِيَّةٌ وَعَلَامَةٌ کی طرح مفرد ہو اور اس میں تاثرائے مبالغہ ہو اَلطَّوْفَانُ: وہ مصیبت یا حادثہ جو انسان کو چاروں طرف سے گھیر لے اس بنا پر آیت کریمہ:

﴿فَارْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوفَانَ﴾ (۷-۱۳۳) تو ہم ان پر طوفان وغیرہ کتنی کھلی ہوئی نشانیاں بھیجیں۔ میں طوفان بمعنی سیلاب بھی ہو سکتا ہے کیونکہ نوح علیہ السلام پر جو عذاب آیا تھا وہ پانی کی صورت میں ہی تھا اور دوسری جگہ فرمایا:

﴿فَأَخَذَهُمُ الطُّوفَانُ﴾ (۲۹-۱۴) پھر ان کو طوفان (کے

① عن ابن عباس والحسن ومجاهد و ابراہیم و فی الطبرسی ۱۰۰۹/۵ وهو المروى عن ابی جعفر

② وفي الحديث: نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن متحدثين على طوفهما وفي الآخر لا يصلين احدكم وهو يدافعه الطوف

والبول انظر الفائق (۳۷/۲) والنهاية واللسان (طوف)

③ اصله في البخاري من حديث ابی هريرة ورحمته - عن ابن مسعود و (ن، ه) عن ابی هريرة و (حم، ن، عن ابن عمر) واليزار

و ابی حزيمة والرويانى (ع، حب، طب، خل، ك، عن ثوبان راجع كنز العمال ج ۳، رقم: (۱۲۱-۱۲۲: ۱۲۲۵، ۱۲۳۶،

۱۲۳۷) الكشف مع التخریج (۲۳۳/۱).

اور لبسا ہونا کے ہیں۔ یہ اَلْقَصَر کے مقابلہ میں آتا ہے اور اعیان و اعراض مثلاً زمانہ وغیرہ سب کے متعلق استعمال ہوتا ہے قرآن پاک میں ہے: ﴿فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْأَمَدُ﴾ (۱۶-۵۷) پھر ان پر لبسا عرصہ گزر گیا۔

﴿سَبْحًا طَوِيلًا﴾ (۷-۷۳) بہت لمبے شغل (ہوتے ہیں) طَوِيلٌ وَطَوَالٌ: جیسے عَرِيضٌ وَعَرَاضٌ: دراز لباس کی جمع طَوَالٌ آتی ہے۔ اور بعض نے طِيَالٌ بھی کہا ہے اور لبسا ہونے کی مناسبت سے جانور کی پچھاڑی کی رسی کو طَوَلٌ کہا جاتا ہے طَوَلٌ قَرَسَكَ: اپنے گھوڑے کی پچھاڑی باندھ دے۔ طَوَالُ الدَّهْرِ: عرصہ دراز۔

تَطَاوَلٌ فُلَانٌ: درازی یا وسعت کو ظاہر کرنا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿فَتَطَاوَلَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ﴾ (۲۸-۳۵) پھر ان پر لبسا عرصہ گزر گیا۔

اور طَوَلٌ کا لفظ خاص کرفضل و احسان کے معنی میں استعمال ہوتا ہے قرآن پاک میں ہے۔

﴿شَدِيدُ الْعِقَابِ ذِي الطَّوْلِ﴾ (۳۰-۳) سخت عذاب دینے والا اور صاحب کرم ہے۔

اور آیت کریمہ ہے:

﴿إِسْتَأْذَنَكَ أَوْلُوا الطَّوْلِ مِنْهُمْ﴾ (۹-۸۶) تو جوان میں دولت مند ہیں وہ تم سے اجازت طلب کرتے ہیں۔ میں أَوْلُوا لَطَوِلٌ سے خوش حال طبقہ مراد ہے اور آیت کریمہ ہے: ﴿وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلاً﴾ (۴-۲۵) اور جو شخص تم میں سے..... مقدور نہ رکھے۔

میں طَوَلٌ کنایہ ہے اس مال سے (جو عورت کو) مہر میں یا نان و نفقہ کے طور پر دینا پڑتا ہے۔

دیا ہو پس آیت ہے: ﴿وَلَا تُحْمِلُنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهِ﴾ (۲-۲۸۶) کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہم پر ایسی ذمہ داری نہ ڈال جس کے اٹھانے کی ہم میں قدرت نہ ہو بلکہ اس سے ایسے کام مراد ہیں جن کا کرنا ہمارے لیے دشوار ہو جیسا کہ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ﴾ (۷-۱۵۷) اور ان پر سے بوجھ..... اتارتے ہیں۔

اسی طرح آیت کریمہ:

﴿وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ﴾ (۲-۹۳) اور تم پر سے بوجھ بھی اتار دیا۔

میں وِزْرٌ سے ان دشوار عبادات کا بوجھ مراد ہے جن کا ترک، گناہ کا موجب تھا۔ اسی طرح آیت ہے:

﴿قَالُوا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوتَ وَجُنُودِهِ﴾ (۲-۲۳۹) تو کہنے لگے کہ آج ہم میں جالوت اور اس کے لشکر سے مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں۔ میں بھی طَاقَةُ کی نفی سے

بھی معنی مراد ہے اور کبھی طَاقَةُ کی نفی سے قدرت کا انکار مراد ہوتا ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مَسْكِينٍ﴾ (۲-۱۸۴) اور جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھیں (لیکن

رکھیں نہیں) وہ روزے کے بدلے محتاج کو کھانا کھلا دیں۔

کے بظاہر معنی تو یہی ہیں کہ یہ جو شخص روزہ کی طاقت رکھتا ہو اس پر فدیہ لازم ہے خواہ روزہ رکھے یا نہ رکھے مگر اس امر پر اجماع ہو چکا ہے کہ صرف دوسری شرط کے ساتھ فدیہ لازم ہوگا۔ ایک قرأت میں يُطَوَّقُونَهُ ہے یعنی جن پر ذمہ داری ڈالی گئی ہے کہ وہ بہ مشقت روزہ رکھیں۔

## (طَوَلٌ)

الطَّوْلُ: یہ اسمائے اضافیہ سے ہے اور اس کے معنی دراز

ماخوذ ہوگا جس کے معنی لپیٹ دینا کے ہیں اور یا طَوَى اللہ عُمَرُہ سے ماخوذ ہوگا اور آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ جس روز آسمان کو فنا کر دیا جائے گا اور آیت:

﴿إِنَّكَ بِالْوَادِي الْمُقَدَّسِ طَوَى﴾ (۲۰-۱۲) تم (یہاں) پاک میدان (یعنی) طوی میں ہو۔ کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ طَوَى اسی وادی المقدس کا نام ہے جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام پہنچ چکے تھے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ طوی اس مرتبہ کی طرف اشارہ ہے جس سے انہیں اجزاء کے طور پر نوازا گیا تھا اگر وہ اس مرتبہ کو مساعی اور اجتہاد کی راہ سے حاصل کر سکتے تھے وادی نبوت تک پہنچنے کی تمام مسافتیں ان کے لیے لپیٹ دی گئیں پھر اگر اسے اس وادی کا نام قرار دیا جائے تو اسے غیر منصرف بھی پڑھ سکتے ہیں اور منصرف بھی ۵ اور اگر اسے طَوَيْت کا مصدر مانا جائے تو منصرف ہی پڑھا جائے گا اور ثَنَى و ثَنَى کی طرح فاعلہ (ط) پر دونوں حرکتیں جائز ہوں گی اور اس صورت میں آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم نے موسیٰ کو دو مرتبہ پکارا۔

### (ط ی ب)

طَابَ (ض) الشَّيْءُ يُطَيَّبُ طَيِّباً فَهُوَ طَيِّبٌ (کے معنی کسی چیز کے پاکیزہ اور حلال ہونے کے ہیں)

طَالُوْتُ: یہ اسمِ نجی ہے اور بنی اسرائیل کے ایک با اقبال بادشاہ کا نام تھا۔ ۱

### (ط و ی)

طَوَيْتُ الشَّيْءَ طَيًّا: کے معنی ہیں کسی چیز کو اس طرح لپیٹ لینا۔ جیسا کہ کپڑے کو اس کی ورز پر لپیٹ دیا جاتا ہے۔ چنانچہ اسی معنی میں فرمایا: ﴿يَوْمَ نَطْوِي السَّمَاءَ كَطَيِّ السِّجِلِّ لِلْكُتُبِ﴾ (۲۱-۱۰۳) جس دن ہم آسمان کو اسی طرح لپیٹ لیں گے جس طرح لکھے ہوئے کاغذوں کا طومار لپیٹ دیا جاتا ہے۔ اسی سے طَوَيْتُ الْفُلْكَ (جنگل کو قطع کرنا) کا محاورہ ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ جنگل کی مسافت کو قطع کیا گیا اور راستوں کو لپیٹ لیا طَوَى اللہ عُمَرُہ: اللہ تعالیٰ نے اسکی عمر ختم کر دی گویا اس کی مدتِ عمر کو لپیٹ دیا۔ شاعر نے کہا ہے ۵ (الوافر)

(۲۹۵) طَوْنَكَ خَطُوبٌ دَهْرَكَ بَعْدَ نَشْرِ حوادثِ زمانہ نے پھیلانے کے بعد تمہیں لپیٹ دیا (یعنی تمہاری عمر ختم کر دی) اور بعض نے کہا ہے کہ آیت کریمہ: ﴿وَالسَّمُوتُ مَطْوِيَّاتٌ بِيَمِينِهِ﴾ (۳۹-۶۷) اور آسمان اس کے داہنے ہاتھ میں لپٹے ہوئے گے۔

میں مَطْوِيَّاتٌ کا لفظ یا تو طَوَيْتُ الشَّيْءَ کے محاورہ سے

۱ وقد مر في (ط ل ت) وقيل ان اسمه بالعبرانية كان شاول بن قيس من اولاد بنيامين بن يعقوب وَلَقِبَ بطالوت لظوله و كان اطول من كل أحد ۱۲.

۲ قاله ابو العتاهيه (اسماعيل بن القاسم) يرثي على ابن ثابت و تمامه : كذاك خطوبه نشرأ وطبا والبيت في الكامل ۳۵۶ والبيان (۲۱۶: ۱/۱۳۰: ۳) والزجاجي ۵۹ والاغانى (۱۴۲: ۳) والصناعتي ۱۱ والو حشيات (الحمامة الصغرى) ۱۳۲ في ستة ابيات و ذيل الامالي ۲ في خمسة ونسبها الى امرأة و السمط ۴ قال الاستاذ الميمحي : والابيات لابي العتاهيه حقاً رواها ۴ الليثي و محمد بن يزيد والزجاجي والا صبهاني وابن عدي و آخرون يرثي بها على بن ثابت و كان صديقاً له وله فيه ثلاث مراتب راجع ادب الدنيا للماورى بشرح اويس و فارزنجاني المعروف بخان زاده ۲۱۶ والمعاهد (۱۸۵/۲).

۳ قال في الفتوحات ليس يريد به طياً بعلاج و انتصاب و ان المراد بذلك الفناء والذهاب (۷۴۹/۳). و اما صرفه فلانه اسم الواد مذکور و اما غيره فللتانيث مع العلمية راجع محاز القرآن (۱۶: ۲). يمكن ان يكون معناه ان الوادي قدس مرتين (الكشاف ۵۵/۳).

﴿الْيَوْمَ أُحِلَّ لَكُمْ الطَّيِّبَاتُ﴾ (۵-۵) آج تمہارے

لئے سب پاکیزہ چیزیں حلال کر دی گئیں۔

کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ طہیات سے وہ جانور مراد

ہیں جنہیں ذبح کر کے کھایا جاتا ہے اور آیت: ﴿رَزَقْنَكُمْ

مِنَ الطَّيِّبَاتِ﴾ (۱۶-۷۲) اور کھانے کو تمہیں پاکیزہ

چیزیں دیں۔

میں مال غنیمت کی طرف اشارہ ہے۔ اور انسانوں سے

”طہیبت“ اس انسان کو کہا جاتا ہے جو جہالت، فسق اور قبیح

اعمال کی نجاست سے پاک ہو اور علم و ایمان اور محاسن اعمال

کے زیور سے آراستہ چنانچہ آیت کریمہ: ﴿الَّذِينَ تَتَوَفَّيْهُمْ

الْمَلَائِكَةُ طَيِّبِينَ﴾ (۱۶-۳۲) جب فرشتے ان کی

جانیں نکالتے ہیں اور یہ (کفر و شرک سے) پاک ہوتے

ہیں۔

میں طہیین سے ایسے ہی لوگ مراد ہیں نیز فرمایا: ﴿طَبِئْتُمْ

فَادْخُلُوْهَا خَالِدِينَ﴾ (۳۹-۷۳) تم بہت اچھے رہے

اب اس میں ہمیشہ کے لیے داخل ہو جاؤ۔ ﴿مَنْ لَّدُنْكَ

ذُرِّيَّةٌ طَيِّبَةٌ﴾ (۳-۳۸) اپنی جناب سے اولاد طیبہ۔

﴿لِيُمَيِّزَ اللَّهُ الْخَبِيثَ مِنَ الطَّيِّبِ﴾ (۸-۳۷)

تاکہ خدا، ناپاک سے الگ کر دے۔

اور آیت کریمہ:

﴿وَالطَّيِّبَاتُ لِلطَّيِّبِينَ﴾ (۲۳-۲۶) اور پاک عورتیں

پاک مردوں کے لیے ہیں۔ میں اس امر پر تنبیہ کی ہے کہ

پاکیزہ اعمال پاکیزہ انسانوں سے ہی سرزد ہوتے ہیں۔

چنانچہ مودی ہے: ﴿(۲۵) اَلْمُؤْمِنُ اَطْيَبُ مِنْ عَمَلِهِ

وَالْكَافِرُ اَخْبَثُ مِنْ عَمَلِهِ﴾ (کہ مومن اپنے عمل کی وجہ

قرآن میں ہے:

﴿فَانْكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ﴾ (۳-۳) تو ان کے سوا جو

عورتیں تم کو پسند ہوں..... ان سے نکاح کر لو۔

﴿فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ مِنَ النِّسَاءِ﴾ (۳-۴) ہاں اگر وہ اپنی

خوشی سے..... تم کو چھوڑ دیں۔

اصل میں طہیبت اسے کہا جاتا ہے جس سے انسان کے

حواس بھی لذت یاب ہوں اور نفس بھی اور شریعت کی رو سے

الطَّعَامُ الطَّيِّبُ اس کھانے کو کہا جاتا ہے جو جائز طریق

سے حاصل کیا جائے اور جائز جگہ سے جائز اندازہ کے مطابق

لیا جائے کیونکہ جو غذا اس طرح حاصل کی جائے وہ دنیا اور

آخرت دونوں میں خوشگوار ثابت ہوگی ورنہ دنیا کی خوشگوار

چیزیں آخرت میں نقصان دہ ثابت ہوں گی اسی بنا پر قرآن

پاک طہیب چیزوں کے کھانے کا حکم دیتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿كُلُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ﴾ (۲-۱۷۲) جو

پاکیزہ چیزیں ہم نے تمہیں عطا فرمائی ہیں ان کو کھاؤ۔

﴿وَكُلُوا مِمَّا رَزَقَكُمْ اللَّهُ هَلَالًا طَيِّبًا﴾ (۵-۸۸)

اور جو حلال، طہیب روزی خدا نے تمہیں دی ہے اسے کھاؤ۔

﴿لَا تُحَرِّمُوا طَيِّبَاتِ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكُمْ﴾ (۵-۸۷)

جو پاکیزہ چیزیں خدا نے تمہارے لیے حلال کی ہیں

ان کو حرام نہ کرو۔

﴿كُلُوا مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَاعْمَلُوا صَالِحًا﴾ (۲۳-۵۱)

پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور نیک اعمال کرو۔ اور یہی معنی

آیت:

﴿وَالطَّيِّبَاتِ مِنَ الرِّزْقِ﴾ (۷-۳۲) اور کھانے (پینے)

کی پاکیزہ چیزیں۔ میں مراد ہیں۔ اور آیت:

طابُ کہا جاتا ہے ❶ اور آیت کریمہ: ﴿طُوبَىٰ لَهُمْ﴾ میں بعض نے کہا ہے (۱۳-۲۹) ان کے لیے خوشحالی ہے۔ میں بعض نے کہا ہے کہ طُوبَىٰ جنت میں ایک درخت کا نام ہے ❷ اور بعض نے کہا ہے کہ اس سے ہر قسم کی خوش گواریاں مراد ہیں جو جنت میں حاصل ہوں گی مثلاً بقاء، عزت، غنا وغیرہ جن کے زوال کا اندیشہ نہیں ہوگا۔ ❸

### (طیر)

الطَّائِرُ: ہر پر دار جانور جو فضا میں حرکت کرتا ہے۔ طَارَ يَطِيرُ طَيْرًا: پرند کا اڑنا۔ الطَّيْرُ یہ طائر: کی جمع ہے۔ جیسے رَاكِبٌ کی جمع رُكَبٌ آتی ہے قرآن پاک میں ہے: ﴿وَلَا طَائِرٌ يَطِيرُ بِجَنَاحَيْهِ﴾ (۶-۳۸) یا پرند جو اپنے پروں سے اڑاتا ہے۔

﴿وَالطَّيْرُ مَحْشُورَةٌ﴾ (۳۸-۱۹) اور پرندوں کو بھی جو کہ جمع رہتے ہیں۔

﴿وَالطَّيْرُ صَافَاتٌ﴾ (۲۳-۳۱) اور پر پھیلائے ہوئے جانور بھی۔

﴿وَحُشِرَ لِسُلَيْمَانَ جُنُودُهُ مِنَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ وَالطَّيْرِ﴾ (۲۷-۱۷) اور سلیمان علیہ السلام کے لیے جنوں، انسانوں اور پرندوں کے لشکر جمع کئے گئے۔

﴿وَنَقَّذَ الطَّيْرَ﴾ (۲۷-۲۰) انہوں نے جانوروں کا جائزہ لیا۔

نَطِيرَ فُلَانٌ وَأَطِيرَ: اس کے اصل معنی تو کسی پرندہ سے شگون لینے کے ہیں پھر یہ ہر اس چیز کے متعلق استعمال

سے اطمینان اور کافرا اپنے عمل کی وجہ سے ضیعت (گندہ) ہوتا ہے)

اور آیت کریمہ ہے: ﴿وَلَا تَبَدَّلُوا الْخَبِيثَ بِالطَّيِّبِ﴾ (۳-۲) کے معنی یہ ہیں کہ اچھے اعمال کو چھوڑ کر بد اعمالیاں مت اختیار کرو اسی معنی میں فرمایا:

﴿وَمَثَلُ كَلِمَةٍ طَيِّبَةٍ كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ﴾ (۱۳-۲۶) پاک عمل کی مثل شجرہ طیبہ کی ہے۔

﴿إِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ﴾ (۳۵-۱۰) اسی کی طرف پاکیزہ کلمے چڑھتے ہیں۔ اور آیت کریمہ: ﴿وَمَسَاكِينُ طَيِّبَةٍ﴾ (۹-۷۲) کے معنی یہ ہیں..... مکانات صاف ستھرے اور فرحت بخش ہوں گے اور آیت کریمہ:

﴿بِلَدَّةٍ طَيِّبَةٍ وَرَبِّ عَفْوَ﴾ (۳۳-۱۵) (رہنے کو) پاکیزہ شہر ہے اور (وہاں بخشنے کو) خدائے غفار، میں بعض نے کہا ہے کہ جنت اور رب العزہ کے جوار کی طرف اشارہ ہے اور آیت کریمہ:

﴿صَعِيدًا طَيِّبًا﴾ (۵-۶) تو پاک مٹی لو۔ میں طیب سے پاک مٹی مراد ہے یعنی جس میں نجاست کی آمیزش نہ ہو اور اِسْتِنْجَاء کو بھی اِسْتِطَابَةٌ اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس سے پاکیزگی اور طہارت حاصل ہوتی ہے اور اَلْأَطْيَانُ سے کھانا نکاح مراد ہے۔ طَعَامٌ مُطَيَّبٌ لِلنَّفْسِ: وہ کھانا جس سے طبیعت کو فرحت حاصل ہو اور طَيِّبٌ کو طاب بھی کہا جاتا ہے اور مدینہ طیبہ میں ایک قسم کھجور ہوتی ہے جسے

❶ رطب ابن طاب .

❷ قال الزجاج وهذا مروى عن النبي صلى الله عليه وسلم وحمله سيبويه على الدعاء وقال هو في موضع رفع من هو و معطوفه وحسن ما ب .

❸ وبه قال ابو اسحاق ۱۲ .

کے گلے میں لٹکا دیا ہے۔ میں انسانی اعمال کو طائر کہا گیا ہے  
(کیونکہ عمل کے سرزد ہوجانے کے بعد انسان کو یہ اختیار نہیں  
رہتا کہ اسے واپس لے لے گیا وہ) اس کے ہاتھوں سے اڑ جاتا  
ہے تَطَائِرُ وہ نہایت تیزی سے گئے منتشر ہو گئے ہیں۔  
شاعر نے کہا ہے ﴿البسيط﴾

(۲۹۶) طَارُوا إِلَيْهِ زَرًّا فَأَبَتْ وَوَحْدَانًا  
تو جماعتیں بن کر اور اکیلے اکیلے اس کی طرف اڑتے چلے  
جاتے ہیں۔

فَجَرُّ مُسْتَطِيرٌ: منتشر ہونے والی صبح۔ قرآن پاک میں ہے:  
﴿وَيَخَافُونَ يَوْمًا كَانَتْ شَرُّهُ مُسْتَطِيرًا﴾ (۷۷-۷۸)  
اور اس دن سے جس کی سختی پھیل رہی ہوگی، خوف رکھتے ہیں۔  
غَبَارٌ مُسْتَطَارٌ: بلند اور منتشر ہونے والا غبار۔ فجر کو فاعل  
تصور کر کے اس کے متعلق مُسْتَطِيرٌ اسم فاعل کا صیغہ  
استعمال کرتے ہیں اور غبار کو مفعول تصور کر کے مُسْتَطَارٌ  
کہتے ہیں۔

فَرَسٌ مُطَارٌ: ہوشیار اور تیز رو گھوڑا۔  
خُذْ مَا طَارَ مِنْ شَعْرِ رَأْسِكَ: یعنی اپنے سر کے  
پراگندہ اور لمبے بال کاٹ ڈالو۔

### (ط ي ن)

الطَّيْنُ: پانی میں ملی ہوئی مٹی کو کہتے ہیں، گو اس

ہونے لگا ہے جس سے براشگون لیا جائے اور اسے منحوس سمجھا  
جائے قرآن پاک میں ہے:

﴿إِنَّا نَطِيرُنَا يَبْئُكُم﴾ (۱۸-۳۶) ہم تم کو منحوس سمجھتے ہیں۔  
اسی لیے کہا گیا ہے ﴿(۱۸) لَا طَيْرٌ إِلَّا طَيْرُكَ﴾ کہ نہیں  
ہے نحوست مگر تیری طرف سے ہے۔ قرآن میں ہے:

﴿إِنْ تُصِيبْهُمْ سَيْئَةٌ يَطِيرُوا﴾ (۷-۱۳۱) اگر سختی پہنچتی  
ہے تو..... بدشگون لیتے ہیں۔

یعنی موسیٰ علیہ السلام کو باعث نحوست سمجھتے ہیں (چنانچہ ان کے  
جواب میں فرمایا) ﴿(۷) إِلَّا أَنْمَا طَائِرُهُمْ عِنْدَ اللَّهِ﴾ (۷-۱۳۱)  
یعنی یہ ان کی بد اعمالیوں کی سزا ہے جو اللہ کے ہاں سے  
مل رہی ہے۔ چنانچہ اسی معنی میں فرمایا:

﴿قَالُوا أَطِيرُنَا بِكَ وَيَمْنُ مَعَكَ قَالَ طَائِرُكُمْ  
عِنْدَ اللَّهِ﴾ (۲۷-۴۷) وہ کہنے لگے کہ تم اور تمہارے  
ساتھیوں کو ہم بدشگون خیال کرتے ہیں (صالح علیہ السلام نے)  
کہا کہ تمہاری بدشگونی خدا کی طرف سے ہے۔

﴿قَالُوا طَائِرُكُمْ مَعَكُمْ﴾ (۱۹-۳۶) انہوں نے کہا  
کہ تمہاری نحوست تمہارے ساتھ ہے۔

اور آیت ہے: ﴿وَكُلُّ إِنْسَانٍ أَلْزَمْنَاهُ طَائِرَهُ فِي  
عَقْبِهِ﴾ (۱۷-۱۳) اور ہم نے ہر انسان کے اعمال کو اس

① ایضاً فی التاج ومن قولهم وفی الاصل انه مرفوع من رواية عبدالله بن عمر فی حدیث الطیرة وبعده: ولا خیر الا حیرک (راجع  
عمل الیوم واللیلۃ لابن سنی ۲۹۲ وتحفة الذاکرین ۲۱۷-۲۱۸ ومسند احمد (۲/۲۲۰) وفی الطیرانی وجمع الزوائد من حدیث  
عبدالله بن عمرو بن العاص وفیه ابن لہیعة ضعیف.

② قاله قریط بن انیف الغنیری واوله: اذا الشرابی نأخذ به لهم..... کذا فی التبریزی وفی التبیہ لابن حنی وقد نروى لابی  
الغیل الطهوی والشطر من شواهد الکشاف والبيت فی اللسان والمحكم (وحده) والصناعتین ۲۸۵ ومحاسن ثعلب ۴۰۵  
والعیون (۱: ۱۸۸) فی تسعة ابیات والسیوطی ۲۵ وهو من اول مقطوعة اختارها ابو تمام فی الحماسة (۲۲-۳۱ مع المروزی) فی  
سبعة وفی رواية التبریزی ثمانية ۱۲.

③ قال فی التاج ومنه الحدیث خذ ما طایر من شعرك وفی رواية من شعر راسک راجع ایضاً النهایة (طیر).

﴿فَأَوْقَدْ لِيَ يَا هَامَانَ عَلَى الْطِينِ﴾ (۳۸ - ۳۸)  
 ہامان! میرے لیے گارے کو آگ لگوا کر (اینٹیں تیار کرواؤ)  
 قرآن پاک میں ہے:

﴿مِنْ طِينٍ لَّازِبٍ﴾ (۱۱-۳۷) چپکنے والی مٹی سے۔  
 ﴿وَخَلَقْتَهُ مِنْ طِينٍ﴾ (۱۲-۷) اور اسے مٹی سے بنایا۔

www.KitaboSunnat.com

## کتاب الظاء

### (ظ ع ن)

ظَعَنَ (ف) يَظَعُنُ ظَعْنًا کے معنی کوچ کرنے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَيَوْمَ ظَعَنَ كُنُيَّةَ عَمْرٍاءَ لِيَبْلُوَهُنَّ﴾ (۸۰-۱۶) سفر کے دن۔

اور ظَعِنَةُ اس ہودج کو کہتے ہیں جس میں عورت سوار ہو اور کبھی یہ لفظ کنیۃ عورت کے لیے بولا جاتا ہے خواہ وہ ہودج میں ہو یا نہ ہو۔

### (ظ ف ر)

الظَّفَرُ: (ناخن) یہ لفظ انسان اور دوسرے جانوروں کے ناخن پر بھی بولا جاتا ہے اور آیت کریمہ: ﴿كُلَّ ذِي ظُفْرِ﴾ (۱۲-۶) تمام ناخن دار جانور۔ میں ذی ظُفْر سے ذی وَخْلَب یعنی نچہ دار شکاری جانور مراد ہیں اور پرند کا ناخن چونکہ اس کا اوزار ہوتا ہے اس مناسبت سے ظُفْر کا لفظ سلاح یعنی ہتھیار کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ محاورہ ہے۔ فُلَانٌ كَلِيلُ الظُّفْرِ: فلاں کندہ ہتھیار یعنی کمزور ہے۔ ظُفْرَةٌ فُلَانٌ فلاں نے اس میں اپنے ناخن گاڑ دیے۔ اَلَا ظُفْرُ: لمبے ناخن والا۔

الظُّفْرَةُ (ناخن چشم) ایک قسم کی جھلی جو آنکھ کو ڈھانپ لیتی ہے اور ناخن کی طرح سخت ہوتی ہے۔

ظَفَرَتْ عَيْنُهُ: اس کی آنکھ پر ناخن چھا گیا۔

الظُّفْرُ: کامیاب ہونا۔ یہ مفہوم دراصل ظُفْرَةٍ سے لیا گیا ہے۔ جس کے معنی ناخن گاڑ دینے کے ہیں۔ اَظْفَرَ:

کامیاب کر دینا قرآن پاک میں ہے:

﴿مِنْ بَعْدِ أَنْ أَظْفَرَ كُنُيَّةَ عَمْرٍاءَ﴾ (۳۳-۳۸) اس کے بعد کہ تمہیں ان پر فتح یاب کر دیا۔

### (ظ ل ل)

الظِّلُّ: سایہ۔ یہ اَلْضَّحُّ (دھوپ) کی ضد سے اور فَعْلٌ سے زیادہ عام ہے کیونکہ (مجازاً) اَلْظِّلُّ کا لفظ تورات کی تاریکی اور باغات کے سایہ پر بھی بولا جاتا ہے نیز ہر وہ جگہ جہاں دھوپ نہ پہنچے اسے ظِلُّ کہہ دیا جاتا ہے، مگر فَعْلٌ صرف اس سایہ کو کہتے ہیں جو زوال آفتاب سے ظاہر ہوتا اور عزت و حفاظت اور ہر قسم کی خوش حالی کو ظِل سے تعبیر کر لیتے ہیں۔

چنانچہ آیت کریمہ:

﴿إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي ظِلَالٍ﴾ (۴۷-۴۸) کے معنی یہ ہیں کہ پرہیزگار ہر طرح سے عزت و حفاظت میں ہوں گے۔

نیز فرمایا:

﴿اَكْلُهَا دَائِمٌ وَظِلُّهَا﴾ (۱۳-۳۵) اس کے پھل ہمیشہ قائم رہنے والے ہیں۔ اور اس کی خوش گواریاں بھی۔

﴿هُمْ وَأَزْوَاجُهُمْ فِي ظِلَالٍ﴾ (۳۶-۵۶) وہ بھی اور ان کی بیویاں بھی ہر قسم کی خوشحالیوں میں۔

ظَلَّلْنِي الشَّجَرُ وَأَظْلَلْنِي: درخت نے مجھ پر سایہ کیا۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿وَوَضَعْنَا عَلَى كُنُيَّةَ عَمْرٍاءَ﴾ (۲-۵۷) اور ہم نے



بادلوں کا تم پر سایہ کے رکھا۔

﴿وَإِظْلَمْنِي فُلَانٌ﴾ اس نے میری حفاظت کی، مجھے اپنے زیر سایہ لے لیا، مجھے عزت سے رکھا۔ اور آیت کریمہ ہے: ﴿يَتَقَيُّوْاْ ظِلَالَهُ﴾ (۱۶-۳۸) جن کے سائے..... لوٹتے رہتے ہیں۔

کے معنی یہ ہیں کہ سائے کا وجود بھی اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور حکمت پر دلالت کرتا ہے۔ اور آیت کریمہ ہے:

﴿وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ اِلٰى قَوْلِهِ وَظِلَالُهُمْ﴾ (۱۳-۱۵) اور..... خدا کے آگے سجدہ کرتی ہے اور ان کے سائے بھی۔

کی تفسیر میں حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ (انسان!) تیرا سایہ تو اللہ کے حضور سجدہ ریز ہوتا ہے مگر تو کفر پر تلا ہوا ہے ظل ظلیل گھنا سایہ۔ مگر آیت کریمہ:

﴿وَنُذْخِلُهُمْ ظِلَالًا ظَلِيلًا﴾ (۳-۵۷) اور ان کو ہم گھنے سائے میں داخل کریں گے۔ میں ظلال ظلیل سے کنایہ زندگی کی آسائش مراد ہے اور ظلالہ سایہ فگن بدلی کو کہتے ہیں اور عام طور پر اس کا استعمال ناخوشگوار مواقع پر ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿كَانَهُ ظُلُمَةٌ﴾ (۷-۱۷۱) گویا وہ سایہ دار بدلی ہے۔

﴿عَذَابُ يَوْمِ الظُّلَّةِ﴾ (۲۱-۱۸) ”ساہبان کی طرح چھا جانے والے دن کے عذاب“ اور آیت کریمہ ہے:

﴿اَنْ يَّاتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلُمٍ مِّنَ الْغَمَامِ﴾ (۲-۲۱۰)

ان پر خدا کا عذاب سایہ دار بادلوں میں نازل ہو۔

میں ظلل کا واحد ظللہ آتا ہے جیسے عُرفَةٌ وَعُرْفٌ وَقُرْبَةٌ وَقُرْبٌ اور ایک قرأت میں فسی ظلال من الغمام بھی ہے۔ اور ظلال ظللہ کی جمع بھی ہو سکتی ہے جیسے غلبۃ کی جمع غلاب و حفرة کی جمع حفار آ جاتی ہے اور ظل کی بھی جیسا کہ آیت ہے: ﴿يَتَقَيُّوْاْ ظِلَالَهُ﴾ (۱۶-۳۸) میں ہے بعض اہل لغت کا خیال ہے کہ ہر بلند ہونے والی چیز کو ظل کہا جاتا ہے۔ چنانچہ شاعر نے کہا ہے۔ (السیط)

(۲۹۷) لَنَا نَزَلْنَا رَفَعْنَا ظِلَّ أَخِيَّةِ

”جب ہم فروکش ہوئے تو خیمے نصب کر دیئے۔“

اور یہ ظاہر ہے کہ ظل یعنی سایہ کو تو کوئی شخص بھی نصب نہیں کرتا لہذا یہاں ظل أَخِيَّةِ سے مراد خیمے ہیں۔ اسی طرح دوسرے شاعر نے کہا ہے۔ (اطویل)

(۲۹۸) تَبَعَ أَقْيَاءَ الظَّلَالِ عَشِيَّةَ

کہ شام کے وقت سایوں کے پیچھے چلتی ہے۔

مگر ان اشعار سے یہ معنی ثابت نہیں ہوتے کیونکہ مصرعہ اول کے معنی یہ ہیں کہ ہم نے خیمے نصب کئے جن کے ساتھ ان کے سائے بھی بلند ہو گئے اور دوسرے مصرعے میں الظلال عام ہے اور فسیء کا لفظ خاص۔ لہذا اَقْيَاءَ الظَّلَالِ میں

الظلال کی طرف اَقْيَاءَ کی اضافت ایسے ہی ہے جیسے

① قاله عبدة بن الطيب المحضري وتماهه : وفار للقوم باللمع المراجيل ، ولا مینه هذه مفضلية والبيت في (۱: ۱۳۹) وفي رواية اللائي مع النمط (۱: ۶۹) وردنا بدل نزلنا واردة بدل اخية وراجع مترجمة الشاعر الاصابة وابن الانباري ۶۸ والبيت ايضا في لبحر (۵: ۴۹۸) والكمال ۴۹۰ لكن فيها نصينا بدل رفعا والمحاضرات للمؤلف (۲: ۶۱۲) والعقد: (۱: ۱۹۲).

② قاله علقمة بن عبدة الفعل والبيت من كلمة مفضيلته (۲: ۱۹۳) والضمير للناقة وفي المطبوع تتبع بالياء محرف وتماهه: على طرق كانهن سبوب. والبيت في منتهى الطلب والشعراء ومختار الحاهلي (۱: ۳۲۱) والعقد الثمين ۱۰۶ وایام العرب ۵۶ والشرط ايضا في البحر ۵: ۴۹۸.

اِذَا مَشَى لَمْ يَكُنْ لَهُ ظِلٌّ کہ آنحضرت جب چلتے تو آپ کا سایہ نہ ہوتا تھا۔ تو اس کی تفسیر دوسرے موقع پر بیان ہوگی۔

ظَلِلْتُ وَظَلَمْتُ (ایک لام کے ساتھ) یہ اصل میں تو اس کام کے متعلق استعمال ہوتا ہے جو دن کے وقت کیا جائے مگر کبھی بمعنی صِرْتُ ”یعنی ہو جانا“ بھی آ جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿لَطَلُّوا مِنْ بَعْدِهِ يَكْفُرُونَ﴾ (۵۱-۳۰) تو اس کے بعد وہ ناشکری کرنے لگ جائیں۔

﴿ظَلَمْتُ عَلَيْهِ عَاكِفًا﴾ (۹۷-۲۰) جس کی عبادت پر جما ہوا تھا۔

## (ظ ل م)

الظُّلْمَةُ: کے معنی روشنی کا معدوم ہونا ہیں اس کی جمع ظُلُمَات ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿أَوْ كَظُلُمَاتٍ فِي بَحْرِ لُجِّيٍّ﴾ (۴۰-۲۳) یا (ان کے اعمال کی مثال ایسی ہے) جیسے دریائے عمیق میں اندھیرے۔

﴿ظُلُمَاتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ﴾ (۴۰-۲۳) (غرض) اندھیرے ہی اندھیرے ہوں ایک پر ایک چھایا ہوا۔

﴿أَمْسَنَ يَهْدِيكُمْ فِي ظُلُمَاتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ﴾ (۲۷-۶۳) بتاؤ بروبحر کی تاریکیوں میں تمہاری روئے رہنمائی کرتا ہے۔

﴿وَجَعَلَ الظُّلُمَاتِ وَالنُّورِ﴾ (۱۰-۹) اور تاریکیوں اور روشنی بنائی۔

اور کبھی ظُلْمَةُ کا لفظ بول کر جہالت، شرک اور فسق و فجور کے معنی مراد لئے جاتے ہیں جس طرح کہ نور کا لفظ ان کے اضداد یعنی علم و ایمان اور عمل صالح پر بولا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

خاص کو عام کی طرف مضاف کر دیا جاتا ہے اور اسے اِضَافَةُ الشَّيْءِ إِلَى جَنْسِهِ کہتے ہیں۔

نِيز الظُّلَّةُ کا لفظ کیونہی کی مثل ہر چھا جانے والی چیز پر بولا جاتا ہے۔ اس بنا پر آیت کریمہ ہے: ﴿وَإِذَا غَشِيَهُمْ مَوْجٌ كَالظُّلُلِ﴾ (۳۱-۳۲) کے معنی یہ ہیں کہ جب بادلوں کی طرح سمندر کی بڑی بڑی موجیں انہیں ڈھانپ لیتی ہیں۔ نیز فرمایا:

﴿لَهُمْ مِنْ فَوْقِهِمْ ظُلَلٌ مِنَ النَّارِ وَمِنْ تَحْتِهِمْ ظُلَلٌ﴾ (۱۶-۳۹) ان کے اوپر آگ کے سائبان ہوں اور نیچے بھی۔

اور ہر ڈھانپ لینے والی چیز کو ظِلُّ کہا جاتا ہے، خواہ وہ اچھی ہو یا بری۔ چنانچہ اچھے معنوں میں فرمایا:

﴿وَلَا الظُّلُّ وَلَا الْحُرُورُ﴾ (۲۱-۳۵) اور نہ سایہ اور نہ دھوپ۔

﴿دَانِيَةً عَلَيْهِمْ ظِلَالُهَا﴾ (۱۳-۷۶) ان سے..... ان کے سائے قریب ہوں گے۔

اور برے معنوں میں فرمایا: ﴿ظِلٌّ مِمَّنْ يَنْحُمُونَ﴾ (۵۶-۴۳) اور سایہ دھوئیں کے سائے میں۔

اور آیت کریمہ:

﴿إِلَى ظِلِّ ذِي ثَلَاثِ شُعَبٍ﴾ (۳۰-۷۷) یعنی تین شاخوں والے سائے کی طرف۔

میں ظِلُّ۔ ظُلَّة کے ہم معنی ہے۔ جیسا کہ آیت کریمہ: ﴿ظُلُلٌ مِنَ النَّارِ﴾ (۱۶-۳۹) سے معلوم ہوتا ہے کیونکہ یہ ظُلَّة کی جمع ہے لہذا اس کے بعد لا ظِلِيلِ (۳۱-۷۷) کے معنی یہ ہیں کہ وہ سایہ دوزخ کی گری سے بچانے کا کام نہیں دے گا اور حدیث میں جو آیا ہے: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ

سے ظَلَمْتُ السِّقَاءَ کا محاورہ ہے جس کے معنی ہیں: منکیزے میں دودھ جننے کے لیے رکھا اور وہی بننے سے پہلے ہی پی لیا۔ اور ایسے دودھ کو..... ظَلِيمٌ کہتے ہیں۔ ظَلَمْتُ الْأَرْضَ: میں نے زمین کو ایسے مقام سے کھودا جہاں سے کھودنا نہیں چاہتا تھا۔ اس قسم کی زمین کو ”مَظْلُومَةٌ“ کہا جاتا ہے اور اس سے کھود کر جو مٹی نکالی جاتی ہے اس مٹی کو ظَلِيمٌ کہتے ہیں۔

اور الظلم کا لفظ حق سے تجاوز پر بولا جاتا ہے جس کی مثال دائرہ میں مرکزی نقطہ کی ہوتی ہے اور ظلم کا اطلاق چونکہ ہر قسم کے تجاوز پر ہوتا ہے خواہ وہ تجاوز قلیل ہو یا کثیر یہی وجہ ہے کہ ایک طرف تو ابلیس کو ظالم کہا ہے اور دوسری طرف آدم علیہ السلام کو ان کی غلطی کی بنا پر ظلم کہہ دیا گیا ہے گو دونوں کے ظالم ہونے میں بہت بڑا فرق پایا جاتا ہے۔

بعض حکماء نے کہا ہے کہ ظلم تین قسم پر ہے (۱) وہ ظلم جو انسان اللہ تعالیٰ کے حق میں کرتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی قسم کفر و شرک اور نفاق ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ﴾ (۱۳-۳۱) شرک تو بڑا بھاری ظلم ہے۔

اور آیات: ﴿الَّا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظَّالِمِينَ﴾ (۱۱-۱۸) سن رکھو کہ ظالموں پر خدا کی لعنت ہے۔

﴿وَالظَّالِمِينَ أَعَدَّ اللَّهُ عَذَابًا أَلِيمًا﴾ (۷۶-۳۱) اور ظالموں کے لیے اس نے دکھ دینے والا عذاب تیار کر رکھا ہے۔ ﴿فَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَبَ عَلَى اللَّهِ﴾ (۳۹-۳۲) تو اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو خدا پر جھوٹ بولے۔

﴿يُخْرِجُهُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ﴾ (۲-۲۵۷) ان کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لے جاتا ہے۔

﴿أَن آخِرُ جَزَاؤِكَ لَكُمْ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ﴾ (۱۳-۵) کہ اپنی قوم کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لے باؤ۔

﴿فَنَادَىٰ فِي الظُّلُمَاتِ﴾ (۲۱-۸۷) آخر تاریکیوں میں خدا کو پکارنے لگے۔ اور آیت کریمہ:

﴿كَمَن مَّثَلُهُ فِي الظُّلُمَاتِ﴾ (۶-۱۲۲) کہیں اس شخص جیسا ہو سکتا ہے جو اندھیرے میں ہو۔

﴿كَمَن هُوَ أَعْمَى﴾ (۱۳-۱۹) کے ہم معنی ہے اور آیت سورۃ النعام:

﴿وَالَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا صُمُّ وَبُكْمٌ فِي الظُّلُمَاتِ﴾ (۶-۳۹) اور جن لوگوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا وہ بہرے اور گونگے ہیں اور تاریکیوں میں بڑے رہتے ہیں، میں فسی

الظُّلُمَاتِ کا لفظ آیت صُمُّ بُكْمٌ وَ عُمَى (۲-۱۸) میں عُمَى کی جگہ پر استعمال ہوا ہے اور آیت کریمہ ہے:

﴿فِي ظُلُمَاتٍ ثَلَاثٍ﴾ (۶-۳۹) تین اندھیروں میں۔ تین تاریکیوں سے مراد پیٹ، رحم، اور پچھائی کی تاریکی مراد ہے۔

أَظْلَمَ کے معنی ہیں تاریکی میں ہو جانا قرآن پاک میں ہے:

﴿فَإِذَا هُمْ مَظْلُومُونَ﴾ (۳۶-۳۷) پھر اچانک وہ تاریکی میں رہ جاتے ہیں۔

الظُّلْمُ: اہل لغت اور اکثر علماء کے نزدیک ظلم کے معنی ہیں کسی چیز کو اس کے مخصوص مقام پر نہ رکھنا خواہ کی یا زیادتی کر کے یا اسے اس کے صحیح وقت یا اصلی جگہ سے ہٹا کر۔ اسی

① کذا فی حبل المعاجم ۱۲۔

② التفسیر ایضاً مروی عن انس (الطیالسی ۱۷ البزار) راجع کنز العمال ج (۳، رقم: ۲۴۶۱)۔

ہیں۔

﴿وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ﴾ (۲-۲۳۱)

اور جو ایسا کرے گا وہ اپنے آپ پر ہی ظلم کرے گا۔

یہ تینوں قسم کا ظلم درحقیقت ظلم علی انفس ہی ہے کیونکہ جب انسان پہلے پہل ظلم کا ارادہ کرتا ہے تو وہ اپنے نفس پر ظلم کرتا ہے اس بنا پر کہہ سکتے ہیں کہ ظالم اپنے ظلم کی ابتداء ہمیشہ اپنی

ذات سے کرتا ہے اس بنا پر متعدد مقامات پر فرمایا:

﴿وَمَا ظَلَمَهُمُ اللَّهُ وَلَكِنْ كَانُوا أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ﴾

(۱۶-۵۷) وہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑتے تھے۔ بلکہ اپنا ہی

نقصان کرتے تھے۔

اور آیت:

﴿وَلَمْ يَلْبِسُوا إِيمَانَهُمْ بِظُلْمٍ﴾ (۶-۸۳) اور اپنے

ایمان کو (شرک کے ظلم) سے محفوظ نہیں کیا۔ کی تفسیر میں بعض

نے کہا ہے کہ ظلم سے شرک مراد ہے اور دلیل یہ پیش کی

ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو صحابہ کرام پر اس کا بہت

گہرا اثر ہوا ان کی یہ حالت دیکھ کر آنحضرت ﷺ نے

فرمایا: (۲۶) کہ ظلم سے مراد تو شرک ہے جیسا کہ حضرت

لقمان علیہ السلام کے قول:

﴿إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ﴾ (۳۱-۱۳) شرک تو بڑا

بھاری ظلم ہے، سے معلوم ہوتا ہے۔<sup>①</sup>

اور آیت کریمہ ہے:

﴿وَلَمْ تَظْلِمْنَا مِنْهُ شَيْئًا﴾ (۱۸-۳۳) اور اس کی پیداوار

میں کسی طرح کی کمی نہ ہوتی۔

لَمْ تَظْلِمْنَا کے معنی لَمْ تَنْقُصْ کے ہیں یعنی اس کی پیداوار

میں کسی قسم کی کمی نہیں ہوتی تھی اور آیت:

﴿وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ﴾ (۱۱-۱۵) اور

اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو خدا پر جھوٹ افتراء کرے۔

اور اس نوع کی دیگر آیات میں اسی قسم کا ظلم مراد ہے۔

(۲) دوسری قسم کا ظلم وہ ہے جو انسان ایک دوسرے پر کرتا ہے۔ چنانچہ آیت کریمہ:

﴿وَجَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِثْلُهَا فَمَنْ عَفَىٰ وَأَصْلَحَ

فَاجِرُهُ عَلَى اللَّهِ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ﴾ (۳۲-۴۰)

اور برائی کا بدلہ تو اسی طرح کی برائی ہے مگر جو درگزر کرے اور

معاملے کو درست کر لے تو اس کا بدلہ خدا کے ذمہ ہے اس میں

شک نہیں کہ وہ ظلم کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ میں ظالمین

سے اسی قسم کے لوگ مراد ہیں۔ نیز آیت کریمہ: ﴿إِنَّمَا

السَّبِيلُ عَلَى الَّذِينَ يَظْلِمُونَ النَّاسَ﴾ (۴۲-۴۲)

الزام تو ان لوگوں پر ہے جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں۔

میں بھی ظلم کے یہی معنی مراد ہیں اسی طرح فرمایا:

﴿وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُومًا﴾ (۱۷-۳۳) اور جو شخص ظلم سے

قتل کیا جائے۔

(۳) تیسری قسم کا ظلم وہ ہے جو انسان خود اپنے نفس پر کرتا

ہے۔ چنانچہ اسی معنی میں فرمایا:

﴿فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهِ﴾ (۲۵-۳۲) تو کچھ ان میں

سے اپنے آپ پر ظلم کرتے ہیں۔

﴿ظَلَمْتُ نَفْسِي﴾ (۱۸-۱۶) میں نے اپنے آپ پر ظلم کیا۔

﴿إِذْ ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ﴾ (۴-۶۳) جب اپنے حق میں

ظلم کر بیٹھے تھے۔

﴿فَتَكُونُوا مِنَ الظَّالِمِينَ﴾ (۷-۹۱) ورنہ ظالم ہو جاؤ گے۔

یعنی ان لوگوں سے ہو جاؤ گے جو اپنی جانوں پر ظلم کرتے

① متفق علیہ من حدیث ابن مسعود ۱۲۔

کرتے تھے۔

چنانچہ شاعر نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے ﴿  
(السريع)

(۲۹۹) فَصَرْتُ كَالْهَيْقِ عَدَا يَتَغَيُّ

قَرْنَا فَلَمْ يَرْجِعْ بِأَذْنَيْنِ

میں شتر مرغ کی طرف خائب و خاسر ہو کر لوٹا جو گیا تھا سینک  
لینے مگر کھو بیٹھا کان بھی۔

ظَلَمَ کے معنی دانتوں کی آب و تاب کے ہیں۔ خلیل نے  
کہا ہے ﴿لَقِيْتُهُ أَذْنَى ظَلَمٍ أَوْ ذِي ظَلَمَةٍ﴾ یعنی  
سب سے پہلے جس چیز پر میری نظر پڑی اور میری نظر کو اس  
نے روکا، وہ فلاں شخص ہے، مگر اس معنی سے فعل مشتق  
ہو کر استعمال نہیں ہوتا۔

(ظ م و)

الْظَّمُّ دوسرے پانی پینے کے درمیان وقفہ اَلْظَّمَّ  
پیاں جو اس وقفہ میں عارض ہو دراصل یہ ظَمِيٌّ يَظْمُ  
فَهُوَ ظَمَانٌ کا مصدر ہے۔

قرآن پاک میں ہے ﴿وَأَنْتَ لَا تَنْظُمُ فِيهَا وَلَا  
تَضْحَى﴾ (۲۰-۱۱۹) اور یہ کہ نہ پیاں سے رو اور نہ دھوپ کھاؤ۔  
﴿يَحْسَبُهُ الظَّمَانُ مَاءً حَتَّىٰ إِذَا جَاءَهُ لَمْ يَجِدْهُ  
شَيْئًا﴾ (۲۳-۳۹) کہ پیاں اسے پانی سمجھ کر اس کی طرف  
جاتا ہے مگر جب وہاں پہنچتا ہے تو کچھ نہیں پاتا۔

﴿وَلَوْ أَنَّ لِلَّذِينَ ظَلَمُوا مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا﴾

(۳۹-۴۷) اور اگر گنہگاروں کے پاس وہ سب مال و متاع ہو  
جو زمین میں ہے۔

میں ظلم کا لفظ تینوں قسم کے ظلم کو شامل ہے کیونکہ جس شخص نے  
دنیا میں ادنیٰ سا ظلم بھی کیا ہوگا وہ قیامت کے دن دنیا کا  
سب مال و متاع فیدہ دے کر رہا ہونے کی کوشش کرے  
گا۔ اور آیت کریمہ ہے:

﴿هُمْ أَظْلَمَ وَأَطْعَمُ﴾ (۵۳-۵۲) وہ لوگ بڑے ہی  
ظالم اور بڑے ہی سرکش تھے۔

میں متنبہ کیا گیا ہے کہ ظلم و ستم کا انجام برا ہوتا ہے اور ایسے  
لوگ آخر کار ہلاک ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ نوح علیہ السلام کی  
قوم کا قصہ اس امر کا شاہد ہے اور قرآن پاک نے ایک موقع  
پر تو۔ ﴿وَمَا اللَّهُ يُرِيدُ ظُلْمًا لِّلْعِبَادِ﴾ (۳۰-۳۱)

اور خدا بندوں پر ظلم کرنا نہیں چاہتا، کہا ہے۔ اور دوسرے مقام  
پر ﴿وَمَا آتَا بِظُلَامٍ لِّلْعَبِيدِ﴾ (۵۰-۲۹) اور ہم بندوں  
پر ظلم نہیں کیا کرتے، فرمایا ہے پس پہلی آیت میں عباد یعنی  
بندوں سے ارادہ ظلم کی نفی کرنا مقصود ہے اور دوسری آیت  
میں بندوں پر سے لفظ ظَلَامٌ (صیغہ مبالغہ) کے ساتھ نفی کی  
ہے۔ ان دونوں میں جو باریک فرق پایا جاتا ہے اس کی  
وضاحت ہم دوسری کتاب میں بیان کریں گے۔ ❶

ظَلِيمٌ زشت تر مرغ۔ کیونکہ عرب لوگ اسے مظلوم جانور خیال

❶ راجع لتاويل الآية شرح الدرّة للخفاجي (۱۳۲-۱۳۳)۔

❷ قاله بشار بن برد الاعشى في قصيدة مطلعها: شط بسلمي عاجل البين وجاوزت اسد بن القين، وقله: طالبا قلبى فراغت به  
وامسكت قلبى مع الدين، وفي رواية كالهقل بدل الهيق وفكنت بدل فصرت والبيت في ذيل الامالى ۱۰۷ في خمسة وفي روايته  
فكنت كالهقل والمحاضرات للمؤلف (۴: ۶۷۱، ۲: ۶۰۲) والعيون (۳: ۱۴۱) والوسط (۳: ۵) قال الاستاذ الميمنى وفي ب ۵  
كالبير غدا كذا في العيون وهو المضروب فيه المثل راجع العيون (۳: ۱۴۱) والميداني والابيات مع الخبر في الاغانى  
(۳: ۲۰۵-۲۰۶)۔

❸ راجع للكلمة مجالس ثعلب ۸۰ ومعناه وضع لك ۱۲۔

## (ظ ن)

رکھتے ہیں۔

میں اشارہ ہے کہ زیادہ لالچ اور طمع میں آ کر وہ اس امر کا یقین کر بیٹھتے تھے۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَلَقَدْ دَاوُدُ إِنَّمَا فَتَنَاهُ﴾ (۲۳-۳۸) میں ظن بمعنی

علم ہے اور فتنہ کے یہاں وہی معنی ہیں جو کہ آیت:

﴿وَفَتَنَّاكَ فُتُونًا﴾ (۲۰-۴۰) میں ہیں اور آیت:

﴿ذَٰلِ النُّونِ إِذْ ذَهَبَ مُغَاصِبًا فَلَقْنَاهُ أَن لَّنْ نَّقْدِرَ

عَلَيْهِ﴾ (۲۱-۸۷) اور ذوالنون (کویا د کرو) جب وہ

(اپنی قوم سے ناراض ہو کر) غصے کی حالت میں چل دیئے

اور خیال کیا کہ ہم ان پر قابو نہیں پاسکیں گے، میں بعض نے

کہا ہے کہ یہاں ظن بمعنی وہم لینا بہتر ہے یعنی ان کے

دل میں یہ وہم گذرا کہ ہم ان پر قابو نہیں پاسکیں گے

اور آیت کریمہ:

﴿وَأَسْتَكَبَرَ هُوَ وَجُنُودُهُ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ

الْحَقِّ وَظَنُوا أَنَّهُم إِلَيْنَا لَا يَرْجِعُونَ﴾ (۲۸-۲۹)

اور وہ اور اس کے لشکر ملک میں ناحق مغرور ہو رہے

تھے اور خیال کرتے تھے کہ ہماری طرف لوٹ کر نہیں آئیں

گے۔

میں ظن کے بعد آن لایا گیا ہے جو کہ ظن بمعنی علم کے

بعد استعمال ہوتا ہے پس اس سے متنبہ کیا ہے کہ انہوں

نے اپنی جگہ پر یقین کر لیا تھا گو یہ یقین بے اصل تھا۔

اور آیت کریمہ:

﴿وَيَظُنُّونَ بِاللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ﴾

(۳-۱۵۴) وہ خدا کے بارے میں ناحق زمانہ جاہلیت کے

سے گمان کرتے ہیں۔

کے معنی یہ ہیں کہ یہ لوگ زمانہ جاہلیت کی طرح اللہ تعالیٰ

الظَّنُّ: کسی چیز کی علامات سے جو نتیجہ حاصل ہوتا

ہے اسے ظن کہتے ہیں جب یہ علامت قوی ہو تو ان سے

علم کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے مگر جب بہت کمزور ہوں تو وہ

نتیجہ وہم کی حد سے آگے تجاوز نہیں کرتا یہی وجہ ہے کہ

جب وہ نتیجہ قوی ہو جائے اور علم کا درجہ حاصل کر لے یا

اسے علم کے درجہ میں فرض کر لیا جائے تو اس کے بعد آن یا

آن استعمال ہوتا ہے۔ مگر جب وہ ظن کمزور ہو اور وہم کے

درجہ سے آگے نہ بڑھے تو پھر اس کے ساتھ (صرف) آن

استعمال ہوتا ہے جو کسی قول یا فعل کے عدم کے ساتھ مختص

ہے۔ چنانچہ آیت:

﴿الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُمْ مُّلاَقُوا رَبِّهِمْ﴾ (۲-۴۶)

جو یقین کئے ہوئے ہیں کہ وہ اپنے پروردگار سے ملنے

والے ہیں۔

﴿يَظُنُّونَ أَنَّهُمْ مُّلاَقُوا اللّٰهَ﴾ (۲-۲۳۹) جو لوگ

یقین رکھتے ہیں کہ ان کو خدا کے رو برو حاضر ہونا ہے۔

﴿وَلَقَدْ ظَنَّ أَنَّهُ الْفِرَاقُ﴾ (۵-۱۸) اور اس (جان

بلب) نے سمجھا کہ اب سب سے جدائی ہے۔

میں ظن کا لفظ علم و یقین کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

اور آیت کریمہ ہے:

﴿أَلَا يَظُنُّ أُولَٰئِكَ﴾ (۸۳-۴) میں ان کی انتہائی

نذمت کی ہے اور معنی یہ ہیں کہ موت کے بعد زندہ ہونے

کے دلائل نہایت واضح ہیں مگر یہ اس زندگی کا گمان تک

نہیں کرتے۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَلَقَدْ أَهْلُهَا أَنَّهُمْ قَادِرُونَ عَلَيْهَا﴾ (۱۰-۲۴)

اور زمین والوں نے خیال کیا کہ وہ اس پر پوری دسترس

﴿وَمَا يَتَّبِعْ أَكْثَرُهُمْ إِلَّا ظَنًّا﴾ (۱۰-۳۶) اور ان میں کے اکثر صرف ظن کی پیروی کرتے ہیں۔

﴿وَأَنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي﴾ (۵۳-۲۸) اور ظن (یقین کے مقابلے میں) کچھ کام نہیں آتا۔

﴿وَأَنَّهُمْ ظَنُّوا كَمَا ظَنَنْتُمْ﴾ (۷۲-۷۰) اور یہ کہ ان کا بھی یہی اعتقاد تھا جس طرح تمہارا۔ اور ایک قراءت میں۔

﴿وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِظَنٍّ﴾ (۸۱-۲۳) اور وہ پوشیدہ باتوں کے ظاہر کرنے میں بخیل نہیں۔

ضاد کی بجائے ظاء کے ساتھ ہے جس کے معنی متہم کے ہیں۔

### (ظہر)

الظَّهْرُ: کے معنی پیٹھ اور پشت کے ہیں اس کی جمع ظُهور آتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَأَمَّا مَنْ أُوْتِيَ كِتَابَهُ وَرَاءَ ظَهْرِهِ﴾ (۸۴-۱۰) اور جس کا نامہ اعمال اس کی پیٹھ کے پیچھے سے دیا جائے گا۔

﴿مَنْ ظَهَرَ رُحْمَ ذُرِّيَّتِهِمْ﴾ (۷-۱۷۲) یعنی ان کی پیٹھوں سے ان کی اولاد۔ اور آیت کریمہ:

﴿أَنقَضَ ظَهْرَكَ﴾ (۹۴-۳) جس نے تمہاری پیٹھ توڑ رکھی تھی۔

میں گناہوں کو بوجھ کے ساتھ تشبیہ دے کر ظہر کا لفظ بطور استعارہ استعمال کیا ہے (کیونکہ بوجھ عام طور پر پیٹھ پر اٹھایا جاتا ہے) اور کبھی ظہر کا لفظ بطور استعارہ روئے زمین کے معنی میں بھی آ جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے ظہرُ

الأرضِ زمین کا اوپر کا حصہ اس کے بالمقابل بَطْنُ

کے متعلق طرح طرح کی قیاس آرائیاں کر رہے ہیں۔ یعنی وہ خیال کرتے ہیں کہ پیغمبر ﷺ نے ان کے سامنے غلط بیانی کی ہے، اس سے تنبیہ کی ہے کہ منافقین کی یہ

بدگمانیاں کفار کی سی ہیں اور وہ اس قسم کی افواہیں پھیلا کر کفار کا کردار ادا کر رہے ہیں۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَوَظَنُوا أَنَّهُمْ مَانِعَتُهُمْ حُصُونُهُمْ﴾ (۵۹-۲)

اور وہ لوگ یہ سمجھتے ہوئے کہ ان کے قلعے ان کو..... بچالیں گے۔

کے معنی یہ ہیں کہ ان کا خیال اس قدر پختہ تھا جیسا کہ کسی شخص کو پورا یقین ہوتا ہے۔ اسی معنی میں فرمایا: ﴿وَلَكِنْ ظَنَنْتُمْ أَنَّ اللَّهَ لَا يَعْلَمُ كَثِيرًا مِّمَّا تَعْمَلُونَ﴾

(۴۱-۲۲) بلکہ تم یہ خیال کرتے تھے کہ خدا کو تمہارے بہت سے عملوں کی خبر ہی نہیں۔

﴿ذَلِكُمْ ظَنُّكُمُ الَّذِي ظَنَنْتُمْ﴾ (۴۱-۴۳) اور اسی خیال نے جو تم..... رکھتے تھے۔

اور آیت کریمہ:

﴿الظَّالِمِينَ بِاللَّهِ ظَنُّ السَّوءِ﴾ (۳۸-۶) جو خدا کے حق میں برے برے خیال رکھتے ہیں۔ میں ظنَّ السَّوءِ کی تفسیر بعد کی آیت:

﴿بَلْ ظَنَنْتُمْ أَن لَّنْ يَنْقَلِبَ الرَّسُولُ﴾ (۴۸-۱۲)

بات یہ ہے کہ تم لوگ یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ پیغمبر..... کبھی لوٹ کر آنے والے ہی نہیں۔ میں بیان کر دی ہے۔ نیز فرمایا:

﴿إِن نَّظُنُّ إِلَّا ظَنًّا﴾ (۴۵-۳۲) ہم اس کو محض ظنی خیال کرتے ہیں۔

اور ظنَّ چونکہ عام طور پر برا ہوتا ہے اس لیے اس کی مذمت کرتے ہوئے فرمایا:

﴿الَّذِينَ ظَاهَرُوا هُمْ﴾ (۳۳-۲۶) (اور اہل کتاب میں سے) جنہوں نے ان کی مدد کی۔

﴿وَتَظَاهَرُونَ عَلَيْهِمْ بِالْإِنِّمِ وَالْعُدْوَانِ﴾ (۲-۸۵) تم ان کے خلاف گناہ اور زیادتی سے ایک دوسرے کی مدد کرتے ہو۔

الظَّاهِرُ: مددگار۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَمَالَهُ مِنْهُمْ مِّنْ ظَهِيرٍ﴾ (۳۳-۲۲) اور نہ ان میں سے کوئی خدا کا مددگار ہے۔

﴿فَلَا تَكُونَنَّ ظَهِيرًا لِّلْكَافِرِينَ﴾ (۲۸-۸۶) تو تم ہرگز کافروں کے مددگار نہ ہونا۔

﴿وَالْمَلَائِكَةُ بَعْدَ ذَلِكَ ظَهِيرٌ﴾ (۲۶-۴) اور ان کے علاوہ اور فرشتے بھی مددگار ہیں۔

اور آیت کریمہ:

﴿وَكَانَ الْكَافِرُ عَلَى رَبِّهِ ظَهِيرًا﴾ (۲۵-۵۵)

اور کافر اپنے پروردگار کی مخالفت میں بڑا زور مارتا ہے۔

کے معنی یہ ہیں کہ کافر خدائے رحمن کی مخالفت میں شیطان کا مددگار بنا ہوا ہے۔ ابو عبیدہ نے کہا ہے کہ یہاں ظہیر کے معنی ہیں پس پشت ڈالا ہوا۔ اور آیت کے معنی یہ ہیں

کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک کافر کی مثال اس چیز کی سی ہے جسے بے وقعت سمجھ کر پس پشت ڈال دیا جائے اور یہ

ظہیرت بگڈا سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں: میں نے اسے پس پشت ڈال دیا اور درخواست نہ سمجھا۔

الظَّهَارُ: کے معنی ہیں خاوند کا بیوی سے یہ کہنا کہ تو میرے لیے ایسی ہے جیسے میری ماں کی پشت۔ کہا جاتا ہے: ظَاہَرَ مِنْ أَمْرَيْنِ: اس نے اپنی بیوی سے ظہار کر لیا۔ قرآن

الْأَرْضِ: کے معنی ہیں: زمین کا اندرونی حصہ قرآن پاک میں ہے:

﴿مَاتَرَكَ عَلَى ظَهْرِهَا مِنْ دَابَّةٍ﴾ (۳۵-۳۵) روئے زمین پر ایک چلنے پھرنے والے کو نہ چھوڑتا۔

رَجُلٌ مُّظْهَرٌ: قومی پشت، مضبوط آدمی۔ ظہر پیٹھ کا درد کرنا اور ظہر سواری کو کہتے ہیں۔ نیز ظہر: مددگار، پشت پناہ۔ بَعِيرٌ ظَهِيرٌ: قومی اونٹ ظہری: وہ قاتلو

سواری۔ جسے احتیاطاً ساتھ رکھ لیا جائے تاکہ بوقت ضرورت اسے استعمال کیا جاسکے۔

نیز ظہری ہر اس چیز کو کہا جاتا ہے جسے پس پشت ڈال کر بھولی بری کر دیا جائے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَرَأَيْتُكُمْ ظَهِرِيًّا﴾ (۱۱-۹۲) پیٹھ پیچھے.....

ظہر علیہ کے معنی ہیں: وہ اس پر غالب آ گیا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿إِنَّهُمْ إِن يَظْهَرُوا عَلَيْكُمْ﴾ (۱۸-۲۰) اگر وہ تم پر دسترس پالیں۔

ظَاہَرْتُهُ: میں نے اس کی مدد کی (اور ظَاہَرَ عَلَيْهِ کے معنی ہیں: اس کے خلاف ایک دوسرے کی مدد کی) قرآن

پاک میں ہے: ﴿وَتَظَاهَرُوا عَلٰیٰ اٰخِرَاجِكُمْ﴾ (۶۰-۹)

اور انہوں نے تمہارے نکالنے میں ایک دوسرے کی مدد کی۔

﴿وَإِنْ تَظَاهَرَا عَلَيْهِ﴾ (۲۶-۴) اور اگر پیغمبر کے خلاف ایک دوسرے کی مدد کرو گی۔ ایک قرأت میں

تَظَاهَرَا ہے (یعنی تاء کو طاء میں ادغام کے ساتھ)



پاک میں ہے:

﴿وَالَّذِينَ يُظَاهِرُونَ مِن نِّسَاءِهِمْ﴾ (۵۸-۳)

اور جو لوگ اپنی بیویوں سے ظہار کر لیں۔

ایک قرأت میں يَظَاهِرُونَ ہے جو اصل میں

يَتَظَاهِرُونَ ہے اور اتنا غاء میں مدغم ہے اور ایک قرأت

میں يَظْهَرُونَ ہے۔<sup>①</sup>

ظَهَرَ الشَّيْءُ: کسی چیز کا زمین کے اوپر اس طرح ظاہر

ہونا کہ نمایاں طور پر نظر آئے اس کے بالمقابل بَطَنَ کے

معنی ہیں: کسی چیز کا زمین کے اندر غائب ہو جانا پھر ہر وہ

چیز جو اس طرح پر نمایاں ہو کہ آنکھ یا بصیرت سے اس کا

ادراک ہو سکتا ہو، اسے ظاہر کہہ دیا جاتا ہے۔ قرآن

پاک میں ہے:

﴿أَوَ أَنَّ يُظْهِرُ فِي الْأَرْضِ الْفَسَادَ﴾ (۴۰-۲۶)

(۱۵-۶) ظاہر ہوں یا پوشیدہ۔

﴿إِلَّا مِرَاءَ ظَاهِرًا﴾ (۱۸-۲۲) مگر سرسری سی گفتگو۔

اور آیت کریمہ ہے:

﴿يَعْلَمُونَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا﴾ (۳۰-۷)

یہ دنیا کی ظاہری زندگی ہی کو جانتے ہیں۔ معنی یہ ہیں

کہ یہ لوگ صرف دنیوی امور سے واقفیت رکھتے ہیں

آخری امور سے بالکل بے بہرہ ہیں اور اَلْعِلْمُ الظَّاهِرُ

اور اَلْبَاطِنُ سے کبھی جلی اور خفی علوم مراد ہوتے ہیں

اور کبھی دنیوی اور آخری۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿بَاطِنُهُ فِيهِ الرَّحْمَةُ وَظَاهِرُهُ مِن قِبَلِهِ

الْعَذَابُ﴾ (۵۷-۱۳) جو اس کی جانب اندرونی ہے

اس میں تو رحمت ہے اور جو جانب بیرونی ہے اس طرف

عذاب۔

اور آیت کریمہ:

﴿ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ﴾ (۳۰-۱۴) خشکی

اور تری میں لوگوں کے اعمال کے سبب فساد پھیل گیا۔

میں ظَهَرَ کے معنی ہیں: زیادہ ہو گیا اور پھیل گیا اور آیت

ہے:

﴿وَأَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهُ ظَاهِرَةً وَبَاطِنَةً﴾ (۳۱-۲۰)

اور تم پر اپنی ظاہری اور باطنی نعمتیں پوری کر دی ہیں۔

میں ظَاہِرَةٌ سے مراد وہ نعمتیں ہیں جو ہمارے علم میں آ

سکتی ہیں۔ اور بَاطِنَةٌ سے وہ جو ہمارے علم سے بالاتر ہیں

چنانچہ اسی معنی کی طرح اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

﴿وَأَن تَعُدُّوا نِعْمَةَ اللَّهِ لَا تُحْصُوهَا﴾ (۱۳-۲۲)

اور اگر خدا کے احسان گننے لگو تو شمار نہ کر سکو۔

اور آیت کریمہ:

﴿فَرَىٰ ظَاهِرَةً﴾ (۳۳-۱۸) کے عام معنی تو یہی ہیں

کہ وہ بتائیاں سامنے نظر آتی تھیں مگر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ

بطور مثال کے انسانی احوال کی طرف اشارہ ہو جس کی

تصریح اس کتاب کے بعد (دوسری کتاب میں) بیان

کریں گے۔ انشاء اللہ

أَظْهَرَهُ عَلَيْهِ<sup>②</sup> اسے اس پر مطلع کر دیا۔

چنانچہ آیت کریمہ:

﴿فَلَا يُظْهِرُ عَلَىٰ غَيْبِهِ أَحَدًا﴾ (۷۲-۲۶) کے

معنی یہ ہیں کہ اللہ اپنے غائب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا

اور آیت کریمہ:

﴿لِيُظْهِرَهُ عَلَىٰ الدِّينِ كُلِّهِ﴾ (۹-۳۳) میں يُظْهِرُ

① وایضاً ظہر علیہ اطلاع علیہ کما فی قوله تعالیٰ لَمْ يُظْهِرُوا عَلَىٰ عَوْرَاتِ النِّسَاءِ (۲۴: ۳۱)۔

صَلَاةُ الظُّهْرِ: ظہر کی نماز۔ ظہیرۃ: ظہر کا وقت۔  
 أَظْهَرَ فُلَانٌ فَلَانَ ظہر کے وقت میں داخل ہو گیا۔ جیسا  
 کہ أَصْبَحَ وَآمَسَى: صبح و شام میں داخل ہونا۔ قرآن  
 پاک میں ہے۔

﴿وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَعَشِيًّا  
 وَحِينَ تُظْهِرُونَ﴾ (۱۸-۳۰) اور آسمان و زمین میں  
 اسی کے لیے تعریف ہے اور سہ پہر کے وقت بھی اور جب  
 تم ظہر کے وقت میں داخل ہوتے ہو۔



کے معنی نمایاں کرنا بھی ہو سکتے ہیں اور معاونت اور غلبہ  
 کے بھی یعنی تمام ادیان پر اسے غالب کرے۔ چنانچہ اس  
 دوسرے معنی کے لحاظ سے فرمایا:

﴿إِنْ يَظْهَرُوا عَلَيْكُمْ يَرْجُمُوكُمْ﴾ (۱۸-۲۰) اگر  
 وہ تم پر دسترس پالیں گے تو تمہیں سنگسار کر دیں گے۔  
 ﴿يَقُومُ لَكُمْ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ظَاهِرِينَ فِي  
 الْأَرْضِ﴾ (۲۹-۳۰) اے قوم! آج تمہاری ہی  
 بادشاہت ہے اور تم ہی ملک میں غالب ہو۔

﴿فَمَا اسْتَطَاعُوا أَنْ يَظْهَرُوهُ﴾ (۱۸-۹۷) پھر ان  
 میں یہ قدرت نہ رہی کہ اس کے اوپر چڑھ سکیں۔

## کِتَابُ الْعَيْنِ

### (ع ب ا)

اور چیز کو ملا دیا اور اَلْعَبْتُ وہ کھانا جو کسی چیز کے ساتھ خلط ملط کیا گیا ہو۔ اسی اعتبار سے کھجور، گھی اور ستو کے آمیزہ کو عَوْبَانِي کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿اَتَبْنُونَ بِكُلِّ رِيعٍ اَيَّةً تَعْبَثُونَ﴾ (۲۶-۱۲۸) تم ہر بلند مقام پر بے مقصد بڑی عمارتیں تعمیر کرتے ہو۔ نیز اَلْعَبْتُ ہر اس کام کو کہتے ہیں جس کی کوئی صحیح غرض نہ ہو۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا﴾ (۲۳-۱۵) کیا تم یہ خیال کئے بیٹھے ہو کہ ہم نے تم کو یونہی بے غرض و غایت پیدا کر دیا ہے۔

### (ع ب د)

اَلْعَبُوْدِيَّةُ: کے معنی ہیں کسی کے سامنے ذلت اور انکساری ظاہر کرنا۔ مگر اَلْعِبَادَةُ کا لفظ انتہائی درجہ کی ذلت اور انکساری ظاہر کرنے پر بولا جاتا ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ معنوی اعتبار سے اَلْعِبَادَةُ کا لفظ اَلْعَبُوْدِيَّةُ سے زیادہ بلیغ ہے لہذا عبادت کی مستحق بھی وہی ذات ہو سکتی ہے جو بے حد صاحب افضال و انعام ہو اور ایسی ذات صرف ذات الہی ہی ہے۔ اسی لیے فرمایا:

﴿اَلَّا تَعْبُدُوْا اِلَّا اِيَّاهُ﴾ (۱۷-۳۳) کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔

عِبَادَةُ: دو قسم پر ہے (۱) عبادت بِالْتَّسْخِيْرِ - جسے ہم بھود کی بحث میں ذکر کر چکے ہیں۔ (۲) عبادت بِالْاِخْتِيَارِ - اس

مَاعِبَاتُ یہ: مجھے اس کی کوئی پروا نہ تھی۔ اصل میں اَلْعِبَاءُ کے معنی ثقل اور بوجھ کے ہیں۔ لہذا مَاعِبَاتُ یہ کے معنی ہوں گے میرے نزدیک اس کا کوئی وزن نہیں یا میری نگاہ میں اس کی کچھ بھی قدر و قیمت نہیں قرآن پاک میں ہے:

﴿قُلْ مَا يَعْبُوْكُمْ رَبِّيْ﴾ (۲۵-۷۷) کہہ دو کہ میرے پروردگار کی نگاہوں میں تمہاری کچھ بھی قدر و قیمت نہیں۔ بعض کے نزدیک آیت کریمہ میں يَعْبُوْا کا لفظ عَبَاتُ الطَّيِّبِ کے محاورہ سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں ”میں نے خوشبو کو باقی رکھا“ پس آیت کے معنی یہ ہیں، ”اگر تم اللہ کو پکارتے نہ ہوتے تو اللہ تعالیٰ تمہیں باقی نہ چھوڑتا۔“

عِبَاتُ الْجَيْشِ وَعِبَاتُهُ میں نے لشکر کو تیار کیا عِبَاةُ الْجَاهِلِيَّةِ: زمانہ جاہلیت کی فحشست جو ان کے دلوں میں رچ چکی تھی اور جسے قرآن پاک نے آیت: ﴿فَنَفَىٰ قُلُوْبَهُمُ الْحَمِيَّةَ حَمِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ﴾ (۳۶-۳۸) ان کے دلوں میں زمانہ جاہلیت کی سی حمیت ہے، میں زمانہ جاہلیت کی سی حمیت سے تعمیر کیا ہے۔

### (ع ب ث)

اَلْعَبْتُ: دراصل اس کے معنی ہیں، کسی کام کے ساتھ کھیل کود کو ملا دینا اور یہ عَبَثُ الْاَقْطَعِ کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں: میں نے پتھر کے ساتھ

لفظ بولا گیا ہے وہ دوسم پر ہیں ایک وہ جو اللہ تعالیٰ کے مخلص بندے بن جاتے ہیں چنانچہ ایسے لوگوں کے متعلق فرمایا:

﴿وَإِذْ كُنَّا عَبْدًا لِّأَيُّوبَ﴾ (۳۸-۴۰) اور ہمارے بندے ایوب کو یاد کرو۔

﴿وَإِنَّهُ كَانَ عَبْدًا شَكُورًا﴾ (۱۷-۳) بے شک نوح علیہ السلام ہمارے شکر گزار بندے تھے۔

﴿نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلَىٰ عَبْدِهِ﴾ (۱-۲۵) جس نے اپنے بندے پر قرآن پاک نازل فرمایا:

﴿عَلَىٰ عَبْدِهِ الْكِتَابَ﴾ (۱۸-۱) جس نے اپنے بندے (محمد ﷺ) پر یہ کتاب نازل کی۔

﴿إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ﴾ (۱۷-۱) جو میرے مخلص بندے ہیں ان پر تیرا کچھ زور نہیں۔

﴿كُونُوا عِبَادًا لِّي﴾ (۳-۷۹) کہ..... میرے بندے ہو جاؤ۔

﴿إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِينَ﴾ (۱۵-۴۰) ہاں ان میں جو تیرے مخلص بندے ہیں۔

﴿وَعَدَ الرَّحْمَنُ عِبَادَهُ بِالْغَيْبِ﴾ (۱۹-۶۱) جس کا خدا نے اپنے بندوں سے وعدہ کیا ہے۔

﴿وَعِبَادُ الرَّحْمَنِ الَّذِينَ يَمْشُونَ عَلَى الْأَرْضِ هَوْنًا﴾ (۲۵-۶۳) اور خدا کے بندے تو وہ ہیں جو زمین پر آہستگی سے چلتے ہیں۔

﴿أَنْ أَسْرِ بِعِبَادِي لَيْلًا﴾ (۲۰-۷۷) ہمارے بندوں کو راتوں رات نکال لے جاؤ۔

کا تعلق صرف ذوی العقول کے ساتھ ہے یعنی ذوی العقول کے علاوہ دوسری مخلوق اس کی مکلف نہیں ہے اور آیت کریمہ:

﴿اعْبُدُوا رَبَّكُمْ﴾ (۲-۲۱) اپنے پروردگار کی عبادت کرو۔

﴿وَاعْبُدُوا اللَّهَ﴾ (۴-۳۶) اور خدا ہی کی عبادت کرو۔

میں اسی دوسری قسم کی عبادت کا حکم دیا گیا ہے ﴿الْعَبْدُ﴾ (بندہ، غلام) کا لفظ چار معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ (۱) الْعَبْدُ بمعنی غلام یعنی وہ انسان جس کو خریدنا اور فروخت کرنا شرعاً جائز ہو چنانچہ آیات کریمہ:

﴿وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ﴾ (۲-۱۷۸) اور غلام کے بدلے غلام۔

﴿وَعَبْدًا مَّمْلُوكًا لَا يَقْدِرُ عَلَىٰ شَيْءٍ﴾ (۱۶-۷۵) ایک غلام ہے جو بالکل دوسرے کے اختیار میں ہے۔

میں عَبْد کا لفظ اس معنی میں استعمال ہوا ہے۔

(۲) الْعَبْدُ بِالْإِيجَادِ: یعنی وہ بندہ جسے اللہ نے پیدا کیا ہے اس معنی میں عبودیت اللہ کے ساتھ مختص ہے کسی دوسرے کی طرف نسبت کرنا جائز نہیں ہے۔ چنانچہ آیت کریمہ:

﴿إِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ إِلَّا آتِي الرَّحْمَنِ عَبْدًا﴾ (۱۹-۹۳) تمام شخص جو آسمان اور زمین میں ہیں خدا کے روبرو بندے ہو کر آئیں گے میں اسی معنی کی طرف اشارہ ہے۔

(۳) عَبْد وہ ہے جو عبادت اور خدمت کی بدولت عبودیت کا درجہ حاصل کر لیتا ہے ﴿اس لحاظ سے جن پر عَبْد کا

① انظر لتفصيله لباب التأويل (ص ۱۹، ج ۱) و تاج العروس للزبيدي والمهماني (ص ۲۴ ج ۱) وتفسير ام الكتاب مولانا ابو

الكلام آزاد (ص ۳۵۸-۲۶۸).

② ای قدیاتی عَبْد بمعنی خدمت کما جاء فی تفسیر قوله تعالیٰ، ﴿وقومهما لنا عابدون﴾ ان العابدون ههنا بمعنی الخادم (الروح ۳۳/۱۸) و ایضاً عَبْد بمعنی انف کما فی قوله تعالیٰ ﴿فانا اَوَّلُ العابدین﴾ (۴۳-۸۱) معناه مستنکفین (راجع الصحيح ۷۱۳/۲).

طَرِيقٌ مُّعَبَّدٌ: ہمارا راستہ جس پر لوگ آسانی سے چل سکیں۔ بَعِيزٌ مُّعَبَّدٌ: جس پر تارکول مل کر اسے خوب بد صورت کر دیا گیا ہو۔ عَبَّدْتُ قُلَاتًا: میں نے اسے مطیع کر لیا محکوم بنالیا قرآن پاک میں ہے:

﴿أَنْ عَبَّدْتُ بَنِي إِسْرَائِيلَ﴾ (۲۶-۲۲) کہ تم نے بنی اسرائیل کو محکوم بنا رکھا ہے۔

### (ع ب ر)

الْعَبْرُ: دراصل اس کے معنی ہیں ایک حالت سے دوسری حالت تک پہنچ جانا مگر الْعُبُورُ کا لفظ خاص کر پانی عبور کرنے پر استعمال ہوتا ہے عام اس سے کہ تیر کر عبور کیا جائے یا کشتی، اونٹ اور پل کے ذریعہ سے۔ اسی سے عَبْرُ النَّهْرِ ہے جس کے معنی نہر کے اس کنارہ کے ہیں جہاں سے پانی میں اتر کر اسے عبور کیا جاتا ہے یا دوسری جانب سے عبور کر کے وہاں سے ہوا جاتا ہے۔ اسی سے عَمْرُ الْعَيْنِ کا محاورہ مشتق ہے جس کے معنی ہیں: آنکھ سے آنسو جاری ہونا۔ الْعَبْرَةُ: آنسو اور مسافر کو عَابِرٌ سَبِيلٍ کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿إِلَّا عَابِرِي سَبِيلٍ﴾ (۴-۴۳) ہاں اگر بحالت سفر رستے چلے جا رہے ہوں۔

نَاقَةٌ عَبْرٌ أَسْفَارٍ: مضبوط اونٹنی جو ہر قسم کی زمین میں سفر کر سکے عَبْرُ الْقَوْمِ: لوگ مر گئے۔ گویا انہوں نے دنیاوی زندگی کے پل کو عبور کر لیا اس اعتبار سے عَبَارَةٌ خاص کر اس کلام کو کہتے ہیں جو مشکم کے منہ سے نکل کر فاصلہ عبور کر کے سامع کے کان تک پہنچ جائے اور الْعَبْرَةُ

﴿فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَا﴾ (۱۸-۶۵) (وہاں) انہوں نے ہمارے بندوں میں سے ایک بندہ دیکھا۔ (۲) دوسرے اس کی پرستش میں لگے رہتے ہیں۔ اور اسی کی طرف مائل رہتے ہیں۔ چنانچہ ایسے لوگوں کے متعلق ہی آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے: ﴿(تَعَسَّ عَبْدٌ الدَّرْهَمِ - تَعَسَّ عَبْدُ الدِّينَارِ)﴾ درہم و دینار کا بندہ ہلاک ہو) عَبْدٌ کے ان معانی کے پیش نظر یہ بھی کہا جاسکتا ہے۔ لَيْسَ كُلُّ إِنْسَانٍ عَبْدًا لِلَّهِ کہ ہر انسان اللہ کا بندہ نہیں ہے۔ یعنی بندہ مخلص نہیں ہے۔ لہذا یہاں عَبْدٌ کے معنی عَابِدٌ یعنی عبادت گزار کے ہیں لیکن عَبْدٌ عَابِدٌ سے زیادہ بلیغ ہے اور یہ بھی کہہ سکتے ہیں۔

وَالنَّاسُ كُلُّهُمْ عِبَادُ اللَّهِ کہ تمام لوگ اللہ کے بندے ہیں یعنی اللہ ہی نے سب کو پیدا کیا ہے۔ بلکہ تمام اشیاء کا یہ حکم ہے۔ بعض عبد بالتسخیر ہیں اور بعض عبد بالاختیار اور جب عَبْدٌ کا لفظ غلام کے معنی میں استعمال ہو تو اس کی جمع عِبِيدٌ یا عِبْدٌ آتی ہے اور جب عَبْدٌ بمعنی عَابِدٌ یعنی عبادت گزار کے ہو تو اس کی جمع عِبَادٌ آئے گی لہذا جب عِبِيدٌ کی اضافت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو یہ عِبَادٌ سے زیادہ عام ہوگا یہی وجہ ہے کہ آیت:

﴿وَمَا أَنَا بِظَلَّامٍ لِلْعَبِيدِ﴾ (۵۰-۲۹) اور ہم بندوں پر ظلم نہیں کیا کرتے۔ میں عِبِيدٌ سے ظلم کی نفی کر کے تنبیہ کی ہے کہ وہ کسی بندے پر ذرا برابر بھی ظلم نہیں کرتا خواہ وہ خدا کی پرستش کرتا ہو اور خواہ عبد الشمس یا عبد اللات ہو گے گامدعی ہو۔

① المحدث فی الفائق (۷/۱) وفی البخاری وابن ماجہ عن ابی ہریرۃ وفی رواۃ الترمذی لعین بدل تعس راجع کنز العمال (۳/رقم ۱۰۰۲ و ۱۰۴۳) وتحریر الاحیاء للعراقی (۴۴/۳ و ۳۳۵)۔

﴿عَبَسَ وَتَوَلَّى﴾ (۸۰-۱) ترش رو ہوئے اور منہ پھیر بیٹھے۔

﴿ثُمَّ عَبَسَ وَبَسَّ﴾ (۴۳-۳۲) پھر اس نے تیوری چڑھائی اور منہ بگاڑ لیا۔

اور اسی سے بَوْمٌ عَبُوسٌ ہے۔ جسکے معنی سخت اور بھیا تک دن کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿يَوْمًا عَبُوسًا قَمْطَرِيرًا﴾ (۶۲-۱۰) اس دن سے جو (چہرہ کو) شکن آلود اور (دلوں کو) سخت مضطر کر دینے والا ہے۔

اور اسی اعتبار سے الْعَبَسُ اس گور اور پیشاب کو کہتے ہیں جو اونٹ کی دم کے بالوں کے ساتھ لگ کر خشک ہو جاتا ہے عَبَسَ الْوَسْخُ عَلَى وَجْهِهِ: اس کے چہرہ پر میل پکیل جم گئی۔

### (ع ب ق ر)

عَبَقَرٌ: بعض نے کہا ہے، جنوں کی آبادی کا نام ہے۔ عرب لوگ جب کسی انسان، حیوان یا پکڑے وغیرہ میں نادرہ کاری دیکھتے تو اسے اس کی طرف نسبت کر دیتے اسی بنا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں آنحضرت ﷺ نے ایک خواب بیان کرتے ہوئے فرمایا: ﴿(۲۷)

((لَمْ أَرْ عَبَقَرِيًّا مِثْلَهُ)) کہ میں نے اس جیسا نادرہ المثال شخص نہیں دیکھا۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَعَبَقَرِيَّ حِسَانٍ﴾ (۵۵-۷۶) اور نفیس مسندوں پر۔

وَالْأَعْيُنُ أَسْوَءُ حَالٍ كَوَيْتِهِمْ جَسَدٌ ذَرِيَّةٌ كَيْ دَيْكِهِمْ هَوْنٌ كَيْ وَاسِطَةٍ مِنْ أُنْ دَيْكِهِمْ نَتَاجٌ تَكْ يَهْنَأُ جَاءَ۔<sup>①</sup>

قرآن پاک میں ہے: ﴿إِنَّ فِي ذَلِكَ لَعِبْرَةً﴾ (۳-۱۳) اس واقعہ میں بڑی عزت ہے۔

﴿فَاعْتَبِرُوا يَا أُولِيَ الْأَبْصَارِ﴾ (۵۹-۲) اصحاب بصیرت اس سے عبرت حاصل کرو۔

اور تَغْيِيرُ کے معنی ہیں: خواب کا انجام بتانا گویا تاویل بتانے والا اس کے ظاہر سے باطن تک پہنچ جاتا ہے۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿إِنْ كُنْتُمْ لِلرُّؤْيَا تَعْبُرُونَ﴾ (۱۲-۲۳) اگر تم خوابوں کی تعبیر دے سکتے ہو۔

اور تَغْيِيرٌ کا لفظ تاویل سے خاص ہے کیونکہ تاویل کے معنی مطلق کسی بات کا انجام بیان کرنے کے ہیں خواہ وہ

خواب ہو یا خواب نہ ہو۔<sup>②</sup>

اور الشَّعْرَى الْعَبُورُ: ایک ستارے کا نام ہے کیونکہ وہ بھی اپنے فلک میں مسافت طے کرتا رہتا ہے الْعَبْرَى:

گھاس جو نہر کے کنارے پر آگ آتی ہے۔ اور شَطُّ مَعْبَرٍ: نہر کا وہ کنارہ جہاں پر عبری گھاس اُگی ہوئی ہو۔

### (ع ب س)

الْعَبُوسُ: (ض) کے معنی سینہ کی تنگی سے چہرہ پر شکن پڑنے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

① قال الخليل الْعِبْرَةُ وَالْأَعْيُنُ أَسْوَءُ حَالٍ كَوَيْتِهِمْ جَسَدٌ ذَرِيَّةٌ كَيْ دَيْكِهِمْ هَوْنٌ كَيْ وَاسِطَةٍ مِنْ أُنْ دَيْكِهِمْ نَتَاجٌ تَكْ يَهْنَأُ جَاءَ۔ ۱۲

② قال الشاعر وقد غابت الشعري وقد طلع النسر راجع التنبيه للبكري (۳۸) والاغاني (۱۶/۴۵)۔

③ راجع للحديث اللسان (فری) والنهایة (۷۰/۳) (۲۱۵) والاضداد ابی الطیب ۵۶۳ والبخاری مع الفتح فضائل اصحاب النبی و تعبیر و توحید والمسلم فضائل الصحابة والترمذی (رؤیا) والحاکم (۲۸/۲) (۴۵۰/۵) القائل (۲۲۰/۲) وغریب ابی عبید (۸۷/۱) وکما قال لیبید: ومن فامون اخوانهم وبنهم کھول وشبان کھلة عبقری راجع التاج (عبقر)۔

کر لیا جیسا کہ اَشْكَيْتُهُ کے معنی ہیں: میں نے اس کی شکایت دور کر دی (یعنی سلبِ ماخذ کے معنی پائے جاتے ہیں) قرآن میں ہے:

﴿فَمَا هُمْ مِنَ الْمُعْتَبِينَ﴾ (۲۳-۳۱) ان سے عتاب دو نہیں کیا جائے گا۔

الْأَسْتِعْتَابُ: (رضامندی چاہنا) کسی سے یہ خواہش کرنا کہ وہ اپنے عتاب کو دور کر دے تاکہ راضی ہو جائے کہا جاتا ہے: اِسْتَعْتَبَ فُلَانٌ کسی سے عتاب کو دور کرنے کی خواہش کی۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُونَ﴾ (۸۳-۱۶) اور نہ ان کی معذرت قبول کر کے ان سے عتاب کو دور کیا جائے گا۔ لَكَ الْعُتْبَىٰ: تیرے لیے رضامندی ہے۔ بَيْنَهُمْ أَعْتَابٌ: وہ باہم کشیدہ ہیں۔

عَتَبَ عَتَبًا: آدمی کا ایک پاؤں پر کود کر چلنا جیسے اوپر چڑھنے والا سیڑھیوں پر قدم رکھتا چلا جاتا ہے۔

### (ع ت د)

الْعَتَادُ: ضرورت کی چیزوں کا پہلے سے ذخیرہ کر لینا اور یہی معنی اِغْسَادُ کے ہیں۔ عَتِيدٌ: (اسم فاعل) تیار کرنے والا (اسم مفعول) تیار کی ہوئی چیز۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿هَذَا مَا لَدَيَّ عَتِيدٌ﴾ (۲۳-۵۰) یہ (اعمال نامہ)

میرے سامنے حاضر ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿رَقِيبٌ عَتِيدٌ﴾ (۱۸-۵) میں عَتِيدُ کے معنی ہیں وہ

میں عَبْقَرِيّ کے معنی ایک قسم کے عمدہ فرش کے ہیں جسے اللہ تعالیٰ نے جنت کے فروش کے لیے ضربِ المثل کے طور پر بیان فرمایا ہے۔

### (ع ت ب)

الْعَتَبُ: ہر اس جگہ کو کہتے ہیں جو وہاں اترنے والے کے لیے سازگار نہ ہو۔ نیز دروازہ کی چوکھٹ اور سیڑھی کو بھی عَتَبَہ کہا جاتا ہے۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی بیوی سے جو فرمایا تھا۔ ((قُولِي لِرَبِّكِ عَتَبَہَ بَابُكِ)) اپنے خاوند سے کہنا کہ اپنے دروازہ کی چوکھٹ تبدیل کر لے تو یہاں عَتَبَہ کے معنی بطور کنایہ عورت کے ہیں اور استعارہ کے طور پر عَتَبُ وَمَعْتَبَہ کے معنی اس ناراضگی یا سختی کے بھی آجاتے ہیں جو انسان کے دل میں دوسرے کے متعلق پیدا ہو جاتی ہے یہ بھی اصل میں اَلْعَتَبُ ہی سے ہے اسی کے مطابق خَشْنَتْ بِصَدْرِ فُلَانٍ وَوَجَدَتْ فِي صَدْرِهِ غِلْظَةً کا محاورہ استعمال ہوتا ہے اور اسی سے کہا گیا ہے۔ حِمْلُ فُلَانٍ عَلَى عَتَبَہ صَعْبَہ فُلَانٌ کونا گوار حالت پر مجبور کیا گیا۔ جیسا کہ شاعر ہے کہا ہے۔ \* (خفیف)

(۳۰۰) وَحَمَلْنَا هُمْ عَلَى صَعْبَہ زَوْ

زَاءٍ يَغْلُونَهَا بِغَيْرِ وَطَاءٍ

ہم نے انہیں نہایت میڑھی حالت پر سوار کیا چنانچہ وہ بغیر عمدہ کے اس پر سوار ہیں۔

اَعْتَبْتُ فُلَانًا (۱) ناراضگی ظاہر کرنا (۲) ناراضگی پر ابھارنا (۳) میں نے اس کی ناراضگی دور کر دی یعنی راضی

① التفصیل فی البدایہ والنہایہ ج ۱ ص ۰

② قال ابو زبید الطائی والبيت فی النفاض ۱۶۰.

شادی شدہ عورت ایک طرح سے خاوند کی ملک میں ہوتی ہے عَتَقَ الْفَرَسُ: گھوڑے کا دوڑ میں آگے بڑھ جانا۔ عَتَقَ مِثْلِي يَمِينُ: قسم کا واجب ہونا۔ شاعر نے کہا ہے۔ (الطویل)

(۳۰۱) عَلَى آيَةٍ عَتَقْتَ قَدِيمًا وَلَيْسَ لَهَا وَإِنْ طَلَبْتَ مَرَامَ مجھ پر عرصہ قدیم سے قسم واجب ہو چکی ہے اور اسے پورا کرنے سے چارہ کار نہیں ہے۔

### (ع ت ل)

الْعَتْلُ: کسی چیز کو اس جگہ سے پکڑنا جہاں اس کے سارے سرے جمع ہوتے ہوں اور اسے بزور گھسیٹنا جس طرح کہ اونٹ کی مہار پکڑ کی اسے نہایت بیدردی کے ساتھ کھینچا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿فَاعْتَلَوْهُ إِلَىٰ سَوَاءِ الْجَحِيمِ﴾ (۴۳-۴۷) اور اسے کھینچ کر دوزخ کے اندر لے جاؤ۔

الْعَتْلُ: بسیار خور اور مال کو روک کر رکھنے والا۔ جو کسی چیز کو نہایت بے دردی سے گھسیٹتا ہو (خت گیر) قرآن پاک میں ہے:

﴿عَتْلُ بَعْدَ ذَٰلِكَ زَيْنٌ﴾ (۶۸-۱۳) خست گیر اور اس کے علاوہ بذات بھی۔

### (ع ت و)

عَتَا يَعْتُو عَتُوًا وَعَتِيًّا: حکم عدولی کرنا۔ قرآن میں ہے:

﴿فَعَتَوْا عَنْ أَمْرِ رَبِّهِمْ﴾ (۵-۴۳) تو انہوں نے

فرشتہ لوگوں کے اعمال لکھنے کے لیے ہر وقت تیار رہتا ہے اور آیت کریمہ:

﴿اعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا﴾ (۴-۱۸) ان کے لیے درد انگیز عذاب تیار کر رکھا ہے۔

میں بھی بعض نے کہا ہے کہ اَعْتَدْنَا کا لفظ عَتَاد سے فعل ماضی اَفْعَلْنَا کے وزن پر ہے اور بعض نے کہا ہے کہ یہ اصل میں اَعْدَدْنَا ہے جس میں ایک ”دال“ ”کو“ ت سے تبدیل کر دیا گیا ہے۔

فَرَسٌ عَتِيدٌ وَعَتْدٌ: گھوڑا، جو ہر وقت دوڑ کے لیے تیار ہو اَلْعَتُوْدُ: بکری کا یکسالہ بچہ جمع اَعْتَلَةٌ وَعِدْدَانُ (ت کے دال میں ادغام کے ساتھ)

### (ع ت ق)

الْعَتِيقُ کے معنی المستمیع یعنی پیش رو کے ہیں خواہ اس کا تقدم زمان کے اعتبار ہو، خواہ مکان یا رتبہ کے اعتبار سے۔ اس لحاظ سے اَلْعَتِيقُ کے معنی کہنہ، نجیب اور آزاد شدہ غلام بھی آجاتے ہیں۔ لہذا آیت کریمہ:

﴿وَلْيَطَّوُّوْا بِالْبَيْتِ الْعَتِيقِ﴾ (۲۲-۲۹) اور خانہ

قدیم (یعنی بیت اللہ) کا طواف کریں۔ میں خانہ کعبہ کو اَلْعَتِيقُ کہنے کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ وہ جبارۃ کے پنجہ ستم سے ہمیشہ آزاد رہا ہے اور جابر سے جابر بادشاہ بھی

اس کے مرتبہ کو پست نہیں کر سکا اَلْعَاتِقَانِ: دونوں طرف سے کندھوں اور گردن کے درمیانی حصے کو کہتے ہیں کیونکہ بدن کا یہ حصہ بھی باقی جسم سے بلند ہوتا ہے نیز عَاتِقُ اس عورت کو بھی کہا جاتا ہے جو حبالہ نکاح سے آزاد ہو۔ کیونکہ

① قال اوس بن حجر انظر ديوانه ٤٦ رقم ٣٤ وفيه فليس بدل وليس واللسان (عتق) والسمط ٩٠ ومجاز القرآن رقم ٨٩ والاقتضاب واصلاح يعقوب ٢٣٤ واورده العلماء في الباب التمثيل وقيل: ان امرء القيس اول من ابتكره ولم يات املح منه ١٢.



آتے ہیں۔

اپنے پروردگار کے حکم سے سرکشی کی۔

### (ع ث ر)

عَثَرَ - يَعَثِرُ - عَثَارًا وَعُثُورًا کے معنی پھسل جانے اور گر پڑنے کے ہیں۔ مجازاً عَثَرَ عَلَى كَذَا کے معنی کسی بات پر بغیر قصد کے مطلع ہو جانا بھی آتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَإِنْ عُثِرَ عَلَىٰ أَنَّهُمَا اسْتَحَقَّا إِثْمًا﴾ (۵-۱۰۷) پھر اگر معلوم ہو جائے کہ انہوں نے جرم کا ارتکاب کیا ہے۔

أَعَثَرَهُ عَلَى كَذَا: اس نے فلاں کو اس چیز سے باخبر کر دیا۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَكَذَٰلِكَ أَعَثَرْنَا عَلَيْهِمْ﴾ (۱۸-۲۱) اور اس طرح ہم نے لوگوں کو ان کے حال سے باخبر کر دیا۔ یعنی لوگوں کے قصد کے بغیر ہی ہم نے ان کے حال پر مطلع کر دیا۔

### (ع ث ی)

الْعَيْشُ وَالْعِيشُ: (سخت فساد پیدا کرنا) بھی جَذَبَ اور جَبَذَ کی طرح تقریباً ہم معنی ہی ہیں۔ لیکن عَيْشٌ کا لفظ زیادہ تر فساد حسی کے لیے بولا جاتا ہے اور الْعِيشُ کا حکمی یعنی دینی اور فکری فساد کے لیے آتا ہے کہا جاتا ہے عِشٌّ يَعْنِي عِيشًا۔ چنانچہ اسی سے قرآن پاک میں ہے:

﴿وَلَا تَعْنُوا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ﴾ (۲-۶۰) اور ملک میں فساد اور انتشار پیدا نہ کرو۔

﴿وَعْتُوا عْتُوا كَيْسًا﴾ (۲۵-۲۱) اور (اسی بنا پر)

بڑے سرکش ہو رہے ہیں۔

﴿عَتَتْ عَنْ أَمْرِ رَبِّهَا﴾ (۲۵-۸) اپنے پروردگار

کے امر سے سرکشی کی۔

﴿بَلْ لَّجُوا فِي عُتُوٍّ وَنُفُورٍ﴾ (۶۷-۲۱) لیکن یہ

سرکش اور نفرت میں پھنسے ہوئے ہیں۔

اور آیت کریمہ:

﴿مِنَ الْكِبَرِ عِتْيًا﴾ (۱۹-۸) کے معنی یہ ہیں کہ میں

بڑھاپے کی ایسی حالت تک پہنچ گیا ہوں جہاں اصلاح اور

مداوا کی کوئی سبیل نہیں رہتی یا عمر کے اس درجہ میں کہ جس

میں ریاضت بھی بیکار ہوتی ہے اور لفظ ریاضت سے وہی

معنی مراد ہیں جن کی طرف شاعر نے اشارہ کیا ہے۔

(الکامل)

(۳۰۲) وَبَنَ الْعَنَاءَ رِيَاضَةُ الْهَرَمِ

اور انتہائی بڑھاپے میں ریاضت دینا سراسر تکلیف دہ ہے۔

اور آیت کریمہ:

﴿أَيُّهُمْ أَشَدُّ عَلَى الرَّحْمَنِ عِتِيًّا﴾ (۱۹-۲۹) جو

خدا سے سخت سرکشی کرتے تھے۔

میں بعض نے کہا ہے کہ عِتِيًّا مصدر اور بعض نے کہا ہے کہ یہ

عَابَتِ کی جمع ہے اور الْعَابَتِی کے معنی سنگ دل اور اچڑ بھی

۱. وصدرة: أنروض عرسك بعد ماهرمت..... والبيت في السمت: (۱۰۶:۱) والبيان (۶۶:۱) والبحتری ۳۴۰ والعبون

(۲۹:۲) والعقد (۴۳۵:۲) وفيه وتروض والحيوان (۴۱/۱-۱۰۲/۳) وفيه وتلوم بدل أنروض ومجموعة المعاني

۱۵۷ ومحاضرات المؤلف (۴۸:۱) والحصري (۲۵۹:۲) وتاريخ الطبري (۶: ۱۵۸) بغیر عزوفیه قاله اعرابی انظر الخبر والشرط

فی طلیسمینات الحمدونی والحمدونی هو اسماعیل اعلم الناس شعراً وعامة شعرة فی طلیسمان ابن حرب راجع طبقات ابن

المعز (۳۷۱-۳۷۲).

نشانوں سے عجیب تھے۔

کے معنی یہ ہیں کہ اصحاب کہف قدرت کے عجائبات سے نہ تھے بلکہ ہماری قدرت کے نشانات ایسے بھی ہیں جو ان سے بڑھ کر اور زیادہ عجیب ہیں۔ اور آیت کریمہ:

﴿سَمِعْنَا قُرْآنًا عَجَبًا﴾ (۱-۷۲) (کہنے لگے) کہ ہم نے ایک عجیب قرآن پاک سنا ہے۔

کے معنی یہ ہیں کہ اس قرآن (وحی) کا نہ تو سبب ہی معلوم ہے اور نہ اس جیسا قرآن پاک پہلے دیکھا ہے اور بطور استعارہ یہ لفظ ہر بھلی چیز کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ محاورہ ہے:

أَعْجَبَنِي كَذَا: یعنی مجھے فلاں چیز اچھی معلوم ہوتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُعْجِبُكَ قَوْلُهُ﴾ (۲-۲۰۴) اور کوئی شخص تو ایسا ہے جس کی گفتگو..... تم کو دلکش معلوم ہوتی ہے۔

﴿وَلَا تُعْجِبُكَ أَمْوَالُهُمْ وَلَا أَوْلَادُهُمْ﴾ (۵۸-۹) اور ان کے مال اور اولاد سے تعجب نہ کرنا۔

﴿وَيَوْمَ حُنَيْنٍ إِذْ أَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُهُمْ﴾ (۹-۶۵) اور جنگ حنین کے دن جب کہ تم کو اپنی کثرت پر غرور تھا۔

﴿أَعْجَبَ الْكُفَّارَ بَنَاتُهُ﴾ (۵۷-۲۰) اور کسانوں کو بھیتی بھلی لگتی ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿بَلْ أَعْجَبْتَ وَيَسْخَرُونَ﴾ (۱۲-۳۷) ہاں تم تو تعجب کرتے ہو اور یہ تمسخر کرتے ہیں۔

کے معنی یہ ہیں کہ دوبارہ زندہ ہونے پر پختہ یقین ہونے کی وجہ سے تمہیں ان کے انکار پر تعجب ہوتا ہے اور یہ لوگ

اور عَثَا يَعْتُوْا عَثُوًّا: (باب نصر سے) بھی آتا ہے اور آلَا عَثْسِي: سیاہی مائل اور ست۔ نیز احق آدی کو بھی آعْثَى کہا جاتا ہے۔

## (ع ج ب)

الْعَجَبُ اور التَّعَجُّبُ: اس حیرت کو کہتے ہیں جو کسی چیز کا سبب معلوم نہ ہونے کی وجہ سے انسان کو لاحق ہو جاتی ہے اسی بنا پر حکماء نے کہا ہے کہ عَجَبٌ اس حیرت کو کہتے ہیں جس کا سبب معلوم نہ ہو اس لیے اللہ تعالیٰ پر تعجب کا اطلاق جائز نہیں ہے کیونکہ ذات باری تعالیٰ تو عَلَامُ الْغُيُوبِ ہے۔ اس بنا پر کوئی چیز بھی اس سے مخفی نہیں ہے۔ عَجِبْتُ عَجَبًا: (س) میں نے تعجب کیا۔ عَجَبٌ: ہر وہ بات جس سے تعجب پیدا ہو اور جس قسم کی چیز عام طور نہ دیکھی جاتی ہو اسے عَجِيبٌ کہا جاتا ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿أَكَاَنَ لِلنَّاسِ عَجَبًا أَنْ أَوْحَيْنَا﴾ (۲-۱۰) کیا لوگوں کو اس بات پر حیرت ہے کہ ہم نے وحی بھیجی۔

میں تنبیہ کی ہے کہ آنحضرت ﷺ کی طرف وحی بھیجنا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کیوں کہ یہ لوگ پہلے سے سلسلہ وحی کو جانتے ہیں۔ نیز فرمایا:

﴿بَلْ عَجِبُوا أَنْ جَاءَهُمْ مُنْذِرٌ مِنْهُمْ﴾ (۲-۵۰) بلکہ ان لوگوں نے تعجب کیا ہے کہ انہی میں سے ایک

ہدایت کرنے والا ان کے پاس آیا۔ ﴿وَأَنْ تَعْجَبَ فَعَجَبٌ قَوْلُهُمْ﴾ (۵-۱۳) اور اگر تم عجیب بات سنی جا ہو تو کافروں کا یہ کہنا عجیب ہے۔ اور

آیت کریمہ:

﴿كَانُوا مِنْ آيَاتِنَا عَجَبًا﴾ (۹-۱۸) کہ وہ ہماری

ازراہ نادانی اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔ بعض نے یہ معنی کیے ہیں کہ آپ کو ان کے انکار و جی پر تعجب ہوتا ہے ایک قرأت میں بَلْ عَجِبْتَ ہے تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اللہ نے تعجب کو اپنی طرف منسوب کیا ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ یہ ان چیزوں سے ہے جن پر عَجِبْتَ بمعنی اُنْكَرْتُ ہو جیسا کہ فرمایا:

﴿أَتَعْجَبِينَ مِنْ أَمْرِ اللَّهِ﴾ (۱۱-۷۳) انہوں نے کہا: تم خدا کی قدرت سے انکار کرتی ہو۔

﴿إِنَّ هَذَا لَشَيْءٌ عَجَابٌ﴾ (۳۸-۵) یہ تو بڑی منکر بات ہے۔

هُوَ مُعْجَبٌ بِنَفْسِهِ: وہ غرور اور خود فریبی میں مبتلا ہے۔  
الْعَجَبُ: جانور کی دم کا وہ حصہ جو سرین سے ملا ہوا ہوتا ہے۔

## (ع ج ز)

عَجَزُ الْإِنْسَانِ۔ انسان کا پچھلا حصہ تشبیہ کے طور پر ہر چیز کے پچھلے حصہ کو عَجَزُ کہہ دیا جاتا ہے۔ ﴿قرآن پاک میں ہے:

﴿كَانَ لَهُمْ أَعْجَازٌ تَخْلِي خَاوِيَةً﴾ (۵۴-۲۰) جیسے کھجوروں کے کھوکھلے تنے۔

عَجَزُ کے اصل معنی کسی چیز سے پیچھے رہ جانا یا اسکے ایسے وقت میں حاصل ہونا کے ہیں جب کہ اس کا وقت نکل چکا ہو۔ جیسا کہ لفظ الدَّبَرُ کسی کام کے کرنے سے قاصر رہ جانے پر بولا جاتا ہے اور یہ الْقُدْرَةُ کی ضد ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿أَعْجَزْتَ أَنْ أَكُونَ﴾ (۵-۳۱) اے مجھ سے

اتنا بھی نہ ہو سکا کہ میں.....

أَعْجَزْتُ فَلَنَا وَعَجَزْتُهُ وَعَاجَزْتُهُ کے معنی کسی کو عاجز کر دینے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَأَعْلَمُوا أَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللَّهِ﴾ (۹-۲) اور جان رکھ کہ تم خدا کو عاجز نہیں کر سکو گے۔

﴿وَمَا أَنْتُمْ بِمُعْجِزِينَ فِي الْأَرْضِ﴾ (۴۲-۳۱) اور تم زمین میں خدا کو عاجز نہیں کر سکتے۔

﴿وَالَّذِينَ سَعَوْا فِي آيَاتِنَا مُعَاجِزِينَ﴾ (۳۴-۵) اور جنہوں نے ہماری آیتوں میں کوشش کی کہ ہمیں ہرا دیں گے۔

ایک قرأت میں مُعْجِزِينَ ہے۔ مُعَاجِزِينَ کی صورت میں اس کے معنی ہوں گے: وہ یہ زعم کرتے ہیں کہ ہمیں بے بس کر دیں گے کیونکہ وہ یہ گمان کر چکے ہیں کہ حشر و نشر نہیں ہے کہ اعمال پر جزا و سزا مرتب ہو لہذا یہ باعتبار معنی آیت کریمہ:

﴿أَمْ حَسِبَ الَّذِينَ يَعْمَلُونَ السَّيِّئَاتِ أَنْ يَسْبِقُونَا﴾ (۲۵-۴) کیا وہ لوگ جو برے کام کرتے ہیں یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ ہمارے قابو سے نکل جائیں گے۔

کے مترادف ہوگا اور اگر مُعْجِزِينَ پڑھا جائے تو معنی یہ ہوں گے کہ وہ آنحضرت ﷺ کے تبعین کی طرف عجز کی نسبت کرتے ہیں۔ جیسے جَهْلَتُهُ وَفَسَقَتُهُ کے معنی کسی کی طرف جہالت یا فسق کی نسبت کرنا کے ہوتے ہیں۔ اور بعض کے نزدیک مُعْجِزِينَ بمعنی مُتَّبِعِينَ ہے۔ یعنی لوگوں کو آنحضرت ﷺ کی اتباع سے روکتے ہیں جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا:

﴿الَّذِينَ يَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ﴾ (۷-۲۵) جو

خدا کی راہ سے روکتے ہیں۔  
اور بڑھیا کو عَجُوزُ اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہ بھی اکثر امور سے عاجز ہو جاتی ہے۔  
قرآن پاک میں ہے:

﴿أَلَا عَجُوزًا فِي الْغَابِرِينَ﴾ (۷۱-۲۶) مگر ایک بڑھیا کہ پیچھے رہ گئی۔  
﴿أَلَيْدُ وَأَنَا عَجُوزٌ﴾ (۷۲-۱۱) اے ہے میرے ہاں بچہ ہوگا؟ اور میں تو بڑھیا ہوں۔

### (ع ج ف)

أَعْجَفُ: (صفت) کے معنی انتہائی لاغر اور دبلا کے ہیں اس کی مؤنث عَجْفَاءُ ہے اور جمع عَجَافُ قرآن پاک میں ہے:

﴿سَبْعَ عَجَافٍ﴾ (۴۳-۱۲) سات دبلی۔  
در اصل یہ نَصْلُ أَعْجَفُ سے مشتق ہے جس کے معنی پتلے اور باریک تیر کے ہیں۔ أَعْجَفَ الرَّجُلُ: اس کے مویشی دبے ہو گئے۔ عَجَفْتُ نَفْسِي عَنِ الطَّعَامِ: میری طبیعت کھانے سے اچاٹ ہو گئی۔ عَنْ فُلَانٍ: اس سے دل برداشتہ ہو گئی۔

### (ع ج ل)

الْعَجَلَةُ: کسی چیز کو اس کے وقت سے پہلے حاصل کرنے کی کوشش کرنا، اس کا تعلق چونکہ خواہش نفسانی سے ہوتا ہے اس لیے عام طور پر قرآن پاک میں اس کی مذمت کی گئی ہے حتیٰ کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ﴿(الْعَجَلَةُ مِنَ الشَّيْطَانِ)﴾ (کہ جلد

بازی شیطان سے ہے) قرآن پاک میں ہے:

﴿سَأُرِيكُمْ آيَاتِي فَلَا تَسْتَعْجِلُونِ﴾ (۲۱-۳۷) میں تم لوگوں کو عنقریب اپنی نشانیاں دکھاؤں گا لہذا اس کے لیے جلدی نہ کرو۔  
﴿وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْآنِ﴾ (۱۱۳-۰۲) قرآن پاک کی تلاوت کے لیے جلدی نہ کیا کرو۔  
﴿وَمَا أَعْجَلَكَ عَنْ قَوْمِكَ﴾ (۸۳-۲۰) تو تم نے اپنی قوم سے آگے چلے آنے میں کیوں جلدی کی؟ اور آیت کریمہ:

﴿وَعَجَلْتُ إِلَيْكَ رَبِّ لِتَرْضَى﴾ (۸۳-۲۰) اور تیری طرف آنے میں اس لیے جلدی کی کہ تم خوش ہو جاؤ۔

میں موسیٰ علیہ السلام نے معذرت کی ہے کہ جلد بازی گو مذموم ہے مگر میں نے اچھے مقصد کے پیش نظر یہ اقدام کیا ہے اور وہ ہے رضائے الہی کی طلب۔  
﴿آتَى أَمْرُ اللَّهِ فَلَا تَسْتَعْجِلُوهُ﴾ (۱-۱۶) خدا کا حکم یعنی عذاب گویا آ ہی پہنچا (کافرو) اس کے لیے جلدی مت کرو۔

﴿وَيَسْتَعْجِلُونَكَ بِالسَّيِّئَةِ﴾ (۶-۱۳) اور یہ تجھ سے برائی کے جلد خواستگار ہیں یعنی طالب عذاب۔  
﴿لَمْ تَسْتَعْجِلْ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ﴾ (۳۶-۳) تم بھلائی سے پہلے برائی کے لیے کیوں جلدی کرتے ہو۔  
﴿وَيَسْتَعْجِلُونَكَ بِالْعَذَابِ﴾ (۴۷-۲۲) اور لوگ تم سے عذاب کے لیے جلدی کر رہے ہیں۔

① الفائق (۶۷: ۱) رواہ الترمذی عن سهل بن سعد (وہب عن انس) كنز العمال ۵۴۸-۵۴۷/۳ وغن الحسن مرسلًا (ابن ابی الدنيا فی ذم الغضب) (الخرائط فی مكارم الاخلاق) راجع احباء العلوم بتخريج العراقي.

جائے۔ جیسے لُھَنۃٌ اور عَجَلَتُھُمْ وَلَھَتُھُمْ کے معنی عَجَالۃً یا لُھَنۃً پیش کرنے کے ہیں۔

الْعَجَلۃُ: چھوٹا سالوٹا جو جلدی میں رفع حاجت کے وقت ساتھ لے جایا جاتا ہے الْعَجَلۃُ: کنویں کی گھرنی (چرخ) جس کے ذریعہ ڈول کھینچا جاتا ہے۔

اور تیل گاڑی کو بھی عَجَلۃً کہا جاتا ہے کیونکہ وہ سرعت سے چلتی ہے۔

الْعَجَلُ: مچھڑے کو کہتے ہیں کیونکہ اس میں پھرتی پائی جاتی ہے جو تیل کی عمر تک پہنچنے پر ختم ہو جاتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿عَجَلًا جَسَدًا﴾ (۷-۱۳۸) ایک مچھڑا (بنالیا) وہ ایک جسم تھا۔

اور وہ گائے جس کے ساتھ اس کا مچھڑا ہوا سے مُعْجَلٌ کہا جاتا ہے۔

### (ع ج م)

الْعُجْمۃُ: (کے معنی ابہام اور خفا کے ہیں اور) یہ الْاِبَانۃُ کی ضد ہے جس کے معنی واضح اور بیان کر دینا کے ہیں اور اِعْجَامُ کے معنی ہیں بہم کرنا اِسْتَعْجَمَتِ الدَّارُ: گھر سونا ہو گیا۔ اور اس میں جواب دینے والا کوئی نہ رہا اسی بنا پر کسی عربی نے آباد شہروں سے کنایہ کرتے ہوئے کہا خَرَجْتُ عَنْ بِلَادٍ تَنْطِقُ: میں شہروں سے نکلا جو آباد تھے۔ اَلْعَجْمُ: غیر عرب کو کہتے ہیں اور اَلْعَجْمِیُّ: اس کی طرف منسوب ہے اَلْاِعْجَمُ: وہ آدمی جس کی زبان فصیح نہ ہو خواہ وہ عربی ہی کیوں نہ ہو

﴿وَلَوْ یُعَجِّلُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ اسْتَعْجَلَا لَھُمْ بِالشَّخِیْرِ﴾ (۱۰-۱۱) اور اگر خدا لوگوں کی برائی میں جلدی کرتا جس طرح وہ طلب خیر میں جلدی کرتے ہیں۔ اور آیت کریمہ:

﴿خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ﴾ (۳۱-۳۲) انسان جلد بازی ہی سے بنایا گیا ہے۔

میں بعض نے عَجَلٌ کے معنی مٹی کے ہیں مگر یہ معنی صحیح نہیں ہیں بلکہ اس سے اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ جلد بازی انسان کی جبلت میں ودیعت کی گئی ہے جیسا کہ دوسری آیت کریمہ:

﴿وَكَانَ الْاِنْسَانُ عَجُولًا﴾ (۱۷-۱۱) انسان جلد باز پیدا ہوا ہے۔

﴿مَنْ كَانَ یُرِیْذُ الْعَاجِلۃَ عَجَلْنَا لَہٗ فِیْہَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِیْذُ﴾ (۱۷-۱۸) جو شخص دنیا کی آسودگی کا خواہش مند ہو تو ہم اس میں سے جتنا چاہتے ہیں جلد دے دیتے ہیں۔

میں اَلْعَاجِلۃُ سے دنیوی ساز و سامان مراد ہے۔ یعنی جو شخص دنیوی ساز و سامان چاہتا ہے اسے ہم جو چاہتے ہیں دے دیتے ہیں۔

﴿عَجَلْنَا لَنَا قَطَنًا قَبْلَ یَوْمِ الْحِسَابِ﴾ (۳۸-۱۶) ہم کو ہمارا حصہ حساب کے دن سے پہلے ہی دے دے۔ ﴿فَعَجَلْنَا لَکُمْ ہٰذِہٖ﴾ (۳۸-۲۰) سو اس نے غیبت کی تمہارے لیے جلدی فرمائی۔

اَلْعُجَالۃُ: کھانا جو اصل کھانے سے پہلے یوں ہی کھایا

① نسبہ صاحب التاج الی ابن الاعرابی قال ابو عبیدۃ العجل بمعنی الحمافی لسان حمیر وقال الزمخشری واللہ اعلم بصحۃ ہذا القول (۱۱۷/۳)، کذا قال الفراء وقال ابو اسحاق و ابن جنی و ہذا هو الصحیح.

کبھی اَعَجَمْتُ الْكَلَامَ کے معنی کلام سے ابہام کو دور کرنا بھی آ جاتے ہیں۔ ۵ جیسا کہ اَشْكِيْتُهُ: (شکایت زائل کرنا) غلیل سے مروی ہے کہ حروف مقطعہ کو حروف معجمہ کہا جاتا ہے کیونکہ یہ اعجمی یعنی گونگے ہوتے ہیں بعض نے کہا ہے کہ غلیل کا مقصد یہ ہے کہ یہ حروف مفرد ہونے کی صورت میں ان معانی پر دلالت نہیں کرتے جن پر کہ مرکب ہونے کی حالت میں دلالت کرتے ہیں۔ ۶

بَابُ مُعْجَمٍ بِنْدَرُوَاوَه۔ اَلْعَجْمُ: کجھور کی گٹھلی۔ مفرد عَجْمَةٌ اور گٹھلی کو عَجْمَةٌ یا تو اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ گودا کے اندر مخفی ہوتی ہے اور یا اس لیے کہ اس کا چبانا مشکل ہوتا ہے اور یا اس لیے کہ کھاتے وقت اسے بھی منہ میں ڈال لیا جاتا ہے اور وہ منہ میں مخفی ہو جاتی ہے اور اَلْعَجْمُ کے معنی چبانے کے ہیں محاورہ ہے:

فُلَانٌ صُلْبُ الْعَجْمِ: یعنی وہ آزمائش میں سخت ہے۔

### (ع د ا)

اَلْعَدَدُ: (گنتی) آحاد مرکبہ کو کہتے ہیں۔ اور بعض نے اس کے معنی ”ترکیب آحاد“ یعنی آحاد کو ترکیب دینا بھی کیے ہیں مگر ان دونوں معنی کا مرجع ایک ہی ہے۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿عَدَدَ السِّنِينَ وَالْجِسَابِ﴾ (۵۱۰) برسوں کا شمار اور (کاموں) کا حساب..... اور آیت کریمہ:

﴿فَضَرَبْنَا عَلَىٰ آذَانِهِمْ فِي الْكَهْفِ سِنِينَ عَدَدًا﴾ (۱۸-۱۱) ہم نے غار میں کئی سال تک ان کے

کیونکہ عرب لوگ عجی کی گفتگو بہت کم سمجھتے تھے اور اَلْاَعْجَمِيُّ اس کی طرف منسوب ہے۔

اور آیت کریمہ:

﴿وَلَوْ نَزَّلْنَاهُ عَلَىٰ بَعْضِ الْأَعْجَمِينَ﴾ (۲۶)

(۱۹۸)..... اور اگر ہم اس کو کسی غیر اہل زبان پر اتارتے۔ میں تخفیف کے لیے یا نسبت کو حذف کر دیا گیا ہے۔

﴿وَلَوْ جَعَلْنَاهُ قُرْآنًا أَعْجَمِيًّا لَقَالُوا لَوْلَا فُصِّلَتْ آيَاتُهُ أَعْجَمِيٌّ وَعَرَبِيٌّ﴾ (۴۱-۴۲) اور

اگر ہم اس قرآن کو غیر (زبان) عربی میں نازل کرتے تو یہ لوگ کہتے کہ اس کی آیتیں (ہماری زبان میں) کیوں کھول کر بیان نہیں کی گئیں کیا (خوب کہ قرآن پاک تو) عجی اور مخاطب عربی۔

﴿وَلِسَانُ الَّذِينَ يُلْحِدُونَ إِلَيْهِ أَعْجَمِيٌّ﴾ (۱۶)

(۱۰۳) مگر جس کی طرف تعلیم کی نسبت کرتے ہیں اس کی زبان تو عجی ہے۔

اسی سے بَهِيمَةٌ (چوپایہ) کو عَجَمَاءُ کہا جاتا ہے کیونکہ وہ ناطق کی طرح الفاظ کے ذریعہ اپنے مافی الضمیر کو ادا نہیں کر سکتا۔

حدیث میں ہے۔ ۱ (۳۰) ﴿جُرْحُ الْعَجَمَاءِ

﴿جُبَارٍ﴾ (چوپایہ اگر کسی کو زخمی کر دے تو مالک پر اس کی دیت نہیں ہے) اور دن کی نماز کو عَجَمَاءُ کہا جاتا ہے کیونکہ اس میں قرأت بالجہر نہیں ہوتی اَعَجَمْتُ الْكَلَامَ: میں نے بات مبہم رکھی یہ اَعْرَبْتُ کی ضد ہے

۱ ولفظہ والعجماء جرحها جبار فی حدیث طویل (عم، وابو عوانہ) طب، عن عبادة بن الصامت والفاق ۵۹/۲ واللسان والنهاية (عجم).

۲ ای تكون الهمة فيه للسلب كما قال ابن جني وقال في المحكم وهذا اسد واصوب.

۳ وانظر بحث حروف المعجم المحكم لابن سیده (۱: ۲۰۷-۲۰۹).

ہے۔ جیسے: جَيْشٌ عَدِيدٌ: کثیر تعداد لشکر انھم لَدُوْ عَدُوٍّ: وہ بے شمار ہیں۔ اس کے بالمقابل قلیل چیز کو جسے گنتی کی ضرورت نہ ہو، شَيْءٌ غَيْرُ مَعْدُوْدٍ کہا جاتا ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿فِي الْكَهْفِ سِنِينَ عَدَدًا﴾ (۱۸-۱۱) غار میں کئی سال، میں عَدَدًا کے دونوں معنی ہو سکتے ہیں اور اسی سے هَذَا غَيْرُ مُعْتَدٍ کا محاورہ ہے یعنی یہ چیز شمار کے قابل نہایت حقیر ہے وَلَهُ عُدَّةٌ: اس کے پاس مال و دولت اور اسلحہ وغیرہ بہت سا ساز و سامان تیار رکھا ہے قرآن پاک میں ہے:

﴿لَا عُدَّةَ لَهُ عُدَّةٌ﴾ (۹-۴۶) تو اس کے لیے سامان تیار کرتے۔

اور مَاءٌ عِدٌّ کے معنی بہت زیادہ پانی کے ہیں جس کا ذخیرہ نہ ہو۔ اور اَلْعِدَّةُ شمار کی ہوئی چیز۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَمَا جَعَلْنَا عِدَّتَهُمْ﴾ (۴۳-۳۱) اور ان کا شمار مقرر نہیں کیا۔

﴿فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ﴾ (۲۱-۱۸۳) تو دوسرے دنوں میں (رکھ کر) ان کا شمار پورا کرے۔

یعنی جتنے دن ماہ رمضان سے فوت ہو گئے ہوں ان کے مطابق دوسرے دنوں میں روزے رکھ لے۔

﴿إِنَّ عِدَّةَ الشُّهُورِ﴾ (۹-۳۶) (خدا کے نزدیک) مہینے گنتی ہیں۔

اور اَلْعِدَّةُ: کا لفظ عورت کی عدت پر بھی بولا جاتا ہے یعنی وہ مدت جس کے اندر عورت دوسری جگہ نکاح نہیں کر سکتی۔

کانوں پر (نیند کا) پردہ ڈالے (یعنی ان کو سلائے) رکھا۔  
کے لفظ سے کثرت تعداد کی طرف اشارہ ہے۔  
اَلْعَدَّةُ کے معنی گنتی اور شمار کرنے کے ہیں۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿لَقَدْ أَحْصَاهُمْ وَعَدَّهُمْ عَدًّا﴾ (۱۹-۹۴) اس نے ان سب کا اپنے علم سے احاطہ اور ایک ایک کو شمار کر رکھا ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿فَاسْأَلِ الْعَادِّينَ﴾ (۲۳-۱۱۳) کے معنی یہ ہیں کہ حساب دانوں سے پوچھ دیکھو۔

﴿كَمْ لَبِثْتُمْ فِي الْأَرْضِ عَدَدَ سِنِينَ﴾ (۲۳-۱۱۴) زمین میں کتنے برس رہے۔

﴿وَأَنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَأَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّونَ﴾ (۲۲-۴۷) بے شک تمہارے پروردگار کے نزدیک ایک روز تمہارے حساب کی رو سے ہزار برس کے برابر ہے۔

اور بجاؤ اَعَدُّ کا لفظ کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے (۱) شَيْءٌ مَعْدُوْدٌ أَوْ مَحْصُوْرٌ: تھوڑی سی چیز۔ اس صورت میں یہ اس چیز کے مقابلہ میں استعمال ہوتا ہے جو

بے شمار ہو جس کی طرف قرآن پاک نے بغیر حساب کہہ کر اشارہ کیا ہے۔ چنانچہ آیت کریمہ:

﴿إِلَّا أَيَّامًا مَعْدُوْدَةً﴾ (۲-۸۰) چند روز کے سوا میں مَعْدُوْدَةً کے معنی چند دنوں کے ہیں کیونکہ یہودیہ سمجھتے تھے کہ ہمیں تو صرف چند دن عذاب ہو گا جتنے دن کہ ہم نے بچھڑے کی پوجا کی تھی۔

اور کبھی اس کے برعکس کثرت کے معنی میں استعمال ہوتا

۱. وفي الحديث قال صلى الله عليه وسلم رجل يا رسول الله انما اقلعت له الماء العذني قصه استقطاع ابيض بن حمال المازني نظر الفائق (۶۱/۲)۔

ایک محفل مرتب کی۔

میں بعض نے کہا ہے کہ اَعْتَدْتَ بھی اسی (عَدْتُ) سے ہے اور آیت کریمہ:

﴿وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ﴾ (۲-۱۸۵) تم روزوں کا شمار پورا کرلو۔

کے معنی یہ ہیں کہ تم ماہ رمضان کی گنتی پوری کرلو۔ اور ﴿آيَامًا مَّعْدُودَاتٍ﴾ (۲-۱۸۳) گنتی کے چند روز..... میں، ماہ رمضان کی طرف اشارہ ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَاذْكُرُوا اللَّهَ فِي أَيَّامٍ مَّعْدُودَاتٍ﴾ (۲-۲۰۳) اور گنتی کے دنوں میں خدا کو یاد کرو۔

میں آیام مَّعْدُودَاتٍ سے عید قربان کے بعد کے تین دن مراد ہیں اور معلومات سے ذوالحجہ کے دس دن۔ بعض فقہاء نے کہا ہے کہ آیام مَّعْدُودَاتٍ سے یوم النحر اور اس کے بعد کے دو دن مراد ہیں اس صورت میں ”یَوْمُ النَّحْرِ“ بھی ان تین دنوں میں شامل ہوگا۔

الْعِدَادُ: اس مقررہ وقت کو کہتے ہیں جس میں بیماری کا دورہ پڑتا ہو۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ﴿(۳۱) مَا زَالَتُ أَكُلُهُ خَيْرٌ تَعَادُنِي: کہ خیر کے دن جو مسموم کھانا میں نے کھایا تھا اس کی زہر بار بار عود کرتی رہی ہے۔ عِدَانُ الشَّيْءِ کے معنی کسی چیز کے موسم یا زمانہ

قرآن پاک میں ہے:

﴿فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُونَهَا﴾ (۳۳-۴۹)

تو تم کو کچھ اختیار نہیں کہ ان سے عدت پوری کراؤ۔

﴿وَوَلَّيْتُمْ عَنْهُنَّ لِيعَذِّبَنَّهُنَّ وَآخِصُّوا الْعِدَّةَ﴾ (۱-۲۵)

تو ان کو عدت کے شروع میں طلاق دو اور عدت کا شمار رکھو۔

الْإِعْدَادُ: تیار کرنا، مہیا کرنا۔ یہ عِدَّتے سے جیسے سَفَى

سے اسقاء اور اَعْدَدْتُ هَذَا لَكَ کے معنی ہیں کہ یہ چیز

میں نے تمہارے لیے تیار کر دی ہے کہ تم اسے شمار کر سکتے

ہو اور جس قدر چاہو اس سے حسب ضرورت لے سکتے،

ہو۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَأَعِدُّوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾ (۸-۶۰) اور جہاں

تک ہو سکے (فوج کی جمعیت سے)..... ان کے (مقابلے

کے لیے) مستعد ہو۔

﴿أَعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ﴾ (۲-۲۴) جو کافروں کے لیے

تیار کی گئی ہے۔

﴿وَأَعَدَّ لَهُمْ جَنَّاتٍ﴾ (۹-۱۰۰) اور اس نے ان کے

لیے باغات تیار کیے ہیں۔

﴿أُولَئِكَ أَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا﴾ (۳-۱۸)

ایسے لوگوں کے لیے ہم نے عذاب الیم تیار کر رکھا ہے۔

﴿وَأَعْتَدْنَا لِمَنْ كَذَّبَ﴾ (۲۵-۱۱) اور ہم نے جھٹلانے

والوں کے لیے دوزخ تیار کر رکھی ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَأَعْتَدْتُ لَهُنَّ مُتَّكًا﴾ (۱۲-۳۱) اور ان کے لیے

① وتمام الحديث فهذا اوان قطعت ابهرى (غريب ابى عبيد) (۷۳/۱) والحديث رواه البزار وابو نعيم فى الطب وابن عدى فى الكامل من حديث ابى هريره والحاكم وابو داود ومرسلًا والطبري من حديث بريدة وفيه سمت له امرأة يهودية بخير والحديث باختلاف القرآن للفتى ۱۸ والفاق (۳۸/۱) اللسان (عدد) والاضداد لابن الانبارى ۹۰ والمخصص ۸۸/۵ وتاويل مختلف الحديث والروض للسهلى قاله صلى الله عليه وسلم فى مرضه الذى مات فيه والحديث يدل على انه مات شهيدًا والحديث فى النهاية (۱۵/۱) وفيه تعاودنى بدل تعادنى ۱۲۰



میں سے ایک عنصر میں بھی اس کی معینہ مقدار سے کمی یا

بیشی ہو جائے تو نظام کائنات قائم نہیں رہ سکتا۔

الْعَدْلُ: دو قسم پر ہے اول عدل مطلق: جو عقلاً مستحسن ہوتا ہے یہ نہ تو کسی زمانہ میں منسوخ ہوا ہے اور نہ ہی کسی اعتبار سے تعدی کے ساتھ متصف ہو سکتا ہے۔ مثلاً کسی کے احسان کے بدلہ میں اس پر احسان کرنا اور جو تمہیں تکلیف نہ دے اسے ایذا رسانی سے باز رہنا وغیرہ۔

دوم: عدل شرعی: جسے شریعت نے عدل کہا ہے اور یہ منسوخ بھی ہو سکتا ہے جیسے قصاص، جنایات کسی دیت اور مال مرتد کی اصل وغیرہ۔ چنانچہ آیات:

﴿فَمَنْ اعْتَدَىٰ عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدَىٰ عَلَيْكُمْ﴾ (۲-۱۴۹) پس اگر کوئی تم پر زیادتی کرے تو جیسی زیادتی وہ تم پر کرے ویسی ہی تم اس پر کرو۔ ﴿وَجَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا﴾ (۴۲-۴) اور برائی کا بدلہ تو اسی طرح کی برائی ہے۔

میں زیادتی اور برائی کی سزا کا کام بھی زیادتی اور برائی ہی قرار دیا ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ﴾ (۶-۹۰) خدا تم کو انصاف اور احسان کرنے کا..... حکم دیتا ہے۔

میں عدل کے یہی معنی مراد ہیں کیونکہ کسی چیز کے برابر اس کا بدلہ دینے کا نام عدل ہے یعنی نیکی کا بدلہ نیکی سے اور برائی کا بدلہ برائی سے اور نیکی کے مقابلہ میں زیادہ نیکی اور شر کے مقابلہ میں مسامت سے کام لینے کا نام احسان ہے اور لفظ عدل واحد جمع دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے جیسے: رَجُلٌ عَدْلٌ وَرَجُلٌ عَدْلٌ نے کہا ہے۔ ﴿(الطویل)

## (ع دس)

الْعَدَسُ: مسور کو کہتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔ ﴿وَعَدَسِيهَا وَبَصَلِيهَا﴾ (۲-۶۱) اور مسور اور پیاز۔ اور عَدَسَةٌ ایک قسم کی پھنسی ہے جو مسور کی شکل پر ہوتی ہے اور عدس (اسم صوت) فخر وغیرہ کو ہانکنے کی آواز کو کہتے ہیں۔ اسی سے عَدَسٌ فِي الْأَرْضِ وَهُوَ عَدُوْسٌ کا محاورہ ہے جس کے معنی زمین میں جانے کے ہیں۔

## (ع دل)

الْعَدَالَةُ وَالْمُعَادَلَةُ کے لفظ میں مساوات کے معنی پائے جاتے ہیں اور معنی اضافی کے اعتبار سے استعمال ہوتا ہے۔ یعنی ایک دوسرے کے ہم وزن اور برابر ہونا اور عَدْلٌ وَعَدْلٌ کے قریب قریب ایک ہی معنی ہیں لیکن عَدْلٌ کا لفظ معنوی چیزوں کے متعلق استعمال ہوتا ہے جیسے احکام شرعیہ۔ چنانچہ اسی معنی میں فرمایا۔

﴿أَوْ عَدْلٌ ذَلِكَ صِيَامًا﴾ (۵-۹۵) یا اس کے برابر روزے رکھنا۔

اور عَدْلٌ وَعَدِيلٌ کے الفاظ ان چیزوں کے لیے بولے جاتے ہیں جن کا اور اک حواس ظاہرہ سے ہوتا ہے جیسے وہ چیزیں جن کا تعلق ماپ، تول یا وزن سے ہوتا ہے، پس عَدْلٌ کے معنی دو چیزوں کا برابر ہونا کے ہیں۔ چنانچہ اسی معنی میں مروی ہے (۳۷) بِالْعَدْلِ قَامَتِ السَّمُوتُ وَالْأَرْضُ (کہ عدل ہی سے آسمان و زمین قائم ہیں) یعنی اگر عناصر اربعہ جن سے کائنات نے ترکیب پائی ہے،

① قطعة من بيت الزهير في قصيده له في مدح هدم بن سنان والحارث بن عوف الحريين والقصيدة في ديوانه ۹۶-۱۵۵ وتكملة ←

(۳۰۳) فَهُمْ رِضًا وَهُمْ عَدْلٌ

وہ راضی رہنے والے اور عادل ہیں۔

در اصل عَدْلٌ کا لفظ مصدر ہے، چنانچہ آیت:-

﴿وَأَشْهِدُوا ذَوَىٰ عَدْلٍ مِّنكُمْ﴾ (۲۶۵-۲) اور

اپنے میں سے دو منصف مردوں کو گواہ بنا لو۔

میں عَدْلٌ کے معنی عَدَالَتہ ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَأَمْرُتُ لَا عَدِلَ بَيْنَكُمْ﴾ (۱۵-۱۴۲) اور مجھے حکم

ہوا کہ تم میں انصاف کرو۔

﴿لَا يَجْزِيَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَنْ لَا تَعْدِلُوا

إِعْدِلُوا﴾ (۸-۵)..... اور لوگوں کی دشمنی تم کو اس بات

پر آمادہ نہ کرے کہ تم انصاف چھوڑ دو۔ انصاف کیا کرو اور

آیت کریمہ۔

﴿وَلَنْ تَسْتَطِيعُوا أَنْ تَعْدِلُوا بَيْنَ النِّسَاءِ﴾

(۱۲۹-۳) اور تم خواہ کتنا ہی چاہو عورتوں میں ہرگز برابری

نہیں کر سکو گے۔

میں انسان کے طبعی میلان کی طرف اشارہ ہے کہ تمام

بیویوں سے برابر درجہ کی محبت اس کی قدرت سے باہر

ہے۔ اور آیت کریمہ۔

﴿فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً﴾ (۳-۳) اگر

اس بات کا اندیشہ ہو کہ سب عورتوں سے یکساں سلوک نہ

کر سکو گے تو ایک عورت کافی ہے۔

میں عدل سے نان و نفقہ اور ازدواجی تعلقات میں برابری

مراد ہے۔ اور آیت کریمہ۔

﴿أَوْ عَدْلٌ ذَٰلِكَ صِيَامًا﴾ (۹۵-۵) اس کے برابر

روزے رکھنا۔

میں عَدْلٌ سے مراد یہ ہے کہ وہ روزے طعام سے فدیہ

کے برابر ہوں کیونکہ فدیہ میں مساوات کے معنی ملحوظ ہوں تو

اسے بھی عَدْلٌ کہہ دیا جاتا ہے۔ ﴿اور (۳۳) لَا يُقْبَلُ

مِنْهُ صَرْفٌ وَلَا عَدْلٌ۔ میں بعض نے کہا ہے کہ

عَدْلٌ کا لفظ فریضہ سے کنایہ ہے مگر اس کے اصل معنی

وہی ہیں جو ہم بیان کر چکے ہیں اور صَرْفٌ کا لفظ نَافِلَةٌ

سے اور یہ اصل فرض سے بڑھ کر کام کرنے کا نام ہے لہذا

یہ باہم تقابل کے اعتبار سے عدل اور احسان کے ہم مثل

ہیں اور لَا يُقْبَلُ مِنْهُ کے معنی یہ ہیں کہ اس کے پاس کسی

قسم کی نیکی نہیں ہوگی جو قبول کی جائے اور یہ آیت۔

﴿بَرِّهٖمْ يَّعْدِلُونَ﴾ (۱۵-۶) کے معنی ہیں کہ وہ

دوسروں کو خدا کی مثل اور نظیر قرار دیتے ہیں۔ لہذا یہ

آیت۔

﴿وَهُمْ بِهِ مُسْتَرْكُونَ﴾ (۱۲-۱۰) کے ہم معنی ہوگی۔

بعض نے اس کے معنی یہ کیے ہیں کہ وہ افعال الہیہ کو

دوسروں کی طرف منسوب کرتے ہیں بعض نے اللہ تعالیٰ

کی عبادت سے عدول کرنا مراد لیا ہے۔ اور آیت کریمہ۔

﴿بَلْ هُمْ قَوْمٌ يَعْدِلُونَ﴾ (۲۷-۶۰) بلکہ یہ لوگ

رستے سے الگ ہو رہے ہیں۔

﴿البيت: حتى يشترقوم يقل سرواتهم... والبيت في ديوانه ۱۰۷ والاضداد للسجستاني ۷۵ ومجاز القرآن ۱۷۶ رقم

۲۰۹ ومختار الشعر العاهلی (۱۶۱/۱) والعقد الثمین ۹۰ وشرح السبع لابن الانباری ۳۸۷ واضداد ابی الطیب ۳۴ قال وهذا ای

اطلاق المصدر علی الواحد والجمع مشهور فی المصادر خاصه (

① متفق علیہ من حدیث علی رضی اللہ عنہ وفی مسند عبدالرزاق العدل الفریضه ومن حدیث ابن رضی اللہ عنہ وابی ہریرہ رواہ

مسلم والبخاری وفی ابی داود من حدیث ابی ہریرہ راجع الانصاف ۷ واللسان (صرف) والنهاية (۲/۳۶۰) والغریب للقتبی ۳۱۱

## (ع د و)

الْعَدُوُّ: کے معنی حد سے بڑھنے اور باہم ہم آہنگی نہ ہونا کے ہیں۔ اگر اس کا تعلق دل کی کیفیت سے ہو تو یہ عداوۃ اور مُعَادَاۃ کہلاتی ہے اور اگر رفتار سے ہو تو اسے عَدُوّ کہا جاتا ہے اور اگر عدل و انصاف میں خلل اندازی کی صورت میں ہو تو اسے عُدُوّ اور عَدُوّ کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے۔ ﴿فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدُوًّا بِغَيْرِ عِلْمٍ﴾ (۲-۱۰۸) کہ یہ بھی کہیں خدا کو بے ادبی سے بے سمجھ برانہ کہہ بیٹھیں۔

اور اگر اس کا تعلق کسی جگہ کے اجزاء کے ساتھ ہو تو اسے عَدُوّاء کہہ دیتے ہیں، جیسے، مَكَانٌ ذُو عَدُوّاء: ناہموار مقام۔ چنانچہ مُعَادَاۃ سے اشتقاق کے ساتھ کہا جاتا ہے رَجُلٌ عَدُوٌّ وَقَوْمٌ عَدُوٌّ۔ اور یہ واحد جمع دونوں کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔ ﴿بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ﴾ (۷-۲۴) (اب سے) تم ایک دوسرے کے دشمن ہو۔

مگر کبھی اس کی جمع عَدٰی رَاعَدَاءُ بنا لیتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔ ﴿يَوْمَ يُخْشَرُ اَعْدَاءُ اللّٰهِ﴾ (۴۱-۱۹) جس روز خدا کے دشمن دوزخ کی طرف چلائے جائیں گے۔

الْعَدُوُّ: دوئم پر ہے ایک دشمن تو وہ ہوتا ہے جو قصد و ارادہ سے دشمنی کرتا ہے جیسے فرمایا۔ ﴿وَإِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ.....﴾ (۴-۹۲)

بھی اسی کے معنی پر محمول ہو سکتی ہے یعنی اس کے معنی يَعْدِلُونَ بِہم کے ہیں۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ عَدَلٌ عَنِ الْحَقِّ سے مشتق ہو جس کے معنی حق سے ہٹ جانا کے ہیں۔

أَيَّامٌ مُّتَعَدِّلَاتٌ: معتدل زمانہ یعنی جب رات دن برابر ہوتے ہیں۔

عَادَلُ بَيْنَ الْأَمْرَيْنِ اس نے دو چیزوں کے درمیان موازنہ کیا۔ عَادَلَ الْأَمْرَ: کسی معاملہ میں پھنس گیا اور کسی ایک جانب فیصلہ نہ کر سکا۔ اور جب کسی شخص کی زندگی سے مایوسی ہو جائے تو اس کے متعلق کہا جاتا ہے۔ وَضَعَ عَلَى يَدَيَّ عَدَلٍ: یعنی اب وہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ ۱

## (ع د ن)

عَدَنُ: (ن ض) کے معنی کسی جگہ قرار پکڑنے اور ٹھہرنے کے ہیں۔ کہا جاتا ہے۔ عَدَنَ بِمَكَانٍ كَذَا: یعنی اس نے فلاں جگہ قیام کیا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿جَنَّاتُ عَدْنٍ﴾ (۱۳-۲۴) یعنی ہمیشہ رہنے کے باغات۔ اسی سے اَلْمَعْدِنُ (کان ہے) ہے کیونکہ کان بھی جواہرات کے ٹھہرنے اور پائے جانے کی جگہ ہوتی ہے۔ حدیث میں ہے۔ ۵ (۳۴) ((اَلْمَعْدِنُ جَبَارٌ)) کہ اگر کوئی شخص کان میں گر کر مر جائے تو کان کن پر اس کی دیت نہیں ہے۔

۱ قال ابن الكلبي! هو العدل بن جزء بن سعد العشيرة وكان ولي شرطة لتبع وكان تبع اذا اراد وقتل رجل دفعه اليه فقال الناس وضع على يدي عدل ثم قيل لكل شيء قد يقس منه انظر للكلمة ادب الكاتب ۴۳ واساس البلاغة واللسان (عدل) والميداني

۲ راجع لتخريج الحديث (ع ج م)

دوڑے۔ رَأَيْتُ عِدَاءَ الْقَوْمِ: میں نے لوگوں کو ایک دوسرے کے مقابلہ میں دوڑتے ہوئے دیکھا۔  
الْأَعْدَاءُ کے معنی حق سے تجاوز کرنا کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَلَا تُمْسِكُوهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوا﴾ (۲-۲۳۱)  
اور اس نیت سے ان کو نکاح میں نہ رہنے دینا چاہیے کہ انہیں تکلیف دو اور ان پر زیادتی کرو۔  
﴿وَمَنْ يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَتَعَدَّ حُدُودَهُ﴾ (۴-۱۴)  
اور جو خدا اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا اور اس کی مقررہ کردہ حدود سے آگے بڑھے گا۔

﴿اعْتَدُوا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ﴾ (۲-۶۵) جو تم میں سے ہفتے کے دن میں حد سے تجاوز کر گئے تھے۔ یعنی انہوں نے ہفتے کے دن مچھلیوں کا شکار حلال سمجھ کر حد سے تجاوز کیا۔

﴿تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ فَلَا تَعْتَدُوهَا﴾ (۲-۲۲۹)  
یہ خدا کی (مقرر کی ہوئی) حدیں ہیں ان سے باہر نہ نکلو۔  
﴿فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْعَادُونَ﴾ (۲۳-۷) وہ (خدا کی مقرر کی ہوئی) حد سے نکل جانے والے ہیں۔  
﴿فَمَنْ اعْتَدَىٰ بَعْدَ ذَٰلِكَ﴾ (۲-۱۷۸) جس نے اس کے بعد زیادتی کی اور آیت کریمہ۔  
﴿بَلْ أَنْتُمْ قَوْمٌ عَادُونَ﴾ (۲۶-۱۶۶)  
میں عَادُونَ کے معنی ہیں (۱) حد سے تجاوز کرنے والے

اور اگر مقتول تمہارے دشمنوں کی جماعت سے ہو۔  
﴿جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِينَ﴾  
..... ﴿(۲۵-۳۱)﴾ ہم نے گنہگاروں میں سے ہر پیغمبر کا دشمن بنا دیا۔  
اور دوسری آیت میں ہے۔

﴿عَدُوًّا شَيَاطِينِ الْإِنسِ وَالْجِنِّ﴾ (۶-۱۱۲)  
شیطان (سیرت) انسانوں اور جنوں کو ہر پیغمبر کا دشمن بنا دیا تھا۔

اور دوسرا دشمن وہ ہے جو قصد و ارادہ سے تو دشمنی نہیں کرتا لیکن اس کی حالت ایسی ہوتی ہے جس سے انسان کو ایسے ہی تکلیف پہنچتی ہے جیسے دشمن سے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے

﴿وَأَنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّيَ الْآرَبَ الْعَالَمِينَ﴾ (۲۶-۷۷)  
وہ میرے دشمن ہیں لیکن خدائے رب العالمین (میرا دوست ہے۔)

اور انسان کی اولاد کے متعلق فرمایا۔  
﴿عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوهُمْ﴾ (۶۴-۱۴)  
تمہارے دشمن (بھی) ہیں سو ان سے بچتے رہو۔

اور عَدُوٌّ (دوڑنا) کے متعلق شاعر نے کہا ہے۔ ﴿(اطویل)﴾  
(۳۰۴) فَعَادَىٰ عِدَاءَ بَيْنَ ثَوْرٍ وَنَعَجَةٍ: اس نے ایک ہی دوڑ میں وحشی تیل اور نیل گائے کا شکار کر لیا۔

تَعَادَتِ النَّمَوَاسِي: مویشی ایک دوسرے کے پیچھے

① قاله امرؤ القيس وآخره: وراگاولم ينضح بماء فيغسل - ای انه ادرکهما سريعا وعقرهما قبل ان يعرق والبيت في اللسان (عدد) ودیوانہ ۱۰۳ (صناعة السندوبی) ومختار الشعر الجاهلی ۱۳ والبيت من ابیات المعانی راجع المعانی للقتبی (۱۲-۱۳) وفي مختار الشعراء الجاهلی واللسان ايضا للعقمة فی بانیته راجع دیوانہ ۶۶ وتماہ: وتیس شیوب کالشمیمہ قریب وفي رواية فی مجموعة لامية العرب ۸۲ والجمهرة ۱۰۲ والعقد الثمین ۴۹ والسیوطی ۳۴ والقالی (۲: ۲۲۶) شرح السبع لابن الانباری ۹۶ ویروی ايضا فعادیت منه ..... وكان عدائی ان رکت علی بالی - وفيه صناعة التبلیغ انظر التبریزی علی العشر ۴۶

نُضْلِيهِ نَارًا ﴿٣٠-٣١﴾ اور جو تعدی اور ظلم سے ایسا کرے گا ہم اس کو عنقریب جہنم میں داخل کریں گے۔ اور آیت کریمہ۔

﴿فَمَنْ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ﴾ (۲-۱۷۳) ہاں جو ناچار ہو جائے بشرطیکہ خدا کی نافرمانی نہ کرے اور حد ضرورت سے باہر نہ نکل جائے۔

میں بَاغ سے وہ شخص مراد ہے جو لذت اندوزی کے لیے مردار کا گوشت کھانے کی خواہش کرتا ہے اور عَاد سے مراد وہ شخص ہے جو قدر کفایت سے تجاوز کرتا ہے بعض نے بَاغ کے معنی خلیفہ وقت کا باغی اور عَاد سے وہ شخص مراد لیا ہے جو مجزو نیاز کرنے والوں کے طریق سے تجاوز کرنے والا ہو ﴿۱﴾۔ اور یہ عَدَى طُورَةَ سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں: اپنے رتبہ سے تجاوز کرنے والا اور اسی سے تَعْدِيَةٌ فِي الْفِعْلِ ہے اور علم نحو میں فعل کو تَعْدِيَةٌ سے مراد ہوتا ہے: فعل کا اپنے فاعل سے گزر کر مفعول تک پہنچ جانا۔ اور مَاعِدًا کا لفظ استثناء کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اور آیت کریمہ۔

﴿إِنَّا نَتَّبِعُ الْغُلُوءَ الدُّنْيَا وَهُمْ بِالْغُلُوءِ الْقُصُوءِ﴾ (۸-۳۴) جس وقت تم (مدینہ سے) قریب کے ناکے پر تھے اور کافر بعید کے ناکے پر۔ میں عُدُوَّةُ الدُّنْيَا سے مدینہ کی جانب کا کنارہ مراد ہے جو حد قریب سے کچھ دور تھا۔

## (ع ذ ب)

مَاءٌ عَذْبٌ کے معنی خوش گوار اور ٹھنڈا پانی کے ہیں۔

اور یا (۲) دشمنی رکھنے والے اور یا (۳) اپنے مرتبہ سے تجاوز کرنے والے اس تیسری صورت میں یہ عَدَى طُورَةَ (اس نے اپنے مرتبہ سے تجاوز کیا) کے محاورہ سے مشتق ہوگا۔ اور آیت کریمہ۔

﴿وَلَا تَعْتَدُوا إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ﴾ (۲-۱۹) مگر زیادتی نہ کرنا کہ اللہ تعالیٰ زیادتی کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔

میں ابتداء ظلم و زیادتی کرنا مراد ہے نہ کہ کسی سے بدلہ لینے میں حد سے تجاوز کرنا۔ جس کا ذکر کہ آیت کریمہ۔

﴿فَمَنْ اعْتَدَىٰ عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدَىٰ عَلَيْكُمْ﴾ (۲-۱۹۴) پس اگر کوئی تم پر زیادتی کرے تو جیسی زیادتی وہ تم پر کرے ویسی ہی تم اس پر کرو۔ میں پایا جاتا ہے یعنی اس کی زیادتی کے مطابق بدلہ دو اور ظلم و زیادتی میں پہل کرنے سے منع کرتے ہوئے فرمایا۔

﴿وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ﴾ (۵-۲) نیکی اور پرہیزگاری کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کیا کرو اور گناہ اور ظلم کی باتوں میں مدد نہ کیا کرو۔

اور عدوان یعنی زیادتی کا بدلہ لینے کو بھی قرآن پاک نے عدوان کہا ہے حالانکہ یہ جائز ہے جیسے فرمایا۔

﴿فَلَا عُدْوَانَ إِلَّا عَلَى الظَّالِمِينَ﴾ (۲-۱۹۳) تو ظالموں کے سوا کسی پر زیادتی نہیں کرنی چاہیے۔

﴿وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ عُدْوَانًا وَظُلْمًا فَسَوْفَ

① ذکر ابرو حیان فی بحرہ (۴۸۱/۱-۴۸۴) تسعة اقوال فی تفسیر الآیۃ والسید المرتضیٰ فی امالیہ (۲۱۵-۲۱۹) حصة اقوال وراجع الطبری القول الثانی (۲: ۳۱۳)

﴿وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ﴾ (۲-۱۰) اور... ان کو دکھ دینے والا عذاب ہوگا۔

﴿وَأَنَّ عَذَابِي هُوَ الْعَذَابُ الْأَلِيمُ﴾ (۱۵-۵) اور یہ کہ میرا عذاب بھی درد دینے والا عذاب ہے۔

لفظ عَذَاب کی اصل میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ عَذَب (ض) الرَّجُلُ کے محاورہ سے مشتق ہے یعنی اس نے (پاس کی شدت کی وجہ سے) کھانا اور نیند چھوڑ دی اور جو شخص اس طرح کھانا اور سونا چھوڑ دیتا ہے اسے عَاذِبٌ وَعَذُوبٌ کہا جاتا ہے لہذا تَعَذِيبٌ کے اصلی معنی ہیں، کسی کو بھوکا اور بیدار رہنے پر اکسانا اور بعض کے نزدیک یہ عَذَب (شیریں) سے مشتق ہے لہذا عَذْبَتُهُ کے معنی ہیں، میں نے اسے زندگی کی لذت اور خوشگوار یوں سے محروم کر دیا جیسا کہ مَرَضَتُهُ (میں نے اس سے مرض کو دور کیا) اور قَذَيْتُهُ میں نے اس کی آنکھ سے تنکا نکالا۔

بعض نے کہا ہے کہ دراصل التَّعَذِيبُ کے معنی ہیں کسی کو کوڑے کے (عَذْبَہ) یعنی سرے کے ساتھ متواتر مارنا۔ چنانچہ بعض علمائے لغت نے تَعَذِيبُ کے معنی ہی مارنا لکھنے ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ یہ مَاءٌ عَذْبُ کے محاورہ سے ماخوذ ہے یعنی مکدر پانی جس کے اوپر کوڑا کرکٹ پڑا ہوا ہو۔ اس بنا پر عَذْبَتُهُ کے معنی ہیں: میں نے اس کی زندگی کے چشمہ صافی کو مکدر کر دیا اس سے زندگی کی راحت دور کر دی۔ عَذْبَةُ السَّوْطِ: کوڑے کا سرا۔ عَذْبَةُ اللِّسَانِ: زبان کا سرا عَذْبَةُ الشَّجَرِ: درخت کا سرا۔

## (ع ذ ر)

الْعُذْرُ: ایسی کوشش جس سے انسان اپنے گناہوں کو مٹا

قرآن پاک میں ہے۔

﴿هَذَا عَذَبٌ فُرَاتٌ﴾ (۲۵-۵۳) ایک کا پانی شیریں اور خوشگوار ہے۔

أَعَذَبَ الْقَوْمُ: لوگوں کو شیریں پانی ملنے لگا۔  
الْعَذَابُ: سخت تکلیف دینا۔ عَذْبَهُ تَعَذِيبًا: اسے عرصہ دراز تک عذاب میں مبتلا رکھا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿لَا عَذْبَتَهُ عَذَابًا شَدِيدًا﴾ (۲۷-۲۱) میں اسے سخت سزا دوں گا۔

﴿وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَأَنْتَ فِيهِمْ وَمَا كَانَ اللَّهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُونَ﴾ (۸-۳۳) اور خدا ایسا نہ تھا کہ جب تک تم ان میں تھے انھیں عذاب دیتا اور نہ ایسا تھا کہ وہ بخشش مانگیں اور وہ انہیں عذاب دے۔ یعنی بذریعہ عذاب کے ان کا استیصال نہیں کرے گا۔ اور آیت کریمہ۔

﴿وَمَا لَهُمْ أَلَّا يُعَذِّبَهُمُ اللَّهُ﴾ (۸-۳۴) اور اب ان کے لیے کون سی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انھیں عذاب نہ دے۔

کے معنی یہ ہیں کہ اب انھیں تہ تیغ کرنے کا وقت آ گیا ہے۔ اور فرمایا۔

﴿وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ﴾ (۱۷-۱۵) اور ہم..... عذاب نہیں دیا کرتے۔

﴿وَمَا نَحْنُ بِمُعَذِّبِينَ﴾ (۲۶-۱۳۸) اور ہم پر کوئی عذاب نہیں آئے گا۔

﴿وَلَهُمْ عَذَابٌ وَأَصِيبٌ﴾ (۳۷-۱۰) اور ان کے لیے دائمی عذاب ہے۔

جبوٹے عذر پیش کرنے والوں پر خدا کی لعنت ہو اور جو واقعی معذور ہیں ان پر رحم فرمائے اور آیت کریمہ۔

﴿مَعْذِرَةٌ إِلَىٰ رَبِّكُمْ﴾ (۱۶۴-۷) تمہارے پروردگار کے سامنے معذرت کر سکیں۔

میں مَعْذِرَةٌ عَذْرَتْ کا مصدر ہے اور اس کے معنی یہ ہیں کہ میں اس سے درخواست کرتا ہوں کہ میرا عذر قبول فرمائے اَعْذَرَ: اس نے عذر خواہی کی اپنے آپ کو معذور ثابت کر دیا۔ کہا گیا ہے ۱ اَعْذَرَ مَنْ اَنْذَرَ: یعنی جس نے ڈر سنا دیا وہ معذور ہے بعض نے کہا ہے کہ عَذْرَ اَصْل میں عَذْرَةٌ سے ماخوذ ہے جس کے معنی نجاست اور گندگی کے ہیں ۲ اور اسی سے جو چڑا ختنہ میں کاٹا جاتا ہے اسے عَذْرَةٌ کہا جاتا ہے ۳ اور عَذْرَتْ الصَّبِيّ کے معنی ہیں: میں نے لڑکے کا ختنہ کر دیا گویا اسے ختنہ کی نجاست سے پاک کر دیا اسی طرح عَذْرَتْ فُلَانًا کے معنی ہیں: میں نے اسے معافی دے کر اس سے گناہ کی نجاست کو دور کر دیا جیسا کہ عَفَرْتُ لَهُ کے معنی ہیں: میں نے اس کا گناہ چھپا دیا اور لڑکے کے ختنہ کے ساتھ تشبیہ دے کر لڑکی کے پردہ بکارت کو بھی عَذْرَةٌ کہا جاتا ہے اور عَذْرَتْهَا کے معنی ہیں: میں نے اس کے پردہ بکارت کو زائل کر دیا اور بچے کے حلق کے درد کو بھی عَذْرَةٌ کہا جاتا ہے اسی سے عَذْرَ الصَّبِيّ ہے جس کے معنی بچے کے درد حلق میں مبتلا ہونے کے ہیں۔ شاعر نے کہا ہے۔ ۴

دینا چاہے اس میں اَلْعُذْرُ اور اَلْعُذْرُ دو لغت ہیں اور عَذْرُ کی تین صورتیں ہیں۔

اول یہ کہ کسی جرم کے ارتکاب سے قطعاً انکار کر دے۔ دوم یہ کہ ارتکاب جرم کی ایسی وجہ بیان کرے جس سے اس کی براءت ثابت ہوتی ہو۔ سوم یہ کہ اقرار جرم کے بعد آئندہ اس جرم کا ارتکاب نہ کرنے کا وعدہ کر لے۔ عذر کی اس تیسری صورت کا نام توبہ ہے جس سے ثابت ہوا کہ توبہ عذر کی ایک قسم ہے۔ لہذا ہر توبہ کو عَذْرُ کہہ سکتے ہیں مگر ہر عذر کو توبہ نہیں کہہ سکتے اَعْتَذَرْتُ إِلَيْهِ: میں نے اس کے سامنے عذر بیان کیا عَذْرَتُهُ: میں نے اس کا عذر قبول کر لیا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿يَعْتَذِرُونَ إِلَيْكُمْ﴾ (۹۴-۹) تو تم سے عذر کریں گے۔ ﴿قُلْ لَا تَعْتَذِرُوا﴾ (۹۴-۹) ان سے کہہ دو کہ عذر مت کرو۔

اَلْمُعْذِرُ: جو اپنے آپ کو معذور سمجھے مگر دراصل وہ معذور نہ ہو۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَجَاءَ الْمُعَذِّرُونَ﴾ (۹۰-۹) عذر کرتے ہوئے (تمہارے پاس آئے۔)

ایک قراءت میں مُعْذِرُونَ ہے یعنی عذر پیش کرنے والے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما ۵ کا قول ہے۔

(لَعَنَ اللَّهُ الْمُعْذِرِينَ وَرَحِمَ الْمُعْذِرِينَ) یعنی

① انظر للكلمة المعيداني رقم ۲۴۹۶

② ومنه قبل للغاء العذرة لالغاء النجاسة فيها وفي الحديث ((ما لكم لا تنظفون عذراتكم)) وفي الحديث ايضاً ((اليهود اتن خلق الله

عزره)) الفائق (۶۲/۲)

③ وفي الحديث ((ولد رسول الله صلى الله عليه وسلم معذراً)) قال في الفائق (۶۳/۲) اي مسروراً من قطعت سرته

④ قاله جرير وصدرة: غمزاين مرة يافزودق كينها۔ والبيت في حل المعاصم (عذر كين۔ نفع) وديوانه ۳۰۶ والاقضاب

۳۴۱ والاشتقاق ۵۳۹ والخزانة (۴۸۱/۱) وفي المطبوع نغانع (بالمهمله) مصحف

مبادا انہیں ان کی طرف سے بے خبری میں کوئی نقصان پہنچ جائے۔

الْعَرَارُ: اس سنناٹ کو کہتے ہیں جو تیز ہوا کے چلنے سے پیدا ہوتی ہے۔ پھر تشبیہاً زشر مرغ کی آواز کو بھی عَرَارُ کہا جاتا ہے۔ عَارَ الظِّلْمُ: زشر مرغ نے آواز کی۔ اَلْعَرَعُ (شمشاد کی قسم کا) ایک درخت جو ہوا کے چلنے سے گونجتا ہے۔ عَرَّ عَارٍ: ایک قسم کا بچوں کا کھیل (جس میں وہ یہ کلمہ بولتے ہیں تاکہ دوسرے بچے اپنے چھپنے کی جگہ سے باہر نکل آئیں۔)

### (ع ر ب)

الْعَرَبُ: حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد کو کہتے ہیں  
الْأَعْرَابُ: دراصل یہ عَرَبُ کی جمع ہے مگر یہ لفظ بادیہ نشین لوگوں کے ساتھ مختص ہو چکا ہے قرآن پاک میں ہے۔  
﴿قَالَتِ الْأَعْرَابُ آمَنَّا﴾ (۱۴-۳۹) بادیہ نشین نے آکر کہا: ہم ایمان لے آئے۔

﴿الْأَعْرَابُ أَشَدُّ كُفْرًا وَنِفَاقًا﴾ (۹-۹۷) دیہاتی لوگ سخت کافر اور سخت منافق ہیں۔  
﴿وَمِنَ الْأَعْرَابِ مَنْ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ  
الْآخِرِ﴾ (۹-۹۹) اور بعض دیہاتی ایسے ہیں کہ خدا پر اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں۔

بعض نے کہا ہے کہ اَعْرَابُ کی جمع اَعَارِبُ آتی ہے کسی شاعر نے کہا ہے۔ (الوافر)

(۳۰۶) اَعَارِبُ ذُو وَفَخِرٍ بِأُفْلِكِ

وَالْيَسَنَةِ لَطَافٍ فِي الْمَقَالِ

اعرابی جو جھوٹے فخر کے مدعی ہیں اور گفتگو میں نرم زبان

(۳۰۵) عَمَزَ الطَّبِيبُ نِعَايِعَ الْمَعْدُورِ  
جیسا کہ طبیب دروہلق میں مبتلا بچے کا گلا دباتا ہے۔  
اور مُعْتَذِرٌ عذر خواہی کرنے والے کی مناسبت سے۔ اِعْتَذَرَتِ الْحِمَاءُ: پانی کے سرچشمے منقطع ہو گئے اور اِعْتَذَرَتِ الْمَنَازِلُ: مکانوں کے نشانات مٹ گئے۔ وغیرہ محاورات استعمال ہوتے ہیں اور عَذِرَةٌ (یعنی نجات سے اعتبار) سے کہا جاتا ہے۔

الْعَاذِرَةُ وہ عورت جسے استخاضہ کا خون آ رہا ہو۔ عَذُورٌ: بدخلق آدمی۔ دراصل عَذِرَةٌ کے معنی مکانات کے سامنے کا کھلا میدان ہے اسکے بعد اس نجاست کو عَذِرَةٌ کہنے لگے ہیں جو اس میدان میں پھینکی جاتی ہے۔

### (ع ر ر)

الْمُعْتَرُ: وہ ہے جو کچھ لینے کے لیے تمہارے سامنے آئے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَأَطِيعُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ﴾ (۲۲-۳۶) اور قناعت سے بیٹھے رہنے والوں اور سوال کرنے والوں کو بھی کھلاؤ۔

عَرَّةٌ يَعْرُوہُ کے معنی ہیں: بخشش طلب کرنے کے لیے کسی کے سامنے آنا۔

اِعْتَرَتْ بِكَ حَاجَتِي: میں نے اپنی ضرورت تمہارے سامنے پیش کی۔ اَلْعَرُ وَالْعُرُ: خارش کی بیماری کو کہتے ہیں جو بدن کو عارض ہو جاتی ہے اس مناسبت سے مَعْرَةٌ کا لفظ ہر قسم کی مضرت پر بولا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَنُصِيبُكُمْ مِنْهُمْ مَعْرَةً بَغَيْرِ عِلْمٍ﴾ (۲۸-۲۶)



﴿عَرَبِيًّا أْتَرَابًا﴾ (۵۶-۳۸) (اور شوہروں کی)

رکھتے ہیں۔

پیاریاں اور ہم عمر۔

اور عَرَبْتُ عَلَيْهِ کے معنی کسی کو اس کی غلطی بتانے کے ہیں۔ حدیث پاک میں ہے (۳۶) عَرَبْتُوْا عَلٰی الْاِمَامِ: (امام قرأت میں غلطی کرے تو اسے بتادو) الْمُعَرَّبُ: عربی گھوڑے کا مالک، جیسا کہ خارش زدہ کو مُجَرَّبُ کہا جاتا ہے۔ اور آیت کریمہ۔

﴿حُكْمًا عَرَبِيًّا﴾ (۳-۳۷) کے معنی واضح اور فصیح کتاب کے ہیں جو حق کو ثابت اور باطل کو غلط ثابت کر دکھائے۔

بعض نے کہا ہے کہ اس کے معنی کریم اور بلند مرتبہ کے ہیں اور یہ عَرَبِيًّا أْتَرَابًا کے محاورہ سے ماخوذ ہے اور اس کے وہی معنی ہیں جو کہ كِتَابٌ كَرِيمٌ کے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ عَرَبِيًّا بمعنی مُعَرَّبُ ہے اور یہ عَرَبْتُوْا عَلٰی الْاِمَامِ کے محاورہ سے ماخوذ ہے اور اس کے معنی ہیں پہلی کتابوں کے احکام کو منسوخ کرنے والا۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ عربی نبی کی طرف منسوب ہے اور عربی کی طرف نسبت کے وقت بھی عربی ہی کہا جائے گا یعنی تلفظ میں منسوب اور منسوب الیہ ایک ہی ہیں۔ يَعْرُبُ اس شخص کا نام ہے جس نے سب سے پہلے سریانی زبان کو عربی میں منتقل کیا اس لیے اس کا نام ہی یعرب مشہور ہو گیا۔

### (ع ر ج)

الْعُرُوجُ کے معنی اوپر چڑھنا کے ہیں قرآن پاک میں ہے ﴿تَعْرُجُ الْمَلَائِكَةُ وَالرُّوحُ اِلَيْهِ﴾ (۴۰-۴۱) جس

آلَا عَرَابِيٌّ: یہ اَعْرَابُ کا مفرد ہے اور عرف میں بادیہ نشین پر بولا جاتا ہے اَلْعَرَبِيُّ: فصیح وضاحت سے بیان کرنے والا۔ اَلْاَعْرَابُ: کسی بات کو واضح کر دیا۔ اَعْرَبَ عَنْ نَفْسِهِ: اس نے اپنی بات کو وضاحت سے بیان کر دیا حدیث میں ہے۔ ﴿اَلْتَّيْبُ تُعْرَبُ عَنْ نَفْسِهَا﴾ کہ شیب اپنے دل کی بات صاف صاف بیان کر سکتی ہے۔ اِعْرَابُ الْكَلَامِ کلام کی فصاحت کو واضح کرنا۔ علمائے نحو کی اصطلاح میں اِعْرَابُ کا لفظ ان حرکات و سکنات پر بولا جاتا ہے جو کلموں کے آخر میں یکے بعد دیگرے (حسب عوائل) بدلتے رہے ہیں۔ اَلْعَرَبِيُّ: واضح اور فصیح کلام کو کہتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا۔

﴿قُرْآنًا عَرَبِيًّا﴾ (۱۲-۲) واضح اور فصیح قرآن (نازل کیا) ﴿بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُبِينٍ﴾ (۲۶-۱۹۵) فصیح عربی زبان میں۔

﴿فُصِّلَتْ اٰيَاتُهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا﴾ (۴۱-۳) جس کی آیات کھول کھول کر بیان کر دی گئی ہیں۔ یعنی واضح قرآن۔

مَا بِالدَّارِ عَرَبِيٌّ: گھر میں کوئی نہیں ہے اِمْرَءَةٌ عَرُوبَةٌ: وہ عورت جو اپنے خاوند سے محبت اور پاک بازی کو ظاہر کرنے والی ہو۔ اس کی جمع عُرُوبٌ ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

① انظر للحديث الفائق (۶۵/۲) تخفيف الرءاء وتشديد ها راجع غريب ابى عبيد (۱: ۱۶۲-۱۶۳) وفى (ج) فى النكاح والحاكم

(۱۹۲/۴)

② قد ذكره ابو الطيب الحلبي فى الاضداد (۲: ۴۹۸-۴۹۹)

کی طرف روح (الایمن) اور فرشتے چڑھتے ہیں۔  
 ﴿فَظَلُّوا فِيهِ يَعْرُجُونَ﴾ (۱۵-۱۳) اور وہ اس میں  
 چڑھنے بھی لگیں۔  
 اور مَعَارِجُ کے معنی سیڑھیوں کے ہیں اس کا مفرد  
 مَعْرَجٌ (اور معراج) ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔  
 ﴿وَمِنَ اللَّيْلِ ذِي الْمَعَارِجِ﴾ (۷۰-۳) سیڑھیوں  
 والے خدا کی طرف سے (نازل ہوگا۔)

وَعْرَجٌ (اور معراج) ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔  
 ﴿وَمِنَ اللَّيْلِ ذِي الْمَعَارِجِ﴾ (۷۰-۳) سیڑھیوں  
 والے خدا کی طرف سے (نازل ہوگا۔)  
 اور شب معراج کو بھی لَيْلَةُ الْمَعْرَاجِ اس لیے کہا جاتا  
 ہے کہ اس میں دعائیں اوپر چڑھتی ہیں جیسا کہ آیت  
 کریمہ:

### (ع ر ش)

﴿إِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ﴾ (۳۵-۱۰) اسی کی  
 طرف پاکیزہ کلمات چڑھتے ہیں۔  
 میں اس کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے۔  
 عَرَجَ عُرُوجًا وَعَرَجَانًا: (ہموار زمین پر) ایسے چلنا  
 جیسے کوئی شخص سیڑھیاں چڑھ رہا ہو جیسا کہ دَرَجَ کا لفظ  
 اس شخص کے لیے استعمال ہوتا ہے جو دَرَجَ یعنی سیڑھی پر  
 چڑھنے والے کی طرح چلے۔ عَرَجَ (س) مستقل طور پر  
 لنگڑا ہونا اور ضَنْبُ (لنگھار) کو عَرَجَاءُ کہا جاتا  
 ہے۔ کیونکہ وہ خِلْفَةُ لَنَگڑا ہوتا ہے اور نَعَارَجَ کے معنی  
 جھکف لنگڑا کر چلنے کے ہیں جیسا کہ تَضَالَعَ کے معنی  
 جھکف سیری ظاہر کرنا کے ہوتے ہیں اسی سے استعارتاً

① قاله ابراهيم بن العباس المصولي وصدره: ابا جعفر خف بنو بعد صولة وفي رواية قصر بدل عرج والبيت في الشعراء ٢٤  
 والصدقة ٣٥ والاغانى (٢١/٩) والادباء (٢٢٤: ١) ونزهة المجلس (٢٦٧: ٢) والوفيات (٥٦: ٢) والطرائف ١٦١ شعر ابراهيم رقم  
 ١٢٤ والعقد (٣٥٦: ٢) وفيه البيت: ابا جعفر عرج على خلطائكا واقصر قليلاً عن مدى غلوائكا والمحاضرات للمؤلف (١٧٥) وفيه  
 دولة بعد صولة وابن عبر نسبة الى علي بن الجهم انه كتب الى ابن الزيات وفي رواية العيون (٢٧٣/١) والعقد الفريد ابا جعفر عرج  
 على خلطائكا واقصر قليلاً عن مدى غلوائكا

② فنونه اصلية ووزنه فعول كذا في القاموس قال الزجاج وزنه فعول ونونه زائدة راجع الروح (٢٠/٢٣)

ان سے دریافت کیا کہ پروردگار نے تمہارے ساتھ کیا کیا؟ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: اگر خدا اپنی رحمت سے میری دیکھیری نہ کرتا "لَئِلْ عَرِشِي" تو میں ذلیل ہو جاتا۔ اور عرش الہی سے صرف نام کی حد تک ہم واقف ہیں اور اس کی حقیقت انسان کے فہم سے بالاتر ہے اور وہ بادشاہ کے عرش کی طرح نہیں ہے جیسا کہ عوام خیال کرتے ہیں کیونکہ اس صورت میں تو عرش باری تعالیٰ کا حامل قرار پائے گا نہ کہ محمول، حالانکہ ذات الہی اس سے بالاتر ہے (کہ کوئی چیز اسے اٹھائے) جیسا کہ خود قرآن پاک میں ہے۔

﴿إِنَّ السَّلَٰةَ يُنْسِكُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ أَنْ تَزُولَا وَلَٰكِنْ زَالَتَا إِنْ أَمْسَكَهُمَا مِنْ أَحَدٍ مِّنْ بَعْدِهِ﴾ (۳۵-۳۱) خدا ہی آسمانوں اور زمین کو تھامے رکھتا ہے کہ اپنی جگہ سے ہٹ نہ جائیں اگر وہ اپنی جگہ سے ہٹ جائیں تو خدا کے سوا کوئی ایسا نہیں جو ان کو تھام سکے۔ بعض علماء کا خیال یہ ہے کہ عرش سے فَلَکُ الْأَعْلٰی (فَلَکُ الْاَفْلَاکِ) اور کُرْسٰی سے فَلَکُ الْکَوَکِبِ یعنی آٹھواں آسمان مراد ہے چنانچہ حدیث میں ہے کہ آنحضرت نے فرمایا۔ ﴿(مَا السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَالْأَرْضُ سَبْعُونَ سَبْعًا فِي جَنْبِ الْکُرْسٰی الْاِکْھَلَقَ مَلَقَاةً فِيْ اَرْضٍ فَلَاقَةً)﴾ کہ سات آسمانوں اور سات زمینوں کی مثال کرسی کے مقابلہ میں ایسی ہی ہے جیسے بیابان میں ایک انگٹھی پڑی ہوئی ہو اور یہی نشیث عرش کے مقابلہ میں کرسی کی ہے۔ اور آیت کریمہ۔ ﴿وَكَانَ عَرْشُهُ عَلٰی الْمَآءِ﴾ (۱۱-۱۷) اور (اس

﴿وَمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا يَعْرِشُونَ﴾ (۱۶-۶۸) اور درختوں میں اور ان سے جنہیں ٹیوں پر چڑھاتے ہیں۔ ﴿وَمَا كَانُوا يَعْرِشُونَ﴾ (۶۷-۱۳) جو ٹیوں پر چڑھاتے تھے۔

ابو عبیدہ نے کہا ہے کہ يَعْرِشُونَ کے معنی يَتَنَوَّنَ ہیں یعنی جو وہ عمارتیں بناتے تھے ﴿اِعْتَرَشَ الْعِثَبَ﴾ انگور کی تیل کے لیے بانس وغیرہ کی ٹٹی بنائی۔ اَلْعَرِيشُ: چھولہ داری۔ جس کی ہیئت انگور کی ٹٹی سے ملتی جلتی ہے۔ اسی سے عَرَشْتُ الْبَنِيَّ ہے جس کے معنی کنوئیں کے اوپر چھولہ داری سی بنانا کے ہیں۔ بادشاہ کے تخت کو بھی اس کی بلندی کی وجہ سے عَرَش کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَرَفَعَ اَبُوْهُ عَلٰی الْعَرْشِ﴾ (۱۲-۱۰۰) اور اپنے والدین کو تخت پر بٹھایا۔ ﴿اَيُّكُمْ يَاتِنِيْ بِعَرْشِهَا﴾ (۲۷-۳۸) کوئی تم میں سے ایسا ہے..... کہ ملکہ کا تخت میرے پاس لے آئے۔ ﴿نَجْرُوْا هَآءَا عَرْشَهَا﴾ (۲۷-۴۱) اس کے تخت کی صورت بدل دو۔

﴿اَهْكَذَا عَرْشُكَ﴾ (۲۷-۴۱) کہ آپ کا تخت بھی اسی طرح کا ہے۔

اور بطور کنایہ عَرَش کا لفظ عزت، غلبہ اور سلطنت کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے، چنانچہ محاورہ ہے۔ فُلَانٌ قُلٌّ عَرَشُهُ: (یعنی فلاں کی عزت جاتی رہی) مروی ہے (۳۱۸) کہ کسی نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خواب میں دیکھا تو

① راجع محاذہ (۲۲۷/۱)

② سیاتی فی (کرسی) وہناک الموعد لتخریجہ انشاء اللہ تعالیٰ

فروخت کے لیے پیش کیا۔ عَرَضْتُ الشَّيْءَ عَلَى  
فُلَانٍ أَوْ لِفُلَانٍ میں نے فلاں کے سامنے وہ چیز پیش  
کی۔ چنانچہ فرمایا۔

﴿ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلَائِكَةِ﴾ (۲-۳۱) پھر ان  
کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا۔

﴿وَعَرَضُوا عَلَى رَبِّكَ صَفًّا﴾ (۱۸-۲۸) اور  
سب تمھارے پروردگار کے سامنے صف باندھ کر لائے  
جائیں گے۔

﴿إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ﴾ (۳۳-۷۲) ہم نے (بار)  
امانت کو پیش کیا۔

﴿وَعَرَضْنَا جَهَنَّمَ يَوْمَئِذٍ لِلْكَافِرِينَ عَرْضًا﴾  
(۱۸-۱۰۰) اور اس روز جہنم کافروں کے سامنے لائیں  
گئے۔

﴿وَيَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِينَ كَفَرُوا عَلَى النَّارِ﴾  
(۲۶-۲۰) اور جس روز کافر دوزخ کے سامنے پیش کیے  
جائیں گے۔

عَرَضْتُ الْجُنْدَ: لشکر کا جائزہ لیا۔

الْعَارِضُ: وہ چیز جو تمھارے سامنے آئے خاص طور پر  
بادل (جوائق پر پھیلا ہوا ہو) جیسے فرمایا۔

﴿هَذَا عَارِضٌ مُّمْطَرًا﴾ (۲۶-۲۳) یہ تو بادل ہے  
جو ہم پر برس کر رہے گا۔

نیز الْعَارِضُ کا لفظ عارضہ مرض پر بھی بولا جاتا ہے۔  
جیسے: بِهٖ عَارِضٌ مِّنَ الْمَرَضِ: اسے بیماری کا

عارضہ ہے۔ اور کبھی بمعنی رخسار آ جاتا ہے۔ جیسے أَخَذَ  
مِّنَ عَارِضِيْهِ: (اس نے اس کے رخسار پکڑ لیے) اور

کبھی بمعنی دانت، اسی سے ان دانتوں کو جو چوستے وقت ظاہر

وقت) اس کا عرش پانی پر تھا۔

میں متنبہ کیا ہے کہ عرش جب سے وجود میں آیا ہے پانی  
کے اوپر ہی رہا ہے۔ اور آیات۔

﴿ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيدِ﴾ (۸۵-۱۵) عرش کا مالک  
بڑی شان والا۔

﴿رَفِيعُ الدَّرَجَاتِ ذُو الْعَرْشِ﴾ (۴۰-۱۵) مالک  
درجات عالی اور صاحب عرش ہے۔ اور ان کے ہم معنی

دیگر آیات میں بعض نے کہا ہے کہ ان سے حق تعالیٰ کی  
سلطنت اور حکومت کی طرف اشارہ ہے ورنہ ان کے یہ معنی

نہیں ہے کہ عرش باری تعالیٰ کا ٹھکانا اور مسکن ہے۔

### (ع ر ض)

الْعَرَضُ: (کسی چیز کی چوڑائی) یہ الطَّوْلُ کی ضد  
ہے اصل میں اس کا استعمال اجسام کے متعلق ہوتا ہے اس

کے بعد غیر اجسام کے متعلق بھی بولا جاتا ہے۔ چنانچہ  
قرآن پاک میں ہے۔

﴿فَلْذُوعَاءٍ عَرِيضٍ﴾ (۴۱-۵۱) تو لمبی لمبی وعائیں  
کرنے لگتا ہے۔

اور عَرَضٌ خاص کر ایک جانب اور کنارہ کو کہتے ہیں  
عَرَضَ الشَّيْءُ: اس کی ایک جانب ظاہر ہوگئی۔

عَرَضْتُ النُّوْدَ عَلَى الْأَنَاءِ: برتن پر لکڑی کو چوڑی  
جانب سے رکھا۔

إِعْتَرَضَ الشَّيْءُ فِي حَلْقِهِ: وہ چیز اس کے حلق میں  
اٹک گئی۔ إِعْتَرَضَ الْفَرَسُ فِي مَشْيِهِ: گھوڑا اپنے

سر اور سینے کو ایک جانب مڑھا کر کے چلا۔ فِيْهِ عُرْضِيَّةٌ  
اس میں مندروری ہے۔

عَرَضْتُ الشَّيْءَ عَلَى الْبَيْعِ: میں نے اسے

سے ایک فریق منہ پھیر لیتا ہے۔

﴿ثُمَّ يَتَوَلَّى فَرِيقٌ مِّنْهُمْ وَهُمْ مُّعْرِضُونَ﴾ (۲۳-۳) تو ایک فریق ان میں سے کج ادائی کے ساتھ منہ پھیر لیتا ہے۔

﴿فَاَعْرِضُوا فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ﴾ (۱۶-۳۳) تو انہوں نے شکر گزاری سے منہ پھیر لیا۔ پس ہم نے ان پر..... چھوڑ دیا۔ اور آیت کریمہ۔

﴿وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمُوتُ وَالْأَرْضُ﴾ (۱۳۲-۳) اور بہشت..... جس کا عرض ارض و سماء کے برابر ہے۔ کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ یہاں عَرْض کا لفظ الطُول کی ضد ہے اور اس کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ عالم آخرت میں جنت کی چوڑائی اتنی ہوگی جتنی کہ اس عالم میں آسمانوں اور زمین کی چوڑائی ہے کیونکہ عالم آخرت کی صفت میں تو قرآن پاک نے کہا ہے۔

﴿يَوْمَ تُبَدَّلُ الْأَرْضُ غَيْرَ الْأَرْضِ وَالسَّمُوتُ﴾ (۱۴-۳۸) جس دن یہ زمین دوسری زمین سے بدل دی جائے گی اور آسمان۔

اور یہ عین ممکن ہے کہ عالم آخرت کے ارض و سماء اس دنیا کے ارض و سماء سے وسیع اور کشادہ ہوں چنانچہ مروی ہے۔

(۳۸) ((إِنَّ يَهُودِيًّا سَأَلَ عَمَرَ عَنْ هَذِهِ الْآيَةِ فَقَالَ فَآيِنَ النَّارِ؟ فَقَالَ عَمَرُ: إِذَا جَاءَ اللَّيْلُ فَآيِنَ النَّهَارِ)) کہ ایک یہودی نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے

اس آیت کے متعلق سوال کیا اور کہا (کہ اگر جنت ہی اتنی وسیع ہوگی) تو دوزخ کس جگہ پر ہوگی؟ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواباً پوچھا ”جب رات آجاتی ہے تو دن کہاں ہوتا ہے۔“ اور بعض نے کہا ہے: عرض سے مراد وسعت

ہوتے ہیں اَلْعَوَارِضُ کہا جاتا ہے۔ اور کنایہ کے طور پر عمدہ گو اور فصیح شخص کو فُلَانٌ شَدِيدُ الْعَارِضَةِ کہا جاتا ہے بَعِيرٌ عَرُوضٌ: اونٹ جو منہ میں دونوں طرف سے کانٹے چبا کر کھاتا ہو۔

اَلْعُرْضَةُ: جو کسی چیز کے سامنے آکر آڑ بن جائے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَلَا تَجْعَلُوا اللَّهَ عُرْضَةً لِأَيْمَانِكُمْ﴾ (۲۲۲-۲) اور خدا کے نام کو اپنی قسموں کے لیے آڑ نہ بناؤ۔ بَعِيرٌ عُرْضَةٌ لِلْسَفَرِ: وہ اونٹ جو سفر کے لیے تیار کیا گیا ہو۔ اَعْرَضَ لِي كَذَا كَيْسٍ: اس طرح سامنے آنا کہ اس کے پکڑنے پر قدرت ہو جائے۔ اَعْرَضَ عَنِّي: اس نے مجھ سے روگردانی کی، اعراض کیا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿ثُمَّ اَعْرَضَ عَنْهَا﴾ (۲۲-۳۲) تو وہ ان سے منہ پھیرے۔

﴿فَاَعْرَضَ عَنْهُمْ وَعَظَّهُمْ﴾ (۶۳-۳) تم ان سے اعراض برتو اور نصیحت کرتے رہو۔

﴿وَاعْرَضَ عَنِ الْجَاهِلِينَ﴾ (۷-۱۹۹) اور جاہلوں سے کنارہ کرلو۔

﴿وَمَنْ اَعْرَضَ عَن ذِكْرِي﴾ (۱۲۳-۲۰) اور جو میری نصیحت سے منہ پھیرے گا۔

﴿وَهُمْ عَنِ آيَتِهَا مُعْرِضُونَ﴾ (۳۲-۲۱) اس پر بھی وہ ہماری نشانیوں سے منہ پھیر رہے ہیں۔

اور کبھی قرآن کی بنا پر اس کے بعد عَنِ کو حذف کر دیتے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔

﴿إِذَا فَرِيقٌ مِّنْهُمْ مُّعْرِضُونَ﴾ (۲۳-۳۸) ان میں

الْآخِرَةَ ﴿٨-٦٤﴾ تم لوگ پیش افتادہ ساز و سامان کے طالب ہو اور خدا آخرت (کی بھلائی) چاہتا ہے۔  
﴿يَا خُذُواْ عَرَضَ هَٰذَا الْاٰذْنٰى﴾ ﴿٤-١٦٩﴾ اس دنیا کی مال و دولت لیتے ہیں۔

﴿وَ اِنْ يَّاتِيْهِمْ عَرَضٌ مِّثْلُہٗ﴾ ﴿٤-١٦٩﴾ اگر ان کے سامنے (بھی) ویسا ہی مال آجاتا..... اور آیت کریمہ۔  
﴿لَوْ كَانْ عَرَضًا قَرِيْنًا﴾ ﴿٩-٣٢﴾ کے معنی یہ ہیں اگر کوئی فائدہ آسانی سے حاصل ہونے کی توقع ہوتی۔  
التَّغْرِیْضُ: پہلو وار بات کرنا جو جھوٹ اور ظاہر و باطن دونوں معنی پر محمول ہو سکتی ہو۔ اور آیت۔

﴿وَلَا جُنَاحَ عَلَیْكُمْ فِیْمَا عَرَضْتُمْ بِہٖ مِنْ خُطْبَیۡہِ النَّسَآءِ﴾ ﴿٢-٢٣٥﴾ اگر تم کنایہ کی باتوں میں عورتوں کو نکاح کا پیغام بھیجو..... تو تم پر کچھ گناہ نہیں۔

میں بعض نے کہا ہے کہ نکاح کے پیغام میں تعریض کی صورت یہ ہے کہ عورت سے مثلاً کہا جائے تم بہت خوبصورت ہو پسندیدہ نظر ہو وغیرہ۔

### (ع ر ف)

الْمَعْرِفَةُ وَالْعِرْفَانُ کے معنی ہیں: کسی چیز کی علامات و آثار پر غور و فکر کر کے اس کا ادراک کر لینا۔ یہ علم سے انحصار یعنی کم درجہ رکھتا ہے اور یہ الّا نکار کے مقابلہ میں بولا جاتا ہے یہی وجہ ہے فُلَانٌ یَعْرِفُ اللّٰہَ تو کہا جاتا ہے مگر تعدیہ بیک مفعول کی صورت میں فُلَانٌ یَعْلَمُ اللّٰہَ استعمال نہیں ہوتا کیونکہ انسان ذات الہی کا علم حاصل

ہے اور یہ وسعت پیمائش کے اعتبار سے مراد نہیں ہے بلکہ مسرت اور خوشی کے اعتبار سے ہے جس طرح کہ اس کے برعکس دنیا کے متعلق کہا جاتا ہے۔ اَلْدُّنْیَا عَلٰی فُلَانٍ حَلَقَةٌ خَاتِمٌ وَ کَفَّةٌ حَابِلٌ (کہ فلاں پر تو دنیا انکسرتی کے حلقہ اور شکاری کے پھندے کی طرح تنگ ہو گئی ہے اسی طرح ایک اور محاورہ ہے۔

سَعَةُ هٰذِهِ الدَّارِ كَسَعَةِ الْاَرْضِ: (کہ اس گھر کی وسعت روئے زمین کی وسعت کے برابر ہے) بعض نے کہا ہے کہ یہاں عَرَضٌ کا لفظ اَلْعَرَضُ لِلْبَیْعِ کے محاورہ سے ماخوذ ہے چنانچہ جب کوئی چیز کسی قسم کے سامان کے عوض بیچ دی جاتی ہے تو کہا جاتا ہے: بَیْعٌ کَذَا (کہ یہ چیز اتنے) سامان کے عوض فروخت کی گئی۔ لہذا آیت میں بھی عَرَضُہَا کے معنی عوض اور بدلہ کے ہیں جیسے محاورہ ہے۔ عَرَضُ هٰذَا الشُّوبِ کَذَا وَ کَذَا (کہ اس کپڑے کی قیمت اتنی اور اتنی ہے)۔

اَلْعَرَضُ: ہر وہ چیز جسے ثبات نہ ہو۔ اسی اعتبار سے علمائے کلام کی اصطلاح میں اَلْعَرَضُ کا لفظ اس چیز پر بولا جاتا ہے جو جوہر کے بغیر قائم نہ رہ سکے۔ جیسے رنگ ذائقہ وغیرہ اور دنیا کی بے ثباتی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا گیا ہے۔

اَلْدُّنْیَا عَرَضٌ حَاضِرٌ (کہ دنیا تو پیش افتادہ ساز و سامان کا نام ہے) قرآن پاک میں ہے۔  
﴿تَرِیْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْیَا وَاللّٰہُ یُرِیْدُ

① رواہ ابن جریر ثلاثہ طرف وفیہ ان ناس من الیہود وفی مسند احمد وروی مرفوعاً وایضاً فی ابن جریر وایضاً احباب بہ ابن عباس وفی

مسند البزار مرفوعاً عن ابن جریر (ابن جریر)

② قال ابو عیسیٰ یقال جمع متاع الدنیا عرض بفتح الراء واما العرض بسکون الراء فهو ماسوی الدنانیر والدرہم راجع الحمل لابن

فارس (ماخوذ من فتح القدر للشوکانی ٥٠١/١)

اور ایک گروہ (یعنی صوفیہ کرام) کی اصطلاح میں عَارِف کا لفظ خاص کر اس شخص پر بولا جاتا ہے جسے عالم ملکوت اور ذات الہی اور اس کے ساتھ حسن معاملہ کے متعلق خصوصی معرفت حاصل ہو۔ عَرَفَهُ كَذَا: فلاں نے اسے اس چیز کا تعارف کروا دیا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿فَعَرَفَ بَعْضُهُ وَأَعْرَضَ عَنْ بَعْضٍ﴾ (۲۶-۳)

تو پیغمبر ﷺ نے کچھ بات تو بتادی اور کچھ نہ بتائی۔

تَعَارَفُوا: انہوں نے باہم ایک دوسرے کو پہچان لیا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿لَتَعَارَفُنَّ﴾ (۱۳-۸۹) تاکہ ایک دوسرے کو شناخت کرو۔

﴿يَتَعَارَفُونَ بَيْنَهُمْ﴾ (۱۰-۲۵) آپس میں ایک دوسرے کو پہچان بھی لیں گے۔

عَرَفَهُ کسی چیز کو خوشبودار کر دیا، معطر بنا دیا۔ چنانچہ جنت کے بارے میں ﴿عَرَفَهَا لَهُمْ﴾ (۶-۲۷) فرمایا ہے جس کے معنی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے جنت کو خوشبو سے بسا دیا ہے اور ان کے لیے آراستہ کر رکھا ہے اور بعض نے اس کے معنی تو صیف کرنا، شوق دلانا اور اس کی طرف رہنمائی کرنا بھی بیان کیے ہیں۔ اور آیت کریمہ۔

﴿فَإِذَا آفَضْتُمْ مِنْ عَرَفَاتٍ﴾ (۲-۱۹۸) جب تم میدان عرفات سے واپس ہونے لگو۔

میں ”عرفات“ سے میدان عرفات مراد ہے۔ بعض نے اس کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی ہے کہ اس میدان میں آدم علیہ السلام اور حوا کا باہم (دنیا میں پہلی دفعہ) تعارف ہوا تھا اس لیے عرفات کہا جاتا ہے اور بعض کا قول ہے کہ اس میدان میں دعا اور عبادت کے ذریعہ لوگ اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل

نہیں کر سکتا البتہ کائنات اور آثار قدرت پر غور و فکر کر کے اس کی صفات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے اسی طرح اللہ يَعْرِفُ كَذَا نہیں کہتے کیونکہ مَعْرِفَةُ کا درجہ علم سے کم تر ہوتا ہے اور لفظ معرفت اس ادراک پر بولا جاتا ہے جو غور و فکر کے بعد حاصل ہوتا ہے جس سے ذات باری تعالیٰ بلند و برتر ہے۔ دراصل معرفت کا لفظ عَرَفْتُ كَذَا سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں: میں نے اس کی بوپالی اور یا أَصَبْتُ عَرَفَةً: (میں نے اس کے رخسار پر مارا) سے یہ لفظ پہچاننے کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿فَلَمَّا جَاءَهُمْ مَاعَرَفُوا كَفَرُوا بِهِ﴾ (۲-۸۹)

پھر جس چیز کو وہ خوب پہچانتے تھے جب ان کے پاس آپہنچی تو اس سے کافر ہو گئے۔

﴿فَعَرَفَهُمْ وَهُمْ لَهُ مُنْكَرُونَ﴾ (۱۲-۵۸) تو یوسف علیہ السلام نے ان کو پہچان لیا اور وہ ان کو نہ پہچان سکے۔

﴿فَلَعَرَفْتَهُمْ بِسِيمِهِمْ﴾ (۲۷-۳۰) اور تم ان کے چہروں سے ہی پہچان لیتے۔

﴿يَعْرِفُونَهُ كَمَا يَعْرِفُونَ أَبْنَاءَهُمْ﴾ (۲-۱۳۷)

اس طرح پہچانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کو پہچانا کرتے ہیں۔

مَعْرِفَةُ کے مقابلہ میں اِنْكَارٌ اور عِلْمٌ کے مقابلہ میں لفظ جَهَالَةٌ استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔

﴿يَعْرِفُونَ نِعْمَةَ اللَّهِ ثُمَّ يُنْكِرُونَهَا﴾ (۱۶-۸۳)

یہ خدا کی نعمتوں سے واقف ہیں مگر (واقف ہو کر) ان سے انکار کرتے ہیں۔

بِمَعْرُوفٍ ﴿۱﴾ تو یا تو ان کو اچھی طرح سے زوجیت میں رہنے دو یا اچھی طرح سے علیحدہ کر دو۔

﴿قَوْلٌ مَّعْرُوفٌ وَمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ﴾ (۲-۱۳-۲) نرم بات اور درگزر کرنا صدقہ سے بہتر ہے۔

یعنی نرم جواب دے کر لوٹا دینا اور فقیر کے لیے دعا کرنا اس صدقہ سے بہتر ہے جس پر احسان جتلیا جائے۔

الْعُرْفُ: وہ نیک بات جس کی اچھائی کو سب تسلیم کرتے ہوں۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ﴾ (۷-۱۹۹) اور نیک کام کرنے کا حکم دو۔

عُرْفُ الْفَرَسِ: گھوڑے کی ایال۔ عُرْفُ الدَّيْلِكِ: مرغ کی کلفی جہاں القطا عُرْفًا: قطا جانور آگے پیچھے یکے بعد دیگرے آئے اسی سے قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَالْمُرْسَلَاتِ عُرْفًا﴾ (۷-۱) ہواؤں کی قسم جو متواتر چلتی ہیں۔

الْعَرَّافُ: یہ گاہن کے ہم معنی ہے مگر عَرَّافُ اس شخص کو کہتے ہیں جو مستقبل میں وقوع پذیر ہونے والی باتوں کی خبر دے اور گاہن اُسے کہتے ہیں جو گذشتہ واقعات کے متعلق اطلاع دے اَلْعَرِيفُ اُسے کہتے ہیں جو لوگوں کو جانتا پہچانتا اور ان کا تعارف کراتا ہو۔ شاعر نے کہا ہے۔ (الکامل)

(۳۰۸) بَعَثُوا إِلَىٰ عَرِيفِهِمْ يَتَوَسَّمُ وہ میرے پاس اپنا عَرِيف بھیجیں گے جو پہچان کر لے گا۔

کرتے ہیں اس لیے اسے عرفات کہا جاتا ہے۔

الْمَعْرُوفُ: ہر اس قول یا فعل کا نام ہے جس کی خوبی عقل یا شریعت سے ثابت ہو اور مُنْكَرُ ہر اس بات کو کہا جائے گا جو عقل و شریعت کی رو سے بری سمجھی جائے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ (۱۱۴-۳) اچھے کام کرنے کو کہتے اور بری باتوں سے منع کرتے۔

﴿وَقُلْنَا قَوْلًا مَّعْرُوفًا﴾ (۳۳-۳۲) اور دستور کے مطابق ان سے بات کیا کرو۔

یہی وجہ ہے کہ جُودٌ (سخاوت) میں اعتدال اختیار کرنے کو بھی مَعْرُوفُ کہا جاتا ہے کیونکہ اعتدال عقل و شریعت کے اعتبار سے قابل ستائش ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَمَنْ كَانَ فَقِيرًا فَلْيَأْكُلْ بِالْمَعْرُوفِ﴾ (۴-۶) اور جو بے مقدور ہو وہ مناسب طور پر یعنی بقدر خدمت کچھ لے لے۔

﴿إِلَّا مَنْ أَمَرَ بِصَدَقَةٍ أَوْ مَعْرُوفٍ﴾ (۴-۱۱۴) ہاں (اس شخص کی مشاورت اچھی ہو سکتی ہے) جو خیرات یا نیک بات..... کہے۔

﴿وَلِلْمُطَلَّقَاتِ مَتَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ﴾ (۲-۲۴۱) اور مطلقہ کو بھی دستور کے مطابق نان و نفقہ دینا چاہیے۔

یعنی اعتدال اور احسان کے ساتھ نیز فرمایا۔ ﴿فَأَمْسِكُوهُمْ بِمَعْرُوفٍ أَوْ فَارِقُوهُمْ﴾

① اولہ : او کلما وردت عکاظ قبیلہ ..... والیت فی اللسان والمحکم والتاج (عرف) ونسبہ الی طریف بن مالک العبیری وقیل طریف بن عمرو کما فی الاقتضاب ۴۶۳ والاشباہ (۴: ۱۰۱) والبحر (۵/ ۴۶۳) والکتاب (۲/ ۲۱۵) والشمسری وعزہ لطریف بن تمیم العبیری



جس کا اثر انسان کے عمل پر ظاہر ہو، کہا جاتا ہے: عَرِمَ  
فُلَانٌ فُلَانٌ خَت مزاج ہو گیا چنانچہ ایسے شخص کو عَارِمٌ  
کہا جاتا ہے۔

اسی سے عَرَامُ الْجَنِّسِ ہے جس کے معنی لشکر کی تندی و  
تیزی اور کثرت کے ہیں اور آیت کریمہ۔

﴿فَارْسَلْنَا عَلَيْهِمْ سَيْلَ الْعَرِمِ﴾ (۱۶-۳۳) کے  
بعض نے یہ معنی کیے ہیں کہ ہم نے ان پر سخت سیلاب بھیجا  
اور بعض نے اَلْعَرِمِ کے معنی بند کیے ہیں اور بعض نے  
اَلْعَرِمِ سے جنگلی چوہا مراد لیا ہے اور اس سیلاب کو اس کی  
طرف اس لیے منسوب کیا ہے کہ چوہوں نے اس بند میں  
نقاب ڈالے تھے اور وہ بند ٹوٹ گیا تھا۔

### (۴ روری)

عَرِيٍّ مِنْ ثَوْبِهِ يَعْرِي: ننگا ہونا چنانچہ، برہنہ اور ننگے  
شخص کو عَارٍ و عَرِيَانٌ کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں  
ہے۔

﴿إِنَّ لَكَ لَأَلَّتَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرِى﴾ (۱۱۸-۲۰)  
یہاں تم نہ بھوکے رہو گے اور نہ ننگے۔

هُوَ عَرُوٌّ مِنَ الذَّنْبِ: وہ گناہ سے عاری ہے۔ أَخَذَهُ  
عُرْوَاءُ: بربنگی کی وجہ سے اس پر پکپی طاری ہو گئی۔ اور  
انسان کے ان اعضاء کو جو عام طور پر ننگے رہتے ہیں۔ جیسے  
چہرہ ہاتھ اور پاؤں کو اَلْمَعَارِي کہا جاتا ہے۔ چنانچہ  
مخاورہ ہے۔ فُلَانٌ حَسَنُ الْمَعْرِى: فلاں کے ننگے

اور عَرِفٌ فُلَانٌ عَرَاْفَةٌ کے معنی عریف بننے کے ہیں  
اس لیے عَرِيْفٌ مشہور سردار کو کہا جاتا ہے۔ شاعر نے کہا  
ہے۔ (البیض)

(۳۰۹) بَلْ كُلُّ قَوْمٍ وَانْ عَزُّوا وَانْ كَثُرُوا  
عَرِيْفُهُمْ بِأَنَّا فِي الشَّرِّ مَرْجُوْمٌ  
ہر قوم خواہ کتنی ہی باعزت اور تعداد میں زیادہ کیوں نہ ہو مگر  
ان کے سردار بھی شرور زمانہ سے محفوظ نہیں رہ سکتے۔  
يَوْمُ عَرَفَةَ: جس روز حجاج میدان عرفہ میں وقوف کرتے  
ہیں۔ اور آیت کریمہ۔

﴿وَعَلَى الْأَعْرَافِ رِجَالٌ﴾ (۴-۳۶) اور  
اعراف پر کچھ آدمی ہوں گے۔

میں اَلْأَعْرَافُ: سے وہ دیوار مراد ہے جو جنت اور  
دوزخ کے درمیان حائل ہے۔

الْأَعْرَافُ (افتعال) کے معنی اقرار کے ہیں اصل میں  
اس کے معنی گناہ کا اعتراف کرنے کے ہیں۔ اس کی ضد  
جُحُوْدٌ یعنی انکار کرنا ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿فَاعْتَرَفُوا بِذَنبِهِمْ﴾ (۱۱-۶۷) پس وہ اپنے گناہ کا  
اقرار کریں گے۔

﴿فَاعْتَرَفْنَا بِذُنُوبِنَا﴾ (۱۱-۴۰) ہم کو اپنے گناہوں کا  
اقرار ہے۔

### (۴ رم)

اَلْعَرَامَةُ کے معنی مزاج کی تندی اور درشتی کے ہیں۔

① قاله علقمه بن عبدة الفحل وفي اللسان (عرف) كل حي يدل كل قوم وان كرموا يدل ان كثروا والبيت من كلمة مفضلية  
(۱۹۷:۲) وفي منتهى الطلب (۲۷/۱) والشعراء (۴۹۸-۵۰۲) ومختار الشعراء الجاهلي (۳۲۷:۱) وديوانه ۱۲۹ والصناعتين  
۳۰۰ والحيوان (۱۴۹:۷) والمحاضرات للمؤلف (۴۹/۴) وفي رواية وكل قوم يدل كل قوم وكرموا يدل كثروا ذكره العسكري  
في امثله روى الاستعارة

کے باغ میں دوسرے کی ملکیت ہو اور اس کے آنے جانے سے باغ کے مالک کو تکلیف ہوتی ہو تو شریعت نے خشک کھجوروں کے عوض اس کا پھل خریدنے کی اجازت دی ہے۔ اس کی جمع عَرَايَا ہے اور آنحضرت ﷺ نے بیع عَرَايَا کی رخصت دی ہے۔ ۵ (۳۹)

### (عَزَّة)

الْعَزَّةُ: اس حالت کو کہتے ہیں جو انسان کو مغلوب ہونے سے محفوظ رکھے۔ یہ اَرْضُ عَزَازُ سے ماخوذ ہے جس کے معنی سخت زمین کے ہیں۔ نَعَزَزَ اللَّحْمُ: گوشت سخت ہو گیا اور گتہ گیا گویا وہ سخت زمین میں پڑا ہے جس تک رسائی مشکل ہے۔ جیسا کہ تَطَلَّفَ کے معنی ظَلِيفٌ یعنی سخت زمین میں چلے جانا کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔ ﴿آيَتُغُونَ عَنْهُمْ الْعِزَّةَ فَإِنَّ الْعِزَّةَ لِلَّهِ جَمِيعًا﴾ (۳۰-۳) کیا یہ ان کے ہاں عزت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ عزت تو سب خدا ہی کی ہے۔

﴿وَلِلَّهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُولِهِ وَلِلْمُؤْمِنِينَ﴾ (۶۳-۸) حالانکہ عزت خدا کی ہے اور اس کے رسول ﷺ کی اور مومنوں کی۔

﴿سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ.....﴾ (۱۳۵) تمہارا پروردگار جو صاحب عزت ہے اس سے پاک ہے۔

الْعِزَّةُ: کبھی باعث مدح ہوتی ہے جیسا کہ مذکورہ بالا آیات سے ظاہر ہوتا ہے اور کبھی باعث مذمت جیسا کہ کفار کے متعلق فرمایا۔

﴿بَلِ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي عِزَّةٍ وَشِقَاقٍ﴾ (۲۳۸)

اعضاء خوبصورت ہیں۔ جیسا کہ حَسَنُ الْمَحْسَرِ وَالْمُجَرَّدُ: کا محاورہ ہے الْعَرَاءُ: کھلی جگہ، جہاں کوئی چیز آڑ کے لیے نہ ہو جیسے فرمایا۔

﴿فَتَبَدَّلْنَا بِالْعَرَاءِ وَهُوَ سَقِيمٌ﴾ (۳۷-۱۳۵) پھر ہم نے اسے جبکہ وہ بیمار تھے کھیلنے میدان میں ڈال دیا۔

الْعَرَى: (اسم مقصور) کنارہ اور جانب کو کہتے ہیں اور عَرَاهُ وَاعْتَرَاهُ: اس کے سامنے آیا، اس کی جانب قصد کیا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿إِلَّا اعْتَرَكَ بَعْضُ إِلَهَيْتَابِسُوءٍ﴾ (۵۳-۱۱) کہ ہمارے معبودوں میں سے کسی نے تجھ پر مصیبت ڈال دی ہے۔

الْعُرْوَةُ: ہر وہ چیز جسے پکڑ کر کوئی لٹک جائے اور آیت کریمہ۔

﴿فَقَدْ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَى﴾ (۲-۲۵۶) تو اس نے مضبوط حلقہ ہاتھ میں پکڑا۔

میں (ایمان باللہ کو) بطور تمثیل کے ”مضبوط حلقہ“ سے تعبیر فرمایا ہے۔ نیز عُرْوَةٌ يَا عُلْفَهَ ایک قسم (کی) خاردار جھاڑی یا پیلو کی قسم کے درخت کو بھی کہتے ہیں جو اونٹوں کے لیے آخری سہارا ہوتا ہے۔ الْعَرِي وَالْعَرِيَّةُ: سرد ہوا جو انسان کو لگ جاتی ہے۔ نیز الْعَرِيَّةُ کھجور کا وہ درخت جو بیج سے مستثنیٰ کیا گیا ہو۔ بعض کہتے ہیں کہ

عَرِيَّةُ کھجور کے اس درخت کو کہتے ہیں جس کا پھل اس کے مالک نے کسی محتاج کو ہبہ کر دیا ہو، شرعاً اس درخت کے پھل کو خشک کھجوروں کے عوض بیچنا جائز ہے بعض کہتے ہیں کہ عَرِيَّةُ کھجور کے اس درخت کو کہتے ہیں جو کسی آدمی

① والحديث اختلاف الفاظه أيضاً في الموطأ (۱۲۵/۲) والرسالة للشافعي رقم (۹۰۹) وتحتة التخریج لآحمد شاکر مصری واختلاف الحديث ۲۱۹ واصحاب الكتب الستة راجع ذخائر الموارث رقم (۱۹۶۱)

اے عزیز! ہمیں اور ہمارے اہل و عیال کو بڑی تکلیف ہو رہی ہے۔

عَزَّوَجَلَّ: (افعال) کے معنی کسی کو عزت بخشنے کے ہیں۔

قرآن پاک میں ہے۔

﴿تُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ﴾ (۳-۲۶)

جس کو چاہے عزت دے اور جسے چاہے ذلیل کر دے۔

عَزَّ عَلٰی كَذَا مجھ پر یہ بات نہایت ہی گراں گزری۔

قرآن پاک میں ہے۔

﴿عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ﴾ (۹-۱۲۸) تمہاری تکلیف ان پر گراں گزرتی ہے۔

اور عَزَّوَجَلَّ: کے معنی ہیں: فلاں اس پر غالب آگیا

چنانچہ مشہور ہے۔ مَن عَزَّيْزٌ: (جس کی لاشیٰ اسی کی

بھینس) قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَعَزَّيْنِي فِي الْخُطَابِ﴾ (۳۸-۲۳) اور گفتگو

میں مجھ پر غالب آگیا ہے۔

بعض نے اس کے معنی یہ کیے ہیں کہ وہ گفتگو اور جھگڑا

مگر جو کافر ہیں وہ غرور اور مخالفت میں ہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ جو عزت اللہ، رسول اور مسلمانوں کو

حاصل ہے وہ دائماً باقی رہنے والی ہے اور یہی عزت حقیقی

ہے مگر کفار کو عزت حقیقی حاصل نہیں ہے بلکہ وہ جھکے

اپنے آپ کو قوی اور غالب ظاہر کر رہے ہیں جیسا کہ

آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔ (۴۰) جو عزت اللہ تعالیٰ

سے حاصل نہ ہو وہ سراسر ذلت ہے۔ اسی معنی میں فرمایا:

﴿وَاتَّخَذُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ إِلَهَةً لِيَكُونُوا لَهُمْ عِزًّا﴾ (۱۹-۸۱) یعنی اللہ کے سوا انھوں نے معبود بنا

رکھے ہیں کہ ان کے ذریعہ عذاب سے محفوظ رہ سکیں اور

آیت کریمہ۔

﴿مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْعِزَّةَ فَلِلَّهِ الْعِزَّةُ جَمِيعًا﴾

(۳۵-۱۰) کے معنی یہ ہیں کہ جو شخص معزز بننا چاہتا ہے

اسے چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں سے عزت حاصل کرے

کیونکہ ہر قسم کی عزت خدا ہی کے قبضہ قدرت میں ہے

کبھی عزت کا لفظ حمیت اور غلط خودداری کے معنوں میں

بھی استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ آیت کریمہ۔

﴿أَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْإِثْمِ﴾ (۲-۲۰۶) تو غرور اس کو

گناہ میں پھنسا دیتا ہے۔ میں عزت کے معنی حمیت کے

ہیں۔

الْعَزِيزُ: وہ ہے جو غالب ہو اور مغلوب نہ ہو۔ قرآن

پاک میں ہے۔

﴿إِنَّهُ هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ﴾ (۲۹-۲۶) بے شک وہ

غالب حکمت والا ہے۔

﴿يَا أَيُّهَا الْعَزِيزُ مَسَّنَا وَأَهْلَنَّا الضُّرَّ﴾ (۱۲-۸۸)

دور نکل گئے ہوں۔

کتاب ہے۔

ایک حدیث میں ہے۔ ﴿(۴۱) (مَنْ قَرَأَ الْقُرْآنَ فِي أَرْبَعِينَ يَوْمًا فَقَدْ عَزَبَ))﴾ کہ جس نے چالیس دن میں قرآن پاک ختم کیا اس نے بہت دیر کی۔

کے معنی یہ ہیں کہ اس جیسی کتاب کا کہیں سے حاصل کرنا اور پایا جانا نہایت دشوار ہے۔

الْعَزْبُ: ایک بت کا نام ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿أَفَرَأَيْتُمُ اللَّتَّ الْعَزْبِيَّ﴾ (۱۹-۵۳) بھلا تم لوگوں نے لات اور عزی کو دیکھا۔

وَاسْتَعِزَّ بِفُلَانٍ: فلاں مرض یا موت سے مغلوب ہو گیا۔

### (ع ز)

التَّعْزِيرُ: اس مدد کو کہتے ہیں جو جذبہ تعظیم کے ساتھ ہو قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَتُعْزِرُوهُ﴾ (۹-۳۸) اور اس کی مدد کرو۔

﴿وَعَزَّرْتُمُوهُمْ﴾ (۱۲-۵) اور ان کی مدد کرو گے۔

التَّعْزِيرُ: (ایضاً) کسی کو حد شرعی سے کم سزا دینا یہ بھی دراصل پہلے معنی کے ساتھ تعلق رکھتا ہے کیونکہ تادیبی سزا بھی درحقیقت اس شخص کی اصلاح کے لیے ایک قسم کی مدد ہوتی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ پہلے معنی کا تعلق کسی مضر چیز کو روکنے سے ہوتا ہے اور تادیب میں کسی شخص کو مضر چیز سے روکا جاتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ کسی کو مضر چیز سے روک دینا بھی اس کی مدد میں شامل ہے۔

اسی بنا پر آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔ ﴿(۱۳۳)

﴿أَنْصُرَ أَخَاكَ ظَالِمًا أَوْ مَظْلُومًا﴾)) اپنے بھائی کی مدد کرو، وہ ظالم ہو یا مظلوم۔ یہ سن کر ایک شخص نے عرض کی اے اللہ کے رسول ﷺ! مظلوم کی مدد کرنا تو سمجھ میں آتا ہے مگر اس کے ظالم ہونے کی صورت میں اس کی مدد

### (ع ز ب)

الْعَارِبُ: وہ آدمی جو گھاس کی تلاش میں اپنے اہل و عیال سے دور نکل جائے۔ عَزَبَ يَعْزُبُ وَيَعْزُبُ (ض ن) دور نکل جانا، پوشیدہ ہو جانا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ﴾ (۱۰-۶۱) اور تمہارے پروردگار سے ذرہ برابر بھی کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے۔

﴿لَا يَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ﴾ (۳-۳۳) ذرہ بھر چیز بھی اس سے پوشیدہ نہیں۔

رَجُلٌ عَزَبٌ: کنوارا، بے زن مرد۔

عَزَبَ عَنْهُ حِلْمُهُ: اس کی عقل جاتی رہی۔

عَزَبَ طُهْرُهَا: اس کا خاوند غائب ہو گیا۔

قَوْمٌ مُعْزَبُونَ: وہ لوگ جن کے اونٹ چرنے کے لیے

① قال فی الفائق (۲: ۷۳) ومعناه فقد ابعد العهد بوله وابطاني تلاوته والحديث فی الترمذی عن ابن عمر وواہن عمرو لفظه ((اقرأ القرآن فی اربعین)) انظر كنز العمال ج (۱) رقم ۲۷۷۴ و ۲۸۱۸

② ذهب ابوا لطیب فی اضدادہ (۵۰۹) انه من الاضداد ویاتی بمعنى التعظیم والتعذیب عن الفراء انه یأتی بمعنى التعليم ومنه قول سعد بن ابی وقاص ثم هؤلاء اهل الکوفة یعزروننی اللسان (عز) والنهاية ۱۰۴/۳

③ متفق علیه من حدیث انس و ذکره ابن حبان فی زوالده ۸۴۷ من حدیث ابن عمرو والدارمی و ابن عساکر عن جابر والمستدرک الترمذی عن انس (راجع الفتح الکبیر للبیہانی (۲۸۱-۲۸۱/۱)

(۱۹-۳۸) اور میں تم سے اور جن کو تم خدا کے سوا پکارتے ہو کنارہ کرتا ہوں۔

کرنے کے کیا معنی ہیں آنحضرت ﷺ نے فرمایا اسے ظلم سے روک کر۔ آیت کریمہ۔

﴿فَاعْتَزِّلُوا النِّسَاءَ﴾ (۲۰-۲۲۲) سو..... عورتوں سے کنارہ کش رہو۔ شاعر نے کہا۔ ﴿(اکاٹل)﴾ (۳۱۰) يَابَيْتَ عَاتِكَةَ آلِي أَنْعَزَلُ أَيْ بَيْتِ عَاتِكِهِ جِسْمِ مِثْلِ كُنَّارِهِ كُشِّ رَهْنًا هَوْنًا۔ اور آیت کریمہ۔

﴿وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ابْنُ اللَّهِ﴾ (۹-۳) اور یہود کہتے ہیں کہ عزیر علیہ السلام اللہ کے بیٹے ہیں۔ میں عزیر علیہ السلام ایک پیغمبر کا نام ہے۔

## (عزل)

الْأَعْزَلُ کے معنی ہیں کسی چیز سے کنارہ کش ہو جانا عام اس سے کہ وہ چیز کوئی پیشہ ہو یا کوئی بات وغیرہ ہو جس سے بری الذمہ ہونے کا اعلان کیا جائے نیز وہ علیحدگی بذریعہ بدن کے ہو یا بذریعہ دل کے دونوں قسم کی علیحدگی پر بولا جاتا ہے۔ عَزَلْتُهُ وَاعْتَزَلْتُهُ وَتَعَزَّيْتُ فِيهِ اس کو علیحدہ کیا فَاعْتَزَلْ چنانچہ وہ علیحدہ ہو گیا۔ قرآن میں ہے۔

﴿وَإِذَا عَزَلْتَ تَتْمُوهُمْ وَمَا يَعْبُدُونَ إِلَّا اللَّهُ﴾ (۱۸-۱۶) اور جب تم نے ان مشرکوں سے اور جن کی یہ اللہ کے سوا عبادت کرتے ہیں ان سے کنارہ کر لیا۔ ﴿فَإِنْ عَزَلْتُمْ فَلَمْ يَقَاتِلُوكُمْ﴾ (۴-۹۰) پھر اگر وہ تم سے جنگ کرنے سے کنارہ کشی کریں اور لڑیں نہیں۔

کے معنی یہ ہیں کہ گو اس سے پہلے شیاطین آسمان سے باتیں سن لیا کرتے تھے مگر اب انہیں سننے سے روک دیا گیا ہے۔

﴿وَأَعْتَزِلُكُمْ وَمَا تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ﴾ (۱۸-۱۶) اور جب تم نے ان مشرکوں سے اور جن کی یہ اللہ کے سوا عبادت کرتے ہیں ان سے کنارہ کر لیا۔ ﴿فَإِنْ عَزَلْتُمْ فَلَمْ يَقَاتِلُوكُمْ﴾ (۴-۹۰) پھر اگر وہ تم سے جنگ کرنے سے کنارہ کشی کریں اور لڑیں نہیں۔

الْأَعْزَلُ (۱) غیر مسلح (۲) چوپایہ جس کی دم ایک جانب جھکی ہوئی ہو (۳) بادل بغیر بارش کے۔

﴿وَأَعْتَزِلُكُمْ وَمَا تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ﴾ (۱۸-۱۶) اور جب تم نے ان مشرکوں سے اور جن کی یہ اللہ کے سوا عبادت کرتے ہیں ان سے کنارہ کر لیا۔ ﴿فَإِنْ عَزَلْتُمْ فَلَمْ يَقَاتِلُوكُمْ﴾ (۴-۹۰) پھر اگر وہ تم سے جنگ کرنے سے کنارہ کشی کریں اور لڑیں نہیں۔

① قاله الاحوص بن محمد بن عاصم بن ابي الفلح حمى الدبر الانصارى فى قصيده له يمدح فيها عمر بن عبدالعزيز وتماه حذر العدى وبه الفواد موكل وفى المطبوع بنت علكمه محرفو فى اللسان والمحكم وعزل اعزل بدل اعزل والروايتين لهما محمل والبيت فى الاغانى (۱۸/۱۹۶) اللالى مع السمط ۲۵۹ والخزان (۱/۲۴۸) والثمار ۲۵۳ والوفيات (۱/۱۸۵) وكنيات الجرجاني ۸۳ والشتيمى (۱/۱۹۰) والعقد الفريد (۴/۳۶۳) والعيون (۱/۵۱) والمرزوقى (۳۵۹) واختلف فى عاتكة هذا اشيع الكلام عليه الاستاذ الميمنى فى السمط واجاد القصه فى المعارف ۱۷۸ وتعلق بالبيت قصة المعدل مع المنصور راجع المعاهد والبيت تمثل به ابن المقفع وقد مر بيت نزار للمجوس فحرق مقتله راجع الامالى للمرئضى (۱/۱۳۵) ومحاضرات الادباء (۳/۷۲) والخزانة (۱/۲۴۸: ۴۵۹) والحصرى (۱/۲۴۶) وانشده ايضا يحيى بن خالد كمالى الثمار (۲۵۳) وابو العلاء وماليه (۱۵۴-۱۵۵)

### (عزم)

الْعَزْمُ وَالْعَزِيمَةُ: کسی کام کو قطعی اور حتمی طور پر کرنے کا ارادہ کرنا۔ عَزَمْتُ الْأَمْرَ وَعَزَمْتُ عَلَيْهِ وَاعْتَزَمْتُ: میں نے اس کام کو قطعی طور پر کرنے کا ارادہ کر لیا۔ قرآن پاک میں ہے۔

فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ (۳-۱۵۹) جب کسی کام کا عزم مصمم کر لو تو خدا پر بھروسہ رکھو۔

﴿وَلَا تَعْزِمُوا عُقْدَةَ النِّكَاحِ﴾ (۲-۲۳۵) اور ..... نکاح کا پختہ ارادہ نہ کرنا۔

﴿وَإِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ﴾ (۲-۲۲۷) اور اگر طلاق کا

ارادہ کر لیں۔ www.KitaboSunnat.com

﴿إِنَّ ذَلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ﴾ (۳۱-۱۷) بیشک

یہ بڑی ہمت کے کام ہیں۔

﴿وَلَمْ نَجِدْ لَهُ عَزْمًا﴾ (۲۰-۱۱۵) اور ہم نے ان

میں صبر و ثبات نہ پایا۔

یعنی جس بات کا انہیں حکم دیا گیا تھا اس کی حفاظت کرنے

اور اسے بجالانے میں ثابت قدم نہ پایا۔

الْعَزِيمَةُ: ایک قسم کا گندہ اور تعویذ جس میں اس خیال

سے گریں لگائی جاتی تھیں کہ گویا شیطان کو ایذا رسانی سے

روک دیا گیا ہے۔ عَزِيمَةُ کی جمع عَزَائِمُ آتی ہے۔

### (عزم)

الْعَزَّةُ: گروہ جماعت۔ اس کی جمع حالت رُفْعِی میں عَزُورٌ

اور حالت نصی اور جری میں عَزِيزٌ (۷۰-۳۷) آتی

ہے اور اس کے معنی ہیں ”جماعتیں جو متفرق ہوں“ اصل میں یہ عَزَوْتُهُ فَاعْتَزَى سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں، میں نے اسے منسوب کیا۔ چنانچہ وہ منسوب ہو گیا گویا عَزَّةٌ ایسی جماعت کو کہتے ہیں جس کے افراد بلحاظ نسب یا بلحاظ مدد کے ایک دوسرے کی طرف منسوب ہوتے ہیں۔ اسی سے الْأَعْتَزَاءُ فِي الْحَرْبِ ہے، جس کے معنی کسی شخص کا لڑائی میں اپنا نسب بیان کرنا اور أَنَا ابْنُ فُلَانٍ وَصَاحِبُ فُلَانٍ کہنا یعنی یہ کہ میں فلاں کا بیٹا یا اس کا ساتھی ہوں۔ مروی ہے۔ (۴۳) کہ

مَنْ تَعَزَّى بِعَزَاءِ الْجَاهِلِيَّةِ فَأَعِضُوهُ بِهِنَّ أَبِيهِ

یعنی جو شخص اہل جاہلیت کی طرح اپنے آباء اجداد پر فخر

کرے اسے کہو کہ اپنے باپ کا مقام ستر کاٹ کھائے۔

بعض اہل لغت کا خیال ہے کہ عَزِيزٌ کا لفظ عَزَا عَزَاءً

فَهُوَ عَزَزَ سے مشتق ہے جس کے معنی صبر و تلی حاصل کرنے

کے ہیں۔ اس اعتبار سے عَزَّةٌ اس جماعت کو کہتے ہیں جس

کے افراد ایک دوسرے سے تلی حاصل لیتے ہوں۔

### (عس)

الْعَسَسَةُ وَالْعَسَاسُ کے معنی تاریکی ہلکی ہونے کے

ہیں۔ یہ کیفیت رات کے دونوں اطراف میں ہوتی ہے

یعنی جب رات آنے والی ہو یا جانے والی ہو۔ اس لیے

آیت کریمہ۔

﴿وَاللَّيْلِ إِذَا عَسَسَ﴾ (۸۱-۱۷) میں عَسَسَ

کے معنی رات کے آنے اور جانے دونوں ہو سکتے ہیں۔

① رواہ الحاكم في المستدرک وابن حبان في زوائده ۷۳۶ بحذف لفظ ”بهن ابیه“ والطبرانی والضیاء والترمذی عن ابی والروایانی فی الافراد راجع کنز العمال ج (۱) رقم (۱۲۹۲۰۱۲۹۳۰۴۰۴۰) وغریب ابی عبید (۳۰۱/۱) والاحادیث فی ذم التفاحیر بالآثار کثرة

﴿فَإِنْ تَعَاسَرْتُمْ فَسْتَزِضْ لَهُ أُخْرَى﴾  
(۶۵-۶) اور اگر باہم ضد (اور نا اتفاقی) کرو گے تو  
(بچے) کو اس کے (باپ کے) کہنے سے کوئی اور عورت  
دودھ پلائے گی۔

يَوْمَ عَسِيرٌ: سخت دن۔ قرآن پاک میں ہے۔  
﴿وَكَانَ يَوْمًا عَلَى الْكَافِرِينَ عَسِيرًا﴾  
(۲۳-۲۶) اور وہ دن کافروں پر (سخت) مشکل ہوگا۔

﴿يَوْمَ عَسِيرٌ عَلَى الْكَافِرِينَ غَيْرُ يَسِيرٍ﴾  
(۷۵-۹-۱۰) مشکل کا دن (یعنی) کافروں پر آسان نہ  
ہوگا۔

عَسَرَ الرَّجُلُ: تنگدستی کے وقت کسی چیز کا مطالبہ کرنا۔

### (ع س ل)

الْعَسَلُ: شہد کو کہتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔  
﴿مِنْ عَسَلٍ مُّصَفًّى﴾ (۷۷-۱۵) صاف کردہ  
شہد کی..... اور کنایہ کے طور پر جماع کو عُسَيْلَةً کہا  
جاتا ہے۔ حدیث میں ہے۔ ﴿(۴۴) (حَتَّى  
تَذُوقِي عُسَيْلَتَهُ وَيَذُوقُ عُسَيْلَتِكَ)) جب  
تک تم دونوں ایک دوسرے سے جماع کی لذت حاصل  
نہ کر لو (اس وقت تک پہلے خاوند سے نکاح کی اجازت  
نہیں ہے) (الْعَسَلَانُ: نیزے کا مضبوط ہونا، دوڑتے  
وقت اعضا کا ہلنا عام طور پر اَلْعَسَلَانُ: کا لفظ

الْعَسُ وَالْعَسَسُ: رات کے وقت مشتبہ لوگوں کی تلاش  
میں پھرنا کے ہیں اور رات کے وقت پہرہ دینے والے  
آدمی کو عَاسٌ یا عَسَّاسٌ کہا جاتا ہے اس کی جمع  
عَسَسٌ ہے مثل مشہور ہے۔ ﴿( )﴾  
كَلْبٌ عَسَّ خَيْزٌ مِنْ أَسِيدٍ رَبَضَ: یعنی رات کے  
وقت شکاری تلاش کرنے والا کتا، بیٹھ رہنے والے شیر سے  
بہتر ہے۔

الْعَسُوسُ: وہ عورت جو رات کو بد معاشی کے لیے پھرتی  
رہتی ہو۔ الْعَسُ: بڑا پیالہ۔ جمع عَسَّاسٌ۔

### (ع س ر)

الْعَسْرُ: کے معنی تنگی اور سختی کے ہیں۔ یہ يُسْرُ (آسانی،  
فارغ البالی) کی ضد ہے قرآن پاک میں ہے۔  
﴿فَإِنْ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا۔ إِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا﴾  
(۹۴-۶۱۵) یقیناً مشکل کے ساتھ آسانی ہے بے شک  
مشکل کے ساتھ آسانی ہے۔

الْعُسْرَةُ: تنگ دستی، تنگ حالی۔ قرآن پاک میں ہے۔  
﴿فِي سَاعَةِ الْعُسْرَةِ﴾ (۹-۱۱۷) مشکل کی گھڑی میں  
﴿وَإِنْ كَانَ ذُو عُسْرَةٍ﴾ (۲-۲۸۰) اور اگر قرض  
لینے والا تنگ دست ہو۔

اور أَضَاقَ فُلَانٌ کی طرح أَعْسَرَ فُلَانٌ کے معنی ہیں،  
وہ مفلس اور تنگ حال ہو گیا۔ تَعَاسَرَ الْقَوْمُ: لوگوں  
نے معاملہ کو الجھانے کی کوشش کی، قرآن پاک میں ہے۔

① راجع للمثل الميداني رقم ۳۰۴۴ والاتباع لابی الطیب ۶۷ وفيه من كلب بدل من اسدو المثل يقال للحث على الكسب۔

② قاله صلى الله عليه وسلم لأمسيرة رفاعه حين طلقها ثلاثه ونكحت عبدالرحمن بن النزير والحديث في السنة وايضاً الشافعي في  
الرسالة رقم ۴۹۴ بتحقيق احمد شاكر والام ۲۲۹/۵ واختلاف الحديث ۳۶۴ على هامش الجزء السابع من الام وايضاً المحازات  
النبويه للشريف الرضی (۲۸۲-۲۸۳)

نہیں کہ اگر تم حاکم ہو جاؤ۔

﴿هَلْ عَسَيْتُمْ إِنْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ ۖ﴾ (۲۳۶-۲) کہ اگر تم کو جہاد کا حکم دیا جائے تو عجب

نہیں.....

﴿فَإِنْ كَرِهْتُمُوهُنَّ فَعَسَىٰ أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَيَجْعَلَ اللَّهُ فِيهِ خَيْرًا كَثِيرًا﴾ (۱۹-۴) اگر وہ تم کو ناپسند ہوں تو عجب نہیں کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرو اور خدا اس میں بہت سی بھلائی پیدا کر دے۔

الْمُعْسِيَانُ: شرمادہ جس کا دودھ منقطع ہو گیا ہو اور اس کے لوٹ آنے کی امید ہو۔

عَسَى الشَّيْءُ يَعْسُو: کسی چیز کا سخت ہو جانا۔  
عَسَى اللَّيْلُ يَعْسُو: رات کا تاریک ہو جانا۔

### (ع ش ر)

الْعَشْرُ: ۱۰۔ العشر: دسواں حصہ الْعَشْرُونَ:

۱۰۰۔ اَر الْعَشْرُ: (موشیوں کا دسویں دن پانی پر وارد ہونا) قرآن پاک میں ہے۔

﴿تِلْكَ عَشْرَةٌ كَامِلَةٌ﴾ (۱۹۶-۲) یہ پورے دس ہوئے۔ ﴿عَشْرُونَ صَابِرُونَ﴾ (۷۵-۸) عیس

آدی ثابت قدم۔

﴿تِسْعَةَ عَشْرٍ﴾ (۳۰-۵۴) انیس (داروغے) عَشْرَتُهُمْ: اَعَشِرُهُمْ: میں ان میں دسواں بن گیا۔ عَشْرُهُمْ: ان سے

عُشْر: یعنی مال کا دسواں حصہ وصول کیا۔

عَشْرَتُهُمْ: میں نے ان کے موشی دس بنا دیئے یعنی

بھیڑے کی تیز روی کے لیے استعمال ہوتا ہے، چنانچہ کہا جاتا ہے: مَرَّيْعَسِلُ وَيَنْسِلُ بھیڑ یا تیزی سے دوڑتا ہوا گزرا۔

### (ع س ی)

عَسَى: ۱۔ کے معنی توقع اور امید ظاہر کرنا ہے۔ اکثر مفسرین نے قرآن پاک میں اس کی تفسیر لازم معنی یعنی یقین سے کی ہے وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے حق میں طمع اور رجا کا استعمال صحیح نہیں ہے مگر یہ ان کی کوتاہ نظری ہے۔ کیونکہ جہاں کہیں قرآن پاک میں عَسَى کا لفظ آیا ہے وہاں اس کا تعلق انسان کے ساتھ ہے نہ کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ لہذا آیت کریمہ۔

﴿عَسَىٰ رَبُّكُمْ أَنْ يُهْلِكَ عَدُوَّكُمْ﴾ (۱۲۹) کے معنی یہ ہیں کہ تم اللہ تعالیٰ سے امید رکھو کہ تمہارا دشمن کو ہلاک کر دے اسی طرح فرمایا۔

﴿عَسَىٰ اللَّهُ أَنْ يَأْتِيَ بِالْفَتْحِ﴾ (۵۲-۵) قریب ہے کہ خدا فتح بھیجے۔

﴿عَسَىٰ رَبِّي أَنْ تُلَاقِيَنَّ﴾ (۵۶-۵) اگر پیغمبر تم کو طلاق دے دیں تو عجب نہیں کہ انکا پروردگار.....

﴿وَعَسَىٰ أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ﴾ (۲۱۶-۲) مگر عجب نہیں کہ ایک چیز تم کو بری لگے اور وہ تمہارے حق میں بھلی ہو۔

﴿فَهَلْ عَسَيْتُمْ إِنْ تَوَلَّيْتُمْ﴾ (۲۲-۲۷) تم سے عجب

۱۔ کلمۃ عسی عدہ العلماء من الاضداد وقال ابن عباس ہی واجبة من الله انظر اضداد ابی الطیب ۴۸۷ ولیمعلم ایضاً ان کل مافی القرآن من عسی علی موحّد العبر فهو وخذ علی تاویل عسی الامر کذا وما کان علی الاستفہام فانه یجمع کمافی الایات ثم الافصح ان یمکن بعدھا "ان" وربما لم یکن علی عکس کل وفانه الافصح ید عدم کون "ان" راجع للبحث الصاحی ۱۵۷ وابن هشام



انسان کے باپ کی طرف سے قریبی رشتہ دار پر مشتمل جماعت۔ کیونکہ ان سے انسان کثرت عدد حاصل کرتا ہے۔ گویا کہ وہ اس کے لیے بمنزلہ عدد کامل کے ہیں کیونکہ عَشْرَةٌ کا عدد ہی کامل ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔ ﴿وَأَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ﴾ (۲۴-۹) اور عورتیں اور خاندان کے آدمی۔

لہذا عَشِيرَةٌ انسان کے رشتہ داروں کی اس جماعت کا نام ہے جن سے انسان کثرت (قوت) حاصل کرتا ہے۔ عَاشِرَتُهُ کے معنی ہیں کہ میں رشتہ دامادی میں اس کے لیے بمنزلہ عَشْرَةٍ کے ہو گیا۔ قرآن پاک میں ہے۔ ﴿وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ﴾ (۱۹-۳) اور ان کے ساتھ اچھی طرح سے رہو۔ عَاشِرٌ: مل جل کر رہنے والا خواہ رشتہ دار ہو یا اجنبی۔

### (ع ش وری)

الْعَشِيُّ: زوال آفتاب سے لے کر طلوع فجر تک کا وقت۔ قرآن مجید میں ہے۔

﴿إِلَّا عَشِيَّةً أَوْ ضُحَاهَا﴾ (۳۶-۷۹) گویا (دنیا میں صرف) ایک شام یا صبح رہے تھے۔

الْعِشَاءُ: (ممدود) مغرب سے عشا کے وقت تک اور مغرب اور عشا کی نمازوں کو الْعِشَاءُ ان کہا جاتا ہے اور الْعِشَاءُ (رتوندی)، تاریکی جو آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہے۔ رَجُلٌ عَشِيٌّ: جسے رتوندی کی بیماری ہو اس کی

پہلے نو تھے ان میں ایک اور شامل کر کے دس بنا دیا مِعْشَارُ الشَّيْءِ دسواں حصہ۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَمَا يَلْعَوْا مِعْشَارَ مَا آتَيْنَهُمْ﴾ (۳۴-۴۵) اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا تھا یہ اس کے دسویں حصے کو بھی نہیں پہنچے۔

نَاقَةُ عِشْرَاءُ: دس ماہ کی حاملہ اونٹنی اس کی جمع عِشَارُ آتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَإِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ﴾ (۸۱-۴) اور جب دس ماہ کی گاہن (حاملہ) اونٹنیاں بیکار ہو جائیں گی۔ جَاؤُا عِشَارِي وہ دس دس افراد پر مشتمل ٹولیاں بن کر آئے۔

الْعِشَارِيُّ: ہر وہ چیز جو دس ہاتھ لمبی ہو۔ الْعِشْرُ اونٹوں کو پانی نہ پلانے کی مدت (نودن)۔ إِبِلٌ عَوَاشِرٌ: نودن کے پیاسے اونٹ۔

قَدْحُ عِشَارٍ: ٹوٹا ہوا پیالہ۔ دراصل عِشَارٌ کا لفظ اس چیز پر بولا جاتا ہے جو ٹوٹ کر دس ٹکڑے ہو گیا ہو اسی سے شاعر نے بطور استعارہ کہا ہے۔ ۱ (الطویل)

(۳۱۱) بِسَهْمَيْكَ فِي عِشَارِ قَلْبٍ مُّقْتَلٍ تم اپنی (نگاہوں) کے دونوں تیر میرے شکستہ دل کے ٹکڑوں پر (بارنا چاہتی ہو)۔

الْعِشْوَرُ: کے معنی گدھے کی آواز کے ہیں کیونکہ گدھا جب آواز کرتا ہے تو دس مرتبہ آواز کرتا ہے۔ الْعِشِيرَةُ

۱ قالہ امرء القیس فی لامیتہ المشہورۃ صدرہ۔ وماذرفت عینک الا لتضربی۔ شرح المعلقات لابن الانباری رقم ۲۲ والتبریزی ۲۳ واللسان والمحکم (عشر قتل) والمحاضرات ۲۹۱ ودیوانہ ۲۶ والعقد الثمین ۱۴۷ وایضاً عتین ۳۵۶ ومختار الشعر الجاهلی والحمہرة للقرشی (۴۵۰) والعمدة (۲۷۷: ۱) وفيه لتقدحی بدل لتضربی فی باب التمثیل وقيل ان امرء القیس اول من ابتکره ولم یات اعلم منه۔

الْمَعْصُوبُ: دراصل لوہے کو کہتے ہیں جو پٹھے (کی تانت) کے ساتھ بندھا ہوا ہو۔ پھر عام مضبوطی کے ساتھ باندھنے پر عَصَبُ کا لفظ بولا جاتا ہے جیسے اہل عرب کہتے ہیں۔ ❶

لَا عَصَبَنَّاكُمْ عَصَبَ السِّلْمَةِ: میں تمہیں سلمہ درخت کی طرح باندھ کر چھوڑ دوں گا۔

فُلَانٌ شَدِيدُ الْعَصَبِ مَعْصُوبُ الْخَلْقِ: فلان کے جوڑ بند مضبوط ہیں۔ یَوْمَ عَصِيبُ: سخت دن۔ یہاں عَصِيبُ کے معنی ہیں: سخت۔ یہ بمعنی فاعل بھی ہو سکتا ہے اور بمعنی مفعول (مَعْصُوبُ) بھی۔ گویا اس کے بدن کے اطراف کو یک جا کر کے رسی کے ساتھ باندھ دیا گیا ہے جس میں وہ گھرے ہوئے ہیں اور نجات کی صورت نظر نہیں آتی۔ جیسا کہ سخت دن کو كَفَّةُ حَابِلٍ يَاحْلِقَةُ خَاتِمِ کے ساتھ تشبیہ دی جاتی ہے۔

الْعُصْبَةُ: وہ جماعت جس کے افراد ایک دوسرے کے حامی اور مددگار ہوں۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿لَتَنْوَأَ بِالْعُصْبَةِ﴾ (۷۶-۲۸) ایک طاقتور

جماعت کو اٹھانی مشکل ہوتی۔ ﴿وَنَحْنُ عُصْبَةٌ﴾

(۸-۱۲) حالانکہ ہم جماعت (کی جماعت) ہیں۔

یعنی ہم باہم متفق ہیں اور ایک دوسرے کے یار و مددگار۔ اِعْصُوبِ الْقَوْمِ: لوگ مجتمع ہو گئے۔ عَصْبُو ابِہ

مونث عَشَوَاءُ آتی ہے۔ مثل مشہور ہے۔ ❷ ( ) هُوَ يَخْبِطُ خَبَطَ عَشَوَاءُ: وہ اندھی اونٹنی کی طرح ہاتھ پاؤں مارتا ہے۔ یعنی بلا سوچے سمجھے معاملات سرانجام دیتا ہے۔ عَشَوْتُ النَّارَ: میں نے رات کو آگ کا قصد کیا۔

عُشْوَةٌ (بروزن شُعْلَةٌ) آگ کا شعلہ جو رات کے وقت دور سے دکھائی دے۔ عِشْيَ عَنْ كَذَا: کسی چیز سے آنکھیں بند کر لیتا۔ اندھا ہو جانا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَمَنْ يَعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمَنِ﴾ (۳۶-۴۳) اور جو کوئی خدا کی یاد سے آنکھیں بند کرے۔

الْعَوَاشِي: رات کو چرنے والے اونٹ۔ اور اس کا واحد عَاشِيَةٌ ہے اسی سے کہا گیا ہے۔ ❸ (مثل)

الْعَاشِيَةُ تُهَيِّجُ الْآبِيَةَ کہ رات کو چرنے والا اونٹ نہ چرنے والے کو رغبت دلاتا ہے یعنی جو اونٹ چارہ نہ کھاتا ہو وہ بھی اسے دیکھ کر چرنے لگ جاتا ہے۔

الْعِشَاءُ: شام کا کھانا۔ الْعِشَاءُ (بکسر العین) عشاء کی نماز۔ وَقَدْ عَشَيْتُ: میں نے رات کا کھانا کھایا۔ میں اسے رات کا کھانا کھلایا مشہور ہے۔

عِشْ وَلَا تَعْتَرَّ: یعنی رات کو اپنے اونٹ چرواؤ اور غافل نہ رہو۔

## (ع ص ب)

الْعَصَبُ کے معنی بدن کے پٹھے جو جوڑوں کو تھامے ہوئے ہیں۔ لَحْمٌ عَصَبٌ: بہت پٹھوں والا گوشت۔

❶ يضرب المثل للمتهافت في اشيء الميداني (۴: ۱۴۱)

❷ قاله يزيد بن رويم الشيباني انظر للمثل والخبر الميداني رقم (۱۱۷، ۲۲۱، ۲۴۰) وفيه خبر طويل والحيوان (۵: ۲۱۲) وعبون الاخبار (۳: ۲۲۵) واللسان (ابا) والجمهرة للعسكري ۱۴۵ ومعناه اذارات الآية التي تتعنى اهاجتها للرعى فرعت معها

❸ قاله الحجاج حين خطب الناس بالكوفة اللسان (عصب) وفي الميداني (۹/۲) قاله يزيد بن رويم الشيباني وفيه خبر طويل قال الميداني (۱۷/۲) يضرب للبخل يستخرج منه الشئ على كره وفي الكامل (۷۶-۳۳۴) لاخر منكم حزم السلمة وايضا راجع ابى الطيب (۵۰۲) والمقد الفريد (۴/ ۱۱۹) عبون الاخبار (۲/ ۱۴۲) وصبح الاعشى والحطبة بطولها في البياض والتبيين (۲/ ۳۰۸-۳۱۰)

اِعْتَصَرْتُ مِنْ كَذَا کے معنی کسی چیز سے خیر و برکت

حاصل کرنا کے ہیں۔ شاعر نے کہا ہے۔ (السریح)

(۳۱۲) وَإِنَّمَا الْعَيْشُ بِرُبَانِهِ

وَأَنْتَ مِنْ أَمَانِهِ مُعْتَصِرٌ

زندگی کا لطف تو اُمّتی جوانی کے ساتھ ہے جب کہ تم اس کی

شاخوں سے رس نچوڑتے ہو۔ اور آیت کریمہ۔

﴿وَأَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرَاتِ مَاءً ثَجَّاجًا﴾

(۷۸-۱۴) اور نچوڑتے بادلوں سے موسلا دھارینہ برسایا۔

میں مُعْصِرَات سے مراد بادل ہیں جو پانی نچوڑتے،

یعنی گراتے ہیں۔ اور بعض نے کہا ہے کہ مُعْصِرَات

ان بادلوں کو کہا جاتا ہے جو اِعْصَار کے ساتھ آتے ہیں

اور اِعْصَار کے معنی ہیں: گرد و غبار والی تند ہوا۔ قرآن

پاک میں ہے۔

فَأَصَابَهَا اِعْصَارٌ (۲-۲۶۶) تو (ناگہاں) اس باغ

پر..... گولا چلے۔

أَلَا غِتْصَارُ کے معنی کسی چیز کو دبا کر اس سے رس

نچوڑنے کے ہیں۔ اسی سے عُصْرٌ وَعَصْرٌ ہے۔ جس

کے معنی جائے پناہ کے ہیں۔ اَلْعَصْرُ وَالْعَصْرُ وقت اور

زمانہ۔ اس کی جمع عُصُورٌ ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

وَالْعَصْرِ - إِنَّ الْإِنْسَانَ لَفِي خُسْرٍ (۱۰۳-۲۱)

زمانہ کی قسم کہ انسان نقصان میں ہے۔

اَلْعَصْرُ کے معنی اَلْعَيْش بھی آتے ہیں، یعنی زوال

۔ اس کا احاطہ کر لیا۔

عَصَبَ الرِّيقِ بِقَمِيهِ: اس کے منہ میں تھوک خشک ہو

گئی اور بول نہ سکا گویا اس کی زبان کو تانت کے ساتھ

باندھ دیا گیا ہے۔

عَصَبٌ: ایک قسم کی یمنی منقش چادر۔

اَلْعَصَابَةُ: کے معنی پٹی یا پگڑی کے ہیں۔ تَعَمَّمَ کی

طرح اِعْتَصَبَ کے معنی بھی پگڑی باندھنا آتے ہیں۔

اَلْمَعْصُوبُ: اونٹنی کہ جب تک اس کے پاؤں باندھ کر

اسے نہ دوہا جائے دودھ نہ دے۔

اَلْعَصِيبُ: پھپھڑا۔ کیونکہ وہ بھی انتڑیوں کے ساتھ لپٹا

ہوتا ہے۔

## (ع ص ر)

اَلْعَصْرُ: یہ عَصَرْتُ الشَّيْءَ کا مصدر ہے جس کے

معنی ہیں: نچوڑنا اَلْمَعْصُورُ: وہ چیز جسے نچوڑا گیا ہو

اَلْعَصَارَةُ: شیرہ جو نچوڑ کر نکال لیا جاتا ہے۔ قرآن پاک

میں ہے۔

إِنِّي أَعَصِرُ خَمْرًا (دیکھتا کیا ہوں) کہ شراب (کے

لیے اُگور) نچوڑ رہا ہوں۔

﴿وَفِيهِ يَعْصِرُونَ﴾ (۱۲-۳۹) اور لوگ اس میں رس

نچوڑیں گے۔

یعنی اس میں خیر و برکت حاصل ہوگی۔ ایک قرأت میں

يُعْصِرُونَ ہے یعنی اس سال خوب بارش ہوگی

① قاله ابن احمرو في القاملي والحمحي واللسان وغيرها مقتفر بدل معتصر وربان العيش حدثانه واولاه والبيت في اللسان

(ريب) والحقم (عصر) والحمحي (۱۲۹) والمعاني للقبتي (۶۶۷) والسمط (۵۵۵) والقالي (۱: ۲۴۲) وابن دريد (۱: ۲۷۷)

وحصائص ابن جنى (۱: ۴۲۲) قال البكري معناه انما الصبا والعيش باوله وجدته ازمان انت معتصر من افئانه وقبله وهو اول

الشعر: قد بكرت عادلتى بكرة تزعم انى بالصبا مشتهر ۱۲

اور مَغْصُومٌ لازم ملزوم ہیں۔ یعنی ایک کا حصول دوسرے کے حصول کو مستلزم ہے۔ اس لیے لفظ عاصم بول کر معصوم مراد لیا گیا ہے۔

﴿وَاللَّهُ مِنْ عَاصِمٍ﴾ (۱۰-۲۷) اور کوئی ان کو خدا سے بچانے والا نہ گا۔

إِلَّا عَصَامٌ: کسی چیز کو پکڑ کر مضبوطی سے تھام لینا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَأَعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا﴾ (۳-۱۰۳) اور سب مل کر خدا کی (ہدایت کی) رسی کو مضبوط پکڑے رہنا۔

﴿وَمَنْ يَعْصِمْ بِاللَّهِ﴾ (۳-۱۰۱) اور جس نے خدا کی (ہدایت کی) رسی کو مضبوط پکڑ لیا۔

إِسْتَعَصِمَ: وہ باز رہا، گویا اس نے ایسی چیز طلب کی جس کے ذریعہ برائی کے ارتکاب سے بچ جائے لہذا ﴿فَاسْتَعَصِمَ﴾ (۱۲-۳۲) کے معنی ہیں: اس نے ایسی چیز تلاش کی جو برائی کے ارتکاب سے اس کی حفاظت کرے بچالے۔ اور آیت کریمہ۔

﴿وَلَا تُمْسِكُوا بِعَصَمِ الْكُوفَرِ﴾ (۶۰-۱۰) میں عَصَمٌ کا واحد عِصْمَةٌ ہے اور عِصْمَةٌ کے معنی عقد نکاح کے ہیں۔ پس آیت کے معنی یہ ہیں۔

جو عورتیں مسلمان نہیں ہونا چاہتیں انہیں مت روکو بلکہ عقد نکاح سے آزاد کر دو۔

الْعَصَامُ: مشک کی رسی یا تسمہ جس کے ساتھ اس کا منہ

آفتاب سے غروب شمس تک کا زمانہ اسی سے صَلَاةُ الْعَصْرِ (نماز عصر) ہے۔ الْعَصْرَانُ صبح شام، رات دن اور یہ الْقَمْرَانُ: کی طرح ہے جس کے معنی ہیں، چاند اور سورج۔ الْمُعْصِرُ: وہ عورت جسے حیض آجائے اور جوانی کی عمر کو پہنچ گئی ہو۔

## (ع ص ف)

الْعَصْفُ وَالْعَصِيفَةُ: کھیتی کے پتے جو کاٹ لیے جاتے ہیں نیز خشک نباتات جو ٹوٹ کر چورہ چورہ ہو جائے۔ قرآن میں ہے۔

﴿وَالْحَبُّ ذُو الْعَصْفِ﴾ (۵۵-۱۱) اور اناج پھلکے کے اندر ہوتا ہے۔

﴿كَعَصِيفٍ مَّاكُولٍ﴾ (۱۰۵-۵) جیسے کھایا ہوا بھس ہو۔ رِيحٌ عَاصِيفٌ وَعَاصِيفَةٌ وَمُعْصِفَةٌ: تند ہوا جو ہر چیز کو توڑ کر بھس کی طرح بنادے اور مجازاً عَصِيفَتْ بِهِمْ الرِّيْحُ کے معنی ہیں: وہ ہلاک اور برباد ہو گئے۔

## (ع ص م)

الْعَصْمُ کے معنی روکنے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔ ﴿لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ أَمْرِ اللَّهِ﴾ (۱۱-۲۳) آج خدا کے عذاب سے کوئی بچانے والا نہیں۔ بعض نے لَا عَاصِمَ کے معنی لَا مَغْصُومَ بھی کیے ہیں۔ یعنی آج اللہ کے حکم سے کوئی بچ نہیں سکے گا۔ اس سے یہ ہیں سمجھ لینا چاہیے کہ عربی زبان میں عَاصِمَ بمعنی مَغْصُوم آجاتا ہے۔ بلکہ یہ بتانا مقصود ہے کہ عَاصِم

① وفي الفائق (۲ / ۷۹) عن ابن عباس رضي الله عنه كان دحية اذ قدم لم تبق معصرا الا خرجت اليه لانه كان مفرط الحمال ۲

② وقد عدّه العلماء من الاضداه (۵۰۶)

میں نے اسے لاشی سے مارا عَصَيْتُ بِالسَّيْفِ: تلوار کو لاشی کی طرح دونوں ہاتھ سے پکڑ کر مارا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿أَلْقِ عَصَاكَ﴾ (۲۷-۱۰) اپنی لاشی ڈال دو۔

﴿فَأَلْقَى عَصَاهُ﴾ (۷-۱۰۷) موسیٰ علیہ السلام نے اپنی لاشی (زمین پر) ڈال دی۔

﴿قَالَ هِيَ عَصَايَ﴾ (۱۰-۱۸) انہوں نے کہا: یہ میری لاشی ہے۔

﴿فَأَلْقَوْا حَبَا لَهُمْ وَعَصِيَهُمْ﴾ (۱۰-۲۶) تو انھوں نے اپنی رسیاں اور لاشیاں ڈالیں۔

أَلْقَى فُلَانٌ عَصَاهُ: کسی جگہ پر پڑاؤ ڈالنا کیونکہ جو شخص سفر سے واپس آتا ہے وہ اپنی لاشی ڈال دیتا ہے۔ شاعر نے کہا ہے۔

(۳۱۳) وَأَلْقَتْ عَصَاهَا وَاسْتَقَرَّ بِهَا النَّوَى

(فراق نے اپنی لاشی ڈال دی اور جم کر بیٹھ گیا۔)

عَصَى عَصِيَانًا کے معنی اطاعت سے نکل جانے کے

ہیں دراصل اس کے معنی ہیں: اس نے لاشی (عصا) سے

اپنا بچاؤ کیا۔ قرآن پاک میں ہے۔

باندھا جاتا ہے اور عِصْمَةُ الْأَنْبِيَاءِ کے معنی انبیاء کی حفاظت کے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے مختلف طریقوں سے انبیاء کی حفاظت کی ہے۔ اول یہ کہ ان کو صاف شفاف جوہر سے پیدا کیا۔ دوم: انہیں جسمانی اور روحانی فضائل سے آراستہ کیا سوم: ان کی مدد کی، انہیں استقلال بخشا ان پر اپنی طرف سے سکینے نازل کی ان کے دلوں کی حفاظت کی اور انہیں اپنی توفیق خاص سے نوازا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَاللَّهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ﴾ (۵-۶۷) اور خدا تم کو لوگوں سے بچا رکھے گا۔

أَلْعِصْمَةُ: بازو بند کے مثل ایک قسم کا حلقہ أَلْعِصْمُ: کلائی اور بازو بند کی مناسبت سے جانور کی کلائی کی سفیدی کو بھی عِصْمَةٌ کہا جاتا ہے جیسا کہ اس کے پاؤں کی سفیدی کو أَلْتَحَجِيلُ کہہ دیا جاتا ہے اسی معنی کے لحاظ سے بڑ کو بھی غُرَابٌ أَعَصَمُ کہتے ہیں۔<sup>۱</sup> کیونکہ اس کے پچھلے سفید ہوتے ہیں اور باقی تمام بدن سیاہ یا سرخ ہوتا ہے۔

## (ع ص وری)

أَلْعَصَا: (لاشی) یہ اصل میں ناقص واوی ہے کیونکہ اس کا تشبیہ عَصَوَان اور جمع عِصَى آتی ہے، عَصَوْتُهُ:

۱ وفی الحدیث (فی المختارات المتبرجات) قال رسول الله صلى الله عليه وسلم ((لا يدخل الجنة منهن الا مثل الغراب الاعصم ای

القليل النادر وفی آخره المرأة الصالحة مثل الغراب الاعصم راجع الفائق والنهاية (عصم)

۲ قاله معمر بن اوس بن حمار البارقي وتمامه : كما قرع عينا بالاياب المسافر وفی المطبوع واستقرت والتصويب من المراجع والبيت في التاج والصحاح والمحكم (عصى) من قصيدته المختارة وراجع للبيت المحاضرات للمؤلف (۴۸/۱۴۸: ۴۱۹) والمؤتلف (۱۲۸) ورأيت في طراز المحال للخواجی (۱۱۳) البيت بواشد بن عبدربه قال وكان من شعراء الصحابة ومن شعره قصيدة له

اولها: صحاح القلب عن سلمى واقصر شأؤه - وردت عليه مانفته تماضر - تم في الكتاب نفسه ۱۴۸ نسبه الخواجی الى معمر بن الحارث البارقي وكذا في العقد (۲/۵۲۰۳: ۵۲۰۳) البيت معزوالی راشد والصواب انه للمعمر راجع العقد (۳/۶۴: ۶۵) والاشتقاق ۴۸۱ والبيت ايضا في تاريخ الطبری (۴/۲/۱۱۵: ۲۶۲) وقال ان عائشة تمثلت به عند ما بلغها قتل علي رضي الله عنه (المعجم)

(وتمثل به المنصور حينما بلغه خبر هزيمة ابراهيم وفي الميداني (۲۸۷۲) لما بوع لابی العباس الفلاح تمام خطيبا فسقط القضيب من يده فقام رجل فاحذًا القضيب ودفعه اليه وانشد البيت وترجمه الشاعر في الخزائن (۲/۲۹۱)

ہے اور کام کی نوعیت کے اعتبار سے کبھی یہ لفظ بطور تعریف استعمال ہوتا ہے اور کبھی بطور مذمت۔

هُوَ عِضٌّ سَفَرٍ: وہ سفر پر بہت قدرت رکھتا ہے۔

هُوَ عِضٌّ فِي الْخُصُومَةِ: وہ جھگڑنے میں نہایت فصیح اور سخور ہے۔

زَمَنْ عَضُوضٌ: خشک سال۔

الْتَّغَضُوضُ: ایک قسم کی کھجور جو دشواری کے ساتھ چبا کر کھائی جاتی ہے۔

### (ع ض د)

الْعَضْدُ: (بازو) کا کہنی سے لے کر کندھے تک کا حصہ عَضْدَتُهُ: میں نے اس کے بازو پر مارا اسی سے استعارہ کے طور پر کہا جاتا ہے۔

عَضْدَتُ الشَّجَرِ بِالْمُعَصِدِ: میں نے انہی سے درخت کو کاٹا۔ جَمَلٌ عَاضِدٌ: بزشر جو مادہ کے بازو کو پکڑ کو جفتی کرنے کے لیے اسے بٹھالیتا ہے اور عَضْدَتُهُ

کے معنی کسی کا بازو پکڑنے اور اسے سہارا دینے کے ہیں اور يَدٌ کی طرح بطور استعارہ عَضْدٌ کا لفظ بھی مددگار کے معنی میں آجاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَمَا كُنْتُ مُتَّخِذَ الْمُضِلِّينَ عَضْدًا﴾ (۵۱-۱۸) اور میں ایسا نہیں تھا کہ گمراہ کرنے والوں کو مددگار بناتا۔

رَجُلٌ أَعَصَدُ: پتلے بازو کا آدمی۔ عَضِدٌ: بازو کے درد میں مبتلا ہونا۔ مُعَصِدٌ: وہ آدمی جس کے بازو پر نشان ہو

ایسے نشان کو عَصَادٌ کہا جاتا ہے اور مُعَصِدٌ کے معنی بازو بند کے ہیں۔ أَعَصَادُ الْحَوْضِ: حوض کے جوانب (میں) جو پشتہ اس کی حفاظت کے لیے بنا دیا جاتا

﴿وَعَصَى آدَمُ رَبَّهُ فَغَوَى﴾ (۲۰-۱۲۱) اور آدم ﷺ نے اپنے پروردگار کے حکم کے خلاف کیا تو (وہ اپنے مطلوب سے) بے راہ ہو گئے۔

﴿وَمَنْ يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ﴾ (۴-۱۲) اور جو خدا اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا۔

﴿الْأَنزِلَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ﴾ (۱۰-۹۱) (جواب ملا کہ) اب؟ (ایمان لاتا ہے) حالانکہ تو پہلے نافرمانی کرتا رہا۔ اور اس شخص کے متعلق جو جماعت سے علیحدگی اختیار کرے، کہا جاتا ہے۔ فَلَا تَشَقَّ الْعَصَا۔

### (ع ض ض)

الْعَضُ: کسی چیز کو دانت سے پکڑ لینا یا کاٹنا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿عَضُّوا عَلَيْكُمُ الْأَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ﴾ (۳-۱۱۹) تم پر غصے سے اپنی انگلیاں کاٹتے ہیں۔ اور آیت کریمہ۔

﴿يَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ﴾ (۲۵-۲۶) اور جس دن ناعاقت اندیش ظالم اپنے ہی ہاتھ کاٹ کاٹ کر کھائے گا۔

میں ندامت سے کنایہ ہے کیونکہ عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ جب کوئی شخص کسی کام پر انتہا درجہ پشیمان ہوتا ہے تو دانت سے اپنے ہاتھ کاٹنے لگتا ہے۔

الْعَضُ: کھجور کی سٹھلی، خاردار جھاڑی، جسے اونٹ کھاتے ہیں۔

الْعِضَاضُ: جانوروں کا ایک دوسرے کو دانتوں سے کاٹنا۔ رَجُلٌ مُعِضٌ: اپنے کام میں نہایت کوشش کرنے والا آدمی۔ گویا وہ اسے دانتوں سے پکڑے ہوئے

دَاءُ عُضَالٍ: لاعلاج مرض جس سے شفا یاب ہونا مشکل ہو اَلْعُضَلَةُ: بڑی مصیبت۔

ہے) جو اس کے لیے بازو کا کام دیتے ہیں۔

## (ع ض ل)

### (ع ض و ر و)

اَلْعِصَّةُ: کے معنی چیز کا ٹکڑا کے ہیں اس کی جمع عُصَوْنٌ وَعِصِيْنٌ ہے جیسا کہ ثُبَّةٌ اور طَبَّةٌ کی جمع ثُبُونٌ وَطَبُونٌ آتی ہے۔ \* اسی سے اَلْعُضْوُ وَالْعُضْوُ ہے جس کے معنی بدن کا ایک حصہ یا ٹکڑا کے ہیں اور عَضِيَّتُهُ تَعْصِيَّةٌ کے معنی ہیں: بکڑے بکڑے کر دینا اعضا کو کاٹ کر الگ الگ کر دینا۔ الکسائی فرماتے ہیں کہ عِصَّةٌ کی اصل عُضْوٌ بھی ہو سکتی ہے اور عِصَّةٌ جس کے اصل عُضْوٌ بھی ہو سکتی ہے اور عِصَّةٌ بھی۔ جس کے معنی جادو کے ہیں۔ \* لہذا بعض کے نزدیک عِصَّةٌ کی اصل بھی عِصَّةٌ ہے کیونکہ اسکی تغیر عَضِيَّةٌ ہے اور بعض نے کہا ہے کہ اسکی اصل عضوة ہے کیونکہ اس کا تشبیہ عِضْوَانٌ آتا ہے۔ ایک روایت میں ہے۔ \* (۳۲) لَا تَعْصِيَّةَ فِی الْوِیْرَاثِ کہ ترکہ کی تقسیم کے وقت ایسی چیز کو کاٹ کر تقسیم نہ کیا جائے جس کے کاٹنے سے وارثوں کو نقصان پہنچتا ہو مثلاً تلوار وغیرہ کہ اسے کاٹ کر دو بکڑے نہ کیے جائیں۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿جَعَلُوا الْقُرْآنَ عِضِينَ﴾ (۱۵-۹۱) جنہوں نے قرآن پاک کو ٹکڑے ٹکڑے کوڑالا، یعنی کسی نے کہا کہ جادو

اَلْعِصَّةُ: پٹھا جس کے ساتھ سخت گوشت ہو۔ رَجُلٌ عَصِلٌ: وہ شخص جو گوشت سے گتھا ہوا ہو۔ عَضَلْتُهُ: میں نے اسے عَضَلٌ یعنی پٹھے کی تانت سے ساتھ باندھ دیا جیسا کہ عَصَبْتُهُ اس کے بعد مجازاً ایلفظ ”بختی سے روک دینا“ کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔ ﴿فَلَا تَعْصَلُوهُنَّ اَنْ يَنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ﴾ (۲۳۲-۲) تو ان کو دوسرے شوہروں کے ساتھ ..... نکاح کرنے سے مت روکو۔

اس آیت کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ اس کے مخاطب ان کے پہلے خاوند ہیں اور بعض نے اولیاء یعنی سرپرست مراد لیے ہیں۔ اور بختی میں عَضَلَةُ کے ساتھ تشبیہ دے کر کہا جاتا ہے۔ عَضَلَتِ الدَّجَاجَةُ بَيْضَهَا: مرغی پرانہ دینا دشوار ہو گیا۔ عَضَلَتِ الْمَرْثَةُ بَوْلِدَهَا: عورت زچہ کی تکلیف میں مبتلا ہو گئی۔ شاعر نے کہا ہے۔ \* (الطویل)

(۳۱۴) تَرَى الْاَرْضَ مِنَّا بِالْفَضَاءِ مَرِيضَةً

مُعَصِّلَةً مِنَّا بِجَمْعٍ عَرَمَرَمٍ

زمین ہمارے لشکر جبار کی وجہ سے اس عورت کی طرح بے چین نظر آتی ہے، جو زچگی کے مرض میں مبتلا ہو۔

① قاله اوس بن حجر والبيت في اللسان والحكم (عضل) والسمط ٤٨١ والميداني (٢٣: ٢) والمعاني للقبتي - (٨٩) والشعراء ١٠١ والخزانة (٤٩٥: ٣) والبيت ايضا من كلمة في ديوانه (٢٧) ومجموعة المعاني (٨٦) وتهذيب الالفاظ (٤٤٣، ٤٤٩)

② وكذا بارة جمعه برين (الطبري ٦٥/ ١٤)

③ ومنه في الحديث لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم العاضة والمسعضة اللسان (عضه)

④ راجع للحديث الفائق (٨١/ ٢) والنهاية (عضي) وتامامه الاماحمل القسم رواه البيهقي عن ابى بكر بن حزم يرسل راجع كنز

العمال (ج ١١ رقم ٣٣) وبمعنى الحديث غريب ابى عبيد





ہیں۔ مجازاً ہر چیز کے بڑا ہونے پر بولا جاتا ہے خواہ اس کا تعلق حس سے ہو یا عقل سے اور عام اس سے کہ وہ مادی چیز ہو یا معنوی۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ﴾ (۱۸۹-۲۶) بڑے (سخت) دن کا عذاب تھا۔

﴿قُلْ هُوَ نَبَأٌ عَظِيمٌ﴾ (۶۷-۳۸) کہہ دو کہ وہ ایک سخت حادثہ ہے۔

﴿عَمَّ يَتَسَاءَلُونَ عَنِ النَّبَأِ الْعَظِيمِ﴾ (۱-۷۸) یہ لوگ کس چیز کی نسبت پوچھتے ہیں کیا بڑے حادثہ کی نسبت؟

﴿عَلَى رَجُلٍ مِّنَ الْقُرَيْشِينَ عَظِيمٍ﴾ (۳۱-۲۳) ان دو بستیوں (یعنی مکہ اور طائف) میں سے کسی بڑے آدمی پر.....

اور عظیم کا لفظ جب اجسام کے متعلق استعمال ہوتا ہے تو ایسے جسم کے متعلق بولا جاتا ہے جس کے اجزاء متصل ہوں مگر اس کے بالمقابل کثیر کا لفظ افراد پر بولا جاتا ہے جو ایک دوسرے سے الگ ہوتے ہیں مگر کبھی عظیم کا لفظ بھی افراد کثیرہ پر بولا جاتا ہے جیسے: جَيْشٌ عَظِيمٌ بھاری لشکر۔ مَالٌ عَظِيمٌ: زیادہ مال۔ اس صورت میں عَظِيمٌ کے معنی کَثِيرٌ ہوتے ہیں۔ اور بڑے حادثہ کو عَظِيمَةٌ کہا جاتا ہے۔ اِلْأَعْظَامَةُ وَالْعِظَامَةُ گدے کی مثل ایک چیز جسے عورت اپنے سرین بڑے ظاہر کرنے کے لیے ان پر باندھ لیتی ہے۔

لینا دینا۔ اَلْأَعْظَاءُ: (افعال) قرآن پاک میں ہے۔

﴿حَتَّى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ﴾ (۲۹-۹) یہاں تک کہ..... جزیہ دیں۔

اور اَلْعَطِيَّةُ وَالْعَطَاءُ: خاص کر اس چیز کو کہتے ہیں جو محض تفضلاً دی جائے۔ چنانچہ فرمایا۔

﴿هَذَا عَطَاءُ نَا﴾ (۹-۳۸) یہ ہماری بخشش ہے۔

﴿فَإِنْ أُعْطُوا مِنْهَا رِضًا وَإِنْ لَمْ يُعْطُوا مِنْهَا﴾ (۵۸-۹) اگر ان کو اس میں سے (خاطر خواہ) مل جائے تو خوش رہیں اور اگر اس قدر نہ ملے۔

أَعْطَى الْبُعَيْرُ: اونٹ مطہ ہو گیا۔ دراصل اس کے معنی ہیں اونٹ نے منہ زوری اور سرتابی چھوڑ دی اور اپنا سر سوار کے سامنے جھکا دیا۔

ظَبْنٌ عَطُوٌّ عَاطٍ: وہ ہرن جو درخت کے پتے کھانے کے لیے اپنا سراو پر اٹھائے ہوئے ہو۔

## (ع ظ م)

اَلْعَظْمُ کے معنی ہڈی کے ہیں۔ اس کی جمع عِظَامٌ آتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿عِظَامًا فَكَسُونَا الْعِظَامَ لَحْمًا.....﴾ (۱۴-۲۳)

ہڈیاں (بنائیں) پھر ہڈیوں پر گوشت (پوست) چڑھایا۔ ایک قراءت میں دونوں جگہ عَظْمٌ ہے اور اسی سے عَظْمَةُ الذَّرَاعِ ہے جس کے معنی بازو کا مٹھا حصہ کے ہیں عَظْمُ الرَّجُلِ: بغیر تنگ کے پالان کی لکڑی عَظْمُ الشَّيْءِ کے اصل معنی کسی چیز کی ہڈی کے بڑا ہونے کے

## (ع ف ف)

معنی قوی ہیکل کے ہیں۔

اصل میں عَفْرِيتُ کا لفظ اَلْعَفْرَ سے ہے جس کے معنی مٹی کے ہیں اور عَافِرُہ کے معنی ہیں: اسے پھار کر مٹی میں لت پت کر دیا اور رَجُلٌ شِرٌّ وَشِمْرٌ کی طرح رَجُلٌ عَفْرٌ بھی کہا جاتا ہے۔ جس کے معنی ہیں: چالاک اور شریر آدمی۔ لَيْتُ عَفْرَيْنَ: گرگٹ کی شکل کا ایک جانور ہے سوار پر حملہ کر کے اسے نیچے گرا لیتا ہے۔ عَفْرِیۃُ الذِّیْنِکَ اَوِ الْحَبَارِی: مرغ یا حبابی کے سر کے بال، (کلفتی)۔

## (ع ف و)

اَلْعَفْوُ: کے معنی کسی چیز کو لینے کا قصد کرنے کے ہیں۔ چنانچہ محاورہ ہے۔ عَفَاہُ وَاَعْتَفَاہُ: کسی کے پاس جو کچھ ہے وہ لینے کا قصد کیا۔ عَفَّتِ الرِّیْحُ الدَّارَ: ہوائے گھر کے نشانات مٹا دیئے اسی معنی کے لحاظ سے شاعر نے کہا ہے۔<sup>①</sup>

(۳۱۵) اَخَذَ الْبَلْبٰی اَیَاتِہَا

بوسیدگی نے اس کے نشانات مٹا ڈالے۔

عَفَّتِ الدَّارُ: گھر کے نشانات مٹ گئے۔ گویا ان آثار نے از خود مٹ جانے کا قصد کیا۔ عَفَا النَّبْتُ وَالشَّجَرُ نباتات اور درخت بڑھ گئے جیسا کہ اَخَذَ النَّبْتُ فِی لَرْبَادَةٍ کا محاورہ ہے یعنی پودے نے بڑھنا شروع کیا۔

عَفَوْتُ عَنْہُ کے معنی ہیں میں نے اس سے درگزر کرتے

اَلْعَفَّةُ: نفس میں ایسی حالت کا پیدا ہو جانا جس کے ذریعہ وہ غلبہ شہوت سے محفوظ رہے۔ اَلْمُتَعَفِّفُ: زبردستی سے اپنے اندر ایسی حالت پیدا کرنے والا۔ اصل میں اس کے معنی تھوڑی سی چیز پر قناعت کرنے کے ہیں۔ جو بمنزلہ عَفَافَۃٍ یَاعُفَّۃٍ یعنی بچی کچی چیز کے ہوا بمنزلہ عَفْعَفٌ یعنی پیلوں کے ہو۔ اَلِاسْتِعْفَافُ عفت طلب کرنا، کسی چیز سے پرہیز کرنا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَمَنْ كَانَ عَنِیًّا فَلْيُتَعَفَّفْ﴾ (۶۴-۶۵) اور جو شخص آسودہ حال ہو اس کو (ایسے مال سے قطعی طور پر) پرہیز رکھنا چاہیے۔

﴿وَلْيُتَعَفَّفِ الذِّیْنَ لَا یَجِدُوْنَ نِکَاحًا﴾ (۲۴-۲۳) اور جو نکاح کا مقدور نہیں رکھتے انہیں چاہیے کہ اپنے آپ کو بچائے رکھیں۔

## (ع ف ر)

اَلْعَفْرِیۃُ: جنوں میں سے عفریت، اس جن کو کہا جاتا ہے جو نہایت موذی اور شریر ہو۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿قَالَ عَفْرِیۃٌ مِّنَ الْجِنِّ﴾ (۲۷-۳۹) جنات میں سے ایک موذی اور شریر جن نے کہا۔

پھر جس طرح کبھی شریر انسان کو شیطان کہہ دیا جاتا ہے اس طرح استعارۃً انسان کو عَفْرِیۃٌ بھی کہہ دیتے ہیں۔ چنانچہ عَفْرِیۃٌ نَفْرِیۃٌ کا محاورہ ہے (نفریت تابع مہمل ہے) ابن قتیبہ کہتے ہیں<sup>②</sup> کہ اَلْعَفْرِیۃُ کے

① انظر للكلمة الاتباع لابی الطیب (۹۸) والقالی (۲/۲۱۷) والمخصص (۴/۳۷) والمزهر (۱/۴۱۸)

② ابو جعفر احمد بن عبداللہ بن مسلم قتیہ المتوفی ۳۲۲ھ معجم الادباء (۲/۱۶۰)

③ لم اجده ویرجی

کس طرح کا مال خرچ کریں کہہ دو جو چاہو خرچ کرو۔  
 میں عفو سے ہر وہ چیز مراد ہے جو ضروریات سے زائد ہو اور  
 اس کے خرچ سے تکلیف نہ ہو اور آغوش عفو اس  
 نے اسے بے مانگے دے دیا۔ یہاں عفو مصدر اسم فاعل  
 کے معنی میں ہے اور حال واقع ہوا ہے یعنی بخشش کرتے  
 وقت اس کی حالت یہ تھی کہ گویا خود لے رہا ہے اور اس  
 میں اس عمدہ معنی کی طرف اشارہ ہے جسے شاعر نے بیان  
 کرتے ہوئے کہا ہے۔ (الطویل)  
 (۳۱۶) كَأَنَّكَ تُغْفِيهِ الَّذِي أَنْتَ سَأَلْتَهُ  
 یعنی جب سائل اس کے پاس آتا ہے تو اس طرح خوش  
 ہوتا ہے گویا جو چیز تم اس سے لے رہے ہو وہ اسے دے  
 رہے ہو۔

اور دعائے ماثورہ میں ہے۔ (۴۳) اَسْأَلُكَ  
 الْعَفْوَ وَالْعَافِيَةَ: یعنی اے اللہ! تجھ سے عفو اور تندرستی  
 طلب کرتا ہوں اور قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے اپنی  
 ذات کو عفو کہا ہے۔ چنانچہ فرمایا۔  
 ﴿إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَفْوَاً غَفُوراً﴾ (۴۳-۳) بے شک  
 اللہ معاف کرنے والا اور بخشنے والا ہے۔

اور حدیث میں ہے (۴۳) ((مَا أَكَلَتِ الْعَافِيَةُ  
 فَهُوَ صَدَقَةٌ)) یعنی کھیتی سے جو کچھ پرند، چرند اور

ہوئے اس کا گناہ مٹا دینے کا قصد کیا لہذا یہاں اصل میں اس  
 کا مفعول ترک کر دیا گیا ہے اور عَنِ کا متعلق مخذوف ہے۔  
 اِی قَصَدْتُ اِزَالَةَ ذَنْبِهِ صَارِفاً عَنْهُ پس عَفُو کے  
 معنی گناہ سے درگزر کرنا کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔  
 ﴿فَمَنْ عَفَا وَأَصْلَحَ﴾ (۴۲-۴۰) مگر جو درگزر کرے  
 اور معاملے کو درست کر لے۔

﴿وَأَنْ تَعْفُوا أَقْرَبُ لِلتَّقْوَى﴾ (۲-۲۳) اور اگر  
 تم ہی اپنا حق چھوڑ دو تو یہ پرہیزگاری کی بات ہے۔  
 ﴿ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ﴾ (۲-۵۲) پھر اس کے بعد ہم  
 نے تم کو معاف کر دیا۔  
 ﴿إِنْ نَعْفُ عَنْ طَآئِفَةٍ مِنْكُمْ﴾ (۹-۶۶) اگر ہم تم  
 میں سے ایک جماعت کو معاف کر دیں۔

﴿فَاعْفُ عَنْهُمْ﴾ (۵-۱۳) تو ان کی خطائیں معاف  
 کر دو۔ اور آیت کریمہ۔  
 ﴿خُذِ الْعَفْوَ﴾ (۸-۱۹۹) (اے محمد) عفو اختیار کرو۔  
 میں اَلْعَفْوَ ہر اس چیز کو کہا گیا ہے جس کا قصد کرنا اور لینا  
 آسان ہو۔ اور بعض نے اس کے معنی کئے ہیں: درگزر  
 کیجیے۔ اور آیت کریمہ۔

﴿وَيَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُقْفُونَ قُلِ الْعَفْوَ﴾ (۲-۲۱۹)  
 (اے محمد ﷺ) لوگ تم سے پوچھتے ہیں کہ اللہ کی راہ میں

① و صدره: تواء اذا ما حبسته متهللاً تراء اذا ما حبسته متهللاً او اليست في اللسان (هلل) غير منسوب قال احد مصححيه في الحاشية  
 وفي شواهد الكشاف انه لزهير بن ابي سلمى يمدح حصن بن ابي حذيفة ويعلم من رواية انه وصف لمعنى بن زائدة وفي المختارات  
 ۶۵ يمدح هرماني ۲۳ بيتاً وفي مختار الشعر الجاهلي (۱: ۶۹) في ۴۲ بيتاً ونقد الشعر ۲۱ في ثلاثة ابیات معزوالی زهير كذافي البحر  
 (۵: ۲) والعمدة (۲: ۴۰۳۱) والعقد الثمين ۹۳ والحصري (۳: ۱۳۳) وخصاص الحاصص للعالبي (۳۱۸) قال وهو امدح بيت قاله  
 العرب والعقد (۱: ۳۳۷) ورسائل البلغاء (۲۷۸) والعيون (۱: ۳۴۱/۵۳) والسيوطي (۹۴)

② ابن ماجة عن ابي هريره وفي رواية الحاكم والترمذي عن ابي بكر: سلوا الله العفو والعافية والفائق (۲: ۸۰)  
 ③ المستدرک (۳: ۳۱۳) وابو داود (بيوع) وغريب ابي عبيد (۱: ۱۴۸) وفي رواية "اصابت" انظر للحديث الفائق (۲: ۸۳) قال  
 والعافية جماعة ويقال للواحد عاف ۱۲

﴿فَارْتَدَّ عَلَى آثَارِهِمَا قَصَصًا﴾ (۱۸-۶۴) تو وہ اپنے پاؤں کے نشان دیکھتے دیکھتے لوٹ گئے۔ نیز کہا جاتا ہے۔

رَجَعَ عَوْدُهُ عَلَى بَذْيِهِ: یعنی جس راستہ پر گیا تھا اسی راستہ سے واپس لوٹ آیا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَنُرِدُّ عَلَىٰ أَعْقَابِنَا﴾ (۶-۷۱) تو کیا ہم اگلے پاؤں پھر جائیں۔

﴿إِنْقَلَبْتُمْ عَلَىٰ أَعْقَابِكُمْ وَمَنْ يَنْقَلِبْ عَلَىٰ عَقْبَيْهِ﴾ (۳-۱۴۴) تو تم اگلے پاؤں پھر جاؤ (یعنی مرتد ہو جاؤ) اور جو اگلے پاؤں پھر جائے گا۔

﴿نَكْصَ عَلَىٰ عَقْبَيْهِ﴾ (۸-۴۸) تو پسپا ہو کر چل دیا۔

﴿فَكُنْتُمْ عَلَىٰ أَعْقَابِكُمْ تَنْكِصُونَ﴾ (۲۳-۶۶) اور تم اگلے پاؤں پھر جاتے تھے۔

عَقْبَهُ: وہ اس کے پیچھے پیچھے چلا، اس کا جانشین ہوا۔ جیسا کہ دَبْرَهُ وَفَقَاهُ کا محاورہ ہے۔

الْعَقْبُ وَالْعُقْبَى: خاص کر ثواب۔ یعنی اچھے بدلے پر بولے جاتے ہیں۔ جیسے فرمایا۔

﴿خَيْرُ نَوَابَا وَخَيْرُ عَقْبَا﴾ (۱۸-۱۴۴) اس کا صلہ بہتر اور (اس کا) بدلہ اچھا ہے۔

﴿أُولَٰئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ﴾ (۱۳-۲۲) یہی لوگ ہیں جن کے لیے عاقبت کا گھر ہے۔

ضرورت مند انسان کھا جائیں وہ صدقہ ہے۔

أَعْفَيْتُ كَذَا: یعنی میں نے اسے بڑھنے دیا۔ اسی سے "أَعْفُوا لِلْحَى" ہے۔ (۳۵) یعنی ڈاڑھی کے بال بڑھنے دو۔

الْعِفَاءُ: اون یا پرند کے پر جو بڑھ جائیں اور کسی سے دیگ مستعار لینے والا۔ جو شور بہ اس کی دیگ میں اسے بھیجتا ہے اس شور بہ کو اَلْمَعَاْفَى کہا جاتا ہے۔

## (ع ق ب)

الْعَقْبُ وَالْعَقْبُ: پاؤں کا پچھلا حصہ یعنی ایڑی اس کی جمع اَعْقَابٌ ہے۔ حدیث میں ہے۔ (۳۵)

((وَنِلْ لِلْأَعْقَابِ مِنَ النَّارِ)) کہ (وضو میں خشک رہنے والی) ایڑیوں کے لیے دوزخ کا عذاب ہے اور بطور استعارہ عَقْبٌ کا لفظ بیٹے پوتے پر بھی بولا جاتا ہے۔

قرآن پاک میں ہے۔ ﴿وَجَعَلَهَا كَلِمَةً بَاقِيَةً فِي عَقْبِهِ﴾ (۳۳-۲۸)

اور یہی بات اپنی اولاد میں پیچھے چھوڑ گئے۔

جَاءَ فِي عَقْبِ الشَّهْرِ: مہینے کے آخری دنوں میں آیا۔ رَجَعَ عَلَى عَقْبِهِ: اگلے پاؤں واپس لوٹا۔

إِنْقَلَبَ عَلَى عَقْبَيْهِ: وہ اگلے پاؤں واپس لوٹا۔ جیسے: رَجَعَ عَلَى حَافِرَتِهِ: کا محاورہ ہے اور جیسا کہ قرآن پاک میں ہے۔

① کلمۃ من الحديث رواه النسائي والمسلم (طهارة) والبخاري (اللباس) وابوداود (ترجل) والترمذي (آداب) والمستدرک (۱۶/۲) والحديث في النهاية (۲۶/۳) والاضداد لابی الطيب (۴۸۳/۲) وعده من الاضداد

② اصل الحديث متفق عليه من حديث عبدالله بن عمرو رضى الله عنه باختلاف الفاظه ابن ماجه والنسائي وغيرهما من كتب الحديث راجع لتعريجه الكاف الشاف لابن حجر رحمه الله ص ۵۲ رقم ۴۴۰-۴۴۲

ہے۔

التَّعْقِيبُ: ایک چیز کے بعد دوسری لانا۔

عَقَّبَ الْفَرَسُ فِي عَدْوِهِ: گھوڑے نے ایک دوڑ کے بعد دوسری دوڑ لگائی۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿لَهُ مُعَقِّبَاتٌ مِّن بَيْن يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ﴾ (۱۱-۱۳) اس کے آگے اور پیچھے خدا کے چوکیدار ہیں اور

آیت کریمہ۔

﴿لَا مُعَقِّبَ لِحُكْمِهِ﴾ (۳۱-۱۳) کے معنی ہیں کہ اللہ کے فیصلے کے خلاف کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا اور نہ اس پر بحث کر سکتا ہے۔ یہ عَقَّبَ الْحَاكِمُ عَلَى حُكْمٍ مِّن قَبْلِهِ کے محاورہ سے ماخوذ ہے یعنی حاکم نے اپنے پیشتر و حاکم کے خلاف فیصلہ دیا۔ شاعر نے کہا ہے۔ ❶

(۳۱۷) وَمَا بَعْدَ حُكْمِ اللَّهِ تَعْقِيبٌ

اللہ کے فیصلہ کے بعد کسی اور کا فیصلہ نہیں آ سکتا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آیت مذکورہ میں لوگوں کو اللہ کے حکم اور اس کی مخفی حکمتوں میں خوض کرنے سے منع فرمایا گیا ہو۔ جیسا کہ قضا و قدر کے اسرار میں غور و خوض سے منع کیا گیا ہے۔ اور آیت کریمہ۔

﴿وَلَيْ مُذِبِّرًا وَلَمْ يُعَقِّبْ﴾ (۱۰-۲۷) میں لَمْ يُعَقِّبْ کے معنی ہیں اس نے مڑ کر پیچھے کو نہ دیکھا۔

الْأَعْتَابُ کے معنی ایک چیز کے بعد دوسری آنے کے ہیں۔ جیسے شب و روز کہ یہ دونوں یکے بعد دیگرے آتے ہیں۔ اسی سے الْعَقْبَةُ ہے یعنی دو مسافروں کا یکے بعد دیگرے ایک سواری پر سوار ہونا۔ عَقْبَةُ الطَّائِرِ:

اور عَاقِبَةُ کالفظ بھی ثواب کے لیے مخصوص ہے۔ جیسے فرمایا۔

﴿وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ﴾ (۸۳-۲۸) اور انجام نیک تو پرہیزگاروں ہی کا ہے۔

مگر یہ اضافت کی صورت میں کبھی عُقُوبَةُ کے معنی میں بھی آ جاتا ہے، جیسے فرمایا۔

﴿ثُمَّ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ آسَاءُ وَالسُّوءِ﴾ (۱۰-۳۰) پھر جن لوگوں نے برائی کی ان کا انجام بھی برا

ہوا۔ اور آیت کریمہ۔

﴿فَكَانَ عَاقِبَتُهُمَا أَنَّهُمَا فِي النَّارِ﴾ (۱۷-۵۹) تو دونوں کا انجام یہ ہوا کہ دونوں دوزخ میں داخل ہوئے۔

میں عَاقِبَةُ کالفظ استعاراً عذاب کے لیے استعمال ہوا ہے جیسا کہ آیت کریمہ۔

﴿فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ﴾ (۳۲-۹) ان کو اس دن کے عذاب الیم کی خوشخبری سنا دو۔

میں عذاب کے ساتھ بشارت کا لفظ لایا گیا ہے اور عِقَاب، عُقُوبَةُ اور مَعَاقِبَةُ عذاب کے ساتھ مخصوص

ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔

﴿فَحَقَّ عِقَابٌ﴾ (۱۲-۳۸) تو سخت عذاب کرنے والا۔ ﴿فَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوا بِمِثْلِ مَا عُوقِبْتُمْ بِهِ﴾

(۱۲-۱۶) اگر تم ان کو تکلیف دینی چاہو تو اتنی ہی دوجہنی تکلیف تم کو ان سے پہنچی ہے۔

﴿وَمَنْ عَاقَبَ بِمِثْلِ مَا عُوقِبَ بِهِ﴾ (۲۰-۲۲) جو شخص کسی کو اتنی ہی سزا دے جتنی سزا کہ اس کو دی گئی

دوسری بار دوڑتا ہے۔

### (ع ق د)

الْعَقْدُ کے معنی کسی چیز کے اطراف کو جمع کر دینے یعنی گره باندھنے کے ہیں یہ اصل میں تو سخت اجسام کے متعلق استعمال ہوتا ہے جیسے، عَقْدُ الْحَبْلِ (رسی کی گره باندھنا) عَقْدُ الْبَنَاءِ وغیرہ محاورات ہیں۔ پھر بطور استعارہ معانی پر بھی بولا جاتا ہے جیسے عَقْدُ الْبَيْعِ سودے کو پختہ کرنا۔ عَقْدُ الْعَهْدِ: محکم عہد باندھنا وغیرہ، چنانچہ کہا جاتا ہے۔

عَاقَدْتُهُ وَعَقَدْتُهُ وَتَعَاقَدْنَا وَعَقَدْتُ يَمِينَهُ میں نے اس سے پختہ عہد و پیمان باندھا۔ قرآن پاک میں ہے۔ ﴿عَاقَدْتُ أَيْمَانُكُمْ﴾ (۳۳-۴) جن لوگوں سے تم نے پختہ عہد باندھ رکھے ہوں۔

ایک قراءت میں عَقَدْتُ أَيْمَانُكُمْ ہے۔ نیز فرمایا۔ ﴿بِمَا عَقَدْتُمُ الْإِيمَانَ﴾ (۵-۸۹) پختہ قسموں پر ایک قراءت میں عَقَدْتُمُ الْإِيمَانَ ہے۔ اسی سے لِفُلَانٍ عَقِيدَةٌ کا محاورہ ہے جس کے معنی پختہ یقین کے ہیں الْعِقْدُ (گلے کا ہار) اور الْعَقْدُ یہ اصل میں مصدر ہیں اور بطور اسم کے استعمال ہوتے ہیں۔ اس کی جمع عُقُودٌ آتی ہے، چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔

﴿أَوْفُوا بِالْعُقُودِ﴾ (۵-۱) اپنے اقراروں کو پورا کرو۔ الْعُقُودُ: نکاح، عہد و پیمان وغیرہ جو پختہ کیا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَلَا تَعْزِمُوا عُقْدَةَ النِّكَاحِ﴾ (۲-۲۳۵) اور

پرند کا کبھی اوپر چھڑھنا اور کبھی نیچے اترنا۔ أَعْقَبَهُ كَذًا: کسی چیز کا وارث بنادینا ایک چیز کی جگہ دوسری چیز کو اس کا جانشین بنانا۔ قرآن پاک میں ہے۔ ﴿فَأَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا﴾ (۹-۷۷) تو خدا نے..... ان کے (دلوں میں) نفاق ڈال دیا۔ شاعر نے کہا ہے۔ ﴿الطَّوِيلِ﴾

(۳۱۸) لَهُ طَائِفَةٌ مِنْ جَنَّةٍ غَيْرُ مُعَقِّبٍ یعنی اسے جنوں کا دورہ پڑتا ہے جس کے بعد افاقہ نہیں ہوتا۔

فُلَانٌ لَمْ يُعَقِّبْ: اس نے اولاد نہیں چھوڑی اور أَعْقَابُ الرَّجُلِ کے معنی آدمی کی اولاد کے ہیں اہل لغت کا قول ہے کہ اس کے تحت لڑکی کی اولاد نہیں آتی کیونکہ وہ نسباً اس کی جانشین نہیں ہوتی لیکن ذُرِّيَّةً کے لفظ میں لڑکی کی اولاد بھی داخل ہوتی ہے۔ اِمْرَأَةٌ مُعَقَّابٌ: وہ عورت جو ایک بار لڑکا اور دوسری بار لڑکی بنے عَقَبْتُ الرُّمَحَ کے معنی نیزے کو عقب یعنی پالان کے پچھلے حصہ کے ساتھ باندھ دیا۔ جیسے عَصْبَتُهُ کے معنی ہیں میں نے اسے عَصَبٌ یعنی تانت سے باندھ دیا أَلْعَقْبَةُ پہاڑ پر چڑھنے کا دشوار گزار راستہ اس کی جمع عُقْبٌ وَعِقَابٌ ہے اور شاہین کو بھی عُقَابٌ کہا جاتا ہے کیونکہ شکار کا

تغائب کرتا ہے اور تشبیہ کے طور پر عُقَابٌ کا لفظ (۱) جھنڈے (۲) کنوئیں کے پتھر جس پر پانی پلانے والا کھڑا ہوتا ہے اور (۳) کان کی بالی کے دھاگے پر بھی بولا جاتا ہے۔ أَلْيَعْقُوبُ: مذکر چکور۔ کیونکہ اس کی عادت یہ ہے کہ ایک مرتبہ دوڑنے کے بعد ٹھہر جاتا ہے اور پھر

① قاله امرء القيس يصف فرساً وأوله يخضلني الآرى حتى كانه - والبيت في اللسان (عقب) وفي رواية الديوان ۸ وصناعة السندوبى به عشرة اوطاف غير معقب والبيت في العقد الثمين (۱۸) او الفائق (۱۷۶/۱) وكتاب الخيل لابی عبيدة (۱۳۸) وفي رواية كانما بديل كانه

..... نکاح کا پختہ ارادہ نہ کرنا۔

عُقْدَ لِسَانَهُ: اس کی زبان پر گرہ لگ گئی۔ فِی لِسَانِهِ عُقْدَةٌ: اس کی زبان میں لکنت ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔ ﴿وَأَجْلَلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِي﴾ (۲۰-۲۷) اور میری زبان کی گرہ کھول دے۔

اور آیت کریمہ۔

﴿وَمِنْ شَرِّ السَّعَیِّتِ فِی الْعُقَدِ﴾ (۱۱۳-۱۲) اور گرہوں پر پڑھ کر پھونکنے والیوں کی برائی سے۔ میں عُقْدٌ عُقْدَةٌ کی جمع ہے یعنی وہ گرہیں جو جادوگر عورتیں لگاتی ہیں۔ دراصل اس کے معنی عَزِیمَةٌ کے ہیں اس لیے اس پر عُقْدَةٌ اور عَزِیمَةٌ دونوں کا استعمال ہوتا ہے اور جادوگر کو مُعَقِّد بھی کہا جاتا ہے۔

لَهُ عُقْدَةٌ مُّلْکٍ: اس کے ہاتھ میں ملک کی باگ ڈور ہے۔ نَاقَةٌ عَاقِدَةٌ وَعَاقِدٌ: وہ اونٹنی جس کی دم گرہ دار ہو جائے اور یہ اس بات کی علامت ہوتی ہے کہ وہ نرسے جفتی کی خواہش مند ہے۔

تَبَسَّسَ وَكَلَبَ أَعْقَدُ: نرساٹ یا کتا جس کی دم لپٹی ہوئی ہو۔

تَعَاقَدَتِ الْكِلَابُ: کتوں کا آپس میں جفتی کرنا۔

## (ع ق ر)

الْعُقُورُ کے معنی حوض یا مکان کے اصل اور وسط کے ہیں

اور اسے عَقْرٌ بھی کہتے ہیں حدیث میں ہے۔ ﴿(۳۶) مَا عَزَى قَوْمٌ فِی عَقْرِ دَارِهِمْ قَطُّ إِلَّا ذَلُّوا﴾ کہ کسی قوم پر ان کے گھروں کے وسط میں حملہ نہیں کیا جاتا مگر وہ ذلیل ہو جاتی ہیں اور قَصْرٌ یعنی محل کو عُقْرَةٌ کہا جاتا ہے۔ عَقْرَتُهُ اس کی عَقْرٌ یعنی جڑ پر مارا۔ جیسا کہ رَأْسَتُهُ کے معنی ہیں۔ میں نے اس کے سر پر مارا۔ اسی سے عَقْرَتُ النَّخْلِ ہے جس کے معنی ہیں: میں نے کھجور کے درخت کو جڑ سے کاٹ دیا۔ عَقْرَتُ الْبَعِیْرِ: اونٹ کی کوچیں کاٹ دیں، اسے ہلاک کر دیا۔ عَقْرَتُ ظَهَرِ الْبَعِیْرِ: اونٹ کی پشت کو زخمی کر دیا اِنْعَقَرَ ظَهْرُهُ: اس کی پیٹھ زخمی ہوگئی۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿فَعَقَرُوا وَهَاقَالًا تَمَتَّعُوا فِی دَارِکُمْ﴾ (۱۱-۲۵) مگر انھوں نے اس کی کوچیں کاٹ ڈالیں تو صالح علیہ السلام نے کہا کہ اپنے گھروں میں ..... فائدہ اٹھا لو۔

﴿فَتَعَاطَى فَقَعَرٌ﴾ (۵۳-۲۹) تو اس نے جسارت کر کے اونٹنی کو پکڑا اور اس کی کوچیں کاٹ ڈالیں اور اسی سے بطور استعارہ کہا جاتا ہے۔

سَرَجٌ مُّعَقَّرٌ: زخمی کر دینے والی زین۔

کَلَبٌ عَقُورٌ: کاٹ کھانے والا کتا، درندہ جانور رَجُلٌ عَاقِرٌ: بانجھ مرد۔

اِمْرَءَةٌ عَاقِرٌ: بانجھ عورت۔ گویا وہ مرد کے نطفہ کو قطع کر دیتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

① فالمراد من النفاثات السواحر کذا ذکره القتی فی المشکل وغریبه و سائر اصحاب التفاسیر (۲۰/۳۵۳)

② قاله علی رضی اللہ عنہ فی خطبہ خطبہا فی تعیلہ جالساً علی السدة حین بلغه ان خیلا المعامیة رضی اللہ عنہ قتل عامله حسان بن حسان البکری وکان علی الانبار فقتله سفیان بن عوف الاسدی فی غارة (بیان والتبیین) (۲۰/۲۵) والکامل للمبرد (۲۰/۲۱) والعقد الفرید (۶۹/۷۰) کذافی الاغانی (۱۵: ۴۵) والصحیح ان اسمه اشرس بن حسان البکری کما فی الطبری وخطبته هذه مشهورة ۱۲

(۲) وَلَا يَنْفَعُ مَسْمُوعٌ - إِذْ أَلَمَ بِكَ مَطْبُوعٌ -

(۳) كَمَا لَا يَنْفَعُ ضَوْءُ الشَّمْسِ وَضَوْءُ الْعَيْنِ مَسْمُوعٌ کہ عقل دو قسم پر ہے۔ (۱) عقل طبعی یعنی جو

طبیعت میں ودیعت کی گئی ہے اور (۲) عقل سمعی یعنی وہ جو لوگوں سے باتیں سن کر حاصل ہوتی ہے۔

(۲) اگر کوئی شخص فطرۃ عقل سے کورا ہو تو سن کر حاصل کی ہوئی عقل اسے کچھ فائدہ نہیں بخشتی۔

(۳) جیسا کہ سورج کی روشنی اندھے آدمی کے لیے بے فائدہ ہوتی ہے۔

عقل کے پہلے معنی کی طرف آنحضرت ﷺ نے ایک حدیث میں اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔ ⑤ (۴۷)

مَا خَلَقَ اللَّهُ خَلْقًا أَكْرَمَ عَلَيْهِ مِنَ الْعَقْلِ (اللہ تعالیٰ نے کوئی ایسی مخلوق پیدا نہیں کی جو اس کے

نزدیک عقل سے زیادہ باعزت ہو)۔ اور دوسرے معنی کی طرف آنحضرت ﷺ کے ارشاد میں اشارہ پایا جاتا

ہے۔ ⑥ (۴۷) (( مَا كَسَبَ أَحَدٌ شَيْئًا أَفْضَلَ مِنْ عَقْلٍ يَهْدِيهِ إِلَى هُدًى أَوْ يَرُدُّهُ عَنْ رَدًى )) کہ

کسی شخص نے اس عقل سے بڑھ کر کوئی چیز حاصل نہیں کی جو انسان کی رہنمائی کرے یا اسے ہلاکت سے بچائے۔

﴿وَأَمْرًا تَبَىٰ عَاقِرٌ﴾ (۳-۴) اور میری بیوی بانجھ ہے۔

﴿وَكَاَنَتْ أَمْرًا تَبَىٰ عَاقِرًا﴾ (۱۹-۵) اور میری بیوی بانجھ ہے۔

قَدْ عَقِرَتْ: وہ بانجھ ہو گئی۔ الْعَقَرُ: آخری بچہ بِيَضَةُ الْعُقْرِ: آخری اندا۔ عَقَارٌ: (پرانی) شراب۔

کیونکہ وہ عقل کو قطع کر دیتی ہے۔ الْمَعَاوَرَةُ کے معنی ہیں: شراب نوشی کا عادی ہونا اور قَصْرُ کے ساتھ تشبیہ

دے کر بکریوں کی ٹکڑی کو بھی عُقْرُ کہا جاتا ہے۔ رَفَعَ فَلَانٌ عَقِيرَتَهُ: فلاں نے آواز بلند کی مروی ہے

کہ ایک آدمی کی ٹانگ کٹ گئی وہ چلایا تو اس وقت سے بطور استعارہ عَقْرُ کا لفظ بلند آواز کے معنی میں استعمال

ہونے لگا ہے۔ عَقَائِرُ جڑی بوٹیاں۔ اس کا واحد عَقَارٌ ہے۔

## (عقل)

الْعَقْلُ: اس قوت کو کہتے ہیں جو قبول علم کے لیے تیار رہتی ہے اور وہ علم جو اس قوت کے ذریعے حاصل کیا جاتا ہے۔

اسے بھی عقل کہہ دیتے ہیں۔ چنانچہ امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ⑤ (ہرج)

(۳۱۹) (۱) الْعَقْلُ عَقْلَان - مُطْبُوعٌ مَسْمُوعٌ

① كَذَا فِي الْأَحْيَاء (۱۶/۳) وَفِي أدب الدنيا والدين للماوردي (۱۳۱) ايضاً معزوة لعلي رضي الله عنه والايات في روضة العقلاء للبهسي بغير عزرو وفي رواية رأيت العقل نوعين وتقسم العقل من كلام سيبورين اردشير وفيه فاحذه بعض الشعراء فقال الخ وامانسية لايات الى على رضي الله عنه علم احققها

② الحديث أخرجه الترمذي الحكيم في نوادره باسناد ضعيف والأحياء (۱۶/۳) بتخريج العراقي وباختلاف عن امامة (الطبراني) وابو نعيم من حديث عائشة وفي رواية ابن عساكر عن معاذ قل من العقل بدل اكرم انظر كنز العمال (ج ۳ رقم ۱۹۱۲) وفي الابي (ج ۱ ص ۱۲۹-۱۳۲) بطرق ماخلفت خلقا احسن منك ولا اكرم

③ والحديث بالفاظه (هب عن عمر) الا ابن مالك كسب مكان ما كسب كنز العمال (ج ۳ رقم ۱۹۱۰) وفي تخريج العراقي أخرجه المعرفي العقل



چنانچہ آیت کریمہ۔

﴿وَمَا يَعْقِلُهَا إِلَّا الْعَالِمُونَ﴾ (۲۹-۴۳) اور اسے تو اہل دانش ہی سمجھتے ہیں۔

میں اسی معنی کے اعتبار سے عقل کی نفی کی گئی ہے۔ اور ہر وہ جگہ جہاں اللہ تعالیٰ نے فقدان عقل کی وجہ سے کفار کی مذمت فرمائی ہے وہاں دوسرے معنی ہی مراد ہیں۔ جیسے فرمایا۔

﴿وَمَثَلُ الَّذِينَ كَفَرُوا كَمَثَلِ الَّذِي يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ إِلَّا دُعَاءً وَنِدَاءً، صُمٌّ بِكُمُّ عَمَىٰ فَهْمٌ لَا يَعْقِلُونَ﴾ (۲-۱۷۱) جو کافر ہیں، ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جو کسی ایسی چیز کو آواز دے جو پکار اور آواز کے سوا کچھ نہ سن سکے، بہرے ہیں، گونگے ہیں اور اندھے ہیں کہ کچھ سمجھ ہی نہیں سکتے۔

علاوہ ازیں اور بھی بہت سی آیات ہیں جن میں کفار سے عقل کی نفی کی گئی ہے اور جس مقام پر عقل نہ ہونے پر انسان کو غیر مکلف قرار دیا گیا ہے۔ وہاں عقل کے اول معنی کی طرف اشارہ ہے۔

در اصل الْعَقْلُ کے معنی روکنا اور منع کرنا ہیں جیسے عَقَالٌ یعنی پائے بند سے اونٹ کا پاؤں باندھ دینا اور دوا کے پیٹ میں قبض کرنے کو بھی عَقْلٌ یعنی پائے بند سے اونٹ کا پاؤں باندھ دینا اور دوا کے پیٹ میں قبض کرنے کو بھی عَقْلٌ کہتے ہیں۔ عَقَلَتِ الْمَرْءَةُ شَعْرَهَا عورت نے اپنے بال باندھ لیے۔ عَقَلَ لِسَانَهُ اس نے اپنی زبان روک لی اسی سے حصین یعنی قلعہ کو مَعْقِلٌ

کہا جاتا ہے اس کی جمع مَعَاقِلُ ہے اور عَقْلُ الْبَعِيرِ سے عَقَلْتُ الْمَقْتُولَ کا محاورہ ہے۔ جس کے معنی ہیں:

مقتول کی دیت ادا کرنا۔ بعض نے کہا ہے کہ عَقَلْتُ الْمَقْتُولَ کے اصل معنی ہیں ولی الدم یعنی مقتول کے وارثوں کے گھر کے صحن میں اونٹ باندھنا مگر بعض کہتے ہیں: نہیں بلکہ اس کے معنی خوزریزی روکنے کے ہیں۔ پھر مطلق خون بہا کو عَقْلُ کہا جانے لگا ہے خواہ کوئی چیز دی

جائے اور جو رشتے دار قاتل کی طرف سے دیت کا بوجھ اٹھاتے ہیں، انہیں عَاقِلَةٌ کہا جاتا ہے۔ عَقَلْتُ عَنْهُ: کسی کی طرف سے خون بہا ادا کرنا۔ دَمُهُ مُعَقَّلَةٌ عَلَى قَوْمِهِ: اس کے خون بہا کا تاوان اس کی قوم پر ہے۔ اَعْتَقَلَهُ بِالشَّعْرِ بَيْتًا اسے پچا لگا کر پچھاڑ دیا۔

اَعْتَقَلَ رُمْحَهُ بَيْنَ رِكَابِهِ وَسَاقِهِ: اس نے نیزے کو اپنی رکاب اور پنڈلی کے درمیان رکھ لیا بعض نے کہا ہے کہ اَلْعَقَالُ کے معنی ایک سال کے صدقہ کے ہیں۔ چنانچہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کا قول ہے ﴿۲۸﴾

لَوْ مَنَعُونِي عَقَالًا لَقَاتَلْتُهُمْ: کہ اگر وہ ہمیں ایک سال کا صدقہ بھی نہ دیں گے تو میں ان سے جنگ کروں گا اور جب کوئی شخص اونٹ نہ لے اور ان کی بجائے نقدی وصول کرے تو عرب کہتے ہیں: اَخَذَ النَّفْدَ وَلَمْ يَأْخُذْ اِلْعِقَالِ مگر جب عَقَال کا لفظ صدقہ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے تو یہ یا تو عَقَالُ بمعنی پائے بند بول کر کنایۃ اونٹ مراد لیے جاتے ہیں اور یا اونٹ بمعہ ان کی رسیوں کے مراد ہوتے ہیں اور یا یہ عَقَلْتُهُ عَقْلًا

① وفي المطبوع دية مصحف والتصويب من المعاجم

② كلمة من الحديث في قتال أبي بكر أصحاب الردة رواه اصحاب السنة والحديث في الفائق ۷۸۷۲

مفعول ہو جیسا کہ اَلْعَجُوزُ الْعَقِيمُ میں ہے اس صورت میں رِيحٌ عَقِيمٌ کے معنی ہوں گے وہ ہوا جو کسی چیز کا اثر اپنے اندر نہ رکھتی ہو چونکہ ایسی ہوا نہ کسی چیز کے اثر کو قبول کرتی ہے اور نہ کسی سے متاثر ہوتی ہے اس لیے نہ وہ کچھ دیتی ہے اور نہ ہی کسی چیز پر اثر انداز ہوتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:-

﴿إِذَا رَسَلْنَا عَلَيْهِمُ الرِّيحَ الْعَقِيمَ﴾ (۵۱-۴۱)

جب ہم نے ان پر خشک ہوا چلائی۔  
يَوْمَ عَقِيمٍ سخت دن، جس میں کسی قسم کا سامانِ فرحت نہ ہو۔ ❶

### (ع ک ف)

اَلْعَكُوفُ: کے معنی ہیں۔ تعظیماً کسی چیز پر متوجہ ہونا اور اس سے وابستہ رہنا۔ اور اصطلاح شریعت میں اَلْاِعْتِكَافُ کے معنی ہیں: عبادت کی نیت سے مسجد میں رہنا اور اس سے باہر نہ نکلنا۔ قرآن پاک میں ہے:-  
﴿وَأَنْتُمْ عَاكِفُونَ فِي الْمَسَاجِدِ﴾ (۸۱-۲) جب تم مسجدوں میں اعتکاف بیٹھے ہو۔

﴿سَوَاءٌ لَّكَ الْعَاكِفُ فِيهِ وَالْبَادِ﴾ (۲۲-۲۵) خواہ وہ وہاں کے رہنے والے ہوں یا باہر سے آنے والے۔  
﴿وَالْعَاكِفِينَ﴾ (۲-۱۲۵) اور اعتکاف کرنے والوں۔

﴿فَنَظَّلُ لَهَا عَاكِفِينَ﴾ (۲۶-۷۱) اور اس کی پوجا پر قائم رہیں۔

عَكَفَتْهُ عَلَى كَذَا: کسی چیز پر روک رکھنا۔

﴿يَعْرِكُفُونَ عَلَى أَصْنَامٍ لَهُمْ﴾ (۷-۱۳۸) یہ اپنے

وَعَقَالاً کا مصدر ہوتا ہے جس کے معنی باندھنا کے ہیں، جیسے كِتَابٌ کہ اصل میں كَتَبْتُ کا مصدر ہے مگر کبھی بمعنی مکتوب آجاتا ہے۔ اسی طرح عَقَال بول کر مَعْقُول مراد لیتے ہیں یعنی وہ جانور جو کوفہ میں وصول کیا جائے۔

اَلْعَقِيلَةُ: وہ (خوبصورت) عورت یا موتی جسے حفاظت سے چھپا کر رکھا جاتا ہے۔ جیسا کہ اعلیٰ درجہ کی چیز کو عِلْقُ مُضِنَّہ کہا جاتا ہے۔ اَلْمَعْقِلُ: (پناہ گاہ) پہاڑ یا قلعہ جس میں پناہ لی جاتی ہے اَلْعُقَّالُ: ایک بیماری جو گھوڑے کے پاؤں میں پیدا ہو جاتی ہے اَلْعَقْلُ کے معنی چلتے وقت پاؤں کا باہم ٹکرانا کے ہیں۔

### (ع ق م)

اَلْعُقْمُ: اصل میں اس خشکی کو کہتے ہیں جو کسی چیز کا اثر قبول کرنے سے مانع ہو۔ چنانچہ محاورہ ہے۔ عَقَمْتُ مَفَاصِلَهُ: (اس کے جوڑ بند خشک ہو گئے) دَاءُ عُقَامٌ لاعلاج مرض۔ اَلْعَقِيمُ: (بانجھ) وہ عورت جو مرد کا مادہ قبول نہ کرے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے۔ عَقَمَتِ الْمَرْثَةُ أَوِ الرِّجْمُ: عورت بانجھ ہو گئی یا رحم خشک ہو گیا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿فَصَكَّتْ وَجْهَهَا وَقَالَتْ عَجُوزٌ عَقِيمٌ﴾ (۵۱-۲۹) اور اپنا منہ لپیٹ کر کہنے لگی کہ (اے) ہے ایک تو بڑھیا (دوسرے) بانجھ۔

اور رِيحٌ عَقِيمٌ (خشک ہوا) میں یہ بھی ہو سکتا کہ فاعل بمعنی فاعل ہو۔ یعنی وہ ہوا جو بادلوں کو ساتھ نہیں لاتی یا درخت کو باردار نہیں کرتی اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ فاعل بمعنی

اور آیت کریمہ۔

﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ﴾ (۱) کے آخر میں فرمایا۔  
﴿فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً﴾ (۱۳-۲۳) پھر تو تھڑے  
کی بوٹی بنائی۔

الْعَلَقُ: اس عمدہ چیز کو کہتے ہیں جس کے ساتھ مالک کا دل  
چمٹا ہوا ہو اور اس کی محبت دل سے اترتی نہ ہو اَلْعَلِيقُ:  
جو وغیرہ جو سفر میں جانور کے کھانے کے لیے اس پر باندھ  
دیتے ہیں اور اَلْعَلِيقَةُ اس اونٹ کو کہتے ہیں جو دوسروں  
کے ساتھ بھیجا جائے۔ شاعر نے کہا ہے۔ (رجز)

(۳۲۰) أَرْسَلَهَا عَلِيقَةً وَقَدْ عَلِمَ

أَنَّ الْعَلِيقَاتِ يَلَاقِينَ الرَّقْمَ

اس نے غلہ لینے کے لیے لوگوں کے ساتھ اپنا اونٹ بھیج دیا  
حالانکہ اسے معلوم تھا کہ دوسروں کے ساتھ بھیجے ہوئے  
اونٹ نکالیف سے دوچار ہوتے ہیں۔

اَلْعَلُوقُ: وہ اونٹنی جو اپنے بچے پر مہربان ہو اور اس سے  
لپٹی رہے اور موت کو بھی عَلُوقُ کہا جاتا ہے۔ اَلْعَلِيقُ:  
درخت جس میں انسان الجھ جائے تو اس سے نکلنا مشکل ہو  
عَلِيقَتِ الْمَرْءِ: عورت حاملہ ہوگئی۔

رَجُلٌ مِغْلَاقٌ: جھگڑاؤ آدمی جو اپنے مخالف کا پیچھا نہ  
چھوڑے اور اس سے چمٹا رہے۔

## (ع ل م)

اَلْعِلْمُ: کسی چیز کی حقیقت کا ادراک کرنا۔ اور یہ دو قسم پر  
ہے اول یہ کہ کسی چیز کی ذات کا ادراک کر لینا: دوم ایک  
چیز پر کسی صفت کے ساتھ حکم لگانا جو (فی الواقع) اس کے

بتوں کی عبادت کے لیے بیٹھے رہتے تھے۔

﴿ظَلَمْتُ عَلَيْهِ عَاكِفًا﴾ (۲۰-۹۷) جس معبود کی پوجا  
پر تو قائم اور مستکف تھا۔

﴿وَالْهَذَى مَعْكُوفًا﴾ (۲۸-۲۵) اور قربانی کے  
جانوروں کو بھی کہ روک دیئے گئے ہیں۔

## (ع ل ق)

اَلْعَلَقُ کے معنی کسی چیز میں پھنس جانے کے ہیں کہا جاتا  
ہے عَلِقَ الصَّيْدُ فِي الْحَبَالَةِ: شکار جال میں پھنس  
گیا اور جب کسی کے جال میں شکار پھنس جائے تو کہا جاتا  
ہے اَعْلَقَ الصَّائِدُ اَلْمِعْلَقُ وَالْمِعْلَاقُ: ہر وہ چیز  
جس کے ساتھ کسی چیز کو لٹکایا جائے اسی طرح عِلَاقَةُ  
السَّوِطِ وَعَلَقُ الْفَرَبَةِ: اس رسی یا تسمہ کو کہتے ہیں جس  
سے کوڑے کو یا مشک کا منہ باندھ کر اسے لٹکا دیا جاتا ہے۔  
عَلَقُ الْبَكْرَةِ: وہ بکری وغیرہ جس پر کنویں کی چرخی لگی  
رہتی ہے۔ اسی سے اَلْعَلَقَةُ ہر اس چیز کو کہا جاتا ہے جسے  
سہارا کے لیے پکڑا جاتا ہے۔ عَلِقَ دَمُ فُلَانٍ بِزَيْدٍ  
فُلَانٌ کا خون زید کے ساتھ چمٹ گیا یعنی زید اس کا قاتل  
ہے۔

اَلْعَلَقُ: (جو تک) ایک قسم کا کیڑا جو خلق کے ساتھ وابستہ  
ہو جاتا ہے۔ نیز جما ہوا خون، اسی سے تو تھڑے کی قسم کے  
خون کو عَلَقَہ کہا جاتا ہے جس سے بچہ بنتا ہے۔ قرآن  
پاک میں ہے۔

﴿خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ﴾ (۹۶-۲) جس نے  
انسان کو خون کے تو تھڑے سے بنایا۔

① قاله الرازي والرقم الداهية والمصيبة الذليل للقالی ۶۳ مبحث اسماء الداهية والرجز ایضاً فی اصلاح المنطق ۳۴۳، ۳۴۷  
والمحکم واللسان (علق)

بعض نے کہا ہے کہ تَعْلِيمُ کے معنی تصور کے لیے نفس کو متوجہ کرنا کے ہیں اور تَعَلَّمَ کے معنی ایسے تصور کی طرف متوجہ ہونا کے اور کبھی تَعْلِيمُ کا لفظ اِغْلَام کی جگہ آتا ہے کہ جب اس میں تاکید کے معنی مقصود ہوں جیسے فرمایا۔  
﴿أَتَعْلَمُونَ اللَّهَ بِدِينِكُمْ﴾ (۱۶-۲۹) کیا تم خدا کو اپنی دینداری جتلاتے ہو۔

اور حسب ذیل آیات میں تَعْلِيمُ کا لفظ استعمال ہوا ہے جیسے فرمایا۔

﴿الرَّحْمَنُ عَلَّمَ الْقُرْآنَ﴾ (۵۵-۲) خدا جو نہایت مہربان، اس نے قرآن کی تعلیم فرمائی۔

﴿عَلَّمَ بِالْقَلَمِ﴾ (۹۶-۲) قلم کے ذریعہ (لکھنا) سکھایا۔  
﴿وَعَلَّمْتُمْ مَا لَمْ تَعْلَمُوا﴾ (۹۲-۶) اور تم کو وہ باتیں سکھائی گئیں جن کو نہ تم جانتے تھے.....

﴿عَلَّمَنَا مَنَظِقَ الطَّيْرِ﴾ (۲۷-۱۶) ہمیں خدا کی طرف سے جانوروں کی بولی سکھائی گئی ہے۔

﴿وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ﴾ (۱۶۳-۳) اور خدا کی کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتے ہیں۔

اور آیت کریمہ۔

﴿وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا﴾ (۳۱-۲) اور اس نے آدم علیہ السلام کو سب چیزوں کے نام سکھائے۔

میں آدم علیہ السلام کو اسماء کی تعلیم دینے کے معنی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کے اندر بولنے کی صلاحیت اور استعداد رکھ دی جس کے ذریعہ اس نے ہر چیز کے لیے ایک نام وضع کر لیا یعنی اس کے دل میں القا کر دیا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے حیوانات کو ان کے کام سکھادیئے ہیں جسے وہ سرانجام

لیے ثابت ہو یا ایک چیز کی دوسری چیز سے نفی کرنا جو (فی الواقع) اس سے منفی ہو۔ پہلی صورت میں یہ لفظ متعدی بیک مفعول ہوتا ہے۔

جیسا کہ قرآن پاک میں ہے۔

﴿لَا تَعْلَمُونَهُمُ اللَّهُ يَعْلَمُهُمْ﴾ (۸-۶۰) جن کو تم نہیں جانتے اور خدا جانتا ہے۔

اور دوسری صورت میں دو مفعول کی طرف متعدی ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا۔

﴿فَإِنْ عَلِمْتُمُوهُنَّ مَوَاقِبَ﴾ (۶۰-۱۰) اگر تم کو معلوم ہو کہ مومن ہیں۔

اور آیت ﴿يَوْمَ يَجْمَعُ اللَّهُ الرُّسُلَ﴾ کے آخر میں ﴿لَا يَعْلَمُ لَنَا﴾ (۵-۱۰۹) سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان کے ہوش و حواس قائم نہیں رہیں گے۔ ایک دوسری حیثیت سے علم کی دو قسمیں ہیں (۱)

نظری (۲) عملی۔ نظری وہ ہے جو حاصل ہونے کے ساتھ ہی مکمل ہو جائے جیسے وہ علم جس کا تعلق موجودات عالم سے ہے اور علم عملی وہ ہے جو عمل کے بغیر تکمیل نہ پائے جیسے عبادات کا علم ایک اور حیثیت سے بھی علم کی دو قسمیں ہیں۔ (۱) عقلی، یعنی وہ علم جو محض عقل سے حاصل نہ ہو بلکہ بذریعہ نقل و سماعت کے حاصل کیا جائے دراصل ہوسکے (۲) سمعی یعنی وہ علم جو محض عقل سے حاصل

اَعْلَمْتُهُ وَعَلِمْتُهُ کے ایک معنی ہیں مگر اِغْلَام جلدی سے بتا دینے کے ساتھ مختص ہے اور تَعْلِيمُ کے معنی بار بار کثرت کے ساتھ خبر دینے کے ہیں۔ حتیٰ کہ متعلم کے ذہن میں اس کا اثر پیدا ہو جائے۔

علم والے سے دوسرا علم والا بڑھ کر ہے۔

میں عَلِيم کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ علم و فضل کے اعتبار سے ایک انسان دوسرے سے بڑھ کر ہے۔ عَلِيم صیغہ مبالغہ لا کر اس علمی فضیلت کو بیان کرنے سے مقصد یہ ہے کہ ہر شخص اپنے سے کم درجہ کے اعتبار سے عَلِيم ہے گواپنے سے بلند درجہ عالم کے اعتبار سے ایسا نہیں ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ عَلِيم سے ذات باری تعالیٰ مراد ہو گو یہ لفظ نکرہ ہے کیونکہ درحقیقت اس صفت کے ساتھ موصوف ہونے کی اہل تو ذات باری تعالیٰ ہی ہے اس صورت میں کُلِّ ذِي عِلْم سے جملہ اہل علم بحیثیت مجموعی مراد ہوں گے اور ہر ایک بحیثیت انفرادی مراد نہیں ہوگا جیسا کہ پہلی صورت میں تھا۔ اور آیت کریمہ۔

﴿عَلَامُ الْغُيُوبِ﴾ (۳۴-۳۸) اور وہ غیب کی باتوں کا جاننے والا ہے۔

میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا علم ہر چیز پر حاوی ہے اور کوئی چیز بھی اس پر مخفی نہیں ہے اور آیت کریمہ۔

﴿عَالِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلَىٰ غَيْبِهِ أَحَدًا إِلَّا مَن ارْتَضَىٰ مِن رَّسُولٍ﴾ (۴۲-۴۶، ۲۶) وہی غیب کا جاننے والا ہے اور کسی پر اپنے غیب کو ظاہر نہیں کرتا ہاں جس پیغمبر کو پسند فرمائے۔ میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ذات باری تعالیٰ اپنے علم خصوصی سے صرف انہیں کو نوازتے ہیں جو اس کے اولیاء کی صف میں داخل ہوں اور الْعَالِمُ کا لفظ جب اللہ تعالیٰ کی صفت کی حیثیت سے بولا جاتا ہے تو اس سے مراد وہ ذات ہوتی ہے جس پر

دیتے رہتے ہیں اور آواز دی ہے جسے وہ نکالتے رہتے ہیں۔ اور آیت کریمہ۔

﴿وَعَلَّمْنَاهُ مِن لَّدُنَّا عِلْمًا، قَالَ لَهُ مُوسَىٰ هَلْ أَتَّبِعُكَ عَلَىٰ أَن تُعَلِّمَنِي مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا﴾ (۱۸-۲۵-۲۶) اور اپنے پاس سے علم بخشا تھا۔ موسیٰ علیہ السلام نے اس سے کہا کہ جو علم خدا کی طرف سے آپ کو سکھلایا گیا ہے اگر آپ مجھے اس میں سے کچھ رشد و ہدایت (کی باتیں) سکھا دیں تو میں آپ کے ساتھ رہوں۔ کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ اس سے ایک خاص علم مراد ہے جس پر انسان از خود واقف نہیں ہو سکتا اور جب تک اللہ تعالیٰ اس پر واقف نہ فرمائے لوگ اسے قابل انکار سمجھتے ہیں۔ کیونکہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام حضرت خضر کے ساتھ چلے تو جب تک انھوں نے ان واقعات کی حقیقت سے موسیٰ علیہ السلام کو باخبر نہیں کر دیا وہ ان باتوں کا انکار ہی کرتے رہے اور بعض نے کہا ہے کہ آیت کریمہ۔

﴿قَالَ الَّذِي عِنْدَهُ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتَابِ﴾ (۳۰-۴۰) ایک شخص جس کو کتاب الہی کا علم تھا کہنے لگا، میں بھی علم کے یہی معنی مراد ہیں یعنی جسے علم خصوصی حاصل تھا اور آیت۔

﴿وَالَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ﴾ (۵۸-۱۱) اور جن کو علم عطا کیا گیا ہے خدا ان کے درجے بلند کرے گا۔ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس بات پر تنبیہ کی گئی ہے کہ مراتب علم کے اعتبار سے علماء کے بھی مختلف درجے اور مرتبے ہیں اور آیت کریمہ۔

﴿وَفَوْقَ كُلِّ ذِي عِلْمٍ عَلِيمٌ﴾ (۱۲-۷۶) اور ہر

مراد ہوتا ہے۔

أَعْلَمْتُ كَذَا کے معنی کسی چیز پر نشان لگانا کے ہیں۔ اور مَعَالِمُ الطَّرِيقِ أَوِ الدِّينِ میں مَعَالِمُ کا واحد مَعْلَمٌ ہے اور مَعْلَمٌ اس نشان کو کہتے ہیں جس سے کسی چیز کی پہچان ہو سکے محاورہ ہے۔

فُلَانٌ مَعْلَمٌ لِلْخَيْرِ: فلاں خیر و برکت کا نشان ہے۔

الْعَلَامُ: مہندی۔ الْعَالَمُ: فلک الافلاک اور جن جواہر و اعراض پر وہ حاوی ہے سب کو الْعَالَمُ: کہا جاتا ہے دراصل یہ فَاعِلٌ کے وزن پر ہے جو اسم آلہ کے لیے استعمال ہوتا ہے جیسے طابَعٌ - مَا يُطْبَعُ بِهِ - مَا يَخْتَمُ بِهِ وغیرہ اسی طرح عَالَمٌ بھی ہے جس کے معنی ہیں مَاعِلِمٌ بِهِ یعنی وہ چیز جس کے ذریعہ کسی شے کا علم حاصل کیا جائے اور کائنات کے ذریعہ بھی چونکہ خدا کا علم حاصل ہوتا ہے اس لیے جملہ کائنات الْعَالَمُ کہلاتی ہے یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک نے ذات باری تعالیٰ کی وحدانیت کی معرفت کے سلسلہ میں کائنات پر غور کرنے کا حکم دیا ہے۔ چنانچہ فرمایا۔

﴿أَوَلَمْ يَنْظُرُوا فِي مَلَكُوتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ (۷-۱۸۵) کیا انھوں نے آسمان اور زمین کی بادشاہت پر غور نہیں کیا۔

اور الْعَالَمُ کی جمع (الْعَالَمُونَ) اس لیے بناتے ہیں کہ کائنات کی ہر نوع اپنی جگہ ایک مستقل عَالَمٌ کی حیثیت رکھتی ہے۔ مثلاً عَالَمُ الْاِنْسَانِ، عَالَمُ الْمَاءِ وَعَالَمُ النَّارِ وغیرہ۔ نیز ایک روایت میں ہے۔ ﴿۳۹﴾ ((اِنَّ لِلهِ بِضْعَةَ عَشَرَ اَلْفَ عِلْمٍ)) کہ اللہ تعالیٰ

کوئی چیز بھی مخفی نہ ہو۔ جیسے فرمایا۔

﴿لَا يَخْفٰی مِنْكُمْ خَافِيَةٌ﴾ (۶۹-۱۸) اور تمہاری کوئی پوشیدہ بات چھپی نہیں رہے گی۔

اور یہ مفہوم صرف ذات باری تعالیٰ کے حق میں ہی صحیح ہو سکتا ہے کسی دوسرے کو اس معنی کے ساتھ متصف کرنا صحیح نہیں ہے۔

الْعَلَمُ: ایسا نشان جس سے کوئی شے پہچانی جاسکے جیسے عَلَمُ الطَّرِيقِ: اس نشان کو کہتے ہیں جو راستہ کی پہچان کے لیے اس میں کھڑا کر دیا جاتا ہے اور فوج کے جھنڈے کو عَلَمُ الْجَيْشِ کہا جاتا ہے کیونکہ اس سے فوج کی پہچان ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ایک قراءت (میں عیسیٰ علیہ السلام) کو ﴿وَ اِنَّهٗ لَعَلَمٌ لِّلْسَاعَةِ﴾ (۳۳-۶۱) کہا گیا ہے یعنی وہ قیامت کی نشانی ہیں۔ اور اس معنی کے اعتبار سے پہاڑ کو بھی عَلَمٌ کہا جاتا ہے۔ اس کی جمع اَعْلَامٌ ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَمِنْ اٰيٰتِهٖ الْخَوَارِیْ فِی الْبَحْرِ کَاَلَاْعْلَامِ﴾ (۳۲-۳۲) اور اس کی نشانیوں میں سے سمندر کے جہاز ہیں جو گویا پہاڑ ہیں۔

اور دوسرے مقام پر فرمایا۔

﴿وَلَهُ الْخَوَارِیْ الْمُنَشَّتُ فِی الْبَحْرِ کَاَلَاْعْلَامِ﴾ (۵۵-۲۴) اور جہاز بھی اسی کے ہیں جو دریا میں پہاڑوں کی طرح اونچے کھڑے ہوتے ہیں۔ نیز اوپر کے ہونٹ کے شکاف اور کپڑے کے نقش و نگار کو بھی عَلَمٌ کہا جاتا ہے اور محاورہ ہے۔ فُلَانٌ عَلَمٌ فُلَانٍ مشہور۔ معروف ہے جھنڈے کے ساتھ تشبیہ کے اعتبار سے یہ معنی

آیت کریمہ۔

﴿وَأَنزَلْنَا فَضْلَنَا عَلَيْكَ عَلَى الْعَالَمِينَ﴾ (۲-۱۲۲) کے بعض نے یہ معنی کیے ہیں کہ تم یعنی بنی اسرائیل کو ان کی ہم عصر اقوام پر فضیلت دی اور بعض نے اس دور کے فضلاء مراد لیے ہیں جن میں سے ہر ایک نوازشات الہی کی بدولت بمنزلہ ایک عالم کے تھا اور ان کو عَالَمٌ سے موسوم کرنا ایسے ہی ہے جیسا کہ آیت کریمہ۔

﴿إِنَّ إِبْرَاهِيمَ كَانَ أُمَّةً﴾ (۱۶-۱۲۰) ”بے شک حضرت ابراہیم علیہ السلام ایک امت تھے۔“ میں حضرت علیہ السلام ابراہیم کو اُمّة کہا ہے۔

### (ع ل ن)

أَعْلَانِيَّةٌ: ظاہر اور آشکارا۔ یہ سیر کی ضد ہے اور عام طور پر اس کا استعمال معانی یعنی کسی بات کے ظاہر ہونے پر ہوتا ہے اور اجسام کے متعلق بہت کم آتا ہے۔ عَلَنٌ كَذًا کے معنی ہیں: فلاں بات ظاہر اور آشکارا ہو گئی اور أَعْلَنَتْهُ آتَا: میں نے اسے آشکارا کر دیا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿أَعْلَنْتُ لَهُمْ وَأَسْرَرْتُ لَهُمْ﴾ (۷۱-۹) میں انہیں برملا اور پوشیدہ ہر طرح سمجھاتا رہا۔

﴿مَا تَكُنْ صُدُورُهُمْ وَمَا يُعْلِنُونَ﴾ (۲۸-۲۹) جو کچھ ان کے سینوں میں مخفی ہے اور جو یہ ظاہر کرتے ہیں۔

عِلْوَانُ الْكِتَابِ: جس کے معنی کتاب کے عنوان اور سرنامہ کے ہیں، ہو سکتا ہے کہ یہ عَلَنٌ سے مشتق ہو اور عنوان سے چونکہ کتاب کے مشمولات ظاہر ہوتے ہیں اس لیے اسے عِلْوَانٌ کہہ دیا گیا ہو۔

نے دس ہزار سے کچھ اور پر عالم پیدا کیے ہیں باقی رہا یہ سوال کہ (وَإِنَّا لَنَعْلَمُ) اسے جمع سلامت کے وزن پر کیوں لایا گیا ہے (جو ذوی العقول کے ساتھ مختص ہے) تو اس کا جواب یہ ہے کہ عَالَمٌ میں چونکہ انسان بھی شامل ہیں اس لیے اس کی جمع، جمع سلامت لائی گئی ہے کیونکہ جب کسی لفظ میں انسان کے ساتھ دوسری مخلوق بھی شامل ہو تو تغلیباً اس کی جمع واؤنوں کے ساتھ بنا لیتے ہیں۔

بعض نے کہا ہے کہ چونکہ لفظ عَالَمٌ سے خلافت کی خاص قسم یعنی فرشتے، جن اور انسان ہی مراد ہیں جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔<sup>۱</sup> اس لیے اس کی جمع واؤنوں کے ساتھ لائی گئی ہے۔ امام جعفر رضی اللہ عنہ بن محمد کا قول ہے<sup>۲</sup> کہ عَالَمِينَ سے صرف انسان مراد ہیں اور ہر فرد بشر کو ایک عَالَمٌ قرار دے کر اسے جمع لایا گیا ہے۔ نیز انھوں نے کہا ہے کہ عَالَمٌ دو قسم پر ہے۔ (۱) أَلْعَالَمُ الْكَبِيرُ: یعنی فلک و مافیہ (۲) أَلْعَالَمُ الصَّغِيرُ: یعنی انسان، کیونکہ انسان کی تخلیق بھی ایک مستقل عَالَمٌ کی حیثیت سے کی گئی ہے اور اس کے اندر قدرت کے وہ دلائل موجود ہیں جو عالم کبیر میں پائے جاتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿أَوَلَمْ نَنهَكَ عَنِ الْعَالَمِينَ﴾ (۱۵-۷۰) کیا ہم نے تم کو سارے جہاں (کی حمایت و طرفداری سے) منع نہیں کیا۔

﴿إِلْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ﴾ (۱-۱) سب تعریف خدا ہی کو سزاوار ہے جو تمام مخلوقات کا پروردگار ہے۔ اور

① الفتح للشوکانی (۲/۱) وعن الفراء وأبو عبيد العالم عباده ممن يعقل وهم أربعة اسم الانس والجن والملائكة والشیاطین

② هو ابو عبد الله جعفر الصادق بن محمد الباقر سیدہاشم فی زمنہ وقد الف تلمیذہ جابر بن حیان الصوفی کتاباً منتظماً رسائلہ وہی

خمسمائة رسالة توفی ۱۴۸ھ راجع شذرات ۲۲۰/۱

## (ع و)

الْعُلُو: کسی چیز کا بلند ترین حصہ۔ یہ سُفْل کی ضد ہے ان کی طرف نسبت کے وقت عُلُوٌّ و سُفْلٌ کہا جاتا ہے اور اَلْعُلُوُّ بلند ہونا۔ عَال صفت فاعلی، بلند عَلٰی یَعْلٰی عَلَا عَلٰی مگر عَلَا (فَعَلَ) کا استعمال زیادہ تر کسی جگہ کے یا جسم کے بلند ہونے پر ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿عَالِيَهُمْ ثِيَابٌ سُنْدُسٌ﴾ (۷۶-۲۱) ان کے بدنوں پر دیا کے کپڑے ہوں گے۔

بعض نے عَلَا اور عَلٰی میں یہ فرق بیان کیا ہے کہ عَلَا (ن) محمود اور مذموم دونوں کے متعلق استعمال ہوتا ہے لیکن عَلٰی (س) صرف مستحسن معنوں میں بولا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿إِنَّ فِرْعَوْنَ عَلٰی فِی الْأَرْضِ﴾ (۲۸-۴) فرعون نے ملک میں سر اٹھا رکھا تھا۔

﴿لَعَالٍ فِی الْأَرْضِ وَإِنَّهُ لَمِنَ الْمُسْرِفِينَ﴾ (۱۰-۸۳) (اور فرعون) ملک میں متکبر اور مغرب اور (کبر و کفر میں) حد سے بڑھا ہوا تھا۔

﴿فَاسْتَكْبَرُوا وَكَانُوا قَوْمًا عَالِينَ﴾ (۲۳-۴۶) تو انھوں نے تکبر کیا اور وہ سرکش لوگ تھے۔

﴿أَسْتَكْبَرْتَ أَمْ كُنْتَ مِنَ الْعَالِينَ﴾ (۳۸-۷۵) کیا تو غرور میں آگیا یا اونچے درجے والوں میں تھا۔

﴿لَا يَرِ يَذُونُ عَلُوًّا فِی الْأَرْضِ﴾ (۲۸-۸۳) جو ملک میں ظلم اور فساد کا ارادہ نہیں رکھتے۔

﴿وَلَعَالَا بَعْضُهُمْ عَلٰی بَعْضٍ﴾ (۲۳-۹۱) اور

ایک دوسرے پر غالب آجاتا۔

﴿الَّا تَعْلَمُوا عَلٰی﴾ (۳۷-۳۱) کہ مجھ سے سرکش نہ کرو۔

﴿وَلَتَعْلَنَّ عَلُوًّا كَبِيرًا﴾ (۱۷-۴) اور بڑی سرکش کرو گے۔

﴿وَاسْتَفْتَيْنَاهَا أَنْفُسُهُمْ ظُلُمًا وَعُلُوًّا﴾ (۲۷-۱۲) اور بے انصافی اور غرور سے (ان کا انکار کیا) کہ ان کے دل ان کو مان چکے تھے۔

اَلْعُلُوُّ کے معنی بلند اور برتر کے ہیں یہ عَلٰی (بکسر اللام) سے مشتق ہے جب یہ لفظ اللہ تعالیٰ کی صفت واقع ہو، جیسے۔

﴿وَهُوَ اَلْعُلُوُّ الْكَبِيرُ﴾ (۳۴-۲۳)

﴿إِنَّ اَللَّهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيرًا﴾ (۴-۳۴) تو اس کے

معنی ہوتے ہیں وہ ذات اس سے بلند و بالاتر ہے کہ کوئی شخص اس کا وصف بیان کر سکے بلکہ عارفین کا علم بھی وہاں تک نہیں پہنچ سکتا۔ اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

﴿تَعَالٰی اَللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُونَ﴾ (۲۷-۶۳) یہ لوگ جو شرک کرتے ہیں خدا (کی شان) اس سے بلند ہے۔

اور یہاں تَعَالٰی باب تفاعل سے ہے جس کے معنی ہیں ”نہایت ہی بلند“ ورنہ یہاں تکلف کے معنی مقصود نہیں ہیں

جیسا کہ جب یہ لفظ انسان کے متعلق استعمال ہو تو یہ معنی مراد لیے جاتے ہیں اور آیت کریمہ۔

﴿وَتَعَالٰی عَمَّا يَقُولُونَ عَلُوًّا كَبِيرًا﴾ (۱۷-۴۳)

اور جو کچھ یہ بکواس کرتے ہیں اس سے (اس کا رتبہ) بہت عالی ہے۔



﴿أَأَنْتُمْ أَشَدُّ خَلْقًا أَمْ السَّمَاءُ بَنَاهَا﴾ (۷۹-۷۷) بھلا تمھارا بنانا آسان ہے یا آسمان کا؟ اسی نے اس کو بنایا۔ اور آیت کریمہ۔

﴿لَفِىْ عِلْمِیْنَ﴾ (۸۳-۱۸) علیمین میں ہیں۔ میں بعض نے کہا ہے کہ عِلْمِیْنَ جنت میں سب سے اعلیٰ مقام کا نام ہے جس طرح کہ سحین دوزخ میں سب سے زیادہ تکلیف دہ طبقہ کا نام ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ دراصل اس کا اطلاق جنتی لوگوں پر ہوتا ہے اور قواعد عربی کے لحاظ سے یہی معنی اقْرَبُ اِلٰی الصَّوْبِ معلوم ہوتے ہیں۔ کیونکہ یہ جمع (جمع سالم) ذوی العقول کے ساتھ مختص ہے اور یہ عِلْمِیٌّ بروزنِ بَطْنِیْخ کی جمع ہے اور معنی ہیں کہ ابراہیم عِلْمِیْنَ لوگوں کے زمرہ میں شامل ہوں گے۔ جیسے فرمایا۔

﴿فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ مِنْ النَّبِیِّیْنَ﴾ (۶۹-۴) آلایہ وہ (قیامت کے روز) ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے بڑا فضل کیا یعنی انبیاء اور صدیقین الخ..... اور معنی عُلُو کے لحاظ سے بلند مقام کو اور بلندی کو عُلِیَاء کہا جاتا ہے اور عُلِیَّةً اصل میں تو عَالِیَّة کی تصغیر ہے لیکن عرف میں بالا خانہ کو عُلِیَّة کہا جاتا ہے اس کی جمع عُلَالِیٌّ بروزنِ فَعَالِیْلُ ہے تَعَالٰی النَّهَارُ دن بلند ہو گیا۔ عَالِیَّة الرُّمُعِ سِنَانٌ (بڑے نیزے) سے چھوٹا نیزہ۔

عَالِیَّة الْمَدِیْنَةِ: مدینہ کی اعلیٰ جانب اس کی جمع عَوَال ہے اسی سے کہا گیا ہے۔ بُعِثَ اِلٰی اَهْلِ الْعَوَالِیِّ کہ اہل عوالی کو بلا بھیجا اور

میں لفظ عُلُو فعل تَعَالٰی کا مصدر نہیں ہے۔ جیسا کہ آیت۔

﴿اَنْتُمْ مِّنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا﴾ (۷۱-۱۷) اور ﴿وَتَبْتَلِ اِلَیْهِ تَبْتِیْلًا﴾ (۷۳-۱۸) میں نَبَاتًا اور تَبْتِیْلًا مصدر (مِنْ غَيْرِ بَابِهِ واقع ہوئے) ہیں۔ اَلَا عُلٰی۔ سب سے بلند اور اشرف۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿اَنَا رَبُّكُمْ اَلَا عُلٰی﴾ (۷۹-۲۳) کہ تمھارا سب سے بڑا مالک میں ہوں۔ اَلَا سْتَعْلَاؤُ: (استفعال) کبھی یہ مذموم غلبہ کی طلب کے لیے آتا ہے اور کبھی اس کے معنی طلبِ رفعت کے ہوتے ہیں اور آیت کریمہ۔

﴿قَدْ اَفْلَحَ الْیَوْمَ مَنْ اَسْتَعْلٰی﴾ (۲۰-۲۳) اور آج جو غالب رہا وہی کامیاب ہے۔

میں دونوں معنی مراد ہو سکتے ہیں۔ اور آیت کریمہ۔ ﴿سَبِّحْ اسْمَ رَبِّكَ اَلَا عُلٰی﴾ (۸۷-۱) پیغمبر) اپنے پروردگارِ جلیل القدر کے نام کی تسبیح کرو۔ پروردگار کے اَلَا عُلٰی ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اس کی ذات اس بات سے بلند ہے کہ کسی مخلوق کو اس پر قیاس کیا جائے یا اسے دوسروں کی طرح سمجھا جائے۔ اور آیت کریمہ۔

﴿وَالسَّمٰوٰتِ الْعُلٰی﴾ (۲۰-۲۱) اور اونچے اونچے آسمان بنائے۔

عُلٰی عُلِیًّا کی جمع ہے اور عُلِیًّا اَعْلٰی کی تانیث ہے اور معنی یہ ہیں کہ آسمان اس دنیا سے اشرف و افضل ہیں جیسے فرمایا:

﴿تَعَالَوْا إِلَى مَا أَنزَلَ اللَّهُ﴾ (۶۱-۳) جو حکم خدا نے نازل فرمایا ہے اس کی طرف رجوع کرو۔ اور..... آؤ۔

﴿الَّا تَعْلُوا عَلَيَّ﴾ (۳۱-۲۷) کہ مجھ سے سرکشی نہ کرو۔ ﴿تَعَالَوْا أَتْلُ﴾ (۱۵۱-۶) کہہ کہ (لوگو) آؤ میں (تمہیں) پڑھ کر سناؤں۔

تَعَلَّى: بلندی پر چڑھ گیا۔ دور چلا گیا۔ کہا جاتا ہے عَلَيَّتُهُ فَتَعَلَّى: میں نے اسے بلند کیا، چنانچہ وہ بلند ہو گیا۔

### عَلَى

عَلَى: یہ حروف جارہ سے ہے مگر کبھی بطور اسم کے استعمال ہوتا ہے جیسے عَدَتْ مِنْ عَلَيَّ: اس پر اوپر کی جانب سے حملہ گیا۔

### (ع م م)

الْعَمُّ: (چچا) باپ کا بھائی (جمع اَعْمَامُ) الْعَمَّةُ (پھوپھی) باپ کی بہن (جمع عَمَّات) قرآن پاک میں ہے۔

﴿أَوْيُؤْتِ أَعْمَامُكُمْ أَوْ يُوْتِ عَمَّاتِكُمْ﴾ (۶۱-۲۳) یا اپنے چچائیوں کے گھر سے یا اپنی پھوپھیوں کے گھروں سے۔

رَجُلٌ مُعَمَّمٌ مُخَوَّلٌ وہ شخص جس کے چچا اور ماموں ہوں یعنی تنہیال اور دودھیال کی طرف قوی ہو۔ اِسْتَعَمَّ عَمًّا وَتَعَمَّمَهُ کسی کو چچا بنانا دراصل یہ

عَالِيَّةٌ کی طرف نسبت کے وقت عَلَوِيٌّ کہا جائے گا اور عَلَاةٌ کے معنی سَنَدَان یعنی نہائی کے ہیں ۱ عام اس سے کہ وہ لوہے کی ہو یا پتھر کی۔ اَلْعَلِيَّانُ بڑا جسیم اونٹ۔

عَلَاوَةُ الشَّيْءِ: کسی چیز کے اوپر کے حصہ کو کہتے ہیں اسی سے سر اور گردن کو عَلَاوَةٌ کہا جاتا ہے۔ نیز پورے بوجھ کے بعد اوپر سے جو زائد بوجھ رکھا جائے اسے بھی عَلَاوَةٌ کہا جاتا ہے۔ ۲ عَلَاوَةُ الرِّيحِ: جو ہوا اوپر سے آئے۔ اس کی ضد سِفَالَةٌ ہے۔ اَلْمُعَلَّى قمار بازی کا ساتواں تیر جو سب سے اشرف اور اعلیٰ ہوتا ہے۔ اُعْلُ عَنِّي: مجھ سے دور ہو جا۔

تَعَالَى: اس کے اصل معنی کسی کو بلند جگہ کی طرف بلانے کے ہیں۔ پھر عام بلانے کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ اصل میں عَلُوٌّ ہے جس کے معنی بلند مرتبہ کے ہیں لہذا جب کوئی شخص دوسرے کو تَعَال کہہ کر بلاتا ہے تو گویا وہ کسی رفعت کے حصول کی طرف دعوت دیتا ہے۔ جیسا کہ مخاطب کا شرف ظاہر کرنے کے لیے اِفْعَلْ كَذَا غَيْرَ صَاغِرٍ کہا جاتا ہے چنانچہ اسی معنی میں فرمایا۔

﴿قُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ أَبْنَاءَنَا﴾ (۶۱-۳) تو ان سے کہنا کہ آؤ ہم اپنے بیٹوں..... کو بلائیں۔

﴿تَعَالَوْا إِلَى كَلِمَةٍ﴾ (۶۳-۳) (جو) بات (یکساں تسلیم کی گئی ہے اس کی) طرف آؤ۔

۱ وفي الفائق (۹۲/۲) عطاء في مهبط آدم قال: هبط معه بعلا (فعلة من العلو)۔

۲ وذكر ابن أبي الدنيا في الغرار وابن المنذر ق: انه لما نزلت الذين اذاصابتهم مصيبة الآية قال عمر رضي الله عنه نعم العذلان ای الصلوات ورحمة ونعم الصلاة ای اولائك هم المهتدون۔

﴿إِرَامَ ذَاتِ الْعِمَادِ﴾ (۸۹-۷) (جوارم) کہلاتے تھے اسے) دراز قد۔

میں اَلْعِمَاد سے وہ چیزیں مراد ہیں جن پر انہیں بڑا بھروسہ تھا۔ محاورہ ہے: عَمَدَتُ الشَّيْءِ: کسی چیز کو سہارا دے کر کھڑا کرنا۔ عَمَدَتُ الْحَائِطِ: سہارا دیوار کو سہارا دے کر کھڑا کیا اور اَلْعُمُودُ اس لکڑی (بلی) کو کہتے ہیں جس کے سہارے خیمہ کھڑا کیا جاتا ہے۔ اس کی جمع عُمُدٌ وَعَمَدٌ آتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔ ﴿فِي عَمَدٍ مُمَدَّدَةٍ﴾ (۱۰۴-۹) (یعنی آگ کے) لیے لیے ستونوں میں۔

اور ایک قراءت میں فِي عُمِدٍ ہے نیز فرمایا۔ ﴿بَغِيرِ عَمِدٍ تَرَوْنَهَا﴾ (۱۳-۲) ستونوں کے بغیر..... جیسا کہ تم دیکھتے ہو۔

نیز اَلْعُمُودُ ہر اس لکڑی یا لوہے کو کہتے ہیں جس پر سہارا لگا کر انسان کھڑا ہوتا ہے۔ عُمُودُ الصُّبْحِ: صبح کی ابتدائی روشنی کیونکہ یہ بھی ایک دم ستون کی طرح اوپر کو اٹھتی ہے۔ عرف میں اَلْعَمْدُ وَالْتَعَمُّدُ کے معنی قصداً کوئی کام کرنا آتے ہیں اور یہ سہو کی ضد ہے۔<sup>۵</sup> قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَمَنْ يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُتَعَمِّدًا﴾ (۴-۹۳) اور جو کوئی شخص مسلمان کو قصداً مار ڈالے گا۔

﴿وَلَكِنْ مَا تَعَمَّدَتْ قُلُوبُكُمْ﴾ (۳۳-۵) لیکن جو قصد دل سے کرو۔ اور محاورہ ہے۔

فُلَانٌ رَفِيعُ الْعِمَادِ: یعنی وہ دراز قامت ہے۔ اَلْعَمَدَةُ: ہر اس مال وغیرہ کو کہا جاتا ہے جس پر اعتماد کیا

عُمُوم سے ہے جس کے معنی شامل ہونے کے ہیں اور یہ شامل ہونا باعتبار کثرت کے ہوتا ہے۔ چنانچہ محاورہ ہے۔ عَمَّهُمْ كَذًا وَعَمَّهُمْ بَكْذَا عَمًّا وَعُمُومًا۔ یعنی وہ چیز عام ہوگئی اور ہر ایک کو اَلْعَمَامَةُ کہا جاتا ہے کیونکہ شہر میں عامی لوگوں کی اکثریت ہوتی ہے اور معنی شمول یعنی لپیٹنے کے اعتبار سے پگڑی کو اَلْعَمَامَةُ کہا جاتا ہے اور تَعَمَّم کے معنی سر پر پگڑی لپیٹنے کے ہیں جس طرح کہ تَقَنَّعٌ وَتَقَمَّصٌ کے معنی چہرہ پر پردہ ڈالنا یا قمیص پہننا کے آتے ہیں۔ عَمَّمْتُهُ: میں نے اسے عمامہ پہنایا۔ اور کنایہ اس کے معنی کسی کو سردار بنانا بھی آتے ہیں۔

شَاةٌ مُعَمَّمَةٌ: سفید سردالی بکری۔ گویا اس کے سر پر عمامہ بندھا ہوا ہے۔ اور یہ مُقَنَّعَةٌ وَمُخَمَّرَةٌ کی طرح استعمال ہوتا ہے کسی شاعر نے کہا ہے۔

(۳۲۱) يَا عَامِرُ بْنُ مَالِكٍ يَا عَمًّا أَفَنَيْتَ عَمًّا وَجَبَرْتَ عَمًّا

اے میرے چچا عامر بن مالک! تو نے بہت سے لوگوں کو فنا کیا اور بہت سے لوگوں پر بخشش کی۔ اور آیت کریمہ۔ عَمَّ يَتَسَاءَلُونَ (۷۸-۱) (یہ) لوگ کس چیز کی نسبت پوچھتے ہیں۔

میں عَمَّ اصل میں عَنْ مَا تھا۔ اور یہ اس باب (ع م) سے نہیں ہے۔

### (ع م د)

اَلْعَمْدُ کے معنی کسی چیز کا قصد کرنے اور اس پر ٹیک لگانا کے ہیں اور اَلْعِمَادُ وہ چیز ہے جس پر ٹیک لگائی جائے یا بھروسہ کیا جائے۔ چنانچہ آیت کریمہ۔

۵ وقد جاء في القرآن في مقابلة الخطأ كمافی (۹۲/۴-۹۳/۴-۵/۲۳)

چنانچہ طَالُ عُمُرُہ کے معنی تو یہ ہوتے ہیں کہ اس کا بدن روح سے آباد رہے۔ لیکن طَالُ بَقَاءُہ اس مفہوم کا متقاضی نہیں ہے۔ کیونکہ اَلْبَقَاءُ تَوْفَاء کی ضد ہے اور چونکہ بقاء کو عُمُر پر فضیلت ہے اس لیے حق تعالیٰ بقاء کے ساتھ تو موصوف ہوتا ہے مگر عُمُر کے ساتھ بہت کم متصف ہوتا ہے۔

اَلتَّغْمِيرُ کے معنی ہیں: بالفعل عمر بڑھانا یا زبان کے ساتھ عَمَّرَكَ اللہ کہنا۔ یعنی خدایتیری عمر دراز کرے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿اَوَلَمْ نَعْمَرْكُمْ مَّا يَتَذَكَّرُ فِيهِ مَن تَذَكَّرَ﴾ (۳۵-۳۷) کیا ہم نے تم کو اتنی عمر نہیں دی تھی کہ اس میں جو سوچنا چاہتا سوچ لیتا۔

﴿وَمَا يُعَمَّرُ مِنْ مُّعْمَرٍ وَلَا يَنْقُصُ مِنْ عُمُرِهِ﴾ (۳۵-۱۱) اور نہ کسی بڑی عمر والے کو عمر زیادہ دی جاتی ہے اور نہ اس کی عمر کم کی جاتی ہے۔

﴿وَمَا هُوَ بِمُرْزِقٍ مِنْ اَلْعَذَابِ اَن يُّعَمَّرَ﴾ (۲-۹۶) اگر اتنی لمبی عمر اس کو مل بھی جائے تو اسے عذاب سے تو نہیں چھڑا سکتی۔ اور آیت۔

﴿وَمَنْ نُّعَمِّرْهُ نُنَكِّسْهُ فِي الْخَلْقِ﴾ (۳۶-۶۸) اور جس کو ہم بڑی عمر دیتے ہیں اسے خلقت میں اوندھا کر دیتے ہیں۔

﴿حَتَّى طَال عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ﴾ (۲۱-۴۳) یہاں تک کہ (اسی حالت میں) ان کی عمریں بسر ہو گئیں۔

﴿وَلَبِثْنَا مِنْ عُمُرِكَ سِنِينَ﴾ (۲۶-۱۸) اور تم نے برسوں ہمارے ہاں عمر بسر کی۔

جائے اس کی جمع عُمِد ہے اور عَمِيدُ وہ سردار جس پر معاملات میں لوگ بھروسہ کرتے ہوں اور عَمِيدُ: کے معنی حزین بھی آتے ہیں گویا کہ وہ غم کا مقصود ہے جس طرح بیمار کو سَقِيم کہتے ہیں کہ وہ بیماری کا مقصود بنا ہوا ہوتا ہے۔ وَقَدْ عَمَدَ: اس نے حزن و ملال، غصہ یا بیماری کی وجہ سے درد و کرب کا اظہار کیا۔ عَمَدَ النَّبْعِيرُ: پیٹھ کے زخمی ہونے کی وجہ سے اونٹ کرا بنے لگا۔

### (ع م و)

اَلْعِمَارَةُ: یہ خَرَاب کی ضد ہے۔ عَمَرَ اَرْضَهُ يَعْمُرُهَا عِمَارَةً: اس نے اپنی زمین آباد کی۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾ (۹-۱۹) اور مسجد محترم (یعنی خانہ کعبہ) کو آباد کرنا۔

کہا جاتا ہے، عَمَرْتُهُ: میں نے اسے آباد کیا۔ فَعَمَرَ: چنانچہ وہ آباد ہو گئی اور آباد کی ہوئی جگہ کو مَعْمُور کہا جاتا ہے۔ چنانچہ فرمایا۔

﴿وَعَمَرُوهَا اَكْثَرِمِمَّا عَمَرُوهَا﴾ (۳۰-۹) اور اس کو اس سے زیادہ آباد کیا تھا جو انھوں نے آباد کیا۔

﴿وَالْبَيْتِ الْمَعْمُورِ﴾ (۵۲-۴) اور آباد کیے ہوئے گھر کی۔

اَعْمَرْتُهُ الْاَرْضَ وَاسْتَعْمَرْتُهُ: میں نے اسے آباد کرنے کے لیے زمین دی۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَاسْتَعْمَرَكُمْ فِيهَا﴾ (۱۱-۶۱) اور اس میں آباد کیا۔ اور اَلْعَمَرُ وَالْعُمُرُ: اس مدت کو کہتے ہیں جس میں بدن زندگی کے ساتھ آباد رہتا ہے اور یہ بقا سے فروتر ہے

تمام لوگوں کا سلسلہ نسب بنی معد سے ملتا ہے۔ اَلْعَمَارُ: عمامہ یا پھول جو قوم کا سردار اپنی سرداری کی علامت اور اس کی حفاظت کے لیے سر پر رکھتا ہے اور بطور استعارہ صرف پھولوں کو بھی عَمَارُ: کہا جاتا ہے گو بطور علامت نہ ہوں۔

اَلْمَعْمَرُ: رہائشی مکان کو کہتے ہیں بشرطیکہ اس میں کوئی آباد ہو اور اَلْعَرَمَرْمَةُ رِثَاء کی اس جماعت کو کہتے ہیں جو جب کسی مقام پر فروکش ہو تو مقام آباد نظر آئے۔

اَلْعُمُرُ: وہ عطیہ جو اس شرط پر دیا جائے کہ جب تک میری یا تمہاری زندگی ہے اس وقت تک اس سے فائدہ اٹھا لو اس کے بعد واپس لے لیا جائے گا۔ جیسا کہ اَلرَّقِیْبُ میں ہوتا ہے اور ایسے عطیہ کو عُمُرُ کہتے ہیں اس کے مستعار ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ اَلْعَمَرُ: مسوڑھوں کا گوشت۔ کیونکہ اس سے دانتوں کی درمیانی خلا پر اور آباد رہتی ہے۔ اس کی جمع عُمُورُ ہے اُمُّ عَامِرٍ۔ مُكْتَمَرٌ لِّكُرْبُلِ ابْنِ عَمْرَةَ: مفلس۔

### (ع م ق)

اَلْعُمُقُ: دراصل اس کے معنی نیچے کی طرف دوری یعنی گہرائی کے ہیں اس لیے بہت گہرے کنویں کو بَشْرُ عَمِیقُ کہا جاتا ہے۔ راستے کی صفت ہو تو اس کے معنی دور دراز راستہ کے ہوتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِیقٍ﴾ (۲۲-۲۷) دور دراز راستے سے۔

اَلْعُمَرُ وَالْعَمَرُ کے ایک ہی معنی ہیں۔ لیکن قسم کے موقع پر خاص کر اَلْعَمَرُ کا لفظ ہی استعمال ہوتا ہے۔ عُمَرُ کا لفظ نہیں بولا جاتا جیسے فرمایا۔

﴿لَعَمْرُكَ إِنَّهُمْ لَفِي سَكْرَتِهِمْ﴾ (۱۵-۷۲) تمہاری زندگی کی قسم وہ اپنی مستی میں ..... عَمَرَكَ اللّٰهُ خدا تمہاری عمر دراز کرے یہاں بھی چونکہ قسم کی طرح تاکید مراد ہے اس لیے لفظ عَمَر کو خاص کیا ہے۔ اَلْاَعْتِمَارُ وَالْعُمَرَةُ کے معنی ملاقات کے ہیں کیونکہ ملاقات سے بھی محبت اور دوستی کا خانہ آباد ہوتا ہے اصطلاح شریعت میں حج کے علاوہ بیت اللہ کی زیارت اور طواف وسعی کرنے کو عُمَرَةُ کہا جاتا ہے اور آیت کریمہ۔ ﴿اَنَّمَا يَعْمُرُ مَسَاجِدَ اللّٰهِ﴾ (۱۹-۱۸) خدا کی مسجدوں کو تو ..... آباد کرتے ہیں۔

میں يَعْمُرُ کا لفظ یا تو اَلْعِمَارَةُ سے ہے، جس کے معنی آباد اور حفاظت کرنا ہیں اور یا اَلْعُمَرَةُ سے جس کے معنی زیارت کے ہیں اور یا عَمَرْتُ بِمَكَانٍ كَذَا سے مشتق ہے جس کے معنی کسی جگہ ٹھہرنے کے ہیں کیونکہ عَمَرْتُ اَلْمَكَانَ وَعَمَرْتُ بِالْمَكَانِ دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ اَلْعِمَارَةُ کے معنی مخصوص خاندان کے ہیں اور یہ لفظ اَلْقَبِيلَةَ سے اخذ ہے یہ اصل میں انسانوں کی اس جماعت کا نام ہے جس سے مکان کی آبادی ہوتی ہے۔ شاعر نے کہا ہے۔ ۱ (الطویل)

(۳۲۲) لِكُلِّ اُنَاسٍ مِنْ مَّعَدٍ عِمَارَةٌ

۱ قاله الاخفش بن شهاب التغلبي العاهلي وتمامه ..... عروض اليها يلحزون وجانب الشطرفي اللسان (عمر) والمحكم (عرض) والبيت من كلمة مفضيلة ۲۷ بيتاً برقم ۴۱ معظمها في الحماسة مع العروزي رقم ۲۴۸ وبعضها في المعجم البكري ۵۰۶ والبلدان (اسم: قضه) والبخلاء ۸۴ او البيت في جزيرة العرب للهمداني والسمط ۸۶۸

## (ع م ل)

صدقات کا حق ہے۔ میں عَامِلِينَ سے محکمہ زکوٰۃ کے کارندے مراد ہیں۔ جو زکوٰۃ و صدقات وصول کرنے پر مقرر ہوتے ہیں اور ان کی اجرت کو عُمَالۃ کہا جاتا ہے۔ عَامِلُ الرُّمَح: نیزے کا وہ حصہ جو سان (بھالا) سے متصل ہوتا ہے۔ اَلْيَعْمَلۃ کے معنی تیز روانہی کے ہیں یہ بھی اَلْعَمَل سے مشتق ہے۔

## (ع م س)

اَلْعَمۃ کے معنی حیرانگی کی وجہ سے کسی کام میں تردد سے کام لینا کے ہیں۔ عِمۃ (س) صیغہ مفت فاعلی عِمۃ وَعَامِۃ اور عَامِۃ کی جمع عَمَّۃ ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔ ﴿فَإِنِّي طُغْيَانِيهِمْ يَعْـمَهُونَ﴾ (۲-۱۵) وہ اپنی شرارت و سرکشی میں پڑے بہک رہے ہیں۔ ﴿زَيَّنَّا لَهُمْ أَعْمَالَهُمْ فَهُمْ يَعْمَهُونَ﴾ (۲-۲۷) ہم نے ان کے اعمال ان کے لیے آراستہ کر دیئے تو وہ سرگردان ہو رہے ہیں۔

## (ع م ی)

اَلْعَمٰی: یہ بصارت اور بصیرت دونوں قسم اندھے پن کے لیے بولا جاتا ہے لیکن جو شخص بصارت کا اندھا ہو اس کے لیے صرف اَعْمٰی اور جو بصیرت کا اندھا ہو اس کے لیے اَعْمٰی وَعَم دونوں کا استعمال ہوتا ہے اور آیت کریمہ۔ ﴿أَن جَاءَهُ اَلْأَعْمٰی﴾ (۲-۸۰) کہ ان کے پاس ایک نابینا آیا۔ میں اَلْأَعْمٰی سے مراد بصارت کا اندھا ہے مگر جہاں

اَلْعَمَل: ہر اس فعل کو کہتے ہیں جو کسی جاندار سے ارادۃ صادر ہو یہ فِعْل سے انحصار ہے کیونکہ فِعْل کا لفظ بھی حیوانات کی طرف بھی منسوب کر دیتے ہیں جن سے بلا قصد افعال سرزد ہوتے ہیں بلکہ جمادات کی طرف بھی منسوب ہو جاتا ہے مگر عمل کا لفظ ان کی طرف بہت ہی کم منسوب ہوتا ہے صرف اَلْبَقَرُ الْعَوَامِلُ: ایک ایسی مثال ہے جہاں کہ عمل کا لفظ حیوانات کے لیے استعمال ہوا ہے۔ نیز عَمَل کا لفظ اچھے اور برے دونوں قسم کے اعمال پر بولا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔ ﴿إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ﴾ (۲-۲۷) جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے ..... ﴿وَمَنْ يَعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ﴾ (۱۰-۱۱۲) اور جو نیک کام کرے گا۔ ﴿مَنْ يَعْمَلْ سُوءًا يُجْزَ بِهِ﴾ (۳-۱۲۳) جو شخص برے عمل کرے گا، اسے اسی (طرح) کا بدلہ دیا جائے گا۔ ﴿وَنَجْزِي مَنْ فِرْعَوْنَ وَعَمِلِهِ﴾ (۶۶-۱۱) اور مجھے فرعون اور اس کے اعمال (زشتہ مال) سے نجات بخشیں۔

﴿إِنَّهُ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ﴾ (۱۱-۳۶) وہ تو ناشائستہ افعال ہے۔ ﴿وَالَّذِينَ يَعْمَلُونَ السَّيِّئَاتِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ﴾ (۳۵-۱۰) اور جو برے برے مکر کرتے ہیں ان کے لیے سخت عذاب ہے۔ اور آیت کریمہ۔ ﴿وَالْعَمَلِينَ عَلَيْهَا﴾ (۹-۱۶۰) اور کارکنان

۱ و يقال للناقة السريعة ناقة عملة و و يعمله كما قال عبدالله بن رواحة: ع يزايد العمال الذليل

﴿صُمًّا وَعُمِيًّا﴾ (۷۳-۲۵۵) اندھے اور بہرے ہو کر..... اور آیت کریہ۔

﴿وَمَنْ كَانَ فِي هَذِهِ أَعْمَىٰ فَهُوَ فِي الْآخِرَةِ أَعْمَىٰ وَأَضَلُّ سَبِيلًا﴾ (۷۳-۱۷) جو شخص اس دنیا میں اندھا ہو وہ آخرت میں بھی اندھا ہوگا۔ اور (نجات کے) رستے سے بہت دور۔

میں پہلا اعمیٰ صیغہ صفت مشبہ ہے اور ثانی کے متعلق بعض نے کہا ہے کہ یہ بھی صیغہ صفت مشبہ ہے۔

اور بعض نے کہا ہے کہ یہ اَفْعَلُ مِنْ كَذَا سے اسم تفضیل کا صیغہ ہے کیونکہ یہ اس اَلْعَمَى سے مشتق ہے جس کے معنی فقدان بصیرت کے ہیں اس لیے اس میں مَا أَفْعَلَهُ وَأَفْعَلُ مِنْ كَذَا دونوں طرح کہنا صحیح ہے مگر اس کے برعکس بعض نے آیت مذکور میں پہلے اعمیٰ کو بصیرت کے اندھا پن اور دوسرے کو بصر کے اندھا پن پر محمول کیا ہے۔ یہ ابو عمر کا قول ہے۔ اس لیے وہ پہلے اعمیٰ میں امالہ کا قائل ہے کیونکہ یہ عَمَى الْقَلْبِ سے ہے اور دوسرے میں امالہ کے قائل نہیں ہیں۔ کیونکہ وہ اسم ہے وَالْإِسْمُ أَبْعَدُ مِنَ الْإِمَالَةِ یعنی اسم میں امالہ جائز نہیں ہے۔ نیز فرمایا۔

﴿وَالَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ فِي آذَانِهِمْ وَقُرْ وَهُوَ عَلَيْهِمْ عَمَىٰ﴾ (۴۱-۴۲) اور جو ایمان نہیں لاتے ان کے کانوں میں گرائی (یعنی بہرہ پن) ہے یہ ان کے حق میں (موجب) ناپیدائی ہے۔

کہیں قرآن پاک نے اَلْعَمَى کی مذمت کی ہے وہاں دوسرے معنی یعنی بصیرت کا اندھا پن مراد لیا ہے۔ جیسے فرمایا۔

﴿صُمٌّ بُكْمٌ عُمَىٰ﴾ (۱۸-۲) یہ بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں۔

﴿فَعَمُّوا وَصَمُّوا﴾ (۷۱-۵) تو وہ اندھے اور بہرے ہو گئے۔

بلکہ بصیرت کے اندھا پن کے مقابلہ میں بصارت کا اندھا پن۔ قرآن پاک کی نظر میں اندھا پن ہی نہیں ہے۔ جیسا کہ فرمایا۔

﴿فَإِنَّهَا لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَلَكِنْ تَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ﴾ (۲۲-۴۶) بات یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ دل جو سینوں میں ہیں وہ اندھے ہو جاتے ہیں۔ اور آیت کریہ۔

﴿الَّذِينَ كَانَتْ أَغْنَتْهُمْ عَنْ ذِكْرِى﴾ (۱۸-۱۰۱) جن کی آنکھیں میری یاد سے پردے میں تھیں۔ بھی اسی معنی پر محمول ہے اور کور بصری کے متعلق فرمایا۔

﴿لَيْسَ عَلَى الْأَعْمَىٰ حَرَجٌ﴾ (۶۱-۲۳) نہ تو اندھے پر کچھ گناہ ہے۔

اور اعمیٰ کی جمع عُمَى وَعُمِيَانُ آتی ہے، چنانچہ فرمایا:

﴿بُكْمٌ عُمَىٰ﴾ (۱۸-۲) گونگے اور اندھے ہیں۔

۱۔ قال الزمخشري وقد جوزوا ان يكون الثانی بمعنى التفضیل: من ثم قرء ابو عمرو الاول مالا (ای بالامالۃ) والثانی مفحماً ای بدون الامالۃ لان افعال التفضیل لما كان تامۃ بمن كانت الفه فی حکم الواقعة فی وسط الکلام کقولک اعمالکم واما الاول فلم يتعلق به شئی فکان الفه واقعه فی الطرف معترضۃ للامالۃ انظر الکشاف (ص ۶۸۳ ج ۲) طبع الاستقامۃ القاہرہ (۱۳۶۵ھ ۱۲)

میں جس کے نیچے بھی عَمَاءٌ تھی اور اوپر بھی اس حالت کی طرف اشارہ ہے جس کا علم حاصل نہیں ہو سکتا اور عَمِيَّةٌ کے معنی جہالت کے ہیں اور اَلْمَعَامِي مَعْمَاہ کی جمع ہے) اس ریگستان کو کہتے ہیں جس میں کوئی نشان راہ نہ ہو۔

### (عن) (حرف)

عن: یہ حرف چار ہے اور اپنے مجرد سے تجاویز کو چاہتا ہے جیسے حَدَّثْتُكَ عَنْ فُلَانٍ (میں فلاں سے تمہارے سامنے بیان کر چکا ہوں) وَأَطَعْتُهُ عَنْ جُنُوعٍ (میں نے اسے بھوک سے کھلایا) ابو نعیم البصری نے کہا ہے کہ عَنْ بِلَاطِ استعمال کے عَلَى سے عام ہے کیونکہ یہ جہالت، ستہ میں استعمال ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ کبھی عَلَى بھی اس کی بجائے آجاتا ہے۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے۔  
(۳۲۳) إِذَا رَضِيتَ عَلَى بَنُو قُشَيْرٍ  
جب بنو قشیر مجھ سے راضی ہوں۔  
اسی طرح أَطَعْتُهُ عَلَى جُنُوعٍ وَكَسَوْتُهُ عَلَى عُرَى  
میں اگر عَنْ کی بجائے عَلَى کہا جائے تو صحیح ہوگا۔

### (ع ن ب)

اَلْعَنْبُ: (انگور) یہ انگور کے پھل اور اس کے درخت کے لیے بھی بولا جاتا ہے اس کا واحد عَنَبَةٌ ہے اور جمع اَعْنَابٌ قرآن میں ہے۔

﴿اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا عَمِيْنَ﴾ (۶۴-۷) کچھ شک نہیں کہ وہ اندھے لوگ تھے۔

اور ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَنَحْشُرُهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ عُمْيًا وَبُكْمًا﴾ (۹-۱۷) اور ہم ان کو قیامت کے دن اندھے منہ، اندھے، گونگے اور بہرے بنا کر اٹھائیں گے۔

میں بصر کا اندھا پن بھی مراد ہو سکتا ہے اور دل کی بصیرت کا زائل ہونا بھی عَمِيَ عَلَيْهِ کے معنی ہیں: اس پر فلاں معاملہ اس طرح غیر واضح اور مشتبہ ہو گیا کہ گویا وہ اس سے اندھا ہے (اور وہ اسے سمجھائی نہیں دیتا) قرآن پاک میں ہے۔

﴿فَعَمِيَتْ عَلَيْهِمُ الْاَنْبَاءُ يَوْمَئِذٍ﴾ (۶۸-۶۹) تو وہ اس روز خبروں سے اندھے ہو جائیں گے۔

﴿وَآتَانِي رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِهِ فَعُمِيَتْ عَلَيْهِمْ﴾ (۱۱-۲۸) اور اس نے مجھے اپنے ہاں سے رحمت بخشی ہے جس کی حقیقت تم سے پوشیدہ رکھی گئی ہے۔

اَلْعَمَاءُ: بادل، جہالت۔ بعض نے کہا ہے کہ روایت: ﴿اِنَّهُ قِيلَ اَيْنَ كَانَ رَبُّنَا قَبْلَ اَنْ خَلَقَ السَّمَاۗءَ وَالْاَرْضَ قَالَ عَمَاءٌ تَحْتَهُ عَمَاءٌ وَفَوْقَهُ عَمَاءٌ﴾ آپ سے پوچھا گیا آسمان و زمین کے پیدا کرنے سے پہلے ہمارا پروردگار کہاں تھا۔ فرمایا اَلْعَمَاءُ

① وفي الفائق (۹۲/۲) وزوال ابن حبان رقم (۹۳) تحتہ ہواء فوقہ ہواء کذا فی ابن جریر والطبرانی وابی الشیخ فی العظمة عن ابی

رزین راجع کنز العمال رقم ۱۸۶ فلفظة الهواء اکثر ۱۲

② قاله الفحيف بن سليم العقيلي من كلمة يمدح فيها حكيم بن المصيب القشيري وتماه: لعمر الله اعجبنى رضاها. وبعده ولا تنو سيوف بنى قشير ولا تمنضى الاسنة فى صفاها والبيت فى اللسان (رضى) والاقتضاب ۴۳۲ والكامل ۸۲۴، ۸۲۵ وادب الكتاب ۴۵ او الفرائر للآلوسى ۱۳۷ والبحر (۶۶۲/۵) والحزانة (۲۳۷: ۴) وابن عقيل ۲۰۶ وابن هشام (۱: ۱۵۳) وامالى ابن الشجرى (۲۶۹: ۲) والسيوطى (۴۲) او محاز القراق رقم ۶۳۵ ونوادى ابى زيد والعينى (۲۸۲: ۳) ۱۲



﴿وَمِنْ ثَمَرَاتِ النَّخِيلِ وَالْأَعْنَابِ﴾ (۱۶-۶۷) اور کھجور اور انگور کے میوؤں سے بھی۔  
 تمہاری تکلیف ان کو گراں معلوم ہوتی ہے۔ اور آیت کریمہ۔

﴿وَعَنْتِ الْوُجُوهُ لِلْحَيِّ الْقَيُّومِ﴾ (۲۰-۱۱۱) اور جَنَّتِ مِنْ نَخِيلٍ وَعَنْبٍ ﴿ (۱۷-۹۱) کھجوروں اور انگوروں کا کوئی باغ ہو۔

﴿وَجَنَّاتٍ مِنْ أَعْنَابٍ﴾ (۱۳-۴) اور انگوروں کے باغ۔

﴿حَدَائِقَ وَأَعْنَابًا﴾ (۷۸-۳۲) یعنی باغ اور انگور۔  
 ﴿وَعِنَبًا وَقَضْبًا وَزَيْتُونًا﴾ (۸۰-۲۷-۲۸) اور

انگور، ترکاری اور زیتون۔

﴿جَنَّاتٍ مِنْ أَعْنَابٍ﴾ (۱۸-۳۲) انگور کے دو باغ۔  
 اور عِنَبَةٌ کے معنی پھنسی کے بھی آتے ہیں، جو شکل میں انگور کے دانہ کے مشابہ ہوتی ہے۔

## (ع ن ت)

الْمُعَانَنَةُ: یہ مُعَانَدَةُ کے ہم معنی ہے یعنی باہم عناد اور دشمنی سے کام لینا لیکن مُعَانَنَةُ اس سے بلیغ تر ہے کیونکہ مُعَانَنَةُ ایسے عناد کو کہتے ہیں جس میں خوف اور ہلاکت کا پہلو بھی ہو۔ چنانچہ عَنْتٌ فُلَانٌ۔  
 يَعْنَتُ عَنَّا اس وقت کہتے ہیں جب کوئی شخص ایسے معاملہ میں پھنس جائے جس میں تلف ہو جانے کا اندیشہ ہو۔

قرآن پاک میں ہے۔

﴿لَمَنْ خَشِيَ الْعَنَتَ مِنْكُمْ﴾ (۴-۲۵) اس شخص کو ہے جسے ہلاکت میں پڑنے کا اندیشہ ہو۔

﴿وَدُّوا مَا عَنِتُّمْ﴾ (۳-۱۱۸) اور چاہتے ہیں کہ (جس طرح ہو) تمہیں تکلیف پہنچے۔

﴿عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ﴾ (۹-۱۲۸) (۳-۱۰۷)

## (ع ن د)

الْعَيْنِدُ کے معنی الْمُعْجِبُ بِمَا عِنْدَهُ کے ہیں یعنی جو کچھ اس کے پاس ہے اس پر اترانے والا۔

اور مُعَانِدُ اسے کہتے ہیں جسے جو کچھ اس کے پاس ہے اس پر فخر ہو۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿كُلُّ كَفَّارٍ عَيْنِدُ﴾ (۵۰-۲۴) ہر سرکش ناشکرے کو۔  
 ﴿إِنَّهُ كَانَ لَا يَأْتِنَا عَيْنِدًا﴾ (۷۴-۱۶) یہ ہماری

آئیوں کا دشمن رہا ہے۔

بعض کے نزدیک الْعِنُودُ کے بھی یہی معنی ہیں صرف ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ عَيْنِدُ اسے کہتے ہیں جو (حق

سے) عناد رکھے اور (اس کی) مخالفت کرے اور عِنُودُ وہ ہے جو صحیح راہ سے ہٹ جائے اس لیے بَعِيرُ عِنُودُ

(وہ اونٹ جو صحیح راہ سے ہٹ کر چلے) تو بولتے ہیں مگر

اے میرے پروردگار میرے لیے بہشت میں اپنے پاس ایک گھر بنا۔

اور اسی معنی میں اَلْمَلَائِكَةُ الْمُقَرَّبُونَ عِنْدَ اللّٰهِ (اللہ کے مقرب فرشتے) کا محاورہ ہے۔

﴿وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَابْقٰی﴾ (۳۶-۳۷) اور جو کچھ خدا کے ہاں ہے وہ بہتر اور قائم رہنے والا ہے۔

﴿وَعِنْدَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ﴾ (۸۵-۳۳) اور اسی کو قیامت کا علم ہے۔

﴿وَمَنْ عِنْدَهُ عِلْمُ الْكِتَابِ﴾ (۴۳-۱۳) اور وہ شخص جس کے پاس کتاب (آسمانی) کا علم ہے۔

﴿فَاُولٰٓئِكَ عِنْدَ اللّٰهِ هُمُ الْكَٰذِبُونَ﴾ (۱۳-۲۳) تو خدا کے نزدیک یہی جھوٹے ہیں۔

﴿وَيَحْسِبُوْنَهُ هَيِّنًا وَهُوَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمٌ﴾ (۱۵-۲۴) اور تم اسے ایک ہلکی بات سمجھتے تھے اور خدا کے نزدیک وہ بڑی بھاری بات تھی۔

اور آیت کریمہ۔

﴿اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِكَ﴾ (۳۲-۸) اگر یہ (قرآن) تیری طرف سے برحق ہے۔ میں عِنْدَ بمعنی حکم ہے۔

## (ع ن ق)

اَلْعُنُقُ: گردن۔ جمع اَعْنَاق۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَكُلُّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنَاهُ طَآئِرَهٗ فِیْ عُنُقِهٖ﴾ (۱۳-۱۷) اور ہم نے ہر انسان کے اعمال کو (بہ صورت کتاب) اس کے گلے میں لٹکا دیا ہے۔

﴿مَسْحًا بِالسُّوقِ وَالْاَعْنَاقِ﴾ (۳۸-۳۳) ان کی ٹانگوں اور گردنوں پر ہاتھ پھیرنے (گلے)۔

عِنْدُ نہیں کہتے اور عِنْدَ عَائِدُ کی جمع ہے اور عُنُوْدُ کی جمع عِنْدَةُ اور عِنْدُ کی جمع عِنْدُ آتی ہے۔ بعض

نے کہا ہے کہ اَلْعُنُوْدُ کے معنی راستہ سے ایک جانب مائل ہو جانے کے ہیں۔ لیکن عُنُوْدُ خاص کر اس شخص کو

کہا جاتا ہے جو کسی راستہ سے ہٹ جائے اور عِنْدُ وہ ہے جو چمکی راہ سے ہٹا ہوا ہو عِنْدَ عَنِ الطَّرِیْقِ: اس

نے راستہ سے عدول کیا۔ بعض نے کہا ہے کہ عَائِدُ کے معنی کسی کو لازم پکڑنا بھی آتے ہیں اور اس سے الگ ہونا

بھی۔ اور یہ دونوں دو مختلف اعتبار سے مشتق ہیں جیسا کہ اَلْبَیِّنُ کا لفظ دو مختلف اعتباروں سے وصل کے معنی بھی دیتا

ہے اور جدائی کے بھی۔

## (ع ن ظ ر ف)

عِنْدَ: یہ کسی چیز کا قرب ظاہر کرنے کے لیے وضع کیا گیا ہے کبھی تو مکان کا قرب ظاہر کرنے کے لیے آتا ہے اور

کبھی اعتقاد کے معنی ظاہر کرتا ہے جیسے عِنْدِیْ کَذَا اور کبھی کسی شخص کی قرب و منزلت کے متعلق استعمال ہوتا

ہے جیسے فرمایا:

﴿بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّہُمْ﴾ (۱۶۹-۳) بلکہ خدا کے نزدیک زندہ ہیں۔

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ عِنْدَ رَبِّكَ لَا یَسْتَكْبِرُوْنَ﴾ (۲۰۹-۷) جو لوگ تمہارے پروردگار کے پاس ہیں وہ..... وہ گردن کشی نہیں کرتے۔

﴿فَالَّذِیْنَ عِنْدَ رَبِّكَ یُسَبِّحُوْنَ لَهُ بِاَلْقُلُوبِ وَالنَّهَارِ﴾ (۳۸-۴) جو (فرشتے) تمہارے پروردگار کے پاس ہیں وہ رات دن اس کی تسبیح کرتے ہیں۔

﴿رَبِّ اِبْنِ لِّیْ عِنْدَكَ بَیْتًا فِی الْجَنَّةِ﴾ (۱۱-۶۲)

چہرے اس زندہ وقائم کے سامنے جھک جائیں گے۔ یعنی مصیبت میں گرفتار ہو کر خدا کے سامنے جھک جائیں گے اور عَنِيتُہ کے معنی کسی کو مصیبت میں مبتلا کرنے کے ہیں اور عَنِيتُہ کے معنی مصیبت میں مبتلا ہونا یا قیدی بننا کے آتے ہیں اسی سے قیدی کو اَلْعَانِي کہا جاتا ہے (اس کی مونث عَانِيہ ہے اور عَانِيہ کی جمع عَوَان آتی ہے) آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ﴿٥٠﴾ (اَسْتَوْصُوا بِالنِّسَاءِ خَيْرًا فَإِنَّهُنَّ عِنْدَكُمْ عَوَانٌ) کہ عورتوں سے اچھا سلوک کرو۔ بے شک وہ تمہارے پاس ایک طرح سے قیدی ہیں۔ محاورہ ہے: عُنِيَ بِحَاجَتِهِ فَهُوَ مَعْنِي بِهَا (کسی حاجت میں مبتلا ہونا) بعض نے عُنِيَ فَهُوَ عَان کہا ہے اور آیت کریمہ۔

﴿لِكُلِّ امْرِئٍ مِنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَأْنٌ يُغْنِيهِ﴾ (۸۰-۴۲) میں ایک قراءت يُغْنِيهِ بھی ہے یعنی اسے مصروف رکھے گی۔

اَلْعَنِيتُہ: ایک دوا جو خارش ہونے پر ملی جاتی ہے۔ مثل مشہور ہے۔ ۵

عَنِيتُہ تشفی العُجْرَب: درحق مرد نیک رای گویند کہ بفکر خود امور رانیک انجام وید۔

اَلْمَعْنٰی: مفہوم یا مقصود جو لفظ سے ظاہر ہوتا ہے ہو۔ یہ عَنِتِ الْاَرْضِ بِالنَّبَاتِ کے محاورہ سے مشتق ہے۔

﴿إِذَا لَا غَلَائِلَ فِي أَعْنَاقِهِمْ﴾ (۴۰-۷۱) جب کہ ان کی گردنوں میں طوق ہوں گے۔ اور آیت کریمہ۔

﴿فَاصْبِرْ بِنَا فَوْقَ الْأَعْنَاقِ﴾ (۸-۱۲) کے معنی یہ ہیں کہ ان کے سروں پر مارو اور اسی سے دراز گردن آدمی کو رَجُلٌ اَعْنَقُ کہا جاتا ہے اِمْرَءٌ عَنَقَاءُ دراز گردن عورت۔ كَلْبٌ اَعْنَقُ: سفید گردن کتا۔

اَعْنَقْتُهُ كَذًا: میں نے اس کی گردن میں فلاں چیز ڈال دی اس سے بطور استعارہ اِعْتَنَقَ الْأَمْرَ کا محاورہ ہے جس کے معنی ہیں: کسی بات کی ذمہ داری اٹھا لینا۔ کسی مسلک کو قبول کر لینا۔ اَلْأَعْنَاقُ کے معنی رؤسائے قوم کے ہیں۔ چنانچہ آیت کریمہ۔

﴿فَطَلَّتْ أَعْنَاقُهُمْ لَهَا خَاضِعِينَ﴾ (۲۶-۴) پھر ان کے اکابر عاجز و درماندہ ہو کر اس کے سامنے جھک جائیں۔

میں اَعْنَاق سے رؤساء و اکابرین قوم مراد ہیں۔ تَعَنَّقَ الْأَرْتَبُ: خرگوش نے گردن اٹھا کر دیکھا۔ اَلْعَنَاقُ بکری کا مادہ بچہ۔

عَنَقَاءُ مُغْرِبٌ: بعض نے کہا ہے کہ ایک خیالی پرند کا نام ہے جس کا وجود دنیا میں نہیں پایا جاتا۔

## (ع ن و)

﴿وَعَنِتِ الْوُجُوهُ لِلْحَيِّ الْقَيُّومِ﴾ (۲۰-۱۱۱) اور

۱ وفی الکشاف فانھن عوان فی ایدیکم الحدیث (۲۵۸/۱) وفی الترمذی والنسائی وابن ماجہ من حدیث عمرو بن الاحوص فی خطبة حجة الوداع وفيها فانھن عوان عندکم روی ابو یعلی والبخاری والطبری من رواية موسى بن عبيدة الزندی (واحد الضعفاء) عن ابن عمر مرفوعا: النساء عوان فی ایدیکم انظر تخريج احادیث الکشاف (ص ۴۰-۴۱) رقم ۳۳۵ وتخریج العراقي (ص ۴۲ ج ۲) ورواه مسلم من حدیث جابر الطویل۔

۲ قال المیدانی (۱۸/۲) العنينة بول البعير بطلی به الاحرب والمثل يضرب للرجل الحید الرأی لیستشفی براہ فیما ینوب انظر للمثل الفائق (۹۷/۲)

جس کے معنی ہیں: زمین نے پودے نمودار کیے۔  
 عَسَتْ الْقَرْبَةُ مُكَّ سَ پانی بہہ پڑا۔ اور جو لوگ  
 عَنَوَانُ الْكِتَابِ کو عُضَى سے مشتق مانتے ہیں ان  
 کے نزدیک یہ بھی عَسَتْ الْقَرْبَةُ سے ماخوذ ہے اور لفظ  
 اَلْمَعْنَى اور التفسیر کا تقریباً ایک ہی مفہوم ہے گوان  
 میں قدرے فرق پایا جاتا ہے۔

### (ع ۵۵)

اَلْعَهْدُ (ض) کے معنی ہیں: کسی چیز کی پیہم نگہداشت اور  
 خبر گیری کرنا۔ اس بنا پر اس پختہ وعدہ کو بھی عَهْدُ کہا جاتا  
 ہے جس کی نگہداشت ضروری ہو۔ قرآن پاک میں ہے۔  
 ﴿وَأَوْفُوا بِالْعَهْدِ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُولًا﴾  
 (۳۴-۱۷) اور عہد کو پورا کرو کہ عہد کے بارے میں ضرور  
 پرسش ہوگی۔ یعنی اپنی قسموں کے عہد پورے کرو۔  
 ﴿لَا يَنْالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ﴾ (۱۲۳-۲) کہ  
 ظالموں کے حق میں میری ذمہ داری پوری نہیں ہو سکتی۔  
 ﴿وَمَنْ أَوْفَى بِعَهْدِهِ مِنَ اللَّهِ﴾ (۱۱۱-۹) اور خدا  
 سے زیادہ وعدہ پورا کرنے والا کون ہے۔  
 عَهْدُ فَلَانٍ إِلَى فَلَانٍ: کسی سے عہد و پیمان لے کر  
 اسے اس پر قائم رہنے کی تاکید کرنا۔ قرآن پاک میں ہے۔  
 ﴿وَلَقَدْ عَهِدْنَا إِلَى آدَمَ﴾ (۱۱۵-۲۰) اور ہم نے.....  
 آدم (علیہ السلام) سے عہد لیا تھا۔  
 ﴿أَلَمْ أَعْهِدْ إِلَيْكُمْ﴾ (۶۰-۳۶) ہم نے تم سے کہہ  
 نہیں دیا تھا؟.....  
 ﴿الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ عَهِدَ إِلَيْنَا﴾ (۱۸۳-۳) جو  
 لوگ کہتے ہیں کہ خدا نے ہم سے عہد لے رکھا ہے۔

﴿وَعَهِدْنَا إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ﴾ (۱۲۵-۲) اور ابراہیم (علیہ السلام)  
 ..... کو کہا اور عَهْدُ اللَّهِ (خدائی عہد) سے مراد کبھی تو وہ  
 صلاحیت ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ نے ہماری عقلوں میں راسخ  
 کر دی ہے اور کبھی اس سے مراد وہ احکام ہوتے ہیں، جن  
 کا کہ پیغمبروں نے کتاب و سنت کے ذریعہ حکم دیا ہے اور  
 کبھی اس سے مراد وہ عبادات بھی ہوتی ہیں جن کی بجا  
 آوری شرعاً واجب نہ ہو بلکہ ہم اپنی طرف سے اسے اپنے  
 اوپر لازم کریں، جیسے نذر وغیرہ، چنانچہ آیات۔

﴿وَمِنْهُمْ مَنْ عَاهَدَ اللَّهَ﴾ (۷۵-۹) اور ان میں  
 سے بعض ایسے ہیں جنہوں نے خدا سے عہد کیا تھا۔  
 ﴿أَوْ كَلَّمَا عَاهَدُوا عَهْدًا نَبَذَهُ فَرِيقٌ مِّنْهُمْ﴾  
 (۱۱۰-۲) ان لوگوں نے (جب خدا سے) عہد واثق کیا تو  
 ان میں سے ایک فریق نے اس کو پھینک دیا۔

﴿وَلَقَدْ كَانُوا عَاهَدُوا اللَّهَ مِنْ قَبْلُ﴾  
 (۱۵-۳۳) حالانکہ پہلے اللہ سے اقرار کر چکے تھے۔  
 میں یہی معنی مراد ہیں اور کفار میں سے جو شخص معاہدہ کے  
 وقت مسلمانوں کے ساتھ شریک ہو اسے مُعَاهِدٌ یا ذِوِ عہد  
 کہا جاتا ہے۔ حدیث میں ہے۔ ﴿(۵۱)﴾ ((لَا يُقْتَلُ  
 مُؤْمِنٌ مُّبْكَافِرٌ وَلَا ذُو عَهْدٍ فِي عَهْدِهِ)) کہ کسی  
 مومن کو کافر کے بدلے قتل نہ کیا جائے اور نہ ہی کسی معاہدہ کو  
 مدت عہد کے اندر مارا جائے اور حفاظت اور پابندی کے  
 اعتبار سے اس وثیقہ کو بھی عَهْدَةُ کہا جاتا ہے جو فریقین  
 عہد و پیمان کے وقت باہم لکھ لیتے ہیں اور محاورہ ہے۔

فِي هَذَا الْأَمْرِ عَهْدَةٌ یعنی وہ معاملہ ہے جس کی  
 نگہداشت کا حکم دیا گیا ہو اور دیکھ بھال کے اعتبار سے بارش کو بھی

ناہمواری کو غور و فکر کے بغیر اس کا ادراک نہیں ہو سکتا یا معاشرہ میں دینی اور معاشی ناہمواریاں کہ عقل و بصیرت سے ہی ان کا ادراک ہو سکتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔  
﴿قُرْآنًا عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِي عِوَجٍ﴾ (۳۹-۳۸) (یہ) قرآن عربی (ہے) جس میں کوئی عیب (اور اختلاف) نہیں ہے۔

﴿وَلَمْ يَجْعَلْ لَّهُ عِوَجًا﴾ (۱۸-۱) اور اس میں کسی طرح کی کجی (اور پیچیدگی) نہ رکھی۔  
﴿وَالَّذِينَ يَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ وَيَبْغُونَهَا عِوَجًا﴾ (۷-۳۵) جو اللہ کی راہ سے روکتے اور اس میں کجی ڈھونڈتے ہیں۔  
اور کنایہ کے طور پر کج خلق آدمی کو بھی آعوج کہا جاتا ہے۔  
الْأَعْوَجِيَّةُ یہ آعوج گھوڑے کی طرف منسوب ہے جو جاہلی عرب میں مشہور تھا۔

### (ع و د)

الْعَوْدُ: (ن) کسی کام کو ابتداء کرنے کے بعد دوبارہ اس کی طرف پلٹنے کو عود کہا جاتا ہے خواہ وہ پلٹا بذاتہ ہو یا قول و عزم سے ہو۔ قرآن پاک میں ہے۔  
﴿رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْهَا فَإِنْ عُدْنَا فَإِنَّا ظَالِمُونَ﴾ (۲۳-۱۰۷) اے پروردگار! ہم کو اس میں سے نکال دے اگر ہم پھر (ایسے کام) کریں تو ظالم ہوں گے۔  
﴿وَلَوْ رُدُّوا لَعَادُوا لِمَا نُهُوا عَنْهُ﴾ (۶-۲۸) اگر (دنیا میں) لوٹائے بھی جائیں تو جن (کاموں) سے ان کو منع کیا گیا تھا وہی کرنے لگیں۔  
﴿وَمَنْ عَادَ فَيَنْتَقِمُ اللَّهُ مِنْهُ﴾ (۵-۹۵) اور جو پھر (ایسا کام) کرے گا تو اللہ اس سے انتقام لے گا۔

عَهْدٌ وَعِيَادٌ کہا جاتا ہے اور رَوْضَةٌ مَعْهُودَةٌ کے معنی ہیں: وہ باغ جس پر بارش ہوئی ہو۔

### (ع ه ن)

الْعِهْنُ کے معنی رنگین اون کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوشِ﴾ (۱۰-۵) دھنی ہوئی رنگین اون کی طرح۔

یہاں صرف رنگ کے اعتبار سے پہاڑوں کو رنگدار اون کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے، جیسا کہ آیت کریمہ۔  
﴿فَكَانَتْ وَرْدَةً كَالدِّهَانِ﴾ (۵۵-۵۷) تیل کی تلچھٹ کی طرح گلابی ہو جائے گا۔ میں بیان ہو چکا ہے۔

رَمَى بِالْكَلَامِ عَلَى عَوَاهِنِهِ: بے سوچے سمجھے بات کرنا، فکر و غور کیے بغیر بات کرنا جیسا کہ کہا جاتا ہے:  
أَوْرَدَ كَلَامَهُ غَيْرَ مُفَسِّرٍ: کہ اس نے اپنی بات کی وضاحت نہیں کی۔

### (ع و ج)

الْعَوْجُ: (ن) کے معنی کسی چیز کے سیدھا کھڑا ہونے کی حالت سے ایک طرف جھک جانا کے ہیں۔ جیسے عُجْتُ الْبَعِيرُ بِرَمَامِهِ: میں نے اونٹ کو اس کی مہار کے ذریعہ ایک طرف موڑ دیا۔ فَلَانٌ مَا يَعْوُجُ عَنْ شَيْءٍ يَهُمُّ بِهِ یعنی فلاں اپنے ارادے سے باز نہیں آتا۔

الْعَوْجُ: اس ٹیڑھے پن کو کہتے ہیں جو آنکھ سے بہولت دیکھا جاسکے جیسے کھڑی چیز میں ہوتا ہے مثلاً لکڑی وغیرہ اور اَلْعَوْجُ اس ٹیڑھے پن کو کہتے ہیں جو صرف عقل و بصیرت سے دیکھا جاسکے جیسے صاف میدان کی

﴿وَالَّذِينَ يُظَاهِرُونَ مِنْ نِسَاءِهِمْ ثُمَّ يَعُودُونَ لِمَا قَالُوا﴾ (۵۸-۳) اور جو لوگ اپنی بیویوں کو ماں کہہ بیٹھیں، پھر اپنے قول سے رجوع کریں۔

میں اہل ظاہر کہتے ہیں کہ يَعُودُونَ کے معنی یہ ہیں کہ عورت سے ایک مرتبہ ظہار کرنے کے بعد اگر دوبارہ اسے وہی کلمہ کہے۔ تب اس پر کفارہ ظہار لازم آتا ہے ۱ لہذا ثُمَّ يَعُودُونَ کا جملہ فَإِنْ قَاءَ وَآ کی طرح ہے اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک عَوْدٌ فِي الظَّهَارِ یہ ہے کہ ظہار کے بعد عورت سے جماع کرے ۲ اور امام شافعی رحمۃ اللہ کے نزدیک یہاں عَوْدٌ کے معنی ہیں ظہار کے بعد عورت کو اتنی مدت تک روک رکھنا جس میں اسے طلاق دے سکتا ہو، لیکن طلاق نہ دے۔ ۳ بعض متاخرین نے کہا ہے کہ ظہار بھی ایک طرح کی قسم ہے اور اس کے معنی ہیں کہ خاوند کہے کہ اگر میں فلاں کام کروں تو میری بیوی میرے لیے ایسے ہے جیسے میری ماں کی پشت، پھر اس کے بعد اگر وہ اس کام کا ارتکاب کرے تو وہ حادث ہو جائے گا اور آیت ظہار میں بیان کردہ کفارہ کا ادا کرنا اس پر لازم ہوگا۔ لہذا آیت۔

﴿ثُمَّ يَعُودُونَ لِمَا قَالُوا﴾ (۵۸-۳) کے معنی یہ ہوں گے کہ جس کام کے نہ کرنے کی انھوں نے قسم کھائی تھی اس کی طرف پلٹیں یعنی اپنی قسم توڑنا چاہیں اور یہ ایسے

﴿وَهُوَ الَّذِي يَبْدَأُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ﴾ (۳۰-۲۷) اور وہی تو ہے جو خلقت کو پہلی بار پیدا کرتا ہے پھر اسے دوبارہ پیدا کرے گا۔

﴿وَمَنْ عَادَ فَأُولَئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ﴾ (۲-۲۷۵) اور جو پھر (سود) لینے لگا تو ایسے لوگ دوزخی ہیں کہ ہمیشہ دوزخ میں (جلتے) رہیں گے۔

﴿وَأَنْ عُدْتُمْ عِدْنَا﴾ (۱۷-۸) اور اگر تم پھر وہی (حرکتیں) کرو گے تو ہم بھی وہی (پہلا سا سلوک) کریں گے۔

﴿وَأَنْ تَعُودُوا تَعُدُّوا﴾ (۸-۱۹) اور اگر پھر (نافرمانی) کرو گے تو ہم بھی پھر (تسمیں عذاب) کریں گے۔

﴿أَوَلَتَعُودُنَّ فِي مِلَّتِنَا﴾ (۷-۸۸) یا تم ہمارے مذہب میں آ جاؤ۔

﴿إِنْ عُدْنَا فَنَاظِرُ الْمُؤَنِّ﴾ (۲۳-۱۰۷) اگر ہم پھر (ایسے کام) کریں تو ظالم ہوں گے۔

﴿إِنْ عُدْنَا فَنُفِي مِلَّتِكُمْ﴾ (۷-۸۹) اگر ہم..... تمہارے مذہب میں لوٹ جائیں۔

﴿وَمَا يَكُونُ لَنَا أَنْ نَعُودَ فِيهَا﴾ (۷-۸۹) اور ہمیں شایان نہیں کہ ہم اس میں لوٹ جائیں۔

اور آیت کریمہ۔

① قال نبي الطبرسي ۷/۲۸ وعن ابي العالبيه وبكير بن عبدالله الاشج و هو مذهب اهل الظاهر لان لفظ العود يدل على تكرير القول وزده ابو علي الفارسي راجع الفتح للشوكاني والمحلي

② العزم على وطنها كما اروي عن قتادة وهو المشهور عن الحنفية واليه ذهب مالك وائمة البيت راجع الطبرسي وروح المعاني (۷/۲۸)۔

③ لان السكوت الى زمان يمكنه، ان يطلق فيه ندم منه على ما ابتداء وهو يعود على ما ابتداءه والحاصل ان العود بمعنى الندم كما قال ابن عباس راجع الطبرسي والروح۔

کے لیے مقرر کیا گیا ہے۔ جیسا کہ حدیث میں ہے۔<sup>①</sup>  
(۵۲) ((أَيَّامُ أَكْلٍ وَشُرْبٍ وَبِعَالٍ)) کہ عید کے دن کھانے پینے اور جماع سے لطف اندوز ہونے کے دن ہیں اس لیے ہر وہ دن جس میں کوئی شادمانی حاصل ہو اس پر عید کا لفظ بولا جانے لگا ہے چنانچہ آیت کریمہ۔

﴿أَنْزِلْ عَلَيْنَا مَائِدَةً مِنَ السَّمَاءِ تَكُونُ لَنَا عِيدًا﴾ (۵-۱۱۳) ہم پر آسمان سے خوان (نعمت) نازل فرما۔ ہمارے لیے (وہ دن) عید قرار پائے۔ میں عید سے شادمانی کا دن ہی مراد ہے اور اَلْعِيدُ اصل میں (خوشی یا غم کی) اس حالت کو کہتے ہیں جو بار بار انسان پر لوٹ کر آئے اور اَلْعَائِدَةُ ہر اس منفعت کو کہتے ہیں جو انسان کو کسی چیز سے حاصل ہو۔

اَلْمَعَادُ کے معنی لوٹنے کے ہیں اور لوٹنے کی جگہ یا زمانہ کو بھی اَلْمَعَادُ کہا جاتا ہے اور آیت کریمہ۔

﴿إِنَّ الَّذِي فَرَضَ عَلَيْكَ الْقُرْآنَ لَرَادُّكَ إِلَىٰ مَعَادٍ﴾ (۲۸-۱۰۵) (اے پیغمبر) جس (اللہ) نے تم پر قرآن پاک (کے احکام) کو فرض کیا وہ تمہیں بازگشت کی جگہ لوٹا دے گا۔

میں بعض نے کہا ہے کہ مَعَاد سے مکہ مکرمہ مراد ہے مگر اس کے صحیح معنی وہ ہیں جن کی طرف حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اشارہ فرمایا ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بھی ذکر کیے

ہی ہے جیسے کہا جاتا ہے: فَلَا تَحْلَفْ ثُمَّ عَادَ یعنی اس نے وہ کام کیا جس کے نہ کرنے کی قسم کھائی تھی۔<sup>②</sup> اور انھنشی علیہ السلام نے کہا ہے کہ لَمَّا قَالُوا كَاتِلِقْ فَتَحْرِ يَرْ رَقَبَةٍ سے ہے اس سے بھی اس آخری قول کی تائید ہوتی ہے نیز انھنشی علیہ السلام نے کہا ہے کہ اس قسم کو توڑنے کے بعد اس پر کفارہ لازم ہوگا جیسا کہ اللہ کی قسم اٹھانے کے بعد اس پر کفارہ لازم آتا ہے۔<sup>③</sup> جو کہ آیت کریمہ۔

﴿فَكَفَّارَتُهُ إِطْعَامُ عَشْرَةِ مَسْكِينٍ﴾ (۵-۸۹) تو اس کا کفارہ دس محتاجوں کو کھانا کھلانا ہے۔ میں مذکورہ ہے۔

اَلْإِعَادَةُ کے معنی لوٹنا کے ہیں، مثلاً بات وغیرہ کو لوٹانا جیسے فرمایا۔

﴿سَنُعِيدُهَا سِيرَتَهَا الْأُولَىٰ﴾ (۲۰-۲۱) ہم اس کو (بھی) اس کی پہلی حالت پر لوٹا دیں گے۔

﴿أَوْ يُعِيدُوكُمْ فِي مِلَّتِهِمْ﴾ (۱۸-۲۰) یا پھر اپنے مذہب میں داخل کر لیں گے۔

اَلْعَادَةُ: کسی فعل یا افعال کو بار بار کرنا حتیٰ کہ وہ طبعی فعل کی طرح سہولت سے انجام پاسکے۔ اسی لیے بعض نے کہا ہے کہ عَادَةُ طبعیت ثانیہ کا نام ہے۔ اَلْعِيدُ: وہ ہے جو بار بار لوٹ کر آئے۔ اصطلاح شریعت میں یہ لفظ یوم الفطر اور یوم الاضحیٰ پر بولا جاتا ہے۔ چونکہ شرعی طور پر یہ دن خوشی

① ذکرہ اصحاب الفروع فی ذیل تعلیق الظہار وهو یصح عند الشافعیہ وکذا فی بعض الصور عند الحنفیہ۔

② ففی الآیۃ تقدیم وتاخیر وهو کثیر فی التزیل الطبری (۷/۲۸) والروح (۹/۲۸)

③ الفائق (۵۵/۱) والحديث باختلاف الفاظ فی مسلم واحمد عن كعب بن مالك والدارقطني عن انس وعبدالله بن حذافة السهمي والنسائي عن ابن مسعود بن الحكم عن امه ومعناه النهی فی ایام التشریق عن صیامها وفی رواية قوله صلى الله عليه وسلم فی يوم العید خاصة الا ان المؤلف فهم ان وزانها وزان یومی عید فاطلق الحديث والله اعلم۔

﴿وَإِنِّي عُذْتُ بِرَبِّي وَرَبِّكُمْ أَنْ تَرْجُمُونِ﴾  
(۳۳-۲۰) اور اس بات سے کہ تم مجھے سنگسار کرو اپنے اور تمہارے پروردگار کی پناہ مانگتا ہوں۔

﴿قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ الْفَلَكِ﴾ (۱۱۳-۱) کہو کہ میں صبح کے پروردگار کی پناہ مانگتا ہوں۔

﴿إِنِّي أَعُوذُ بِالرَّحْمَنِ﴾ (۱۹-۱۸) میں تم سے اللہ کی پناہ مانگتی ہوں۔

اور أَعَذْتُهُ بِاللَّهِ أَعِيذُهُ کے معنی دوسرے کو اللہ کی پناہ میں دینے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿إِنِّي أَعِيذُهَا بِكَ﴾ (۳۶-۳) میں اس کو..... تیری پناہ میں دیتی ہوں۔ اور آیت کریمہ۔

﴿مَعَاذَ اللَّهِ﴾ (۱۲-۲۳) (کہ خدا پناہ میں رکھے۔) کے معنی یہ ہیں کہ ہم اللہ کی پناہ لیتے ہیں اور اس قسم کے برے کام سے بچنے کے لیے اس سے مدد مانگتے ہیں کیونکہ یہ گناہ کا کام ہے جس کے ارتکاب سے ہمیں کنارہ کش رہنا چاہیے۔

الْعَوْدَةُ: اصل میں ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ کسی چیز سے بچاؤ حاصل کیا جائے، اسی سے تَمِيمَةُ یعنی تعویذ اور رُقِيَّةٌ یعنی دم جھاڑ کو عَوْدَةُ کہا جاتا ہے اور عَوْدَةُ کے معنی کسی کو (خطرہ سے) بچانے کے ہیں اور ہر وہ مادہ جس نے حال ہی میں بچہ دیا ہو اسے سات دن تک عَائِدٌ کہا جاتا ہے۔

### (ع و ر)

الْعَوْرَةُ: انسان کے مقام ستر کو کہتے ہیں مگر اس کے یہ معنی کنائی ہیں اصل میں یہ عار سے مشتق ہے اور مقام ستر کے کھلنے سے بھی چونکہ عار محسوس ہوتی ہے اس لیے اسے عَوْرَةُ

ہیں کہ اس سے جنت مراد ہے۔ جس میں آنحضرت ﷺ کو بالقوہ اس وقت پیدا کیا تھا جب کہ آپ ﷺ صلب آدم علیہ السلام میں تھے پھر وہاں سے عالم دنیا میں لا کر آنحضرت ﷺ کو دنیا پر جلوہ گر کیا گیا۔ جیسا کہ آیت۔  
﴿وَإِذْ أَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِي آدَمَ﴾ (۷۲-۷۱) الآیۃ میں مذکور ہے۔

اور الْعَوْدُ: عمر رسیدہ اونٹ کو عَوْدُ یا تو اس لیے کہتے ہیں کہ وہ سیر و عمل کا تکرار کر چکا ہوتا ہے اور یا اس لیے کہ اس پر متواتر سا لہا سال گزر چکے ہوتے ہیں۔ پہلی توجیہ کے لحاظ سے الْعَوْدُ (مصدر) بمعنی فاعل ہوگا۔ اور دوسرے اعتبار سے بمعنی مفعول نیز عَوْدُ پرانے راستہ کو بھی کہتے ہیں کیونکہ اس پر بار بار سفر ہو چکا ہوتا ہے اور عَوْدُ سے ہی عِبَادَةُ الْمَرِيضِ مشتق ہے جس کے معنی تیمارداری کے ہیں۔

عِيْدِيَّةٌ: وہ اونٹ جو عِيْدُ نامی سانڈ کی نسل سے ہوں۔  
الْعَوْدُ: بعض نے کہا ہے کہ عَوْدُ اصل میں اس لکڑی کو کہتے ہیں جسے اگر کاٹ دیا جائے تو اس میں دوبارہ بڑھنے کی قوت ہو، پھر یہ لفظ خاص کر مزار یعنی ستار یا اس لکڑی پر بولا جانے لگا ہے جس سے دھونی دی جائے۔

### (ع و ذ)

الْعَوْدُ (ن) کے معنی ہیں: کسی کی پناہ لینا اور اس سے چمٹے رہنا۔ محاورہ ہے:

عَاذَ فُلَانٌ بِفُلَانٍ: فلاں نے اس کی پناہ لی۔ اسی سے ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

﴿أَعُوذُ بِاللَّهِ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْجَاهِلِينَ﴾ (۶۷-۲) کہ میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں کہ نادان بنوں۔



میں ثلاث عَوْرَات سے پردہ کے تین اوقات مراد ہیں یعنی دوپہر کے وقت۔ عشاء کی نماز کے بعد اور صبح کی نماز سے پہلے۔ اور آیت کریمہ۔

﴿لَمْ يَظْهَرُوا عَلَى عَوْرَاتِ النِّسَاءِ﴾ (۲۳-۳۱)  
(یا ایسے لڑکوں سے) جو عورتوں کے پردے کی چیزوں سے واقف نہ ہوں۔

سے مراد نابالغ لڑکے ہیں جن میں ہنوز جنسیات کے متعلق باتوں کا شعور پیدا نہ ہوا ہو۔ سَنَمُ عَائِرٌ وہ تیر جو نامعلوم طرف سے آئے لِفُلَانٍ عَائِرَةٌ مِنَ الْمَالِ فلاں کے پاس اتنا زیادہ مال ہے کہ اس کی فراوانی آنکھ کو حیرت زدہ اور خیرہ کر دیتی ہے۔ ۱۰ اَلْمُعَاوَرَةُ: بعض

نے کہا ہے کہ اس کے معنی مستعار لینے کے ہیں اور اسی سے عَارِيَّةٌ بروزنِ فَعْلِيَّةٌ ہے۔ اسی سے کہا جاتا ہے، تَعَاوَرُوا وَالْعَوَارِي: استعمال کی چیزیں باہم لینا دینا۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ عار سے مشتق ہے چونکہ کوئی چیز مستعار دیکر اس کا واپس لینا بھی موجب عار سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے اسے عَارِيَّةٌ کہا جاتا ہے مثل مشہور ہے کہ عَارِيَّةٌ (مستعار لی ہوئی چیز) سے کسی نے دریافت کیا کہ کدھر جا رہی ہو تو اس نے کہا: میں اپنے اہل کے لیے مذمت اور عار لینے جا رہی ہوں۔ بعض نے کہا ہے کہ عَارِيَّةٌ کا مادہ وادی ہے جیسا کہ تَعَاوَرْنَا کا لفظ اس پر دلالت کرتا ہے اور عَارٌ کا مادہ یائی ہے۔ جیسا کہ

کہا جاتا ہے اور عورت کو بھی عورت اس لیے کہا جاتا ہے کہ ان کے بے ستر رہنے کو باعث عار سمجھا جاتا ہے اسی سے بری بات کو عوراء کہا جاتا ہے۔

عَوْرَتٌ عَيْنُهُ عَوْرًا وَعَارَتْ عَيْنُهُ عَوْرًا: اس کی ایک آنکھ کی بینائی جاتی رہی۔ عَوْرَتْهَا: میں نے اسے بھینگا کر دیا۔ اسی سے بطور استعارہ عَوْرَتُ الْبَيْتِ کا محاورہ ہے جس کے معنی ہیں: مٹی ڈال ڈال کر کنوئیں کا پانی خشک کر دینا اور مجازاً نظر کی تیزی کی وجہ سے کوئے کو اَلَا عَوْرٌ کہا جاتا ہے جیسے کسی لفظ کو اس کی ضد میں استعمال کر لیتے ہیں۔ چنانچہ شاعر نے کہا ہے۔ ۱۱ (الخصيف)

(۳۲۴) وَصَحَّاحُ الْعُيُونِ يَذْعِينُ عَوْرًا  
تندرست آنکھوں والے آدمیوں کو بھینگا کہا جاتا ہے۔  
اَلْعَوَارُ وَالْعَوْرَةُ کے معنی کپڑے یا مکان وغیرہ میں شکاف کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿إِنَّ بَيُوتَنَا عَوْرَةٌ وَمَا هِيَ بِعَوْرَةٍ﴾ (۳۳-۱۳)  
کہ ہمارے گھر کھلے پڑے ہیں حالانکہ وہ کھلے نہیں تھے۔  
یعنی ان میں جگہ جگہ رخنے پڑے ہوئے ہیں جن میں سے جو چاہے ان کے اندر گھس سکتا ہے اسی سے محاورہ ہے۔  
فُلَانٌ يَحْفَظُ عَوْرَتَهُ کہ فلاں اپنے خلل کی حفاظت کرتا ہے اور آیت کریمہ۔

﴿ثَلَاثَ عَوْرَاتٍ لَّكُم﴾ (۲۳-۵۸) (یہ) تین (وقت) تمہارے پردے کے ہیں۔

۱ قاله الكميّت وصدره، والحوار التمام ذا السر منه..... وفي المطبوع يدعون مصحف والتصويب من المراجع والبيت في المحاضرات للمؤلف (۶۷۳: ۴) والمعاني للقبتي ۲۵۸ والعجز في اللسان والتاج (عور) بغير عزو و قبله: نطعم الجبال اللهيدي من الكو- م ولم ندع من يشيط الحزورا-

۲ انظر للمثل المبداني ۷/۲ وفي تاويله اختلاف اختر نامنه تاويل ابی حاتم ۱۲

حق استحقاق سے زیادہ لے کر بے انصافی کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔

(عوق)

﴿ذَٰلِكَ أَذْنٰى اَنْ لَا تَعُوْٓا ۖ﴾ (۳-۳) اس سے تم بے انصافی سے بچ جاؤ گے۔

اور اسی سے عَالَتْ الْفَرِيضَةُ کا محاورہ ہے جس کے معنی ترکہ کی تقسیم کے وقت وارثوں کے مقررہ حصے دینے کے بعد کچھ مال بچ جانے کے ہیں۔ اَلْتَّغْوِيْلُ کے معنی کسی مشکل کام میں دوسروں پر اعتماد کرنے کے ہیں اسی سے عَوَّلُ ہے جس کے معنی بھاری مصیبت کے ہیں۔ چنانچہ محاورہ ہے۔

وَيْلَهُ وَعَوَّلَهُ: ہائے اس کی مصیبت۔ اور اسی سے اَلْعِيَالُ یعنی وہ افراد جن کے اخراجات کا انسان ذمہ دار ہو جن کے بوجھ کے نیچے دبا ہوا ہو اس کا مفرد عِيْلٌ ہے عَالَهُ اس نے فلاں کے اخراجات کا بوجھ اٹھایا۔ اسی سے نبی ﷺ کا فرمان ہے۔ (۵۳) ((اِنْدَاءَ بِنَفْسِكَ ثُمَّ بِمَنْ تَعُوْلُ)) کہ پہلے اپنی ذات پر خرچ کرو اور پھر ان پر جن کے اخراجات تمہارے ذمہ ہیں۔ اَعَالَ الرَّجُلُ وہ آدمی کثیر العیال ہو گیا۔

(عوم)

اَلْعَامُ (سال) اور السَّنة کے ایک ہی معنی ہیں۔ لیکن اَلْسَنَةُ کا لفظ عموماً اس سال پر بولا جاتا ہے جس میں

عِيَرَتُهُ بِكَذَا کے محاورہ سے معلوم ہوتا ہے۔

اَلْعَانِقُ: وہ جو لوگوں کو خیر اور بھلائی سے روکنے والا ہو لوگوں کو ان کے مقاصد سے روک کر اپنی طرف متوجہ کر لیں اور عَاقَهُ عَوَّقَهُ وَاعْتَاقَهُ: اس نے اسے روک دیا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿قَدْ يَعْلَمُ اللّٰهُ الْمُعَوِّقِيْنَ﴾ (۱۸-۳۳) خدائے مہربان سے ان لوگوں کو بھی جانتا ہے جو لوگوں کو منع کرتے ہیں۔

یعنی جو لوگوں کو بھلے کاموں سے روکتے اور منع کرتے ہیں۔ رَجُلٌ عَوَّقٌ وَعَوَّقَهُ جو لوگوں کو بھلے کاموں سے روکے۔

﴿يَعُوْٓ﴾ (۲۳-۷۱) قبیلہ بنی کنانہ اور حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے) ایک بت کا نام (تھا)۔

(عول)

عَالَهُ وَغَالَهُ کے قریب قریب ایک ہی معنی ہیں لیکن اَلْعَوْلُ کا لفظ اس چیز کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔ جو انسان کو ہلاک کر ڈالے اور اَلْعَوْلُ ہر اس چیز کے متعلق استعمال ہوتا ہے جو انسان کو گراں بار کر دے اور اس کے

بوجھ تلے وہ دب جائے۔ محاورہ ہے۔

مَا عَالَكَ فَهُوَ عَائِلِيٌّ: کہ جو چیز تجھ پر بار ہے وہ مجھ پر بھی گراں بار ہے اور اسی سے عَوَّلُ ہے۔ جس کے معنی

① من العول المقابل للعدل يقال عال الحاكم اذا جاور عال الميزان اذا مال من جانب الى جانب وايضاً عال الرجل اذا كثرت عياله و به قال الشافعي في تفسير الآية والنقد عليه من الحريري في درته من سوء الادب فان الشافعي اعلم بالغة منه ومن اضراجه راجع الحمل (۱/۴۶۲) وروح المعاني (۱۷۵/۴) وشرح الدرر الخفاجي (۲۰۵-۲۰۶)۔

② والخبر في الدرر للحريري قال الخفاجي في شرح ۲۰۵ وهو بعض حديث رواه الطبراني والحديث في الاصل متفق اما لفظ "انذ" بنفسك" فرواه في (هب) عن جابر) وفي رواية عنه فليبدأ بنفسه (حم، م، د، ت) ولم يروه الا جابر واما لفظة ((وابدأ بمن تعول)) فورد في حديث "ابن العلياء خير" وفي "خير الصدقة ما كان عن ظهر غنى" اور وهما لجميع الطرق على المتقى في كنز (۹ ج ۶ رقم ۲۱۶-۲۲۱)۔

(افعال) میں نے اس کی مدد کی۔ قرآن پاک میں ہے۔  
﴿فَاعْيُوثِي بِقُوَّةٍ﴾ (۱۸-۹۵) تم مجھے قوت (بازو) سے مدد دو۔

﴿وَأَعَانَهُ عَلَيْهِ قَوْمٌ آخَرُونَ﴾ (۳۵-۴) اور دوسرے لوگوں نے اس میں اس کی مدد کی۔

التَّعَاوُنُ: ایک دوسرے کی مدد کرنا۔ قرآن پاک میں ہے۔  
﴿تَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ﴾ (۵-۲) نیکی اور پرہیز گاری میں ایک دوسرے کی مدد کرو اور گناہ اور ظلم کی باتوں میں ایک دوسرے کی مدد نہ کیا کرو۔

الْإِسْتِعَانَةُ: مدد طلب کرنا۔ قرآن پاک میں ہے۔  
﴿اسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ﴾ (۲-۳) صبر اور نماز سے مدد لیا کرو۔

الْعَوَانُ: ادھیڑ عمر کو کہتے ہیں۔ قرآن میں ہے۔  
﴿عَوَانٌ بَيْنَ ذَلِكَ﴾ (۲-۶۸) بلکہ ان کے بین بین یعنی ادھیڑ عمر کی۔

اور کبھی بطور کنایہ کے عمر رسیدہ عورت کو بھی عَوَان کہہ دیا جاتا ہے۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے۔<sup>①</sup> (المبیط)

(۲۲۵) فَإِنْ أَتَوَكَ فَقَالُوا إِنَّهَا نَصَفَتْ  
فَإِنْ أَمْنَلْ نَصَفِيهَا الَّذِي ذَهَبَا

اگر تمہارے پاس آکر کہیں کہ ادھیڑ عمر ہے تو تم کہو اس کی عمر کا بہترین حصہ تو گزر چکا ہے۔

اور استعارۃً جو جنگ کئی سال تک جاری ہے اور پرانی ہو

تکلیف یا خشک سالی ہو اس بنا پر قحط سالی کو سَنَةٌ سے تعبیر کر لیتے ہیں اور عَامٌ اس سال کو کہا جاتا ہے جس میں وسعت اور فراوانی ہو۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿عَامٌ فِيهِ يَغَاثُ النَّاسُ وَفِيهِ يَعْصِرُونَ﴾ (۱۲-۴۹) اس کے بعد ایک ایسا سال آئے گا جس میں خوب بارش ہوگی اور لوگ اس میں نچوڑیں گے۔ اور آیت کریمہ۔

﴿فَلَيْتَ فِيهِمْ أَلْفَ سَنَةٍ إِلَّا خَمْسِينَ عَامًا﴾ (۲۹-۱۳) تو وہ ان میں پچاس برس کم ہزار برس رہے۔  
میں لفظ سَنَةٌ کو مشتقی منہ اور لفظ عَامٌ کو مشتقی لانے میں ایک لطیف نکتہ ہے جسے ہم اس کتاب کے بعد کسی دوسرے موقع پر بیان کریں گے۔ ان شاء اللہ۔ اور عَوَمٌ (ن) کے معنی پانی میں تیرنا بھی آتے ہیں چنانچہ بعض نے کہا ہے کہ سال کو بھی عَامٌ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ اس مدت میں سورج اپنے تمام برجوں میں تیر لیتا ہے۔ چنانچہ آیت کریمہ۔

﴿وَكُلٌّ فِيهِ فَلَكَ يَسْبَحُونَ﴾ (۳۶-۴۰) سب اپنے اپنے دائرے میں تیر رہے ہیں۔

میں يَسْبَحُونَ کے لفظ سے اس توجیہ کی تائید ہوتی ہے۔

## (ع و ن)

الْعَوْنُ (کے معنی کسی کی مدد اور پشت پناہی کرنا کے ہیں) نیز عَوْنٌ مددگار) کہا جاتا ہے۔

فُلَانٌ عَوْنِي یعنی فلاں میرا مددگار ہے قَدْ أَعَنَتَهُ

① البيت في اللسان والتاج بغیر عرو وفي رواية اطیب بدل مثل وغير ابدل ذهبا والبيت ايضا في المحاضرات للمؤلف (۲۰۳: ۳) والحماسة مع المبرز وفي رقم ۸۷۰ مع آخر وفي التبریزی "وان" بدل فان واختلف في قرينه ففي الحماسة قبله: لا تنكح عجزا وان اتوك بها واخلع ثيابك منه معنا هربا۔ وفي اللسان وفيه اقواء: لا تنكح عجزا او مطلقة ولا يسوقنها في حبك القدر ۱۲۔

لاتے ہیں۔ قرآن میں ہے۔

﴿فَلَمَّا فَصَلَتِ الْعِيرُ﴾ (۱۲-۹۳) جب قافلہ مصر

سے روانہ ہوا۔

﴿أَيُّهَا الْعِيرُ إِنَّكُمْ لَسَارِقُونَ﴾ (۱۲-۷۰) کہ

قافلے والو! تم چور ہو۔

﴿وَالْعِيرَ الَّتِي أَقْبَلْنَا فِيهَا﴾ (۱۲-۸۲) اور جس

قافلے میں ہم آئے۔

اور عِيسِر کا لفظ متعدد معنوں میں استعمال ہوتا ہے (۱)

گورخر (۲) پاؤں کی پشت پر ابھری ہوئی ہڈی (۳)

آنکھوں کی پتلی (۴) کان کی پچھلی طرف ابھری ہوئی نرم

ہڈی (۵) خس و خاشاک جو پانی کے اوپر جمع ہو جاتا ہے

(۶) میخ (۷) تیر کے پھل کا درمیانی حصہ جو اوپر ابھرا ہوا

ہوتا ہے الغرض گو عِيسِر کا لفظ ان سب معانی میں استعمال

ہوتا ہے۔ مگر ان معانی میں باہم مناسبت بیان کرنا تکلف

اور تعسف سے خالی نہیں۔

الْعِمَارُ: ناپ یا تول جانچنے کا معیار۔ اسی سے محاورہ ہے:

عَيْرَتُ الدَّنَانِيرُ: اشرفیوں کو کوٹنی پر پرکھنا عَيْرَتُهُ: میں

نے اس کی مذمت کی۔ یہ عَارٌ سے مشتق ہے۔ تَعَايِرَ

بَنُو قُلَانٍ انھوں نے ایک دوسرے کو عار دلائی یا ایک

دوسرے کے عیب بیان کیے۔ بعض نے کہا ہے کہ دراصل

تَعَايِرَ کے معنی ہیں: گورخر کی طرح ایک دوسرے سے دور

بھاگنا اور بدکنا اور اسی سے عَارَتِ الدَّابَّةِ تَعْيِيرُ کا محاورہ

ہے جس کے معنی ہیں جانور کا بدک کر بھاگ جانا۔ کہا جاتا

ہے فُلَانٌ عَيَارٌ: فلاں آوارہ گرد یا غنڈہ ہے۔

جائے اے بھی عَوَانٌ کہا جاتا ہے۔ نیز پرانی کجیور کو بھی

عَوَانَةٌ کہہ دیتے ہیں۔

الْعَانَةُ: گورخر اس کی جمع عَانَاتٌ وَعَوْنٌ ہے الْعَانَةُ

موئے زہار۔ اس کی تصغیر عَوِينَةٌ ہے۔

## (ع ی ب)

الْعَيْبُ وَالْعَابُ: نقص اور خرابی، ہر وہ حالت جس سے

کسی چیز میں نقص پیدا ہو جائے اور عَيْبَةُ کے معنی ہیں

میں نے اسے عیب دار کر دیا، جیسے فرمایا۔

﴿فَارَدْتُ أَنْ آعِيْبَهَا﴾ (۱۸-۷۹) تو میں نے چاہا

کہ اسے عیب دار کر دوں۔

نیز عَيْبَةُ کسی چیز کی مذمت کرنے اور اس کا عیب ظاہر

کرنے پر بھی بولا جاتا ہے۔ جیسے عَيْبْتُ فُلَانًا (میں

نے اس کی مذمت کی)۔

اور عَيْبَةُ (بیگ) ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس میں کوئی چیز

چھپا کر رکھی جائے اسی سے نبی ﷺ کا فرمان ہے۔

• (۵۳)

((الْأَنْصَارُ كَرَشِيٍّ وَعَيْبَتِي)) کہ انصار میرے

مخزن اسرار ہیں۔

## (ع ی ر)

الْعَيْرُ: قافلہ جو غذائی سامان لا کر لاتا ہے۔ اصل میں یہ

لفظ غلہ بردار اونٹوں اور ان کے ساتھ جو لوگ ہوتے ہیں

ان کے مجموعہ پر بولا جاتا ہے مگر کبھی اس کا استعمال صرف

ان اونٹوں پر ہوتا ہے جو غذائی سامان اٹھا کر لاتے ہیں اور

کبھی ان لوگوں پر بولا جاتا ہے جو کہیں سے غذائی سامان

① کلمۃ من حدیث فی الفائق (۱۹۷/۲) رواہ النسائی عن اسید بن حضیر و انس و الترمذی و البخاری و مسلم عن انس بن مالک و قال الترمذی هذا حدیث حسن صحیح و تسمتہ: ((و لولا الهجرة لکنتم امرء من الانصار)) راجع غریب ابی عبید (۱۳۷/۱)

## (ع ی س)

ہی نے تمہارے لیے اس میں زیت کے سامان پیدا کر دیے۔

﴿لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشٌ﴾ (۷-۱۰) تمہارے لیے اس میں سامان زیت۔ اور اہل جنت کے متعلق فرمایا۔

﴿فَهُوَ فِي عِيشَةٍ رَاضِيَةٍ﴾ (۱۰۱-۷) وہ دل پسند عیش میں ہوگا۔ اور نبی ﷺ نے فرمایا۔ ﴿(۵۵) (لَا عَيْشَ إِلَّا عَيْشَ الْآخِرَةِ)﴾ کہ حقیقی زندگی تو آخرت کی زندگی ہی ہے۔

## (ع ی ل)

الْعَيْلَةُ کے معنی فقر و فاقہ کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔ ﴿وَأَنْ خِفْتُمْ عَيْلَةً﴾ (۹-۲۸) اگر تم کو مفلسی کا خوف ہو۔

عَالَ الرَّجُلُ يَعِيلُ: وہ آدمی محتاج اور ضرورت مند ہو گیا۔ عَائِلٌ: محتاج، ضرورت مند۔ مگر آعَالَ (افعال) جس کے معنی کثیر العیال ہونے کے ہیں اجوف وادی (ع دل) سے ہے۔ اور آیت۔

﴿وَوَجَدَكَ عَائِلًا فَأَغْنَى﴾ (۹۳-۸) اور تجھے ضرورت مند پایا تو غنی کر دیا۔

میں عَائِلًا کے معنی ہیں: تجھ سے فقر نفس کو دور کر کے تجھے غنائے اکبر عطا کی، چنانچہ آپ ﷺ نے اس غنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔ ﴿(۵۶) (أَلْغَنَى عَنِيَ النَّفْسُ)﴾ (کہ اصل غنی تو نفس کی بے نیازی ہے)

﴿عَيْسَى﴾ (۳-۴۳-۵۴) یہ ایک پیغمبر کا نام اور اسم علم ہے اگر یہ لفظ عربی الاصل مان لیا جائے تو ہو سکتا ہے کہ یہ اس عیسٰی سے ماخوذ ہو جو کہ اَعْيَس کی جمع ہے اور اس کی مونث عَيْسَاء ہے اور عَيْسٰی کے معنی ہیں سفید اونٹ جن کی سفیدی میں قدرے سیاہی کی آمیزش ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے عَيْسٰی سے مشتق ہو جس کے معنی ساند کے مادہ منویہ کے ہیں اور بَعِيرٌ اَعْيَسٌ وَنَاقَةٌ عَيْسَاء (جمع عَيْسٰی اور عَاسَاهَا يَعْيِسُهَا کے معنی ہیں: نر کا مادہ سے بھتی کھانا۔

## (ع ی ش)

الْعَيْشُ: خاص کر اس زندگی کو کہتے ہیں جو حیوان میں پائی جاتی ہے اور یہ لفظ الْحَيَاة سے اخذ ہے کیونکہ الْحَيَاة کا لفظ حیوان، باری تعالیٰ اور ملائکہ سب کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔ اور الْعَيْشُ سے لفظ الْمَعِيشَةُ ہے جس کے معنی ہیں: سامان زیت کھانے پینے کی وہ تمام چیزیں جن پر زندگی بسر کی جاتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَعِيشَتَهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا﴾ (۳۲-۳۳) ہم نے ان میں ان کی معیشت کو دنیا کی زندگی میں تقسیم کر دیا۔

﴿مَعِيشَةً ضَنْكًا﴾ (۲۰-۱۳۴) اس کی زندگی تنگ ہو جائے گی۔

﴿وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ﴾ (۱۵-۲۰) اور ہم

① الحديث صدر البيت الذى تمثل به رسول الله ﷺ يوم الخندق الا ان فى الصحيحين: الا هم ان العيش عيش الآخرة - فارحم الانصار والمهاجرة والرجز لرجل من المسلمين وروى: اللهم لا خير الا خَيْرُ الْآخِرَةِ فانصر الانصار والمهاجرة وفى رواية فاغفر وفى رواية فاكرم انظر تخريج العراقي (۲/ ۲۷۴) وايضا فى حجة الوداع رواه الشافعى مرسلًا والحاكم متصلًا (تخريج العراقي (۴/ ۱۰۳))

② واصل الحديث متفق عليه ورواه الترمذى من حديث ابى هريرة وقال حسن صحيح (۲/ ۶۰) وابن حبان فى زوائده (۲۵۲۰)

تم میرے سامنے پرورش پاؤ۔  
اور اسی سے عَيْنُ اللّٰهِ عَلَيْكَ ہے جس کے معنی ہیں:  
اللہ تعالیٰ تمہاری حفاظت اور نگہداشت فرمائے۔ یا اللہ  
تعالیٰ تم پر اپنے نگہبان فرشتے مقرر کرے جو تمہاری  
حفاظت کریں اور اَعْيُنٌ وَعُيُونٌ دونوں عین کی جمع  
ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَلَا أَقُولُ لِلَّذِينَ تَزْدِرِيْ أَعْيُنُكُمْ﴾ (۱۱-۳۱)

اور نہ ان کی نسبت جن کو تم حقارت کی نظر سے دیکھتے ہو یہ  
کہتا ہوں کہ۔

﴿رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ أَزْوَاجِنَا وَذُرِّيَّتِنَا قُرَّةَ  
أَعْيُنٍ﴾ (۲۵-۷۴) اے ہمارے پروردگار! ہم کو ہماری  
بیویوں کی طرف سے دل کا چین اور اولاد کی طرف سے  
آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما۔

اور استعارہ کے طور پر عَيْنٌ کا لفظ کئی معنوں میں استعمال  
ہوتا ہے جو مختلف اعتبارات سے آنکھ میں پائے جاتے ہیں۔  
(۱) مشکیزہ کے سوراخ کو عَيْنٌ کہا جاتا ہے کیونکہ وہ ہیئت  
اور اس سے پانی بہنے کے اعتبار سے آنکھ کے مشابہ ہوتا  
ہے۔ پھر اس سے اشتقاق کے ساتھ کہا جاتا ہے۔

سِقَاءٌ عَيْنٍ وَمُعِينٌ: پانی کی مشک جس سے پانی ٹپکتا  
ہو عَيْنٌ قَرَبَتْكَ: اپنی نئی مشک میں پانی ڈالو تاکہ تر ہو۔  
کر اس میں سلامی کے سوراخ بھر جائیں۔

(۲) جاسوس کو عَيْنٌ کہا جاتا ہے کیونکہ وہ دشمن پر آنکھ  
لگائے رہتا ہے جس طرح کہ عورت کو فَسَّجٌ اور سواری کو  
ظَهْرٌ کہا جاتا ہے کیونکہ ان دونوں سے مقصود یہی دو  
چیزیں ہوتی ہیں چنانچہ محاورہ ہے: فُلَانٌ يَمْلِكُ كَذَا  
فَرَجًا وَكَذَا ظَهْرًا (فلاں کے پاس) اس قدر لونڈیاں

کہا جاتا ہے۔  
مَا عَالَ مُفْتَصِّدٌ: اعتدال سے خرچ کرنے والا کبھی فقیر  
نہیں ہوتا۔ مگر بعض نے آیت کے یہ معنی بیان کئے ہیں کہ  
اللہ تعالیٰ نے تمہیں اپنی رحمت اور غلو کا محتاج پا کر تمہارے  
اگلے پچھلے گناہ معاف کر دیے اور تجھے اپنی مغفرت سے  
بہرہ وافر عطا فرما کر غنی کر دیا۔

## (ع ی ن)

أَلْعَيْنُ کے معنی آنکھ کے ہیں۔ قرآن میں ہے۔

﴿أَلْعَيْنُ بِالْعَيْنِ﴾ (۵-۲۵) آنکھ کے بدلے آنکھ۔  
﴿لَطَمَسْنَا عَلَى أَعْيُنِهِمْ﴾ (۳۶-۶۶) ان کی  
آنکھوں کو مٹا (کراندھا) کر دیں۔

﴿وَأَعْيُنُهُمْ تَفِيضُ مِنَ الدَّمْعِ﴾ (۵-۸۳) ان کی  
آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں۔  
﴿قُرَّةَ عَيْنٍ لِّىْ وَلَكَ﴾ (۲۸-۹) (یہ) میری اور تمہاری  
(دونوں کی) آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔

﴿كَى تَقَرَّرَ عَيْنُهَا﴾ (۲۰-۲۰) تاکہ ان کی آنکھیں  
ٹھنڈی ہوں۔ اور عَيْنٌ کے معنی شخص اور کسی چیز کا محافظ  
کے بھی آتے ہیں اور فُلَانٌ بِعَيْنِي کے معنی ہیں۔  
فلاں میری حفاظت اور نگہبانی میں ہے۔ جیسا کہ هُوَ  
بِمَرَأَى يَمْنَى وَمَسْمَعٍ کا محاورہ ہے۔ قرآن پاک  
میں ہے۔

﴿فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا﴾ (۵۲-۲۸) تم تو ہماری آنکھوں  
کے سامنے ہو۔

﴿تَجَرَّبَى بِأَعْيُنِنَا﴾ (۵۳-۱۳) وہ ہماری آنکھوں کے  
سامنے چلتی تھی۔

﴿وَلَتُضَنَعَ عَلَى عَيْنِي﴾ (۲۰-۳۹) اور اس لیے کہ

﴿فَنُفِیْ جَنَّتٍ وَعُیُونٍ﴾ (۱۵-۲۵) باغ اور چشموں میں۔

﴿مِنْ جَنَّتٍ وَعُیُونٍ وَزُرُوعٍ﴾ (۲۴-۲۶) باغ اور چشمے اور کھیتیاں۔

عِنْتُ الرَّجُلِ کے معنی ہیں: میں نے اس کی آنکھ پر مارا۔ جیسے رَأْسُهُ کے معنی ہوتے ہیں: میں نے اس کے سر پر مارا اور فَأَذْنُهُ: میں نے اس کے دل پر مارا نیز عِثُّہ کے معنی ہیں: میں نے اسے نظر بد لگادی جیسے سَفْتُهُ کے معنی ہیں: میں نے اسے تلوار سے مارا، یہ اس لیے کہ اہل عرب کبھی تو اس عضو سے فعل مشتق کرتے ہیں جس پر مارا جاتا ہے اور کبھی اس چیز سے جو مارنے کا آلہ ہوتی ہے جیسے سَفْتُهُ وَرَمَحْتُهُ۔ چنانچہ یَدِیْتَهُ کا لفظ ان ہر دو معنی میں استعمال ہوتا ہے یعنی میں نے اسے اپنے ہاتھ سے مارا یا اس کے ہاتھ پر مارا اور عِنْتُ الْبَیْتِ کے معنی ہیں: کنواں کھودتے کھودتے اس کے پانی کے چشمہ تک پہنچ گیا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿إِلَى رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَمَعِينٍ﴾ (۲۳-۵۰) ایک اونچی جگہ پر جو رہنے کے لائق تھی اور تنہا ہوا پانی جاری تھا۔

﴿فَمَنْ يَأْتِيكُمْ بِمَاءٍ مَّعِينٍ﴾ (۶۷-۳۰) تو (سوائے خدا کے) کون ہے جو تمہارے لیے شیریں پانی کا چشمہ بہالائے۔

بعض نے کہا ہے کہ مَعِينٌ میں لفظ میم حروف اصلیہ سے ہے اور یہ مَعْنٌ سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں: کسی چیز کا سہولت سے چلنا یا بہنا اور عِیْن کا لفظ بطور استعارہ ترازو کے جھکاؤ پر بھی بولا جاتا ہے اور وحشی گائے کو آنکھ کی

اور اتنی سواریاں ہیں۔ (۳) عین بمعنی سونا بھی آتا ہے کیونکہ یہ جواہر میں افضل سمجھا جاتا ہے۔ جیسا کہ اعضاء میں آنکھ سب سے افضل ہوتی ہے اسی سے افاضل قوم کو اَعْبَانُ کہا جاتا ہے اور ماں باپ دونوں کی طرف سے حقیقی بھائیوں کو اَعْبَانُ الْأَخُوۃُ کہا جاتا ہے۔

(۴) بعض نے کہا ہے کہ عِیْنٌ کا لفظ جب ذات شے کے معنی میں استعمال ہو جیسے کُلُّ مَالِهِ عِیْنٌ تو یہ معنی مجازی ہوگا، جیسا کہ غلام کو رَقَبَةُ (گردن) کہہ دیا جاتا ہے اور عورت کو فَسْرَجُ (شرمگاہ) کہہ دیتے ہیں کیونکہ عورت سے مقصود ہی یہی جگہ ہوتی ہے۔

(۵) پانی کے چشمہ کو بھی عِیْنٌ کہا جاتا ہے۔ کیونکہ اس سے پانی ابلتا ہے جس طرح کہ آنکھ سے آنسو جاری ہوتے ہیں اور عِیْنُ الْمَاءِ سے مَاءٌ مَعِیْنٌ کا محاورہ لیا گیا ہے۔ جس کے معنی جاری پانی کے ہیں جو صاف طور پر چلتا ہوا دکھائی دے اور عِیْنٌ کے معنی جاری چشمہ کے ہیں۔ چنانچہ فرمایا۔

﴿عِیْنًا فِیْہَا تُسَمَّى سَلْسَبِلًا﴾ (۷۶-۱۸) یہ بہشت میں ایک چشمہ ہے جس کا نام سلسیل ہے۔

﴿وَفَجَّرْنَا الْأَرْضَ عُیُونًا﴾ (۵۲-۱۲) اور زمین میں چشمے جاری کر دیے۔

﴿فِیْہِمَا عِیْنَانِ تَجْرِیَانِ﴾ (۵۵-۸۰) ان میں دو چشمے بہ رہے ہیں۔

﴿عِیْنَانِ نَضَّاخَتَانِ﴾ (۵۵-۶۶) دو چشمے ابل رہے ہیں۔

﴿وَأَسْلَمْنَا لَهُ عِیْنَ الْقَطْرِ﴾ (۳۴-۱۲) اور ان کے لیے ہم نے تانبے کا چشمہ بہا دیا تھا۔

سے پیدا ہو جاتی ہے اور عسیٰ کے معنی کسی کام یا بات کو نہ کر سکرنا کے ہوتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿أَفَعَيْنَا بِالْخَلْقِ الْأَوَّلِ﴾ (۵۰-۱۵) کیا ہم پہلی تخلیق سے تھک گئے ہیں۔

﴿وَلَمْ يَعَىٰ بِخَلْقِهِنَّ﴾ (۳۲-۳۳) اور ان کے پیدا کرنے سے تھکا نہیں اور اسی سے ہے: عَىٰ فِی مَنْطِقِهِ عِیًّا فَهُوَ عِیٌّ۔ جس کے معنی سخن سے عاجز ہونے کے ہیں۔ رَجُلٌ عِیَّاءٌ طِبَاقًا: مرد جو سخن اور کام کرنے سے عاجز ہو داء عِیَاءٌ لاعلاج مرض۔



خوب صورتی کی وجہ سے اَعِیْنٌ وَعِیْنَاءُ کہا جاتا ہے اس کی جمع عِیْنٌ ہے پھر گاوان وحشی کے ساتھ تشبیہ دے کر خوبصورت عورتوں کو بھی عِیْنٌ کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿فَاصْرَاتِ الْوَعْدِ عِیْنٌ﴾ (۳۷-۳۸) جو نگاہیں نیچی رکھتی ہوں (اور) آنکھیں بڑی بڑی۔

﴿وَحُورٌ عِیْنٌ﴾ (۵۶-۲۲) اور بڑی بڑی آنکھوں والی حوریں۔

## (عی ی)

آلِ عِیَاءُ کے معنی اس در ماندگی اور تکان کے ہیں جو چلنے



## کتابُ الْغَيْنِ

### (غ ب ر)

الْغَابِرُ: اسے کہتے ہیں جو ساتھیوں کے چلے جانے کے بعد پیچھے رہ جائے۔ چنانچہ آیت کریمہ۔  
﴿الْأَعْجُوزَ فِي الْغَابِرِينَ﴾ (۷۱-۲۶) مگر ایک بڑھیا کہ پیچھے رہ گئی۔

کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے: غَابِرِينَ سے عمر رسیدہ لوگ مراد ہیں اور بعض نے اس سے پیغمبر کے مخالفین لوگ مراد لیے ہیں جو (سدم میں) پیچھے رہ گئے تھے اور لوط علیہ السلام کے ساتھ نہیں گئے تھے بعض نے عذاب الہی میں گرفتار ہونے والے لوگ مراد لیے ہیں۔ علاوہ ازیں ایک مقام پر۔

﴿إِلَّا أَمْرًا تَكَ كَانَتْ مِنَ الْغَابِرِينَ﴾ (۳۳-۲۹) بجز ان کی بیوی کے کہ وہ پیچھے رہنے والوں میں ہوگی۔ اور دوسرے مقام پر:

﴿قَدَرْنَا إِنَّهَا لَمِنَ الْغَابِرِينَ﴾ (۶۰-۱۵) اس کے لیے ہم نے ٹھہرا دیا ہے کہ وہ پیچھے رہ جائے گی۔

فرمایا ہے اور اسی سے غُبْرَةٌ ہے جس کے معنی تھنوں میں باقی ماندہ دودھ کے ہیں۔ اس کی جمع اَغْبَارٌ آتی ہے غُبْرُ اللَّيْلِ: رات کا بقیہ۔ غُبْرُ الْحَيْضِ: حیض کا بقیہ۔

الْغُبَارُ (مٹی اڑنے کے بعد جو گرد و غبار (فضا میں) باقی رہ جاتا ہے، اسے غبار کہا جاتا ہے۔ یہ دُخَانٌ اور عُثَارٌ

وغیرہما (فعال) کے وزن پر ہے جو کہ بقیہ شے کے معنی میں استعمال ہوتے ہیں اور غَبَرُ الْغُبَارِ کے معنی ہیں گرد و غبار بلند ہونا اور اڑنا کے ہیں۔

بعض نے کہا ہے کہ غَابِرٌ: کا لفظ ماضی اور باقی (مستقبل) دونوں پر بولا جاتا ہے اس قول کو صحیح مان لینے کی صورت میں یہ توجیہ ہو سکتی ہے کہ غبار بھی چونکہ زمین سے اٹھ کر اوپر چڑھ جاتا ہے۔ اس لحاظ سے غَابِرٌ بمعنی ماضی آ جاتا ہے اور دوڑتے ہوئے چونکہ غبار پیچھے باقی رہ جاتا ہے اس لحاظ سے غَابِرٌ بمعنی باقی یعنی مستقبل آ جاتا ہے۔ اور غبار سے غُبْرَةٌ مشتق ہے اور اس کے معنی یا تو اس گرد و غبار کے ہیں جو کسی چیز پر جم جاتا ہے اور خاکستری رنگ کی چیز کو بھی غُبْرَةٌ کہا جاتا ہے۔ اور آیت۔

﴿وَجُوهٌ يَوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ﴾ (۸۰-۳۰) اور کتنے منہ ہوں گے جن پر گرد پڑی ہوئی ہوگی۔

میں بطور کنایہ حسرت آگس چہرے سے مراد ہیں جو غم کے باعث افسردہ نظر آئیں گے جس طرح کہ ﴿ظَلَّ وَجْهُهُ مُسْوَدًّا﴾ (۵۸-۱۶) میں چہرہ کے سیاہ پڑنے سے غمناک ہونا مراد ہے کہا جاتا ہے۔ غَبَرٌ، غُبْرَةٌ وَاعْبَرُوا غَبْرًا: غبار آلود ہونا اور طرفہ کے شعر (الطویل)

(۳۲۶) رَأَيْتُ بَنِي غَبْرَاءَ لَا يُنْكِرُونَ نَبِيَّ

اپنے ساتھی کا حق مارنے کے ہیں ۵ اگر یہ کمی مال وغیرہ میں ہو تو عَبْنَ فَلَانٌ کہا جاتا ہے اور اگر رائے وغیرہ میں ہو تو عَبْنٌ کہتے ہیں اور عَبْنْتُ كَذَا عَبْنْتُ کے معنی کسی چیز سے غفلت برتنے کو خسار خیال کرنے کے ہیں اور قرآن پاک میں ﴿يَوْمَ التَّغَابُنِ﴾ (۹۶۳-۹۶۴) نقصان اٹھانے کا دن سے يَوْمَ الْقِيَامَةِ مراد ہے کیونکہ قیامت کے روز اس مبايعت (معاملہ) میں جس کی طرف کہ آیت:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَشْرِي نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ﴾ (۲۰۷-۲۰۸) اور کوئی شخص ایسا ہے کہ خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اپنی جان بیچ ڈالتا ہے۔

﴿إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ﴾ (۹-۱۱) آلائیہ خدا نے مومنوں سے ان کی جانیں اور ان کے مال خرید لیے ہیں۔

﴿الَّذِينَ يَشْتَرُونَ بِعَهْدِ اللَّهِ وَأَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيلًا﴾ (۳-۷) جو لوگ خدا کے اقراروں اور اپنی قسموں کو (بیچ ڈالتے ہیں اور ان) کے عوض تھوڑی قیمت حاصل کرتے ہیں۔

میں اشارہ فرمایا ہے نقصان ظاہر ہوگا اور انہیں معلوم ہو جائے گا کہ دنیا میں اس معاملہ کو جو انھوں نے اپنے اللہ

نقراء اور مہمان مجھے اجنبی خیال نہیں کرتے ہیں اور نہ اغنیاء مجھ سے ناواقف ہیں۔

میں بَنِي عَبْرَاءَ سے ریگستانوں میں رہنے والے لوگ مراد ہیں۔ ۱ جو ہر وقت غبار آلود رہتے ہیں جیسا کہ بنو السبیل سے مراد مسافر ہوتے ہیں۔ اور دَاهِيَةُ عَبْرَاءَ (بڑی مصیبت کا) محاورہ یا تو عَبْرَ الشَّيْءِ سے ماخوذ ہے جس کے معنی غبار میں واقع ہونے کے ہیں گویا مصیبت بھی انسان کو غیر آلود کر دیتی ہے اور ہوش سنبھالنے نہیں دیتی اور یا یہ عَبْرٌ سے مشتق ہے جس کے باقی رہنے کے ہیں اس اعتبار سے عَبْرَاءُ اس مصیبت کو کہا جائے گا جو باقی رہے اور گزرنے نہ پائے اور یا یہ عَبْرَةُ اللَّوْنِ سے مشتق ہے جس طرح کہ دَاهِيَةُ زَبَاءَ کا محاورہ ہے اور یا عَبْرَةُ اللَّبَنِ سے جس کے معنی تھنوں میں بقیہ دودھ کے ہیں۔ اور ان سب اشتقاقیات کے اعتبار سے عَبْرَاءُ اس مصیبت کو کہا جائے گا جو گزر جانے کے بعد بھی اپنا اثر چھوڑ جائے اور یا یہ عِرْقُ عَبْرٌ سے ماخوذ ہے جس کے معنی پیہم تڑپنے والی رگ کے ہیں چنانچہ جاتا ہے (عَبْرُ الْعِرْقِ) رگ پھڑکی۔ اَلْعُبَيْرَاءُ نوع از گیاه ریگستانی، شمرہ گیاه جو غبار کے رنگ پر ہوتا ہے۔

## (غ ب ن)

اَلْغَبْنُ (ض) کے معنی باہمی معاملہ میں پوشیدہ طور پر

۱ وتامہ ولا اهل، بذلك الطرف الممدد - والبيت من مغلقة المشهورة التي مطلعها: لحولة اطلال بركة نهمد - تلوح كباقى الوشم فى ظاهر اليد قال المبرداراد بنى غبراء للصوص والمشهور المراد منه الفقراء والاضياف بالبيت فى الخزنة (۲۲۸: ۴) واللسان وشرح ابن الانبارى (۱۹۲) والمعانى للقتبى ۲۴۸ والعشر للتبريزى - ۸ ومختار الشعر الجاهلى (۲۳۱/۱) والعينى (۴۱۰: ۱) والفاائق (۸۰: ۲) والجمهرة ۵۵ والعقد الثمين ۵۷ والانبارى ۴۸۰۔

۲ قال الحريرى الغبن باسكان الباء فى المال وفتحها يقع فى العقل والرأى قال الخفاجى وهذا ماذهب اليه بعض اهل اللغة وليس المتعين ۱۲۔

جائے ۵ اور اس کی کچھ بھی پرواہ نہ کی جائے۔ اسی سے کہا جاتا ہے۔ غَثَا الْوَادِی (ن) غَثَوًا: یعنی وادی میں کوڑا کرکٹ زیادہ ہوگیا۔ غَثَتْ (ض) نَفْسُهُ تَغْثِی غَثِیَانَا اس کی طبیعت خراب ہوگئی۔

### (غ د ر)

الْعَذْرُ (ض) اس کے اصل معنی کسی چیز میں خلل واقع کرنے اور اسے چھوڑ دینے کے ہیں اور تَرَكَ الْعَهْدَ یعنی بے وفائی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اسی سے فُلَانٌ عَادِرٌ (بے وفا) کا محاورہ ہے۔ عَادِرٌ کی جمع غَزَرَةٌ ہے۔ اور بہت بڑے بے وفا اور عہد شکن کو عَذَارٌ کہا جاتا ہے۔ اَلْأَعْدَرُ وَالْعَدِيرُ اس پانی کو کہتے ہیں جو سیلاب کسی جوہڑ میں چھوڑ جائے عَدِيرٌ کی جمع عُذْرَانٌ وَعُذْرٌ: آتی ہے اور اسْتَغْدَرَ الْعَدِيرُ کے معنی ہیں: تالاب میں پانی جمع ہوگیا۔

عَدِيرَةٌ: لمبے بال، گیسو باندھنے اس کی جمع اَلْعَدَائِرُ ہے اور عَادَرَةٌ کے معنی ہیں اس نے اسے چھوڑ دیا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿لَا يَعْادِرُ صَغِيرَةً وَلَا كَبِيرَةً إِلَّا أَحْصَاهَا﴾ (۱۸-۳۹) نہ چھوٹی بات کو چھوڑتی ہے نہ بڑی (کوئی) بات بھی نہیں) مگر اسے لکھ رکھا ہے۔

﴿فَلَمْ يُعَادِرْ مِنْهُمْ أَحَدًا﴾ (۱۸-۴۷) تو ان میں سے کسی کو بھی نہ چھوڑیں گے۔

عَدَرَتِ الشَّائِنُ (عَنِ الْغَنَمِ) کے معنی بکری کے

کے ساتھ کیا تھا، چھوڑ کر اس کی بجائے متاع دنیا حاصل کر کے انھوں نے کس قدر نقصان اٹھایا ہے کسی سے دریافت کیا گیا کہ قرآن پاک میں قیامت کو یَوْمُ التَّغَابُنِ کیوں کہا گیا ہے تو انھوں نے جواب دیا کیونکہ وہاں ان مقادیر (پیمانوں) کے خلاف اشیاء کا ظہور ہوگا جن کے مطابق وہ دنیا میں اندازہ لگایا کرتے تھے۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اصل میں غَبْنٌ کے معنی کسی چیز کو چھپانے کے ہیں اور اَلْغَبْنُ (بفتح الباء) اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں کوئی چیز چھپائی جائے اور دلیل میں یہ شعر پیش کیا ہے۔ ۵ (المسر ح)

(۳۲۷) وَلَمْ أَرْمِلْ الْفَتِيَانِ فِيْ غَبْنٍ

الرَّأْيِ يُنْسَى عَوَاقِبُهَا

اس رائے کے چھپانے میں نو جوانوں جیسا کوئی نہیں دیکھا جس کے نتائج کو بھلا دیا جائے۔

چنانچہ مڑنے والے اعضاء جیسے نعل اور کبجہ ران وغیرہ کو مغابن کہا جاتا ہے کیونکہ اعضاء کے یہ حصے بھی پوشیدہ رہتے ہیں اور (نفاست پسند) عورت کو طَبِيَّةُ الْمَغَابِنِ کہا جاتا ہے۔

### (غ ث و)

اَلْغُثَاءُ: ہانڈی کے جھاگ اور اس کوڑا کرکٹ کو کہتے ہیں جسے سیلاب بہا کر لاتا ہے اور یہ ہر اس چیز کے لیے ضرب المثل ہے جسے (بوجہ بے سود ہونے کے) ضائع ہونے دیا

۱ قاله عدی بن زید مناة والبيت في امالي ابن السجری وشرح الدرر للحمفاجی ۲-۳ وفي روايتها..... في غن اله ايام ينسون ماعواقبها والبيت في الشعراء ۵۲ والعمدة (۱۰۴: ۱) والاغانی (۱۴۸/۲) والمعانی الكبير للقبتي ۱۲۷۰ قال وغبس الايام ما يغبن منهما فينقضى ان عملوا فيه لآخرتهم وبعده: ما يغفلوا لا يکن لهم يتم في كل صرف تسعی ماربها ولم ارفی المراجع من رواه برواية المؤلف فاخشى ان تكون الرواية محرفة۔

۲ وفي القرآن فجعلتهم غثاء (۲۳-۴۱)

﴿عُدُّوْهَا شَهْرٌ وَرَوَّاحُهَا شَهْرٌ﴾ (۱۲-۳۳) اس کا صحیح کا جانا ایک مہینہ کی راہ ہوتی ہے اور شام کا جانا بھی ایک مہینے کی۔

اور عُدَاةٌ کے مقابلہ میں عَشِيٌّ جیسے فرمایا۔  
﴿بِالْعُدَاةِ وَالْعَشِيِّ﴾ (۵۲-۶) صبح و شام۔

الْعَادِيَةُ: صبح کا بادل۔ الْعُدَاةُ: کھانا جو دن کے ابتدائی حصہ میں کھالیا جائے عُدُوْتُ اَعْدُوُ کے معنی ہیں: صبح سویرے روانہ ہونا یا کسی جگہ پہنچ جانا ہیں۔ قرآن میں ہے۔

﴿اَنْ غَدُوْا عَلٰی حَرْبِنَا﴾ (۲۸-۲۲) اپنی کھیتی پر سویرے ہی جا پہنچو۔

عَدُوٌّ: کل آئندہ۔ جیسا کہ آیت  
﴿سَيَعْلَمُوْنَ عُدَا﴾ (۵۴-۲۶) ان کو کل معلوم ہو جائے گا۔ اور دیگر آیات میں مذکور ہے۔

### (غُرُ)

غَرَرْتُ (ن) فُلَانًا (فریب دینا) کسی کو غافل پاکر اس سے اپنا مقصد حاصل کرنا۔ غِرَّةٌ: بیداری کی حالت میں غفلت۔ غِرَارٌ: اونگھ کے ساتھ غفلت، اصل میں یہ غُرٌّ سے ہے جس کے معنی کسی شے پر ظاہری نشان کے ہیں۔

اسی سے غُرَّةُ الْفَرَسِ (گھوڑے کی پیشانی کی سفیدی) ہے اور غِرَارُ السَّيْفِ کے معنی تلوار کی دھار کے ہیں۔ غِرَالُ الثَّوْبِ: کپڑے کی تہ۔ اسی سے محاورہ ہے۔

إِطْوَاهُ عَلَى غِرَةٍ: کپڑے کو اس کی تہ پر پلٹ دینا یعنی اس معاملہ کو جوں کا توں رہنے دو۔ غِرَةٌ كَذًا غُرُوْرًا: اسے فریب دیا۔ گویا اسے اس کی تہ پر پلٹ دیا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ﴾ (۸۲-۶) اے انسان!

دوسری بکریوں سے پیچھے رہ جانا کے ہیں اس سے صیغہ (صفت فاعلی) غَدَرٌ ہے اور غَدَرٌ اس سنگ زار زمین کو کہتے ہیں جس میں عرصہ دراز تک ویران پڑا رہنے کی وجہ سے، سوراخ پڑ گئے ہوں اور اس میں اونٹ یا گھوڑا چلے تو لٹکڑا ہو جائے اسی سے محاورہ ہے: مَا أَتَبَتْ غَدَرُ هَذَا الْفَرَسِ کہ یہ گھوڑا کس قدر ثابت قدم ہے مَا أَتَبَتْ غَدَرُهُ وہ کس قدر ثابت قدم ہے یہ اس شخص کے حق میں بولتے ہیں جو لغزش کے موقعہ پر ثابت قدم رہے۔

### (غَدَقَ)

الْغَدَقُ: کے معنی بہت زیادہ اور وافر کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔  
﴿لَا سَقِيْنَهُمْ مَّاءَ غَدَقًا﴾ (۷۲-۱۶) تو ہم ان کے پینے کو بہت سا پانی دیتے۔

اور اسی سے غَدَقْتُ عَيْنَهُ تَغْدُقُ ہے جس کے معنی آنکھ سے خوب پانی بہنا کے ہیں اور غَدَقْتُ ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو وافر اور زیادہ ہو عام اس سے کہ پانی ہو یا گھنگھو اور یاد دوز ہو۔

### (غَدُوْ)

الْغَدُوَّةُ وَالْعُدَاةُ کے معنی دن کا ابتدائی حصہ کے ہیں۔ قرآن پاک میں عُدُوْ (غَدُوَّة کی جمع) کے مقابلہ میں اَصَالَ استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ فرمایا۔

﴿بِالْغُدُوِّ وَالْأَصَالِ﴾ (۷-۲۰۵) صبح و شام (یاد کرتے رہو)۔

اور عُدُوْ (مصدر) رَوَّاحِ کے مقابلہ میں جیسے فرمایا:

چیز مراد ہے جو انسان کو فریب میں مبتلا کر دے بعض نے غُرُور سے مراد صرف شیطان لیا ہے کیونکہ جو چیزیں انسان کو فریب میں مبتلا کرتی ہیں، شیطان ان سب سے زیادہ خبیث ہے اور بعض نے اس کی تفسیر دنیا سے کی ہے کیونکہ دنیا بھی انسان سے فریب کھیتی ہے دھوکا دیتی ہے نقصان پہنچاتی ہے اور گزر جاتی ہے۔

الْغُرُورُ: دھوکا۔ یہ غُر سے ہے اور (حدیث میں) بیع الْغَرَر سے منع کیا گیا ہے۔ ﴿٥٤﴾ الْغَرِيرُ: اچھا خلق۔ کیونکہ وہ بھی دھوکے میں ڈال دیتا ہے۔ چنانچہ (بوڑھے شخص کے متعلق محاورہ ہے۔ فُلَانٌ اَذْبَرَ غَرِيرَهُ وَاَقْبَلَ هَرِيرَهُ) (اس سے حسن خلق جاتا رہا اور چڑچڑاپن آ گیا) اور غُرَّةُ الْفَرَسِ سے تشبیہ کے طور پر مشہور معروف آدمی کو اَغْرَ کہا جاتا ہے اور مہینے کی ابتدائی تین راتوں کو غُر کہتے ہیں کیونکہ مہینہ میں ان کی حیثیت غُرَّةُ الْفَرَسِ کی ہوتی ہے غِرَارُ السَّيْفِ: تلوار کی دھار اور غِرَارٌ کے معنی تھوڑا سا دودھ کے بھی آتے ہیں اور غَارَاتِ النَّاقَةِ کے معنی ہیں اونٹنی کا دودھ کم ہو گا لاکہ اس کے متعلق یہ گمان نہ تھا کہ اس کا دودھ کم ہو جائے گا گویا کہ اس اونٹنی نے مالک کو دھوکا دیا۔

### (غ ر ب)

الْغَرْبُ: (ن) سورج کا غائب ہو جانا۔ غَرَبَتْ تَغْرُبُ غَرْبًا وَغُرُوبًا سورج غروب ہو گیا اور مَغْرِبُ الشَّمْسِ وَمُغِيرٌ نَهَا (مصرغ) کے معنی آفتاب غروب ہونے کی جگہ یا وقت کے ہیں۔ ﴿قرآن میں ہے۔

تجھ کو اپنے پروردگار کرم گستر کے باب میں کس چیز نے دھوکا دیا۔

﴿لَا يَغُرُّكَ تَقَلُّبُ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي الْبِلَادِ﴾ (۱۹۶-۳) (اے پیغمبر) کافروں کا شہروں میں چلنا پھرنا تمہیں دھوکا نہ دے۔

﴿وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطَانُ إِلَّا غُرُورًا﴾ (۶۴-۱۷) اور شیطان جو وعدے ان سے کرتا ہے سب دھوکا ہے۔

﴿بَلْ إِنْ يَعِدِ الظَّالِمُونَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا إِلَّا غُرُورًا﴾ (۴۰-۳۵) بلکہ ظالم جو ایک دوسرے کو وعدہ دیتے ہیں محض فریب ہے۔

﴿يُوحِي بَعْضُهُمْ إِلَى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُورًا﴾ (۱۱۳-۶) وہ دھوکا دینے کے لیے ایک دوسرے کے دل میں طمع کی باتیں ڈالتے رہتے ہیں۔

﴿وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا مَتَاعُ الْغُرُورِ﴾ (۱۸۵-۳) اور دنیا کی زندگی تو دھوکے کا سامان ہے۔

﴿وَعَرَّتْهُمْ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا﴾ (۷۰-۶) اور دنیا کی زندگی نے ان کو دھوکے میں ڈال رکھا ہے۔

﴿مَا وَعَدَنَا اللَّهُ وَرَسُولُهُ إِلَّا غُرُورًا﴾ (۱۲-۳۳) کہ خدا اور اس کے رسول نے ہم سے دھوکے کا وعدہ کیا تھا۔

﴿وَلَا يَغُرُّكُمْ بِاللَّهِ الْغُرُورُ﴾ (۳۱-۳۳) اور نہ فریب دینے والا (شیطان) تمہیں خدا کے بارے میں کسی طرح کا فریب دے۔

پس غرور سے مال و جاہ، خواہش نفسانی، شیطان اور ہر وہ

① رواہ الجماعة الا البخاری من حدیث ابی ہریرۃ واحمد من حدیث ابن عمرو ابن ماجة من حدیث ابن عباس وعن سهل عند الطبرانی والبیع الغررصور (راجع النیل (۱۵۶:۵-۱۵۷) ومنه المثل الغرة تجلب الندرة (المیدانی ۲/۲۲)

② تصنیع مغربان

نے ایک کو ابھی جازمین کریدنے لگا۔

اور عَارِبُ السَّنَامِ کے معنی کوہان کی بلندی کے ہیں کیونکہ (بلندی کی وجہ سے) اس تک پہنچنا مشکل ہوتا ہے اور غَرْبُ السَّيْفِ کے معنی تلوار کی دھار کے ہیں کیونکہ تلوار بھی جسے ماری جائے اس میں چھپ جاتی ہے لہذا یہ مصدر بمعنی فاعل ہے۔ پھر جس طرح زبان کو تلوار کے ساتھ تشبیہ دی جاتی ہے اسی طرح زبان کی تیزی کو بھی تلوار کی تیزی کے ساتھ تشبیہ دے کر فُلَانٌ غَرْبُ اللِّسَانِ (فلاں تیز زبان ہے) کہا جاتا ہے اور کنوئیں میں بعد مسافت کے معنی کا تصور کر کے ڈول کو بھی غَرْبُ کہہ دیا جاتا ہے اور اَغْرَبَ السَّاقِي کے معنی ہیں: پانی پلانے والے نے ڈول پکڑا۔ اور غَرْبُ کے معنی سونا بھی آتے ہیں کیونکہ یہ بھی دوسری معدنیات سے قیمتی ہوتا ہے اور اسی سے سَهْمٌ غَرْبُ کا محاورہ ہے یعنی وہ تیر جس کے متعلق یہ معلوم نہ ہو کہ کدھر سے آیا ہے۔ اور بلا ارادہ کسی طرف دیکھنے کو نَظَرٌ غَرْبُ کہا جاتا ہے اور غَرْبُ کا لفظ بے پھل درخت پر بھی بولا جاتا ہے گویا وہ ثمرات سے دور ہے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ عَنَقَاءُ جانور ایک لڑکی کو اٹھا کر دور دراز لے گیا تھا۔ اس وقت سے اس کا نام عَنَقَاءُ مُغْرِبٌ أَوْ عَنَقَاءُ مُغْرِبٍ (اضافت کے ساتھ) پڑ گیا۔

الْعُرَابَانِ: سرینوں کے اوپر دونوں جانب کے گڑھے جو

﴿رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ﴾ (۷۳-۹۰) (وہی) مشرق اور مغرب کا مالک ہے۔

﴿رَبُّ الْمَشْرِقَيْنِ وَرَبُّ الْمَغْرِبَيْنِ﴾ (۵۵-۱۷) وہی دونوں مشرقوں اور مغربوں کا مالک ہے۔

﴿رَبِّ الْمَشَارِقِ وَالْمَغَارِبِ﴾ (۷۰-۴۰) مشرقوں اور مغربوں کے مالک کی قسم۔

ان کے ثنئیہ اور جمع لانے کی بحث پہلے گزر چکی ہے۔<sup>②</sup> نیز فرمایا۔

﴿لَا شَرْقِيَّةَ وَلَا غَرْبِيَّةَ﴾ (۲۴-۳۴) کہ نہ مشرق کی طرف ہے اور نہ مغرب کی طرف۔

﴿حَتَّىٰ إِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَغْرُبُ﴾ (۱۸-۸۶) یہاں تک کہ جب سورج کے غروب ہونے کی جگہ پہنچا۔

اور ہر اجنبی کو غریب کہا جاتا ہے اور جو چیز اپنی ہم جنس چیزوں میں بے نظیر اور انوکھی ہو اسے بھی غَرِيبٌ کہہ دیتے ہیں۔ اسی معنی میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔<sup>③</sup>

(۵۸) اَلْإِسْلَامُ بَدَأَ غَرِيبًا وَسَيَعُودُ كَمَا بَدَأَ کہ اسلام ابتداء میں غریب تھا اور آخر زمانہ میں پھر پہلے کی طرح ہو جائے گا اور جہلاء کی کثرت اور اہل علم کی قلت کی وجہ سے علماء کو غرباء کہا گیا ہے۔ اور کَوَّے کو عُرَابِ اس لیے کہا گیا ہے کہ وہ بھی دور تک چلا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿قَبَعَتِ اللَّهُ عُرَابًا يَبِخْتُ﴾ (۵-۳۱) اب اللہ

② راجع (ش ر ق)

③ الحدیث باختلاف الفاظ فی (۴م) عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ وابن مسعود و انس بن مالک رضی اللہ عنہ وفی (طب) عن سلمان وسہل بن سعد وابن عباس وبمعناہ فی الترمذی عن عمر بن عوف المزنی وابو نصر السجزی فی الایانة عن عبدالرحمان بن سنۃ ونعیم بن حماد فی الفتن عن مجاہد والحاکم عن سہل بن ابی وقاص (انظر کنز العمال رقم ۱۱۹۳ - ۱۱۹۵ و رقم ۱۱۹۹ : ۱۲۰۲۔

قرآن پاک میں ہے۔

﴿الْأَمْسِ اغْتَرَفَ غُرْفَةً بِيَدِهِ﴾ (۲-۲۳۹) ہاں اگر کوئی ہاتھ سے چلو بھر پانی لے لے (تو خیر)۔

اسی سے بطور استعارہ کہا جاتا ہے۔ غَرَفْتُ عَرَفَ الْفَرَسِ: میں گھوڑے کی پیشانی کے بال کاٹ ڈالے۔ غَرَفْتُ الشَّجَرَةَ: میں نے درخت کی ٹہنیوں کو کاٹ ڈالا۔

الْغَرَفُ: ایک قسم کا پودا (جس سے چڑے کو دباغت دی جاتی ہے) غَرَفْتُ الْإِبِلُ: اونٹ غر ف کھا کر بیمار ہو گئے۔ الْغُرْفَةُ: بالا خانہ (جمع غُرَفٌ وَغُرَفَاتٌ) قرآن میں جنت کے منازل اور درجات کو اَلْغُرَفُ کہا گیا ہے۔ چنانچہ فرمایا۔

﴿وَأُولَٰئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوا﴾ (۲۵-۷۵) ان صفات کے لوگوں کو ان کے صبر کے بدلے اونچے اونچے محل دیئے جائیں گے۔

﴿لَنَبْوِئَنَّهُمْ مِنَ الْجَنَّةِ غُرَفًا﴾ (۲۹-۵۸) ان کو ہم بہشت کے اونچے اونچے محلوں میں جگہ دیں گے۔

﴿وَهُمْ فِي الْغُرَفَاتِ آمِنُونَ﴾ (۳۳-۳۷) اور وہ خاطر جمع سے بالا خانوں میں بیٹھے ہوں گے۔

### (غ ر ق)

الْغَرَقُ: پانی میں تہ نشین ہو جانا، کسی مصیبت میں گرفتار ہو جانا۔ غَرِقَ (س) فُلَانٌ يَغْرَقُ غَرَقًا: فلاں پانی میں ڈوب گیا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿حَتَّىٰ إِذَا أَدْرَكَهُ الْغَرَقُ﴾ (۱۰-۹۰) یہاں تک کہ

ہیئت میں کوئے کی طرح معلوم ہوتے ہیں۔ اَلْمُغْرَبُ گھوڑا جس کا کرانہ چشم سفید ہو کیونکہ اس کی آنکھ اس سفیدی میں عجب و غریب نظر آتی ہے۔ اور آیت کریمہ۔

﴿غَرَابِيبُ سُودٌ﴾ (۳۵-۲۷) کالے سیاہ ہیں۔ میں بعض نے کہا ہے کہ غَرَابِيبُ کا واحد غَرَابِيبُ ہے اور اس کے معنی کوئے کی طرح بہت زیادہ سیاہ کے ہیں جس طرح کہ اَسْوَدُ كَحَلَكِ الْغَرَابِ کا محاورہ ہے۔

(یعنی مفت تا کیدی ہے اور اس میں قلب پایا جاتا ہے اصل میں سُودٌ غَرَابِيبُ ہے۔)

### (غ ر ض)

الْغَرَضُ کے اصل معنی نشانہ کے ہیں پھر ہر اس غایت کو جہاں پہنچنا مقصود ہو، غَرَضٌ کہا جاتا ہے۔ اس کی جمع اَغْرَاضٌ آتی ہے۔

غرض دو قسم پر ہے۔ غرض ناقص جو بالذات مقصود نہ ہو بلکہ اس سے کوئی دوسری چیز مقصود ہو جیسے تو گری یا ریاست یا اس قسم کی دوسری اغراض جن کے حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کرتے ہیں (۲) غرض تام: جس کے بعد کسی اور چیز کا اشتیاق باقی نہ رہے۔ جیسے جنت۔

### (غ ر ف)

الْغَرَفُ (ض) کے معنی کسی چیز کو اٹھانے اور پکڑنے کے ہیں جیسے: غَرَفْتُ الْمَاءَ أَوِ الْمَرْقَ (میں نے پانی یا شوربہ لیا) اور غُرْفَةُ: کے معنی چلو بھر پانی کے ہیں اور اَلْغُرْفَةُ ایک مرتبہ چلو سے پانی نکالنا اَلْمِغْرَفَةُ: ججغ غیرہ جس سے شوربہ وغیرہ نکال کر برتن میں ڈالا جاتا ہے۔

① کذا قال النسفی راجع معجم القرآن لعبد الرؤف مصری ۱۲۔

② وليس فی القرآن من هذا المادة ۱۲۔

جب اسے غرقابی نے آلیا۔

أَغْرَقَهُ (افعال) اس نے اسے ڈبو یا غرق کر دیا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَأَغْرَقْنَا آلَ فِرْعَوْنَ﴾ (۵۰-۲) اور ہم نے آل فرعون کو غرق کر دیا۔

﴿فَأَغْرَقْنَاهُ وَمَنْ مَعَهُ جَمِيعًا﴾ (۱۰۳-۱۷) تو ہم نے اس کو اور جو اس کے ساتھ تھے، سب کو ڈبو دیا۔

﴿ثُمَّ أَغْرَقْنَا بَعْدُ الْبَاقِينَ﴾ (۱۲-۶۶) پھر اس کے بعد باقی لوگوں کو ڈبو دیا۔

﴿وَأَن نَّشَأَ نَغْرِقَهُمْ﴾ (۴۳-۳۶) اور اگر ہم چاہیں تو ان کو غرق کر دیں۔

﴿أَغْرِقُوا فَاذْخُلُوا نَارًا﴾ (۲۵-۷۱) غرقاب کر دیے گئے پھر آگ میں ڈال دیے گئے۔

﴿فَكَانَ مِنَ الْمَغْرِقِينَ﴾ (۴۳-۱۱) اور وہ ڈوب گیا اور تشبیہ کے طور پر زیر بارا حسان ہونے کے لیے بھی

الْغَرَقُ کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ جیسے:

فُلَانٌ غَرِقَ فِى نِعْمَةٍ فُلَانٍ: فلاں اس کے احسانات میں ڈوبا ہوا ہے۔<sup>۱</sup>

## ( غ ر م )

الْغَرْمُ (مفت کا تاوان یا جرمانہ) وہ مالی نقصان جو کسی قسم کی خیانت یا جنایت (جرم) کا ارتکاب کیے بغیر انسان کو اٹھانا پڑے غَرِمَ كَذَا غَرْمًا وَمَغْرَمًا فلاں نے نقصان اٹھایا اُغْرِمَ فُلَانٌ غَرَامَةً اس پر تاوان پڑا

گیا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿إِنَّا لَمُغْرَمُونَ﴾ (۶۶-۵۶) (کہ ہائے) ہم مفت تاوان میں پھنس گئے۔

﴿فَهُمْ مِّنْ مَّغْرَمٍ مُّتَقَلِّوْنَ﴾ (۴۰-۵۲) کہ ان پر تاوان کا بوجھ پڑ رہا ہے۔

﴿يَتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ مَغْرَمًا﴾ (۹۸-۹) کہ جو کچھ خرچ کرتے ہیں اسے تاوان سمجھتے ہیں۔

اور غَرِيمٌ کا لفظ مقروض اور قرض خواہ دونوں کے لیے آتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَالْغَارِمِينَ فِى سَبِيلِ اللّٰهِ﴾ (۶۰-۹) اور قرض داروں (کے قرض ادا کرنے) کے لیے اور خدا کی راہ میں۔

اور جو تکلیف یا مصیبت انسان کو پہنچتی ہے اسے غَرَامٌ کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿إِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا﴾ (۶۵-۲۵) کہ اس کا عذاب بڑی تکلیف کی چیز ہے۔

یہ هُوَ مَغْرَمٌ بِالنِّسَاءِ (وہ عورتوں کا دلدادہ ہے) کے محاورہ سے ماخوذ ہے یعنی وہ شخص جو غَرِيمٌ (قرض خواہ) کی طرح عورتوں کے پیچھے پیچھے پھرتا ہو۔ حسن بنی اللہ فرماتے ہیں:

﴿كُلُّ غَرِيمٍ مُّقَارِقٌ غَرِيمَةٌ إِلَّا النَّارُ﴾ یعنی ہر قرض خواہ اپنے مقروض کو چھوڑ سکتا ہے۔ لیکن آگ اپنے غَرَمَاءُ کو نہیں چھوڑے گی۔

بعض نے عذاب جہنم کو غرام کہنے کی یہ وجہ بیان کی ہے کہ

بعض نے عذاب جہنم کو غرام کہنے کی یہ وجہ بیان کی ہے کہ

۱ و جاء بمعنى المبالغة فى الشيء كما فى الآية والنزاعات غرقا (۷۹-۱) معناه الترع بالمبالغة والقوة التامة (راجع،

الكشاف ۳/۳۰۸) ج ۳۔

۲ راجع لقول الحسن



الْغَزَالَةُ: سورج کی ٹکیہ اور کنایہ کے طور پر غَزَلٌ (س) اور مُعَاذَلَةٌ کے معنی غزال یعنی ہرنوٹے جیسی خوبصورت عورتوں کے ساتھ عشق و محبت اور دلچسپی کی باتیں کرنا آتے ہیں۔

غَزَلُ الْكَلْبِ غَزَالًا کتے کا ہرن کو پا کر اس سے پیچھے ہٹ جانا۔

### (غ ز و)

الْغَزْوُ کے معنی دشمن سے جنگ کرنے کے ارادے سے نکلتا ہیں۔ غَزَا يَغْزُو غَزْوًا: وہ دشمن سے جنگ کے ارادہ سے نکلا ایسے شخص کو الْغَزَايِ کہا جاتا ہے۔ اس کی جمع غَزَاةٌ وَغَزُوٌّ آتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔ ﴿أَوْ كَانُوا غَزِيًّا﴾ (۱۵۶-۳) یا وہ جہاد کر رہے ہوں۔

### (غ س ق)

غَسَقُ اللَّيْلِ کے معنی (ابتدائے) شب کی سخت تاریکی کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿إِلَى غَسَقِ اللَّيْلِ﴾ (۷۸-۱) رات کی تاریکی تک۔ الْغَاسِقُ: تاریک رات۔ ﴿قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ إِذَا وَقَبَ﴾ (۱۱۳-۳) اور شب تاریک کی برائی سے جب اس کی تاریکی چھا جائے۔ اور اس سے مراد رات کے وقت پیش آنے والی مصیبت یا حادثہ کے ہیں۔ جیسے طَارِقٌ (رات کے وقت آنے والا) بعض نے کہا ہے کہ ﴿غَاسِقٌ چاند کو کہتے ہیں جب کہ وہ

وہ عذاب ان کا اسی طرح پیچھا کرے گا یا وہ انہیں ہلاک کرنے پر شیفۃ ہے۔

### (غ د و)

غَرِي يَبْكَدًا کے معنی کسی کے ساتھ چٹ جانا ہیں اصل میں یہ غَرَاءُ سے ہے اور غَرَاءُ اس مادہ کو کہتے ہیں جس سے کسی چیز کو دوسری کے ساتھ پیوست کیا جائے اور اسی سے أَغْرَيْتُ فُلَانًا يَبْكَدًا کے معنی ہیں: میں نے فلاں کو اس پر شیفۃ کر دیا، اس پر ابھارا اور اکسایا اس کے پیچھے لگا دیا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَأَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعِدَاةَ وَالْبَغْضَاءَ﴾ (۱۳-۵) تو ہم نے ان کے باہم، قیامت تک کے لیے دشمنی اور کینہ ڈال دیا۔

﴿لَنُغْرِيَنَّكَ بِهِمْ﴾ (۶۰-۳۳) تو ہم تم کو ان کے پیچھے لگا دیں گے۔

### (غ ز ل)

الْغَزْلُ: (ض) کاتے ہوئے سوت کو کہتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَقَّضْتُ غَزْلَهَا﴾ (۹۲-۱۶) اور اس عورت کی طرح نہ ہونا جس نے اپنا کاتا ہوا سوت اڑھیز دیا۔

غَزَلْتُ غَزْلًا: سوت کا تنا اور ہرنی کے بچہ کو غَزَالٌ کہا جاتا ہے۔

① کذا فسرہ القسبی فی غریبہ وفی الفخر ۱۹۴/۳۲: وهذا قول الفراء وابی عبیدہ وقال الزجاج الغاسق فی اللغة البارہ وسمى الليل غاسقاً لانه ابرد من النهار (القرطبی ۲۰/۲۵۶) وهو قول ابن عباس وغيره روى مرفوعاً

② وهذا ايضا حکاء القسبی فی غریبہ ۵۴۳ وقد نقله القرطبی ۲/۲۵۷ والبحر ۸/۵۳۱ والفخر ۳۲/۱۹۵ واللسان (غسق او قدر وی مرفوعاً (راجع النہایہ ۳/۱۶۱) والطبری ۳۰/۳۵۲) والكشاف ۴/۵۶۸) والدر ۱۸/۴۱۸ والشوکانی ۶/۵۰) راجع کنز العمال عن عائشة (ج ۲ رقم ۷۳)

سے کوئی چیز ڈھانپ دی جائے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَجَعَلَ عَلَىٰ بَصَرِهِ غِشَاوَةً﴾ (۲۳-۲۵) اور

اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا۔

﴿وَعَلَىٰ أَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ﴾ (۲-۷) اور ان کی

آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا ہے۔

مخاورہ ہے: غَشِيَتْ، تَغَشَّاهُ وَغَشِيَتْ: اسے چھپالیا۔

قرآن میں ہے۔

﴿وَإِذَا غَشِيَهُمْ مَّوْجٌ﴾ (۳۱-۳۲) اور جب ان پر

لہریں چھا جاتی ہیں۔

﴿فَغَشِيَهُمْ مِّنَ اللَّيْلِ مَا غَشِيَهُمْ﴾ (۲۰-۷۸) تو

دریا (کی موجوں) نے ان پر چڑھ کر انہیں ڈھانپ

لیا (یعنی ڈبو دیا)۔

﴿وَتَغَشَّىٰ وُجُوهُهُمُ النَّارُ﴾ (۱۳-۵۰) اور ان

کے مونہوں کو آگ لپٹ رہی ہوگی۔

﴿إِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشَى﴾ (۵۳-۱۶) جب

کہ اس بیری پر چھارہا تھا جو چھارہا تھا۔

﴿وَاللَّيْلُ إِذَا يَغْشَى﴾ (۹۲-۱) رات کی قسم جو (دن

کو) چھپالے۔

﴿إِذْ يَغْشِيَكُمُ النَّعَاسُ﴾ (۸-۱۱) جب اس نے

..... تمہیں نیند (کی چادر) اڑھا دی۔

غَشِيَتْ مَوْضِعَ كَذَا: میں فلاں جگہ پر آیا اور کنائیاً

عورت سے مجامعت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے چنانچہ

غَشَّاهَا وَتَغَشَّاهَا کے معنی ہیں: میں نے عورت سے

مجامعت کی۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿فَلَمَّا تَغَشَّاهَا حَمَلَتْ﴾ (۷-۱۱۹) سو جب وہ اس

سے ہم بستری کرتا ہے تو اسے ہلکا سا حمل رہ جاتا ہے۔

گہن لگ کر سیاہ ہو جائے۔ الْغَسَاقُ: دوزخیوں کے

جسموں سے بننے والا لہو یا پیپ۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿إِلَّا حَمِيمًا وَغَسَّاقًا﴾ (۸-۲۵) مگر گرم پانی اور

بہتی پیپ۔

## (غسل)

غَسَلْتُ الشَّيْءَ غُسْلًا: کے معنی کسی چیز پر پانی بہا کر

اسے میل کچیل سے پاک کرنے کے ہیں۔ اسی سے

غُسْلٌ اسم ہے اور غَسَلَ وہ چیز ہے جس کے ساتھ

کپڑے کو دھویا یا نہایا جاتا ہے (جیسے صابن وغیرہ) قرآن

پاک میں ہے۔

﴿فَاغْسِلُوا وُجُوْهُكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ أَلَايَةً﴾

(۵-۶) تو اپنے چہرے اور کہنیوں تک ہاتھ دھولیا کرو۔

الْأَغْتِسَالُ (افتعال) کے معنی نہانے اور تمام بدن کو

دھونے کے ہیں۔ قرآن میں ہے۔

﴿حَتَّىٰ تَغْتَسِلُوا﴾ (۴-۲۳) جب تک کہ غسل نہ کرلو۔

الْمُغْتَسِلُ: نہانے کی جگہ یا نہانے کا پانی۔ قرآن پاک

میں ہے۔

﴿هَذَا مُغْتَسَلٌ بَارِدٌ وَشَرَابٌ﴾ (۳۸-۴۲) یہ

چشمہ نہانے کو ٹھنڈا اور پینے کو شیریں ہے۔

الْغُسْلَيْنِ کے معنی دوزخیوں کے اجسام کا غسل (پیپ)

کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَلَا طَعَامٌ إِلَّا مِنْ غِسْلَيْنِ﴾ (۶۹-۳۶) اور نہ

پیپ کے سوا ان کے لیے کھانا ہے۔

## (غش و)

غَشِيَهُ، غِشَاوَةٌ وَغِشَاءٌ: اس کے پانی اس چیز کی

طرح آیا جو اسے چھپائے۔ غِشَاوَةٌ: (اسم) پردہ جس

﴿فَأَغْشَيْنَهُمْ فَهُمْ لَا يَبْصُرُونَ﴾ (۹-۳۶) ان کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا تو یہ دیکھ نہیں سکتے۔  
 ﴿كَانَ مَا أَغْشَيْتَ وَجُوهَهُمْ﴾ (۱۰-۲۷) ان کے مونہوں (کی سیاہی کا یہ عالم ہوگا کہ ان پر) گویا پردے اڑھا دیئے گئے ہیں۔ اور آیت کریمہ۔

﴿وَاسْتَغْشَوْا ثِيَابَهُمْ﴾ (۷۱-۸۷) کے معنی ہیں کہ انھوں نے کپڑوں سے اپنے کان بند کر لیے اور یہ کسی کی بات پر توجہ نہ دینے سے کنایہ ہوتا ہے بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد دور بھاگ جانا ہے جس طرح کہ شَمَرٌ ذِئْلَهُ اَلْقَى ثَوْبَهُ ہے کہ اس کے معنی کسی کام کی تیاری کے آتے ہیں۔ غَشِيَتْهُ سَوَاطِیْ اَوْ سَيْفًا: میں نے اسے کوڑے یا تلوار سے مارا۔ جس طرح کہ كَسَوْتُهُ وَعَمَّمْتُهُ کے معنی کسی کو كِسَاءً (کبل) پہنانے اور عمامہ باندھنے کے آتے ہیں۔

### (غ ص ص)

اَلْغُصَّةُ: اس ہڈی کو کہتے ہیں جو حلق میں پھنس کر رہ جاتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔  
 ﴿وَوَطَعَا مَا ذَا غُصَّةٍ﴾ (۷۳-۱۳) اور گلو گیر کھانا ہے۔

### (غ ض ض)

اَلْغَضُّ: (ن) کے معنی کمی کرنے کے ہیں خواہ نظر اور صورت میں ہو یا کسی برتن میں سے کچھ کم کرنے کی صورت میں ہو۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿قُلْ لِلْمُؤْمِنِينَ يَغُضُّوا مِنْ أَبْصَارِهِمْ﴾ (۲۴-۳۰) مومن مردوں سے کہ دو کہ اپنی نظریں نیچی رکھا کریں۔  
 ﴿وَقُلْ لِلْمُؤْمِنَاتِ يَغْضُضْنَ﴾ (۲۴-۳۱) اور مومن عورتوں سے بھی کہہ دو (کہ اپنی نگاہیں) نیچی رکھا کریں۔

یہی معنی اَلْغَشِيَان کے ہیں۔ اَلْغَاشِيَةُ: ہر وہ چیز جس سے دوسری چیز کو چھپایا جائے۔ مثلاً غَاشِيَةُ السَّرَج: چمڑا جو زین کے اوپر ڈالا جاتا ہے۔ اور آیت کریمہ۔  
 ﴿أَنْ تَأْتِيَهُمْ غَاشِيَةٌ﴾ (۱۲-۱۰۷) کہ ان پر خدا کا عذاب نازل ہو کر ان کو ڈھانپ لے، میں غَاشِيَةُ سے مراد وہ مصیبت ہے جو چاروں طرف سے ان پر چھا جائے اور گھوڑے کے جھول کی طرح انہیں ڈھانپ لے بعض نے کہا کہ لفظ غَاشِيَةُ اصل میں اچھی چیز کے لیے استعمال ہوا ہے مگر یہاں بطور استعارہ عذاب کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جس طرح آیت کریمہ۔

﴿لَهُمْ مِنْ جَهَنَّمَ مِهَادٌ وَمِنْ فَوْقِهِمْ غَوَاشٍ﴾ (۷-۴۱) ایسے لوگوں کے لیے (نیچے) بچھانا بھی (آتش) جہنم کا ہوگا اور اوپر سے اوڑھنا بھی۔  
 میں ہے کہ (یہاں مِهَادٌ (بچھونے) کے مقابل میں غَوَاشٍ کا لفظ آیا ہے جس سے جہنم کا عذاب مراد ہے۔ اور آیت کریمہ۔

﴿هَلْ أَتَاكَ حَدِيثُ الْغَاشِيَةِ﴾ (۸۸-۱) بھلا تم کو ڈھانپ لینے والی (یعنی قیامت کا) حال معلوم ہے۔ میں اَلْغَاشِيَةُ سے مراد قیامت ہے اور اس کی جمع غَوَاشٍ ہے غُشِيَ عَلَى فُلَانٍ اس پر بیہوش طاری ہوگئی۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿كَالَّذِي يُغْشَى عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ﴾ (۳۳-۱۹) جیسے کسی پر موت سے غشی طاری ہو۔ نَظَرَ اَلْمَغْشَى عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ (۲۷-۲۰) جس طرح کسی پر موت کی بیہوش طاری ہو رہی ہو۔ اَغْشَاهُ اس کی آنکھ پر پردہ ڈال دیا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَبَاءٌ وَأَبْغَضَ مِنَ اللَّهِ﴾ (۲۱-۲) اور وہ خدا کے غضب میں گرفتار ہو گئے۔

﴿وَمَنْ يَحْلِلْ عَلَيْهِ غَضَبِي﴾ (۲۰-۸۱) اور جس پر میرا غصہ نازل ہوا۔

﴿وَعُذِبَ اللَّهُ عَلَيْهِ﴾ (۳-۹۳) اور خدا اس پر غضب ناک ہوگا۔ اور آیت کریمہ۔

﴿غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ﴾ (۱-۷) نہ ان کے جن پر غصے ہوتا رہا۔

میں بعض نے کہا ہے کہ مَغْضُوبٌ عَلَيْهِمْ سے یہود مراد ہیں۔ اور غَضَبٌ کے معنی سخت چٹان کے ہیں۔

الْغَضُوبُ: بہت زیادہ غصے ہونے والا۔ یہ سانپ اور تند مزاج اونٹنی پر بولا جاتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ

فُلَانٌ غَضِبٌ کے معنی ہیں: فلاں بہت جلد غصے ہونے والا ہے۔ بعض نے بیان کیا ہے کہ غَضِبْتُ لِفُلَانٍ

کے معنی کسی زندہ شخص کی حمایت میں ناراض ہونا ہیں اور غَضِبْتُ بِهِ کے معنی کسی مردہ شخص کی حمایت کے لیے

غضب ناک ہونا۔

### (غ ط ش)

﴿وَأَغْطَشَ لَيْلَهَا﴾ (۹-۲۹) اور اس نے رات کو تاریک بنایا۔

﴿وَأَغْضَضُ مِنْ صَوْتِكَ﴾ (۳۱-۱۹) اور (بولتے وقت) آواز نیچی رکھنا۔

اور شاعر کے قول (الوافر) (۳۲۸) فَغَضَّ الطَّرْفَ إِنَّكَ مِنْ نُمَيْرٍ (نگاہ نیچی رکھ تو بنی نمیر سے ہے۔)

میں غَضَّ کا لفظ بطور تمکیم استعمال ہوا ہے۔ غَضَضْتُ السَّقَاءَ: میں نے مشک سے پانی کم کر دیا۔ اور غَضَّ ایسی تر اور تازہ چیز کو کہتے ہیں جس پر ابھی زیادہ عرصہ نہ گزرا ہو۔

### (غ ض ب)

الْغَضَبُ: انتقام کے لیے دل میں خون کا جوش مارنا۔ اسی لیے آنحضرت ﷺ نے فرمایا: (۵۹) ((اتقوا

الغضب فإنه جمره توقد في قلب ابن آدم الم تروا الى انتفاخ اوداجه وحمرة عينيه۔))

کہ غصہ سے بچو بے شک وہ انسان کے دل میں دہکتے ہوئے انگارہ کی طرح ہے تم اس کی رگوں کے پھولنے اور آنکھوں کے سرخ ہو جانے کو نہیں دیکھتے۔ لیکن غضب الہی سے مراد

انتقام (اور عذاب) ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿فَبَاءٌ وَأَبْغَضَ عَلَى غَضَبٍ﴾ (۲-۹۰) تو وہ (اس کے) غضب بالاے غضب میں مبتلا ہو گئے۔

① قاله جريري من كلمته طويلة في النقائص (۴۴۶) يهجو بها عبيد الله بن الحصين الراعي النميري في قصيدته، المشهورة التي تسمى الفاضحة وسماها جرير الدماغة وتماه: فلاكعبا بلغت ولاكلايا۔ راجع ديوانه (۵۷) وتفسير الطبري (۲۱: ۱۲۰) واللسان (غضض) والحكم (حد) والسمط ۸۶۱ والاقتضاب ۵۰ والکامل ۲۹۴ وامالي المرتضى (۲۸۹/۱) والفاضل (۱۰۹) وكنایات الجرجاني ۷۴ والعقد الفريد (۴۶۸: ۲) والجمحي (۱۳۱-۱۴۵) والبحر (۴۴۳: ۶) والکتاب (۱۶۰: ۲) والمعاهد (۱۹۹: ۲) والعمدة (۱۷۰: ۲/۵۰۰: ۱) والحصري (۵۶) والماوردي ۶۱ ومحاضرات الادبار (۱۱۴۳/۱/۸۹) والجمهرة (۵۶) والتنبيه (۲۲) والاغانی (۱۶۹۰: ۲۰/۵۱۰۰: ۳۹: ۷) والحيوان (۲۵۹: ۱) والسيوطي (۱۷)۔

② رواه الترمذی عن ابی سعید الخدری فی حدیث طویل راجع تخريج العراقي علی الاحياء ۱۷۴/۳

③ قد ثبت مرفوعا عن ابی ذر وعن الناس من اصحاب النبی ﷺ (راجع ابن کثیر ۳۰: ۱)

پروردگاری بخشش کی طرف لپکو۔

﴿وَمَنْ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ إِلَّا اللَّهُ﴾ (۳-۱۳۵) اور

خدا کے سوا گناہ بخش بھی کون سکتا ہے۔

اور کبھی غَفَرَلَهُ کے معنی کسی کو ظاہری طور پر معاف کر دینا آتے ہیں، خواہ دل سے معاف نہ کیا ہو یعنی درگزر کرنا۔

جیسے فرمایا۔

﴿قُلْ لِلَّذِينَ آمَنُوا يَغْفِرُ وَلِلَّذِينَ لَا يُرْجُونَ

آيَامَ اللَّهِ﴾ (۴۵-۱۴) مومنوں سے کہہ دو کہ جو لوگ خدا

کے دنوں کی (جو اعمال کے بدلے کے لیے مقرر ہیں)

توقع نہیں رکھتے ان سے درگزر کریں۔

اور اِسْتِغْفَارُ کے معنی قول اور عمل سے مغفرت طلب کرنا

کے ہیں۔ لہذا آیت کریمہ۔

﴿اِسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ إِنَّهُ كَانَ غَفَّارًا﴾ (۷۱-۱۰)

اپنے پروردگار سے معافی مانگو کہ وہ بڑا معاف کرنے والا

ہے، میں صرف زبان کے ساتھ مغفرت مانگنے کا حکم نہیں

ہے۔ بلکہ زبان اور عمل دونوں کے ساتھ معافی طلب

کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس بنا پر بعض نے کہا ہے کہ

صرف زبان سے بخشش طلب کرنا کذاب آدمیوں کا کام

ہے۔ اور یہی معنی آیت کریمہ۔

﴿اُدْعُونِي اَسْتَجِبْ لَكُمْ﴾ (۴۰-۶۰) کہ تم مجھ سے

دعا کرو میں تمہاری دعا قبول کروں گا۔

قرآن پاک میں ہے۔

﴿اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ﴾ (۹-۸۰) ان

کے لیے بخشش مانگو یا نہ مانگو۔

﴿وَيَسْتَغْفِرُونَ لِّلَّذِينَ آمَنُوا﴾ (۴۰-۷۱) اور

مومنوں کے لیے بخشش مانگتے رہتے ہیں۔

یہ اصل میں رَجُلٌ اَغْطَشٌ سے ہے جس کے معنی کمزور

نظر اور چندھے آدمی کے ہیں۔

فُلَاةٌ غَطَشِي: اس صحرا کو کہتے ہیں جس میں راستہ نہ ملتا

ہو۔ اَلَّتَغَاطِشُ کسی چیز سے آنکھیں بند کر لینا۔ غفلت

برتتا۔

## ( غ ط و )

اَلْغَطَاءُ کے اصل معنی طہاق وغیرہ کی قسم کی چیز کے ہیں

جو کسی چیز پر بطور سرپوش کے رکھی جائے جیسا کہ غِشَاءٌ

لباس وغیرہ کی قسم کی چیز کو کہتے ہیں جسے کسی دوسری چیز کے

اوپر ڈالا جائے اور بطور استعارہ غِطَاءٌ کا لفظ (پردہ)

جہالت وغیرہ پر بولا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَاءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ

حَدِيدٌ﴾ (۵۰-۲۲) ہم نے تجھ پر سے پردہ اٹھا دیا تو

آج تیری نگاہ تیز ہے۔

## ( غ ف ر )

اَلْغَفَرُ (ض) کے معنی کسی کو ایسی چیز پہنا دینے کے ہیں جو

اسے میل کچیل سے محفوظ رکھ سکے۔ اسی سے محاورہ ہے۔

اِغْفِرْ ثَوْبَكَ فِي الْوِجَاءِ: اپنے کپڑوں کو صندوق وغیرہ

میں ڈال کر چھپا دو۔

اِصْبَغْ ثَوْبَكَ فَإِنَّهُ اَغْفَرُ لِلْوَسَخِ: کپڑے کو رنگ لو

کیونکہ وہ میل کچیل کو زیادہ چھپانے والا ہے۔ اللہ کی طرف

سے مَغْفِرَةٌ یا غُفْرَانٌ کے معنی ہوتے ہیں بندے کو

عذاب سے بچالیا۔ قرآن میں ہے۔

﴿غُفْرَانَكَ رَبَّنَا﴾ (۲۱-۲۸۵) اے پروردگار! ہم تیری

بخشش مانگتے ہیں۔

﴿اِلَى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَبِّكُمْ﴾ (۳-۱۳۳) اور اپنے

غفلت سے کام لیا۔ چنانچہ ایسے شخص کو عَافِلٌ کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿لَقَدْ كُنْتَ فِي غَفْلَةٍ مِّنْ هَذَا﴾ (۲۲-۵۰) بے شک تو اس سے غافل ہو رہا تھا۔

﴿وَهُمْ فِي غَفْلَةٍ مَّعْرُضُونَ﴾ (۱-۲۱) اور وہ غفلت میں (پڑے اس سے) منہ پھیر رہے ہیں۔

﴿وَدَخَلَ الْمَدِينَةَ عَلَى حِينٍ غَفْلَةٍ مِّنْ أَهْلِهَا﴾ (۱۵-۲۸) اور وہ ایسے وقت شہر میں آ داخل ہوئے کہ وہاں کے باشندے بے خبر ہو رہے تھے۔

﴿وَهُمْ عَنْ دُعَائِهِمْ غَافِلُونَ﴾ (۵-۴۶) اور ان کو ان کے پکارنے کی بھی خبر نہ ہو۔

﴿لَمَنِ الْغَافِلِينَ﴾ (۳-۱۲) بے خبر تھے۔

﴿فَهُمْ غَافِلُونَ﴾ (۷-۳۰) (اور آخرت کی طرف سے) غافل ہیں۔

﴿بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُونَ﴾ (۱۴۰-۲) جو کچھ یہ کر رہے ہیں خدا اس سے غافل نہیں ہے۔

﴿كُتِبَ لَهُم مَّا عَمِلُوا وَأَمْ لَبِثُوا فِي الْغَفْلَةِ﴾ (۱۰۲-۳) کافر اس گھات میں ہیں کہ تم ذرا اپنے ہتھیاروں اور سامانوں سے غافل ہو جاؤ۔

﴿فَهُمْ غَافِلُونَ﴾ (۶-۳۶) وہ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔

﴿عَنْهَا غَافِلِينَ﴾ (۱۳۶-۷) ان سے لاپرواہی کرتے تھے۔

أَرْضٌ غَفْلٌ: وہ زمین جس پر نشان راہ نہ ہو اور نا تجربہ

اور اَلْغَافِرُ وَالْغُفُورُ اسمائے حسنیٰ سے ہیں ۱ اور ان کے معنی گناہوں کا بخشنے والا ہیں، چنانچہ فرمایا۔

﴿غَافِرِ الذَّنْبِ﴾ (۳-۴۰) جو گناہ بخشنے والا ہے۔

﴿إِنَّهُ غَفُورٌ شَكُورٌ﴾ (۳۰-۳۵) وہ تو بخشنے والا قدر دان ہے۔

﴿وَهُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ﴾ (۱۰-۱۰۷) اور وہ بخشنے والا مہربان ہے۔

اور غَفِيرَةٌ بمعنی غُفْرَانٌ ہے، اسی سے فرمایا۔

﴿رَبَّنَا اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ﴾ (۱۴-۴۱) پروردگار! (حساب کتاب کے دن) مجھے اور میرے ماں باپ کو بخش دیجو۔

﴿أَنْ يَغْفِرَ لِي خَطِيئَتِي﴾ (۸۲-۲۶) میرے گناہ بخش دے گا۔

﴿وَاعْفِرْ لَنَا﴾ (۲۸۶-۲) اور ہمارے گناہ بخش دے۔ بعض نے کہا ہے کہ اِغْفِرْ وَاهَذَا لَا مَرْبِعَ لَهُ: کے

معنی ہیں کہ اس معاملہ کو اس طرح چھپاؤ جس طرح چھپانے کا حق ہے۔ ۵ اَلْمَغْفَرُ: لوہے کا خود۔ اَلْغَفَارَةُ: اس

چھیتھرے کو کہتے ہیں جسے عورت اپنے دوپٹے کو تیل سے بچانے کے لیے اس کے نیچے سر پر اوڑھ لیتی ہیں نیز

غَفَارَةٌ اس بادل کو کہتے ہیں جو دوسرے بادل پر چھایا ہوا، ہو نیز اس ٹکڑے کو بھی جس سے کمان کے گوشہ کو لپیٹتے ہیں۔

## (غ ف ل)

اَلْغَفْلَةُ: اس سہو کو کہتے ہیں جو قلت تحفظ و احتیاط کی بنا پر انسان کو عارض ہو جاتا ہے۔ غَفْلٌ: (ن) اس نے

۱ وايضاً غَفَارٌ كما في الآيات (۱۰-۷۱) (۸۲-۳۰) (۶۶-۳۸) (۵۰-۳۹) (۴۰-۴۲) وراجع لمعناه الغريب للقطبي

(۵-۱۴)

۲ انظر للكلمة الميداني رقم (۲۴۸۳)

کی گردنوں میں طوق..... ہوں گے۔

﴿وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ﴾ (۷-۱۵۷) اور ان پر سے بوجھ اور طوق، جو ان (کے سر) پر (اور) گلے میں (تھے، اتارتے ہیں۔

اور) کنایہ کے طور پر) کتبوں شخص کو مغلول الید کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ﴾ (۸۷-۲۹) اور اپنے ہاتھ کو نہ تو گردن سے بندھا ہوا (یعنی بہت تنگ کرلو)۔

﴿وَقَالَتِ الْيَهُودُ يَدُ اللَّهِ مَغْلُولَةٌ غُلَّتْ أَيْدِيهِمْ﴾ (۵۵-۶۵) اور یہود کہتے ہیں کہ خدا کا ہاتھ گردن سے بندھا ہوا ہے (یعنی اللہ بخیل ہے) انہیں کے ہاتھ باندھے جائیں۔

یعنی وہ اللہ تعالیٰ پر بغل کا الزام لگاتے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ جب انھوں نے یہ سنا کہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کا فیصلہ کر دیا ہے تو کہنے لگے پھر تو اللہ کا ہاتھ مقید ہے یعنی فارغ ہونے کی وجہ سے مقید کے حکم میں ہے۔ تو یہ آیت نازل ہوئی اور آیت کریمہ۔

﴿إِنَّا جَعَلْنَا فِيْٓ أَعْنَاقِهِمْ أَغْلَالًا﴾ (۳۶-۸) ہم نے ان کی گردنوں میں طوق ڈال رکھے ہیں۔ سے مراد یہ ہے کہ ہم نے انہیں ہر قسم کی خبر سے محروم کر رکھا ہے جس طرح کہ ان کے قلوب پر مہر لگانا اور آنکھ و کان پر پردہ ڈالنا ذکر کیا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ یہاں جَعَلْنَا اگرچہ ماضی کا صیغہ ہے لیکن یہ اس سزا کی طرف اشارہ ہے جو آخرت میں انہیں دی جائے گی۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا۔

کار آدمی کو بھی غُفْلُ کہا جاتا ہے اور اِغْفَالُ الْكِتَابِ کے معنی کتاب کو (نقطے) اور اعراب لگائے بغیر چھوڑ دینے کے ہیں۔ پس آیت کریمہ۔

﴿مَنْ أَغْفَلْنَا قَلْبَهُ عَنْ ذِكْرِنَا﴾ (۱۸-۲۸) کے معنی یہ ہیں کہ جس کے دل کو ہم نے یوں ہی چھوڑ دیا ہے اور اس میں ایمان کا نقش نہیں بٹھایا جس طرح کہ اس کے برعکس موشین کے دلوں کی حالت بیان کرتے ہوئے فرمایا۔

﴿أُولَٰئِكَ كَتَبَ فِيْ قُلُوبِهِمُ الْإِيمَانَ﴾ (۵۸-۲۲) یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں خدا نے ایمان (پتھر پر لکیر کی طرح) تحریر کر دیا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اَغْفَلْنَا قَلْبَهُ کے معنی دل کو حقائق کی معرفت سے غافل کر دینا کے ہیں۔

## ( غ ل ل )

الْغُلُّ کے اصل معنی کسی چیز کو اوپر اوڑھنے یا اس کے درمیان میں چلے جانے کے ہیں اسی سے غُلُّ اس پانی کو کہا جاتا ہے جو درختوں کے درمیان سے بہہ رہا ہو اور کبھی ایسے پانی کو غِیْلُ بھی کہ دیتے ہیں اور اِنْغُلُّ کے معنی درختوں کے درمیان میں داخل ہونے کے ہیں لہذا غُلُّ (طوق) خاص کر اس چیز کو کہا جاتا ہے۔ جس سے کسی کے اعضاء کو جکڑ کر اس کے وسط میں باندھ دیا جاتا ہے۔ اس کی جمع اَغْلَالُ آتی ہے۔ اور غُلُّ فُلَانٌ کے معنی ہیں اسے طوق سے باندھ دیا گیا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿خُذُوْهُ فَعُلُوْهُ﴾ (۶۹-۳۱) اسے پکڑ لو اور طوق پہنا دو۔ ﴿إِذَا لَا غْلَالَ فِيْٓ أَعْنَاقِهِمْ﴾ (۴۰-۷۱) جب کہ ان

﴿وَمَا كَانَ لِنَبِيِّ أَنْ يُغْلَ﴾ (۳-۱۶۱) اور کبھی نہیں ہو سکتا کہ پیغمبر (خدا) خیانت کریں۔

ایک قراءت میں اَنْ يُغْلَ ہے جو کہ اَغْلَتْهُ سے ہے یعنی اسے خیانت کے ساتھ مہم کیا جائے۔

﴿وَمَنْ يُغْلِلْ يَأْتِ بِمَا عَلَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ﴾ (۳۱-۱۶۱) اور خیانت کرنے والوں کو قیامت کے دن خیانت کی ہوئی چیز (خدا کے روبرو) حاضر کرنا ہوگی۔

ایک روایت میں ہے - ﴿(۶۰) لَا اِغْلَالَ وَلَا اِسْلَاكَ﴾ یعنی خیانت اور چوری نہیں ہے اور حدیث میں ہے - ﴿(۶۲) ثَلَاثٌ لَا يَغْلِلُ عَلَيْهِنَّ قَلْبُ الْمُؤْمِنِ﴾ یعنی تین باتوں پر مومن کا دل کینہ دہی سے کام نہیں لیتا۔

اور ایک روایت میں ((لَا يُغْلِلُ)) ہے یعنی خیانت نہیں کرتا اَعْلَلَ الْجَاذِرَ رَأُو السَّالِخُ: قصاب کا کھال کے ساتھ کچھ گوشت چھوڑ دینا۔ یہ اِغْلَالَ بمعنی خیانت سے ہے گویا قصاب نے کھال کے ساتھ گوشت چھوڑ کر خیانت کی تاکہ وہ گوشت لے جائے۔

اَلْعُلَّةُ وَالْعَلِيلُ: پیاس، غصہ یا محبت کی سوزش شَفَا فُلَانٌ غَلِيلَةً: فلاں نے اپنا غصہ نکال لیا اَلْفَلَّةُ: زمین کی پیداوار۔ اسی سے اَعْلَلْتُ صَبِغَتُهُ ہے جس کے معنی ہیں۔ زمین نے پیداوار دی اور مَغْلَغَلَةً اس

﴿وَجَعَلْنَا الْاَغْلَالَ فِيْ اَعْنَاقِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ (۳۳-۳۳) اور ہم کافروں کی گردنوں میں طوق ڈال دیں گے۔

اَلْغُلَاةُ: اس کپڑے کو کہتے ہیں جو دو کپڑوں کے درمیان میں پہنا جاتا ہے۔ چنانچہ شِعَارٌ وہ کپڑا ہے جو غلام کے نیچے پہنا جائے مگر کبھی بطور استعارہ غُلَاةٌ کا لفظ درع پر بھی بولا جاتا ہے جس طرح کہ دِرْعٌ کا لفظ مجازاً اغلالہ کے معنی میں آجاتا ہے۔ اور غِلٌّ کے معنی (کینہ و پوشیدہ) دشمنی کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے -

﴿وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ﴾ (۴۳-۷) اور جو کچھ ان کے دلوں میں ہوں گے ہم سب نکال ڈالیں گے۔

﴿وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَا اِنَّكَ رَوْفٌ رَّحِيْمٌ﴾ (۵۹-۱۰) اور مومنوں کی طرف سے ہمارے دلوں میں کینہ (وسد) نہ پیدا ہونے دے۔

عَلَّ يَغْلُ کسی کے متعلق دل میں کینہ رکھنا اور اَلْعُلُوْلُ کے معنی ہیں خیانت کرنا اور یہ عَلَّ يَغْلُ: سے ہے جس کے معنی ہیں: خیانت کرنا اور اَعْلَلَ (افعال) کے معنی خیانت کے ساتھ متصف ہونے کے ہیں اور اَغْلَلْتُ فُلَانًا کے معنی دوسرے کو خیانت کے ساتھ مہم کرنے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔

① قال ابن حجر اخرجه ابو داؤد و احمد من رواية الزهري عن المسور و مروان في حديث و رواه الدارمي و الطبراني و ابن عدى من رواية كثير بن عبد الله و رواه ابن زنجويه في الاموال و ابراهيم الحربي في الغريب راجع الكاف ۳۳۔

② انظر للحديث الفائق (۱۱۴/۲) و النهاية (غلل) و رواه الشافعي في رسالته رقم (۱۱-۲) و البيهقي في المدخل و ابن ماجة و الدارمي عن زيد بن ثابت راجع شرح الترمذی (۳۷۲/۳) و المستدرک (۸۶/۱-۸۸) و الترغيب (۶۳/۱-۶۴) و مجمع الزوائد (۱۳۷/۱-۱۳۹) و نسبہ الحافظ في تخريجه على الكشاف الى ابن عدى و ابى داؤد و الامم ال لابن زنجويه و الغريب لايراهيم الحربي انظر رقم (۲۷۳) و الفتح للنبهاني (۳۰۹/۳)۔



..... کوئی تم پر غالب نہ ہوگا۔

﴿إِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغَالِبِينَ﴾ (۷-۱۱۳) اگر ہم جیت گئے۔

﴿إِنَّا لَنَحْنُ الْغَالِبُونَ﴾ (۶۲-۴۴) ہم ضرور غالب رہیں گے۔

﴿فَعُلبُوا هُنَالِكَ.....﴾ (۷-۱۱۹) اور وہ مغلوب ہو گئے۔

﴿أَفَهُمُ الْغَالِبُونَ﴾ (۲۱-۴۴) کیا یہ لوگ غلبہ پانے والے ہیں۔

﴿سَتُغْلِبُونَ وَتُحْشَرُونَ﴾ (۳-۱۲) عنقریب مغلوب ہو جاؤ گے اور (آخرت میں جہنم کی طرف) ہانکے جاؤ گے۔

﴿ثُمَّ يُغْلِبُونَ﴾ (۸-۳۶) اور وہ مغلوب ہو جائیں گے۔ غَلَبَ عَلَيْهِ کے معنی کسی پر مستولی ہونے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿غَلَبَتْ عَلَيْنَا شِقْوَتُنَا﴾ (۳۳-۱۰۶) ہم پر ہماری کم بختی غالب ہو گئی۔

بعض نے کہا ہے کہ اصل میں غَلَبَتْ کے معنی کسی کی گردن کے موٹے حصہ کو پکڑنے یا اس پر مارنے کے ہیں اور موٹی گردن والے شخص کو اَغْلَبَ کہا جاتا ہے۔ اس کی مونث غَلْبَاءُ سے اور هَضْبَةٌ غَلْبَاءُ کے معنی بلند نیلہ کے ہیں جیسا کہ اس معنی میں هَضْبَةٌ رَقَبَاءُ وَعَنْقَاءُ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔ ۱ غَلْبَاءُ کی جمع غُلَبٌ ہے

پیغام یا خط کو کہا جاتا ہے جو شہر بشہر پہنچایا جائے۔ شاعر نے کہا ہے۔ ۲ (الوافر)

(۳۲۹) تَغْلَغَلَ حَيْثُ لَمْ يَلْبُغْ شَرَابٌ وَلَا حُزْنٌ وَلَمْ يَلْبُغْ سُرُورٌ

اس کی محبت وہاں پہنچ گئی ہے جہاں شراب اور غم و سرور کا بھی گزر نہیں ہو سکتا۔

## ( غ ل ب )

الْغَلْبَةُ: کے معنی قہر اور بالادستی کے ہیں۔ غَلَبْتُهُ (ض) غَلَبًا وَغَلْبَةً میں اس پر مستولی اور غالب ہو گیا۔ اسی سے صیغہ مفت فاعلی غَالِبٌ ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿الَّذِينَ غَلَبَتِ الرُّومُ فِي أَدْنَى الْأَرْضِ وَهُمْ مِنْ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُونَ﴾ (۳۰-۳۱) الم (اہل) روم مغلوب ہو گئے نزدیک کے ملک میں اور وہ مغلوب ہونے کے بعد عنقریب غالب ہو جائیں گے۔

﴿كَمْ مِنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللَّهِ﴾ (۲-۲۴۹) کہ بسا اوقات تھوڑی سی جماعت نے خدا کے حکم سے بڑی جماعت پر فتح حاصل کی ہے۔

﴿يَغْلِبُوا مَا تَتَّبِعِينَ﴾ (۸-۶۶) دو سو پر غالب رہیں گے۔ ﴿يَغْلِبُوا النَّفَا﴾ (۸-۶۵) وہ ہزار پر غالب رہیں گے۔

﴿لَا غَلِبَ لَنَا أَوْ رُسُلُنَا﴾ (۵۸-۲۱) کہ میں اور میرے پیغمبر ضرور غالب رہیں گے۔

﴿لَا غَالِبَ لَكُمْ الْيَوْمَ﴾ (۸-۴۸) کہ آج کے دن

۱ قاله عبيد الله بن عبد الله بن عتبة بن مسعود، أحد فقهاء السبعة بشيبي بعمته امراته وقبله: تغلغل حب عثمة في فوادي - فباديه مع الخافي يسير والبيت في تاريخ الخطيب (۸/۴۷۰) والمصارع (۲۰۱) والاصابة (۴۹۵۴) ونسبه ابن كثير (۱: ۱۲۶) الى النابغة في زوجته عثمة وحكاه عن القرطبي والله اعلم وقد مر في (شرب) رقم ۲۵۹۔

۲ وفي الاصول حذيفة غلباء وهو نسب لقوله تعالى: وحذائق غلبا (۶۰-۳۰)

میں بند ہو۔) چنانچہ سَيْفٌ اَنْسَلَفَ: کے معنی ہیں تلوار، جو غلاف یعنی نیام میں بند ہو اور غیر مخنون لڑکے کو غِلَامٌ اَغْلَفَ کہا جاتا ہے اور جو چمڑہ ختم کرتے وقت کاٹ دیا جاتا ہے اسے غُلْفَةٌ کہتے ہیں۔ غَلَّفْتُ السَّيْفَ: تلوار کو نیام میں بند کر دیا۔ غَلَّفْتُ الْفَارُورَةَ: شیشے کے اوپر غلاف چڑھا دیا۔ غَلَّفْتُ الرَّحْلَ اَوِ السَّرَجَ: پالان یا زین پر چمڑا مڑھ دیا۔ اسی طرح غَلَّفْتُ لِحْيَتَهُ بِالْحِجَاءِ کے معنی کسی کی داڑھی کو مہندی سے چھپا دینے کے ہیں اور تَغَلَّفَ (تفعل) بمعنی تَخَضَّبَ ہے۔ پس آیت کے معنی یہ ہیں کہ ہمارے دل غلافوں میں بند ہیں۔

باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آسکتیں، یہاں یہ آیت کریمہ۔ ﴿قُلُوبُنَا فِیْ اَكْثٰی﴾ (۲۱-۵) اور فِیْ عَقْلٰی مِّنْ هٰذَا (۲۲-۵۰) کے ہم معنی ہوگی۔

بعض نے کہا ہے کہ یہ (غُلْفَ) اصل میں غُلْفُ بضم اللام ہے جیسا کہ ایک قراءت میں ہے۔ اور یہ اَغْلَفَ کی نہیں بلکہ غِلَافَ کی جمع ہے جیسا کہ کِتَابُ کی جمع کُتُبٌ آتی ہے اور آیت کے معنی یہ ہیں کہ ہمارے دل خود علوم و معارف کے گنجینے اور مخزن ہیں اور ان علوم کی موجودگی میں ہم دوسروں کے علوم سے بے نیاز ہیں لہذا تم سے کسی قسم کے استفادہ کی ہمیں ضرورت نہیں ہے۔

## (غ ل ق)

الْعَلَقُ وَالْمَغْلَقُ: قفل وغیرہ، جس کے ساتھ دروازہ بند کیا جاتا ہے اور بعض نے وہ چیز مرا لی ہے جس کے ساتھ اسے کھولا جاتا ہے۔ لیکن اگر معنی بندش کا لحاظ کیا تو

(جس کے معنی گھنے باغات کے ہیں، جیسے فرمایا۔ ﴿وَحَدَّائِقُ غُلْبًا﴾ (۸۰-۳۰) اور گھنے گھنے باغ۔

## (غ ل ظ)

الْغِلْظَةُ: (غین کے کسرہ اور ضمہ کے ساتھ) کے معنی موٹا پایا گاڑھ پین کے ہیں۔ یہ رِقَّة کی ضد ہے اصل میں یہ اجسام کی صفت ہے۔ لیکن کَبِیْرٌ وَکَثِیْرٌ کی طرح بطور استعارہ معانی کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ آیت کریمہ۔

﴿وَلِيَجِدُوا فِیْكُمْ غِلْظَةً﴾ (۹-۱۲۳) چاہیے کہ وہ تم میں سخت محسوس کریں۔

میں غِلْظَةُ کے معنی سخت مزاجی کے ہیں۔ نیز فرمایا۔ ﴿ثُمَّ نَضْطِرُّهُمْ اِلٰی عَذَابٍ غَلِيْظٍ﴾ (۳۱-۲۴) پھر عذاب شدید کی طرف مجبور کر کے لے جائیں گے۔ ﴿مِنْ عَذَابٍ غَلِيْظٍ﴾ (۱۱-۵۸) عذاب شدید سے۔ ﴿جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِيْنَ وَاَعْلَظْ عَلَيْهِمْ﴾ (۹-۷۳) کافروں اور منافقوں سے لڑو اور ان پر سخت کرو۔

اِسْتَغْلَظَ کے معنی موٹا اور سخت ہونے کو تیار ہو جانا ہیں اور کبھی موٹا اور سخت ہو جانے پر بھی بولا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿فَاسْتَعْلَظْ فَاَسْتَوٰی عَلٰی سُوْقِهِ﴾ (۲۸-۲۹) پھر موٹی ہوئی اور اپنی نال پر سیدھی کھڑی ہو گئی۔

## (غ ل ف)

آیت کریمہ۔ ﴿قُلُوبُنَا غُلْفٌ﴾ (۲-۸۸) کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ یہ یعنی (غُلْفُ) اَغْلَفَ کی جمع ہے (اور اَغْلَفَ اس چیز کو کہتے ہیں جو غلاف

دیوار تھی سو وہ دوازکوں کی تھی۔

اور حضرت یوسف علیہ السلام کے قصہ میں فرمایا۔

﴿هَذَا غُلَامٌ﴾ (۱۲-۱۹) یہ تو (نہایت حسین) لڑکا ہے۔ غُلَام کی جمع غُلَمَة وَ غُلَمَان آتی ہے۔ اور اِغْتَلَمَ الغُلَامُ کے معنی ہیں: لڑکا بالغ ہو گیا۔ عام طور پر چونکہ اس عمر میں جنسی خواہش کا غلبہ ہو جاتا ہے اس لیے غُلَمَة کا لفظ جنسی خواہش کی شدت پر بولا جاتا ہے۔ اور اِغْتَلَمَ الفحل کے معنی ہیں ساندہ جنسی خواہش سے مغلوب ہو گیا۔

### (غ ل وری)

الْغُلُو کے معنی کسی چیز کے حد سے تجاوز کرنے کے ہیں اگر یہ (حد سے تجاوز) اشیاء کے نرخ میں ہو تو اسے غَلَاء (گرانی) کہا جاتا ہے اور قدر و منزلت میں ہو تو اسے غُلُو کہتے ہیں اور اگر تیرا اپنی حدود سے تجاوز کر جائے تو غُلُو مگر ان ہر سہ اشیاء کے متعلق فعل غَلَا یَغْلُو (ن) ہی استعمال ہوتا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿لَا تَغْلُوا فِي دِينِكُمْ﴾ (۴-۱۷۱) اپنے دین میں حد سے نہ بڑھو۔

اور ہندیا کے ابال اور جوش کھانے کو غَلِي وَ غَلِيَان (باب ضرب) کہتے ہیں۔ اسی سے بطور استعارہ ارشاد ہے۔

﴿طَعَامُ الْاَنِيمِ - كَالْمُهْلِ ، يَغْلِي فِي الْبُطُونِ كَغَلِي الْحَمِيمِ﴾ (۴۳-۴۵-۴۶) گنہگار کا کھانا ہے جیسے پگھلا ہوا تانبہ۔ پیٹوں میں اس طرح کھولے گا جس

۱ وفی الحدیث لا یغلیق الرهن ای لا یتحققه المرتهن اذا لم یرد الراهن مارهنه فيه وکان هذا من فعل الحاحلیة فابطله الاسلام راجع للحدیث کنز العمال (۴: رقم ۱۱۶۲ و ۱۱۶۶) ولعمناه الزرقانی (۴: ۵-۶)

جائے تو اسے مِغْلَقٌ وَ مِغْلَقٌ کہا جائے گا اور کھولنے کے اعتبار سے مِفْتَحٌ یا مِفْتَحٌ کہا جاتا ہے اور اَغْلَقْتُ الْبَابَ کے معنی دروازہ بند کرنے کے ہیں اور غَلَقْتُهُ میں تکثیر کے معنی پائے جاتے ہیں یعنی بہت سے دروازوں کو بند کرنا یا ایک ہی دروازے کو احکام یعنی بڑی مضبوطی سے بند کرنا اس بنا پر آیت کریمہ۔

﴿وَعَلَقْتُ الْاَبْوَابَ﴾ (۱۲-۲۳) اور دروازے بند کر کے، میں ابواب کے ساتھ فعل غَلَقَ لایا گیا ہے اور تشبیہ کے طور پر غَلَقَ الرَّهْنُ غُلُوْقًا کا محاورہ بھی بولا جاتا ہے جس کے معنی گروی چیز کو روک لینے کے ہیں۔ ۱ غَلَقَ ظَهْرُهُ وَ بَرَّ اَوْنَتِیْ کا پٹھہ کا زخم بھر گیا اور قمار بازی کے ساتویں تیر کو مِغْلَقٌ کہا جاتا ہے کیونکہ وہ جوئے کے باقی ماندہ تمام حصوں کو روک لیتا ہے۔ نَخْلَةُ غِلَقَةٍ وہ کھجور جس کی جڑیں خشک ہو گئی ہوں اور وہ پھل دینے سے رک جائے اور غِلَقَةُ زہریلی قسم کے ایک کڑوے درخت کا نام ہے۔

### (غ ل م)

الْغُلَامُ: اس لڑکے کو کہتے ہیں جس کی میس بھیگ چکی ہوں محاورہ ہے غُلَامٌ بَيْنَ الْغُلُوْمَةِ وَالْغُلُوْمَةِ: لڑکا، جو بھرپور جوانی کی عمر میں ہو۔ قرآن پاک میں ہے۔ ﴿اَنْتَیْ یَكُوْنُ لَیْ غُلَامٌ﴾ (۱۹-۲۰) میرے ہاں لڑکا کیونکر ہوگا۔

﴿وَاَمَّا الْغُلَامُ فَكَانَ اَبَوَاهُ مُؤْمِنَيْنِ﴾ (۱۸-۸۱) اور وہ لڑکا تھا جس کے ماں باپ دونوں مؤمن تھے۔

﴿وَاَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلَامَيْنِ﴾ (۱۸-۸۲) اور جو

طرح گرم پانی کھولتا ہے۔

ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿ثُمَّ لَا يَكُنْ أَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً﴾ (۱۰-۱۷۱)

پھر تمہارا معاملہ تم پر مشتبہ نہ رہے۔

یعنی پھر وہ معاملہ تمہارے لیے قلق و اضطراب کا موجب نہ

ہو اور غَم و غُمَّة کے ایک ہی معنی ہیں یعنی حزن و کرب

جیسے كَرْبٌ وَكُرْبَةٌ اور عَمَامَةٌ اس چیتھرے کو کہتے

ہیں جو اونٹنی کی ناک اور آنکھوں پر باندھ دیا جاتا ہے

(تاکہ کسی چیز کو دیکھ یا سونگھ نہ سکے) اور نَاصِيَةُ عَمَاءُ

پیشانی کے لمبے بال جو چہرے کو چھپالیں۔

(غ م ر)

الْغَمْرُ (ض) کے اصل معنی کسی چیز کے اثر کو زائل کر

دینے کے ہیں۔ اسی سے غَمْرٌ غَامِرٌ اس زیادہ پانی کو

کہتے ہیں جس کا سیلاب ہر قسم کے اثرات کو (چھپا کر زائل

کر دے شاعر نے کہا ہے۔) (المستقارب)

(۳۳۰) وَالْمَاءُ غَامِرٌ يَحْدَاهَا

اور پانی اپنے گڑھوں کو چھپانے والا تھا۔

اسی مناسبت سے فیاض آدمی اور تیز رو گھوڑے کو بھی غَمْرٌ

کہا جاتا ہے جس طرح کہ تشبیہ کے طور پر اسے بَحْرٌ کہہ

دیا جاتا ہے اور غَمْرَةٌ اس پانی کو کہتے ہیں جس کی

اتھاہ نظر نہ آئے۔ اور یہ اس جہالت کے لیے ضرب المثل

ہے جو آدمی پر چھا جاتی ہے۔ اور قرآن پاک نے

فَاغْشَيْنَاهُمْ وَغِيْرَه الْفَاظ سے اسی معنی کی طرف اشارہ کیا

اور تشبیہ کے طور پر غصہ اور لڑائی کے بھڑک اٹھنے کو بھی

غَلِيَانٌ کہہ دیتے ہیں۔ تَعَالَى النَّبْتُ: گھاس کا زیادہ

ہونا اور بڑھ جانا۔ عَلِيٌّ اور غُلُوٌّ یعنی: واوی اور یائی

دونوں سے آتا ہے اور غُلُوَاء کے معنی خود سری میں حد

سے تجاوز کرنے کے ہیں اور اسی سے بطور تشبیہ جوش جوانی

کو غُلُوَاءُ الشَّبَابِ کہا جاتا ہے۔

(غ م م)

الْغَمُّ: (ن) کے بنیادی معنی کسی چیز کو چھپالینے کے ہیں

اسی سے الْغُمِّي ہے جس کے معنی غبار اور تاریکی کے

ہیں۔ نیز الْغُمِّي جنگ کی شدت کو کہتے ہیں جو قوم پر چھا

جائے اس طرح بادل کو الْغَمَام کہتے ہیں کیونکہ وہ سورج

کی روشنی کو ڈھانپ لیتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿أَنْ يَأْتِيَهُمُ اللَّهُ فِي ظُلَلٍ مِنَ الْغَمَامِ﴾

(۱۰-۲) کہ خدا کا عذاب بادلوں کے سائبانوں میں

آنازل ہو۔ اسی سے غَمُّ الْهَلَالِ (چاندبر کے نیچے

آگیا اور دیکھانہ جاسکا) وَيَوْمَ غَمٍّ (سخت گرم دن

وَلَيْلَةُ غَمَّةٍ وَغُمِّي (تاریک اور سخت گرم رات) وغیرہا

مخاورات ہیں کسی شاعر نے کہا ہے۔) (رجز)

(۳۲۹) لَيْلَةُ غُمِّي طَامِسٌ هَلَالُهَا

تاریک رات جس کا چاند بے نور ہو۔

اور غُمَّة الْأَمْرِ کے معنی کسی معاملہ کا پیچیدہ اور مشتبہ ہونا

① قاله الزّاجر وتامه او غلتها ومكره ايغالها راجع اللسان والصّحاح (غم) واصلاح يعقوب ۲۸۲۔

② لم اجد بهذا اللفظ وفي محال ثعلب (۲۲۲: ۱) والاقطصاب (۴۲۳) والمعاني للقبتي (۴۴۲): والليل غامر جدادها۔ كذا في اللسان (جدد) والمغرب للجواليقي (بكر) وهذا البيت لا عشى يصف خمرا طرقة، لا يتبايع الخمر فاؤفد سراجا والليل قد غمرای ستر جداد الخبء اى الخيوط المعقدة واسفلها واوله: اضاء مظلمته بالسراج۔ وبعده: وواهمنا كلها جيدة۔ فلا تحسبها بتقادها والقصيدة في ديوانه (۵۷-۶۱) فاخشى ان يكون البيت مصحفاني المطبوع۔

کہنا ایسے ہی ہے جیسا کہ انارڑی آدمی کو ہونج وغیرہ کہا جاتا ہے۔

### (غ م ن)

الْعَمَزُ (س) کے اصل معنی کسی کی عیب جوئی کرتے ہوئے اس کی طرف ہاتھ یا پلک سے اشارہ کرنے کے ہیں اور اسی سے مَا فِیْ فُلَانٍ عَمِيزَةٌ ہے یعنی اس میں کوئی ایسا عیب نہیں ہے جس کی طرف اشارہ کیا جا سکے اور عَمِيزَةٌ کی جمع عَمَائِزُ آتی ہے (الْتَّغَامُزُ) باہم کسی کے عیوب کی طرف ہاتھوں یا آنکھوں سے اشارہ کرنا قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَإِذَا مَرُّوا بِهِمْ يَتَغَامَزُونَ﴾ (۸۳-۳۰) اور جب ان کے پاس سے گزرتے ہیں تو حشرات سے اشارہ کرتے ہیں۔

اصل میں یہ عَمَزَتْ الْكِبَشُ کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی مینڈھے کے بدن کو دبا کر دیکھنے کے ہیں کہ اس میں چربی ہے یا نہیں جس طرح کہ عَبَطْتُهُ کا محاورہ ہے۔

### (غ م ض)

الْعَمَضُ (ض) کے اصل معنی نیند کے جھونکا کے ہیں چنانچہ محاورہ ہے۔ مَا أَذَقْتُ عَمَضًا وَلَا عَمَاضًا (یعنی چشم من یکدم نخفتہ) اسی مناسبت سے نرم اور نشیبی زمین کو عَامِضَةٌ وَعَمَضَةٌ کہا جاتا ہے اور دَارُ عَامِضَةٍ اس سرے کو کہتے ہیں جو شارع عام پر نہ ہو۔ عَمَضَ عَيْنَهُ وَأَعْمَضَهَا کے معنی آنکھ کو بند کر لینے کے ہیں اور بطور استعارہ تغافل اور تساہل برتنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿فَزَرَهُمْ فِیْ عَمْرٍ نَهْمٍ﴾ (۵۴-۲۳) تو ان کو .... ان کی غفلت ہی میں رہنے دو۔

﴿الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ عَمْرٍ سَاهُونَ﴾ (۵۱-۱۱) جو بے خبری میں بھولے ہوئے ہیں۔

اور عَمَرَات کے معنی شدائد کے ہیں (کیونکہ وہ بھی انسان پر ہجوم کر کے اسے بدحواس کر دیتے) ہیں فرمایا:

﴿فِیْ عَمَرَاتِ الْمَوْتِ﴾ (۶-۹۳) (جب) موت کی سختی میں۔

اور نا تجربہ کار آدمی کو بھی عَمَرُ کہا جاتا ہے۔

وَالْجَمْعُ أَعْمَارٌ نیز عَمَرُ کے معنی پوشیدہ کینہ کے بھی آتے ہیں۔ وَالْجَمْعُ عَمُورٌ اور عَمَرُ کے معنی چربی کی بدبو کے آتے ہیں جو تمام چیزوں کی بو پر غالب آجاتی ہے عَمِرَتْ يَدُهُ: اس کا ہاتھ میلا ہو گیا۔ عَمِرَ عِرْضُهُ اس کی عزت پر بند لگ گیا۔ محاورہ ہے۔

دَخَلَ فِیْ عَمَارِ النَّاسِ وَخُمَارِهِمْ: وہ لوگوں کے ہجوم میں داخل ہو گیا۔

الْعُمَرُ: زعفران سے تیار کیا ہوا طلا جو چہرے پر ملتے ہیں۔ تَعَمَّرْتُ بِالطَّيْبِ: میں نے (اپنے چہرے پر) زعفرانی خوشبو ملی اور پانی پینے کے چھوٹے پیالے کو عُمَرُ کہا جاتا ہے اسی سے تَعَمَّرْتُ ہے جس کے معنی تھوڑا سا پانی پینے کے ہیں اور کسی شخص کو مُعَامِرٌ اس وقت کہتے ہیں جب کہ وہ اپنے آپ کو لڑائی کی آگ میں جھونک دے اور یہ یا تو دشمن کی صفوں میں گھسنے کے لیے ہوتا ہے جیسا کہ فُلَانٌ يَحْوَضُ الْحَرْبِ کا محاورہ ہے اور یا نا تجربہ کاری کی وجہ سے اور اس صورت میں اسے مُعَامِرٌ

﴿وَإِنَّ اللَّهَ لَهُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ﴾ (۲۲-۲۳) اور  
بے شک خدا بے نیاز اور قابل ستائش ہے۔

﴿أَنْتُمْ الْفُقَرَاءُ إِلَى اللَّهِ وَاللَّهُ هُوَ الْغَنِيُّ  
الْحَمِيدُ.....﴾ (۱۵-۳۵) تم سب خدا کے محتاج ہو اور

خدا بے پرواہ منزہ اور حمد و ثناء والا ہے۔ میں بھی اللہ تعالیٰ  
کے غنی ہونے سے یہی معنی مراد ہیں۔

قدرے محتاج ہونا اور ماتیسز پر قانع رہنا۔ چنانچہ آیت  
کریمہ۔

﴿وَوَجَدَكَ عَائِلًا فَأَغْنَى﴾ (۸-۹۳) اور تنگ  
دست پایا تو غنی کر دیا۔

میں آغنی سے اس قسم کی غنا مراد ہے اور اس قسم کی  
غنا (یعنی قناعت کے متعلق آنحضرت ﷺ نے

فرمایا۔ ﴿(الغنى غنى النفس)﴾ کہ غنی  
درحقیقت قناعت نفس کا نام ہے اور غنی کے تیسرے معنی

کثرت ذخائر کے ہیں اور لوگوں کی ضروریات کے لحاظ  
سے اس کے مختلف درجات ہیں۔ جیسے فرمایا۔

﴿وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ﴾ (۴-۶) جو شخص  
آسودہ حال ہو اس کو ایسے مال سے قطعی طور پر پرہیز رکھنا

چاہیے۔

﴿الَّذِينَ يَسْتَأْذِنُونَكَ وَهُمْ أَغْنِيَاءُ﴾ (۹-۹۳) جو  
دولت مند ہیں اور پھر تم سے اجازت طلب کرتے ہیں۔

﴿لَقَدْ سَمِعَ اللَّهُ قَوْلَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ فَقِيرٌ  
وَنَحْنُ أَغْنِيَاءُ﴾ (۱۳-۱۸) خدا نے ان لوگوں کا قول

سن لیا ہے جو کہتے ہیں۔ خدا فقیر ہے اور ہم امیر ہیں۔

یہ بات انھوں نے اس وقت کہی جب کہ اللہ تعالیٰ نے

﴿وَلَسْتُمْ بِأَخْذِيهِ إِلَّا أَنْ تُغْمِضُوا فِيهِ﴾  
(۲-۲۶) تو بجز اس کے کہ لیتے وقت آنکھیں بند کر لو  
ان کو کبھی نہ لو۔

## (غ ن م)

الْغَنَمُ: بکریاں۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَمِنَ الْبَقَرِ وَالْغَنَمِ حَرَّمَ عَلَيْنَهُمْ شُحُومَهُمَا﴾  
(۶-۶) اور گایوں اور بکریوں سے ان کی چربی حرام کر  
دی تھی۔

الْغَنَمُ کے اصل معنی کہیں سے بکریوں کا ہاتھ لگنا۔ اور ان  
کو حاصل کرنے کے ہیں پھر یہ لفظ ہر اس چیز پر بولا جانے  
لگا ہے۔ جو دشمن یا غیر دشمن سے حاصل ہو۔ قرآن میں

﴿وَأَعْلَمُوا أَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِنْ شَيْءٍ﴾ (۸-۴۱) اور  
جان رکھو کہ جو چیز تم کفار سے لوٹ کر لاؤ۔

﴿فَكُلُوا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلَالًا طَيِّبًا﴾ (۸-۶۹) جو  
مال غنیمت تم کو ملا ہے اسے کھاؤ کہ تمہارے لیے حلال

طیب ہے۔

الْمَغْنَمُ: مال غنیمت۔ اس کی جمع مَغَانِمُ آتی ہے۔  
قرآن پاک میں ہے۔

﴿فَعِنْدَ اللَّهِ مَغَانِمُ كَثِيرَةٌ﴾ (۴-۹۴) سو خدا کے  
پاس بہت سی غنیمتیں ہیں۔

## (غ ن ی)

الْغِنَى (تو نگر) بے نیازی، یہ کئی قسم پر ہے کلی طور پر  
بے نیاز ہو جانا، اس قسم کی غنا سوائے اللہ کے کسی کو حاصل

نہیں ہے۔ چنانچہ آیت کریمہ۔

① رواہ مسلم (۳۳۶/۱) طبعة انصاری ہندو الترمذی من حدیث ابی ہریرۃ وقال حدیث حسن صحیح ص (۶۰ ج ۱۲)۔

اور آغْنَانِي كَذًا وَآغْنِي عَنْهُ كَذًا: کسی چیز کا کافی ہونا اور فائدہ بخشا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿مَا آغْنِي عَنِّي مَالِي﴾ (۲۸-۲۹) میرا مال میرے کچھ بھی کام نہ آیا۔

﴿مَا آغْنِي عَنْهُ مَالُهُ﴾ (۲-۱۱) نہ تو اس کا مال ہی اس کے کچھ کام آیا۔

﴿لَنْ تُغْنِي عَنْهُمْ أَمْوَالُهُمْ وَلَا أَوْلَادُهُمْ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا﴾ (۹-۳) نہ تو ان کا مال ہی خدا کے عذاب سے انہیں بچا سکے گا اور نہ ان کی اولاد ہی کچھ کام آئے گی۔

﴿مَا آغْنِي عَنْهُمْ مَا كَانُوا يَمْتَعُونَ﴾ (۲۶-۲۷) تو جو فائدے یہ اٹھا رہے ہیں ان کے کسی کام نہ آئیں گے۔

﴿لَا تُغْنِي عَنِّي شَفَاعَتُهُمْ﴾ (۳۶-۳۷) ان کی سفارش مجھے کچھ بھی فائدہ نہ دے سکے گی۔

﴿وَلَا يُغْنِي مِنَ اللَّهِ﴾ (۷۷-۷۸) اور نہ لپٹ سے بچاؤ۔

اور اَلْغَانِيَةُ: اس عورت کو کہا جاتا ہے جو اپنے خاوند کے سبب زینت سے بے نیاز ہو۔ بعض نے کہا ہے کہ غَانِيَةُ اس عورت کو کہتے ہیں جو اپنے ذاتی حسن و جمال کی وجہ سے خارجی زیبائش و آرائش سے بے نیاز ہو۔ غْنِي فُحِي مَكَان كَذًا: کسی جگہ مدت دراز تک اقامت کرنا گویا وہ دوسری جگہوں سے بے نیاز ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿كَأَن لَّمْ يَغْنَوْا فِيهَا﴾ (۷۲-۷۳) گویا وہ ان میں کبھی

آیت کریمہ۔

﴿مَنْ ذَا الَّذِي يُقْرِضُ اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا﴾ (۲-۲۳۵) کوئی ہے کہ خدا کو قرض حسدے۔ نازل فرما

کر ان سے صدقات و خیرات کا مطالبہ کیا اور آیت کریمہ۔

﴿يَخْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ أَغْنِيَاءَ مِنَ التَّعَفُّفِ﴾ (۲۱-۲۷۳) کہ ناماگنے کی وجہ سے ناواقف شخص ان کو غنی خیال کرتا ہے۔

کے معنی یہ ہیں کہ وہ بظاہر قانع اور بے نیاز رہتے ہیں اور کسی کے سامنے دست سوال دراز نہ کرنے کی وجہ سے

ناواقف لوگ انہیں تو مگر خیال کرتے ہیں چنانچہ ایسے ہی لوگوں کے متعلق آنحضرت ﷺ نے حضرت معاویہ رضی اللہ

کو حکم دیا: ﴿(۶۳) (خُذْ مِنْ أَغْنِيَاءِ هُمْ وَ رُدِّفِي فَقَرَاءِ هُمْ)﴾ کہ ان کے اغنیاء سے صدقات

وصول کر کے وہاں کے فقراء میں تقسیم کرو (اور حقیقت یہ ہے کہ نفس قانع نہ ہو تو مال و دولت کے باوجود بھی انسان

فقیر ہی رہتا ہے) جیسا کہ شاعر نے کہا ہے۔ ﴿(۳۳۱) وَقَدْ يَكْثُرُ الْمَالُ وَالْإِنْسَانُ مُفْتَقِرٌ اور کبھی مال کی فراوانی کے باوجود انسان محتاج ہی نظر آتا

ہے۔ محاورہ ہے۔ غَنِيْتُ بِكَذَا غِنْيًا وَغِنَاءً وَاسْتَغْنَيْتُ وَتَغْنَيْتُ وَتَغَانَيْتُ: مال دار یا بے نیاز ہونا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَاسْتَغْنَى اللَّهُ، وَاللَّهُ غَنِيٌّ حَمِيدٌ﴾ (۲۳-۲۴) اور خدا نے بھی بے پروائی کی اور خدا بے پرواہ

(اور سزاوار حمد و ثنا) ہے۔

① رواه الشيخان والترمذی والنسائی من حديث عبدالله بن عباس نظر الصحيح (ص ۱۹۶ ج ۱) والترمذی (ص ۸۰ ج ۱)

و مسلم (ص ۳۶ ج ۱) والنسائی (ص ۲۵۸ ج ۱)۔

② انظر أيضاً في المحاضرات للمؤلف (۲: ۵۲۱) بغیر عزو۔

آباد ہی نہیں ہوئے تھے۔

پروردگار سے فریاد کرتے تھے۔

﴿فَاسْتَغَاثَهُ الَّذِي مِنْ شِيعَتِهِ عَلَى الَّذِي مِنْ عَدُوِّهِ﴾ (۲۸-۱۵) تو جو شخص ان کی قوم میں سے تھا اس نے دوسرے شخص کے مقابلے میں جو موسیٰ علیہ السلام کے دشمنوں میں سے تھا، موسیٰ علیہ السلام سے مدد طلب کی۔ اور آیت کریمہ۔

﴿وَأَنْ يَسْتَعِثُّوا يُعَاثُوا بِمَاءٍ كَالْمُهْلِ﴾ (۱۸-۲۹) اور اگر فریاد کریں گے تو ایسے کھولتے ہوئے پانی سے ان کی دادرسی کی جائے گی جو ہلکے ہوئے تانبے کی طرح گرم ہوگا۔

میں یَسْتَعِثُّوْا عَوْثٌ (مدد مانگنا) سے بھی ہو سکتا ہے۔ اور عِثٌ (پانی مانگنا) سے بھی۔ اسی طرح يُعَاثُوا (فعل مجہول) کے بھی دونوں معنی ہو سکتے ہیں (پہلی صورت میں یہ أَعَاثٌ یعنی (باب افعال) سے ہوگا دوسری صورت میں عَاثٌ، یَعِثُّ سے اور آیت کریمہ۔

﴿كَمَثَلِ غَيْثٍ أَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهُ﴾ (۵۷-۱۰) جیسے بارش کہ اس سے کھیتی اگتی اور کسانوں کو کھیتی بھلی لگتی ہے۔

میں غَيْثٌ کے معنی بارش ہیں، چنانچہ شاعر نے کہا ہے۔

الْمَغْنَى: یہ اسم مصدر اور ظرف مکان دونوں کے لیے استعمال ہوا ہے۔

غَنَى، أُغْنِيَةً، وَغِنَاءٌ (تَغْنَى) گیت گانا۔

بعض نے کہا ہے کہ کبھی (تَغْنَى) بمعنی اسْتَعْنَى بھی آجاتا ہے۔ چنانچہ فرمان نبوی ﷺ (۶۳) ((مَنْ لَمْ يَتَغَنَّ بِالْقُرْآنِ)) (جو شخص قرآن کے ساتھ اکتفانہ کرے) میں لَمْ يَتَغَنَّ بمعنی لَمْ يَسْتَعْنِ ہی ہے۔ یعنی جو شخص قرآن پاک کے ساتھ دوسروں سے بے نیاز نہ رہے۔

### (غ و ث (غ ی ث)

الْعَوْثُ کے معنی مدد اور الْغَيْثُ کے معنی بارش کے ہیں اور اسْتَعِثُّهُ: (استعمال) کے معنی کسی کو مدد کے لیے پکارنے یا اللہ تعالیٰ سے بارش طلب کرنا آتے ہیں جب کہ اس کے معنی مدد طلب کرنا ہو تو اس کا مطاوع اَعَاثِيْنِ آئے گا مگر جب اس کے معنی بارش طلب کرنا ہو تو اس کا مطاوع عَاثِيْنِ آتا ہے اور عَوْثٌ: میں نے اس کی مدد کی یہ بھی عَوْثٌ سے مشتق ہے جس کے معنی مدد ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿إِذْ تَسْتَغِيثُونَ رَبَّكُمْ﴾ (۸-۹) جب تم اپنے

① واختار هذا المعنى ابو عبيد القاسم بن سلام وراجع غريبه) والحديث من رواية عبد الله بن نهيك وفي معناه بحث راجع امالي المرتضى (۱: ۳۱-۳۶) ولتخريج (الحديث انظر الكثر للمتقى (رقم ۲۷۷۰) ثم في (رقم ۲۷۹۸) وتخريج الكشف للحافظ ابن حجر رقم (۲۴۲) والفتح الكبير للنبهاني (۷/۳۶۷) قال البيهقي في سننه الكبرى من كتاب الشهادات عن الشافعي معناه بقره تحزينا وليس معناه الاستغناء على ما قالوا وقد كره بعض الفقهاء التحدث لهذا الحديث كراهة ان يتناول بالحناء مكرورة (راجع المحاضرات للمؤلف (۴/ ۴۳۷)۔

② قاله ذو الرمة في مدح بلال بن ابي بردة والصحيح اسم ناقته والبيت في اللسان (غيث) والمحكم (صدق) و الكامل (۳۹۶) وشواهد الكشف ۸۸ الدقة للخفاجي ۲۳۵ وطراز المحال ۵۸ وفي البيت شاهدان فعل السمع يتعدى الى مفعولين ويدخل على المبتداء والخبر مثل علم وروى برفع الناس على الحكاية اى مقول فيهم كذا وينصبه على المفعولية والمبحث في المطولات ونظيره وجدت الناس اخبر نقله بهاء السكة۔



اور غَارَتِ الشَّمْسُ غِيَارًا کے معنی سورج غروب ہو جانے کے ہیں۔ کسی شاعر نے کہا ہے۔ ﴿(الطویل)﴾  
 (۳۳۳) هَلِ الدَّهْرُ إِلَّا لَيْلَةٌ وَنَهَارُهَا  
 وَلَا تَطْلُوعُ الشَّمْسِ ثُمَّ غِيَارُهَا  
 (زمانہ دن رات کی گردش اور سورج کے طلوع و غروب ہونے کا نام ہے۔)

غَسُورَ کے معنی پست زمین میں چلے جانے کے ہیں۔  
 وَأَعَارَ عَلَى الْعُدُوِّ إِغَارَةً وَغَارَةً کے معنی دشمن پر لوٹ مارنے کے۔ قرآن پاک میں ہے۔  
 ﴿فَالْمُغِيرَاتِ صُبْحًا﴾ (۱۰۰-۳) پھر صبح کو چھاپہ مارتے ہیں۔  
 اور اس سے مراد گھوڑے ہیں (صبح کو دشمن پر چھاپہ مارتے ہیں۔)

### (غ و ص)

الْغَوَّاصُ کے معنی پانی میں غوطہ لگا کر کوئی چیز نکال لانے کے ہیں اور جو شخص کسی پیچیدہ مسئلہ کی تک پہنچ جائے یا نیچے کی تہ سے کوئی چیز نکال لائے اسے غَائِصٌ کہا جاتا ہے اسی سے غَوَّاصٌ صیغہ مبالغہ ہے جس کے معنی غوطہ خور کے ہیں۔

﴿وَالشَّيَاطِينِ كُلِّ بَنَاءٍ وَغَوَّاصٍ﴾ (۳۸-۳۷)  
 اور شیاطین کو بھی (ان کے زیر فرمان کیا) وہ سب عمارتیں بنانے والے اور غوطہ مارنے والے تھے۔  
 ﴿وَمِنَ الشَّيَاطِينِ مَنْ يَغُوصُونَ لَهُ﴾ (۲۱-۸۲)  
 اور شیاطین (کی جماعت کو بھی ان کے تابع کر دیا تھا کہ

(۳۳۲) سَمِعْتُ النَّاسَ يَتَجَعَّمُونَ غِيثًا  
 فَقُلْتُ لِيَصِيدَحَ أَنْتَجِعِي بِلَا لَا  
 میں نے سنا ہے کہ لوگ بارش کے مواقع تلاش کرتے ہیں تو میں نے اپنی اونٹنی صیدح سے کہا تم بلال کی تلاش کرو۔  
 (غ و ر)

الْغَوْرُ کے معنی نشیبی زمین کے ہیں۔ محاورہ ہے۔  
 غَارَ الرَّجُلُ وَأَعَارَ: نشیبی زمین میں چلا جانا۔ غَارَتِ عَيْنُهُ غَوْرًا وَغَوْرًا: آنکھ کا اندر گھس جانا۔ قرآن پاک میں ہے۔  
 ﴿مَاءٌ كُمْ غَوْرًا﴾ (۶۷-۳۰) تمہارا پانی بہت زیادہ زمین کے نیچے اتر جائے۔  
 ﴿أَوْ يُصْبِحَ مَاءٌ هَا غَوْرًا﴾ (۱۸-۴۱) یا اس کا پانی زمین کے اندر اتر جائے۔  
 الْغَارُ کے معنی غار کے ہیں۔ ج۔ (أَغْوَارٌ وَغَيْرَانٌ)  
 قرآن پاک میں ہے۔

﴿إِذْ هَمَّافِي الْغَارِ﴾ (۹-۳۰) جب وہ دونوں غار (ثور) میں تھے۔

اور کنایہ کے طور پر فرج و بطن یعنی پیٹ اور شرمگاہ کو غَارَان (تثنیہ) کہا جاتا ہے اور مَغَارٌ کا لفظ غَوْرُ کی طرح اسم مکان کے معنی میں استعمال ہوتا ہے (جمع مَغَارَاتِ) قرآن میں ہے۔

﴿لَوْ يَجِدُونَ مَلْجَأَ أَوْ مَغْرَبٍ أَوْ مَذًى خَلَا﴾ (۹-۵۷)  
 اگر ان کو کوئی بچاؤ کی جگہ (جیسے قلعہ) یا غار و مفاک یا (زمین کے اندر) گھسنے کی جگہ مل جائے۔

② البيت من مطلع قصيدة لابی ذؤبب الهذلي في ديوانه ٢، وانظرا للسان (غور) والاقتضاب ١٧٨ وابن عقيل رقم ١٦٨ ومجالس ثعلب ٥٨٣۔

﴿وَإِخْوَانُهُمْ يَمُدُّوْنَهُمْ فِي الْغَيِّ﴾ (۷-۲۰۲)  
اور ان (کفار) کے بھائی انہیں گمراہی میں کھینچتے جاتے  
ہیں۔ اور آیت کریمہ۔  
﴿فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا﴾ (۹-۵۹) سو عنقریب ان کو  
گمراہی (کی سزا) ملے گی۔

میں غی سے عذاب مراد ہے عذاب کو غی اس لیے  
کہا ہے کہ گمراہی عذاب کا سبب بنتی ہے۔ لہذا عذاب کو  
غی کہا مجازی ہے یعنی کسی شے کو اس کے سبب نام سے  
موسوم کر دینا جیسا کہ نبات کو ندی (طراوت) کہہ دیتے  
ہیں۔ بعض نے آیت کے یہ معنی کئے ہیں کہ یہ لوگ  
عنقریب ہی اپنی گمراہی کا نتیجہ اور شرہ پالیں گے مگر مال  
کے لحاظ سے دونوں معنی ایک ہی ہیں غَاوٍ بھٹک جانے  
والا، گمراہ۔ جمع غَاوُونَ وَغَاوِينَ جیسے فرمایا۔

﴿وَبُرِّزَتِ الْجَهَنَّمُ لِلْغَاوِينَ﴾ (۲۶-۹۱) اور  
دورِخ گمراہوں کے سامنے لائی جاتی گی۔  
﴿وَالشُّعْرَاءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوُونَ﴾ (۲۶-۲۲۳) اور  
شاعروں کی پیروی گمراہ لوگ کیا کرتے ہیں۔  
الْغَوِيُّ: گمراہ، غلط رو۔ جیسے فرمایا۔

﴿إِنَّكَ لَغَوِيٌّ مُّبِينٌ﴾ (۲۸-۱۸) کہ تو صریح گمراہ  
ہے۔ اور آیت کریمہ۔

﴿وَعَصَى آدَمُ رَبَّهُ فَغَوَى﴾ (۲۰-۱۲۱) اور  
آدم علیہ السلام نے اپنے پروردگار کے حکم کے خلاف کیا (تو وہ  
اپنے مطلوب سے) بے راہ ہو گئے۔

میں غَوَى کے معنی یہ ہیں کہ آدم نے جہالت کا ارتکاب  
کیا اور بعض نے اس کے معنی خَاب کیے ہیں یعنی انھوں

ان میں سے بعض ان کے لیے غوطے مارتے تھے۔ میں  
پانی کے اندر سے موتی نکالنے والے غوطہ خور ہی مراد نہیں  
ہیں بلکہ نادر کام کرنے والے اور عجیب و غریب صنعتیں  
ایجاد کرنے والے بھی ان میں داخل ہیں۔

## (غُول)

الْغَوْلُ: کسی کو اس طرح ہلاک کر دینا کہ اس کا پتہ بھی نہ  
چل سکے۔ غَالٌ يَغُولُ غَوْلًا وَاغْتَالَهُ اغْتِيَالًا: اس  
نے اسے ہلاک کر دیا۔ اسی سے سِغْلَةٌ (چنیل) کو  
غَوْلٌ کہا جاتا ہے (غَوْل در دوسرے مستی) قرآن پاک  
نے جنت کی شراب کی صفت بیان کرتے ہوئے لَا فِيْهَا  
غَوْلٌ (۳۷-۴۷) نہ اس سے در دوسر ہوگا۔

کہہ کر اس سے ہر اس عیب کی نفی کر دی ہے جس کی طرف  
آیت۔

﴿وَأَثْمُهُمَا أَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا﴾ (۲-۲۱۹) (ان میں  
نقصان بڑے ہیں۔) اور آیت۔

﴿وَرَجَسَ مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ﴾  
(۵-۹۰) ناپاک اعمال شیطان سے ہیں سو ان سے بچتے  
رہنا۔

## (غَوِي)

الْغَوِيُّ: اس جہالت کو کہتے ہیں جو غلط اعتقاد پر مبنی ہو۔  
کیونکہ جہالت کبھی تو کسی عقیدہ پر مبنی ہوتی ہے اور کبھی  
عقیدہ کو اس میں دخل نہیں ہوتا۔ پہلی قسم کی جہالت کا نام  
غی (گمراہی ہے)۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوَى﴾ (۵۳-۱۲) کہ  
تمہارے رفیق (محمد) نہ رستہ بھولے ہیں اور نہ بھٹکے ہیں۔

میں بتایا گیا ہے کہ کفار قیامت کے دن اعلان کریں گے کہ ہم نے ان کے ساتھ انتہائی مخلصانہ سلوک کیا تھا جو کہ ایک انسان اپنے دوست سے کر سکتا ہے کیونکہ انسان کا سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ وہ اپنے دوست کے لیے وہی چیز پسند کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے تو وہ کہیں گے کہ ہم نے انہیں اپنی طرف سے فائدہ پہنچایا اور انہیں اپنے جیسا سمجھا تھا اور یہی معنی آیت -

﴿فَاغْوَيْنَاكُمْ إِنَّا كُنَّا غَاوِينَ﴾ (۳۷-۳۸) ہم نے تم کو بھی گمراہ کیا (اور) ہم خود بھی گمراہ تھے، کے ہیں۔  
﴿فَبِمَا أَغْوَيْتَنِي لَأَزِيِّنَ لَهُمْ فِي الْأَرْضِ وَلَا أَغْوِيَنَّهُمْ.....﴾ (۱۵-۳۹) جیسا کہ تم نے مجھے رستے سے الگ کیا ہے میں بھی زمین میں لوگوں کے لیے (گناہوں کو) آراستہ کر دکھاؤں گا اور ان کو بہکاؤں گا۔

### (غ ی ب)

الْغَيْبُ: (ض) غَابَتِ الشَّمْسُ وَغَيْرُهَا کا مصدر ہے جس کے معنی کسی چیز کے نگاہوں سے اوجھل ہو جانے کے ہیں۔ چنانچہ محاورہ ہے۔  
غَابَ عَنِّي كَذَا فلاں چیز میری نگاہ سے اوجھل ہو گئی۔ قرآن پاک میں ہے۔  
﴿أَمْ كَانَ مِنَ الْغَائِبِينَ﴾ (۲۷-۲۰) کیا کہیں غائب ہو گیا ہے۔

نے سراسر نقصان اٹھایا۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے۔  
(الطویل)

(۳۳۴) وَمَنْ يَغْوِلَا يَغْدَمَ عَلَى الْغَيِّ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ  
اور اگر ناکام ہو جائے تو ناکامی پر بھی ملامت کرنے والوں کی کمی نہیں ہے۔

بعض نے غَوَى کے معنی فَسَدَ عَيْشُهُ کیے ہیں یعنی اس کی زندگی تباہ ہو گئی اور یہ غَوَى الْفَصِيلُ وَغَوَى جیسے هَوَى وَهَوَى سے ماخوذ ہے اور اس کے معنی ہیں: اونٹ کے بچے نے بہت زیادہ دودھ پی لیا جس سے اسے بد ہضمی ہو گئی۔ اور آیت کریمہ۔

﴿إِنْ كَانَ اللَّهُ يُرِيدُ أَنْ يُغْوِيَكُمْ﴾ (۱۱-۳۲) اور اگر اللہ یہ چاہے کہ تمہیں گمراہ کرے۔  
میں يُغْوِيَكُمْ سے مراد گمراہی کی سزا دینے کے ہیں اور بعض نے اس کے معنی گمراہی کا حکم لگانا بھی کیے ہیں۔ اور آیت کریمہ۔

﴿قَالَ الَّذِينَ حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ رَبَّنَا هَؤُلَاءِ الَّذِينَ أَغْوَيْنَا، أَغْوَيْنَاهُمْ كَمَا غَوَيْنَا تَبَرَّأْنَا إِلَيْكَ﴾ (۲۸-۶۳) (تو جن لوگوں پر) عذاب کا حکم ثابت ہو چکا ہو گا وہ کہیں گے کہ ہمارے پروردگار یہ وہ لوگ ہیں جن کو ہم نے گمراہ کیا تھا اور جس طرح ہم خود گمراہ تھے اسی طرح انہیں گمراہ کیا تھا۔

① وفي المعجم للمرزبانی ۵: البيت للمرقش الاصغر (ربيعه بن سليمان بن سعد بن مالك) وهو ابن اخي المرقش الاكبر وعم طرفه بن العبد اوله: فمن يلق خيرا يحمد الناس امره..... انظر اللسان (غوى) والمفضليات (۱۱۸) والبيت من شواهد الطبري (۱۰۱: ۱۶) والخزانة (۱۶۴: ۱) والاغانى (۱۸۵: ۵) والشعرو الشعراء (۱۰۷) والحماسة للبحترى (۲۳۶) والمرزبانى (۱۰۲) وشعراء الجاهلية (۳۲۹) والانصاف (۱۱۸) والمرئضى (۱: ۳۶۱: ۴۶) والبحر (۶: ۲۰۱: ۲۲۶: ۲) واصلاح يعقوب (۲۰۳) وقبله: امن حلم اصبحت تنكث واجما وقد تعترى الاحلام من كان نائما والبيت ايضا فى الحصرى (۱۱: ۳) والعقد الفريد (۲: ۱۸۶) والسيوطى ۱۵۹ والفائق (۲: ۱۰۱)

ہوتا ہے اور انہیں نہ ماننے کی وجہ سے انسان لحد ہو جاتا ہے ❶ اور جن لوگوں نے غیب سے قرآن یا تقدیر مراد لی ہے۔ تو انھوں نے اس کے جزوی مفہوم کی طرف اشارہ کیا ہے اور بعض نے یَوْمُنُونَ بِالْغَيْبِ کے معنی یہ کیے ہیں کہ ”تم سے غائب ہونے کی حالت میں بھی وہ ایمان لاتے ہیں، ❷ یعنی وہ ان منافقوں کی طرح نہیں ہیں جن کے متعلق ارشاد ہے کہ:

﴿وَإِذَا خَلَوْا إِلَىٰ شُيُطَانِهِمْ ، قَالُوا إِنَّا مَعَكُمْ ، إِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِئُونَ﴾ (۱۴-۲) اور جب اپنے شیطانوں میں جاتے ہیں تو (ان سے) کہتے ہیں کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں اور ہم (پیردان محمدؐ سے) تو ہنسی کیا کرتے ہیں۔ چنانچہ مندرجہ ذیل آیات۔

﴿الَّذِينَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُم بِالْغَيْبِ﴾ (۱۸-۳۵) جو بن دیکھے اپنے پروردگار سے ڈرتے..... ہیں۔  
﴿مَنْ خَشِيَ الرَّحْمَنَ بِالْغَيْبِ﴾ (۳۳-۵۰) جو خدا سے بن دیکھے ڈرتا ہے۔

وغیرہ میں بھی غیب کے معنی خلوت اور تنہائی کے ہیں۔  
﴿وَلِلَّهِ غَيْبُ السَّمُوتِ وَالْأَرْضِ﴾ (۷۷-۱۶) اور آسمانوں اور زمین کا علم خدا ہی کو ہے۔

﴿أَطْلَعَ الْغَيْبِ﴾ (۷۸-۱۹) کیا اس نے غیب کی خبر پالی ہے۔

﴿فَلَا يَظْهَرُ عَلَىٰ غَيْبِهِ أَحَدًا﴾ (۷۹-۲۶) اور کسی پر اپنے غیب کو ظاہر نہیں کرتا۔

﴿لَا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمُوتِ وَالْأَرْضِ الْغَيْبَ

اور ہر وہ چیز جو انسان کے علم اور حواس سے پوشیدہ ہو اس پر غیب کا لفظ بولا جاتا ہے یعنی غیب بمعنی غائب ہے۔  
قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَمِمَّنْ غَائِبَةٌ فِي السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ إِلَّا فِي كِتَابٍ مُّبِينٍ﴾ (۷۵-۲۷) اور آسمانوں اور نہ زمین میں کوئی پوشیدہ چیز نہیں ہے مگر (وہ) کتاب روشن میں (لکھی ہوئی) ہے۔

اور کسی چیز کو غَيْبٌ یا غَائِبٌ لوگوں کے لحاظ سے کہا جاتا ہے ورنہ باری تعالیٰ سے تو کوئی چیز بھی پوشیدہ نہیں ہے۔ جیسے فرمایا۔

﴿لَا يَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ فِي السَّمُوتِ وَلَا فِي الْأَرْضِ﴾ (۳۴-۳) ذرہ بھر چیز بھی اس سے پوشیدہ نہیں (نہ) آسمانوں میں اور نہ زمین میں۔ لہذا آیت کریمہ۔

﴿عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ﴾ (۷۳-۶) وہی پوشیدہ اور ظاہر (سب) کا جاننے والا ہے۔

میں الْغَيْبُ وَالشَّهَادَةُ سے مراد وہ اشیاء ہیں جو انسان کے علم و حواس سے پوشیدہ ہیں اور جو اس کے سامنے موجود ہیں اور آیت کریمہ۔

﴿يَوْمُنُونَ بِالْغَيْبِ﴾ (۳-۲) غیب پر ایمان لاتے ہیں۔

میں الغیب سے وہ تمام اشیاء اور حقائق مراد ہیں جو انسانی حواس سے ماوراء ہیں اور بجاہت عقل سے ان کا علم نہیں ہو سکتا بلکہ انبیاء علیہم السلام کے خبر دینے سے ہی ان کا علم

❶ وهو قول جمهور المفسرين كما في الروح۔

❷ وهو اختيار أبي مسلم الاصفهاني فعلى هذا قوله (بالغيب) صفة المؤمنين (راجع الفخر ۲/۲۷)۔

جنگل کو غابۃ کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔  
﴿فِیْ غِیَابَةِ الْجُبِّ﴾ (۱۰-۱۲) کسی کنویں کی گہرائی  
میں..... ایک محاورہ ہے۔  
هُمْ یَشْهَدُونَ أَحِبَانَا وَیَتَغَیَّبُونَ أَحِبَانَا کہ وہ  
کبھی ظاہر ہوتے ہیں اور کبھی چھپ جاتے ہیں۔ اور آیت  
کریمہ۔

وَيَفْذِقُونَ بِالْغُیْبِ مِنْ مَّكَانٍ بَعِیدٍ کے معنی یہ ہیں  
کہ..... (وہ یونہی اندھیرے میں تیر چلاتے ہیں اور  
نگاہ و بصیرت سے اس کا ادراک نہیں کرتے۔ ۱)

### (غیر)

غیر۔ کالفظ کی طرح پر استعمال ہوتا ہے۔ ۱۔ محض نفی کے  
لیے یعنی اس سے کسی دوسرے معنی کا اثبات مقصود نہیں ہوتا  
جیسے، مَرَرْتُ بِرَجُلٍ غَیْرِ قَائِمٍ: یعنی میں ایسے آدمی  
کے پاس سے گزرا جو کھڑا نہیں تھا۔ قرآن پاک میں ہے۔  
﴿وَمَنْ أَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوَاهُ بِغَيْرِ هُدًى مِنَ  
اللّٰهِ﴾ (۵۰-۲۸) اور اس سے زیادہ کون گمراہ ہوگا جو خدا  
کی ہدایت کو چھوڑ کر اپنی خواہش کے پیچھے چلے۔

﴿وَهُوَ فِی الْخِصَامِ غَیْرُ مُبِینٍ﴾ (۱۸-۳۳) اور  
جھگڑے کے وقت بات نہ کر سکے۔

۲۔ بمعنی الّا جو مستثنیٰ کے لیے آتا ہے۔ اس صورت میں  
یہ نکرہ کی صفت بن سکتا ہے۔ جیسے مَرَرْتُ بِقَوْمٍ غَیْرِ  
زَیْدٍ: یعنی میں زید کے علاوہ دوسری قوم کے پاس سے  
گزرا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِنْ اِلٰهِ غَیْرِی﴾ (۲۸-۳۸) میں  
تمہارا اپنے سوا کسی کو اللہ نہیں جانتا۔

اِلَّا اللّٰهُ ﴿۶۵-۲۷﴾ کہ جو لوگ آسمانوں اور زمین میں  
ہیں خدا کے سوا غیب کی باتیں نہیں جانتے۔

﴿تِلْكَ مِنْ اَنْبَاءِ الْغَیْبِ﴾ (۱۱-۳۹) یہ (حالات)  
مخملہ غیب کی خبروں کے ہیں۔

﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطِلَّ عَلَیْكُمْ عَلَی الْغَیْبِ﴾  
(۱۷۹-۳) اور اللہ تم کو غیب کی باتوں سے مطلع نہیں  
کرے گا۔

﴿اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُیُوبِ﴾ (۱۱۶-۵) بے شک تو  
عَلَّامُ الْغُیُوبِ ہے۔

﴿اِنَّ رَبِّیْ یَقْضِیْ بِالْحَقِّ عَلَّامُ الْغُیُوبِ﴾  
(۳۳-۲۸) میرا پروردگار اوپر سے حق اتارتا ہے (اور وہ)  
غیب کی باتوں کا جاننے والا ہے۔

اَعَابَتْ الْمَرْءَ: وہ عورت جس کا خاوند اس کے پاس  
موجود نہ ہو۔ چنانچہ آیت کریمہ۔

﴿حَافِظَاتٌ لِّلْغَیْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ﴾ (۳۴-۴)  
اور ان کے پیٹھے پیچھے اللہ کی حفاظت میں (مال و آبرو کی)  
خبرداری کرتی ہیں۔

کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنے خاوندوں کی عدم موجودگی میں وہ  
کام نہیں کرتیں جسے وہ برا سمجھتے ہوں۔

الْغَیْبِیَّةُ: کے معنی کسی انسان کی عدم موجودگی میں اس کے  
اس عیب کو بیان کرنے کے ہیں جو اس میں موجود تو ہو لیکن  
اس کا ذکر کرنا اس پر ناگوار گزرے۔ قرآن پاک میں ہے۔  
﴿وَلَا یَغْتَبِ بَعْضُكُم بَعْضًا﴾ (۱۲-۳۹) اور نہ کوئی  
کسی کی غیبت کرے۔

الْغِیَابَةُ: کے معنی نشیمن زمین کے ہیں اور اسی سے گھنے

سوا کوئی قرآن (بنا) لاؤ۔

اور تَغْيِير کا لفظ بھی دو طرح استعمال ہوتا ہے ایک صرف کسی چیز کی صورت کو بدلنا جیسے غَيَّرْتُ دَارِي یعنی میں نے اپنے گھر کی شکل و صورت بدل دی۔ دوم کسی دوسری چیز سے تبدیل کر لینا جیسے: غَيَّرْتُ عَلَامِي وَ دَابَّتِي یعنی میں نے اپنا غلام یا جانور دوسرے سے تبدیل کر لیا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْيِرُ مَا يَقُومُ حَتَّىٰ يَغْيِرَ مَا بِنَفْسِهِمْ﴾ (۱۳-۱۱) خدا اس نعمت کو جو کسی قوم کو حاصل ہے نہیں بدلتا جب تک کہ وہ اپنی حالت کو نہ بدلیں۔

اور لفظ غَيَّرُ اور مُخْتَلِفٌ میں معنوی لحاظ سے فرق یہ ہے کہ غیر کا مفہوم لفظ مختلف سے زیادہ عام ہے کیونکہ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ چیز دوسری کی غیر ہے تو ان دونوں چیزوں کا بلحاظ جو ہر کے مختلف ہونا ضروری نہیں ہے۔ بلکہ تغایر فی الوصف کی صورت بھی میں ایک دوسری کا غیر کہا جاسکتا ہے مگر ایک چیز کو دوسری سے مختلف اس صورت میں کہا جاسکتا ہے جب کہ ان دونوں میں تغایر بلحاظ جو ہر کے پایا جائے۔ بس اس سے واضح ہوتا ہے کہ ہر جگہ مختلفین کو متغایرین تو کہہ سکتے ہیں مگر ہر موقعہ پر متغایرین کو مختلفین نہیں کہہ سکتے۔

### (غ ی ض)

غَاصَّ (ض) اَلشَّيْءُ غَيْصًا وَ غَاَصَهُ غَيْرُهُ: یہ نقص کی طرح لازم و متعدی دونوں طرح آتا ہے۔ لہذا اس کے معنی کسی چیز کو کم کرنے یا اس کے از خود کم ہونے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَ غِيَصَ الْمَاءُ﴾ (۴۴-۱۱) تو پانی خشک ہو گیا۔

﴿مَا لَكُمْ مِّنَ الْيَوْمِ غَيْرُهُ﴾ (۷-۶۵) اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں۔

﴿هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللَّهِ﴾ (۳-۳۵) کیا خدا کے سوا کوئی اور خالق (اور رازق) ہے۔

۳۔ کسی چیز سے صرف اس کی صورت یعنی وصف کی نفی کرنے کے لیے آتا ہے۔ جیسے الْمَاءُ إِذَا كَانَ حَارًّا غَيْرُهُ: إِذَا كَانَ بَارِدًا۔ کہ پانی گرم ہونے کی حالت میں ٹھنڈے کا غیر ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُودُهُمْ بَدَلْنَاهُمْ جُلُودًا غَيْرَهَا﴾ (۴-۵۶) جب ان کی کھالیں گل (اور جل) جائیں گی تو اور کھالیں بدل دیں گے۔

۴۔ یہ کہ وہ نفی ذات کو بھی شامل ہو۔ جیسے فرمایا۔

﴿الْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُونِ بِمَا كُنْتُمْ تَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ غَيْرَ الْحَقِّ﴾ (۶-۹۳) آج تم کو ذلت کے عذاب کی سزا دی جائے گی اس لیے کہ تم خدا پر جھوٹ بولا کرتے تھے۔ یعنی باطل بہتان بندیاں کرتے تھے۔

www.KitaboSunnat.com

﴿وَاسْتَكَبَرُوا وَ جُودُهُ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ﴾ (۲۸-۳۹) اور وہ اور اس کے لشکر ملک میں

ناحق مغرور ہو رہے تھے۔

﴿أَغْيَرُ اللَّهُ أَبْعَىٰ رَبًّا﴾ (۶-۱۶۴) کیا میں خدا کے سوا اور پروردگار تلاش کروں۔

﴿وَيَسْتَبْدِلُ رَبِّي قَوْمًا غَيْرَكُمْ﴾ (۴۷-۳۸) اور تمہاری جگہ اور لوگ پیدا کرے گا۔

﴿أَنْتَ بِقُرْآنٍ غَيْرِ هَذَا﴾ (۱۵-۱۰) (یا تو) اس کے

﴿كَذَا الْآيَةِ فِي الْأَصْلِ وَانْمَا هُوَ مِنَ الْمَصْحُوحِ دُونَ لَفْظِ رَبِّي انْمَا جَاءَ فِي (۱۱-۵۷) لَكِنْ هُنَاكَ يَسْتَخْلَفُ بَدَلُ يَسْتَبْدِلُ

ہے اور جو لوگ اپنے غصہ کو پی جاتے ہیں ان کی تحسین فرمائی ہے۔ چنانچہ فرمایا۔

﴿وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ﴾ (۳-۱۳۳) اور غصے کو روکتے ہیں۔

اور اگر غیظ کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو اس سے انتقام لینا مراد ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا۔

﴿وَأَنَّهُمْ لَنَا لَغَائِظُونَ﴾ (۲۶-۵۵) اور یہ ہمیں غصہ دلا رہے ہیں۔

یعنی وہ اپنی مخالفانہ حرکتوں سے ہمیں انتقام پر آمادہ کر رہے ہیں۔ اور تَغَيْظُ کے معنی اظہار غیظ کے ہیں جو کبھی ایسی آواز کے ساتھ ہوتا ہے جو سنائی دے، جیسے فرمایا۔

﴿سَمِعُوا لَهَا تَغِيظًا وَزَفِيرًا﴾ (۲۵-۱۲) تو اس کے جوش غضب اور چیخنے چلانے کو سنیں گے۔



﴿وَمَا تَغْنِصُ الْأَرْضَ حَامٌ﴾ (۱۳-۸) اور پیٹ کے سکڑنے۔ یعنی وہ نطفہ جسے بگاڑ کر رحم اس پانی کی طرح ضائع کر دیتے ہیں جسے زمین اپنے اندر جذب کر لیتی ہے (اور وہ پینے کے کام نہیں آتا۔)

الْغَيْصَةُ: وہ جگہ جہاں پانی ٹھہرے اور زمین اسے اپنے اندر جذب کر لے لَيْلَةُ غَائِصَةٍ: تاریک رات۔

## (غ ی ظ)

الْغَيْظُ کے معنی سخت غصہ کے ہیں۔ یعنی وہ حرارت جو انسان اپنے دل کے دوران خون کے تیز ہونے پر محسوس کرتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿قُلْ مُوتُوا بِغَيْظِكُمْ﴾ (۳-۱۱۹) کہہ دو کہ (بد بختوں) غصے میں مر جاؤ۔ غَاظُهُ (کسی کو غصہ دلانا)۔

﴿لِيَغِيظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ﴾ (۴۸-۲۹) تاکہ کافروں کا جی جلانے۔

اور اللہ تعالیٰ نے سخت غصہ کے وقت نفس کو روکنے کا حکم دیا

## کتاب الفاء

سے کسی کتاب میں بیان کی جائے گی۔

### (ف ت ا)

مَا فَتَاتُ وَمَا فَتِنْتُ أَفَعَلْتُ كَذَا (بمعنی مَا زِلْتُ)  
میں اس کام کو برابر کرتا رہا۔ قرآن پاک میں ہے۔  
﴿تَفْتَتُوا تَذَكَّرُ يَوْسُفَ﴾ (۸۵-۱۲) آپ یوسف کو  
اسی طرح یاد کرتے ہی رہو گے۔

### (ف ت ح)

الْفَتْحُ کے معنی کسی چیز سے بندش اور پیچیدگی کو زائل  
کرنے کے ہیں اور یہ ازالہ دو قسم پر ہے ایک وہ جس کا  
آنکھ سے ادراک ہو سکے جیسے۔ فَتَحَ الْبَابِ (دروازہ  
کھولنا) اور فَتَحَ الْقُفْلِ (قفل کھولنا) اور فَتَحَ  
الْمَتَاعِ (اسباب کھولنا۔ قرآن پاک میں ہے۔)  
﴿وَلَمَّا فَتَحُوا مَتَاعَهُمْ﴾ (۶۵-۱۲) اور جب انھوں  
نے اپنا اسباب کھولا۔

﴿وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا مِّنَ السَّمَاءِ﴾ (۱۴-۱۵)  
اور اگر ہم آسمان کا کوئی دروازہ ان پر کھولتے۔ دوم جس کا  
ادراک بصیرت سے ہو۔ جیسے:

فَتَحَ إِلَهُمَّ: (یعنی ازالہ غم) اس کی چند قسمیں ہیں (۱) وہ  
جس کا تعلق دنیوی زندگی کے ساتھ ہوتا ہے جیسے مال وغیرہ  
دے کر غم و اندوہ اور فقر و احتیاج کو زائل کر دینا۔ جیسے  
فرمایا۔

﴿فَلَمَّا نَسُوا مَا ذُكِّرُوا بِهِ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ أَبْوَابَ

### (ف و د)

الْفَوَادُ کے معنی قلب یعنی دل کے ہیں مگر قلب کو فواد کہنا  
معنی تَفَوُّدُ یعنی روشن ہونے کے لحاظ سے ہے محاورہ ہے  
فَأَذْتُ اللَّحْمَ: گوشت کو آگ پر بھون لینا۔ لَحْمٌ  
فَيَنْدُ آگ میں بھنا ہوا گوشت۔ قرآن پاک میں ہے۔  
﴿مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا آتَى﴾ (۱۱-۵۳) جو کچھ انھوں  
نے دیکھا ان کے دل نے اس کو جھوٹ نہ جانا۔

﴿إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ﴾ (۳۶-۱۷) کہ  
کان آنکھ اور دل.....

فَوَادُ کی جمع أَفِيدَةٌ ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔  
﴿فَاجْعَلْ أَفِيدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِي إِلَيْهِمْ﴾  
(۱۳-۳۷) لوگوں کے دلوں کو ایسا کر دے کہ ان کی طرف  
جھکے رہیں۔

وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفِيدَةَ اور  
تمہارے کان، آنکھیں اور دل بنائے۔

﴿وَأَفِيدَتُهُمْ هَوَاءٌ﴾ (۱۳-۴۳) اور ان کے دل  
(مارے خوف کے) ہوا ہو رہے ہوں گے۔

﴿نَارُ اللَّهِ الْمُوقَدَةُ الَّتِي تَطْلُعُ عَلَى الْأَفِيدَةِ﴾  
(۱۰۴-۷۰۶) وہ خدا کی بھڑکائی ہوئی آگ ہے جو دلوں  
پر چالپڑی گی۔

أَفِيدَةُ کی تخصیص سے اس کی شدت تاثیر پر تنبیہ کی ہے  
جس کی وضاحت اس کے بعد علوم قرآن پر کتابوں میں



الْفَاتِحَةِ: ہر چیز کے مبدء کو کہا جاتا ہے جس کے ذریعہ اس کے مابعد کو شروع کیا جائے اسی وجہ سے سورۃ فاتحہ کو فَاتِحَةُ الْكِتَابِ کہا جاتا ہے۔ اَفْتَحَ فُلَانٌ كَذَا فلاں نے یہ کام شروع کیا۔ فَتَحَ عَلَيْهِ كَذَا: کسی کو کوئی بات بتانا اور اس پر اسے ظاہر کر دینا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿اَنْحَدِثُوْهُمْ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ﴾ (۲-۷۶) جو بات خدا نے تم پر ظاہر فرمائی ہے وہ تم ان کو..... بتائے دیتے ہو۔

﴿مَا يَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ﴾ (۲-۳۵) جو لوگوں کے لیے..... کھول دے۔ فَتَحَ الْقَضِيَّةَ فَتَاحًا یعنی اس نے معاملے کا فیصلہ کر دیا اور اس سے مشکل اور پیچیدگی کو دور کر دیا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَاَنْتَ خَيْرُ الْفَاتِحِيْنَ﴾ (۷۶-۸۹) ہمارے پروردگار! ہم میں اور ہماری قوم میں انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دے اور تو سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔

اسی سے ﴿الْفَتْحُ الْعَلِيْمُ﴾ (۳۳-۲۶) ہے یعنی خوب فیصلہ کرنے والا اور جاننے والا یہ اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنی سے ہے کسی شاعر نے کہا ہے۔ ﴿الوافر﴾ (۳۳۵) وَابْنِي مِنْ فَتَاحَتِكُمْ غَنِيٌّ

كُلِّ شَيْءٍ ﴿(۶-۴۴) پھر جب انھوں نے اس نصیحت کو جو ان کو کی گئی تھی، فراموش کر دیا تو ہم نے ان پر ہر چیز کے دروازے کھول دیے۔ یعنی ہر چیز کی فراوانی کر دی۔ نیز فرمایا۔

﴿اَفْتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكَاتٍ مِّنَ السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ﴾ (۷۶-۷۶) تو ہم ان پر آسمان اور زمین کی برکات کے دروازے کھول دیتے۔

یعنی انہیں ہر طرح سے آسودگی اور فارغ البالی کی نعمت سے نوازتے۔ (۲) علوم و معارف کے دروازے کھولنا جیسے مجاورہ ہے۔

فُلَانٌ فَتَحَ مِنَ الْعِلْمِ بَابًا مُّغْلَقًا: فلاں نے علم کا بند دروازہ کھول دیا۔ یعنی شبہات کو زائل کر کے ان کی وضاحت کر دی۔ اور آیت کریمہ۔

﴿اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا﴾ (۱-۲۸) (۱) محمد ﷺ) ہم نے تم کو فتح دی اور فتح بھی صریح و صاف۔ میں بعض نے کہا ہے یہ فتح مکہ کی طرف اشارہ ہے اور بعض نے کہا ہے کہ نہیں بلکہ اس سے علوم و معارف اور ان ہدایات کے دروازے کھولنا مراد ہے جو کہ ثواب اور مقامات محمودہ تک پہنچنے کا ذریعہ بنتے ہیں اور آنحضرت ﷺ کے لیے غفران و ثوب کا سبب بنے۔<sup>①</sup>

① وهذا هو المناسب لقوله تعالى بعده ليغفر لك الله الآية۔

② والصحيح باني بدل واني وادله: الا ابلغ بنى عصم رسولاً..... وفي رواية بنى عمرو بدل بنى عصم وفي رواية المحكم (فتح) صدره: به الامن مبلغ عمرا رسولاً۔ وفي الاساس۔ الا ابلغ بنى وهب رسولاً۔ وفي رواية اللسان غني بدل فني وفي رواية القالي فاني عن "بدل" واني من "والبيت كماترى اختلافافي روايته ايضا مما اختلف في غزوه فنبه صاحب اللسان الى الاسعر الجعفي وفي زيادات الحمهرة (۲: ۴) منسوب لاعشى قيس لكن الاعشى مصحف من الاسعر نسبته ابن السيرافي الى شويعر الجعفي وفي الحماسة الصغرى لابی تمام (۴۶) ان البيت لمحمد بن حمران ابني حمران وابو حمران اسمه مرثد بن حمران ولعل محمد مصحف والبيت في اصلاح المنطق ۱۱۲ و تهذيبه (۱: ۸۸) والبحر (۴: ۳۴۴) وذيل محازات ←

﴿وَأَنْ تَسْتَفْتِحُوا فَقَدْ جَاءَكُمْ الْفَتْحُ﴾ (۸-۱۹)  
(کافرو) اگر تم محمد ﷺ پر فتح چاہتے ہو تو تمہارے پاس  
فتح آچکی۔

یعنی اگر تم کامیابی یا فیصلہ کرتے ہو تو وہ آپکا ہے اور یا یہ  
معنی ہیں کہ اگر تم مبدئ خیرات طلب کرتے ہو تو آنحضرت  
ﷺ کی بعثت سے تمہیں مل چکا ہے اور آیت کریمہ۔  
﴿وَكَانُوا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُونَ عَلَى الَّذِينَ  
كَفَرُوا﴾ (۲-۸۹) اور وہ پہلے ہمیشہ کافروں پر فتح مانگا  
کرتے تھے۔

میں یَسْتَفْتِحُونَ کے مختلف معانی بیان کیے گئے ہیں۔  
(۱) آنحضرت ﷺ کی بعثت کے ذریعہ اللہ تعالیٰ سے  
فتح طلب کرتے تھے (۲) وہ آنحضرت ﷺ کی بعثت  
کے متعلق کبھی لوگوں سے دریافت کرتے تھے اور کبھی  
کتب سماویہ سے اس پر استدلال کرتے تھے (۳) وہ  
آنحضرت ﷺ کے ذکر کے ذریعہ اللہ تعالیٰ سے مدد  
طلب کرتے تھے (۴) وہ کہا کرتے تھے کہ آنحضرت کے  
ذریعہ ہمیں بت پرستوں پر غلبہ حاصل ہوگا۔

الْمِفْتَاحُ وَالْمِفْتَاحُ: (کنجی) وہ چیز جس کے ساتھ کسی  
چیز کو کھولا جائے اس کی جمع مَفَاتِيحُ وَمَفَاتِيحُ آتی ہے  
اور آیت ﴿وَعِنْدَهُ مَفَاتِيحُ الْغَيْبِ﴾ (۶-۵۹) اور  
اسی کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں۔ میں مَفَاتِيحُ سے وہ  
وسائل مراد ہیں جن کے ذریعہ اس غیب تک رسائی ہوتی  
ہے جس کا ذکر کہ آیت ﴿فَلَا يُظْهِرُ عَلَىٰ غَيْبِهِ

اور میں تمہارے فیصلہ سے بے نیاز ہوں۔

بعض کے نزدیک فُتْحَةٌ فَاحَةٌ فَا کے ضمہ اور فتح دونوں کے  
ساتھ صحیح ہے۔ ۵ اور آیت کریمہ۔

﴿إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ﴾ (۱۱۰-۱) جب اللہ کی  
مدد آپہنچی اور فتح حاصل ہوگئی۔

میں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ الْفَتْحُ سے نصرت، کامیابی اور  
حکم مراد ہو اور یہ بھی احتمال ہے کہ علوم و معارف کے  
دروازے کھول دینا مراد ہو۔ اسی معنی میں فرمایا۔

﴿نَنْصُرُ مِنَ اللَّهِ وَفَتْحٌ قَرِيبٌ﴾ (۶۱-۱۳) (یعنی  
تمہیں) خدا کی طرف سے مدد (نصیب ہوگی) اور فتح  
عنقریب (ہوگی)۔

﴿فَعَسَىٰ اللَّهُ أَنْ يَأْتِيَنَّ بِالْفَتْحِ﴾ (۵-۵۲۲) تو  
قریب ہے کہ خدا فتح بھیجے۔

﴿وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هَذَا الْفَتْحُ﴾ (۳۳-۲۸) اور  
کہتے ہیں..... یہ فیصلہ کب ہوگا۔

﴿قُلْ يَوْمَ الْفَتْحِ﴾ (۳۲-۲۹) کہہ دو کہ فیصلے کے  
دن.....

یعنی حکم اور فیصلے کے دن بعض نے کہا ہے کہ الْفَتْحُ سے  
قیامت پکا کر کے ان کے شک و شبہ کو زائل کرنے کا دن  
مراد ہے بعض نے یوم عذاب مراد لیا ہے۔ جسے وہ طلب کیا  
کرتے تھے۔

الْإِسْتِفْتَا ح کے معنی غلبہ یا فیصلہ طلب کرنے کے ہیں۔  
قرآن پاک میں ہے۔

◀ القرآن لشريف الرضى والطبرى (۲: ۹) والسمط ۹۲۷ والقرطبي (۱۳: ۹۴) واللسان والتاج (فتح، فتا) و محاز  
القرآن لابی عبیدہ (۱: ۲۲۰/۲: ۸۷) وشواهد الكشاف ۵ وفي روايته: الابلغ بنی حمران انی عن عواد تکم نهی فی ۹  
ابیات راجع السمط

① والصحيح بالضممة والكسرة فانه في اصلاح يعقوب ۱۲: في باب الفعانه والفعالة

((إِنَّ لِكُلِّ عَالِمٍ شِرَّةً وَلِكُلِّ شِرَّةٍ فَتْرَةٌ فَمَنْ فَتَرَ إِلَى سُنَّتِي فَقَدْ نَجَاوُ إِلَّا فَقَدْ هَلَكَ)) کہ ہر عالم میں تیزی ہوتی ہے اور ہر تیزی کے بعد فترہ یعنی سکون ہوتا ہے تو جو شخص میری سنت سے سکون حاصل کرے گا وہ نجات یافتہ ہے ورنہ وہ ہلاک ہوگا۔ پس لِكُلِّ شِرَّةٍ فَتْرَةٌ میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ باطل میں پہلے پہل تو جوش ہوتا ہے مگر جلد ہی مضحل ہو جاتا ہے اور حق کی سلطنت کبھی ذلیل یا کمزور نہیں ہوتی۔ اور مَنْ فَتَرَ إِلَى سُنَّتِي کے معنی سنت نبوی کی پناہ میں سکون حاصل کرنے کے ہیں۔

الطَّرْفُ الْفَاتِرُ: نگاہ مست اور یہ اچھی صفت کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔

الْفَتْرُ: انگشت شہادت اور انگوٹھے کے درمیان کا فاصلہ اور شَبْرَتُهُ بِشَبْرِي کی طرح فَتْرَتُهُ بِفَتْرِي کا محاورہ ہے جس کے معنی انگوٹھا اور انگشت شہادت کے ساتھ کسی چیز کو تاپنے کے ہیں۔

### (ف ت ق)

الْفَتْقُ (ض) کے معنی دو متصل چیزوں کو الگ الگ کر دینے کے ہیں اور یہ رَنْقُ کی ضد ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَلَمْ يَرَالَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنَاهُمَا﴾ (۲۱-۳۰) آسمان اور زمین دونوں ملے ہوئے تھے تو ہم نے ان کو جدا جدا کر دیا۔

الْفَتْقُ وَالْفَتِيقُ صبح کو کہتے ہیں (کیونکہ وہ تاریکی سے نمودار ہوتی ہے۔

أَفْتَقَ الْقَمَرُ: چاند کا بادل سے ظاہر ہونا۔

أَحَدًا إِلَّا مَنْ ارْتَضَى مِنْ رَسُولٍ ﴿(۷۲-۲۶) اور کسی پر اپنے غیب کو ظاہر نہیں کرتا ہاں جس پیغمبر کو پسند فرمائے۔ میں ہے اور آیت کریمہ۔

﴿مَا إِنْ مَفَاتِحَهُ لَتَنُوءَ بِالْعُصْبَةِ أُولَى الْقُوَّةِ﴾ (۷۲-۲۸) اتنے خزانے دیئے تھے کہ ان کی کنجیاں ایک طاقتور جماعت کو اٹھانی مشکل ہوتیں۔

میں مَفَاتِحُ سے بعض کے نزدیک خزانوں کی چابیاں مراد ہیں اور بعض نے خزانے ہی مراد لیے ہیں۔

عام طور پر بَابٌ فَتَحَ کے معنی مَفْتُوحُ کے آتے ہیں اور یہ غَلَقُ کی ضد ہے۔ ایک روایت میں ہے۔

﴿مَنْ وَجَدَ بَابًا غَلَقًا وَجَدَ إِلَى جَنْبِهِ بَابًا فَتَحًا﴾ کہ جس سے ایک دروازہ بند ہو جائے تو اس کے لیے دوسرا دروازہ کھلا ہے اور بعض کے نزدیک فَتَحَ بمعنی وَاسِعٌ ہے۔

### (ف ت ر)

الْفُتُورُ: کے معنی تیزی کے بعد ٹھہرنے بختی کے بعد نرم اور

قوت کے بعد کمزور پڑ جانا کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿يَا أَهْلَ الْكِتَابِ قَدْ جَاءَكُمْ رَسُولُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ عَلَى فَتْرَةٍ مِنَ الرُّسُلِ﴾ (۵-۱۹) اے اہل کتاب! پیغمبروں کے آنے کا سلسلہ جو ایک عرصے تک منقطع رہا تو اب تمہارے پاس ہمارے پیغمبر آ گئے ہیں۔

یعنی سلسلہ رسالت کے منقطع اور ماند پڑ جانے کے بعد

آنحضرت ﷺ تشریف لے آئے ہیں۔ آیت کریمہ۔

﴿لَا يَفْتَرُونَ﴾ (۲۱-۲۰) کے معنی یہ ہیں کہ وہ ہمیشہ

عبادت میں سرگرم رہتے ہیں اور کبھی ست نہیں پڑتے اور

ایک روایت میں ہے۔

چکھو۔ یعنی عذاب کا مزہ چکھو۔ جیسے آیت کریمہ:  
﴿كُلَّمَا نَضَجَتْ جُلُودُهُمْ بَدَّلْنَاهُمْ جُلُودًا غَيْرَهَا لِيَذُوقُوا الْعَذَابَ﴾ (۵۶-۴)  
جب ان کی کھالیں گل (اور جل) جائیگی تو ہم اور کھالیں  
بدل دیں گے تاکہ (ہمیشہ) عذاب کا مزہ چکھتے رہیں۔

میں لِيَذُوقُوا الْعَذَابَ سے تعبیر فرمایا ہے اور آیت:  
﴿النَّارُ يُعْرَضُونَ عَلَيْهَا﴾ (۴۰-۳۶) یعنی آتش  
جہنم پر پیش کیے جاتے ہیں۔

میں اسی عذاب کو عرض علی النار کہا ہے۔  
اور کبھی فتنہ کا لفظ اس چیز پر بھی بولا جاتا ہے جو عذاب کا  
باعث بنتی ہو جیسے فرمایا:

﴿أَلَا فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوا﴾ (۹-۳۹) دیکھو! یہ آفت  
میں پڑ گئے ہیں۔

اور کبھی اس کے معنی امتحان اور آزمائش کرنے کے آتے  
ہیں۔ جیسے فرمایا:

﴿وَفَتَنَّاكَ فُتُونًا﴾ (۲۰-۴۰) اور ہم نے تمہاری کئی بار  
آزمائش کی۔

اور بلاء کی طرح فتنہ کا لفظ بھی تکلیف اور آزمائش دونوں  
قسم کی حالت پر بولا جاتا ہے۔ جن میں انسان کو مبتلا کر  
کے اس کی آزمائش کی جاتی ہے (اور اس کے صبر و شکر کا  
امتحان کیا جاتا ہے)

لیکن شدت کے معنی میں اس کا استعمال زیادہ ظاہر اور اکثر  
ہے چنانچہ قرآن پاک نے دونوں قسم کے فتنہ کے متعلق  
فرمایا ہے۔

﴿وَنَبْلُوكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً﴾ (۲۱-۳۵) اور

نَصْلُ فِتْنَتُ الشَّرِّ تَيْنِ: بھالا جس کی دو شاخیں  
ہوں۔ گویا ایک کو دوسری سے پھاڑ کر بنایا گیا ہے۔

جَمَلُ فِتْنَتِ: اونٹ جس کا چمڑا موناپے کی وجہ سے پھٹ  
گیا ہو اور یہ فِتْنَتِ (س لازم) فتنقا سے ہے۔

## (ف ت ل)

فَتَلْتُ الْحَبْلَ فِتْلًا کے معنی رسی کو بل دینے کے  
ہیں اور بتی ہوئی رسی کو مَفْتُولُ کہا جاتا ہے اور کھجور کی گٹھلی  
کے شکاف میں جو باریک سا ڈورا ہوتا ہے اسے بھی فِتْنِلُ  
کہا جاتا ہے کیونکہ وہ رسی کی شکل و صورت پر ہوتا ہے  
(عربی زبان میں یہ حقیر شے کے لیے ضرب المثل ہے)  
جیسے فرمایا: ﴿وَلَا يُظْلَمُونَ فِتْيَلًا﴾ (۳-۴۹) اور ان  
پر ذرہ برابر بھی ظلم نہیں کیا جائے گا۔

فَتْنِلُ اصل میں اس دھاگے یا میل کو کہتے ہیں جو دو  
انگلیوں میں پکڑ کر بنی جاتی ہے اور یہ حقیر چیز کے لیے  
ضرب المثل ہے۔

نَاقَةُ فِتْلَاءِ الدِّرَارِ عَيْنِ: مضبوط بازوؤں والی اونٹنی۔

## (ف ت ن)

الْفَتْنُ: دراصل فتنن کے معنی سونے کو آگ  
میں پگھلانے کے ہیں تاکہ اس کا کھرا کھوٹا ہونا معلوم ہو  
جائے اس لحاظ سے کسی انسان کو آگ میں ڈالنے کے لیے  
بھی استعمال ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿يَوْمَ هُمْ  
عَلَى النَّارِ يُفْتَنُونَ﴾ (۵۱-۱۳) جب ان کو آگ میں  
عذاب دیا جائے گا۔ اور اس کا اطلاق نفس عذاب پر بھی  
ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿ذُوقُوا فِتْنَتَكُمْ﴾ (۵۱-۱۴) اپنی شرارت کا مزہ

① انظر لفظ الفتنة ومعانيها المختلفة في القرآن - الفتح الباری (۱۶/۱۱۸)

یعنی تجھے وحی کے احکام سے برگشتہ کر کے مصیبت اور شدت میں مبتلا نہ کر دیں۔

﴿فَتَسْتَمُ أَرْسُكُمْ﴾ (۱۳-۵۷) تم نے خود اپنے تئیں بلا میں ڈالا۔

یعنی اپنے آپ کو بلا اور عذاب میں مبتلا کر دیا۔ اور اسی معنی میں فرمایا:

﴿وَ اتَّقُوا فِتْنَةً لَا تُصِيبَنَّ الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْكُمْ خَاصَّةً﴾ (۲۵-۸) اور اس فتنے سے ڈرو جو خصوصیت کے ساتھ انہی لوگوں پر واقع نہ ہوگا جو تم میں گنہگار ہیں۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَ اعْلَمُوا أَنَّمَا أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ﴾ (۲۸-۸) اور جان رکھو کہ تمہارا مال اور اولاد بڑی آزمائش ہے۔

میں اموال و اولاد کو فتنہ قرار دیا ہے کیونکہ ان کے سبب سے انسان مصیبت میں مبتلا ہوتا ہے اور آیت کریمہ:

﴿إِنَّ مِنْ أَزْوَاجِكُمْ وَأَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ﴾ (۱۳-۶۳) تمہاری عورتوں اور اولادوں میں سے بعض تمہارے دشمن بھی ہیں۔

میں بعض ازواج اور اولاد کو دشمن قرار دیا ہے کیونکہ بعض اوقات ان سے اس طرح اذیت پہنچتی ہے جس طرح کہ دشمن سے پہنچتی ہے اور آیت کریمہ: ﴿زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِينَ﴾ (۳۱-۳) لوگوں کو ان کی خواہشوں کی چیزیں یعنی عورتیں اور بیٹے..... بڑی زینت دار معلوم ہوتی ہیں۔

میں عورتوں اور بیٹوں کو زینت قرار دیا ہے۔ کیونکہ لوگ ان کو باعث زینت خیال کرتے ہیں نیز قرآن پاک میں

ہم تم لوگوں کو سختی اور آسودگی میں آزمائش کے طور پر مبتلا کرتے ہیں۔

اور تکلیف کے متعلق فرمایا:

﴿إِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ﴾ (۱۰۲-۲) ہم تو ذریعہ آزمائش ہیں۔ ﴿وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ﴾ (۱۹۱-۲) اور (دین سے گمراہ کرنے کا) فساد قتل و خون ریزی سے کہیں بڑھ کر ہے۔

﴿وَقِيلُوا لَهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ﴾ (۱۹۳-۲) ان سے اس وقت تک لڑتے رہو حتیٰ کہ فساد نابود ہو جائے۔

﴿وَمِنْهُمْ مَنْ يَقُولُ ائْذَنْ لِي وَلَا تَفْتِنِّي أَلَا فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوا﴾ (۳۹-۹) اور ان میں سے کوئی ایسا بھی ہے جو کہتا ہے کہ مجھے تو اجازت ہی دیجیے اور آفت میں نہ ڈال لیے دیکھو یہ آفت میں پڑے ہیں۔

یعنی مجھے بلا اور تکلیف میں نہ ڈال لے حالانکہ وہ بات کہنے کی وجہ سے مصیبت اور عذاب میں گرفتار ہو رہے ہیں۔

﴿فَمَا أَمَّنَ لِمُوسَى إِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِنْ قَوْمِهِ عَلَى خَوْفٍ مِنْ فِرْعَوْنَ وَ مَلَائِهِمْ أَنْ يَفْتِنَهُمْ﴾ (۸۳-۱۰) تو موسیٰ علیہ السلام پر کوئی ایمان نہ لایا مگر اس کی قوم میں سے چند لڑکے اور وہ بھی فرعون اور اس کے اہل دربار سے ڈرتے ڈرتے کہ کہیں وہ ان کو آفت میں نہ پھنسا دے۔

یعنی ایسا نہ ہو کہ انہیں مصیبت اور عذاب میں ڈال دے۔

﴿وَ احْذَرْهُمْ أَنْ يَقْتُولُوكَ﴾ (۳۹-۵) اور ان سے بچتے رہنا کہ..... یہ کہیں تم کو بہکا نہ دیں۔

﴿وَ إِنْ كَادُوا لَيَفْتِنُوكَ﴾ (۷۳-۱۷) قریب تھا کہ یہ (کافر) لوگ تم کو اس سے بھلا دیں۔

کے مطابق آزمائش و امتحان مراد ہوتا ہے۔ اور جب اس کا اسناد انسان کی طرف ہو تو اس کے برعکس معنی مراد ہوتے ہیں اس لیے مختلف انواع کے فتنوں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے جا بجا انسان کی مذمت کی ہے چنانچہ فرمایا:-

﴿وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ﴾ (۲-۱۹۱) اور (دین سے گمراہ کرنے کا فساد) قتل و خونریزی سے کہیں بڑھ کر ہے۔

﴿إِنَّ الَّذِينَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِينَ﴾ (۵۸-۱۰) جن لوگوں نے مومن مردوں کو تکلیفیں دیں۔

﴿مَا أَنْتُمْ عَلَيْهِ بِفَاتِنِينَ﴾ (۳۷-۱۶۲) خدا کے خلاف بہکا نہیں سکتے۔

یعنی گمراہ کرنے والے نہیں ہو۔ اور آیت کریمہ:-  
﴿بِأَيْكُمُ الْمُفْتُونُ﴾ (۶۸-۶) کہ تم میں سے کون دیوانہ ہے۔

میں بقول انھیں مفتون بمعنی فتنہ ہے جس طرح کہ لیس لہ معقول وخذ ميسورة ودع معسورة میں معقول ميسور و معسور بمعنی عقل، يسر اور عسر ہیں تو آیت کی اصل بِأَيْكُمُ الْمُفْتُونُ ہے۔

بعض علماء کا خیال یہ ہے کہ بِأَيْكُم میں باؤزائد ہے جیسا کہ آیت وَكَفَى بِاللّٰهِ شَهِيدًا میں ہے لہذا یہ اصل میں أَيْكُمُ الْمُفْتُونُ ہے۔ اور آیت کریمہ:-

﴿وَاحْذَرْهُمْ أَنْ يُفْتِنُوكَ عَنْ بَعْضِ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ﴾ (۵-۳۹) اور ان سے بچتے رہنا کہ کسی حکم

سے جو خدا نے تم پر نازل فرمایا ہے یہ کہیں تم کو بہکا دیں۔  
میں أَنْ يُفْتِنُوكَ کے معنی ہیں: خَدَعُوكَ اس لیے عَنْ (صلہ) کے ساتھ استعمال ہوا ہے۔

ہے:  
﴿الْم أَحَسِبَ النَّاسُ أَنْ يُتْرَكُوا أَنْ يَقُولُوا آمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُونَ﴾ (۲۹-۱) کیا لوگ یہ خیال کیے ہوئے ہیں کہ صرف یہ کہنے سے کہ ہم ایمان لے آئے۔ چھوڑ دیئے جائیں گے اور انکی آزمائش نہیں کی جائے گی۔ یعنی انہیں آزمائش میں ڈال کر اچھے اور برے کو الگ الگ نہیں کیا جائے گا جیسے دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿لِيَجْيزَ اللَّهُ الْخَبِيثَ مِنَ الطَّيِّبِ﴾ (۸-۳۷) تاکہ خدا، ناپاک کو پاک سے الگ کر دے۔

اور آیت کریمہ:

﴿أَوْ لَا يَرَوْنَ أَنَّهُمْ يُفْتَنُونَ فِي كُلِّ عَامٍ مَرَّةً أَوْ مَرَّتَيْنِ ثُمَّ لَا يَتُوبُونَ وَلَا هُمْ يَذَكَّرُونَ﴾ (۹-۱۲۶) کیا یہ دیکھتے نہیں؟ کہ یہ ہر سال ایک یا دو بار بلا میں پھنسا دیے جاتے ہیں۔ پھر بھی توبہ نہیں کرتے اور نہ نصیحت پکڑتے ہیں۔

میں اس ابتلا کی طرف اشارہ ہے جس کا ذکر کہ آیت ﴿وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِنَ الْخَوْفِ﴾ (۲-۱۵۵) الایہ اور ہم کسی قدر خوف..... سے تمہاری آزمائش کریں گے۔

میں پایا جاتا ہے اور آیت کریمہ:

﴿وَاحْسِبُوا آلَاتِكُمْ فِتْنَةً﴾ (۵-۷۱) اور یہ خیال کرتے تھے کہ (اس سے ان پر) کوئی آفت نہیں آئے گی۔ میں بھی فِتْنَةُ اسی معنی پر محمول ہے۔

فِتْنَةُ کا لفظ بلا، مصیبت، قتل اور عذاب وغیرہ، افعال کریمہ پر بولا جاتا ہے اور یہ ان افعال سے ہے جن کا اسناد، اللہ تعالیٰ اور بندے دونوں کی طرف ہوتا ہے۔ لیکن جب اس کا اسناد اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو اس سے مقتضائے حکمت

## (ف ت ی)

لوگ تم سے (یتیم) عورتوں کے بارے میں فتویٰ طلب کرتے ہیں۔ کہہ دو کہ خدا تم کو ان کے (ساتھ نکاح کرنے کے) معاملے میں فتویٰ (اجازت) دیتا ہے۔ (۱۲۷-۴)

﴿فَاسْتَفْتِهِمْ﴾ (۱۱-۳۷) تو ان سے پوچھو.....  
﴿أَفْتُونِي فِي أَمْرِي﴾ (۳۲-۲۷) میرے اس معاملہ میں مجھے مشورہ دو۔

## (ف ج ح)

الْفَجَّ: دو پہاڑوں کے درمیان کشادگی کو کہتے ہیں اس کے بعد وسیع راستہ کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے۔ اس کی جمع فجاج ہے قرآن پاک میں ہے:  
﴿مَنْ كُلَّ فَجٍّ عَمِيقٍ﴾ (۲۷-۲۲) دور (دراز) راستوں سے۔

﴿فِيهَا فَجَاجَا سُبُلًا﴾ (۳۱-۲۱) اس میں کشادہ رستے اَلْفَجَجُ انسان کے دونوں گھٹنوں کے درمیان کشادگی ہونا اور ایسے آدمی کو جس کے گھٹنوں میں کشادگی ہو اَفَجَّ کہتے ہیں۔

اسی سے حَافِرٌ مُفَجِّجٌ ہے۔ یعنی وہ گھوڑا جس کی ناگوں کے درمیان کشادگی ہو اور خام زخم کو جُوجُ فُجَّ کہا جاتا ہے۔

## (ف ج ر)

الْفَجْرُ کے معنی کسی چیز کو وسیع طور پر پھاڑنے اور شق کر دینے کے ہیں۔ جیسے محاورہ ہے، فَجَّرَ الْإِنْسَانُ السَّكْرَ: اس نے بند میں وسیع شکاف ڈال دیا۔ فَجَّرَتْهُ فَأَنْفَجَرَ: میں نے پانی کو پھاڑ کر بہایا تو وہ بہ گیا فَجَّرَتْهُ فَتَفَجَّرَ: شدت کے ساتھ پانی کو پھاڑ کر بہایا۔ قرآن

الْفَتَى کے معنی نو جوان کے ہیں اس کی مؤنث فَتَاةٌ اور مصدر فَتَاءٌ ہے بعدہ کنایہ کے طور پر دونوں لفظ (فَتَى اور فَتَاةٌ) غلام اور لونڈی کے معنی میں استعمال ہونے لگے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿تَرَاوَدُّ فَتَاهَا عَنْ نَفْسِهِ﴾ (۳۰-۱۲) اپنے غلام کو اپنی طرف مائل کرنا چاہتی تھی۔

جس طرح نو جوان آدمی کو فَتَسَى کہا جاتا ہے۔ اسی طرح نو جوان اونٹ پر فَتَسَى (فعلیل) بولا جاتا ہے فَتَسَى کی جمع فَتَيَّةٌ وَفَتَيَانٌ اور فَتَاهُ کی جمع فَتَيَاتٍ آتی ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿مِنْ فَتَيَاتِكُمُ الْمُؤْمِنَاتِ﴾ (۲۵-۴) تو مومن لونڈیوں میں سے.....

﴿وَلَا تُكْرِهُوا فَتَيَاتِكُمْ عَلَى الْبِغَاءِ إِنْ أَرَدْنَ تَحَصُّنًا﴾ (۳۳-۲۴) اور اپنی لونڈیوں کو اگر وہ پاک دامن رہنا چاہیں تو..... بدکاری پر مجبور نہ کرنا۔ ﴿وَقَالَ لِفَتَاتِهِ﴾ (۶۲-۱۲) اور یوسف علیہ السلام نے اپنے خدام سے کہا۔

﴿إِذْ أَوَى الْفَتِيَّةُ إِلَى الْكَهْفِ﴾ (۱۰-۱۸) جب وہ جوان غار میں جا رہے۔

﴿أَنَّهُمْ فَتِيَّةٌ آمَنُوا بِرَبِّهِمْ﴾ (۱۳-۱۸) وہ کئی نو جوان تھے جو اپنے پروردگار پر ایمان لائے تھے۔

اور کسی مشکل مسئلہ کے جواب کو فَتَيَا وَفَتَوَى کہا جاتا ہے۔ اِسْتَفْتَاهُ کے معنی فتویٰ طلب کرنے اور اِفْتَاهُ (افعال) کے معنی فتویٰ دینے کے ہیں جیسے فرمایا: ﴿وَيَسْتَفْتُونَكَ فِي النِّسَاءِ قُلِ اللَّهُ يُفْتِيكُمْ فِيهِنَّ﴾ (اے پیغمبر)

پاک میں ہے۔  
﴿وَفَجَّرْنَا الْأَرْضَ عُيُونًا﴾ (۱۲-۵۴) اور زمین میں چشمے جاری کر دیے۔

﴿وَفَجَّرْنَا خِلَلَهُمَا نَهْرًا﴾ (۱۸-۳۳) اور دونوں میں ہم نے ایک نہر بھی جاری کر رکھی تھی۔ ﴿فَفَجَّرَ الْأَنْهَارَ خِلَلَهَا﴾ (۱۷-۱۹) اور اس کے بیچ میں نہریں بہا نکالو۔

﴿تَفَجَّرَ لَنَا مِنَ الْأَرْضِ يَنْبُوعًا﴾ (۱۷-۹۰) جب تک کہ ہمارے لیے زمین میں سے چشمہ جاری (نہ) کر دو۔

اور ایک قرأت میں تَفَجَّرَ (بصیغہ تفعیل) ہے۔ ﴿فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا﴾ (۲-۶۰) تو پھر اس میں سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے۔

اور اسی سے صبح کو فجر کہا جاتا ہے کیونکہ صبح کی روشنی بھی رات کی تاریکی کو پھاڑ کر نمودار ہوتی ہے۔ قرآن میں ہے۔

﴿وَالْفَجْرَ وَلَيَالٍ عَشْرٍ﴾ (۲۸-۸۹) فجر کی قسم اور دس راتوں کی۔

﴿إِنَّ قُرْآنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُودًا﴾ (۱۷-۷۸) کیونکہ صبح کے وقت قرآن پاک پڑھنا موجب حضور (ملائکہ) ہے۔ بعض نے کہا کہ فجر دو قسم پر ہے ایک فجر کاذب جو بھیڑیے کی دم کی طرح (سیدی روشنی سی نمودار ہوتی ہے) دوم فجر صادق جس کے ساتھ نماز روزہ وغیرہ کے احکام تعلق رکھتے ہیں۔

چنانچہ قرآن پاک میں ہے:  
﴿حَتَّى يَبَيِّنَ لَكُمْ الْخَبِيثَ الْأَبْيَضَ مِنَ الْخَبِيثِ﴾

① کلمة فی فنوت الوتر عن عبدالرحمن بن العزى قال صليت خلف عمر بن الخطاب الصبح الحديث وفى آخر



يَعْظُمُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ﴿١٦﴾ اور بے حیائی اور نامعقول کاموں اور سرکشی سے منع کرتا ہے (اور) تمہیں نصیحت کرتا ہے تاکہ تم یاد رکھو۔

مَنْ يَفْجُرْكَ كَمَا مَعْنَى مَنْ يَتَّبَعُ عَنْكَ كَيْهِي عِنِي  
جو تجھ سے علیحدہ اور دور ہوتا ہے۔  
ایام الحجار: خانہ جنگی کے ایام جو عربوں میں واقع ہوئی۔

### (ف ج و)

الْفَجْوَةُ: دو چیزوں کے درمیان کشادگی۔ کھلی جگہ  
قرآن پاک میں ہے:  
﴿وَهُمْ فِي فَجْوَةٍ مِّنْهُ﴾ (۱۸-۱۷) اور وہ اس کے میدان میں تھے۔

﴿مَنْ يَأْتِ مِنْكُمْ بِفَاحِشَةٍ مُّبِينَةٍ﴾ (۳۳-۳۰)  
تم میں سے جو کوئی صریح ناشائستہ (الفاظ کہہ کر رسول اللہ کو ایذا دینے کی) حرکت کرے گی۔ ﴿إِنَّ الَّذِينَ يُحِبُّونَ أَنْ تَشِيعَ الْفَاحِشَةُ﴾ (۲۳-۱۹) اور جو لوگ اس بات کو پسند کرتے ہیں کہ مومنوں میں بے حیائی (یعنی تہمت بدکاری کی خبر پھیلے)۔

یعنی وسیع میدان میں تھے۔ اس سے قَوْسٌ فَجَاءَ وَفَجَّوَاءُ ہے یعنی کمان جو کھینچی ہوئی حالت میں ہو۔ رَجُلٌ أَفْجَى: جس کے دونوں ہنڈیوں کے درمیان فاصلہ ہو۔

﴿إِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ﴾ (۷-۳۳) کہ میرے پروردگار نے تو بے حیائی کی باتوں کو..... حرام کیا ہے۔ اور آیت کریمہ:

### (ف ج ش)

الْفُحْشُ وَالْفُحْشَاءُ وَالْفَاحِشَةُ: اس قول یا فعل کو کہتے ہیں جو قباحیت میں حد سے بڑھا ہوا ہو۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿لَا أَنْ يَأْتِيَنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبِينَةٍ﴾ (۳-۱۹) ہاں اگر وہ کھلے طور پر بدکاری کی مرتکب ہوں۔

﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يَأْمُرُ بِالْفُحْشَاءِ﴾ (۷-۲۸) کہ خدا بے حیائی کے کام کرنے کا حکم ہرگز نہیں دیتا۔

میں فاحشہ میسر سے مراد زنا ہے اسی طرح آیت کریمہ ﴿وَالَّذِي يَأْتِيَنَّ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَائِكُمْ﴾ (۳-۱۵) عورتوں میں جو بدکاری کا ارتکاب کر بیٹھیں۔ میں بھی فاحشہ سے مراد بدکاری ہے۔ فَحْشٌ فَلَانٌ برا ہونا۔ اسی سے شاعر نے کہا ہے ﴿الطويل﴾

﴿وَيَنْهَى عَنِ الْفُحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ﴾

حدیث دزعم عبید انہما سورتان من القرآن فی مصحف عبداللہ بن مسعود ایضاً قنت بھولاء الکلمات عثمان و علیؓ (راجع کنز العمال ۵۲/۸) و ایضاً المروزی فی الصلاة والطبرانی فی الدعاء: ان علی بن ابی طالب حدثنی انه من القرآن ۱ قالہ طرفہ بن العبد البکری فی معلقته المشہور مطلعها: لحولة اطلاق..... و صدر البيت: اری الموت بعتام الکرام ویصطفی۔ والبيت فی الطبری (۳۰: ۲۷۹) واللسان (عوم) لکن فی رواية مال الباخل بدل مال الفاحش؟ والفوس بدل الکرام والبيت فی مختار الشعر الجاهلی (۱: ۲۳۲) ومجاز القرآن لابی عبیدہ (۲/ ۲۰۸) رقم (۹۴۶) وذیل الامالی للمرتضی (۱: ۳۸۲) وذیل المشکل للفتی (۵۸) محولا علی الطبری واللسان والتاج (عدم فحش) والمحمک (عیم) والکامل (۳۱۴) وشواهد الکشاف (۳۹) وتاریخ الطبری (۵: ۳۸) فی خمسة ابیات والبحر (۲/ ۸۱۹: ۵۰۵) واخذاد ابی الطیب (۷۰۰) والمعلقة فی دیوانہ (۲۱-۳۲) والبيت فی ۳۱ والجمهرة للقرشی (۱۴۹-۱۶۰) والبيت فی (۱۵۶) والعقد الثمین (۵۸) وابن الانباری (۲۰۰) وابن الشجرى فی اماليہ (۱: ۲۱۱) والسيوطی (۲۷۱) وشرح العشر للتبریزی (۸۵)

دیکر اسے مصیبت سے بچالینا کے ہیں قرآن پاک میں ہے:

﴿فَإِمَّا مَنَّا بَعْدُ وَإِمَّا فِدَاءً﴾ (۴۷-۴۸) پھر اس کے بعد یا تو احسان رکھ کر چھوڑ دینا چاہیے۔ یا کچھ مال لے کر۔

چنانچہ محاورہ ہے: قَدَيْتُهُ بِمَالٍ۔ میں نے کچھ خرچ کر کے اسے مصیبت سے بچالیا قَدَيْتُهُ بِنَفْسِي: میں نے اپنی جان کے عوض اسے چھڑالیا فَادَاهُ بِكَذَّابٍ اس نے کچھ دے کر اسے چھڑالیا قرآن پاک میں ہے:

﴿وَإِنْ يَأْتِوكُمُ أُسْرَىٰ تَقْدُواهُمْ﴾ (۸۵-۲) اور اگر وہ تمہارے پاس قید ہو کر آئیں تو بدلہ دے کر انہیں چھڑا بھی لیتے ہو۔

تَقْدَايَ فُلَانٌ مِنْ فُلَانٍ: کسی کا فدیہ دے کر اس کو چھڑالینا۔

﴿وَقَدَيْنَاهُ بِذَبْحٍ عَظِيمٍ﴾ (۳۷-۱۰۷) اور ہم نے ایک بڑی قربانی کو ان کا فدیہ دیا۔

اِفْتَدَىٰ کے معنی خود اپنے کو مال کے عوض چھڑانے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فِيمَا افْتَدَتْ بِهِ﴾ (۲۳۹-۲) رہائی پانے کے بدلے میں.....

﴿وَمِثْلَهُ مَعَهُ لَافْتَدَوْا بِهِ﴾ (۱۳-۱۸) (تو وہ سب کے سب) اور ان کے ساتھ ہی اتنے اور (نجات کے) بدلے میں صرف کر ڈالیں۔

﴿لَافْتَدَتْ بِهِ﴾ (۱۰-۵۴) تو (عذاب سے بچنے کے) لیے (سب) دے ڈالے۔

﴿لَيَفْتَدُوا بِهِ﴾ (۵-۳۶) تاکہ..... بدلہ دیں.....

(۲۳۶) عَقِيلَةٌ مَّالٍ الْفَاحِشِ الْمُتَشَدِّدِ یعنی سخت بخیل آدمی کے نفیس مال کو (منتخب کر کے) فنا کرتی ہے تو فاحش تشدد سے بخل میں حد سے بڑھا ہوا شخص مراد ہے۔ اور بہت زیادہ فحش کام کرنے والے کو مُفْتَحِحٌ کہا جاتا ہے۔

## (ف خ ر)

الْفَخْرُ: (ن) کے معنی ان چیزوں پر اترانے کے ہیں جو انسان کے ذاتی جوہر سے خارج ہوں مثلاً مال و جاہ وغیرہ اور اسے فَخْرٌ (فَتْخُ الْا) بھی کہتے ہیں اور فخر کرنے والے کو فَاحِشٌ کہا جاتا ہے اور فَخُورٌ وَفَخِيرٌ صِيغہ مبالغہ ہیں یعنی بہت زیادہ اترانے والا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿إِنَّ الْبَلَاءَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ﴾ (۳۱-۲۸) کہ خدا کسی اترانے والے خود پسند کو پسند نہیں کرتا۔ فَخَرْتُ فُلَانًا عَلَىٰ صَاحِبِهِ أَفْخَرُهُ فَخْرًا ایک کو دوسرے پر فضیلت دینا اور ہر نفیس چیز کو فَاحِشٌ کہا جاتا ہے۔ ثَوْبٌ فَاحِشٌ: قیمتی کپڑا اور جس اونٹنی کے تھن تو بڑے بڑے ہوں مگر دودھ بہت کم دے اسے فخور کہتے ہیں۔ ۱۰ اَلْفَخَّارُ: منکوں کو کہا جاتا ہے کیونکہ وہ ٹھوکا لگانے سے اس طرح زور سے بولتے ہیں جیسے کوئی بہت زیادہ فخر کر رہا ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ﴾ (ٹھیکرے کی طرح کھٹکھٹاتی مٹی سے.....)

## (ف د ی)

الْفِدَى وَالْفِدَاءُ کے معنی کسی کی جانب سے کچھ

﴿فَفِرُّوْا إِلَى اللَّهِ﴾ (۵۱-۵۰) تو تم خدا کی طرف بھاگ چلو۔

أَفَرَأَيْتُمْ: کسی کو بھاگ دینا۔

رَجُلٌ فَرَّ وَفَارًّا: بھاگنے والا۔

الْمَفَرُّ: (مصدر) کے معنی بھاگنا (ظرف مکان) جائے فرار (ظرف زمان) بھاگنے کا وقت چنانچہ آیت:

﴿أَيُّنَ الْمَفَرِّ﴾ (۶۵-۱۰) کہ (اب) کہاں بھاگ جاؤں۔ کے معنی تینوں طرح ہو سکتے ہیں۔

### (ف ر ت)

الْفَرَاتُ کے معنی شیریں یا نہایت شیریں پانی کے ہیں اور یہ واحد جمع دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَأَسْقَيْنَكُم مَّاءً فُرَاتًا﴾ (۷۷-۷۵) اور تم لوگوں کو میٹھا پانی پلایا۔

﴿هَذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ﴾ (۲۵-۵۳) ایک کا پانی شیریں ہے پیاس بجھانے والا۔

### (ف ر ث)

الْفَرْتُ: جو کچھ جانور کی اوجھڑی کے اندر ہوتا ہے اسے فرث کہتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَمِنْ بَيْنِ فَرْتٍ وَدَمٍ لَبْنَا خَالِصًا﴾ (۱۶-۶۶) گوہر اور لہو میں سے کس طرح خاص دودھ..... فَرْتُ كَبِدَةٍ: میں نے اس کے جگر کو پارہ پارہ کر دیا۔ أَفَرْتُ فُلَانًا أَصْحَابَهُ: فلاں نے اپنے ساتھیوں کو ایسی مصیبت میں مبتلا کر دیا جو بمنزلہ فَرْتُ کے تھی (یعنی ریزہ ریزہ کر دینے والی)۔

### (ف ر ج)

الْفَرْجُ وَالْفَرْجَةُ کے معنی دو چیزوں کے درمیان

﴿وَلَوْ افْتَدَى بِهِ﴾ (۳-۹۱) اگر..... بدلے میں..... دیں ﴿لَوْ يَفْتَدِي مِنْ عَذَابٍ يَوْمَئِذٍ بَيْنِهِ﴾ (۷۰-۱۱) کہ کسی طرح اس دن کے عذاب کے بدلے میں (سب کچھ) دے ڈالے یعنی بیٹے.....

اور جو مال کسی عبادت میں کوتاہی کرنے کی وجہ سے خرچ کر کے انسان خود اپنے آپ کو گناہ سے بچاتا ہے اسے بھی فِذْيَةٌ کہا جاتا ہے جیسا کہ کفارہ بمیرہ اور صوم کے متعلق فرمایا:

﴿فَفِذْيَةٌ مِنْ صِيَامٍ أَوْ صَدَقَةٍ أَوْ نُسُكٍ﴾ (۲-۱۹۶) تو اس کے بدلے روزے رکھے یا صدقہ دے یا قربانی کرے۔

﴿فَفِذْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ﴾ (۲-۱۸۴) روزے کے بدلے محتاج کو کھانا کھلا دیں۔

### (ف ر ر)

الْفَرُّ وَالْفِرَارُ، اس کے اصل معنی ہیں: جانور کی عمر معلوم کرنے کے لیے اس کے دانتوں کو کھولنا۔ اسی سے فَرَّ الدَّهْرُ جَذْعًا کا محاورہ ہے یعنی زمانہ اپنی پہلی حالت پر لوٹ آیا۔ اور اسی سے افترار: ہے جس کے معنی ہنسنے میں دانتوں کا کھل جانا کے ہیں۔ فَرَّ مِنَ الْحَرْبِ فَرَارًا میدان کارزار چھوڑ دینا۔ لڑائی سے فرار ہو جانا۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿فَفَرَرْتُ مِنْكُمْ﴾ (۲۶-۲۱) تو میں تم سے بھاگ گیا۔ ﴿فَرَرْتُ مِنْ قُصُورَةٍ﴾ (یعنی شیر سے ڈر کر بھاگ جاتے ہیں۔

﴿فَلَمْ يَزِدْهُمْ دُعَائِي إِلَّا فِرَارًا﴾ (۱۷-۶۱) لیکن میرے بلانے سے اور زیادہ گریز کرتے رہے۔ ﴿لَنْ يَنْفَعَكُمُ الْفِرَارُ إِنْ فَرَرْتُمْ﴾ (۳۳-۱۶) (کہہ دو) کہ اگر تم..... بھاگتے ہو تو بھاگنا تم کو فائدہ نہ دے گا۔

ہو۔

فَوَارِجُ الدَّجَاجِ: مرغی کے چوڑے۔ کیونکہ وہ انڈوں سے نکلتے ہیں اور چوڑوں والی مرغی کو مُفْرِجُ کہا جاتا ہے۔ اَلْمُفْرِجُ: وہ قاتل جس سے لوگ دور ہو جائیں اور اس کے قاتل کا علم نہ ہو سکے۔

### (ف ر ج)

اَلْفَرْجُ کے معنی کسی فوری یا دنیوی لذت پر انشراح صدر کے ہیں۔ عموماً اس کا اطلاق جسمانی لذتوں پر خوش ہونے کے معنی میں ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:-

﴿وَلَا تَفْرَحُوا بِمَا آتَاكُمْ﴾ (۲۳-۷۵) اور جو تم کو اس نے دیا ہو اس پر اترایا نہ کرو۔

﴿وَفَرِحُوا بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا﴾ (۲۶-۱۳) اور (کافر) لوگ دنیا کی زندگی پر خوش ہو رہے ہیں۔

﴿ذَلِكُمْ بِمَا كُنتُمْ تَفْرَحُونَ﴾ (۷۵-۴۰) یہ اس کا بدلہ ہے کہ تم..... خوش ہوا کرتے تھے۔

﴿حَتَّىٰ إِذَا فَرِحُوا بِمَا أُوتُوا﴾ (۴۳-۶) یہاں تک کہ جب ان چیزوں سے جو ان کو دی گئی تھی خوب خوش ہو گئے۔

﴿فَرِحُوا بِمَا عِنْدَهُمْ مِنَ الْعِلْمِ﴾ (۸۳-۴۰) تو جو علم (اپنے خیال میں) ان کے پاس تھا اس پر اترانے لگے۔

﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِينَ﴾ (۷۶-۲۸) کہ خدا اترانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

اور قرآن پاک میں صرف دو آیتیں یعنی..... ﴿فَبِذَلِكَ فَلْيَفْرَحُوا﴾ (۵۸-۱۰) تو چاہیے کہ لوگ اس سے خوش ہوں۔

﴿وَيَوْمَئِذٍ يَقَرُّحُ الْمُؤْمِنُونَ﴾ (۴-۳۰) اور اس

شگاف کے ہیں۔ جیسے دیوار میں شگاف یا دونوں ٹانگوں کے درمیان کی کشادگی اور کنایہ کے طے طور پر فرج کا لفظ شرمگاہ پر بولا جاتا ہے اور کثرت استعمال کی وجہ سے اسے حقیقی معنی سمجھا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَالَّتِي أَحْصَنَتْ فَرْجَهَا﴾ (۹۱-۲۱) اور ان (مریم علیہا السلام) کو (بھی یاد کرو) جنہوں نے اپنی عصمت کو محفوظ رکھا۔ ﴿لَفُرُوجِهِمْ حَافِظُونَ﴾ (۵-۲۳) اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ وَيَحْفَظْنَ فُرُوجَهُنَّ (۳۱-۲۴) (اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کیا کریں)۔

اور استعارے کے طور پر سرحد اور ہر خطرہ کی جگہ کو فرج کہا جاتا ہے اور بعض نے کہا ہے کہ اسلامی دور حکومت میں فَرْجَانِ کا لفظ ترک اور سوڈان پر بولا جاتا تھا۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَمَا لَهَا مِنْ فُرُوجٍ﴾ (۶-۵۰) اور اس میں کہیں شگاف تک نہیں۔

میں فروج بمعنی شگاف ہے اور آیت کریمہ:

﴿وَإِذَا السَّمَاءُ فُرِجَتْ﴾ (۹-۷۷) اور جب آسمان پھٹ جائے۔

میں فُرِجَتْ بمعنی انشَقَّتْ ہے یعنی جب آسمان شق ہو جائے گا۔

اَلْفَرْجُ کے معنی غم دور ہونے کے ہیں چنانچہ محاورہ ہے۔ فَرَجَ اللَّهُ عَنْكَ: اللہ تجھ سے غم کو دور کرے اور قَوْسُ فَرْجِ اس کمان کو کہتے ہیں جس کے دونوں گوشے کشادہ ہوں۔ جیسا کہ تانت سے علیحدہ ہونے کی حالت میں اور جو شخص اپنا بھید نہ چھپائے اس کو فَرْجُ کہا جاتا ہے اور فَرْجُ اس شخص کو کہتے ہیں جس کی شرمگاہ پر ستر یعنی پردہ نہ

روزِ مومن خوش ہو جائیں گے۔ دوسری نہ ملانی گئی ہو یہ لفظ و تـ (طاق) سے عام اور

ایسی ہیں جن میں فرح کا لفظ پسندیدہ معنی میں استعمال ہوا ہے۔

وَمُفْرَاحٌ : بہت زیادہ اترانے والا۔ شاعر نے کہا ❶ (الطویل)

(۳۳۷) وَلَسْتُ بِمُفْرَاحٍ إِذَا الْخَيْرُ مَسَّنِي

وَلَا جَانِزٍ مِنْ صَرْفِهِ الْمُتَقَلِّبِ

نہ تو میں خیر حاصل ہونے سے اتراتا ہوں اور نہ ہی زمانہ کے حوادث پر جزع فزع کرتا ہوں۔

محاورہ ہے۔ مَا يَسْرُنِي بِهَذَا الْأَمْرِ مُفْرَحٌ أَوْ

مَفْرُوحٌ بہ: مجھے اس امر سے کچھ بھی خوشی نہیں۔ رَجُلٌ

مُفْرَحٌ : وہ آدمی جو قرض کے نیچے دب گیا ہو۔ حدیث

میں ہے ❷ ((لَا يُتْرَكُ فِى الْإِسْلَامِ

مُفْرَحٌ)) یعنی اسلام میں کسی کو مُفْرَحٌ یعنی مقروض نہیں

چھوڑا جائے گا۔ گویا اِفْرَاحٌ کا لفظ فرحت کے حاصل

ہونے اور زائل کرنے دونوں معنی میں استعمال ہوتا ہے

جیسا کہ اِشْكَاءٌ کا لفظ جلبِ شکوئی و ازالہ آں کے معنی میں

آتا ہے اور مقروض سے بھی چونکہ اس کی خوشی زائل ہو جاتی

ہے اس لیے اسے مفرح کہا جاتا ہے۔ اسی بنا پر کہا گیا ہے:

لَا غَمَّ إِلَّا غَمُّ الدِّينِ کہ اصل غم تو قرض کا غم ہے۔

## (فرد)

الْفَرْدُ: (اکیلا) اس چیز کو کہتے ہیں جس کے ساتھ

اور اللہ تعالیٰ کے متعلق فرد کا لفظ بولنے میں اس بات پر

تنبیہ ہے کہ وہ تنہا ہے اس کے برعکس باقی اشیاء جوڑا جوڑا

پیدا کی گئی ہیں جس پر کہ آیت ﴿وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ

خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ﴾ (۵۱-۴۹) اور ہر چیز کی ہم نے دو

قسمیں بنائیں۔

میں تنبیہ پائی جاتی ہے اور بعض نے کہا ہے کہ اللہ کے فرد

ہونے کے معنی یہ ہیں کہ دوسروں سے بے نیاز ہے جیسا

کہ آیت:

﴿عَنِّي عَنِ الْعَالَمِينَ﴾ (۳-۹۷) اہل عالم

سے بے نیاز ہے۔

میں اس پر تنبیہ کی ہے اور جب یہ کہا جاتا ہے کہ ذات

باری تعالیٰ اپنی وحدانیت میں مفروض ہے تو اس کا معنی یہ ہوتا

ہے کہ وہ ذات ہر قسم کی ترکیب اور بحالت سے مبرا ہے اور

جملہ موجودات کے برعکس ہے۔ اور فرید کے معنی واحد یعنی

اکیلا اور تنہا کے ہیں۔ اس کی جمع فُرَادِی آتی ہے جیسے

أَسِيرٌ کی جمع أُسَارِی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَلَقَدْ جِئْتُمُونَا فُرَادِی﴾ (۶-۹۴) اور جیسا ہم

❶ قاله هدية العذرى انظر العقد (۱/۱۱۶) وفي رواية سرتنى بدل مسنى وفي العيون (۱/۲۷۶) البيت اللبيث واخرى فيه: (۱/۲۸۱) انه لتابط شرا انظر الميسر ۴۹ والمعاني للقبتي (۱۱۵۱)۔

❷ الحديث فى النهاية (فرج) والحديث اخرجه الطبرانى فى الكبير راجع كنز العمال رقم (۴۳۸) عن كثير بن عبد الله عن ابيه عن جده وفى مجمع بحار الانوار مفرج يا لحييم ومعنا ومن لا عشيرة له والفاقي (۲/۱۲۶) ولفظه المفرج ذكره العلماء فى الاضداد ومعناه المسرور ايضا المثلث بالدين۔ (اضد اد ابى الطيب ۵۶۶ وابن الانبارى ۱۹۷) ولمعناه انظر غريب ابى عبيد ۱۲۔

اور محاورہ ہے۔ فُلَانٌ كَرِيمٌ الْمَقَارِشِ: یعنی اس کی بیگمات اعلیٰ مرتبہ کی ہیں۔

أَفْرَشَ الرَّجُلُ صَاحِبَهُ: اس نے اپنے ساتھی کی غیبت اور بدگوئی کی۔ أَفْرَشَ عَنْهُ: کسی چیز سے رک جانا (الْفَرَاشَةُ پروانہ تلی وغیرہ) اس کی جمع الْفَرَاشِ آتی ہے قرآن پاک میں ہے: ﴿كَأَلْفَرَاشٍ الْمَبْثُوثِ﴾ (۱۰۱-۴) جیسے بکھرے ہوئے پتنگے۔

اور تشبیہ کے طور پر تالے کے کندے کو بھی فَرَاشَةُ الْقُفْلِ کہا جاتا ہے نیز فَرَاشَةُ کے معنی برتن میں تھوڑا سا پانی کے بھی آتے ہیں۔

### (ف ر ض)

الْفَرَضُ: (ض) کے معنی سخت چیز کو کاٹنے اور اس میں نشان ڈالنے کے ہیں۔ مَثَلًا فَرَضُ الْحَدِيدِ: لوہے کو کاٹنا فَرَضُ الْقَوْسِ: کمان کا چلہ فَرَضُ الزَّيْدِ: چمقاں کا ٹکڑا اور فَرَضَةُ الْمَاءِ کے معنی دریا کا دھانہ کے ہیں اور آیت کریمہ:

﴿لَا تَتَّخِذَنَّ مِنْ عِبَادِكَ نَصِيبًا مَفْرُوضًا﴾ (۱۱۸-۳) میں تیرے بندوں سے (غیر خدا کی نذر دلو کر) مال کا ایک مقرر حصہ لے لیا کروں گا۔ میں بعض نے کہا ہے کہ یہاں مفروض کے معنی معین کے ہیں اور بعض نے کاٹ کر الگ کیا ہوا مراد لیا ہے۔ اور فَرَضٌ بمعنی ایجاب (واجب کرنا) آتا ہے مگر واجب کے معنی کسی چیز کے بلحاظ وقوع اور ثبات کے قطعی ہونے کے ہیں اور فرض کے معنی بلحاظ حکم

نے تم کو پہلی دفعہ پیدا کیا تھا ایسا ہی آج اکیلے ہمارے پاس آئے۔

### (ف ر ش)

الْفَرَشُ: (ن ض) کے اصل معنی کپڑے کو بچھانے کے ہیں لیکن بطور اسم کے ہر اس چیز کو جو بچھائی جائے فرش و فَرَاش کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ فَرَاشًا﴾ (۲۲-۲) جس نے تمہارے لیے زمین کو بچھوٹا..... بنایا۔ یعنی قابل رہائش بنایا اور اسے ابھرا ہوا نہیں بنایا جس پر سکونت ناممکن ہو اور الْفَرَاشِ کی جمع فُرُشُ آتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَفُرُشٍ مَّرْقُوعَةٍ﴾ (۵۶-۳۳) اور اونچے اونچے فرشوں میں۔

﴿فُرُشٍ بَطَّائِنُهَا مِنْ إِسْتَبْرَقٍ﴾ (۵۵-۵۴) ایسے بچھونوں پر جن کے استر اطلس کے ہیں..... اور فرش سے مراد وہ جانور بھی ہوتے ہیں جو بار برداری کے قابل نہ ہوں جیسے فرمایا۔

﴿وَمِنَ الْأَنْعَامِ حَمُولَةٌ وَفَرَشَاءُ﴾ (۱۴۲-۶) چوپایوں میں سے بڑی عمر کے جو بار برداری کے کام آتے ہیں اور چھوٹی عمر کے جو بار برداری کا کام نہیں دیتے اور زمین میں لگے ہوئے (یعنی چھوٹے چھوٹے) بھی۔

اور کنایہ کے طور پر فرش کا لفظ میاں بیوی میں سے ہر ایک پر بولا جاتا ہے چنانچہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔ ① ﴿الْوَلَدُ لِلْفَرَاشِ﴾ کہ بچہ خاوند کا ہے۔

① وتمام الحديث ((و للعاہر الحجر)) انظر للحديث النهاية (۳۳۵/۱) والفاقی (۲/۲۰۱) واللسان (حجر عہد) والحملۃ الثانيه فقط فی اضداد ابی الطیب (۱۱۷) واصل الحديث متفق علیہ ورواہ ابو داؤد و الترمذی وابن ماجہ عن عائشۃ انظر للتفصیل کنز العمال (۶ ج رقم ۷۲۰) و زوائد ابن حبان رقم (۱۳۳۶) عن ابن مسعود والفتح الکبیر للنہانی (۳-۳۰۸)

کے معنی یہ ہیں چونکہ تم ان کے لیے مہر مقرر اور اپنے اوپر لازم کر چکے ہو اور یہی معنی فَرَضَ لَهُ فِي الْعَطَاءِ کے ہیں (یعنی کسی کے لیے عطا سے حصہ مقرر کر دینا) اسی بنا پر عطیہ اور قرض بھی فرض کہا جاتا ہے اور فَرَأَيْضُ اللَّهِ سے مراد وہ احکام ہیں جن کے متعلق قطعی حکم دیا گیا ہے اور جو شخص علم فرائض کا ماہر ہو اسے فَاَرِضْ وَفَرَضِي کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَمَنْ فَرَضَ فِيهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ﴾ (۲-۱۹۷) تو جو شخص ان مہینوں میں حج کی نیت کرے تو حج (کے دنوں) میں نہ عورتوں سے اختلاط رکھے نہ کوئی برا کام کرے اور کسی سے جھگڑے۔ یعنی جس نے فریضہ حج کو اپنے اوپر لازم کر لیا ہو اور اس کی پختہ نیت کر لی ہو۔ یہاں پر فرض کی نسبت انسان کی طرف کرنے میں اس بات پر دلیل ہے کہ اس وقت مقرر کرنا انسان کا کام ہے (کہ میں امسال حج کروں گا یا آئندہ سال) اور زکوٰۃ میں جو چیز وصول کی جاتی ہے اس پر بھی فریضہ کا لفظ بولا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے: ﴿إِنَّمَا الصَّدَقَتُ لِلْفُقَرَاءِ إِلَى قَوْلِهِ فَرِيضَةً مِّنَ اللَّهِ﴾ (۹-۶۰) صدقات (یعنی زکوٰۃ و خیرات) تو مغفلوں..... کا حق ہے (یہ) خدا کی طرف سے مقرر کر دیئے گئے ہیں۔

اسی بنا پر مروی ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے ایک عامل کی طرف خط لکھا اور اس میں ارقام فرمایا ﴿۶۷﴾

کے قطعی ہونے کے۔ قرآن پاک میں ہے:-  
﴿سُورَةٌ أَنْزَلْنَاهَا وَفَرَضْنَاهَا﴾ (۱-۲۴) (یہ ایک) سورہ ہے جس کو ہم نے نازل کیا اور اس (کے احکام) کو فرض کر دیا ہے۔  
یعنی اس پر عمل کرنا فرض کر دیا ﴿۱۰﴾ نیز فرمایا:-

﴿إِنَّ الَّذِي فَرَضَ عَلَيْكَ الْقُرْآنَ﴾ (۲۸-۸۵) (اے پیغمبر) جس نے تم پر قرآن (کے احکام) کو فرض کیا ہے.....

یعنی اس پر عمل کرنا تجھ پر واجب کیا ہے اور اسی سے جو نفعہ وغیرہ، حاکم کسی کے لیے مقرر کر دیتا ہے اسے بھی فرض کہا جاتا ہے اور ہر وہ مقام جہاں قرآن پاک میں فَرَضَ عَلٰی (علی) کے ساتھ آیا ہے۔ اس کے معنی کسی چیز کے واجب اور ضروری قرار دینے کے ہیں اور جہاں فَرَضَ اللَّهُ لَهُ (لام کے ساتھ) آیا ہے تو اس کے معنی کسی چیز سے بندش کو دور کرنے اور اسے مباح کر دینے کے ہیں۔ چنانچہ فرمایا:-

﴿مَا كُنَّا عَلَى النَّبِيِّ مِنْ حَرَجٍ فِيمَا فَرَضَ اللَّهُ لَهُ﴾ (۳۳-۳۸) پیغمبر پر اس کام میں کچھ تنگی نہیں جو خدا نے ان کے لیے مقرر کر دیا۔

﴿قَدْ فَرَضَ اللَّهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ أَيْمَانِكُمْ﴾ (۶۶-۲) خدا نے تم لوگوں کے لیے تمہاری قسموں کا کفارہ مقرر کر دیا ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيضَةً﴾ (۲-۲۳۷) لیکن مہر مقرر کر چکے ہو۔

① وعن عكرمة قدرنا فيها الحدود وفي قراءة بالتشديد عن ابن كثير وابي عمرو (مجمع البيان للطبرسي ۶/۵)

② وكتاب ابی بکر الصديق فی الصدقات مروی عن انس (حم) و اموال ابی عبید) خ' و ان و ابن جریر و ابن الحارود و ابن خزيمة و الطحاوی راجع كنز العمال (۶ ج رقم ۲۲۶۱)۔

اور چھوٹے بچے پر جنازہ کی دعا میں کہا جاتا ہے۔

﴿اللَّهُمَّ اجْعَلْهُ لَنَا قَرَطًا اے اللہ! اسے

ہمارے لیے میرسا مان بنا۔ اور آیت کریمہ:

﴿اَنْ يَّفْرُطَ عَلَيْنَا﴾ (۲۰-۳۵) کہ وہ کہیں ہم سے

زیادتی نہ کرے۔

فَرَسٌ فَرَطٌ: تیز رفتار گھوڑا جو دوسرے گھوڑوں کو پیچھے

چھوڑ کر آگے نکل جائے۔

الْاَفْرَاطُ کے معنی حد سے بہت زیادہ تجاوز کر جانے کے

ہیں ﴿اور تَقْرِيطُ کے معنی فرط یعنی تقدم میں کوتاہی کرنے

کے ہیں چنانچہ محاورہ ہے: مَا فَرَطْتُ فِي كَذَا: میں

نے فلاں معاملہ میں کوتاہی نہیں کی۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿مَا فَرَطْنَا فِي الْكِتَابِ﴾ (۶-۳۸) ہم نے کتاب

(یعنی لوح محفوظ میں) کسی چیز (کے لکھنے) میں کوتاہی نہیں

کی۔

﴿مَا فَرَطْتُ فِي جَنْبِ اللَّهِ﴾ (۳۹-۵۶) اس تقصیر

پر (انہوں نے) جو میں نے خدا کے حق میں کی۔

﴿مَا فَرَطْتُمْ فِي يُوسُفَ﴾ (۱۲-۸۰) تم یوسف

کے بارے میں تصور کر چکے ہو۔

اَفَرَطْتُ الْقِرْبَةَ: مشکیزہ کو پانی سے خوب بھر دیا۔

قرآن پاک میں ہے:-

﴿وَكَانَ اَمْرُهُ فُرْطًا﴾ (۱۸-۲۸) اور اس کا کام حد

سے بڑھ گیا۔

((هَذِهِ فَرِيضَةُ الصَّدَقَةِ الَّتِي فَرَضَهَا رَسُولُ

اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى الْمُسْلِمِينَ))

کہ یہ یعنی جو مقدار لکھی جا رہی ہیں فریضہ زکوٰۃ ہے۔ جو

رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں پر فرض کیا ہے۔

الْفَارِضُ: عمر رسیدہ گائے یا بیل۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿لَا فَارِضٌ وَلَا بَكْرٌ﴾ (۲-۶۲) نہ بوڑھا ہوا اور نہ

بچھڑا۔

بعض نے کہا ہے کہ بیل کو فارض اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ

زمین کو پھاڑتا یعنی جوتا ہے اور یا اس لیے کہ اس پر سخت

کاموں کا بوجھ ڈالا جاتا ہے اور یا اس لیے کہ گائے کی زکوٰۃ

میں تیج اور مُسِنَّۃ لیا جاتا ہے اور تیج کا لینا تو بعض حالتوں

میں جائز ہوتا ہے اور بعض احوال میں ناجائز لیکن مُسِنَّۃ

کی ادائیگی ہر حال میں ضروری ہوتی ہے اس لیے مُسِنَّۃ کو

فَارِضۃ کہا گیا ہے اس توجیہ کی بنا پر فَارِضٌ کا لفظ

مصطلحات اسلامیہ سے ہوگا۔

## (ف ر ط)

فَرَطٌ يَفْرُطُ (ن) کے معنی قَصْدًا آگے بڑھ

جانے کے ہیں۔ اسی سے فَارِطٌ ہے جس کے معنی ڈول

وغیرہ درست کرنے کے لیے قافلہ سے پہلے پانی پر جانے

والا کے ہیں اور اسے فَرَطٌ بھی کہا جاتا ہے اسی سے

آخضرت نے فرمایا: ﴿(۶۸) (اَنَا فَرَطُكُمْ عَلَى

الْحَوْضِ)) میں حوض پر تمہارا پیش رو ہوں گا۔

① الحديث في الفائق (۲۵۶/۱) والنهاية (۲۱۱/۳) وغريب ابی عبید (۴۴:۱) وابن حبان في زوائد رقم (۱۸۵۸) من

حديث قيس بن ابي حازم مرسلًا والحديث في البحار (فتن رفاق طهارة فضائل راجع الفتح الكبير) (۳۷۵:۱)

② ای فی الصلوٰۃ علی المولود درواہ البیہقی من حدیث ابی ہریرۃ انظر النیل (۶۹/۴) وغریب ابی عبید واللسان والتاج

(فرط)

③ وفي القرآن وانهم مفروطون (۶۲-۶)



(جمع فرعون کی) اور ابالیسہ (جمع ابلیس کی) کہا جاتا ہے۔

## (ف ر غ)

الْفَرَاعُ: یہ شغل کی ضد ہے۔ اور فَرَاعٌ (ن) فُرُوعًا خالی ہونا۔ فارُعٌ: خالی۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَأَصْبَحَ فُؤَادُ أُمِّ مُوسَىٰ فَرِيحًا﴾ (۲۸-۱۰) اور موسیٰ کی ماں کا دل بے صبر ہو گیا۔

یعنی خوف کی وجہ سے گویا عقل سے خالی ہو چکا تھا..... جیسا کہ شاعر نے کہا ہے ﴿(الوافر)

(۳۳۸) كَانَتْ..... جَوْ جَوْهَ هَوَاءَ

گویا..... اس کا سینہ ہوا ہو رہا تھا

اور بعض نے فَارِعًا کے معنی موسیٰ علیہ السلام کے خیال سے خالی ہونا کئے ہیں یعنی ہم نے موسیٰ علیہ السلام کا خیال ان کے دل سے بھلا دیا حتیٰ کہ وہ مطمئن ہو گئے اور موسیٰ علیہ السلام کو دریا میں ڈال دینا انہوں نے گوارا کر لیا بعض نے فارغا کا معنی اس کی یاد کے سوا باقی چیزوں سے خالی ہونا بھی کیے ہیں۔ جیسا کہ اس کے بعد کی آیت:

﴿وَأَن تَكُنْتَ تَتَّبِعُنِي بِهٖ لَوْلَا أَن رَّبَطْنَاهُ عَلَىٰ قُلُوبِنَا﴾ (۲۸-۱۰) اگر ہم ان کے دل کو مضبوط نہ کرتے تو قریب تھا کہ وہ اس قصے کو ظاہر کر دیں۔ سے معلوم ہوتا

ہے اور اسی سے فرمایا:

﴿فَإِذَا فَرَغْتَ فَانصَبْ﴾ (۹۴-۷) تو جب فارغ

ہوا کرو تو عبادت میں محنت کیا کرو۔

﴿سَنَفْرُغُ لَكُمْ أَيُّهَا الثَّقَلَيْنِ﴾ (۵۵-۳۱) اے

دونوں جماعتو! ہم غمغریب تمہاری طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

یعنی افراط و تفریط میں حد سے بڑھا ہوا ہے۔

## (ف ر ع)

فَرْعُ الشَّجَرِ: کے معنی درخت کی شاخ کے ہیں اس کی جمع فُرُوعٌ آتی ہے۔ اور آیت کریمہ ﴿وَفَرُّعُهَا فِي السَّمَاءِ﴾ (۱۴-۲۴) اور شاخیں آسمان میں۔ میں فَرْعُهَا کے دو معنی ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ لمبا طویل کے اسے فی السَّمَاءِ کہا ہو، جیسے محاورہ ہے: فَرْعٌ كَذَا (یعنی لمبا ہو جانا) اور سر کے بالوں کو بلندی اور طول کی وجہ سے فَرْعٌ کہا جاتا ہے۔

رَجُلٌ أَفْرَعٌ: گھنے اور لمبے بالوں والا اس کی مونث فَرْعَاءُ اور جمع فُرُوعٌ آتی ہے اور کہا جاتا ہے۔

فَرَعَتْ الْجَبَلَ: پہاڑ کی چوٹی پر چلا جانا۔ فَرَعَتْ رَأْسَهُ بِالسَّيْفِ: اس کا سر تلوار سے قلم کر دیا۔ تَفَرَّعَتْ فِي بَنِي فُلَانٍ: میں نے ان کے اونچے خاندان میں شادی کر لی۔ دوم یہ کہ عرض یعنی پھیلاؤ کے لحاظ سے اسے فی السَّمَاءِ کہا ہو اور یہ تَفَرَّعَ كَذَا سے ہو جس کے معنی پھیل جانے کے ہیں اور مسئلہ کی جزئیات کو فروغ کہا جاتا ہے۔ اور فُرُوعُ الرَّجُلِ کے معنی اولاد کے بھی ہیں۔

## (ف ر ع ن)

فِرْعَوْنُ: یہ علم عجیب ہے اور اس سے سرکشی کے معنی لے کر کہا جاتا ہے تَفَرَّعَ عَنْ فُلَانٍ کہ فلاں فرعون بنا ہو ہے۔ جس طرح کہ ابلیس سے ابْلَسَ وَتَبَلَّسَ وغیرہ مشتقات استعمال ہوتے ہیں اور اسی سے سرکشوں کو فِرَاعِنَ

① قطعة من كلمة لرهير والبيت بتمامه: كان الرجل منهافوق صعل من الظلمان جؤ جؤه هواء. والبيت في اللسان (هوا) والکامل (۲۸۷) ومختار الشعر الجاهلی (۱۹۳: ۱) والبحر (۴۳: ۵) وغریب القرآن للقبتي و دیوانه ۶۳ والحيوان (۳۹۸: ۴) والعقد الثمين (۷۶) والعيون (۶۹: ۲) والمعافی للقبتي (۳۳۵)۔

توراۃ کو زبان مروڑ مروڑ کر پڑھتے ہیں۔ ﴿فَفَرَّقْنَاهُ﴾ کَذَّبْتُمْ وَفَرَّقْنَا تَقْتُلُونَ ﴿(۵۰-۷۰)﴾ ایک جماعت کو جھٹلا دیتے اور ایک جماعت کو قتل کر دیتے تھے۔

﴿فَرِيقٌ فِي الْجَنَّةِ وَفَرِيقٌ فِي السَّعِيرِ﴾ ﴿(۷۲-۷۳)﴾ ایک فریق بہشت میں ہوگا اور ایک فریق دوزخ میں۔

﴿إِنَّهُ كَانَ فَرِيقٌ مِّنْ عِبَادِي﴾ ﴿(۲۳-۱۰۹)﴾ میرے بندوں میں ایک گروہ تھا..... ﴿أَيُّ الْفَرِيقَيْنِ﴾ ﴿(۱۹-۷۳)﴾ دونوں فریق میں سے..... کس کے۔

﴿وَتُخْرِجُونَ فَرِيقًا مِّنْكُمْ مِّن دِيَارِهِمْ﴾ ﴿(۲-۸۵)﴾ اور اپنے میں سے بعض لوگوں کو..... وطن سے نکال بھی دیتے ہو۔

﴿وَإِنَّ فَرِيقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُونَ الْحَقَّ﴾ ﴿(۲-۱۳۶)﴾ مگر ایک فریق ان میں سے سچی بات کو..... چھپا رہا ہے۔

اور فَرَقْتُ بَيْنَ الشَّيْئَيْنِ کے معنی دو چیزوں کو الگ الگ کر دینے کے ہیں خواہ وہ علیحدگی نظر سے محسوس ہو رہی ہو یا اس کا تعلق بصیرت سے ہو۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَاَفْرِقْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ الْقَوْمِ الْفَاسِقِينَ﴾ ﴿(۵-۲۵)﴾ تو ہم میں اور ان نافرمان لوگوں میں جدائی کر دے۔

﴿فَالْفَرِيقُ فَرَقًا﴾ ﴿(۷۷-۴)﴾ پھر وہ (اشیاء کے درمیان) فرق کر دیتے ہیں۔

یعنی وہ فرشتے جو اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق اشیاء کا فیصلہ کرتے ہیں۔ اور آیت کریمہ:

﴿فِيهَا يُفَرَّقُ كُلُّ أَمْرٍ حَكِيمٍ﴾ ﴿(۲۴-۴)﴾ اسی رات میں تمام حکمت کے کام فیصلہ کیے جاتے ہیں، میں بھی یفرق اسی معنی پر محمول ہے اور حضرت عمرؓ کو فاروق

اور أَفْرَعْتُ الدَّلْوَ کے معنی ڈول سے پانی بہا کر اسے خالی کر دینا کے ہیں چنانچہ آیت کریمہ: ﴿أَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا﴾ ﴿(۲-۲۵۰)﴾ ہم پر صبر کے دہانے کھول دے، بھی اسی سے مستعار ہے۔ ذَهَبَ دَمُهُ فَرَاغًا۔ اس کا خون رائیگاں گیا۔ فَرَسُ فَرِيعٍ: وسیع قدم اور تیز رفتار گھوڑا گویا وہ دوز کر پانی کی طرح بہہ رہا ہے۔ ضَرْبَةُ فَرِيعَةٍ: وسیع زخم جس سے خون زور سے بہہ رہا ہو۔

## (ف ر ق)

الْفَرْقُ وَالْفَرْقُ کے قریب قریب ایک ہی معنی ہیں لیکن معنی اشتقاق یعنی پھٹ جانا کے لحاظ سے فَلَاقَ کا لفظ بولا جاتا ہے اور معنی انفصال یعنی الگ الگ ہونے کے لحاظ سے فَرَّقَ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَإِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ﴾ ﴿(۲-۵۰)﴾ اور جب ہم نے تمہارے لیے دریا کو پھاڑ دیا۔

اور الْفَرْقُ ﴿(۲۶-۲۳)﴾ کے معنی الگ ہونے والا ٹکڑہ کے ہیں۔ اسی سے فَرْقَةٌ ﴿(۹-۱۲۲)﴾ ہے جس کے معنی لوگوں کا گروہ یا جماعت کے ہیں۔ اور طلوع فجر پر فَرَّقَ اور فَلَاقَ

دونوں لفظ بولے جاتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَإِنْفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فَرَقٍ كَالطُّورِ الْعَظِيمِ﴾ ﴿(۲۶-۶۳)﴾ تو دریا پھٹ گیا اور ہر ایک ٹکڑا یوں ہو گیا

(کہ) گویا بڑا پہاڑ ہے۔

اور فریق اس جماعت کو کہتے ہیں جو دوسروں سے الگ ہو۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَإِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِيقًا يَلْوُونَ أَلْسِنَتَهُم بِالْكِتَابِ﴾ ﴿(۳-۷۸)﴾ اور اہل کتاب میں بعض ایسے ہیں کہ کتاب

میں اور تجھ میں علیحدگی۔ اور آیت کریمہ: ﴿وَظَنَّ أَنَّهُ الْفِرَاقُ﴾ (۴۵-۲۸) اس (جان بلب) نے سمجھا کہ اب سب سے جدائی ہے، کے معنی یہ ہیں کہ اسے یقین ہو جاتا ہے کہ بس اب دنیا سے مفارقت کا وقت قریب آ پہنچا ہے اور آیت کریمہ:

﴿وَيُرِيدُونَ أَن يُفَرِّقُوا بَيْنَ اللَّهِ وَرُسُلِهِ﴾ (۴-۱۵۰) اور خدا اور اس کے پیغمبروں میں فرق کرنا چاہتے ہیں۔

کے معنی یہ ہیں کہ وہ ظاہر تو یہ کرتے ہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ پر ایمان پیغمبروں کے ساتھ کفر کرتے ہیں اور آیت کریمہ: ﴿وَلَمْ يُفَرِّقُوا بَيْنَ أَحَدٍ مِّنْهُمْ﴾ (۴-۱۵۲) اور ان میں کسی میں فرق نہ کیا۔

کے معنی یہ ہیں کہ وہ تمام پیغمبروں پر ایمان رکھتے ہیں۔  
الْفِرْقَانُ: یہ فرق سے ابلغ ہے کیونکہ یہ حق اور باطل کو الگ الگ کر دینا کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور یہ رَجُلٌ قُنْعَانٌ (یعنی وہ آدمی جس کے حکم پر قناعت کی جائے) کی طرح اسم صفت ہے مصدر نہیں ہے اور فرق کا لفظ عام ہے جو حق کو باطل سے الگ کرنے کے لیے بھی آتا ہے اور دوسری چیزوں کے متعلق بھی استعمال ہوتا ہے اور آیت کریمہ: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن تَتَّبِعُوا اللَّهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا﴾ (۸-۲۹) مومنو! اگر تم خدا سے ڈرو گے تو وہ تمہارے لیے امر فارق پیدا کر دے گا (یعنی تم کو ممتاز کر دے گا۔ میں فرقان سے مراد یہ ہے کہ وہ تمہارے دلوں کے اندر نور اور توفیق پیدا کر دے گا جس کے ذریعہ تم حق و باطل میں امتیاز کر سکو گے تو گویا یہاں فرقان کا لفظ ایسے ہی ہے جیسا کہ دوسری جگہ سکینہ اور

اس لیے کہا گیا ہے کہ وہ حق کو باطل سے جدا کرنے والے تھے اور آیت کریمہ: ﴿وَفُرْنَا فَرْقَنَاهُ﴾ (۱۷-۱۰۶) اور ہم نے قرآن پاک کو جزو جزو کر کے نازل کیا ہے۔

کے معنی ہیں کہ ہم نے قرآن پاک میں تمام احکام کھول کھول کر بیان کر دیے ہیں اور بعض نے فَرْقَنَاهُ کے معنی مفروق طور پر نازل کرنا بھی لکھے ہیں۔

التَّفْرِيقُ اصل میں نکشیر کے لیے ہے اور کسی چیز کے شیرازہ اور اتحاد کو زائل کر دینے پر بولا جاتا ہے جیسے فرمایا:

﴿مَا يُفَرِّقُونَ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهِ﴾ (۲-۱۰۲) جس سے میاں بیوی میں جدائی ڈال دیں۔ ﴿فَفَرَّقْتَ بَيْنَ بَنِي إِسْرَآئِيلَ﴾ (۲۰-۹۴) کہ تم نے بنی اسرائیل میں تفرقہ ڈال دیا۔ اور آیت کریمہ: ﴿لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّن رُّسُلِهِ﴾ (۲-۲۸۵) اور کہتے ہیں کہ ہم اس کے پیغمبروں سے کسی میں کچھ فرق نہیں کرتے۔ نیز آیت:

﴿لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّنْهُمْ﴾ (۳-۸۴) ہم ان پیغمبروں میں سے کسی میں کچھ فرق نہیں کرتے۔ میں احد کا لفظ چونکہ حرف نفی کے تحت واقع ہونے کی وجہ سے جمع کے معنی میں ہے لہذا تفریق کی نسبت اس کی طرف جائز ہے اور آیت کریمہ۔

﴿إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ﴾ (۶-۱۵۹) جن لوگوں نے اپنے دین میں بہت سے رستے نکالے۔

میں ایک قرأت فَرَّقُوا ہے اور فَرَّقٌ وَ مُفَارَقَةٌ کا لفظ عام طور پر اجسام کے ایک دوسرے سے الگ ہونے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿هَذَا فِرَاقُ بَيْنِي وَبَيْنِكَ﴾ (۱۸-۷۸) اب مجھ

نشانیاں ہیں اور (حق و باطل کو) الگ الگ کرنے والا ہے۔

الْفَرْقُ کے معنی خوف کی وجہ سے دل کے پراگندہ ہو جانے کے ہیں اور دل کے متعلق اس کا استعمال ایسے ہی ہے جس طرح کہ صَدْعٌ وَ شَقٌّ کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَلَكِنَّهُمْ قَوْمٌ يَفْرُقُونَ﴾ (۹-۵۶) اصل یہ ہے کہ یہ ڈرپوک لوگ ہے۔

اور فَرُوقٌ وَ فَرُوقَةٌ کے معنی ڈرپوک مرد یا عورت کے ہیں (وَيَسْتَوِي فِيهِ التَّذْكِيرُ وَالتَّأْنِيثُ) اور اسی سے اس اونٹنی کو جو درندہ کی وجہ سے بدک کر دور بھاگ جائے۔ فَارِقٌ يَا فَارِقَةَ کہا جاتا ہے اور تشبیہ کے طور پر اس بدلی کو بھی فَارِقٌ کہا جاتا ہے۔ جو دوسری بدلیوں سے علیحدہ ہو۔

الْأَفْرَقُ: (۱) وہ مرغ جس کی کلفتی شاخ در شاخ ہو۔ (۲) وہ گھوڑا جس کا ایک سرین دوسرے سے اونچا ہو۔ الْفَرِيقَةُ: دودھ میں پکائی ہوئی کھجور۔ الْفَرُوقَةُ گردوں کی چربی۔

### (فارہ)

الْفَرَّةُ: (صفت مشبہ) اترانے والا۔ اور نَاقَةُ مُفَرَّهَةٍ: اس اونٹنی کو کہا جاتا ہے جو چست اور پھر تیلے بچے دے (اس سے اسم فاعل فَارِهٌ ہے) قرآن پاک میں ہے۔ ﴿وَتَنْجِتُونَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوتًا فَارِهِينَ﴾ (۲۶-۱۳۹) اور تکلف سے پہاڑوں میں تراش تراش کر گھر بناتے ہو۔

روح کے الفاظ ہیں اور قرآن پاک نے یوم الفرقان اس دن کو کہا ہے جس روز کہ حق و باطل اور صحیح و غلط کے مابین فرق اور امتیاز ظاہر ہوا چنانچہ آیت:-

﴿وَمَا أَنزَلْنَا عَلَى عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ﴾ (۸-۴۱) اور اس (نصرت) پر ایمان رکھتے ہو جو (حق و باطل میں) فرق کرنے کے دن نازل فرمائی۔ میں یوم الفرقان سے جنگ بدر کا دن مراد ہے کیونکہ وہ (تاریخ اسلام میں) پہلا دن ہے جس میں حق و باطل میں کھلا کھلا امتیاز ہو گیا تھا۔

اور کلام الہی (وحی) بھی فرقان ہوتی ہے کیونکہ وہ حق اور باطل عقائد میں فرق کر دیتی ہے سچی اور جھوٹی باتوں اور اچھے برے اعمال کو بالکل الگ الگ بیان کر دیتی ہے اس لیے قرآن کریم، تورات اور انجیل کو فرقان سے تعبیر فرما گیا ہے چنانچہ تورات کے متعلق فرمایا: ﴿وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى وَهُرُونَ الْفُرْقَانَ﴾ (۲۱-۴۸) اور ہم نے موسیٰ اور ہارون کو (ہدایت اور گمراہی میں) فرق کر دینے والی..... عطا کی۔

﴿تَبَارَكَ الَّذِي نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلَى عَبْدِهِ﴾ (۲۵-۱) وہ خدائے عزوجل بہت ہی بابرکت ہے جس نے اپنے بندے پر قرآن نازل فرمایا: ﴿وَآتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ وَ الْفُرْقَانَ﴾ (۲-۵۳) ﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَ بَيِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدَى وَ الْفُرْقَانَ﴾ (۲-۱۸۵) روزوں کا مہینہ رمضان کا مہینہ ہے جس میں قرآن (اول اول) نازل ہوا جو لوگوں کا رہنما ہے اور جس میں ہدایت کی کھلی

﴿وَمَا ظَنُّ الَّذِينَ يَفْتَرُونَ عَلَى اللَّهِ الْكُذِبَ﴾ (۱۰-۶۰) اور جو لوگ خدا پر افتراء کرتے ہیں وہ..... کیا خیال رکھتے ہیں؟

﴿أَنْ يُفْتَرَىٰ مِنْ دُونِ اللَّهِ﴾ (۱۰-۳۷) کہ خدا کے سوا کوئی اس کو اپنی طرف سے بنالائے۔ ﴿إِنْ أَنْتُمْ إِلَّا مُفْتَرُونَ﴾ (۱۱-۵۰) تم (شرک کر کے خدا پر) محض بہتان باندھتے ہو۔

اور آیت کریمہ:  
﴿لَقَدْ جَنَّتْ شَيْئًا فَرِيًّا﴾ (۹-۲۷) یہ تم نے برا کام کیا۔

میں بعض نے کہا ہے کہ فَرِيًّا کے معنی عظیم بات کے ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ اس کے معنی عجیب بات کے ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ اس کے معنی من گھڑت اور بنائی ہوئی بات کے ہیں لیکن تال کے اعتبار سے یہ تمام اقوال ایک ہی ہیں۔

## (ف ز)

الْأَسْتَفْزَازُ ہلکا جھٹکا گھبرا دینا اور جگہ سے ہٹا دینا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَأَسْتَفْزِرُ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ﴾ (۱۷-۶۳) اور ان میں سے جس کو بہکا سکے اپنی آواز سے بہکا تا رہ۔

﴿فَارَادَ أَنْ يَسْتَفْزَهُمْ مِنَ الْأَرْضِ﴾ (۱۷-۱۰۳) تو اس نے چاہا کہ انہیں گڑ بڑا کر سرزمین (مصر) میں سے نکال دے۔

اور فَرْزَنِي قُلَانٌ کے معنی ہیں: اس نے مجھے پریشان کر کے میری جگہ سے ہٹا دیا اور گائے کے بچہ کو فَرْزُ کہا جاتا

میں فَاْرِهَيْنَ کے معنی حَاذِقَيْنَ (یعنی ماہر اور ہنرمند) کے ہیں اور قِرْوۃ کی جمع قِرْوۃ ہے یہ انسان اور دیگر حیوانات کے لیے استعمال ہوتا ہے ایک قرأت میں فَرِهَيْنَ ہے جو فَاْرِهَيْنَ کے ہم معنی ہے اور بعض نے (دونوں) کے معنی اَسِيرَيْنَ (اترانے والے) بھی کیے ہیں۔

## (ف ری)

الْفَرْيُ (ن) کے معنی چڑے کو سینے اور درست کرنے کے لیے اسے کاٹنے کے ہیں اور اَفْرَاءُ (افعال) کے معنی اسے خراب کرنے کے لیے کاٹنے کے۔

اِفْتِرَاءُ (افعال) کا لفظ اصلاح اور فساد دونوں کے لیے آتا ہے لیکن اس کا زیادہ تر استعمال افساد ہی کے معنوں میں ہوتا ہے اسی لیے قرآن پاک میں جھوٹ، شرک اور ظلم کے موقعوں پر استعمال کیا گیا ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿وَمَنْ يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدْ افْتَرَىٰ إِثْمًا عَظِيمًا﴾ (۳-۲۸) جس نے خدا کا شریک مقرر کیا اس نے بڑا

بہتان باندھا۔  
﴿أَنْظُرْ كَيْفَ يَفْتَرُونَ عَلَى اللَّهِ الْكُذِبَ﴾ (۳۰-۵۰) دیکھو یہ خدا پر کیسا جھوٹ (طوفان) باندھتے ہیں۔

اور کذب کے متعلق فرمایا:  
﴿اِفْتَرَاءَ عَلَى اللَّهِ قَدْ ضَلُّوا﴾ (۶-۱۳۰) اور خدا پر افتراء کر کے..... وہ بے شبہ گمراہ ہیں۔

﴿وَلَكِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا يَفْتَرُونَ عَلَى اللَّهِ الْكُذِبَ﴾ (۱۰۳-۱۰۵) بلکہ کافر خدا پر جھوٹ افتراء کرتے ہیں۔

﴿أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ﴾ (۱۱-۳۵) کیا یہ کہتے ہیں کہ اس (پیغمبر) نے قرآن پاک اپنے دل سے بنا لیا ہے۔

مدد مانگنے کے ہیں اور فَرْعُ اُمِّہ کے معنی مدد کرنے کے۔  
 ۱ شاعر نے کہا ہے ۲ (البیہ)

(۳۳۹) وَكُنَّا إِذَا مَا اتَّانَا صَارِحُ فَرْعُ

یعنی جب کوئی فریاد چاہنے والا گھبرا کر ہمارے پاس آتا۔  
 بعض نے فَرْعُ کے معنی مستغیث کیے ہیں تو یہ لفظ فَرْع  
 کے اصل معنی نہیں ہیں بلکہ معنی مقصود کی تشریح ہے۔

### (ف س ج)

الْفُسْحُ وَالْفَسِيحُ کے معنی وسیع جگہ کے ہیں اور  
 تَفْسِيحُ کے معنی وسیع ہونے کے۔ چنانچہ محاورہ ہے۔

فَسَّخْتُ مَجْلِسَهُ میں نے اس کے لیے محفل  
 میں جگہ کر دی تو وہ اس میں کھل کر بیٹھ گیا۔ قرآن میں  
 ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا قِيلَ لَكُمْ تَفَسَّحُوا فِي  
 الْمَجَالِسِ فَافْسَحُوا يَفْسَحِ اللَّهُ لَكُمْ﴾  
 (۵۸-۱۱) اے مومنو! جب تم سے کہا جائے کہ مجلس میں  
 کھل کر بیٹھو تو کھل کر بیٹھ جایا کرو خدا تم کو کشادگی بخشے گا۔

اسی سے فَسَّخْتُ لِفُلَانٍ أَنْ يَفْعَلَ كَذَا کا محاورہ ہے  
 جس کے معنی وَسَّعْتُ لَهُ کے ہیں هُوَ فِي فُسْحَةٍ  
 مِنْ هَذَا الْأَمْرِ وہ اس معاملہ میں آزاد ہے۔

### (ف س د)

الْفَسَادُ يَهْ فَسَدَ (ن) أَلْشَيْءُ فَهُوَ فَاسِدٌ کا

ہے کیونکہ اس میں خفت یعنی بکلی پائی جاتی ہے جس طرح  
 کہ اس میں غلٹ (جلد بازی) کا تصور کر کے اسے  
 عَجَلُ کہا جاتا ہے۔

### (ف ز ع)

الْفَزَعُ: انقباض اور وحشت کی اس حالت کو کہتے  
 ہیں جو کسی خوفناک امر کی وجہ سے انسان پر طاری ہو جاتی  
 ہے یہ جَزَعُ کی ایک قسم ہے اور خِفْتُ مِنَ اللَّهِ کا  
 محاورہ تو استعمال ہوتا ہے لیکن فَزَعْتُ مِنْهُ کہنا صحیح نہیں  
 ہے اور آیت کریمہ:

﴿لَا يَحْزَنُهُمُ الْفَزَعُ الْأَكْبَرُ﴾ (۲۱-۱۰۳) ان کو  
 (اس دن کا) بڑا بھاری غم ٹمکن نہیں کرے گا۔

میں فَزَعُ أَكْبَرُ سے دوزخ میں داخل ہونے کا خوف مراد  
 ہے۔ نیز فرمایا:

﴿فَفَزَعَ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ﴾  
 (۲۷-۸۷) اور ایسے لوگ (اس روز) گھبراہٹ سے  
 بے خوف ہوں گے۔

﴿حَتَّى إِذَا فَزِعَ عَنْ قُلُوبِهِمْ﴾ (۳۳-۳۳) یہاں  
 تک کہ جب ان کے دلوں سے اضطراب دور کر دیا جائے  
 گا۔

یعنی ان کے دلوں سے گھبراہٹ دور کر دی جائے گی فَزِعَ  
 إِلَيْهِ کے معنی گھبراہٹ کے وقت کسی سے فریاد کرنے اور

۱ ومنه قوله ﷺ للانصار: انكم تغفلون عند الطمع وتكثرون عند الفزع انظر للكلمة الكامل للمبرد ۴ واضداد ابی الطیب (۵۴۱-۵۴۴) وعده العلماء من الاضداد۔

۲ قاله سلامة بن الحنبل وتماه: ..... كان الصراخ له قرع الظنایب والبيت من قصيده مفضيلة (۱۱۷-۱۲۲) والشعراء النصرانية (۴۸۶-۴۹۰) راجع للبيت اضداد الاصمعي (۵۴) وابن السکیت (۲۰۸) واللسان (طب) واضداد ابی الطیب (۴۳۱، ۵۴۰) والسعافی للقبتي (۹۴۳) و دیوانه ۱۱ والسمط ۴۷ والمرزوقي (۱: ۱۳۰) والمیدانی (۲: ۹۳) والبحر (۵: ۴۱۴) والكامل ۴: ويشق من هذا المعنى ان يقع مفزع في معنى اغاث فاللفظ من الاضداد۔

اس کو تباہ کر دیتے ہیں۔

﴿وَإِنَّ اللَّهَ لَا يُصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِينَ﴾

(۱۰-۸۱) بے شک خدا شریروں کے کام سنوارا نہیں کرتا۔

﴿وَاللَّهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ﴾

(۲-۲۲۰) اور خدا خوب جانتا ہے کہ خرابی کرنے والا کون

ہے اور اصلاح کرنے والا کون۔

### (ف س ر)

الْفَسْرُ (ض ن) کے معنی کسی چیز کی معنوی صفت

کو ظاہر کرنے کے ہیں اسی سے ”تَفْسِيرَةٌ“ ہے۔ جس

کے معنی قارورہ کی تشخیص کے ہیں اور (مجازاً) قارورہ

(پیشاب کی بوتل) کو تفسر کہہ دیتے ہیں۔ التفسیر بھی

الفسر کے ہم معنی ہے۔ مگر اس میں مبالغہ کے معنی پائے

جاتے ہیں اور (عرف میں) تفسیر کا لفظ کبھی تو مفرد اور

غریب الفاظ کی تشریح اور وضاحت پر بولا جاتا ہے اور کبھی

خاص کر تاویل کے معنی میں استعمال ہوتا ہے یہی وجہ ہے

کہ تَأْوِيلُ الرُّوْيَا (خواب کی تعبیر) کی بجائے تَفْسِيرُ

الرُّوْيَا کا محاورہ بھی استعمال ہوتا ہے اور آیت کریمہ:

﴿وَأَحْسَنَ تَفْسِيرًا﴾ (۲۵-۳۳) اور خوب شرح۔

میں بھی تفسیر بمعنی تاویل استعمال ہوا ہے۔

### (ف س ق)

فَسَقَ فُلَانٌ کے معنی کسی شخص کے دائرہ شریعت

سے نکل جانے کے ہیں یہ فَسَقَ الرُّطْبُ کے محاورہ سے

ماخوذ ہے جس کے معنی گدڑی کھجور کے اپنے چھلکے سے باہر

نکل آنا کے ہیں (شرعاً) فسق کا مفہوم کفر سے اعم ہے

کیونکہ فسق کا لفظ چھوٹے اور بڑے ہر قسم کے گناہ کے

ارتکاب پر بولا جاتا ہے اگرچہ عرف میں بڑے گناہوں

مصدر ہے اور اس کے معنی کسی چیز کے حد اعتدال سے تجاوز

کر جانا کے ہیں۔ عام اس سے کہ وہ تجاوز کم ہو یا زیادہ یہ

اصل میں صلاح کی ضد ہے اور نفس بدن اور ہر اس چیز

کے متعلق استعمال ہوتا ہے جو حالت استقامت سے نکل

چکی ہو اور افسدہ کے معنی کسی چیز کا توازن بگاڑنے کے

ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:-

﴿لَفَسَدَتِ السَّمَوَاتُ وَالْأَرْضُ﴾ (۲۳-۷۱) تو

آسمان وزمین..... سب درہم برہم ہو جائیں۔ ﴿لَوْ

كَانَ فِيهِمَا إِلَهٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا﴾ (۲۱-۲۲) اگر

آسمان وزمین میں خدا کے سوا اور معبود ہوتے تو زمین و

آسمان درہم برہم ہو جاتے۔

﴿ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ﴾ (۳۰-۳۱)

خشکی اور تری میں لوگوں کے اعمال کے سبب فساد پھیل

گیا۔

﴿وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الْفُسَادَ﴾ (۲-۲۰۵) اور خدا فتنہ

انگیزی کو پسند نہیں کرتا۔

﴿وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ﴾

(۲-۱۱) اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد نہ

ڈالو۔

﴿أَلَا إِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُونَ﴾ (۲-۱۲) دیکھو ایہ

بلاشبہ مفسد ہیں۔

﴿لَيُفْسِدَ فِيهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ﴾

(۲-۲۰۵) تاکہ اس میں فتنہ انگیزی کرے اور کھیتی کو اور

(انسانوں اور حیوانوں کی) نسل کو نابود کر دے۔

﴿إِنَّ الْمُلُوكَ إِذَا دَخَلُوا قَرْيَةً أَفْسَدُوهَا﴾

(۲۷-۳۳) کہ بادشاہ جب کسی شہر میں داخل ہوتے ہیں تو

اور خدا نافرمان لوگوں کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔

﴿إِنَّ الْمُنَافِقِينَ هُمُ الْفَاسِقُونَ﴾ (۹-۶۷) بے

شک منافق نافرمان ہیں۔

﴿كَذَلِكَ حَقَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِينَ

فَسَقُوا﴾ (۱۰-۳۳) اسی طرح خدا کا ارشاد نافرمانوں

کے حق میں ثابت ہو کر رہا۔

﴿أَفَمَنْ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ فَاسِقًا﴾

(۱۸-۳۲) بھلا جو مومن ہو وہ اس شخص کی طرح وہ سکتا

ہے۔ جو نافرمان ہو۔

یہاں فسق کا لفظ ایمان کے مقابلہ میں استعمال ہوا ہے جس

سے معلوم ہوتا ہے فاسق کافر سے اعم ہے مگر ظالم فاسق

سے بھی عام ہے چنانچہ فرمایا۔

﴿وَالَّذِينَ يَرْمُونَ الْمُحْصَنَاتِ إِلَى قَوْلِهِ

وَأُولَئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ﴾ (۲۴-۴) اور جو لوگ

پاک دامن عورتوں پر بدکاری کا الزام لگائیں..... اور یہی

بدکار ہیں۔

اور چوہیا کو اس کی خباثت اور شرارت کی بنا پر فویسقہ کہا

جاتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اس کے بار بار اپنے بل

سے باہر نکلنے کی وجہ سے اسے فویسقہ کہتے ہیں۔

آنحضرت ﷺ کا فرمان ہے ﴿(۷۰)﴾ (أُفْتُلُوا

الْفُؤَيْسِقَةَ) فَإِنَّهَا تُؤْهِى السِّقَاءَ وَتُضْرِمُ النَّبْتِ

عَلَى أَهْلِهِ)) کہ چوہیا کو مار ڈالو کیونکہ وہ پانی کی مشک

میں سوراخ کر ڈالتی ہے اور گھروں میں آگ لگا دیتی ہے۔

ابن العربی کا قول ہے کہ فساق کا لفظ صرف قرآن کریم

نے انسانوں کے لیے استعمال کیا ہے ورنہ جاہلیت میں یہ

لفظ انسانوں کے لیے اس معنی میں نہیں بولا جاتا تھا بلکہ

کے ارتکاب پر بولا جاتا ہے اور عام طور پر فاسیق کا لفظ

اس شخص کے متعلق استعمال ہوتا ہے جو احکام شریعت کا

الزام اور اقرار کرنے کے بعد تمام یا بعض احکام کی خلاف

ورزی کرے اور کافر حقیقی پر فاسق کا لفظ اس لیے بولا جاتا

ہے کہ وہ حکم، عقل یا فطرت کی خلاف ورزی کرتا ہے۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿فَفَسَقَ عَنْ أَمْرِ رَبِّهِ﴾ (۱۸-۵۰) تو اپنے پروردگار

کے حکم سے باہر ہو گیا۔

﴿فَفَسَقُوا فِيهَا﴾ (۱۶-۱۷) تو وہ نافرمانیاں کرتے

ہیں۔ ﴿وَأَكْثَرُهُمُ الْفَاسِقُونَ﴾ (۳-۱۱) اور اکثر

نافرمان ہیں۔

﴿أَفَمَنْ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ فَاسِقًا﴾

(۱۸-۳۲) بھلا جو مومن ہے، اس شخص کی طرح ہو سکتا

ہے جو نافرمان ہے؟

﴿وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذَلِكَ فَأُولَئِكَ هُمُ

الْفَاسِقُونَ﴾ (۲۳-۵۵) اور جو اس کے بعد کفر کرے

تو ایسے لوگ بدکار ہیں۔

یعنی جو نعمت الہی کی ناشکری کرے گا وہ دائرہ طاعت سے

خارج سمجھا جائے گا۔

﴿وَأَمَّا الَّذِينَ فَسَقُوا فَمَا لَهُمُ النَّارُ﴾

(۲۰-۳۲) اور جنہوں نے نافرمانی کی ان کے رہنے کے

لیے دوزخ ہے۔

﴿وَالَّذِينَ كَذَبُوا بِالْآيَاتِ يَمْسُهُمُ الْعَذَابُ بِمَا

كَانُوا يَفْسُقُونَ﴾ (۶-۳۹) اور جنہوں نے ہماری آیتوں

کو جھٹلایا ان کی نافرمانیوں کے سبب انہیں عذاب ہوگا۔

﴿وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ﴾ (۹-۲۴)



جھاگ کے نیچے خالص دودھ ہوتا ہے۔

اور اسی سے فَصَحَ الرَّجُلُ کا محاورہ مستعار ہے جس کے معنی کسی شخص کے خوش گفتار ہونے کے ہیں اور أَفْصَحَ کے معنی خالص عربی زبان میں گفتگو کرنے کے ہیں اور بعض نے اس کے برعکس کہا ہے لیکن پہلا قول زیادہ صحیح ہے بعض نے کہا ہے کہ فَصِيحٌ نَاطِقٌ (یعنی انسان فرشتے وغیرہ) کو کہتے ہیں اور أَعْجَمِي کے معنی غیر ناطق (یعنی چوپایہ وغیرہ) کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَإِخْوَى هُرُونَ هُوَ أَفْصَحُ مِنِّي لِسَانًا﴾ (۳۲-۲۸) اور ہارون جو میرا بھائی ہے اس کی زبان مجھ سے زیادہ فصیح ہے۔

اسی سے أَفْصَحَ الصُّبْحُ کا محاورہ مستعار ہے جس کے معنی صبح کے روشن اور نمودار ہونے کے ہیں اور أَفْصَحَ النَّصَارَى معنی عیسائیوں کے ایسٹریکی عید (یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دوبارہ زندہ ہونے کا تہوار) منانے کے ہیں۔

### (ف ص ل)

الْفَصْلُ کے معنی دو چیزوں میں سے ایک کو دوسری سے اسی طرح علیحدہ کر دینے کے ہیں کہ ان کے درمیان فاصلہ ہو جائے اسی سے مَفَاصِلُ (جمع مَفْصِلٌ) ہے جس کے معنی جسم کے جوڑ کے ہیں اور فَصَلَتِ الشَّاةُ کے معنی بکری کے جوڑ کاٹ کر الگ الگ کر دینے کے ہیں۔

فَصَلَ الْقَوْمُ عَنْ مَكَانٍ كَذَا: قوم کا کسی جگہ سے روانہ ہونا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَلَمَّا فَصَلَتِ الْعِيرُ﴾ (۹۴-۱۲) اور جب قافلہ

گدڑی کھجور کے متعلق فَسَقَتِ الرُّطْبَةُ عَنْ قَشْرِهَا کا محاورہ استعمال ہوتا تھا۔

### (ف ش ل)

الْفَشْلُ: (س) کے معنی کمزوری کے ساتھ بزدلی کے ہیں قرآن پاک میں ہے:

﴿حَتَّىٰ إِذَا فُشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِي الْأَمْرِ﴾ (۱۴۲-۳) یہاں تک کہ تم نے ہمت ہار دی اور حکم (پیغمبر) میں جھگڑا کرنے لگے۔

﴿فَتَفَشِلُوا وَتَفْهَبَ رِيحُكُمْ﴾ (۶۴-۸) تو تم بزدل ہو جاؤ گے اور تمہارا اقبال جاتا رہے گا۔ ﴿لَفُشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِي الْأَمْرِ﴾ (۴۳-۸) تو تم لوگ جی چھوڑ دیتے اور (جو) معاملہ (درپیش تھا اس) میں جھگڑنے لگتے۔

تَفَشَلَ الْمَاءُ: پانی بہہ پڑا۔

### (ف ص ح)

الْفُصْحُ کے معنی کسی چیز کے ہر قسم کی امیزش سے پاک ہونے کے ہیں اصل میں اس کا استعمال دودھ کے خالص ہونے پر ہوتا ہے چنانچہ محاورہ ہے۔

فَصَحَ اللَّبَنُ وَأَفْصَحَ کے معنی دودھ کے اوپر سے جھاگ اتار کر اسے بالکل صاف کر لینے کے ہیں اور جس دودھ کے اوپر سے جھاگ اتار کر اسے بالکل صاف کر لیا جائے اسے مُفْصِحٌ يَا فَصِيحُ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ مروی ہے۔ (الوافر)

(۳۴۰) وَتَحْتَ الرِّغْوَةِ اللَّبَنُ الْفَصِيحُ

① قاله النضلة السلمی فی يوم غول واوله: ولم یخیشوا مصالته علیہم وفي رواية الصريح بدل الفصيح والبيت فی الکامل ۸۱ فی خمسة واللسان (فصح) وفي محالس ثعلب ۸ لرجل من بنی سلیم وفي البیان للمحافظ (۳۳۸:۳) لابی محسن السلمی وفي مجموعة المعانی (۱۵۵) الفضله السهمی وفيه بسالة بدل مصالته۔

(مصر سے) روانہ ہوا۔

اور یہ اقوال اور اعمال دونوں کے متعلق استعمال ہوتا ہے جیسے قرآن پاک میں ہے:-

﴿إِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ مِيقَاتُهُمْ أَجْمَعِينَ﴾ (۴۰-۳۴) کچھ شک نہیں کہ فیصلے کا دن سب کے اٹھنے کا دن ہے۔

﴿هَذَا يَوْمَ الْفَصْلِ﴾ (۷۷-۳۸) یہی فیصلے کا دن ہے۔ یعنی آج اللہ تعالیٰ حق کو باطل سے الگ کر دے گا اور لوگوں کے درمیان (انصاف سے) فیصلہ کر دیا جائے گا چنانچہ اسی معنی میں فرمایا:

يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ ..... (۱۲-۱۷) ان (سب) میں..... فیصلہ کر دے گا۔

﴿وَهُوَ خَيْرُ الْفَصْلَيْنِ﴾ (۶-۵۷) اور وہ سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔

اور فَصْلُ الْخُطَابِ (۳۸-۲۰) کے معنی فیصلہ کن بات کے ہیں اور یہی معنی حُكْمٌ فَيَصِلُ وَ لِسَانٌ مِفْصَلٌ کے ہیں۔

التَّفْصِيلُ: واضح کر دینا کھول کر بیان کر دینا چنانچہ فرمایا: ﴿وَكُلُّ شَيْءٍ فَصْلُهُ تَفْصِيلًا﴾ (۱۷-۱۲) اور ہم نے ہر چیز (بخوبی) تفصیل کر دی ہے۔

اور آیت کریمہ: ﴿الرَّ كِتَبُ أَحْكَمَتْ آيَتُهُ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَدُنْ حَكِيمٍ خَبِيرٍ﴾ (۱۱-۱) یہ وہ کتاب ہے جس کی آیتیں مستحکم ہیں اور خدائے حکیم و خبر کی طرف سے بہ تفصیل بیان کر دی گئی ہیں۔

میں آیت کریمہ:

﴿بَيِّنَاتٍ لِّكُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً﴾ (۱۶-۸۹) کہ (اس میں) ہر چیز کا بیان (مفصل) ہے

اور مسلمانوں کے لیے ہدایت اور رحمت..... ہے۔ کے مضمون کی طرف اشارہ ہے۔

فَصِيلَةُ الرَّجُلِ: آدمی کا خاندان جو اس سے الگ ہوتا ہے جیسے اولاد وغیرہ۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَفَصِيلَتِهِ الَّتِي تُؤْوِيهِ﴾ (۷۰-۱۳) اور اپنا خاندان جس میں وہ رہتا تھا۔

الْفَصَالُ کے معنی بچے کا دودھ چھڑانا کے ہیں قرآن پاک میں ہے:

﴿فَإِنْ أَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِنْهُمَا﴾ (۲-۲۳۳) اور اگر دونوں (یعنی ماں باپ) آپس کی رضا مندی..... سے بچے کا دودھ چھڑانا چاہیں۔

﴿وَفَصْلُهُ فِي عَامَيْنِ﴾ (اور (آخر کار) دو برس میں اس کا دودھ چھڑانا ہوتا ہے۔

اسی سے الْفَصِيلُ (یعنی دودھ چھڑایا ہوا بچہ) ہے لیکن یہ خاص کراؤٹ کے بچہ پر بولا جاتا ہے۔ الْفَصْلُ قرآن پاک کی آخری منزل کو کہا جاتا ہے اس لیے کہ اس میں چھوٹی چھوٹی سورتوں میں تمام قصے الگ الگ بیان کیے گئے ہیں۔ الْفَوَاصِلُ: اواخر آیات۔

اور فَوَاصِلُ الْقِلَادَةِ: ان بڑے موتیوں کو کہا جاتا ہے جو ہار کے اندر چھوٹے موتیوں کے درمیان فاصلہ کے لیے ڈال دیے جاتے ہیں۔ حدیث میں ہے۔ ① (۷۱)

① انظر للحديث الصحيح للحوثری (فصل) وفي (حم) ع والشاشی) من عبادة بن الجراح رضى الله عنه فاضلة بالضا و المعجمة انظر كثر العمال (۶: رقم ۲۳۹۸)۔

حیوانات سے برتر ہونا جیسے فرمایا:

﴿وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ..... وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَى كَثِيرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلًا﴾ (۷۰-۷۱) اور ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی..... اور اپنی بہت سی مخلوق پر فضیلت دی۔

(۳) فضیلت بلحاظ ذات مثلاً ایک شخص کا دوسرے سے شخص سے برتر ہونا اول الذکر دونوں قسم کی بلحاظ جوہر ہوتی ہے۔ جن میں ادنیٰ ترقی کر کے اپنے سے اعلیٰ کے درجہ کو حاصل نہیں کر سکتا۔ مثلاً گھوڑا اور گدھا کہ یہ دونوں انسان کا درجہ حاصل نہیں کر سکتے۔ البتہ تیسری قسم کی فضیلت من حیث الذات چونکہ کبھی عارضی ہوتی ہے اس لیے اس کا کتاب عین ممکن ہے چنانچہ آیات کریمہ:

﴿وَاللَّهُ فَضَّلَ بَعْضُكُمْ عَلَى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ﴾ (۱۶-۷۱) اور خدا نے رزق (دولت) میں بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔

﴿لَتَتَّبِعُوا أَفْضَلَ مِّنْ رَبِّكُمْ﴾ (۱۷-۱۲) تاکہ تم اپنے پروردگار کا فضل (یعنی روزی) تلاش کرو۔ میں یہی تیسری قسم کی فضیلت مراد ہے جسے محنت اور سعی سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿بِمَا فَضَّلَ اللَّهُ بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ﴾ (۳۴-۳۳) اس لیے کہ خدا نے بعض کو بعض سے افضل بنایا ہے، میں انسان کے ان ذاتی امتیازات کی طرف اشارہ ہے جس کے ساتھ اسے خاص طور پر نوازا جاتا ہے مثلاً مال و جاہ عزت اور قوت وغیرہ نیز فرمایا:

﴿وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيِّنَ عَلَى بَعْضٍ﴾ (۱۷-۵۵) اور ہم نے بعض پیغمبروں کو بعض پر فضیلت

((مَنْ أَنْفَقَ نَفَقَةً فَاِصْلَةً فَلَهُ مِنَ الْآجْرِ كَذَا)) یعنی جس نے اتنا زیادہ خرچ کیا جس سے حق و باطل کے درمیان فاصلہ ہو جائے تو اس کے لیے اتنا اور اتنا اجر ہے۔

## (ف ض ض)

الْفَضُّ کے معنی کسی چیز کو توڑنے اور ریزہ ریزہ کرنے کے ہیں جیسے، فَضَّ خَتَمَ الْكِتَابِ: خط کی مہر کو توڑنا۔ اسی سے أَنْفَضَ الْقَوْمُ کا محاورہ مستعار ہے جس کے معنی تفرق اور منتشر ہو جانے کے ہیں قرآن پاک میں ہے:

﴿وَإِذَا رَأَوْا تِجَارَةً أَوْ لَهْوًا أَنْفَضُوا إِلَيْهَا﴾ (۶۲-۱۱) اور جب یہ لوگ سودا بکنا یا تماشا ہوتا دیکھتے ہیں تو ادھر بھاگ جاتے ہیں۔

﴿لَا تَنْفَضُوا مِنْ حَوْلِكَ﴾ (۳-۱۵۹) تو یہ تمہارے پاس سے بھاگ کھڑے ہوتے۔

﴿الْفِضَّةُ﴾ (۳-۱۳) چاندی یعنی وہ ادنیٰ جوہر جس کے ذریعہ لین دین کیا جاتا ہے۔

دِرْعٌ فَضْفَاضَةٌ وَفَضْفَاضٌ: فراخ زرہ۔

## (ف ض ل)

الْفَضْلُ کے معنی کسی چیز کے اقتصاد (متوسط درجہ) سے زیادہ ہونا کے ہیں اور یہ دو قسم پر ہے (۱) محمود جیسے علم و حلم وغیرہ کی زیادتی (۲) مذموم جیسے غصہ کا حد سے بڑھ جانا۔ لیکن عام طوراً الْفَضْلُ اچھی باتوں پر بولا جاتا ہے۔ اور الْفُضُولُ بری باتوں میں اور جب فضل کے معنی ایک چیز کے دوسری پر زیادتی کے ہوتے ہیں تو اس کی تین صورتیں ہو سکتی ہیں (۱) برتری بلحاظ جنس کے، جیسے جنس حیوان کا جنس نباتات سے افضل ہونا۔

(۲) برتری بلحاظ نوع کے، جیسے نوع انسان کا دوسرے

بَنَشَى ﴿فَضَّلَ اللَّهُ الْمُجَاهِدِينَ عَلَى الْفَاعِلِينَ﴾ (۳۲۱) طَعَامُهُمْ فَوْضَى فَضَا فِي

رَحْلِهِمْ

ان کے گھروں میں طعام منتشر اور بکھرا پڑا ہے۔

### (ف ط ر)

الْفَطْرُ: (ن ض) اس کے اصل معنی کسی چیز کو (پہلی

مرتبہ) طول میں پھاڑنے کے ہیں چنانچہ محاورہ ہے: فَطَرَ فُلَانٌ كَذَا فَطَرًا کسی چیز کو پھاڑ ڈالنا۔ اَفْطَرَ هُوَ فُطُورًا: روزہ افطار کرنا: اِنْفَطَرَ اِنْفِطَارًا: پھٹ جانا اور آیت کریمہ۔

﴿هَلْ تَرَى مِنْ فُطُورٍ﴾ (۳-۳۷) بھلا تجھ کو کوئی

شگاف نظر آتا ہے۔

میں فُطُور کے معنی خلل اور شگاف کے ہیں اور یہ پھاڑنا کبھی کسی چیز کو بگاڑنے اور کبھی مٹی بر مصلحت ہوتا ہے چنانچہ فرمایا:

﴿السَّمَاءُ مُنْفَطِرٌ بِهِ كَانَ وَعْدُهُ مَفْعُولًا﴾

(۱۸-۷۳) اور جس سے آسمان پھٹ جائے گا، یہ اس کا وعدہ (پورا) ہو کر رہے گا۔

فَطَرْتُ الشَّاةَ: میں نے بکری کو دودھ لگیوں سے دوہا۔ فَطَرْتُ الْعَجِينَ: آٹا گوندھ کر فوراً روٹی پکانا۔ اسی سے فطرہ ہے جس کے معنی تخلیق کے ہیں اور فَطَرَ اللَّهُ الْخَلْقَ کے معنی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کی تخلیق اس طرح کی ہے کہ اس میں کچھ کرنے کی استعداد موجود ہے پس آیت کریمہ:

بَنَشَى ﴿فَضَّلَ اللَّهُ الْمُجَاهِدِينَ عَلَى الْفَاعِلِينَ﴾

(۹۳-۴) خدا نے..... جہاد کرنے والوں کو بیٹھ رہنے والوں پر کہیں زیادہ فضیلت بخشی ہے۔

اور ہر اس عطیہ کو جو دینے والے پر لازم نہیں ہوتا وہ فضل کہلاتا ہے جیسے فرمایا:

﴿وَسَأَلُوا اللَّهَ مِنْ فَضْلِهِ﴾ (۳۲-۴) اور خدا سے اس کا فضل (و کرم) مانگتے رہو۔

﴿ذَلِكَ فَضْلُ اللَّهِ﴾ (۵۴-۵) یہ خدا کا فضل ہے۔

﴿ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ﴾ (۷۳-۳) بڑے فضل کا مالک ہے۔ اور اسی معنی میں فرمایا۔

﴿قُلْ بِفَضْلِ اللَّهِ﴾ (۵۸-۱۰) کہہ دو کہ (یہ کتاب) خدا کے فضل سے۔

﴿وَلَوْ لَا فَضْلُ اللَّهِ﴾ (۸۳-۴) اور اگر..... خدا کا فضل نہ ہوتا۔

### (ف ض ی)

الْفَضَاءُ کے معنی وسیع جگہ کے ہیں اور اسی سے اَفْضَى بَيْدِهِ اِلَى كَذَا کا محاورہ ہے جس کے معنی کسی جگہ پر ہاتھ پہنچ جانے کے ہیں اور اَفْضَى اِلَى امْرَأَةٍ: عورت سے جماع کرنے سے کنایہ ہوتا ہے اور یہ خَلَا بَهَا کے محاورہ سے زیادہ صریح ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَقَدْ اَفْضَى بَعْضُكُمْ اِلَى بَعْضٍ﴾ (۲۱-۴) تم ایک دوسرے کے ساتھ محبت کر چکے ہو۔

شاعر نے کہا ہے: ﴿الطَّوِيلِ﴾

① قاله المعذل بن عبد الله البكري احد بنى قيس بن ثعلبة (المعجم للمريزباني (۳۸۸) والشعراء (۸۳/۲۹) يمدح العتيك رهط نهس بن ربيعة العتيكى فى خمسة ابيات وعجزه اولا يحسنون السرالاتنا ديا وفى اللسان (فضاء فوض) ولا يحسبون السوء..... والبيت فى الحماسة بشرح المرزوقى رقم ۷۹۱ فى خمسة وابن واد ۹۵۔

## (ف ظ ظ)

اَلْفُظُّ کے معنی بد مزاج کے ہیں اور یہ اس فظ سے مستعار ہے جس کے معنی اونٹ کے اوجھر میں جمع رہنے والا پانی کے ہیں جو سخت ضرورت کے وقت بادل خواستہ پیا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا عَلِيْظَ الْقَلْبِ﴾ (۳-۱۵۸) اور اگر تم بد خو اور سخت دل ہوتے۔

## (ف ع ل)

اَلْفِعْلُ کے معنی کسی اثر انداز کی طرف سے اثر اندازی کے ہیں۔ عام اس سے کہ وہ تاثیر عہدگی کے ساتھ ہو یا بغیر عہدگی کے ہو اور علم سے ہو یا بغیر علم کے قصداً کی جائے یا بغیر قصد کے پھر وہ تاثیر انسان کی طرف سے ہو یا دوسرے حیوانات اور جمادات کی طرف سے ہو۔ یہی معنی لفظ عمل کے ہیں۔ مگر لفظ صُنْع ان دونوں سے انحصار ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:-

﴿وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ يَعْلَمُهُ اللّٰهُ﴾ (۲-۱۹۷) اور جو نیک کام تم کرو گے خدا کو معلوم ہو جائے گا۔ ﴿وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ عُدُوْنَا وَظُلْمًا﴾ (۴-۳۰) اور جو تعدی و ظلم سے ایسا کرے گا۔

﴿يَا أَيُّهَا الرُّسُلُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ وَإِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ﴾ (۵-۶۷) اے پیغمبر جو ارشادات خدا کی طرف سے تم پر نازل ہوئے ہیں سب لوگوں کو پہنچا دو اور اگر ایسا نہ کیا تو تم خدا کے پیغام پہنچانے میں قاصر رہے۔ یعنی اگر تم نے یہ حکم نہ پہنچایا تو گویا تم نے تبلیغ کی ہی نہیں۔

﴿فَطَرَهُ اللّٰهُ اَلَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا﴾ (۲۰-۱۰) اور خدا کی فطرت کو، جس پر لوگوں کو پیدا کیا (اختیار کیے) رہو۔

میں اس مغفرت الہی کی طرف اشارہ ہے جو تخلیقی طور پر انسان کے اندر ودیعت کی گئی ہے لہذا فطرۃ اللہ سے معرفت الہی کی استعداد مراد ہے۔ جو انسان کی جبلت میں پائی جاتی ہے۔ چنانچہ آیت: ﴿وَلَكِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَهُمْ لَيَقُولُنَّ اللّٰهُ﴾ (۲۳-۸۷) اور اگر تم ان سے پوچھو کہ ان کو کس نے پیدا کیا تو بول انھیں گے کہ خدا نے۔

میں اسی قوت معرفت کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے۔ ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ (۳۵-۱) سب تعریف خدا ہی کو سزاوار ہے جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے۔

﴿اَلَّذِيْ فَطَرَهُنَّ﴾ (۲۱-۵۶) جس نے ان کو پیدا کیا ہے۔ اور آیت کریمہ: ﴿اَلْسَّمَآءُ مُنْفَطِرٌ بِهٖ﴾ (۴۳-۱۸) اور جس سے آسمان پھٹ جائے۔

میں ہو سکتا ہے کہ انظار سے اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پر فیضان ہوگا۔ وہ اسے قبول کر لے گا۔

الفطر: روزہ انظار کرنا۔ کہا جاتا ہے۔ فَطَرْتُهُ وَافْطَرْتُهُ وَافْطَرَهُوْ: یعنی لازم اور متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے اور كَمَآءُ (کھمبی) کو فَطَرٌ کہا جاتا ہے کیونکہ وہ زمین کو پھاڑ کر باہر نکلتی ہے۔

پہچان لینے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَتَفَقَّدَ الطَّيْرَ﴾ (۲-۳۷) انہوں نے جانوروں کا

جانزہ لیا۔

اور فَاقِدُ اس عورت کو کہا جاتا ہے جس کا لڑکا یا خاوند فوت

ہو گیا ہو۔

## (ف ق ر)

الْفَقْرُ: کالفظ چار طرح پر استعمال ہوتا ہے۔

(۲) زندگی کی بنیادی ضروریات کا نہ پایا جانا۔ اس اعتبار

سے انسان کیا کائنات کی ہر شے فقیر (محتاج) ہے۔ چنانچہ

اس معنی میں فرمایا:

﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ أَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ إِلَى اللَّهِ﴾

(۱۵-۳۵) لوگو! تم سب خدا کے محتاج ہو۔

اور الانسان میں اسی قسم کے احتیاج کی طرف اشارہ کرتے

ہوئے فرمایا:

﴿وَمَا جَعَلْنَاهُمْ جَسَدًا لَا يَأْكُلُونَ الطَّعَامَ﴾

(۸-۲۱) اور ہم نے ان کے ایسے جسم نہیں بنائے تھے کہ

کھانا نہ کھائیں۔

(۲) ضروریات زندگی کا کما حقہ پورا نہ ہونا۔ چنانچہ اس

معنی میں فرمایا:

﴿لِلْفُقَرَاءِ الَّذِينَ أُحْصِرُوا..... مِنْ

التَّعَفُّفِ﴾ (۲-۳۷) تو ان حاجت مندوں کے لیے

جو خدا کے راہ میں رکے بیٹھے ہیں۔

﴿إِنْ يَكُونُوا فُقَرَاءَ يُغْنِهِمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ﴾

(۳۲-۲۴) اگر وہ مفلس ہو گئے تو خدا ان کو اپنے فضل

سے خوشحال کر دے گا۔

﴿إِنَّمَا الصَّدَقَتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسْكِينِ﴾

اور جس پر فاعل اپنا فعل کرتا ہے اسے منفعل اور مفعول کہا جاتا ہے۔

بعض نے مفعول اور منفعل میں یہ فرق کیا ہے کہ فاعل کے

فعل کے اعتبار سے اسے مفعول کہا جاتا ہے اور فعل کا

اثر..... قبول کر لینے کے لحاظ سے اسے منفعل کہا جاتا ہے

پس مفعول منفعل سے اعم ہے کیونکہ منفعل تو اس اثر کو بھی

کہا جاتا ہے جو فاعل سے صادر تو ہو مگر اس نے اس کے

ایجاد کا ارادہ نہ کیا ہو جیسے خجالت کی سرخی جو کسی انسان کو

دیکھ کر عارض ہو جاتی ہے اور طرب جو رقص و سرود کے سننے

سے حاصل ہوتا ہے یا عاشق اپنے معشوق کو دیکھ کر بلا

اختیار و جد میں آ جاتا ہے۔ اس اعتبار سے ہر فعل کو انفعال

کہہ سکتے ہیں۔ بجز ابداع کے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی جانب

منسوب ہوتا ہے کیونکہ ابداع کے معنی عدم سے وجود میں

لانے کے ہیں اور یہ کسی جوہر یا عرض پر عمل کا نام نہیں ہے

بلکہ جوہر کو وجود میں لانے کا نام ہے۔

## (ف ق د)

الْفَقْدُ کے معنی ہیں کسی چیز کے وجود کے بعد اس کا

نہ پایا جانا..... اور یہ عَدَم سے اخص ہے کیونکہ عَدَم

فَقْد کو بھی کہتے ہیں۔ اور کسی چیز کے سرے سے موجود نہ

ہونے کو بھی قرآن پاک میں ہے۔

﴿مَاذَا تَفْقِدُونَ - قَالُوا نَفَقْدُ صَوَاعَ الْمَلِكِ﴾

(۱۲-۷۲) تمہاری کیا چیز کھوئی گئی ہیں؟ وہ بولے کہ

بادشاہ کے پانی پینے کا گلاس کھو یا گیا۔ اور تَفَقَّد کے معنی

تعہد یعنی کسی چیز کی دیکھ بھال کرنے کے ہیں لیکن اصل

میں تَفَقَّد کے معنی کسی چیز کے گم ہونے کو معلوم کر لینے

کے ہیں اور تَعَهَّد کے معنی عہد حتم (پرانی ملاقات) کو

﴿رَبِّ إِنِّي لِمَا أَنزَلْتَ إِلَيَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيرٌ﴾

(۲۸-۲۴) کہ پروردگار میں اس کا محتاج ہوں کہ تو مجھ پر اپنی نعمت نازل فرمائے۔

اس معنی میں شاعر نے کہا ہے ⑤ ( )

(۳۴۲) وَيُعْجِبُنِي فَقْرِي إِلَيْكَ وَلَمْ يَكُنْ

لِيُعْجِبَنِي لَوْ لَا مُحِبَّتُكَ الْفَقْرُ

(مجھے تمہارا محتاج رہنا اچھا لگتا ہے اگر تمہاری محبت نہ ہوتی تو یہ بھلا معلوم نہ ہوتا)

اور اس معنی میں اِفْتَقَرُ فَهُوَ مُفْتَقِرٌ وَفَقِيرٌ استعمال ہوتا ہے اور فَقَرٌ كَالْفَقْرِ اگرچہ قیاس کے مطابق ہے۔ لیکن لغت

میں مستعمل نہیں ہوتا۔ اَلْفَقِيرُ دراصل اس شخص کو کہتے ہیں جس کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹی ہوئی ہو۔ چنانچہ محاورہ ہے:

فَقَرَّتْهُ فَاقِرَةٌ: یعنی مصیبت نے اس کی کمر توڑ دی اَفْقَرَكَ

الصَّيْدُ فَلَرَمِهِ: یعنی شکار نے تجھے اپنی کمر پر قدرت دی ہے لہذا تیرا ریمے بعض نے کہا ہے کہ یہ افقر سے ہے جس

کے معنی حُفْرَةٌ یعنی گڑھے کے ہیں اور اسی سے فقیر ہر اس گڑھے کو کہتے ہیں جس میں بارش کا پانی جمع ہو جاتا ہے۔

فَقَرْتُ لِلْفَقِيرِ: میں نے پودا لگانے کے لیے گڑھا کھودا شاعر نے کہا ہے ⑥ (الرجز)

(۹-۶۰) صدقات (یعنی زکوٰۃ و خیرات) تو مفلسوں اور محتاجوں کا حق ہے۔

(۳) فَقَرُ النَّفْسِ: یعنی مال کی ہوس۔ چنانچہ فقر کے اس معنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آنحضرت ﷺ نے فرمایا ⑦ (۷۲)

كَادَ الْفَقْرُ أَنْ يَكُونَ كُفْرًا: کچھ تعجب نہیں کہ فقر کفر کی حد تک پہنچا دے اس کے بالمقابل غنی کے معنی کی طرف

اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: اَلْغِنَى غِنَى النَّفْسِ کہ غنا تو نفس کی بے نیازی کا نام ہے۔ اور اسی معنی میں حکماء نے

کہا ہے۔

مَنْ عَدِمَ الْمَتَاعَةَ لَمْ يُقْضِهِ الْمَالُ: غنی جو شخص قناعت کی دولت سے محروم ہوا اسے مال داری کچھ فائدہ

نہیں دیتی۔

(۴) اللہ تعالیٰ کی طرف احتیاج جس کی طرف آنحضرت نے اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ⑧ (۷۳)

((اَللّٰهُمَّ اَغْنِنِيْ بِاِلَافٍ فَقَارٍ اِلَيْكَ وَلَا تُفْقِرْنِيْ بِاِلَافٍ سِتْغْنَاءٍ عَنْكَ)) (اے اللہ۔ مجھے اپنا محتاج بنا کر

غنی کر اور اپنی ذات سے بے نیاز کر کے فقیر نہ بنا) اس معنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

① أخرجه أبو مسلم الكشي في سننه والبيهقي في الشعب من رواية يزيد الرقاشي عن أنس مرفوعاً ويزيد ضعيف و تمام الحديث وكاد الحسد يغلب القدر رواه ابن عدى في الكامل ورواه والطبراني في الاوسط بلفظ وكادت الحاجة ان يكون كفرا وفيه ايضا ضعف نعم ورد في النسائي عن ابي سعيد الخدري انه صلى الله عليه وسلم كان يقول ((اللهم اني اعوذ بك من الكفر والفقر)) الحديث راجع تخريج العراقي على الاحياء (۱/۲۳۴) و (۳/۷۸) والمقاصد للسخاوي رقم (۷۸۹)۔

② متفق عليه من حديث ابي هريرة واللدليمي بلا سند رفعه عن انس ((الغنى غنى النفس والفقر فقر النفس)) ورواه العسكري من حديث ابي ذر ولكن فيه القلب بدل النفس وفي معناه اشعار ليعقوب الكندي نقل السخاوي في المقاصد رقم (۷۳۲)۔

③ لم اجد المراجع ۱۲۔

④ قاله الراجز وابعد: مجنونة تودي بروح الانسان وفي الفائق (۲: ۱۴۳) يعقل الانسان والرجز في اللسان والصاح

الرَّجُلُ فَقَاهَةً: فقیہ بن جانا۔ فقہ فقہا وفقہہ: کسی چیز کو سمجھ لینا۔

تَفَقَّهَ: علم فقہ حاصل کر کے اس میں تخصیص حاصل کر لینا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿لِيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ﴾ (۹-۱۲) تاکہ دین (کا علم سیکھتے اور اس میں سمجھ پیدا کرتے۔

### (ف ک ک)

أَلْفَكُ: اس کے اصل معنی جدا کر دینے کے ہیں جیسے۔ فَكُ الرَّهْنِ گروی چیز کو چھڑانا ﴿فَكَ الرَّقَبَةَ﴾ گردن کا آزاد کرنا۔ اور آیت کریمہ:

﴿فَكَ رَقَبَةً﴾ (۹۰-۱۳) کسی کی گردن کا چھڑانا۔

میں بعض نے کہا ہے کہ غلام کو آزاد کرانا مراد ہے اور بعض نے کہا ہے کہ کلمات طیبہ اور اعمال صالحہ کے ذریعہ انسان کا اپنے آپ اور دوسروں کو عذاب الہی سے آزاد کرانا مراد ہے۔ لیکن دوسروں کو جہی آزاد کر سکتا ہے جب پہلے اپنے آپ کو رہا کروالے ورنہ جو شخص خود ہدایت یافتہ نہیں ہے وہ دوسروں کو کب ہدایت کر سکتا ہے جیسا کہ ہم اپنی کتاب "مکارم الشریعہ" میں اس کی وضاحت کر چکے ہیں۔

أَلْفَلَكَ کے معنی کمزوری کی وجہ سے شانہ کے اپنی جگہ سے ہٹ جانے کے ہیں۔ اور دونوں جبرؤں کے ملنے کی جگہ کو فَكَّان کہا جاتا ہے اور آیت کریمہ ﴿لَمْ يَكُنِ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ وَالْمُشْرِكِينَ مُنْفَكِّينَ﴾ (۹۸-۱) جو لوگ کافر ہیں (یعنی) اہل کتاب اور مشرک وہ کفر سے باز آنے والے نہ تھے۔

میں مُنْفَكِّينَ کے معنی یہ ہیں کہ اَلْبَيِّنَہ کے آنے تک ان میں اختلاف نہیں تھا بلکہ سب گمراہی پر متفق تھے۔ جیسے

(۳۴۳) مَا لَيْلَةُ الْفَقِيرِ إِلَّا شَيْطَانٌ

کہ فقیر میں رات بھی شیطان کی مثل ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ یہاں الفقیر ایک کنویں کا نام ہے۔ فَقَرْتُ الْحَرَزَ: میں نے منکوں میں سوراخ کیا أَفْقَرْتُ الْبَعِيرَ: اونٹ کی ناک چھید کر اس میں مہارڈالنا۔

### (ف ق ع)

أَصْفَرُ فَاقِعٌ کے معنی گہرے زرد رنگ کے ہیں اور یہ اصفر کی تاکید ہے جس طرح أَسْوَدُ حَالِكٌ میں حَالِكٌ کا لفظ أَسْوَدُ کی تاکید بن کر استعمال ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿صَفَرَاءُ فَاقِعٌ﴾ (۲-۷۰) گہرا زرد رنگ۔

فَقَعَ: ایک قسم کی کھسی ہے جس کے ساتھ ذلیل آدمی کو تشبیہ دے کر کہا جاتا ہے۔ هُوَ أَذَلُّ مِنْ فَقْعٍ بِقَاعٍ: وہ جنگل کی کھسی سے بھی زیادہ ذلیل ہے۔ خَلِيلٌ نے کہا ہے کہ شراب کو فَقَّاعِ اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس پر جھاگ ابھر آتی ہے۔ اور تشبیہ کے طور پر پانی کے بلبلے کو بھی فَقَاقِيعُ الْمَاءِ بولتے ہیں۔

### (ف ق ه)

أَلْفَفَهُ کے معنی علم حاضر سے علم غائب تک پہنچنے کے ہیں اور یہ علم سے اخص ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَمَا لَ هُوَ لَا إِعْقَابَ الْقَوْمِ لَا يَكَادُونُ يَفْقَهُونَ حَدِيثًا﴾ (۴-۷۸) ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ بات بھی نہیں سمجھ سکتے۔

﴿وَلَكِنْ لَا تَفْقَهُونَ﴾ (۱۷-۳۴) لیکن تم..... نہیں سمجھتے۔

عِلْمُ الْفَقْه: احکام شریعت جاننے کا نام ہے۔ فَقَّهَ (فقر) وعجزه: نمودی قریح الاستساک۔ (فقر) والظمان ۲۴۸



فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ ﴿٣٠﴾ (۲۱-۳۰) جو لوگ غور کرتے ہیں ان کے لیے ان باتوں میں (بہت سی) نشانیاں ہیں۔

﴿يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمُ الْآيَاتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُونَ﴾ (۲-۲۱۹، ۲۲۰) تاکہ تم سوچو (یعنی) دنیا اور آخرت (کی باتوں) میں۔

رَجُلٌ فَكِيرٌ: (بہت زیادہ غور و فکر کرنے والا) بعض ادباء کا خیال ہے کہ لفظ فکّر دراصل فَرَكْتُ سے مقلوب ہے لیکن فکر کا لفظ معانی کے متعلق استعمال ہوتا ہے جس کے معنی معاملہ کی تہ تک پہنچنے کے لیے اس کے بارے میں چھان بین کرنے کے ہیں۔

### (ف ک ہ)

الْفَاكِهَةُ: بعض نے کہا ہے کہ فَاكِهَةٌ کا لفظ ہر قسم کے میوہ جات پر بولا جاتا ہے اور بعض نے کہا ہے کہ انگور اور انار کے علاوہ باقی میوہ جات کو فَاكِهَةٌ کہا جاتا ہے۔ اور انہوں نے ان دونوں کو اس لیے مستثنیٰ کیا ہے کہ (قرآن پاک میں) ان دونوں کو فَاكِهٌ پر عطف کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ فَاكِهٌ کے غیر ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَفَاكِهَةً مِّمَّا يَتَخَيَّرُونَ﴾ (۵۶-۲۰) اور میوے جس طرح کے ان کو پسند ہوں۔

﴿وَفَاكِهَةً كَثِيرَةً﴾ (۵۶-۲۰) اور میوہ ہائے کثیرہ (کے

دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً﴾ (۲-۲۱۳) (پہلے تو سب) لوگوں کا ایک ہی مذہب تھا۔ مَا أَنْفَكُ يَفْعَلُ كَذَا: وہ برابر ایسے کرتا رہا۔

### (ف ک ر)

الْفَيْحْرَةُ: اس قوت کو کہتے ہیں جو علم کو معلوم کی طرف لے جاتی ہے اور تَفَكَّرُ کے معنی نظر عقل کے مطابق اس قوت کو جولانی دینے کے ہیں۔ اور غور و فکر کی استعداد صرف انسان کو دی گئی ہے دوسرے حیوانات اس سے محروم ہیں اور تَفَكَّرَ فِيهِ کا لفظ صرف اسی چیز کے متعلق بولا جاتا ہے جس کا تصور دل (ذہن) میں حاصل ہو سکتا ہو اسی لیے مروی ۵ ہے (۷۴) ((تَفَكَّرُوا فِي آلاءِ اللَّهِ وَلَا تَفَكَّرُوا فِي اللَّهِ)) کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور قدرتوں پر تو غور کیا کرو لیکن خدا کی ذات میں کبھی غور نہ کرو (کہ وہ کیسی ہے) کیونکہ اس کا تصور انسانی ذہن میں نہیں آ سکتا اور وہ صورت کے ساتھ متصف ہونے سے منزہ ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿أَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوا فِي أَنْفُسِهِمْ مَا خَلَقَ اللَّهُ السَّمَوَاتِ﴾ (۳۰-۸) کیا انہوں نے اپنے دل میں غور نہیں کیا کہ خدا نے آسمانوں کو..... پیدا کیا ہے۔ ﴿أَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوا سَكَنَ مَا بِصَاحِبِهِمْ مِنْ جَنَّةٍ ط﴾ (۷۴-۸۴) کیا انہوں نے غور نہیں کیا کہ ان کے رفیق (محمد ﷺ) کو کسی طرح کا بھی جنون نہیں ہے۔ ﴿إِنَّ

① الحديث في اللسان (الا) و (ابو الشيخ طس عدهب عن ابن عمر وفيه الفزازع بن نافع متروك وقد مرفي ال ه) وفي رواية عن ابن عباس: ((تفكر وافي خلق الله ولا تفكر وافي الله فانكم لا تقدرون قدره)) رواه في الحلية باسناد ضعيف والا صهباني في الترغيب والترهيب منه وجه آخر اصح من وفي ابن ابى شيبه في كل شيء بدل في آلاء الله قال السخاوي في المقاصد رقم (۳۴۲) او اسانيد هاضعيفة لشكن اجتماعهما يكتسب قوة والمعنى صحيح (راجع ايضا تخريج العراقى

باغوں) میں۔ (کیونکہ وہ زمین کو پھاڑتا لیے فَلَاحٌ گسان کو کہتے ہیں۔)

﴿وَفَاكِهَةً وَأَبًّا﴾ (۳۱-۸۱) اور میوے اور چارہ۔

﴿فَوَاكِهَ وَهُم مَّكْرُمُونَ﴾ (۳۷-۴۲) (یعنی)

میوے اور ان کا اعزاز کیا جائے گا۔

﴿وَفَوَاكِهَ مِمَّا يَشْتَهُونَ﴾ (۷۷-۴۲) اور میووں

میں جو ان کو مرغوب ہوں۔

أَلْفَاكَاهَةٌ: خوش طبعی کی باتیں، خوش گئی۔

اور آیت کریمہ:

﴿فَطَلْتُمْ تَفَكَّهُونَ﴾ (۵۶-۶۵) اور تم باتیں بناتے

رہ جاؤ گے۔

میں بعض نے تَفَكَّهُونَ کے معنی خوش طبعی کی باتیں بنانا

لکھے ہیں اور بعض نے فروٹ تناول کرنا۔

اسی طرح آیت کریمہ:

﴿فَاكِهَيْنَ بِمَا آتَاهُم رَّبُّهُنَّ﴾ (۵۲-۱۸) جو کچھ ان

کے پروردگار نے ان کو بخشا اس کی وجہ سے خوش

حال.....

میں فَاكِهَيْنَ کی تفسیر میں بھی دونوں قول منقول ہیں۔

## (ف ل ح)

أَلْفَلَحُ کے معنی پھاڑنا کے ہیں مثل مشہور ہے

أَلْحَدِيدُ بِالْحَدِيدِ يُفْلَحُ: لوہا لوہے کو کاٹتا ہے اس

علی الاحیاء (۴: ۴۳۴)۔

① واولہ: حتی تری جماعاً تطرح وهو فی الصحاح والتاج (فلح) والقرطبی (۱۵۸/۱) وقد ذهب مثلاً انظر الميداني رقم (۱۳) والفرائد (۱۸/۱) وشرح المعلقات لابن التبری (۱۸۱) وفيه اوله: قد علمت خيلك اين الصحيح ولم اراحد انسبه۔ قاله عبيد بن

الابرص في قصيدة من الهجر والبسيط في ۴۸ بيتا وكثير منها جاء على مغلغ وكثير منها مختلفة الوزن والشاعر لايحسن القريض قال فيه المعري: وقد يخطئ الرأي امرؤ وهو حازم۔ كما اختل في وزن القريض عبيد۔ والبيت في الجمهرة ۱۷۴ والشعر والشعراء ل

(۲۲۶: ۱) والغريب للقيتي (۳۹) ومجاز القرآن (۳۰: ۱) والقرطبی (۱۵۸: ۱) والطبری (۱۰۸: ۱) واللسان والمحكم (فلح) وفيها بالنون بدل بالضعف وابن خالويه في اعرابه (۱۰۰) والحيوان (۸۹: ۳) في خمسة ابيات وفي رواية فقد يبلغ بدل يدرك ۱۲۔

② رواه الشيخان عن انس وفي الباب عن سهل وقد مر

لیے مقدر کی گئی ہے۔

## (فلق)

الْفَلَقُ (ض) کے معنی کسی چیز کو بھاڑنے اور اس کے ایک ٹکڑے کو دوسرے سے الگ کرنے کے ہیں۔  
محاورہ ہے۔

فَلَقْتُهُ میں اسے بھاڑ دیا فَأَنْفَلَقَ چنانچہ وہ چیز پھٹ گئی۔  
قرآن پاک میں ہے:

فَالِقُ الْإِصْبَاحِ: (۶-۹۶) وہی رات کے اندھرے (سے) صبح کی روشنی بھاڑ نکالتا ہے۔  
﴿إِنَّ اللَّهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوَى﴾ (۶-۹۵) بے شک خدا ہی دانے اور گٹھلی کو بھاڑ کر ان سے درخت وغیرہ اگاتا ہے۔

﴿فَأَنْفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيمِ﴾  
(۲۶-۶۳) تو دریا پھٹ گیا اور ہر ایک ٹکڑا یوں ہو گیا گویا بڑا پہاڑ ہے۔

اور دو ٹیلوں کے درمیان پست جگہ کو بھی فلق کہا جاتا ہے اور آیت کریمہ:

﴿قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ﴾ (۱-۱۱۳) کہو کہ میں صبح کے پروردگار کی پناہ مانگتا ہوں۔

میں فَلَاق سے مراد صبح ہے بعض نے کہا ہے کہ اس سے نہریں مراد ہیں جن کا کہ آیت:

﴿أَمَّنْ جَعَلَ الْأَرْضَ قَرَارًا وَجَعَلَ خِلَالَهَا أَنْهَارًا﴾ (۲۷-۶۱) بھلا کس نے زمین کو قرار گاہ بنایا اور اس کے بیچ نہریں بنائیں۔

میں تذکرہ پایا جاتا ہے۔ اور بعض نے وہ کلمہ مراد لیا ہے

﴿قَدْ أَفْلَحَ مَنْ تَزَكَّى﴾ (۸۷-۱۳) بے شک وہ مراد کو پہنچ گیا جو پاک ہوا۔

﴿قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكَّاهَا﴾ (۹۱-۹) جس نے اپنے نفس یعنی روح کو پاک رکھا وہ مراد کو پہنچ گیا۔

﴿قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ﴾ (۲۳-۱) بے شک ایمان والے رستگار ہو گئے۔

﴿لَعَلَّكُمْ تَفْلِحُونَ﴾ (۲۳-۳۱) تاکہ تم فلاح پاؤ۔  
﴿إِنَّهُ لَا يَفْلِحُ الْكُفْرُونَ﴾ (۲۳-۱۱) کچھ شک نہیں کہ کافر رستگاری نہیں پائیں گے۔

﴿فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾ (۷-۸) وہ تو نجات پانے والے ہیں۔

اور آیت کریمہ:  
﴿قَدْ أَفْلَحَ الْيَوْمَ مَنْ اسْتَعْلَى﴾ (۱۰-۶۱) اور آج جو غالب رہا وہی کامیاب ہوا۔

میں یہ بھی صحیح ہے کہ انہوں نے فلاح دنیوی مراد لی ہو بلکہ یہی معنی (بجاء ظرائن) اقرب الی الصحت معلوم ہوتے ہیں۔

اور سَحُورُ یعنی طعام سحر کو بھی فَلَاح کہا گیا ہے کیونکہ اس وقت حَتَّى عَلَى الْفَلَاح کی آواز بلند کی جاتی ہے اور اذان میں حَتَّى عَلَى الْفَلَاح کے معنی یہ ہیں کہ اس کامیابی کی طرف آؤ جو نماز کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے مقدر کر رکھی ہے اور حدیث ۵ (۷۶) حَتَّى خِفْنَا أَنْ يَقُوتَنَا الْفَلَاحُ (حتی کہ فلاح کے فوت ہو جانے کا ہمیں اندیشہ ہوا) میں بھی فَلَاح سے مراد وہ کامیابی ہے جو صلاۃ عشا ادا کرنے کی وجہ سے ہمارے

ہے:

﴿وَكُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ﴾ (۳۶-۴۰) سب

اپنے اپنے مدار میں تیر رہے ہیں۔

اور فَلَكُهُ الْمَغْزَلُ کے معنی چرنے کا دم کڑہ کے ہیں اور اسی سے فَلَكٌ شَدُّ الْمَرْءِ کا محاورہ ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں عورت کی چھاتی کے دم کڑہ کی طرح ابھر آنے کے ہیں اور فَلَقْتُ الْجَدَى کے معنی بکری کے بچے کی زبان پھاڑ کر اس میں پھر کی سی ڈال دینے کے ہیں۔ تاکہ وہ اپنی ماں کے پستانوں سے دودھ نہ چوس سکے۔

### (ف ل ن)

فُلَانٌ وَفُلَانَةٌ انسانوں کے ناموں کے لیے بطور کنایہ بولا جاتا ہے اور الْفُلَانُ وَالْفُلَا (یعنی الف لام کے ساتھ) انسان کے علاوہ دوسرے حیوانات کے لیے بطور کنایہ استعمال ہوتا ہے ﴿قرآن پاک میں ہے:

﴿يَا وَيْلَتَى لَيْتَنِي لَمْ أَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيلًا﴾ (۲۵-۲۸) ہائے شامت کاش! میں فلاں شخص کو دوست نہ بناتا۔ آیت میں تنبیہ پائی جاتی ہے کہ قیامت کے دن ہر شخص باطل پرستی میں اپنے دوستوں اور آشنائوں کا ساتھ دینے پر اظہار ندامت کرے گا اور کہے گا کاش! میں نے فلاں کو دوست نہ بنایا ہوتا لہذا یہ اس آیت کے ہم معنی ہے۔

﴿الْأَخْلَاءُ يَوْمَئِذٍ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ إِلَّا الْمُتَّقِينَ﴾ (۴۳-۶۷) جو آپس میں دوست ہیں اس روز ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے۔ مگر پرہیزگار لوگ باہم دوست ہی رہیں گے۔

جس کی اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو تعلیم دی تھی اور انہوں نے اس کی برکت سے سمندر پھاڑ دیا تھا اور فَلَاقٌ بمعنی مَفْلُوقٌ ہے جس طرح کہ نَفَضٌ بمعنی مَنْقُوضٌ اور نَحْتُ بمعنی مَنْكُوثٌ آتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ فَلَاقٌ اور فَلَاقٌ کے معنی تعجب کے ہیں اور دو پہاڑوں کی درمیانی جگہ کو فَلَاقٌ و فَلَاقٌ کہا جاتا ہے اور اونٹ کی دو کہان کے درمیانی حصہ کو بھی فَلَاقٌ و فَلَاقٌ کہتے ہیں۔

### (ف ل ک)

الْفُلُكُ کے معنی سفینہ یعنی کشتی کے ہیں۔ اور یہ واحد و جمع دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ لیکن دونوں میں اصل کے لحاظ سے اختلاف ہے فُلُكٌ اگر مفرد کے لیے ہو تو یہ بروزن فُكُلٌ ہوگا۔ اور اگر بمعنی جمع ہو تو حُمْرٌ کی طرح ہوگا۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿حَتَّىٰ إِذَا كُنْتُمْ فِي الْفُلْكِ﴾ (۱۰-۲۲) یہاں تک کہ جب تم کشتیوں میں سوار ہوتے ہو۔

﴿وَالْفُلْكِ الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ﴾ (۲-۱۶۳) اور کشتیوں (اور جہازوں) میں جو دریا میں..... رواں ہیں۔

﴿وَتَرَى الْفُلْكَ مَوَاجِرَ﴾ (۱۶-۱۳) اور تم دیکھتے ہو کہ کشتیاں دریا میں پانی کو پھاڑتی چلی جاتی ہیں۔

﴿وَجَعَلْ لَكُم مِّنَ الْفُلْكِ وَالْأَنْعَامِ مَا تَرْكَبُونَ﴾ (۴۳-۱۲) اور تمہارے لیے کشتیاں اور چار پائے بنائے جن پر تم سوار ہوتے ہو۔ اور فلک کے معنی ستاروں کا مدار (مَجْرَى) کے ہیں اور اسے فلک یعنی کشتی نما ہونے کی وجہ سے فلک کہا جاتا ہے۔ قرآن میں

## (ف ن ن)

﴿فَفَهَّمْنَهَا سُلَيْمَانَ﴾ (۷۹-۲۱) ہم نے فیصلہ کرنے کا طریقہ سلیمان کو سمجھا دیا۔

میں تفہیم کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی قوت فہم میں اضافہ کر دیا جس کے ذریعہ انہوں نے نزاع کی حقیقت کو پالیا اور دوسرے معنی یہ ہیں کہ وحی کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے اس معاملہ کی حقیقت ان کے قلب پر القا کر دی۔

أَفْهَمْتُهُ کے معنی کسی کو کچھ سمجھا دینے کے ہیں اور استفہام کے معنی کسی چیز کے سمجھنے کی طلب کے ہیں۔

## (ف و ت)

أَلْفَوْتُ: (ن) (ہاتھ سے نکل جانا) کسی چیز کا انسان سے اتنا دور ہو جانا کہ اس کا حاصل کر لینا اس کے لیے دشوار ہو۔ چنانچہ فرمایا:

﴿وَإِنْ فَاتَكُمْ شَيْءٌ مِّنْ أَزْوَاجِكُمْ إِلَى الْكُفَّارِ﴾ (۶۰-۱۱) اور اگر تمہاری عورتوں میں سے کوئی عورت تمہارے ہاتھ سے نکل کر کافروں کے پاس چلی جائے۔

﴿لَكَيْلًا تَأْسَوْا عَلَىٰ مَا فَاتَكُمْ﴾ (۵۷-۲۳) تاکہ جو مطلب تم سے فوت ہو گیا ہے۔ اس کا غم نہ کھایا کرو۔

﴿وَلَوْ تَرَىٰ إِذْ فَرَغُوا قُلُوبَهُمْ﴾ (۳۴-۵۰) اور کاش تم دیکھو جب یہ گھبرا جائیں گے تو (عذاب سے) بچ نہیں سکیں گے۔

یعنی جس عذاب سے وہ گھبرائیں گے اس سے بچ نہیں سکیں گے۔ محاورہ ہے۔

هُوَ مِثْلِي قُوْتُ الرُّمَحِ: وہ میرے نیزے کی دسترس

أَلْفَنَانُ۔ کے معنی اس شاخ کے ہیں جس پر تروتازہ پتے ہوں اس کی جمع آفنان آتی ہے۔ پس آیت کریمہ:-

﴿ذَوَاتَا أَفْنَانٍ﴾ (۵۵-۲۸) ان دونوں میں بہت سی شاخیں (یعنی) قسم قسم کے میوؤں کے درخت ہیں۔ کے معنی ہری بھری شاخوں والے درختوں کے ہیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس سے انواع و اقسام کے درخت مراد ہوں۔

## (ف ن د)

أَلْفَنَدُ کے معنی رائے کی کمزوری کے ہیں اس سے أَلْتَفَنِيْدُ (تفعیل) ہے جس کے معنی کسی کو کمزور رائے یا فائر العقل بتانے کے ہیں قرآن پاک میں ہے:

﴿لَوْ لَا أَنْ تُفْنِدُونِ﴾ (۹۴-۱۲) اگر مجھ کو یہ نہ کہو کہ بعض نے اس کے معنی تَلَوُ مُؤْنِي یعنی ملامت لکھے ہیں لیکن اس کا اصل معنی وہی ہیں جو ہم نے بیان کیے ہیں اور أَلَا فَنَادُ (افعال) کے معنی بہکی بہکی باتیں کرنے کے ہیں۔ اور فَنَدُ اصل میں پہاڑ کی چوٹی کو کہتے ہیں اور اسی سے بوڑھے کھوسٹ کو فَنَدُ کہا جاتا ہے (کیونکہ وہ بھی عمر کی انتہا کو پہنچ چکا ہوتا ہے)۔

## (ف ہ م)

أَلْفَهْمُ: انسان کی اس ذہنی قوت کا نام جس سے وہ مطالب کو بہتری اور عمدگی کے ساتھ اخذ کر لیتا ہے اور فَهْمْتُ كَذَا کے معنی کسی چیز کو اچھی طرح سمجھ لینے کے ہیں اور آیت کریمہ:

## (ف و ر)

الْفُورُ کے معنی سخت جوش مارنے کے ہیں یہ لفظ آگ کے بھڑک اٹھنے پر بھی بولا جاتا ہے اور ہنڈیا اور غصہ کے جوش کھانے پر بھی۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَهِيَ تَفُورُ﴾ (۶۷-۷۷) اور وہ جوش مار رہی ہوگی۔  
﴿وَقَارَ التَّنُورُ﴾ (۱۱-۴۰) اور تنور جوش مارنے لگا۔

شاعر نے کہا ہے ۱ (المقارِب)

(۳۴۵) وَلَا الْعُرْقُ قَارًا

اور نہ اس کی رگوں میں گرہ یا نفع ظاہر ہوتا ہے۔

محاورہ ہے:

فَارُ فُلَانٌ مِنَ الْحُمَى يَفُورُ: فلان کو زور کا بخار ہے اور ہنڈیا کے ابال کو فَوَارَة کہا جاتا ہے پھر تشبیہ کے طور پر پانی کے ابلتے ہوئے چشمہ کو بھی فَوَارَة الْمَاءِ کہتے ہیں۔

ایک محاورہ ہے:

فَعَلْتُ كَذَا مِنْ قَوْرَى: میں نے جوش میں ایسا کیا یعنی سکون امر سے قبل یہ کام کیا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَيَأْتُوَكُمْ مِنْ قَوْرِهِمْ هَذَا﴾ (۳-۱۲۵) اور کافر تم پر جوش کے ساتھ دفعہ حملہ کر دیں۔

الْفُسَارُ: چوبہا اس کی جمع فُيْسِرَانِ آتی ہے پھر شکل میں مشابہت کی وجہ سے نافہ مشک کو بھی قَارَة الْمِسْكِ کہا جاتا ہے۔

مَكَانٌ فُشْرٌ: بہت چوہوں والی زمین۔

سے باہر ہے۔

جَعَلَ اللَّهُ رِزْقَهُ قَوْتَ فَمِهِ (اللہ اس کا رزق اس کی دسترس سے باہر کر دے) یعنی رزق سامنے نظر آئے لیکن منہ تک نہ پہنچ سکے (بددعا)

اسی سے اِفْتِيَاتٌ (افتعال) ہے اور اس کے معنی کسی ایسے شخص سے مشورہ کے بغیر کوئی کام کرنے کے ہیں جس سے مشورہ ضروری ہو۔

الْتَفَاوْتُ: (تفاعل) کے معنی دو چیزوں کے اوصاف مختلف ہونے کے ہیں گویا ایک کا وصف دوسری کو یا ہر ایک کا وصف دوسری کو فوت کر رہا ہے قرآن پاک میں ہے۔

﴿مَا تَرَىٰ فِي خَلْقِ الرَّحْمَنِ مِنْ تَفَاوُتٍ﴾ (۶۷-۳) کیا تو (خدا) رحمن کی آفرینش میں کچھ نقص دیکھتا ہے؟ یعنی اس میں کوئی بات بھی حکمت کے خلاف نہیں ہے۔

## (ف و ج)

الْفُجُجُ کے معنی تیزی سے گزرنے والی جماعت کے ہیں اس کی جمع افواج ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿كُلَّمَا أَلْقَىٰ فِيهَا فُجُجٌ﴾ (۸-۶۷) جب اس میں ان کی کوئی جماعت ڈالی جائے گی۔

﴿فُجُجٌ مُّقْتَحِمٌ﴾ (۳۸-۳۹) (یہ) ایک فوج (ہے) تمہارے ساتھ) داخل ہوگی۔

﴿فِي دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا﴾ (۱۱۰-۲) غول کے غول خدا کے دین میں۔۔۔۔۔

۱ قطعۃ من قول العوف بن عطية بن الخرع يصف فرسا والبيت بتمامه 'لها رمع ايد مكرّب فلا العظم واه ولا العرق فارا ومعناه اى لا يظهر بعرقه نفخ او عقد يقال: فارت عروقه، تفور فوراً وذاكره من الفرس وفي المعاني للقبتي اى لم يكن بها داء ففوج فيفور الدم وقطع الودج كما القصد للانسان والبيت في اللسان (فور) وكتاب النخيل لابي عبيد (۹۱ و ۱۰۰) والمعاني الكبير للقبتي (۱: ۱۶۳)۔

## (فوز)

ہے۔ اسی بنا پر مثل مشہور ہے۔ مَا أَحَدٌ إِلَّا وَالْمَوْتُ خَيْرٌ لَهُ کہ موت ہر ایک کے لیے بہتر ہے۔ یہ دنیا کے اعتبار سے ہے۔ لیکن اگر اخروی نعمتوں سے ہم آغوش ہونے کا لحاظ کیا جائے تو موت بہت بڑی کامیابی ہے۔

چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَأُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ﴾ (۱۸۵-۳) تو جو شخص آتش جہنم سے دور رکھا گیا اور بہشت میں داخل کیا گیا وہ مراد کو پہنچ گیا۔

اور آیت کریمہ:

﴿فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَقَازَةٍ مِنَ الْعَذَابِ﴾ (۱۸۸-۳) ان کی نسبت خیال نہ کرنا کہ وہ عذاب سے رستگار ہو جائیں گے۔

میں مَقَازَةُ فَازَ کا مصدر ہے اور فَوزُ اسم ہے یعنی یہ مت سمجھو کہ یہ عذاب سے رہائی حاصل کر لیں گے اور آیت کریمہ:

﴿إِنَّ لِلْمُتَّقِينَ مَقَازًا﴾ (۳۱-۷۸) بے شک پرہیز گاروں کے لیے کامیابی ہے۔

میں مَقَازَا فَوزُ سے اسم ظرف ہے یعنی متقین کے لیے کامیابی کا مقام ہے پھر اس کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا: ﴿حَدَّثَنَا وَأَعْنَابًا﴾ (۳۲-۷۸) (یعنی) باغ اور انگور وغیرہ۔

اور آیت کریمہ:

﴿وَلَمَّا أَصَابَكُمْ فَضْلُ اللَّهِ إِلَى قَوْلِهِ فَقَدْ فَازَ فَوزًا عَظِيمًا﴾ (۷۱-۳۳) تو بے شک بڑی مراد

الْفَوْزُ کے معنی سلامتی کے ساتھ خیر حاصل کر لینے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿ذَلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْكَبِيرُ﴾ (۱۱-۸۵) یہی بڑی کامیابی ہے۔

﴿فَقَدْ فَازَ فَوزًا عَظِيمًا﴾ (۷۱-۳۳) تو بے شک بڑی مراد پائے گا۔

﴿ذَلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْمُبِينُ﴾ (۳۰-۳۵) یہی صریح کامیابی ہے۔

دوسری جگہ پر العظیم ہے (۵۷-۴۲)

﴿وَأُولَئِكَ هُمُ الْفَائِزُونَ﴾ (۲۰-۹) اور وہی مراد کو پہنچنے والے ہیں۔

الْمَقَازَةُ: تفاسل کے طور پر ریستان کو مَقَازَةُ کہا جاتا ہے۔ نیز کامیابی کا ذریعہ ہونے کے لحاظ سے بھی بیابان کا مَقَازَةُ کہتے ہیں۔ کیونکہ بیابان جس طرح ہلاکت کا سبب ہوتا ہے اسی طرح کبھی کامیابی کا بھی سبب بنتا ہے لہذا ان دونوں معنی کے لحاظ سے اسے کبھی قَفَرُ اور کبھی مَقَازَةُ کہا جاتا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ لفظ مَقَازَةُ فَوزًا الرَّجُلُ سے مشتق ہے جس کے معنی ہلاک ہو جانے کے ہیں۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ لغت میں فَوزُ بمعنی هَلَكٌ آتا ہے تو یہ بھی معنی فَوزُ کے لحاظ سے ہے کیونکہ مرنے کے بعد انسان دنیا کے پھندے سے نجات پالیتا ہے لہذا موت اگر ایک لحاظ سے ہلاکت ہے تو دوسرے لحاظ سے باعث نجات بھی

① وقد عدا العلماء لفظ "المقازة" من الاضداد لكن المؤلف حملة على المجاز والاستعارة الاضداد لابی الطیب (۵۰۷)۔

اسی نے زمین میں اس کے اوپر پہاڑ بنائے۔

پائے گا۔

اس کی ضد تحت ہے جس کے معنی نیچے کے ہیں چنانچہ فرمایا:

﴿قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلَىٰ أَنْ يَبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ أَوْ مِنْ تَحْتِ أَرْجُلِكُمْ﴾ (۶۱-۶۵)

کہہ دو کہ وہ اس پر بھی قدرت رکھتا ہے کہ تم پر اوپر کی طرف سے یا تمہارے پاؤں کے نیچے سے عذاب بھیجے۔

کے معنی یہ ہیں کہ وہ دنیوی ساز و سامان کی حرص کرتے ہیں اور غنیمت وغیرہ حاصل کر لینے کو ہی بڑی کامیابی سمجھتے ہیں۔

## (فَوْضُ)

فَوْضُ: (الی) کے معنی کوئی معاملہ کسی کے سپرد کر دینے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:-

﴿وَأَفْوُضْ أَمْرِي إِلَى اللَّهِ﴾ (۴۰-۴۴) اور میں اپنا کام خدا کے سپرد کرتا ہوں۔

یعنی میں اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کرتا ہوں اصل میں یہ مَالُهُمْ فَوْضَىٰ بَيْنَهُمْ کے محاورہ سے مشتق ہے (یعنی ان کا مال سب میں مشترک ہے) شاعر نے کہا ہے: (الطویل)

(۳۴۶) طَعَامُهُمْ فَوْضَىٰ فَضًا فِي رِحَالِهِمْ۔

ان کے گھروں میں طعام منتشر اور بکھرا پڑا ہے۔ اور اسی سے شِرْكُهُ مَقَاوِضَةٌ ہے یعنی کمپنی جس میں سب کے حصص مساوی ہوں۔

## (فَوْقُ)

فَوْقُ: یہ مکان، زمان، جسم، عدد اور مرتبہ کے متعلق استعمال ہوتا ہے اور کئی معنوں میں بولا جاتا ہے اوپر (۱) جیسے فرمایا:

﴿وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمْ الطُّورَ﴾ (۲-۶۳) اور کوہ طور کو تم پر اٹھا کھڑا کیا۔

﴿وَمَنْ فَوْقَهُمْ ظُلُمٌ مِّنَ النَّارِ﴾ (۳۹-۱۶) ان کے اوپر تو آگ کے سائبان ہوں گے۔

﴿وَجَعَلَ فِيهَا رَوَاسِيَ مِّنْ فَوْقِهَا﴾ (۴۱-۱۰) اور

(۲) صعود: یعنی بلندی کی جانب کے معنی میں اس کی ضد اسفل ہے جس کے معنی پستی کی جانب کے ہیں۔ چنانچہ فرمایا:

﴿إِذْ جَاءُوكُم مِّنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ أَسْفَلَ مِنكُمْ﴾ (۳۳-۱۰)

جب وہ تمہارے اوپر اور نیچے کی جانب سے تم پر چڑھ آئے۔

(۳) کسی عدد پر زیادتی کے معنی ظاہر کرنے کے لیے آتا ہے جیسے فرمایا:

﴿فَإِنْ كُنَّ نِسَاءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ﴾ (۴-۱۱) اگر اولاد صرف لڑکیاں ہی ہوں (یعنی دو یا) دو سے زیادہ۔

(۴) جسمانیات کے لحاظ سے بڑا یا چھوٹا ہونے کے معنی دیتا ہے۔ چنانچہ آیت کریمہ۔

﴿مَثَلًا مَّا بَعُوضَةٌ فَمَا فَوْقَهَا﴾ (۲-۲۶) مچھریاں اس سے بڑھ کر کسی چیز (مثلاً مکھی، مکڑی) کی مثال بیان فرمائے۔

میں بعض نے کہا ہے کہ فَمَا فَوْقَهَا سے مچھر سے بڑی چیز کی طرف اشارہ ہے جیسے مکڑی جس کی کہ دوسری جگہ مثال بیان کی گئی ہے اور بعض نے فوق بلحاظ صغر مراد لیا ہے یعنی مچھر سے بھی چھوٹا اور جنہوں نے اس کی تفسیر



کے ہیں اور سَنَهُمْ اَفَوْقُ کے معنی پر شکستہ سوار کے ہیں۔  
 اَلَا فَاَقَّةٌ: (افعال) کے معنی نشہ یا غش کے بعد ہوش میں  
 آنے یا مرض کے بعد ہوش میں آنے یا مرض کے بعد  
 کمزوری سے قوت کی طرف لوٹ آنے کے ہیں نیز اَفَاَقَةُ  
 کے معنی دودھ دوہنے کے بعد دودھ کا پھرتھنوں میں لوٹ  
 آنا بھی آتے ہیں اور جو دودھ تھنوں میں لوٹتا ہے اسے  
 فُوقَةً کہا جاتا ہے اور ایک دفعہ تھنوں سے دودھ دوہنے  
 کے بعد پھر ان میں دودھ لوٹنے تک جو وقفہ ہوتا ہے اسے  
 فواق کہا جاتا ہے اور آیت کریمہ:-  
 ﴿مَا لَهَا مِنْ فَوَاقٍ﴾ (۳۸-۱۵) جس میں (شروع  
 ہوئے پیچھے) کچھ وقفہ نہیں ہوگا۔

جس کے معنی راحت کے ہیں اور بعض نے اس کے معنی یہ  
 کیے ہیں کہ دوبارہ دنیا کی طرف لوٹنا نہیں ہے۔ ابو عبیدہ  
 نے کہا ہے ﴿کہ اگر فَوَاقٍ بضم الفاء پڑھا جائے تو  
 یہ فَوَاقٍ النَّاقَةِ کے محاورہ سے مشتق ہوگا اور بعض نے کہا  
 کہ فتح اور ضمہ فاء دونوں کے ایک ہی معنی ہیں ﴿جیسے  
 جَمَامٌ وَ جَمَامٌ اور بعض نے کہا ہے کہ اِسْتَفِقَ  
 نَاقَتَكَ کے معنی یہ ہیں کہ اپنی اونٹنی کو چھوڑ دوتا کہ اس کے  
 تھنوں میں دودھ اتر آئے اور فوق فَصِيلَكَ کے معنی  
 ہیں کہ اونٹ کے بچہ کو کچھ وقفہ کے بعد دودھ پلاؤ۔ ظَلَّ  
 يَتَفَوَّقُ الْمَحْضُ وہ دن بھر تھنوں کے ساتھ دودھ بلوتا  
 رہا۔ شاعر نے کہا ﴿(البسيط)

مادونہا سے کی ہے ان کی مراد بھی یہی ہے بعض اہل  
 لغت نے اس سے یہ سمجھ لیا ہے کہ فوق بمعنی دون بھی  
 استعمال ہوتا ہے اور اسے اعداد میں شمار کیا ہے مگر یہ محض  
 ان کی خام خیالی ہے۔

(۵) لحاظ فضیلت دنیوی کے استعمال ہوتا ہے جیسے فرمایا:  
 ﴿وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ﴾ اور ایک دوسرے  
 پر درجے بلند کیے۔

اور کبھی فضیلت اخروی کے لحاظ سے آتا ہے۔ جیسے فرمایا:  
 ﴿وَالَّذِينَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيَمَةِ﴾ (۲-۲۱۲)  
 لیکن جو پرہیزگار ہیں وہ قیامت کے دن ان پر فائق ہوں  
 گے۔

﴿فَوْقَ الَّذِينَ كَفَرُوا﴾ (۳-۵۵) کافروں پر  
 فائق۔

(۶) فوقیت معنی غلبہ اور تسلط کے جیسے فرمایا:  
 ﴿وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهِ﴾ (۶-۱۸) اور وہ اپنے  
 بندوں پر غالب ہے۔

﴿مِنْ قَوْمٍ فِرْعَوْنُ وَإِنَّا فَوْقَهُمْ قَاهِرُونَ﴾  
 (۷-۱۲۷) فرعون سے اور بے شبہ ہم ان پر غالب ہیں۔  
 اور فَوْقُ کے لفظ سے فَاَقُ فُلَانٍ غَيْرَهُ يَقُوُّ کا  
 محاورہ ہے جس کے معنی دوسرے پر بازی لے جانے کے  
 ہیں لہذا یہ فوق بمعنی فضیلت سے مشتق ہے۔ اور فوق سے  
 فَوْقُ السَّهْمِ کا محاورہ مشتق ہے جس کے معنی سوار تیر

① انظر مجازہ (۷۹/۲)

② كما يفهم من تفسير الفراء حيث قال: مالها من راحة وإخافة قرء الحسن وعاصم وأهل المدينة فواق بالفتح وهي لفظة جيدة وبالضمة حمزة والاعمش والكشائي (راجع الطبري)۔

③ قاله الأعشى بن ميمون في قصيدة يمدح فيها هودة بن علي الحنفی۔ لم يلبس التاج معدى غيره والبيت ال ۳۳ من قصيدة وتامه: جاء ت لترضع شق النفس لورضعاً والبيت من شواهد الطبري (۳۳/۲۲)

ہیں کہ ہم مومن ہیں۔ لیکن ان کے دل مومن نہیں ہیں۔  
﴿يَقُولُونَ بِأَفْوَاهِهِمْ مَا لَيْسَ فِي قُلُوبِهِمْ﴾  
(۱۶۷-۳) منہ سے وہ باتیں کہتے ہیں جو ان کے دل میں  
نہیں ہیں۔

اور اسی سے فَمُ النَّهْرِ کی طرح فَوْهُ النَّهْرِ کا محاورہ  
ہے جس کے معنی نہر کے دہانہ کے ہیں اور أَفْ—وَاهُ  
الطَّبِيبِ۔ ان چیزوں کو کہا جاتا ہے جو خوشبو کے لیے ڈال  
جائیں۔ اس کا واحد نَوْءٌ ہے۔

### (ف ی ع)

الْفَيْئَةُ وَالْفَيْئَةُ کے معنی اچھی حالت کی طرف  
لوٹ آنے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:-  
﴿حَتَّى تَفِيءَ إِلَى أَمْرِ اللَّهِ فَإِنْ فَاءَتْ﴾  
(۴۹-۹) یہاں تک کہ وہ خدا کے حکم کی طرف رجوع  
لائے۔ پس جب وہ رجوع لائے۔  
﴿فَإِنْ فَاءَ وَآ﴾ (۲۲۶-۲) اگر (اس عرصے میں قسم  
سے) رجوع کر لیں۔

اور اسی سے فَاءُ الظِّلِّ ہے جس کے معنی سایہ کے (زوال  
کے بعد) لوٹ کر آتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:-  
﴿يَتَّقِيُوا ظِلُّهُ﴾ (۱۶-۴۸) جن کے سائے.....  
لوٹے ہیں۔ اور جو مال غنیمت بلا مشقت حاصل ہو جائے  
اسے بھی فینی کہا جاتا ہے چنانچہ قرآن پاک میں ہے:-  
﴿مَّا أَفَاءَ اللَّهُ عَلَى رَسُولِهِ﴾ (۵۹-۷) جو مال  
خدا نے اپنے پیغمبر کو..... دلوائی۔

﴿وَمِمَّا أَفَاءَ اللَّهُ عَلَيْكَ﴾ (۳۳-۵۰) جو خدا نے  
تمہیں (کفار سے بطور مال غنیمت) دلوائی ہے۔  
بعض نے کہا ہے کہ مال غنیمت کو فینی بمعنی سایہ کے

(۳۴۷) حَتَّى إِذَا فَيْقَتْ فِي ضَرْعِهَا اجْتَمَعَتْ  
حتیٰ کہ جب اس کے تھنوں میں دودھ دوبارہ جمع ہو گیا۔

### (ف و م)

الْفَوْمُ: گیہوں۔ اور بعض نے کہا ہے کہ فوم اصل  
میں ثوم ہی ہے (یعنی فاء ثاء سے بدل دی گئی ہے) جیسا  
کہ جدث وجدف میں ہے اور اس کے معنی لہسن کے ہیں۔  
قرآن پاک میں ہے:-  
﴿وَقُومِهَا وَعَدَسِهَا﴾ (۲۱-۲) اور گیہوں اور  
مسور۔

### (ف و ه)

أَفْوَاهُ: فَم کی جمع ہے اور فم اصل میں فَوء ہے اور  
قرآن پاک میں جہاں کہیں بھی قول کی نسبت فَم یعنی  
منہ کی طرف کی گئی ہے۔ وہاں دروغ گوئی کی طرف اشارہ  
ہے اور اس پر تنبیہ ہے کہ وہ صرف زبان سے ایسا کہتے  
ہیں ان کے اندرون اس کے خلاف ہیں جیسے فرمایا:-  
﴿ذَلِكُمْ قَوْلُكُمْ بِأَفْوَاهِكُمْ﴾ (۳۳-۴) یہ سب  
تمہارے منہ کی باتیں ہیں۔  
﴿كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ﴾ (۱۸-۵) بات جو  
ان کے منہ سے نکلتی ہے۔

﴿يَرْضَوْنَكُمْ بِأَفْوَاهِهِمْ وَتَأْبَى قُلُوبُهُمْ﴾  
(۸-۹) یہ منہ سے تو تمہیں خوش کر دیتے ہیں۔ لیکن ان  
کے دل ان باتوں کو قبول نہیں کرتے۔ ﴿فَرَدُّوا  
أَيْدِيَهُمْ فِي أَفْوَاهِهِمْ﴾ (۱۴-۹) تو انہوں نے اپنے  
ہاتھ ان کے منہوں پر رکھ دیے (کہ خاموش رہو)۔  
﴿مِنَ الَّذِينَ قَالُوا آمَنَّا بِأَفْوَاهِهِمْ وَلَمْ تُؤْمِنْ  
قُلُوبُهُمْ﴾ (۵-۴۱) کچھ تو ان میں سے منہ سے کہتے

### (ف ی ض)

فَاضَ الْمَاءُ کے معنی کسی جگہ سے پانی اچھل کر بہ نکلنا ہیں (اور آنسوؤں کے بہنے کے لیے بھی آتا ہے) چنانچہ فرمایا۔

﴿تَرَىٰ أَعْيُنُهُمْ تَفِيضُ مِنَ الدَّمْعِ﴾ (۵-۸۳) تم دیکھتے ہو کہ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوتے ہیں۔

اور أَفَاضَ آفَاءً کے معنی برتن کو لبالب بھر دینے کے ہیں حتیٰ کہ پانی اس سے نیچے گرنے لگے اور أَفَضْتُهُ کے معنی اوپر سے گرانے اور بہانے کے ہیں جیسے فرمایا:-

﴿أَنْ أَفِيضُوا عَلَيْنَا مِنَ الْمَاءِ﴾ (۷-۵۰) کہ کسی قدر ہم پر پانی بہاؤ۔

اسی سے فَاضَ صَدْرُهُ بِالسِّرِّ، جس کے معنی بھید ظاہر کرنے کے ہیں اور سخی آدی کو فَيَاضَ کہا جاتا ہے اور اسی سے أَفَاضُوا فِي الْحَدِيثِ کا محاورہ مستعار ہے۔ جس کے معنی باتوں میں مشغول ہو جانے اور چرچا کرنے کے ہیں چنانچہ فرمایا ﴿لَمَسَّكُمْ فِيمَا أَفَضْتُمْ فِيهِ﴾ (۲۲-۱۳) تو جس بات کا تم چرچا کرتے تھے اس کی وجہ سے تم پر..... نازل ہوتا۔

﴿هُوَ أَعْلَمُ بِمَا تَفِيضُونَ فِيهِ﴾ (۳۶-۸) وہ اس گفتگو کو خوب جانتا ہے جو تم اس کے بارے میں کرتے ہو۔

﴿إِذْ تُفِيضُونَ فِيهِ﴾ (۱۰-۶۱) جب اس میں مصروف ہاتے ہو۔

اور حَدِيثٌ مُسْتَفِيضٌ کے معنی منتشر یعنی عام پھیلی

ساتھ تشبیہ دے کرنے کہنے میں اس امر پر تنبیہ ہے کہ دنیا کا بہترین سامان بھی بمنزلہ ظل زائل کے ہے شاعر نے کہا ہے ❶ (الطویل)

(۳۳۸) اَمَادِي الْمَالُ أَفْيَاءُ الظَّلَالِ عَشِيَّةُ  
اے مادی مال شام کے ڈھلتے ہوئے سایہ کی طرح ہے۔  
دوسرے شاعر نے کہا ❷

(۳۳۹) اِنَّمَا الدُّنْيَا كَظِلٍّ زَائِلٍ  
کہ دنیا زائل ہونے والے سایہ کی طرح ہے۔

الْفِتْنَةُ: اس جماعت کو کہتے ہیں جس کے افراد تعاون اور تعاضد کے لیے ایک دوسرے کی طرف لوٹ کر آئیں ❸ قرآن پاک میں ہے:

﴿إِذَا لَقِيتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوا﴾ (۸-۲۵) جب (کفار کی) کسی جماعت سے تمہارا مقابلہ ہو تو ثابت قدم رہو۔

﴿كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً﴾ (۲-۲۳۹) بسا اوقات تھوڑی سی جماعت نے..... بڑی جماعت پر فتح حاصل کی۔

﴿فِي فِئَتَيْنِ التَّقَاتِ﴾ (۳-۱۳) دو گروہوں میں جو (جنگ بدر میں) آپس میں بھڑ گئے۔

﴿فِي الْمُنْفِقِينَ فِئَتَيْنِ﴾ (۴-۸۸) کہ تم منافقوں کے بارے میں دو گروہ۔

مِّنْ فِئَةٍ يَنْصُرُونَهُ: کوئی جماعت اس کی مددگار نہ ہو سکی۔ (۲۸-۸۱)

﴿فَلَمَّا تَرَأَتْهُ الْفِئَتَانِ﴾ (۸-۲۸) جب یہ دونوں فوجیں ایک دوسرے کے مقابلے میں صف آرا ہوئیں۔

❶ قاله حاتم الطائي وقد مرفى (اوی)

❷ لم اجدہ

❸ ذکر اصحاب المعاجم ایضاً لفظة "الفئة" فی رفء۔

ہے جس طرح کہ دُرْعُ مَسْنُونَةٌ کے معنی بھی وسیع زرہ کے ہیں جو کہ سَنَنْتُ بمعنی صَبَّيْتُ سے مشتق ہے۔

### (ف ی ل)

الْفَيْلُ: ہاتھی جمع۔ فَيْلَةٌ وَفُيُولُ قرآن پاک

میں ہے:-

﴿الَّذِينَ تَرَكَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِأَصْحَابِ الْفَيْلِ﴾

(۱۰۵-۱) کیا تم نے نہیں دیکھا کہ تمہارے پروردگار نے

ہاتھی والوں کے ساتھ کیا کیا۔

رَجُلٌ فَيْلُ الرَّأْيِ وَقَالَ الرَّأْيِ: کمزور رائے آدی۔

الْمُقَايَلَةُ: ایک قسم کا کھیل جس میں بچے کوئی چیز مٹی میں

چھپا دیتے ہیں پھر اس مٹی کو مٹھیاں بھر بھر کر تقسم کرتے

ہیں اور دیکھتے ہیں کہ وہ کس کے حصہ میں آتی ہے اور

فَائِلٌ، سرین کے گڑھے یا گوشت کے نیچے ایک رگ کا

نام ہے۔



ہوئی بات کے ہیں اور فَيْضُ کے معنی کثیر پانی کے ہیں۔

چنانچہ محاورہ۔

أَعْطَاهُ غَيْضًا مِّنْ فَيْضٍ: یعنی اسے زیادہ مال میں

سے تھوڑا سا دیا۔ اور ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

﴿فَإِذَا أَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفَاتٍ﴾ (۲-۱۹۸) اور جب

عرفات سے واپس ہونے لگو۔

اور آیت کریمہ:

﴿ثُمَّ أَفِضُوا مِّنْ حَيْثُ أَفَاضَ النَّاسُ﴾

(۲-۱۹۹) پھر جہاں سے اور لوگ واپس ہوں وہیں سے تم

بھی واپس ہو۔

میں إِفَاضَةٌ کے معنی مجمع کثیر کے یکبارگی لوٹنے کے ہیں

اور یہ فیضان الماء یعنی (پانی کا زور سے بہہ نکلتا) کے

ساتھ تشبیہ دے کر بولا جاتا ہے۔

أَفَاضَ بِالْقِدَاحِ: تیر گھمانا۔

أَفَاضَ الْبَعِيرُ بَجَرَّتِهِ: اونٹ کا جگال پھینکنا۔ دُرْعُ

مُفَاضَةٌ: کشادہ زرہ۔ گویا پہننے والے پر اسے بہا دیا گیا

## کتابُ الْقَاف

### (ق ب ح)

الْقَبْرِ: اس چیز کو کہتے ہیں جس کے دیکھنے سے آنکھ کو نفرت ہو اور اعمال و احوال میں سے اس عمل اور حالت کو کہتے ہیں جس سے طبیعت کو کراہت ہو، کہا جاتا ہے۔  
قَبْحٌ قَبَاحَةٌ (ک) فَهُوَ قَبِيحٌ۔ اور آیت کریمہ: ﴿مَنْ الْمَقْبُوحِينَ﴾ (۲۸-۲۲) میں مقبوحین سے بد حال لوگ مراد ہیں اور اس سے کفار کی صفات ذمیرہ کی طرف اشارہ ہے کہ دنیا میں وہ پلید اور گندے رہتے ہیں اور آخرت میں سیاہ روگر بہ چشم ہوں گے اور اغلال و سلاسل میں جکڑ کر انہیں گھسیٹا جائے گا۔ الغرض اس قسم کی مذموم صفات مراد ہیں (جن کے ساتھ قیامت کے دن متصف ہوں گے)  
قَبْحَهُ اللَّهُ عَنِ الْخَيْرِ: اللہ اسے خیر سے دور کرے  
الْقَبِيح: بازو کی ہڈی جس کا نصف کہنی کے ساتھ متصل ہوتا ہے۔

### (ق ب ر)

الْقَبْرِ کے معنی میت کو دفن کرنے کی جگہ کے ہیں اگر یہ قَبْرُتْہ (ضرب و نصر) کا مصدر ہو تو اس کے معنی میت کو قبر میں دفن کرنے کے ہوتے ہیں۔ اور اَقْبَرُتْہ کے معنی کسی کے لیے قبر مہیا کرنے کے ہیں تاکہ اس میں دفن کیا جائے۔ جیسے اَسْقَيْتْہ کے معنی پینے کے لیے پانی مہیا کرنے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:  
﴿ثُمَّ أَمَاتَهُ فَأَقْبَرَهُ﴾ (۸۰-۲۱) پھر اس کو موت دی۔

پھر قبر میں دفن کرایا۔

بعض نے اَقْبَرُہ کے معنی یہ کیے ہیں کہ اسے الہام کر دیا کہ کس طرح میت کو دفن کیا جائے۔ اَلْمَقْبَرَةُ وَالْمَقْبَرَةُ (قبرستان) جمع مقابر قرآن پاک میں ہے۔  
﴿حَتَّى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ﴾ (۱۰۲-۲) (یہاں تک کہ تم نے قبریں جا دیکھیں۔

یہ موت سے کننا یہ ہے اور آیت کریمہ:

﴿إِذَا بُعْثِرَ مَا فِي الْقُبُورِ﴾ (۱۰۰-۹) کہ جو مردے قبروں میں ہیں وہ باہر نکال لیے جائیں گے۔ میں حیات بعد الحیات یعنی موت کے بعد زندہ ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ دلوں کے اسرار ظاہر کر دینے کی طرف اشارہ ہے کیونکہ جب تک انسان دنیا میں رہتا ہے اس کے بھید مستور رہتے ہیں گویا قبر میں مدفون ہیں۔ تو یہاں قبور سے مجازاً دل مراد ہیں۔ بعض نے اس کے معنی یہ کیے ہیں کہ جب موت کی وجہ سے جہالت کا پردہ اٹھ جائے گا گویا کافر اور جاہل جب تک دنیا میں رہتے ہیں جہالت کی قبروں میں مدفون رہتے ہیں۔ چونکہ مرنے کے بعد وہ جہالت دور ہو جاتی ہے۔ تو گویا وہ قبر جہالت سے دوبارہ زندہ کر کے نکالے گئے ہیں۔ جیسا کہ مروی ہے  
أَلَا نَسَانُ نَسِئُمْ فَإِذَا مَاتَ انْتَبَهَ: کہ انسان دنیا میں سویا رہتا ہے جب موت آ کر دستک دیتی ہے تو اس کی آنکھیں کھلتی ہیں اور اسی معنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے

فرمایا۔

میں استعمال ہوتا ہے۔ اور آیت: ﴿فَقَبَضْتُ قَبْضَةً﴾

(۲۰-۹۶) تو میں نے ایک مٹھی بھری۔ میں ایک قرأت

فَقَبَضْتُ قَبْضَةً (صادمہملہ) کے ساتھ بھی ہے۔

قَبْضُوصُ: سبک رفتار اور چست گھوڑا جو دوڑتے وقت

صرف سم ہی زمین پر لگائے۔ اور تیز رفتار گھوڑے پر اس کا

اطلاق مجازی ہے جیسا کہ مجازاً سرعت رفتاری کے لیے

قَبْضُ کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔

### (ق ب ض)

الْقَبْضُ کے معنی کسی چیز کو پورے پنچے کے

ساتھ پکڑنے کے ہیں جیسے قَبْضُ السَّيْفِ وغیرہ تلوار کو

پکڑنا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ أَثَرِ الرَّسُولِ﴾ (۲۰-۹۶)

تو میں نے فرشتے کے نقش پائے مٹی کی ایک مٹھی بھری۔

قَبْضُ الْيَدِ عَلَى الشَّيْءِ کے معنی مٹھی میں لے لینے

کے ہیں اور قَبْضُهَا عَنِ الشَّيْءِ کے معنی کسی چیز کو

پکڑنے سے ہاتھ سکیڑ لینے کے ہیں۔ اسی مفہوم کے لحاظ

سے مال خرچ کرنے سے ہاتھ روک لینے کو بھی قبض کہا جاتا

ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَيَقْبِضُونَ أَيْدِيَهُمْ﴾ (۹-۶۷) اور (خرچ کرنے

سے) ہاتھ بند کیے رہتے ہیں۔

یعنی خرچ نہیں کرتے۔ اور استعارہ کے طور پر کسی چیز کے

حاصل کر لینے کو بھی قبض کہا جاتا ہے اگرچہ اسے ہاتھ سے نہ

پکڑا جائے جیسے محاورہ ہے۔ قَبَضْتُ الدَّارَ مِنْ فُلَانٍ

یعنی اسے اپنے تصرف میں لے لیا۔ قرآن پاک میں ہے۔ ۱۰

﴿مَا أَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِي الْقُبُورِ﴾ (۳۵-۳۲)

اور تم ان کو جو قبروں میں مدفون ہیں نہیں سنا سکتے۔ یعنی جو

(لوگ جہالت کے گڑھے میں گرنے کی وجہ سے) مردوں

کے حکم میں ہیں۔

### (ق ب س)

الْقَبَسُ: آگ (کا شعلہ یا اس کی چنگاری)

جو شعلہ سے لی جائے قرآن پاک میں ہے۔

﴿أَوْ آتَيْنَاكُمْ بِشَهَابٍ قَبَسٍ﴾ (۲۷-۷۷) یا سلاٹا ہوا

انگاہ تمہارے پاس لاتا ہوں۔

اور الْقَبَسُ (مصدر) وَالْأَقْبَسُ کے معنی بڑی آگ

سے کچھ آگ لینے کے ہیں۔ مجازاً علم و ہدایت کی طلب پر

بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿انظُرُونَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُورِكُمْ﴾ (۵۷-۱۳) ہماری

طرف نظر شفقت کیجیے کہ ہم بھی تمہارے نور سے روشنی

حاصل کر لیں۔

أَقْبَسْتُهُ نَارًا أَوْ عِلْمًا: میں نے اسے آگ دی یا علم

سکھایا۔

الْقَبَسُ: وہ ساٹھ جو تیزی کے ساتھ مادہ کو حاملہ کر دے

گو یا سرعت میں وہ شعلہ کی طرح ہے۔

### (ق ب ص)

الْمَقْبِصُ: (ض) کے معنی چٹکی سے کوئی چیز

لینے کے ہیں اور جو چیز چٹکی سے لی گئی ہو اسے قَبْصُ وَ

قَبِصَةٌ کہا جاتا ہے۔ اس لیے قبض، حقیر چیز کے معنی

۱۰ قال فی الکشاف (۲/۴۴۵) وہی قراءة الحسن راجع ایضا ابدال ابی الطیب (۲/۴۴۶) وعلماء اللغة فرقوا بینہما راجع

غریب ابی عبید (۱/۳۶) وکما فی قوله تعالیٰ: فرہان مقبوضة (۲/۲۸۳)

کے ہیں اور ترک تبسط یعنی بے تکلفی چھوڑ دینے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

## (ق ب ل)

قَبْلُ: یہ تقدم متصل اور منفصل دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے اور اس کی ضد بَعْدُ ہے بعض نے کہا ہے کہ یہ دونوں تقدم متصل کے لیے آتے ہیں اور ان کا ضد دُبُر و دُبُر ہے۔ یہ اس کے اصل معنی ہیں اگرچہ مجازاً ہر قسم کے تقدم پر بولا جاتا ہے پس قَبْل چار طرح استعمال ہوتا ہے۔ (۱) تقدم مکانی: یعنی کسی مقام کا دوران سفر میں پہلے آنا اور دوسرے کا اس کے بعد آنا جیسے اصفہان سے مکہ کی طرف جاتے وقت بغداد کو فہ سے پہلے آتا ہے لیکن مکہ سے اصفہان کو جاتے وقت بغداد کو فہ سے پہلے آتا ہے۔

(۲) تقدم زمانی: جیسے عَبْدُ الْمَلِكِ قَبْلَ الْمَنْصُورِ کہ عبد الملک کا زمانہ منصور سے پہلے کا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَلَمَّ تَقْتُلُونَ أَنْبِيَاءَ اللَّهِ مِنْ قَبْلُ.....﴾ (۲-۹۱)  
تو خدا کے پیغمبروں کو پہلے ہی کیوں قتل کیا کرتے۔

(۳) تقدم لمحاظ مرتبہ: جیسے عَبْدُ الْمَلِكِ قَبْلَ الْحَجَّاجِ کہ عبد الملک حجاج سے پہلے ہے یعنی مرتبہ میں بڑا ہے۔

(۴) تقدم صنای: یعنی ترتیب تعلیمی اور فنی میں ایک چیز کا دوسری سے پہلے ہونا جیسے کہا جاتا ہے۔

تَعَلَّمَ الْهَجَاءَ قَبْلَ تَعَلُّمِ الْخَطِّ کہ حروف ہجا کی تعلیم کتابت سیکھنے سے پہلے دی جاتی ہے قرآن پاک میں ہے:

﴿مَا أَمَنْتَ قَبْلَهُمْ مِنْ قَرْنٍ﴾ (۲۱-۶) ان سے

﴿وَالْأَرْضُ جَمِيعًا قَبْضَتُهُ يَوْمَ الْقِيَمَةِ﴾ (۳۹-۶۷) اور قیامت کے دن تمام زمین اس کی مٹھی میں ہوگی۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے تصرف میں ہوگی اور کسی کا ملک نہیں ہوگا۔ اور آیت کریمہ:

﴿ثُمَّ قَبْضَتْنَاهُ إِلَيْنَا قَبْضًا يَسِيرًا﴾ (۲۵-۴۶) پھر ہم اس کو آہستہ آہستہ اپنی طرف سمیٹ لیتے ہیں۔

میں سورج کے سایہ کو نقل کرنے کی طرف اشارہ ہے اور استعارہ کے طور پر قبض کے معنی تیز دوڑنے کے بھی آتے ہیں اس لحاظ سے کہ گویا دوڑنے والا زمین سے کسی چیز کو پکڑتا ہے اور آیت کریمہ: ﴿يَفْبِضُ وَيَنْصُطُ﴾ (۲-۲۳۵) (اور خدا ہی روزی کو) تنگ کرتا اور اسے وہی کشادہ کرتا ہے۔

کے معنی یہ ہیں کہ وہ کبھی چھین لیتا ہے اور کبھی عطا کر دیتا ہے۔ یا ایک قوم سے چھین لیتا ہے اور دوسری کو عطا کر دیتا ہے۔ یا یہ کہ وہ کبھی جمع کرتا ہے اور کبھی بکھیر دیتا ہے اور یا اس کے معنی زندہ کرنے اور مارنے کے ہیں۔ کیونکہ کبھی قبض موت سے کنایہ ہوتا ہے۔ چنانچہ مجاورہ ہے۔ قَبْضَةُ اللَّهِ: اللہ نے اس کی روح قبض کر لی اس معنی میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا ﴿(۷۷) (مَا مِنْ آدَمِيٍّ إِلَّا وَقَلْبُهُ بَيْنَ إِصْبَعَيْنِ مِنْ أَصَابِعِ الرَّحْمَنِ)﴾

کہ ہر آدمی کا دل اللہ تعالیٰ کی دو انگلیوں کے درمیان میں ہے یعنی انسان کے سب سے اشرف جزء پر اللہ تعالیٰ کو تصرف حاصل ہے تو دوسرے اعضاء پر بالاولیٰ تصرف حاصل ہوگا۔ رَاعَى قَبْضَةً: منتظم چرواہا۔

الْإِنْقِبَاضُ کے معنی اطراف یعنی ہاتھ پاؤں سمیٹ لینے

﴿وَقَابِلِ التَّوْبِ﴾ (۳۰-۳) اور توبہ قبول کرنے والا۔

﴿وَهُوَ الَّذِي يَقْبَلُ التَّوْبَةَ﴾ (۳۲-۲۵) اور وہی تو ہے جو اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا..... ہے۔ اور تَقْبَلُ کے معنی کسی چیز کو اس طرح قبول کرنے کے ہیں کہ وہ عوض کی مقتضی ہو جیسے ہدیہ وغیرہ قرآن پاک میں ہے:

﴿أُولَئِكَ الَّذِينَ نَتَقَبَّلُ عَنْهُمْ أَحْسَنَ مَا عَمِلُوا﴾ (۴۱-۱۶) یہی لوگ ہیں جن کے اعمال نیک ہم قبول کریں گے۔

﴿إِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللَّهُ مِنَ الْمُتَّقِينَ﴾ (۵-۲۷) کہ خدا پرہیزگاروں ہی کی نیاز قبول فرمایا کرتا..... ہے۔ میں اس بات پر تنبیہ ہے کہ ہر عبادت قبول نہیں ہوتی بلکہ وہی قبول کی جاتی ہے جو مخصوص طریق سے ادا کی جائے۔ فرمایا:

﴿فَتَقَبَّلَ مِنِّي﴾ (۳-۳۵) تو اسے میری طرف سے قبول فرما۔ کَفَالَةٌ کو قُبَالَةٌ کہا جاتا ہے کیونکہ کَفَالَةٌ کے معنی مَوَدِّعہ طور پر کسی چیز کو قبول کر لینے کے ہیں تو آیت

﴿فَتَقَبَّلَ مِنِّي﴾ میں کفالت کے معنی معتبر ہیں اور لکھے ہوئے عہد کو قُبَالَةٌ کہا جاتا ہے اور آیت کریمہ:

﴿فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُولٍ حَسَنٍ﴾ (۳-۳۷) پروردگار نے اسے پسندیدگی کے ساتھ قبول فرمایا میں بعض نے کہا ہے کہ یہ بمعنی تَقَبَّلَهَا کے ہے اور بعض نے کہا ہے کہ یہ بمعنی تَكْفَّلَهَا کے ہے یعنی اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس نے درحقیقت مجھے بہت بڑی کفالت کا ذمہ دار بنا دیا ہے اور پھر آیت کریمہ میں بِتَقَبُّلٍ کی بجائے بِقَبُولٍ حسن فرمایا ہے تاکہ اس میں دونوں امر جمع ہو جائیں یعنی تقبیل جو قبولیت کا اعلیٰ درجہ ہے اور قبول کرنا جو کہ رضا اور

پہلے جن بستیوں کو ہم نے ہلاک کیا وہ ایمان نہیں لائی تھیں۔

﴿قَبْلَ طُلُوعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوبِهَا﴾ (۲۰-۱۳۰) سورج کے نکلنے سے پہلے اور اس کے غروب ہونے سے پہلے۔

﴿قَبْلَ أَنْ تَقُومَ مِنْ مَقَامِكَ﴾ (۲۸-۲) قبل اس کے کہ آپ اپنی جگہ سے اٹھیں۔

﴿أَوْ تُنَوِّسُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِ﴾ (۵۷-۱۶) (ان سے) پہلے کتابیں دی گئی تھیں۔

ان تمام آیات میں تقدم زمانی مراد ہے اور کنایہ کے طور پر قَبْلٌ وَذُبُرٌ کا لفظ شرمگاہ پر بولا جاتا ہے اور استقبال کی طرح اقبال کے معنی بھی کسی کے روبرو اور اس کی طرف متوجہ ہونے کے ہیں قرآن پاک میں ہے۔ ﴿فَأَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلَى بَعْضٍ يَتَلَوْمُونَ﴾ (۲۸-۳۰) پھر لگے ایک دوسرے کو رو در رو ملامت کرنے۔ ﴿وَأَقْبَلُوا عَلَيْهِمْ﴾ (۱۲-۷۱) اور وہ ان کی طرف متوجہ ہو کر.....

﴿فَأَقْبَلَتِ امْرَأَتُهُ فِي صَرَءَ﴾ (۵۱-۲۹) ابراہیم علیہ السلام کی بیوی چلائی ہوئی آئی۔

اور جو شخص ڈول کی طرف منہ کر کے اسے کنویں سے پکڑتا ہے۔ اسے قابل اور دانی کو قابلہ کہا جاتا ہے کیونکہ وہ ولادت کے وقت بچے کو پکڑتی ہے قَبِلْتُ عُذْرَهُ وَتَوْبَتَهُ وغیرہ وَتَقَبَّلْتُهُ: میں نے اس کا عذر اور توبہ وغیرہ قبول کر لی۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ﴾ (۲-۱۲۳) اور نہ اس سے بدلہ قبول کیا جائے۔



بذریعہ عنایت اور مودت کے ہو۔ قرآن پاک میں ہے۔  
﴿مُتَكِبِّينَ عَلَيْهَا مُتَقَابِلِينَ﴾ (۵۶-۱۶) آنے  
سانے نکیہ لگائے ہوئے۔

﴿اِخْوَانًا عَلَى سُرُرٍ مُتَقَابِلِينَ﴾ (۱۵-۴۷) بھائی  
بھائی تختوں پر ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے ہوئے ہیں۔  
لِي قَبِلَ فُلَانٌ كَذَا کے معنی ہیں: میرے فلاں کی جانب  
اتنے ہیں اور یہ عِنْدَهُ کے ہم معنی ہے قرآن پاک میں ہے:  
﴿وَجَاءَ فِرْعَوْنُ وَمَنْ قَبْلَهُ﴾ (۶۹-۹) اور فرعون  
اور جو لوگ اس سے پہلے تھے سب..... کرتے تھے۔

﴿فَمَا لِلَّذِينَ كَفَرُوا قَبْلَكَ مُهْطِعِينَ﴾  
(۷۰-۳۶) تو ان کافروں کو کیا ہوا ہے کہ تمہاری طرف  
دوڑتے چلے آتے ہیں۔

اور استعارہ کے طور پر قوت اور قدرت علیٰ التقابلہ کے معنی  
میں استعمال ہوتا ہے چنانچہ محاورہ ہے۔  
لَا قَبْلَ لِي بِكَذَا: میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ قرآن  
پاک میں ہے:

﴿فَلَنَأْتِيَنَّهُمْ بِجُنُودٍ لَا قَبْلَ لَهُمْ بِهَا﴾  
(۲۷-۳۷) ہم ان پر ایسے لشکر سے حملہ کریں گے جس  
کے مقابلہ کی ان کو طاقت نہ ہوگی۔

یعنی ان کے سامنے ہونے اور مدافعت کرنے کی ان میں  
سکت نہیں ہوگی۔

الْقَبْلَةُ: اصل میں بالمقابل آدمی کی حالت کو کہا جاتا ہے جیسے  
جَنَسَةٌ وَقَعْدَةٌ اور عرف میں اس جہت کو قبلہ کہا جاتا ہے  
جس کی طرف متوجہ ہو کر نماز پڑھی جاتی ہے۔ چنانچہ فرمایا۔

﴿فَلَنُؤَلِّسَنَّ قَلِيلَةً تَرْضَاهَا﴾ (۲-۱۴۳) سو ہم تم کو ایسے قبلہ  
کی طرف جس کو تم پسند کرتے ہو متوجہ ہونے کا حکم دیں گے۔

ثواب کا منتفی ہوتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ قَبُولٌ کا لفظ  
فُلَانٌ عَلَيْهِ قَبُولٌ کے محاورہ سے ماخوذ ہے یعنی جو اسے  
دیکھتا ہے اس سے محبت کرتا ہے اور آیت کریمہ ﴿كُلُّ  
شَيْءٍ قُبُلًا﴾ (۶-۱۱۱) سب چیزوں کو..... سامنے۔

میں بعض نے کہا ہے کہ قَبْلٌ قَابِلٌ کی جمع ہے جس کے  
معنی سامنے کے ہیں۔ مجاہدؒ نے اس کے معنی جماعت  
درجمات کیے ہیں اس صورت میں یہ قبیل کی جمع ہوگی۔  
اس طرح آیت کریمہ: ﴿أَوْ يَأْتِيَهُمُ الْعَذَابُ  
قُبُلًا﴾ (۱۸-۵۵) یا ان پر عذاب سامنے آ موجود ہو۔

میں بھی قُبُلًا کے معنی میں اختلاف ہے بعض نے قَبْلًا  
پڑھا ہے جس کے معنی عِيَانًا یعنی سامنے کے ہیں۔

الْقَبِيلُ: یہ قبیلہ کی جمع ہے یعنی وہ جماعت جو ایک  
دوسرے پر متوجہ ہو۔ قرآن پاک میں ہے:  
﴿وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ﴾ (۴۹-۱۳) تمہاری  
قومیں اور قبیلے بنائے۔

﴿وَالْمَلَائِكَةُ قَبِيلًا﴾ (۱۷-۹۲) اور فرشتوں کو  
(ہمارے) سامنے لے آؤ۔

بعض نے کہا ہے کہ یہاں قَبِيلٌ بمعنی كَفِيلٌ یعنی ضامن  
کے ہے اور یہ قَبِلْتُ فُلَانًا وَتَقَبَّلْتُ بِهِ کے محاورہ  
سے ماخوذ ہے جس کے معنی ضامن بننے کے ہیں۔ اور  
بعض نے اس کے معنی مقابلہ یعنی معائنہ کیے ہیں۔ مثل  
مشہور ہے۔

فُلَانٌ لَا يَعْرِفُ قَبِيلًا مِّنْ دَبِيرٍ: وہ عورت کے  
اگلے اور پچھلے سوت میں تمیز نہیں کر سکتا یعنی بیوقوف ہے۔  
الْمُقَابِلَةُ وَالتَّقَابُلُ کے معنی ایک دوسرے کی طرف  
متوجہ ہونے کے ہیں خواہ وہ توجہ بذریعہ ذات کے ہو یا

قَتَرْتُ الشَّيْءَ وَأَقْتَرْتُهٗ وَقَتَرْتُہٗ کے معنی کسی چیز کو کم کرنے کے ہیں اور مُقْتِرٌ بمعنی فقیر ہے قرآن پاک میں ہے:

﴿وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدْرُهُ﴾ (۲-۲۳۶) اور تنگدست اپنی حیثیت کے مطابق۔

اصل میں یہ قُتَارٌ وَقَتَرٌ سے ہے جس کے معنی اس دھواں کے ہیں جو کسی چیز کے بھونے یا لکڑی کے جلنے سے اٹھتا ہے گویا مُقْتِرٌ اور مُقْتِرٌ بھی ہر چیز سے دھوئیں کی طرح لیتا ہے اور آیت کریمہ:

﴿تَسْرَهُنَّهَا قَتَرَةٌ﴾ (۸۰-۸۱) (اور) سیاہی چڑھ رہی ہوگی۔

میں قَتَرَةٌ عَبْرَةٌ کی طرح ہے مراد دھوئیں کی طرح سیاہی اور افسردگی ہے جو جھوٹ کی وجہ سے چہرہ پر چھا جاتی ہے۔

الْقَتْرَةُ: شکاری کی کمین گاہ جو انسان کی بو کو بھی شکار تک نہیں پہنچنے دیتی۔ کیونکہ شکاری کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اس کی بو بھی شکار تک نہ پہنچے تاکہ شکار بھاگ نہ جائے۔

رَجُلٌ قَاتِرٌ: کمزور آدمی۔ گویا وہ ضعف میں دھوئیں کی طرح ہے جیسا کہ کمزور آدمی کو ہوو ہبَاءٌ کہا جاتا ہے۔

إِنُّنْ قَتْرَةٌ: ایک باریک اور چھوٹا سا سانپ۔ الْقَتِيرُ: زرہ کی میٹھوں کے سرے۔

## (ق ت ل)

الْقَتْلُ: (ن) الموت کی طرح اس کے معنی بھی جسم سے روح کو زائل کرنے کے ہیں لیکن موت اور قتل میں فرق یہ ہے کہ اگر اس فعل کو سرانجام دینے والے کا اعتبار کیا جائے تو اسے قتل کہا جاتا ہے اور اگر صرف روح کے فوت ہونے کا اعتبار کیا جائے تو اسے موت کہا جاتا

اور قَبُولٌ کے معنی پُر واک ہوا کے ہیں اور اسے قَبُولٌ اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ قبلہ کی جانب متوجہ ہوتی ہے اور سر کی ہڈیوں کے ملنے کی جگہ کو قَبِيلَةٌ کہا جاتا ہے اور مَقَابِلَةٌ اس بکری کو کہا جاتا ہے جس کا کان سامنے کی جانب سے کٹا ہوا ہو۔ اور قَبَالُ النَّعْلِ کے معنی جوتے کا تسمہ کے ہیں قَابِلْتُ النَّعْلَ: جوتے کو تسمہ لگانا۔

الْقَبْلُ: پاؤں کے نیچہ کا اندر کی جانب مڑا ہوا ہونا الْقَبْلَةُ: ایک قسم کا منکا جس کے متعلق ساحروں کا خیال ہے کہ وہ باہم محبت کا کام دیتا ہے اسی سے قُبْلَةٌ ہے جس کے معنی بوسہ کے ہیں اس کی جمع قبل آتی ہے۔ اور قَبْلَتُهُ تَقْبِيلًا کے معنی بوسہ دینے کے ہیں۔<sup>①</sup>

## (ق ت ر)

الْقَتْرُ: (ن) کے معنی بہت ہی کم خرچ کرنے اور بخل کرنے کے ہیں۔ یہ اسْتِرَافٌ کی ضد ہے۔ اور یہ دونوں صفات مذمومہ سے ہیں قرآن پاک میں ہے:

﴿وَالَّذِينَ إِذَا أَنْفَقُوا لَمْ يَسْرِفُوا وَلَمْ يَقْتُرُوا وَكَانَ بَيْنَ ذَلِكَ قَوَامًا﴾ (۲۵-۶۷) بلکہ اعتدال کے ساتھ نہ ضرورت سے زیادہ نہ کم۔ اسی سے صفت مشبہ کا صیغہ قَتُورٌ وَمُقْتِرٌ آتا ہے اور آیت کریمہ۔

﴿وَكَانَ الْإِنْسَانُ قَتُورًا﴾ (۱۷-۱۰۰) اور انسان دل کا بہت تنگ ہے۔

میں اس بات پر تنبیہ ہے کہ انسان فطرۃً کنجوس واقع ہوا ہے جیسے فرمایا:

﴿وَأَخْضَرَتِ الْأَنْفُسُ الشُّحَّ﴾ (۴-۱۲۸) اور طبیعتیں تو بخل کی طرف مائل ہوتی ہیں۔

① انظر في القبله لطائف و طرائف (محاضرات الادباء) (۱۲۰/۳-۱۲۲)

ہے۔ قرآن میں ہے۔

﴿أَفَأَسِنَّ مَاتَ أَوْ قُتِلَ﴾ (۱۴۴-۳) بھلا اگر یہ مر

جائیں یا مارے جائیں۔

﴿فَلَمْ تَقْتُلُوهُمْ وَلَكِنَّ اللَّهَ قَتَلَهُمْ﴾ (۱۷-۸)

تم لوگوں نے ان (کفار) کو قتل نہیں کیا بلکہ خدا نے انہیں قتل کیا۔

﴿قُتِلَ الْإِنْسَانُ﴾ (۱۷-۸۰) انسان ہلاک ہو

جائے۔ اور آیت کریمہ:

﴿قُتِلَ الْخَرَّاصُونَ﴾ (۱۰-۵۱) انگل دوڑانے والے

ہلاک ہوں۔

میں بعض نے کہا ہے کہ یہ بددعا کے لیے ہے اور قتل کی

نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو اس کے معنی ایجاد قتل کے

ہوتے ہیں اور آیت کریمہ:

﴿فَأَقْتُلُوا أَنْفُسَكُمْ﴾ (۵۴-۲) اور اپنے تئیں ہلاک

کر ڈالو۔

کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ تم آپس میں ایک دوسرے کو قتل

کر دو اور بعض نے خواہشات نفسانی کا قلع قمع کر دینا مراد لیا

ہے۔ اسی سے بطور استعارہ کہا جاتا ہے۔

﴿قَتَلْتُ الْخَمْرَ بِالنَّمَاءِ﴾ میں نے شراب میں پانی ملا دیا

(جس سے اس کا جوش ٹھنڈا ہو گیا)

﴿قَتَلْتُ فُلَانًا وَقَتَلْتُهُ﴾ میں نے اسے ذلیل کر دیا۔

شاعر نے کہا ہے ❶ (البیض)

(۳۵۰) كَانَ عَيْنِي فِي عَرَبِي مُقْتَلَةٍ

گویا میری دونوں آنکھیں بھرے ہوئے ڈول میں رکھی

ہوئی ہیں۔

﴿قَتَلْتُ كَذَا عِلْمًا﴾ میں نے اچھی طرح جان لیا۔ اور

آیت کریمہ

﴿وَمَا قَتَلُوهُ يَقِينًا﴾ (۱۵۷-۴) اور انہوں نے

عیسیٰ علیہ السلام کو یقیناً قتل نہیں کیا۔

کے معنی یہ ہیں کہ انہیں مسیح علیہ السلام کے مصلوب ہونے کا یقین

نہیں ہے۔ ❷

﴿الْمُقَاتَلَةُ﴾ کے معنی جنگ کرنے اور کسی کے درپے قتل

ہونے کے ہیں قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَقَتَلُوهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةً﴾ (۱۹۳-۲) اور

ان سے اس وقت تک لڑتے رہنا کہ فسادنا بود ہو جائے۔

﴿وَلَسِنَّ قُوتِلُوا﴾ (۱۲-۵۹) اور اگر ان سے جنگ

ہوئی۔

﴿قَاتِلُوا الَّذِينَ يَلُونَكُمْ مِنَ الْكُفَّارِ﴾ (۱۲۳-۹)

(اپنے نزدیک کے رہنے والے) کافروں سے جنگ

کرو۔

﴿وَمَنْ يُقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَيُقْتَلْ﴾ (۷۴-۴)

اور جو شخص خدا کی راہ میں جنگ کرے پھر شہید ہو جائے۔

بعض نے کہا ہے کہ قتل کے معنی دشمن اور ہمسر کے ہیں مگر

اسکے اصل معنی مقاتل یعنی لڑنے والا کے ہیں اور آیت

کریمہ۔

﴿فَقَاتِلْهُمْ اللَّهُ﴾ (۳-۹) خدا ان کو ہلاک کرے۔

بعض کے نزدیک جملہ دعائیہ ہے کہ اللہ ان پر لعنت کرے

اور بعض نے اس کے معنی قتل کر دینا کے لکھے ہیں۔ لیکن

❶ وتامة: من النواضح تسقى حنة سحقا۔ قاله زهير وقد مر تخريجه (جن) والبيت ايضا في المحكم (سحق)

❷ راجع (ی ق ن) ۱۲

(۵-۹۵) جب تم احرام کی حالت میں ہو تو شکار نہ مارنا، اور جو تم میں سے جان بوجھ کر اسے مارے تو (یا اس کا) بدلہ (دے) اور وہ یہ ہے کہ اسی طرح کا چار پایہ۔

میں ذبح کی بجائے لفظ قتل اس لیے ذکر کیا ہے کہ یہ سب الفاظ سے اعم ہے اور اس میں متنبہ کیا ہے کہ احرام کی حالت میں شکار کی جان لینا ہیثمہ وجہ ممنوع ہے۔

أَقْتَلْتُ فُلَانًا میں نے اسے قتل کے لیے پیش کیا۔ اَقْتَلْتُ النِّجْنُ وَالْعِشْقُ: اسے عشق یا جن نے قتل کر ڈالا۔ اور یہ لفظ ان دونوں کے علاوہ کسی اور کے ساتھ استعمال نہیں ہوتا اور اَقْتَالَ بمعنی مَقَاتَلَهُ بھی آتا ہے جیسے فرمایا: ﴿مَنْ الْمُؤْمِنِينَ أَقْتَلُوا﴾ (۳۹-۹) مومنوں میں سے..... آپس میں لڑیں۔

### (ق ح م)

الْإِفْتِحَامُ کے معنی کسی خوف ناک جگہ میں گھس جانے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿فَلَا أَفْتَحَمَ الْعُقَبَةَ﴾ (۹۰-۱۱) مگر وہ گھاٹی پر سے ہو کر نہ گزرا۔

﴿هَذَا فَوْجٌ مُّقْتَحِمٌ﴾ (۳۸-۵۹) یہ ایک فوج ہے جو..... داخل ہوگی۔ فَحَمَ الْفَرَسُ فَارِسَهُ: گھوڑا اپنے سوار کو لے کر خطرناک جگہ میں جا گھسا۔

فَحَمَ فُلَانٌ نَفْسَهُ فِي كَذَا اس نے اپنے تئیں بے سوچے سمجھے خطرہ میں ڈال دیا۔

مَقَاجِئِمُ: (واحد مَفْجَامُ) بے خطر کسی (خوف ناک) امر میں گھس جانے والے۔ شاعر نے کہا ہے: ❶

اصل میں یہ باب مفاعلہ سے ہے اور معنی یہ ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ سے لڑائی کے درپے ہو رہے ہیں اور جو اللہ سے جنگ کرے گا وہ مغلوب ہوگا جیسے فرمایا:

﴿وَأَنْ جُنَدَنَا لَهُمُ الْغَالِبُونَ﴾ (۲۷-۱۷۳) اور ہمارا لشکر غالب رہے گا۔

اور آیت کریمہ:

﴿وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ مِنْ إِمْلَاقٍ﴾ (۶-۱۵۲) اور ناداری (کے اندیشے) سے اپنی اولاد کو قتل نہ کرنا۔ کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ اس میں لڑکیوں کو زندہ درگور کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ اور بعض نے کہا ہے نہیں بلکہ عَزْلُ کے ذریعہ نطفے کو ضائع کرنے اور اسے بے محل ڈالنے سے منع فرمایا ہے اور بعض کا قول ہے کہ اس میں اولاد کو ایسے کاموں میں مشغول رکھنے سے منع کیا ہے جو ان کو حصول علم اور ایسے کاموں میں کوشش کرنے سے روک رکھیں جو ابدی زندگی کے حصول کا ذریعہ بنتے ہیں کیونکہ جاہل اور غافل لوگ آخرت سے مردوں کی طرح بے خبر رہتے ہیں اسی بنا پر آیت:

﴿أَمْوَاتٌ غَيْرُ أَحْيَاءٍ﴾ (۱۶-۲۱) وہ لاشیں ہیں بے جان۔ میں انہیں مردے کہا ہے اور یہی معنی آیت: ﴿وَلَا تَقْتُلُوا أَنْفُسَكُمْ﴾ (۳-۲۹) اور اپنے آپ کو ہلاک نہ کرو، کے ہیں کیونکہ اس کے بعد:

﴿وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ عُدُوْنَا وَظُلْمًا﴾ (اور جو تعدی و ظلم سے ایسا کرے گا) فرمایا ہے۔ اور آیت کریمہ: ﴿لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَأَنْتُمْ حُرْمٌ وَمَنْ قَتَلَهُ مِنْكُمْ مُتَعَمِّدًا فَجَزَاءٌ مِثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ﴾

﴿قَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَيْنَا﴾ (۹۰-۱۲) خدا نے ہم پر بڑا احسان کیا ہے۔

﴿قَدْ كَانَ لَكُمْ آيَةٌ فِي فِئْتَيْنِ﴾ (۱۳-۳) تمہارے لیے دو گروہوں میں ..... (قدرت خدا کی عظیم الشان نشانی تھی۔

﴿قَدْ سَمِعَ اللَّهُ﴾ (۱-۵۸) خدا نے ..... سن لی۔  
﴿لَقَدْ رَضِيَ اللَّهُ عَنِ الْمُؤْمِنِينَ﴾ (۱۸-۲۸) (اے پیغمبر) ..... تو خدا ان سے خوش ہوا۔

﴿لَقَدْ تَابَ اللَّهُ عَلَى النَّبِيِّ﴾ (۹-۱۱۷) بے شک خدا نے پیغمبر پر مہربانی کی۔

اور چونکہ یہ فعل ماضی پر تجدد کے لیے آتا ہے اس لیے اللہ تعالیٰ کے اوصاف ذرا حیح کے ساتھ استعمال نہیں ہوتا۔ لہذا قَدْ كَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا۔“ کہنا صحیح نہیں ہے اور آیت:

﴿قَدْ عَلِمَ أَنْ سَيَكُونُ مِنْكُمْ مَرْرَضٌ﴾ (۲۰-۷۳) اس نے جانا کہ تم میں بعض بیمار بھی ہوتے ہیں۔

میں قَدْ لَفْظًا اگرچہ علم پر داخل ہوا ہے لیکن معنوی طور پر اس کا تعلق مرض کے ساتھ ہے جیسا کہ ”مَا عَلِمَ اللَّهُ زَيْدًا يَخْرُجُ“ میں نئی کا تعلق خروج کے ساتھ ہے۔ اور اس کی تقدیر یوں ہے: قَدْ يَمْرُضُونَ فِيمَا عَلِمَ اللَّهُ ”وَمَا يَخْرُجُ زَيْدٌ فِيمَا عَلِمَ اللَّهُ“ اگر ”قَدْ“ فعل مستقبل پر داخل ہو تو تقلیل کا فائدہ دیتا ہے یعنی کبھی وہ فعل واقع ہوتا ہے اور کبھی واقع نہیں ہوتا اور آیت کریمہ:

﴿قَدْ يَعْلَمُ اللَّهُ الَّذِينَ يَتَسَلَّلُونَ مِنْكُمْ لِوَاذًا﴾ (۲۳-۷۳) خدا کو یہ لوگ معلوم ہیں جو تم میں سے آنکھ پچا

(۳۵۱) مَقَاحِيْمٌ فِي الْأَمْرِ الَّذِي يَتَجَنَّبُ وہ قابلِ اجتناب یعنی خوفناک امور میں بے دھڑک گھسنے والے ہیں ..... ایک روایت میں يَتَهَيَّبُ ہے۔

## (ق د د)

أَلْقَدُ کے معنی کسی چیز کو طول میں قطع کرنے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَإِنْ كَانَ قَمِيصُهُ قُدٌّ مِنْ قَبْلٍ﴾ (۲۱-۲۷) اور اگر کرتہ پیچھے سے پھٹا ہو۔

﴿وَإِنْ كَانَ قَمِيصُهُ قُدٌّ مِنْ دُبُرٍ﴾ (۱۲-۲۷) اور اگر کرتہ پیچھے سے پھٹا ہو۔

أَلْقَدُ: بمعنی مَقْدُوْدٌ ہے اور اسی سے انسان کے قد و قامت کو قَدْ کہا جاتا ہے جیسا کہ: تَقْطِيعُ الْإِنْسَانِ (انسان کا قد و قامت) کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔

قَدَرْتُ اللَّحْمَ کے معنی گوشت کے پارے بنانے کے ہیں اور کٹے ہوئے گوشت کو قَدِيدٌ کہا جاتا ہے۔

أَلْقَدُ اس کا واحد قَدَّةٌ ہے اور اس کے معنی مختلف طرق اور مذاہب کے ہیں جیسے فرمایا: ﴿كُنَّا طَرَاثِقَ قَدَدًا﴾ (۱۱-۷۲) ہمارے کئی طرح کے مذاہب ہیں۔

اور قَدَّةٌ کے معنی لوگوں کی بولی اور گروہ کے بھی آتے ہیں جیسے قَطْعَةُ اقْتَدَّ الْأَمْرُ: کسی کام کی تدبیر کرنا جیسا کہ:

فَصَلَ وَحَزَمَ الْأَمْرَ کا محاورہ ہے۔

## (ق د)

یہ حرف تحقیق ہے اور فعل کے ساتھ مخصوص ہے علماء نحو کے نزدیک یہ حرف توقع ہے اور اصل میں جب یہ فعل ماضی پر آئے تو تجدد اور حدوث کے معنی دیتا ہے جیسے فرمایا:

(۲۲-۲۹) اور وہ جب چاہے ان کے جمع کر لینے پر.....

قادر ہے۔

اور یہی معنی تقریباً مُقْتَدِر کے ہیں جیسے فرمایا: ﴿عِنْدَ مَلِكٍ مُّقْتَدِرٍ﴾ (۵۳-۵۵) ہر طرح کی قدرت

رکھنے والے بادشاہ کی بارگاہ میں۔

﴿فَأَنَّا عَلَيْهِمْ مُّقْتَدِرُونَ﴾ (۳۳-۳۲) ہم ان پر قابو رکھتے ہیں۔

لیکن مقتدر کے ساتھ کبھی انسان بھی متصف ہو جاتا ہے۔ اور جب اللہ تعالیٰ کے متعلق مقتدر کا لفظ استعمال ہو تو یہ قدیر کے ہم معنی ہوتا ہے اور جب انسان کا وصف واقع ہو تو اس کے معنی تکلیف سے قدرت حاصل کرنے والا کے ہوتے ہیں۔ محاورہ ہے۔

قَدَرْتُ عَلَى كَذَا قُدْرَةً کہ میں نے فلاں چیز پر قدرت حاصل کر لی۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿لَا يَفْدِرُونَ عَلَى شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوا﴾ (۲۶۴-۲۶۲) (اسی طرح) یہ (ریا کار) لوگ اپنے اعمال کا کچھ بھی صلہ نہیں لے سکیں گے۔

الْقَدْرُ وَالتَّقْدِيرُ کے معنی کسی چیز کی کیت کو بیان کرنے کے ہیں۔ کہا جاتا ہے: قَدَرْتُهُ وَقَدَّرْتُهُ اور قَدَرَهُ (تفعیل) کے معنی کسی کو قدرت عطا کرنا بھی آتے ہیں محاورہ ہے۔

قَدَّرَنِي اللَّهُ عَلَى كَذَا وَقَوَّانِي عَلَيْهِ: اللہ نے مجھے اس پر قدرت عطا فرمائی پس ”تقدیر الہی“ کی دو صورتیں ہیں (۱) اللہ تعالیٰ کا اشیاء کو قدرت بخشنا (۲) یا اللہ تعالیٰ کا اشیاء کو مقدار مخصوص اور طرز مخصوص پر بنانا جیسا کہ اس کی حکمت کا تقاضا ہے اس لیے کہ فعل الہی دو قسم پر ہے اول

کر چل دیتے ہیں۔

کی تقدیریوں ہے قَدْ يَتَسَلَّلُونَ أَحْيَانًا فِيمَا عَلِمَ اللَّهُ..... تو یہ آیت بھی ماسبق کی طرح موہل ہوگی اور قد کا تعلق تسلل کے ساتھ ہوگا۔

قَدْ وَقَطَّیہ دونوں اسم فعل بمعنی حَسَبُ کے آتے ہیں جیسے محاورہ ہے: قَدْ نَسِیَ كَذَا وَقَطَّنِي كَذَا اور قَدِنِي (بدون نون وقایہ) کا محاورہ بھی حکایت کیا گیا ہے فراء نے قَدِنِي اور قَدْكَ پر قیاس کر کے قَدْ زَيْدًا بھی حکایت کیا ہے لیکن صحیح یہ ہے کہ قَدْ (اسم فعل) اسم ظاہر کے ساتھ استعمال نہیں ہوتا بلکہ صرف اسم مضمَر کے ساتھ آتا ہے۔

## (ق د ر)

الْقُدْرَةُ: (قدرت) اگر یہ انسان کی صفت ہو تو اس سے مراد وہ قوت ہوتی ہے جس سے انسان کوئی کام کر سکتا ہو اور اللہ تعالیٰ کے قادر ہونے کے معنی یہ ہیں کہ وہ عاجز نہیں ہے اور اللہ کے سوا کوئی دوسری ہستی معنوی طور پر قدرت کاملہ کے ساتھ متصف نہیں ہو سکتی اگرچہ لفظی طور پر ان کی طرف نسبت ہو سکتی ہے اس لیے انسان کو مطلقاً هُوَ قَادِرٌ کہنا صحیح نہیں ہے۔ بلکہ تنقید کے ساتھ هُوَ قَادِرٌ عَلَى كَذَا کہا جائے گا لہذا اللہ کے سوا ہر چیز قدرت اور عجز دونوں کے ساتھ متصف ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی ذات ہی ایسی ہے جو ہر لحاظ سے عجز سے پاک ہے۔

الْقَدِيرُ: اسے کہتے ہیں جو اقتضائے حکمت کے مطابق جو چاہے کر سکے اور اس میں کمی بیشی نہ ہونے دے۔ لہذا اللہ کے سوا کسی کو قدیر نہیں کہہ سکتے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَهُوَ عَلَى جَمْعِهِمْ إِذَا يَشَاءُ قَدِيرٌ﴾

ہیں اور یا اعطاء قدرت کے اور آیت کریمہ:  
نَحْنُ قَدَرْنَا بَيْنَكُمْ الْمَوْتَ هَمَّ نَمَّ مِمَّنْ مَرَّ مَرَّ مَرَّ  
دیا۔

میں اس امر پر تنبیہ ہے کہ موت مقدر کرنے والا چونکہ اللہ تعالیٰ ہی ہے اس لیے یہ بھی عین حکمت کے مطابق ہے اور مجوس کا یہ زعم غلط ہے کہ اللہ تعالیٰ پیدا کرتا ہے اور الیسیں مارتا ہے۔ اور آیت کریمہ ﴿إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ﴾ ہم نے اس (قرآن پاک) کو شب قدر میں نازل کرنا شروع کیا۔

میں لَيْلَةُ الْقَدْرِ سے خاص رات مراد ہے جسے امور مخصوصہ کی انجام دہی کے لیے اللہ نے مقرر کر رکھا ہے۔ نیز فرمایا۔

﴿إِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنَاهُ بِقَدَرٍ﴾ (۵۴-۵۹) ہم نے ہر چیز اندازہ مقرر کے ساتھ پیدا کی ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَاللَّهُ يُقَدِّرُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ عَلِيمٌ أَنْ لَنْ تُخْصِسُوهُ﴾ (۷۳-۷۴) اور خدا تورات اور دن کا اندازہ رکھتا ہے اس نے معلوم کیا کہ تم اس کو نباہ نہ سکو گے۔

میں سلسلہ لیل و نہار کے اجراء کی طرف اشارہ ہے اور یہ کہ ان کے اوقات کی معرفت حاصل کرنا اور پھر اوقات معینہ میں حق عبادات ادا کرنا کسی کے لیے ممکن نہیں ہے اور آیت کریمہ:

﴿مِنْ نُطْفَةٍ خَلَقَهُ فَقَدَرَهُ﴾ (۸۰-۱۹) نطفے سے بنایا پھر اس کا اندازہ مقرر کیا۔

میں ان قوی کی طرف اشارہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے نطفہ میں

ایجاد بالفعل یعنی ابتداء ہی سے کسی چیز کو ایسا کامل وجود عطا کرنا کہ جب تک مشیت الہی اس کے فنا یا تبدیل کی مقتضی نہ ہو اس میں کمی بیشی نہ ہو سکے جیسے اجرام سماویہ اور مافیہا کی تخلیق (کہ ان میں تا قیامت کسی قسم کا تغیر نہیں ہوگا) دوم یہ کہ اصول اشیاء کو بالفعل اور ان کے اجزاء کو بالقوة وجود عطا فرمانا اور ان کو اس اندازہ کے ساتھ مقدر کرنا کہ اس کی خلاف ظہور پذیر نہ ہو سکیں جیسا کہ خرما کی کھٹلی کے متعلق تقدیر الہی یہ ہے کہ اس سے خرما کا درخت ہی اگتا ہے اور سیب یا زیتون کا درخت نہیں اگ سکتا اسی طرح انسان کی منی سے انسان ہی پیدا ہوتا ہے دوسرے جانور پیدا نہیں ہو سکتے۔ پس تقدیر الہی کے دو معنی ہوئے ایک یہ کہ کسی چیز کے متعلق نفی یا اثبات کا حکم لگانا کہ یوں ہوگا اور یوں نہیں ہوگا۔ عام اس سے کہ وہ حکم بر سبیل وجوب ہو یا بر سبیل امکان چنانچہ آیت:

﴿قَدْ جَعَلَ اللَّهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا﴾ (۶۵-۳) خدا نے ہر چیز کا اندازہ مقرر کر رکھا ہے۔

میں یہی معنی مراد ہیں دوم، کسی چیز پر قدرت عطا کرنے کے ہیں۔ اور آیت کریمہ:

﴿فَقَدَرْنَا فَنِعْمَ الْقَادِرُونَ﴾ (۷۷-۲۳) پھر اندازہ مقرر کیا اور ہم کیا ہی خوب اندازہ مقرر کرنے والے ہیں۔ میں اس امر پر تنبیہ ہے کہ اللہ کا ہر حکم قابل ستائش ہے۔ اور یہ آیت:

﴿قَدْ جَعَلَ اللَّهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا﴾ (۶۵-۳) خدا نے ہر چیز کا اندازہ مقرر کر رکھا ہے۔

کے ہم معنی ہے اور اس میں ایک قرأت فَقَدَرْنَا (تشدید وال) کے ساتھ بھی ہے اور اس کے معنی یا تو حکم کرنے کے

یہ ہیں کہ جو شخص اپنی مقدور کے مطابق اخراجات ادا کرے۔ اور آیت کریمہ ﴿وَالَّذِي قَدَّرَ فَهَدَى﴾ (۳۸-۳۷) اور جس نے (اس کا) اندازہ ٹھہرایا (پھر اس کو) رستہ بتایا کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو وہ کچھ عطا فرمادیا جس میں اس کی مصلحت ہے اور اسے تعلیمی یا تسخیری طور پر ان چیزوں کی طرف ہدایت کر دی ہے جن میں اس کی نجات مضمر ہے جیسے فرمایا ﴿الَّذِي أَعْطَى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهُ ثُمَّ هَدَى﴾ (۵۰-۲۰) جس نے ہر چیز کو اس کی شکل و صورت بخش پھر راہ دکھائی۔

جب ”تقدیر“ کا فاعل انسان ہو تو اس کے دو معنی ہوتے ہیں ایک تقدیر محمود یعنی عقل و فکر کے مطابق کسی امر پر غور و فکر کرنا اور پھر اس فارمولہ کے مطابق کسی کام کو سرانجام دینا۔ دوم تقدیر مذموم کہ انسان اپنی تمنا اور خواہش کے پیانہ کے مطابق کسی امر پر غور و فکر کرے اور عقل و فکر سے کام نہ لے جیسے فرمایا:

﴿إِنَّهُ فَكَّرَ وَقَدَّرَ فَقَتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ﴾ (۴۳-۱۸-۱۹) اس نے فکر کیا اور تجویز کی یہ مارا جائے اس نے کیسی تجویز کی۔

اور استعارہ کے طور پر قدرت اور مقدور کے معنی حالت اور وسعت مالی کے بھی آتے ہیں اور قدر کے معنی اس معین وقت یا مقام کے بھی ہوتے ہیں جو کسی کام کے لیے مقرر ہو چکا ہو چنانچہ فرمایا ﴿إِلَىٰ قَدَرٍ مَّعْلُومٍ﴾ (۷۷-۲۲) ایک معین وقت تک۔ نیز فرمایا:

بالقوة وليت كرركه ہیں اور وہ وقتاً فوقتاً صورت کا لباس پہن کر ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں۔ اور آیت کریمہ ﴿وَكَانَ أَمْرُ اللَّهِ قَدَرًا مَّقْدُورًا﴾ (۳۸-۳۳) اور خدا کا حکم ٹھہر چکا ہے۔

میں قدر کے لفظ سے ان امور کی طرف اشارہ ہے جن کا فیصلہ ہو چکا ہے اور وہ لوح محفوظ میں لکھے جا چکے ہیں جن کی طرف کہ آنحضرت ﷺ نے اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: ﴿(۷۸)﴾

﴿فَسَرَ رَبُّكُمْ مِنَ الْخَلْقِ وَالْأَجَلِ وَالرَّزْقِ﴾ کہ اللہ تبارک و تعالیٰ خلق، عمر اور رزق سے فارغ ہو چکا ہے اور مقدور کے لفظ سے ان امور کی طرف اشارہ ہے جو وقتاً فوقتاً ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں۔ جن کی طرف کہ آیت:

﴿كُلُّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ﴾ (۵۵-۲۹) وہ ہر روز کام میں مصروف رہتا ہے۔ میں اشارہ فرمایا ہے اسی معنی میں فرمایا۔ ﴿وَمَا نُنْزِلُ إِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُومٍ﴾ (۱۵-۲۱) اور ہم ان کو بمقدار مناسب اتارتے رہتے ہیں۔

ابو الحسن نے کہا ہے کہ یہ قَدَرٌ وَقْدُورٌ (بفتح الدال و سکونہا) دونوں طرح بولا جاتا ہے چنانچہ مجاورہ خُذْ بِقَدَرٍ كَذَا وَقَدَرٌ كَذَا (کہ اتنی مقدار میں لے لو) فَكَلَانَ يُخَاصِمُ بِقَدَرٍ وَقَدَرٌ اور آیت کریمہ: ﴿عَلَىٰ الْمَوْسِعِ قَدْرُهُ وَعَلَىٰ الْمُقْتَرِ قَدْرُهُ﴾ (۲۳۶-۲) (یعنی) مقدور والا اپنے مقدور کے مطابق دے اور تنگ دست اپنی حیثیت کے مطابق میں قدر کے معنی

① وفی روایۃ ابن عساکر عن انس مرفوعاً فرغ اللہ عن أربع من الخلق الخ وفی روایۃ الطبرانی عن ابی الدرداء ((من خمس من اجله ورزقه و اثره مضجعه و شقی اور سعید)) (راجع کنز العمال رقم ۴۹۶-۴۹۷) و الفتح الکبیر للبیہانی (۲/۲۶۶)



پاؤں ٹھیک اس جگہ پڑیں جہاں اگلے پاؤں پڑے تھے۔  
اور آیت کریمہ:

﴿وَمَا قَدَرُوا اللَّهَ حَقَّ قَدْرِهِ﴾ (۷۶-۳۹) ان لوگوں نے اللہ کی قدر شناسی جیسے کرنا چاہیے تھی نہیں کی۔

یعنی یہ لوگ اس کی حقیقت کو نہیں پاسکے اور پھر اس امر پر تنبیہ کی ہے کہ وہ اس کی کہنہ کا ادراک بھی کیسے کر سکتے ہیں جب کہ اس کی شان یہ ہے کہ ﴿وَالْأَرْضُ جَمِيعًا قَبْضَتُهُ يَوْمَ الْقِيَمَةِ﴾ (۷۶-۳۹) اور قیامت کے دم تمام زمین اس کی مٹھی میں ہوگی۔

اور آیت کریمہ:

﴿أَن أَعْمَلَ سُيُغْفِرُ وَقَدِّرْ فِي السَّرْدِ﴾ (۱۱-۳۴) کہ کشادہ زر ہیں بناؤ اور کڑیوں کو اندازے سے جوڑ دو۔

میں قَدِّرْ فِي السَّرْدِ کے معنی یہ ہیں کہ مضبوط اور محکم زر ہیں بناؤ۔

اور مِقْدَارُ الشَّيْءِ، اس وقت یا زمانہ وغیرہ کو کہا جاتا ہے جو کسی چیز کے لئے مقرر کیا گیا ہو۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ خَمْسِينَ أَلْفَ سَنَةٍ﴾ (۴-۷۰) اور اس روز (نازل ہوگا) جس کا اندازہ پچاس ہزار برس کا ہوگا۔ اور آیت کریمہ:

﴿لَبَّيْلاً يَعْلَمُ أَهْلُ الْكِتَابِ إِلَّا يَقْدِرُونَ عَلَى شَيْءٍ مِّنْ فَضْلِ اللَّهِ﴾ (۲۶-۵۷) (یہ باتیں) اس لیے (بیان کی گئی ہیں) کہ اہل کتاب جان لیں کہ وہ خدا کے فضل پر کچھ بھی قدرت نہیں رکھتے۔

پر بحث تاویل کے ساتھ مختص ہے (یعنی اس میں تاویل

﴿فَسَالَتْ أَوْدِيَةٌ بِقَدَرِهَا﴾ (۱۷-۱۳) پھر اس سے اپنے اپنے اندازے کے مطابق نالے بہ نکلے۔ یعنی نالے اپنے اپنے ظرف کے مطابق بہ نکلتے ہیں ایک قرأت میں بِقَدَرِهَا ہے جو بمعنی تقدیر یعنی اندازہ..... کے ہے اور آیت کریمہ۔

﴿وَعَدُوا عَلَى حَرِّ قَادِرِينَ﴾ (اور کوشش کے ساتھ) سویرے ہی جا پہنچے (گویا کھیتی پر) قادر ہیں۔ میں قادرین کے معنی قاصدین کے ہیں یعنی جو وقت انہوں نے مقرر کر رکھا تھا۔ اندازہ کرتے ہوئے اس وقت پر وہاں جا پہنچے اور یہی معنی آیت کریمہ:

﴿فَالْتَقَى الْمَاءُ عَلَى أَمْرٍ قَدْ قُدِرَ﴾ (۱۲-۵۴) تو پانی ایک کام کے لیے جو مقدر ہو چکا تھا جمع ہو گیا۔

میں مراد ہیں۔ اور قَدَرْتُ عَلَيْهِ الشَّيْءَ کے معنی کسی پر تنگی کر دینے کے ہیں گویا وہ چیز اسے معین مقدار کے ساتھ دی گئی ہے اس کے بالمقابل بغیر حساب (یعنی بے اندازہ) آتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔ ﴿وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهُ﴾ (۷۶-۷۵) اور جس کے رزق میں تنگی ہو۔

یعنی جس پر اس کی روزی تنگ کر دی گئی ہو۔ نیز فرمایا:

﴿إِنَّ اللَّهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَشَاءُ وَيَقْدِرُ﴾ (۲۶-۱۳) خدا جس پر چاہتا ہے رزق فراخ کر دیتا ہے اور جس کا چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے۔

﴿فَظَنُّوا أَن لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ﴾ (۸۷-۲۱) اور خیال کیا کہ ہم ان پر تنگی نہیں کریں گے۔

اور ایک قرأت میں لَنْ نَقْدِرَ عَلَيْهِ ہے اور اسی سے لفظ اقدر مشتق ہے جس کے معنی کوتاہ گردن آدمی کے ہیں اور اقدر اس گھوڑے کو بھی کہتے ہیں جس کے دوڑتے وقت پچھلے

ہیں کہ ہم تیرے حکم کی بجا آوری میں اشیاء کو پاک و صاف کرتے ہیں اور بعض نے اس کے معنی - نَصْفُكَ بِالتَّقْدِيسِ بھی لکھے ہیں۔ یعنی ہم تیری تقدیس بیان کرتے ہیں۔ اور آیت کریمہ:

﴿قُلْ نَزَّلَهُ رُوحُ الْقُدُسِ﴾ (۱۶-۱۰۲) کہہ دو کہ اس کو روح القدس..... لے کر نازل ہوئے ہیں، میں روح القدس سے مراد حضرت جبریل علیہ السلام ہیں کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے قدس یعنی قرآن پاک حکمت اور فیض الہی لے کر نازل ہوتے تھے جس سے نفوس انسانی کی تطہیر ہوتی ہے۔ اور البیت المقدس کو بیت مقدس اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ نجاست شرک سے پاک صاف ہے۔

اسی طرح آیت کریمہ:

﴿يُقِيمُوا اَذْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِي كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ﴾ (۵-۲۱) تو بھائیو! تم ارض مقدس (یعنی ملک شام) میں جسے خدا نے تمہارے لیے لکھ رکھا ہے۔ داخل ہو۔

میں ارض مقدسہ کے معنی پاک سرزمین کے ہیں۔ اور حَظِيرَةُ الْقُدُسِ سے بعض کے نزدیک جنت اور بعض کے نزدیک شریعت مراد ہے اور یہ دونوں قول صحیح ہیں۔ کیونکہ شریعت بھی ایک ایسا حظیرہ یعنی احاطہ ہے جس میں داخل ہونے والا پاک و صاف ہو جاتا ہے۔

سے چارہ نہیں ہے)

الْقِدْرُ: (دیگ) برتن جس میں گوشت پکایا جاتا ہے۔

چنانچہ فرمایا:

﴿وَقَدْ وَرِثِيَّتِ﴾ (۳۳-۱۳) اور دیکھیں جو ایک ہی جگہ رکھی ہیں۔

اور قَدَرْتُ اللَّحْمَ کے معنی ہنڈیا میں گوشت پکانے کے ہیں اور ہنڈیا میں پکائے ہوئے گوشت کو قَدِير کہا جاتا ہے۔ الْقُدَارُ: (قصاب) وہ شخص جو اونٹ کو نحر (ذبح) کر کے دیگ میں اس کا گوشت پکاتا ہے۔ شاعر نے کہا ہے ۵ (الکامل)

(۳۵۱) ضَرَبَ الْقُدَارِ نَقِيعَةَ الْقُدَامِ

جیسا کہ قصاب سفر سے آنے والے کی خوشی میں دعوت کے لیے گوشت کاٹتا ہے۔

## (ق د س)

التَّقْدِيسُ کے معنی اس تطہیر الہی کے ہیں جو کہ آیت وَيُطَهِّرُكُمْ تَطْهِيرًا (۳۳-۳۳) اور تمہیں بالکل پاک صاف کر دے۔

میں مذکور ہے۔ کہ اس کے معنی تطہیر بمعنی ازالہ نجاست محسوسہ کے نہیں اور آیت کریمہ ﴿وَنَحْنُ نَسَبُحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ﴾ (۲-۳۰) اور ہم تیری تعریف کے ساتھ تسبیح و تقدیس کرتے ہیں۔ کے معنی یہ

۱ قالہ مہلہل بن ربیعہ واولہ: وانا لنضرب بالصوارم ہا مہاونی رواۃ بالسیوف رؤسہم بدل بالصوارم ہامہا راجع للیت الامالی للمرتضی (۱: ۲۸۵/۲۸۶) و تہذیب الالفاظ (۲۶۵) و البخلۃ (۲۱۵) و الفاخر (۹۸) و المخصص (۴: ۱۲۰) و اللسان (قدر، نفع، قدم) و الاشتقاق (۳۲۳) و المقالیس (۵: ۴۷۲، ۶۶: ۵) و المرزوقی (۲۵)۔ او نظام الغریب (۲۴۲) و المعانی للفتی (۳۷۷) و الیبت ثالث ثلاثہ فی دیوانہ (۷۰-۷۱) و راجع لمعناہ المرزوقی و الاشتقاق و کتاب النوادر لابی مسہل (۱: ۳۷-۳۹) و الشاعر اسمہ امرؤ القیس اوعدی بن ربیعہ جاہلی ترجمۃ فی الشعراء (۲۵۶-۲۵۹) و المرزبانی (۲۴۸) (۱۱) و الآمدی و الاغانی (۴: ۱۴۰-۱۵۱) و اللالی (۲۶-۲۷-۱۱۱-۱۱۲) و العینی (۴: ۲۱۱-۲۱۲) و شواہد المغنی (۲۲۵)

## (ق د م)

الْقَدَمُ: انسان کا پاؤں۔ جمع أَقْدَامٌ۔ قرآن

پاک میں ہے۔

﴿وَيُنَبِّتُ بِهِ الْأَقْدَامَ﴾ (۸-۱۱) اس سے تمہارے پاؤں جمائے رکھے۔

اسی سے تقدم کا لفظ لیا گیا ہے جو کہ تاخر کی ضد ہے اور تقدم چار قسم پر ہے جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ ۱ اور

قدیم، حدیث کی ضد ہے اور اس کے معنی پرانی چیز کے ہیں (یہ تقدم زمانی سے ہے) اور کبھی تقدم بلحاظ مرتبہ کے ہوتا

ہے جیسے فُلَانٌ مُّتَقَدِّمٌ عَلٰی فُلَانٍ۔ یعنی فلاں اس سے اشرف ہے۔ اور کبھی متقدم اس چیز کو کہا جاتا ہے جس

پر دوسری چیز کا وجود موقوف ہو جیسے الْوَاحِدُ مُتَقَدِّمٌ عَلٰی الْعَدَدِ کہ واحد عدد پر متقدم ہے کیونکہ واحد کے

بغیر عدد کا وجود ناممکن ہے۔ الْقَدَمُ کے معنی کسی چیز کے زمانہ ماضی میں موجود ہونے کے ہیں۔ اس کے بالمقابل

بقاء ہے جس کے معنی زمانہ مستقبل میں موجود رہنے کے آتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی وصف میں یَا قَدِيمَ الْإِحْسَانِ

تو آیا ہے۔ لیکن کہیں بھی قرآن پاک اور آثار صحیحہ سے قَدِيمَ کے لفظ کا اسمائے حسنیٰ سے ہونا ثابت نہیں ہے البتہ

علمائے متکلمین اسے بطور صفت الہی کے استعمال کرتے ہیں عموماً الْقَدِيمَ کا لفظ قدم باعتبار زمانہ یعنی پرانی چیز

کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿كَالْعُرْجُونِ الْقَدِيمِ﴾ (۳۶-۳۹) کھجور کی پرانی

شاخ کی طرح۔ اور آیت کریمہ: ﴿لَهُمْ قَدَمٌ صَدِيقٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ﴾ (۱۰-۲) ان کے

پروردگار کے ہاں) ان کا سچا درجہ ہے۔

میں قَدَمٌ صَدِيقٌ سے سابقہ فضیلت مراد ہے اور یہ اسم مصدر ہے اور قَدَمْتُ كَذَا کے معنی پہلے سے کوئی کام کر

چکنے یا بھیجنے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿أَشْفَقْتُمْ أَنْ تُقَدِّمُوا بَيْنَ يَدَيِ نَجْوَاكُمْ

صَدَقَاتٍ﴾ (۵۸-۱۳) کیا تم اس سے کہ پیغمبر کے کان میں کوئی بات کہنے سے پہلے خیرات دیا کرو، ڈر گئے ہو۔

﴿لَيْسَ مَا قَدَمْتُ لَهُمْ أَنْفُسُهُمْ﴾ (۵-۸۰) انہوں نے جو کچھ اپنے واسطے آگے بھیجا، ہے برا ہے ﴿بِمَا قَدَمْتُ أَيْدِيَهُمْ﴾ (۲-۹۵) جو ان کے ہاتھ

آگے بھیج چکے ہیں۔ اور قَدَمْتُ فُلَانًا أَقْدَمُهُ کے معنی کسی کے آگے آگے جانے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿يَقْدُمُ قَوْمَهُ يَوْمَ الْقِيَمَةِ﴾ (۱۱-۹۸) وہ قیامت کے دن اپنی قوم کے آگے آگے چلے گا۔

اور آیت کریمہ: ﴿لَا تُقَدِّمُوا بَيْنَ يَدَيِ اللَّهِ وَرَسُولِهِ﴾ (۳۹-۱) خدا اور اس کے رسول سے پہلے نہ بول اٹھا کرو۔

کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ لَا تُقَدِّمُوا بمعنی لَا تَتَقَدَّمُوا کے ہیں اور اس کے اصل معنی یہ ہیں۔ کہ قول و حکم میں پیغمبر سے سبقت نہ کرو بلکہ وہی کام کرو جس کا

تمہیں حکم دیتے ہیں۔ جیسا کہ اللہ کے مکرّم بندوں یعنی فرشتوں کا کردار بیان کرتے ہوئے فرمایا: ﴿لَا يَسْبِقُونَهُ بِالْقَوْلِ﴾ (۲۱-۲۷) اس کے آگے بڑھ کر

بول نہیں سکتے۔

الفاظ میں معنی تقدم معتبر ہے۔

### (ق ذ ف)

الْقَذْفُ: (ض) کے معنی دور پھینکنا کے ہیں پھر معنی بعد کے اعتبار سے دور دراز منزل کو منزل نذف و نذیف کہا جاتا ہے اسی طرح دور دراز شہر کو بِلْدَة قَذِيفَة بول لیتے ہیں..... اور آیت کریمہ:

﴿فَقَذَفَ فِيهِ فِي الْيَمِّ﴾ (۳۹-۲۰) پھر اس (صندوق) کو دریا میں ڈال دو۔

کے معنی دریا میں پھینک دینے کے ہیں۔ نیز فرمایا ﴿وَقَذَفَ فِي قُلُوبِهِمُ الرُّعْبَ﴾ (۲۶-۳۳) اور ان کے دلوں میں دہشت ڈال دی۔

﴿بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ﴾ (۱۸-۲۱) بلکہ ہم سچ کو جھوٹ پر کھینچ مارتے ہیں۔

﴿يَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَٰمُ الْغُيُوبِ﴾ (۲۸-۳۳) وہ اوپر سے حق اتارتا ہے اور وہ غیب کی باتوں کا جاننے والا ہے۔

﴿وَيُقْذَفُونَ مِنْ كُلِّ جَانِبٍ﴾ (۸-۳۷) اور ہر طرف سے (ان پر انگارے) پھینکے جاتے ہیں (یعنی) وہاں سے نکال دینے کو۔

اور رَمَى کی طرح قَذْف کا لفظ بھی بطور استعارہ گالی دینے اور عیب لگانے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

### (ق ر ر)

قَرَفَى مَكَانَهُ يَقْرَأُ قَرَارًا: (ض) کے معنی کسی جگہ ٹھہر جانے کے ہیں اصل میں یہ قر سے ہے جس کے معنی سردی کے ہیں جو کہ سکون کو چاہتی ہے جیسا کہ اس

اور آیت کریمہ:

﴿لَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ﴾

(۶۱-۱۶) ایک گھڑی نہ پیچھے رہ سکتے ہیں اور نہ آگے بڑھ سکتے ہیں۔

کے معنی یہ ہیں کہ وہ تقدم و تاخر کا ارادہ بھی نہیں کر سکتے۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَنَكْتُبُ مَا قَدَّمُوا وَآثَارَهُمْ﴾ (۱۲-۳۶) جو

کچھ وہ آگے بھیج چکے ہیں اور جو ان کے پیچھے نشان (رہ گئے) ہیں ہم ان کو قلم بند کر لیتے ہیں۔

میں مَا قَدَّمُوا سے مراد وہ اعمال ہیں جو وہ پہلے کر چکے ہیں۔

قَدَّمْتُ إِلَيْهِ بَكْدًا: پہلے سے کسی چیز کے متعلق کہہ رکھنا اور قَدَّمْتُ بِهِ: وقت حاجت سے پہلے کسی کام کے متعلق آگاہ کرنا۔ اور اسی سے آیت کریمہ: ﴿قَدَّمْتُ إِلَيْكُمُ

بِأَنوَعِينَ﴾ (۲۸-۵۰) ہم تمہارے پاس پہلے ہی عذاب کی وعید بھیج چکے تھے۔

ہے اور قَدَّمَ خَلْفَ کی ضد ہے اس کی تصغیر قُدِيمَة آتی ہے۔

رَكِبَ فُلَانٌ مَقَادِيمَهُ: وہ سیدھا چلا گیا۔ یعنی ادھر ادھر مڑ کر نہیں دیکھا۔

قَادِمَةُ الرَّجُلِ: کجاوہ کا اگلا حصہ قَادِمَةُ الْإِطْبَاعِ: (جانور کا اگلا پستان یا پستان کا سرا) قَادِمَةُ الْجَنَاحِ: پرندے کے بازو کا اگلا حصہ۔ مُقَدَّمَةُ الْجَيْشِ: لشکر کا اگلا حصہ (ہر اول دستہ)۔

الْقُدُومُ: دیر سے آگے بڑھنے والا آدمی، تیشہ۔ ان تمام

اور یَوْمَ النَّحْرِ سے بعد کے دن کو یَوْمَ الْقِيَامِ کہا جاتا ہے کیونکہ لوگ اس روز منیٰ میں ٹھہرے رہتے ہیں۔  
 اِسْتَقَرَّ فُلَانٌ قرار پانے کا قصد کرنا۔ اور کبھی یہ بمعنی قَرَّ (قرار پانا) بھی آجاتا ہے جیسے استجاب بمعنی اجاب چنانچہ جنت کے متعلق فرمایا: ﴿خَيْرٌ مُّسْتَقَرًّا وَاحْسَنُ مَقِيلًا﴾ (۲۵-۲۴) ٹھکانا بھی بہتر ہوگا اور مقام استراحت بھی عمدہ ہوگا اور جہنم کے متعلق فرمایا: ﴿اِنَّهَا سَاكنٌ مُّسْتَقَرًّا﴾ (۲۵-۲۶) اور دوزخ، ٹھہرنے کی بہت بری جگہ ہے۔

اور آیت کریمہ:  
 ﴿فَمُسْتَقَرًّا وَمُسْتَوْدَعًا﴾ (۶-۹۸) تہارے لیے ایک ٹھہرنے کی جگہ ہے اور ایک سپرد ہونے کی میں، ابن مسعودؓ کے نزدیک مستقر سے مراد زمین میں ٹھہرنا ہے اور مستودع سے مراد قبریں ہیں۔ ابن عباسؓ کا قول ہے کہ مستقر سے مراد تو زمین ہی ہے لیکن مستودع سے مراد دنیا ہے۔ الحاصل ہر وہ حالت جس سے انسان منتقل ہو جائے وہ مستقر نام نہیں ہو سکتا۔

اَلْاَفْرَارُ: (افعال) کے معنی کسی چیز کو ٹھہرا دینے کے ہوتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:  
 ﴿وَنُقِرُّ فِي الْاَرْحَامِ مَا نَشَاءُ اِلٰى اَجَلٍ مُّسَمًّى﴾ (۲۲-۵) اور ہم جس کو چاہتے ہیں ایک میعاد مقرر تک پیٹ میں ٹھہرائے رکھتے ہیں۔  
 اور کبھی اس کے معنی ثابت کرنا بھی آجاتے اور اقرار کبھی دل سے ہوتا ہے اور کبھی زبان سے اور کبھی ان دونوں

کے برعکس حَرَّ (گرمی) حرکت کو چاہتی ہے۔ اور آیت کریمہ۔

﴿وَقَرْنَ فِيْ بُيُوتِكُنَّ﴾ (۳۳-۳۳) اور اپنے گھروں میں ٹھہری رہو۔

میں ایک قرأتِ وَقَرْنَ فِيْ بُيُوتِكُنَّ ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ اصل میں اقرن ہے ایک راء کو تخفیف کے لیے حذف کر دیا گیا ہے جیسا کہ آیت: فَظَلَلْتُمْ تَفَكَّهُونَ میں ظَلَلْتُمْ اصل میں ظَلَلْتُمْ ہے (اور ایک لام کو تخفیفاً حذف کر دیا گیا ہے)

اَلْقَرَارُ (اسم) (ٹھہرنے کی جگہ) قرآن میں ہے۔  
 ﴿جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ قَرَارًا﴾ (۴۰-۶۴) (جس نے) زمین کو قرار گاہ بنایا۔

اور جنت کے متعلق فرمایا:

﴿ذٰلِكَ قَرَارٌ وَمَعِيْنٌ﴾ (۲۳-۵۰) جو رہنے کے لائق اور جہاں ٹھہرا ہوا پانی جاری تھا (پناہ دی) اور جہنم کے متعلق فرمایا:

﴿وَبِئْسَ الْقَرَارُ﴾ (۱۴-۲۹) اور وہ برا ٹھکانا ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿اَجْتَسَتْ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ﴾ (۱۴-۲۶) زمین کے اوپر ہی سے اکھیڑ کر پھینک دیا جائے۔ اس کو ذرا بھی قرار نہیں۔ میں..... قرار کے معنی ثبات کے ہیں۔ شاعر نے کہا ہے۔<sup>۱</sup>

(۳۵۲) وَلَا قَرَارَ عَلٰی زَاوٍ مِنَ الْاَسَدِ  
 یعنی شیر کے دھاڑنے پر اس (چمن) حاصل نہیں ہو سکتا۔

① قاله النابغة في البيت وصدرة فبت ان ابا قابوس اوعدني ..... والبيت في ديوانه واللسان (قيس) وخصائص الخاص ثعالبی

۷۶ والعشر للتبریزی (۳۰۲) والسيوطی (۲۸، ۷۸۵)

ٹھنڈے پانی سے غسل کرنے کے ہیں۔ قُرْتُ عَيْنُهُ  
تَقَرُّ: آنکھ کا ٹھنڈا ہونا۔ مراد خوشی حاصل ہونا ہے، قرآن  
پاک میں ہے:

﴿كَيْ تَقَرَّ عَيْنُهَا﴾ (۲۰-۴) تاکہ ان کی آنکھیں  
ٹھنڈی ہوں۔

اور جسے دیکھ کر انسان کو خوشی حاصل ہو اسے قُرَّةُ عَيْنٍ کہا  
جاتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿قُرْتُ عَيْنٍ لِّى وَلَكَ﴾ (۲۸-۹) یہ میری اور  
تمہاری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔

﴿رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ أَزْوَاجِنَا وَذُرِّيَّتِنَا قُرَّةَ  
أَعْيُنٍ﴾ (۲۶-۷۴) اے ہمارے پروردگار! ہمیں  
بیویوں کی طرف سے دل کا چین اور اولاد کی طرف آنکھ کی  
ٹھنڈک عطا فرما۔

بعض نے کہا ہے کہ یہ اصل میں قُرٌّ بمعنی سردی سے ہے  
لہذا قُرْتُ عَيْنُهُ کے معنی آنکھ کے ٹھنڈا ہو کر خوش ہو  
جانے کے ہیں بعض نے کہا ہے کہ قُرْتُ عَيْنُهُ کے معنی  
خوش ہونا اس لیے آتے ہیں کہ خوشی کے آنسو ٹھنڈے  
ہوتے ہیں اور غم کے آنسو چونکہ گرم ہوتے ہیں اس لیے  
بد دعا کے وقت اَسْخَنَ اللَّهُ عَيْنَهُ کہا جاتا ہے۔ بعض  
نے کہا ہے کہ قرار سے مشتق ہے اور معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ  
اسے وہ چیز بخشے جس سے اس کی آنکھ کو سکون حاصل ہو  
یعنی اسے دوسری چیز کی حرص نہ رہے۔

أَقْرَبَ الْحَقِّ: حق کا اعتراف کرنا۔ تَقَرَّ الْأَمْرُ عَلَى  
كَذَا: کسی امر کا حاصل ہو جانا۔

سے۔ توحید اور دیگر ایمانیات کے بارے میں صرف  
زبان سے اقرار کر لینا کافی نہیں ہوتا جب تک کہ اس کے  
ساتھ دل سے بھی اقرار نہ کرے۔ اقرار کی ضد انکار آتی  
ہے اور جو صرف زبان سے انکار کر دینے پر بولا جاتا ہے  
خواہ دل سے اسے تسلیم ہی کیوں نہ کرتا ہو جیسا کہ پہلے گزر  
چکا ہے ۱۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿ثُمَّ أَفْرَزْتُمْ وَأَنْتُمْ تَسْهَدُونَ﴾ (۲۲-۲) پھر تم  
نے اقرار کر لیا اور تم اس بات کے گواہ ہو۔

﴿ثُمَّ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ  
لْتُؤْمِنُوا بِهِ وَلَتَنْصُرُنَّهُ قَالَ أَأَقْرَضْتُمْ وَآخَذْتُمْ  
عَلَىٰ ذُلِّكُمْ إِضْرِبْ قَالُوا أَأَقْرَرْنَا﴾ (۸۱-۳) پھر  
تمہارے پاس کوئی پیغمبر آئے جو تمہاری کتاب کی تصدیق  
کرے۔ تو تمہیں ضرور اس پر ایمان لانا ہوگا اور ضرور اس کی مدد  
کرنا ہوگی (اور عہد لینے کے بعد) پوچھا کہ بھلا تم نے اقرار کیا  
اور اقرار پر میرا ذمہ لیا۔ انہوں نے کہا ہاں ہم نے اقرار کیا۔

قُرْتُ لَيْلَتِنَا تَقَرُّ: رات کا ٹھنڈا ہونا۔  
يَوْمٌ قَرٌّ: (ٹھنڈا دن) لَيْلَةٌ قَرَّةٌ: (ٹھنڈی رات) قُرٌّ  
فُلَانٌ فلاں کو سردی لگ گئی اور مَقْرُورٌ کے معنی ٹھنڈا  
آدی کے ہیں۔ مثل مشہور ہے۔ ۲۔ حَرَّةٌ تَحْتَ قَرَّةٍ یہ  
اس شخص کے حق میں بولتے ہیں جو اپنے ضمیر کے خلاف  
بات کرے۔

قُرْتُ الْقِدْرِ أَقْرَها: میں نے ہنڈیا میں ٹھنڈا پانی  
ڈالا۔ اور اس پانی کو قَرَارَةٌ یا قَرَرہ کہا جاتا ہے۔ اَقْتَرَّ  
فُلَانٌ اِقْتَرَارًا: یہ تَبَرَّد کی طرح ہے۔ جس کے معنی

① (راجع ج ۵)

② اللسان (حر، ق) قال وإنما كسر والحرة مكان القرية والمثل ايضا في الحيوان (۱۰۶/۵) والميداني ۱۲

کی طرف منتقل ہونے کے ہیں۔ اور آنحضرت ﷺ نے فرمایا ❶ (۸۱) ((أُقْعِدُنِي عَنِ الصَّلَاةِ أَيَّامَ أَقْرَائِكَ)) کہ حیض کے دنوں میں نماز ترک کر دے۔

یہ محاورہ ایسے ہی ہے جیسے کسی کو کہا جائے: اِفْعَلْ كَذَا أَيَّامَ وَرُودِ فُلَانٍ کہ فلاں آدمی کی آمد کے دنوں یہ اور یہ کام کرو تو یہاں بھی ایام کا لفظ استعمال ہوا ہے حالانکہ ورود تو ایک ساعت میں ہو جاتا ہے۔ بعض اہل لغت کا قول ہے کہ قرء کا لفظ قرء سے مشتق ہے جس کے معنی جمع کرنے کے ہیں۔ تو انہوں نے زمانہ طہر اور زمانہ حیض کو جمع کرنے کے معنی کا اعتبار کیا ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔ کیونکہ زمانہ طہر میں خون رحم میں جمع ہوتا رہتا ہے۔

الْقِرَاءَةُ کے معنی حرف و کلمات کو ترتیل میں جمع کرنے کے ہیں کیونکہ ایک حرف کے بولنے کو قرأت نہیں کہا جاتا اور نہ یہ عام ہر چیز کے جمع کرنے پر بولا جاتا ہے۔ لہذا أَجْمَعْتُ الْقَوْمَ کی بجائے قَرَأْتُ الْقَوْمَ کہنا صحیح نہیں ہے۔ الْقُرْآنُ: یہ اصل میں کفران و رجحان کی طرح مصدر ہے چنانچہ فرمایا:

﴿إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ فَإِذَا قَرَأَهُ فَأَتَّبِعْ قُرْآنَهُ﴾ (۷۵-۷۶-۱۸) اس کا جمع کرنا اور پڑھوانا ہمارے ذمہ ہے جب ہم وحی پڑھا کریں تو تم (اس کو سنا کرو اور پھر اسی طرح پڑھا کرو۔

نصرت ابن عباسؓ نے اس کا یہ ترجمہ کیا ہے کہ جب ہم

الْقَارُورَةُ: شیشہ جمع قَوَارِيرُ..... قرآن پاک میں ہے: ﴿قَوَارِيرٌ مِنْ فُضَّةٍ﴾ (۷۶-۱۶) اور شیشے بھی چاندی کے۔ صَبَحَ مُمَرَّدٌ مِنْ قَوَارِيرٍ: یہ ایسا محل ہے جس میں (بچے بھی) شیشے جڑے ہوئے ہیں (۲۷-۴۴) یعنی شیشے کا بنا ہوا ہے۔

## (ق ر ء)

قَرَأَتِ الْمَرْءُ وُقِرَّتِ الدَّمُ وَاَقْرَأَتْ: عورت کو حیض آنا اور قَرَأَتْ الْحَجَارِيَّةُ: استبراء رحم کرنا۔ القراء کے اصل معنی طہر سے حیض میں داخل ہونے کے ہیں۔ اور چونکہ یہ لفظ طہر اور حیض دونوں کا جامع ہے اس لیے دونوں پر اس کا اطلاق ہوتا ہے کیونکہ قاعدہ یہ ہے کہ جو اسم دو چیزوں کے لیے بحیثیت مجموعی وضع کیا گیا ہو وہ ہر ایک پر انفراداً بھی بولا جاسکتا ہے ❶ مثلاً لفظ مَائِدَةٌ کہ دسترخوان اور کھانا دونوں کے مجموعہ کے لیے وضع کیا گیا ہے مگر ہر ایک پر انفراداً بھی بولا جاتا ہے لہذا قَرَأَتْ نہ صرف حیض کا نام ہے اور نہ صرف طہر کا (بلکہ دونوں کے لیے وضع کیا گیا ہے) اس کی دلیل یہ ہے کہ جس عورت کو حیض نہ آتا ہو اسے ذاتٌ قُرْءَیْنِ نہیں کہا جاتا اور ایسے ہی حائض، جسے متواتر خون آ رہا ہو اور نُفَسَاءُ (صاحب نفاس) کو بھی ذاتٌ قُرْءَیْنِ نہیں کہتے اور آیت کریمہ:

﴿يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ ثَلَاثَةَ قُرُوءٍ﴾ (۲۲۸-۲) تین حیض تک اپنے تئیں روک رہیں۔

میں ثَلَاثَةُ قُرُوءٍ کے معنی تین مرتبہ طہر سے حالت حیض

❶ وعلى هذا الاطلاق كلاهما محاذ او قد عدّه العلماء من الاضداد (اضداد ابی الطیب (۵۷۱-۵۷۶))

❷ قاله صلى الله عليه وسلم لام حبيبة بنت جحش او فاطمة بنت ابی جيس و كلا الحديثين باختلاف الفاظهما اخرجهما اصحاب السنن (راجع العون (۱۱-۱۲۲) والزرقانی علی الموطأ (۲۱-۲۴) انظر للبحث عن لفظ القرآن محاذ ابی عبيدة من ۱-۳ و عليه سلك البخاری فی صحيحه فتح الباری (۸: ۳۴۰-۳۳۹))

اَقْرَأْتُ فُلَانًا كَذَا کے معنی کسی کو کچھ پڑھانے کے ہیں۔ چنانچہ فرمایا۔  
﴿سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسَى﴾ (۸۷-۶) (ہم تمہیں پڑھائیں گے کہ فراموش نہ کرو گے۔  
اور تَقْرَأْتُ بمعنی تَفَهَّمْتُ ہے۔ (یعنی میں نے اسے اچھی طرح سے سمجھ لیا)  
فَارَأْتَهُ: (مفاعلتہ) باہم مذاکرہ کرنا یا کتاب کا سبق دہرانا۔

### (ق ر ب)

اَلْقُرْبُ وَالبُعْدُ: یہ دونوں ایک دوسرے کے مقابلہ میں استعمال ہوتے ہیں۔ محاورہ ہے۔ قَرُبْتُ مِنْهُ اَقْرَبُ وَقَرَبْتَهُ اَقْرَبُهُ قُرْبًا وَقُرْبَانًا: کسی کے قریب جانا اور مکان، زمان، نسبی تعلق، مرتبہ حفاظت اور قدرت سب کے متعلق استعمال ہوتا ہے چنانچہ قرب مکانی کے متعلق فرمایا:

﴿وَلَا تَقْرَبَا هَذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُونَا مِنَ الظَّالِمِينَ﴾ (۲-۳۵) لیکن اس درخت کے پاس نہ جانا نہیں تو ظالموں میں داخل ہو جاؤ گے۔ ﴿وَلَا تَقْرَبُوا مَالَ الْيَتِيمِ﴾ (۶-۱۵۳) اور یتیم کے مال کے پاس بھی نہ جانا۔

﴿وَلَا تَقْرَبُوا الزَّيْنَى﴾ (۱۷-۳۲) اور زنا کے پاس بھی نہ جانا۔

﴿فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هَذَا﴾ (۹-۲۸) تو اس برس کے بعد وہ خانہ کعبہ کے پاس نہ جانے پائیں۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَلَا تَقْرَبُوا هَٰؤُلَاءِ﴾ (۲-۲۲۲) ان سے

قرآن تیرے سینہ میں جمع کر دیں تو اس پر عمل کرو لیکن عرف میں یہ اس کتاب الہی کا نام ہے جو آنحضرت ﷺ پر نازل کی گئی اور یہ اس کتاب کے لیے بمنزلہ علم بن چکا ہے جیسا کہ توراۃ اس کتاب الہی کو کہا جاتا ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی اور انجیل اس کتاب کو کہا جاتا ہے جو حضرت عیسیٰ پر نازل کی گئی بعض علماء نے قرآن پاک کی وجہ تسمیہ یہ بھی بیان کی ہے کہ قرآن پاک چونکہ تمام کتب سماویہ کے ثمرہ کو اپنے اندر جمع کیے ہوئے ہے بلکہ تمام علوم کے حاصل کو اپنے اندر سیٹھ ہوئے ہے اس لیے اس کا نام قرآن پاک رکھا گیا ہے جیسا کہ آیت:

﴿وَتَفْصِيلَ كُلِّ شَيْءٍ﴾ (۱۲-۱۱۱) اور ہر چیز کی تفصیل کرنے والا۔ اور آیت کریمہ:

﴿تَبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ﴾ (۱۶-۸۹) کہ اس میں ہر چیز کا بیان مفصل ہے۔  
میں اس کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے۔ نیز فرمایا: ﴿قُرْآنًا عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِي عِوَجٍ﴾ (۳۹-۲۸) یہ قرآن پاک عربی ہے جس میں کوئی عیب (اور اختلاف) نہیں۔ ﴿وَقُرْآنًا فَرَقْنَاهُ لِتَقْرَأَهُ عَلَى النَّاسِ﴾ (۱۷-۱۰۶) اور ہم نے قرآن پاک کو جزو و جزو کر کے نازل کیا تاکہ تم لوگوں کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھ کر سناؤ۔

﴿فِي هَٰذَا الْقُرْآنِ﴾ (۱۷-۳۱) اس قرآن پاک میں..... اور آیت کریمہ:

﴿وَقُرْآنَ الْفَجْرِ﴾ (۱۷-۷۸) اور صبح کو قرآن پاک پڑھا کرو میں قرآن پاک کے معنی تلاوت قرآن کے ہیں۔ ﴿إِنَّهُ لَقُرْآنٌ كَرِيمٌ﴾ (۵۶-۷۷) یہ بڑے رتے کا قرآن پاک ہے۔



مقاربت نہ کرو۔ میں جماع سے کٹا یہ ہے۔

﴿فَقَرَّبَهُ إِلَيْهِمْ﴾ (۵۱-۲۷) اور (کھانے کے لیے)

ان کے آگے رکھ دیا۔

اور قرب زمانی کے متعلق فرمایا:

﴿اِقْتَرِبْ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ﴾ (۲۱-۱) لوگوں کے

حساب (اعمال) کا وقت نزدیک پہنچا۔

﴿إِنْ أَدْرَى أَقْرَبُ أَمْ بَعِيدٌ مَا تُوعَدُونَ﴾

(۲۱-۱۰۹) اور مجھے معلوم نہیں کہ جس چیز کا تم سے وعدہ کیا

جاتا ہے وہ غمگین آنے والی ہے یا اس کا وقت دور ہے۔

اور قرب نسبی کے متعلق فرمایا:

﴿وَإِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ أُولُو الْقُرْبَى﴾ (۴-۸)

اور جب میراث کی تقسیم کے وقت..... غیر وارث (رشتے

دار آ جائیں۔

﴿وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبَى﴾ (۶-۱۵۲) گو وہ تمہارے

رشتے دار ہی ہوں۔

﴿وَلِذِي الْقُرْبَى﴾ (۸-۳۱) اور اہل قرابت کا۔

﴿وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبَى﴾ (۳-۳۶) اور رشتے دار

ہمسایوں ﴿يَتِيمًا ذَا مَقْرَبَةٍ﴾ (۹۰-۱۵) یتیم رشتے دار

کو..... اور قرب بمعنی رتبہ کے اعتبار سے کسی کے قریب

ہونا کے متعلق فرمایا:

﴿وَلَا الْمَلَائِكَةُ الْمُقَرَّبُونَ﴾ (۴-۱۷۲) اور نہ

مقرب فرشتے (عار) رکھتے ہیں۔

اور عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق فرمایا:

﴿وَجِيهًا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِينَ﴾

(۳-۲۵) (اور جو) دنیا اور آخرت میں آبرو والا اور (خدا

کے) خاصوں میں سے ہوگا۔

﴿عَيْنًا يَشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُونَ﴾ (۸۲-۲۸) وہ

ایک چشمہ ہے جس میں سے (خدا کے) مقرب

پئیں گے۔

﴿فَأَمَّا إِنْ كَانَ مِنَ الْمُقَرَّبِينَ﴾ (۵۶-۸۸) پھر

اگر وہ خدا کے مقربوں میں سے ہے۔

﴿قَالَ نَعَمْ وَإِنَّكُمْ لَمِنَ الْمُقَرَّبِينَ﴾ (۷-۱۱۴)

(فرعون نے) کہا: ہاں (ضرور) اور اس کے علاوہ تم

مقربوں میں داخل کر لیے جاؤ گے۔

﴿وَقَرَّبْنَاهُ نَجِيًّا﴾ (۱۹-۲) اور باتیں کرنے کے لیے

نزدیک بلایا۔

اور الْقُرْبَةُ کے معنی قرب حاصل کرنے کا ذریعہ کے بھی

آتے ہیں جیسے فرمایا:

﴿أَلَا إِنَّهَا قُرْبَةٌ لَّهُمْ﴾ (۹-۹۹) دیکھو وہ بے شبہ ان

کے لیے (موجب) قربت ہے۔

﴿تُقَرَّبُكُمْ عِنْدَنَا زُلْفَى﴾ (۳۴-۳۷) کہ تم کو ہمارا

مقرب بنا دیں۔

اور رعایت و نگہبانی کے متعلق فرمایا:

﴿إِنَّ رَحْمَتَ اللَّهِ قَرِيبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِينَ﴾

(۷۶-۷۷) کچھ شک نہیں کہ خدا کی رحمت نیکی کرنے

والوں کے قریب ہے۔

﴿فَلْيَأْتِ قَرِيبٌ دُعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ﴾

(۲-۱۸۶) میں تو تمہارے پاس ہوں۔ جب کوئی پکارنے

والا پکارتا ہے تو میں اسکی دعا قبول کرتا ہوں اور قرب معنی

قدرة فرمایا:

﴿وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ﴾

(۵۰-۱۶) اور ہم اس کی رگ جان سے بھی زیادہ قریب

ہیں۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْكُمْ﴾ (۵۶-۸۵) اور ہم اس مرنے والے کے تم سے بھی زیادہ نزدیک ہوتے ہیں۔

میں بھی یہ ممکن ہے کہ قرب بلحاظ قدرت مراد ہو۔ الْقُرْبَانُ: (نیاز) ہر وہ چیز جس سے اللہ کی قرب جوئی کی جائے اور عرف میں قربان بمعنی نَسِيكَةٌ یعنی ذَبِيحَةٌ آتا ہے اس کی جمع قَرَابِينُ ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿إِذْ قَرَّبْنَا قُرْبَانًا﴾ (۵-۲۷) جب ان دونوں نے خدا کی جناب میں کچھ نیازیں چڑھائیں۔

﴿حَتَّىٰ يَأْتِيََنَّ بِقُرْبَانٍ﴾ (۳-۱۸۳) جب تک کوئی پیغمبر ہمارے پاس ایسی نیاز نہ لے کر آئے..... اور آیت کریمہ:

﴿قُرْبَانًا آلِهَةً﴾ (۳۶-۲۸) تقرب خدا کے سوا معبود (بنایا تھا)

میں قُرْبَان کا لفظ قُرْبَانُ الْمَلِكِ کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی بادشاہ کا ہم نشین اور ندیم خاص کے ہیں اور یہ واحد و جمع دونوں پر بولا جاتا ہے اور یہاں چونکہ جمع کے معنی میں ہے اس لیے آلِهَةً بلفظ جمع لایا گیا ہے۔

الْتَّقَرُّبُ: ایسی چیز کا قصد کرنا جس سے دوسرے کے ہاں قدرومنزلت حاصل ہو۔

اور اللہ تعالیٰ کا کسی بندہ کے قریب ہو جانا باعتبار مکان کے نہیں ہوتا بلکہ اس پر فضل و کرم اور فیض (خاص) جاری کرنا

مراد ہوتا ہے۔ اس لیے مروی ہے (۷۹) کہ موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے عرض کی کہ باری تعالیٰ! کیا تو قریب ہے کہ میں تجھ سے مناجات کروں یا دور ہے کہ میں تمہیں پکاروں؟ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اگر میں تیرے لیے دوری معین کر دوں تو وہاں تک پہنچ نہیں سکے گا اور اگر قرب معین کر دوں تو تجھے اس پر قدرت نہیں ہوگی۔ چنانچہ فرمایا:

﴿وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ﴾ (۵۰-۱۶) اور ہم اس کی رگ جان سے بھی زیادہ قریب ہیں۔ اور کسی بندہ کے مقرب الہی ہونے کے معنی یہ ہیں کہ وہ بہت سی ایسی صفات اپنے اندر پیدا کر لے..... جن کے ساتھ ذات الہی متصف ہوتی ہے گو وہ صفات انسان میں اس درجہ نہ پائی جائیں جس درجہ میں کہ ذات الہی میں وہ صفات متحقق ہوتی ہیں۔ مثلاً انسان، علم و حکمت علم و رحمت اور بے نیازی جیسی صفات اپنے اندر پیدا کر لے اور یہ ان کے اضداد یعنی جہالت..... طیش و غضب اور احتیاج نفسانی کی میل کچیل سے پاک ہونے کے بعد حاصل ہوتی ہیں اور یہ قرب جسمانی کے قبیل سے نہیں ہے بلکہ قرب روحانی ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ۵۔ (۸۰)

((مَنْ تَقَرَّبَ إِلَيَّ شَبْرًا تَقَرَّبْتُ إِلَيْهِ ذِرَاعًا)) کہ جو شخص بالشت بھر میرے قریب ہوتا ہے تو میں ایک ذراع یعنی ہاتھ بھر اس کے قریب ہو جاتا ہوں اور نیز ایک روایت میں ہے کہ تقرب الہی حاصل کرنے کے لیے فرائض کی ادائیگی کے بعد نوافل کے ذریعہ میرا قرب

① متفق علیہ من حدیث ابی ہریرۃ والحديث باختلاف الفاظه فی المستدرک وابن ماجہ عن ابی ہریرۃ و انس وابی ذرر ابی سعید والطبرانی عن سلمان وابی زر وابو نعیم عن ابن شہین فی الترغیب عن ابن عباس (راجع کثر العمال ۱۱۳-۱۱۳۸) و (۱۱۷۸-۱۱۸۴) وتخریج العراقی علی الاحیاء (۹/۳)۔

قریب ہوتی ہے)۔ الْقَرَابُ: قریب۔  
فَرَسٌ لَا حِقَّ الْأَقْرَابُ: گھوڑا جس کی تہی گاہیں پچی  
ہوئی ہوں۔

الْقَرَابُ: تلوار کی نیام بعض کا قول ہے کہ قراب نیام کو  
نہیں کہتے بلکہ نیام کے اوپر کے چڑے کو کہا جاتا ہے اس  
کی جمع قُرْبُ ہے اور قَرَبْتُ السَّيْفَ وَأَقْرَبْتُهُ کے  
معنی تلوار کو نیام کے اندر بند کرنے کے ہیں۔

رَجُلٌ قَارِبٌ: آدمی جو پانی کے قریب پہنچ جائے۔ لَيْلَةُ  
الْقُرْبِ: عرب لوگ اونٹ چراتے چراتے پانی کی طرف  
چلے جاتے جب ان کے اور پانی کے درمیان ایک شب کا  
سفر باقی رہ جاتا تو عجلت سے سفر کرتے لہذا اس رات کو  
لَيْلَةُ الْقُرْبِ کہتے چنانچہ اسی سے أَقْرَبُوا إِلَيْهِمْ  
کا محاورہ ہے۔ جس کے معنی لَيْلَةُ الْقُرْبِ میں اونٹوں کو  
پانی کی طرف ہٹانے کے ہیں۔

الْمُقَرَّبُ: حاملہ عورت جو قریب الولادة ہو۔

### (ق ر ح)

الْقَرْحُ: (فتح القاف) کسی خارجی اثر سے  
ہونے والے زخم کو قَرْح کہا جاتا ہے اور اندرونی طور پر  
ہونے والے زخم (جیسے پھنسی وغیرہ کا زخم) کو قَرْح۔  
قَرَحْتُهُ (ف) کے معنی زخمی کرنے کے ہیں۔ مگر کبھی لازم  
بھی آتا ہے جیسے قَرِحُ قَلْبُهُ: (اس کا دل زخمی ہو گیا)

حاصل کرتا رہتا ہے حتیٰ کہ میں اسے اپنا محبوب بنا لیتا  
ہوں۔..... اور آیت کریمہ:

﴿وَلَا تَقْرَبُوا مَالَ الْيَتِيمِ﴾ (۶-۱۵۳) اور یتیم کے  
مال کے پاس بھی نہ جانا۔

میں لَا تَقْرَبُوا کے لفظ میں جو بلاغت پائی جاتی ہے وہ  
تَنَاوَلُوا کے لفظ سے پیدا نہیں ہو سکتی! کیوں کہ کسی چیز کو  
لینے سے منع کرنے کی نسبت اس کے قریب جانے سے  
منع کرنے میں زیادہ مبالغہ پایا جاتا ہے اسی لیے فرمایا  
﴿وَلَا تَقْرَبُوا هَذِهِ الشَّجَرَةَ﴾ (۲-۳۵) لیکن اس  
درخت کے پاس نہ جانا۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَلَا تَقْرَبُوا هُنَّ حَتَّى يَطْهَرْنَ﴾ (۲-۲۲۲) اور  
جب تک پاک نہ ہو جائیں ان سے مقاربت نہ کرو۔ میں  
قرب جماع سے کنایہ ہے۔ نیز فرمایا:  
﴿لَا تَقْرَبُوا الزَّيْنَى﴾ (۱۷-۳) اور زنا کے پاس بھی نہ  
جانا۔

الْقَرَابُ: (مصدر) بمعنی مقاببت ہے شاعر نے کہا  
ہے (الطویل)

(۳۵۳) فَإِنَّ قَرَابَ الْبَطْنِ يَكْفِيكَ مَلُوءَهُ قَدَحٌ  
قَرَبَانُ: تقریباً بھرا ہوا پیالہ۔

اور قَرَبَانُ الْمَرْءَةِ: عورت سے مجامعت کرنا۔ تَقَرَّبُ  
الْفَرَسُ: گھوڑے کا ذکی دوڑنا ایک رفتار جو دوڑ کے

① قاله هلال بن خثعم وتماحه: ويكفيك عورات الامور اجتنابها والبيت في امالي المرتضى (۱: ۳۷۹) والحيوان (۱: ۳۸۲) في اربعة والبخلا (۲: ۲۰) وبيروى لقيس بن خطيم وفي العيون (۳: ۱۸۴) البشار بن بشر ولكنه مجهول ولم يعرف لهذا الاسم اى شاعر وفي حماسة البحري (طبعة اروپا البيت لزياد بن منقذ التميمي وفي مجموعة المعاني رافع بن خميصة وفي رواية لسوءات الامور بدل عورات الامور كما في الاحيا للغزالي (۳: ۲۴۰) في ثلاثة ابیات وفيه قصه ابى محمد اليزيدى مع هارون وفي الحماسة لابن الشحرى والمعاني للقتبي والامالي "ملا" بالنصب على التميز وهو الصواب وفي المطبوع يكفيك بالموحدة مصحف ۱۲۔

اور آیات کریمہ۔

﴿كُونُوا قِرَدَةً خَاسِئِينَ﴾ (۲-۶۵) ذلیل و خوار بند ہو جاؤ۔

﴿وَجَعَلَ مِنْهُمْ الْقِرَدَةَ﴾ (۵-۶۰) اور جن کو ان میں سے بندر..... بنادیا۔

کو بعض نے ظاہری معنی پر محمول کیا ہے یعنی انہیں سچ بچ بندر بنادیا گیا تھا بعض نے کہا ہے کہ انکے اخلاق و اطوار بندروں جیسے ہو گئے تھے۔ نہ کہ وہ سچ بچ بندر بنادے گئے تھے۔ ❶

الْقِرَادُ چیڑی۔ جمع قِرْدَانٌ۔

صُوفٌ قِرْدٌ: الجھی ہوئی اون (جو کاتی نہ جاسکے) اسی سے تہ برتہ چھائے ہوئے بادل کو سَحَابٌ قِرْدٌ کہا جاتا ہے۔

أَقْرَدٌ: چیڑی کی طرح زمین کے ساتھ چمٹ جانا۔ قَرَدٌ چیڑی کی طرح ساکن ہو جانا۔ اور قَرَدْتُ الْإِبِلَ کے معنی اونٹ سے چیڑی دور کرنے کے ہیں۔ (ازالہ ماخذ) جیسے قَدَيْتُ وَمَرَضْتُ کا محاورہ ہے۔ اور استعارہ کے طور پر قَرَدٌ کے معنی چالوسی کے ذریعہ کسی کو دھوکا دینا بھی آتے ہیں۔ چنانچہ محاورہ ہے۔ فُلَانٌ يُقَرِدُ فُلَانًا۔ فلاں مدارات سے اسے فریب دے رہا ہے اور پستان کے سرے کو قَرَدٌ کہا جاتا ہے کیونکہ اس کی شکل بھی چیڑی جیسی ہوتی ہے۔

## (ق ر ض)

الْقَرَضُ: (کرتا) قطع کی ایک قسم ہے پھر جس طرح کسی جگہ سے گزرنے اور تجاوز کرنے لیے قَطَعَ الْمَكَانَ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے اس طرح قَرَضَ

وَأَقْرَحْتُهُ: اسے زخمی کیا و قَرَحَ (س) زخمی ہو جانا۔

کبھی قَرَحُ کا لفظ زخم اور قَرَحُ اس درد و الم پر بولا جاتا ہے جو زخم کی وجہ سے ہو قرآن پاک میں ہے: ﴿مِنْ بَعْدِ مَا أَصَابَهُمُ الْقَرْحُ﴾ (۳-۱۷۲) باوجود زخم کھانے کے۔

﴿إِنْ يَمَسُّكُمْ قَرَحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرَحٌ مِثْلُهُ﴾ (۳-۴۰) اگر تمہیں زخم (حکمت) لگا ہے تو ان لوگوں کو بھی ایسا زخم لگ چکا ہے۔

ایک قرأت میں قَرَحٌ بضمہ قاف ہے۔

الْقَرَحَانُ: وہ شخص جو کبھی چیچک و طاعون، جدری وغیرہ بیماری میں مبتلا نہ ہوا ہو۔

قَرَسٌ قَارِحٌ: گھوڑا جس کے ناب (دانت) جو سب دانتوں سے آخر میں نکلتے ہیں ظاہر ہو گئے ہوں مونث قَارِحَةٌ أَقْرَحُ: گھوڑا جس کی پیشانی میں سفید نشان ہو۔ رَوْضَةٌ قَرَحَاءُ: سبزہ زار جس کے وسط میں سفید پھول ہو گو یا وہ أَقْرَحُ: گھوڑے کے مشابہ ہے اِفْتَرَحْتُ النُّجْمَلُ: کسی اونٹ پر پہلے پہل سواری کرنا اِفْتَرَحْتُ كَذَا عَلَى فُلَانٍ کسی کے سامنے پہلی مرتبہ کسی رائے کا اظہار کرنا۔ اِفْتَرَحْتُ بَشْرًا: میں نے کنوئیں سے خالص پانی نکالا أَرْضٌ قَرَاحٌ اور سرزمین جس میں نہ گھاس ہو اور نہ پانی۔ الْقَرِيحَةُ: پہلا پانی جو کنوئیں سے نکالا جاتا ہے اور اسی سے قَرِيحَةُ الْإِنْسَانِ مستعار ہے جس کے معنی انسان کی طبیعت کے ہیں۔

## (ق ر د)

الْقَرْدُ: بندر اس کی جمع قُرُودٌ وَقَرَدَةٌ ہے۔

❶ کذا قال مجاهد المعنى الاول ذهب اليه ابن عباس وغيره راجع انوار التنزيل واسرار التاويل للبيضاوي۔

چیز پر مارنے کے ہیں اسی سے قَرَعَتْهُ بِالْمِقْرَعَةِ کا محاورہ ہے جس کے معنی کوڑے سے سرزنش کرنے کے ہیں (اور قیامت کے حادثہ کو قَارِعَةٌ کہا گیا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔ ﴿كَذَّبَتْ ثَمُودُ وَعَادٌ بِالْقَارِعَةِ﴾ (۶۹-۴) (وہی) کھڑکھڑانے والی (جس کو ثمود اور عاد (دونوں نے جھٹلایا)۔

﴿الْقَارِعَةُ﴾ - مَا الْقَارِعَةُ ﴿ (۱۰۱-۲) کھڑکھڑانے والی کیا ہے۔

### (ق ر ف)

الْقَرَفُ وَالْإِفْتِرَافُ کے اصل معنی کریدنے کے ہیں اور جو چھال یا چھلکا اتارا جاتا ہے۔ اسے قرف کہا جاتا ہے اور بطور استعارہ اِفْتَرَفَ (افعال) کمانے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے خواہ وہ سب اچھا ہو یا برا، جیسے فرمایا ﴿سَيَجْزُونَ بِمَا كَانُوا يَفْتَرُونَ﴾ (۶-۱۲۰) وہ عنقریب اپنے کیے کی سزا پائیں گے۔

﴿وَلِيَفْتَرُوا مَا هُمْ مُفْتَرُونَ﴾ (۶-۱۱۳) اور جو کام وہ کرتے تھے وہی کرنے لگیں۔

﴿وَأَمْوَالُنِ افْتَرَفْتُمُوهَا﴾ (۹-۲۴) اور مال جو تم کمانے ہو۔

لیکن اس کا بیشتر استعمال برے کام کرنے پر ہوتا ہے اسی بنا پر محاورہ ہے الْأَعْتِرَافُ مُزِيلُ الْإِفْتِرَافِ کہ اعتراف جرم، جرم کو مٹا دیتا ہے قَرَفْتُ فَلَانًا بِكَذِّا میں نے فلاں پر تہمت لگائی اور آیت کریمہ: ﴿وَلِيَفْتَرُوا مَا هُمْ مُفْتَرُونَ﴾ (۶-۱۱۳) کو بھی بعض نے اسی معنی پر محمول کیا ہے۔ فَلَانٌ قَرَفَنِي: فلاں نے مجھ پر تہمت لگائی۔

الْمَكَانَ بھی کہتے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَإِذَا غَرَبَتْ تَقَرَّرَ طُهُمُ ذَاتِ الشَّمَالِ﴾ (۱۸-۱۷) اور جب غروب ہو تو اس سے بائیں طرف کترا جائے۔

یعنی غروب کے وقت انہیں ایک جانب چھوڑتا ہوا گزر جاتا ہے۔

اور قرض اس مال کو بھی کہتے ہیں جو کسی کو (اس کی ضرورت پوری کرنے کے لیے) دیا جائے اس شرط پر کہ وہ واپس مل جائے گا۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿مَنْ ذَا الَّذِي يُقْرِضُ اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا﴾ (۲-۲۳۵) کوئی ہے کہ خدا کو قرض حسد دے؟

اور شعر گوئی کو بھی مُقَارَضَةٌ کہا جاتا ہے اور شعر کو بطور استعارہ قَرِيضٌ کہا جاتا ہے جس طرح کہ نَسَجٌ اور حَوْكٌ کے الفاظ اس معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔

### (ق ر ط س)

الْقِرْطَاسُ: ہر وہ چیز جس پر لکھا جائے۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿وَلَوْ نَزَّلْنَاهُ عَلَيْكَ كِتَابًا فِي قِرْطَاسٍ﴾ (۶-۷)

اور اگر ہم تم پر کاغذ میں لکھی کتاب نازل کرتے۔

﴿قُلْ مَنْ أَنْزَلَ الْكِتَابَ الَّذِي جَاءَ بِهِ مُوسَى نُورًا وَهُدًى لِلنَّاسِ تَجْعَلُونَهُ قِرَاطِينَ﴾

(۶-۹۱) کہو کہ جو کتاب موسیٰ علیہ السلام لے کر آئے تھے اسے

کس نے نازل کیا تھا جو لوگوں کے لیے نور اور ہدایت تھی

اور جسے تم نے علیحدہ علیحدہ اوراق (میں نقل) کر رکھا ہے۔

### (ق ر ع)

الْقَرَعُ: (ف) کے اصل معنی ایک چیز کو دوسری

(گواہ) کہا ہے۔

﴿قَالَ قَرِينُهُ رَبَّنَا مَا أَطْعَمْتُهُ﴾ (۵۰-۲۷) اس کا

ساتھی (شیطان) کہے گا کہ اے ہمارے پروردگار! میں

نے اس کو گمراہ نہیں کیا۔

﴿فَهُوَ لَهُ قَرِينٌ﴾ (۴۳-۳۶) تو وہ اس کا ساتھی ہو

جاتا ہے۔

قَرِينٌ کی جمع قُرَنَاءَ ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَقَيَّضْنَا لَهُمْ قُرَنَاءَ﴾ (۴۱-۲۵) اور ہم نے

شیطان کو ان کا ہم نشین مقرر کر دیا۔

ایک زمانہ کے لوگ یا امت کو قُرُنُ کہا جاتا ہے اس کی جمع

قُرُونٌ ہے قرآن پاک میں ہے:

﴿وَلَقَدْ أَهْلَكْنَا الْقُرُونُ مِنْ قَبْلِكَ﴾ (۱۰-۱۳)

اور تم سے پہلے ہم کئی امتوں کو..... ہلاک کر چکے ہیں۔

﴿وَكَمْ أَهْلَكْنَا مِنَ الْقُرُونِ﴾ (۱۷-۱۷) اور ہم

نے..... بہت امتوں کو ہلاک کر ڈالا۔

﴿وَكَمْ أَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِنْ قُرُنٍ﴾ (۱۹-۷۸، ۷۸)

اور ہم نے ان سے پہلے بہت امتیں ہلاک کر دیں۔

﴿وَقُرُونًا بَيْنَ ذَلِكَ كَثِيرًا﴾ (۲۵-۳۸) اور ان

کے درمیان اور بہت سی جماعتوں کو بھی..... ﴿ثُمَّ أَنشَأْنَا

مِنْ بَعْدِهِمْ قُرْنًا آخَرِينَ﴾ (۲۳-۳۱) پھر ان کے

بعد ہم نے ایک اور جماعت پیدا کی۔ ﴿قُرُونًا

آخَرِينَ﴾ (۲۳-۴۲) اور جماعتیں..... ﴿الْقُرُونُ﴾ (فتح

القاف) کے معنی نفس کے بھی آتے ہیں کیونکہ وہ بھی جسم

کے ساتھ ملا ہوا ہوتا ہے نیز قُرُونٌ وہ اونٹ ہے جو چلتے

وقت پچھلے پاؤں اگلے پاؤں کی جگہ پر رکھے گویا وہ ان کو

باہم ملا رہا ہے۔

رَجُلٌ مُفْرِفٌ: دوغلا آدمی۔ قَارَفَ فُلَانٌ اَمْرًا اس نے برے کام کا ارتکاب کیا۔

## (قِرْدَن)

الْاَقْتِرَانُ۔ اِزْدِوَاجٌ کی طرح اِقْتِرَانُ کے

معنی بھی دو یا دو سے زیادہ چیزوں کے کسی معنی میں باہم

مجمع ہونے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿اَوْ جَاءَ

مَعَهُ الْمَلَائِكَةُ مُقْتَرِنِينَ﴾ (۴۳-۵۳) یا یہ ہوتا کہ

فرشتے جمع ہو کر اس کے ساتھ آتے۔

قَرَنْتُ الْبَعِيرَ مَعَ الْبَعِيرِ: دو اونٹوں کو ایک رسی کے

ساتھ باندھ دینا اور جس رسی کے ساتھ ان کو باندھا جاتا

ہے اے قَرْنُ کہا جاتا ہے اور قَرْنَتُهُ (تفعیل) میں

مبالغہ کے معنی پائے جاتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَأَخْرَيْنَ مُفْرِنِينَ فِي الْأَصْفَادِ﴾ (۳۸-۳۸)

اور اوروں کو بھی جو زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔ اور

وہ آدمی جو دوسرے کا ہم عمر ہو یا بہادری، قوت اور دیگر

اوصاف میں اس کا ہم پلہ ہو اے اس کا قرن کہا جاتا ہے

اور ہم پلہ یا ہم سر کو قریب بھی کہتے ہیں۔ چنانچہ محاورہ

ہے۔

فُلَانٌ قَرْنٌ فُلَانٍ اَوْ قَرِينَتُهُ: فلاں اس کا ہم عمر یا ہم

سر ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿إِنِّي كُنَّا لِي قَرِينٍ﴾ (۳۷-۵۱) کہ میرا ایک ہم

نشین تھا۔

﴿وَقَالَ قَرِينُهُ هَذَا مَا لَدَيَّ عَتِيدٌ﴾ (۵۰-۲۳)

اور اس کا ہم نشین (فرشتہ) کہے گا یہ (اعمال نامہ) میرے

پاس تیار ہے۔

یہاں قرین سے مراد وہ فرشتہ ہے جسے دوسری جگہ شہید

جائیں تو بحیثیت مجموعی ان دونوں کو قریہ کہتے ہیں اور جمع ہونے والے لوگوں اور جگہ پر انفراداً بھی قریہ بولا جاتا ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَاسْتَلِ الْقَرْيَةَ﴾ (۸۲-۱۲) اور..... بستی سے دریافت کر لیجیے۔

میں اکثر مفسرین نے اہل کالفظ محذوف مان کر قریہ سے وہاں کے باشندے مراد لیے ہیں لیکن بعض مفسرین نے کہا ہے کہ قریۃ کے معنی ہی باشندوں کے ہیں (لہذا اہل کالفظ محذوف ماننے کی ضرورت نہیں) چنانچہ اسی معنی میں فرمایا ﴿وَضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ آمِنَةً مُطْمَئِنَّةً﴾ (۱۱۲-۱۲) اور خدا ایک بستی کی مثال بیان فرماتا ہے جو (ہر طرح) امن چین سے بستی تھی ﴿وَكَايِنَ مِنْ قَرْيَةٍ هِيَ أَشَدُّ قُوَّةً مِنْ قَرْيَتِكَ﴾ (۱۳-۳۷) اور بہت سی بستیاں تمہاری بستی سے..... زور و قوت میں کہیں بڑھ کر تھیں۔

اور آیت کریمہ:

﴿وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرَى﴾ (۱۱-۱۱۷) اور تمہارا پروردگار ایسا نہیں کہ بستیوں کو..... تباہ کر دے۔

میں القریٰ ایک خاص شہر کا نام ہے اسی طرح آیت کریمہ: ﴿وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ إِلَّا رَجُلًا نُوحِي إِلَيْهِمْ مِنْ أَهْلِ الْقُرَى﴾ (۱۰۹-۱۲) اور ہم نے تم سے پہلے بستیوں کے رہنے والوں میں مرد ہی بھیجے تھے۔ جن کی طرف ہم وحی بھیجتے تھے۔

میں بھی القریٰ شہر کا نام ہے۔ نیز فرمایا:

قَرْنٌ: ترکش جب کہ کمان کے ساتھ بندھا ہوا ہو۔ نَاقَةٌ قَرُونٌ: وہ اونٹنی جس کے پچھلے تھن باہم ملے ہوئے ہوں۔

الْقَرَانُ..... حج اور عمرہ کو جمع کرنا اور مطلق دو چیزوں کے جمع کرنے پر بھی بولا جاتا ہے۔

قَرْنٌ: جانور کا سینگ۔ كَبْشٌ أَقْرَنُ: سینگوں والا مینڈھا مؤنث قرناء تشبیہ کے طور پر عورت کے عَقْلَةً کو بھی قَرْنٌ کہا جاتا ہے کیونکہ وہ سینگ کی شکل کا ایک مادہ ہوتا ہے جس سے مرد کے عضو مخصوص کو مجامعت کے وقت اس طرح تکلیف محسوس ہوتی ہے گویا اسے سینک چبھ رہا ہے۔ قَرْنُ الْجَبَلِ: پہاڑ کا ابھرا ہوا حصہ۔ قَرْنُ الْمَرْءَةِ عورت کے گیسو قَرْنُ الْمَرْءَةِ: آئینے کا فریم۔

قَرْنُ الْفَلَاةِ: جنگل کا کنارہ۔ قَرْنُ الشَّمْسِ: آفتاب کا کنارہ۔ قَرْنُ الشَّيْطَانِ: شیطان کے سینگ الغرض ان تمام محاوروں میں قرن کالفظ بطور تشبیہ کے استعمال ہوا ہے۔ اور ذوالقرنین ایک مشہور بادشاہ کا لقب تھا (جس کا قصہ سورہ کہف ۸۳ تا ۹۸ میں مذکور ہے)

ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ نے حضرت علیؓ سے فرمایا ﴿إِنَّ لَكَ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ وَإِنَّكَ لَذُو قَرْنِيهَا﴾ کہ جنت میں تمہارے لیے ایک مکان مخصوص ہے اور تم اس امت کے ذوالقرنین ہو یعنی بلحاظ مرتبہ کے اس امت میں ذوالقرنین کی مثل ہو۔

## (ق ر ی)

الْقَرْيَةُ: وہ جگہ جہاں لوگ جمع ہو کر آباد ہو

① الحديث في الفائق (۳۲۷/۲) وغریب ابی عبید (۷۸/۳) والضمیر فی قرنیہا يعود الی الامۃ والعود الی المضر اکثر فی القرآن و کلام العرب ۱۲۔

جمع کیا.....

قَرِيتُ الضَّيْفِ قَرَى: میں نے مہمان کی مہمانی کی  
قَرَى الشَّيْءَ فِي فَيْمِهِ مِنْهُ: منہ میں کوئی چیز جمع کرنا۔  
قَرِيَانُ الْمَاءِ: پانی جمع ہونے کی جگہ۔

### (ق س س)

الْقِسُّ وَالْقَسِيسُ کے معنی رؤسائے نصاریٰ میں  
سے خدا پرست عالم کے ہیں چنانچہ فرمایا: ﴿ذَلِكَ بِأَنَّ  
مِنْهُمْ قَسِيْسَيْنِ وَرُهْبَانًا﴾ (۵-۸۲) یہ اس لیے کہ  
ان میں عالم بھی ہیں اور مشائخ بھی۔

اصل میں قُسُّ کے معنی رات کے وقت کسی چیز کی جستجو  
کرنے کے ہیں۔ چنانچہ مجاورہ ہے۔

تَقَسَّسْتُ أَصْوَاتَهُمْ بِاللَّيْلِ: میں نے رات کے  
وقت ان کی آوازوں کی جستجو کی۔

الْقَسْقَاسُ وَالْقَسْقَاسُ کے معنی رات کے وقت  
رہنمائی کرنے والے کے ہیں۔

### (ق س ر)

الْقَسْرُ (ن) کے معنی غلبہ اور تسلط کے ہیں۔  
قَسْرَتُهُ وَقَسْرَتُهُ: میں نے اسے مجبور کیا۔

اسی سے الْقَسْوَرَةُ ہے جس کے معنی شیر کے ہیں نیز  
تیر انداز اور شکاری کو بھی قسورة کہتے ہیں چنانچہ آیت  
کریمہ: ﴿قَرَّتْ مِنْ قَسْوَرَةٍ﴾ (۷۵-۵۱) یعنی شیر  
سے ڈر کر بھاگ جاتے ہیں۔

میں بعض نے کہا ہے کہ قَسْوَرَةُ سے مراد شیر ہے اور بعض  
نے تیر انداز اور بعض نے شکاری مراد لیا ہے ❶۔

﴿رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْ هَذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ أَهْلُهَا﴾  
(۴-۷۵) اے ہمارے پروردگار! ہم کو اس شہر سے، جس  
کے رہنے والے ظالم ہیں نکال کر کہیں اور لے جا۔

حکایت کی گئی ہے کہ ایک قاضی، علی بن حسینؑ کے پاس آیا  
علی بن حسینؑ نے اس سے دریافت کیا کہ آیت ﴿وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ الْقُرَى الَّتِي بَرَكْنَا فِيهَا  
قُرًى ظَاهِرَةً﴾ (۳۳-۱۸) اور ہم نے ان کے اور ان  
بستیوں کے درمیان جن میں ہم نے برکت دی تھی، ایک  
دوسرے کے متصل دیہات بنائے تھے۔

کے متعلق تمہارے علماء کا کیا خیال ہے؟ تو اس نے کہا کہ  
وہ القری سے مکہ مراد لیتے ہیں۔ تو انہوں نے فرمایا: کہ تم  
نہیں جانتے کہ اس سے وہاں کے لوگ مراد ہیں تو میں  
(قاضی) نے کہا کہ کتاب اللہ میں اس کی کوئی دلیل بھی  
ہے۔ جہاں قریہ سے مراد لوگ ہوں اس پر انہوں نے  
فرمایا کہ تم نے آیت کریمہ ﴿وَكُنَّا مِنْ قَرْيَةٍ عَتَتْ  
عَنْ أَمْرِ رَبِّهَا وَرُسُلِهِ﴾ (۶۵-۸) اور بہت سی  
بستیوں کے رہنے والوں نے اپنے پروردگار اور اس کے  
پیغمبروں کے احکام کی سرکشی کی۔

نہیں پڑھی (یعنی یہاں قریہ سے لوگ مراد ہیں)  
﴿وَتِلْكَ الْقُرَى أَهْلَكْنَاهُمْ لَمَّا ظَلَمُوا﴾  
(۱۸-۵۹) اور یہ بستیاں (جو ویران پڑی ہیں) جب  
انہوں نے (کفر سے) ظلم کیا تو ہم نے ان کو تباہ کر دیا۔

﴿وَإِذْ قُلْنَا ادْخُلُوا هَذِهِ الْقَرْيَةَ﴾ (۲-۵۸) اور  
جب ہم نے ان سے کہا اس گاؤں میں داخل ہو جاؤ  
قَرِيتُ الْمَاءِ فِي الْحَوْضِ: میں نے حوض میں پانی

❶ وفی الطبری ذہب الی الاول: ابوہریرۃ وابن عباس وزید بن السلم الی الثانی: عکرمۃ ومجاہد والی الثالث: سعید بن جبیر (انظر انطری ۲۹/۱۶۹)



## (ق س ط)

طرح اس سے بھی عدل و انصاف کے معنی مراد لیے جاتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا:

﴿وَزِنُوا بِالْقِسْطِ الْمُسْتَقِيمِ﴾ (۱۷-۳۵) اور جب تول کر دو۔ تو ترازو سیدھی رکھ کر تول کرو۔

## (ق س م)

الْقِسْمُ وَالْقِسْمَةُ (ض) کے معنی کسی چیز کے حصے کرنے اور بانٹ دینے کے ہیں۔ مثلاً قِسْمَةُ الْمِيرَاثِ: ترکہ کو وارثوں کے درمیان تقسیم کرنا۔ قِسْمَةُ الْعَنِيَمَةِ: مال غنیمت تقسیم کرنا چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿لِكُلِّ بَابٍ مِنْهُمْ جُزْءٌ مَقْسُومٌ﴾ (۱۵-۴۴) ہر ایک دروازے کے لیے ان میں سے جماعتیں تقسیم کر دی گئیں ہیں۔

﴿وَنَبِّئُهُمْ أَنَّ الْمَاءَ قِسْمَةٌ بَيْنَهُمْ﴾ (۵۴-۲۸) اور ان کو آگاہ کر دو کہ ان میں پانی کی باری مقرر کر دی گئی ہے۔

اِسْتَقْسَمْتُہُ کے معنی کسی سے تقسیم چاہنا ہیں اور کبھی یہ بمعنی قسم (تقسیم کرنا) بھی آتا ہے قرآن پاک میں ہے:

﴿وَأَنْ تَسْتَقْسِمُوا بِالْأَزْلَامِ ذَلِكُمْ فَسُقُ﴾ (۵-۳) اور یہ بھی کہ پانسوں سے قسمت معلوم کرو یہ سب گناہ کے کام ہیں۔

رَجُلٌ مُنْقَسِمُ الْقَلْبِ: وہ آدمی جس کا دل تفلرات سے پریشان ہو گویا تفلرات نے اس کے دل کو تقسیم کر لیا ہے۔ یہ مُتَوَرِّعُ الْخَاطِرِ وَمُشْتَرِكُ اللَّبِّ کی طرح کا محاورہ ہے۔

اَقْسَمَ (افعال) کے معنی حلف اٹھانے کے ہیں یہ دراصل

الْقِسْطُ (اسم) تَصَفُّفٌ وَنَصَفَةٌ کی طرح قِسْطٌ بھی مثنیٰ بر عدل حصہ کو کہتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا:

﴿لَيَجْزِي الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ بِالْقِسْطِ﴾ (۱۰-۴) تاکہ ایمان والوں اور نیک کام کرنے والوں کو انصاف کے ساتھ بدلہ دے۔

﴿وَأَقِيمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ﴾ (۵۵-۹) اور انصاف کے ساتھ ٹھیک تولو۔

اور قِط کے معنی دوسرے کا حق مارنا بھی آتے ہیں اس لیے یہ ظلم اور جور کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اَلْقِسْطُ: پاؤں میں میڑھا پن یہ اَفْجَحُ کی ضد ہے جس کے معنی پاؤں کے اگلے حصہ کی جانب سے ان کے نزدیک اور ایڑیوں کی جانب سے دور ہونے کے ہیں اَلْاَفْسَاطُ: اس کے اصل معنی کسی کو اس کا حق دینے کے ہیں اسی چیز کا نام انصاف ہے اسی بنا پر کہا گیا ہے کہ قَسَطَ الرَّجُلُ (فَهُوَ قَاسِطٌ) کے معنی ظلم کرنے اور اَفْسَاطُ کے معنی انصاف کرنے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَأَمَّا الْقَاسِطُونَ فَكَانُوا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا﴾ (۷۲-۱۵) اور گنہگار ہوئے وہ دوزخ کا ایندھن بنے۔

﴿وَأَقْسَطُوا إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ﴾ (۳۹-۹) اور انصاف سے کام لو کہ خدا انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

تَقَسَّطْنَا بَيْنَنَا: ہم نے (کسی چیز کو) آپس میں برابر تقسیم کر لیا۔

چنانچہ اَلْقِسْطَاسُ، ترازو کو کہتے ہیں اور لفظ میزان کی

خبر دے ہیں اور الْقَسَامَةُ بمعنی حسن۔ اصل میں یہ قِسْمَةٌ سے ہے گویا ہر عضو کو اس کے مناسب حال حسن سے بہرہ ور کیا ہے۔ اس لیے ان میں یگانگت پیدا ہوگئی ہے اور عدم تناسب نظر نہیں آتا بعض نے کہا ہے کہ خوب رو کو مُقَسَّمٌ اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے حسن سے نظر کو تقسیم کر لیتا ہے یعنی نظر جسم کے کسی ایک حصہ پر جم کر نہیں رہ جاتی (بلکہ ہر عضو کی طرف بار بار منتقل ہوتی رہتی ہے) اور آیت کریمہ:

﴿كَمَا أَنْزَلْنَا عَلَى الْمُقْتَسِمِينَ﴾ (۱۵-۹۰) جس طرح ان لوگوں پر نازل کیا جنہوں نے تقسیم کر دیا۔ میں مُقْتَسِمِينَ سے وہ لوگ مراد ہیں جو مکہ کی مختلف گھاٹیوں میں بٹ کر بیٹھ گئے تھے۔ تاکہ نووارد لوگوں کو اسلام سے روکیں اور رسول اللہ ﷺ تک پہنچنے نہ دیں۔ بعض کے نزدیک وہ لوگ مراد ہیں جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کے خلاف سازش کرنے پر قسمیں کھائی تھیں۔ ۱

### (ق س و)

الْقَسْوَةُ کے معنی سنگ دل ہونے کے ہیں یہ اصل میں حَجَرٌ قَاسٍ سے ہے جس کے معنی سخت پتھر کے ہیں۔  
الْمُقَاسَاةُ: سختی جھیلنا۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿ثُمَّ قَسَتْ قُلُوبُكُمْ﴾ (۲-۷۴) پھر..... تمہارے دل سخت ہو گئے۔

﴿فَوَيْلٌ لِلْقَاسِيَةِ قُلُوبُهُمْ مِّنْ ذِكْرِ اللَّهِ﴾

قَسَامَةٌ سے مشتق ہے اور قَسَامَةٌ ان قسموں کو کہا جاتا ہے جو اولیائے مقتول پر تقسیم کی جاتی ہیں پھر مطلق قسم کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے ۲ قرآن پاک میں ہے۔  
﴿وَأَقْسَمُوا بِاللَّهِ جَهْدَ أَيْمَانِهِمْ﴾ (۱۶-۱۳۸) اور یہ خدا کی سخت سخت قسمیں کھاتے ہیں۔

﴿أَهْوَاءِ الَّذِينَ أَقْسَمْتُمْ﴾ (۷-۴۹) کیا یہ وہی لوگ ہیں جن کے بارے میں تم قسمیں کھایا کرتے تھے۔  
﴿لَا أَقْسِمُ بِسَوْمِ الْقِيَمَةِ وَلَا أَقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَامَةِ﴾ (۷-۲۱) ہم کو روز قیامت کی قسم اور نفسِ لوامہ کی۔

﴿فَلَا أَقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ﴾ (۷-۴۰) ہمیں مشرقوں اور مغربوں کے مالک کی قسم۔  
﴿إِذْ أَقْسَمُوا لَيَصْرِمُنَّهَا مُصْبِحِينَ﴾ (۶۸-۱۷) جب انہوں نے قسمیں کھا کر کہا کہ ہم صبح ہوتے اس کا میوہ توڑ لیں گے۔

﴿فَيُقْسِمَانِ بِاللَّهِ﴾ (۵-۱۰۶) اور دونوں خدا کی قسمیں کھائیں۔

قَاسَمْتُهُ وَتَقَاسَمَا: باہم قسمیں اٹھانا قرآن پاک میں ہے۔ ﴿وَقَاسَمَهُمَا إِنِّي لَكُمَا لَمِنَ النَّصِيحِينَ﴾ (۷-۲۱) اور ان کو قسم کھا کر کہا کہ میں تو تمہارا خیر خواہ ہوں۔ ﴿قَالُوا تَقَاسَمُوا بِاللَّهِ﴾ (۲۷-۴۶) کہنے لگے کہ خدا کی قسم کھاؤ۔

فَلَانٌ مُّقَسَّمٌ الْوَجْهَ أَوْ قَسِيمٌ الْوَجْهَ کے معنی

۱ وایضاً قسم بطلاق علی الدلیل والشہادۃ کما فی قولہ تعالیٰ وَاِنَّهُ لَقَسَمٌ لِّو تَعْلَمُوْنَ عَظِیْمٌ (۵۶-۷۶)۔

۲ وہ قال مقاتل والفراء واختاره البيضاوی وقال ابن عباس وعكرمة المراد به اهل الكتاب وقال زيد بن اسلم المراد منه قوم صالح تقاسموا علی قتله قسموا مقتسمين والتفصيل فی الطبری والقرطبی۔

﴿وَقَالَتْ لِأُخْتِهِ قُصِّيه﴾ (۲۸-۱۱) اور اس کی بہن سے کہا کہ اس کے پیچھے پیچھے چلی جا۔

اسی سے قَصِصُ ہے جس کے معنی اس باقی ماندہ گھاس کے ہیں جس سے کھوج لگایا جاسکے۔

قَصَصْتُ ظُفْرَةً: میں نے اس کے ناخن تراشے۔  
الْقَصَصُ کے معنی اخبار متبعہ کے ہیں قرآن پاک میں ہے۔ ﴿إِنَّ هَذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ﴾ (۳-۶۱)  
یہ تمام بیانات صحیح ہیں۔

﴿فَنُقِصِّهِمْ مِّنْ عَمْرَةٍ﴾ (۱۲-۱۱۱) ان کے قصے میں..... عبرت ہے۔

﴿وَقَصَّ عَلَيْهِ الْقَصَصَ﴾ (۲۸-۲۵) اور ان سے اپنا ماجرا بیان کیا۔

﴿نَقُصُّ عَلَيْكَ أَحْسَنَ الْقَصَصِ﴾ (۱۲-۲)  
تمہیں ایک اچھا قصہ سناتے ہیں۔

﴿فَلَنَقُصَّنَّ عَنْهُمْ بَعْلَمَ﴾ (۴-۷۷) پھر اپنے علم سے ان کے حالات بیان کریں گے۔

﴿يَقُصُّ عَلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ﴾ (۳۷-۷۶)  
بنی اسرائیل کے سامنے..... بیان کر دیتا ہے۔

﴿فَاقْصُصِ الْقَصَصَ﴾ (۷۶-۱۷۶) تو ان سے یہ قصہ بیان کر دو۔

الْقِصَاصُ کے معنی خون کا بدلہ دینے کے ہیں چنانچہ فرمایا:

﴿وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَوةٌ﴾ (۲-۱۷۹) حکم

(۲۲-۳۹) پس ان پر افسوس ہے جن کے دل خدا کی یاد سے سخت ہو رہے ہیں۔

﴿وَالْقَاسِيَةِ قُلُوبُهُمْ﴾ (۲۲-۵۳) اور جن کے دل سخت ہیں۔

﴿وَجَعَلْنَا قُلُوبَهُمْ قَاسِيَةً﴾ (۵-۱۳) اور ان کے دلوں کو سخت کر دیا۔

ایک قرأت میں قَاسِيَةً ہے یعنی ان کے دل خالص نہیں ہیں یہ دَرَهُمْ قَاسِيً سے مشتق ہے۔ جس کے معنی کھوٹے درہم کے ہیں جس میں (سکہ کی) ملاوٹ کی وجہ سے صلابت پائی جائے۔ شاعر نے کہا ہے (البسيط)

(۳۵۴) صَاحَ الْقَاسِيَاتُ فِي أَيْدِي الصَّيَارِفِ  
کھوٹے درہم صرافوں کے ہاتھ میں آواز دیتے ہیں۔

## (ق ش ع ر)

الْقَشْعَرَةُ: روٹنے کھڑے ہونا۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُودُ الَّذِينَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ﴾ (۲۳-۳۹) جو لوگ اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں۔ اس سے ان کے بدنوں پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔

## (ق ص ص)

الْقَصُّ کے معنی نشان قدم پر چلنے کے ہیں۔  
مماورہ ہے۔ قَصَصْتُ آثَرَهُ: یعنی میں اس کے نقش قدم پر چلا اور قصص کے معنی نشان کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿فَارْتَدَّا عَلَىٰ آثَارِهِمَا قَصَصًا﴾ (۱۸-۶۳) تو وہ اپنے اپنے پاؤں کے نشان دیکھتے دیکھتے لوٹ گئے۔

① وہی قراءۃ اهل الكوفة ۱۲۔

② قاله ابو زيد الطائي في قصيدة يرثي بها عثمان بن عفان الخليفة. وصدرها لها صو اهل في صم السلام كمال. والسلام معناه الصخر والبيت من شواهد الطبري (۶: ۱۵۵) واللسان (قسا) والا مالى (۱: ۲۷) اللالى (۱: ۱۲۸) والبحر (۳: ۴۴۵) والمعانى (۴-۱۲) وبعض الابيات من الرثاء ايضا فى اللسان (۰ امر) راجع السمط (۹۴۱: ۱۲)

جس کے محمود اور مذموم ہونے میں شبہ ہو یعنی جو نہ بالکل محمود ہو اور نہ بالکل مذموم بلکہ ان کے درمیان میں ہو۔ مثلاً ایک چیز عدل و جور کے مابین ہو چنانچہ اسی معنی کے اعتبار سے فرمایا ﴿فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهِ وَمِنْهُمْ مُقْتَصِدٌ﴾ (۳۵-۳۲) تو کچھ ان میں سے اپنے آپ پر ظلم کرتے ہیں اور کچھ میانہ رو ہیں۔

اسی طرح درمیانی مسافت پر بھی قصد کا لفظ بولا جاتا ہے۔ چنانچہ آیت ﴿وَسَفَرًا قَاصِدًا﴾ (۹-۳۲) اور سفر بھی ہلکا سا ہوتا۔ میں قاصدا کے معنی معتدل سفر کے ہیں جو زیادہ دور کا نہ ہو اور بعض نے اس کا معنی سفر قریب لکھا ہے۔ لیکن اصل معنی وہی ہیں جو ہم نے بیان کر دیئے ہیں۔ أَقْصَدَ السَّهْمُ: تیر کا لگ کر فوراً ہلاک کر دینا۔ گویا اس نے اپنے قصد کو پالیا۔ شاعر نے کہا ہے ﴿الاکمل﴾ (۳۵۵) فَاصَابَ قَلْبَكَ غَيْرَ أَنْ لَمْ يُقْصِدْ وہ تیرے دل پر لگا لیکن اس نے قتل نہیں کیا۔ اِنْقَصَدَ الرُّمُحُ کے معنی نیزہ ٹوٹ جانے کے ہیں اور تَقْصَدُ بمعنی نَکَسْرُ کے ہیں۔

قَصَدَ الرُّمُحُ: نیزہ توڑ دیا۔  
نَاقَةُ قَصِيدٍ: گوشت سے گتھی ہوئی اونٹنی۔ الْقَصِيدُ کم از کم سات اشعار کی نظم۔

### (ق ص ر)

الْقَصْرُ: یہ طول کی ضد ہے اور یہ دونوں اسمائے نسبتی سے ہیں جو ایک دوسرے پر قیاس کے ذریعہ سمجھے

قصاص میں تمہاری زندگی ہے۔

﴿وَالْجُرُوحُ قِصَاصٌ﴾ (۵-۲۵) سب زخموں کا

اسی طرح بدلہ ہے۔

محاورہ ہے: قِصَصٌ فُلَانٌ فُلَانًا وَضَرْبُهُ ضَرْبًا فَاَقْصَصَهُ: فلاں کو (مار مار کر) مرنے کے قریب کر دیا۔

انقص کے معنی چونہ کے ہیں۔ حدیث میں ہے ﴿ (۱۸۱) (نَهَى رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ تَقْصِصِ الْقُبُورِ) ﴾ کہ رسول اللہ نے قبروں کو گچ کرنے سے منع فرمایا۔

### (ق ص د)

الْقَصْدُ: (ض) راستہ کا سیدھا ہونا۔ محاورہ ہے قَصَدْتُ قَصْدَهُ: میں اس کی طرف سیدھا گیا۔ اسی سے اِقْتِصَادٌ ہے اور اِقْتِصَادٌ دو قسم پر ہے (ق) محمود علی الاطلاق: جو افراط و تفریط کے درمیان میں ہو جیسے سخاوت، جو اسراف اور بخل کے مابین کو کہتے ہیں اور شجاعت جو لا پرواہی اور بزدلی کے درمیانی درجہ کا نام ہے چنانچہ اسی معنی کے لحاظ سے فرمایا: ﴿وَأَقْصِدْ فِي مَشْيِكَ﴾ (۳۱-۱۹) اور اپنی چال میں اعتدال کیے رہنا۔

اور اقتصاد کی اسی نوع کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ﴿وَالَّذِينَ إِذَا أَنْفَقُوا..... الْاِيَةُ﴾ (۲۵-۶۷) یعنی اعتدال کے ساتھ نہ ضرورت سے زیادہ نہ کم۔

(۲) قصد کا لفظ کنایہ کے طور پر ہر اس چیز پر بولا جاتا ہے۔

① رواہ احمد فی مسنده (۷۸/۸) من رواية ام سلمة وفي معناه روايات في السنن (مجمع الزوائد ۳/۶۱)

② قاله النابغة في قصيدة في وصف المجردة امرأة نعمان مطلعها امن آل ميثه رائج او مقتدى۔ عجلان ذا زاد وغير مزود وصدر البيت: في اثر غناية امتك بسهمها والقصيدة في ديوانه (۳۹-۳۴) والبيت في مختار الشعر الجاهلي (۱۱: ۲) واللسان قصد والعقد الثمين ۹ في ۳۳۔ بيتا والعيني (۸۲: ۱)

جاتے ہیں۔

﴿فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَقْصُرُوا مِنَ الصَّلَاةِ﴾ (۴-۱۰) تو تم پر کچھ گناہ نہیں کہ نماز کو کم کر کے پڑھو۔ قَصَرْتُ اللَّفْحَةَ عَلَى فَرَسِي: اونٹنی کا دودھ اپنی گھوڑی کے لیے مخصوص کر دیا۔

قَصَرْتُ كَذَا کے معنی کسی چیز کو کوتاہ کرنے کے ہیں اور تقصیر کے معنی کوتاہی اور سستی کے ہیں اور قَصَرْتُ كَذَا کے معنی سکیڑنے اور کسی چیز کے بعض اجزاء کو بعض کے ساتھ ملانا کے بھی آتے ہیں۔ اسی سے قَصْر بمعنی محل ہے اس کی جمع قُصُور آتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَقَصْرَ مَشِيدٍ﴾ (۲۲-۴۵) اور بہت سے محل۔

قَصَرَ السَّهْمُ عَنِ الْهَدَفِ: تیر کا نشانہ تک نہ پہنچنا۔ اِمْرَأَةٌ قَاصِرَةٌ الطَّرْفِ وہ عورت جو ناجائز نظر اٹھا کر نہ دیکھے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿فِيهِنَّ قَاصِرَاتُ الطَّرْفِ﴾ (۳۷-۸۴) ان میں نیچی نگاہ والی عورتیں ہیں۔

﴿وَيَجْعَلْ لَكَ قَصُورًا﴾ (۲۵-۱۰) نیز تمہارے لیے محل بنا دے گا۔

قَصَرَ شَعْرُهُ: بال کتر وانا۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿مُحَلِّقِينَ رُءُوسَكُمْ وَمُقَصِّرِينَ﴾ (۴۸-۲۷) اپنے سر منڈوا کر اور بال کتر واکر۔

﴿إِنَّهَا تَرْمِي بِشَرِّ كَالْقَاصِرِ﴾ (۷۷-۳۲) اس سے آگ کی اتنی (بڑی بڑی) چنگاریاں اٹھتی ہیں جیسے محل۔

قَصَرَ فِي كَذَا: کسی کام میں سستی کرنا۔ قَصَرَ عَنْهُ: کسی کام میں سستی کرنا۔ قَصَرَ عَنْهُ: باوجود قدرت کے کوئی کام کرنے سے باز رہنا۔

بعض نے کہا ہے کہ قصر جمع ہے اور اس کے معنی درخت کی جڑوں کے ہیں۔ اس کا واحد قَصْرَة ہے جیسے جَمْرَة وَجَمْرٌ اور ان شراروں کو قصر کے ساتھ تشبیہ دینا ایسے ہی ہے جیسا کہ دوسری آیت میں ان کو۔

اِقْتَصَرَ عَلَى كَذَا: تھوڑی چیز پر اکتفا کرنا۔ اِقْتَصَرَتِ الشَّاةُ: بوڑھا ہونے کی وجہ سے بکری کے دانتوں کے اطراف کا کوتاہ ہو جانا۔

﴿كَأَنَّهُ جُمِلْتُ صُفْرًا﴾ (۷۷-۳۳) گویا زرد رنگ کے اونٹ ہیں۔

اَقْصَرَتِ الْمَرْءَةُ: چھوٹے قد کی اولاد جننا۔ تَقْصَارُ: چھوٹا سا بار۔

کہا ہے اور قَصَرْتُهُ کے معنی محل میں داخل کرنے کے ہیں اور اسی سے ارشاد الہی ہے۔

اَلْقَوْصَرَةُ: کھجور ڈالنے کی زنبیل جو کھجور کے پتوں یا نرکل کی بنی ہوئی ہوتی ہے۔

﴿حُورٌ مَّقْصُورَاتٌ فِي الْخِيَامِ﴾ (۵۵-۷۲) وہ حوریں ہیں جو خیموں میں مستور ہیں۔

## (ق ص ف)

اَلْقَاصِيفُ: (بادخت شکستہ) تیز اور سخت ہوا۔ جو درختوں اور عمارتوں کو توڑتی ہوئی چلی جائے۔

قَصَرَ الصَّلَاةُ: بموجب رخصت شرعی کے نماز کے بعض ارکان کو ترک کر کے اسے کم کر کے پڑھنا۔ قرآن پاک میں ہے:

قرآن پاک میں ہے:

﴿فَيَرْسِلْ عَلَيْكُمْ قَاصِفًا مِّنَ الرِّيحِ﴾ پھر تم پر تیز ہوا چلائی۔

رَعْدٌ قَاصِفٌ: بڑے زور کی گرج۔ جس کی آواز میں تکرار ہو۔ اسی سے معارف یعنی آلات موسیقی کی آواز کو قَصْفٌ کہا جاتا ہے اور مجازاً ہر قسم کے لہو کو قَصْفٌ کہہ دیتے ہیں۔

### (ق ص م)

الْقَصْمُ: (ض) کے معنی ہلاک کرنے اور کسی چیز کو توڑ دینے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَكَمْ قَصَمْنَا مِن قَرْيَةٍ كَانَتْ ظَالِمَةً﴾ (۱۱-۲۱) اور ہم نے بہت سی بستیوں کو جو ستمگار تھیں ہلاک کر مارا۔

یعنی انہیں توڑ مروڑ کر ریزہ ریزہ اور ہلاک کر دیا۔ اور ہلاکت کو قَاصِمَةُ الظَّهْرِ کہا جاتا ہے جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا:

﴿وَمَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرَى﴾ (۵۹-۲۸) اور ہم بستیوں کو ہلاک نہیں کیا کرتے۔

الْقَصْمُ: وہ آدمی جو ہر مقاومت کرنے والے کو توڑ ڈالے۔

### (ق ص و)

الْقَصِيُّ کے معنی بعد یعنی دوری کے ہیں اور قَصِيٌّ بعید کو کہا جاتا ہے ۱ محاورہ ہے۔

قَصَوْتُ عَنْهُ: میں اس سے دور ہوا۔ اَقْصَيْتُهُ: میں نے اسے دور کر دیا۔ اَلْمَكَانُ الْاَقْصَى: دور دراز جگہ۔ اَلنَّاحِيَةُ الْقُصْوَى دور یا کنارہ اسی سے قرآن پاک

میں میں ہے:

﴿وَجَاءَ رَجُلٌ مِّنْ اَقْصَا الْمَدِينَةِ يَسْعَى﴾ (۲۸-۲۰) اور ایک شخص شہر کی پرلی طرف سے دوڑتا ہوا آیا۔ ﴿اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا﴾ (۱-۱۷) مسجد اقصیٰ یعنی بیت المقدس تک۔

میں مسجد الاقصیٰ سے مراد بیت المقدس ہے اور اسے اَلْاَقْصَىٰ مخاطبین یعنی آنحضرت ﷺ اور صحابہ کرام کے مقام سکونت کے اعتبار سے کہا ہے۔ کیونکہ وہ مدینہ سے دور تھی۔

﴿اِذْ اَنْتُمْ بِالْعُدُوَّةِ الدُّنْيَا وَهُمْ بِالْعُدُوَّةِ الْقُصْوَى﴾ (۸-۳۲) جس وقت تم (مدینہ سے) قریب کے ناکے پر تھے اور کافر بعید کے ناکے پر۔ قَصَوْتُ الْبَعِيْرُ: کے معنی اونٹ کا کان قطع کرنے کے ہیں اور کان کٹی اونٹنی کو نَاقَةُ قُصْوَاءُ کہا جاتا ہے اور اس معنی میں بَعِيْرٌ اَقْصَىٰ کا محاورہ بھی منقول ہے قَصِيَّةٌ اس اونٹنی کو کہا جاتا ہے جو کام کاج سے دور کھی گئی ہو (اصیل اونٹنی)

### (ق ض ض)

قَضَضْتُهُ فَاَنْقَضَ: میں نے اسے گرایا تو وہ

گر پڑا۔

اِنْقَضَ الْحَائِطُ دیوار گر پڑی۔ قرآن پاک میں ہے۔ ﴿يُرِيدُ اَنْ يَنْقَضَ فَاَقَامَهُ﴾ (۱۸-۷۷) وہ (جھک کر) گرا چاہتی تھی (حضرت نے) اس کو سیدھا کر دیا۔ اَقْضَ عَلَيْهِ مَضْجَعُهُ: خواب گاہ کا کنگرا آلود ہونا (بے چینی کی وجہ سے نیند نہ آنا)

### (ق ض ب)

اَلْقَضْبُ: (اسم) کے معنی لمبے اور پھیلے ہوئے

۱ کما فی قولہ تعالیٰ: مَكَانًا قَصِيًّا (۱۹-۲۲)

درخت کے ہیں۔ مگر آیت کریمہ:

**(قَضَىٰ)**

الْقَضَاءُ کے معنی قولاً یا عملاً کسی کام کا فیصلہ کر دینے کے ہیں اور قضاء قولی و عملی میں سے ہر ایک کی دو قسمیں ہیں ۱۔ قضا الہی اور قضاء بشری چنانچہ قضا الہی کے متعلق فرمایا:

﴿وَقَضَىٰ رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ﴾ (۲۳-۱۷) اور تمہارے پروردگار نے ارشاد فرمایا کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔

﴿وَقَضَيْنَا إِلَىٰ بَنِي إِسْرَآءَ يَلْ فِي الْكِتَابِ﴾ (۴-۱۷) اور ہم نے کتاب میں بنی اسرائیل سے کہہ دیا تھا..... یہاں قضاء سے مراد قطعی طور پر اطلاع دینے اور حکماً فیصلہ کر دینے کے ہیں۔ یعنی ہم نے انہیں اطلاع دے دی اور وحی کے ذریعہ قطعی طور پر حکم دے دیا تھا۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَقَضَيْنَا إِلَيْهِ ذَلِكَ الْأَمْرَ أَنَّ دَابِرَ هُوَ لَأَرْ مَقْطُوعٌ مُّصْبِحِينَ﴾ (۱۵-۶۶) اور ہم نے لوط علیہ السلام کی طرف وحی بھیجی کہ ان لوگوں کی جڑ صبح ہوتے ہوتے کاٹ دی جائے گی۔

میں بھی یہی معنی مراد ہے۔

فعلاً قضاء الہی کے متعلق فرمایا:

درخت کے ہیں۔ مگر آیت کریمہ:

﴿فَأَنْبَتْنَا فِيهَا حَبًّا وَعِنَبًا وَقَضْبًا﴾

(۸۱-۲۷-۲۸) پھر ہم ہی نے اس میں اناج اگایا اور انگور اور ترکاری۔ میں قضب سے مراد تازہ گھاس اور ترکاریاں ہیں ۱

الْمَقَاضِبُ: وہ زمین جہاں ساگ پات وغیرہ اگتا ہو۔ الْقَضِيبُ: بمعنی قضب ہے لیکن درخت کی تروتازہ شاخوں کو قَضِيبٌ اور سبزی ترکاری وغیرہ کو قَضْبٌ کہا جاتا ہے۔ نیز الْقَضْبُ (مصدر) کے معنی سبزی ترکاری اور تروتازہ شاخوں کو قطع کرنا بھی آتے ہیں ایک روایت میں ہے ۲ (۸۲) أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ إِذَا رَأَىٰ فِي ثَوْبٍ تَصْلِيْبًا قَضْبَةً کہ آنحضرت ﷺ جب کسی کپڑے میں صلیب کے نشانات دیکھتے تو اسے قطع کر دیتے۔

سَيْفٌ قَاضِبٌ وَقَضِيبٌ: قاطع تلوار۔

یہ فعلیل بمعنی فاعل ہے اور اس سے پہلی مثال میں بمعنی مفعول اس طرح نَاقَةٌ قَضِيبٌ اس اونٹنی کو کہتے ہیں جو اونٹوں سے الگ کر لی گئی ہو اور قَضِيب ہر اس چیز کو کہا جاتا ہے جو کاٹ کر جدا کر دی گئی ہو اور جو چیز غیر مہذب یعنی کانٹ جھانٹ کر درست نہ کی گئی ہو اسے مقتضب کہا جاتا ہے اور اسی سے اقتضب حدیث کا محاورہ ہے۔ جس

① قال فی الکشاف والقضب الرطبة وفي الصحاح القضة والقضب الرطب قال بعض الفضلاء القضب هو المسمى فی مصر بالبرسيم الحمجازی (الکشاف وذیلہ، ۷۰۴/۴)

② الحدیث فی الفائق (۱۷۵/۲) و غریب ابی عبید (۱: ۳۲) و باختلاف الفاظہ فی ابی داؤد وعن عائشة راجع کنز العمال (۴: رقم ۲۹۴)

③ ذکر الفخر (۱۲: ۱۵۳) للفظ القضاء ثلاثة معان (۱) بمعنی الحكم والامر كما فی (۱۷-۲۳) بمعنی الخبر والاعلام (۱۷-۴) و (۳) بمعنی صفة الفعل اذا تم كما فی (۴۱-۱۲) كذا فی البحاری۔



﴿مَنَّا سِکْکُمْ﴾ (۲۰۰-۲) پھر جب حج کے تمام ارکان پورے کر چکو۔

﴿ثُمَّ لَیْقَضُوا تَفَثَهُمْ وَلَیُوفُوا نُدُورَهُمْ﴾ (۲۹-۲۲) پھر چاہیے کہ لوگ اپنا میل کچیل دور کریں اور نذریں پوری کریں۔

اور نیز فرمایا:

﴿ذَٰلِكَ بَیْنُی وَبَیْنُکَ اَیْمًا الْاَجَلِیْنِ قَضِیْتُ فَلَآ عُدُوَانٌ عَلَیَّ﴾ (۲۸-۲۸) مجھ میں اور آپ میں یہ عہد پختہ ہوا کہ میں جو کسی مدت چاہوں پوری کر دوں پھر مجھ پر کوئی زیادتی نہ ہو۔

﴿فَلَمَّا قَضٰی زَیْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا﴾ (۳۷-۳۳) پھر جب زید نے اس سے کوئی حاجت متعلق نہ رکھی۔ ﴿ثُمَّ اَقْضُوا اِلَیَّ وَلَا تَنْظُرُوْنَ﴾ (۷۱-۷۰) پھر وہ کام میرے حق میں کر گزرو۔

یعنی تم میرے متعلق اپنے فیصلے کو عملی جامہ پہنا لو۔ اور آیت کریمہ۔

﴿فَاقْضِ مَا اَنْتَ قَاضٍ اِنَّمَا تَقْضِیْ هٰذِهِ الْحَیْوةَ الدُّنْیَا﴾ (۷۲-۲۰) تو آپ کو جو حکم دینا ہو دے دیجیے اور آپ جو حکم دے سکتے ہیں وہ صرف اسی دنیا کی زندگی میں دے سکتے ہیں۔ اور اسی طرح شعر ﴿الطویل﴾

﴿وَاللّٰهُ یَقْضِیْ بِالْحَقِّ وَالَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا یَقْضُوْنَ بَشِیْءًا﴾ (۲۰-۳۰) اور خدا سچائی کے ساتھ فیصلہ کرتا ہے اور جن کو یہ لوگ پکارتے ہیں وہ کچھ بھی حکم نہیں دے سکتے۔

اور آیت کریمہ:

﴿فَقَضَّاهُنَّ سَبْعَ سَمَوَاتٍ فِیْ یَوْمَیْنِ﴾ (۱۲-۴۱) پھر دودن میں سات آسمان بنائے.....

میں اللہ تعالیٰ کی ایجاد ابدائی اور اس سے فارغ ہونے کی طرف اشارہ ہے جیسے فرمایا:

﴿بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ (۱۱۷-۲) وہ ہی آسمان اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے۔

اور آیت کریمہ:

﴿اِلَیَّ اَجَلٌ مُّسَمًّی لِّقَضٰی بَیْنَهُمْ﴾ (۱۳-۴۲) اگر ایک وقت مقرر تک کے لیے بات نہ ٹھہر چکی ہوتی تو ان میں فیصلہ کر دیا جاتا۔

میں قَضٰی بمعنی فِصْل ہے یعنی ان کے درمیان فیصلہ کر دیا جاتا۔ اور قضا بشری بذریعہ قول، جیسے قَضٰی الْحَاکِمُ بِکَذَا: حاکم نے فلاں فیصلہ کیا۔

کیونکہ حاکم ہمیشہ زبان کے ساتھ فیصلہ دیتا ہے اور قضا بشری بذریعہ فعل کے متعلق فرمایا۔ ﴿فَاِذَا قَضِیْتُمْ

۱ زلة من المصحح والصواب الى اجل بدل لولا اجل ۱۲۔

۲ قاله شاعر فی رثاء عمر وتمامه بوائج فی اکما مہالم تفتق وفی رواية بوائج بدل بوائج والشعر مما اختلف فی قائله فنسبه، ابو تمام للشماخ بن ضرار و تابع الحضری فی زهره (۱۱۵: ۴) وابن درید فی اشتقاقه (۱۹۹) وکذا فی اللسان والصاح (بوج) والبیث لیس فی دیوان شماخ ونسبه الجاحظ فی البیان (۳۶۴: ۴) و ابو الطیب فی ابداله (۲۴۱: ۱) لمزین زرار العطفانی احوال شماخ الاکبر (۶۳۱۱: ۱) وفی الاغانی (۱۰۲: ۸) والفائق (۶۲: ۱) الی الجن والبیث فی الطبری (۵۰۹: ۱) والمشكل للقبتي (۳۴۳) والبحر (۳۵۵: ۱) بغیر عز وقال فی ذیل الابدال والصحيح انه لجنء احی شماخ راجع المرزوقی رقم (۳۸۸) والیہ نسب ابن درید فی الاشتقاق فی ۲۸۶ وشماخ هذا اسمه معقل بن ضرار راجع لترجمته (الاغانی (۱۰۴: ۹۷: ۸) والمؤتلف (۱۳۸) و اللالی (۵۹-۵۸) والخزانة (۵۱۶: ۱) والشعراء ۲۸۴ والاشتقاق ۱۷۴۔



(۳۵۶) قَضَيْتَ أُمُورًا تَمْ غَادَرْتَ بَعْدَهَا

تم نے اپنی زندگی میں بڑے بڑے امور سرانجام دیے۔ پھر اس کے بعد..... چھوڑ دیئے ہیں میں دونوں معنی ہو سکتے ہیں۔

یعنی قضاء قولی بھی اور قضا فعلی بھی۔

اور کبھی قضا سے موت مراد ہوتی ہے جیسے کہا جاتا ہے فُلَانٌ قَضَى نَحْبَهُ: یعنی اس نے اپنے دنیاوی امور جو اس کے ساتھ مخصوص تھے پورے کر لیے یعنی فوت ہو گیا۔ چنانچہ آیت کریمہ:

﴿فَمِنْهُمْ مَنْ قَضَى نَحْبَهُ وَمِنْهُمْ مَنْ يَنْتَظِرُ﴾ (۳۳-۲۳) تو ان میں سے بعض ایسے ہیں جو اپنی نذر سے فارغ ہو گئے اور بعض ایسے ہیں کہ انتظار کر رہے ہیں۔

کے بعض نے یہ معنی کیے ہیں کہ انہوں نے اپنی نذر پوری کر لی۔ کیونکہ انہوں نے اپنے اوپر لازم کر لیا تھا کہ وہ جان قربان کر دیں گے اور کبھی بھی دشمنوں سے شکست کھا کر نہیں بھاگیں گے مگر بعض نے اس کے معنی فوت ہو جانا بھی کیے ہیں۔ اور آیت کریمہ:

﴿ثُمَّ قَضَى أَجَلًا وَأَجَلٌ مُّسَمًّى عِنْدَهُ﴾ (۲۶-۲) پھر مرنے کا ایک وقت مقرر کر دیا اور ایک مدت اس کے ہاں اور مقرر ہے۔

میں بعض نے کہا ہے کہ اجل اول سے دنیاوی زندگی مراد ہے اور ثانی سے موت کے بعد دوبارہ زندہ ہونا مراد ہے اور ارشاد الہی:

﴿يَا أَيَّتُهَا كَانَتِ الْقَاضِيَةَ﴾ (۶۹-۲۷) ۱۷ کا ش

موت (ابدالہ آباد کے لیے میرا کام) تمام کر چکی ہوتی۔

﴿وَنَادُوا يَا مَالِكُ لِيَقْضِ عَلَيْنَا رَبُّكَ﴾ (۴۳-۷۷) اور پکاریں گے کہ اے مالک تمہارا پروردگار ہمیں موت دے دے۔

میں بھی موت سے کنایہ ہے۔ نیز فرمایا:

﴿فَلَمَّا قَضَيْنَا عَلَيْهِ الْمَوْتَ مَا دَلَّاهُمْ عَلَىٰ مَوْتِهِ إِلَّا دَابَّةُ الْأَرْضِ﴾ (۳۴-۱۲) پھر جب ہم نے ان کے لیے موت کا حکم صادر کیا تو کسی چیز سے ان کا مرنا معلوم نہ ہوا مگر گھن کے کیڑے سے قَضَى الدِّينِ قرض ادا کرنا۔

اور اقضاء کے معنی قرض کی واپسی کا مطالبہ کرنے کے ہیں۔ اور اسی سے هَذَا يَقْضَى كَذَا محاورہ ہے اور آیت کریمہ:

﴿لَقَدْ قَضَىٰ إِلَيْهِمْ أَجَلُهُمْ﴾ (۱۰-۱۱) تو ان کی عمر کی میعاد پوری ہو چکی ہوتی۔

کے معنی یہ ہیں کہ ان کی دنیاوی زندگی کی میعاد پوری کر دی جاتی۔

قضاء الہی قدر (تقدیر) سے انحصار ہے۔ کیونکہ قضاء کے معنی تقدیر کو قطعی کر دینے کے ہیں لہذا قدر بمعنی تقدیر ہے اور قضاء اس کا فیصلہ کرنے کا نام ہے۔ بعض علماء کا خیال ہے کہ قدر (بمزلہ) اس چیز کے ہے جو ماپ کے لیے تیار کی گئی ہو) اور قضاء بمزلہ اپنے کے ہے جیسا کہ مروی ہے کہ جب حضرت عمرؓ نے ملک شام سے بوجہ طاعون کے واپسی کا ارادہ کیا تو ابو عبیدہؓ نے کہا ﴿أَتُفَرِّقُ مِنَ الْقَضَاءِ﴾ (کیا تم قضا الہی سے بھاگ رہے ہو) تو حضرت عمرؓ نے فرمایا: أَفَرُّ مِنْ قَضَاءِ اللَّهِ إِلَىٰ قَدَرٍ

۱ رواہ البخاری (۸۵۳: ۲) (طبعہ ہند) من حدیث عبداللہ بن عباس و عبداللہ بن عامر لکن لفظہ نقر من قدر اللہ الی قدر اللہ و اصل الحدیث متفق علیہ۔

کہ علیؑ تم سب سے اچھا فیصلہ کرنے والے ہیں۔

### (ق ط ط)

الْفِطْ: حصہ۔ حساب کارجر قرآن پاک میں ہے: ﴿وَقَالُوا رَبَّنَا عَجِّلْ لَنَا قِطْعَانًا قَبْلَ يَوْمِ الْحِسَابِ﴾ (۳۸-۱۶) اور کہتے ہیں کہ ہمارے پروردگار ہم کو ہمارا حصہ حساب کے دن سے پہلے ہی دے دے۔ اَلْفِطْ اصل میں صحیفہ کو کہے ہیں پھر جو چیز (یعنی حکم وغیرہ) لکھا گیا ہو اور جس چیز میں لکھا گیا ہو دونوں کو قِطْ کہنے لگے ہیں اور کبھی صرف اس فیصلہ وغیرہ کو قِطْ کہا جاتا ہے جو (کسی چیز پر) لکھا گیا ہو جیسا کہ کلام کو کتاب کہا جاتا ہے اگرچہ وہ لکھی ہوئی نہ ہو۔

اصل میں قِطْ اس چیز کو کہا جاتا ہے جو عرض میں قطع کی گئی ہو جیسا کہ (اس کے بالمقابل) قِطْ اس چیز کو کہا جاتا ہے جو طول میں قطع کی گئی ہو۔ پھر (معاورہ میں) اس معین حصہ کو (بھی) قِطْ کہا جاتا ہے جو کاٹ کر الگ کر لیا گیا ہو چنانچہ حضرت ابن عباسؓ نے آیت مذکورہ میں یہی معنی مراد لیے ہیں۔ مَا رَأَيْتُهُ قِطْ: میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا تو قِطْ سے خاص زمانہ مراد ہے۔

قَطْنِي (اسم فعل) مجھے کافی ہے

### (ق ط ر)

الْقَطْرِ کے معنی جانب اور طرف کے ہیں اس

اللہ کے میں قضا الہی سے تقدیر الہی کی طرف بھاگتا ہوں۔ تو اس میں تنبیہ ہے کہ تقدیر جب تک قضا کے مرحلہ میں داخل نہ ہو۔ ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے (دعا وغیرہ کے وسیلہ سے) روک دے لیکن جب اللہ تعالیٰ قضا یعنی قطعی فیصلہ کر دے تو کسی حیلہ سے اسے روکنا ممکن نہیں ہوتا۔ جیسا کہ مندرجہ ذیل آیات سے معلوم ہوتا ہے۔

﴿وَكَانَ أَمْرًا مَّقْضِيًّا﴾ (۱۰-۳۱) اور یہ کام مقرر ہو چکا ہے۔

﴿كَانَ عَلَى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا﴾ (۱۹-۷۱) یہ تمہارے پروردگار پر لازم اور مقرر ہے۔

اور اسی طرح آیت کریمہ:

﴿وَقُضِيَ الْأَمْرُ﴾ (۱۱-۲۳) اور کام تمام کر دیا گیا۔ میں قُضِيَ کے معنی فُصِّل کے ہیں یعنی قطعی فیصلہ کر دیا گیا کہ اس کی تلافی نہیں ہو سکتی اسی طرح فرمایا: ﴿وَإِذَا قُضِيَ أَمْرًا﴾ (۲-۱۱۷) اور جب کوئی کام کرنا چاہتا ہے۔

اور ہر وہ قول جس میں نفع یا اثبات قطعی کا حکم پایا جائے اسے قضیہ کہا جاتا ہے اسی لیے یہ صدق و کذب کے ساتھ متصف ہوتا ہے اور اسی بنا پر بعض نے کہا ہے کہ تجربہ خطرناک امر ہے اور قضا مشکل یعنی کسی چیز کے متعلق یہ فیصلہ کرنا کہ یہ یوں ہے یا یوں نہیں ہے نہایت ہی مشکل امر ہے حدیث میں ہے آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ﴿(عَلَى أَفْصَاكُمُ)﴾

① عن ابن عباس في حديث مرفوع وفي عبدالرزاق عن قتادة مرسلًا وعن انس اخبره البيهقي في شرح السنة والمصابيح وفي معناه احاديث رواها اصحاب السنن (المقاصد رقم ۱۴۲) وايضا قال عمر فيه رضي الله تعالى عنه على اقضنا واني اقرونا (المستدرک ۳/۳۰۵)

② وعند اكثر اهل التفسير المراد منه صحيفة الاعمال وقال قتادة المراد منه نصيب العذاب وعن سعيد بن جبیر نصيب من الجنة (راجع الطبري ۲۳/۱۳۵-۱۳۴)

③ قال في التنبيه ۶۱-۶۲: ناتي قِطْ بمعنى حسب وكفى تقول: قِطْ عبدالله درهم وقِطْنِي درهم وعند اهل البصرة تكون مضافا الى ما بعدها تقول قِطْ عبدالله درهم وحيث تكون مخففة ومثقلة واما في الزمان والعدد فلاحتمال الامثلية ۱۲۔

## (ق ط ع)

کی جمع اقطار ہے قرآن پاک میں ہے:

﴿إِنْ اسْتَطَعْتُمْ أَنْ تَنْفُذُوا مِنْ أَقْطَارِ السَّمُوتِ  
وَالْأَرْضِ﴾ (۳۳-۵۵) اگر تمہیں قدرت ہو کہ آسمان  
اور زمین کے کناروں سے نکل جاؤ۔ ﴿وَلَوْ دُخِلَتْ  
عَلَيْهِمْ مِّنْ أَقْطَارِهَا﴾ (۱۴-۳۳) اور اگر فوجیں  
اطرافِ مدینہ سے ان پر داخل ہوں۔ قَطَرْتُهُ: کسی کو  
پہلو پر گرا دینا۔

اسی سے قَطَرُ الْمَطَرُ کا محاورہ ہے جس کے معنی بارش  
برسنے کے ہیں اور اسی وجہ سے بارش کو قطر کہا جاتا ہے۔  
تَقَاطَرُ الْقَوْمُ: لوگ بارش کے قطروں کی طرح پیہم  
آئے۔ اسی سے اونٹوں کی قطر کو قطار کہا جاتا ہے مثل  
مشہور ۱ ہے۔

الْبِقَاضُ يَقْطُرُ الْجَلْبُ: یعنی توشہ ختم ہو جائے تو عمدہ  
اونٹ بھی فروخت کے لیے منڈی میں لائے جاتے ہیں۔  
الْقَطْرَانُ کے معنی گھلی ہوئی رال یا گندھک کے ہیں  
قرآن پاک میں ہے۔

﴿سَرَّابِلُهُمْ مِّنْ قَطْرَانٍ﴾ (۱۴-۵۰) ان کے  
کرتے گندھک کے ہوں گے۔

ایک قرأت میں قَطْرَانِ ہے جس کے معنی گھلے ہوئے  
گرم تانبے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿أَتُونِي أَوْرَعُ عَلَيْهِ قَطْرًا﴾ (۹۶-۱۸) (اب)  
میرے پاس تانبا لاؤ کہ اس پر گھلا کر ڈال دوں یہاں  
قَطْرًا کے معنی گھلا ہوا تانبا کے ہیں۔

الْقَطْعُ کے معنی کسی چیز کو علیحدہ کر دینے کے ہیں خواہ  
اس کا تعلق حائے بھر سے ہو جیسے اجسام وغیرہ یا بصیرت  
سے ہو۔ جیسے معنوی چیزیں چنانچہ اسی سے اعضاء کا قطع  
کرنا۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿لَا قِطْعَنَ أَيْدِيكُمْ وَ  
أَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ﴾ (۱۴-۷) میں (پہلے تو)  
تمہارے ایک طرف کے ہاتھ اور دوسرے طرف کے  
پاؤں کو اداؤں گا۔ ﴿وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوا  
أَيْدِيَهُمَا﴾ (۵-۳۸) اور جو چوری کرے مرد ہو یا  
عورت ان کے ہاتھ کاٹ ڈالو۔

﴿وَسُقُوا مَاءَ حَمِيمًا فَقَطَّعَ أَمْعَاءَ هُمْ﴾  
(۱۵-۴۷) اور ان کو کھولتا ہوا پانی پلایا جائے گا تو انکی  
انٹریوں کو کاٹ ڈالے گا۔

اور اسی سے قطع ثوب ہے جیسے فرمایا:

﴿فَالَّذِينَ كَفَرُوا قُطِّعَتْ لَهُمْ ثِيَابٌ مِّنْ نَّارٍ﴾  
جو کافر ہیں ان کے لیے آگ کے کپڑے قطع کیے جائیں  
گے (۲۲-۱۹)

اور قطع طریق کے دو معنی آتے ہیں (۱) راستہ طے کرنا  
(۲) رہزنی کرنا۔ جیسے فرمایا:

﴿إِنَّكُمْ لَتَأْتُونَ الرِّجَالَ وَتَقْطَعُونَ السَّبِيلَ﴾  
(۲۹-۲۹) تم کیوں (لذت کے ارادے سے) لڑکوں کی  
طرف مائل ہوتے اور مسافروں کی رہزنی کرتے ہو۔

۱ وفی المطبوع الانفاس والتصویب من الاصول راجع للمثل (جلب) والمشکل للقبی ۶۶ ومجمع الامثال (۴۲۱۸)  
ومعناه اصلح بالك قبل ان يتطرق الافساد۔ قال فی اللسان (نفض) وكان ثعلب يفتح النون ويقول معناه الجذب لكن فی  
محاسبه ۳۲۴ قال والنفاض يفتح النون وضمها ۱۲۔

فیصل کرنے والی نہیں۔ اور آیت کریمہ:

﴿لَيَقْطَعَ طَرَفًا﴾ (یہ خدا نے) اس لیے (کیا) کہ کافروں کی ایک جماعت کو ہلاک ..... کر دے۔

کے معنی کفار کی ایک جماعت کو ہلاک کر دینے کے ہیں قَطَعَ دَابِرَ الْإِنْسَانِ کے معنی نوع انسانی کو فنا کر دینے کے ہیں۔ چنانچہ فرمایا:

﴿فَقَطَعَ دَابِرَ الْقَوْمِ الَّذِينَ ظَلَمُوا﴾ (۶-۳۵) غرض ظالم لوگوں کی جڑ کاٹ دی گئی۔

﴿أَنَّ دَابِرَهُ هُوَ لَاءٌ مَقْطُوعٌ مُصْبِحِينَ﴾ (۱۵-۶۶) تو ان لوگوں کی جڑ صبح ہوتے ہوتے کاٹ دی جائے گی اور آیت کریمہ:

﴿إِلَّا أَنْ تَقَطَعَ قُلُوبُهُمْ﴾ (۹-۱۱۰) مگر یہ کہ ان کے دل پاش پاش ہو جائیں۔

میں تقطع قلوب سے مر جانا مراد ہے اور یا اس سے مراد ایسی توبہ کرنے کے ہیں کہ اپنی کوتاہیوں پر ندامت کی وجہ سے انسان کا دل پارہ پارہ ہو جائے۔ قَطَعَ مِنَ اللَّيْلِ کے معنی رات کے ایک حصہ کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَأَسْرِ بِأَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِنَ اللَّيْلِ﴾ (۱۱-۸۱) تو کچھ رات رہے سے اپنے گھر والوں کو لے کر چل دو۔

الْقَطِيعُ: بکریوں کا ریوڑ۔ جَمْعُ قِطْعَانٍ۔ یہ معنی قطع سے مشتق ہے جیسا صِرْمَةٌ اور فِرْقَةٌ وغیرہ الفاظ کے معنی جماعت کے آتے ہیں اور ان میں قطع کا معنی پایا جاتا ہے۔

الْقَطِيعُ کے معنی کوڑا بھی آتے ہیں۔ محاورہ ہے: أَصَابَ بِسَرِّهِمْ قِطْعٌ: (گری کی وجہ سے) ان کے

یہاں قطع سبیل کے وہی معنی ہیں جس کی طرف کہ آیت ﴿الَّذِينَ يَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ﴾ (۱۱-۱۹) جو خدا کے رستے سے روکتے ہیں۔ اور آیت:

﴿فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيلِ﴾ (۲۹-۳۸) اور ان کو سیدھے رستے سے روک دیا۔

میں اشارہ فرمایا ہے اور راہ گیروں کو لوٹنے پر قطع اس لیے بولا جاتا ہے کہ اس کی وجہ سے لوگ راہ چلنا چھوڑ دیتے ہیں۔ تو گویا یہ راستہ کو قطع کرنا ہے قَطَعَ الْمَاءَ بِالسَّبَاحَةِ: پیرا کی کے ذریعہ پانی عبور کرنا۔ قَطَعَ الْوَصْلُ: تعلق قطع کر لینا۔ قَطَعَ الرَّجِيمُ: رشتہ کاٹ لینا یا احسان کو روک لینا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَتَقَطَّعُوا أَرْحَامَكُمْ﴾ (۲۷-۲۲) اور اپنے رشتوں کو توڑ ڈالو۔

﴿وَيَقْطَعُونَ مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَنْ يُوصَلَ﴾ (۲-۲۷) اور جس چیز (یعنی رشتہ قربت) کے جوڑ رکھنے کا خدا نے حکم دیا ہے اس کو قطع کر ڈالتے ہیں۔ اور آیت کریمہ:

﴿ثُمَّ لَيَقْطَعَنَّ فَلْيَنْظُرْ﴾ (۲۲-۱۵) پھر اس سے اپنا گلا گھونٹ لے پھر دیکھے.....

کے معنی بعض نے رسی کاٹ دینا کیے ہیں تاکہ وہ زمین پر گر پڑے اور بعض نے کہا ہے کہ گلے میں پھانسی ڈال کر زندگی کو قطع کر دینا مراد ہے اور یہی معنی حضرت ابن عباسؓ سے منقول ہیں۔

قَطَعَ الْأَمْرَ: کے معنی کسی کام کا فیصلہ کرنے کے ہیں اسی سے فرمایا:

﴿مَا كُنْتُ قَاطِعَةً أَمْرًا﴾ (۲۷-۳۲) میں کسی کام کو

## (ق ط ن)

أَلَيْقُطَيْنِ: گیاه بے ساق مثل درخت کدو

و مانند آں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَأَنْبَتْنَا عَلَيْهِ شَجَرَةً مِّنْ يَّقُطِينِ﴾ (۱۳۶-۳۷)

اور ان پر ہم نے کدو کا درخت اگایا۔

أَلْقُطْن: روئی۔ قُطْنُ الْحَيَوَان: میان دوران۔

## (ق ع د)

أَلْقَعُودُ: یہ قِیَام (کھڑا ہونا) کی ضد ہے۔

اس سے قَعْدَةُ صِنْو مَرَّةً یعنی ایک بار بیٹھنا اور قَعْدَةُ

(بکسرہ قاف) بیٹھنے کی حالت کو کہتے ہیں اور أَلْقَعُودُ

قَاعِدُ کی جمع بھی ہے جیسے فرمایا: ﴿فَإِذَا قُضِيْتُمْ

الصَّلَاةَ فَادْكُرُوا اللَّهَ قِيَمًا وَقُعودًا﴾ (۱۰۳-۴)

تو کھڑے اور بیٹھے..... ہر حال میں خدا کو یاد کرو۔

﴿الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللَّهَ قِيَمًا وَقُعودًا﴾

(۱۹۱-۳) جو کھڑے اور بیٹھے..... ہر حال میں خدا کو یاد

کرتے ہیں۔

أَلْمَقْعَدُ کے معنی جائے قیام کے ہیں اس کی جمع مقاعد

ہے قرآن پاک میں ہے:

﴿فَنِي مَقْعَدِ صَدَقٍ عِنْدَ مَلِكٍ مُّقْتَدِرٍ﴾

(۵۵-۵۴) (یعنی) پاک مقام میں ہر طرح کی قدرت

رکھنے والے بادشاہ کی بارگاہ میں۔ یعنی نہایت پرسکون

مقام میں ہوں گے اور آیت کریمہ:

﴿مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ﴾ (۱۲۰-۳) لڑائی کے لیے

مورچوں پر، میں لڑائی کے مورچے مراد ہیں جہاں سپاہی

جم کر لڑتے ہیں اور کبھی کسی کام میں سستی کرنے والے کو

بھی قاعد کہا جاتا ہے جیسے فرمایا:

کنویں کا پانی ختم ہو گیا۔

مَقَاتِعُ الْأَوْدِيَةِ: وادیوں کے سرے۔

## (ق ط ف)

قَطَفْتُ (ض) أَلْتَمَرَةَ قُطْفًا کے معنی پھل

چننا کے ہیں اور درخت سے توڑے ہوئے پھل کو قُطْفٌ

کہا جاتا ہے۔ اس کی جمع قُطُوفٌ آتی ہے قرآن پاک

میں ہے:

﴿قُطُوفُهَا دَانِيَةٌ﴾ (۶۱-۲۳) جن کے میوے جھکے

ہوئے ہوں گے۔

قُطِفَتِ الدَّابَّةُ قُطْفًا: جانور کا آہستہ چلنا اور ایسے

جانور کو قُطُوفٌ کہا جاتا ہے اور جانور کے متعلق اس کا

استعمال صرف تشبیہ اور استعارہ کے طور پر ہوتا ہے۔ یعنی

دابتہ کو قَاطِفٌ (پھل چننے والا) کے ساتھ تشبیہ دی جاتی

ہے جیسا کہ نقض کے ساتھ کوئی چیز متصف ہوتی ہے۔

وَقَدْ تَقَدَّمَ ذِكْرُهُ۔ أَقْطَفَ الْكُرْمُ: انگور چننے کا موسم

قریب آ گیا۔ اور جو انگور پک کر زمین پر گر پڑیں انہیں

قِطَافَةٌ کہا جاتا ہے اور یہ قَفَايَةُ کی طرح ہے۔

## (ق ط م ر)

أَلْقِطْمِيرُ: (نقطہ سپید بر پشت دانہ کہ خرما از

وے روید) قرآن پاک میں ہے:

﴿وَالَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ مَا يَمْلِكُونَ مِنْ

قِطْمِيرٍ﴾ (۱۳-۳۵) اور جن لوگوں کو تم اس کے سوا

پکارتے ہو وہ سمجھو کی گتھلی کے نقطہ سپید کے برابر بھی تو کسی

چیز کے مالک نہیں۔

قِطْمِيرُ: کے معنی اس ہلکے سے سپید نقطہ کے ہیں جو گتھلی پر

ہوتا ہے۔ یہ حقیر اور بے قدر چیز کے لیے ضرب المثل ہے۔

قَعِيدَكَ اللَّهُ وَقَعِيدَكَ اللَّهُ: یعنی میں اللہ تعالیٰ سے تیری حفاظت کا سوال کرتا ہوں۔

الْقَاعِدَةُ: وہ عورت جو عمر رسیدہ ہونے کی وجہ سے نکاح اور حیض کے قابل نہ رہی ہو۔ اس کی جمع قَوَاعِدُ ہے •

چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَالْقَوَاعِدُ مِنَ النِّسَاءِ﴾ (۲۴-۶۰) اور بڑی عمر کی عورتیں۔

اور مُفْعَدٌ اس شخص کو بھی کہا جاتا ہے جو ملازمت سے سبکدوش ہو چکا ہو اور اپنا آدی جو چل پھر نہ سکے اسے بھی مُفْعَدٌ کہہ دیتے ہیں۔ اسی وجہ سے مجازاً امینڈک کو بھی مُفْعَدٌ کہا جاتا ہے اس کی جمع مُفْعَدَاتٌ ہے اور ابھری ہوئی چھاتی پر نڈی مُفْعَدٌ کا لفظ بولا جاتا ہے اور کنایہ کے طور پر کینے اور خیس اطوار آدی پر بھی مُفْعَدٌ کا اطلاق ہوتا ہے۔ • قَوَاعِدُ الْبِنَاءِ: عمارت کی بنیادیں۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَإِذْ يَرْفَعُ إِبْرَاهِيمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ﴾ (۲-۱۲۷) اور جب ابراہیم علیہ السلام..... بیت اللہ کی بنیادی اونچی کر رہے تھے۔

قَوَاعِدُ الْهُودِج (چوکتھا) ہودے کی لکڑیاں جو اس کے بمنزلہ بنیاد کے ہوتی ہیں۔

### (ق ع و)

قَعَرُ الشَّيْءِ: کے معنی کسی چیز کی گہرائی کی انتہا کے ہیں۔ اور آیت کریمہ:

﴿كَأَنَّهُمْ أَعْجَازُ نَخْلٍ مُنْقَعِرٍ﴾ (۲۰-۵۴) کہ

﴿لَا يَسْتَوِي الْقَعْدُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ غَيْرُ أُولَى الضَّرَرِ﴾ (۵۹-۴) جو مسلمان (گھروں میں) بیٹھ رہتے ہیں اور لڑنے سے جی چراتے ہیں) ہیں اور کوئی عذر نہیں رکھتے۔

اسی سے رَجُلٌ قُعْدَةٌ ضَجَعَةٌ کا محاورہ ہے جس کے معنی بہت کاہل اور بیٹھے رہنے والے آدمی کے ہیں نیز فرمایا۔

﴿فَضَّلَ اللَّهُ الْمُجَاهِدِينَ عَلَى الْقَعِيدِينَ أَجْرًا عَظِيمًا﴾ (۹۵-۴) خدا نے مال اور جان سے جہاد کرنے والوں کو بیٹھے والوں پر درجے میں فضیلت بخشی ہے۔ اور کبھی قَعْدَ لَہ کے معنی کسی چیز کے لیے گھات لگا کر بیٹھے اور انتظار کرنے کے بھی آتے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿لَا قُعْدَنَ لَهُمْ صِرَاطُكَ الْمُسْتَقِيمَ﴾ (۱۶-۷) میں بھی سیدھے رستے پر..... بیٹھوں گا۔ نیز فرمایا:

﴿إِنَّا هُنَا قَعِدُونَ﴾ (۲۴-۵) ہم یہیں بیٹھیں رہیں گے یعنی یہاں بیٹھ کر انتظار کرتے رہیں گے۔ اور آیت کریمہ ﴿عَنِ الْيَمِينِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيدٌ﴾ (۵۰-۱۷) جو دائیں بائیں بیٹھے ہیں۔

میں قَعِيدٌ سے مراد وہ فرشتہ ہے جو (ہر وقت اعمال کی) نگرانی کرتا رہتا ہے اور انسان کے اچھے برے اعمال (اس کے نامہ اعمال میں) درج کرتا رہتا ہے یہ واحد جمع دونوں پر بولا جاتا ہے۔ نیز جو وحشی جانور پیچھے سے آتا ہے اور اس سے براشگون لیا جاتا ہے اسے بھی قَعِيدٌ کہا جاتا ہے اور یہ نَطِيع کی ضد ہے۔

۱ بل القاعد بغیرھا ويقال: قعدت عن المحيض فهي قاعد دراجع اضداد ابی الطیب (۵۸۳) والجمع القواعد ۱۲۔

۲ هُنَا القواعد جمع قاعدة وفي صفة المروءة جمع قاعد بغیرھا۔

الْفَقِيلُ: خشک چیز کو کہتے ہیں اس لیے کہ خشک ہونے کی وجہ سے اس کے اجزاء ایک دوسرے کی طرف لوٹ آتے ہیں اور یا اس لیے کہ صلابت کی وجہ سے گویا اس پر قفل لگ جاتا ہے۔ محاورہ ہے:

قَفَلَ النَّبَاتُ: نباتات خشک ہو گئی۔  
قَفَلَ الْقَحْلُ: مستی سے سائڈھ کا دبلا ہو جانا۔

### (ق ف و)

الْفَقَا کے معنی گدی کے ہیں اور قَفَرْتُهُ کے معنی کسی کی گدی پر مارنا اور کسی کے پیچھے پیچھے چلنا۔ یہ دونوں محاورے استعمال ہوتے ہیں قَفَوْتُ اَثَرَهُ وَاَقْتَفَيْتُهُ کے معنی کسی کے پیچھے چلنے کے ہیں دوسرے کا مصدر اِقْتَفَاء ہے۔ جس کے اصل معنی کسی کی قفا کا اتباع کرنے کے ہیں۔ لیکن کنایہ کے طور پر کسی کی غیبت اور عیب جوئی کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ﴾ (۱۷-۳۶) اور (اے بندے) جس چیز کا تجھے علم نہیں اس کے پیچھے نہ پڑ۔ یعنی محض قیافہ اور ظن سے کام نہ لو بعض کے نزدیک قیافہ کا لفظ بھی اقتفاء سے مقلوب ہے۔ جیسے جَذَبَ وَجَبَدَ اور یہ (قیافہ) ایک فن ہے۔ اور قَفَيْتُهُ کے معنی کسی کو دوسرے کے پیچھے لگانے کے ہیں چنانچہ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَقَفَّيْنَا مِنْ بَعْدِهِ بِالرُّسُلِ﴾ (۲-۸۷) اور ان کے پیچھے یکے بعد دیگرے پیغمبر بھیجتے رہے۔

الْقَافِيَةُ: مصرع کے جزو اخیر کو کہا جاتا ہے۔ جس کے حرف روی کی ہر شعر میں رعایت رکھی جاتی ہے۔  
الْقَفَاوَةُ: وہ کھانا جس سے مہمان کی آؤ بھگت کی جائے۔

گویا اکھڑی ہوئی کھجوروں کے تنے ہیں۔

میں فحل منقعر سے کھجور کے وہ درخت مراد ہیں جن کی جڑیں زمین کی گہرائی تک چلی گئی ہوں اور بعض نے کہا ہے کہ انْقَعَرَتِ الشَّجَرَةُ کے معنی درخت کے زمین کی گہرائی سے اکھڑ جانے کے ہیں اور بقول بعض اس کے معنی زمین کی گہرائی تک چلے جانے کے ہیں اور آیت کے معنی یہ ہیں کہ جس طرح زمین کی گہرائی تک چلے جانے والے نخل کو جڑ سے اکھاڑ دیا جائے تو اس کا کوئی نشان باقی نہیں رہتا یہی مثال ان لوگوں کی ہے کہ ان کا کوئی نام و نشان باقی نہیں رہے گا۔

قَصْعَةُ قَعْبِيرَةٍ: گہرا پیالہ۔ قَعَرَ فُلَانٌ فِي كَلَامِهِ: حلق سے آواز نکالنا جیسا کہ جبرے سے آواز نکالنے کو شَدَقَ کہا جاتا ہے۔

### (ق ف ل)

الْقُفْلُ: تالابج۔ اَقْفَالٌ محاورہ ہے:

اَقْفَلْتُ الْبَابَ: میں نے دروازے کو قفل لگا دیا اور تمثیل کے طور پر ہر اس چیز کو قفل کہا جاتا ہے جو کسی کام سے مانع اور رکاوٹ بنے۔ چنانچہ محاورہ ہے۔ فُلَانٌ مَقْفُلٌ عَنْ كَذَا: فلاں کو اس کام سے روک دیا گیا ہے قرآن پاک میں ہے:

﴿أَمْ عَلَى قُلُوبٍ أَقْفَالُهَا﴾ (۲۴-۴۷) یا ان کے دلوں پر قفل لگ رہے ہیں۔

اور کنجوس آدمی کو جس طرح مغلول الیدین کہا جاتا ہے اسی طرح مَقْفُولُ الْيَدَيْنِ بھی کہہ دیتے ہیں۔

الْقُفُولُ: سفر سے واپس لوٹنا اور سفر سے واپس آنے والی جماعت کو قافلہ کہا جاتا ہے۔

## ﴿ق ل﴾

﴿إِذْ يُرِيكَهُمُ اللَّهُ فِي مَنَامِكَ قَلِيلًا﴾

(۸-۴۳) اس وقت خدا نے تمہیں خواب میں کافروں کو تھوڑی تعداد میں دکھایا:

﴿وَيُقَلِّلُكُمْ فِي أَعْيُنِهِمْ﴾ (۸-۴۴) اور کافروں کو تمہاری نظروں میں تھوڑا کر کے دکھاتا تھا، میں مراد ہے اور شاعر کے قول ﴿(السرّج)﴾

(۳۵۷) وَلَسْتُ بِالْأَكْثَرِ مِنْهُ حَصًّا

وَأَنَا الْعِزَّةُ لِلْكَائِبِ

اور تم تعداد میں ان سے زیادہ نہیں ہو اور عزت صرف کثیر التعداد کے لیے ہے۔

کے پیش نظر کبھی قلت کا لفظ بطور کنایہ ذلت کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے چنانچہ اسی معنی میں فرمایا۔ ﴿وَإِذْ كُرُوا إِذْ كُنْتُمْ قَلِيلًا فَكَثَّرَكُمْ﴾ (۷-۸۶) اس وقت کو یاد کرو جب تم تھوڑے سے تھے تو خدا نے تم کو جماعت کثیر بنادیا۔

اور آیت کریمہ:

﴿وَقَلِيلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُورُ﴾ (۳۳-۱۳) اور

میرے بندوں میں شکر گزار تھوڑے ہیں۔ اور آیت:-

﴿وَقَلِيلٌ مَّا هُمْ﴾ (۳۸-۲۴) اور ایسے لوگ بہت کم

ہیں۔

میں قلیل کا لفظ بطور عزت و احترام کے استعمال ہوا ہے اس لیے کہ جتنی کوئی چیز زیادہ عزیز القدر ہوتی ہی کیاب ہوتی ہے اور آیت کریمہ: ﴿وَمَا أُوْتِيتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا﴾ (۱۷-۸۵) اور تم لوگوں کو بہت ہی کم علم دیا گیا ہے۔ میں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ مَا أُوْتِيتُمْ سے مستثنیٰ ہو

أَلْقَلَّةٌ وَالْكَثْرَةُ: بلحاظ اصل وضع کے صفات عدد سے ہیں جیسا کہ عَظَمٌ اور صَغَرٌ صفات اجسام سے ہیں بعدہ کثرت و قلت اور عَظَمٌ و صَغَرٌ میں سے ہر ایک دوسرے کی جگہ بطور استعارہ استعمال ہونے لگا ہے اور آیت کریمہ: ﴿ثُمَّ لَا يُجَاوِرُونَكَ فِيهَا إِلَّا قَلِيلًا﴾ (۳۳-۶۰) پھر وہاں تمہارے پڑوس میں نہیں رہ سکیں گے مگر تھوڑے دن۔

میں قَلِيلًا سے عرصہ قلیل مراد ہے۔ اسی طرح فرمایا: ﴿قُمِ اللَّيْلَ إِلَّا قَلِيلًا﴾ (۳-۲) رات کو قیام کرو، مگر تھوڑی رات۔

﴿وَإِذَا لَا تُمْتَعُونَ إِلَّا قَلِيلًا﴾ (۳۳-۱۶) اور اس وقت تم بہت ہی کم فائدہ اٹھاؤ گے۔

﴿نُمَتِّعُهُمْ قَلِيلًا﴾ (۱۳-۲۴) ہم ان کو تھوڑا سا فائدہ پہنچائیں گے۔

اور آیت کریمہ:

﴿مَّا قُتِلُوا إِلَّا قَلِيلًا﴾ (۳۳-۲۰) تو لڑائی نہ کریں مگر کم۔

قَلِيلًا مصدر محذوف کی صفت ہے یعنی قَتَلَا قَلِيلًا اور آیت کریمہ:

﴿وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلَى خَائِنَةٍ مِّنْهُمْ إِلَّا قَلِيلًا﴾ (۱۵-۱۳) اور تھوڑے آدمیوں کے سوا ہمیشہ ان کی (ایک نہ ایک) خیانت کی خبر پاتے رہتے ہو۔

قَلِيلًا سے مراد تھوڑی سی جماعت اور یہی معنی آیت کریمہ:

① قاله الاعشى الميمون وفي رواية فيهم، بدل منه والبيت في التاج واللسان (كشر) راجع تخريجہ (ك ث ر)



مُشْرِئُونَ ﴿۱۲-۱۰۶﴾ اور یہ اکثر خدا پر ایمان نہیں رکھتے مگر اس کے ساتھ شرک کرتے ہیں۔

أَقْلَلْتُ كَذَا کے معنی کسی چیز کو ہلکا پانے کے ہیں کبھی یہ ہلکا سمجھنا محض حکمی ہوتا ہے۔ أَقْلَلْتُ مَا أَعْطَيْتَنِي یعنی میں نے تمہارے دیئے ہوئے کو حقیر سمجھا اور کبھی اس شے کی قوت کے اعتبار سے ہوتا ہے جیسے فرمایا:

﴿إِذَا أَقْلَلْتُ سَحَابًا ثِقَالًا﴾ (۷-۵۷) جب وہ بھاری بادلوں کو اٹھالاتی ہے۔ یہاں اقلت کہہ کر اشارہ فرمایا ہے۔ کہ وہ بادل جن کو اٹھا کر لاتی ہے اگرچہ فی نفسہ بھاری ہوتے ہیں مگر ہوا کی قوت کے اعتبار سے نہایت ہلکے ہیں۔ اسْتَقْلَلْتُہُ: کسی چیز کو حقیر خیال کرنا جیسے اسْتَخَفُّتُہُ: کسی چیز کو ہلکا خیال کرنا۔ الْقُلَّةُ: ہر چیز کا بالائی حصہ۔ اور قُلَّةُ الْجَبَلِ: پہاڑ کی چوٹی کو کہتے ہیں کیونکہ باقی پہاڑ کے مقابلہ میں وہ قلیل سی ہوتی ہے۔

تَقَلَّقَ الشَّيْءُ کے معنی کسی چیز کے مضطرب ہونے کے ہیں اور تَقَلَّقَ الْقَلَمُ الْمَسْمَارُ (شیخ کا مضطرب ہونا) قَلَقَلَهُ سے مشتق ہے جس کے معنی کسی چیز کی حرکت کی آواز کو حکایت کرنے کے ہیں۔

## (ق ل ب)

قَلْبُ الشَّيْءِ کے معنی کسی چیز کو پھرنے اور ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف قَلْبُ الثَّوبِ: پلٹنے کے ہیں۔ (کپڑے کو الٹنا) اور قَلْبُ الْإِنْسَانِ کے معنی انسان کو اس کے راستہ سے پھیر دینے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَالَّذِينَ تَقَلَّبُونَ﴾ (۲۱-۲۹) اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔

الْإِنْقِلَابُ کے معنی پھر جانے کے ہیں ارشاد ہے۔

یعنی تم میں سے بہت لوگ ایسے ہیں جنہیں اس کا علم دیا گیا ہے اور یہ بھی کہ قَلِيلًا مصدر محذوف کی صفت ہو یعنی تمہیں اس کے متعلق علم قلیل (تھوڑا سا علم) دیا گیا ہے۔ اور آیت کریمہ۔

﴿وَلَا تَسْتَرْوُا بِأَيِّئِئِنَّمَا قَلِيلًا﴾ (۲-۴۱) اور میری آیتوں (میں تحریف کر کے ان) کے بدلے تھوڑی سی قیمت (یعنی دنیاوی منفعت) نہ حاصل کرو۔

میں قلیل سے مراد دنیوی مال و متاع ہے کیونکہ دنیوی مال و متاع خواہ کتنا ہی زیادہ کیوں نہ ہو اخروی نعمتوں کے مقابلہ میں جو حق تعالیٰ نے متقین کے لیے تیار کی ہیں، نہایت ہی حقیر ہے اسی بناء پر فرمایا: ﴿قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيلٌ﴾ (۴-۷۷) کہہ دو کہ دنیا کا فائدہ بہت تھوڑا ہے۔

اور کبھی قلیل کا لفظ بول کر نفی کے معنی مراد لیے جاتے ہیں۔ جیسے قَلَمًا يَفْعَلُ فُلَانٌ بِكَذَا: کہ فلاں ایسا کام نہیں کرتا یہی وجہ ہے کہ نفی کی طرح اس کے بعد بھی استثناء لانا صحیح ہوتا ہے جیسے قَلَمًا يَفْعَلُ كَذَا إِلَّا قَاعِدًا أَوْ قَائِمًا أَوْ مَا يَجْرِي مَجْرَاهُ۔ اور بعض نے آیت کریمہ: ﴿قَلِيلًا مَا تُؤْمِنُونَ﴾ (۷۰-۴۱) لیکن تم لوگ بہت ہی کم ایمان لاتے ہو۔

کو بھی اسی معنی پر محمول کیا ہے یعنی وہ ایمان ہی نہیں لاتے اور بعض نے اس کے معنی تُوْمِنُونَ اِيْمَانًا قَلِيلًا کیے ہیں۔ یعنی وہ بہت کم ایمان لاتے ہیں اور ایمان قلیل سے مراد صرف زبان کے ساتھ اقرار اور سطحی سی معرفت حاصل کرنے کے ہیں جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: ﴿وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُم بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ

﴿وَلِتَطْمَئِنَّ قُلُوبُكُمْ بِهِ﴾ (۱۲۶-۳) اس لیے کہ تمہارے دلوں کو اس سے تسلی ہو۔

میں قلوب کے مطمئن ہونے سے ان میں بہادری کا ثابت ہونا اور خوف کا زائل ہونا مراد ہے۔ چنانچہ اس کے برعکس خوف کے طاری ہونے کے متعلق فرمایا:

﴿وَقَذَفَ فِي قُلُوبِهِمُ الرُّعْبَ﴾ (۲۶-۳۳) اور ان کے دلوں میں دہشت ڈال دی۔

اور آیت کریمہ:-

﴿ذَلِكُمْ أَطْهَرُ لِقُلُوبِكُمْ وَقُلُوبِهِمْ﴾ (۵۳-۳۳) یہ تمہارے اور ان کے دلوں کے لیے بہت پاکیزگی کی بات ہے۔

میں اَطْهَرُ سے جالب عفت ہونا مراد ہے۔ نیز فرمایا:-  
﴿هُوَ الَّذِي أَنْزَلَ السَّكِينَةَ فِي قُلُوبِ الْمُؤْمِنِينَ﴾ (۴-۴۸) وہی تو ہے جس نے مومنوں کے دلوں پر تسلی نازل فرمائی۔

اور آیت کریمہ: ﴿وَقُلُوبُهُمْ شَتَّى﴾ (۱۳-۵۹) مگر ان کے دل پھٹے ہوئے ہیں۔

میں شتی کے معنی متفرق ہونے کے ہیں۔ اور آیت کریمہ:  
﴿وَلَكِنْ تَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ﴾ (۴۶-۲۲) بلکہ دل۔ جو سینوں میں ہیں (وہ) اندھے ہوتے ہیں۔

کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ قلوب سے مراد عقلیں ہیں اور بعض نے روجیں مراد لی ہیں۔ لیکن عقل کبھی اندھی نہیں ہوتی لہذا تَعْمَى کی قلوب کی طرف نسبت مجازی ہوگی جیسا کہ آیت کریمہ ﴿تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ﴾ (۱۲۵-۲) میں (مجازاً) جاری ہونے کی نسبت انہار کی

﴿وَمَنْ يَنْقَلِبْ عَلَى عَقْبَيْهِ﴾ (۱۳۲-۳) اور جو الٹے پاؤں پھر جائے گا۔

﴿إِنَّا إِلَى رَبِّنَا مُنْقَلِبُونَ﴾ (۵۰-۲۶) ہم اپنے پروردگار کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔

﴿أَيُّ مُنْقَلِبٍ يُنْقَلِبُونَ﴾ (۲۶-۲۲) کہ کوئی جگہ لوٹ جاتے ہیں۔

﴿وَإِذَا انْقَلَبُوا إِلَىٰ أَهْلِهِمْ انْقَلَبُوا فَكِهِينَ﴾ (۸۳-۳۱) اور جب اپنے گھر کو لوٹتے تو اتراتے ہوئے لوٹتے۔

بعض نے کہا ہے کہ انسان کے دل کو بھی قلب اسی لیے کہا جاتا ہے کہ وہ کثرت سے التا پلٹتا رہتا ہے اور قلب کا لفظ بول کر اوصاف قلبی مراد لیے جاتے ہیں جیسے علم، شجاعت، روح وغیرہ چنانچہ آیت کریمہ:

﴿وَبَلَغَتِ الْقُلُوبُ الْحَنَاجِرَ﴾ (۱۰-۳۳) اور دل (مارے دہشت کے) گلوں تک پہنچ گئے۔ میں قلوب سے ارواح مراد ہیں اور آیت کریمہ: ﴿إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَذِكْرٍ لِّمَنْ كَانَ لَهُ قَلْبٌ﴾ (۳۷-۵۰) جو شخص دل (آگاہ) رکھتا ہے..... اس کے لیے اس میں نصیحت ہے۔

میں قلب سے مراد علم و فہم ہے۔ نیز فرمایا:- ﴿وَجَعَلْنَا عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ أَكِنَّةً أَنْ يَفْقَهُوهُ﴾ (۲۵-۶) اور ہم نے ان کے دلوں پر توپردے ڈال دیئے ہیں کہ اس کو سمجھ نہ سکیں۔

﴿طَبَعَ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُونَ﴾ (۸۷-۹) ان کے دلوں پر مہر لگا دی گئی ہے تو یہ سمجھتے ہی نہیں اور آیت کریمہ:

﴿وَتَقَلَّبَكَ فِي السَّجْدَيْنِ﴾ (۲۶-۲۹) اور نمازیوں میں تمہارے پھرنے کو بھی۔

﴿أَوْ يَأْخُذْهُمْ فِي تَقَلُّبِهِمْ فَمَا هُمْ بِمُعْجِزِينَ﴾ (۱۶-۳۶) یا ان کو چلتے پھرتے پکڑ لے وہ (خدا کو) عاجز نہیں کر سکتے۔

رَجُلٌ قَلْبٌ: بہت زیادہ حیلہ گراور ہوشیار آدمی جو معاملات میں الٹ پھیر کرنے کا ماہر ہو اَلْقَلَابُ: دل کی ایک بیماری (جوانٹ کو لگ جاتی ہے)

مَا بِهِ قَلْبَةً: یعنی وہ تندرست ہے اسے کسی قسم کا عارضہ نہیں ہے جو پریشانی کا موجب ہو اَلْقَلْبُ: ایک خاص قسم کا کنگن۔ صاف نہ کیا گیا ہو۔ اَلْقَلْبُ: ایک خاص قسم کا کنگن۔

## (ق ل د)

اَلْقَلْدُ کے معنی رسی وغیرہ کو بل دینے کے ہیں۔ جیسے قَلَدْتُ الْحَبْلَ: (میں نے رسی بٹی) اور بٹی ہوئی رسی کو قَلِيدٌ یا مَقْلُودٌ کہا جاتا ہے اور قِلَادَةُ اس بٹی ہوئی چیز کو کہتے ہیں جو گردن میں ڈالی جاتی ہے جیسے ڈور اور چاندی وغیرہ کی زنجیر اور مجازاً تشبیہ کے طور پر ہر اس چیز کو جو گردن میں ڈالی جائے یا کسی چیز کا احاطہ کرے قِلَادَةُ کہا جاتا ہے اور اسی سے تَقَلَّدَ سَيْفَهُ کا محاورہ ہے۔ کیونکہ وہ بھی قِلَادَةُ کی طرح گردن میں ڈال کر لٹکائی جاتی ہے۔ جیسے وشاح (ہار) سے توشیح بہ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے اور قَلْدَتُهُ سَيْفًا کے معنی کسی کی گردن میں تلوار باندھنے یا تلوار سے اس کی گردن مارنے کے ہیں۔ قَلْدَتُهُ عَمَلًا کوئی کام کسی کے ذمہ لگا دینا۔

طرف کی گئی ہے حالانکہ انہار جاری نہیں ہوتیں بلکہ ان میں پانی جاری ہوا کرتا ہے۔ تَقْلِيْبُ الشَّيْءِ کے معنی کسی چیز کی حالت کو متغیر کر دینے کے ہیں جیسے فرمایا: ﴿يَوْمَ تَقَلَّبَ وُجُوهُهُمْ فِي النَّارِ﴾ (۳۳-۶۶)

جس دن ان کے منہ آگ میں الٹائیں جائیں گے۔ اور تَقْلِيْبُ الْأُمُورِ کے معنی کسی کام کی تدبیر اور اس میں غور و فکر کرنے کے ہیں چنانچہ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَقَلَّبُوا لَكَ الْأُمُورَ﴾ (۹-۳۸) اور بہت سی باتوں میں تمہارے لیے الٹ پھیر کرتے رہے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے دلوں اور بصیرتوں کو پھیر دینے سے ان کی آراء کو تبدیل کر دینا مراد ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَنُقَلِّبُ أَفْئِدَتَهُمْ وَأَبْصَارَهُمْ﴾ (۶-۱۱) اور ہم ان کے دلوں اور آنکھوں کو الٹ دیں گے۔

اور تَقْلِيْبُ الْيَدِ پشیمانی سے کنایہ ہوتا ہے۔ کیونکہ عام طور پر نادم آدمی کا یہی حال ہوتا ہے (کہ وہ اظہار ندامت کے لیے اپنے ہاتھ ملنے لگ جاتا ہے) قرآن پاک میں ہے: ﴿فَأَصْبَحَ يُقَلِّبُ كَفَّيْهِ﴾ (۱۸-۳۲) تو..... (حسرت سے) ہاتھ ملنے لگا۔

شاعر نے کہا ہے ① ( )

(۳۵۸) كَمَغْبُونٍ يَعْصُ عَلَى يَدَيْهِ

تَبَيَّنَ غَيْبُهُ بَعْدَ الْبَيَّاعِ

جیسے خسارہ اٹھانے والا آدمی تجارت میں خسارہ معلوم کر لینے کے بعد اپنے ہاتھ کاٹنے لگتا ہے۔ اور تَقْلِبُ (تفعل) کے معنی پھرنے کے ہیں۔ ارشاد ہے:-

① قاله قيس بن ذريح والبيت في اللسان (بيع) وفي محاضرات الادباء (۳/۱۰۰-۱۰۱) في ثلاثة بغیر عزو ۱۲۔

② انظر ادب الکاتب (۱۲۴۳)

اور آیت کریمہ:

﴿الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ﴾ (۹۶-۴) جس نے قلم کے ذریعے سے علم سکھایا۔

میں تنبیہ پائی جاتی ہے کہ انسان کو کتابت کی تعلیم دینا اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا احسان ہے اور جو حدیث میں آیا ہے کہ آنحضرت ﷺ جبریل علیہ السلام سے وحی اخذ کرتے تھے اور جبریل میکائیل سے، وہ اسرائیل سے اور اسرائیل لوح محفوظ سے اور لوح محفوظ قلم سے۔ تو یہاں قلم سے سرائی کی طرف اشارہ ہے جس کی تحقیق کا یہاں موقع نہیں ہے۔

الْأَقْلَامُ: ربح سکون کا ساتواں حصہ۔ علماء بیت کی تحقیق کے مطابق زمین کے سات حصے ہیں۔ اور ہر حصہ پر اقلیم کا لفظ بولتے ہیں اس کی جمع اَقَالِیمُ ہے۔

## (ق ل ی)

الْقَلَى کے معنی شدت بغض کے ہیں قَلَاہُ (ماضی) اور يَقْلِيهِ وَيَقْلُوهُ مضارع دونوں طرح آتا ہے۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلَى﴾ (۹۳-۳) (اے محمد ﷺ) تمہارے پروردگار نے نہ تو تم کو چھوڑا اور نہ تم سے ناراض ہوا۔

﴿إِنِّي لَعَمَلِكُمْ مِنَ الْفَالِینَ﴾ (۶۸-۲۶) میں تمہارے کام کا سخت دشمن ہوں۔

اگر اسے داوی قَلَوُ سے مشتق مانا جائے جس کے معنی (رَمَى کے ہیں تو یہ قَلَتِ النَّاقَةُ بِرَأْكِبِهَا قَلَوًا۔

قَلَدَتْهُ هَجَاءً: کسی پر ہجو کو لازم کر دینا اور آیت کریمہ: ﴿لَهُ مَقَالِيدُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ﴾ (۳۹-۶۳) اسی کے پاس آسمانوں اور زمین کی کنجیاں ہیں۔ میں مقالید سے مراد وہ چیز ہے جو ساری کائنات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ بعض نے اس سے خزانے اور بعض نے کنجیاں مراد لی ہیں لیکن ان سب سے اللہ تعالیٰ کی اس قدرت اور حفاظت کی طرف اشارہ ہے، جو تمام کائنات پر محیط ہے۔

## (ق ل م)

الْقَلَمُ: (مصدر) اس کے اصل معنی کسی سخت چیز کو تراشنے کے ہیں۔ اس لیے ناخن، بانس کی گرہ اور سرکنڈے وغیرہ کے تراشنے پر قَلَمُ کا لفظ بولا جاتا ہے اور تراشیدہ چیز کو قَلَمُ کہا جاتا ہے تَوَقَّلْتُ بمعنی مظلوم ہے جیسے نَقَضُ بمعنی مَنْقُوضٌ آتا ہے۔

اور (عرف میں) خاص کر لکھنے کے آلہ اور قرعہ اندازی کے تیر پر یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ اس کی جمع أَقْلَامٌ ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُونَ﴾ (۶۸-۱) قلم کی اور جو (اہل قلم) لکھتے ہیں اس کی قسم۔

﴿وَلَوْ أَنَّ مَا فِي الْأَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ أَقْلَامٌ﴾ (۳۱-۲۷) اور اگر یوں ہو کہ زمین میں جتنے درخت ہیں (سب کے سب) قلم ہوں۔ اور آیت کریمہ: ﴿وَإِذْ يُلْقُونَ أَقْلَامَهُمْ﴾ (۳-۳۲) جب وہ لوگ اپنے قلم (بطور قرعہ) ڈال رہے تھے۔

میں أَقْلَامٌ سے قرعہ اندازی کے تیر مراد ہیں۔ ❶

❶ کذا قال عطاء ونقل عن ابن عباس ومجاهد وابن جريج ان المراد بها الاقلام التي كانوا يكتبون بها التوراة وكانت من نحاس. انظر الفيوضات الالهية (ص ۳۱۸ ج ۱ والطبری (ص ۲۴۳ ج ۳)۔

﴿إِذِ الْأَغْلَالُ فِي أَعْنَاقِهِمْ وَالسَّلْسِلُ﴾  
(۴۰-۷۱) جب کہ ان کی گردنوں میں طوق اور  
زنجیریں ہوں گی۔ میں پایا جاتا ہے۔

### (ق م ر)

الْقَمَرُ: چاند جب پورا ہو رہا ہو تو اسے قمر کہا  
جاتا ہے اور یہ حالت تیسری رات کے بعد ہوتی ہے۔  
بعض نے کہا کہ چاند کو قمر اس لیے کہا جاتا ہے وہ  
ستاروں کی روشنی کو خیرہ کر دیتا ہے اور لن پر غالب آ جاتا

ہے قرآن پاک میں ہے: ﴿هُوَ الَّذِي جَعَلَ  
الشَّمْسَ ضِيَاءً وَالْقَمَرَ نُورًا﴾ (۱۰-۵) وہی تو  
ہے جس نے سورج کو روشن اور چاند کو منور بنایا۔

﴿وَالْقَمَرَ قَدَرْنَاهُ مَنَازِلَ﴾ (۳۶-۳۹) اور چاند کی  
(بھی) ہم نے منزلیں مقرر کر دیں۔

﴿وَأَنشَقَّ الْقَمَرُ﴾ (۵۳-۱) اور چاند شق ہو گیا۔

﴿وَالْقَمَرَ إِذَا تَلَّهَا﴾ (۹۱-۲) اور چاند کی جب اس  
کے پیچھے نکلے۔

﴿كَأَلَا وَالْقَمَرَ﴾ (۷۴-۳۲) ہاں ہاں (ہمیں) چاند  
کی قسم۔

الْقَمَرَاءُ: چاند کی روشنی۔ چاندنی۔ تَقَمَّرْتُ فَلَانَا  
چاندنی رات میں کسی کے پاس جانا۔

قَمَرَتِ الْقَرْبَةُ: چاند کی روشنی سے پانی کی مشک خراب  
ہو گئی۔

حِمَارٌ أَقْمَرُ: چاند کے رنگ۔ یعنی سبزی مائل سفید رنگ  
کا گدھا۔

قَمَرْتُ فَلَانًا كَذَا میں نے فلاں کو اس چیز سے دھوکا دیا۔

(ناقہ نے سوار کو گرا دیا) وَقَلَوْتُ بِالْقَلَّةِ (میں نے گلی  
کو پھینکا) وغیرہا محاورات سے مشتق ہوگا۔ اور جس چیز  
سے دل بوجہ بغض یا ناپسندیدہ ہونے کے اس طرح گھن  
کھائے گویا اسے پھینک رہا ہے تو اسے مَقْلُوْ کہا جائے  
گا۔ اور اگر ناقص یائی سے مشتق مانا جائے تو یہ قَلِيْتُ  
الْبُسْرِ وَالسَّوِيْقِ عَلَى الْمُقْلَةِ کے محاورہ سے ماخوذ  
ہوگا جس کے معنی مَقْلَاة (فرائی پین) میں کھجور اور ستو  
ڈال کر تلنے کے ہیں۔

### (ق م ح)

الْقُمْحُ: خلیل نے کہا ہے کہ قَمْحُ اس  
گیہوں کو کہتے ہیں جو پکنے کے وقت سے لے کر ذخیرہ  
اندوزی تک بالی کے اندر ہی رکھا جائے اور اس گیہوں  
سے جو ستو بنایا جاتا ہے اسے قَمْيْحَة کہا جاتا ہے۔

(اور ستو کی مناسبت سے) کوئی چیز پھانکنے کے لیے سراو پر  
اٹھانے کو الْقَمْحُ (ف) کہتے ہیں۔ پھر محض سراٹھانے پر  
(خواہ کسی وجہ سے ہو قَمْحُ کہا جانے لگا ہے۔ چنانچہ کہا  
جاتا ہے قَمْحُ الْبَعِيرُ: اونٹ نے (سیری کے بعد حوض  
سے) سراو پر اٹھا لیا أَقْمَحْتُ الْبَعِيرَ: میں نے اونٹ کا  
سراونچا کر کے پچھلی جانب باندھ دیا۔ اور آیت کریمہ:

﴿فَهُمْ مُّقْمَحُونَ﴾ (۳۶-۸) تو انکے سراٹھ رہے  
ہیں۔ میں تشبیہ اور تمثیل کے طور پر ان کو مُقْمَحُونَ کہا گیا  
ہے۔ اور اس سے مقصود قبول حق سے ان کی سرتابی اور  
سرکشی اور راہ خدا میں خرچ کرنے سے ان کے انکار کو بیان  
کرنا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ قیامت کے دن ان کی اس  
حالت کی طرف اشارہ ہے جس کا تذکرہ آیت۔

پیٹ پیٹ کر کسی کو مطیع اور مقہور کیا جائے اسی سے محاورہ ہے۔

قَمَعْتُهُ فَأَنْقَمَعَ: میں نے اسے ردکا تو وہ رک گیا۔ اور  
الْقَمْعُ وَالْقَمْعُ (قیف) وہ چیز ہے جس کے ذریعہ کوئی  
(سیال) چیز (بوتل وغیرہ میں) ڈالی جائے۔ تاکہ نیچے نہ  
گرنے پائے۔ حدیث میں ہے ﴿۸۶﴾

((وَيْلٌ لِّأَقْمَاعِ الْقَوْلِ)) یعنی ان پرافسوس ہے جو  
اپنے کان لوگوں کی باتیں سننے کے لیے قیفس بنائے رکھتے  
ہیں یعنی دوسروں کی باتیں سننے کے درپے رہتے ہیں۔  
الْقَمْعُ: ذباب ازرق کیونکہ اسے مار کر دور بھگایا جاتا ہے  
تَقْمَعُ الْحِمَارُ: گدھے کا بھی کو دور بھٹانا۔

### (ق م ل)

الْقَمْلُ: چھوٹی کھیاں قرآن پاک میں ہے:  
﴿وَالْقَمْلَ وَالضَّفَادِعَ وَالْدَّمَ﴾ (۷-۱۳۳) اور  
چھوٹی کھیاں، مینڈک اور خون۔

الْقَمْلُ: کے معنی ہیں۔ جوں اور رَجُلٌ قَمْلٌ اس آدمی  
کو کہتے ہیں جس کے جوئیں پڑ جائیں اور اسی سے چھوٹے  
سے بد صورت مرد یا عورت کو قَمْلٌ یا قَمْلَةٌ کہا جاتا ہے  
گویا وہ جوں یا چھوٹی کھئی کی طرح ہے۔

### (ق ن ت)

الْقُنُوتُ: (ن) کے معنی خضوع کے ساتھ  
اطاعت کا التزام کرنے کے ہیں اس بنا پر آیت کریمہ:-  
﴿وَقُومُوا لِلَّهِ قَانِتِينَ﴾ (۲-۲۳۸) اور خدا کے آگے

### (ق م ص)

الْقَمِصُّ: قمیص۔ قمیص جمع قُمُصٌّ  
وَأَقْمِصَةٌ وَقُمَصَانٌ: قرآن پاک میں ہے:  
﴿إِنْ كَانَ قَمِيصُهُ قُدَّ مِنْ قُبُلٍ﴾ (۱۲-۲۶) اگر اس  
کا کرتہ آگے سے پھٹا ہو۔ ﴿وَأَنْ كَانَ قَمِيصُهُ قُدَّ  
مِنْ دُبُرٍ﴾ (۱۲-۲۷) اور اگر کرتہ پیچھے سے پھٹا ہو۔  
تَقْمَصُ قَمِيصَ پھٹنا۔ قَمَصَ (ن-ض) اَلْبَعِيرُ اونٹ  
کا جست کرنا۔

الْقَمَاصُ: اونٹ کا ایک مرض جو اسے چین سے کھڑا  
ہونے نہیں دیتا اور اسی سے لفظ قَامِصَةٌ ہے جس کا ذکر  
حدیث میں آیا ہے ﴿۸۵﴾

### (ق م ط ر)

الْقَمْطَرِيرُ: سخت۔ قرآن پاک میں ہے:-  
﴿عَبُّوْا قَمْطَرِيرًا﴾ (جو (چروں کو) کریہہ المنظر اور  
(لوں کو) سخت (مضطر) کر دینے والا۔ (۷۶-۱)  
قَمْطَرِيرٌ ایک لخت میں قما طیر بھی ہے۔

### (ق م ع)

الْمَقَامِعُ (مفرومِ قَمْع) ہتھوڑے۔ قرآن  
پاک میں ہے:  
قرآن پاک میں ہے:-

﴿وَلَهُمْ مَّقَامِعٌ مِنْ حَدِيدٍ﴾ (۲۲-۲۱) اور ان کے  
مارنے ٹھوکنے کے لیے لوہے کے ہتھوڑے ہوں گے۔  
مَقَامِعُ کا واحد مَقْمَعٌ ہر اس چیز کو کہا جاتا ہے جس سے

① روی عن علی انه قضی فی الفارصة والقامصة والواقصة بالدية اثلاثا راجع للقصة النهاية۔

② الكلمة من الحديث الفائق (۱۸۴/۲) والنهاية (قمع) قال فی الفائق معناه ای لا ینجع فیهم الوعظ کالاقامع التی لا  
تعی شینا مما یفرع فیها ۱۲۔

﴿أَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ آنَاءَ اللَّيْلِ سَاجِدًا وَقَائِمًا﴾

(۹-۳۹) یا وہ جو رات کے وقتوں میں زمین پر پیشانی رکھ کر اور کھڑے ہو کر عبادت کرتا ہے۔

﴿أَفْتَيْتَنِي لِرَبِّكَ﴾ (۳-۲۳) اپنے پروردگار کی فرمانبرداری کرنا۔

﴿وَمَنْ يَقْنُتْ مِنْكُنَّ لِلَّهِ وَرَسُولِهِ﴾ (۳۳-۳۱) اور جو تم میں سے خدا اور اس کے رسول کی فرمانبرداری ہے گی۔

﴿وَالْفَتْنَيْنِ وَالْفِتْنَةِ﴾ (۳۳-۳۵) اور فرمانبرداری مرد اور فرمانبرداری عورتیں۔

﴿فَالصَّلَاحُ فِتْنَةٌ﴾ (۴-۳۲) تو جو نیک پیمیاں ہیں وہ مردوں کے حکم پر چلتی ہیں۔

### (ق ن ط)

الْقَنُوطُ (مصدر) کے معنی بھلائی سے مایوس ہونے کے ہیں اور یہ قَنَطُ (ض) وَقَيْطُ (س) قَنُوطًا

یعنی ہر دو ابواب سے استعمال ہوتا ہے قرآن پاک میں ہے۔ ﴿فَلَا تَكُنْ مِنَ الْفَنِطِينَ﴾ (۱۵-۵۵) آپ مایوس نہ ہوئے۔

﴿وَمَنْ يَقْنُطُ مِنْ رَحْمَةِ رَبِّهِ إِلَّا الضَّالُّونَ﴾ (۱۵-۵۶) خدا کی رحمت سے (میں) مایوس کیوں ہونے لگا۔ اس سے (ما یوس ہونا تو گمراہوں کا کام ہے۔

ادب سے کھڑے رہا کرو۔

میں بعض نے قانتین کے معنی طاعین کیے ہیں ۱ یعنی اطاعت کی حالت میں اور بعض نے خاضعین یعنی خشوع اور خضوع کے ساتھ اسی طرح آیت کریمہ: ﴿كُلُّ لَهْ

فَتَيْتُونَ﴾ (۲-۱۱۶) سب اس کے فرمانبردار ہیں۔ میں بعض نے فِتْيُون کے معنی خَاضِعُونَ کیے ہیں اور بعض نے طَائِعُونَ (فرمانبردار) اور بعض نے سَائِكُونَ

یعنی خاموش اور چپ چاپ اور اس سے بالکل خاموش ہو کر کھڑے رہنا مراد نہیں بلکہ عبادت گزاری میں خاموشی سے ان کی مراد یہ ہے جیسا کہ آنحضرت نے فرمایا ۲۔ (۸۷)

”کہ نماز تلاوت قرآن اور اللہ کی تسبیح و تحمید کا نام ہے اور اس میں کسی طرح کی انسانی گفتگو جائز نہیں ہے۔“ اسی بنا پر جب آپ سے پوچھا گیا کہ کوئی نماز افضل ہے تو آپ نے فرمایا ۳ (۸۸) ﴿طَوَّلُ الْقُنُوتِ﴾ یعنی عبادت میں ہمدن مصروف ہو جانا اور اس کے ماسوا سے توجہ پھیر لینا قرآن پاک میں ہے ﴿إِنَّ إِبْرَاهِيمَ كَانَ أُمَّةً قَانِتًا﴾

(۱۶-۱۲۰) بے شک حضرت ابراہیم علیہ السلام (لوگوں کے) امام اور (خدا کے) فرمانبردار تھے۔ اور مریم علیہا السلام کے متعلق فرمایا ﴿وَكَاَنَتْ مِنَ الْقَانِتِينَ﴾ (۲۶-۱۲) اور فرمانبرداروں میں سے تھیں۔

۱ وفی المستدرک عن ابی سعید: کل حرف فی القرآن یذکر فیہ القنوت فهو الطاعة (کنز العمال ۲ رقم ۷۷)

۲ رواہ ابوداؤد و النسائی فی حدیث طویل و مسلم فی صحیح انظر العون (۱: ۳۴۹-۳۵۱) ورواہ الترمذی عن جابر (۵۱: ۱) و الحدیث فی اللسان (قنت) و مشکل القرآن للقبی (۳۵۰) و نسبه المتقی فی التزالی الابانة لابی نصر عبد الله

بن سعید بن سعید بن حاتم السخبری رقم ۷۷۔

۳ الحاكم فی المستدرک و الترمذی و مسلم و ابن ماجه عن جابر و الطبرانی عن ابن موسیٰ و عن عمرو بن عبیده و عن عمر بن قتادة اللیثی و الحدیث فی الکشاف (۳/ ۳۴۰) و الفائق (۲/ ۸۵) قال الحافظ فی تخریجه علی الکشاف: وفی رواية الطحاوی

طول القيام (راجع رقم ۳۱۸)

۱ وفی المستدرک عن ابی سعید: کل حرف فی القرآن یذکر فیہ القنوت فهو الطاعة (کنز العمال ۲ رقم ۷۷)

۲ رواہ ابوداؤد و النسائی فی حدیث طویل و مسلم فی صحیح انظر العون (۱: ۳۴۹-۳۵۱) ورواہ الترمذی عن جابر (۵۱: ۱) و الحدیث فی اللسان (قنت) و مشکل القرآن للقبی (۳۵۰) و نسبه المتقی فی التزالی الابانة لابی نصر عبد الله بن سعید بن سعید بن حاتم السخبری رقم ۷۷۔

۳ الحاكم فی المستدرک و الترمذی و مسلم و ابن ماجه عن جابر و الطبرانی عن ابن موسیٰ و عن عمرو بن عبیده و عن عمر بن قتادة اللیثی و الحدیث فی الکشاف (۳/ ۳۴۰) و الفائق (۲/ ۸۵) قال الحافظ فی تخریجه علی الکشاف: وفی رواية الطحاوی طول القيام (راجع رقم ۳۱۸)

راضی ہو جائے شاعر نے کہا ہے ۵ (الوافر)  
(۳۵۹) لَمَّا لَ الْمَرْءُ يَصْلِحُهُ فَيُغْنِي  
مَفَاقِرَهُ أَعْفُ مِنَ الْقَنُوعِ

وہ مال جو انسان کی حالت درست رکھے اور احتیاج سے  
بچائے وہ سوال کرنے سے بہر حال بہتر ہے۔

أَفْنَعَ رَأْسُهُ: اس نے اپنے سر کو اونچا کیا۔ قرآن پاک  
میں ہے: ﴿مُقْنِعِي رَأْيٍ وَسِيهِمْ﴾ (۱۳-۴۳) سر اٹھائے  
ہوئے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ اصل میں قِنَاعٌ سے مشتق  
ہے اور قِنَاعٌ اس چیز کو کہتے ہیں جس سے سر ڈھانکا جائے  
اس سے قَنِعَ (س) کے معنی ہیں اس نے اپنے فکر کو

چھپانے کے لیے سر پر قناع اوڑھ لیا اور قَنَعَ (ف) کے  
معنی سوال کرنے کے لیے سر کھولنے یعنی لوگوں کے سامنے  
احتیاج ظاہر کرنے کے ہیں جیسا کہ خفی (س) کے معنی  
چھپنے اور خفی (ف) کے معنی خفاء کو دور کرنے یعنی ظاہر  
ہونے کے ہیں اور رجل مَقْنَعٌ کا محاورہ قَنَاعَةٌ سے ہے  
یعنی وہ آدمی جس کی شہادت کو کافی سمجھا جائے اس کی حجج  
مَقَانِعُ ہے۔ شاعر نے کہا ہے ۵۔ (الطویل)

(۳۶۰) شَهْوَدِي عَلَى لَيْلِي عُذُولٌ مَقَانِعُ  
اور لیلیٰ پر عادل اور پسندیدہ لوگ میرے گواہ نہیں تھے جن

﴿يُعْبَدِي الَّذِينَ اسْرَفُوا عَلَى أَنْفُسِهِمْ لَا  
تَقْنُطُوا مِنْ رَحْمَةِ اللَّهِ﴾ (۵۳-۳۹) اے میرے  
بندو! جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے خدا کی  
رحمت سے ناامید نہ ہونا۔

﴿وَإِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ فَيَئُوسٌ قَنُوطٌ﴾ اور اگر تکلیف  
پہنچتی ہے تو ناامید ہو جاتا ہے اور آس توڑ بیٹھتا ہے  
(۴۱-۳۹) اور کبھی قَنِطُ کا لفظ فرح کے مقابلہ میں  
استعمال ہوتا ہے جیسے فرمایا:

﴿وَإِذَا هُمْ يَقْنُطُونَ﴾ (۳۶-۳۰) تو ناامید ہو کر رہ  
جاتے ہیں۔

## (ق ن ع)

الْقَنَاعَةُ کے معنی ضروریات زندگی میں سے  
تھوڑی سی چیز پر راضی ہو جانے کے ہیں اور یہ قَنِعَ (س)  
يَقْنَعُ قَنَاعَةً سے ہے کیونکہ قَنَعَ (ف) يَقْنَعُ قَنُوعًا  
کے معنی سوال کرنے کے ہیں۔ لہذا آیت کریمہ:  
﴿وَأَطِيعُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ﴾ (۲۲-۳۶) اور  
قناعت سے بیٹھنے والوں اور سوال کرنے والوں کو بھی  
کھلاؤ۔ میں بعض نے کہا ہے کہ قَانِعٌ سے مراد وہ سائل  
ہے جو باصرار سوال نہ کرے اور جو کچھ مل جائے اسی پر

① قاله شماخ بن ضرار في أبيات يخاطب امرءة، عائشه من قصيدة في ديوانه ۵۶-۶۲ والبيت في اللسان والمحكم (قنع) والاضداد للصمعي (۵۰) والسجستاني (۱۶) وابن السكيت (۲۰۳) وابن الانباري مع اخر (۶۶-۶۷) واضدا دواي الطيب (۵۷۹) والصاحي (۱۶۸-۱۹۷) والمعاني اللقبتي (۴۲۹، ۴۹۹، ۲۳۳) والطبري (۱۷/۱۶۸) والبحر (۶/۳۴۷) وتهذيب الالفاظ ۱۷ والبخلاء (۱۸۱) ومحاز ابی عبيدة (۵۱: ۲) والجمهرة (۳: ۱۳۲) والقرطبي (۱۲: ۶۴) والميداني (۱: ۲۵۴) والاشتقاق ۳۵۶۔

② قاله البعيث وصدرة ۱۰ نيت ليلي بالخلاء ولم يكن والبيت في اللسان (قنع) والاشباه النحويه (۴: ۲۲) لئكن فيه خلاء بدل بالخلاء وشهود بدون الاضافة وهي رواية الكامل (۳۹۱) والمحاضرات للمؤلف (۸۶) والبيت أضافي أيضاً لى (۱: ۱۹۳) والبلدان (سم: قناعت) في ستة أبيات والمحكم (قنع) واضداد ابی الطيب ۵۸۰ وبعده: وما كل مامنتك نفسك خالبا۔ يكون والا كل الهوى انت تابع ۱۲۔



میں ہلکی سی زردی کی ملاوٹ ہوتی ہے۔ اور قنہ جس کے معنی ناک کے بانسہ کے اوپر اٹھنے اور اس کی نوک کے جھکی ہوئی ہونے کے ہیں۔ یہ معنی قنہ بمعنی نیزہ سے ماخوذ ہے۔ کیونکہ وہ ہیئت میں اس کے مشابہ ہوتی ہے۔ محاورہ ہے:

رَجُلٌ أَقْنَىٰ وَامْرَأَةٌ قَنَوَاءُ: وہ مرد یا عورت جس کی ناک درمیان سے اٹھی ہوئی ہو اور اس کے نتھنے ٹنگ ہوں۔

### (ق ن ی)

الْإِقْنَاءُ: (افعال) کے معنی غنی کر دینے کے

ہیں۔ قرآن میں ہے:

﴿وَأَنَّهُ هُوَ أَغْنَىٰ وَأَقْنَىٰ﴾ (۵۳-۵۴) اور یہ کہ وہی دولت مند بناتا اور مفلس کرتا ہے۔

یہ اِقْنَاءُ (افعال) سے ہے جس کے معنی اتنا مال دینے کے ہیں کہ احتیاج باقی نہ رہے یا قَنِیۃ سے ہے اور اسکے معنی ذخیرہ کیا ہوا مال بخشنے کے ہیں۔ اور بعض نے کہا ہے کہ اَقْنَىٰ کے معنی اَرْضَىٰ یعنی راضی کرنا ہیں۔ اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنی رضا و اطاعت کا خزانہ بخش دیا اور یہ غنا مادی غنا (مالداری) سے بڑھ کر ہے۔

اور قَنِیۃ کی جمع قَنِیَاتُ آتی ہے اور قَنِیْتُ کَذَا او اَقْتَنِیْتُہ کے معنی کسی چیز کو لازم پکڑنے کے ہیں، اسی سے شاعر نے کہا ہے ①

(۳۶۲) قَنِیْتُ حَیَائِی عِقَّةً وَتَكْرُمًا

کی شہادت پر قناعت ہو سکے۔ اور قَنَاعٌ سے تَقَنَّعَتِ الْمَرْءَةُ کا محاورہ ہے جس کے معنی برقعہ اوڑھنے کے ہیں۔

اور اس کے ساتھ تشبیہ دے کر کہا جاتا ہے: تَقَنَّعَ الرَّجُلُ مرد نے سر پر خود رکھا۔ قَنَعْتُ رَأْسَهُ بِالسَّيْفِ او السَّوْطِ: کسی کے سر پر تلوار یا کوڑا مارنا۔

### (ق ن و)

الْقَنُوْ کے معنی (کھجور یا انگور کے) خوشے کے ہیں اس کا شنیہ قَنَوَانٌ اور جمع قَنَوَانٌ آتی ہے قرآن پاک میں ہے:

﴿قَنَوَانٌ دَانِیَّةٌ﴾ (۶۱-۹۹) لٹکے ہوئے گچھے۔

اور قَنَاءَ (نیزے کی لکڑی) بھی نہیں ہونے میں قَنُوْ کے مشابہ ہے لیکن وہ قناعت (نالی) جس میں پانی بہتا ہے اسے طول میں نیزے کی لکڑی کے ساتھ تشبیہ دے کر قَنَاءُ کہا جاتا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ یہ دراصل قَنِیْتُ الشَّیْءِ سے مشتق ہے جس کے معنی کسی چیز کا ذخیرہ جمع کرنے کے ہیں اور نالی میں بھی چونکہ پانی کا ذخیرہ جمع رہتا ہے اس لیے اسے قَنَاءُ کہا جاتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ قَنَاءُ کے محاورہ سے مشتق ہے۔ جس کے معنی مل جانے کے ہیں۔

شاعر نے کہا ہے ② (الطویل)

(۳۶۱) كَبَّكَرِ الْمُقَانَاةِ الْبَيَاضِ بِصُفْرَةٍ

اس کا رنگ شتر مرغ کے تازہ انڈے جیسا ہے جس کی سفیدی

① قاله امرؤ القیس فی لامیته یصف حیثیته، وتماہ: غذا ہا نمیر الماء غیر محلل راجع للبیوت دیوانہ۔ ۱۰ (صنعة السند وبی) والجمہرة ۹۸ والمعانی للقبتی ۳۶۱ ولعمدة (۹۸:۲) والبحر (۳۶:۷) ومختار الجاہلی ۱۱ والاشباه (۲۱۵:۳) واللسان (قنی) وغریب القرآن للقبتی ۳۷۱ والعقد الثمین ۱۴۸ والمعلقات مع الانباری ۷۰ والتبریزی ۳۵ وفیہ ضبط اعرابہ۔

② قال ابن کثیر وعلیہ یدور کلام کثیر من المفسرین واختارہ بن جریر ورواہ عن ابی صالح (ص ۷۵ ج ۲۷)۔

③ رواہ ابن ابی حاتم عن ابن عباس ونقل فیہ اقوال آخر (ص ۷۶ ج ۲۷)

④ قالہ حاتم الطائی واولہ۔ اذا قل مالی او نکبت بنکبة والبیوت فی اللسان (قنی) ۱۲

کھانوں کے قاب کے فاصلہ پر یا اس سے بھی کم۔

## (قوت)

الْقُوْتُ: غذا جس سے سیرِ رقی ہو سکے اس کی

جمع اقوات ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَقَدَّرَ فِيهَا اَقْوَاتَهَا﴾ (۱۰-۴۱) اور اس میں سب سامان معشیت مقرر کیا۔

قَاتَهُ يَقُوْتُهُ قُوْتًا کے معنی غذا کھلانے کے ہیں، اور

اَقَاتَهُ يَقِيْتُهُ کے معنی ایسی چیز دینے کے ہیں جس سے وہ

قوت حاصل کر سکے۔ حدیث میں ہے ﴿۸۹﴾

((اِنَّ اَكْبَرَ الْكِبَائِرِ اَنْ يُضَيِّعَ الرَّجُلُ مَنْ يَقُوْتُ))

کہ جس کی قوت انسان کے ذمہ ہو اسے ضائع کرنا سب سے

بڑا گناہ ہے ایک روایت میں مَنْ يَقِيْتُ (افعال) بھی ہے۔

قرآن پاک میں ہے: ﴿وَكَنَّانَ اللّٰهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ

مُقِيْتًا﴾ (۸۵-۴) اور خدا ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

بعض نے اس کے معنی مقتدر یعنی قدرت رکھنے والا کیے

ہیں اور بعض نے محافظ اور بعض نے شاہد یعنی حاضر رہنے

والا..... لیکن اس کے اصل معنی یہ ہیں کہ اللہ ہر چیز کی

حفاظت کرتا اور اسے روزی دیتا ہے۔

اور اس میں قوت قُوْتُ قِيْتُ وَقِيْتُهُ تین لغات ہیں

جیسے طَعْمٌ وَطَعْمٌ وَطَعْمَةٌ چنانچہ محاورہ ہے: مَالَهُ

قُوْتُ لَيْلَةٍ وَقِيْتُ لَيْلَةٍ وَقِيْتُهُ لَيْلَةً: اس کے پاس

ایک رات کا بھی کھانا نہیں ہے شاعر نے آگ کی صفت

میں کہا ہے ﴿(الطَّوِيل)

تو میں بوجہ عفت و کرم کی وجہ سے حیا کی چادر اوڑھ لیتا

ہوں۔

## (قہر)

الْقَهْرُ کے معنی کسی پر غلبہ پا کر اسے ذلیل

کرنے کے ہیں اور دنوں (یعنی غلبہ اور تذلیل) میں سے

ہر ایک معنی میں علیحدہ علیحدہ بھی استعمال ہوتا ہے۔ قرآن

پاک میں ہے:

﴿وَهُوَ الْغَايُ فَوقَ عِبَادِهِ﴾ (۱۸-۶) اور وہ اپنے

بندوں پر غالب ہے۔

﴿وَهُوَ الْوَاحِدُ الْغَافِرُ﴾ (۱۶-۱۳) اور وہ یکتا اور

زبردست ہے۔

﴿وَإِنَّا فَوقَهُمْ فَهْرُونَ﴾ (۱۲-۷) اور بے شبہ ہم

ان پر غالب ہیں۔

﴿فَأَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَفْهَرْ﴾ (۹۳-۹) تو تم بھی یتیم پر

ستم نہ کرو۔ یعنی اسے ذلیل نہ کرو۔

اَقْهَرَهُ: کسی پر ایسے شخص کو مسلط کرنا جو اسے ذلیل کر دے۔

الْقَهْرُ: پچھلے پاؤں لوٹنا۔

## (قاب)

الْقَابُ کے معنی کمان کے درمیانی حصہ

(مقبض) سے لے کر ایک گوشہ کمان تک کے فاصلہ کے

ہیں اور قوس کی طرف اضافت کے ساتھ استعمال ہوتا

ہے) چنانچہ فرمایا:

﴿فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ أَوْ أَدْنَى﴾ (۵۳-۹) تو دو

① مجمع البحار والقائق (۱۸۹/۲) وفيه كفى بالرجل اثماً ان يُضَيِّعَ مَنْ يَقُوْتُ وابوداؤد (۲۳۵/۲) والنسائي والحديث في الاحياء للزغالي ولفظه: كفى بالمرء اثماً ان يضيع من يعول وهو عند مسلم بلفظ آخر راجع تحريج العراقي على الاحياء (۳۳: ۲)۔

② قاله ذوالرمة في وصف نار في قصيده له في ديوانه ۲۴ (طبعة كمبرج ۱۹۱۹) وقد مر في (روح)

(۳۶۳) فَقُلْتُ لَهُ ارْزَعْهَا إِلَيْكَ وَآحِبَهَا  
بِرُوحِكَ وَأَفْتِنَهُ لَهَا قِيَتَةً قَدْرًا

میں نے اسے کہا کہ اسے اپنی طرف اٹھاؤ اور اس پر تھوڑا  
تھوڑا ایندھن لگا کر نرم پھونک سے اسے سلگاؤ۔

## (ق و س)

الْقَوْسُ: کمان۔ قرآن پاک میں ہے:-

﴿فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ أَوْ أَدْنَى﴾ (۹-۵۳) تودو  
کمان کے فاصلے پر یا اس سے بھی کم۔

اور کمان کی ہیئت کدائی کے لحاظ سے تَقْوُسٌ بمعنی  
إِنْجَنَاءِ آتا ہے۔ محاورہ ہے:-

قَوْسَ الشَّيْخِ وَتَقْوَسَ: بوڑھا خمیدہ ہو گیا۔ قَوْسُ  
الْحَطِّ: میں نے خمیدہ خط کھینچا۔ اور خمیدہ خط کو مُقْوَسٌ  
کہا جاتا ہے۔

الْمَقْوَسُ: وہ جگہ جہاں سے گھوڑ دوڑ میں گھوڑے دوڑنا  
شروع کرتے ہیں اور اس کے اصل معنی اس رسی کے ہیں  
جس سے گھوڑ دوڑ میں گھوڑوں کی صف بندی کی جاتی ہے  
اور پھر انہیں دوڑنے کے لیے چھوڑا جاتا ہے۔

## (ق و ل)

الْقَوْلُ اور الْقِيلُ کے معنی بات کے ہیں

قرآن پاک میں ہے:

﴿وَمَنْ أَصْدَقُ مِنَ اللَّهِ قِيلًا﴾ (۱۲۲-۴) اور خدا  
سے زیادہ بات کا سچا کون ہو سکتا ہے۔

قول کا لفظ کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

(۱) عام طور پر حروف کے اس مجموعہ پر قول کا لفظ بولا جاتا  
ہے جو بذریعہ نطق کے زبان سے ظاہر ہوتے ہیں خواہ وہ  
الفاظ مفرد ہوں یا جملہ کی صورت میں مفرد۔ جیسے زَيْدٌ  
خَرَجَ اور مَرَّ بَ جیسے زَيْدٌ مُنْطَلِقٌ وَهَلْ خَرَجَ  
عَمَرُو وَنَحْوُ ذَلِكَ: کبھی انوار ثلاثہ یعنی اسم فعل  
اور حرف میں ہر ایک کو قول کہا جاتا ہے جس طرح کہ قصیدہ  
اور خطبہ وغیرہما کو قول کہہ دیتے ہیں۔

(۲) جو بات ابھی ذہن میں ہو اور زبان تک نہ لائی گئی ہو  
اسے بھی قول کہتے ہیں اس بنا پر قرآن پاک میں آیت  
کریمہ: ﴿وَيَقُولُونَ فِي أَنْفُسِهِمْ لَوْلَا يُعَذِّبُنَا  
اللَّهُ﴾ (۵۸-۸) اور اپنے دل میں کہتے ہیں (اگر یہ  
واقعی پیغمبر ہیں تو) جو کچھ ہم کہتے ہیں خدا ہمیں اس کی سزا  
کیوں نہیں دیتا۔

یعنی دل میں خیال کرنے کو قول سے تعبیر کیا ہے۔

(۳) رائے خیال اور عقیدہ پر بھی قول کا لفظ بولا جاتا ہے۔  
جیسے فُلَانٌ يَقُولُ يَقُولُ أَبِي حَنِيفَةَ: (فلاں ابو  
حنیفہ کی رائے کا قائل ہے)

(۴) کسی چیز پر دلالت کرنے کو قول سے تعبیر کر لیتے ہیں۔  
جیسا کہ شاعر نے کہا ہے۔ (الربز)

(۳۶۴) اِمْتَلَا الْخَوْضُ وَقَالَ قَطْنِي

خوض بھر گیا اور اس نے کہا بس مجھے کافی ہے۔

① قاله الراجز وقرينه مهلا رويدا قد ملات بطني هذه الرواية في شرح الدرة للخفاجي ۳۱ والصباح (قطط) والتنبه للبكري  
(۶۲) والمسقط (۴۷۵) والاببدال لابي الطيب (۳۷۴: ۱) وهي رواية النحاة وفي اللسان والتاج (قطط) وتهذيب اصلاح المنطق  
(۱۰۱: ۱) واصلاح يحقوب (۵۷، ۳۴۲) وابن الشجري (۱: ۳۱۳: ۲: ۴۰) سلا بدل مهلا وفي المقاييس حسبي بدل قطني  
وفي الكامل (۴۲۴) قد حقت بدل امتلا راجع ايضا الانصاف ۷۳ محالس ثعلب (۱: ۱۵۸) والعيني (۳۶۱) والطبري (۱: ۱۰۱)  
والفخر (۲۱: ۱۰۲) والمقاييس (۵: ۱۴) والمرتضى (۲: ۱۰۹) ومجازات القرآن للسيد شريف الرضي (۱: ۳۱۱)۔

میں اَفْوَاهِهِمْ کے لفظ سے اس بات پر تنبیہ کی ہے کہ یہ جھوٹ بولتے ہیں اور جو کچھ کہتے ہیں ان کے دل اس کی تائید نہیں کرتے اور یہ محاورہ ایسے ہی ہے جس طرح کتابت کے ساتھ ید کا لفظ ذکر کر کے اس کے جھوٹا ہونے کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَوَيْلٌ لِلَّذِينَ يَكْتُبُونَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ ثُمَّ يَقُولُونَ هَذَا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ﴾ (۷۹-۲) تو ان لوگوں پر افسوس ہے جو اپنے ہاتھ سے تو کتاب لکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ خدا کے پاس سے آئی ہے۔

اور آیت کریمہ:

﴿لَقَدْ حَقَّ الْقَوْلُ عَلَىٰ أَكْثَرِهِمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ﴾ (۷۳-۳۶) ان میں سے اکثر پر خدا کی بات پوری ہو چکی، سو وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ میں قول سے اللہ کا علم اور اس کا حکم مراد ہے۔ ﴿وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ﴾ (۱۱۵-۶) اور تمہارے پروردگار کی باتیں پوری ہو گئیں۔

﴿إِنَّ الَّذِينَ حَقَّتْ عَلَيْهِمْ كَلِمَةُ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ﴾ (۹۶-۱۰) جن لوگوں کے بارے میں خدا کا حکم (عذاب) قرار پا چکا ہے وہ ایمان نہیں لانے کے۔

حکم عذاب کو کلمۃ سے تعبیر فرمایا ہے اور آیت کریمہ ﴿ذَلِكَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ قَوْلَ الْحَقِّ الَّذِي فِيهِ يَمْتَرُونَ﴾ (۱۹-۳۴) یہ مریم علیہا السلام کے بیٹے عیسیٰ علیہ السلام ہیں (اور یہ) سچی بات ہے جس میں لوگ شک کرتے ہیں۔

میں عیسیٰ علیہ السلام کو قول الحق کہہ کر آیت کریمہ:

﴿إِنَّ مَثَلَ عِيسَىٰ عِنْدَ اللَّهِ كَمَثَلِ آدَمَ خَلَقَهُ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ﴾ (۵۹-۳)

(۵) کسی چیز کا صدق دل سے اعتبار کرنا اور اس کی طرف متوجہ ہونا جیسے فُلَانٌ يَقُولُ بِكَذَا افلاں اس کا صدق دل سے خیال رکھتا ہے۔

(۶) اہل منطق کے نزدیک قول بمعنی حد کے آتا ہے جیسے قَوْلُ الْجَوْهَرِ كَذَا وَقَوْلُ الْعَرَضِ كَذَا یعنی جو ہر کی تعریف یہ ہے اور عرض کی یہ۔

(۷) الہام کرنا یعنی کسی کے دل میں کوئی بات ڈال دینا جیسے فرمایا:

﴿قُلْنَا يَا الْقَارِئِينَ إِنَّمَا أَنْتُمْ مُنَادُونَ﴾ (۸۶-۱۸) ہم نے کہا ذوالقرنین! تم ان کو خواہ تکلیف دو۔

(یہاں قول بمعنی الہام اور القا کے ہے) کیونکہ تاریخ اور روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ ذوالقرنین کو (انبیاء کی طرح) مخاطب نہیں کیا گیا بلکہ یہ بات ان کے دل میں القا کر دی گئی تھی چنانچہ اس الہام کو قول سے تعبیر کر دیا ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ آیت کریمہ:

﴿قَالَتَا أَتَيْنَا طَائِعِينَ﴾ (۱۱-۴۱) انہوں نے کہا ہم خوش سے آتے ہیں۔

میں خطاب ظاہری نہیں تھا بلکہ ان کا یہ انتہال اور اظہار اطاعت تغیری طریقہ سے تھا اور یہی معنی آیت کریمہ:

﴿قُلْنَا يَنَارُ كُونِي بَرْدًا وَسَلَامًا﴾ (۶۹-۲۱) ہم نے حکم دیا اے آگ! سرد ہو جا اور ..... (موجب سلامتی بن جا۔)

میں مراد ہے اور آیت کریمہ:

﴿يَقُولُونَ بِأَفْوَاهِهِمْ مَا لَيْسَ فِي قُلُوبِهِمْ﴾ (۱۶۷-۳) منہ سے وہ باتیں کہتے ہیں جو ان کے دل میں نہیں ہیں۔

راوی یا خطبہ راوی نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ شعر کا اطلاق قول کی خاص شکل و صورت پر ہوتا ہے اور اس شکل و صورت کے ڈھالنے میں راوی کا کوئی دخل نہیں ہے مگر قول کی نسبت راوی اور مروی عنہ دونوں کی طرف ہو سکتی ہے اور آیت کریمہ:

﴿إِذَا أَصَابْتَهُمْ مُصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ﴾ (۲-۱۵۶) جب کوئی مصیبت واقع ہوتی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم اللہ کا مال ہیں اور اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔

میں صرف زبان کے ساتھ اِنَّا لِلّٰہِ اِلَیْہِ کہنا مرا نہیں بلکہ اس کے ساتھ اعتقاد و عمل کا ہونا بھی ضروری ہے۔

الْمَقُولُ کے معنی زبان کے ہیں اور محاورہ میں رَجُلٌ مَقُولٌ وَ مِنْطِقٌ وَقَوْلٌ وَ قَوْلًا کے معنی زبان دراز آدمی کے ہیں۔

الْقِيلُ: حیمری بادشاہوں کا لقب ہوتا تھا اور انہیں قیل یا تو اس لیے کہا جاتا تھا کہ ان کی ہر ایک بات پر اعتماد کیا جاتا تھا اور اس کی اقتداء کی جاتی تھی اور یا اس لیے کہ ان میں ہر ایک اپنے آباء کی روش پر چلتا تھا اور یہ تَقِيلُ فُلَانٌ اَبَاہُ (گفتار میں اپنے باپ کے مشابہ ہونا) کے محاورہ سے مشتق ہے جس طرح کہ (یمن کے ہر) بادشاہ کو تبع کہا جاتا تھا۔ کیونکہ ہر بادشاہ اپنے فیصلوں میں اپنے سے پیشرو کی اقتداء کرتا تھا۔

اصل میں یہ واوی ہے کیونکہ اس کی جمع اقوال آتی ہے جیسے مِیْتٌ کی جمع اموات آتی ہے۔

نیز یہ قیل کا مخفف ہے جیسے مِیْتٌ وَ مِیْتٌ اور جو لوگ اس کی جمع اَقْبَالٌ بناتے ہیں تو یہ (اقوال جمع قول سے،

اللہ کے ہاں عیسیٰ علیہ السلام کی مثال..... پھر فرمایا کہ (انسان) ہو جا تو وہ (انسان) ہو گئے۔

کے مضمون پر تنبیہ کی ہے اور عیسیٰ علیہ السلام کو قول کہنا ایسے ہی ہے جس طرح کہ آیت کریمہ:

﴿وَكَلِمَتَهُ أَلْفَهَامًا إِلَىٰ مَرِيَمَ﴾ (۴-۱۷۱) اور یہ کلمہ (بشارت) تھا جو اس نے مریم علیہا السلام کی طرف بھیجا تھا۔ میں انہیں کلمہ کہا گیا ہے اور آیت کریمہ: ﴿إِنكُم لَفِي قَوْلٍ مُّخْتَلِفٍ﴾ (۵۱-۸) تم ایک متناقض بات میں پڑے ہوئے ہو۔

کے معنی یہ ہیں کہ بعث (موت کے بعد زندگی) کے معاملہ میں تمہارے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔ اور بعث کو جو درحقیقت مقول فیہ ہے (مجازاً) قول کہہ دیا ہے۔ جیسا کہ مذکور چیز کو ذکر کہہ دیا جاتا ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ قَلِيلًا مَّا تُوْمَنُونَ﴾ (۶۹-۴۰، ۴۱) یہ قرآن پاک فرشتے عالی مقام کی زبان کا پیغام ہے اور یہ کسی شاعر کا کلام نہیں ہے۔ لیکن تم لوگ بہت ہی کم ایمان لاتے ہو۔

میں قرآن پاک کو قول رسول یعنی حضرت جبریل کا قول کہنا بنا بر مجاز ہے کیونکہ جو پیغام کسی رسول کے ذریعہ پہنچایا جاتا ہے اس کی نسبت رسول اور مرسل دونوں کی طرف صحیح ہوتی ہے یعنی کبھی مجازاً اسے قول رسول کہہ دیتے ہیں اور کبھی بنا برحقیقت مرسل کی طرف نسبت کر دیتے ہیں اگر اس پر یہ شبہ وارد ہو کہ اس اصل کی بنا پر تو شعر یا خطبہ کی نسبت بھی ان کے راوی کی طرف صحیح ہونی چاہیے جس طرح کہ انکی نسبت قائل کی طرف ہوتی ہے تو ہم کہیں گے کہ بے شک آپ شعر یا خطبہ کو قول راوی کہہ سکتے ہیں لیکن اسے شعر

﴿مِنْهَا قَائِمٌ وَحَصِيدٌ﴾ (۱۱-۱۰) ان میں سے بعض تو باقی ہیں اور بعض تہیں نہیں ہو گئے ہیں۔ ﴿مَا قَطَعْتُمْ مِّن لِّينَةٍ أَوْ تَرَكْتُمُوهَا قَائِمَةً عَلَى أُصُولِهَا﴾ (۵۹-۵) کھجور کے جو درخت تم نے کاٹے یا ان کو اپنی جڑوں پر کھڑا رہنے دیا سو خدا کے حکم سے تھا۔

اور قیام اختیاری کے معنی میں فرمایا: ﴿أَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ آنَاءَ اللَّيْلِ سَاجِدًا وَقَائِمًا﴾ (۳۹-۹) یا وہ جو رات کے وقتوں میں زمین پر پیشانی رکھ کر اور کھڑے ہو کر عبادت کرتا ہے۔

اور آیت کریمہ: ﴿الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللَّهَ قِيَامًا وَقُعُودًا﴾ (۳۱-۱۹۱) جو کھڑے اور بیٹھے..... ہر حال میں خدا کو یاد کرتے ہیں۔

اور نیز آیت: ﴿وَالَّذِينَ يَبْتَغُونَ لِرَبِّهِمْ سُجْدًا وَقِيَامًا﴾ اور وہ لوگ اپنے پروردگار کے آگے سجدہ کر کے (عجز و ادب سے) کھڑے رہ کر راتیں بسر کرتے ہیں۔ میں قیام قائم کی جمع ہے اور کسی چیز کی حفاظت اور مراعات کے معنی میں فرمایا:

﴿الرِّجَالُ قَوْمٌ عَلَى النَّسَاءِ﴾ (۴-۳۴) مرد عورتوں پر راعی اور محافظ ہیں۔ ﴿كُونُوا قَوْمِينَ لِلَّهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ﴾ (۵-۸) انصاف پر قائم رہو اور خدا کے لیے سچی گواہی دو۔

فرق کرنے کے لیے ہے جو) جس طرح کہ (عید کی جمع) اَعْيَادُ ہے پھر اس سے فعل مشتق کر کے تَقِيلُ أَبَاهُ کہہ دیتے ہیں جس طرح کہ (عید کے لفظ سے) تعید کہا جاتا ہے۔

إِقْتَالَ قَوْلًا: ایسی بات کہنا جو فائدہ یا نقصان کا باعث بنے اور کبھی اِقْتَالَ بھی اِحْتَكَمَ آتا ہے جیسا کہ شاعر نے کہا ہے ﴿الْخَفِيفُ﴾

(۳۶۵) يَأْبَى حَكُومَةَ الْمُقْتَالِ کسی زبردستی حاکم بننے والے کی حکومت کو نہیں مانتا۔ اَلْقَالُ وَالْقَالَةُ: وہ بات جو شر ہو جائے۔ غلیل نے کہا ہے کہ کبھی قَالَ بمعنی قَاتِلٌ بھی آ جاتا ہے۔ چنانچہ محاورہ ہے۔

أَنَا قَالَ كَذَا یعنی میں اس کا قاتل ہوں ﴿۵﴾۔

## (ق و م)

قَامَ يَقُومُ قِيَامًا فَهُوَ قَائِمٌ..... کھڑا ہونا قَائِمٌ کی جمع (بھی) قیام آتی ہے اور اَقَامَ بِالْمَكَانِ اِقَامَةً کے معنی کسی جگہ قیام کرنے کے ہیں اور قیام کا لفظ مختلف معانی میں استعمال ہوتا ہے۔

(۱) کسی شخص کا تسخیری طور پر یا اپنے ارادے سے کھڑا ہونا۔

(۲) قِيَامٌ لِّلشَّيْءِ: یعنی شے کی حفاظت اور نگہبانی کرنا۔

(۳) کسی کام کا پختہ ارادہ کر لینا۔

تسخیری طور پر کھڑا ہونے کے معنی میں فرمایا۔

① قاله الاعشى فى قصيدة له فى ٧٥ بيتا يمدح فيها الاسود بن المذر اللخمى و صدره: والمثل الذى جمعت لربيب الد..... هر والبيت فى اللسان والمحکم (حکم) والمعانى للقبتي (٩٢٣) وفى المطبوع تايبى بالتاء والصواب بالياء كما فى المراجع وفى ديوانه (١٦٨) من العدة بدل لربيب الدهر۔

② وايضا ﴿ولو تقول علينا بعض الاقاويل﴾ (٦٩-٤٤) معناه النسبة الى احد القول كذبا وزورا۔

لَكُمْ قِيَمًا ﴿٥-٣﴾ اور بے عقولوں کو ان کا مال، جسے خدا نے تم لوگوں کے لیے سبب معیشت بنایا مت دو۔

یعنی ان کو تمہاری بقا کا سبب بنایا، اسی طرح آیت: ﴿جَعَلَ اللَّهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيَمًا﴾ (٥-٩٤) خدا نے عزت کے گھر (یعنی) کعبے کو موجب امن مقرر فرمایا:

میں بیت اللہ کے قیاماً لِلنَّاسِ ہونے کے معنی یہ ہیں کہ لوگوں کی دنیا اور آخرت کی اصلاح اور درستگی بیت اللہ کے ساتھ وابستہ ہے۔ اہم کا قول ہے ﴿کہ یہاں قیام بمعنی قائم ہے یعنی اس کی یہ حیثیت کبھی منسوخ نہیں ہوگی اور ایک قرأت میں قِيَمًا ہے جو بمعنی قِيَامًا ہے اور بعض اسے قِيَمَةً کی جمع بتاتے ہیں لیکن یہ توجیہ بے معنی سی ہے۔

اور محاورہ میں قَامَ كَذَا وَثَبَتَ وَرَكَزَ کے ایک ہی معنی آتے ہیں۔ چنانچہ آیت کریمہ: ﴿وَاتَّخِذُوا مِنْ مَّقَامِ إِبْرَاهِيمَ مُصَلًّى﴾ (٢-١٢٥) اور حکم دیا کہ جس مقام پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کھڑے ہوئے تھے اس کو نماز کی جگہ بنا لو۔

(میں لفظ مقام بھی اسی محاورہ سے ماخوذ ہے۔)

قَامَ فُلَانٌ مَقَامَ فُلَانٍ کے معنی کسی کے قائم مقام ہونے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿فَأَخْرَجَ يَقُومُنْ مَقَامَهُمَا مِنَ الَّذِينَ اسْتَحَقَّ عَلَيْهِمُ الْأَوْلِيَانِ﴾ (٥-١٠٤) تو جن لوگوں کا انہوں نے حق مارنا چاہا تھا ان میں سے ان کی جگہ اور دو گواہ

﴿قَائِمًا بِالْقِسْطِ﴾ (٣-١٨) جو انصاف پر قائم ہیں۔ ﴿وَأَقَمْنَ هُوَ قَائِمٌ عَلَى كُلِّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ﴾ (١٣-٣٣) تو کیا جو خدا ہر نفس کے اعمال کا نگہبان ہے۔ یہاں (بھی) قائم بمعنی حَافِظ ہے۔ نیز فرمایا ﴿لَيْسُوا سَوَاءً مَنْ أَهْلُ الْكِتَابِ أُمَّةٌ قَائِمَةٌ﴾ (٣-١٢) یہ بھی سب ایک جیسے نہیں ہیں۔ ان اہل کتاب میں کچھ لوگ حکم خدا پر قائم بھی ہیں۔

اور آیت کریمہ:

﴿إِلَّا مَا دُمْتُ عَلَيْهِ قَائِمًا﴾ (٣-٤٥) تو جب تک اس کے سر پر ہر وقت کھڑے نہ رہو۔ میں قَائِمًا کے معنی برابر مطالبہ کرنے والے کے ہیں اور قیام بمعنی عزم کے متعلق فرمایا:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلَاةِ﴾ (٥-٦) مومنو! جب تم نماز پڑھنے کا قصد کیا کرو۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَيُقِيمُونَ الصَّلَاةَ﴾ (٢-٣) اور آداب کے ساتھ نماز پڑھتے..... ہیں۔

میں يُقِيمُونَ کے معنی نماز پر دوام اور (اس کے ارکان کی) حفاظت کرنے کے ہیں۔

اور قِيَامٌ و قِيَامٌ اس چیز کو بھی کہتے ہیں جس کے سہارے کوئی چیز قائم رہ سکے جس طرح کہ عِمَادٌ اور سِنَادٌ اس چیز کو کہتے ہیں جس سے کسی چیز کو سہارا لگا دیا جائے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ أَمْوَالَكُمُ الَّتِي جَعَلَ اللَّهُ

① هو ابو بکر عبدالرحمن بن کيسان الاصم المتوفى ٢٤٠ھ اقدم شيوخ المعتزلة وفي الفهرست ٥٧ ان له كتابا في تفسير القرآن وفي لسان الميزان (٣: ٤٢٧) الاصم المعتزلى صاحب المقالات فى الاصول وله تفسير عجيب انظر الملل وذيله (١: ٣٦١)

کھڑے ہوں۔ [www.KitaboSunnat.com](http://www.KitaboSunnat.com) اور آیت کریمہ: ﴿دِينًا قِيَمًا﴾ (۶-۱۶۲) یعنی دین صحیح ہے۔ میں قیَمًا بھی ثابت و مقوم کے معنی میں ہے یعنی ایسا دین جو لوگوں کے معاشی اور اخروی معاملات کی اصلاح کرنے والا ہے ایک قرأت میں قیَمًا مخفف ہے جو قیام سے ہے اور بعض نے کہا ہے کہ یہ صفت کا صیغہ ہے جس طرح کہ قَوْمٌ عِدَى، مَكَانٌ سِوَى، لَحْمٌ، رِذَى، مَاءٌ رُؤَى میں عدی سِوَى اور رِذَى وغیرہ اسلئے صفات ہیں اور اسی معنی میں فرمادیا۔

﴿ذَلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ﴾ (۹-۳۶) یہی دن (کا) سیدھا (راستہ) ہے۔

﴿وَلَمْ يَجْعَلْ لَهُ عِوَجًا﴾ (۱۸-۱) اور اس میں کسی طرح کی کجی اور چھیدگی نہ رکھی بلکہ سیدھی (اور سلیس اتاری ہے) اور آیت کریمہ: ﴿وَذَلِكَ دِينُ الْقَيِّمَةِ﴾ (۵۹۸-۵) یہی سچا دین ہے۔

میں قیَمَہ سے مراد امت عادلہ ہے جس کی طرف آیت کریمہ:

﴿كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ﴾ (۳-۱۱۰) تم سب سے بہتر ہو۔ اور آیت:

﴿كُونُوا قَوْمِينَ بِالْأَيْسُطِ شُهَدَاءَ لِلَّهِ﴾ (۴-۱۳۵) انصاف پر قائم رہو اور خدا کے لیے سچی گواہی دو۔

میں اشارہ پایا جاتا ہے اور آیت کریمہ: ﴿يَتْلُوا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً فِيهَا كُتِبَ قِيَمَةٌ﴾ (۹۸-۳۶) جو پاک

اور اوراق پڑھتے ہیں جن میں مستحکم آیتیں لکھی ہوئی ہیں۔ میں صُحُفًا مُّطَهَّرَةً سے قرآن پاک کی طرف اشارہ ہے۔ اور فِيهَا كُتِبَ قِيَمَہ کے معنی یہ ہیں کہ قرآن

پاک تمام کتب سماویہ کے مطالب پر حاوی ہے کیونکہ قرآن پاک تمام کتب متقدمہ کا ثمرہ اور نچوڑ ہے اور آیت: ﴿اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ﴾ (۲-۲۵۵) خدا وہ معبود برحق ہے کہ اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ زندہ، ہمیشہ رہنے والا۔

میں قَيُّوم (اسمائے حسنی سے ہے) یعنی ذات الہی ہر چیز کی نگران اور محافظ ہے اور ہر چیز کو اس کی ضروریات زندگی بہم پہنچاتی ہے جیسا کہ فرمایا: ﴿الَّذِي آعْطَى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهُ ثُمَّ هَدَى﴾ (۲۰-۵۰) جس نے ہر چیز کو اس کی شکل و صورت بخشی پھر راہ دکھائی۔

﴿أَفَمَنْ هُوَ قَائِمٌ عَلَى كُلِّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ﴾ (۱۳-۳۳) تو کیا جو (خدا) ہر نفس کے اعمال کا نگران ہے۔

قَيُّومٌ بروزن فَيَعُولُ اور قِيَامٌ بروزن فَيَعَالُ سے جیسے دَيُّونٌ وَدَيَّانٌ۔

الْقِيَامَةُ: سے مراد وہ ساعت (گھڑی) ہے۔ جس کا ذکر کہ ﴿وَيَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ﴾ (۳۰-۳۶) اور جس روز قیامت برپا ہوگی۔

﴿يَوْمَ يَقُومُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ﴾ (۸۳-۶) جس دن تمام لوگ رب العالمین کے سامنے کھڑے ہوں گے۔

﴿وَمَا أَظُنُّ السَّاعَةَ قَائِمَةً﴾ (۱۸-۳۶) اور نہ خیال کرتا ہوں کہ قیامت برپا ہو۔

و غیرہا آیات میں پایا جاتا ہے۔ اصل میں قیامت کے معنی انسان کے یکبارگی قیام یعنی کھڑا ہونے کے ہیں اور قیامت کے یکبارگی وقوع پذیر ہونے پر تنبیہ کرنے کے لیے



﴿وَمَا مِنَّا إِلَّا لَهُ مَقَامٌ مَّعْلُومٌ﴾ (۱۶۴-۳۷) ہم میں سے ہر ایک کا ایک مقرر مقام ہے۔

اور آیت کریمہ:

﴿أَنَا آتِيكَ بِهِ قَبْلَ أَنْ تَقُومَ مِنْ مَقَامِكَ﴾ (۳۹-۲۷) قبل اس کے کہ آپ اپنی جگہ سے اٹھیں، میں اس کو آپ کے پاس حاضر کرتا ہوں۔

کی تفسیر میں انفس نے کہا ہے کہ یہاں مقام بمعنی مقعد یعنی نشستگاہ کے ہیں۔ اگر انفس کا مقصد اس سے یہ ہے کہ مقام اور مقعد بالذات ایک ہی چیز کے دو نام ہیں صرف نسبت الی الفاعل کے لحاظ سے دونوں میں فرق پایا جاتا (یعنی ایک ہی جگہ کو کسی شخص کے وہاں کھڑے ہونے کے لحاظ سے مقام اور بیٹھنے کے اعتبار سے مقعد کہا جاتا ہے جس طرح کہ صَعُودٌ اور حَذُورٌ کے الفاظ ہیں) کہ ایک ہی جگہ کو اوپر چڑھنے کے لحاظ سے صَعُودٌ اور اس سے نیچے اترنے کے لحاظ سے حَذُورٌ کہا جاتا ہے) تو یہ بجا ہے اور اگر ان کا مقصد یہ ہے کہ لغت میں مقام بمعنی مقعد آتا ہے تو یہ صحیح نہیں ہے۔ اور بعض نے المقامة کے معنی جماعت بھی کیے ہیں۔ چنانچہ شاعر نے کہا ہے ۵

(الطویل)

(۳۶۲) وَفِيهِمْ مَقَامَاتٌ حِسَانٌ وَجُوهُهُمْ

اور ان میں خوب روگوں کی جماعتیں ہیں..... مگر یہ بھی دراصل ظرف مکان ہے اگرچہ (مجازاً) اصحاب مقام مراد

لفظ قیام کے آخر میں ہاء (ة) کا اضافہ کیا گیا ہے۔ ۱  
الْمَقَامُ: یہ قیام سے کبھی بطور مصدر میسی اور کبھی بطور ظرف مکان اور ظرف زمان کے استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿إِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكُمْ مَقَامِي وَتَذَكَّرِي﴾ (۱۰-۷۱) اگر تم کو میرا رہنا اور..... نصیحت کرنا ناگوار ہو۔

﴿وَذَلِكَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِي وَخَافَ وَعِيدِ﴾ (۱۴-۱۳) یہ اس شخص کے لیے ہے جو قیامت کے روز میرے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرے۔ ﴿وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ﴾ (۵۵-۶۳) اور جو شخص اپنے پروردگار کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرا۔ ﴿وَ اتَّخَذُوا مِنْ مَقَامِ إِبْرَاهِيمَ مُصَلًّى﴾ (۲-۱۲۵) اور حکم دیا کہ جس مقام پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کھڑے ہوئے اس کو نماز کی جگہ بنا لو۔

﴿فِيهِ آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ مَقَامِ إِبْرَاهِيمَ﴾ (۳-۹۷) اس میں کھلی ہوئی نشانیاں ہیں جن میں سے ایک ابراہیم علیہ السلام کے کھڑے ہونے کی جگہ ہے۔

﴿وَزُرُوعٌ وَمَقَامٌ كَرِيمٌ﴾ (۳۳-۲۶) اور کھیتیاں اور نفیس مکان۔

﴿إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي مَقَامٍ آمِنٍ﴾ (۳۳-۱۵) بے شک پرہیزگار لوگ امن کے مقام میں ہوں گے۔

﴿خَيْرٌ مَقَامًا وَأَحْسَنُ نَدِيًّا﴾ (۱۹-۷۳) مکان کس کے اچھے اور مجلس کس کی بہتر ہیں۔

۱ ولذا عبر عن اتيا نها بلفظ بغة راجع (۶-۳) (۷-۱۸۷) (۲۱-۴۰) (۲۲-۵۰) (۴۳-۶۶) (۴۷-۱۸)۔

۲ قاله زهير يمدح سنان بن الحارثه وتماحه: واندية بنتاها القول والفعل- والبيت في ديوانه مع شرح الاعلام الشنتمري- رطبعه لندن و شواهد الكشاف (۹۰) والعمدة (۲: ۱۳۴) والصناعتين (۱۰۲) ومختار الشعر الجاهلي (۱: ۱۶۳) ونقد الشعر ۳۳ في سبعة ابواب والبحر المحيط (۵/ ۸۸) (۸/ ۸۹۱) والعقد الثمين ۹۱ والعقد الفريد (۱: ۳۸۸) والسيوطي (۱۰۸)۔

﴿فَاسْتَقِيمُوا إِلَيْهِ﴾ (۲۱-۶) تو سیدھے اس کی طرف متوجہ ہو۔

إِلَاقَامَةُ: (افعال) فی المكان کے معنی کسی جگہ پر ٹھہرنے اور قیام کرنے کے ہیں اور اقامَةُ الشَّيْءِ: (کسی چیز کی اقامت) کے معنی اس کا پورا پورا حق ادا کرنے کے ہوتے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے: ﴿قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَسْتُمْ عَلَى شَيْءٍ حَتَّى تُقِيمُوا التَّوْرَةَ وَالْإِنْجِيلَ﴾ (۵-۲۸) کہو کہ اے اہل کتاب! جب تک تم توراۃ اور انجیل..... کو قائم نہ رکھو گے کچھ بھی راہ پر نہیں سکتے۔ یعنی جب تک کہ علم و عمل سے ان کے پورے حقوق ادا نہ کرو۔ اسی طرح فرمایا:

﴿وَلَوْ أَنَّهُمْ أَقَامُوا التَّوْرَةَ وَالْإِنْجِيلَ﴾ (۵-۲۶) اور اگر وہ توراۃ اور انجیل کو..... قائم رکھتے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک میں جہاں کہیں نماز پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ یا نمازیوں کی تعریف کی گئی ہے۔ وہاں اقامۃ کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے۔ جس میں اس بات پر تنبیہ کرنا ہے کہ نماز سے مقصود محض اس کی ظاہری ہیئت کا ادا کرنا ہی نہیں ہے بلکہ اسے جملہ شرائط کے ساتھ ادا کرنا مراد ہے اسی بنا پر کئی ایک مقام پر آقِيمُوا الصَّلَاةَ اور الْمُقِيمِينَ الصَّلَاةَ کہا ہے ﴿اور آیت کریمہ:

ہیں جس طرح کہ ﴿(اکال)

(۳۶۷) وَاسْتَبَّ بَعْدَكَ يَا كُتَيْبُ الْمَجْلِسُ

اے کلب! تیرے بعد لوگ ایک دوسرے کو گالیاں دینے لگے ہیں۔

الِاسْتِقَامَةُ: (استفعال) کے معنی راستہ کے خط مستقیم کی طرح سیدھا ہونے کے ہیں اور تنبیہ کے طور پر راہ حق کو بھی..... صراط مستقیم کہا گیا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ﴾ (۱-۵) ہم کو سیدھے راستے پر چلا۔

﴿وَإِنَّ هَذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ﴾ (۶-۱۵۳) اور یہ کہ میرا سیدھا راستہ یہی ہے۔

﴿إِنَّ رَبِّي عَلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ﴾ (۱۱-۵۶) بے شک میرا پروردگار سیدھے راستے پر ہے۔

اور کسی انسان کی استقامت کے معنی سیدھی راہ پر چلنے اور اس پر ثابت قدم رہنے کے ہوتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا:

﴿إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا﴾ (۴۱-۳۰) جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا پروردگار خدا ہے پھر وہ اس پر قائم رہے۔

﴿فَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ﴾ (۱۱۲-۱۱) سو (اے پیغمبر)

جیسا کہ تم کو حکم ہوتا ہے اس پر..... قائم رہو۔

① قاله مهلهل بن ربيعة يرثي اخاه كليباً وصدره كما في امالي القالي (۹۵: ۱) نبئت ان التار بعدك اوقدت والشرط في محاسن ثعلب ۳۷ واليت في الحماسة مع المرزوقي رقم ۳۱۵ والمختارات ۶۲ واللالی ۲۹۸ وفيها صدره برواية ابن السكيت، ذهب الخيار من المعاصر كلهم واليت في الحصري (۱۷۹: ۲/۶۳/۴) في ثلاثة وفي الصنائع (۲۰۳) والمحاسن (۵۸۴) وامالي ابن التجرى (۵۲: ۱) اودى بدل ذهب في خمسة واليت ايضا في البحر (۱۱۳: ۱) ومحاضرات المؤلف (۴۰: ۲/۷۵: ۱) وانظر القصة (۳۰۱/۱) والعقد في ايام العرب والاغاني (۱۵۱-۱۳۹: ۴)

② الآية ۳۵ من سورة الحج هذه قراءة ابن مسعود وبحذف النون والاضافة قراءة ابى عمرو وابن ابى اسحاق والحذف النون ونصب الصلوة راجع ابو حبان (۳۶۹: ۶)

اور آیت کریمہ:

﴿لَا مَقَامَ لَكُمْ فَارْجِعُوا﴾ (۱۳-۳۳) یہاں تمہارے لیے (ٹھہرنے کا) مقام نہیں ہے تو لوٹ چلو۔

میں مقام کا لفظ قیام سے ہے یعنی تمہارا کوئی ٹھکانا نہیں ہے اور ایک قرأت میں مَقَامٌ (بضم المیم) اَقَام سے ہے اور کبھی اَقَامَۃ سے معنی دوام مراد لیا جاتا ہے۔ جیسے فرمایا ﴿عَذَابٌ مُّقِيمٌ﴾ (۵-۳۷) ہمیشہ کا عذاب۔ اور ایک قرأت میں آیت کریمہ:

﴿إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي مَقَامٍ أَمِينٍ﴾ (۴۳-۵۱) بے شک پرہیزگار لوگ امن کے مقام میں ہوں گے۔ مقام بضم میم ہے۔ یعنی ایسی جگہ جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔

تَقْوِيمُ الشَّيْءِ کے معنی کسی چیز کو سیدھا کرنے کے ہیں۔ چنانچہ فرمایا:

﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ﴾ (۹۵-۵) کہ ہم نے انسان کو بہت اچھی صورت میں پیدا کیا۔

اس میں انسان کے عقل و فہم قد و قامت کی راستی اور دیگر صفات کی طرف اشارہ ہے جن کے ذریعہ انسان دوسرے حیوانات سے ممتاز ہوتا ہے اور وہ اس کے تمام عالم پر مستولی اور غالب ہونے کی دلیل بنتی ہیں۔

تَقْوِيمُ السِّلْعَةِ: سامان کی قیمت لگانا۔ الْقَوْمُ: یہ اصل میں صرف مردوں کی جماعت پر بولا جاتا ہے جس میں عورتیں شامل نہ ہوں۔ چنانچہ فرمایا:

﴿لَا يَسْخَرُ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ﴾ (۳۹-۱۱) کوئی قوم کسی قوم سے تمسخر نہ کرے۔

﴿وَإِذَا قَامُوا إِلَى الصَّلَاةِ قَامُوا كُتَالًا﴾

(۱۴۲-۴) اور جب یہ نماز کو کھڑے ہوتے ہیں تو سست اور کاہل ہو کر۔

میں قَامُوا، اِقَامَۃ سے نہیں بلکہ قیام سے مشتق ہے (جس کے معنی عزم اور ارادہ کے ہیں) اور آیت: ﴿رَبِّ اجْعَلْنِي مُقِيمَ الصَّلَاةِ﴾ (۱۳-۴۰) پروردگار! مجھ کو (ایسی توفیق عنایت) کر کہ نماز پڑھتا رہوں۔

میں دعا ہے کہ الہی! مجھے نماز کو پورے حقوق کے ساتھ ادا کرنے کی توفیق عطا فرما۔ اور آیت کریمہ: ﴿فَإِنْ تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ﴾ (۹-۵) پھر اگر وہ توبہ کر لیں اور نماز پڑھنے لگیں۔

کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ یہاں اقامۃ سے نماز کا ادا کرنا مراد نہیں ہے بلکہ اس کے معنی اس کی فرضیت کا اقرار کرنے کے ہیں۔

الْمُقَامُ: یہ مصدر میمی، ظرف مکان، ظرف زمان اور اسم مفعول کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ لیکن قرآن پاک میں صرف مصدر میمی کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿إِنَّهَا سَاءَتْ مُسْتَقَرًّا وَمُقَامًا﴾ (۲۵-۶۶) اور دوزخ ٹھہرنے اور رہنے کی بہت بری جگہ ہے۔

اور مقامۃ (بضم المیم) بمعنی اقامۃ ہے جیسے فرمایا۔

﴿الَّذِي أَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ مِنْ فَضْلِهِ﴾ (۳۵-۳۵) جس نے ہم کو اپنے فضل سے ہمیشہ کے رہنے کے گھر میں اتارا یہاں جنت کو دَارُ الْمُقَامَةِ کہا ہے جس طرح کہ اسے دَارُ الْخُلْدِ اور جَنَاتِ عَدْنِ کہا ہے۔

چیزیں مراد ہوتی ہیں اور کبھی قوت بمعنی قدرت الہیہ کے آتا ہے چنانچہ بدنی قوت کے متعلق فرمایا:

﴿مَنْ أَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً﴾ (۱۵-۲۱) ہم سے بڑھ کر قوت میں کون ہے۔

﴿فَاعِينُونِي بِقُوَّةٍ﴾ (۹۵-۱۸) تم مجھے قوت (بازو) سے مدد دو۔

یہاں قوت سے بدنی قوت مراد ہے۔ کیونکہ انہوں نے خارجی مدد کی پیش کش کو مامکنیٰ فیہ ربیٰ خیر کہہ کر ٹھکرا دیا تھا اور قوت قلبی کے متعلق فرمایا:

﴿يَا حَيُّ خُذِ الْكِتَابَ بِقُوَّةٍ﴾ (۱۲-۱۹) اے بیک!

ہماری کتاب کو زور سے پکڑے رہو۔

یعنی پورے عزم اور حوصلہ کے ساتھ کتاب الہی پر عمل کرو اور خارجی معاون کے معنی میں فرمایا: ﴿لَوْ أَنَّ لِي بِكُمْ قُوَّةً﴾ (۸۰-۱۱) اگر مجھ میں تمہارے مقابلے کی طاقت ہوگی۔

چنانچہ بعض نے اس جگہ قوت سے فوجی یا مالی طاقت مراد لی ہے۔ نیز فرمایا:

﴿نَحْنُ أَوْلُوا قُوَّةً وَأَوْلُوا بِأَسِيسٍ شَدِيدٍ﴾ (۳۳-۲۷)

ہم بڑے زور آور اور سخت جنگجو ہیں۔ اور قوت بمعنی قدرت الہیہ کے متعلق فرمایا:

اور شاعر نے کہا ہے: (الوافر)

(۳۶۸) أَقْوَمُ آلُ حِصْنٍ أَمْ نِسَاءٌ كَهَ آلِ حِصْنٍ مَرْدٍ

ہیں یا عورتیں؟

اور قرآن پاک میں عموماً مرد و عورتیں کبھی مراد لیے گئے ہیں لیکن اصل میں یہ مردوں کی جماعت پر بولا جاتا ہے جس پر کہ آیت۔

﴿الرَّجَالُ قَوْمٌ عَلَى النِّسَاءِ﴾ (۳۴-۴) مرد عورتوں پر راعی اور حاکم ہیں۔

میں (بھی) تنبیہ پائی جاتی ہے۔

(ق و)

الْقُوَّةُ: یہ کبھی قدرت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جیسے فرمایا:

﴿خُذُوا مَا آتَيْنَكُمْ بِقُوَّةٍ﴾ (۶۳-۲) اور حکم دیا کہ جو کتاب ہم نے تم کو دی اس کو زور سے پکڑے رہو۔

اور کبھی قوت بمعنی استعداد اور صلاحیت کے آتا ہے جو کسی چیز کے اندر پائی جاتی ہے جیسے کہا جاتا ہے کہ نُوۃ (یعنی کھجور کی گٹھلی) بِالْقُوَّةِ کھجور کا درخت ہے یعنی اس میں کھجور کا درخت بننے کی صلاحیت پائی جاتی ہے۔

اور کبھی قوت بدنی کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔

اور کبھی قوت قلبی کے لیے اور کبھی کبھی خارجی معاون

① قاله زبير بن ابی سلمیٰ هجاء بيت من كلب من بنی سليم في قصيدة له مطلعها: عنا من آل فاطمة الجواثر۔ فيمن فالقوادم فالهساء راجع اللسان (حصن) وديوانه (۱۵۹) مع شرح الاعلام الشنمري وشواهد الكشاف ۶ مختار الشعر الجاهلي (۱۹۵: ۱) والبحر المحيط (۵: ۸۳/ ۱۱۲) والطبري (۲۶: ۹۳) والعمدة (۲: ۶۶) في باب التشكك (۱۷۱) وابن هشام رقم ۵۵، ۲۳۹ العجز والعقد الثمين (۷۷) وامالي ابن الشجري (۲: ۳۳۴) (۱: ۲۲۶) والصاحبي ۱۸۹ والمعاهد (۲: ۵۲) والمعاني الكبير (۵۹۳) والسيوطي (۴۸، ۱۴۱) وفي صنعة تحاهل العارف انظر قانون البلاغة (۴۵۹) في ضمن رسائل البغاة

② وفي الكشاف القوم الرجال خاصة لانهم القوام بامور النساء قال الله تعالى ﴿الرجال قوامون على النساء﴾ ص ۱۵۳ ج ۳ قال في الطبري (۲۶/ ۹۳): وهو قول الخليل۔

جنہیں وہ تعلیم دیتا ہے وہ بہت بڑی قوت اور قدرت عظیم کا مالک ہے۔

قوت بمعنی استعداد و صلاحیت عام طور پر علمائے فلاسفہ استعمال کرتے ہیں اور ان کے نزدیک اس کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ ایک شخص میں صلاحیت موجود ہو لیکن وہ بالفعل اسے استعمال نہ کر رہا ہو جیسے فُلَانٌ كَاتِبٌ بِالْقُوَّةِ (فلاں کاتب بالقوہ ہے) یعنی وہ لکھتا تو جانتا ہے لیکن اس وقت بالفعل لکھنے میں مشغول نہیں ہے اور دوسرے معنی فُلَانٌ كَاتِبٌ بِالْقُوَّةِ کے یہ ہوتے ہیں کہ اس میں کتابت سیکھنے کی صلاحیت ہے۔ نہ کہ وہ فن کتابت جانتا ہے۔

مَفَازَةٌ: یعنی ریگستان کو قِوَاءُ کہا جاتا ہے اور اَفْوَى الرَّجُلُ کے معنی کسی آدمی کے قِوَاءِ یعنی بیابان میں چلے جانے کے ہیں۔ پھر فَقْرٌ یعنی بیابان سے فَقْرٌ کا معنی لے کر اَفْوَى الرَّجُلُ کا محاورہ افقر یعنی محتاج اور نادار کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ آیت کریمہ:

﴿وَمَتَاعًا لِلْمُقْوِينَ﴾ (۵۲-۷۳) اور محتاج ضرورت مندوں کے لیے سامان آسائش بنایا ہے۔ میں مُقْوِينَ کا لفظ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔

### (ق ی ض)

الْقَيْضُ کے معنی انڈے کے اوپر کا چھلکا کے ہیں اور چھلکا چونکہ اس کے باقی ماندہ اجزاء پر محیط اور مستولی ہوتا ہے لہذا اس سے قَيْضُ (فعل) کسی چیز پر غالب اور مستولی ہونے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:-

﴿إِنَّ اللَّهَ قَوِيٌّ عَزِيزٌ﴾ (۲۵-۵۷) بے شک خدا قوی (اور) غالب ہے۔

﴿وَكَانَ اللَّهُ قَوِيًّا عَزِيزًا﴾ (۲۵-۳۳) اور خدا طاقت ور اور زبردست ہے۔

اور آیت کریمہ:  
﴿إِنَّ اللَّهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِينُ﴾ (۵۸-۵۱) خدا ہی تو رزق دینے والا زور آور اور مضبوط ہے۔

میں قوت کا لفظ عام معنی میں استعمال ہوا ہے۔ یعنی یہ قدرت الہی اور اس قدرت کو بھی شامل ہے جو اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو عطا کی ہے اور آیات کریمہ ﴿وَيَزِدْكُمْ قُوَّةً إِلَى قُوَّتِكُمْ﴾ (۵۲-۱۱) اور تمہاری طاقت پر طاقت بڑھائے گا۔

میں اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کو ان کی استعداد کے مطابق قسم قسم کی قوت عطا کرنے کا وعدہ فرمایا ہے اور آیت:  
﴿ذِي قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِينٍ﴾ (۲۰-۸۱) جو صاحب قوت، مالک عرش کے ہاں اونچے درجے والا۔ میں ذِي قُوَّةٍ سے حضرت جبریل علیہ السلام مراد ہیں اور اسے لفظ مفرد اور نکرہ کے ساتھ ذِي قُوَّةٍ کہنے سے اس بات پر تنبیہ مقصود ہے کہ مثلاً اَعْلَى کے لحاظ سے اس کی قوت کم درجہ کی ہے۔ اور پھر آیت کریمہ:

﴿عَلَّمَهُ شَدِيدُ الْقُوَى﴾ (۵۳-۵) ان کو نہایت قوت والے نے سکھلایا۔

میں ان کو جمع معرف بلاں الجنس کے ساتھ متصف کر کے اس بات پر تنبیہ کی ہے کہ عالم سفلی اور اہل دنیا کے لحاظ

۱ اقوی من الاضداد (ابو الطیب ۵۶۹) ويحتمل ان يكون من اقوى الرجل اذا حصل في القواء الى المفازة ۲۔

الْفَحْلُ النَّاقَةُ کا محاورہ مستعار ہے جس کے معنی نراونٹ کے ناقہ کے ساتھ جفتی کرنے (اور پوری طرح سوار ہو کر اس پر بیٹھ جانے) کے ہیں۔

### (ق ی ل)

الْمَقِيلُ: مقام استراحت چنانچہ آیت کریمہ: ﴿أَصْحَابُ الْجَنَّةِ يَوْمَئِذٍ خَيْرٌ مُّسْتَقَرًّا وَأَحْسَنُ مَقِيلًا﴾ (۲۴-۲۵) اس دن اہل جنت کا ٹھکانا بھی بہتر ہوگا اور مقام استراحت بھی عمدہ ہوگا۔

میں مَقِيلًا قُلْتُ قِيلُولَةً کا مصدر ہے جس کے معنی دوپہر کے وقت استراحت کے لیے لیٹنے کے ہیں اور یا ظرف مکان ہے یعنی قیلولہ کی جگہ ۱ محاورہ ہے: قِيلُولُهُ فِي السَّبْعِ وَأَقْلَلْتُهُ وَتَقْلِيلًا: بیع فسخ کرنا۔



قَيْضًا لَهُمْ قُرْنَاءَ اور ہم نے شیطانوں کو ہم نشین مقرر کر دیا ہے اسی طرح آیت کریمہ: ﴿وَمَنْ يَغْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمَنِ نُقِيضُ لَهُ شَيْطَانًا﴾ (۳۶-۳۷) اور جو کوئی خدا کی یاد سے آنکھیں بند کر لے (یعنی تغافل کرے) ہم اس پر ایک شیطان مقرر کر دیتے ہیں۔

میں نُقِيضُ لَهُ شَيْطَانًا کے معنی یہ ہیں کہ ہم اس سے الگ ہو جاتے ہیں تاکہ شیطان اس پر اس طرح مسلط ہو جائے جیسے انڈے کا اوپر کا چھلکا اپنے مآ فیہا پر مستولی رہتا ہے۔

### (ق ی ع)

الْقَيْعَةُ: ہموار میدان۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿كَسْرَابٍ بِقَيْعَةٍ﴾ (۳۹-۴۰) جیسے میدان میں ریت الْقَيْعُ وَالْقَاعُ کے معنی ہموار زمین کے ہیں۔ اس کی جمع قَيْعَانٌ اور تَصْغِيرُ قُوْنِعٌ آتی ہے اور اسی سے قَاعٌ

۱ القیلولہ وزنہ فیعلولہ ویختص بذوات البیاء مثل سار سیر ورة وحاد حیدودة الاربعة احرف من ذوات الواوھی: کینونة و دیومة هیعومة و سیدودة راجع ادب الکاتب (۴۹۶) ومن القیلولة قوله تعالیٰ: ﴿اوهم قائلون (۷-۴)﴾

## کتاب الکاف

### (ک حرف)

آمیزش ہوگی۔

اور کبھی اس کا اطلاق خالی پیالہ یا صرف پینے کی چیز پر ہوتا ہے۔ مثلاً

شَرِبْتُ كَأْسًا: میں نے شراب کا پیالہ پیا۔

كَأْسٌ طَيِّبَةٌ: عمدہ شراب۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَكَأْسٍ مِّنْ مَّعِينٍ﴾ (۵۶-۱۸) اور صاف شراب

کے گلاس۔ كَأْسَتِ النَّاقَةُ تَكْوُسُ: اونٹنی کا تین پاؤں

پر چلنا اور الْكَيْسُ کے معنی دانائی اور زیرکی کے ہیں اور

أَكْأَسَ الرَّجُلُ وَأَكْيَسَ کے معنی غدر یعنی بد عہدی

بھی آتے ہیں کیونکہ اس میں زیرکی سے کام لیا جاتا ہے۔

اور یا اس لیے کہ كَيْسَان نامی ایک شخص تھا جو بے وفائی

میں ضرب المثل تھا پھر ہر غدار کو كَيْسَان کہا جانے لگا۔

جیسا کہ هَالِكِي اصل میں ایک مشہور آہنگر کا نام تھا پھر

ہر حداد یعنی آہنگر پر هَالِكِي کا لفظ بولا جانا لگا ہے۔

### (ک ب ب)

الْكَبُ (ن) کے معنی کسی کو منہ کے بل گرانے

کے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَكَبَّتْ وَجُوهُهُمْ فِي النَّارِ﴾ (۲۷-۹۰) تو ایسے

لوگ اوندھے منہ دوزخ میں ڈال دیئے جائیں گے

الْاِكْبَابُ: کسی چیز پر منہ کے بل گر جانا (اور کنایہ از ہمتن

مشغول شدن در کارے) اسی سے قرآن پاک میں ہے۔

الکاف: حروف بجا سے ہے۔ اور تشبیہ یا

تمثیل کے معنی ظاہر کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَمَثَلُهُ كَمَثَلِ صَفْوَانَ عَلَيْهِ تُرَابٌ﴾ (۲-۲۶۴)

تو اس (کے مال) کی مثال اس چٹان کی سی ہے۔ جس پر

تھوڑی سی مٹی ہو۔

اور آیت کریمہ:

﴿كَأَلَذَىٰ مَالَهُ رِثَاءَ النَّاسِ﴾ (۲-۲۶۴)

اس شخص کی طرح جو لوگوں کو دکھاوے کے لیے مال خرچ

کرتا ہے۔

میں کاف تشبیہ کے لیے نہیں ہے بلکہ تمثیل کے معنی پر محمول

ہے۔ جیسا کہ علماء نحو کہتے ہیں۔ فَالْاِسْمُ كَقَوْلِكَ زَيْدٌ

یعنی اسم کی مثال جیسے زید تو یہاں بھی کاف تمثیل کے لیے

ہے۔ پھر تمثیل، تشبیہ سے عام ہے۔ کیونکہ ہر تمثیل کو تشبیہ

کہہ سکتے ہیں لیکن ہر تشبیہ تمثیل نہیں ہو سکتی۔ ۱

### (ک و س)

الْكَأْسُ: پینے کا برتن۔ جب کہ اس میں پینے

کی چیز موجود ہو۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿مِنْ كَأْسٍ كَانَ مِزَاجُهَا كَافُورًا﴾ (۷۶-۵)

اور ایسی شراب نوش جان کریں گے جس میں کافور کی

واپس کر دینا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿كُتِبُوا كَمَا كُتِبَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ﴾ (۵۸-۵)  
وہ اسی طرح ذیل کیے جائیں گے جس طرح ان سے پہلے  
لوگ ذیل کیے گئے تھے۔

﴿لَيَقْطَعَ طَرَفًا مِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَوْ يَكْتَسِبُهُمْ  
فَيَنْقَلِبُوا خَآئِبِينَ﴾ (۱۲۷-۳) (یہ خدا نے) اس لیے  
(کیا) کہ کافروں کی ایک جماعت کو ہلاک، یا انہیں ذلیل  
و مغلوب کر دے کہ (جیسے آئے تھے ویسے ہی) ناکام  
واپس جائیں۔

### (ک ب د)

الْكَبِدُ: جگر کو کہتے ہیں۔ اور الْكَبْدُ  
وَالْكِبَادُ کے معنی درد جگر کے ہیں اور الْكَبْدُ (مصدر)  
کے معنی جگر پر مارنے کے ہیں اس سے كَبِدْتُ الرَّجُلَ  
(س) کا محاورہ ہے۔ یعنی جگر پر مارنا۔ پھر انسان کا جگر  
چونکہ وسط جسم میں ہوتا ہے۔ اس لیے تشبیہ کے طور پر وسط  
آسمان کو كَبِدُ السَّمَاءِ کہا جاتا ہے۔  
تَكَبَّدَتِ الشَّمْسُ: (آفتاب کا وسط آسمان میں پہنچنا)  
نیز الْكَبْدُ کے معنی مشقت بھی آتے ہیں۔

چنانچہ آیت کریمہ۔

﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي كَبَدٍ﴾ (۹۰-۴) کہ ہم

نے انسان کو تکلیف (کی حالت) میں (رہنے والا) بنایا  
ہے۔

میں متنبہ کیا ہے انسان کی ساخت ہی اللہ تعالیٰ نے کچھ اس  
قسم کی بنائی ہے کہ جب تک (دین کی) گھاٹی پر ہو کر نہ  
گزرے وہ نہ تورنخ و مشقت سے نجات پاسکتا ہے۔ اور  
نہ ہی اسے (حقیقی) چین نصیب ہو سکتا ہے جیسا کہ دوسری

﴿أَفَمَنْ يَمْشِي مُكِبًّا عَلَى وَجْهِهِ أَهْدَىٰ﴾

(۶۷-۲۲) بھلا جو شخص چلتا ہوا منہ کے بل گر کر پڑتا ہو۔  
وہ سیدھے رستے پر ہے۔ یعنی جو غلط روش پر چلتا ہے۔  
الْكَبْكَبَةُ: کسی چیز کو اوپر سے لڑھکا کر گڑھے میں پھینک  
دینا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَكَبَّ كَبْسُهَا فِيهَا وَالْعَاوُونَ﴾ (۹۶-۹۴) تو وہ  
اور گمراہ (یعنی بت اور بت پرست) اوندھے منہ دوزخ  
میں ڈال دیئے جائیں گے۔

كَبَّ وَكَبْكَبَ (ثلاثی و رباعی دونوں طرح آتا ہے۔ مثل  
كَفَّ وَكَفَّكَفَ وَصَرَّ الرِّيحُ وَصَرَّصَرَ الْكَوَاكِبُ  
ظاہر ہونے والے ستارے، ستاروں کو کواکب اسی وقت کہا  
جاتا..... جب نمودار اور ظاہر ہوں۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ اللَّيْلُ رَأَى الْكُوكِبَاتِ﴾ (۶-۷۶)  
(یعنی) جب رات نے ان کو (پردہ تاریکی سے) ڈھانپ  
لیا (تو آسمان میں) ایک ستارہ نظر پڑا۔

﴿كَانَهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ﴾ (۳۵-۳۴) گویا وہ موتی کا  
ساجھتا ہوا تارا ہے۔

﴿إِنَّا زَيْنَا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِرَبْنَةٍ نِ الْكُوكِبِ﴾  
(۳۷-۶) بے شک ہم نے آسمان دنیا کو ستاروں کی  
زینت سے مزین کیا۔

﴿وَإِذَا الْكُوكِبَاتُ انشَرَّتْ﴾ (۸۲-۲) اور جب  
(آسمان کے) ستارے جھڑ پڑیں گے۔

محاورہ ہے۔ ذَهَبُوا تَحْتَ كُلِّ كَوْكَبٍ: وہ منتشر ہو  
گئے۔ كَوْكَبُ الْعُسْكَرِ لشکر میں اسلحہ کی چمک

### (ک ب ت)

الْكُبْتُ: (ض) کسی کو سختی اور ذلت کے ساتھ



الْعُمُرَةُ هِيَ الْحَجُّ الْأَصْغَرُ۔ کہ عمرہ حج اصغر ہے۔  
اور کبھی بڑائی بلحاظ زمانہ مراد ہوتی ہے چنانچہ محاورہ ہے۔  
فُلَانٌ كَبِيرٌ کہ فلاں سن رسیدہ ہے اور قرآن پاک میں  
ہے۔

﴿وَمَا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ أَحَدُهُمَا﴾ (۲۳-۱۷)  
اگر ان میں سے ایک تمہارے سامنے بڑھاپے کو پہنچ  
جائے۔

﴿وَأَصَابَهُ الْكِبَرُ﴾ (۲-۲۶۶) اور اسے بڑھاپا  
پکڑے۔

﴿وَقَدْ بَلَغَنِيَ الْكِبَرُ﴾ (۳-۳۰) کہ میں تو بوڑھا ہو  
گیا ہوں۔

اور کبھی بڑائی بلحاظ مرتبہ اور رفعت کے ملحوظ ہوتی ہے چنانچہ  
قرآن پاک میں ہے:

﴿قُلْ أَيُّ شَيْءٍ أَكْبَرُ شَهَادَةً قُلِ اللَّهُ شَهِيدٌ  
بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ﴾ (۶-۱۹) ان سے پوچھو کہ سب سے  
بڑھ کر (قرین انصاف) کس کی شہادت ہے۔ کہہ دو کہ خدا  
ہی مجھ میں اور تم میں گواہ ہے۔

﴿الْكَبِيرُ الْمُتَعَالِ﴾ (۱۳-۹) سب سے بزرگ (اور  
عالی رتبہ ہے۔

اور آیت: ﴿فَجَعَلَهُمْ جُودًا إِلَّا كَبِيرًا لَهُمْ﴾  
(۲۱-۵۸) پس ان کو توڑ کر ریزہ ریزہ کر دیا مگر ایک  
بڑے (بت) کو (نہ توڑا)

میں صنم کو کبیر کہنا اس کی حقیقی قدر و منزلت کے لحاظ سے  
نہیں ہے۔ بلکہ ان کے اعتقاد کی بنیاد پر ہے۔ اور آیت۔

﴿بَلْ فَعَلَهُ كَبِيرُهُمْ هَذَا﴾ (۲۱-۶۳) بلکہ یہ ان کے  
بڑے (بت) نے کیا (ہوگا) بھی اس معنی پر محمول ہے۔

جگہ فرمایا: ﴿لَتَسْرُكُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ﴾ (۸۳-۱۹)  
کہ تم درجہ بدرجہ (رتبہ اعلیٰ پر) چڑھو گے۔

## (ک ب ر)

کبیر اور صغیر اسمائے اضافیہ سے ہیں۔ جن کے  
معانی ایک دوسرے کے لحاظ سے متعین ہوتے ہیں۔  
چنانچہ ایک ہی چیز دوسری کے مقابلہ میں صغیر ہوتی ہے۔  
لیکن وہی شے ایک اور کے مقابلہ میں کبیر کہلاتی ہے۔ اور  
قلیل و کثیر کی طرح کبھی تو ان کا استعمال کیت متصل یعنی  
اجسام میں ہوتا ہے۔ اور کبھی کمیۃ منفصلہ یعنی عدد میں۔  
اور بعض اوقات کثیر اور کبیر دو مختلف جہتوں کے لحاظ سے  
ایک ہی چیز پر بولے جاتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا۔

﴿قُلْ فِيهِمَا إِنْ كَبِيرٌ﴾ (۲-۲۱۹) کہہ دو کہ ان میں  
نقصان بڑے ہیں۔

کہ اس میں ایک قرأت کثیر بھی ہے۔  
یہ اصل وضع کے لحاظ سے تو اعیان میں ہی استعمال ہوتے  
ہیں۔ لیکن استعارہ کے طور پر معانی پر بھی بولے جاتے  
ہیں۔ چنانچہ فرمایا:

﴿لَا يُغَادِرُ صَغِيرَةً وَلَا كَبِيرَةً إِلَّا أَحْصَاهَا﴾  
(۱۸-۳۹) کہ نہ چھوٹی بات کو چھوڑتی ہے۔ اور نہ بڑی کو

(کوئی بات بھی نہیں) مگر اسے گن رکھا ہے۔ ﴿وَلَا  
أَصْغَرَ مِنْ ذَلِكَ وَلَا أَكْبَرَ﴾ (۱۰-۶۱) اور نہ کوئی  
چیز اس سے چھوٹی ہے نہ بڑی۔

اور آیت کریمہ: ﴿يَوْمَ الْحَجِّ الْأَكْبَرِ﴾ (۹-۳) اور  
حج اکبر کے دن.....

میں حج کو اکبر کہہ کر متنبہ کیا ہے کہ عمرہ حج اصغر ہے۔ جیسا  
کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے۔

اور کسی جان کا ناحق قتل کرنا جیسا کہ فرمایا۔

اور آیت:

﴿وَإِنْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا كَانَتْ خَطَاً كَبِيرًا﴾ (۱۷-۳۱) کچھ شک نہیں کہ ان کا مار ڈالنا بڑا سخت گناہ ہے۔ ﴿قُلْ فِيهِمَا أَنتُمْ كَبِيرٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَإِنَّهُمَا أَكْبَرُ مِنْ نَفْعِهِمَا﴾ (۲-۲۱۹) کہہ دو کہ ان میں نقصان بڑے ہیں اور لوگوں کے لیے کچھ فائدے بھی ہیں۔ مگر ان کے نقصان فائدوں سے زیادہ ہیں۔

﴿وَكَذَلِكَ جَعَلْنَا فِي كُلِّ قَرْيَةٍ أَكْبَرَ مُجْرِمِينَ﴾ (۶-۱۲۳) اور اسی طرح ہم نے ہر بستی میں بڑے بڑے مجرم پیدا کیے۔

میں اکابر سے وہاں کے رؤساء مراد ہیں اسی طرح آیت: ﴿إِنَّهُ لَكَبِيرُكُمْ الَّذِي عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ﴾ (۲۰-۷۱) بے شک وہ تمہارا بڑا (یعنی استاد) ہے جس نے تم کو جادو سکھایا۔

میں بھی کبیر بمعنی رئیس ہی ہے۔ اور اس معنی میں مشہور محاورہ ہے۔ وَرِثَهُ كَابِرًا عَنْ كَابِرٍ۔ یعنی یہ چیز اسے بلند مرتبہ آباؤ اجداد سے ورثہ میں حاصل ہوئی ہے۔

الْكَبِيرَةُ: عرف میں اس گناہ کو کہتے ہیں جس کی سزا بڑی سخت ہو۔ اس کی جمع الْكَبَائِرُ آتی ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔

﴿الَّذِينَ يَجْتَنِبُونَ كَبَائِرَ الْإِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ إِلَّا اللَّمَمَ﴾ (۵۳-۳۲) جو صغیرہ گناہوں کے سوا بڑے بڑے گناہوں اور بے حیائی کی باتوں سے اجتناب کرتے ہیں۔

اور آیت۔ ﴿وَإِنْ تَجْتَنِبُوا كَبَائِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ﴾ (۴-۳۱) اگر تم بڑے بڑے گناہوں سے جن سے تم کو منع کیا جاتا ہے، اجتناب رکھو۔

میں بعض نے کہا ہے۔ کہ کبائر سے مراد شرک ہے۔ کیونکہ دوسری آیت: ﴿إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ﴾ (۳۱-۱۳) شرک تو بڑا بھاری ظلم ہے۔

میں شرک کو ظلم عظیم کہا ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ کبائر کا لفظ۔ شرک اور تمام مہلک گناہوں کو شامل ہے۔ جیسے زنا

اور کبیرۃ اس عمل کو بھی کہتے ہیں جس میں مشقت اور صعوبت ہو۔ چنانچہ فرمایا۔ ﴿وَأَنَّهَا لَكَبِيرَةٌ إِلَّا عَلَى الْخَاشِعِينَ﴾ (۲-۳۵) بے شک نماز گراں ہے مگر ان لوگوں پر نہیں جو عجز کرنے والے ہیں۔

﴿كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِينَ مَا تَدْعُوهُمْ إِلَيْهِ﴾ (۴۲-۱۳) جس چیز کی طرف تم مشرکوں کو بلاتے ہو وہ ان کو دشوار گزرتی ہے۔

﴿وَإِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ إِعْرَاضُهُمْ﴾ (۲-۳۵) اور اگر ان کی روگردانی تم پر شاق گزرتی ہے اور آیت: ﴿كَبُرَتْ كَلِمَةً﴾ (۱۸-۵) (یہ) بڑی بات ہے۔

میں اس گناہ کے دوسرے گناہوں سے بڑا اور اس کی سزا کے سخت ہونے پر تنبیہ پائی جاتی ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللَّهِ﴾ خدا اس بات سے سخت بیزار ہے۔ (۲۱-۳۵) اور آیت۔

﴿وَالَّذِي تَوَلَّى كِبْرَهُ﴾ (۲۱-۳۵) اور جس نے ان میں سے اس بہتان کا بڑا بوجھ اٹھایا۔

میں تَوَلَّى كِبْرَهُ سے مراد وہ شخص ہے جس نے افک کا شاخسانہ کھڑا کیا تھا اور اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جو

شخص کسی بڑے طریقے کی بنیاد ڈالے اور لوگ اس پر عمل کریں تو وہ سب سے بڑھ کر گنہگار ہوگا۔ اور آیت -

﴿إِلَّا كِبَرُ مَا هُمْ بِبَالِغِهِ﴾ (۴۰-۵۶) (ارادہ) عظمت ہے اور اس کو پہنچنے والے نہیں۔

میں کِبَر کے معنی بھی تکبر ہی کے ہیں۔ اور بعض نے کہا ہے کہ اس سے ہر بڑا امر مراد ہے۔ اور یہ کبر بمعنی پیرانہ سالی سے ماخوذ ہے جیسا کہ آیت: ﴿وَالَّذِي تَوَلَّى كِبَرَهُ﴾ میں ہے۔ اور الْكِبَرُ وَالتَّكْبُرُ وَالْإِسْتِكْبَارُ کے معنی قریب قریب ایک ہی ہیں پس کبر وہ حالت ہے جس کے سبب سے انسان عجب میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اور عجب یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو دوسروں سے بڑا خیال کرے اور سب سے بڑا تکبر قبول حق سے انکار اور عبادت سے انحراف کر کے اللہ تعالیٰ پر تکبر کرنا ہے۔<sup>①</sup>

الْإِسْتِكْبَارُ: (استعجال) اس کا استعمال دو طرح پر ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ انسان بڑا بننے کا قصد کرے۔ اور یہ بات اگر منشاء شریعت کے مطابق اور بر محل ہو اور پھر ایسے موقع پر ہو۔ جس پر تکبر کرنا انسان کو سزاوار ہے تو محمود ہے۔ دوم یہ کہ انسان جھوٹ موٹ بڑائی کا اظہار کرے اور ایسے اوصاف کو اپنی طرف منسوب کرے جو اس میں موجود نہ ہوں۔ یہ مذموم ہے۔ اور قرآن پاک میں یہی دوسرا معنی مراد ہے۔ فرمایا۔

﴿أَبْلَىٰ وَاسْتَكْبَرَ﴾ (۳۴-۲) مگر شیطان نے انکار کیا اور غرور میں آ گیا۔

﴿أَفَكُلَّمَا جَاءَكُمْ رَسُولٌ بِمَا لَا تَهْوَىٰ

أَنفُسُكُمْ اسْتَكْبَرْتُمْ﴾ (۲-۸۷) تو جب کوئی پیغمبر تمہارے پالیسی باتیں لے آئے جن کو تمہارا جی نہیں چاہتا تھا۔ تم سرکش ہو جاتے رہے۔  
﴿وَأَصْرُوا وَاسْتَكْبَرُوا اسْتِكْبَارًا﴾ (۷۱-۷۷) اور اڑ گئے اور اکڑ بیٹھے۔

﴿اسْتِكْبَارًا فِي الْأَرْضِ﴾ (۳۵-۴۳) (یعنی) انہوں نے ملک میں غرور کرنا۔  
﴿فَاسْتَكْبَرُوا فِي الْأَرْضِ﴾ (۲۹-۳۹) تو وہ ملک میں مغرور ہو گئے۔

﴿تَسْتَكْبِرُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ﴾ (۴۶-۲۰) کہ تم زمین میں ناحق غرور کیا کرتے تھے۔  
﴿إِنَّ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَاسْتَكْبَرُوا عَنْهَا﴾ (۷۱-۴۰) جن لوگوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا اور ان سے سرتابی کی۔

﴿مَا آغْنَىٰ عَنْكُمْ جَمْعُكُمْ وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُونَ﴾ (۷۱-۲۸) (آج) نہ تو تمہاری جماعت ہی تمہارے کسی کام آئی۔ اور نہ ہی تمہارا تکبر سودمند ہوا۔ اور آیت کریمہ:

﴿فَيَقُولُ الضُّعَفَاءُ لِلَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا﴾ (۴۰-۴۷) تو ادنیٰ درجے کے لوگ بڑے آدمیوں سے کہیں گے، میں متکبرین کے مقابلہ میں ضعیفاء کا لفظ لانے سے اس بات پر تنبیہ کرنا مقصود ہے۔ کہ ان کا استکبار بدنی اور مالی قوت کے حاصل ہونے کی وجہ سے تھا۔ اسی طرح آیت -

① وفي الحديث الكبرياء تسفه الحق وتغمص الناس (الادب المفرد للبخاري) من رواية عبدالله بن عمرو بن العاص وقال علماء الاخلاق الكبير يكون بالمنزلة الرفيعة والعجب يكون بالفضيلة الماوروى بشرحه منهاج اليقين ۳۹۷

دوم یہ کہ کوئی شخص صفات کمال کا ادعاء کرے۔ لیکن فسی الواقع وہ صفات حسنہ سے عاری ہو اس معنی کے لحاظ سے یہ انسان کی صفت بن کر استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے:

﴿فَبَشِّرْهُ مَثْوًى الْمُتَكَبِّرِينَ﴾ (۷۶-۴۰) متکبروں کا کیا برا ٹھکانا ہے۔

﴿كَذَلِكَ يَطْبَعُ اللَّهُ عَلَى كُلِّ قَلْبٍ مُتَكَبِّرٍ﴾ (۳۵-۴۰) اسی طرح خدا ہر سرکش متکبر کے دل پر مہر لگا دیتا ہے۔

تو معنی اول کے لحاظ سے یہ صفات محمودہ میں داخل ہے اور معنی ثانی کے لحاظ سے صفت ذم ہے اور کبھی انسان کے لیے تکبر کرنا مذموم نہیں ہوتا جیسا کہ آیت:

﴿سَأَصْرِفُ عَنْ آيَتِيَ الَّذِينَ يَتَكَبَّرُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ﴾ (۷-۱۳۶) جو لوگ زمین میں ناحق غرور کرتے ہیں ان کو اپنی آیتوں سے پھیر دوں گا۔

سے معلوم ہوتا ہے کہ تکبر بغیر الحق نہ ہو تو مذموم نہیں ہے۔ اور آیت:

﴿عَلَى كُلِّ قَلْبٍ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٌ﴾ (۳۵-۴۰) ہر متکبر جابر کے دل پر، میں لفظ قلب متکبر کی طرف مضاف ہے۔ اور بعض نے قلب تنوین کے ساتھ پڑھا ہے اس صورت میں متکبر قلب کی صفت ہوگا۔

الْكِبَرِيَاءُ: اطاعت کیشی کے درجہ سے اپنے آپ کو بلند سمجھنے کا نام کبریا ہے۔ اور یہ اتحقاق صرف ذات باری تعالیٰ کو ہی حاصل ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿وَلَهُ الْكِبَرِيَاءُ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ﴾

﴿قَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا مِنْ قَوْمِهِ لِلَّذِينَ اسْتَضَعِفُوا﴾ (۷-۷۵) تو ان کی قوم کے سردار لوگ جو غرور رکھتے تھے غریب لوگوں سے ..... کہنے لگے۔ میں بھی متکبرین مستضعفین کے مقابلہ میں استعمال ہوا ہے۔ اور آیت۔

﴿فَاسْتَكْبَرُوا وَكَانُوا قَوْمًا مُجْرِمِينَ﴾ (۱۰-۷۵) تو انہوں نے تکبر کیا اور وہ گنہگار لوگ تھے۔

میں لفظ فاستکبروا سے اس بات پر متنبہ کیا ہے کہ انہوں نے قبول حق کے سلسلہ میں تکبر، خود پسندی، اور نخوت سے کام لیا اور پھر وہ کانوا قوما مجرمین کہہ کر یہ بتایا ہے کہ ان کے سابقہ جرائم نے ہی انہیں تکبر پر اکسایا تھا۔ اور یہ تکبر ان کے لیے کوئی نئی بات نہ تھی۔ بلکہ ان کا شیوہ بن چکا تھا۔ اور فرمایا:

﴿فَالَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ قُلُوبُهُمْ مُنْكَرَةٌ وَهُمْ مُسْتَكْبِرُونَ﴾ (۱۶-۲۲) تو جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ان کے دل انکار کر رہے ہیں۔ اور وہ سرکش ہو رہے ہیں۔

اس کے بعد دوسری آیت میں فرمایا:

﴿إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِينَ﴾ (۱۶-۲۳) وہ (خدا) سرکشوں کو ہرگز پسند نہیں کرتا۔

الْتَكَبَّرُ: اس کا استعمال دو طرح پر ہوتا ہے ایک یہ کہ فی الحقیقت کسی کے افعال حسنہ زیادہ ہوں اور وہ ان پر دوسروں سے بڑھا ہوا ہو۔ اسی معنی میں اللہ تعالیٰ صفت تکبر کے ساتھ متصف ہوتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿الْعَزِيزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ﴾ (۵۹-۲۳) غالب زبردست بڑائی والا۔

خدا نے تم کو ہدایت بخشی ہے تم اس کو بزرگی سے یاد کرو۔  
﴿وَكَبِّرُهُ تَكْبِيرًا﴾ (۱۷-۱۱۱) اور اس کو بڑا جان کر  
اس کی بڑائی کرتے رہو۔ اور آیت:  
﴿لَخَلَقُ السَّمُوتِ وَالْأَرْضِ أَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ  
النَّاسِ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ﴾  
(۴۰-۵۷) آسمانوں اور زمینوں کا پیدا کرنا لوگوں کے  
پیدا کرنے کی نسبت بڑا کام ہے۔ لیکن اکثر لوگ نہیں  
جانتے۔

میں اَكْبَرُ کے لفظ سے قدرت الہی کی کارگیری اور حکمت  
کے ان عجائب کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ جو آسمان اور  
زمین کی خلق میں پائے جاتے ہیں۔ اور جن کو کہ وہ خاص  
لوگ ہی جان سکتے ہیں۔ جن کی وصف میں فرمایا:  
﴿وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمُوتِ وَالْأَرْضِ﴾  
(۳-۱۹۱) اور آسمان اور زمین کی پیدائش میں غور کرتے  
ہیں۔

ورنہ ان کی ظاہری عظمت کو تو عوام الناس بھی سمجھتے ہیں  
(اس لیے یہ معنی یہاں مراد نہیں ہیں) اور آیت: ﴿يَوْمَ  
نَبْطِشُ الْبَطْشَةَ الْكُبْرَى﴾ (۴۳-۱۶) جس دن ہم  
بڑی سخت پکڑ پکڑیں گے۔ میں اس بات پر متنبہ کیا ہے کہ  
روز قیامت سے پہلے دنیا یا عالم برزخ میں کافر کو جس قدر  
بھی عذاب ہوتا ہے عذاب آخرت کے مقابلہ میں ہچ  
ہے۔ اَلْكُبَارُ۔ اس میں کبیر کے لفظ سے زیادہ مبالغہ پایا  
جاتا ہے۔ اور كُبَّار (بتشدید یاد) اس سے بھی زیادہ بلیغ

(۳۷-۳۷) اور آسمانوں اور زمینوں میں اس کے لیے  
بڑائی ہے اور اس کا ثبوت اس حدیث قدسی سے بھی ملتا  
ہے۔ جس میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ ﴿(۹۰)  
((الْكِبَرِيَاءُ رِدَائِي وَالْعِظْمَةُ إِزَارِي فَمَنْ  
نَازَعَنِي فِي وَاحِدٍ مِنْهُمَا فَصَمْتُهُ))﴾ کہ کبریاء  
میری رداء ہے اور عظمت ازار ہے۔ جو شخص ان دونوں  
میں سے کسی ایک میں میرے ساتھ مزاحم ہوگا۔ تو میں اس  
کی گردن توڑ ڈالوں گا۔ اور قرآن پاک میں ہے:  
﴿قَالُوا أَجِئْنَا لِنُلْفِتَنَّا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا  
وَتَكُونُ لَكُمُ الْكِبَرِيَاءُ فِي الْأَرْضِ﴾  
(۷۸-۱۰) وہ بولے کیا تم ہمارے پاس اس لیے آئے ہو  
کہ جس (راہ) پر ہم اپنے باپ دادوں کو پاتے رہے ہیں  
اس سے ہم کو پھیر دو اور اس ملک میں تم دونوں ہی کی  
سرمداری ہو جائے۔ اَكْبَرْتُ الشَّيْءَ کے معنی کسی چیز کو  
بڑا خیال کرنے کے ہیں چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَلَمَّا رَأَيْنَهُ أَكْبَرْنَهُ﴾ (۱۲-۳۱) جب عورتوں نے  
ان کو دیکھا تو ان کا رعب ان پر چھا گیا۔  
اَلتَّكْبِيرُ: (تفعیل) اس کے ایک معنی تو کسی کو بڑا سمجھنے  
کے ہیں۔ اور دوم اللہ اکبر کہہ کر اللہ تعالیٰ کی عظمت کو ظاہر  
کرنے پر بولا جاتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس کی  
عظمت کا احساس کرنے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا  
ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿وَلِتُكَبِّرُوا اللَّهَ عَلَى  
مَا هَدَكُمُ﴾ (۲-۲۸۵) اور اس احسان کے بدلے کہ

① الحديث ذكره السيوطي في الدر (۳۷: ۶) وابن كثير (۴: ۱۵۳) وفي رواية أبي داود قلته في النار وفي رواية مسلم  
عن أبي هريرة وأبي سعيد القيتي في النار وغدبته، انظر للحديث وتحريره باختلاف الالفاظ كثر العمال (ج ۳) رقم  
۲۶۱۱۳-۲۶۱۱۶ عن علي وأبي هريرة وابن عباس وأبي سعيد وتحريره الكشف للحافظ رقم (۱۳۷) وتحريره الاحياء  
للعراقي (۳/ ۳۳۷) وزوائد ابن حبان رقم ۴۹ و منهاج اليقين شرح ادب الدنيا والدين واويس وقا الزرنجاني ۳۹۷۔

ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿وَمَكْرُؤًا مَّكْرًا كُبْرًا﴾ (۷۱-۲۲) اور وہ بڑی بڑی چالیں چالیں چلے۔

## (ک ت ب)

الْكِتَابُ - کے اصل معنی کھال کے دو ٹکڑوں کو ملا کر سی دینے کے ہیں چنانچہ کہا جاتا ہے: كَتَبْتُ السِّقَاءَ ”میں نے مشکیزہ کو سی دیا كَتَبْتُ الْبَغْلَةَ: میں نے چھری کی شرمگاہ کے دونوں کنارے بند کر کے ان پر (لوہے) کا حلقہ چڑھا دیا“ عرف میں اس کے معنی حروف کو تحریر کے ذریعہ باہم ملا دینے کے ہیں مگر کبھی ان حروف کو تلفظ کے ذریعہ باہم ملا دینے پر بھی بولا جاتا ہے الغرض كِتَابَةُ کے اصل معنی تو تحریر کے ذریعہ حروف کو باہم ملا دینے کے ہیں مگر بطور استعارہ کبھی معنی تحریر اور کبھی بمعنی تلفظ استعمال ہوتا ہے اس بنا پر کلام الہی کو کتاب کہا گیا ہے گو (اس وقت) قید تحریر میں نہیں لائی گئی تھی۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿الَمْ ذَلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ﴾ (۱-۲) یہ کتاب (قرآن مجید) اس میں کچھ شک نہیں۔

﴿إِنِّي عَبْدُ اللَّهِ إِنِّي الْكِتَابُ﴾ (۱۹-۳۰) میں خدا کا بندہ ہوں اس نے مجھے کتاب دی ہے۔

الْكِتَابُ: اصل میں مصدر ہے اور پھر مکتوب فیہ (یعنی جس چیز میں کچھ لکھا گیا ہو) کو کتاب کہا جانے لگا ہے دراصل الْكِتَابُ اس صحیفہ کو کہتے ہیں جس میں کچھ لکھا ہوا ہو۔ چنانچہ آیت:

﴿يَسْأَلُكَ أَهْلُ الْكِتَابِ أَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتَابًا مِّنَ السَّمَاءِ﴾ (۱۵۳-۴) (۱-۷) اہل کتاب تم سے درخواست کرتے ہیں کہ تم ان پر ایک لکھی ہوئی

کتاب آسمان سے اتار لاؤ۔

میں ”کتاب“ سے وہ صحیفہ مراد ہے جس میں کچھ لکھا ہوا ہو اسی لیے دوسری جگہ فرمایا:

﴿وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتَابًا فِي قِرْطَاسٍ﴾ (۷-۶) اور اگر ہم تم پر کاغذوں پر لکھی ہوئی کتاب نازل کرتے۔

نیز کسی چیز کے ثابت کر دینے، اندازہ کرنے، فرض یا واجب کر دینے اور عزم کرنے کو كِتَابَةُ سے تعبیر کر لیتے ہیں اس لیے کہ پہلے پہل تو کسی چیز کے متعلق دل میں خیال پیدا ہوتا ہے پھر زبان سے ادا کی جاتی ہے اور آخر میں لکھ لی جاتی ہے لہذا ارادہ کی حیثیت مبداء اور کتابت کی حیثیت منتہی کی ہے پھر جس چیز کا ابھی ارادہ کیا گیا ہو تاکید کے طور پر اسے كَتَبَ سے تعبیر کر لیتے ہیں جو کہ دراصل ارادہ کا منتہی ہے..... چنانچہ فرمایا: ﴿كَتَبَ اللَّهُ لَا غَيْبَ لَنَا وَرُسُلِي﴾ (۵۸-۲۱) خدا کا حکم ناطق ہے کہ میں اور میرے پیغمبر ضرور غالب رہیں گے۔

﴿قُلْ لَّنْ يُصِيبَنَا إِلَّا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَنَا﴾ (۹-۵۱) کہہ دو کہ ہم کو کوئی مصیبت نہیں پہنچ سکتی بجز اس کے کہ جو خدا نے ہمارے لیے مقدر کر دی ہے۔

﴿لَبَرَزَ الَّذِينَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ﴾ (۳-۱۵۳) تو جن کی تقدیر میں مارا جانا لکھا تھا۔ وہ اپنی اپنی قتل گاہوں کی طرف ضرور نکل آتے۔ اور آیت: ﴿وَأُولُوا الْأَرْحَامِ بَعْضُهُمْ أَوْلَىٰ بِبَعْضٍ فِي كِتَابِ اللَّهِ﴾ (۸-۷۵) اور رشتے دار خدا کے حکم کی رو سے ایک

دوسرے کے زیادہ حقدار ہیں۔ میں کتاب اللہ سے مراد قانون خداوندی ہے اور آیت: ﴿وَكُتِبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَا﴾

بھی تقدیر کی دونوں اقسام مراد ہیں اور آیت:

﴿أُولَٰئِكَ كَتَبَ فِي قُلُوبِهِمُ الْإِيمَانَ وَأَيَّدَهُم بِرُوحٍ مِّنْهُ﴾ (۵۸-۲۲) یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں خدا نے ایمان (پتھر پر لکیر کی طرح) تحریر کر دیا ہے اور فیض غیبی سے ان کی مدد کی ہے۔ میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان لوگوں کی حالت ان کفار کے برعکس ہے۔ جن کے متعلق ارشاد ہے۔

﴿وَلَا تُطِغْ مَنْ أَغْفَلْنَا قَلْبَهُ عَنْ ذِكْرِنَا﴾ (۱۸-۲۸) اور جس شخص کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا اس کا کہنا نہ مانا۔

کیونکہ اغفلنا کا لفظ اغفلت الكتاب سے ماخوذ ہے جس کے معنی کتاب کو مہمل یعنی اعراب و نقاط سے معری چھوڑ دینا کے ہیں۔ اور آیت ﴿فَلَا كُفْرَانَ لِسَعِيدِهِ وَ إِنَّا لَهُ كَاتِبُونَ﴾ (۲۱-۹۴) تو اس کی کوشش رائگاں نہ جائے گی۔ اور ہم اس کے لیے (ثواب اعمال) لکھ رہے ہیں۔

میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اعمال کو ثابت رکھا جا رہا ہے۔ اور ان کی ضروری ہی جزا دی جائے گی۔ اور آیت:

﴿فَاكْتُبْنَا مَعَ الشَّاهِدِينَ﴾ (۳-۵۳) تو ہم کو ماننے والوں میں لکھ رکھ۔

کے معنی یہ ہیں کہ ہمیں ان کے زمرہ میں داخل فرما۔ اور یہ آیت کریمہ:

﴿فَأُولَٰئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ﴾ (۴-۶۹) وہ (قیامت کے روز) ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے۔ جن پر خدا نے بڑا فضل کیا، کے مضمون کی

أَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ ﴿(۵-۲۵) اور ہم نے ان لوگوں کے لیے توراۃ میں یہ حکم لکھ دیا تھا۔ کہ جان کے بدلے جان۔ میں کُتِبْنَا بمعنی أَوْحَيْنَا وَقَرَضْنَا ہے یعنی ہم نے وحی بھیجی یا فرض کر دیا اور اسی معنی میں فرمایا: ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ﴾ (۲-۱۸۰) تم پر فرض کیا جاتا ہے کہ جب تم میں سے کسی کو موت کا وقت آجائے۔

﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ﴾ (۲-۱۸۳) مومنو! تم پر روزے فرض کیے گئے۔

﴿لَمْ كُتِبَ عَلَيْنَا الْقِتَالُ﴾ (۴-۷۶) تو نے ہم پر جہاد (جلد) کیوں فرض کر دیا۔

﴿مَا كُتِبْنَاهَا عَلَيْهِمْ﴾ (۵-۲۷) ہم نے ان کو اس کا حکم نہیں دیا تھا۔ اور آیت:

﴿وَلَوْلَا أَنْ كَتَبَ اللَّهُ عَلَيْهِمُ الْجَلَاءَ﴾ (۵۹-۳) اور اگر خدا نے ان کے بارے میں جلا وطن کرنا نہ لکھ رکھا ہوتا۔

کے معنی یہ ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ نے گھروں کو چھوڑنا ان پر ضروری نہ کیا ہوتا (تو ان کو کوئی دوسری سزا دی جاتی) اور کبھی کتابت سے تقدیر حتمی یا حتمی کی مثل مراد ہوتی ہے۔ چنانچہ آیت:-

﴿بَلَىٰ وَرُسُلُنَا لَدَيْهِمْ يَكْتُبُونَ﴾ (۳۳-۸۰) ہاں ہاں (سب سنتے ہیں) اور ہمارے فرشتے ان کے پاس (ان کی) سب باتیں لکھ لیتے ہیں۔ میں بعض نے

تقدیر کے نویندے مراد لیے ہیں اور بعض نے کہا ہے۔ کہ آیت:-

﴿يَمْحُوا اللَّهُ مَا يَشَاءُ وَيُثَبِّتُ﴾ (۱۳-۳۹) میں

اور خدا ایسا نہ تھا۔ کہ جب تک تم ان میں تھے انہیں عذاب دیتا۔ کی طرف اشارہ ہے۔ اور آیت:

﴿قُلْ لَنْ يُصِيبَنَا إِلَّا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَنَا﴾ (۹-۵۱)

کہہ دو کہ ہم کو کوئی مصیبت نہیں پہنچ سکتی بجز اس کے جو خدا نے ہمارے لیے لکھ دی ہو۔

میں کَتَبَ کے معنی مقدر اور فیصلہ کرنا کے ہیں اور یہاں عَلَيْنَا کی بجائے لَنَا کہنے سے اس بات پر تنبیہ ہے کہ جو مصیبت بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمیں پہنچتی ہے اسے ہم اپنے لیے نعمت سمجھتے ہیں۔ اور قمت خیال نہیں کرتے اور آیت:

﴿ادْخُلُوا الْأَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِي كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ﴾ (۵-۲۱) (تو بھائیو) تم ارض مقدس (یعنی ملک شام) جسے خدا نے تمہارے لیے لکھ رکھا ہے۔ چل داخل ہو۔ میں بعض نے کَتَبَ اللہ کے معنی وَهَبَ لَكُمْ کئے ہیں یعنی جو کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں عطا کی تھی۔ اور پھر تمہارے وہاں نہ جانے اور اس عطا الہی کو قبول نہ کرنے کے باعث اللہ تعالیٰ نے وہ زمین ان پر حرام کر دی۔ اور بعض نے کہا ہے کہ کَتَبَ اللہ لَكُمْ کے معنی یہ ہیں۔ کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے حق میں اس کا فیصلہ کر دیا تھا۔ بشرطیکہ تم وہاں چلے جاتے اور بعض نے کتب کے معنی اوجب کیے ہیں یعنی اللہ تعالیٰ نے وہاں چلے جانا تم پر واجب کر دیا تھا اور پھر عَلَيْنَا کی بجائے لَكُمْ اس لیے کہا ہے کہ وہاں چلے جانے میں ان کے دنیوی اور اخروی دونوں قسم کے فوائد مضر تھے اس لیے وہاں چلے جانا لَكُمْ ہوگا نہ کہ عَلَيْنَا جیسا کہ مثلاً کوئی شخص کسی بات کو نقصان دہ خیال کرتا ہو مگر مال کے اعتبار سے جو فوائد اس میں پنہاں ہیں اس سے غافل اور بے خبر

طرف اشارہ ہے۔ اور آیت:

﴿مَالِ هَذَا الْكِتَابِ لَا يُغَادِرُ صَغِيرَةً وَلَا كَبِيرَةً إِلَّا أَحْصَاهَا﴾ (۱۸-۴۹)

ہائے شامت! یہ کیسی کتاب ہے نہ چھوٹی بات کو چھوڑتی ہے۔ اور نہ بڑی کو (کوئی بات بھی نہیں) مگر اسے لکھ رکھا ہے۔ میں الکتاب سے لوگوں کے اعمال نامے مراد ہیں اور آیت کریمہ:

﴿إِلَّا فِي كِتَابٍ مِّنْ قَبْلِ أَنْ نَّبْرَأَهَا﴾ (۵۷-۲۲)

مگر پیشتر اس کے کہ ہم اس کو پیدا کریں ایک کتاب میں (لکھی ہوئی ہے)۔

میں بعض نے کہا ہے کہ ”کتاب“ سے لوح محفوظ کی طرف اشارہ ہے۔ چنانچہ اسی معنی میں فرمایا:

﴿إِنَّ ذَلِكَ فِي كِتَابٍ إِنَّ ذَلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ﴾ (۲۲-۷۰) یہ سب کچھ کتاب میں لکھا ہوا ہے بے شک یہ سب خدا کو آسان ہے۔

﴿وَلَا رَطْبٌ وَلَا يَابِسٌ إِلَّا فِي كِتَابٍ مُّبِينٍ﴾ (۶-۵۹)

کوئی تر یا خشک چیز نہیں۔ مگر کتاب روشن میں لکھی ہوئی ہے۔

﴿فِي الْكِتَابِ مَسْطُورًا﴾ (۱۷-۵۸) یہ کتاب (یعنی تقدیر میں) لکھا جا چکا ہے۔ اور آیت:

﴿لَوْ لَا كِتَابٌ مِّنَ اللَّهِ سَبَقَ﴾ (۸-۸۶) اگر خدا کا حکم پہلے نہ ہو چکا ہوتا۔

کے معنی یہ ہیں کہ اگر یہ بات حکمت الہی میں مقدر نہ ہو چکی ہوتی لہذا یہ آیت۔

﴿كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلَى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ﴾ (۶-۵۴)

خدا نے اپنی ذات پاک پر رحمت کو لازم کر لیا، کی طرف اشارہ ہوگا اور بعض نے کہا ہے کہ یہ۔

﴿وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَأَنْتَ فِيهِمْ﴾ (۸-۳۳)



کریمہ: ﴿فَهُمْ يَكْتُوبُونَ﴾ (۶۸-۷۷) کہ وہ اسے لکھ لیتے ہیں، میں یکتوبون سے ان کے علم و تحقیق اور عقیدہ کی طرف اشارہ ہے۔ اور آیت۔  
﴿وَابْتَغُوا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ﴾ (۲-۱۸۷) اور خدا نے جو تمہاری چیز تمہارے لیے لکھ رکھی ہے۔ (یعنی اولاد) اس کو (خدا سے) طلب کرو۔

میں ایک لطیف نقطہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے انسان میں نکاح کی خواہش اس لیے رکھی ہے کہ وہ اس سے طلب نسل کرے جو نوع انسانی کے بقاء کا موجب ہے۔ لہذا انسان کو چاہیے کہ وہ نکاح سے اسی چیز کا قصد کرے جو کہ عقل و دیانت کے تقاضا کے مطابق اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے مقرر کر دی ہے۔ یعنی حفظ نسل اور عفت نفس اور بعض نے جو یہ لکھا ہے کہ ما کتب اللہ سے مراد اولاد ہے۔ تو انہوں نے بھی اسی معنی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اور کبھی کتابت سے کسی چیز کا وجود میں لانا۔ اور محو سے کسی چیز کا زائل اور فنا کرنا مراد ہوتا ہے چنانچہ آیت: ﴿لِكُلِّ أَجَلٍ كِتَابٌ يَمْحُوهُ اللَّهُ مَا يَشَاءُ وَيُنَبِّتُ﴾ (۱۳-۳۸، ۳۹) میں تنبیہ ہے کہ کائنات میں ہر لمحہ ایجاد ہوتی رہتی ہے۔ اور ذات باری تعالیٰ مقتضائے حکمت کے مطابق اشیاء کو وجود میں لاتی اور فنا کرتی رہتی ہے۔ لہذا اس آیت کا وہی مفہوم ہے۔ جو کہ آیت ﴿كُلُّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ﴾ (۵۵-۲۹) وہ ہر روز کام میں مصروف رہتا ہے۔ اور آیت: (۱۳-۳۹) میں وَعِنْدَهُ أُمُّ الْكِتَابِ (اور اس کے پاس اصل کتاب ہے) کا ہے اور آیت: ﴿وَأَنَّ مِنْهُمْ لَفَرِيقًا يَلْوَنَ أَلْسِنَتَهُم بِالْكِتَابِ لِتَحْسَبُوهُ مِنَ الْكِتَابِ وَمَا هُوَ مِنْ

ہو تو اس سے کہا جائے گا هَذَا الْكَلَامُ لَكَ لَا عَلَيْكَ (یعنی اس میں) تمہارا فائدہ ہے نہ کہ نقصان اور آیت۔ ﴿وَقَالَ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ وَالْإِيمَانَ لَقَدْ لَبِثْتُمْ فِي كِتَابِ اللَّهِ إِلَى يَوْمِ الْبَعْثِ﴾ (۳۰-۵۶) اور جن لوگوں کو علم اور ایمان دیا گیا تھا۔ وہ کہیں گے خدا کی کتاب کے مطابق تم قیامت تک رہو گے۔ میں کتاب اللہ سے اللہ کا حکم، فیصلہ اور علم مراد ہے۔ اور یہی معنی آیت۔ ﴿لِكُلِّ أَجَلٍ كِتَابٌ﴾ (۱۳-۳۸) ہر (حکم) قضا (کتاب میں) مرقوم ہے۔ کے ہیں۔ اور آیت: ﴿إِنَّ عِدَّةَ الشُّهُورِ عِنْدَ اللَّهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِي كِتَابِ اللَّهِ﴾ (۹-۳۶) خدا کے نزدیک مہینے گنتی میں بارہ ہیں یعنی..... کتاب خدا میں، میں کتاب اللہ کے معنی بھی حکم الہی ہی ہیں۔ اور کبھی کتاب سے وہ حجت الہی مراد ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ثابت ہو چکی ہو چنانچہ فرمایا ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُجَادِلُ فِي اللَّهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَلَا هُدًى وَلَا كِتَابٍ مُبِينٍ﴾ (۲۲-۸) اور لوگوں میں کوئی ایسا بھی ہے جو خدا کی شان میں بغیر علم (و دانش) کے اور بغیر ہدایت کے اور بغیر کتاب روشن کے جھگڑتا ہے۔

أَمْ آتَيْنَهُمْ كِتَابًا مِنْ قَبْلِهِ: یا ہم نے ان کو اس سے پہلے کوئی کتاب دی تھی۔  
﴿فَاتُوا بِكِتَابِكُمْ﴾ (۳۷-۵۷) تو اپنی حجت پیش کرو۔ ﴿أُوتُوا الْكِتَابَ﴾ (۲-۳۵) جنہیں الکتاب یعنی حجت دی ﴿كِتَابَ اللَّهِ﴾ (۲-۱۰۱) خدا کی کتاب کو۔ اور آیت: ﴿أَمْ آتَيْنَاهُمْ كِتَابًا﴾ (۳۳-۲۱) یا ہم نے انکو (اس سے پہلے) کوئی کتاب دی تھی۔ اور آیت

﴿إِنَّ عِدَّةَ الشُّهُورِ عِنْدَ اللَّهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِي كِتَابِ اللَّهِ﴾ میں کتاب سے مراد حکم ہی ہے۔ اور آیت: ﴿قَوْلِيلٌ لِّلَّذِينَ يَكْتُبُونَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ﴾ (۷۹-۲) تو ان لوگوں پر افسوس ہے۔ جو اپنے ہاتھ سے کتاب لکھتے ہیں۔

میں تنبیہ کی ہے کہ از خود جھوٹی باتیں گھڑ کر لکھ لیتے ہیں۔ اور یہاں جھوٹی تحریروں کو ان کے ہاتھوں کی طرف منسوب کرنا ایسے ہی ہے جیسا کہ آیت ﴿ذَلِكَ قَوْلُهُمْ بِأَفْوَاهِهِمْ﴾ (۹۰-۳۰) میں ان کی من گھڑت باتوں کو ان کے منہوں کی طرف منسوب کیا ہے۔

أَلَا تَحْسَبُ (افعال) کا لفظ عموماً جھوٹی اور جعلی تحریر کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:-

﴿أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ اكْتَتَبَهَا﴾ (۲۵-۵) پہلے لوگوں کی کہانیاں ہیں جن کو اس نے جمع کر رکھا ہے۔ اور قرآن پاک میں جہاں کہیں بھی اہل الکتاب کا لفظ آیا ہے۔ وہاں الکتاب سے تورات، انجیل یا دونوں مراد ہیں۔ اور آیت:- ﴿وَمَا كَانَ هَذَا الْقُرْآنُ أَنْ يُفْتَرَىٰ إِلَىٰ قَوْلِهِ وَتَفْصِيلَ الْكِتَابِ﴾ (۱۰-۳۷) اور یہ قرآن پاک ایسا نہیں کہ خدا کے سوا کوئی اس کو اپنی طرف سے بنا لائے۔ اور (ان ہی) کتابوں کی (اس میں) تفصیل ہے۔

میں الکتاب سے قرآن پاک سے پہلے کی تمام کتب سماویہ مراد ہیں۔ کیونکہ زیر بحث آیت میں قرآن کو ان کا مصدق ٹھہرایا گیا ہے۔ لہذا وہ خود ان میں شامل نہیں ہو سکتا اور آیت کریمہ:

﴿وَهُوَ الَّذِي أَنْزَلَ إِلَيْكُمُ الْكِتَابَ مُفَصَّلًا﴾ (۶-۱۱۳) حالانکہ اس نے تمہاری طرف واضح المطالب

الْكِتَابِ ﴿ (۳-۷۸) اور ان (اہل کتاب) میں سے بعض ایسے ہیں کہ کتاب کو زبان مروڑ کر پڑھتے ہیں تاکہ تم سمجھو کہ جو کچھ وہ پڑھتے ہیں کتاب (تورہ) میں ہے۔ حالانکہ وہ (کسی سماوی) کتاب سے نہیں ہوتا۔ میں (لفظ الکتاب تین مرتبہ آیا ہے چنانچہ) پہلی جگہ الکتاب سے وہ جھوٹی تحریریں مراد ہیں جن کا تذکرہ آیت: ﴿قَوْلِيلٌ لِّلَّذِينَ يَكْتُبُونَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ﴾ (۷۹-۲) میں کیا گیا ہے۔ اور دوسری الکتاب سے تورات مراد ہے اور تیسری الکتاب میں الف لام جنس کا ہے اور اس سے ہر آسمانی کتاب اور کلام الہی مراد ہو سکتی ہے پس آیت کے معنی یہ ہیں کہ وہ حکم نہ تو کسی آسمانی کتاب میں موجود ہے اور نہ ہی کلام الہی ہو سکتا ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَآتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ وَ الْفُرْقَانَ﴾ (۲-۵۳) اور جب ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب اور معجزے عنایت کیے۔ میں بعض نے کہا ہے کہ یہاں کتاب اور فرقان دونوں سے تورات مراد ہے اس لحاظ سے کہ تورات میں احکام الہی ثبت ہیں اسے الکتاب کہا گیا ہے اور اس لحاظ سے کہ اس میں حق کو باطل سے جدا کرنے والے احکام مذکور ہیں اسے الفرقان کہا گیا ہے اور آیت: ﴿وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ أَنْ تَمُوتَ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ كِتَابًا مُّوجَّلًا﴾ (۳-۱۳۵) اور کسی شخص میں طاقت نہیں کہ خدا کے حکم کے بغیر مر جائے (اس نے موت کا) وقت مقرر کر کے لکھ رکھا ہے۔ میں کتاباً موجلہ سے حکم الہی مراد ہے۔ چنانچہ آیات ﴿لَوْ لَا كِتَابٌ مِّنَ اللَّهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ﴾ (۸-۶۸) اگر خدا کا حکم پہلے نہ ہو چکا ہوتا..... تو تم پر..... نازل ہو۔

تم سے پہلے پیغمبروں پر نازل ہوئیں سب پر ایمان لاتے ہیں، میں ہے مگر بعض نے کہا ہے۔ کہ الکتاب سے قرآن پاک مراد ہے اور کُتِبَ کہہ کر اس معنی کی طرف اشارہ کیا ہے کہ تم ان لوگوں کی طرح نہیں ہو۔ جن کے حق میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿وَيَقُولُونَ نُوْمِنُ بِبَعْضٍ وَنَكْفُرُ بِبَعْضٍ﴾ (۱۵۰-۳) اور کہتے ہیں کہ ہم بعض کو مانتے ہیں اور بعض کو نہیں مانتے۔

كِتَابَةُ الْعَبْدِ کے معنی غلام کے خود کو اپنے آقا سے اس (مقررہ) مال کے عوض خرید لینے کے ہیں۔ جو وہ کما کر اسے (بالاقساط) ادا کرے گا۔ چنانچہ آیت کریمہ:

﴿وَالَّذِينَ يَبْتِغُونَ الْكِتَابَ وَمِمَّا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ فَكَايَتُهُمْ﴾ (۳۳-۲۴) اور جو غلام تم سے مکاتب چاہیں..... تو ان سے مکاتب کرلو۔

میں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کَايَتُهُمْ کتابت بمعنی ایجاب سے مشتق ہو۔ اور یہ بھی کہ الْكِتَاب بمعنی نظم یعنی تحریر سے ہو کیونکہ ان دونوں کی نسبت انسان کی طرف ہو سکتی ہے۔

### (ک ت م)

كَتَمْتُهُ (ن) كَتَمًا وَكِتْمَانًا کے معنی کوئی

بات چھپانے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهُ مِنَ اللَّهِ﴾ (۱۴۰-۲) اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہے جو خدا کی شہادت کو، جو اس کے پاس کتاب اللہ میں موجود ہے۔ چھپائے۔

﴿وَأَنْ قَرِيقًا مِنْهُمْ لَيَكْتُمُونَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ﴾ (۱۴۶-۲) مگر ایک فریق ان میں سچی بات

کتاب بھی ہے۔

میں بعض نے کہا ہے۔ کہ الکتاب سے مراد قرآن پاک ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ یہ لفظ قرآن پاک کے علاوہ دوسرے دلائل حقہ اور علم و عقل کو بھی شامل ہے۔ اسی طرح آیت:

﴿فَالَّذِينَ آتَيْنَهُمُ الْكِتَابَ يُوْمِنُونَ بِهِ﴾ (۲۹-۳۷) تو جن لوگوں کو ہم نے کتابیں دی تھیں وہ اس پر ایمان لے آتے ہیں، میں بھی الکتاب کا مفہوم عام ہے۔ اور آیت:

﴿قَالَ الَّذِي عِنْدَهُ عِلْمٌ مِنَ الْكِتَابِ﴾ (۲۷-۴۰) ایک شخص جس کو کتاب الہی کا علم تھا کہنے لگا، میں بعض نے کہا ہے۔ کہ عِلْمٌ مِنَ الْكِتَابِ میں مِنْ زائدہ ہے اور اس کے معنی علم الکتاب یعنی کتاب کا علم کے ہیں۔ اور بعض نے کہا ہے کہ منجملہ ان علوم کے ایک علم مراد ہے جو اللہ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو ان کی خاص کتاب میں عطا فرمائے تھے اور انہی کے ذریعے سے ہر چیز حضرت سلیمان علیہ السلام کے تابع ہو گئی تھی۔ اور آیت۔

﴿وَتُؤْمِنُونَ بِالْكِتَابِ كُلِّهِ﴾ (۱۱۹-۳) اور تم سب کتابوں پر ایمان رکھتے ہو۔

میں الکتاب سے تمام کتب سماویہ مراد ہیں اور جمع کی بجائے مفرد کا لفظ یا تو اس لیے لایا گیا ہے کہ یہ اسم جنس ہے۔ جیسا کہ كَثُرَ الدِّرْهَمُ فَمِنْ أَيْدِي النَّاسِ میں الدِّرْهَمُ سے جنس درہم مراد ہے۔ اور یا اس لیے کہ یہ اصل میں عدل کی طرح مصدر ہے (جو مفرد و جمع دونوں کے لیے آتا ہے) جیسا کہ آیت:-

﴿يُؤْمِنُونَ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ﴾ (۴-۲) جو کتاب تم پر نازل ہوئی اور جو کتابیں

گواہی دیں گے تو اس وقت وہ تمنا کریں گے کہ خدا تعالیٰ سے کوئی بات نہ چھپائی ہوتی۔

حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ۱ کہ آخرت میں متعدد مواقع ہوں گے بعض موقعوں پر وہ اپنی حالت کو چھپانے کی کوشش کریں گے۔ اور بعض میں نہیں چھپائیں گے بعض نے کہا ہے کہ کوئی بات چھپانہ سکے سے مراد یہ ہے کہ ان کے اعضاء ان کے خلاف گواہی دیں گے۔

### (ک ث ب)

الْكُثْبُ: ریت کا ٹیلہ۔ چنانچہ آیت:-  
﴿وَكَاَنَتِ الْجِبَالُ كَثِيْبًا مَّهِلًا﴾ (۳-۱۳) اور  
پہاڑ (ایسے بھر بھرے گویا) ریت کے ٹیلے ہو جائیں گے  
اور كُثْبُ کی جمع اَكْثِيْبَةٌ وَكُتْبٌ وَكُتْبَانٌ آتی ہے۔  
اور معنی اجتماع کے لحاظ سے دودھ اور کھجوروں کی تھوڑی سی  
مقدار کو كُثْبِيَّةً کہا جاتا ہے۔

كُتْبَ: (ض) اصل معنی اکٹھا کرنا کے ہیں اور اس سے  
صفت فاعلی كَاثِبٌ آتی ہے جس کے معنی ہیں ”جمع  
کرنے والا“ اور التَّكْثِيْبُ کے معنی شکار کے اپنے  
آپ پر موقعہ دینے کے ہیں، چنانچہ کہا جاتا ہے: اَكْثَبَكَ  
الصَّيْدُ فَارْمِهِ (کہ شکار تجھے پر آ گیا ہے لہذا اسے شکار کر  
لو) اور یہ كُتْبٌ سے مشتق ہے جس کے معنی ہونا کے ہیں۔

### (ک ث ر)

پہلے گذر چکا ہے کہ کثرت اور قلت کمیت  
منفصلہ یعنی اعداد میں استعمال ہوتے ہیں چنانچہ فرمایا ﴿وَلَا  
لَيَزِيدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ﴾ (۵-۸۶) (اس سے) ان

جان بوجھ کر چھپا رہا ہے۔

﴿وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ﴾ (۲-۲۵۳) اور (دیکھنا)

شہادت کو مت چھپانا۔

اور آیت کریمہ:

﴿الَّذِيْنَ يَخْلُوْنَ وَيَأْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبَخْلِ وَ  
يَكْتُمُوْنَ مَا آتَاهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ﴾ (۴-۳۷)

جو خود بھی بخل کریں اور لوگوں کو بھی بخل سکھائیں اور جو  
(مال) خدا نے ان کو اپنے فضل سے عطا فرمایا ہے اسے

چھپا چھپا کر رکھیں۔

میں كُتْمَانُ فَضْلٍ سے کفرانِ نعمت مراد ہے اسی بنا پر اس  
کے بعد فرمایا:

﴿وَاعْتَدْنَا لِلْكَافِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِينًا﴾ (۴-۳۷)  
اور ہم نے ناشکروں کے لیے ذلت کا عذاب تیار کر رکھا  
ہے۔

اور آیت کریمہ:

﴿وَلَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا﴾ (۴-۳۲) اور خدا  
سے کوئی بات چھپا نہیں سکیں گے۔

کی تفسیر میں حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ جب  
قیامت کے روز مشرکین دیکھیں گے کہ جنت میں وہی  
لوگ داخل ہو رہے ہیں جو مشرک نہیں تھے۔ تو جھٹ سے  
پکار اٹھیں گے۔ ﴿وَاللّٰهُ رَبَّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ﴾

(۶-۲۳) خدا کی قسم! جو ہمارا پروردگار! ہے ہم شریک نہیں  
بناتے تھے۔

مگر اس کے بعد جب ان کے ہاتھ پاؤں ان کے خلاف

۱ ابو سعید الحسن البصری من سادات التابعین و امام اهل البصرة توفی ۱۱۱ھ (شذرات الذهب ۱/۱۳۶) (وابن خلکان  
۱۶۰/۱) وقد جمع العاجز تراجمه فی مقالة۔

(۳۶۹) وَلَسْتَ بِالْأَكْثَرِ مِنْهُمْ حَصًى

وَأَنَّمَا الْعِزَّةُ لِلْكَائِبِ

تم گنتی میں ان سے زیادہ نہیں ہو۔ عزت تو انہی کے لیے ہے جو تعداد میں زیادہ ہوں۔

الْمُكَاتِرَةُ وَالتَّكَاتُرُ: کے معنی ایک دوسرے سے مال و دولت اور عزت میں بڑھنے کی کوشش کرنا کے ہیں۔ چنانچہ

فرمایا:

﴿أَلْهَكُمُ التَّكَاثُرُ﴾ (۱۰۲-۱) (لوگو! تم کو (مال کی)

بہت سی طلب نے غافل کر دیا۔

اور فُلَانٌ مَّكْثُورٌ کے معنی مَغْلُوبٌ فِي الْكَثْرَةِ کے ہیں۔

الْجَمُّكَاتُرُ: عرف میں بہت سی باتیں کرنے والے کو کہتے ہیں۔

الْأَكْثَرُ کے معنی ہیں خرما کا گودا جب زیادہ ہو۔ اور یہ سکون ثاء کے ساتھ بھی مروی ہے۔ ایک روایت میں ہے ۵

(۹۱)

((لَا قَطْعَ فِي ثَمَرٍ وَلَا كَثْرٍ)) کہ پھل اور گودے کی چوری میں قطع یہ نہیں ہے۔ اور آیت:

﴿إِنَّا أَعْطَيْنَاكَ الْكَوْثَرَ﴾ (۱۰۸-۱) (اے

محمد ﷺ) ہم نے تم کو کوثر عطا فرمائی۔

میں بعض نے کہا ہے کہ کوثر جنت کی ایک نہر کا نام ہے۔

میں سے اکثر کی سرکشی اور کفر اور بڑھے گا۔

﴿وَأَكْثَرُهُمْ لِلْحَقِّ كَارِهُونَ﴾ (۲۳-۷۰) اور ان

میں سے اکثر حق کو ناپسند کرتے ہیں۔

﴿كَم مِّن فِتْنَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِتْنَةُ كَثِيرَةٍ﴾

(۲۳۹-۲) بسا اوقات تھوڑی سی جماعت نے

بڑی جماعت پر فتح حاصل کی۔

﴿وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً﴾ (۱-۳)

پھر ان دونوں سے کثرت سے مرد و عورت (پیدا کر کے روئے زمین پر) پھیلا دیے۔

﴿وَدَّ كَثِيرٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ﴾ (۲-۱۰۹) بہت سے اہل کتاب..... یہ چاہتے ہیں۔

علیٰ ہذا القیاس بہت سی اس قسم کی آیات ہیں (جن میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے) اور آیت:

﴿وَفَاكِهَةً كَثِيرَةً﴾ (۵۶-۳۲) اور میوہ ہائے کثیرہ کے باغوں میں۔

میں فواکہ جنت کو مطعومات دنیا کے لحاظ سے کثیرہ کہا ہے۔

اور اس سے صرف کثرت عدد ہی مراد نہیں ہے۔ بلکہ کثرت بلحاظ فضیلت بھی مراد ہے اور عَدَدٌ كَثِيرٌ وَكُثَارٌ

وَكَثَائِرٌ کے معنی کثرت تعداد کے ہیں اور رَجُلٌ كَاثِرٌ

مال دار آدمی کو کہتے ہیں۔ کسی شاعر نے کہا

ہے ۵ (السرج)

① قاله الاعشى يعمون من كلمة في ٦٠ بيتا يهجو فيها علقمة بن علاثة في منافرة ويمدح عامر بن طفيل والاصح ان الكاثر بمعنى كثير العدد كما في اللسان (كث) والقصيدة في ديوانه (٩٢-٩٦) والبيت في التاج (كث) والخزانة (٨: ٢) وتهذيب الالفاظ ٣٤ وابن عقيل رقم (٢٧٧) السيوطي (٣٠٥) وقد مر (قلل)

② اورده في المؤطا من حديث رافع بن خديج (الزرقاني ١٦٣/٤) والشافعي في الام (١١٨: ٦) عن مالك وعن سفیان ابن عيينة وابو داؤد الطيالسي رقم (٩٥٨) واحمد في المسند (٤١٣/٣) و٤٦٤ و٤٠/٤ والدارمي (١٦٤/٢) وابوداود (٢٣٨) والترمذي (٢٧٣/١-٢٧٤) والنسائي (٢٥٨/٢) وابن ماجه (٦٦/٢)۔

ستارے بکھر کر بے نور ہو جائیں گے۔  
 اِنْكَدَرُ الْقَوْمُ عَلَى كَذَا: قوم بکھر کر اس پر ٹوٹ  
 پڑی۔

### (ک دی)

الْكُدْيَةُ کے معنی سخت زمین کے ہیں چنانچہ

محاورہ ہے۔

حَفَرَ فَكُدْيَ: وہ گڑھا کھودتا ہوا سخت زمین تک جا پہنچا  
 اور مزید کھدائی سے رک گیا اور استعارہ کے طور پر اَكْدَى  
 کا لفظ تھوڑا سا دے کر ہاتھ روک لینے اور ناکام ہونے پر  
 بولا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَأَعْطَى  
 قَلِيلًا وَأَكْدَى﴾ (۵۳-۳۴) تھوڑا سا دیا اور پھر  
 (ہاتھ) روک لیا۔

### (ک ذ ب)

الْكُذِبُ: (جھوٹ) صِدْقُ پر بحث کے سلسلہ

میں یہ بیان ہو چکا ہے کہ قول اور فعل دونوں کے متعلق اس کا  
 استعمال ہوتا ہے چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔

﴿إِنَّمَا يَفْتَرِي الْكُذِبَ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ﴾  
 (۱۶-۱۰۵) جھوٹ اور افتراء تو وہی لوگ کیا کرتے ہیں۔

جو خدا کی آیتوں پر ایمان نہیں لاتے۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَاللَّهُ يَشْهَدُ أَنَّ الْمُنَافِقِينَ لَكَاذِبُونَ﴾  
 (۶۳-۱) لیکن خدا ظاہر کیے دیتا ہے کہ منافق (دل سے)

اعتقاد نہ رکھنے کے لحاظ سے) جھوٹے ہیں۔ میں ان کے

کاذب ہونے کے معنی یہ ہیں کہ جو کچھ یہ کہتے ہیں گواہی

اور بعض نے خیر کثیر مراد لی ہے۔ جو کہ اللہ تعالیٰ نے  
 آنحضرت ﷺ کو عطا کی اور سخی آدمی کو کوثر کہا جاتا ہے  
 تَكُوْثَرُ الشَّيْءُ کے معنی کسی چیز کے بہت زیادہ ہونے  
 کے ہیں۔ شاعر نے کہا ہے ۵ (الطویل)

(۳۷۰) وَقَدْ تَارَ نَفْعُ الْمَوْتِ حَتَّى تَكُوْثُرَا

موت کا غبار اٹھا۔ یہاں تک کہ بہت زیادہ ہو گیا۔

### (ک د ج)

الْكُدْحُ کے معنی کوشش کرنا اور مشقت اٹھانا

کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿إِنَّكَ كَادِحٌ إِلَى رَبِّكَ كَدْحًا﴾ (۸۴-۶) تو

اپنے پروردگار کی طرف (پہنچنے میں) خوب کوشش کرتا  
 ہے۔

اور کبھی كَذْحُ بمعنی كَذْمُ بھی آتا ہے جس کے معنی دانت  
 کاٹنے کا نشان کے ہیں۔

### (ک در)

الْكَدْرُ کے معنی کسی چیز میں گدلاپن کے ہیں

اور یہ صَفَاءُ (صفائی) کی ضد ہے، مثلاً: عَيْشُ كَدْرٍ -

تیرہ زندگی۔ الْكُدْرَةُ کے معنی بھی گدلاپن کے ہیں مگر اس

کا استعمال خصوصیت کے ساتھ رنگ میں ہوتا ہے اور

كَدُورَةُ کا پانی اور زندگی میں۔

الْإِنْكِدَارُ: (انفعال) اس تغیر کو کہتے ہیں جو کسی چیز کے

بکھر جانے سے واقع ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَإِذَا النُّجُومُ اِنْكَدَرَتْ﴾ (۸-۲) اور جب

① قاله حسان بن نشبه واوله: ابوا ان يببحوا اجارهم لعدوهم. والبيت من قصيدة حماسية في اربعة ابيات راجع  
 المرزوقي رقم ۱۱۳ وفي التبریزی حتى تكورا ای من كور العمامة والمعنى واحد قال ابو محمد الاعرابی واسم الشاعر  
 مصحف والصواب حساس بن نشبه قال جریر یهجو حذوب بن خربع التیمی: احذوب اشبهت التی كان بظرها كطروث  
 ارض غیر ذات اناس: لقد شهدت يتم علی ام حذوب كان سراة التیم رهط حساس

﴿وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا﴾ (۲-۳۹) اور ہماری آیتوں کو جھٹلایا۔

﴿رَبِّ انصُرْنِي بِمَا كَذَّبُون﴾ (۲۳-۲۶) کہ پروردگار! انہوں نے مجھے جھٹلایا ہے تو میری مدد کرو۔ ﴿بَلْ كَذَّبُوا بِالْحَقِّ﴾ (۵۰-۵۰) بلکہ انہوں نے حق کو جھوٹ سمجھا۔

﴿كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ فَكَذَّبُوا عَبْدَنَا﴾ (۵۳-۹) ان سے پہلے نوح کی قوم نے بھی تکذیب کی تھی تو انہوں نے ہمارے بندے کو جھٹلایا۔

﴿وَإِنْ يُكَذِّبُوكَ فَقَدْ كَذَّبَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ﴾ (۳۵-۲۵) اور (اے پیغمبر) اگر یہ تمہاری تکذیب کریں تو جو لوگ ان سے پہلے تھے وہ بھی تکذیب کر چکے ہیں۔

﴿فَإِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُونَكَ﴾ (۶-۳۳) یہ تمہاری تکذیب نہیں کرتے۔

ایک قراءت میں لَا يُكَذِّبُونَكَ ہے۔ یعنی وہ نہ تجھے جھوٹا پاتے ہیں۔ اور نہ ہی تیرا جھوٹ ثابت کر سکتے ہیں۔ اور آیت کریمہ:

﴿حَتَّىٰ إِذَا اسْتَيْسَسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوا أَنَّهُمْ قَدْ كُذِّبُوا جَاءَهُمْ نَصْرُنَا﴾ (۱۲-۱۱۰) یہاں تک کہ جب پیغمبرنا امید ہو گئے اور انہوں نے خیال کیا (کہ اپنی نصرت کے بارے میں جو بات انہوں نے کہی تھی اس میں وہ سچے نہ نکلے۔

یعنی انہوں نے یقین کر لیا کہ یہ لوگ جن کی طرف انہیں بھیجا گیا ہے تکذیب ہی کریں گے تو کُذِّبُوا کے معنی جھٹلائے جانے کے ہیں جیسے فُتِّقُوا وَحُطِّتُوا کے معنی کسی کی طرف فتح یا خطا کاری کی نسبت کرنے کے ہیں۔

صحیح ہے مگر ان کے ضمیر اس کے خلاف ہیں۔ اور آیت کریمہ:-

﴿لَيْسَ لَوْفَعَتِهَا كَاذِبَةٌ﴾ (۲-۵۶) اس کے واقع ہونے میں کچھ جھوٹ نہیں ہے۔

میں نفس فعل یعنی وقوع کی طرف کذب کی نسبت کی ہے۔ جیسا کہ فِعْلَةٌ صَادِقَةٌ وَفِعْلَةٌ كَاذِبَةٌ کا محاورہ ہے اور آیت کریمہ:

﴿نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ﴾ (۹۶-۱۶) یعنی اس جھوٹے خطا کار کی پیشانی (کے بال) میں ناصیہ کو مبالغہ کے طور پر کاذب (کہا ہے) اور كَذَّابٌ كَذُوبٌ، كَذْبُذْبٌ وَكَيْدْبَانٌ یہ سب مبالغہ کے صیغے ہیں۔ محاورہ ہے۔

لَا مَكْذُوبَةٌ یعنی..... میں تیرے سامنے جھوٹ نہیں بولتا۔ كَذَّبْتُكَ حَدِيثًا: میں نے تم سے جھوٹ کہا۔ قرآن میں ہے۔

﴿الَّذِينَ كَذَّبُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ﴾ (۹-۹۰) جنہوں نے خدا اور رسولؐ سے جھوٹ بولا۔

اور کبھی دو مفعولوں کی طرف متعدی ہوتا ہے جیسا کہ آیت:-

﴿لَقَدْ صَدَقَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ الرُّوْيَا بِالْحَقِّ﴾ میں صدق دو مفعولوں کی طرف متعدی ہے۔ محاورہ ہے۔

كَذَّبَهُ كَذِبًا وَكَذَّابًا: یعنی اس کے سامنے جھوٹ بولا۔ اَكْذَبْتُهُ: میں نے اسے جھوٹا پایا۔ كَذَّبْتُهُ: میں نے اس کی طرف جھوٹ کی نسبت کی (یعنی اسے جھوٹا کہا) خواہ وہ

واقعہ میں سچا ہے یا جھوٹا۔ دونوں حالتوں میں اس کا استعمال ہو سکتا ہے۔ لیکن قرآن پاک میں صرف سچے آدمی کی تکذیب پر اس کا استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ فرمایا۔

چنانچہ فرمایا:

﴿فَقَدْ كَذَبْتَ رَسُولٌ مِّنْ قَبْلِكَ﴾ (۳۵-۴) تو تم سے پہلے بھی پیغمبر جھٹلائے گئے ہیں۔

﴿فَكَذَّبُوا رُسُلِي﴾: تو انہوں نے میرے پیغمبروں کو جھٹلایا۔

﴿إِنْ كُلُّ آلَا كَذَّبَ الرُّسُلَ﴾ (۳۸-۱۳) (ان) سب نے پیغمبروں کو جھٹلایا۔

مذکورہ بالا آیت (۱۲-۱۱) میں ایک قراءت کُذِّبُوا تحقیق دال بھی ہے ۱ جو کہ کَذَّبْتُكَ حَدِيثًا سے ماخوذ ہے اس صورت میں کُذِّبُوا کا فاعل کفار ہوں گے یعنی حتی کہ کفار نے یہ خیال کیا کہ پیغمبر جھوٹ بولتے ہیں کہ اگر تم ایمان نہ لائے تو تم پر عذاب نازل ہوگا اور کفار کے دلوں میں یہ خیال اس بنا پر پیدا ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں مہلت دی اور فوراً عذاب نازل نہ کیا۔ اور آیت ﴿لَا يَسْمَعُونَ فِيهَا لَغْوًا وَلَا كِذَابًا﴾ (۷۸: ۲۵) (وہاں نہ وہ بیہودہ بات سنیں گے نہ جھوٹ (وخرافات) میں کِذَاب کے معنی تَکْذِيب کے ہیں۔ یعنی وہ جھوٹ ہی نہیں بولیں گے حتی کہ ایک دوسرے کی تکذیب کی نوبت آئے لہذا جنت میں تکذیب

کی نفی کذب کی نفی کو مستلزم ہے ایک قراءت میں کِذَابًا ہے۔ جو کہ باب مفعلہ کا مصدر ہے۔ اس صورت میں معنی یہ ہوں گے۔ ”کہ اہل جنت باہم کذب بیانی نہیں کریں گے۔“ جس طرح کہ لوگ دنیا میں کرتے ہیں۔ محاورہ ہے۔

حُمِلَ فُلَانٌ عَلَىٰ فِرْيَةٍ وَكَذِبَ: فُلَانٌ کو جھوٹ بولنے پر اکسایا گیا ہے۔ جیسا کہ اس کی ضد میں صَدَقَ استعمال ہوتا ہے۔ اور جب انوفی کے متعلق یہ یقین ہو کہ کچھ عرصہ تک اس کا دودھ خشک نہیں ہوگا۔ لیکن توقع کے خلاف اس مدت سے پہلے ہی خشک ہو جائے تو کہا جاتا ہے كَذَبَ لَبَنُ النَّاقَةِ: انوفی کا دودھ توقع کے خلاف خشک ہو گیا اور كَذَبَ عَلَيْكَ الْحَجُّ فَبَادِرُ کے بعض نے یہ معنی کیے ہیں کہ تم پر حج فرض ہو چکا ہے۔ اسے فوراً ادا کرو۔ ۵ (۹۲) اور اصل حج کو اس غائب آدمی کے ساتھ تشبیہ دی ہے جس کی آمد میں دیر ہو گئی ہے اور یہ قَدْ فَاتَ الْحَجُّ فَبَادِرُ۔ (کہ حج فوت ہونے کو ہے لہذا جلدی کرو) کے ہم معنی ہے اور كَذَبَ عَلَيْكَ الْعَسَلُ میں عَسَل منصوب علی الاغراء ہے۔ یعنی شہد ہاتھ سے نہ نکل جائے۔ ۵ (۹۳)

۱ قال الطبری: وذلك قراءة بعض قراء المدينة وعلمة قرار اهل الكوفة ونحن نختار هذا القراءة واماخذ من التفسير ص (۸۵ ج ۱۲)۔

۲ قاله عمر بن الخطاب رضى الله تعالى عنه انظر للآخر معانيه المختلفة الصحاح واللسان (كذب) واصلاح المنطق لابن السكيت (۳۲۴) قال في الدنيا (۱/ ۱۳۲) ان لاحمد بن محمد لاغسيكفي كتاب كذب عليك كذا، وفي النوادر (۱۱۲/ ۱۱۵): قال ابو عبيدة الحج مرفوع على الاغراء ثم ذكر الشاهد وجاء في المنصب ايضا انتهى مختصرا وانظر للآخر ايضا غريب ابى عبيد ۳/ والمعاني للقبتي (۱۹۰) لزوم الحج ۱۲۔

۳ وحينئذ يكون عليك اسم فعل بمعنى الزم وفي ابدال ابى الطيب (۲/ ۳۱۹) والفاث (۲/ ۱۹۶) (وفيه البحث على طوله): وشكا عمرو بن معديكرب الى عمر بن الخطاب المعص (اي التواء عصب الرجل فقال كذب عليك العسل اي عليك بالعدد فالعسل ههنا بمعنى العسلان اي الاسراع ومقاربة الخطو كما يفعل الذئب اذا قارب من الشئ والمثل يضرب على طرق شتى قال ابو شميل اللغوي كذب العسل اي امكنك فاعسل واسرع ورفع العسل بكذب ومعناه النصب لانه يريد ان يامر به بالعسلان كما يقال امكنك الصيد فازمه وانظر ايضا الدرة للحريري مع شرح الخفاجي (۱۴۹- ۱۵۰) فان الشارح قد حقق القول بانه يجوز ان نصب ورفع على العسل والحج۔



کہتے ہیں۔ اور لوگوں کی مجتمع جماعت پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔

الْكَرْكُرَةُ۔ کے معنی ہوا کے بادل کو چلانا کے ہیں اور یہ کُر سے فعل رباعی ہے۔

### (ک ر ب)

الْكَرْبُ: کے معنی سخت غم کے ہیں۔ قرآن

پاک میں ہے:

﴿فَنَجَّيْنَاهُ وَآهْلَهُ مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيمِ﴾ (۷۶-۲۱)  
تو ان کو اور ان کے ساتھیوں کو بڑی گھبراہٹ سے نجات دی۔

اور كُرْبَةٌ، غُمَّة کی طرح ہے یہ اصل میں كَرْبُ الْأَرْضِ سے مشتق ہے جس کے معنی زمین میں قلبہ رانی کے ہیں۔ اور غم سے بھی چونکہ طبعیت الٹ پلٹ جاتی ہے۔ اس لیے اسے كَرْبُ کہا جاتا ہے۔ مثل مشہور ہے۔<sup>۱</sup>

الْكَرَابُ عَلَى الْبَقَرِ: یعنی ہر آدمی کو اس کا کام کرنے دو اور یہ الْكِلَابُ عَلَى الْبَقَرِ کے قبیل سے نہیں ہے<sup>۲</sup> اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ كِرَابُ (سخت غم) كَرَبَتِ الشَّمْسُ سے ماخوذ ہو جس کے معنی ہیں سورج غروب ہونے کے قریب ہو گیا اور اَنَاءُ كَرَبَانُ میں كَرَبَانُ بمعنی قَرَبَانُ ہے۔ یعنی تقریباً بھرا ہوا برتن اور یہ بھی ہو سکتا ہے۔ کہ كَرْبُ (غم) الْكَرْبُ سے مشتق ہو جس کے معنی سخت گرہ کے ہیں جو ڈول کے ساتھ رسی میں لگی رہتی

بعض نے کہا ہے کہ یہاں عَسَلُ بمعنی عَسَلَانُ اور عَسَلَانُ کے معنی ایک قسم کی دوڑ کے ہیں۔ الْكَذَابَةُ: ایک قسم کا کپڑا جس پر مصنوعی نقش و نگار کیا گیا ہو مگر ایسا معلوم ہو کہ اس کا نقش و نگار اصلی ہے۔ اس کے دیکھنے میں چونکہ انسان دھوکا کھا جاتا ہے۔ اس لیے اسے كَذَابَةٌ کہا جاتا ہے۔

### (ک ر ر)

الْكَرُّ: اس کے اصل معنی کسی چیز کو بالذات بالفعل پلٹانا یا موڑ دینا کے ہیں۔ اور نئی ہوئی رسی کو بھی کُر کہا جاتا ہے۔ یہ اصل میں مصدر ہے مگر بطور اسم استعمال ہوتا ہے۔ اس کی جمع كُرُورُ آتی ہے اسی سے الْكَرَّةُ (دوسری بار) ہے جیسے فرمایا:

﴿ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ﴾ (۶-۱۷) پھر ہم نے دوسری بار تم کو ان پر غلبہ دیا۔

﴿قُلُوا أَنْ لَنَا كَرَّةٌ فَنَكُونُ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ﴾ (۱۰۲-۲۶) کاش ہمیں دنیا میں بھی پھر جانا ہو تو ہم مومنوں میں ہو جائیں۔

﴿وَقَالَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا لَوْ أَنْ لَنَا كَرَّةٌ﴾ (۱۶۷-۲) (یہ حال دیکھ کر) پیروی کرنے والے (حسرت سے) کہیں گے کہ اے کاش! ہمیں پھر دنیا میں جانا نصیب ہوتا۔

لَوْ أَنَّ لِي كَرَّةً: اگر مجھے پھر ایک بار دنیا میں جانا نصیب ہوتا۔

الْكَرْكِرَةُ: (مِثْلُ زِبْرَجَةٍ) شتر کے سینہ کی سخت جگہ کو

① قال فی المیدانی (۱۴۲/۲): یضرب فی تحلیۃ المرء وصناعة۔

② انظر للمثل "الكلاب على البقر" الحيوان للملاحظ (۲۶۰: ۱) واللسان (كلب) والعيون (۲: ۲) وفي التاج وكذا في الحيوان للدميري كلد في كثير وايضا انظر المزهر ۶۵ قال في مجمع الامثال يضرع عند تحريش بعض القوم على بعض من غير مبالاة۔

چیز کی اصل اور بنیاد کو کہتے ہیں۔  
محاورہ ہے۔

هُوَ قَدِيمُ الْكُرْسِيِّ: اس کی بنیاد پرانی ہے اور ہر چیز کے ڈھیر کو کُرسُ کہا جاتا ہے اور کُروُسُ کے معنی بڑے سروالا کے ہیں۔ اور آیت کریمہ: ﴿وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمُوتِ وَالْأَرْضَ﴾ (۲-۲۵۵) اس کی ”کُرسی“ آسمان اور زمین سب پر حاوی ہے کی تفسیر میں ابن عباسؓ سے مروی ہے۔ کہ کُرسی سے علم باری تعالیٰ مراد ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ کُرسی کے معنی حکومت و اقتدار کے ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ فلک محیط یعنی فلک الافلاک کا دوسرا نام کُرسی ہے \* اس کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے۔ کہ سات آسمان کی مثال کُرسی کے مقابلہ میں ایسی ہے جیسے بیابان میں ایک انگوٹھی پڑی ہو۔ \*

### (ک ر م)

الْكُرْمُ: جب اللہ کی صفت ہو تو اس سے احسان و انعام مراد ہوتا ہے جو ذات باری تعالیٰ سے صادر ہوتا رہتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:  
﴿فَإِنَّ رَبِّي غَنِيٌّ كَرِيمٌ﴾ (۲۷-۴۰) تو میرا پروردگار بے پرواہ اور کرم کرنے والا ہے۔

ہے۔ اور غم بھی دل پر بمنزلہ گرہ کے بیٹھ جاتا ہے۔ اس لیے اسے کُرب کہا جاتا ہو۔ اَكْرَبْتُ الدَّلُو: ڈول کے دستہ میں چھوٹی سی رسی باندھنا۔

### (ک ر س)

الْكُرْسِيُّ: عوام کے عرف میں اس شے کو کہتے ہیں جس پر بیٹھا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:  
﴿وَالْقَيْنَا عَلَى كُرْسِيِّهٖ جَسَدًا ثُمَّ أَنَابَ﴾ (۳۸-۳۴) اور ان کے تخت پر ایک دھڑ ڈال دیا پھر انہوں نے (خدا کی طرف) رجوع کیا۔  
یہ اصل میں کُرسُ کی طرف منسوب ہے اور کُرس کے معنی ہیں، اوپر تلے جم جانے والا اور جمع ہو جانے والا۔ اسی سے کُرسَاۃ (مجموعہ اوراق) ہے۔ کُرسَتْ الْبَنَاءُ فَتَكْرَسُ: میں نے عمارت کی بنیاد رکھی چنانچہ وہ بنیاد پڑ گئی عجاج نے کہا ہے \* (الرجز)

(۴۰۸) يَا صَاحِبَ هَلْ تَعْرِفُ رَسْمًا مُّكَرَّسًا  
قَالَ نَعَمْ اَعْرِفُهُ وَاَبَاءَ سَا

اے میرے دوست: کیا تم نشان منزل کو پہنچانتے ہو جہاں کہ اونٹوں کا بول و براز جما ہوا ہے۔ اس نے کہا ہاں پہنچانتا ہوں اور غم زدہ ہو کر خاموش ہو گیا اَلْكُرْسُ کسی

① قاله العجاج واثلهما وانحلبت عيناه من فرط الاسى وفي اللسان والبسابل و اباسا، انظر للشطر ديوانه ١٦ و الكامل ٥٢٩ والطبري (١١٦:٧) والقرطبي (٤٢٧:٦) واللسان و التاج (بلس، كرس) ومعاني القرآن المنسوب الى الفراء (٢٣٥:١) والمكرس موضع فيه الكروس اي ابوال الابل وابعار هما يتلبدها بعضها على بعض والرجز ايضا في الطبري (٢٦:٢١/٢٢٧:١) ومحازا القرآن رقم (٢١٧) وتهذيب الانفاذ ٦٢٥ والبحر (٢: ٢٨٠) والثالث فقط في محاز القرآن (١٦١)

② فسرہ الرمخشري بالملك والعلم قال ومنه يقال للعلماء الكراسي ١٢۔

③ اخرجه ابن جرير وابن المنذر عن ابن عباس وروى بمعناه مرفوعا عن ابى ذر كما فى زوائد ابن حبان رقم (٩٤) فى اثناء حديث طويل وقال فى آخره وفيه ابراهيم بن هشام بن يحيى الغساني قال ابو حاتم وغيره كذاب انظر لترجمته الحرح عليه لسان الميزان ١٢۔

﴿إِنَّهُ لَقُرْآنٌ كَرِيمٌ﴾ (۵۶-۷۷) کہ یہ بڑے رتبے کا قرآن پاک ہے۔

﴿وَقُلْ لَهُمَا قَوْلَا كَرِيمًا﴾ (۱۷-۲۲) اور ان سے بات ادب کے ساتھ کرنا۔

الْأَكْرَامُ وَالَّتَّكْرِيمُ کے معنی ہیں: کسی کو اس طرح نفع پہنچانا کہ اس میں اس کی کسی طرح کی سبکی اور خفت نہ ہو یا جو نفع پہنچایا جائے وہ نہایت باشرف اور اعلیٰ ہو اور الْمُكْرَمُ کے معنی معزز اور باشرف کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿هَلْ أَتَاكَ حَدِيثُ ضَيْفِ إِبْرَاهِيمَ الْمُكْرَمِينَ﴾ (۵۱-۲۳) بھلا تمہارے پاس ابراہیم علیہ السلام کے معزز مہمانوں کی خبر پہنچی ہے؟ اور آیت کریمہ:-

﴿بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُونَ﴾ (۲۱-۲۶) کے معنی یہ ہیں کہ وہ اللہ کے معزز بندے ہیں جیسے فرمایا: ﴿وَجَعَلَنِي مِنَ الْمُكْرَمِينَ﴾ (۳۶-۲۷) اور مجھے عزت والوں میں کیا۔

﴿كَرَامًا كَاتِبِينَ﴾ (۸۲-۱۱) عالی قدر (تمہاری باتوں کے) لکھنے والے۔

﴿بِأَيْدِي سَفَرَةٍ كَرَامٍ بَرَرَةٍ﴾ (۸۰-۱۶) (ایسے) لکھنے والوں کے ہاتھوں میں جو سردار اور نیکو کار ہیں۔ اور آیت کریمہ:

﴿ذُؤَالْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ﴾ (۵-۲۷) اور جو صاحب جلال اور عظمت ہے۔

میں اکرام کا لفظ ہر دو معنی پر مشتمل ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ عزت و تکریم بھی عطا کرتا ہے اور باشرف چیزیں بھی بخشتا ہے۔<sup>۱</sup>

اور جب انسان کی صفت ہو، تو پسندیدہ اخلاق اور افعال مراد ہوتے ہیں جو کسی انسان سے ظاہر ہوتے ہیں۔ اور کسی شخص کو اس وقت تک کریم نہیں کہا جاسکتا جب تک کہ اس سے کرم کا ظہور نہ ہو چکا ہو۔

بعض علماء نے کہا ہے کہ حریت اور کرم ہم معنی ہیں لیکن حریت کا لفظ جھوٹی بڑی ہر قسم کی خوبیوں پر بولا جاتا ہے اور کرم صرف بڑے بڑے محاسن کو کہتے ہیں۔ مثلاً جہاد میں فوج کے لیے ساز و سامان مہیا کرنا یا کسی ایسے بھاری تادان کو اٹھالینا جس سے قوم کے خون اور جان کی حفاظت ہوتی ہو۔ اور آیت:-

﴿إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ﴾ (۴۹-۱۳) اور خدا کے نزدیک تم میں زیادہ عزت والا وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے۔

میں ”اتقی“ یعنی سب سے زیادہ پرہیزگار کو ”اکرم“ یعنی سب سے زیادہ عزت و تکریم کا مستحق ٹھہرانے کی وجہ یہ ہے کہ کرم بہترین صفات کو کہتے ہیں اور سب سے بہتر اور پسندیدہ کام وہی ہو سکتے ہیں جن سے رضا الہی کے حصول کا قصد کیا جائے لہذا جو جس قدر زیادہ پرہیزگار ہوگا اسی قدر زیادہ واجب التکریم ہوگا۔

نیز التَّكْرِيمُ ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو اپنی ہم نوع چیزوں میں سب سے زیادہ باشرف ہو چنانچہ فرمایا: ﴿فَأَنْبَتْنَا فِيهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيمٍ﴾ (۳۱-۱۰) پھر (اس سے) اس میں ہر قسم کی نفیس چیزیں اگائیں۔ ﴿وَزُرُوعٍ وَمَقَامٍ كَرِيمٍ﴾ (۴۳-۲۶) اور کھیتیاں اور نفیس مکان۔

۱۔ وهذا المعنى هو المراد (۹۶-۳) (۱۷-۶۲) (۸۹-۱۵)

## (ک ر ہ)

الْكُرْهُ وَالْكُرْهُ: (سخت ناپسندیدگی) ہم معنی ہیں۔ جیسے ضَعْفٌ وَضَعْفٌ بعض نے کہا ہے کہ کُرْہ (لَفَتْ الکاف) اس مشقت کو کہتے ہیں۔ جو انسان کو خارج سے پہنچے اور اس پر زبردستی ڈالی جائے۔ اور کُرْہ (بضم الکاف) اس مشقت کو کہتے ہیں جو اسے ناخواستہ طور پر خود اپنے آپ سے پہنچتی ہے۔ اور یہ دو قسم پر ہے۔ ایک وہ جو طبعاً ناگوار ہو۔ اور دوم وہ جو عقل یا شریعت کی رو سے مکروہ ہو لہذا ایک ہی چیز کے متعلق انسان کہہ سکتا ہے۔ کہ میں اسے پسند کرتا ہوں اور برا بھی سمجھتا ہوں یعنی مجھے طبعاً تو پسند ہے لیکن عقل و شریعت کی رو سے اسے ناپسند کرتا ہوں یا عقل و شریعت کی رو سے مجھے پسند ہے لیکن طبعاً ناپسند ہے چنانچہ آیت کریمہ:

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهُ لَكُمْ (مسلمانو) تم پر (خدا کے رستے میں) لڑنا فرض کر دیا گیا ہے۔ وہ تمہیں ناگوار تو ہوگا۔

میں کُرْہ کے معنی یہ ہیں کہ تمہاری طبیعتیں اسے ناپسند کرتی ہیں پھر اس کے بعد۔

﴿وَعَسَىٰ أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ﴾ (مگر) عجب نہیں کہ ایسے چیز تم کو بری لگے اور تمہارے حق میں بھلی ہو۔

فرما کر وضاحت کر دی ہے۔ کہ انسان کو چاہیے کہ کسی چیز کو اس وقت تک محبوب یا مکروہ نہ سمجھے جب تک کہ اس کی حقیقت حال سے آگاہ نہ ہو جائے۔

كَرِهْتُ کالفاظ دونوں قسم کی کراہت کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔ گویا یہ تر کُرْہ یعنی ناگوار کے معنی دیتا ہے۔

چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ﴾ (۳۲-۹) اگرچہ کافروں کو برا ہی لگے۔

﴿وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ﴾ (۳۳-۹) اور اگرچہ کافر ناخوش ہی ہوں۔

﴿وَأَنَّ فَرِيقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ لَكَرِهُونَ﴾ (۵-۸) اور (اس وقت) مومنوں کی ایک جماعت ناخوش تھی۔ اور آیت کریمہ: ﴿أَيُّحِبُّ أَحَدُكُمْ أَنْ يَأْكُلَ لَحْمَ أَخِيهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوهُ﴾ (۱۲-۴۹) کیا تم میں سے کوئی اس بات کو پسند کرے گا کہ وہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے اس سے تو تم ضرور نفرت کرو گے۔

میں اس بات پر تنبیہ ہے کہ انسان اپنے بھائی کا گوشت کھانے کا خواہ قصد بھی کرے مگر طبعاً اسے اس سے ضرور نفرت ہوگی اور آیت کریمہ: ﴿لَا يَجِلُّ لَكُمْ أَنْ تَرِثُوا النِّسَاءَ كَرِهًا﴾ تم کو جائز نہیں کہ زبردستی عورتوں کے وارث بن جاؤ (۱۹-۴) میں ایک قراءت کُرْہا بھی ہے۔ الا کُرْہا: اس کے معنی کسی کو ایسے کام پر مجبور کرنا کے ہیں جسے وہ ناپسند کرتا ہو۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَلَا تَكْرَهُوا قِتَالَكُمْ عَلَى الْبَغَاءِ﴾ (۳۳-۲۴) اور اپنی لونڈیوں کو..... بدکاری پر مجبور نہ کرنا۔

میں بدکاری پر مجبور کرنے سے منع فرمایا ہے کیونکہ اس پر کُرْہ اور کُرْہ دونوں کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ اور آیت:

﴿لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ﴾ (۲۵۶-۲) دین (اسلام) میں زبردستی نہیں ہے کی مختلف توجیہات بیان کی گئی ہیں۔

اول یہ کہ شروع اسلام میں یہ حکم تھا کہ کسی پر اسلام پیش کیا جائے اگر وہ اپنی خوشی سے مسلمان ہو جائے تو فسخ

اس پر جبر نہ کیا جائے۔<sup>①</sup> کسی عمل کو قبول نہیں کرتا ﴿وَاللّٰهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ﴾

اسی لیے آنحضرت ﷺ فرمایا ﴿(۹۴)﴾ ((الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ)) کہ اعمال کے ثواب کا مدار نیتوں پر ہے۔ نیز فرمایا ﴿: أَخْلَصْ يَكْفِيكَ الْقَلِيلُ مِنَ الْعَمَلِ﴾ کہ اخلاص کے ساتھ تو تھوڑا عمل بھی کافی ہوتا ہے۔

بعض نے آیت کے معنی یہ کیے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جن احکام کا بھی انسان کو مکلف بناتا ہے تو وہ درحقیقت اسے کسی امر پر مجبور نہیں کرتا بلکہ اپنی ابدی نعمتوں کے حاصل کرنے کی تکلیف دیتا ہے جیسا کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ اس قوم پر تعجب فرماتے ہیں جو زنجیروں میں جکڑے ہوئے جنت کی طرف کھینچے جاتے ہیں۔ ﴿(۹۵)﴾

ششم<sup>(۶)</sup> یہ کہ دین کے معنی اجزاء کے ہیں اور آیت کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ جزائے اعمال پر مجبور نہیں ہے۔ بلکہ اسے اختیار ہے کہ جس کے ساتھ جس طرح چاہے سلوک کرے۔ اور آیت کریمہ: ﴿أَقْبِرَ دِينَ اللّٰهِ يَبْغُونَ وَلَهُ أَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ﴾

دوم یہ کہ یہ حکم اہل کتاب کے ساتھ مخصوص ہے۔ یعنی اگر وہ لوگ جزیہ دینا قبول کر لیں اور دوسری شرائط کی پابندی کریں تو انہیں مسلمان ہونے پر مجبور نہ کیا جائے۔<sup>②</sup>

سوم<sup>(۳)</sup> یہ کہ اس آیت کا تعلق مسلمانوں کے ساتھ ہے اور آیت کے معنی یہ ہیں کہ اگر کسی مسلمان کو دین باطل کے قبول کرنے پر مجبور کیا جائے اور وہ زبان سے اس کا اقرار کر کے اس دین میں داخل ہو جائے تو اس پر کفر کا حکم عائد نہیں ہوتا۔ جیسا کہ آیت:

﴿إِلَّا مَنْ أَكْرِهَ وَقَلْبُهُ مُطْمَئِنٌّ بِالْإِيمَانِ﴾ (۱۶-۱۱۶) وہ نہیں جو (کفر پر زبردستی) مجبور کیا جائے اور اس کا دل ایمان کے ساتھ مطمئن ہو، سے معلوم ہوتا ہے۔

چہارم<sup>(۴)</sup> زیر بحث آیت کے معنی یہ ہیں کہ جو شخص دنیا میں کسی طرف سے مجبور ہو کر اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتا ہے۔ تو آخرت میں اسے اس کا ثواب نہیں ملے گا بے شک اللہ تعالیٰ دلوں کے بھید خوب جانتا ہے۔ اور وہ اخلاص کے بغیر

① وهذا هو المروى عن عبد الله بن مسعود وابن زيد وسليمان بن موسى وعندهم هذا الحكم منسوخ بآية: جاهد الكفار والمنافقين۔

② وهو المحكى عن الحسن قتادة والضحاك وورد في سبب نزوله يؤيده (روح المعاني ص ۲ ج ۳)

③ قاله وقال هذا يشير كلام مجاهد وأخرج ابن جرير وغيره عن أبي العالية (روح المعاني ۱۸۸/۳)

④ متفق عليه لكن بزيادة "إنما" وابن حبان في صحيحه بدونها (المقاصد ۶۸) ومالك برواية محمد بن الحسن والحاكم في المستدرک وأصحاب السنن كلهم عن عمر وأيضاً مالك في رواية محمد بن الحسن والشافعي في مختصر الربيع والحميدي وابن الجارود وابن خزيمة والطحاوي عن غير عمر أيضاً لكن طرقها كلها ضعيفة راجع للبحث (الفتح الباری) (والعینی) فانهما اشبع الكلام والسيوطي في التدريب في بحث "الشاذ" والحاصل ان الحديث صحيح غريب وقد تواتر معناه (راجع كنز العمال ۳۶-۲۱، ۲۴۵) بعض علماء الازهر جمع اسانيدہ فی رسالہ مسماة الاجتهاد تبخیر احادیث المنہاج۔

⑤ والحديث ابن أبي الدنيا في الاخلاص وللدیلمی فی مسنده باسناد منقطع ولفظه اخلص العمل يحرك من القليل (راجع كنز العمال ج ۳ رقم ۱۳۰) وتخریج العراقی علی الاحیاء (۳۸۶/۴)۔

⑥ البخاری فی صحيحه فی باب الاسارى فی فی السلاسل من حديث ابی هريرة وابوداؤد و مسلم وباختلاف الفاظه الحاكم في المستدرک والطبرانی عن ابی امامة (راجع كنز العمال ۴ رقم ۲۱۹، ۱۷۸)۔

وقت ان کے ایمان نے ان کو کچھ فائدہ نہ دیا۔ سے معلوم ہوتا ہے۔

(۴) چہارم یہ کہ کُفْرًا مسلمان ہونے سے وہ لوگ مراد ہیں جو لڑائی میں جان بچانے کے لیے مسلمان ہو جاتے تھے۔

(۵) اس آیت میں پانچواں قول ابو العالیہ اور مجاہد کا ہے کہ ہر شخص اللہ کے خالق ہونے کا معترف ہے۔ خواہ مشرک ہی کیوں نہ ہو جیسا کہ آیت: ﴿وَلَيْسَ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ لَيَقُولُنَّ اللَّهُ﴾ (۲۵-۳۱) اور اگر تم اس سے پوچھو کہ آسمان اور زمینوں کو کس نے پیدا کیا تو بول انھیں گے کہ خدا نے۔

سے معلوم ہوتا ہے گویا مومن خوشی سے اس کی خالقیت کا اعتراف کرتے ہیں اور کفار زبردستی سے۔

(۶) ابن عباس سے مروی ہے کہ تمام لوگ احوال فطری کے لحاظ سے اس کے فرمانبردار ہیں اگرچہ زبان کے ساتھ وہ اظہار کفر کرتے ہیں اور اس سے مراد ”ذَرِ أَوَّلَ“ کے وقت کا اسلام ہے جس کا ذکر کہ آیت ﴿الْأَسْتَبْرِيَكُمْ قَالُوا بَلَىٰ﴾ (۱۷۲-۷) کہ کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں؟ وہ کہنے لگے: کیوں نہیں، میں پایا جاتا ہے۔ یعنی عقل (وغیرہ) کی قسم کے فطری دلائل مراد ہیں جو اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کے متقنی ہیں اور وہ دلائل وہی جن کی طرف کہ آیت:

﴿وَوَضَّلْنَاهُمْ بِالْغُدُوِّ وَالْآصَالِ﴾ (۱۵-۱۳) اور ان کے سائے بھی صبح وشام (سجدہ کرتے ہیں) میں اشارہ فرمایا ہے۔

(۷) زیر بحث آیت میں ساتواں قول بعض صوفیاء کرام کا

طَوْعًا وَكَرْهًا﴾ (۸۳-۳) کیا یہ (کافر) خدا کے دین کے سوا کسی اور دین کے طالب ہیں حالانکہ سب اہل آسمان و زمین خوشی یا زبردستی سے خدا کے فرمانبردار ہیں۔ کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ طوعًا کا تعلق مَنْ فِی السَّمَوَاتِ کے ساتھ ہے اور کَرْهًا کا تعلق الْآرَضِیْنَ سے اور آیت کے معنی یہ ہیں کہ اہل آسمان تو بطیب خاطر اس کی فرمانبرداری کر رہے ہیں اور اہل زمین زبردستی سے یعنی دلائل فطرت سے مجبور ہو کر اس کی اطاعت کا اظہار کرتے ہیں۔ جیسے کہا جاتا ہے۔

الذَّلَالَةُ أَكْثَرُ هَتَنِیْ عَلَی الْقَوْلِ بِهَذِهِ الْمَسْئَلَةِ کہ دلائل سے مجبور ہو کر میں اس مسئلہ کو مانتا ہوں اور اس قسم کا جبر مذموم نہیں ہے یعنی دلائل سے مجبور ہو کر کسی بات کو مانتا سلب اختیار کو مستلزم نہیں ہے (حتیٰ کہ اس پر عدم جزا کا مسئلہ مرتب ہو جیسا کہ جبر یہ فرقہ کا مذہب ہے)

(۲) اس آیت کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ مومنین تو خوشی سے اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کرتے ہیں اور کافر کراہت یعنی زبردستی سے کیونکہ اللہ تعالیٰ جس بات کا ان سے ارادہ کرتا ہے اور جو بھی ان کے متعلق فیصلہ کرتا ہے۔ وہ اس سے انکار کی طاقت نہیں رکھتے۔

(۳) قتادہ نے اس کو حالت نزع پر محمول کیا ہے۔ کہ عند الموت مومنین تو خوشی سے اور کفار زبردستی سے اس کی فرمانبرداری کا اظہار کرتے ہیں۔ لیکن اس حالت میں ان کا ایمان اللہ تعالیٰ کے ہاں قبول نہیں ہو سکتا۔ جیسا کہ آیت:

﴿فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ إِيْمَانُهُمْ﴾ (۸۵-۴۰) اس

كَسَبْتُ فَلَنَا كَذَا: میں نے فلاں کو اتنا کچھ حاصل کر کے دیا۔ مگر الْاِخْتِسَابُ: ایسا کام کرنے کو کہتے ہیں جس میں انسان صرف اپنے مفاد کو پیش نظر رکھے لہذا ہر اِکْتِسَاب کو کسب لازم ہوتا ہے۔ لیکن ہر کسب کو اِکْتِسَاب لازم نہیں ہے۔ اور یہ خَبَزَ وَ اخْتَبَزَ وَ شَوَى وَ اشْتَوَى، وَ طَبَخَ وَ اطْبَخَ کی طرح ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿اَنْفِقُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا كَسَبْتُمْ﴾ (۲-۲۶۷) جو پاکیزہ اور عمدہ مال تم کھاتے ہو..... اس میں سے راہ خدا میں خرچ کرو۔

کے متعلق آنحضرت ﷺ سے سوال کیا گیا ۵

أَيُّ الْكَسْبِ أَطْيَبُ؟ کہ کونسا کسب زیادہ پاکیزہ ہے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا ((عَمَلُ الرَّجُلِ بِيَدِهِ۔ کہ انسان کا اپنے ہاتھ سے کام کرنا اور نیز فرمایا ۵ (۹۵) ((إِنَّ أَطْيَبَ مَا يَأْكُلُ الرَّجُلُ مِنْ كَسْبِهِ وَإِنَّ وَلَدَهُ مِنْ كَسْبِهِ)) سب سے زیادہ پاکیزہ رزق وہ ہے جو انسان اپنے ہاتھ سے کما کر کھالے اور اسکی اولاد بھی اس کے کسب سے ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿لَا يَقْدِرُونَ عَلَى شَيْءٍ مِمَّا كَسَبُوا﴾ (۲-۲۶۳) (اسی طرح یہ ریا کار) لوگ اپنے اعمال کا کچھ بھی صلہ حاصل نہیں کر سکیں گے اور قرآن پاک میں نیک و بد دونوں قسم کے اعمال کے متعلق یہ فعل استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ اعمال صالحہ کے متعلق فرمایا:

ہے۔ کہ مَنْ اَسْلَمَ طَوْعًا سے وہ لوگ مراد ہیں جو ثواب اور عقاب کے پیش نظر اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری نہیں کرتے بلکہ براہ راست اس ذات کا مشاہدہ کرتے ہیں جو ثواب و عقاب دینے والی ہے اور کَرْهًا سے مراد وہ لوگ ہیں جو صرف ثواب و عقاب کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ اور ثواب کی رغبت یا عذاب کے خوف سے اس کے فرمانبردار رہتے ہیں۔ اور آیت کریمہ:-

﴿وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَكَرْهًا﴾ (۱۳-۱۵) اور جنہی مخلوقات آسمانوں اور زمینوں میں ہیں خوشی سے یا زبردستی سے خدا کے آگے سجدہ کرتی ہیں۔

بھی اس کی مثل ہے (یعنی مذکورۃ الصدر معانی پر محمول ہو سکتی ہے۔)

## (ک س ب)

اَلْكَسْبُ: اصل میں جلب نفع یا خوش نصیبی حاصل کرنے کے لیے کسی چیز کا قصد کرنے کو کسب کہتے ہیں، جیسے کسب مال وغیرہ اور ایسے کام کے قصد پر بھی بولا جاتا ہے جسے انسان اس خیال پر کرے کہ اس سے نفع حاصل ہوگا لیکن الثا اس سے نقصان اٹھانا پڑے۔ پس اَلْكَسْبُ ایسا کام کرنے کو کہتے ہیں جسے انسان اپنی ذات اور اس کے ساتھ دوسروں کے فائدہ کے لیے کرے اسی لیے یہ کبھی دو مغفولوں کی طرف متعدی ہوتا ہے جیسے

① رواہ الترمذی عن عذينة والبخاری عن عبد الله بن عمر والطبرانی واحمد عن رافع بن خديج وابن اسحاق عن علي قال في الكنز (۴ رقم ۶۶۶) ونقد به بهلول وقال الحاكم صحيح الاسناد راجع تخريج العراقي على الاحياء (۶۳/۲-۱۲۶۴)۔

② الحديث في ابی داؤد عن عائشة رضی اللہ عنہا وزوائد بن حبان رقم (۱۰۹۱ و ۱۰۹۲) وکنز العمال (ج ۴ رقم ۴۰، ۳۲، ۳۱) وايضاً تخريج الكشف للحافظ (ص ۱۲۰) رقم (۹۰) وقال الحاكم عن عمارة عن امه عن عائشة وذكر النارقطنی فی العلل وطال ويتعلق بالباب حديث (( انت ومالك لا يليك فارجع اليه )) قال القتيبي في الغريب وبعضهم فسر آية اللهب "وما كسب" اي وما ولد

﴿وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ إِلَّا عَلَيْهَا﴾ (۶-۱۶۴)  
اور جو کوئی برا کام کرتا ہے تو اس کا ضرر اسی کو ہوتا ہے اور  
آیت کریمہ:

﴿ثُمَّ تُوَفَّى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ﴾ (۲-۲۸۱) اور  
ہر شخص اپنے اعمال کا پورا پورا بدلہ پائے گا۔ میں  
مَا كَسَبَتْ کا لفظ نیک و بد دونوں قسم کے اعمال کو شامل  
ہے اور اکتساب کا لفظ بھی ہے۔ چنانچہ اعمال صالحہ کے  
متعلق فرمایا:

﴿لِلرَّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوا وَلِلنِّسَاءِ  
نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ﴾ (۳-۳۲) مردوں کو ان  
کاموں کا ثواب ہے جو انہوں نے کیے اور عورتوں کو ان  
کاموں کا ثواب ہے جو انہوں نے کیے۔

اور آیت کریمہ:

﴿لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ﴾ (۲-۲۸۶)  
اچھے کام کرے گا تو اس کو ان کا فائدہ ملے گا اور برے کام  
کرے گا تو اسے ان کا نقصان پہنچے گا۔

سے بعض نے استدلال کیا ہے کہ کسب کا لفظ اعمال صالحہ  
اور اکتساب کا لفظ اعمال سیئہ کے ساتھ مخصوص ہے اور  
بعض نے کہا ہے کہ کَسَب سے اعمال اخروی اور  
اكتساب سے مکاسب دنیوی مراد ہیں۔

بعض نے کہا ہے کہ کسب سے مراد ہر وہ عمل ہے جو فعل خیر  
یا جلب نفع کے قبیل سے ہو اور دوسروں کو نفع پہنچانے کے  
لیے جائز طریقے سے انسان اسے کرتا ہے اور اکتساب  
سے ہر وہ نفع مراد ہے جو انسان اپنی ذات کے لیے حاصل  
کرتا ہے بشرطیکہ اس کا حصول اس کے لیے جائز ہو لہذا  
آیت میں اس امر پر متنبہ کیا ہے کہ جو فعل انسان دوسروں

﴿أَوْ كَسَبَتْ فِي إِيمَانِهَا خَيْرًا﴾ (۶-۱۵۸) یا اپنے  
ایمان کی حالت میں نیک عمل نہیں کیے ہو گئے اور آیت  
کریمہ:

﴿وَمِنْهُمْ مَّنْ يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً  
الْآيَةِ﴾ کے بعد فرمایا:

﴿وَمِمَّا كَسَبُوا﴾ (۲-۲۰۲) ان کے کاموں کا (حصہ)  
اور اعمال بد کے متعلق فرمایا۔

﴿أَنْ تُبْسَلَ نَفْسٌ بِمَا كَسَبَتْ﴾ (۶-۷۰) تاکہ  
(قیامت کے دن کوئی شخص اپنے اعمال کی سزا میں ہلاکت  
میں نہ ڈالا جائے۔

﴿أُولَٰئِكَ الَّذِينَ أُبْسِلُوا بِمَا كَسَبُوا﴾ (۶-۷۰)  
یہی لوگ ہیں کہ اپنے اعمال کے وبال میں ہلاکت میں  
ڈالے گئے۔

﴿إِنَّ الَّذِينَ يَكْسِبُونَ الْأَثَمَ سَيَجْزَوْنَ بِمَا  
كَانُوا يَفْتَرُونَ﴾ (۶-۱۲۰) جو لوگ گناہ کرتے ہیں وہ  
عنقریب اپنے کیے کی سزا پائیں گے ﴿فَوَيْلٌ لَهُمْ مِّمَّا  
كَتَبَتْ أَيْدِيهِمْ وَوَيْلٌ لَهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُونَ﴾  
(۲-۷۹) ان پر افسوس ہے اس لیے کہ (بے اصل  
باتیں) اپنے ہاتھ سے لکھتے ہیں اور پھر ان پر افسوس ہے۔  
اس لیے کہ ایسے کام کرتے ہیں۔

﴿فَلْيَضْحَكُوا قَلِيلًا وَلْيَبْكُوا كَثِيرًا جَزَاءً بِمَا  
كَانُوا يَكْسِبُونَ﴾ (۹-۸۲) یہ (دنیا میں) تھوڑا سا  
ہنس لیں اور (آخرت میں) ان کو اعمال کے بدلے جو  
کرتے رہے ہیں بہت سارونا ہوگا۔ ﴿وَلَوْ يَوَّاخِذُ  
اللَّهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوا﴾ (۳۵-۳۵) اور اگر خدا  
لوگوں کو ان کے اعمال کے سبب پکڑنے لگتا۔



﴿أَوْ تُسْقِطَ السَّمَاءَ كَمَا زَعَمَتْ عَلَيْنَا كِسْفًا﴾  
(۱۷-۹۲) یا جیسا تم کہا کرتے ہو ہم پر آسمان کے ٹکڑے  
لا کر گراؤ۔

ایک قراءت میں کِسْفًا بسکون سین ہے اور  
کِسْف کا واحد کِسْفَةٌ ہے جیسے سِدْرَةٌ وَسِدْرٌ اور  
فرمایا۔

﴿وَأَن يَرَوْا كِسْفًا مِّنَ السَّمَاءِ﴾ (۵۲-۴۳) اور  
اگر یہ آسمان سے عذاب کا کوئی ٹکڑا گرتا ہوا دیکھیں۔  
ابوزید نے کہا ہے ﴿كَسَفْتُ الثُّوبَ﴾ (ض) کِسْفًا  
کے معنی کپڑے کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے ہیں بعض نے  
كَسَفْتُ عُرْقُوبَ الْإِبِلِ بھی کہا جس کے معنی اونٹ  
کی کوچ کاٹ دینے ہیں (لیکن) بعض اہل لغت کے  
نزدیک اس معنی میں صرف كَسَحْتُ (ف) ہی استعمال  
ہوتا ہے۔

### (ک س ل)

الْكَسْلُ کے معنی کسی ایسے معاملہ میں گراں  
باری ظاہر کرنا کے ہیں۔ جس میں گرانباری کرنا مناسب نہ  
ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اسے مذموم خیال کیا جاتا ہے اور یہ  
باب کَسِلَ (س) فَهُوَ كَسِلٌ وَكَسْلَانٌ کا مصدر  
ہے۔ اور كَسْلَانٌ کی جمع كُسَالَى وَكَسَالَى آتی ہے  
چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔

کو فائدہ پہنچانے کے لیے کرتا ہے۔ اس کا اسے ثواب  
حاصل ہوگا اور جو صرف اپنی ذات کے لیے حاصل کرتا ہے  
خواہ اس کا حصول جائز طریقے پر ہی کیوں نہ ہو، تو یہ  
شاذ و نادر ایسا ہوتا ہے کہ اس کا وبال اس پر نہ پڑے تو یہ  
اس مقولہ کی طرف اشارہ ہے کہ جو شخص دنیا حاصل کرنا  
چاہتا ہے اسے چاہیے کہ اپنے آپ کو مصائب کا خوگر  
بنائے جیسا کہ آیت ﴿أَنَّمَا أَمْوَالُكُمُ وَاَوْلَادُكُمْ  
فِتْنَةٌ﴾ (۸-۲۸) کہ تمہارا مال اور اولاد بڑی آزمائش  
ہے۔ اور اس قسم کی دوسری آیات سے ثابت ہوتا ہے۔

### (ک س ف)

كُسُوفُ الشَّمْسِ وَالْقَمَرِ کے معنی ہیں:  
سورج یا چاند کا کسی خاص عارضہ سے مستور یعنی گہن میں  
آ جانا کے ہیں۔ اور تشبیہ کے طور پر چہرہ یا حالت کے  
خراب ہونے پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے جیسے كَسِيفٌ  
الْوَجْهَ یا كَسِيفُ الْحَالِ۔

الْكِسْفَةُ: کے معنی بادل، روئی یا اس قسم کے دوسرے  
متخلخل اجسام کے ٹکڑے کے ہیں اس کی جمع كِسْفٌ آتی  
ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔ ﴿ثُمَّ يَجْعَلُهَا  
كِسْفًا﴾ (۳۰-۲۸) اور اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے۔  
﴿فَأَسْقِطْ عَلَيْنَا كِسْفًا مِّنَ السَّمَاءِ﴾ (۲۶-۱۸۷)  
تو ہم پر آسمان سے ایک ٹکڑا لا کر گراؤ۔

① ابوزید البلخی احمد بن سہل (۲۳۵-۳۲۲) أحد الکبار، الافذاذ من علماء الاسلام وصاحب التالیفات و کتابہ نظم القرآن من امثل ما کتب فیہ قال ابو حیان فی کتاب "البصائر والذخائر" قال ابو حامد القاضی لم ار کتا با فی القرآن مثل کتاب ابی زید البلخی و فی الفہرست ۵۹ لہ کتاب غریب القرآن وقوارع القرآن وغیر ذلک و ہناک ابوزید سعید بن اوس الانصاری ولہ ایضا کتاب النوادر توفی ۲۱۵ الفہرست ۸۷، لکن النواذر للبلخی اجمع فی فنون شی جمع بین الشریعة والفلسفۃ والادب الفنون (راجع لسان المیزان) (۱: ۱۸۳) ومعجم الادباء (۳: ۶۵-۸۶) وحکماء الاسلام (۲۲) ماخوذ من الاعلام للزرکلی ۱۲۔

بعض نے کہا ہے کہ یہاں مصقول الْكِسَاءِ سے مراد دودھ ہے جس پر بالائی کی تہ آچکی ہو۔

دوسرے شاعر نے کہا ہے ۵ (المنسرح)

(۳۷۳) حَتَّىٰ أَرَىٰ قَارِسَ الصَّمُوتِ عَلَىٰ

أَكْسَاءٍ خَيْلٍ كَانَتْهَا الْإِبِلُ

یہاں تک کہ میں ”صموت“ کے شہسوار کو دیکھوں کہ وہ اونٹ جیسے قد آدرگھوڑوں کا تعاقب کر رہا ہو۔ بعض نے کہا ہے کہ اَكْسَاءُ بمعنی اعقاب کے ہے۔ لیکن اصل میں اونٹ کے تیز دوڑانے سے جو غبار اٹھتا ہے اور وہ بلند ہو کر انہیں چھپا لیتا ہے۔ اسے اَكْسَاءُ کہا جاتا ہے۔ یہاں عَلٰی اَكْسَاءِ اِبِلٍ سے مراد یہ ہے کہ وہ اس کے لباس کے غبار میں متصل آ رہا ہے۔

### (ک ش ف)

الْكَشْفُ یہ كَشَفْتُ (ص) الثَّوْبَ عَنِ

الْوَجْهِ کا مصدر ہے۔ جس کے معنی چہرہ وغیرہ سے پردہ اٹھانے کے ہیں۔ اور مجازاً غم و اندوہ کے دور کرنے پر بھی بولا جاتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿وَإِنْ يَمْسَسْكَ اللَّهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهُ إِلَّا هُوَ﴾ (۶-۱۷) اور خدا تم کو سختی پہنچائے تو اس کے سوا کوئی دور کرنے والا نہیں ہے۔

﴿فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُونَ إِلَيْهِ﴾ (۶-۴۱) تو جس دکھ

﴿وَلَا يَأْتُونَ الصَّلَاةَ إِلَّا وَهُمْ كُسَالَىٰ﴾

(۵۴-۹) اور نماز کو آتے ہیں تو ست اور کامل ہو کر۔

مماوردہ ہے۔ فُلَانٌ لَا يَكْشِلُهُ الْمَكَائِلُ: اس کو اسباب کا ہلی ست نہیں بناتے۔

فَحُلُّ كَسِيلٍ، جو زکریٰ جنتی میں ست ہو جائے امرأَةً مَّكْسَالٍ: زن ست، جو ناز پروردہ ہونے کی وجہ سے اپنے کمرہ سے باہر نہ نکلے۔ (صفت مدح)

### (ک س و)

الْكِسَاءُ وَالْكِسْوَةُ کے معنی لباس کے ہیں۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿أَوْكُسُوهُمْ﴾ (۵-۸۹) یا ان کو کپڑا دینا۔

كَسَوْتُهُ: میں نے اسے لباس پہنایا۔

اِكْتَسَى: (افعال) اس نے پہن لیا۔ قرآن پاک میں

ہے: ﴿وَأَرْزُقُوهُمْ فِيهَا وَاكْسُوهُمْ﴾ (۴-۵)

ہاں اس میں سے ان کو کھلاتے اور پہناتے رہو۔

﴿فَكَسَوْنَا الْعِظَامَ لَحْمًا﴾ (۲۳-۱۴) پھر ہڈیوں پر

گوشت پوست چڑھایا۔

اِكْتَسَتْ الْأَرْضُ بِالنَّبَاتِ: زمین نے نباتات

کا لباس پہن لیا۔ شاعر نے کہا ہے ۵ (الطویل)

(۳۷۲) فَبَاتَ لَهُ دُونَ الصَّبَا وَهِيَ قَرَّةٌ

لِخَافٍ وَمَصْقُولُ الْكِسَاءِ رَقِيقٌ

① قاله عمرو بن الاثم وقوله: فَبَاتَ لَنَا مِنْهَا وَلِلضَّيْفِ مَوْهِنًا - شَاءَ سَمِينٌ زَاهِقٌ وَغَبِيقٌ وَفِي اللِّسَانِ (كسأ) قال ابن بري: والصواب انشاده وبات بدل فبات والبيت من كلمة مفضلية رقم ۲۳ بيتا راجع عيون الاخبار (۱: ۳۴۲) والمعاني للقبتي ۳۹۸۔

② قاله المثلث عن عمرو التنوخي في اربعة ابيات يصف فرسه الصموت ومعناه هو يهزم اعداءه فيسوقهم من وراءهم ويطردهم كما يطرد الابل والبيت لى اللسان (صمت) والمؤتلف للامدى ۲۷۶ في خمسة ابيات وقد نسب الى بريق بن عياض الهذلي (بقية اشعار الهذليين ۲۵) وفي رواية انساء خيل بدل اكساء خيل وفي رواية التبريزي كانها ابل (جميع ابل) والمرزوقي ۴۷۹ وفي الحمحي: ونرويه لرجل من تنوخ ۱۲۔

یہ كَسَطُ النَّاقَةِ کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی اونٹنی کی کھال اتارنے کے ہیں اور اس سے اِنْكَسَطَ رَوْعُهُ کا محاورہ مستعار ہے جس کے معنی خوف زائل ہونے کے ہیں۔

### (ک ظ م)

الْكُظْمُ: اصل میں ”مخرج النفس“ یعنی سانس کی نالی کو کہتے ہیں۔ چنانچہ محاورہ ہے: أَخَذَ بِكُظْمِهِ: اس کی سانس کی نالی کو پکڑ لیا۔ یعنی غم میں مبتلا کر دیا۔

الْكُظْمُومُ کے معنی سانس رککنے کے ہیں اور خاموش ہو جانے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ جیسا کہ انتہائی خاموشی کے معنی کو ظاہر کرنے کے لیے فُلَانٌ لَا يَتَنَفَّسُ کہا جاتا ہے۔ فلاں سانس نہیں لیتا یعنی خاموش ہے۔ كُظِمَ فُلَانٌ اس کا سانس بند کر دیا گیا۔ (مراد نہایت غمگین ہونا) چنانچہ قرآن پاک میں ہے: ﴿إِذْ نَادَىٰ وَهُوَ مَكْظُومٌ﴾ (۶۸-۶۸) کہ انہوں نے خدا کو پکارا اور وہ (غم) غصہ میں بھرے تھے اور كُظِمَ الْغَيْظُ کے معنی غصہ روکنے کے ہیں۔ جیسے فرمایا:

﴿وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ﴾ (۳-۱۳۴) اور غصے کو روکتے۔

اور اسی سے كُظِمَ الْبَعِيرُ کا محاورہ ہے جس کے معنی اونٹ کا جگالی نہ کرنا کے ہیں۔ كُظِمَ السِّقَاءُ مشک کو پانی سے بھر کر اس کا منہ باندھ دینا تاکہ اس سے پانی نہ نکل سکے۔ الْكِظَامَةُ: ترازو کے اس حلقہ کو کہتے ہیں جس میں پلڑے کی رسیاں اکٹھی کر کے ترازو کی ڈنڈی کے ساتھ

کے لیے اسے پکارتے ہو..... تو اس کو دور کر دیتا ہے۔

﴿لَقَدْ كُنْتُ فِي غَفْلَةٍ مِّنْ هَذَا فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَاءَ كَ﴾ (۵۰-۲۲) یہ وہ دن ہے کہ اس سے تو غافل

ہو رہا تھا۔ اب ہم نے تجھ پر سے پردہ اٹھا دیا۔  
﴿أَمَّنْ يُجِيبُ الْمُضْطَرَّ إِذَا دَعَاہُ وَيَكْشِفُ السُّوءَ﴾ (۲۷-۶۲) بھلا کون بے قراری کی التجا قبول کرتا ہے جب وہ اس سے دعا کرتا ہے۔ اور (کون اس کی تکلیف کو دور کرتا ہے۔) اور آیت:

﴿يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ﴾ (۶۸-۶۸) جس دن پنڈلی سے کپڑا اٹھا دیا جائے گا۔

میں بعض نے کہا ہے کہ یہ قَامَتِ الْحَرْبُ عَلٰی سَاقٍ کی طرح کا محاورہ ہے یعنی شدت اور سختی..... ظاہر ہونے سے کنایہ ہے۔<sup>۱</sup>

اور بعض نے کہا ہے کہ یہ اصل میں تَذْمِيرُ النَّاقَةِ کے محاورہ سے ماخوذ ہے یعنی جب کوئی شخص حاملہ اونٹنی کے پیٹ کے اندر ہاتھ ڈال کر بچہ نکالتا ہے تو اس وقت کہا جاتا ہے۔

كُشِفَ عَنِ السَّاقِ (کہ پنڈلی کھولی گئی) تو یہاں بھی صعوبت حال ہی سے کنایہ ہے۔

### (ک ش ط)

الْكِسْطُ (ص) کے معنی کھال اتارنے کے

ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَإِذَا السَّمَاءُ كُشِطَتْ﴾ (۸۱-۱۱) اور جب

آسمان کی کھال کھینچی لی جائے گی۔

۱ کذا قال قتادة على ما في المشكل للبتی ۱۰۳ و الطبری و روی نحوه عن ابن عباس و مجاهد و ابن جبر و هو اختيار

ابی عبیدہ و اهل اللغة كما في اللسان ۱۲۔

اور کاعب کی جمع گواعب آتی ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَكُوعَابَ اَثْرَابًا﴾ (۴۸-۳۳) اور ہم عمر نو جوان عورتیں۔

كَعَبَ الشَّدْيُ كَعْبًا وَكَعَبَ تَكْعِيًّا: (لڑکی کی) چھاتی ابھر آنا۔

ثَوْبٌ مُكْعَبٌ: لپیٹا ہوا کپڑا جس کی تہ سخت اور اٹھی ہوئی ہو۔ اور سر کنڈے یا نیزے کی دو گرہوں کے درمیان کے حصہ کو بھی تشبیہ کے طور پر کعب (پور) کہا جاتا ہے۔ کیونکہ جس طرح ٹخنہ پنڈلی اور پاؤں کے درمیان فاصلہ ہوتا ہے اس طرح یہ بھی دو گرہوں کے درمیان فاصلہ ہوتی ہے۔

### (ک ف ف)

الْكُفُّ - کے معنی ہاتھ کی ہتھیلی کے ہیں جس کے ساتھ انسان چیزوں کو اکٹھا کرتا اور پھیلاتا ہے۔ كَفَفْتُهُ کے اصل معنی کسی کی ہتھیلی پر مارنے یا کسی کو ہتھیلی کے ساتھ مار کر دور ہٹانے اور روکنے کے ہیں پھر عرف میں دور ہٹانے اور روکنے کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے خواہ ہتھیلی سے ہو یا کسی اور چیز سے ﴿رَجُلٌ مَكْفُوفُ الْبَصَرِ﴾ جس کی بینائی جاتی رہی ہو۔ اور آیت کریمہ: ﴿وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ﴾ (۲۳-۲۸) اور (اے محمد ﷺ) ہم نے تم کو گناہوں سے روکنے والا بنا کر بھیجا ہے۔

باندھ دی جاتی ہیں۔ (۲) اس تسمہ کو بھی کظامہ کہا جاتا ہے جس کو کمان کی تانت کے ساتھ باندھ دیا جاتا ہے۔

الْكُظَايِمُ: (واحد كُظَامَةٌ) وہ زمین دوز نالیاں جن کے ذریعہ ایک کنویں کو (دوسرے کے ساتھ ملا دیا جاتا ہے) تاکہ ایک کا پانی دوسرے میں منتقل ہوتا رہے۔ گویا وہ سانس آنے جانے کی نالیاں ہیں ۵

### (ک ع ب)

كَعْبُ الرَّجُلِ: (ٹخنہ) اس ہڈی کو کہتے ہیں جو پاؤں اور پنڈلی کے جوڑ پر ہوتی ہے قرآن پاک میں ہے۔ ﴿وَ اَرْجُلُكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ﴾ (۵-۶) اور ٹخنوں تک پاؤں دھولیا کرو۔

الْكُعْبَةُ: اصل میں ہر اس مکان کو کہتے ہیں جو ٹخنے کی شکل پر چوکور بنا ہوا ہو اسی سے بیت الحرام کو الْكَعْبَةُ کے نام سے پکارا گیا ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿جَعَلَ اللّٰهُ الْكُعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيَمًا لِّلنَّاسِ﴾ (۵-۹۷) خدا نے عزت کے گھر (یعنی) کعبہ کو لوگوں کے لیے موجب امن قرار فرمایا۔

ذَوَا الْكُعْبَاتِ: بنوریہ کی عبادت گاہ کا نام جو انہوں نے جاہلیت میں بنائی تھی۔ محاورہ ہے۔

فُلَانٌ حَاسِسٌ فِيْ كُعْبَتِهِ: یعنی فلاں اپنے کمرہ میں بیٹھا ہوا ہے۔ جو کعبہ کی شکل پر بنا ہوا ہے اَمْرًا كَاعِبٌ ابھرے ہوئے پستانوں والی لڑکی۔ اور یہ كِعَابَةٌ سے ماخوذ ہے جس کے معنی عورت کی چھاتی ابھرنے کے ہیں۔

۱ وفی الحدیث: اتی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کظامۃ قوم فنوضا و مسح علی قدمیہ انظر الفائق (۲/۲۰۱)

وغریب ابی عبید (۱/۲۶۸)۔

۲ کما فی قولہ تعالیٰ: کف ایدی الناس عنکم (الفتح- ۲۰) وهو الذی کف ایدیہم عنکم (الفتح ۲۵)

كِفَّةُ الْمِيزَانِ: ترازو کا پلڑا۔ کیونکہ وہ بھی موزوں چیز کو روک لینے میں، پھیل کے مشابہ ہوتا ہے۔ ایسے ہی كُفَّةُ الْحَبَالَةِ ہے۔ جس کے معنی شکاری کے پھندا کے ہیں۔

كَفَفْتُ الثَّوْبَ: کچی سلائی کے بعد کپڑے کے اطراف کو سینا۔

### (ک ف ت)

الْكَفْتُ: (ض) کسی چیز کو جمع کر کے اسے قبضہ میں لے لینے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿الْمَنْ نَجْعَلِ الْأَرْضَ كِفَاتًا أَحْيَاءَ وَأَمْوَاتًا﴾ (۷۷-۲۵-۲۶) کیا ہم نے زمین کو سیننے والی نہیں بنایا۔ یعنی زندوں اور مردوں کو۔

یعنی زمین تمام مردوں اور زندوں کو سمیٹے ہوئے ہے اور بعض نے کہا ہے کہ احیاء سے مراد انسان، حیوان اور نباتات ہیں اور اموات سے جمادات بعض نے ”کفات“ کے معنی تیزی سے اڑنا بھی کیے ہیں لیکن اصل میں اس کے معنی اڑنے کے لیے پروں کو سمیٹنا کے ہیں۔ جیسا کہ قرآن پاک میں ہے: ﴿أَوَلَمْ يَرَوْا إِلَى الطَّيْرِ فَوْقَهُمْ صَفَائِفَ وَيَقْبِضْنَ﴾ (۶۷-۱۹) کیا انہوں نے اپنے سروں پر اڑتے جانوروں کو نہیں دیکھا جو پروں کو پھیلائے رہتے ہیں اور سکیڑ بھی لیتے ہیں۔

تو یہاں قبض کا لفظ ایسے ہی ہے جیسا کہ اوپر کی آیت میں كِفَاتٌ کا لفظ ہے۔

الْكَفْتُ کے معنی تیز ہانکنا بھی آتے ہیں۔ اور قبض کی

میں كِفَاةٌ کے معنی لوگوں کو گناہوں سے روکنے والا ہے۔ اس میں ہامبالہ کے لیے ہے۔ جیسے کہ رَاوِيَةٌ وَعَلَامَةٌ اور نَسَابَةٌ۔ میں ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِينَ كَافَّةً كَمَا يُقَاتِلُونَكُمْ كَافَّةً﴾ (۹-۶۳) اور تم سب کے سب مشرکوں سے لڑو۔

جیسے وہ سب کے سب تم سے لڑتے ہیں۔ میں بعض نے دونوں جگہوں میں كَافَّةً کے معنی کافین یعنی روکنے والے کیے ہیں۔ اور بعض نے یہ معنی کیا ہے۔ کہ جماعۃ یعنی اجتماعی قوت کی وجہ سے اسے كَافَّةً بھی کہا جاتا ہے۔

اور آیت کریمہ:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً﴾

(۲-۲۰۸) مومنو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ۔ میں بھی كَافَّةً بمعنی جماعت ہی ہے اور آیت کریمہ

﴿فَاصْبَحَ يُقَلِّبُ كَفِّهِ عَلَى مَا أُنْفِقَ فِيهَا﴾

(۱۸-۴۲) تو جو مال اس نے اس پر خرچ کیا تھا اس پر حسرت سے ہاتھ ملنے لگا۔

پشیمان ہونے والے کی حالت کی طرف اشارہ ہے۔ کیونکہ انسان پشیمانی کی حالت میں ہاتھ ملتا ہے۔

تَكَفَّفَ الرَّجُلُ: سوال کے لیے ہاتھ پھیلا نا۔

اسْتَكْفَفَ سوال یا مدافعت کے لیے ہاتھ پھیلا نا۔

اسْتَكْفَفَ الشَّمْسُ: پھیلنے کے ذریعہ دھوپ کو دفع کرنا اور وہ اس طرح کہ دھوپ کی شعاعوں کو روکنے کے لیے

ابروں پر بطور سایہ ہاتھ رکھ لے تاکہ جس چیز کو دیکھنا مطلوب ہو آسانی سے دیکھی جاسکے۔

۱ وفی الکامل یقال لكل مستطیل کفة (بضم الکاف) ومعناه کفة الحاحل ولکل مستدیر کفة ومنه کفة المیزان

(۳۷۴) أَلْقَتْ ذُكَاءً يَمِينَهَا فِي كَافِرٍ -

سورج نے اپنا دایاں ہاتھ رات کے اندر ڈال دیا۔ یعنی غروب ہو گیا۔

الْكَافُورُ: اس غلاف کو کہتے ہیں۔ جو پھل کو اپنے آغوش میں چھپائے رکھتا ہے۔ شاعر نے کہا ہے ﴿الرجز﴾

(۳۷۵) كَالْكَرْمِ إِذْ نَادَى مِنَ الْكَافُورِ

جیسے انگور غلاف سے ظاہر ہوتا ہے۔

كُفِّرَ یا کفرانِ نعمت کے معنی نعمت کی ناشکری کر کے اسے چھپانے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَلَا تُكْفِرَنَّ لِسَعِيهِ﴾ (۹۳-۲۱) تو اس کی کوشش راگناں نہ جائے گی۔

اور سب سے بڑا کفر اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، شریعت حقہ یا نبوت کا انکار ہے۔ پھر کفران کا لفظ زیادہ تر نعمت کا انکار کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اور کفر کا لفظ انکار دین کے معنی میں اور کُفُور کا لفظ دونوں قسم کے انکار پر بولا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔

طرح گفت کا لفظ بھی اونٹوں کے ہنگانے پر بولا جاتا ہے۔ چنانچہ قبض الراعی الاہل کے معنی ان کو تیز ہانکنے کے ہیں۔ اور منتظم چرواہے کو راعی قبضۃ کہا جاتا ہے۔ اور كَفَّتَ اللَّهُ فُكْلَانَا إِلَى نَفْسِهِ (اللہ تعالیٰ نے اس کی روح قبض کر لی) قبضہ کے ہم معنی ہے۔ حدیث میں ہے ﴿(۹۸)

((اُكْفِتُوا صَبِيَّانَكُمْ بِاللَّيْلِ)) رات کو اپنے بچوں کو اپنے گھروں میں بند رکھو۔

## (ک ف ر)

الْكُفْرُ: اصل میں کفر کے معنی کسی چیز کو

چھپانے کے ہیں اور رات کو کافر کہا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ تمام چیزوں کو چھپا لیتی ہے۔ اسی طرح کاشکار چونکہ زمین کے اندر بیج کو چھپاتا ہے۔ اس لیے اسے بھی کافر کہا جاتا ہے۔ اور یہ رات یا کسان کے ناموں میں سے نہیں ہے جیسا کہ بعض اہل لغت نے بطور دلیل مندرجہ ذیل شعر پیش کہا ہے ﴿(الکامل)

① كلمة من حديث طويل عن جابر قاله رضي الله عنه في الآداب والحديث في الفائق (۱/ ۱۸۴) واللسان والنهاية (گفت)

② قاله ثعلبه بن صعير المازني يصف ناقته، وشبه عييته والقيان بریش جناحی الظلم حين يكون معارضا لنعمة الرحين بينهما عند غروب الشمس وصدرة فتذكر أثقلا ثيدا بعد ما..... والبيت في الطبری (۱/ ۱۱۱) والطبرسی (۲/ ۹۵) واللسان (ثقل اثر، ذکا، کفر، یدی) وتهذيب اصلاح المنطق (۱/ ۸۴) والاصلاح ۴۱۷ والحصری (۴/ ۱۲۳) والشعراء ۱۵۶ والكنز اللغوي ۵۱ والاشتقاق (۳۵۱، ۱۸۷) وفي الامالي (۲/ ۱۴۲) غير منسوب ونسبه في السمط (۷۶۹) مع اليمين وفي رواية المفضيلة ۱۵۲ فتذكرت بدل فتذكر او البيت ايضا في ذيل الصناعتين ۱۸۵ وابن ولاد ۵۲ وتهذيب الالفاظ ۳۸۷ وابدال ابی الطیب (۲/ ۵۷) وابدال يعقوب ۵۱ وشرح السبع لابن الانباري ومبادئ اللغة لاسكان في او المعجز فقط في نظام الغريب ۱۸۵ والمعافي للقبتي ۳۵۸ وهو من قصيدة في منتهى الطلب (۱/ ۱۶۱-۱۵۲) والمفضيلة ۲۴ التي مطلعها: هل عند عمرة من نبات..... والرشد معناه التضيد فانهم يذكرون ان النعمة تضع بيضا طولاً وعرضاً على خط وسط كما في الحيوان (۴/ ۳۲۸) وعيون الاخبار (۲/ ۸۷-۸۸) والبيت ايضا في الحيوان (۵/ ۱۳۱) والمخصص (۹/ ۱۷) والحصری (۴/ ۱۱۵) والبالا في اعجازه ۲۰۰.

③ قاله العجاج وقبله غراء تسبي نظر الناظور - بفاحم يعكف او منشور (راجع اللسان (۱۲/ ۱۱۲) والعمدة (۱/ ۲۶۷) ومبادئ اللغة (۱۷۸) ومشكل القرآن للقبتي ۱۰۰ وديوانه ۲۷.

سے منکر اول نہ بنو۔

تو یہاں کافر بمعنی جاحد (منکر) کے ہے اور کافر علی الاطلاق یعنی بلا تشدید عرف میں اس شخص کو کہا جاتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، شریعت اور نبوت میں سے کسی ایک یا تینوں کا منکر ہو۔ اور کبھی کفر کا لفظ اس شخص کے متعلق بھی استعمال ہوتا ہے جو شریعت کے کسی حکم میں خلل اندازی کرتا ہو یا اللہ تعالیٰ کی اس طرح شکرگزاری نہ کرتا ہو جیسے کرنا چاہیے۔ چنانچہ آیت:

﴿مَنْ كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهُ﴾ (۳۰-۳۲) تو جس نے کفر کیا، اس کے کفر کا ضرر اسی پر ہے۔

میں کفر کے معنی شریعت کے حکم میں خلل اندازی کرنے کے ہیں۔ جیسا کہ اس کے بالمقابل آیت:

﴿وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلَا نَفْسَ لَهُ يَمْهَدُونَ﴾ (۳۰-۳۲) اور جس نے نیک عمل کیے تو ایسے لوگ اپنے ہی لیے آرام گاہ درست کرتے ہیں۔

سے معلوم ہوتا ہے۔ نیز فرمایا:

﴿وَأَكْثَرُهُمُ الْكَافِرُونَ﴾ (۸۶-۸۳) اور یہ اکثر ناشکرے ہیں۔

اور آیت کریمہ:

﴿وَلَا تَكُونُوا أَوَّلَ كَافِرٍ بِهِ﴾ (۲-۴۱) اور اس سے منکر اول نہ بنو۔

کے معنی یہ ہیں کہ تم ائمہ کفر نہ بنو کہ دوسرے لوگ اس میں تمہاری اقتداء کریں۔ اور آیت کریمہ: ﴿وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذَلِكَ فَأُولَئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ﴾ (۱۲-۵۵) اور جو اس کے بعد کفر کرے تو ایسے لوگ بدکردار ہیں۔

میں مَنْ كَفَرَ سے حقوق الہی کو چھپانے والے لوگ مراد

﴿فَأَبَى الظَّالِمُونَ إِلَّا كُفُورًا﴾ (۱۷-۸۹) تو ظالموں نے انکار کرنے کے سوا اسے قبول نہ کیا ﴿فَأَبَى أَكْثَرُ النَّاسِ إِلَّا كُفُورًا﴾ (۱۷-۸۹) مگر اکثر لوگوں نے انکار کرنے کے سوا قبول نہ کیا۔ اور فعل كَفَرَ فَهُوَ كَافِرٌ ہر دو معانی کے لیے آتا ہے۔ چنانچہ معنی کفر ان کے متعلق فرمایا: ﴿لَيَسْئَلُنِيَّ أَشْكُرُ أَمْ أَكْفُرُ وَمَنْ شَكَرَ فَإِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهِ وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ رَبِّي غَنِيٌّ كَرِيمٌ﴾ (۲۷-۲۷) تاکہ مجھے آزمائے کہ میں شکر کرتا ہوں یا کفر ان نعمت کرتا ہوں۔ اور جو شکر کرتا ہے تو اپنے ہی فائدے کے لیے شکر کرتا ہے۔ اور جو ناشکری کرتا ہے۔ تو میرا پروردگار بے پروا (اور) کرم کرنے والا ہے۔ ﴿وَأَشْكُرُ وَلِيَّ وَلَا تَكْفُرُونَ﴾ (۲-۱۵۲) اور میرا احسان ماننے رہنا اور ناشکری نہ کرنا۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَفَعَلْتَ فَعَلْتِكَ الَّتِي فَعَلْتَ وَأَنْتَ مِنَ الْكَافِرِينَ﴾ (۲۶-۱۹) اور تم نے ایک اور کام کیا تھا جو کیا۔ تم ناشکرے معلوم ہوتے ہو۔

کے معنی یہ ہیں کہ تم نے قصدا میری نعمت کی ناشکری کی ہے۔

﴿لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِي لَشَدِيدٌ﴾ (۱۴-۷۱) اگر شکر کرو گے تو میں تمہیں زیادہ دوں گا۔ اور اگر ناشکری کرو گے تو (یاد رکھو کہ) میرا عذاب بھی سخت ہے۔

اور کفر ان نعمت چونکہ انکار نعمت کا مقتضی ہے اس لیے یہ مطلقاً انکار کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَلَا تَكُونُوا أَوَّلَ كَافِرٍ بِهِ﴾ (۲-۴۱) اور اس

ہے حالانکہ دوسرے مقام پر آیت:

﴿وَكُفِّرَ الْيَكُومُ الْكُفْرُ﴾ (۱۷-۴۹) اور کفر سے تم کو بیزار کر دیا۔

سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کو کفر سے طبعی نفرت ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ آیت ”إِنَّ الْإِنْسَانَ لَكُفُورٌ مِّنْ كُفُورٍ“ کفر سے نہیں ہے۔ بلکہ کفرانِ نعمت سے ہے پس آیت میں اس بات پر متنبہ کیا ہے کہ ناپاسی اور شکر گزاری سے غفلت برتنا انسان کا فطرتی خاصہ ہے۔ اور آیت۔

﴿قُلِ الْإِنْسَانُ مَا أَكْفَرَهُ﴾ (۱۷-۸۰) انسان ہلاک ہو جائے، کیسا ناشکرا ہے، بھی اسی معنی پر محمول ہے۔ اسی لیے دوسرے مقام پر فرمایا ﴿وَقَلِيلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُورُ﴾ (۱۳-۳۴) اور میرے بندوں سے شکر گزار تھوڑے ہیں۔ اور آیت کریمہ:

﴿إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِرًا وَإِمَّا كَفُورًا﴾ (۳-۷۶) اور اسے رستہ بھی دکھا دیا (اب) خواہ وہ شکر گزار ہو خواہ ناشکرا۔

میں بھی متنبہ کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو (ہدایت اور گمراہی کے) راستے بتا دیئے ہیں جیسا کہ آیت: ﴿وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ﴾ (۱۰-۹۰) اور اس کو (خیر و شر کے) دونوں رستے بھی دکھا دیئے۔

سے معلوم ہوتا ہے۔ اب کوئی ناشکر گزاری کے رستہ پر گامزن ہے اور کوئی ناشکری کی راہ پر اور آیت: ﴿وَكَاَنَّ الشَّيْطَانُ لِرَبِّهِ كَفُورًا﴾ (۱۷-۷۷) اور شیطان اپنے پروردگار کی نعمتوں کا کفران کرنے والا (یعنی) ناشکرا ہے۔ میں کُفُور کفر سے ہے اور آیت میں كَانَ کے لفظ سے

ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں فاسق کہا ہے کیونکہ کفر مطلق فسق سے اعم ہے پس آیت کے معنی یہ ہیں کہ جو شخص حق باری تعالیٰ میں جحود سے کام لے گا تو وہ اپنے اس ظلم کے سبب اطاعتِ الہی سے خارج سمجھا جائے گا۔

پھر جس طرح ہر اچھے کام کو ایمان قرار دیا گیا ہے اسی طرح ہر برے کام کو کفر شمار کیا گیا ہے۔ چنانچہ سحر کے متعلق فرمایا: ﴿وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٌ وَلَكِنَّ الشَّيْطَانَ كَفَرُوا يُعَلِّمُونَ النَّاسَ السِّحْرَ﴾ (۱۰۲-۲) اور سلیمان نے مطلق کفر کی بات نہیں کی بلکہ شیطان ہی کفر کرتے تھے۔

اور آیت ﴿الَّذِينَ يَأْكُلُونَ الرِّبَا﴾ کے بعد فرمایا: ﴿وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ أَثِيمٍ﴾ (۲۷-۲) کہ اللہ کسی ناشکرے گنہگار کو دوست نہیں رکھتا۔ اور اسی طرح آیت وَلِلَّهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ کے آخر میں فرمایا:

﴿وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ﴾ (۹۷-۳) اور جو اس حکم کی تعمیل نہ کرے گا تو خدا بھی اہل عالم سے بے نیاز ہے۔

الْكَفُورُ: (مبالغہ) کے معنی انتہائی درجہ کے ناپاس کے ہیں۔ چنانچہ فرمایا:

﴿إِنَّ الْإِنْسَانَ لَكُفُورٌ﴾ (۶۶-۲۲) اور انسان تو بہت ناشکرا ہے۔

﴿ذَلِكَ جَزَيْنَهُمْ بِمَا كَفَرُوا وَهَلْ نُجْزِي إِلَّا الْكَفُورَ﴾ (۱۷-۳۴) یہ ہم نے ان کی ناشکری کی ان کو سزا دی۔ اور ہم سزا ناشکرے ہی کو دیا کرتے ہیں۔

یہاں یہ شبہ پیدا ہو سکتا ہے کہ آیت مذکورہ میں انسان کو كُفُورٌ بصیغہ مبالغہ کہا ہے۔ اور پھر اسی پر اکتفاء نہیں کیا بلکہ ”إِنَّ“ ولام توکید لاکر کلام کو اور بھی زور دار بنا دیا گیا



ہے اور فَجْرَةٌ فاسق مسلمان کو بھی کہا جاتا ہے (تو معلوم ہوا کہ یہاں کُفْرٌ سے مراد نہ شکرے ہی ہیں اور آیت: ﴿جَزَاءٌ لِّمَن كَانَ كُفْرًا﴾ (۱۳-۵۴) یہ سب کچھ اس شخص کے انتقام کے لیے کیا گیا ہے۔ جس کو کافر مانتے نہ تھے۔

میں لِمَن كَانَ كُفْرًا سے انبیاء علیہم السلام اور ان کے خلفاء مراد ہیں۔ جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے بارے میں لوگوں کو نصیحت کی لیکن ان کی دعوت پر کسی نے بھی کان نہ دھرا۔ اور آیت کریمہ: ﴿إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا ثُمَّ كَفَرُوا ثُمَّ آمَنُوا ثُمَّ كَفَرُوا﴾ (۴-۱۳۷) جو لوگ ایمان لائے پھر کافر ہو گئے۔ پھر ایمان لائے پھر کافر ہو گئے۔

کے بعض نے یہ معنی بیان کیے ہیں کہ اولاً موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے پھر اس کے بعد دوسرے پیغمبروں کے ساتھ کفر کیا۔ پھر عیسائی عیسیٰ پر ایمان لائے مگر ان کے بعد آنے والے پیغمبر کے ساتھ کفر کیا۔ اور بعض نے کہا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانا پھر انہی کے ساتھ کفر کرنا مراد ہے۔ کیونکہ ان کا کسی دوسرے پر تو ایمان لانا ثابت نہیں ہے۔ اور بعض نے کہا ہے۔ کہ یہ آیت۔

﴿وَقَالَتْ طَائِفَةٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ آمَنُوا بِالَّذِي أُنْزِلَ عَلَيَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَجْهَ النَّهَارِ وَاکْفُرُوا آخِرَهُ﴾ (۳-۷۲) اور اہل کتاب ایک دوسرے سے کہتے ہیں کہ (جو) کتاب مومنوں پر نازل ہوئی اس پر دن کے شروع میں تو ایمان لے آیا کرو اور اس کے آخر میں انکار کر دیا کرو۔

کی طرح ہے۔ اور اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ وہ دو دفعہ ایمان لائے اور پھر دوبارہ کفر کیا۔ بلکہ اس سے ان کی

اس بات پر تنبیہ کی ہے کہ اس نے جہنم ہی کفر پر لیا ہے۔ اَلْكُفَّارُ: اس میں کفور سے بھی زیادہ مبالغہ پایا جاتا ہے۔ جیسا کہ مندرجہ ذیل آیات سے معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿كُلَّ كَفَّارٍ عَيْنِي﴾ (۲۳-۵۰) ہر سرکش ناشکرے کو ﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي مَنْ هُوَ كَاذِبٌ كَفَّارٌ﴾ (۳-۳۹) بے شک خدا اس شخص کو جو جھوٹا ناشکرا ہے، ہدایت نہیں دیتا۔

﴿وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ أَثِيمٍ﴾ (۲-۲۷۶) اور خدا کسی ناشکرے گنہگار کو دوست نہیں رکھتا۔ ﴿إِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا﴾ (۷۱-۲۷) وہ بھی بدکار اور ناشکر گزار ہوگی۔

اور کبھی کُفَّار بمعنی کفور بھی آ جاتا ہے۔ جیسے فرمایا ﴿إِنَّ الْإِنْسَانَ لَظَلُومٌ كَفَّارٌ﴾ (۳۳-۱۳) بے شک انسان بڑا بے انصاف اور ناشکرا ہے۔

كُفَّارٌ اور كَفْرَةٌ دونوں کافر کی جمع ہیں۔ لیکن پہلی جمع تو عام طور پر مومنین کے بالمقابل استعمال ہوتی ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ﴾ (۳۸-۹) وہ کافروں کے حق میں سخت ہیں۔

﴿لِيَغْضَبَ بِهِمُ الْكُفَّارَ﴾ (۳۸-۲۹) تاکہ کافروں کا جی جلانے۔

اور دوسری بمعنی کفرانِ نعمت کے آتی ہے چنانچہ آیت:

﴿أُولَٰئِكَ هُمُ الْكَفَرَةُ الْفَجْرَةُ﴾ (۸۰-۴۲) یہ لوگ کفار بد کردار ہیں۔

میں آپ نہیں دیکھتے کہ كَفْرَةٌ کی صفت فَجْرَةٌ لائی گئی

مجھے شریک بناتے تھے۔ اور آیت کریمہ:

﴿كَمْثَلْ غَيْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهُ﴾ (۲۰-۵۷)؟ اس کی مثال ایسی ہے جیسے بارش کہ اس سے کھیتی (اگتی اور) کسانوں کو بھی بھلی لگتی ہے۔

میں بعض نے کہا ہے کہ کفار سے کسان مراد ہیں کیونکہ وہ بیج کوٹی میں چھپا دیتے ہیں جیسا کہ کافر اللہ تعالیٰ کے حق کو چھپاتا ہے۔ چنانچہ آیت: ﴿يُغْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ﴾ (۲۸-۲۹) اور لگی کھیتی والوں کو خوش کرنے تاکہ کافروں کا جی جلائے۔

بھی اس معنی پر دلالت کرتی ہے۔ کیونکہ بارش کی روئیدگی سے خوش ہونا کافر کے ساتھ مختص نہیں ہے۔ بلکہ ہر کاشتکار کو اس سے خوشی حاصل ہوتی ہے۔ خواہ وہ مسلمان ہو یا کافر بعض نے کہا ہے کہ یہاں بھی کفار سے کافر ہی مراد ہیں اور ان کی تخصیص اس لیے کہ ہے۔ کہ وہ دنیا اور اس کے ساز و سامان پر خوش اور اس کی طرف مائل رہتے ہیں۔ اَلْكَفَّارَةُ: جو چیز گناہ دوہر کر دے اور اسے ڈھانپ لے اسے کفارہ کہا جاتا ہے۔ اسی سے كَفَّارَةُ الْيَمِينِ ہے چنانچہ اس کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: ﴿ذَلِكَ كَفَّارَةُ اَيْمَانِكُمْ اِذَا حَلَفْتُمْ﴾ (۵-۸۹) یہ تمہاری قسموں کا کفارہ ہے جب تم قسمیں کھاؤ۔

﴿فَكَفَّارَتُهُ اِطْعَامُ عَشْرَةِ مَسْكِيْنٍ﴾ (۵-۸۹) تو اس کا کفارہ دس محتاجوں کو کھانا کھلانا ہے۔ اسی طرح دوسرے گناہ جیسے قتل، ظہار وغیرہ کے تاوان پر بھی کفارہ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اَلْتَّكْفِيْرُ: اس کے معنی بھی گناہ کو چھپانے اور اسے اس طرح مٹا دینے کے ہیں جیسے اس کا ارتکاب ہی نہیں کیا۔ اور ہو سکتا ہے کہ یہ اصل میں ازالہ کفر

مختلف حالتوں کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ جس طرح فضائل میں ترقی کے تین درجات ہیں اسی طرح رذائل میں بھی انحطاط کے تین درجے ہیں۔ اور آیت کریمہ میں انہی درجات کی طرف اشارہ ہے۔ اس مفہوم کو ہم نے اپنی کتاب ”الذريعة“ میں خوب وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔

كَفَرَ فُلَانٌ کے معنی اعتقاد کفر کے بھی ہوتے ہیں اور محض زبان سے اظہار کفر کے بھی۔ خواہ دل سے اس کا معتقد نہ ہو۔ اسی لیے فرمایا:

﴿مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْ بَعْدِ اِيْمَانِهٖ اِلَّا مِنْ اُكْرِهٖ وَ قَلْبُهُ مُطْمَئِنٌّ بِالْاِيْمَانِ﴾ (۱۶-۱۰۶) جو شخص ایمان کے بعد خدا کے ساتھ کفر کرے وہ نہیں جو (کفر پر زبردستی) مجبور کیا جائے اور اس کا دل ایمان کے ساتھ مطمئن ہو۔

كَفَرَ فُلَانٌ بِالشَّيْطَانِ کے معنی شیطان کی وجہ سے کفر کرنے کے ہیں۔ اور کبھی اس کا معنی شیطان کے ساتھ کفر کرنا بھی آ جاتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا: ﴿فَمَنْ يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ﴾ (۲-۲۵۶) تو جو شخص بتوں سے اعتقاد نہ رکھے اور خدا پر ایمان لائے۔

اَكْفَرَهُ اِكْفَارًا کے معنی کسی پر کفر کا فتویٰ لگانے کے ہیں۔ اور کبھی کفر کے معنی کسی سے بیزار ہونا بھی آ جاتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا:

﴿ثُمَّ يَوْمَ الْقِيَمَةِ يَكْفُرُ بَعْضُكُم بِبَعْضٍ﴾ (۲۹-۲۵) پھر قیامت کے دن ایک دوسرے کی دوستی سے انکار کر دو گے۔

﴿اِنِّى كَفَرْتُ بِمَا اَشْرَكَتُمُوْنَ مِنْ قَبْلُ﴾ (۱۳-۲۲) میں تو اس بات سے انکار کرتا ہوں کہ تم پہلے

اپنے اندر چھپائے رکھتا ہے۔ شاعر نے کہا ہے ﴿الرجز﴾  
(۳۷۵) كَا الْكُرْمِ اِذْ نَادَىٰ مِنَ الْكُافُورِ۔

جیسے انگور شگوفہ کے غلاف سے ظاہر ہوتے ہیں۔ لیکن کافور  
ایک مشہور خوشبو..... کا بھی نام ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿كَانَ مِزَاجُهَا كَافُورًا﴾ (۵۷۶-۵) جس میں کافور  
کی آمیزش ہوگی۔

## (ک ف ل)

الْكَفَّالَةُ: ضمانت کو کہتے ہیں۔ اور تَكْفَلْتُ

بِكَذَا کے معنی کسی چیز کا ضامن بننے کے ہیں۔

اور تَكْفَلْتُهُ فُلَانًا کے معنی ہیں: میں نے اسے فلاں کی

کفالت میں دے دیا۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَكَفَّلَهَا

زَكَرِيَّا﴾ (۳-۳۷) اور زکریا کو اس کا متکفل بنایا۔

بعض نے کَفَلَ تخفیف فاء کے ساتھ پڑھا ہے۔ ﴿اس

صورت میں اس کا فاعل زکریا علیہ السلام ہوں گے یعنی حضرت

زکریا علیہ السلام نے ان کو اپنی کفالت میں لے لیا۔

(اَكْفَلَهَا زَيْدًا - اسے زید کی کفالت میں دے دیا)

قرآن پاک میں ہے:

﴿اَكْفَلْنِيهَا﴾ (۳۸-۲۳) یہ بھی میری کفالت میں دے

دو (میرے سپرد کر دو)

الْكَفِيلُ: اصل میں بقدر ضرورت حصہ کو کہتے ہیں۔ گویا وہ

انسان کی ضروریات کا ضامن ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَقَدْ جَعَلْتُمُ اللَّهَ عَلَيْكُمْ كَفِيلًا﴾ (۱۶-۹۱)

اور تم خدا کو اپنا کفیل بنا چکے ہو۔

اور الْكَفِيلُ کے معنی بھی الْكَفِيلُ یعنی حصہ کے آتے

یا کفران سے ہو جیسے تریض کے معنی ازالہ مرض کے آتے  
ہیں۔ اور تَفْذِيَّةٌ کے معنی ازالہ قذی یعنی تھکا دور کرنے  
کے۔

چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْكِتَابِ آمَنُوا وَاتَّقَوْا

لَنُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ﴾ (۵-۶۵) اور اگر اہل

کتاب ایمان لاتے اور پرہیزگاری کرتے تو ہم ان سے

ان کے گناہ محو کر دیتے۔

﴿نُكَفِّرُ عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ﴾ (۴-۳۱) تو ہم تمہارے

(چھوٹے چھوٹے) گناہ معاف کر دیں گے۔ چنانچہ آیت

کریمہ: ﴿إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ﴾

(۱۱-۱۱۴) کچھ شک نہیں کہ نیکیاں گناہوں کو دور کر دیتی

ہیں۔ میں بھی اسی معنی کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے۔ مگر

بعض نے کہا ہے کہ چھوٹی چھوٹی نیکیاں بڑے گناہوں کا

کفارہ نہیں بن سکتیں۔

﴿لَا تُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ﴾ (۳-۱۹۵) میں ان

کے گناہ دور کر دوں گا۔

﴿لِيُكَفِّرَ اللَّهُ عَنْهُمْ أَسْوَأَ الَّذِي عَمِلُوا﴾

(۳۹-۳۵) تاکہ خدا ان سے برائیوں کو جو انہوں نے

کیں، دور کر دے۔ محاورہ ہے۔

كَفَّرَتِ الشَّمْسُ التُّجُومَ: سورج نے ستاروں کو چھپا

دیا۔ اور اس بادل کو بھی کافر کہا جاتا ہے جو سورج کو چھپا لیتا

ہے: تَكْفَرُ فِي السَّلَاحِ: اس نے ہتھیار پہن لیے۔

الْكَافُورُ: اصل میں پھلوں کے غلاف کو کہتے ہیں جو ان کو

① راجع فی العنوان نفسه۔

② وہی قراءۃ معظم السبعة وقراءۃ التشدید ہی قراءۃ الکوفیین عاصم وحمزہ والکسائی (ابو حیان ۴۲/۲)

اَوْ لَا رُكْبَنَكَ الْحَسْرَى۔ یعنی میں تمہیں سخت تکلیف

پہنچاؤں گا۔ اسی معنی میں شاعر نے کہا ہے ❶۔

(۳۷۷) وَحَمَلْنَا هُمْ عَلَى صَعْبَةٍ زَوْ

رَاءَ يَعْلَوْنَهَا بِغَيْرِ طَاءٍ

اور ہم نے ان کو نہایت تند اور میڑھی حالت کی تنگی پشت پر سوار ہونے پر مجبور کر دیا۔

پس آیت (۸۵-۳) کے معنی یہ ہیں کہ اگر کوئی شخص کسی

اچھے کام میں دوسرے کا شریک کار ہوگا۔ تو اسے بھی اس

سے حصہ ملے گا۔ اور اگر کوئی شخص برے کام میں دوسرے

کی مدد کرے گا تو اسے بھی اس کے انجام بد سے دوچار ہونا

پڑے گا۔

بعض کے نزدیک اس آیت میں بھی کفل بمعنی کفیل ہی ہے

اور اس میں متنبہ کیا ہے کہ جو شخص شرعی برائی کا جو یا ہوگا

تو وہ برائی اس پر کفیل ہوگی جو اس سے باز پرس کرے گی۔

جیسا کہ محاورہ ہے۔

مَنْ ظَلَمَ فَقَدْ أَقَامَ كَفِيلًا بِظُلْمِهِ کہ جس نے ظلم کیا

تو اس نے اپنے اوپر ظلم سے کفیل کھڑا کر دیا چنانچہ آیت

مذکورہ میں تنبیہ کی ہے کہ برائی میں دوسرے کی مدد کرنے

والا کبھی بھی اس کی سزا سے نہیں بچ سکتا۔

### (ک ف ء)

الْكُفُوُ کے معنی مرتبہ اور منزلت میں دوسرے کا

ہم پلہ ہونے کے ہیں اسی سے كِفَاء کپڑے کے اس

نکلنے کو کہتے ہیں جو اس جیسے دوسرے کٹڑے کے ساتھ ملا

کر خیمہ کے پچھلی طرف ڈال دیا جاتا ہے اور اسی سے نکاح

یا لڑائی میں ہمسروں کے متعلق کہا جاتا ہے فُلَانٌ كُفُوٌ

ہیں۔ چنانچہ فرمایا:

﴿يُؤْتِكُمْ كَفْلَيْنِ مِنْ رَحْمَتِهِ﴾ (۵۷-۲۸) وہ

تمہیں اپنی رحمت سے اجر کے دو حصے عطا فرمائے گا۔ یعنی

دنیا اور عقبی دونوں جہانوں میں تمہیں اپنے انعامات سے

نوازے گا۔ اور یہی دو قسم کی نعمتیں ہیں جن کے لیے آیت

﴿رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ

حَسَنَةً﴾ (۲۰۱-۲) کہ پروردگار ہم کو دنیا میں بھی نعمت

عطا فرما اور آخرت میں بھی نعمت بخشو، میں اللہ تعالیٰ سے

دعا کی جاتی ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہاں كَفْلَيْنِ سے

دو نعمتیں مراد نہیں ہیں۔ بلکہ اس سے پیہم اور کفایت کرنے

والی نعمت مراد ہے۔ اور تشنہ کا لفظ لَبَّيْكَ وَسَعْدَيْكَ کی

طرح تاکید معنوی کے لیے ہے۔ اور آیت کریمہ: ﴿مَنْ

يَشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَكُنْ لَهُ نَصِيبٌ مِنْهَا وَ

مَنْ يَشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَكُنْ لَهُ كِفْلٌ مِنْهَا﴾

(۸۵-۳) جو شخص نیک بات کی سفارش کرے تو اس کو اس

(کے ثواب) میں سے حصہ ملے گا۔ اور جو بری بات کی

سفارش کرے اس کو اس (کے عذاب) میں سے حصہ ملے گا۔

میں كِفْل کا معنی کافی حصہ کے نہیں ہے بلکہ استعارۃً اس

سے حقیر چیز مراد لی ہے۔ اور یہ اس کفل سے مشتق ہے

جس کے معنی کو لہے کے پچھلے حصہ کے ہوتے ہیں۔ چونکہ

اس حصہ پر سواری تکلیف دہ ہوتی ہے اس لیے عرف میں

كِفْل بمعنی شدت استعمال ہونے لگا ہے جیسا کہ

سَيِّئَاءَ كَالْفِظِ ہے کہ اصل میں اس کے معنی گدھے کی

پشت پر کی ابھری ہوئی ہڈی ہیں۔ چنانچہ محاورہ ہے۔

لَا حِمْلَكَ عَلَى الْكِفْلِ أَوْ عَلَى السَّيِّئَاءِ

❶ قاله ابو زبيد الطائي وقد مر تخريجه، في (عتب)

﴿إِنَّا كَفَيْنَاكَ الْمُسْتَهْزِئِينَ﴾ (۱۵-۹۵) ہم تمہیں ان لوگوں کے شر سے بچانے کے لیے جو تم سے استہزاء کرتے ہیں، کافی ہیں۔ اور آیت کریمہ: ﴿وَكُفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا﴾ (۸-۹) اور حق ظاہر کرنے کے لیے اللہ ہی کافی ہے۔ میں بعض نے کہا ہے کہ بازائدہ ہے اور آیت کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہی گواہ ہونے کے لیے کافی ہے اور بعض نے کہا ہے کہ با اصلی ہے اور آیت کے معنی یہ ہیں کہ گواہ ہونے کے لیے اللہ تعالیٰ پر ہی اِخْتِصَافًا کرو اَلْكَفِيَّةُ مِنَ الْقُوْتِ غذا جو گزارہ کے لیے کافی ہو۔ ج کُفَىٰ محاورہ ہے۔ كَافِيكَ فُلَانٌ مِّن رَّجُلٍ۔ یعنی فلان شخص تمہارے لیے کافی ہے اور یہ حَسْبُكَ مِّن رَّجُلٍ کے محاورہ کے ہم معنی ہے۔

## (ک ل ل)

كُلُّ کالفظ کسی شے کے اجزاء کو یک جا کرنے پر بولا جاتا ہے اور یہ دو طرح پر استعمال ہوتا ہے (۱) کبھی اس سے کسی چیز کی ذات اور اس کے احوال خصوصی کا مجموعہ مراد ہوتا ہے۔ اور لفظاً تمام کے معنی دیتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ﴾ (۱۷-۲۹) اور نہ بالکل کھول ہی دو (کہ سبھی کچھ دے ڈالو) شاعر نے کہا ہے (۵)۔

(۳۷۸) لَيْسَ الْفَتَىٰ كُلُّ الْفَتَىٰ - إِلَّا الْفَتَىٰ فِي آدِبِهِ

فُلَانٌ فلاں اس کا ہمسر ہے قرآن میں ہے۔ ﴿وَلَمْ يَكُنْ لَهُ كُفُوًا أَحَدٌ﴾ (۱۱۲-۴) اور کوئی اس کا ہمسر نہیں۔ اسی سے مُكَافَاةٌ ہے جس کے معنی کسی کام میں دوسرے کے بالمقابل ہونے کے ہیں۔ نیز محاورہ ہے: فُلَانٌ كُفُوٌ لِّكَ: فلان دشمنی میں تیرا ہم پلہ ہے۔ اَلْاِخْتِفَاءُ کے معنی کسی چیز کو الٹا کر دینے کے ہیں گویا اس میں مساوات کو دور کرنے کے معنی پائے جاتے ہیں اور اسی سے اِخْتِفَاءٌ فِي الشَّيْءِ ہے جس کے معنی تصیدہ میں حرف روی کے مختلف ہونے کے ہیں۔ مُكْفَاءُ الْوَجْهِ اَذْ كُفَى الْوَجْهِ: متغیر رو آدی۔ كَفَاءَةُ اَدْنُوں كى ناقص پیدائش۔ محاورہ ہے۔

جَعَلَ فُلَانٌ اِبْنَهُ كَفَاتَيْنِ: اس نے اپنے اَدْنُوں كو دو حصوں ميں تقسيم كر ديا۔ يعنى ايك سال ايك حصه سے نسل ليتا ہے اور دوسرے سال دوسرے سے۔

## (ک ف ی)

اَلْكَفَايَةُ: وہ چیز جس سے ضرورت پوری اور مراد حاصل ہو جائے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَكُفَىٰ اللَّهُ الْمُؤْمِنِينَ الْقِتَالَ﴾ (۳۳-۵) اور خدا مومنوں کے لیے جنگ کی ضروریات کے سلسلہ میں کافی ہوا۔

① قاله ابو محمد الزبيدي (يحيى بن المبارك بن العدوى المتوفى ۲۰۲) وسمى الزبيدي لصحبه يزيد بن منصور خال المهدى وكان شاعرا فصيحاً نحوياربيب ابى عمرو بن العلاء رفى النحو واللغة والغريب والقرءة، جعل الرشيد المامون ابنه فى حجره وله فى هجو الاصمعى ابيات منها ابن لى دمي بن اصمعى۔ متى كنت فى الاسرة الفاضلة ومنها: رايـت قريب الاصمعى۔ كثيرا فواضحه شاملة والبيت فى المواعظ فى ثمانية ابيات وبعده: وبعض اخلاق الفتى۔ اولى به من نسبہ۔ راجع للبيت المعجم للمرزبانى ۴۸۷ وروضة العقلا ۱۹۸ بغير عزو ولا موال الشاعر الانساب (۵۹۹-۶۰۰) وابن خلكان ۷۷۰ واليافعى (۷۰۳:۲) والبيهقي للسيوطى ۴۱۴، وطبقات زبيدي ۲۱ وطبقات ابن المعتز ۲۷۳-۲۷۶ ونزهة الالباء لابن الانبارى ۱۰۳-۱۱۰)

﴿وَكُلًّا جَعَلْنَا صَالِحِينَ﴾ (۷۳-۲۱) اور سب کو

نیک بخت کیا۔

﴿وَكُلٌّ مِّنَ الصَّابِرِينَ﴾ (۱۲-۸۸) یہ سب صبر

کرنے والے تھے۔

ان کے علاوہ اور بھی اس نوع کی بہت سی آیات ہیں۔ اور

قرآن پاک اور فصحاء عرب کے کلام میں کہیں بھی یہ لفظ ❶

معرف باللام یعنی الْكُلُّ استعمال نہیں ہوا بلکہ یہ محض

متکلمین، فقہاء اور دیگر علمائے فن کی اصطلاح ہے۔

الْكَلَالَةُ: باپ اور اولاد کے علاوہ جو وارث بھی ہو وہ

كَلَالَةٌ ہے ❷

ابن عباسؓ کا قول ہے کہ كَلَالَةٌ ہر اس وارث کو کہتے

ہیں، جو اولاد کے علاوہ ہو، ایک روایت میں ہے ❸ کہ

آنحضرت ﷺ سے ”كَلَالَةٌ“ کے متعلق دریافت کیا

گیا تو آپ نے فرمایا: ((مَنْ مَاتَ وَلَيْسَ لَهُ وَلَدٌ

وَلَا وَلَدٌ)) کہ كَلَالَةٌ ہر اس میت کو کہتے ہیں جس کا

باپ اور اولاد زندہ نہ ہوں۔ اس حدیث میں آنحضرت ﷺ

نے خود میت کو کالالہ قرار دیا ہے اور کالالہ کے یہ دونوں معنی صحیح

ہیں کیونکہ ”كَلَالَةٌ“ مصدر ہے جو وارث اور مورث دونوں پر

بولا جاسکتا ہے گویا کالالہ کو کالالہ یا تو اس لیے کہتے ہیں کہ

سلسلہ نسب اس تک ..... پہنچنے سے عاجز ہو گیا ہے اور یا اس

لیے کہ وہ نسب کسی ایک جانب یعنی جانب اہل یا جانب

فرع سے اس کے ساتھ بالواسطہ پہنچتا ہے اور یہ (یعنی دو

احتمال) اس لیے ہیں کہ نسبی تعلق دو قسم پر ہے انتساب ❹

یعنی کامل جو انمر تو وہی ہو سکتا ہے جو ادب میں کامل ہو۔

(۲) کبھی اس سے کئی چیزوں کا مجموعہ مراد ہوتا ہے۔ اس

صورت میں کبھی تو یہ جمع معرف باللام کی طرف مضاف

ہوتا ہے۔ جیسے:

كُلُّ الْقَوْمِ: (پوری قوم) اور کبھی جمع معرف باللام کی ضمیر

کی طرف مضاف ہوتا ہے۔ جیسے قرآن پاک میں ہے:

﴿فَسَجَدَ الْمَلَائِكَةُ كُلُّهُمْ أَجْمَعُونَ﴾ (۱۵-۳۰)

تو فرشتے سب کے سب سجدہ میں گر پڑے۔ ﴿لِيُظْهِرَهُ

عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ﴾ (۹-۳۳) تاکہ اس (دین) کو دنیا

کے تمام دینوں پر غالب کرے۔ ﴿وَكُلُّهُمْ آتِيهِ يَوْمَ

الْقِيَمَةِ فَرْدًا﴾ (۱۹-۹۵) اور سب قیامت کے دن اس

کے سامنے اکیلے اکیلے حاضر ہوں گے۔

اور کبھی نکرہ مفردہ کی طرف مضاف ہوتا ہے جیسے فرمایا:

﴿وَكُلُّ إِنْسَانٍ لِّرَبِّهِ أَكْرَهٌ﴾ اور ہم نے ہر انسان (کے

اعمال کو بصورت کتاب اس کے گلے میں) لٹکا دیا ہے۔

(۱۷-۱۳) ﴿وَاللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ﴾ (۶-۱۰۲)

اور اللہ ہر چیز سے باخبر ہے۔ وغیرہ ذالک من الآية:

اور کبھی بغیر اضافت کے استعمال ہوتا ہے اس وقت اس کا

مضاف الیہ مقدر ہوتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿كُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ﴾ (۳۶-۲۰) اور سب

اپنے اپنے دائرے میں تیر رہے ہیں۔

﴿وَكُلٌّ أَتَوْهُ دُخْرِينَ﴾ (۲۷-۸۷) اور سب اس

کے پاس عاجز ہو کر چلے آئیں گے۔

❶ راجع الآيات (۴-۱۳) (۴-۱۷۷)

❷ وفي الطبري من قول أبي بكر وعمر ؓ ولم يثبت عندی مرفوعاً وفي كثر العمال (۱۱/۷۳-۷۷) بعض آثار الص

فليراجع اليه ۱۲۔

ہے۔ اور یہ اس شخص کے حق میں کہتے ہیں جو اپنے باپ سے کسی مال کا وارث ہو۔ شاعر نے کہا ہے ① (البیض)  
(۳۸۰) وَرَثْتُمْ قَنَآةَ الْمُلْكِ غَيْرَ كَلَالَةٍ  
عَنِ ابْنِ مَنَافٍ عَبْدِ شَمْسٍ وَهَاشِمٍ  
تمہیں عبد مناف کے دونوں بیٹوں عبد شمس اور ہاشم سے حکومت کا ورثہ ملا ہے۔ اور تم اس کے مستحق ہو۔ اَلْاُكْلِيلُ کے معنی تاج کے ہیں۔ اور تاج کا نام اکلیل اس لیے رکھا گیا ہے کہ وہ سر پر محیط ہو جاتا ہے۔ محاورہ ہے۔

كَلَّ الرَّجُلُ فِي مِشْيَتِهِ كَلَالًا۔ انسان کا چلنے سے عاجز ہو جانا ②

كَلَّ السَّيْفُ عَنْ صَرِيهِ كُتُلًا وَكَلَّةً۔ تلوار کا نشانہ پر نہ لگانا۔

كَلَّ اللِّسَانُ: زبان کا کلام سے عاجز ہو جانا۔

اَكَلَّ فُلَانٌ: کسی کی سواری کا تھک جانا۔

اَلْكُلْكُلُ: سینہ کو کہتے ہیں۔ نیز ہر چیز کا اگلہ حصہ۔

## کَلَا

كَلَا: تشبیہ کے معنی دیتا ہے جیسا کہ کُلُّ جمع کے لیے آتا ہے۔ یہ چونکہ لفظاً مفرد اور معنی تشبیہ ہوتا ہے اس لیے اسے کبھی مفرد اور کبھی تشبیہ تصور کر لیتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿اَمَّا يَلْعَنَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَا اَوْ كِلَاهُمَا﴾

(۲۳-۱۷) اگر ان میں سے ایک یا دونوں تمہارے سامنے

بالعمق (یعنی براہ راست تعلق) جیسے باپ بیٹے کا باہمی تعلق۔ نسبت (۲) بالعرض یعنی بالواسطہ جیسے بھائی یا چچا کے ساتھ (رشتے کی نسبت) قطرب کا قول ہے کہ والدین اور بھائی کے علاوہ باقی رشتہ داروں کو کَلَالَةٌ کہا جاتا ہے۔ لیکن یہ قول بلا دلیل ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ کَلَالَةٌ کا لفظ ہر وارث پر بولا جاتا ہے جیسا کہ شاعر نے کہا ہے ① (مجردء کمال)

(۳۷۹) وَالْمَرْءُ يَبْخُلُ بِالْحَقُوقِ

وَلِلْكَالَالَةِ مَا يُسَيِّمُ

انسان حقوق کی ادائیگی میں بخل کرتا ہے حالانکہ اس کا تمام مال اس کے وارثوں کے لیے ہے۔

يُسَيِّمُ، اَسَامَ الْاِبِلَ سے مشتق ہے۔ جس کے معنی اونٹوں کو چراگاہ میں لے جانے کے ہیں مگر لفظ کَلَالَةٌ سے شاعر نے وہ معنی مراد نہیں لیے جو اس شارح نے سمجھے ہیں بلکہ شاعر کی مراد یہ ہے کہ انسان کو مال جمع کرنے میں زہد سے کام لینا چاہیے۔ کیونکہ کلالہ کے لیے ترک مال

اولاد کے لیے ترک مال سے بڑھ کر شاق ہوتا ہے اور اس میں تنبیہ ہے کہ جن کے لیے تم مرتے وقت مال چھوڑ رہے ہو وہ بمنزلہ کلالہ کے ہیں۔ جیسے تم کہو۔ مَا تَجْمَعُهُ فَهُوَ

لِلْعَدُوِّ: تم جو جمع کرتے ہو وہ تمہارے دشمن کا ہے۔ اور اہل عرب کے ہاں محاورہ ہے۔

لَمْ يَرِثْ فُلَانٌ كَلَالَةً: فلاں آدمی کلالہ کا وارث نہیں

① قالہ بزید بن الحکم الثقفی یعظ ابنہ بدرا والبیث فی الحماسة مع المرزوقی (۱۱۹۵) من قصیدۃ فی ۲۳ بیتا وللییات فصۃ انظر الاعانی (۱۱: ۹۶-۱۰۲) والحزانة (۱: ۱۱۱)۔

② قالہ المرزوق والخطاب لسلیمان بن عبد الملک والبیث فی اللسان (کلیل) وفی روایۃ "لاعن" بدل غیر وقنۃ المجد بدل قنۃ الملک وفی روایۃ الکامل (۳: ۶۳۶) اول البیث ورثتم ثیاب المجد فہی لبوسکم والبیث فی الاشباہ (۳: ۱۷۰) والبحر (۳: ۱۸۸) والسیوطی ۳۲۔

① قالہ بزید بن الحکم الثقفی یعظ ابنہ بدرا والبیث فی الحماسة مع المرزوقی (۱۱۹۵) من قصیدۃ فی ۲۳ بیتا وللییات

فصۃ انظر الاعانی (۱۱: ۹۶-۱۰۲) والحزانة (۱: ۱۱۱)۔

② قالہ المرزوق والخطاب لسلیمان بن عبد الملک والبیث فی اللسان (کلیل) وفی روایۃ "لاعن" بدل غیر وقنۃ المجد

بدل قنۃ الملک وفی روایۃ الکامل (۳: ۶۳۶) اول البیث ورثتم ثیاب المجد فہی لبوسکم والبیث فی الاشباہ (۳: ۱۷۰)

والبحر (۳: ۱۸۸) والسیوطی ۳۲۔

بڑھاپے کو پہنچ جائیں۔ کَلَّا کا مَوْنُث کِلْتَا ہے۔  
جب یہ اسم ظاہر کی طرف مضاف ہوں تو احوال ثلاثہ میں  
ان کا الف بحالہ باقی رہتا ہے۔ اور اس میں کسی قسم کی  
تبدیلی نہیں ہوتی مگر جب اسم ظاہر کی طرف مضاف ہوں  
تو حالت رفعی میں بحالہ باقی رہتا ہے اور نصی اور جری  
حالت میں ’’ی‘‘ سے تبدیل ہو جاتا ہے۔ جیسے:  
جَاءَ فِیْ کِلَاھُمَا رَآیْتُ کِلَیْھِمَا، مَرَرْتُ  
بِکِلَیْھِمَا اور مَوْنُث کے لیے کِلْتَا آتا ہے۔ قرآن

پاک میں ہے:-  
کِلْتَا الْجَنَّتَیْنِ اَنْتَ اُكْلٰھَا (۱۸-۳۳) دونوں باغ  
کثرت سے پھل لائے۔

### (ک ل و)

اَلْکَلَاءَةُ کے معنی کسی چیز کی حفاظت کرنے اور  
اسے باقی رکھنے کے ہیں۔ چنانچہ محاورہ ہے۔  
کَلَّاكَ اللّٰهُ: اللہ تعالیٰ تمہیں محفوظ رکھے وَبَلَغَ بِكَ  
اَكْلًا الْعُمُرِ تمہیں انتہائی عمر تک بحفاظت پہنچائے۔  
اِكْتِلَاتُ بِعَیْنِیْ كَذَا: میں نے بذات خود فلاں چیز کی  
نگرانی کی قرآن میں ہے:

﴿قُلْ مَنْ یَّكْلُوْكُمْ بِاللَّیْلِ الْاِیَةِ﴾ (۲۱-۳۲) کہو کہ  
رات اور دن میں خدا سے تمہاری کون حفاظت کر سکتا ہے۔  
اَلْمَكْلَا (گودی) ہر وہ مقام جہاں کشتیوں کو محفوظ رکھا جا  
سکے۔

اَلْکَلَاءُ: بصرہ میں ایک مقام کا نام ہے کیونکہ وہاں

کہا ہے: (الوافر)

(ک ل ب)  
اَلْکَلْبُ: (کتا) بھونکنے والا جانور۔ اس کی  
مَوْنُث کَلْبَةٌ اور جمع اُكْلَبٌ وَکِلَابٌ آتی ہے۔ کبھی  
اس کی جمع کِلِیْبٌ بھی آ جاتی ہے۔ ﴿كَمَثَلِ الْاَنْكَلَبِ﴾  
(۷-۱۷۶) تو اس کی مثال کتے کی سی ہے۔

﴿وَکَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَیْهِ بِالْوَصِیْدِ﴾ (۱۸-۱۸)  
اور ان کا کتا چوکھٹ پر دونوں ہاتھ پھیلائے ہوئے تھا۔  
اور اسی سے اَلْکَلْبُ (فتح اللام) مشتق ہے۔ جس کے  
معنی شدت حرص کے ہیں۔ اسی سے کہا جاتا ہے:

هُوَ اَحْرَصُ مِنْ كَلْبٍ: وہ کتے سے زیادہ حریص ہے  
اور رَجُلٌ كَلْبٌ کے معنی سخت حریص آدمی کے ہیں اور  
کَلْبٌ كَلْبٌ باؤلا کتا جسے انسان کا گوشت کھانے کا چرکا  
لگ جاتا ہے اور جسے وہ کاٹ کھائے اسے بھی ہڑکائے  
کتے جیسا مرض لاحق ہو جاتا ہے مفرد کے لیے رَجُلٌ  
کَلْبٌ اور جمع کے لیے قَوْمٌ کَلْبِی کہتے ہیں۔ شاعر نے

① أخرجه الدارقطني من حديث ابن عمر رضی اللہ عنہما وصححه الحاكم على شرط مسلم لكن اهل الحديث يوهنون هذا الحديث وايضا في الطبرانی من حديث رافع بن خديج راجع النيل (۵/۶۶) وايضا (ك) حق عنه كنز العمال (۴ رقم ۴۱۳) والحديث في الفائق (۲/۲۰۶) وغريب أبي عبيد (۱: ۲۰) واللسان والنهاية (كلاء)



(۳۸۱) دِمَاءُ هُمْ مِّنَ الْكَلْبِ الشِّقَاءُ

ان کے خون کلب کی مرض سے شفا بخشتے ہیں۔

اور کبھی یہ مرض اونٹ کو بھی لاحق ہو جاتا ہے چنانچہ اَنَّ كَلْبَ الرَّجُلِ کے معنی باؤ لے اونٹ کا مالک ہونے کے ہیں۔

كَلْبِ الشِّتَاءُ: سردی سخت ہوگئی گویا وہ کتے کی طرح پاؤں ہوگئی ہے۔ دَهْرُ كَلْبٍ: سخت زمانہ۔ اَرْضُ كَلْبَةٍ: اس زمین کو کہتے ہیں جو سیراب نہ ہونے کی وجہ سے خشک ہو جائے جیسا کہ باؤ لا آدی پانی نہ پینے کی وجہ سے آخر کار سوکھ کر رہ جاتا ہے۔ اَلْكَلَابُ وَالْمُكَلَّبُ:

اس شخص کو کہتے ہیں جو کتوں کو شکار کے لیے سدھاتا اور انہیں تعلیم دیتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿وَمَا عَلَّمْتُم مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِينَ تُعَلِّمُونَهُنَّ﴾ (۴-۵) اور وہ شکار بھی حلال ہے جو تمہارے لیے ان شکاری جانوروں نے پکڑا ہو جن کو تم نے سدھا رکھا ہے۔

اَرْضُ مُكَلَّبَةٍ: بہت کتوں والی سرزمین۔ اَلْكَلَابُ وَالْكَلْبُ: میخ جو تلوار کے قبضہ میں لگی ہوتی ہے۔ اَلْكَلْبَةُ: توشہ دان باندھنے کے تسمہ سے نیچے کا تسمہ جس

سے اسے سیا جاتا ہے۔ اس کا یہ نام شکاری کتے کی

مناسبت سے رکھا گیا ہے۔ پس كَلَبْتُ اَلْاَدِيمَ کے معنی

چمڑے کو سینے کے ہیں کسی شاعر نے کہا ہے ﴿الرجز﴾

(۳۸۲) سَبَرُ صَنَاعٍ فِيْ اَدِيمٍ تَكْلِبُهُ

کارگر مگر عورت کے تسمہ کی طرح ملائم اور چمکدار ہے جس سے وہ مشکیزہ سی رہی ہو۔

اَلْكَلْبُ: تاروں کے ایک جھکے کا نام ہے جسے کتے کے ساتھ تشبیہ دی جاتی ہے۔ کیونکہ وہ ایک دوسرے جھکے کے تابع ہوتا ہے جسے اَلرَّاعِي (چرواہا) کہا جاتا ہے۔

اَلْكَلْبَتَانِ (دسپناہ) لوہار کے ایک اوزار کا نام ہے جس سے وہ گرم لوہے کو پکڑتا ہے کسی چیز کو پکڑنے کے لحاظ سے اسے

شکاری کتے کے ساتھ تشبیہ دیتے ہیں۔ اور دو کنارے ہونے کی وجہ سے تشبیہ کا لفظ اختیار کیا گیا ہے۔ اَلْكَلْبُوبُ۔

کنڈی۔ کَلَالِبُ جمع کَلَالِبُ الْبَاذِي: باز کے پنجے۔ یہ بھی كَلْب سے مشتق ہے۔ کیونکہ جو چیز اس کے پنجہ میں

آجائے اسے کتے کی طرح پکڑ کر روک لیتا ہے۔

## (ک ل ف)

اَلْكَلْفُ: (س) کسی چیز پر شیفہ ہونا۔ محاورہ ہے كَلِفَ

۱ وفی اللالی قال الشاعر (وهو الحطینیة) قال الاستاذ المیمنی فی طرقہ علیہ "او هذه الزیادة خطأ" لانه لا یوجد فی شیء من نسخ دیوان الحطینیة وانما هو لابی ابرج القاسم بن حنبل المری فی زفر بن ابی ہاشم (عامل الیمامة یکن ایا حبیب) من ثمانية آیات وصدره: حناتہ مکارم واساتہ کلم..... راجع للبیث المرزوقی رقم ۷۲۷ والمعجم للمرزبانی (۲۱۴) والآمدی ۸۱ فی خمسة مطلعها: اری الخلالن بعد ابی حبیب بحجر فی بقائهم جفاء۔ راجع للبیث الحیوان للمحافظ (۵: ۲) وفیه بعد ابی عمیر وفیه البیت منسوب الی بعض المریین والشطریضاً مروی لامية بن ابی السلت وفی المعانی للقبتی بغیر عزو (۲۴۳)

۲ قاله دکیں بن رجاء الفقیمی یصف فرسا وقبلة: کان غیر متنه اذ نحنه من بعد یوم کامل نؤدبه۔ وفی رواية اللسان والصحاح (حزر) خریز بدل ادمهم والرجز فی الاقتضاب بتقدیم وتاخیر وراجع للشرط ایضاً الحمرة لابن درید ۷۵۰۶ والازمنة للمرزوقی (۷۰: ۲) والمعانی للقبتی ۲۶۰ والسمط ۵۸۶ واللسان والصحاح (کلب) ولفظه خریز اکثر من لفظة ادم۔

نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا ﴿٢﴾ (۲۸۶) خدا کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔

کے معنی یہ ہیں کہ جن احکام کو یہ مشقت سمجھتے ہیں وہ مال کے لحاظ سے ان کے لیے وسعت کا باعث ہیں جیسے فرمایا: ﴿وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ مِّلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ﴾ (۲۲-۷۸) اور تم پر دین کی کسی بات میں تنگی نہیں کی اور تمہارے لیے تمہارے باپ ابراہیم علیہ السلام کا دین پسند کیا۔

اور نیز فرمایا:

﴿فَعَسَىٰ أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ﴾ (۲-۲۱۶) مگر جب نہیں کہ ایک چیز تم کو بری لگے اور وہ تمہارے حق میں بھلی ہو۔

### (ک ل م)

الْكَلْمُ: یہ اصل میں اس تاثر کو کہتے ہیں جس کا ادراک دو حاسوں میں سے کسی ایک کے ساتھ ہو سکے چنانچہ کلام کا ادراک قوت سامعہ کے ساتھ ہوتا ہے: اور كَلِمٌ: (زخم) کا ادراک قوت بصر کے ساتھ۔ محاورہ ہے: كَلِمَتُهُ۔ میں نے اسے ایسا زخم لگایا، جس کا نشان ظاہر ہوا۔

اور چونکہ یہ دونوں (یعنی کلام اور کَلِمٌ) معنی تاثیر میں مشترک ہیں۔ اس لیے شاعر نے کہا ہے ﴿(الکامل)﴾ (۳۸۳)

فَلَا تُبْكَدًا: فلاں اس پر شیفۃ ہے۔ اَكْلَفْتُهُ بہ: میں نے اسے شیفۃ کر دیا۔

الْكَلْفُ: (ایضاً) چہرہ پر کے سیاہ دھبے، چہرہ کی چھائیاں گویا اس پر کلفت کا اثر ظاہر ہے۔

الْتَّكْلُفُ: کوئی کام کرتے وقت شیفنگی ظاہر کرنا باوجودیکہ اس کے کرنے میں مشقت پیش آرہی ہو اسلئے عرف میں کلفت مشقت کو کہتے ہیں اور تَكْلُفُ اس کام کے کرنے کو جو مشقت تقصیر یا اوپرے جی سے دکھلاوے کے لیے کیا جائے اس لیے تکلیف دو قسم پر ہے محمود اور مذموم۔ اگر کسی کام کو اس لیے محنت سے سرانجام دے کہ وہ کام اس پر آسان اور سہل ہو جائے اور اسے اس کام کے ساتھ شیفنگی اور محبت ہو جائے تو ایسا تکلف محمود ہے چنانچہ اسی معنی میں عبادات کا پابند بنانے میں تکلیف کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اور اگر وہ تکلیف محض ریاکاری کے لیے ہو تو مذموم ہے۔ چنانچہ آیت:

﴿قُلْ مَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ وَمَا أَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِينَ﴾ (۳۸-۸۶) (اور اے پیغمبر) کہہ دو کہ میں تم سے اس کا صلہ نہیں مانگتا اور نہ میں بناوٹ کرنے والوں میں ہوں، میں تکلیف کے بھی معنی مراد ہیں اور حدیث ہے ﴿(۹۹)﴾ ((أَنَا وَأَتَقِيَاءُ أُمْتِي بُرَاءٌ مِنَ التَّكْلُفِ)) کہ میں اور میری امت کے پرہیزگار آدمی تکلیف سے بری ہیں۔ اور آیت۔ ﴿لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ

① قال النووي ليس بثابت راجع المقاصد للسخاوي رقم ۱۹۱ والحديث أخرجه الدارقطني في الأفراد من حديث الزبير بن العوام ولفظه: الا اني برى من التكلف وصالحو امتي واسناده جيد والحديث بلفظ المؤلف أورده الغزالي في الاحياء (راجع بتخريج العراقي ۱/۱۸۹)

② قاله طرفة بن العبد والبيت بتمامه: بحسام سيفك اولسانك وار۔ كلم الاصيل كا رعب الكلم والبيت في الصناعتين ۳۲۷، ۳۹۳ ديوانه ۶۱ وفيه قبله: وتصدعك مخلية الرجل الشنوف موضحة عن العظم وفي نقد الشعر وتكف بدل تصد والقريض بدل الشنوف وفي الشعراء للحمعي ترو " وفي العيون (۲/۲۳) كا وسع الكلم۔

یہ بڑی سخت بات ہے جو ان کے منہ سے نکلتی ہے۔

اور آیت کریمہ:

﴿قَتَلْتُمَا آدَمَ مِنْ رَبِّهِ كَلِمَتٍ﴾ (۲-۳۷) پھر آدم نے اپنے پروردگار سے کچھ کلمات سیکھے۔

میں بعض نے کہا ہے کہ یہاں کلمات سے رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنْفُسَنَا وغیرہ ادعیہ مراد ہیں ❶ (۱۰۰) حسن بصریؒ سے

مروی ہے کہ ان سے مراد یہ دعا ہے ❷ (۱۲)

أَلَمْ تَخْلُقْنِي بِيَدِكَ؟ أَلَمْ تُسَكِّنِي جَنَّتِكَ؟ أَلَمْ تُسَجِّدْ لِي مَلَائِكَتَكَ؟ أَلَمْ تَسْبِقْ رَحْمَتَكَ غَضَبَكَ؟ أَرَأَيْتَ إِنْ تَبْتُ أَكُنْتُ مُمِيدِي إِلَى الْجَنَّةِ؟ (اے باری تعالیٰ) کیا تو نے مجھے اپنے ہاتھ سے پیدا نہیں کیا؟ کیا تو نے مجھے اپنی جنت میں نہیں بسایا؟ کیا مجھے مجبور ملائکہ نہیں بنایا؟ کیا تیری رحمت تیرے غضب پر سبقت نہیں لے گئی؟ پھر کیا اگر میں توبہ کر لوں تو مجھے جنت میں دوبارہ لوٹا کر نہیں لے جائے گا؟ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کیوں نہیں۔

بعض نے کہا ہے کہ کلمات سے مراد وہ امانت ہے جو کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان، زمین اور پہاڑوں پر پیش کی مگر انہوں نے

وَالْحِكْمُ الْأَصِيلُ كَارِعِبِ الْكَلِمِ

اس شعر میں پہلا اَلْکَلِمِ، کلمۃ کی جمع ہے اور دوسرا کَلِمِ کی جس کے معنی زخم کے ہیں اور اَرَعِبُ کے معنی بہت وسیع کے ہیں پس شعر کے معنی یہ ہیں کہ دل میں لگ جانے والی باتوں کی تاثیر وسیع تر زخموں کی طرح ہوتی ہے اور دوسرے شاعر نے کہا ہے ❶ (المتقارب)

(۳۸۴) وَجَرَحُ اللِّسَانِ كَجَرَحِ الْيَدِ

اور زبان کے زخم بھی ہاتھ کے زخم کے مشابہ ہوتے ہیں۔ کَلَام کا اطلاق منظم و مرتب الفاظ اور ان کے معانی دونوں کے مجموعہ پر ہوتا ہے۔ اور اہل نحو کے نزدیک کلام کے ہر جزو پر اس کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ خواہ وہ اسم ہو یا فعل ہو یا حرف۔ مگر اکثر متکلمین کے نزدیک صرف جملہ مرکبہ و مفیدہ کو کلام کہا جاتا ہے۔ اور یہ قَوْل سے انحصار ہے۔ کیونکہ قَوْل کا لفظ ان کے نزدیک صرف مفرد الفاظ پر بولا جاتا ہے اور کَلِمۃ کا اطلاق انواع ثلاثہ یعنی اسم فعل اور حرف تینوں میں سے ہر ایک پر ہوتا ہے۔ اور بعض نے اس کے برعکس کہا ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ﴾ (۵-۱۸)

❶ وفی اللالی (۵۳۰-۵۳۱) نسبه بعضهم لامری القیس انظر العقد الثمین (۱۲۳) والمعانی للقبی ۲۳ وعن ابن درید انه لامری القیس بن عباس الصحابی وهو الصحیح (العینی (۲: ۳۱) وفی رواية وزر اللسان كذا (العینی (۲: ۳۵) قال ابن الكلبي: والبيت لعمر وابن معدی كرب قاله فی قتله بنی مازن ثم ندم علی قتالهم وصدرو: ولوعن تنافيره جاء نى..... فی خمسة والشرط فی الصناعتین (۳۹۳) والعقد الفريد (۲: ۴۴۵) والعيوك (۲: ۲۳) ومختار الشعراء الحاهلی (۱: ۶۶) وفی المقصورة الدريدية ۱۲۸ بغير عزو۔

❷ اخبرحه الثعالبي عن ابن عباس، وابن المنذر من طريق ابن جرير نحوه والبيهقي في الشعب عن محمد بن كعب القرظي مثله۔

❸ اخبرحه ابن جرير عن ابن عباس ايضا (انظر فتح القدير للشوكاني (۱/ ۷۱) والحاكم في المستدرک فی تنزيه آدم من فضائل الانبياء (من رواية المنهال بن عمرو عن سعيد بن جبیر وقول ابن عباس ايضا في الكشف (راجع تحريج الكشف وللحافظ ص ۷ رقم ۴۴) وذكر الديلمي فيه قصة طويلة عن علي مرفوعا قال في الكنز (۲ رقم ۳۵۵) وسنده واه وابن جرير نسب القول الاول الى الحسن ايضا والثاني الى ابن عباس على عكس ما قال المؤلف ۱۲۔

اس کے اٹھانے سے انکار کر دیا جس کا ذکر کہ آیت کریمہ:  
﴿إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ الْإِيَّةِ﴾ (۷۲-۷۳) ہم نے (بار) امانت کو آسمانوں اور زمین پر پیش کیا: میں آچکا ہے اور آیت کریمہ:  
﴿وَإِذْ أَنْتَلَىٰ إِلَهُهُمْ رَبَّهُ بِكَلِمَاتٍ فَأَتَمَّهُنَّ﴾ (۱۴۲-۲) اور جب پروردگار نے چند باتوں میں ابراہیم کی آزمائش کی تو وہ ان میں پورے اترے۔

میں بعض نے کہا ہے کہ کلمات سے ذبح ولد، ختنہ وغیرہ ایسے کام مراد ہیں جن کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کی آزمائش کی تھی۔ اور زکریا علیہ السلام کے متعلق اللہ تعالیٰ کے فرمان ﴿إِنَّ اللَّهَ يَشْرُكَ بِبَيْحِي مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللَّهِ﴾ (۳۱-۳۹) خدا تمہیں بچی کی بشارت دیتا ہے۔ جو خدا کے فیض یعنی عیسیٰ کی تصدیق کریں گے۔ میں بعض نے کہا ہے کہ بکلمہ سے مراد کلمہ توحید ہے اور بعض نے کتاب اللہ مراد لی ہے اور بعض نے عیسیٰ علیہ السلام مراد لیے ہیں پس آیت..... (۳۹-۳) اور آیت کریمہ:

﴿وَكَلِمَتُهُ أَلْفَهَا إِلَىٰ مَرِيَمَ﴾ (۴-۱۷۱) اور اس کا

کلمہ (بشارت) تھے جو اس نے مریم کی طرف بھیجا تھا۔

میں عیسیٰ علیہ السلام کو کلمہ اس لیے کہا گیا ہے کہ وہ کلمہ کن سے

پیدا ہوئے تھے جیسا کہ آیت ﴿إِنَّ مَثَلَ عِيسَىٰ

عِنْدَ اللَّهِ﴾ (۵۹-۳) عیسیٰ کا حال خدا کے نزدیک۔

میں مذکور ہے اور بعض نے کہا ہے کہ لوگوں کے ان کے

ذریعہ ہدایت پانے کی وجہ سے انہیں کلمہ کہا گیا ہے جیسا

کہ کلام اللہ کے ذریعہ لوگ ہدایت پاتے ہیں۔ اور بعض نے کہا ہے کہ یہ اس خصوصی رحمت کے سبب سے ہے جو انکے بچنے میں اللہ تعالیٰ نے ان پر کی تھی۔ جب کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ماں کی گود میں لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا۔

﴿إِنِّي عَبْدُ اللَّهِ إِنِّي الْكِتَابَ وَجَعَلَنِي نَبِيًّا﴾ (۱۹-۳۰) کہ میں خدا کا بندہ ہوں اس نے مجھے کتاب دی ہے اور نبی بنایا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ نبی ہونے کی وجہ سے انہیں کلمہ اللہ کہا گیا ہے جیسا کہ آنحضرت ﷺ کو رسول اللہ ہونے کی وجہ سے ذکر کہا گیا ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَعَدًا﴾ (۶-۱۱۵) اور تمہارے پروردگار کی باتیں سچائی اور انصاف میں پوری ہیں۔

میں کلمہ بمعنی قضیہ یعنی فیصلہ کے ہے چنانچہ ہر قضیہ کو خواہ وہ قولی ہو یا فعلی کلمہ کہہ سکتے ہیں اور اسے صدق کے ساتھ متصف کرنا اس لیے ہے کہ قول اور فعل دونوں صدق کے ساتھ متصف ہوتے ہیں لہذا تَمَّتْ کَلِمَةُ رَبِّكَ میں آیت کریمہ:

﴿الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ﴾ (۵-۳) (اور) آج

ہم نے تمہارے لیے تمہارا دین کامل کر دیا، کے مضمون کی

طرف اشارہ ہوگا۔ اور اس میں متنبہ کیا ہے کہ آج کے بعد

شریعت میں ”نسخ“ نہیں ہوگا۔ بعض نے کہا ہے کہ اس میں

آنحضرت ﷺ کے اس فرمان کی طرف اشارہ ہے ﴿۱۰۲﴾

① اخرجہ احمد مسندہ (۱۲۵/۳) وایضاً ابو داود عن عبادہ بن الصامت وبمعناه فی (حل، حق) عن ابن عباس والترمذی عن عبادہ راجع کنز العمال (۵۳۶) وروضة العقلاء للبسنی ۱۳۵۔

﴿اَنْتَ بِقُرْآنٍ غَيْرِ هَذَا﴾ (۱۵-۱۰) کہ اس کے سوا کوئی اور قرآن (بنا) لاؤ، میں مذکور ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ تمت کلمۃ ربک سے احکام الہی مراد ہیں اور تمت کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے وہی احکام اپنے بندوں کے لیے شروع کیے ہیں جن میں کہ ان کے لیے کفایت ہے اور آیت کریمہ:

﴿وَتَمَّتْ کَلِمَةُ رَبِّکَ الْحُسْنٰی عَلٰی بَنِیْ اِسْرَآئِیْلَ بِمَا صَبَرُوْا﴾ (۷-۱۳۷) اور بنی اسرائیل کے بارے میں ان کے صبر کی وجہ سے تمہارے پروردگار کا وعدہ نیک پورا ہوا۔ میں بعض نے کہا ہے کہ یہاں کلمہ حسنی سے مراد وہ فیصلہ ہے جس کا ذکر کہ آیت:

﴿وَنُرِیْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلٰی الَّذِیْنَ اسْتَضَعُّوْا﴾ (۲۸-۵) اور ہم چاہتے تھے کہ جو لوگ ملک میں کمزور کر دیئے گئے ہیں ان پر احسان کریں۔

میں پایا جاتا ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَلَوْ لَا کَلِمَةُ سَبَقَتْ مِنْ رَبِّکَ لَکَانَ لِزَامًا﴾ (۲۰-۱۲۹) اور اگر یہ بات تمہارے پروردگار کی طرف سے پہلے صادر اور (جزائے اعمال کے لیے) ایک میعاد (مقرر نہ ہوتی) تو (نزول) عذاب واقع ہو جاتا۔

نیز دوسری آیت:

﴿وَلَوْ لَا کَلِمَةُ سَبَقَتْ مِنْ رَبِّکَ اِلٰی اَجَلٍ مُّسَمًّی لَقَضٰی بَیْنَهُمْ﴾ (۳۲-۱۳) اور اگر تمہارے پروردگار کی طرف سے پہلے ہی ایک وقت مقرر تک کے لیے بات نہ ٹھہر چکی ہوتی تو ان کے درمیان فیصلہ کر دیا جاتا۔

میں سبق کلمۃ اللہ تعالیٰ سے اس حکم ازلی کی طرف

((اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰهُ الْقَلَمَ فَقَالَ لَهُ اَجْرِ بِمَا هُوَ کَاثِنٌ اِلٰی یَوْمِ الْقِیَامَةِ)) کہ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے قلم کو پیدا کیا اور اس سے کہا کہ جو کچھ قیامت تک ہونے والا ہے اسے لکھ دو..... الخ۔

اور بعض نے کہا ہے کہ کَلِمَةُ سے مراد قرآن پاک ہے اور اسے "کَلِمَةُ" کہنا ایسا ہی ہے جیسے قصیدہ کو کلمہ کہا جاتا ہے اور تَمَّتْ سے قرآن پاک کے تا قیامت (تحریف سے) محفوظ رہنے کی طرف اشارہ ہے۔ اور لفظ ماضی لا کر اس بات کے قطعی ہونے کی طرف اشارہ کیا ہے اور قرآن پاک کی اسی قسم کی حفاظت کی طرف آیت کریمہ: ﴿فَاِنْ یَّکْفُرْ بِهَا هُوَ لَآءِ الْاٰیَةِ﴾ (۶-۹۰) اگر یہ کفار ان باتوں سے انکار کریں، میں بھی اشارہ پایا جاتا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ تَمَّتْ کَلِمَةُ رَبِّکَ سے ثواب و عقاب کا وعدہ مراد ہے۔ جیسا کہ دیگر آیات میں فرمایا:

﴿بَلٰی وَلٰکِنْ حَقَّتْ کَلِمَةُ الْعَذَابِ عَلٰی الْکٰفِرِیْنَ﴾ (۳۹-۷۱) کہیں گے کیوں نہیں۔ لیکن کافروں کے حق میں عذاب کا حکم حق ہو چکا تھا۔

﴿كَذٰلِكَ حَقَّتْ کَلِمَةُ رَبِّکَ عَلٰی الَّذِیْنَ فَسَقُوْا﴾ (۱۰-۳۳) اسی طرح خدا کا ارادہ نافرمانوں کے حق میں ثابت ہو کر رہا۔

اور بعض نے کہا ہے کہ کلمات سے معجزات مراد ہیں جو قوم نے طلب کیے تھے اور لفظ تمت سے اس بات پر تنبیہ کی ہے کہ جو آیات بھیجی گئی ہیں وہ اپنی جگہ پر مکمل اور کافی ہیں۔ اور آیت کریمہ: ﴿لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَتِهِ﴾

(۱۸-۲۷) اس کی باتوں کو کوئی بدلنے والا نہیں، میں ان کے اس مطالبہ کی تردید ہے جو کہ آیت:

(۵۱-۴۲) اور کسی آدمی کے لیے ممکن نہیں ہے کہ خدا اس سے بات کرے مگر الہام کے ذریعہ سے.....

میں دنیا میں ہم کلام ہونے کا بیان ہے اور آخرت میں ثواب و کرامت کے طور پر صرف مومنین سے ہم کلام ہوگا

جس کی کیفیت ہم سے مخفی ہے چنانچہ آیت کریمہ:

﴿إِنَّ الَّذِينَ يَشْتَرُونَ بِعَهْدِ اللَّهِ﴾ (۷۷-۳) کے آخر میں لَا يُكَلِّمُهُمُ اللَّهُ کہہ کر تنبیہ کی ہے کہ کفار اس نعمت عظمیٰ سے محروم رہیں گے۔ اور آیت کریمہ:

﴿يُحَرِّقُونَ الْكَلِمَ عَنْ مَوَاضِعِهِ﴾ (۴۶-۴) کہ کلمات کو ان کے مقام سے بدل دیتے ہیں۔ میں کَلِمَ کَلِمَةً کی جمع ہے۔ اس آیت کی تاویل میں اختلاف ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ وہ الفاظ میں تغیر و تبدل کرتے تھے اور بعض نے تحریف معنوی مراد لی ہے یعنی آیت کو اس کے مقتضی کے خلاف معنی پر محمول کرنا یہ دوسرا قول قوی تر معلوم ہوتا ہے ❶ کیونکہ الفاظ کے مشہور اور متداول ہونے کے بعد ان میں تبدیلی کرنا ذرا مشکل معلوم ہوتا ہے اور آیت کریمہ:

﴿وَقَالَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللَّهُ أَوْ تَأْتِينَا آيَةٌ﴾ (۱۱۸-۲) اور جو لوگ کچھ نہیں جانتے (یعنی مشرک ہیں) وہ کہتے ہیں۔ کہ خدا ہم سے کلام کیوں نہیں کرتا یا ہمارے پاس کوئی نشانی کیوں نہیں آتی۔

کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہم سے بالمشافہہ گفتگو کیوں نہیں

اشارہ ہے جس کی حکمت الہی مقتضی تھی اور یہ کہ کلمات الہیہ کو کوئی تبدیل نہیں کر سکتا۔ اور نہ ہی ان میں کسی قسم کے تغیر کی گنجائش ہوتی ہے۔

اور آیت کریمہ:

﴿أَنْ يُحَقِّقَ الْحَقَّ بِكَلِمَاتِهِ﴾ (۷-۸) کہ اپنے فرمان سے حق کو قائم رکھے۔

میں کَلِمَاتِهِ سے وہ دلائل ثابتہ مراد ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے کفار کے خلاف مسلمانوں کے لیے سلطان مبین یعنی زبردست دلیل کی حیثیت سے قائم کیا ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿يُرِيدُونَ أَنْ يُبَدِّلُوا كَلَامَ اللَّهِ﴾ (۱۵-۴۸) یہ چاہتے ہیں کہ خدا کے کلام کو بدل دیں۔

میں کلام اللہ سے اس پیشگوئی کی طرف اشارہ ہے جو کہ آیت ﴿فَقُلْ لَنْ تَخْرُجُوا مَعِيَ أَبَدًا﴾ (۸۳-۹) تو کہہ دینا کہ تم میرے ساتھ ہرگز نہیں نکلو گے۔ میں مذکور ہے اور بتایا ہے کہ منافقین کا یہ کہنا کہ ﴿ذُرُونَا نَتَّبِعْكُمْ﴾ (۱۵-۴۸) کلام الہی میں تبدیلی کے مترادف ہے اور متنبہ کیا ہے کہ یہ لوگ ہرگز ہرگز تمہارے ساتھ نہیں نکلیں گے اور نکل بھی کیسے سکتے ہیں جب کہ علم الہی میں یہ..... فیصلہ ہو چکا ہے کہ ان سے یہ نہیں ہو سکے گا۔ ❷

بندے سے اللہ تعالیٰ کا ہم کلام ہونا دو قسم پر ہے یعنی یا دنیا میں اور یا آخرت میں۔ چنانچہ آیت: ﴿وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُكَلِّمَهُ اللَّهُ إِلَّا وَحْيًا﴾ الایۃ

❶ هذا ما تاول به عبدالرحمن بن زيد بن اسلم وقال به الجبائي وفيه نظر لان آية البراءة نزلت في غزوة تبوك وهي متاخرة عن عمرة الحديبية بارب سنين (لان صلح الحديبية كان سنة ست وغزوة تبوك سنة تسع) ابن كثير (۱۸۶/۴) فالصحيح هو الوعد الذي وعد به اهل الحديبية قال الطبرسي (۶۰/۲۶) وهذا قول الجبائي غلط فاحش حملة عليه العصبية ۱۲۔

❷ نسبه علماء التفسير الى ابن عباس

کرنا جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا:

﴿يَسْأَلُكَ أَهْلُ الْكِتَابِ أَرَأَاكَ اللَّهُ جَهْرَةً﴾ (۴-۱۵۳)  
(اے محمدؐ) اہل کتاب تم سے درخواست کرتے ہیں۔ ہمیں  
خدا کو ظاہر (یعنی آنکھوں سے دکھا دو)۔

## کَلَّا

یہ حرف ردع اور زجر ہے اور ماقبل کلام کی نفی  
کے لیے آتا ہے اور یہ۔ ”اِنی“ حرف ایجاب کی ضد  
ہے۔ جیسا کہ قرآن پاک میں ہے:

﴿أَفَرَأَيْتَ الَّذِي كَفَرَ بِآيَاتِنَا وَقَالَ لَأُوتِيَنَّ مَالًا  
وَلَدًا أَطَّلَعَ الْغَيْبَ أَمِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمَنِ  
عَهْدًا كَلًّا﴾ (۱۹-۷۷، ۷۸، ۷۹) بھلا تم نے اس  
شخص کو دیکھا جس نے ہماری آیتوں سے کفر کیا۔ اور کہنے  
لگا (اگر میں از سر نو زندہ ہوا بھی تو یہی) مال اور اولاد مجھے  
وہاں ملے گا کیا اس نے غیب کی خبر پالی ہے یا خدا کے  
یہاں (سے) عہد لے لیا ہے؟ ہرگز نہیں۔

﴿لَعَلِّي أَعْمَلُ صَالِحًا فِيمَا تَرَكْتُ كَلًّا﴾  
(۲۳-۱۰۰) تاکہ میں اس میں جسے چھوڑ آیا ہوں نیک  
کام کروں ہرگز نہیں۔

﴿كَأَلَّا لَمَّا يَفْضُ مَا أَمَرَهُ﴾ (۸۰-۲۳) کچھ شک  
نہیں کہ خدا نے اسے جو حکم دیا۔ اس نے ابھی تک اس پر  
عمل نہیں کیا۔

اور اس نوع کی اور بھی بہت آیات ہیں۔

## كَمْ

یہ عدد سے کنایہ کے لیے آتا ہے اور یہ دو قسم پر  
ہے۔ استفہامیہ<sup>(۱)</sup> اور خبریہ<sup>(۲)</sup>۔ استفہامیہ ہو تو اس کا مابعد  
اسم تیز بن کر منصوب ہوتا ہے (اور اس کے معنی) کتنی

تعداد یا مقدار کے ہوتے ہیں جیسے کَمْ رَجُلًا ضَرَبْتُ:  
اور جب خبر یہ ہو تو اپنی تمیز کی طرف مضاف ہو کر اسے  
مجرد کر دیتا ہے اور کثرت کے معنی دیتا ہے ”یعنی کتنے ہی“  
جیسے کَمْ رَجُلٍ ضَرَبْتُ: میں نے کتنے ہی مردوں کو  
پیٹا اور اس صورت میں کبھی اس کی تمیز پر من جارہ داخل  
ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے: ﴿كَمْ مِّنْ قَرْيَةٍ  
أَهْلَكْنَاهَا﴾ (۷-۴) اور کتنی ہی بستیاں ہیں کہ ہم نے  
تباہ کر ڈالیں۔ ﴿وَكَمْ قَصَمْنَا مِن قَرْيَةٍ كَانَتْ  
ظَالِمَةً﴾ (۲۱-۱۱) اور ہم نے بہت سی بستیوں کو جو ستم  
گار تھیں ہلاک کر ڈالا۔

## (ک م م)

الْكُمُّ: آستین کو کہتے ہیں اور الْكِمُّ (بکسر  
الکاف) خوشوں کے غلاف کو..... اس کی جمع الْكُمَامُ  
آتی ہے جیسے فرمایا ﴿ذَاتُ الْاَكْمَامِ﴾ (۵۵-۱۱)  
اور کھجور کے درخت ہیں جن (کے خوشوں) پر غلاف  
ہوتے ہیں۔

الْكُمَةُ: ایک طرح کی گول ٹوپی۔ جو سر پر پہنی جاتی ہے۔

## (ک م ل)

كَمَالُ الشَّيْءِ: کسی چیز کے کامل ہونے  
سے مراد ہے، وہ غرض پوری ہو جانا جس کے لیے وہ وجود  
میں آئی تھی۔ چنانچہ جب کسی چیز کے متعلق كَمُلَ ذَالِكَ  
کہا جاتا ہے تو اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ جو کچھ اس سے  
مقصود تھا۔ وہ حاصل ہو گیا۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَالْوَالِدَتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ  
كَامِلَيْنِ﴾ (۲-۲۳۳) اور مائیں اپنے بچوں کو پورے  
دو سال دودھ پلائیں۔

(۳۸۵) كَمِثَّتْ عَيْنَاهُ حَتَّى ابْيَضَّتَا  
اس کی آنکھیں بے نور ہو کر سفید ہو گئیں۔

(ک ن ن)

الْكِنُّ: ہر وہ چیز جس میں کسی چیز کو محفوظ رکھا

جائے۔

كَتَنَتُ الشَّيْءَ كَتْنًا: کسی چیز کو کِنِّ میں محفوظ کر دیا اور  
كَتَنَتُ (مثلاً مجرد) خصوصیت کے ساتھ کسی مادی شے کو  
گھریا کپڑے وغیرہ میں چھپانے پر بولا جاتا ہے۔ چنانچہ  
قرآن پاک میں ہے:

﴿كَانَتْهُمْ يَبْضُ مَكْنُونٌ﴾ (۳۷-۲۹) گویا وہ

محفوظ اندھے ہیں۔

﴿كَانَتْهُمْ لَوْ لَوْ مَكْنُونٌ﴾ (۵۲-۲۳) جیسے چھپائے

ہوئے موتی۔

اور اَكْنَنْتُ (باب افعال سے) دل میں کسی بات کو

چھپانے پر بولا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:-

﴿وَأَكْنَنْتُمْ فِي أَنْفُسِكُمْ﴾ (۲-۲۳۵) یا (نکاح کی

خواہش کو) اپنے دلوں میں مخفی رکھو۔

اور كِنُّ کی جمع اَكْنَانُ آتی ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں

ہے: ﴿وَجَعَلَ لَكُم مِّنَ الْجِبَالِ أَكْنَانًا﴾

(۱۶-۱۸) اور پہاڑوں میں تمہارے لیے غاریں بنائیں۔

الْكِنَانُ: پردہ، غلاف وغیرہ جس میں کوئی چیز چھپائی

جائے اس کی جمع اَكْنَنَةٌ آتی ہے۔ جیسے غطاء کی جمع

أَغْطِيَةُ: چنانچہ ارشاد ہے۔

﴿وَجَعَلْنَا عَلَى قُلُوبِهِمْ أَكِنَّةً أَنْ يَفْقَهُوهُ﴾ (اور

میں گامِ لینی سے مراد یہ ہے کہ رضاعت کے لیے دو  
سال کی مدت آخری مدت ہے جس سے بچہ کی نشوونما اور  
اسکی بیوی کا تعلق ہے اور آیت کریمہ:

﴿لِيَحْمِلُوا أَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً يَوْمَ الْقِيَمَةِ﴾

(۱۶-۲۵) یہ قیامت کے دن اپنے (اعمال کے) پورے

بوجھ بھی اٹھائیں گے۔

میں اس بات پر تنبیہ کی ہے کہ انہیں قیامت کے دن پوری

سزا ملے گی اور آیت:

﴿تِلْكَ عَشْرَةٌ كَامِلَةٌ﴾ (۲-۱۹۶) یہ پورے دس

ہوئے۔

میں عَشْرَةٌ کی صفت گَامِلَةٌ لانے سے یہ مقصد نہیں

ہے کہ سات اور تین مل کر دس ہو جاتے ہیں۔ بلکہ گَامِلَةٌ

کے لفظ سے اس بات کی وضاحت کرنا ہے کہ دس دن کے

روزوں سے ہدی کا پورا بدل حاصل ہو جاتا ہے۔

اور بعض نے کہا ہے کہ گَامِلَةٌ کا لفظ استطراداً لایا گیا

ہے اور اس سے مقصد اسم عدد میں عشرہ کی فضیلت کو ظاہر

کرنا ہے کہ یہ پہلی (دہائی) ہے جس پر عدد کامل ہو جاتا

ہے۔ پھر اس کے بعد ان ہی ہندسوں کا تکرار ہوتا رہتا ہے

جو اس سے قبل ہوتے ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ عشرہ

ہی کامل عدد ہے۔

(ک م ہ)

الْأَكْمَةُ کے معنی پیدائشی اندھا کے ہیں مگر

کبھی اس شخص کے لیے آتا ہے جس کی بعد میں بصارت

کھو گئی ہو شاعر نے کہا ہے (الزل)

۱ وفی القرآن ﴿وابری الاکمه والابرص﴾ (۳-۴۹)۔

۲ قاله سويد بن ابی کامل الشکری فی عینیتہ المشہورۃ الی تسمى "الیتیمۃ" راجع المفضلیات (۱: ۱۸) والبیٹ فی اللسان (کمه) وتماہم فهو یلحی نفسه لما نزع والبیٹ من شواہد الطبری (۳/ ۲۷۷)۔



احسان نہ ماننے والا اور ناشکرا ہے۔

## (ک ن ز)

الْكَنْزُ: (ض) کے معنی دولت جمع کر کے اسے محفوظ رکھ دینے کے ہیں یہ اصل میں كَنْزْتُ التَّمَرِ فِی النُّوعَاءِ سے مشتق ہے۔ جس کے معنی کھجور کو بار دان میں بھر کر محفوظ کر لینے کے ہیں۔ اور کھجور اندوختہ کرنے کے موسم کو زَمَنُ الْكَنْزِ کہا جاتا ہے۔ اور نَاقَةُ كِنَازٍ کے معنی گوشت سے گتھی ہوئی اونٹنی کے ہیں۔ اور آیت کریمہ: ﴿وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ﴾ (۹-۳۴) اور جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں۔

میں يَكْنِزُونَ سے مراد وہ لوگ ہیں جو سونا اور چاندی جمع کرنے میں مصروف رہتے ہیں۔ اور اسے راہ خدا میں صرف نہیں کرتے ایسے لوگوں کو قیامت کے دن کہا جائے گا۔

﴿فَذُوقُوا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُونَ﴾ (۹-۳۵) کہ جو کچھ تم جمع کرتے تھے اس کا مزہ چکھو۔

اور آیت ﴿لَوْ لَا أَنْزَلْنَا عَلَيْهِ كَنْزًا﴾ (۱۲-۱۱) میں کنز کے معنی خزانہ اور بڑی دولت کے ہیں اور آیت کریمہ: ﴿وَكَانَ تَحْتَهُ كَنْزُ لَهُمَا﴾ (۸۲-۱۸) اور اس کے نیچے ان کا خزانہ (مدفون) تھا۔ میں بعض نے کہا ہے کہ یہاں کنز سے صحیفہ علم مراد ہے۔

## (ک ہ ف)

الْكُهْفُ: کے معنی پہاڑ میں غار کے ہیں اس کی جمع كُهُوفٌ آتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿إِنَّ أَصْحَابَ الْكُهْفِ وَالرَّقِيمِ﴾ (۹-۱۸) کہ

ہم نے انکے دلوں پر تو پردے ڈال رکھے ہیں کہ اس کو سمجھ نہ سکیں۔ اور آیت کریمہ: ﴿وَقَالُوا قُلُوبُنَا فِيْ أَكِنَّةٍ﴾ (۵-۴۱) اور کہنے لگے ہمارے دل پردوں میں ہیں۔

کے بعض نے یہ معنی بیان کیے ہیں کہ ہم تمہاری باتیں سمجھنے سے قاصر ہیں۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا: ﴿قَالُوا يُشْعِبُ مَا نَفَقَهُ كَثِيرًا مِّمَّا تَقُولُ﴾ (۹۱-۱۱) انہوں نے کہا اے شعیب! تمہاری بہت سی باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آتیں۔ اور آیت کریمہ: ﴿إِنَّهُ لَقُرْآنٌ كَرِيمٌ فِیْ كِتَابٍ مَّكْنُونٍ﴾ (۵۶-۷۷، ۷۸) کہ یہ بڑے رتبے کا قرآن پاک ہے جو کتاب محفوظ میں لکھا ہوا ہے۔

کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ کتاب کنون سے لوح محفوظ مراد ہے<sup>۱</sup> اور بعض نے کہا ہے کہ یہ قرآن پاک کے عند اللہ محفوظ ہونے کی طرف اشارہ ہے جیسا کہ دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿وَأَنَّا لَهُ لَحَفِظُونَ﴾ (۹-۱۵) اور ہم ہی اس کے نگہبان ہیں۔

اور شادی شدہ عورت پر بھی كِنَّةٌ کا اطلاق ہوتا ہے کیونکہ وہ اپنے خاوند کی حفاظت میں رہتی ہے اس بنا پر شادی شدہ عورت کو مُحَصَّنَةٌ بھی کہتے ہیں۔ گویا وہ اپنے خاوند کی حفاظت کے قلعے میں محفوظ ہے۔

الْكِنَانَةُ: ترکش جو کہیں سے پھٹا ہوا نہ ہو۔

## (ک ن د)

أَرْضٌ كَنْوُودٌ: بنجر زمین جہاں کچھ پیداوار نہ ہوتی ہو۔ (اور کنایہ کے طور پر ناپاس گذار کو كَنْوُودٌ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے: ﴿إِنَّ الْإِنْسَانَ لِرَبِّهِ لَكَنُودٌ﴾ (۶-۱۰۰) کہ انسان اپنے پروردگار کا

۱ کما فی قولہ تعالیٰ۔ ﴿فِیْ لُوحٍ مَّحْفُوظٍ﴾ (۸۵-۲۲)

غار اور لوح والے۔

## (ک ۵ ل)

الْكَهْلُ: ادھیڑ عمر آدمی جس کے بال سفید ہو

گئے ہوں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا وَمِنَ الصَّالِحِينَ﴾ (۳۶-۳) اور ماں کی گود میں اور بڑی عمر

کا ہو کر لوگوں سے گفتگو کرے گا اور نیکو کاروں میں ہوگا۔

اِكْتَهَلَ النَّبَاتُ: پودے کا حدیث سے یعنی بڑھنے کی

آخری حد کو پہنچ جانا۔ جیسا کہ ادھیڑ عمر آدمی بڑھاپے کی حد

کو پہنچ جاتا ہے۔ شاعر نے کہا ہے: (لبیط)

(۳۸۶) مُوزَّرٌ بِهَشِيمٍ النَّبْتُ مُكْتَهَلٌ

اس کی گھاس آخری حد تک بڑھی ہوئی ہے اور اس نے

اپنے گردا گرد دوسرے پودوں کی چادر پہن رکھی ہے۔

## (ک ۵ ن)

الْكَاهِنُ: اس شخص کو کہتے ہیں جو تخمینے سے

ماضی کے خفیہ واقعات کی خبر دیتا ہو اور عزاف اسے جو

آئندہ کے متعلق خبر دیتا ہو ان دونوں پیشوں کی بنا چونکہ ظن

پر ہے جس میں صواب و خطا کا احتمال پایا جاتا ہے۔ اس

لیے آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ﴿(مَنْ أَتَى

عَرَّافًا أَوْ كَاهِنًا فَصَدَقَهُ إِمَّا قَالَ فَقَدْ كَفَرَ بِمَا

أُنْزِلَ عَلَى أَبِي الْقَاسِمِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ

وَسَلَّمَ))۔ کہ جو شخص عراف یا کاهن کے پاس جا کر ان

کے قول کی تصدیق کرے تو اس نے جو کچھ ابوالقاسم (یعنی

مجھ پر) اتارا گیا ہے اس کے ساتھ کفر کیا کھن فُکْلَانُ

كَهَانَةٌ کہانت کرنا۔ اور جب کوئی شخص اس پیشہ کے

ساتھ مختص ہو تو اس کے متعلق کھن کہتے ہیں۔

تَكْهَنُ: بتکلف کہانت کرنا قرآن پاک میں ہے: ﴿وَلَا

يَقُولُ كَاهِنٌ قَلِيلًا مَّا تَذَكَّرُونَ﴾ (۶۹-۱۳۲)

اور نہ کسی کاهن کے مخرفات ہیں لیکن تم لوگ بہت ہی کم

دھیان دیتے ہو۔

## (ک ۵ ب)

الْكُوبُ: پیالہ جس کا دستہ ہو۔ اس کی جمع

اَكْوَابٌ آتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿بِاَكْوَابٍ وَأَبَارِيقٍ وَكَأْسٍ مِّنْ مَّعِينٍ﴾

(۵۶-۱۸) یعنی آنخورے اور آفتابے اور صاف شراب

کے گلاس۔

الْكُوبَةُ: (ڈگڈگی) یعنی باریک میان طبلک جو تماشہ کے

وقت مداری بجاتے ہیں۔

## (ک ۵ د)

كَادَ: (س) یہ فعل مقارب ہے یعنی کسی فعل

کے قریب ہونے کو بیان کرنے کے لیے آتا ہے مثلاً كَادَ

يَفْعَلُ: قریب تھا کہ وہ اس کام کو کر گزرتا یعنی کرنے والا

① قاله الاعشى وصدرة: يضاحك الشمس منها كوكب شرق۔ راجع للبيت الصناعتين ۲۷۶ والبلغة في شذور اللغة

(کتاب النبات الاصمعی ۳۳) ودیوانہ (۱۴۴) افی قصیدہ مخاطباً لیزید بن مسهر مطلعها: ودع هريرة ان الركب مرتحل۔

وهل تطيق وداعا ايها الرجل۔ وهريرة هذه قينة لبشر بن عمر تكتي بام الخليلد والقصيدة في ديوانه (۱۴۴-۱۴۹) والبيت

في اللسان (ازر، كمل) وشرح للديوان ۵۷۔ والطبری (۲۱-۲۷) والمرتضى (۱: ۲۲۱) والمشكل للقبتي (۱۰۳)

والعيون (۲: ۱۰۶) وشرح العشر للتبریزی (۲۷۶) وفي روايته بعميم بدل بهشيم ۱۲۔

② عن ابی هريرة مرفوعاً رواه الحاكم في المستدرک وعن علی موقوفا (رسته) انظر كنز العمال (۶: رقم ۳۰۹۸ و ۴۰۰۴ ج ۶) وفي رواية مسلم والحاكم فقد برى مما انزل الله على محمدض (كنز العمال ۳۰۹۵)

## (ک و ر)

الْكَوْرُ: کے معنی کسی چیز کو عمامہ کی طرح لپیٹنے اور اس کو اوپر تے گھمانے کے ہیں۔ چنانچہ آیت: ﴿يَكْوِرُ الَّيْلُ عَلَى النَّهَارِ وَيَكْوِرُ النَّهَارُ عَلَى الَّيْلِ﴾ (۵-۳۹) اور وہی رات کو دن پر لپیٹتا اور دن کو رات پر لپیٹتا ہے۔

میں مطالعہ شمسی کے تبدیل ہونے سے دن رات کے بڑھنے اور گھٹنے کو نکویر سے تعبیر فرمایا ہے۔

طَعَنَهُ فَكَوْرَهُ: اس کو نیزہ مار کر گھجھلی کر دیا۔

اِكْتَسَرَ الْقَرْسُ: گھوڑے کا دوڑتے وقت اپنی دم گھمانا اور بہت سے اونٹوں کو بھی کَوْر کہا جاتا ہے اور کُوَارَةُ النَّحْلِ کے معنی شہد کے چھتے کے ہیں۔

الْكَوْرُ کے معنی اونٹ کا پالان بھی آتے ہیں اور ہر بڑے شہر کو کُوْرہ کہا جاتا ہے یعنی وہ علاقہ جس میں بہت سی بستیاں اور دیہات جمع ہوں۔

## (ک و ن)

كَانَ - فعل ماضی کے معنی کو ظاہر کرتا ہے بیشتر صفات باری تعالیٰ کے متعلق استعمال ہو تو ازلیت (یعنی ہمیشہ سے ہے) کے معنی دیتا ہے چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَكَانَ اللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا﴾ (۴۰-۳۳) اور خدا ہر چیز سے واقف ہے۔ ﴿وَكَانَ اللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرًا﴾ (۲۱-۴۸) اور خدا ہر چیز پر قادر ہے۔

تھا مگر کیا نہیں قرآن پاک میں ہے: ﴿لَقَدْ كَذَبْتَ تَرَكَنَ إِلَيْهِمْ شَيْئًا قَلِيلًا﴾ (۴-۱۷) تو تم کسی قدر ان کی طرف ہٹل ہونے ہی لگے تھے ﴿وَإِنْ كَادُوا لَيَفْتِنُوْكَ﴾ (۴-۷۳) قریب تھا کہ یہ (کافر) لوگ تم کو اس سے بجا دیں۔

﴿يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ﴾ (۲۰-۲) قریب ہے کہ بجلی کی چمک ان کی آنکھوں کی بصارت کو اچک لے جائے۔ ﴿يَكَادُوْنَ يَسْطُوْنَ﴾ (۷۲-۲۳) قریب ہوتے ہیں کہ ان پر حملہ کر دیں۔

﴿إِنْ كَذَبْتَ لَتُرْدِيْنَ﴾ (۶۵-۳۷) تو تو مجھے ہلاک ہی کر چکا تھا اور اگر اس کے ساتھ حرف نفی آجائے تو اثباتی حالت کے برعکس فعل کے وقوع کو بیان کرنے کے لیے آتا ہے جو وقوع کے قریب نہ ہو اور حرف نفی اس پر مقدم ہو یا متاخر دونوں صورتوں میں ایک ہی معنی دیتا ہے چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔ ﴿مَا كَادُوا يَفْعَلُوْنَ﴾ (۷۱-۲) اور وہ ایسا کرنے والے تھے نہیں۔

﴿لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيثًا﴾ (۷۸-۴) کی بات بھی نہیں سمجھ سکتے۔

اور کَادَ کے بعد ان کا استعمال صرف ضرورت شعری کے لیے ہوتا ہے۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے ﴿الرجز﴾ (۳۸۷) قَدْ كَادَ مِنْ طُولِ الْبَلَى أَنْ يَمْصَحَا قریب تھا کہ زیادہ بوسیدگی کے باعث وہ مٹ جائے۔

① قاله رؤبة بن العجاج وقيله: ربع عفاه الدهر طولا فانمحي۔ والرجز في اسرار ابن الانباري (۱۲۹) واللسان والمصباح (كاد) والكمال (۱۶۷) والعيني (۲: ۲۱۵) وابن عيش والانتصاب (۳۹۶) وقال والرجز يروي لرؤبة بن العجاج ولم اجد في ديوانه وارجع للشطر ايضا المشكل للقبتي (۴۰۷) والكتاب (۷۸: ۱) والخزانة (۴: ۹۱) والجمل للرجاجي - ۲۱۰ والانصاف ۲۳۴ والدرر اللوامع (۱: ۱۰۵) وادب الكاتب ۴۱۱ ويروي قبله: ربع عفا من بعد ما قد انمحي وكلتا الروايتين ذكرهما الخفاجي في شرح الدررة ونسبه الى رؤبة وفي الفائق (۲: ۳۱۶) معز والي ابى النجم قال الشنيطي ولم احقق لسبته۔

زمانہ تکلم سے ایک لمحہ بھی پہلے ہو تو اس کے متعلق کان کا لفظ استعمال ہو سکتا ہے لہذا جس طرح ”كَانَ اَدَمُ كَذًا“ کہہ سکتے ہیں اسی طرح ”كَانَ زَيْدٌ هَهُنَا“ بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس بنا پر آیت:-

﴿كَيْفَ نَكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًا﴾ (۱۹-۲۹) (وہ بولے کہ) ہم اس سے جو گود کا بچہ ہے کیونکر بات کریں۔

کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ جو ابھی گود کا بچہ تھا یعنی کم عمر ہے اور یہ بھی کہ ”جو ابھی گود کا بچہ ہے“ یعنی ماں کی گود میں ہے۔<sup>۱</sup> لیکن یہاں زمانہ حال مراد لینا بے معنی ہے اس میں زمانہ قریب ہے جیسے آیت ﴿كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ﴾ (۳-۱۱۰) جتنی امتیں ہوئیں تم ان سب سے بہتر ہو۔

میں بھی بعض نے کہا ہے کہ كُنْتُمْ زمانہ حال پر دلالت کرتا ہے لیکن یہ معنی صحیح نہیں ہیں بلکہ معنی یہ ہیں کہ تم اللہ کے علم اور حکم کے مطابق بہتر تھے۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَإِنْ كَانَ ذُو عُسْرَةٍ﴾ (۲-۲۸) اور اگر (قرض لینے والا) تنگ دست ہو۔

میں بعض نے کہا ہے کہ یہاں كَانَ کے معنی کسی چیز کے واقع ہو جانا کے ہیں اور یہ فعل تام ہے۔ یعنی اگر وہ تنگ دست ہو جائے بعض لوگ کہتے ہیں کہ کون کا لفظ کسی جوہر کے اپنے سے پست تر جوہر میں تبدیل ہونے کے لیے آتا ہے۔ اور اکثر متکلمین اسے معنی ابداع میں استعمال کرتے ہیں بعض علمائے نحو کا خیال ہے کہ كَيْنُونَةٌ کا لفظ اصل میں كَوْنُونَةٌ بروزن فَعْلُونَةٌ ہے۔ ثقل کی وجہ سے واویاء سے تبدیل ہو گئی ہے مگر سیبویہ کے نزدیک یہ

اور جب یہ کسی جنس کے ایسے وصف کے متعلق استعمال ہو جو اس میں موجود ہو تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ یہ وصف اس اسم کے ساتھ لازم و ملزوم رہتا ہے اور بہت ہی کم اس سے علیحدہ ہوتا ہے۔ چنانچہ آیات:

﴿وَكَانَ الْإِنْسَانُ كَفُورًا﴾ (۱۷-۶۰) اور انسان ہے ہی ناشکرا۔

﴿وَكَانَ الْإِنْسَانُ قَتُورًا﴾ (۱۷-۱۰۰) اور انسان دل کا بہت تنگ ہے۔ ﴿وَكَانَ الْإِنْسَانُ أَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا﴾ (۱۸-۵۴) اور انسان سب چیزوں سے بڑھ کر جھگڑا لوبہ۔

میں تنبیہ کی ہے کہ یہ امور انسان کے اوصاف لازمہ سے ہیں اور شاذ و نادر ہی اس سے منفک ہوتے ہیں اسی طرح شیطان کے متعلق فرمایا: ﴿وَكَانَ الشَّيْطَانُ لِلْإِنْسَانِ خَذُولًا﴾ (۲۵-۲۹) اور شیطان انسان کو وقت پر دغا دینے والا ہے۔ ﴿وَكَانَ الشَّيْطَانُ لِرَبِّهِ كَفُورًا﴾ (۱۷-۲۷) اور شیطان اپنے پروردگار کی نعمتوں کا کفران کرنے والا یعنی ناقدرا ہے۔

جب یہ فعل زمانہ ماضی کے متعلق استعمال ہو تو اس میں یہ بھی احتمال ہوتا ہے کہ وہ چیز تا حال اپنی پہلی حالت پر قائم ہو اور یہ بھی کہ اس کی وہ حالت متغیر ہو گئی ہو مثلاً كَانَ فُلَانٌ كَذًا ثُمَّ صَارَ كَذًا: یعنی فلاں پہلے ایسا تھا لیکن اب اس کی حالت تبدیل ہو گئی ہے نیز یہ ماضی بعید کے لیے بھی آتا ہے جیسے۔ كَانَ فِي أَوَّلِ مَا أَوْجَدَ اللَّهُ تَعَالَى كَذًا۔ کہ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے فلاں چیز پیدا کی تھی اور ماضی قریب کے لیے بھی حتیٰ کہ اگر وہ حالت

۱ فی الصورة الثانية يكون تامه وفي الاولى ناقصة (الطبري ص ۷۹-۱۹)

## ک ی د

الْكَيْدُ: (خفیہ تدبیر) کے معنی ایک قسم کی حیلہ جوئی کے ہیں یہ اچھے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے اور برے معنوں میں بھی مگر عام طور پر برے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اسی طرح لفظ اسْتَدْرَاجُ اور مَكْرُ بھی کبھی اچھے معنوں میں آ جاتے ہیں چنانچہ اچھے معنوں میں فرمایا:۔

﴿كَذَلِكَ يَكْدُنَا لِيُؤْسَفَ﴾ (۱۲-۷۶) اسی طرح ہم نے یوسفؑ کے لیے تدبیر کر دی۔

﴿وَأَمْلَى لَهُمْ إِنَّ كَيْدِي مَتِينٌ﴾ (۷-۱۸۳) اور میں ان کو مہلت دیئے جاتا ہوں۔ میری تدبیر (بڑی) مضبوط ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ یہاں کید سے مراد عذاب ہے لیکن صحیح یہ ہے کہ اس سے ڈھیل اور مہلت دینا مراد ہے جو آخر کار موجب عذاب بنتی ہے جیسے فرمایا: ﴿إِنَّمَا نُمَلِّئُ لَهُمْ لَيْزًا دَاوُوا إِنَّمَا﴾ (۳-۱۷۸) (نہیں بلکہ) ہم ان کو اس لیے مہلت دیتے ہیں کہ وہ زیادہ گناہ کر لیں۔ اور آیت کریمہ:

﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي كَيْدَ الْخَائِنِينَ﴾ (۱۲-۵۲) اور اللہ خیانت کرنے والوں کے مکر کو رو براہ نہیں کرتا۔ خائنین کی تخصیص سے معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ اپنی تدبیر سے خیانت کا ارادہ نہیں کرتے ان کی تدبیر کو کبھی اللہ تعالیٰ رو براہ اور کامیاب کر دیتا ہے۔ جیسا کہ یوسفؑ کی اپنے بھائی کے بارے میں تدبیر کرنا۔ اور آیت کریمہ:۔

﴿لَا يَكِيدَنَّ أَصْنَامُكُمْ﴾ (۲۱-۵۷) میں تمہارے بتوں سے ایک چال چلوں گا۔ میں لَا يَكِيدَنَّ کے معنی یہ

اصل میں كَيُّوْ نُوْنَةً بروزن فَيَعْلُوْنَةً ہے۔ واؤ کو یا میں ادغام کرنے سے كَيُّوْ نُوْنَةً ہو گیا پھر ایک یاء کو تخفیف کے لیے گرا دیا تو كَيُّوْ نُوْنَةً بن گیا جیسا کہ مَيِّتٌ سے مَيِّتٌ بنا لیتے ہیں جو اصل میں مَيِّوْتٌ ہے۔ فرق صرف یہ ہے۔ کہ كَيُّوْ نُوْنَةً (بتشدید الیاء) استعمال نہیں ہوتا اور مَيِّتٌ تشدید یاء کے ساتھ اکثر استعمال ہوتا ہے۔ اَلْمَكَاْنُ: بعض کے نزدیک یہ دراصل گَانَ يَكُوْنُ (ک و ن) سے ہے مگر کثرت استعمال کے سبب میم کو اصلی تصور کر کے اس سے تَمَكَّنٌ وغیرہ مشتقات استعمال ہونے لگے ہیں جیسا کہ مَسْكِيْنٌ سے تَمَسْكُنٌ بنا لیتے ہیں حالانکہ یہ (س ک ن) سے ہے۔ اِسْتَكَانَ فُلَانٌ فلاں نے عاجزی کا اظہار کیا۔ گویا وہ ٹھہر گیا اور ذلت کی وجہ سے سکون و طمانینت کو چھوڑ دیا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَمَا اسْتَكَاْنُوا لِلرِّبِّهِمْ﴾ (۲۳-۷۶) تو بھی انہوں نے اللہ کے آگے عاجزی نہ کی۔

## ک و ی

كَوَيْتُ الدَّابَّةَ بِالنَّارِ كَيًّا کے معنی جانور کو گرم لوہے سے داغ دینے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:۔ ﴿فَتُكْوَىٰ بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوبُهُمْ﴾ (۹-۲۵) پھر اس سے ان (بخیلوں) کی پیشانیاں اور پہلو داغے جائیں گے۔

## کی

یہ کسی چیز کے فعل کا سبب بیان کرنے کے لیے آتا ہے بمعنی "تاکہ" اور كَيُّوْ نُوْنَةً اس کی لٹی کے لیے جیسے فرمایا: ﴿كَيْ لَا يَكُوْنُ دُوْلَةً﴾ (۷-۵۹) تاکہ مال..... گردش نہ کرتا رہے۔

﴿كَيْفَ يَهْدِي اللَّهُ قَوْمًا﴾ (۸۶-۳) خدا ایسے لوگوں کو کیونکر ہدایت دے۔

﴿كَيْفَ يَكُونُ لِلْمُشْرِكِينَ عَهْدٌ﴾ (۷-۹) بھلا مشرکوں کے لیے کیونکر قائم رہ سکتا ہے۔

﴿أَنْتَظِرُ كَيْفَ ضَرَبُوا لَكَ الْأَمْثَالَ﴾ (۳۸-۱۷) دیکھو انہوں نے کس کس طرح کی تمہارے بارے میں باتیں بنائیں۔

﴿فَانْظُرُوا كَيْفَ بَدَأَ الْخَلْقَ﴾ (۲۹-۲۰) اور دیکھو کہ اس نے کس طرح خلقت کو پہلی مرتبہ پیدا کیا۔

﴿أَوَلَمْ يَرَوْا كَيْفَ يُبْدِئُ اللَّهُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ﴾ (۱۹-۲۹) کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ خدا کس طرح خلقت کو پہلی بار پیدا کرتا پھر کس طرح اس کو بار بار پیدا کرتا رہتا ہے۔

## (ک ی ل)

الْكَيْلُ: (ض) کے معنی غلہ ناپنے کے ہیں) اور كَيْلُ لَهُ الطَّعَامُ (صلہ لام) کے معنی ہیں۔ میں نے اس کے لیے غلہ ناپنے کی ذمہ داری سنبھالی اور كَيْلُ الطَّعَامِ (بدوں لام) کے معنی ہیں میں نے اسے غلہ ناپ کر دیا اور اَكْتَلْتُ عَلَيْهِ کے معنی ہیں۔ میں نے اس سے ناپ کر لیا۔

قرآن پاک میں ہے: ﴿وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِينَ الَّذِينَ إِذَا أَكْتَالُوا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُونَ وَإِذَا كَالُوهُمْ أَوْ وَزَنُوهُمْ يُخْسِرُونَ﴾ (۸۳-۳۲، ۱) ناپ اور تول میں کمی کرنے والوں کے لیے خرابی ہے۔ جو لوگوں سے ناپ کر لیں تو پورا لیں اور جب ان کو ناپ کر یا تول کر دیں تو کم دیں۔

ہیں کہ میں ان کے ساتھ بری طرح پیش آؤں گا۔

﴿فَارَادُوا بِهِ كَيْدًا فَجَعَلْنَاهُمُ الْأَسْفَلِينَ﴾ (۹۸-۳۷) غرض انہوں نے ان کے ساتھ ایک چال چلنی چاہی اور ہم نے انہی کو زیر کر دیا۔

﴿فَإِنْ كَانَ لَكُمْ كَيْدٌ فَكِيدُوا﴾ (۷۷-۳۹) اگر تم کو کوئی داؤ آتا ہو تو مجھ پر کر چلو۔

﴿كَيْدٌ سَاحِرٍ﴾ (۲۰-۲۹) جادو کے ہتھکنڈے..... ﴿فَاجْمِعُوا كَيْدَكُمْ﴾ (۲۰-۲۹) تو تم جادو کا سامان اکٹھا کر لو۔

مجاورہ ہے: فُلَانٌ يَكِيدُ بِنَفْسِهِ: فلاں جان دے رہا ہے اور جب چھماق دیر سے آگ نکالے تو اس کے متعلق کہا جاتا ہے كَادَ الزَّنْدُ۔

## (ک ی ف)

كَيْفَ: (اسم استفہام) اس چیز کی حالت دریافت کرنے کے لیے آتا ہے۔ جس پر کہ شبیہ اور غیر شبیہ کا لفظ بولا جاسکتا ہو جیسے أَبْيَضُ (سفید) أَسْوَدُ (سیاہ) صَحِيحٌ (تندرست) سَقِيمٌ (بیمار) وغیرہ۔ لہذا اللہ تعالیٰ کے متعلق اس کا استعمال جائز نہیں ہے اور کبھی اس چیز پر بھی كَيْفَ کا اطلاق کر دیتے ہیں جس کے متعلق سوال کرنا ہو مثلاً کہا جاتا ہے کہ اسود اور أَبْيَضُ مقولہ کیف سے ہیں اور جہاں کہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کے متعلق کیف کا لفظ استعمال کیا ہے تو وہ تنبیہ یا توفیح کے طور پر مخاطب سے استخبار کے لیے لایا گیا ہے جیسے فرمایا:

﴿كَيْفَ تَكْفُرُونَ بِاللَّهِ﴾ (۲-۲۸) کا فرد! تم خدا سے کیونکر منکر ہو سکتے ہو۔

ہمارے ساتھ ہمارے بھائی کو بھیج دیجئے تاکہ ہم پھر غلہ پیدا کر لائیں اور آیت کریمہ:

﴿وَنَزِدَاذْكَيْلَ بَعِيرٍ﴾ (۱۲-۶۵) (اور ہم) ایک اونٹ کے بوجھ کے برابر غلہ زیادہ لائیں گے۔ میں کَیْلَ بَعِيرٍ کے معنی بارشتر کے برابر غلہ کے ہیں۔



یہ آیت اگرچہ خاص کر ناپ میں کمی کے متعلق نازل ہوئی ہے۔ مگر اس میں ہر قسم کے لین دین میں عدل و انصاف کو ملحوظ رکھنے کی تاکید ہے۔ نیز فرمایا: ﴿فَأَوْفَ لَنَا الْكَيْلَ﴾ (۱۲-۸۸) آپ ہمیں (اس کے عوض) پورا غلہ دیجیے۔

﴿فَارْسِلْ مَعَنَا آخَانًا نَّكَتِلْ﴾ (۱۲-۶۳) تو

## کتاب اللام

### (اللام) (حرف)

یہ کئی طرح پر استعمال ہوتا ہے۔ اول حرف جارہ اور اس کی چند قسمیں ہیں۔

(۱) تعدیہ کے لیے اس وقت بعض اوقات تو اس کا حذف کرنا جائز نہیں ہوتا جیسے فرمایا:

﴿وَتَلَّه لِّلْجَبِّینَ﴾ (۱۰۳-۱۰۲) اور باپ نے بیٹے کو پٹ پڑی کے بل لٹا دیا۔

اور کبھی حذف کرنا جائز ہوتا ہے چنانچہ آیت کریمہ: ﴿یُرِیدُ اللّٰهُ لَیْسِنَ لَکُمْ﴾ (۲۶-۴) خدا چاہتا ہے کہ تم سے کھول کھول کر بیان فرمادے۔ میں لام مذکور ہے اور آیت: ﴿فَمَنْ یُّرِِدِ اللّٰهُ اَنْ یَّهْدِیْہَ یَشْرِحْ صَدْرَہٗ ۚ وَلَا سَکَامَ ۚ وَمَنْ یُّرِِدْ اَنْ یُّضِلّٰہُ یَجْعَلْ صَدْرَہٗ ضِیقًا﴾ (۱۲۵-۶) تو جس شخص کو خدا چاہتا ہے کہ ہدایت بخشے اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے کہ گمراہ کرے اس کا سینہ تنگ کر دیتا ہے۔ میں اسے حذف کر دیا ہے۔ (یعنی اصل میں لَا اَنْ یَّهْدِیْہَ وَلَا اَنْ یُّضِلّٰہُ ہے۔

(۲) ملک اور استحقاق کے معنی ظاہر کرنے کے لیے آتا ہے اور ملک سے ہمیشہ ملک عین ہی مراد نہیں ہوتا۔ بلکہ ملک منافع اور ملک تصرف سب کو عام ہے چنانچہ فرمایا:

﴿وَلِلّٰہِ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ (۲۷-۲۵) اور آسمانوں اور زمینوں کی بادشاہت خدا ہی کی ہے۔

﴿وَلِلّٰہِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ (۲۸-۲۷) آسمانوں اور زمین کے لشکر سب خدا ہی کے ہیں اور ملک تصرف کے لیے مثلاً: کسی شخص کے ساتھ لکڑی اٹھاتے وقت تم اس سے یہ کہو: نَحْذُ طَرَفَکَ لِاِخْذَ طَرَفِیْ کہ تم اپنی جانب سے پکڑ لو تا کہ میں اپنی جانب سے پکڑوں۔

اور لِلّٰہِ دَرُکُ کی طرح جب لِلّٰہِ کَذَا کہا جاتا ہے تو اس میں بعض نے لام تمسک مانا ہے یعنی یہ چیز بلحاظ شرف (منزلت) کے اتنی بلند ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا اس پر کسی کا ملک نہیں ہونا چاہیے اور بعض نے کہا ہے کہ اس میں لام ایجاد کے لیے ہے یعنی اللہ نے اسے بطریق ابداع پیدا کیا ہے کیونکہ موجودات دو قسم پر ہیں۔ ایک وہ جن کو اللہ تعالیٰ نے اسباب طبعی یا صنعت انسانی کے واسطے سے ایجاد کیا ہے۔ اور دوم وہ جنہیں بغیر کسی واسطے کے پیدا کیا ہے جیسے افلاک اور آسمان وغیرہ اور یہ دوسری قسم پہلی کی نسبت اشرف اور اعلیٰ ہے۔ اور آیات کریمہ: ﴿وَلَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوءُ الدَّارِ﴾ (۵۲-۴۰) اور ان کے لیے لعنت اور برا گھر ہے۔

اور ﴿وَلِیْلٌ لِّلْمُطَفِّفِیْنَ﴾ (۸۳-۱) ناپ اور تول میں کمی کرنے والوں کے لیے خرابی ہے۔

میں لام استحقاق کے معنی دیتا ہے یعنی یہ لوگ لعنت اور ویل کے مستحق ہیں۔ اور یہ لام بھی لام ملک کی طرح ہے لیکن لام ملک اس چیز پر داخل ہوتا ہے جو ملک میں حاصل ہو



کیونکہ یہاں لام مفعول پر داخل ہوا ہے اور معنی یہ ہیں۔ لا تَكُنْ حَصِيْمًا لِلّٰهِ کہ تم اللہ کے خصیم یعنی فریق مخالف مت بنو۔

(۳) لام ابتداء جیسے فرمایا:

﴿لَمَسْجِدٌ أُسِّسَ عَلَى التَّقْوَىٰ﴾ (۹-۱۰۸) البتہ وہ مسجد جس کی بنیاد پہلے دن سے تقویٰ پر رکھی گئی ہے۔  
﴿لِيُؤْسِفُ وَآخُوهُ أَحَبُّ إِلَيَّ إِنِّي أَنَا مِنَ الْبَاقِينَ﴾ (۱۲-۸) کہ یوسف اور اس کا بھائی ہمارے ابا کو ہم سے زیادہ پیارے ہیں۔

﴿لَا تَنْتُمْ أَشَدُّ رَهْبَةً﴾ (۵۹-۱۳) تمہاری ہیبت ان کے دلوں میں ..... بڑھ کر ہے۔

(۴) چہارم وہ لام جو ان کے بعد آتا ہے۔ یہ بھی تو ان کے اسم پر داخل ہوتا ہے اور کبھی ان کی خبر اور کبھی متعلق خبر پر، چنانچہ جب اسم خبر سے متاخر ہو تو اسم پر داخل ہوتا ہے جیسے فرمایا: ﴿إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَعِبْرَةً﴾ (۲۳-۴۳) اس میں بڑی عبرت ہے۔

اور خبر پر داخل ہونے کی مثال جیسے فرمایا:

﴿إِنَّ رَبَّكَ لَبَالْمُرْصَادِ﴾ (۸۹-۱۳) بے شک تمہارا پروردگار تاک میں ہے۔

﴿إِنَّ إِبْرَاهِيمَ لَحَلِيمٌ أَوَّاهٌ مُنِيبٌ﴾ (۱۱-۷۵) بے شک ابراہیم علیہ السلام بڑے حل والے اور نرم دل اور رجوع کرنے والے تھے۔

اور یہ لام متعلق خبر پر اس وقت آتا ہے جب متعلق خبر ان کی خبر پر مقدم ہو۔ جیسے فرمایا:

﴿لَعَمْرُكَ أَنَّهُمْ لَفِي سَكْرَتِهِمْ يَعْهَوْنَ﴾ (۱۵-۷۲) اے محمد ﷺ تمہاری جان کی قسم! وہ اپنی

چکی ہو اور لام استحقاق اس پر جو تا حال حاصل تو نہ ہوئی ہو مگر اس پر استحقاق ثابت ہونے کے لحاظ سے حاصل شدہ چیز کی طرح ہو بعض علمائے نحو نے کہا ہے کہ آیت کریمہ: وَلَهُمُ اللَّعْنَةُ میں لام بمعنی علی ہے۔ ای عَلَیْهِمُ اللَّعْنَةُ (یعنی ان پر لعنت ہے) اسی طرح آیت کریمہ: ﴿لِكُلِّ أَمْرٍ مِنْهُمْ مَا اكْتَسَبَ مِنَ الْإِثْمِ﴾ (۲۳-۱۱) ان میں جس شخص نے گنہ کا جتنا حصہ لیا اس کے لیے اتنا ہی وبال ہے۔ میں بھی لام بمعنی علی ہے لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ کبھی لام بمعنی الی بھی آتا ہے۔ جیسا ﴿بِأَنَّ رَبَّكَ أَوْحَىٰ لَهَا﴾ (۹۹-۵) کیونکہ تمہارے پروردگار نے اس کو حکم بھیجا ہوگا، میں ہے یعنی أَوْحَى إِلَيْهَا مگر یہ بھی صحیح نہیں ہے کیونکہ یہاں تو وحی تسخیری مروا ہے اور لام کے ذریعہ اس وحی کے تسخیری ہونے پر متنبہ کیا گیا ہے اور یہ اس وحی کی طرح نہیں ہوتی جو انبیاء علیہم السلام کی طرف بھیجی جاتی ہے لہذا لام بمعنی الی نہیں ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَلَا تَكُنْ لِلْخَائِنِينَ خَصِيمًا﴾ (۴-۱۰۵) اور (دیکھو) دعا بازوں کی حمایت میں بھی بحث نہ کرنا۔ میں بعض نے کہا ہے کہ یہ لام لام اجل ہے اور سبب اور جانب کے معنی دیتا ہے یعنی تم ان کی حمایت میں مت بحث کرو جیسا کہ دوسری آیت میں فرمایا:

﴿وَلَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِينَ يَخْتَانُونَ أَنفُسَهُمْ﴾ (۴-۱۰۷) اور جو لوگ اپنے ہم جنوں کی خیانت کرتے ہیں ان کی طرف سے بحث نہ کرنا۔

اور یہ لا تَكُنْ لِلّٰهِ خَصِيْمًا کے لام کی طرح نہیں ہے

مستی میں مدہوش (ہو رہے) تھے۔

(۵) وہ لام جو ان مخففہ اور اِنْ نافیہ میں فرق کرنے کے لیے ان مخففہ کے ساتھ آتا ہے۔

جیسے فرمایا:

﴿وَإِنْ كُلُّ ذِيكَ لَمَّا مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا﴾  
(۳۳-۳۵) اور یہ سب دنیا کی زندگی کا تھوڑا سا سامان ہے۔

(۵) لام قسم۔ یہ کبھی اسم پر داخل ہوتا ہے جیسے فرمایا:  
﴿يَذْعُوا لِمَنْ ضَرَّهُ أَقْرَبُ مِنْ نَفْعِهِ﴾ (۲۲-۱۳)  
(بلکہ) ایسے شخص کو پکارتا ہے جس کا نقصان فائدہ سے زیادہ قریب ہے۔ اور کبھی فعل ماضی پر آتا ہے۔ جیسے فرمایا:  
﴿لَقَدْ كَانَ فِي قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِأُولِي الْأَلْبَابِ﴾ (۱۲-۱۱۱) ان کے قصے میں عقلمندوں کے لیے عبرت ہے۔

اگر یہ لام فعل مستقبل پر آئے تو اس کے ساتھ نون تاکید ثقیلہ یا خفیفہ کا آنا ضروری ہے جیسے فرمایا: ﴿لَتَسُوْ مِنْ بِهِ وَلَتَنْصُرُنَّهُ﴾ (۳-۸۱) تو تمہیں ضرور اس پر ایمان لانا ہوگا۔ اور ضرور اس کی مدد کرنا ہوگی۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَإِنْ كُنَّا لَمَّا لِيُوقِينَهُمْ﴾ (۱۱-۱۱۱) اور تمہارا پروردگار ان سب کو قیامت کے دن ان کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دے گا۔

میں لَمَّا کا لام ان کے جواب میں واقع ہوا ہے۔ اور لِيُوقِينَهُمْ کا لام قسم کا ہے۔

(۷) وہ لام جو ”لَوْ“ کی خبر پر داخل ہوتا ہے جیسے فرمایا:  
﴿وَلَوْ أَنَّهُمْ آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَمَثُوبَةٌ﴾ (۲-۱۳) اور اگر وہ ایمان لاتے اور پرہیزگاری کرتے تو خدا کے ہاں

سے بہت اچھا صلہ ملتا۔

﴿لَوْ تَزَيَّلُوا لَعَذَّبْنَا الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْهُمْ﴾  
(۲۸-۲۵) اگر دونوں فریق الگ الگ ہو جاتے تو جو ان میں کافر تھے ان کو ہم..... عذاب دیتے ﴿وَلَوْ أَنَّهُمْ قَالُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا وَأَسْمَعُ وَانْظُرْنَا لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ﴾ (۳-۳۶) اور اگر یہ لوگ کہتے کہ ہم نے سن لیا اور مان لیا اور آپ کو متوجہ کرنے کے لیے..... رَاعِنَا کی جگہ اَنْظُرْنَا کہتے تو ان کے حق میں بہتر ہوتا۔

اور کبھی لَوْ کے جواب میں لام محذوف ہوتا ہے جیسا لَوْ جِتْنِيْ اَكْرَمْتِكَ اصل میں لَا كَرَمْتِكَ ہے۔

(۸) وہ لام جو ”مَدْعُو“ یا مدعو الیہ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ مدعو کے لیے یہ مفتوح ہوتا ہے۔ جیسے بِالْزَيْدِ۔ اور مدعو الیہ پر آئے تو مکسور ہوتا ہے۔ جیسے بِالْزَيْدِ۔

(۹) لام امر یہ ابتدا میں آئے تو مکسور ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا:  
﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لِيَسْتَذِنُكُمُ الَّذِينَ مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ﴾ (۲۴-۵۸) مومنو! تمہارے غلام، لونڈیا..... تم سے اجازت لیا کریں۔ ﴿لِيَقْضِ عَلَيْنَا رَبُّكَ﴾ (۳-۷۷) تمہارا پروردگار ہمیں موت دے دے۔ اور اگر اس پر وادیا فا آجائے تو ساکن ہو جاتا ہے۔

جیسے فرمایا:

﴿وَلِيَتَمَتَّعُوا فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ﴾ (۲۹-۶۶) اور فائدہ اٹھائیں (سو خیر) عنقریب ان کو معلوم ہو جائے گا ﴿وَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيُكْفُرْ﴾ (۱۸-۲۸) تو جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کافر رہے۔

﴿فَبِذَلِكَ فَلْيَفْرَحُوا﴾ (۱۰-۵۸) تو چاہیے کہ لوگ

درمیان کوئی فاصل آ جائے۔ جیسے لَا رَجُلًا ضَرَبْتُ  
وَلَا امْرَأَةً (۲) جب اس پر دوسرے فعل کا عطف ہو  
جیسے: لَا خَرَجْتُ وَلَا ضَرَبْتُ اور یا (۳) لَا  
مکرر ہو جیسے:-

﴿فَلَا صَدَقَ وَلَا صَلَّى﴾ (۴۵-۳۱) اس ناعاقبت  
اندیش نے نہ تو کلام خدا کی تقدیق کی اور نہ نماز پڑھی اور  
یا (۴) جملہ دعائیہ میں جیسے لَا كَانَ (خدا کرے ایسا نہ  
ہو)

لَا أَفْلَحَ (وہ کامیاب نہ ہو) وغیرہ۔  
اور زمانہ مستقبل میں نفی کے متعلق فرمایا:

﴿لَا يَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ﴾ (۳۳-۳) ذرہ بھر  
چیز بھی اس سے پوشیدہ نہیں۔

اور کبھی ”لا“ کلام مثبت پر داخل ہوتا ہے اور کلام مخدوف کی  
نفی کے لیے آتا ہے۔ جیسے فرمایا: ﴿وَمَا يَعْزُبُ عَنْ  
رَبِّكَ مِنْ مِثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ﴾  
(۱۰-۶۱) اور تمہارے پروردگار سے ذرہ برابر بھی کوئی چیز  
پوشیدہ نہیں ہے نہ زمین میں اور نہ آسمان میں..... اور  
مندرجہ ذیل آیات میں بھی بعض نے لا کو اسی معنی پر حمل  
کیا ہے۔

﴿لَا أُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيَمَةِ﴾ (۷۵-۱) ہم کو روز  
قیامت کی قسم۔

﴿فَلَا أُقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشْرِقِ﴾ (۷۰-۴۰) میں  
شرقوں اور مغربوں کے مالک کی قسم کھاتا ہوں۔ ﴿فَلَا  
وَرَبِّكَ لَا يَوْمُنُونَ﴾ (۴-۶۵) تمہارے پروردگار  
کی قسم یہ مومن نہیں ہوں گے۔

﴿فَلَا أُقْسِمُ بِمَوَاقِعِ النُّجُومِ﴾ (۷۶-۷۵)

اس سے خوش ہوں۔ ایک قرأت میں فَلْتَفْرَحُوا ہے۔  
اور جب اس پر ثم داخل ہو تو اسے ساکن اور متحرک دونوں  
طرح پڑھنا جائز ہوتا ہے جیسے فرمایا: ﴿ثُمَّ لِيَقْضُوا  
تَفَتُّهُمْ وَلِيُوفُوا نَّذْرَهُمْ وَلِيُطَوِّفُوا بِالْبَيْتِ  
الْعَتِيقِ﴾ (۲۲-۲۹) پھر چاہیے کہ لوگ اپنا میل پچیل  
دور کریں اور نذریں پوریں کریں۔ اور خانہ قدیم یعنی بیت  
اللہ کا طواف کریں۔

## (ل و لاء)

الْوَلُوءُ: موتی۔ جمع لالہ۔ قرآن پاک میں ہے:  
﴿يَخْرُجُ مِنْهُمَا الْوَلُوءُ﴾ (۵۷-۵۸) دونوں  
دریاؤں سے موتی..... نکلتے ہیں۔

﴿كَانَهُمْ لَوْلُوا مَكْنُونٌ﴾ (۵۲-۲۳) جیسے چھپائے  
ہوئے موتی۔ اور تَكْلًا لَ الشَّيْءِ کے معنی کسی چیز کے  
موتی کی طرح چمکنے کے ہیں مشہور محاورہ ہے۔ لَا أَفْعَلُ  
ذَلِكَ مَا لَا لَاتِ الظُّبَاءُ بِأَذْنَابِهَا: جب تک کہ آہو  
اپنے دم ہلاتے رہیں گے میں یہ کام نہ کروں گا یعنی کبھی  
بھی یہ کام نہیں کروں گا۔

## (لا حرف)

لا۔ یہ کبھی عدم محض کے لیے آتا ہے۔ جیسے:  
زَيْدٌ لَا عَالِمٌ: یعنی زید جاہل ہے اور کبھی نفی کے لیے  
ہوتا ہے۔ اور اسم و فعل دونوں کے ساتھ ازمنہ ثلاثہ میں نفی  
کے معنی دیتا ہے لیکن جب زمانہ ماضی میں نفی کے لیے ہو تو  
یا تو اس کے بعد فعل کو ذکر ہی نہیں کیا جاتا مثلاً اِغْرَ كُوِيْ هَلْ  
خَرَجْتَ کہے تو اس کے جواب میں صرف ”لا“ کہہ دینا  
کافی ہے یعنی لَا خَرَجْتُ اور اگر فعل مذکور بھی ہوتا ہے تو  
شاذ و نادر اور وہ بھی اس وقت (۱) جب لا اور فعل کے

(۱۸-۲۷) ایسا نہ ہو کہ سلیمان علیہ السلام اور اس کے لشکر تم کو کچل ڈالیں..... میں بھی لانی کے لیے ہے۔ اور آیت کریمہ: ﴿وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَ بَنِي إِسْرَآءَ قُلْ لَا تَعْبُدُونَ إِلَّا اللَّهَ﴾ (۸۳-۲) اور جب ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا کہ خدا کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا۔ کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ لا نافیہ بمعنی خبر ہے یعنی وہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہیں کریں گے۔ اسی طرح آیت کریمہ:

﴿وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُونَ دِمَاءَ كُمْ﴾ (۸۳-۲) اور جب ہم نے تم سے عہد لیا کہ تم آپس میں کشت و خون نہیں کرو گے۔

میں بھی لانی پر محمول ہے اور فرمان باری تعالیٰ: ﴿وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ﴾ (۷۵-۴) تمہیں کیا ہوا کہ خدا کی راہ میں نہیں لڑتے۔

میں ہو سکتا ہے کہ لا تُقَاتِلُونَ موضع حال میں ہو۔ اور معنی یہ ہو: مَا لَكُمْ غَيْرَ مُقَاتِلِينَ یعنی تمہیں کیا ہوا اور آنحالیکہ تم لڑنے والے نہیں ہو۔

اور لا کے بعد اگر اسم کرہ آجائے تو وہ مبنی برفتح ہوتا ہے اور لانی کے معنی دیتا ہے۔ جیسے فرمایا: ﴿فَلَا رَفَتْ وَلَا قُسُوفٌ﴾ (۱۹۷-۲) نہ عورتوں سے اختلاط کرے نہ کوئی

ہمیں تاروں کی منزلوں کی قسم ۱۰ اور اسی معنی میں شاعر نے کہا ہے ۱۰ (المقارب)

(۳۸۸) لَا وَآيِكَ اِيْنَةُ الْعَامِرِي

نہیں تیرے باپ کی قسم! اے عامری کی بیٹی۔

اور مروی ہے ۱۰ (۱۰۵) ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے یہ سمجھ کر کہ سورج غروب ہو گیا ہے روزہ افطار کر دیا اس کے بعد سورج نکل آیا تو آپؐ نے فرمایا:

لَا تَقْضِيْهِ مَا تَجَانَفْنَا الْاِثْمَ فِيْهِ اس میں بھی لا کلام محذوف کی نفی کے لیے ہے یعنی اس غلطی پر جب لوگوں نے کہا ہے کہ آپؐ نے گناہ کا ارتکاب لیا تو اس کی نفی کے لیے انہوں نے لا فرمایا یعنی ہم گنہگار نہیں ہیں۔ اس کے بعد تَقْضِيْهِ سے از سر نو جملہ شروع کیا ہے۔

اور کبھی یہ لانی کے لیے آتا ہے جیسے فرمایا: ﴿لَا يَسْحَرُ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ﴾ (۱۱-۳۹) کوئی قوم کسی قوم سے تمسخر نہ کرے۔

﴿وَلَا تَنَابَزُوا بِالْأَلْقَابِ﴾ (اور نہ ایک دوسرے کا براناں رکھو۔ اور آیت:-

﴿يٰۤاَيُّهَا اٰدَمُ لَا يَفْتِنَنَّكَ الشَّيْطٰنُ﴾ (۷۷-۷) اے بنی آدم! دیکھنا کہیں شیطان تمہیں بہکا نہ دے۔ اور نیز ﴿لَا يَحْطَمَنَّكُمْ سُلَيْمٰنُ وَجُنُوْدُهُ﴾

۱ بعضہم قال ان "لا" زائده في القسم لكن ضعفه الرازي (۲۱۵-۲۱۴/۳۰)۔

۲ والبيت مطلع قصيده لامري القيس عدتها ۴۲ بيتا وغى بابنة العامري فاطمة بنت عمه وتاممه..... لا يدعى القوم اني افرد "البيت في الحماسة في قصيدة طويلة راجع الخزاعة (۴۸۹: ۴/۳۳۷: ۱) والبعني (۹۶: ۱) و شرح المقضليات والمعلقات لابن الانباري (۴۴) والعقد الثمين (۲۶) والسيوطي (۲۱۷) والطبرسي (۱۳۱/۲۷) والفخر (۲۱۴/۳۰) والبيت من شواهد الكشف قال المحب: و قيل لبيت الربيعه بن جشم اليمنى۔

۳ انظر لقول عمرؓ وتاويله غريب ابى عبيدة (۳۱۳/۳) في حديث عمرو والمسند لعمر (۷-۲) عن زيد بن وهب والنهاية (جنف) والفاق (۲۱۸/۱)

براکام کرے۔

سمجھتے ہیں۔ اور آیت کریمہ:-

﴿وَلَا تَحِجْنَ مَنَاصِیْ﴾ (۳۸-۳) اور وہ رہائی کا وقت نہیں تھا۔ میں فراء کے نزدیک لَا تَ اصل میں لَا حِجْنَ ہے اور اس میں تاء زائدہ ہے جیسا کہ ثُمَّتَ اور رُبَّتَ میں لائی جاتی ہے۔ بعض اہل بصرہ نے کہا ہے وَلَا تَ بمعنی لَيْسَ ہے۔ ابو بکر العلاف کا قول ہے کہ یہ اصل میں لَيْسَ ہے ۵ یا الف سے اور سین تاء سے تبدیل ہو کر لَا تَ بن گیا ہے۔ جیسا کہ نَاسٌ میں ایک لغت نَاتٌ بھی ہے۔ بعض کا قول ہے کہ لَا تَ اصل میں لَا ہی ہے۔ اس میں تاء تانیث کا اضافہ کر کے ایک ساعت یا مدت کے معنی پر تنبیہ کی گئی ہے اور پوری بات یوں ہے:

لَيْسَتْ السَّاعَةُ أَوِ الْمُدَّةُ حِجْنَ مَنَاصِیْ۔

## (ل ب ب)

الْلُبُّ کے معنی عقل خالص کے ہیں جو آمیزش (یعنی ظن و وہم اور جذبات) سے پاک ہو اور عقل کو لُبُّ اس لیے کہتے ہیں کہ وہ انسان کے معنوی قوی کا خلاصہ ہوتی ہے جیسا کہ کسی چیز کے خالص حصے کو اس کا لُبُّ اور لُبَّاب کہہ دیتے ہیں۔

بعض نے کہا ہے کہ لُبُّ کے معنی پاکیزہ اور ستھری عقل کے ہیں چنانچہ ہر لُبُّ کو عقل کہہ سکتے ہیں لیکن ہر عقل ”لُبُّ“ نہیں ہو سکتی یہی وجہ ہے۔

کہ اللہ تعالیٰ نے ان تمام احکام کو جن کا ادراک عقل زکیہ ہی کر سکتی ہیں اَوْ لَوْ اَلْاَلْبَابِ کے ساتھ مختص کیا ہے۔

اور کبھی متضاد معنوں کے درمیان لا مکرر آ جاتا ہے۔ اور دونوں کا اثبات مقصود ہوتا ہے جیسے:-

لَا زَيْدٌ بِمُقِيمٍ وَلَا ظَاْعِيْنِ نہ زید مقیم ہے اور نہ ہی مسافر یعنی کبھی مقیم ہے اور کبھی سفر پر اور کبھی دو متضاد معنوں کی نفی سے ایک درمیانی حالت کا اثبات مقصود ہوتا ہے جیسے لَيْسَ اَبْيَضُ وَلَا اَسْوَدَ سے مراد ہے کہ وہ ان دونوں رنگوں کے درمیان ہے یا پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان دونوں کے علاوہ کوئی تیسرا رنگ ہو چنانچہ آ یہ کریمہ: ﴿لَا شَرْقِيَّةٍ وَلَا غَرْبِيَّةٍ﴾ (۳۵-۳۴) یعنی زیتون کی نہ مشرق کی صرف منسوب ہے اور نہ مغرب کی طرف۔ کے بعض نے یہ معنی کیے ہیں کہ وہ بیک وقت مشرقی بھی ہے اور غربی بھی اور بعض نے اس کا افراط اور تفریط سے محفوظ ہونا مراد لیا ہے۔

کبھی لامحض سلب کے لیے استعمال ہوتا ہے اور اس سے ایک شے کی نفی کر کے دوسری کا اثبات مقصود نہیں ہوتا مثلاً لَا اِنْسَانَ کہہ کر صرف انسانیت کی نفی کا قصد کیا جائے اور عامی محاورہ لَا حِجْثٌ بھی اس معنی پر محمول ہے۔

## (الَّلَات)

الَّلَات اور اَلْعُزَّىٰ دو بتوں کے نام ہیں۔ اَلَّلَات اصل میں اللہ ہے۔ ہاء کو حذف کر کے اس کے عوض تاء تانیث لائی گئی ہے۔ اور اس تانیث سے اللہ تعالیٰ کے مرتبہ سے کم ہونے پر تنبیہ کرنا مقصود ہے اور یہ کہ وہ اس کو اپنے زعم میں قرب الہی حاصل کرنے کا خاص ذریعہ

۱ ای بکسر الیاء ذکر ابن هشام فی المغنی (۲۸۱/۱) ولم ینسبه والیه ذهب ابو عبیدة وابن الطراوة و ابو بکر هذا العله الخياط مکان العلاف لان الخياط كان من علماء النحاة ذكره السيوطی فی البغیة ۱۹ باب المحمديين مات سنة عشرين وثلاثمائة وثلاثمائه راجع للبحث المغنی لابن هشام فانه یغنیك۔

جیسے فرمایا:

﴿وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا أُولُو الْأَلْبَابِ﴾ (۲-۲۶۹) اور جس کو دانائی ملی ہے شک اس کو بڑی نعمت ملی اور نصیحت تو وہی لوگ قبول کرتے ہیں جو عقلمند ہیں اور اس نوع کی اور بھی بہت سی آیات ہیں۔

لَبَّ فُلَانٌ (س) کے معنی کسی کے صاحب لب ہونے کے ہیں۔ ایک عورت نے اپنے خاوند کو لڑکے کے متعلق کہا۔

إِضْرِبْهُ كَيْ يَلْبَّ وَيَقْوَدَ الْجَيْشَ ذَا اللَّجَبِ: اسے پیٹو تاکہ عقلمند ہو جائے اور لشکر جرار کی قیادت کر سکے۔

رَجُلٌ أَلْبَبُ کے معنی عقلمند آدمی کے ہیں اسکی جمع اَلْبَاءُ آتی ہے۔ اور مَلْبُوبُ اسے کہتے ہیں جو عقلمندی میں مشہور ہو۔

أَلْبَبٌ بِالْمَكَانِ: کسی مقام پر قیام کرنا اس کے اصل معنی اونٹ کا کسی مقام پر اپنا بل یعنی سینہ رکھ دینے کے ہیں۔

تَلَبَّبَ: اس کے اصل معنی سینہ پر پٹی باندھنے کے ہیں (پھر مجازاً) (احرام باندھنے اور کسی کام کے لیے مستعد ہونے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے) لَبَّبْتُهُ کے معنی کسی کے لبّے یعنی سینہ پر مارنے کے ہیں۔ اور لَبَّۃً (سینہ) کو لَبَّۃً اس لیے کہتے ہیں کہ وہ قوت عقلی کا مقام ہے۔ محاورہ ہے۔ فُلَانٌ فِي لَبِّ: فلاں آسودہ حال ہے۔

لَبِيكَ (کلمہ ایجاب ہے) بعض نے کہا ہے کہ یہ لَبَّ بِالْمَكَانِ وَالْأَلْبُ سے ماخوذ ہے جس کے معنی کسی جگہ پر مقیم ہونے کے ہیں اور مَوْكِدٌ طور پر فرمانبرداری کا اظہار

کرنے کے لیے اسے تشنہ بنا لیا گیا ہے اور بعض کہتے ہیں کہ یہ اصل میں لَبَّسَ ہے، اس کی آخری باء کو یا سے تبدیل کر دیا گیا ہے۔ جیسے تَطَنَّنْتُ کہ اصل میں تَطَنَّنْتُ ہے اس کا آخری نون یا سے تبدیل کر دیا گیا ہے بعض کا خیال ہے یہ امرءة لَبَّۃً سے ماخوذ ہے جس کے معنی اولاد سے محبت کرنے والی عورت کے ہیں۔ بعض کے نزدیک اس کے معنی إِخْلَاصٌ لَكَ بَعْدَ إِخْلَاصٍ کے ہیں یعنی بار بار تمہارے سامنے اپنی عقیدت کا اظہار کرتا ہوں اور یہ لَبُّ الطَّعَامِ سے ماخوذ ہے جس کے معنی خالص کھانا کے ہیں۔ اسی سے حَسَبُ لُبَابٍ کا محاورہ ہے جس کے معنی خالص حَسَبَ کے ہیں۔

### (ل ب ث)

لَبَّثَ بِالْمَكَانِ کے معنی کسی مقام پر جم کر ٹھہرنے اور مستقل قیام کرنا کے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَلَبِثَ فِيهِمْ أَلْفَ سَنَةٍ﴾ (۲۹-۲۴) تو وہ ان میں ..... ہزار برس رہے۔

﴿فَلَبِثْتُ سِنِينَ﴾ (۲۰-۱۴۰) پھر تم کئی سال ٹھہرے رہے۔

﴿قَالَ كَمْ لَبِثْتُمْ﴾ (۲۳-۱۱۳) خدا پوچھے گا کہ تم کتنے برس رہے۔

﴿قَالُوا لَبِثْنَا يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ﴾ (۲۳-۱۱۳) وہ کہیں گے کہ ہم ایک روز یا ایک روز سے بھی کم رہے تھے۔

﴿قَالُوا رَبُّكُمْ أَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ﴾ (۱۸-۱۹) انہوں نے کہا جتنی مدت تم رہے ہو تمہارا پروردگار ہی اس کو خوب

هُوَ أَمْنَعُ مِنْ لَبْدَةِ الْأَسَدِ: وہ شیر کے لبده یعنی سینہ یا ایال سے بھی زیادہ محفوظ ہے۔ لَبْدُ الشَّعْرِ: بالوں کا اوپر تلے جم جانا۔

لَبْدَتِ الْإِبِلُ لَبْدًا: زیادہ گھاس کھانے کی وجہ سے اونٹ پریشان اور سینہ گرفتہ ہو گئے اور آیت کریمہ: ﴿مَا لَا لَبْدًا﴾ (۶۰-۹۰) بہت سامان۔

میں لَبْد کے معنی مال کثیر کے ہیں۔ مثل مشہور ہے ⑤ مَالَهُ سَبْدٌ وَلَا لَبْدٌ: نہ اس کے پاس اون ہے نہ مال یعنی بالکل مفلس ہے نہ تھوڑا ہے نہ بہت۔ لَبْدٌ ایک پرند جو زمین کے ساتھ سینہ لگا کر چپک جاتا ہے اور نور لقمان (لقمان کے گدھوں میں سے آخری نر گدھ) کو لَبْد کہا جاتا ہے۔ اَلْبَدُّ الْبَعِيرُ: اونٹ کے سرین پر گوبر کا جم جانا کبھی یہ اس کے خوبصورت اور موٹا ہونے سے کنایہ ہوتا ہے۔ اَلْبَدْتُ الْقُرْبَى: مشک کو لَبِيد یعنی بالوں سے بنی ہوئی چھوٹی بوری میں ڈال دینا۔

### (ل ب س)

لَبَسَ الثَّوْبُ: کے معنی کپڑا پہننے کے ہیں اور اَلْبَسَهُ کے معنی دوسرے کو پہنانا کے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَيَلْبَسُونَ ثِيَابًا خُضْرًا﴾ (۱۸-۳۱) اور وہ سبز کپڑے پہنا کریں گے۔ اَللِّبَاسُ وَاللَّبُوسُ وَاللَّبْسُ: وہ چیز جو پہنی جائے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿قَدْ أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ لِبَاسًا يُورِي سَوَاتِكُمْ﴾ (۲۶-۷۷) ہم نے تم پر پوشاک اتاری کہ تمہارا ستر ڈھانپے۔

جانتا ہے۔

﴿لَمْ يَلْبَثُوا إِلَّا عَشِيَّةً﴾ (۷۹-۸۶) کہ گویا (دنیا میں صرف) ایک شام رہے تھے۔

﴿لَمْ يَلْبَثُوا إِلَّا سَاعَةً﴾ (۳۶-۳۵) (تو خیال کریں گے کہ) گویا وہ دنیا میں رہے ہی نہ تھے مگر گھڑی بھر۔ ﴿مَا لَبَثُوا فِي الْعَذَابِ الْمُهِينِ﴾ (۳۳-۱۴) تُوذلت کی تکلیف میں نہ پڑے رہتے۔

### (ل ب د)

لَبْدَةٌ: تہ برتہ جمی ہوئی اون ج لَبْدٌ قرآن پاک میں ہے: ﴿يَكُونُونَ عَلَيْهِ لَبْدًا﴾ (۷۲-۱۹) کافران کے گرد گردجم کر لینے کو تھے۔

یعنی تہ برتہ جمی ہوئی اون کی طرح ان کے گرد جمع ہو گئے۔ بعض نے اس کے معنی یہ کیے ہیں کہ وہ آپ پر مجتمع ہو کر لبده کی طرح گرنے لگے۔ ایک قرأت میں لَبْدًا بھی ہے۔ یعنی آپ کے گرد ہجوم کی وجہ سے وہ ایک دوسرے پر چڑھ رہے تھے۔ اور لَبْدٌ کی جمع اَلْبَادُ وَلَبُودٌ آتی ہے اَلْبَدْتُ السَّرَجُ: میں نے زین کے لیے منہ بنایا اور اَلْبَدْتُ الْفَرَسُ کے معنی ہیں: میں نے گھوڑے پر منہ ڈالا۔ جیسے اَسْرَجْتُهُ (میں نے اس پر زین کسی)۔ وَالْجَمْتُهُ: میں نے اسے لگام دی۔ اَلْبَيْتَةُ (سینہ بند باندھا)۔

اَللَّبْدَةُ: یہ لَبْد کا مفرد ہے منہ کے ایک ٹکڑہ کو لَبْدَةُ کہتے ہیں۔ مثل مشہور ہے ⑥

① المثل فی حل المعامح۔

② انظر للمثل ادب الکاتب (۳۹) وجمهرة العسکری (۱۹۱) والمیدانی (۲: ۲۰۰) واللسان (لبده والحيوان

(۴۷۹/۵) والنوادر لابی مسلم ۱۲۔

استعمال ہوتا ہے۔ اور شاعر نے کہا ہے ❶ ( )

(۳۹۰) وَكَسَوْتُهُمْ مِّنْ خَيْرٍ بُرِّدٌ مُّنَجَّمٌ

عمدہ دھاری دار چادریں ان کا لباس ہیں۔

بعض نے وَلِبَاسُ التَّقْوَىٰ پڑھا ہے جو لَبَسٌ بمعنی ستر سے مشتق ہے۔

در اصل لَبَسٌ کے معنی کسی چیز کو چھپانے کے ہیں۔ اور معانی کے متعلق بھی استعمال ہوتا ہے۔ مَثَلًا لَبَسْتُ عَلَيْهِ أَمْرًا چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ مَا يَلِيسُونَ﴾ (۶-۹) اور جو

شبہ (اب) کرتے ہیں اسی شبہ میں پھر ڈال دیتے۔

﴿وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ﴾ (۲-۴۲) تم سچ کو

جھوٹ کے ساتھ نہ ملاؤ۔

﴿لَمْ تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ﴾ (۳-۷۱) تم سچ کو

جھوٹ کے ساتھ خلط ملط کیوں کرتے ہو۔

﴿الَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يَلْبِسُوا إِيمَانَهُمْ بِظُلْمٍ﴾

(۶-۸۲) جو لوگ ایمان لائے اور اپنے ایمان کو شرک کے

ظلم سے مخلوط نہیں کیا۔

فِي الْأَمْرِ لُبْسَةٌ یعنی اس معاملہ میں اشتباہ ہے۔

لَا بَسْتُ الْأُمُورَ: کسی کام کی مزاحمت کرنا۔

لَا بَسْتُ فُلَانًا: کسی سے گھل مل جانا یعنی اندرون سے

واقف ہونا۔ لَيْسَ فِي فُلَانٍ مُّلبَسٌ: یعنی دروے

کبر و رسال خوردگی نیست شاعر نے کہا ہے ❷ (الطویل)

(۳۹۱) وَبَعْدَ الْمَشِيبِ طَوْلٌ عُمُرٍ وَمَلْبَسًا

اور لباس کا لفظ ہر اس چیز پر بولا جاتا ہے۔ جو انسان کے برے

کاموں پر پردہ ڈال سکے۔ چنانچہ میاں بیوی میں سے ہر ایک کو

دوسرے کا لباس قرار دیا گیا ہے کیونکہ وہ ایک دوسرے کو قباہ

کے ارتکاب سے روکتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ﴾ (۲-۸۷)

وہ تمہاری پوشاک ہیں اور تم ان کی پوشاک ہو۔

چنانچہ اسی معنی میں شاعر نے اپنی بیوی کو ازار کہا ہے ❸

(۳۸۹) فِذِي لَكَ مِنْ أَخِي ثِقَةٌ إِزَارِي

اے میرے قابل اعتبار بھائی! تجھ پر میری ازار یعنی بیوی

قربان ہو۔

اور تمثیل و تشبیہ کے طور پر تقویٰ کو بھی لباس قرار دیا گیا

ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿لِبَاسُ التَّقْوَىٰ﴾ (۷-۲۶) اور جو پرہیزگاری کا

لباس ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿صَنْعَةُ لَبُوسٍ لَّكُمْ﴾ (۸۱-۸۰) (اور ہم نے)

تمہارے لیے ان کو ایک طرح کا لباس بنانا..... میں

لَبُوسٌ سے زر ہیں مراد ہیں۔ اور آیت کریمہ:

﴿فَإِذَا قَامَ إِلَهُ لِبَاسِ الْجُوعِ وَالْخَوْفِ﴾

(۱۶-۱۱۲) تو خدا نے ان کے اعمال کے سبب بھوک اور

خوف کا لباس پہنا کر ناشکری کا مزہ چکھادیا۔

میں جو یعنی بھوک اور خوف کی تصویر کھینچنے کے لیے اسے

لباس کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔ جیسا کہ:

تَدْرَعُ فُلَانٌ الْفَقْرَ أَوْ لِبَسَ الْجُوعَ کا محاورہ

❶ قاله جعدة بن عبد السلمی وقد مر فی (ازر)

❷ لم أجده فی المراجع۔

❸ قاله امرؤ القیس وصدر الا ان بعد العدم للمرء قنوة..... والبيت فی اللسان (لیس) وديوانه (۱۴۲) ومن الستة ۱۳۵

وامالی المرتضى (۱: ۵۹۶) والسمط (۳۳۷) والصناعتين (۴۴۳) وفي بعد الشباب بدل بعد المشيب ۱۲.



کوئی معنوی تعلق نہیں اللَّبْنُ (اینٹ سے لَبَنَہ (ض) يَلْبَنُہ کے معنی اینٹ سے مارنے کے ہیں اور اینٹ بنانے والے کو لَبَّانُ کہا جاتا ہے۔

اور بڑھاپے کے کبر سنی اور کہن سالی ہے:

## (ل ب ن)

اللَّبْنُ: دودھ۔ ج۔ اللَّبَانُ۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَأَنهَرُ مِنْ لَبَنٍ لَمْ يَتَغَيَّرْ طَعْمُهُ﴾ (۱۵-۴۷) اور دودھ کی نہریں ہیں جن کا مزہ نہیں بدلے گا۔ ﴿مَنْ بَيَّنَّ فَرْثٌ وَ دَمٌ لَبَنًا خَالِصًا﴾ اور اس غذا سے جو نہ فضلہ بنی ہو اور نہ خون ہم تم کو خالص دودھ پلاتے ہیں۔

## (ل ج ج)

اللَّجَّاجُ: (مصدر جس) کے معنی کسی ممنوع کام کے کرنے میں بڑھتے چلے جانے اور اس پر ضد کرنے کے ہیں۔ اس سے فعل لَجَّ فِی الْأَمْرِ استعمال ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَلَوْ رَحِمْنَاهُمْ وَكَشَفْنَا مَا بِهِمْ مِنْ ضُرٍّ لَلَجُّوا فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ﴾ (۷۵-۲۳) اور اگر ہم ان پر رحم کریں اور جو تکلیفیں انہیں پہنچ رہی ہیں وہ دور کر دیں تو اپنی سرکشی پر اڑے رہیں اور بھٹکتے (پھریں) ﴿بَلْ لَجُّوا فِي عُتُوٍّ وَنُفُورٍ﴾ (۶۷-۲۱) لیکن یہ سرکشی اور نفرت میں بڑھتے چلے جاتے ہیں۔

اسی سے لَجَّةُ الصَّوْتِ مشہور ہے۔ جس کے معنی آواز کے بار بار آنے جانے اور پلٹنے کے ہیں۔ لُجَّةُ الْبَحْرِ: (بضم اللام) سمندر کی موجوں کا تلاطم (ان کا بار بار آنا اور پلٹنا)

لُجَّةُ اللَّيْلِ: رات کی تاریکی کا آنا جانا اور سخت ہونا۔ اور لَجَّةٌ وَلُجَّةٌ: میں ایک لغت لُجٌ اور لُجٌ بھی ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿فِي بَحْرِ لُجِّيٍّ﴾ (۴۰-۲۳) دریائے عمیق میں۔ میں لُجِّيٌّ بھی لُجَّةُ الْبَحْرِ کی طرف منسوب ہے اور

لَابِنٌ: بہت دودھ والا۔ لَبَنَتُهُ: میں نے اسے دودھ پلایا۔ فَرَسٌ مَلْبُونٌ: دودھ سے پرورش کیا ہوا گھوڑا۔ اللَّبْنُ قُلَانٌ: بہت سے دودھ کا مالک ہونا اور ایسے آدمی کو مُلْبِنٌ کہا جاتا ہے۔

الْبَنَتِ النَّاقَةُ کے معنی ہیں: اونٹنی بہت دودھ والی ہوگی عام اس سے کہ طبعی طور پر ہو یا تھنوں میں دودھ چھوڑ دینے کی وجہ سے ہو۔ الْمَلْبِنُ: دودھ دوہنے کا برتن اور ہُوَ أَخُوهُ بِلَبَانٍ اُمِّہ کے معنی یہ ہیں کہ وہ اس کا رضاعی بھائی ہے اور اس محاورہ میں لَبَانِ اُمِّہ کی بجائے لَبْنِ اُمِّہ کہنا۔ صحیح نہیں ہے کیونکہ یہ اہل عرب سے سمجھ نہیں ہے۔

كَمْ لَبْنٌ غَنِمَكَ: یعنی تیری بکریوں میں دودھ والی کتنی ہیں ❶

الْلُبَّانُ کے معنی صدر یعنی سینہ کے ہیں اور لُبَانَةُ کے اصل معنی تو دودھ کی ضرورت کے ہیں مگر مطلق ضرورت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اور اللَّبْنُ جس کے معنی عمارتی اینٹ کے ہیں اور اس کا واحد لَبَنَةُ ہے اس کا لَبْنُ (دودھ) سے

❶ وهو جمع لبون بمعنى ذات الدرة۔

❷ في معناه استلج وفي الحديث اذا استلج احدكم بيمينه فانه اثم له عند الله من الكفارة۔

❸ اي ارتفاعه وفي حديث عكرمة: سمعت لهم لجة بآمين (اللسان)

لَحْدَ النَّمِيَّتِ وَالْحَدَّةُ: میت کو لحد میں دفن کرنا اور لَحْدٌ كَوْمَلَحْدٍ بھی کہا جاتا ہے جو کہ الْحَدَثَةُ (افعال) سے اسم ظرف ہے۔

لَحْدَ بِلِسَانِهِ إِلَى كَذَا: زبان سے کسی کی طرف جھکنے یعنی غلط بات کہنا کے ہیں اور آیت کریمہ: ﴿لِسَانَ الَّذِي يُلْحِدُونَ إِلَيْهِ﴾ (۱۶-۱۰۳) مگر جس کی طرف تعلیم کی نسبت کرتے ہیں۔ میں يُلْحِدُونَ لَحْدَ سے ہے اور ایک قرأت میں يُلْحِدُونَ (الْحَدَ سے) ہے۔

کہا جاتا ہے: اَلْحَدَ فُلَانٌ۔ فلاں حق سے پھر گیا۔

اَلْحَادُ دو قسم پر ہے۔ ایک شرک باللہ کی طرف مائل ہونا۔ (۲) دوم شرک بالاسباب کی طرف مائل ہونا۔

اول قسم کا الحاد ایمان کے منافی ہے اور انسان کے ایمان و عقیدہ کو باطل کر دیتا ہے۔ اور دوسری قسم کا الحاد ایمان کو تو باطل نہیں کرتا لیکن اس کے عروۃ (حلقہ) کو کمزور ضرور کر

دیتا ہے چنانچہ آیات:- ﴿وَمَنْ يَرْذُ فِيهِ بِاِلْحَادٍ بِظُلْمٍ نَذِقْهُ مِنْ عَذَابِ اَلْنِیْمِ﴾ (۲۳-۲۵) اور جو اس میں شرارت سے کجروی و کفر کرنا چاہے تو اس کو ہم درد دینے والے عذاب کا مزہ چکھائیں گے۔ ﴿اَلَّذِیْنَ

روایت ۱۰۶) (۱۰۶) وَضَعَ اللُّجَّ عَلَى قَفَى (اس نے میری گردن پر تلوار رکھ دی) میں لُجَّ کے معنی آبدار تلوار کے ہیں اور قَفَى اصل میں قَفَاۤی ہے الف یاء سے مبدل ہو کر یاء میں ادغام ہو گیا ہے۔

اَللَّجْلَجَةُ کے معنی ہکلا پن کے ہیں اور نیز لقمہ کو بغیر چبائے منہ میں پھرانے کو بھی لَجْلَجَةٌ کہتے ہیں کسی شاعر نے کہا ہے ۵ (الوافر)

(۳۹۲) يَلْجَلِجُ مُضْغَةً فِيهَا اَيْضُ

یعنی منہ میں گوشت کا نیم پختہ ٹکڑا پھر رہا ہے۔

رَجُلٌ لَّجَلَجٌ: ہکلا رک رک کر بات کرنے والا۔ اَلْحَقُّ اَبْلَجٌ وَالبَّاطِلُ لَجَلَجٌ: حق واضح ہے اور باطل مشتبہ یعنی کوئی شخص باطل کو نہ تو صاف طور پر بیان کر سکتا ہے اور نہ انشراح صدر کے ساتھ اسے انجام دے سکتا ہے۔ بلکہ اس میں ہمیشہ متردد رہتا ہے۔

## (ل ح د)

اَللَّحْدُ: اس گڑھے یا شگاف کو کہتے ہیں جو قبر کی ایک جانب میں بنایا جاتا ہے۔ اور لَحْدَ الْقَبْرِ وَالْحَدَّةُ کے معنی قبر میں لحد بنانا کے ہیں۔

۱ فی حدیث طلحة ولفظه قد مونی فوضعوا للحو علی قفی قال فی النہایة (۲۳۴/۴) اللج بالضم السیف بلغة طی و قبل هو اسم سمي به السیف كما قالوا الصمصامة راجع غریب ابی عبید (۹/۴) احادیث طلحة بن عبید اللہ التمیمی وهو من العشرة المبشرة قتل يوم الحمل سنة ۳۶ وهو بجانب عائشة وله فی الصحيحین ۳۸ حديثاً انظر لترجمته الاصابة (۲۹۰/۳) وتهذيب التهذيب (۲۰/۵) والحديث فی قصه بيعة علی قال طلحة "انی اخذت فادخلت فی الحش وقربوا فوضعوا اللج علی قفی فقالوا: لتبايعن اولنقتلنك فبايعت وانا مكره وراجع للحديث ايضا الفائق (۹۱/۳) والصواب وضعوا مكان وضع كذا فی جميع المراجع ۱۲۔

۲ قاله زهير وتمامة: اصلت فهي تحت الكشح واؤ والبيت في اللسان (انض، لحج، صل) ودبرانه بشرح الشنمري ۱۶۳ ومختار الشعر الجاهلي (۱۹۸:۱) وتهذيب الالفاظ ۴۹۷ والبحر (۲۰۰:۷) وفي رواية الكامل تلجلج (۱:۱۶) وهي موافقة لرواية الستة (العقد الثمين ۸۷) وهو الصواب لانه خطاب وبعده: و غصصت بينهما فبشمت منها۔ وعندك لو اردت لهادواء۔ والبيت من ابیات المعانی انظر المعانی الكبير للقبتي (۸۴۸، ۸۴۱)۔

لحاف میں ڈھانپ دیا چنانچہ وہ اس میں لپٹ گیا۔

### (ل ح ق)

لَحِيفَتُهُ وَلَحِيفَتُ بِهِ کے معنی کسی کو پالنے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿الَّذِينَ لَمْ يَلْحَقُوا بِهِمْ مِنْ خَلْفِهِمْ﴾ (۱۶۹-۳) اور جو لوگ ان کے پیچھے رہ گئے۔ (اور شہید ہو کر) ان میں شامل نہ ہو سکے۔

﴿وَالْآخَرِينَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوا بِهِمْ﴾ (۳-۶۲) اور ان میں سے دوسرے لوگوں کی طرف بھی (ان کو بھیجا ہے) جو ابھی ان مسلمانوں سے نہیں ملے محاورہ ہے: اَلْحَقْتُ بِهِ كَذَا: میں نے اسے اس سے ملا دیا۔ بعض نے کہا ہے کہ اَلْحَقُّ بمعنی لَحِيفَةٌ ہے۔ اور دعائے قنوت میں ﴿۱۰۶﴾ إِنَّ عَذَابَكَ بِالْكَفَّارِ مُلْحَقٌ میں بھی ملحق اسی معنی پر محمول ہے بعض نے کہا ہے کہ یہ اَلْحَقْتُ بِهِ كَذَا سے ماخوذ ہے۔

لیکن عذاب کی ہولناکی بیان کرنے کے لیے اسے مُلْحَق (ملنے والا) کہہ دیا ہے۔ اور کنایۃ مُلْحَق اسے بھی کہتے ہیں جسے کسی خاندان نے اپنے سے وابستہ کر لیا ہو۔ اور وہ نسباً ان سے نہ ہو۔

### (ل ح م)

اللَّحْمُ: (گوشت) کی جمع لَحَامٌ، لُحُومٌ اور لُحْمَانٌ آتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿أَوْ لَحْمِ الْخِنْزِيرِ﴾ (۱۷۳-۲) اور سور کا گوشت۔ لَحْمُ الرَّجُلِ فَهُوَ لَحِيمٌ کے معنی ہیں: وہ پر گوشت

يُلْحِدُونَ فِي أَسْمَائِهِمْ ﴿۷-۱۸۰﴾ جو لوگ اس کے ناموں کے وصف میں کجروی اختیار کرتے ہیں۔

میں یہی دوسری قسم کا الحاد مراد ہے اور اَلْحَادِ فِیْ اَسْمَائِهِ یعنی صفات خداوندی میں الحاد کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ باری تعالیٰ کو ان اوصاف کے ساتھ متصف ماننا جو شان الوہیت کے منافی ہوں دوم یہ کہ صفات الہی کی ایسی تاویل کرنا جو اس کی شان کے زبیا نہ ہو۔ اَلتَّحَدُّ فَلَانٌ اِلٰی كَذَا: وہ (راستہ ہٹ کر) ایک جانب مائل ہو گیا اور آیت کریمہ: ﴿وَلَنْ تَجِدَ مِنْ دُونِهِ مُلْتَحِدًا﴾ (۱۸-۲۷) اور اس کے سوا تم کہیں پناہ کی جگہ بھی نہیں پاؤ گے۔ میں مُلْتَحِدًا مصدر میسی بمعنی اَلتَّحَادِ بھی ہو سکتا ہے اور اسم ظرف بھی (اور اس کے معنی پناہ گاہ کے ہیں) اَلتَّحَدُّ السَّهْمُ عَنِ الْهَدَفِ - تیر نشانے سے ایک جانب مائل ہو گیا۔ (یعنی ہٹ گیا۔)

### (ل ح ف)

اَللَّحَافُ کے معنی الحاح یعنی چٹ کر مانگنا کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿لَا يَسْتَلُونَ النَّاسَ اِلْحَافًا﴾ (۲۷۳-۲) اور شرم کے سبب (لوگوں سے منہ پھوڑ کر) لپٹ کر نہیں مانگ سکتے۔

اسی سے استعارہ کے طور پر اَلْحَفَ شَارِبُهُ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے جس کے معنی مونچھیں جڑ سے کاٹ دینے کے ہیں اور یہ دراصل لِحَاف سے ہے اور لحاف کے معنی اوڑھنے کا کپڑا ہیں۔ اَلْحِفَتُهُ فَالْتَحَفَ: میں نے اسے

① وقوله ای قول الداعی او قوله تعالیٰ لان اُیُّا کان یزید فی مصحفہ وبعد القنوت سورتین عن القرآن انظر المشکل للفتنی ۲۰ وایضاً فی مصحف بن عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ انظر کنز العمال (۴۸/۸) و لتخریجہ رقم (۶۹۲) وفی منتہی الارب ملحق بکسر الحاء والفتح احسن واصوب ۱۲۔

بڑی کے ساتھ گوشت پیوست ہوتا ہے۔  
الْلَحَامُ: وہ چیز جس سے برتن کو ٹانکا لگایا جائے  
الْحَمْتُ فُلَانًا کسی کو قتل کر کے اس کا گوشت درندوں  
کو کھلادیا۔

الْحَمْتُ الطَّائِرَ: میں نے پرند کا گوشت کھلایا۔  
الْحَمْمَتُكَ فُلَانًا: میں نے فلاں کی غیبت کا موقع دیا۔  
اور یہ ایسے ہی ہے جیسے غیبت و بدگوئی کو اکل اللحم یعنی  
گوشت کھانے سے تعبیر کر لیتے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں  
ہے:

﴿أَيَحِبُّ أَحَدُكُمْ أَنْ يَأْكُلَ لَحْمَ أَخِيهِ مَيْتًا﴾  
(۱۲-۳۹) کیا تم میں سے کوئی اس بات کو پسند کرے گا کہ  
اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے۔

فُلَانٌ لَحِيمٌ فلاں کو قتل کر دیا گیا۔ گویا اسے درندوں کی  
خوراک بنا دیا گیا۔ الْمُلْحَمَةُ معرکہ مَلَا حِمٌّ۔

### (ل ح ن)

الْلَحْنُ (ف) کے معنی ہیں بات کو اس کے  
مستعمل طریقہ اور اسلوب سے پھیر دینا۔ اگر یہ لفظ کے  
اعراب یا ہیئت تبدیل کر دینے سے ہو جو کہ لَحْنٌ کا عام  
مفہوم ہے تو یہ قابلِ مذمت ہے اور اگر تصریح چھوڑ کر بطور  
تعریض کلام کرنے سے ہو تو اکثر ادباء کے نزدیک فن  
بلاغت کے لحاظ سے یہ مستحسن اور کلام کی خوبیوں میں شمار  
ہوتا ہے شاعر نے کہا ہے ۵ (الخفيف)

(۳۹۳) وَخَيْرُ الْحَدِيثِ مَا كَانَ لَحْنًا

اور موٹا ہو گیا۔ اور مولے چربی چڑھے ہوئے آدمی کو  
لَا حِمٌّ شَا حِمٌّ کہا جاتا ہے۔ جیسے: لَا بَيْنَ وَ تَامِرٌ:  
لَحِمٌ (س) کے معنی گوشت کھانے کا حریص ہونا کے ہیں  
اسی سے بہت زیادہ گوشت خور باز یا بھیڑیے کو لَحِمٌ کہا  
جاتا ہے۔

بَيْتٌ لَحِمٍ: وہ گھر جہاں لوگوں کی اکثر غیبتیں کی  
جائیں۔ حدیث میں ہے ۱ (۱۰۷)

إِنَّ اللَّهَ يَنْغَضُّ قَوْمًا لَحْمِينَ کہ اللہ تعالیٰ بہت  
گوشت خور لوگوں کو ناپسند کرتا ہے یعنی جو ہر وقت لوگوں کی  
غیبت کرتے رہتے ہیں۔ اَلْحَمَةُ کے معنی کسی کو گوشت  
کھلانے کے ہیں۔ اور اسی سے تشبیہ کے طور پر اس آدمی کو  
جس کی گزرانہ شکار پر ہو۔ رَجُلٌ مُلْحَمٌ کہا جاتا ہے۔  
پھر مطلقاً تشبیہا ہر کھاتے میتے آدمی کو مُلْحَمٌ کہہ دیتے  
ہیں اور اسی سے ”تَوْبٌ مُلْحَمٌ“ کا محاورہ ہے جس کے  
معنی بنے ہوئے کپڑے کے ہیں کپڑے کے بانا کو لُحْمَةُ  
کہا جاتا ہے جو کہ لُحْمَةُ الْبَازِي سے مشتق ہے۔ اسی  
سے کہا جاتا ہے۔ ۲ (۱۰۸)

أَلْوَلَاءُ لُحْمَةٍ كُلُّ لُحْمَةٍ النَّسَبِ کہ ولاء کا رشتہ بھی  
نسب کے رشتہ کی طرح ہے شَجَّةٌ مُتَلَا حِمَةٌ زخم پر  
گوشت چڑھ گیا ہو۔ لَحْمَتُ اللَّحْمِ عَنِ الْعَظْمِ  
میں نے بڑی سے گوشت کو الگ کر دیا۔ لَحْمَتُ  
الشَّيْءِ وَالْحَمْمَةُ وَلَا حَمْتُ بَيْنَ الشَّيْئَيْنِ میں  
نے ایک چیز کو دوسری کے ساتھ اس طرح گتھی کر دیا۔ جیسے

۱ انظر مجمع البحار (۲۴۸/۳) والفائق (۲۲۲/۲) باختلاف يسير في اللفظ وكذا فسر سفیان الثوري۔

۲ حدیث مرفوع أخرجه ابویعلی وابن حبان عن ابن عمر انظر الذرقانی علی الموطا (۹۶/۴) وکنز العمال (ج ۱۰ رقم  
۵۴۳) ورقم (۱۵۵۷) و (۱۶۲۲) عن علی وعبد اللہ بن ابی اوفی والفتح الكبير للنہانی ۳۰۸/۳

۳ قاله مالک بن اسماء بن خارجة (۷۵۸-۷۵۶ الشعراء) شاعر اسلامی غزل و صدرہ منطق رائع ولحن احیا۔ ناد.....

شدید اللد یعنی اس آدمی کو کہتے ہیں۔ جس کی گردن کا پہلو بڑا سخت ہو۔ اور مجازاً اس شخص پر بولا جاتا ہے جسے اس کے ارادہ سے پھیرا نہ جاسکے۔  
 فَلَانٌ يَتَلَدُّ: فلاں گردن موڑ کر رخ پھیرتا ہے۔  
 اَللَّدُوْدُ: وہ دوا جو منہ کی جانب سے پلائی جائے۔  
 اَلتَّدَدْتُ: لدو لینا۔

### (ل د ن)

لَدُنْ: یہ عِنْدَ سے انحص ہے کیونکہ یہ کسی فعل کی انتہاء کے آغاز پر دلالت کرتا ہے۔ جیسے اَقَمْتُ عِنْدَهُ مِنْ لَدُنْ طُلُوعِ الشَّمْسِ إِلَى غُرُوبِهَا: آغاز طلوع شمس سے غروب آفتاب تک اس کے پاس ٹھہرا رہا۔ تو یہاں لَدُنْ کا لفظ ٹھہرنے کے آغاز کو بیان کرتا ہے اور کبھی عِنْدَ کی بجائے بھی استعمال ہوتا ہے۔ جیسا کہ حکایت ہے اَصْبَتْ عِنْدَهُ مَالًا وَلَدْنَهُ مَالًا: میں نے اس کے پاس مال پایا بعض نے کہا ہے کہ لَدُنْ عِنْدَ سے مبلغ اور انحص ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿فَلَا تُصِحِّبْنِي قَدْ بَلَغْتَ مِنْ لَدُنِّي عُذْرًا﴾ (۷۶-۱۸) تو مجھے اپنے ساتھ نہ رکھیے گا کہ آپ کو (مجھے ساتھ نہ رکھنے کے بارے میں) میری طرف سے عذر حاصل ہوگا۔

بہتر کلام وہ ہے جو تعریض میں ہو۔ اور آیت کریمہ: ﴿وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِي لَحْنِ الْقَوْلِ﴾ (۳۰-۴۷) اور تم انہیں ان کے انداز گفتگو سے پہچان لو گے۔ میں بھی یہی مراد ہے۔ اور اسی سے ذہین آدمی جو کلام کے صحیح مقصد کو خوب سمجھ لیتا ہو۔ لَحْنُ کہا جاتا ہے۔ حدیث میں ہے۔

① (۱۰۹)

لَعَلَّ بَعْضَكُمْ اَلْحَنُ بِحُجَّتِهِ مِنْ بَعْضٍ: شاید تم میں سے بعض آدمی دوسرے کی نسبت دلیل پر زیادہ قدرت رکھتے ہوں تو اَلْحَنُ کے معنی زبان آور اور فصیح شخص کے ہیں جو اپنے مافی الضمیر کو وضاحت اور استدلال سے بیان کر سکتا ہو۔

### (ل د د)

اَللَّدُّ: سخت جھگڑا آدمی کو کہتے ہیں جو کسی کی بات ماننا ہی نہ ہو۔ اسی کی جمع لَدُّ آتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَهُوَ اَلَّذُ الْخَصَامُ﴾ (۲۳-۲) حالانکہ وہ سخت جھگڑا ہو۔

﴿وَتَنْذِرُ بِهِ قَوْمًا لَّدَّا﴾ (۹-۱۹) تاکہ اس کے ذریعہ سخت جھگڑا قوم کو بد انجام سے آگاہ کرو۔ اصل میں اَللَّدُّ

❦ وفي مصارع العشاق (۲۶۳) انه قال في امرئته حسينة بنت ابي حنبل الانصاري انظر البيت السمت ۱۶ والمشاطرة للاستاذ الميمنى وامالى المرتضى (۱۵۰/۱۴) وفي روايتهما جميعا صائب بدل رائع والبيت في ادب الكتاب للصولي (۱۳۱) والعقد الفريد (۴۸۰/۲) والمعجم للمرزباني (۲۶۶) والبيان للحافظ ۱۴۷ والعيون (۱۶۱/۲) والخزانة (۴۸۵/۲) والعمدة (۳۰۸/۱) وفيه صنعة الاشارة للحن ومعناه في الآية والبيت الشاهد كلام يعرفه المخاطب بفحواه وان كان على غير وجهه ويسمى اليوم المحاجة لدلالة الحجة عليها كذا افسر ابن دريد البيت لفكن قرينه صائب يا بى عن ذلك الا انه يستلزم الحواري وايضا راجع هوامش محالس ثعلب (۵۳۱)

① قال الحافظ في الكاف اصلحه في الصحيحين قال الذكر ۱/۲۰۳) اخرجه مالك والشافعي وابن ابى شيبة والصحيحان عن ام سلمة والحاكم واحمد من رواية اسامة بن زيد وابن حبان في زوائده رقم ۱۱۹ عن ابى هريرة والحديث في الفائق (۲۲۱، ۵۱/۲) وغريب القتيبي ۷۵

② وفي الحديث خير ماتدا ويتم به اللدو والفائق (۲۲۳/۲)۔

دراز تک ایک جگہ ٹھہرے رہنا کے ہیں۔ اور الزام (افعال) دو قسم پر ہے ایک تو الزام بالتسخیر ہے اسکی نسبت اللہ تعالیٰ اور انسان دونوں کی طرف ہو سکتی ہے اور دوسرے الزام بالحکم والامر یعنی کسی چیز کا حکم واجب کر دینا جیسے فرمایا:

﴿أَنْزِلْهُمْ مَكْمُومًا وَأَنْتُمْ لَهَا كَرِهُونَ﴾ (۱۱-۲۸) تو کیا ہم اس کے لیے تمہیں مجبور کر سکتے ہیں۔ اور تم ہو کہ اس سے ناخوش ہو رہے ہو۔ ﴿وَالزَّمَهُمْ كَلِمَةً التَّقْوَى﴾ (۲۶-۳۸) اور ان کو پرہیزگاری کی بات پر قائم رکھا۔

﴿فَسَوْفَ يَكُونُ لِزَامًا﴾ (۲۵-۷۷) سو وہ (سزا) تمہارے لیے لازم ہوگی۔

﴿وَلَوْ لَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَبِّكَ لَكَانَ لِزَامًا وَأَجَلٌ مُّسَمًّى﴾ (۲۰-۱۲۹) اور اگر ایک بات تمہارے پروردگار کی طرف سے پہلے صادر اور اجزائے اعمال کے لیے میعاد مقرر نہ ہو چکی ہوتی۔ تو عذاب (تم سے) چٹ جاتا۔

## (ل س ن)

اللسان: زبان اور قوت گویائی کو کہتے ہیں۔

قرآن مجید میں ہے:

﴿وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِي﴾ (۲۰-۲۷) اور میری زبان کی گرہ کھول دے۔

یہاں لسان کے معنی قوت گویائی کے ہیں کیونکہ وہ بندش ان کی زبان پر نہیں تھی بلکہ قوت گویائی سے عقدہ کشائی کا سوال تھا۔ محاورہ ہے: لِكُلِّ قَوْمٍ لِّسَانٌ وَلِلسُنِّ (بکسر اللام) یعنی ہر قوم رافت و لہجہ جدا است۔ قرآن

﴿رَبَّنَا آتِنَا مِنْ لَدُنْكَ رَحْمَةً﴾ (۱۸-۱۰) اے ہمارے پروردگار ہم پر اپنے ہاں سے رحمت نازل فرما:

﴿فَهَبْ لِي مِنْ لَدُنْكَ وَلِيًّا﴾ (۱۹-۵) تو مجھے اپنے پاس سے ایک وارث عطا فرما:

﴿وَأَجْعَلْ لِّي مِنْ لَدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِيرًا﴾ (۱۷-۸۰) اور اپنے ہاں سے زور و قوت کو میرا مددگار بنائیو۔

﴿وَعَلَّمْنَاهُ مِنْ لَدُنَّا عِلْمًا﴾ (۱۸-۶۵) ہم نے اے اپنے پاس سے علم بخشا تھا۔

اور لَدُنْ میں لَدُ، لَدَى تین لغات اور بھی ہیں۔  
اللدن: پکدار نرم۔

## (ل د ی)

لدى یہ تقریباً لدن کے معنوں میں استعمال

ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَأَلْفَيَا سَيِّدَهَا لَدَا الْبَابِ﴾ (۱۲-۲۵) اور دونوں کو دروازے کے پاس عورت کا خاوند مل گیا۔

## (ل ز ب)

اللازب: اس چیز کو کہتے ہیں جو کسی مقام پر شدت

سے ثبت ہو جائے اور چٹ جائے قرآن پاک میں ہے:

﴿وَمِنْ طَبِئِ لَازِبٍ﴾ (۱۱-۳۷) چپکتے گارے سے

(بنایا) اور کبھی لازِب بمعنی واجب بھی آتا ہے جیسا کہ کسی چیز کے لازم اور ضروری ہونے کو بیان کرنے کے لیے ضربیہ لازب کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔ اللَّزْبَةُ: سخت قحط سالی اس کی جمع لَذَبَاتُ آتی ہے۔

## (ل ز م)

لَزِمَهُ يَلْزِمُهُ لَزُومًا کے معنی کسی چیز کا عرصہ

ہے: ﴿اللَّهُ لَطِيفٌ بِعِبَادِهِ﴾ (۱۹-۴۲) خدا اپنے

بندوں پر مہربان ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿إِنَّ رَبِّي لَطِيفٌ لِّمَا يَشَاءُ﴾ (۱۲-۱۰۰) بے شک

میرا پروردگار جو کچھ چاہتا ہے حسن تدبیر سے کرتا ہے۔ میں لطیف سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر کام کو حسن تدبیر سے سرانجام دیتا ہے۔ چنانچہ دیکھیے کہ یوسف علیہ السلام کو ان کے بھائیوں نے کنوئیں میں ڈال دیا تھا مگر اللہ تعالیٰ نے اپنے لطف و کرم سے انہیں اس مرتبہ تک پہنچا دیا۔ اور کبھی ان تحائف کو بھی لطف کہا جاتا ہے جو دوستی بڑھانے کے لیے ایک دوسرے کو دیئے جاتے ہیں۔ اسی لیے آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ﴿۱۱۰﴾

تَهَادُوا تَحَابُّوا کہ ایک دوسرے کو تحفے بھیجا کرو۔ تو تمہاری آپس میں محبت بڑھ جائے گی۔

الْطَّفُ فُلَانٌ أَخَاهُ بِكَذَا: فلاں نے اپنے بھائی کے ساتھ کسی چیز کے ذریعہ حسن سلوک کیا۔ ﴿۱۱۰﴾

## (ل ظ ی)

لَظِيْبُ النَّارِ وَتَلَطَّطْتُ کے معنی آگ بھڑک

اٹھنے کے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے: ﴿نَارًا تَلَطَّى﴾ (۱۴-۹۲) بھڑکتی آگ سے۔

اور لَظَى آگ کے شعلہ کو کہا جاتا ہے۔ جس میں دھوئیں کی آمیزش نہ ہو۔ یہ جہنم کا علم اور غیر منصرف ہے چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿إِنَّهَا لَطَّى﴾ (۱۵-۷۰) وہ بھڑکتی ہوئی آگ ہے۔

پاک میں ہے:

﴿فَإِنَّمَا يَسْتَرْئِيهِ بِلِسَانِكَ﴾ (۱۹-۹۷) (۱ے پیغمبر)

م نے یہ قرآن پاک تمہاری زبان میں آسمان نازل کیا۔

﴿بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِينٍ﴾ (۲۶-۱۹۵) فصیح عربی

زبان میں۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَأَخْتَلَفُ الْأَلْسِنَتُكُمُ وَالْوَاوِيْنُكُمُ﴾ (۳۰-۲۲)

اور تمہاری زبانوں اور رنگوں کا اختلاف۔

میں السنہ سے اصوات اور لہجوں کا اختلاف مراد ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جس طرح دیکھنے میں ایک شخص کی صورت دوسرے سے نہیں ملتی اسی طرح قوت سامعہ ایک لہجہ کو دوسرے سے الگ کر لیتی ہے۔

## (ل ط ف)

الْطَّيْفُ: جب یہ کسی جسم کی صفت واقع ہو تو

یہ جَنَل کی ضد ہوتا ہے جس کے معنی بھاری اور ثقیل کے ہیں کہتے ہیں شَعْرٌ جَنَلٌ..... (یعنی زیادہ اور بھاری بال) اور کبھی لَطَافَةٌ يالطَّف سے حرکت خفیفہ اور دقیق

امور کا سرانجام دینا مراد ہوتا ہے اور لَطَافَتٌ سے وہ باتیں مراولی جاتی ہیں جن کا ادراک انسانی حواس نہ کر سکتے ہوں اور اللہ تعالیٰ کے لَطِيف ہونے کے معنی یا تو یہ ہیں کہ وہ انسانی حواس کے ادراک سے مافوق اور بالاتر ہے اور یا اسے اس لیے لطیف کہا جاتا ہے کہ وہ دقیق امور تک سے واقف ہے اور یہ کہ وہ انسانوں کی ہدایت دینے میں نہایت نرم انداز اختیار کرتا ہے۔ قرآن پاک میں

① الحديث أخرجه البخاري في الادب المفرد والبيهقي من حديث أبي هريرة بسند جيد انظر تخريج الاحياء (۴۰/۲)

وکنز العمال (ج ۶ رقم ۴۷۶، ۴۷۷)۔

② وايضاً الآيات (۱۰۴-۱۰۸ و ۱۹)

## (ل ع ب)

لُعَابُ النَّحْلِ: شہد۔ لُعَابُ الشَّمْسِ: وہ چیز جو دھوپ میں مکڑی کے جالے کی طرح دکھائی دیتی ہے مُلَاعِبُ ظِلِّهِ: ایک جانور (جس کی گردن چھوٹی اور بازو بڑے ہوتے ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا پیٹ سفید ہوتا ہے) بیٹھے ہوئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اپنے سائے سے کھیل رہا ہے۔

## (لَعَلَّ)

لَعَلَّ: (حرف) یہ طبع اور اشفاق (ڈرتے ہوئے چاہنے) کے معنی ظاہر کرنے کے لیے آتا ہے۔ بعض مفسرین کا قول ہے کہ جب یہ لفظ اللہ تعالیٰ اپنے لیے استعمال کرے تو اس کے معنی میں قطعیت آ جاتی ہے..... اس بنا پر بہت سی آیات میں لفظ کی اس کی تفسیر کی گئی ہے کیونکہ ذات باری تعالیٰ کے حق میں توقع اور اندیشے کے معنی لینا صحیح نہیں ہیں۔ اور گو لَعَلَّ کے معنی توقع اور امید کے ہوتے ہیں مگر کبھی اس کا تعلق مخاطب سے ہوتا ہے اور کبھی مشکم سے اور کبھی ان دونوں کے علاوہ کسی تیسرے شخص سے ہوتا ہے۔ لہذا آیت کریمہ:

﴿لَعَلَّنَا تَتَّبِعُ السَّحَرَةَ﴾ (۲۶-۴۰) تاکہ ہم ان جادوگروں کے پیرو ہو جائیں۔ میں توقع کا تعلق قوم فرعون سے ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿لَعَلَّهُ يَتَذَكَّرُ أَوْ يَخْشَى﴾ (۲۰-۴۳) شاید وہ غور کرے یا ڈر جائے۔ میں توقع کا تعلق موسیٰ اور ہارون علیہ السلام کے ساتھ ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ اس امید پر فرعون سے نرمی کے ساتھ گفتگو کرنا کہ ممکن ہے وہ نصیحت حاصل کرے یا ڈر جائے اور آیت کریمہ:

﴿فَلَعَلَّكَ تَبَارَكَ بَعْضَ مَا يُوحَىٰ إِلَيْكَ﴾

الْعُتْبُ: اس مادہ کی اصل لُعَاب ہے جس کے معنی منہ سے بہنے والی رال کے ہیں اور لَعَبَ (ف) يَلْعَبُ لَعْبًا کے معنی لعاب بہنے کے ہیں۔ لیکن لَعَبَ (س) فُلَانٌ يَلْعَبُ لَعْبًا کے معنی بغیر صحیح مقصد کے کوئی کام کرنا کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَمَا هَذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا اِلَّا لَهْوٌ وَ لَعِبٌ﴾ (۲۹-۶۴) اور یہ دنیا کی زندگی تو صرف کھیل اور تماشا ہے۔

﴿وَذَرِ الَّذِينَ اتَّخَذُوا دِينَهُمْ لَعِبًا وَّ لَهْوًا﴾ (۶۰-۷۰) اور جن لوگوں نے اپنے دین کو کھیل اور تماشا بنا رکھا ہے۔ ان سے کچھ کام نہ رکھو۔

﴿اَوْ اَمِنْ اَهْلِ الْفُرٰى اَنْ يٰتِيَهُمْ بِاَسْنَا ضُحٰى وَّ هُمْ يَلْعَبُوْنَ﴾ (۷-۹۸) کیا بستیوں کے رہنے والے اس سے بے خوف ہیں کہ ان پر ہمارا عذاب دن چڑھے آنازل ہو، اور وہ کھیل رہے ہوں۔

﴿قَالُوا اَجِئْتَنَا بِالْحَقِّ اَمْ اَنْتَ مِنَ اللَّٰعِبِيْنَ﴾ (۲۱-۵۵) وہ بولے کیا تم ہمارے پاس واقعی حق لائے ہو یا ہم سے کھیل کی باتیں کرتے ہو۔ ﴿وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاءَ وَّ الْاَرْضَ وَّ مَا بَيْنَهُمَا لَعِبًا﴾

(۲۱-۱۶) اور ہم نے آسمان اور زمین کو اور جو مخلوقات ان دونوں کے درمیان ہیں اس کو لہو و لعب کرتے ہوئے پیدا نہیں کیا اَللَّعْبَةُ: (صیغہ مَرَّةً) ایک مرتبہ کھیلنا لَعْبَةً (بکسر اللام) کھیلنے کی حالت رَجُلٌ تَلْعَابَةً کے معنی ہیں دُو تَلْعَبٍ یعنی بہت بڑا کھلاڑی بے کار کام کرنے والا۔ لُعْبَةٌ: گڑیا، (شطرنج چوسر وغیرہ جن کے ساتھ کھیلا جاتا ہے) الْمَعْلَبُ: (ظرف) کھیلنے کی جگہ یا میدان۔



﴿وَالْخَاسِئَةُ أَنْ لَعْنَةُ اللَّهِ عَلَيْهِ إِنْ كَانَ مِنَ الْكَاذِبِينَ﴾ (۷۲-۷۳) اور پانچویں (بار) یہ کہے کہ اگر وہ جھوٹا ہو تو اس پر خدا کی لعنت ہو۔ ﴿لَعْنَتِ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ بَنِي إِسْرَآءَ يَلْ﴾ (۷۵-۷۸) جو لوگ بنی اسرائیل میں کافر ہوئے ان پر لعنت کی گئی۔

﴿وَيَلْعَنُهُمُ اللَّهُ عَنُونَ﴾ (۷۲-۱۵۹) اور لعنت کرنے والے ان پر لعنت کرتے ہیں۔<sup>①</sup>

اللَّعْنَةُ: (مسکون العین) یہ اللَّعْنَنَ سے ہے یعنی اپنے آپ پر لعنت کرنے والا۔ یا جس پر بہت لعنتیں بھیجی جائیں۔ مگر اللَّعْنَةُ (بفتح العین) لَعْنَنَ (متعدی) سے ہے یعنی دوسروں پر بہت لعنت کرنے والا۔

الْتَّلَاعُنُ وَالْمَلَا عَنَةُ: لوگوں کا باہم اپنے آپ یا دوسروں پر لعنت بھیجنا۔

### (ل غ ب)

الْغُوبُ: کے معنی بہت زیادہ در ماندہ ہونے اور تھک جانے کے ہیں۔ چنانچہ محاورہ ہے: اَتَانَا سَاغِبًا لَا غِبًا: وہ ہمارے پاس بھوکا اور تھکا ہارا ہو کر پہنچا۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَمَا مَسَّنَا مِنْ لُغُوبٍ﴾ (۵۰-۳۸) اور ہم کو ذرا بھی تنگن محسوس نہیں ہوئی۔

سَهْمٌ لُغِبٌ: وہ تیر جس کے پر کمزور ہوں۔ رَجُلٌ لُغِبٌ: کاہل اور کمزور رائے آدمی۔

ایک اعرابی کا قول ہے: فُلَانٌ لُغُوبٌ أَحْمَقُ جَاءَتْهُ كِتَابِي فَأَحْتَقَرَهُ كَفُلَانٍ تُخْضِ بَوَابِ وَقُوفٍ

(۱۱-۱۲) شاید تم کچھ چیز وحی میں سے جو تمہارے پاس آتی ہے چھوڑ دو۔ میں لعل کے معنی یہ ہیں کہ لوگ تمہارے متعلق ایسا گمان کرتے ہیں۔ اسی طرح آیت کریمہ:

﴿فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَفْسِكَ﴾ (۱۸-۶) تو شاید تم اپنے تئیں ہلاک کر دو گے۔

میں بھی لعل کا تعلق لوگوں سے ہے یعنی وہ یہ سمجھتے ہیں اور آیت کریمہ:

﴿وَاذْكُرُوا اللَّهَ كَثِيرًا لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ﴾ (۶۲-۱۰) کے معنی یہ ہیں کہ اللہ کو یاد کرو مگر دل میں یہ امید رکھ کر اللہ کا ذکر کرو کہ اس سے فلاح و کامرانی حاصل ہوگی جیسا کہ دوسری جگہ مومنین کے متعلق فرمایا:

﴿وَيَرْجُونَ رَحْمَتَهُ وَيَخَافُونَ عَذَابَهُ﴾ (۱۷-۹۷) کہ وہ اس کی رحمت کے امید وار رہتے ہیں اور اس کے عذاب سے خوف رکھتے ہیں۔

### (ل ع ن)

الْلَعْنُ: کسی کو ناراضگی کی بنا پر اپنے سے دور کر دینا اور دھتکار دینا۔ خدا کی طرف سے کسی شخص پر لعنت سے مراد یہ ہوتی ہے کہ وہ دنیا میں تو اللہ کی رحمت اور توفیق سے اثر پذیر ہونے سے محروم ہو جائے اور آخرت میں عقوبت کا مستحق قرار پائے اور انسان کی طرف سے کسی پر لعنت بھیجنے کے معنی بد دعا کے ہوتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿أَلَا لَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الظَّالِمِينَ﴾ (۱۱-۱۸) سن رکھو کہ ظالموں پر خدا کی لعنت ہے۔

① وایضاً راجع الآیات (۳۳-۶۱) (۱۵-۳۵) (۲-۸۸)

② وایضاً لاحظ الآية (۳۵-۳۵)

سَمِعُوا اللَّغْوَ أَعْرَضُوا عَنْهُ ﴿٢٨-٥٥﴾ اور جب بے ہودہ بات سنتے ہیں تو اس سے منہ پھیر لیتے ہیں۔  
﴿لَا يَسْمَعُونَ فِيهَا لَغْوًا وَلَا تَأْثِيمًا﴾  
(٢٥-٥٦) وہاں نہ بے ہودہ بات سنیں گے اور نہ الزام تراشی۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَإِذَا مَرُّوا بِاللَّغْوِ مَرُّوا كِرَامًا﴾ (٢٥-٤٣)  
اور جب ان کو بے ہودہ چیزوں کے پاس سے گزرنے کا اتفاق ہو تو شریفانہ انداز سے گزرتے ہیں۔ کہ معنی یہ ہیں کہ وہ فحش بات کبھی صراحت سے نہیں کہتے۔ بلکہ ہمیشہ کنایہ سے کام لیتے ہیں اور بعض نے اس کے یہ معنی کیے ہیں کہ اگر کہیں اتفاق سے وہ ایسی مجلس میں چلے جاتے ہیں جہاں بے ہودہ باتیں ہو رہی ہوتی ہیں تو اس سے دامن بچا کر نکل جاتے ہیں۔

پس لغو ہر اس بات کو کہا جاتا ہے جو کسی شمار قطار میں نہ ہو۔ اور اسی سے لَغْوٌ فِی الْإِيمَانِ ہے یعنی وہ قسم جو یونہی بلا ارادہ زبان سے نکل جائے ﴿چنانچہ قرآن میں ہے:

﴿لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللَّهُ بِاللَّغْوِ فِیْ أَيْمَانِكُمْ﴾  
(٢-٢٢٥) خدا تمہاری لغو قسموں پر تم سے مواخذہ نہیں کرے گا۔

اور شاعر نے کہا ہے ﴿البیط)

اور احمق ہے کہ اس نے میرے خط کو حقیر سمجھا یہاں لَغْوٌ کے معنی کمزور رائے آدمی کے ہیں۔ اس پر اعرابی سے کسی نے سوال کیا کہ کتاب تو نذر کر ہے پھر جَاءَتْهُ کیوں کہا تو اس نے جواب دیا أَلَيْسَ الْكِتَابُ بِصَحِيفَةٍ کہ کیا کتاب بھی ایک صحیفہ نہیں ہے (اور صحیفہ مونث ہے)

## (ل غ و)

اللَّغْوُ (ن) کے معنی بے معنی بات کے ہے جو کسی گنتی شمار میں نہ ہو یعنی جو سوچ سمجھ کرنے کی جائے۔ گویا وہ پرندوں کی آواز کی طرح منہ سے نکال دی جائے ابو عبیدہ کا قول ہے کہ اس میں ایک لغت لَغَا بھی ہے۔ جیسے عَيْنٌ وَعَابٌ شاعر نے کہا ﴿(الرجز)

(٣٩٣) عَنِ اللَّغَاوِ رَفِثَ التَّكْلِیمِ

جو بے ہودہ اور فحش گفتگو سے خاموش ہیں۔

اس کا فعل لَغَيْثٌ تَلَغَّى یعنی سَمِعَ سے ہے۔ اور کبھی ہر قبیح بات کو لغو کہہ دیا جاتا ہے چنانچہ قرآن میں ہے:

﴿لَا يَسْمَعُونَ فِيهَا لَغْوًا وَلَا كِذَّابًا﴾ (٤٨-٣٥)

وہاں نہ بیہودہ بات سنیں گے نہ جھوٹ اور خرافات

﴿وَالَّذِينَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُونَ﴾ (٣٢-٣)

اور جو بیہودہ باتوں سے اعراض کرتے ہیں۔ ﴿وَإِذَا

② وفي اللسان قاله رؤبة ونسبه ابن بري للعجاج وقوله: ورب اسراب حجيح كظم والشرطي القرطبي (٤٠٧/٢) وفي محاز القرآن (٧٠: ١) وفي ديوانه ٥٩ وابن ولاد (١١٢) والطبرسي (٢٣٣: ٢) والاقصاب (٤٦١) واللسان والتاج (رفث لغو) وشواهد الكشاف (٢٩٨) وابو علي الفارسي في الحجة (٢٦٢: ٢) وفي الانصاف ١٢٢ وصدرة: استغفر الرحمن ذا التعظيم ١٢۔  
② كذا فسيره ابن عباس وعكرمة والشعبي وروى مرفوعا عن عائشة قال ابو هريرة والحسن ومجاهد وآخرون اللغو في اليمين ان يحلف زاعما انه صادق ولا يكون كذلك وروى مرفوعا عن ابن عباس انه لا يمين في غضب (الطبري ج ٢ ص ٤٠٤-٤١٤)

③ قاله الفرزق روى ان الحسن سئل عن لغو اليمين فقال للفرزدق وعنى اجب وعنك يا ابا سعيد وانشد البيت من شواهد لكشاف ١١ والبحر (١٧٩: ٢) ومحاضرات المؤلف (٤٨١: ٢)۔

لَفَّ لَفْفُهُم: یعنی وہ اور ان کے سب متعلقین آئے۔ اور

آیت کریمہ:

﴿وَجَنَّتِ الْأَقْفَا﴾ (۷۸-۱۶) اور گھنے گھنے باغ میں  
الفاف سے ایک دوسرے سے متصل گھنے اور گنجان  
درختوں والے باغیچے مراد ہیں۔

الْتَفَّ ایک چیز کا دوسری سے لپٹ جانا قرآن پاک میں  
ہے:

الْأَلْفُ: وہ آدمی جس کی رانیں موٹاپے کی وجہ سے باہم  
ملی ہوئی ہوں اور بہت زیادہ بھاری جسم اور ست آدمی کو  
بھی الٹ کہا جاتا ہے۔ لَفَّ رَأْسَهُ: اس نے اپنے سر کو  
(کپڑوں میں) چھپالیا۔

الْلَفِيفُ: مختلف قبل کے ایک جگہ جمع ہونے والے لوگ  
اور خلیل نے ہر اس کلمے کا نام لفیف رکھا ہے جس کے  
حروف اصلی میں سے دو حرف علت ہوں۔

## (ل ف ت)

لَفَّتَهُ عَنْ كَذَا: کسی چیز سے پھیر دینا۔  
قرآن پاک میں ہے:

﴿أَجِئْنَا لِتَلْفِئْتَنَا﴾ (۷۸-۱۰) کیا تم ہمارے پاس اس  
لیے آئے ہو کہ (جس راہ پر ہم اپنے باپ دادا کو پاتے  
رہے ہیں اس سے ہم کو پھیر دو۔

اور اسی سے اِلْتَفَتَ فُلَانٌ ہے جس کے معنی رخ موڑنے  
کے ہیں۔ امْرَأَةٌ لَّفُوْتُ وہ عورت جو اپنے پہلے خاوند کے  
بچے سے محبت کرے اور دوسرے خاوند کی طرف توجہ نہ دے۔  
الْلَفِيَةُ: ایک قسم کا گاڑھا حریر۔

﴿۳۹۵﴾ وَلَسْتَ بِمَا خُوِذَ بِلُغْوِ تَقْوُلُهُ

إِذَا لَمْ تُعَمِّدْ عَاقِدَاتِ الْعَزَائِمِ

لغوتم کھانے پر تم سے مواخذہ نہیں ہوگا بشرطیکہ قصداً عزم  
قلب کے ساتھ تم نہ کھائی جائے۔ اور آیت کریمہ:

﴿لَا تَسْمَعُ فِيهَا لِأَغِيَةٍ﴾ (۸۸-۱۱) وہاں کسی طرح  
کی بکواس نہیں سنیں گے۔ میں لاغیۃ بمعنی لغو کے ہے  
اور یہ (اسم فاعل) کلام کی صفت واقع ہوا ہے جیسا کہ  
كَاذِبَةٌ وغیرہ۔

اور خومہا میں لغو اونٹ کے ان بچوں کو کہا جاتا ہے جو کنتی  
میں شمار نہ کیے جائیں۔ چنانچہ شاعر نے کہا ہے ❶  
(الوافر)

﴿۳۹۶﴾ كَمَا أَلْغَيْتَ فِي الدِّيَةِ الْحُورَ

جیسا کہ اونٹ کے چھوٹے بچے کو خومہا میں ناقابل شمار سمجھا  
جاتا ہے۔

لَغِيَ بِكَذَا کے معنی چڑیا کے چھپانے کی طرح کسی چیز کا  
بار بار تذکرہ کرنے کے ہوتے ہیں۔ اور اسی سے ہر گروہ  
کی زبان اور بولی جس کے ذریعے وہ بات کرتا ہے لُغَةٌ  
کہلاتی ہے۔

## (ل ف ف)

لَفَفْتُ الشَّيْءَ لَفًّا کے معنی ایک چیز کو  
دوسری چیز کے ساتھ ملا دینے اور مدغم کر دینے کے ہیں۔  
قرآن پاک میں ہے:

﴿جِئْنَا بِكُمْ لَفِيفًا﴾ (۱۰۴-۱۷) اور ہم تم سب کو جمع  
کر کے لے آئیں گے۔ اور محاورہ ہے: جَاءُوا وَمَنْ

❶ قاله ذوالرمة يهجو هشام بن قيس المرثي (أحد بنی امرئ القيس بن زيد مناة) وصدرة: وبهلك وسطها المرثي لغوا.....

قال في اللسان (لغو) وهذا البيت عمل له جرير وقد احسن به الفرزدق لما سمعه والبيت في الامالي (۲: ۱۳۷)

دادا کو پایا۔

## (ل ف ح)

﴿وَالْفَيَّا سَيِّدَهَا لَذَا الْبَابِ﴾ (۱۲-۲۵) اور دونوں نے دروازے کے پاس اس کے شوہر کو پایا۔

## (ل ق ب)

الَلَقْبُ: اس نام کو کہتے ہیں جو اصلی نام کے علاوہ ہو..... لقب دینے میں معنی کی رعایت کی جاتی ہے بخلاف اعلام کے کہ ان میں معنوی رعایت نہیں ہوتی اس بنا پر شاعر نے کہا ہے ﴿﴾

(۳۹۷) وَقَلَمًا أَبْصَرْتُ عَلَيْنَاكَ ذَالِقَبٍ

إِلَّا وَمَعْنَاهُ إِنَّ قَتَشْتَ فِي لَقْبِهِ

تم نے کسی صاحب لقب کو نہیں دیکھا ہوگا۔ مگر ذرا تلاش کرنے پر اس کے اوصاف اس کے لقب میں مل سکتے ہیں۔

لقب دو قسم پر ہے۔ ایک لقب تشریفی جیسا کہ سلاطین کے القاب ہوتے ہیں اور دوسرا لقب تحقیری چنانچہ آیت کریمہ: ﴿وَلَا تَنَابَزُوا بِالْأَلْقَابِ﴾ (۱۱-۴۹) اور نہ ایک دوسرے کا برا نام رکھو۔ میں اس دوسری قسم کے القاب سے منع کیا گیا ہے۔ کیونکہ ان سے اہانت کا پہلو نکلتا ہے۔

## (ل ق ح)

لَقِيَحَتِ النَّافَةُ تَلْقَحُ - لَقَحًا وَلَقَاحًا کے معنی اونٹنی کے حاملہ ہونے کے ہیں۔ اسی طرح درخت کے پھلدار ہونے پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے اور اَلْقَح کے

لَفَحَتُهُ الشَّمْسُ وَالسَّمُومُ کے معنی ہیں:

سورج یا بادِ سموم نے اپنی لپٹ سے جھلسا دیا۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿تَلْفَحُ وُجُوهُهُمْ النَّارُ﴾ (۱۰۴-۲۳) آگ ان کے چہروں کو جھلس دے گی۔

اور اسی سے استعارہ کے طور پر لَفَحَتُهُ بِالسَّيْفِ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔ جس کے معنی تلوار سے سر قلم کر دینا ہیں۔

## (ل ف ظ)

الَلْفُظُ بِالْكَلَامِ کے معنی کلام کرنا کے ہیں اور یہ لَفُظُ الشَّيْءِ مِنَ الْقَمِ يَلْفُظُ الرَّحَى بِالذَّقِيقِ کے محاورہ سے مستعار ہے۔ اسی سے مرغ کو لَا فِظَةً کہا جاتا ہے ﴿ کیونکہ وہ مرغی کے لیے چوگا ڈالتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿مَا يَلْفُظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ﴾ (۱۸-۵۰) کوئی بات اس کی زبان پر نہیں آتی مگر ایک نگہبان اس کے پاس تیار رہتا ہے۔

## (ل ف ی)

الْفَيْتُ کے معنی وَجَدْتُ یعنی کسی چیز کو پالینا

کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿بَلْ نَتَّبِعُ مَا آَلَفَيْنَا عَلَيْهِ أَبَاءُ نَا﴾ (۱۷-۲) بلکہ ہم تو اسی چیز کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ

① وفی المثل "اسمع من لافظة" الامالی (۲۴۴/۱) والسمط (۵۵۲) وتهذيب الالفاظ (۲۰۳) والعسكري (۴۴)، (۱۷/۱) لشكن بلفظ اسخى وفی الثمار (۳۷۴) والمستقصى والبخلاء (۱۳۵) لاقطة بالقاف وقيل اللافظة العنتر لانها تلفظ مافى فيها من العلف وقت الحلب والحيوان (۱۰/۷، ۲۲۰/۱) ولا نصيح الالحملة على الحازة البعيدة راجع الحيوان (۱۵۱-۱۴۹/۲)

② والبيت فى محاضرات الادباء (۳۳۷/۳) بغير عزو وفی رواية من رجل بدل ذالقب وفی اسم اولقب بدل ان فتشت فى لقبه۔

جادوگروں کے بنائے ہوئے سانپوں کو (ایک ایک کے) ننگے لگا۔

### (ل ق م)

﴿لَقْمَان﴾ (۱۲-۳۱) مشہور حکیم کا نام ہے ہو سکتا ہے کہ یہ بھی لَقِمْتُ الطَّعَامَ الْقِمَّةَ وَتَلَقَّمْتُهُ سے مشتق ہو جس کے معنی کسی چیز کو ہڑپ کر جانا کے ہیں۔ رَجُلٌ تَلَقَّامٌ: بڑے بڑے لقمے ننگے والا۔ اَللَّقِيمُ۔ لولا اور راستہ کی ایک جانب کو لَقِمَ کہا جاتا ہے۔

### (ل ق ی)

لَقِيَهُ (س) يَلْقَاهُ لِقَاءً کے معنی کسی کے سامنے آنے اور اسے پالینے کے ہیں اور ان دونوں معنی میں سے ہر ایک پر الگ الگ بھی بولا جاتا ہے اور کسی چیز کا حس اور بصیرت سے ادراک کر لینے کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَلَقَدْ كُنْتُمْ تَمْنُونَ الْوَيْتَ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَلْقَوْهُ﴾ (۱۲۳-۳) اور تم موت (شہادت) آنے سے پہلے اس کی تمنا کیا کرتے تھے۔

﴿لَقَدْ لَقِينَا مِنْ سَفَرِنَا هَذَا نَصَبًا﴾ (۶۲-۱۸) اس سفر سے ہم کو بہت تکان ہو گئی ہے۔

اور ملاقات الہی سے مراد قیامت کا بپا ہونا اور اللہ تعالیٰ کے پاس چلے جانا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَأَعْلَمُوا أَنَّكُمْ مُلْقَوَةٌ﴾ (۲۲۳-۲) اور جان رکھو کہ ایک دن تمہیں اس کے روبرو حاضر ہونا ہے۔ ﴿قَالَ الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُمْ مُلْقَوُوا اللَّهَ﴾ (۲۳۹-۲) جو

اَلْفَحْلُ النَّاقَةُ وَالرَّيْحُ السَّحَابُ کے معنی سائڈھ کے اونٹنی کو یا ہوا کے بادل کو باردار کرنے کے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَأَرْسَلْنَا الرِّيحَ لَوَاقِحَ﴾ (۲۲-۱۵) اور ہم ہی ہوائیں چلاتے ہیں۔ (جو بادلوں کے پانی سے) بھری ہوئی ہوتی ہیں۔

اَلْقَحْ فَلَانُ النَّحْلِ وَلَقَحَهَا: کھجور کو پیوند کرنا۔ اِسْتَلْقَحَتِ النَّحْلَةُ: کھجور پیوند کے لائق ہو گئی اور حاملہ اونٹنی کے ساتھ تشبیہ دے کر حَرْبٌ لَاقِحٌ کا محاورہ بھی استعمال ہوتا ہے جس کے معنی سخت لڑائی کے ہیں۔ جو اپنے ساتھ بہت مصائب لائے۔ لِقَحَةٌ: شیردار اونٹنی۔ ج لِقَاحٌ وَلَقَّحَ۔ اَلْمَلَا قِيْحُ: حاملہ اونٹنیاں۔

نیز بچوں کو بھی ملا قح کہا جاتا ہے۔ اور حدیث میں ہے ﴿نَهَى عَنْ بَيْعِ الْمِلَاقِحِ وَالْمِضَامِينِ﴾ (۱۱۱) نہی سے منع فرمایا۔ تو ملا قح کے معنی جنین کے ہیں اور مضامین نر کے مادہ منویہ کو کہتے ہیں۔ جو تاحال اس کی پشت میں محفوظ ہو۔ اَللِّقَاحُ: نر جانور کا مادہ منویہ۔ نیز لِقَاحُ اس آزاد قبیلہ کو بھی کہتے ہیں جو کسی بادشاہ کے زیر حکومت نہ ہو گویا وہ حامل ہے محمول نہیں ہے۔

### (ل ق ف)

لَقِفْتُ الشَّيْءَ اَلْقَفُّهُ وَتَلَقَّفْتُهُ کے معنی کسی چیز کو ہوشیاری اور خداقت سے لینا کے ہیں اور یہ منہ یا ہاتھ دونوں سے لینے پر بولا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿فَإِذَا هِيَ تَلْقَفُ مَا يَأْفِكُونَ﴾ (۱۱۷-۷) وہ فوراً

① رواہ الطبرانی عن ابن عباس رضی اللہ عنہ والحديث في الفائق (۲۲۸/۲) وغريب ابی عبيد (۲۰۷/۱) وايضاً الفتح الكبير للبيهقي (۲۷۹/۳)

وہاں ان کا استقبال دعا و سلام کے ساتھ کیا جائے گا۔  
﴿وَلَقَدْهُمْ نَصْرَةٌ وَسُورٌ﴾ (۷۶-۱۱) اور تازگی اور  
شادمانی سے ہمکنار فرمائے گا۔

تَلَقَّاهُ کے معنی کسی چیز کو پالینے یا اس کے سامنے آنے کے  
ہیں۔ جیسے فرمایا:

﴿وَتَلَقَّيْنَاهُمُ الْمَلَائِكَةُ﴾ (۲۱-۱۰۳) اور فرشتے ان کو  
لینے آئیں گے۔

﴿وَأَنَّكَ لَتَلَقَّيَ الْقُرْآنَ﴾ (۲۷-۶) اور تم کو قرآن  
عطا کیا جاتا ہے۔

الْإِبْقَاءُ: (افعال) کے معنی کسی چیز کو اس طرح ڈال دینا  
کے ہیں کہ وہ دوسرے کو سامنے نظر آئے پھر عرف میں  
مطلق کسی چیز کو بھینک دینے پر التاء کا لفظ بولا جاتا ہے۔  
قرآن میں ہے:

﴿وَكَذَلِكَ أَلْقَى السَّامِرِيُّ﴾ (۲۰-۷۸) اور اسی  
طرح سامری نے ڈال دیا۔

﴿قَالُوا يَمُوسَى إِمَّا أَنْ تُلْقَى وَإِمَّا أَنْ نَكُونَ  
نَحْنُ الْمُلْقِينَ قَالَ أَلْقُوا﴾ (۷-۱۱۵-۱۱۶) تو  
جادو گروں نے کہا کہ موسیٰ یا تو تم جادو کی چیز ڈالو یا ہم  
ڈالتے ہیں۔ موسیٰ نے کہا تم ہی ڈالو۔

﴿قَالَ أَلْقِهَا يَمُوسَى فَأَلْقَاهَا﴾ (۲۰-۱۹) فرمایا کہ  
موسیٰ! اسے ڈال دو تو انہوں نے اس کو ڈال دیا۔  
﴿فَلْيُلْقِ الْيَمُّ بِالسَّاحِلِ﴾ (۲۰-۳۹) تو دریا اس کو  
کنارے پر ڈال دے گا۔

﴿إِذَا أَلْقُوا فِيهَا﴾ (۶۷-۷) جب وہ اس میں ڈالے  
جائیں گے۔

لوگ یقین رکھتے تھے کہ ان کو خدا کے رو برو حاضر ہونا ہے  
وہ کہنے لگے۔ اور لِقَاءَ (مصدر) ملاقات کے ہم معنی  
ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿وَقَالَ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا﴾ (۲۵-۲۱) اور  
جو لوگ ہم سے ملنے کی امید نہیں رکھتے۔

﴿إِلَىٰ رَبِّكَ كَذْحًا فَمُلَاقِيهِ﴾ (۸۳-۶) اپنے  
پروردگار کی طرف پہنچنے میں خوب کوشش کرتا ہے سو اس  
سے جا ملے گا۔ اور آیت کریمہ:

﴿فَذُوقُوا بِمَا نَسِيتُمْ لِقَاءَ يَوْمِكُمْ هَذَا﴾  
(۳۲-۱۴) کے معنی یہ ہیں کہ تم نے قیامت کے دن اور

حشر و نشر کو بھلا رکھا تھا اور ﴿يَوْمَ التَّلَاقِ﴾ (۴۰-۱۵)  
سے قیامت کا دن مراد ہے اور قیامت کے دن کو يَوْمَ  
التَّلَاقِ اس لیے کہا گیا ہے کہ اس روز سب سے اگلے

اور پچھلے یا اہل سماء اور اہل ارض ایک دوسرے کے سامنے  
آجائیں گے۔ نیز اس روز ہر شخص اپنے اعمال کے نتائج کو  
پالے گا۔ لَقِيَ فُلَانٌ خَيْرًا أَوْ شَرًّا فلاں نے خیر یا  
شر کو پایا۔ شاعر نے کہا ہے۔<sup>①</sup> (الویل)

(۳۹۸) فَمَنْ يَلْقَ خَيْرًا يَحْمَدِ النَّاسُ أَمْرَهُ  
جو شخص خیر کو پالیتا ہے لوگ اس کی تعریف کرتے ہیں۔  
دوسرے شاعر نے کہا ہے۔

(۳۹۹) وَتَلَقَّى السَّمَاحَةُ مِنْهُ وَالنَّدَىٰ خُلُقًا  
سحابات اور بخشش کرنا اس کی طبیعت ثانیہ بن چکی ہے۔

لَقِيْتُهُ بِكَذَا: میں فلاں چیز کے ساتھ اس کے سامنے  
پہنچا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَيُلْقُونَ فِيهَا تَحِيَّةً وَسَلَامًا﴾ (۲۵-۷۵) اور

① قاله المرقش الاصغر وتماه: ومن يغولا يعدم على الغي لائما۔ وقد مرت تحريره، في (غ و ي)

کے غلبہ کو دیکھ کر وہ سجدہ ریز ہونے پر مجبور ہو گئے تھے۔ اور انہیں اس کے سوا کوئی چارہ نظر نہ آتا تھا۔

### (لَم) (حرف)

لَمْ - کے بعد اگر چہ فعل مستقبل آتا ہے لیکن معنوی اعتبار سے وہ اسے ماضی منفی بنا دیتا ہے اور اس پر ہمزہ استفہام تقریر کے لیے آتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿الَمْ نُرَبِّكَ فِينَا وَلَيْذَا﴾ (۱۸-۲۶) کیا ہم نے لڑکپن میں تمہاری پرورش نہیں کی تھی۔

﴿الَمْ يَجِدْكَ يَتِيمًا فَآوَى﴾ (۶-۹۳) بھلا اس نے تمہیں یتیم پا کر جگہ نہیں دی۔ بے شک دی

### (لَمَّا) (حرف)

یہ دو طرح پر استعمال ہوتا ہے زمانہ ماضی میں کسی فعل کی نفی اور اس کے قریب الوقوع ہونے کے لیے جیسے فرمایا:

﴿وَلَمَّا يَعْلَمِ اللَّهُ الَّذِينَ جَاهَدُوا مِنْكُمْ﴾ (۱۳۲-۳) حالانکہ ابھی خدا نے تم میں جہاد کرنے والوں کو اچھی طرح معلوم کیا ہی نہیں۔

اور کبھی یہ اسم ظرف کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ اور یہ قرآن پاک میں بکثرت آیا ہے۔ جیسے فرمایا: ﴿فَلَمَّا أَنْ جَاءَ الْبَشِيرُ﴾ (۹۶-۱۲) جب خوشخبری دینے والا آ پہنچا۔

### (لَمْ م)

لَمَمْتُ الشَّيْءَ کے معنی کسی چیز کو جمع کرنے اور اس کی اصلاح کرنے کے ہیں۔ اسی سے لُحْمُ شَعْبَةٍ کا محاورہ ہے جس کے معنی کسی کی پراگندہ حالت کو سنوارنے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿كَلَّمَا أَلْقَىٰ فِيهَا فَوْجٌ﴾ (۸-۶۷) جب اس میں..... کوئی جماعت ڈالی جائے گی۔ اور آیت: ﴿وَأَلْقَتْ

مَا فِيهَا وَتَخَلَّتْ﴾ (۴-۸۱) اور جو کچھ اس میں ہے اسے نکال کر باہر ڈال دے گی۔ اور بالکل خالی ہو جائے گی۔ دوسری آیت: ﴿وَإِذَا الْقُبُورُ بُعْثِرَتْ﴾ (۴-۸۱) اور جب قبریں الٹ پلٹ کر دی جائیں گی۔

کے ہم معنی ہے۔ اَلْقَيْتُ إِلَيْكَ قَوْلًا وَسَلَامًا وَكَلَامًا وَمَوَدَّةً کے معنی ہیں۔ تجھ سے کوئی بات کی یا سلام و کلام کیا یا دوستی بڑھائی۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿تُلْقُونَ إِلَيْهِم بِالْمَوَدَّةِ﴾ (۱-۶۰) تم ان کو دوستی کے پیغام بھیجتے ہو۔ ﴿فَالْقُوا إِلَيْهِمُ الْقَوْلَ﴾ (۱۶-۶۸) تو وہ ان سے کہیں گے۔

﴿وَالْقُوا إِلَى اللَّهِ يَوْمَئِذٍ السَّلَامَ﴾ (۱۶-۸۷) اور اس دن خدا کے سامنے سرنگوں ہو جائیں گے اور آیت کریمہ:

﴿إِنَّا سَنُلْقِي عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيلًا﴾ (۵-۷۳) ہم عنقریب تم پر ایک بھاری فرمان نازل کریں گے۔

میں وحی اور نبوت کے اس بوجھ کی طرف اشارہ ہے۔ جو آپ پر ڈالا گیا تھا۔ اور آیت کریمہ: ﴿أَوَ أَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيدٌ﴾ (۵۰-۳۷) یا دل سے متوجہ ہو کر سنتا ہے۔

میں اَلْقَاءَ سَمْعٍ سے کان لگا کر سننا مراد ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿فَالْقَى السَّحَرَةُ سُجَّدًا﴾ (۷۰-۷۰) تو جادوگر سجدے میں گر پڑے۔

میں فعل مجہول لا کر اس بات پر متنبہ کیا گیا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام

کرنا۔ اس پر عیب چینی کرنا کے ہیں۔ کہا جاتا ہے۔  
لَمَزَةٌ يَلْمِزُهُ وَيَلْمِزُهُ: یعنی یہ باب ضرب اور نصر دونوں  
سے آتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَمِنْهُمْ مَّنْ  
يَلْمِزُكَ فِي الصَّدَقَاتِ﴾ (۹-۵۸) اور ان میں بعض  
ایسے بھی ہیں کہ تقسیم صدقات میں تم پر طعن زنی کرتے  
ہیں۔ ﴿الَّذِينَ يَلْمِزُونَ الْمُطَّوِّعِينَ.....﴾  
(۹-۷۹) جو رضا کارانہ خیرات کرنے والوں پر طعن و  
..... طعن کرتے ہیں۔

﴿وَلَا تَلْمِزُوا أَنْفُسَكُمْ﴾ (۱۱-۳۹) اور اپنے  
(مومن بھائیوں) پر عیب نہ لگاؤ۔

یعنی دوسروں پر عیب نہ لگاؤ ورنہ وہ تم پر عیب لگائیں گے۔  
اسی طرح گویا تم اپنے آپ پر عیب لگاتے ہو۔  
رَجُلٌ لَّمَّازٌ وَلَمَزَةٌ: بہت زیادہ عیب جوئی اور طعن و طعن  
کرنے والا۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَيْسَلُ لِكُلِّ  
هُمَزَةٍ لُّمَزَةٌ﴾ (۱۰۳-۱) ہر طعن آمیز آشارتیں کرنے  
والے بخلخواری خرابی ہے۔

### (ل م س)

الْلَّمْسُ (ن) مَسٌّ کی طرح اس کے معنی  
بھی اعضاء کی بالائی کھال کے ساتھ کسی چیز کو چھو کر اس کا  
ادراک کر لینا کے ہیں۔ پھر مطلق کسی چیز کی طلب کرنے  
کے معنی میں آتا ہے۔ شاعر نے کہا ہے ﴿مَجْرُ وَالْوَاغِرِ﴾  
(۴۰۰) اَلْمِسُّ فَلَا اَجْدُهُ

میں اسے تلاش کرتا ہوں مگر وہ ملتا نہیں۔ قرآن پاک میں ہے:  
﴿وَاِنَّا لَمَسْنَا السَّمَاءَ﴾ (۲-۸) اور یہ کہ ہم نے

﴿وَتَأْكُلُونَ التُّرَاثَ أَكْثَلًا لَّمَّا﴾ (۸۹-۱۹) اور  
میراث کے مال کو سمیٹ کر کھا جاتے ہو اللہ کے اصل معنی  
معصیت کے قریب جانے کے ہیں کبھی اس سے صغیرہ  
گناہ بھی مراد لیے جاتے ہیں محاورہ ہے:  
فَلَانٌ يَفْعَلُ كَذَا لَمَمًا: وہ کبھی کبھار یہ کام کرتا ہے۔  
اور آیت کریمہ:

﴿الَّذِينَ يَجْتَنِبُونَ كَبَائِرَ الْإِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ إِلَّا  
اللَّيْمَ﴾ (۵۳-۳۲) جو صغیرہ گناہوں کے سوا بڑے بڑے  
گناہوں اور بے حیائی کی باتوں سے اجتناب کرتے ہیں۔  
میں لَمَمٌ کا لفظ اَلَمَمْتُ بِكَذَا سے مشتق ہے۔ جس  
کے معنی کسی چیز کے قریب جانا کے ہیں یعنی ارادہ کرنا مگر  
مرتب نہ ہونا۔ نیز محاورہ ہے۔

زِيَارَتُهُ اِلْمَامُ: یعنی اس کی زیارت مختصر ہوتی ہے۔

### (ل م ج)

اَلْلَمْحُ کے معنی بجلی کی چمک کے ہیں۔ محاورہ  
ہے۔

رَأَيْتُ لَمَحَةَ الْبَرْقِ میں نے اسے بجلی کی چمک کی  
طرح ایک جھلک دیکھا۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿كَلَمَحٍ  
بِالْبَصْرِ﴾ (۵۴-۵۰) آنکھ کے جھپکنے کی طرح۔ اور  
محاورہ ہے:

لَا رِيْسَنَكَ لَمَحًا بِأَصْرًا: میں تمہیں صاف طور پر دکھلا  
دوں گا۔ تم پر حقیقت کھول دوں گا۔

### (ل م ز)

لَمَزَةٌ (ض ن) لَمَزَا کے معنی کسی کی غیبت

① قاله اعرابي في رثاء ابن له في سنة وهذا خامسه وصدره الام على تبكيه والبيت في الحماسة المرزوقي ۳۰۲ واللسان  
(لمس) والبيت من شواهد الكشف ۱۳۷ وبعده: وكيف يلام محزون كبير فاته ولد.



آسان کوٹولا۔

بولا جاتا ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿تَبَّتْ يَدَا أَبِي لَهَبٍ وَتَبَّ﴾ (۱۱۱-۱) ابولہب کے ہاتھ ٹوٹیں اور وہ ہلاک ہو۔

اور لَمَسِ اور مَلَمَسَ کے معنی کنایتہ جماع کے بھی آتے ہیں۔ اور آیت کریمہ:

﴿أَوَلَمْ تَسْتُمِ النِّسَاءَ﴾ (۶-۵) یا تم نے عورتوں سے مباشرت کی ہو۔

میں بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہاں ابولہب کے لفظ سے اس کی کنیت ..... مراد نہیں ہے۔ جس کے ساتھ وہ مشہور تھا۔ بلکہ اس سے اس کے دوزخی ہونے کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے لہذا یہاں اس نام سے اسے موسوم کرنا ایسے ہی ہے۔ جیسا کہ لڑائی بھڑکانے والے اور ہمیشہ لڑنے والے کو أَبُو الْحَرْبِ یا أَخُو الْحَرْبِ کہا جاتا ہے۔ فَرَسٌ مُلْهَبٌ: برق رفتار گھوڑا گویا وہ بھڑکتی ہوئی آگ ہے۔ اس سے اَلْهُوبُ ہے جس کے معنی سخت دوڑ کے ہیں۔

میں ایک قراءت لَمَسْتُمِ النِّسَاءَ بھی ہے اس لئے بعض نے اس سے مطلق ہاتھ لگانا اور بعض نے جماعت کرنا مراد لیا ہے ۱ اور حدیث میں ہے ۲ ((انہ نہی عن الملاسة)) کہ آنحضرتؐ نے بیع ملاسة سے منع فرمایا۔ اور بیع ملاسة کی صورت یہ ہے کہ بائع یا مشتری دوسرے سے کہے کہ جب ہم سے کوئی دوسرے کا کپڑا چھو لے گا تو بیع واجب ہو جائے گی۔

الماسة: معمولی حاجت۔

## (ل ه ب)

اَللَّهَبُ: آگ کا شعلہ۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَلَا يُغْنِي مِنَ اللَّهَبِ﴾ (۷۷-۳۱) اور نہ لپٹ سے بچائے گا۔

﴿سَيَصْلَى نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ﴾ (۱۱۱-۳) وہ جلد بھڑکتی ہوئی آگ میں جلے گا۔

اَللَّهَبُ: شعلہ۔ اور لَهَبٌ کا لفظ دھوئیں اور غبار پر بھی

## (ل ه ث)

لَهَتْ (س) يَلْهَتْ لَهْتَ: سخت پیاس کی وجہ سے زبان باہر نکالنا۔

ابن درید کہتے ہیں ۱ کہ لَهَتْ کا لفظ در ماندگی اور پیاس دونوں کے مجموعہ پر بولا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿كَمْثَل الْكَلْبِ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَتْ اَوْ

① ذهب الى الاول عمر بن الخطاب وابن مسعود والشعبي وعطاء واختاره الشافعي والى الثاني علي وابن عباس ومجاهد والسدي وقاعدة واختاره ابو حنيفة وابو علي الجبائي من المعتزلة وفي الطبرسي (۱۱۳/۵): قصة العرب والسناني واختلافهم في معنى الآية فقال ابن عباس غلبت الموالي المراد به الجماع ورجحه الطبرسي من الامامية۔

② منفق عليه من حديث ابی سعيد وعن انس في البخاری وعن ابی هريرة رضى الله عنه في السنائي ومسلم وله ثلاث صورو ما ذكره المؤلف منقول عن الزهري وابی هريرة قال في الفتح و تفسير ابی هريرة اقعد انظر النيل (۱۵۹-۱۶۰)

③ هو ابوبكر محمد بن الحسن بن وريد الحماعی صاحب الحمهرة في اللغة ولد ۲۲۳ھ وتوفي ۳۲۱ھ انظر لتراجمه الفهرست ابن ندیم (۹۷-۹۸) وبغية الوطاة للسيوطی (۳۳۰) وامالي الفاي (۲۷۹/۲) وكشف الظنون (۱۹۸۰/۲) و لکتابه (الحمهرة عدة نسخ والحجة هي نسخة عبيد الله بن عبد الله ۱۲۔

## (ل ھ و)

اللَّهُو: ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو انسان کو اہم کاموں سے ہٹائے اور باز رکھے یہ لَہَوْتُ بِكَذِّ اَوْ لَہَيْتُ عَنْ كَذَا سے اسم ہے جس کے معنی کسی مقصد سے ہٹ کر بے سود کام میں لگ جانا کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿أَنَّمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَلَهْوٌ﴾ (۵۷-۲۰) جان رکھو کہ دنیا کی زندگی تو کھیل اور تماشا ہے۔

پھر ہر وہ چیز جس سے کچھ لذت اور فائدہ حاصل ہو اسے بھی لَہَوٌ کہہ دیا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿لَوْ أَرَدْنَا أَنْ نَتَّخِذَ لَهْوًا لَا تَخَذُ مِنْهُ مِنْ لَدُنَّا﴾ (۲۱-۱۷) اگر ہم چاہتے کہ کھیل بنائیں تو ہم اپنے پاس سے بنالیتے۔

اور جن مفسرین نے یہاں لَہَوٌ سے مراد عورت یا اولاد لی ہے انہوں نے دنیاوی آرائش کی بعض چیزوں کی تخصیص کی ہے جو لہو و لعب بنالی گئی ہیں ۵ محاورہ ہے:

الْهَاهُ كَذَا: یعنی اسے فلاں چیز نے اہم کام سے مشغول کر دیا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿الْهَكُمُ التَّكَاثُرُ﴾ (۱۰۲-۱) لوگو! تم کو کثرت مال و جاہ و اولاد کی خواہش نے غافل کر دیا۔ ﴿رَجَالٌ لَا تُلْمِيهِمْ تِجَارَةٌ وَلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ﴾ (۲۳-۳۷) یعنی ایسے لوگ جن کو خدا کے ذکر سے نہ سوداگری غافل کرتی ہے اور نہ خرید و فروخت۔

اس آیت سے تجارت کی ممانعت یا کراہت بیان کرنا

تَنْرُكُهُ يَنْلَهْتُ ﴿ (۷-۱۷۶) تو اس کی مثال کتے کی سی ہوگی کہ اگر سختی کرو تو زبان نکالے رہے اور یوں ہی چھوڑ دو تو بھی زبان نکالے رہے۔

## (ل ھ م)

الْإِلَهَامُ: (افعال) کے معنی کسی کے دل میں کوئی بات القا کر دینا کے ہیں۔ لیکن یہ لفظ ایسی بات کے القاء کے ساتھ مخصوص ہو چکا ہے جو اللہ تعالیٰ یا ملاء علی کی جانب سے کسی کے دل میں ڈالی جاتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَالْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا﴾ (۹۱-۸) پھر اس کو بدکاری (سے بچنے) اور پرہیزگاری (کرنے) کی سمجھ دی۔

اور اس کو لَمَّةُ الْمَلِكِ يَنْفُثُ فِي الرُّوحِ سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ﴿۱۱۳﴾ ((إِنَّ لِلْمَلِكِ لَمَّةً وَلِلشَّيْطَانِ لَمَةً)) کہ ایک لَمَّة فرشتے کا ہے اور ایک لَمَّة شیطان کا ہے۔ اور ایک دوسری حدیث میں فرمایا ﴿۱۱۴﴾ ((إِنَّ رُوحَ الْقُدُسِ نَفَثَ فِي رَوْعِي)) کہ روح القدس نے میرے دل میں یہ بت ڈال دی۔

اصل میں یہ الْإِلَهَامُ الشَّيْءُ سے ماخوذ ہے۔ جس کے معنی کسی چیز کو نگل جانا کے ہیں چنانچہ محاورہ ہے: التَّهَمَ الْفَصِيلُ مَا فِي الضَّرْعِ۔ کہ اونٹنی کے بچے نے تھنوں سے تمام دودھ چوس لیا۔ فَرَسَ لَهْمٌ: تیز رو گھوڑا۔ گویا وہ اپنی تیز روی سے زمین کو نگل رہا ہے۔

① زوائد ابن حبان رقم (۴۰) من حدیث عبد اللہ ۱۲۔

② رواہ البيهقي وفي شرح السنة راجع لتخریجه (روح)

③ قاله قتادة والحسن: إلهوا المرأة وقال ابن عباس رضي الله عنه هو الولد راجع الطبری والدر وفي الروح لكن حمله على العموم أولى (۱۷/۱۹) قارن المشكل للقبتي (۱۲۳-۱۲۴)۔

اور لوح لکڑی وغیرہ کی اس تختی کو بھی کہتے ہیں جس پر کچھ لکھا جاتا ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿فِي لَوْحٍ مَّحْفُوظٍ﴾ (۸۵-۲۲) لوح محفوظ میں۔

میں لوح محفوظ کی اصل کیفیت کو ہم اسی قدر جان سکتے ہیں جو احادیث میں مروی ہے اس کو دوسری آیت میں کتاب سے تعبیر کیا گیا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿إِنَّ ذَلِكَ فِي كِتَابٍ إِنَّ ذَلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ﴾ (۲۲-۷۰) بے شک یہ کتاب میں لکھا ہوا ہے بے شک یہ کتب خدا کو آسان ہے۔

اللَّوْحُ کے معنی پیاس کے ہیں۔ اور جس چوپایہ کو جلدی پیاس لگتی ہو اسے دَابَّةٌ وَلَوْاحٌ کہا جاتا ہے۔ اور لوح (ضمہ لام کے ساتھ) آسمان اور زمین کے درمیانی خلا کو بھی کہتے ہیں لیکن اکثر علمائے لغت کے نزدیک فتح لام کے ساتھ بمعنی پیاس کے ہے اور ضمہ لام کے ساتھ زمین و آسمان کے درمیانی خلا کے معنی میں آتا ہے گو اس میں فتح لام بھی جائز ہے۔

لَوْحُهُ الْحَرُّ: اسے گرمی نے جھلس دیا۔  
لَا حَ الْحَرُّ لَوْحًا گرمی فضا میں پھیل گئی۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ لَمَحَ کی طرح ہے اور الْأَحَ بِسَيْفِهِ کے معنی ہیں اس نے تلوار سے اشارہ کیا۔

## (ل و ذ)

لَاوَذَ (مفاعله) بِكَذَا لَوْأَذًا وَمَلَاوَرَةً کے معنی کسی چیز کی آڑ لینا اور اس کے پیچھے چھپ جانا ہیں۔ پس آیت کریمہ:

﴿قَدْ يَعْلَمُ اللَّهُ الَّذِينَ يَتَسَلَّلُونَ مِنْكُمْ لِوَاذًا﴾ (۲۴-۶۳) کے معنی یہ ہیں کہ خدا کو وہ لوگ خوب معلوم

مقصود نہیں ہے۔ بلکہ اس میں پروانہ وار مشغول ہو کر نماز اور دیگر عبادات سے غافل ہونے کی مذمت کی طرف اشارہ ہے نفس تجارت کو قرآن پاک نے فائدہ مند اور فضل الہی سے تعبیر کیا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿لِيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ﴾ (۲۲-۲۸) تاکہ اپنے فائدے کے کاموں کے لیے حاضر ہوں۔

﴿لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَبْتَغُوا فَضْلًا مِّن رِّبِّكُمْ﴾ (۲-۱۹۸) اس کا تمہیں کچھ گناہ نہیں کہ (جج کے دنوں میں بذریعہ تجارت) اپنے پروردگار سے روزی طلب کرو۔

اور آیت کریمہ:

﴿لَا هِيَةَ قُلُوبُهُمْ﴾ (۲۱-۳) ان کے دل غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔ کے معنی یہ ہیں کہ ان کے دل غافل ہو کر بیکار کاموں میں مشغول ہیں۔

الْهَوَةُ: آنا پیتے وقت چکی میں ایک مرتبہ جتنی مقدار میں غلہ ڈالا جائے۔ اسے لَهْوَةٌ کہا جاتا ہے اس کی جمع لِهَاءٌ آتی ہے۔ پھر تشبیہ کے طور پر عطیہ کو بھی لَهْوَةٌ کہہ دیتے ہیں۔

الْهَاءُ: (حلق کا کو) وہ گوشت جو حلق میں لٹکا ہوا نظر آتا ہے۔ بعض نے اس کے معنی منہ کا آخری سرا بھی کیے ہیں۔

## (ل و ح)

اللَّوْحُ: تختہ (کشتی وغیرہ کا) اس کی جمع الواح ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَحَمَلْنَاهُ عَلَى ذَاتِ الْوَاحِ وَدُسِّرُ﴾ (۵۴-۱۳) اور ہم نے نوح علیہ السلام کو ایک کشتی پر جو تختوں اور میخوں سے تیار کی گئی تھی سوار کر لیا۔

﴿فَلَا تَلْمُزْهُمْ وَتَلْمُزْهُمْ وَتَلْمُزْهُمْ وَتَلْمُزْهُمْ﴾ (۲۲-۱۳) تو آج مجھے ملامت نہ کرو اپنے آپ ہی کو ملامت کرو۔

﴿فَذَلِكُنَّ الَّذِي لُمْتُنِنِي فِيهِ﴾ (۳۲-۱۲) یہ وہی ہے جس کے بارے میں تم مجھے طعن دیتی تھیں۔

﴿وَلَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ﴾ (۵۳-۵) اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈریں۔

اور مَلُومٌ (ملامت کیا ہوا) صفت مفعولی ہے اور آیت کریمہ:

﴿فَلَا تَلْمُزْهُمْ غَيْرُ مَلُومِينَ﴾ (۶-۲۳) ان سے مباحثت کرنے میں انہیں ملامت نہیں ہے۔ میں تنبیہ کی ہے کہ جب ان پر ملامت ہی نہیں ہے۔ تو اس سے زیادہ سرزنش کے وہ بالائی مستحق نہیں ہیں۔

آلَامٌ: مستحق ملامت ہونا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَتَبَدَّلْنَا هُمُومَ فِي الْيَمِّ وَهُوَ مُلِيمٌ﴾ (۴۰-۵۱) تو ان کو دریا میں پھینک دیا اور وہ کام ہی قابل ملامت کرتا تھا۔

الْتَّلَاوُمُ: ایک دوسرے کو ملامت کرنا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَأَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلَى بَعْضٍ يَتَلَوَمُونَ﴾ (۳۰-۶۸) پھر لگے ایک دوسرے کو رو در رو ملامت کرنے۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَلَا أُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ﴾ (۲-۷۵) اور نفس لوامہ کی قسم۔ کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے۔ کہ نفس لوامہ سے مراد نفس ہے جس نے کچھ فضائل حاصل کر لیے ہوں اور کسی غلطی کے ارتکاب پر صاحب نفس کو ملامت کرے۔

اس لحاظ سے لوامہ کا درجہ مطمئنہ سے کم ہوگا بعض نے کہا

ہیں جو تم میں سے ایک دوسرے کی آڑ اور پناہ لے کر یکے بعد دیگرے کھسک کر نکل جاتے ہیں اور یہاں لَوَاذًا لَا وَذًا (مفاعله) کا مصدر ہے کیونکہ اگر یہ لا ذ (ن) کا مصدر ہوتا تو لَوَاذًا (بالياء) آنا چاہیے تھا۔ اس لیے کہ لا ذًا لَيَاذًا کہا جاتا ہے۔ اَلَلُوذُ: پہاڑ کا کنارہ۔

## (ل و ط)

لُوطٌ: حضرت لوط علیہ السلام (یہ اسم علم ہے اور لا ط الشئ بِقَلْبِي يَلُوطُ لُوطًا وَلَيْطًا سے مشتق ہے جس کے معنی کسی چیز کی محبت دل میں جاگزیں اور پیوست ہو جانے کے ہیں۔ حدیث میں ہے ❶ (۱۱۵) ((اَللَّوْطُ اَللَّوْطُ بِالْكَيْدِ)) کہ اولاد سے جگری محبت ہوتی ہے۔

هَذَا اَمْرٌ لَا يَلْتَأُطُ بِصَفَرِي: یہ بات میرے دل کو نہیں کھاتی۔

لُطْتُ الْحَوْضَ بِالطَّيْنِ لُوطًا: میں نے حوض پر کھگل کی۔ گارے سے پلتر کیا۔..... حضرت لوط علیہ السلام کے نام سے اشتقاق کر کے تَلَوَطَ فُلَانٌ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے ❷ جس کے معنی خلاف فطرت فعل کرنا ہیں حالانکہ حضرت لوط علیہ السلام تو اس فعل سے منع کرتے تھے اور اسے قوم لوط سے مشتق نہیں کیا گیا جو اس کا ارتکاب کرتے تھے۔

## (ل و م)

لُمْتُهُ: (ن) لَوْمًا کے معنی کسی کو برے فعل کے ارتکاب پر برا بھلا کہنے اور ملامت کرنے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

❶ حدیث ابی بکر فی الجامع الکبیر مسند ابی بکر رقم (۵۳۴) والفاظ (۴۷۹/۲) وغریب ابی عبید (۲۲۲/۲) والحديث ذكره الماوردی فی ادبه ص (۲۶۳)۔

❷ ولا يخفى ان الكلمة قبيحة لان فيه نسبة السوء فالاولى ماورد وفي الحديث عمل قوم لوط فليستعمل هذه۔

نظر آتا ہے۔ اس سے خدا کی وسیع قدرت پر تنبیہ کی گئی ہے۔ اور کبھی الوان سے کسی چیز کے انواع و اقسام مراد ہوتے ہیں۔ چنانچہ محاورہ ہے۔ فُلَانٌ اَتٰی بِاَلْوَانٍ مِّنَ الْاَحَادِیْثِ اس نے رنگارنگ کی باتیں کیں اور اَلْوَانٌ مِّنَ الطَّعَامِ سے مراد ہیں قلم قسم کے کھانے۔

### (لوی)

لَوٰی (ض) الْجَبَلُ یَلْوِیْہُ لَیًّا کے معنی ری بٹنے کے ہیں۔ لَوٰی یَدُّہُ: اس کے ہاتھ کو موڑا لَوٰی رَاسُہُ وَبَرَّاسِہُ اس نے اپنا سر پھیر لیا یعنی اعراض کیا ۵۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے: ﴿لَوَّارُءٌ وَسَهْمٌ﴾ (۵۶-۵) تو سر پھیر لیتے ہیں لَوٰی لِسَانُہُ بِکَذًا: کناہیہ ہوتا ہے جھوٹ بولنے اور اٹکل بچو کی باتیں بنانے سے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿یَلْوُنَ اَلْسِنَتَہُمْ بِاَلْکِتٰبِ﴾ (۷۸-۳) کتاب (توراة) کو زبان موڑ کر پڑھتے ہیں۔

﴿لَیًّا بِاَلْسِنَتَہُمْ﴾ (۳۶-۳) زبان کو موڑ کر۔ محاورہ ہے۔ فُلَانٌ لَا یَلْوِیْ عَلٰی اَحَدٍ: وہ کسی کی طرف گردن موڑ کر بھی نہیں دیکھتا۔ یہ سخت ہزیمت کھا کر بھاگ اٹھنے کے موقع پر بولا جاتا ہے۔ جیسے فرمایا: ﴿اِذْ تَصْعَدُوْنَ وَلَا تَلْوُنَ عَلٰی اَحَدٍ﴾ (۱۵۳-۳) جب تم لوگ دور بھاگے جاتے تھے۔ اور کسی کو پیچھے پھر کر نہیں دیکھتے تھے۔ چنانچہ شاعر نے اس معنی کو یوں ادا کیا ہے ۵ (الکامل)

ہے کہ نفس لواہ اس نفس کو کہتے ہیں۔ جو بذات خود مطمئن ہو۔ علاوہ ازیں اس میں دوسروں کو تادیب کرنے کی صلاحیت بھی پیدا ہو چکی ہو۔ اس لحاظ سے یہ نفس مطمئن سے افضل ہوگا رَجُلٌ لَّوْمَةٌ: وہ شخص جو دوسروں کو ملامت کرے مگر لَوْمَةٌ (بسکون واؤ) وہ ہے جسے لوگ ملامت کرتے ہوں۔

جیسا کہ سُخْرَةٌ وَسُخْرَةٌ اور هُزْءَةٌ وَهُزْءَةٌ میں فرق پایا جاتا ہے اَللَّوْمَةُ: کے معنی ملامت کے ہیں۔ اور لَا اِثْمَةَ اس فعل کو کہتے ہیں۔ جس کا ارتکاب کرنے پر انسان قابل ملامت سمجھا جائے

### (لون)

اَللَّوْنُ: کے معنی رنگ کے ہیں اور یہ سیاہ سفید اور ان دونوں سے مرکب یعنی ہر قسم کے رنگ پر بولا جاتا ہے۔ تَلَوْنَ کے معنی رنگ بدلنے کے ہیں قرآن پاک میں ہے: ﴿وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌ بَیْضٌ وَحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُہَا﴾ (۳۵-۲۷) اور پہاڑوں میں سفید اور سرخ رنگوں کی دھاریاں ہیں۔ اور آیت کریمہ: ﴿وَ اِخْتِلَافٌ اَلْسِنَتَکُمْ وَ اَلْوَانِکُمْ﴾ (۳۰-۲۲) اور تمہاری زبانوں اور رنگوں کا مختلف ہونا۔ میں اختلاف الوان سے انواع و اقسام کے رنگوں اور شکلوں کے مختلف ہونے کی طرف اشارہ ہے اور باوجود اس قدر تعداد کے ہر انسان اپنی ہیئت کذائی اور رنگت میں دوسرے سے ممتاز

① ومنہ قوله تعالى: ﴿وَ اَن تَلَوْا وَ تَعْرَضُوْا﴾ (۴-۱۳۵)

② قالہ حسان بن ثابت یعیر بہ الحارث بن ہشام حیث فریوم بدر عن اخیه ابی جہل و قبلہ: ان کنت کاذبۃ الذی حدثنی فنجوت منحنی الحارث بن ہشام والبیث من کلمۃ فی دیوانہ (۹۵ و ۲۱۵) و (طبعہ وار صاوں) والسیرة (۳۸۳/۳) ←

﴿لَوْ لَا أَنْتُمْ لَكُنَّا مُؤْمِنِينَ﴾ (۳۲-۳۱) اگر تم نہ ہوتے تو ہم ضرور مومن ہو جاتے۔

دوم بمعنی ہلکا کے آتا ہے۔ اور اس کے بعد متصلاً فعل کا آنا ضروری ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔

لَوْ لَا أَرْسَلْتُ إِلَيْكَ رَسُولًا: تو نے ہماری طرف کوئی پیغمبر کیوں نہیں بھیجا۔ وغیرہ ذالک من الامثلة۔

## (ل ی ت)

لَا تَهُ (ض) عَنْ كَذَا لَيْتَا: کے معنی اسے کسی چیز سے پھیر دینا اور ہٹا دینا ہیں۔ نیز لَا تَهُ وَالْأَتَهُ کس کا حق کم کرنا پورا نہ دینا۔ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿لَا يَلْتَكُمُ مِنْ أَعْمَالِكُمْ شَيْئًا﴾ (۴۹-۱۳) تو خدا تمہارے اعمال میں سے کچھ کم نہیں کرے گا۔ اور اس کے اصلی معنی رَدُّ اللَّيْتِ یعنی گردن کے پہلو کو پھیرنے کے ہیں۔

لَيْتَ: یہ حرف طمع و تمنی ہے یعنی گذشتہ کوتاہی پر اظہار تاسف کے لیے آتا ہے چنانچہ فرمایا:

﴿يَا وَيْلَتَى لَيْتَنِي لَمْ أَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيلًا﴾

(۲۵-۲۸) کہے گا کاش میں نے فلاں شخص کو دوست نہ

بنایا ہوتا ﴿وَيَقُولُ الْكَافِرُ لَيْتَنِي كُنْتُ تُرَابًا﴾

(۷۸-۴۰) اور کافر کہے گا اے کاش! میں مٹی ہوتا۔

﴿يَا لَيْتَنِي اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُولِ سَبِيلًا﴾

(۲۵-۲۷) کہے گا اے کاش میں نے پیغمبر کے ساتھ رستہ

(۴۰۱) تَرَكَ الْآحِبَّةَ اِنْ تُقَاتِلَ دُونَهُ

وَنَجَابِرَ أَسِيرَ طِمْرِيَّةٍ وَثَابٍ

اور اس نے دوستوں کے ورے لڑنا چھوڑ دیا اور چھلانگیں بھر کر دوڑنے والی گھوڑی پر سوار ہو کر بھاگ گیا۔

الْيَوَاءُ: جھڑے کو کہتے ہیں۔ کیونکہ وہ ہوا سے لہراتا رہتا ہے۔ اَللَّوِيَّةُ وہ کھانا جو پلیٹ کر توشہ کے طور پر رکھ دیا جائے۔

لَوِي مَدِينَةً: اپنے مقروض کو ڈھیل دینا۔

الْوِي: ٹیلے کے لوی یعنی موڑ پر پہنچنا۔

## (لو)

لَوْ (حرف) بعض نے کہا ہے کہ یہ اِمْتِنَاعُ

الشَّيْءِ لَا مِتْنَاعَ غَيْرِهِ کے لیے آتا ہے (یعنی ایک چیز

کا دوسری کے امتناع کے سبب ناممکن ہونا) اور معنی شرط کو

مضمّن ہوتا ہے چنانچہ قرآن پاک میں ہے: ﴿قُلْ لَّوْ

أَنْتُمْ تَمْلِكُونَ خَزَائِنَ رَحْمَةِ رَبِّي﴾ (۱۷-۱۰۰)

کہہ دو کہ اگر میرے پروردگار کی رحمت کے خزانے

تمہارے ہاتھ میں ہوتے۔

## (لولا)

لَوْ لَا (حرف) اس کا استعمال دو طرح پر ہوتا

ہے ایک شے کے پائے جانے سے دوسری شے کا ممتنع

ہونا۔ اس کی خبر ہمیشہ محذوف رہتی ہے۔ اور لَوْ لَا کا

جواب قائم مقام خبر کے ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَالسَّهِيلَى (۲: ۱۱۰) وَالْمَحَاضِرَاتِ لِلْمَوْلَفِ (۳: ۱۸۶) وَأَعْجَازِ الْقُرْآنِ لِلْبَقْلَانِي (۴: ۱۰۴) (دارالمعارف ۱۹۶۴)

وَالْبَحْرِ (۵: ۱۵۸/۳: ۲۹۱) وَالْعَقْدِ (۱: ۱۷۰) وَالْعِيُونِ (۱: ۲۹) وَالصَّنَاعَتَيْنِ ۳۶۸ مِ بَحْثِ آلِ اسْطَرَادِمَعِ اعْتَرَارِ

الْحَارِثِ وَقَالَ فِيهِ: وَهَذَا أَوَّلُ مَنْ اعْتَذَرَ مِنْ هَزِيمَةٍ رَوِيَتْ عَنِ الْعَرَبِ وَالْبَيْتِ أَيْضًا فِي الْمَجْرَلِ لَابِنِ حَبِيبِ (۲: ۵۰) وَالْحِزْرِ

فِي الْفَاضِلِ (۵۲) وَالْإِصَابَةِ رَقْمَ (۴: ۱۵۰) فِي تَرْجُمَةِ الْحَارِثِ بْنِ هِشَامٍ وَاسِدِ الْغَايَةِ (۱: ۳۵۱) وَفِي رَوَايَتِهِمْ وَلِحَامِ وَفِي

الْمَطْبُوعِ وَثَابِ وَالْطَّمْرَةِ الْفَرَسِ الْجَوَادِ وَيَسْتَعَارُ لِلْأَتَانِ وَيُرْوَى الْبَيْتُ أَيْضًا لِحِمَامِ بْنِ قَيْسِ بْنِ خَالِدِ الْبَكْرِيِّ ۱۳۔

کی تصغیر لَيْلَةٌ اور جمع لَيَالٍ آتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ﴾ (۱-۹۷) ہم نے اس قرآن پاک کو شب قدر میں نازل (کرنا شروع) کیا۔

﴿وَسَخَّرَ لَكُمُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ﴾ (۱۳-۳۳) اور رات، دن کو تمہاری خاطر کام میں لگا دیا۔

﴿وَاللَّيْلَ إِذَا يَغْشَى﴾ (۱-۹۲) رات کی قسم جب ان پر چھا جائے۔

﴿وَوَعَدْنَا مُوسَى ثَلَاثِينَ لَيْلَةً﴾ (۷-۱۴۲) اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام سے تیس رات کی میعاد مقرر کی۔

﴿وَلَيَالٍ عَشِيرَ﴾ (۲-۸۹) اور دس راتوں کی۔

﴿ثَلَاثَ لَيَالٍ سَوِيًّا﴾ (۱۰-۱۹) برابر تین راتیں (دن)

## (ل ی ن)

الَلَّيْنُ کے معنی نرمی کے ہیں اور یہ خشونت کی

ضد ہے اصل میں تو یہ اجسام کے لیے استعمال ہوتے ہیں مگر استعارہ اخلاق وغیرہ یعنی معانی کے لیے بھی آجاتے ہیں۔ چنانچہ فُلَانٌ لَّيْنٌ یا خَشِنٌ کے معنی ہیں: فلاں

نرم یا درشت مزاج ہے۔ اور یہ دونوں لفظ حسب موقع مکمل

اختیار کیا ہوتا۔ شاعر نے کہا ہے: (الرجز)

(۴۰۲) وَلَيْلَةٌ ذَاتُ دُجَى سَرِيَتْ

وَلَمْ يَلْتَنِي عَنْ هَوَاهَا لَيْتٌ

بہت سی تاریک راتوں میں میں نے سفر کیے۔ لیکن مجھے کوئی پرخطر مرحلہ بھی محبوب کی محبت سے دل برداشتہ نہ کر سکا (کہ میں کہتا کاش میں نے محبت نہ کی ہوتی)۔

یہاں لَيْتٌ اسم معرب اور لَمْ يَلْتٌ کا فاعل ہے اور یہ قَوْلِي لَيْتُهُ كَانَ كَذَا کی تاویل میں ہے۔

جیسا کہ دوسرے شاعر نے کہا ہے: (الخصيف)

(۴۰۳) إِنَّ لَيْتًا وَإِنَّ لَوْ أَعْنَاءُ

کہ لَيْتٌ يَالُوْ کہنا سرا سربا عث تکلف ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ پہلے شعر میں لیت مصدر بمعنی لائت یعنی اسم فاعل ہے اور معنی یہ ہیں کہ مجھے اس کی محبت سے کوئی چیز نہ پھیر سکی۔

## (ل ی ل)

لَيْلٌ وَلَيْلَةٌ کے معنی رات کے ہیں۔ اس کی

جمع لَيَالٍ وَلَيَالٍ وَلَيَالٌ آتی ہے اور نہایت تاریک رات کو لَيْلٌ اللَّيْلُ وَلَيْلَةٌ لَيْلَاءُ کہا جاتا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ لَيْلَةٌ اصل میں لَيْلَاءُ ہے کیونکہ اس

① قاله الراجز ابو محمد الحری الفقعی وفی لسان العرب ندی بدل وحی فلفظة لیت "هنا اسم ای لم یلتنی عن سراها ان اتندم فاقول لیتنی ماسریتها وقیل لیت مصدر موضع اسم بمعنی صارف والشطران فی اللسان (لیت، سری) والقالی (۴۲:۲) فی تسعة ابیات والطبری (۲۰۱۵:۲۶:۴۳) ونسبها الطبری وابو حیان فی البحر (۸:۱۰۴) ويعقوب فی اصلاحه ۱۳۶ وابن خالویه فی اعرابه ۴۷ الی روبه من المعاج ونسبه صاحب الحاشیة الی الوهم وهو الحق کما فی الالی والرجز ایضا فی شرح دیوان الحطیئة للمسکری (۳۶)۔

② قاله ابو زید الطائی یصف حال الحیوان عند اشتداد الهجیر واوله: لیت شعری: واین منی لیت..... والبیث فی اللسان (امالا) والبحر (۱:۳۶۲) والکتاب (۲:۳۲) والخفاجی ۴۹ والفتح لابن حجر (۱۶:۳۵۳) باب ما یحوز من اللو والشطرن فی الصناعتین ۷۷ ومحاضرات المؤلف ۲/۴۵۵ وفی الوسیط بعده ثلاثة اخری وصدر البیث فی البلدان (رسم برام) من قصیده قالها ابو قطیفة عمرو بن الولید بن عقبه بن ابی معیط فی حنین الی المدینة حین نفاہ عبدالله بن الزبیر فلحق بالشام لکن فیہ عجزه اعلى العهد یلین خیر ام فی عشرة ابیات و یلین غدیر لمدینة ۱۲۔

کی یاد کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ میں اس معنی کی طرف اشارہ ہے کہ کہ اباہ اور انکار کے بعد وہ حق کے سامنے سرنگوں ہو جاتے ہیں۔ اور آیت کریمہ: ﴿مَا قَطَعْتُمْ مِّن لِّسْنَةٍ﴾ (۵۹-۵) مومنو! کھجور کے جو درخت تم نے کاٹ ڈالے۔ میں لیسنۃ کے معنی نرم و نازک کھجور کا درخت ہیں..... اور یہ فعلۃ کے وزن پر ہے جیسے حنطۃ۔ تاہم یہ مختلف انواع میں سے ایک نوع کے لیے مخصوص نہیں ہے۔



کبھی مدح کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ اور کبھی مذمت کے لیے آتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔ ﴿فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ﴾ (۱۵۹-۳) (اے محمدؐ) خدا کی مہربانی سے تمہاری افتاد و مزاج ان لوگوں کے لیے نرم واقع ہوئی ہے۔

اور آیت کریمہ: ﴿ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُوْدَهُمْ وَقُلُوْبُهُمْ اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ﴾ (۲۳-۳۹) پھر ان کی کھالیں اور ان کے دل نرم ہو کر خدا



## کتاب المیم

www.kitaboSunnat.com

(ما)

میں بھی جمع کے معنی مراد ہیں۔ اور کبھی (۲) نکرہ ہوتا ہے

جیسے فرمایا:

﴿نِعْمًا يَعِظُكُم بِهَا﴾ (۵۸-۳) بہت خوب نصیحت کرتا ہے۔

تو یہاں نِعْمًا بمعنی نِعْمَ شَیْئًا ہے۔ نیز فرمایا: ﴿فَنِعْمًا هِيَ﴾ (۳۵-۲) تو وہ بھی خوب ہے۔ اور آیت کریمہ: ﴿مَا بَعُوضَةٌ فَمَا قَوَّهَا﴾ (۲۶-۲) کہ چھریا اس سے بڑھ کر کسی چیز کی۔

میں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ماکرہ بمعنی شَیْئًا ہو اور (۲) یہ بھی کہ مَا صلہ ہو اور اس کا مَا بعد یعنی بَعُوضَةٌ مفعول ہو اور نَظْمُ کلام دراصل یوں ہو۔ اَنْ یَضْرِبَ مَثَلًا بَعُوضَةً۔

اور کبھی (۳) اِسْتَفْهَامِیہ ہوتا ہے۔ اس صورت میں کبھی کسی چیز کی نوع یا جنس سے سوال کے لیے آتا ہے۔ اور کبھی کسی چیز کی صفات جنسیہ یا نوعیہ کے متعلق سوال کے لیے آتا ہے۔ اور کبھی غیر ذوی العقول اشخاص اور اعیان کے متعلق سوال کے لیے بھی آ جاتا ہے۔

بعض علمائے نحو کا قول ہے کہ کبھی اس کا اطلاق اشخاص ذوی العقول پر بھی ہوتا ہے چنانچہ فرمایا: ﴿اَلَا عَلٰی اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُهُمْ﴾ (۶-۲۳) مگر ان ہی بیویوں یا (کنیزوں سے) جو ان کی ملک ہوتی ہیں۔

یہ عربی زبان میں دو قسم پر ہے۔ اسی اور حرفی۔ پھر ہر ایک پانچ قسم پر ہے لہذا کل دس قسمیں ہیں (۱) ما اسی ہو تو واحد جمع اور تذکیر و تانیث کے لیے یکساں استعمال ہوتا ہے۔ پھر لفظاً مفرد ہونے کے لحاظ سے اس کی طرف ضمیر مفرد بھی لوٹ سکتی ہے۔ اور معنی جمع ہونے کی صورت میں ضمیر جمع کا لانا بھی صحیح ہوتا ہے۔ یہ ما (۱) کبھی بمعنی اَلَّذِی ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا۔ ﴿وَعِبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا یَضُرُّهُمْ﴾ (۱۰-۱۸) اور یہ (لوگ) خدا کے سوا ایسی چیزوں کی پرستش کرتے ہیں جو نہ ان کا کچھ بگاڑ سکتی ہیں تو یہاں مَا کی طرف یَضُرُّهُمْ میں مفرد کی ضمیر لوٹ رہی ہے۔ اس کے بعد معنی جمع کی مناسبت سے هُوَ لَاءِ شُفَعَاءَ نَا عِنْدَ اللّٰهِ آ گیا ہے اسی طرح آیت کریمہ:-

﴿وَعِبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا یَمْلِكُ لَهُمْ رِزْقًا مِنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ (۱۶-۷۳) اور خدا کے سوا ایسوں کو پوجتے ہیں جو ان کو آسمانوں اور زمین میں روزی دینے کا ذرہ بھی اختیار نہیں رکھتے، میں بھی جمع کے معنی ملحوظ ہیں اور آیت کریمہ:-

﴿بِسْمَا یَاْمُرُکُمْ بِہِ اَیْمَانُکُمْ﴾ (۲-۹۳) کہ تمہارا ایمان تم کو بری بات بتاتا ہے۔

اسی طرح آتانی الْقَوْمُ مَا عَدَا زَيْدًا میں بھی ما مصدریہ ہے اور تقدیر ظرف کی صورت میں بھی ما مصدریہ ہوتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿كُلَّمَا أَصَاءَ لَهُمْ مَشَوْا فِيهِ﴾ (۲۰-۲) جب بجلی (چمکتی اور) ان پر روشنی ڈالتی ہے تو اس میں چل پڑتے ہیں۔  
﴿كُلَّمَا أَوْقَدُوا نَارًا لِلْحَرْبِ أَطْفَأَهَا اللَّهُ﴾ (۲۳-۵) یہ جب لڑائی کے لیے آگ جلاتے ہیں۔ خدا اس کو بجھا دیتا ہے۔

﴿كُلَّمَا خَبَتْ زِدْنُهُمْ سَعِيرًا﴾ (۱۷-۹۷) جب (اس کی آگ) بجھنے کو ہوگی تو ہم ان کو (عذاب دینے) کے لیے اور بھڑکا دیں گے اور آیت کریمہ:  
﴿فَاصْذُغْ بِمَا تُؤْمَرُ﴾ (۱۵-۹۴) پس جو حکم تم کو (خدا کی طرف سے) ملا ہے وہ (لوگوں کو) سنا دو۔  
میں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ما مصدریہ ہو اور یہ بھی کہ ما موصولہ بمعنی الَّذِي ہو۔

یاد رکھو کہ مَا اپنے ما بعد کے ساتھ مل کر مصدری معنی میں ہونے کی صورت میں ہمیشہ حرفی ہوتا ہے کیونکہ اگر وہ اسی ہو تو اس کی طرف ضمیر کا لوٹنا ضروری ہے۔ پس یہ اُرِيدُ اَنْ اُخْرَجَ میں اُن کی طرح ہوتا ہے جس طرح اُن کے بعد ضمیر نہیں ہوتی جو اس کی طرف لوٹ سکے اسی طرح ما کے بعد عائد (ضمیر) نہیں آتی۔

دوم (۲) ما نافیہ ہے۔ اہل حجاز اسے مشروط عمل دیتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا:

﴿مَا هَذَا بَشَرًا﴾ (۱۲-۳۱) یہ آدمی نہیں ہے۔  
تیسرا (۳) ما کافہ ہے جو اَنْ وَاَخَوَاتُهَا اور رُبِّ کے ساتھ مل کر فعل پر داخل ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا:

اور آیت کریمہ:

﴿إِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا يَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ مِنْ شَيْءٍ﴾ (۲۹-۴۲) جس چیز کو خدا کے سوا پکارتے ہیں۔ خواہ وہ کچھ ہی ہو۔ خدا اسے جانتا ہے۔

میں غلیل نے کہا ہے کہ مَا تَدْعُونَ میں ما استفہامیہ ہے اَنْ اَيُّ شَيْءٍ تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ اور انہوں نے یہ تکلف اس لیے کیا ہے کہ یہ ہمیشہ ابتدا کلام میں واقع ہوتا ہے اور ما بعد کے متعلق استفہام کے لیے آتا ہے۔ جو آخر میں واقع ہوتا ہے۔ جیسا کہ آیت:-

﴿مَا يَفْتَحِ اللَّهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَحْمَةٍ﴾ (۳۵-۲) خدا جو اپنی رحمت کا دروازہ کھول دے۔ اور مثال مَا تَضَرَّبَ أَضْرَبَ میں ہے۔

اور کبھی (۵) تعجب کے لیے ہوتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:- ﴿فَمَا أَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ﴾ (۲-۱۷۵) یہ (آتش) جہنم کی کیسی برداشت کرنے والے ہیں۔

ما (۱) حرفی ہونے کی صورت میں بھی پانچ قسم پر ہے اول (۱) یہ کہ اس کا ما بعد بمنزلہ مصدر کے ہو۔ جیسا کہ فعل مستقبل پر ان ناصبہ داخل ہونے کی صورت میں ہوتا ہے۔

چنانچہ فرمایا:  
﴿مِمَّا رَزَقْنَهُمْ يُنْفِقُونَ﴾ (۲-۳) اور جو کچھ ہم نے انہیں عطا فرمایا ہے۔ اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔

تو یہاں ما رزق بمعنی رزق مصدر کے ہے اور اس ما کے بمعنی ان مصدریہ ہونے کی دلیل یہ ہے۔ کہ اس کی طرف کہیں بھی لفظ یا تقدیر ضمیر نہیں لوٹی۔ اور آیت کریمہ:

﴿بِمَا كَانُوا يَكْذِبُونَ﴾ (۲-۱۰) اور ان کے جھوٹ بولنے کے سبب۔ میں بھی ما مصدری معنی پر محمول ہے۔

﴿إِنَّمَا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ أَحَدُهُمَا﴾ (۲۳-۱۷)  
اگر ان میں سے ایک یا دونوں تمہارے سامنے بڑھاپے  
کو پہنچ جائیں۔

### (۴۵)

الْمِائَةُ: (سو) یہ اصول اعداد میں تیسری اکائی  
کا نام ہے۔ کیونکہ اصول اعداد چار ہیں۔ آحاد، عشرات،  
مئات اور أَلُوف..... قرآن پاک میں ہے: ﴿فَإِنْ يَكُنْ  
مِنْكُمْ مِائَةٌ صَابِرَةٌ يَغْلِبُوا مِائَتَيْنِ﴾ (۸-۶۶)  
پس اگر تم میں ایک سو ثابت قدم رہنے والے ہوں گے تو  
دوسو پر غالب رہیں گے۔

﴿وَإِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ مِائَةٌ يَغْلِبُوا أَلْفًا مِنَ الَّذِينَ  
كَفَرُوا﴾ (۸-۶۵) اور اگر سو (ایسے) ہوں گے تو  
ہزاروں پر غالب رہیں گے۔ اور مائۃ کا آخری حرف یعنی  
لام کلمہ محذوف ہے۔  
أَمَانَةُ الدَّرَاهِمِ فَاَمَاتُ هِيَ بمعنی میں نے دراہم کو  
سو کیا تو وہ سو ہو گئے۔

### (۴۶)

الْمَيْدُ: زمین کی طرح کی کسی بڑی چیز کا مضرب  
ہونا۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے: ﴿أَنْ تَمِيدَ بِكُمْ﴾  
(۱۲-۱۵) کہ تم کو لے کر کہیں جھک نہ جائے۔  
﴿أَنْ تَمِيدَ بِهِمْ﴾ (۲۱-۳۱) تاکہ لوگوں (کے بوجھ  
سے ہلنے اور جھکنے) نہ لگے۔  
مَادَتِ الْأَعْصَانُ تَمِيدُ: شاخوں کا مضرب ہونا  
بعض نے کہا ہے کہ شاعر کے کلام (۵)

﴿إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ﴾  
(۳۵-۲۸) خدا سے تو اس کے بندوں میں سے وہی  
ڈرتے ہیں جو صاحب علم ہیں۔

﴿إِنَّمَا تُمْلَى لَهُمْ لِيَزَادُوا إِثْمًا﴾ (۲-۱۷۸)  
(نہیں بلکہ) ہم ان کو اس لیے نہلت دیتے ہیں کہ اور گناہ  
کر لیں۔

كَانَ مَا يُسْأَلُونَ إِلَى الْمَوْتِ گویا موت کی طرف  
دھکیلے جا رہے ہیں۔  
اور آیت کریمہ:

﴿رُبَّمَا يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا﴾ (۱۵-۲) کسی وقت کافر  
لوگ آرزو کریں گے۔

میں بھی مآ کا فہ ہی ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ قَلَمًا اور  
لَمًا میں بھی مآ کا فہ ہوتا ہے۔

چہارم (۴) مَامُسْلَطَةٌ یعنی وہ مآ جو کسی غیر عامل کلمہ کو عامل  
بنا کر مآ بعد پر مسلط کر دیتا ہے جیسا کہ اِذْ مَّا وَحَيْثُمَا کا  
مآ ہے کہ مآ کے ساتھ مرکب ہونے سے قبل یہ کلمات غیر  
عاملہ تھے۔ لیکن ترکیب کے بعد اسمائے شرط کا ساعمل  
کرتے ہیں۔ اور فعل مضارع کو جزم دیتے ہیں۔ جیسے  
حَيْثُمَا تَقْعُدُ أَقْعُدْ وغیرہ۔

پانچواں (۵) مآزائدہ ہے۔ جو محض پہلے لفظ کی تاکید کے  
لیے آتا ہے۔ جیسے اِذَا مَا فَعَلْتَ كَذَا (جب تم ایسا  
کرو) اِمَّا تَخْرِجُ اَخْرِجْ (اگر تم باہر نکلو گے تو میں بھی  
نکلوں گا۔ قرآن پاک میں ہے۔ ﴿فَاِمَّا تَرَيْنَ مِنَ  
النَّاسِ اَحَدًا﴾ (۱۹-۲۶) اگر تم کسی آدمی کو دیکھو۔

① قاله ابن احمر (ابو الخطاب عمرو بن احمر بن عمرو الباهلی القیسی المتوفی فی خلافة عثمان قبل سنة ۳۵۰ راجع  
الخزانة (۳: ۳۸) واوله..... وصادفت والبيت فی اللسان والصحاح (مید)

## (م ی ن)

الْحَمِيزُ وَالتَّمْيِيزُ کے معنی متشابہ اشیاء کو ایک دوسری سے الگ کرنے کے ہیں۔ اور مَازَہ یَمِيزُہ وَمِيزَہ تَمِيزًا دونوں ہم معنی ہیں۔ چنانچہ فرمایا:

﴿لِيُمَيِّزَ اللَّهُ الْخَبِيثَ مِنَ الطَّيِّبِ﴾ (۸-۳۷)

تاکہ خدا ناپاک کو پاک سے الگ کر دے۔ اور ایک قرأت میں لِيُمَيِّزَ اللَّهُ الْخَبِيثَ ہے۔ التَّمْيِيزُ کے معنی الگ کرنا بھی آتے ہیں اور اس ذاتی قوت پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے جس کے ذریعہ انسان معانی کا استنباط کرتا ہے۔ چنانچہ محاورہ ہے۔ فُلَانٌ لَا تَمِيزُ لَهُ: فلاں میں قوت تمیز نہیں ہے۔

إِنَّمَا زَ اور اَمْتَا زَ کے معنی الگ ہونے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَأَمْتَا زُوا الْيَوْمَ﴾ (۵۹-۳۶) اور آج الگ ہو جاؤ۔ اور تَمِيزٌ كَذًا (تفعل) مَازَ کا مطاوع آتا ہے اور اس کے معنی الگ اور منقطع ہونے کے ہیں۔ چنانچہ فرمایا:

﴿تَكَادُ تَمِيزُ مِنَ الْغَيْظِ﴾ (۸-۶۷) گویا مارے جوش کے پھٹ پڑے گی۔

## (م ی ل)

الْمَيْلُ: اس کے معنی وسط سے ایک جانب مائل ہو جانے کے ہیں۔ کبھی ظلم کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ جب یہ اجسام کے متعلق استعمال ہو تو بدل میں پیدائشی کجی کو مَيْلٌ (نفع الیاء) اور عارضی کجی کو مَيْلٌ (بسکون الیاء) کہتے ہیں۔ اور وُصِلْتُ إِلَى فُلَانٍ کے معنی کسی کی مدد کرنے کے ہیں۔ چنانچہ فرمایا:

(۴۱۷) نَعِيمًا وَمَيْدَانًا مِنَ الْعَيْشِ أَخْضَرَ (نعمتیں اور سرسبز لہلہاتی ہوئی زندگی) میں بھی مَيْدَانًا مَادَاتِ الْأَغْصَانُ سے ہے اور اس کے معنی کشادہ زندگی کے ہیں اور اسی سے میدان الدابة ہے جس کے معنی جانور کے کھلے میدان میں پھرنے کے ہیں۔

الْمَائِدَةُ اصل میں اس خوان کو کہتے ہیں جس پر کھانا چنا ہوا ہو۔ اور ہر ایک پر یعنی کھانے اور خالی خوان پر افراد بھی مَائِدَةٌ کا لفظ بولا جاتا ہے۔ یہ مَادَنِي یَمِيدُنِي سے ہے جس کے معنی کھانا کھلانے کے ہیں۔ بعض نے اس کے معنی رات کا کھانا کھلانا بھی کیے ہیں۔

اور آیت کریمہ:

﴿أَنْزَلَ عَلَيْنَا مَائِدَةً مِنَ السَّمَاءِ﴾ (۱۱۴-۵) ہم پر آسمان سے خوان نازل فرما۔

کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ انہوں نے کھانا طلب کیا تھا۔ اور بعض نے کہا ہے کہ علم کے لیے دعا کی تھی۔ اور علم کو مَائِدَہ سے اس لیے تعبیر فرمایا ہے کہ علم روح کی غذا بنتا ہے جیسا کہ طعام بدن کے لیے غذا ہوتا ہے۔

## (م ی ر)

الْمَيْرَةُ: غلہ جو انسان کھانے کے لیے فراہم کرتا ہے۔ اور مَارَ أَهْلُهُ یَمِيزُهُمْ کے معنی اہل و عیال کے لیے غلہ لانے کے ہیں۔

چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَنَمِيرُ أَهْلَنَا﴾ (۶۵-۱۲) اب ہم اپنے اہل و عیال کے لیے پھر غلہ لائیں گے۔

اور خَيْرَةُ اور مِيرَةُ کے قریب قریب ایک ہی معنی ہیں۔

أَمَاهُ الرَّجُلُ وَآمَهُی (کنواں کھودتے ہوئے) پانی تک پہنچ گیا۔

### (م ت ع)

الْمُتَوَّعُ کے معنی کسی چیز کا بڑھنا اور بلند ہونا

کے ہیں۔

جیسے مَتَّعَ النَّهَارُ: (دن بلند ہو گیا)۔

مَتَّعَ النَّسَبَاتُ: (پودا بڑھ کر بلند ہو گیا) اَلْمَتَّاعُ:

عرصہ دراز تک فائدہ اٹھانا۔ محاورہ ہے۔

مَتَّعَهُ اللَّهُ بِكَذَا وَآمَتَّعَهُ: اللہ اسے دیر تک فائدہ

اٹھانے کا موقع دے۔ تَمَتَّعَ بِهِ: اس نے عرصہ دراز تک

اس سے فائدہ اٹھایا۔ قرآن پاک میں ہے:-

﴿وَمَتَّعْنَهُمْ إِلَىٰ حِينٍ﴾ (۱۰-۹۸) اور ایک مدت

تک (فوائد دنیوی سے) ان کو بہرہ مند رکھا۔

﴿وَنُمِيتُهُمْ قَلِيلًا﴾ (۳۱-۲۳) ہم ان کو تھوڑا سا فائدہ

پہنچائیں گے۔

﴿فَأَمِيتُهُمْ قَلِيلًا﴾ (۴-۱۲۶) میں اس کو بھی کسی قدر

ممتنع کروں گا۔

﴿سَنُمِيتُهُمْ ثُمَّ يَمْسُهُمْ مَوْتًا عَذَابٌ أَلِيمٌ﴾

(۱۱-۳۸) ان کو ہم (دنیا کے فوائد سے) محفوظ کریں

گے۔ پھر ان کو ہماری طرف سے عذاب الیم پہنچے گا۔ اور

قرآن پاک میں جہاں کہیں دنیاوی ساز و سامان کے

متعلق تَمَتَّعُوا آیا ہے تو اس سے تہدید مراد ہے کیونکہ

اس میں ایک گونہ عیش و کوشی اور دسعت کے معنی پائے

جاتے ہیں اور اسْتَمْتَعَ کے معنی کسی چیز سے نفع حاصل

کرنے اور فائدہ اٹھانے کے ہیں قرآن پاک میں ہے۔

﴿رَبَّنَا اسْتَمْتَعَ بَعْضُنَا بِبَعْضٍ﴾ (۶-۱۲۸) اے

﴿فَلَا تَحْمِلُوا كُلَّ الْمِثْلِ﴾ (۴-۱۲۹) تو ایسا بھی

نہ کرنا کہ ایک ہی طرف ڈھل جاؤ۔

مِلْتُ عَلَيْهِ کے معنی کسی پر حملہ کرنے کے ہیں۔ جیسے

فرمایا ہے:

﴿فَيَحْمِلُونَ عَلَيْكُمْ مِّثْلَهُ وَآحِدَةً﴾ (۴-۱۰۲) تو

تم پر یکبارگی حملہ کر دیں۔

اور اَلْسَمَالُ کو مال اس لیے کہا جاتا ہے۔ کہ وہ ہمیشہ مائل

اور زائل ہوتا رہتا ہے۔ بدیں وجہ اسے عرض بھی کہتے

ہیں۔ اسی لیے کسی نے کہا ہے کہ مال کی مثال ایک پیشہ ور

عورت کی ہے جو کبھی عَطَّار اور کبھی بِنِيطَار کے گھر ہوتی

ہے۔

### (م ی ہ)

الْمَاءُ۔ کے معنی پانی کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ﴾ (۲۱-۳۰)

اور تمام جاندار چیزیں ہم نے پانی سے بنائیں۔

﴿مَاءٌ طَهُورًا﴾ (۲۵-۳۸) پاک (اور تھرا ہوا) پانی۔

اور محاورہ ہے۔

مَاءُ بَنِي فُلَانٍ: فلاں قبیلے کا پانی یعنی ان کی آبادی۔

مَاءٌ أَصْلٌ فِي مَوْتٍ ہے۔ کیونکہ اس کی جمع اَمْوَاءٌ اور

مِیَاہ آتی ہے۔ اور تَغْيِيرُ مَوْتٍ پھر ہا کو حذف کر کے واؤ

کو الف سے تبدیل کر لیا گیا ہے۔ رَجُلٌ مَاءُ الْقَلْبِ:

پانی دل۔ یعنی بزدل آدمی۔ یہاں ماہ مومہ سے بنا ہے بعض

نے کہا ہے کہ یہ رَجُلٌ قِصَاہ کی طرح ہے۔ یعنی ہا ہمزہ

سے مبدل ہے۔ مَا هَتِ الرِّكْبَةُ تَمِیْہَةً وَتَمَہً: کنویں

میں پانی بڑھ گیا۔ بَثْرٌ مِیْہَةٌ وَمَاہَةٌ وَمِیْہَةٌ زیادہ پانی

والا کنواں۔

نیز ہر وہ چیز جس سے کسی قسم کا نفع حاصل کیا جائے۔ اسے مَتَاعٌ وَمُتَعَةٌ کہا جاتا ہے۔ اس معنی کے لحاظ سے آیت کریمہ:-

﴿وَلَمَّا فَتَحُوا مَتَاعَهُمْ﴾ (۱۲-۶۵) جب انہوں نے اپنا اسباب کھولا۔

میں غلہ کو متاع کہا ہے۔ اور بعض نے غلہ کے تھیلے یا بوریاں مراد لیے ہیں اور یہ دونوں متاع میں داخل اور باہم متلازم ہیں کیونکہ غلہ ہمیشہ تھیلوں ہی میں ڈالا جاتا ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَلِلْمُطَلَّقَاتِ مَتَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ﴾ (۲-۲۴۱) اور مطلقہ عورتوں کو بھی دستور کے مطابق نان و نفقہ دینا چاہیے۔ میں متاع بمعنی متعہ ہے اور متعہ سے یہاں وہ نان و نفقہ مراد ہے جو عورت کو طلاق دینے کے بعد شوہر سے ملتا ہے تاکہ عدت طلاق پوری ہونے تک وہ گذر بسر کر سکے۔ اور اَمْتَعَ وَمَتَعَ کے معنی متعہ دینے کے ہیں۔ مگر قرآن پاک میں اس معنی کے لیے صرف مَتَعَ یعنی تفعل استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ فرمایا:-

﴿فَمَتَّعُوهُنَّ وَسَرَّحُوهُنَّ سَرَاحًا جَمِيلًا﴾ (۳۳-۴۹) تو ان کو کچھ فائدہ (یعنی خرچ) دے کر..... رخصت کر دو۔ ﴿قَدَرُهُ وَ عَلَى الْمُفْتَرِ قَدَرُهُ﴾ مَتَاعًا بِالْمَعْرُوفِ ﴿ (۲-۲۳۶) ہاں ان کو دستور کے مطابق کچھ خرچ ضرور دو (یعنی) مقدور والا اپنے مقدور کے مطابق دے اور تنگ دست اپنی حیثیت کے مطابق۔

مُتَعَةُ النِّكَاح (یعنی نکاح متعہ) کی صورت یہ ہے کہ مرد کسی عورت کو کچھ مال دے کر متعین عرصہ کے لیے اس سے نکاح کر لے۔ پھر جب وہ مدت گذر جائے تو وہ

ہمارے پروردگار ہم ایک دوسرے سے فائدہ اٹھاتے رہے۔

﴿فَاسْتَمْتَعُوا بِخَلَاقِهِمْ فَاسْتَمْتَعْتُمْ بِخَلَاقِكُمْ كَمَا اسْتَمْتَعَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ بِخَلَاقِهِمْ﴾ (۹-۶۹) وہ اپنے حصے سے بہرہ یاب ہو چکے۔ سو جس طرح تم سے پہلے لوگ اپنے حصے کا فائدہ اٹھا چکے ہیں۔ اسی طرح تم نے اپنے حصے سے فائدہ اٹھالیا۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ﴾ (۲۱-۳۶) اور تمہارے لیے زمین میں ایک وقت تک ٹھکانا اور فائدہ اٹھانا (مقرر کر دیا گیا ہے)

میں اس بات پر تنبیہ ہے کہ ہر انسان کو دنیا میں ایک مدت تک فائدہ اٹھانا ہے۔ اور پھر آیہ کریمہ: ﴿قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيلٌ﴾ (۴-۷۷) کہہ دو کہ دنیا کا فائدہ بہت تھوڑا ہے۔ میں متاع دنیا کو قلیل کہہ کر اشارہ کیا ہے کہ اخروی ثواب کے مقابلہ میں دنیا کا ساز و سامان بے وقعت ہے اور ناقابل اعتناء جیسا کہ آیت ﴿فَمَا مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا فِي الْآخِرَةِ إِلَّا قَلِيلٌ﴾ (۹-۳۸) دنیا کی زندگی کے فائدے تو آخرت کے مقابلہ میں بہت ہی کم ہیں اور آیت:-

﴿وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا فِي الْآخِرَةِ إِلَّا مَتَاعٌ﴾ (۱۳-۲۶) سے واضح ہوتا ہے اور خانگی ضروریات کی چیزوں کو بھی متاع کہا جاتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿ابْتَغَاءَ حِلْيَةٍ أَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِثْلُهُ﴾ (۱۳-۱۷) زیور یا کوئی اور سامان بنانے کے لیے..... اس میں بھی ایسا ہی جھاگ ہوتا ہے۔

مَتْنُهُ: کسی کی پیٹھ پر مارنا مَتْنُ مضبوط پشت والا ہونا اور مضبوط پشت والے آدمی کو مَتِينٌ کہا جاتا ہے۔ اسی سے حَبْلٌ مَتِينٌ کا محاورہ ہے۔ جس کے معنی مضبوط رسی کے ہیں قرآن پاک میں ہے:

﴿إِنَّ اللَّهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِينُ﴾ (۵۸-۵۱) خدا ہی تو رزق دینے والا زور آور اور مضبوط ہے۔

### (م ت ی)

مَتًى: یہ اسم استفہام ہے اور کسی کام کا وقت دریافت کرنے کے لیے بولا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے۔

﴿مَتًى هَذَا الْوَعْدُ﴾ (۲۸-۳۲) یہ وعدہ کب (پورا) ہوگا؟ ﴿مَتًى هَذَا الْفَتْحُ﴾ (۲۸-۳۲) یہ فیصلہ کب ہوگا؟

کہتے ہیں کہ بنی ہذیل، جَعَلْتُهُ مَتًى كُحْمً (میں نے اسے اپنے آستین کے وسط میں ڈال لیا) کا محاورہ استعمال کرتے ہیں۔ چنانچہ ابو ذؤیب (الہذلی) نے کہا ہے ﴿الکامل﴾

(۴۰۵) شَرِبْنِ بِمَاءِ الْبَحْرِ ثُمَّ تَرَفَعْتَ  
مَتًى لِحَجِّ خُضْرٍ لَّهُنَّ نَتِيجُ

عورت بغیر طلاق کے خاوند سے الگ ہو جاتی ہے اور حج کے ساتھ عمرہ کرنے کو مُتَعَةُ الْحَجِّ کہا جاتا ہے چنانچہ قرآن پاک میں ہے: ﴿فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ إِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ﴾ (۱۹۶-۲) تو جو (تم میں) حج کے وقت تک عمرہ سے فائدہ اٹھانا چاہے وہ جیسی قربانی میسر ہو کرے۔

شَرَابٌ مَاتِعٌ: بعض نے اس کے معنی سرخ شراب“ کیے ہیں لیکن اصل میں مَاتِعٌ ہر عمدہ اور اعلیٰ شراب کو کہتے ہیں۔ گو شراب کا سرخ ہونا بھی اس کی عمدگی کی ایک علامت ہے مگر مَاتِعٌ کا لفظ اس کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔

جَمَلٌ مَاتِعٌ: قوی اونٹ ۱ (اور مَاتِعٌ کے معنی رائج اور زائدہ بھی آجاتے ہیں چنانچہ شاعر کے شعر۔

(۴۰۴) وَمِيزَانُهُ فِي سُورَةِ الْبُرِّ مَاتِعٌ  
(اس کا ترازو نیکیوں سے جھکا ہوا ہے)

میں مَاتِعٌ معنی رائج اور زائدہ ہی کے ہیں۔

### (م ت ن)

الْمَتْنَان: پیٹھ کے دونوں حصے جو ریڑھ کی ہڈی کے ارد گرد ہوتے ہیں۔ اور تشبیہ کے طور پر سخت زمین کو اُمتن کہتے ہیں۔

۱ کذا فی الصلب والصواب حبل بدل حمل کما فی المعاجم۔

۲ قاله النابغة الذبياني واوله الى خير دين سنة قد علمته والبيت في اللسان (متن) وفي رواية المجد بدل البر والشطر ايضا في ملحق ديوانه۔

۳ وفي ديوان الهذليين تروت بدل شر بن وعلى حبشيات بدل لحج خضر والضمير في شر بن يعود الى حناتم سود في البيت قبله سقى ام عمرو كل آخر ليلة۔ حناتم سود ماء من ثجيج، والمراد بها السحاب والبيت في الطبري (۲۹: ۲۰۷) وادب الكاتب (۱۷: ۵) واللسان (متن) وشرح شواهد المغني للسيوطي (۱۰۹) والاقتضاب (۴۴۷) والحواليقي (۳۶۷) وديوان الهذليين (۱: ۵۱) وفي روايته اختلاف يسير وفي الصاحي (۱۷۵) غير منسوب وفي مشكل القرآن (۴۳۰) (بحث الباء مكان من) والخزانة (۳: ۹۳-۹۵) والبيت ايضا في الطبرسي (۲۹: ۱۴۵)۔

يَتَفَكَّرُونَ ﴿٥٩﴾ اور یہ مثالیں ہم لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں تاکہ وہ فکر کریں۔ اور دوسرے مقام پر ﴿وَمَا يَعْقِلُهَا إِلَّا الْعِلْمُونَ﴾ (۵۹-۴۳) اور اسے تو اہل دانش ہی سمجھتے ہیں۔ فرمایا ہے:-

مَثَلٌ وَمَثَلٌ دونوں ہم معنی ہیں جیسے شَبَّهٌ وَشَبَّهٌ وَنَقَضٌ وَنَقَضٌ وغیرہ۔ اور یہ دو طرح استعمال ہوتا ہے ایک بمعنی وصف جیسے فرمایا ﴿مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِي وُعدَ الْمُتَّقُونَ﴾ (۱۳-۳۵) یعنی جس جنت کا متقی لوگوں سے وعدہ کیا گیا ہے اس کے اوصاف یہ ہیں۔

اور دوم مشابہ کے معنی میں آتا ہے اور ہر قسم کی مشابہت کو شامل ہوتا ہے یعنی عربی میں جو الفاظ بھی مشابہ کے معنی میں آئے ہیں سب سے زیادہ عام ہوتا ہے مثلاً نَدَّ صرف اس مشابہ کو کہتے ہیں جو دوسرے کے ساتھ اس کے جوہر میں شریک ہو اور شَبَّهٌ کا لفظ دوسرے کے ساتھ صرف کیفیت میں شرکت کو ظاہر کرتا ہے اور مساوی اسے کہتے ہیں جو صرف کمیت میں دوسرے کے برابر ہو اسی طرح مَشْكُلٌ کا لفظ صرف اندازہ اور پیمائش کے لحاظ سے مشابہت پر بولا جاتا ہے اس بنا پر اللہ تعالیٰ سے من کل الوجوه تشبیہ کی نفی کرنے کے لیے قرآن پاک نے مثل کا لفظ استعمال کیا ہے۔ چنانچہ فرمایا:-

﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ﴾ (۱۱-۳۲) اس جیسی کوئی چیز نہیں۔ اب رہا یہ سوال کہ اگر یہاں مثل بمعنی مشابہ ہے تو پھر کاف تشبیہ کیوں لایا گیا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ ان

انہوں نے سمندر سے پانی پیا پھر سمندر کے گہرے کنڈوں سے بلند ہوئیں اور اگر جتے ہوئے تیز رفتاری سے چل پڑیں۔

## (م ث ل)

مَثَلٌ (ک) اَلشَّيْءُ مُثْلًا: کے معنی کسی چیز کا سیدھا کھڑا رہنا یا دوسری چیز کی شکل و صورت اختیار کر لینا کے ہیں۔ اسی سے حدیث میں ہے ﴿(۱۱۶)﴾ ((مَنْ أَحَبَّ أَنْ يَمَثَلَ لَهُ الرَّجَالُ فَلْيَتَّبِعْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ)) کہ جو شخص یہ چاہتا ہے کہ لوگ اس کے سامنے سیدھے کھڑے رہیں۔ تو وہ اپنا ٹھکانا آگ میں بنائے۔

اَلْمُمَثَّلُ: وہ چیز جو کسی نمونہ کے مطابق بنائی گئی ہو۔ اَلْيَمَثَالُ: تصویر۔ کسی چیز کا مجسمہ ﴿تَمَثَّلَ كَذَا﴾: کسی کی شکل بن جانا۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا﴾ (۱۹-۱۷) تو وہ ان کے سامنے ٹھیک آدمی (کی شکل) بن گیا۔

اَلْمَثَلُ کے معنی ہیں: ایسی بات کے جو کسی دوسری بات سے ملتی جلتی ہو۔ اور ان میں سے کسی ایک کے ذریعہ دوسری کا مطلب واضح ہو جاتا ہو۔ اور معاملہ کی شکل سامنے آ جاتی ہو۔ مثلاً عین ضرورت پر کسی چیز کو کھودینے کے لیے اَلصَّيْفَ صَبَّعَتِ اللَّبَنَ کا محاورہ ضرب المثل ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں امثال بیان کرنے کی غرض بیان کرتے ہوئے فرمایا:-

﴿وَتِلْكَ الْأَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ

۱ وفی روایۃ ان تمثّل قال الحافظ فی تخریجہ لم اجدہ ہکذا وفی السنن، من حدیث معاویۃ من سرہ ان یتمثّل لہ الناس قیاماً فلیتبعہ مقعدہ من النار انظر ایضاً تخریج الاحیاء للعراقی (۲/۵۰۵) فی غریب ابی عبید من حدیث البراء راجع الکافی (ص ۱۴۲ رقم ۳۰۷) والفائق (۷/۳) والنهاية (۸۲/۴)

۲ وجمعه تمانیل کما فی قوله تعالیٰ: (۳۱-۵۲) (۱۳-۳۴)



دونوں کو تاکید نفی کی غرض سے یکجہ لایا گیا ہے یعنی یہ کہ اللہ تعالیٰ کے حق میں نہ تو مثل کا استعمال صحیح ہے اور نہ ہی کاف کا اس لیے یکبارگی دونوں کی نفی کر دی ہے۔

﴿مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِي وُعدَ الْمُتَّقُونَ﴾ (۱۳-۳۵) جس جنت کا متقی لوگوں سے وعدہ کیا گیا ہے اس کے اوصاف یہ ہیں۔

بعض نے کہا ہے کہ یہاں مثل بمعنی صفت ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفت کی طرح کسی کی صفت نہیں ہے یعنی گویا ذات باری تعالیٰ بھی بہت سی ان صفات کے ساتھ متصف ہوتی ہے جن کے ساتھ انسان متصف ہوتا ہے لیکن ان صفات کے وہ معنی نہیں ہیں جو بشر میں لیے جاتے ہیں۔ اور آیت کریمہ:

﴿لِلَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ مَثَلُ السَّوْءِ وَلِلَّهِ الْمَثَلُ الْأَعْلَى﴾ (۱۶-۶۰) جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے انہی کے لیے بری باتیں (شایاں) ہیں۔ اور خدا کو صفت اعلیٰ زیب دیتی ہے۔ کے معنی یہ ہیں کہ یہ لوگ نہایت بری صفات کے مالک ہیں۔ اور باری تعالیٰ اعلیٰ صفات کے ساتھ متصف ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿فَلَا تَضْرِبُوا لِلَّهِ الْأَمْثَالَ﴾ (۱۶-۷۴) تو (لوگو) خدا کے بارے میں (غلط مثالیں پیش نہ کرو)۔

میں اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کے لیے امثال بیان کرنے سے منع فرمادیا ہے۔ پھر اس خود ہی اس کے بعد آیت:

﴿ضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا عَبْدًا مَمْلُوكًا﴾ (۱۶-۷۵) الایۃ - خدا ایک (اور) مثال بیان فرماتا ہے کہ ایک غلام

ہے..... میں اپنی ذات کے لیے مثال بھی بیان فرمادی

ہے۔ مگر ان میں تعارض نہیں ہے۔ اس لیے کہ اس مثال کے بیان کرنے کے بعد آخر میں ﴿إِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ﴾ کہہ کر یہ بھی فرمادیا ہے کہ تم اس حقیقت کو نہیں سمجھ سکتے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہم بشری صفات میں سے اللہ تعالیٰ کے لیے کوئی صفت بیان نہیں کر سکتے۔ بلکہ جو صفات اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کے لیے ثابت کی ہیں بیان کر سکتے ہیں۔ اور آیت کریمہ:

﴿مَثَلُ الَّذِينَ حُمِلُوا التَّوْرَةَ.....﴾ (۲۲-۵) جن لوگوں (کے سر) پر توراۃ لدوائی گئی..... ان کی مثال، کے معنی یہ ہیں کہ یہود تورات میں بیان کردہ حقائق کے مفہوم سے اس گدھے کی طرح جاہل ہیں جس کی پشت پر علم و حکمت کی بڑی بڑی کتابیں لدی ہوں اور آیت کریمہ:

﴿وَاتَّبَعَ هَوَاهُ فَمَثَلُهُ كَمَثَلِ الْكَلْبِ إِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ أَوْ تَتْرَلْهُ يَلْهَثْ﴾ (۷-۱۷۶) اور اپنی خواہش کے پیچھے چل پڑا۔ تو اس کی مثال کتے کی سی ہوگی ہے۔ کہ اگر سختی کر دو تو زبان نکالے رہے۔ اور یوں ہی چھوڑ دو تو بھی زبان نکالے رہے۔ میں اس شخص کو ہوائے نفسانی کی اتباع اور ہر وقت اس کی تکمیل کے درپے رہنے میں اس کتے کے ساتھ تشبیہ دی ہے جو ہر حالت میں زبان باہر نکالے رہتا ہے۔ اور کسی حالت میں بھی زبان نکال کر باہر نہیں چھوڑتا اور آیت کریمہ: ﴿مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا﴾ الایۃ (۲-۱۷۷) ان کی مثال اس شخص کی سی ہے۔ جس نے (شب تاریک میں) آگ

جلائی..... میں اس شخص کو جسے اللہ تعالیٰ نے ایک گونہ ہدایت اور اس کے لیے صلاحیتوں کو ضائع کر دیا ہو۔ اور ابدی انعامات کے حاصل کرنے کے لیے انہیں ذریعہ نہ

سخت سردی ہو۔ میں بھی مثل بمعنی مثال کے ہے۔

الْمُثَالُ: (۱) ایک چیز کا اس کی نظیر سے مقابلہ کرنا یا (۲) نمونہ جس کے مطابق کوئی چیز بنائی جائے۔

الْمُثَلَّةُ: عبرت ناک سزا جس سے دوسرے بھی عبرت حاصل کر کے ارتکاب جرم سے رک جائیں یہی معنی نَكَالُ کے ہیں۔ اس کی جمع مُثَلَّاتٌ وَمَثَلَاتٌ آتی ہے اور آیت کریمہ:

﴿وَقَدْ خَلَلْتُ مِنْ قَبْلِهِمْ الْمُثَلَّتُ﴾ (۱۳-۶) حالانکہ ان سے پہلے عذاب واقع ہو چکے ہیں۔

میں ایک قرأتِ الْمُثَلَّاتُ (سکون ثاء) بھی مروی ہے۔ جیسا کہ عُضْدٌ وَعُضْدٌ اور أَمَثَلُ السُّلْطَانُ فُلَانًا کے معنی یہ ہیں کہ بادشاہ نے فلاں کو عبرت ناک سزا دی۔

الْأَمْثَلُ: اس شخص کو کہتے ہیں جو نفوسِ فاضلہ سے زیادہ مشابہت رکھتا ہو اور اقرب الی الخیر ہو اور کنایہ کے طور پر برگزیدہ لوگوں کو أَمْثَلُ الْقَوْمِ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ آیت کریمہ:

﴿إِذْ يَقُولُ آمَنَّا لَهُمْ طَرِيقَةٌ إِنْ لَبِثْتُمْ إِلَّا يَوْمًا﴾ (۲۰-۱۰۴) جب کہ اس وقت ان میں سب سے اچھی راہ والا (یعنی عاقل و ہوشمند) کہے گا کہ نہیں بلکہ ایک ہی روز ٹھہرے ہو۔

میں بھی امثل اسی معنی پر محمول ہے اور آیت کریمہ: ﴿وَيَذْهَبَا بِطَرِيقَتِكُمُ الْمُثَلَّةِ﴾ (۲-۶۳) اور تمہارے شائستہ ترین مذہب کو نابود کر دیں۔

میں مُثَلَّے کا ذکر اَمْثَلُ ہے۔ یعنی وہ راستہ جو دوسروں سے بہتر ہو۔

بنایا ہو۔ اسے اس شخص کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔ جس نے تاریکی میں آگ سلگائی ہو لیکن جب اس نے اس کے لیے آس پاس کو روشن کر دیا تو اس نے وہ روشنی ضائع کر دی ہو اور وہ..... دوبارہ اندھیرے میں چلا گیا ہو اور آیت کریمہ:

﴿وَمَثَلُ الَّذِينَ كَفَرُوا كَمَثَلِ الَّذِي يَنْعُقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ إِلَّا دُعَاءً وَنِدَاءً﴾ (۲-۷۱) جو لوگ کافر ہیں ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جو کسی ایسی چیز کو آواز دے جو پکار اور آواز کے سوا کچھ نہ سن سکے۔ میں اس شخص کو جسے ہدایت کی طرف دعوت دی گئی ہو۔ بکریوں کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔ لیکن اختصار کے پیش نظر الفاظ کے باہم مقابلہ اور بسط کلام کے بجائے معنوی مناسبت کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ کہ کفار کو ہدایت کی طرف دعوت دینے والے شخص اور کفار کی مثال اس چرواہے اور بکریوں کی سی ہے جو انہیں بلانے کے لیے چیختا ہو۔ لیکن وہ اس کے بلانے اور پکارنے کی آواز کے سوا کچھ نہیں سنتیں اور اسی طرح آیات۔

﴿مَثَلُ الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ أَتَتْ سَنَابِلَ فِي كُلِّ سُنبُلَةٍ مِائَةُ حَبَّةٍ﴾ (۲-۲۶۱) جو لوگ اپنا مال خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔ ان کے مال کی مثال اس دانے کی سی ہے۔ جس سے سات بالیں اگیں اور ہر بال میں سو سودانہ ہو۔

﴿مَثَلُ مَا يُنْفِقُونَ فِي هَذِهِ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا كَمَثَلِ رِيحٍ فِيهَا صِرٌّ﴾ (۳-۱۱۷) یہ جو مال دنیا کی زندگی میں خرچ کرتے ہیں اس کی مثال ہوا کی سی ہے جس میں

## (م ج د)

مَجْدَ يَمْجُدُ مَجْدًا وَمَجَادَةً کے معنی کرم و شرف اور بزرگی میں وسعت اور پہنائی کے ہیں یہ دراصل مَجْدَتِ الْإِبْلِ کے محاورہ سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں: اونٹوں کا کسی وسیع اور زیادہ چارہ والی چراگاہ میں پہنچ جانا..... اور اَمْجَدَهَا الرَّاعِي کے معنی ہیں چراہے کا اونٹوں کو بڑی وسیع چراگاہ میں لے جانا عرب لوگ کہتے ہیں ❶ فَيُكَلِّ شَجَرٍ نَارًا وَاسْتَمَجَدَ الْمَرْخُ وَالْعَفَارُ ہر درخت میں آگ ہوتی ہے مگر مرخ اور عفار درخت میں تو بہت زیادہ آگ پائی جاتی ہے۔ الجید اسائے حسنی میں سے ہے جس کے معنی ہیں وہ ذات جو اپنے فضل و کرم خصوصی سے نوازنے میں نہایت وسعت اور فراخی سے کام لینے والی ہو چنانچہ آیت کریمہ:

﴿ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيدُ﴾ (۸۵-۱۵) عرش کا مالک بڑی شان والا ہے۔

کی حیثیت بیاباں میں پڑی ہوئی ایک انگوٹھی کی ہے اور اسی مفہوم کے پیش نظر آیت کریمہ: ﴿لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيمِ﴾ (۲۳-۱۶) میں عرش کو الکریم کہا ہے۔ قرآن پاک کی صفت میں بھی الْمَجِيدُ آیا ہے کیونکہ قرآن پاک بھی تمام دنیوی اور اخروی مکارم پر مشتمل ہونے کی وجہ سے جلیل القدر کتاب ہے چنانچہ فرمایا:

﴿ق. وَالْقُرْآنُ الْمَجِيدُ﴾ (۵۰-۱) قرآن مجید کی قسم ہے۔ ﴿بَلْ هُوَ قُرْآنٌ مَّجِيدٌ﴾ (۸۵-۲۱) بلکہ یہ قرآن عظیم الشان ہے۔

اور قرآن پاک کے عظیم الشان اور مکارم دارین کی تعلیمات پر مشتمل ہونے کی وجہ سے یہ آیت بھی اسی معنی پر محمول ہے۔ اَلْتَّجِيدُ: بندے کی طرف سے اللہ تعالیٰ کی تجید کے معنی اس کی صفات حسنہ بیان کرنے کے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندے کی تجید کے معنی اس پر فضل و کرم کرنے کے ہوتے ہیں۔

## (م ج ص)

اَلْمَحْصُصُ کے اصل معنی کسی چیز کو کھوٹ اور عیب سے پاک کرنے کے ہیں۔ یہ فَحْصُصُ کے ہم معنی ہے مگر فَحْصُصُ کا لفظ ایک چیز کو دوسری ایسی چیزوں سے الگ کرنے پر بولا جاتا ہے جو اس میں مل جائیں لیکن درحقیقت اس سے منفصل ہوں۔ مگر مُحْصُصُ کا لفظ ان ملی ہوئی چیزوں کو کسی سے الگ کرنے کے لیے آتا ہے۔ جو اس سے متصل اور گھل مل گئی ہوں..... چنانچہ محاورہ ہے۔

میں ذات باری تعالیٰ کا اَلْمَجِيدُ کے ساتھ متصف ہونا اس کے وسعت فیض اور کثرتِ جود کے سبب سے ہی ہے ایک قرأت میں اَلْمَجِيدُ کسرہ وال کے ساتھ ہے اس صورت میں یہ اَلْعَرْشِ کی صفت ہوگی اور جلالتِ قدر اور عظمتِ شان کے لحاظ سے عرش کو اَلْمَجِيدُ کہا گیا ہے چنانچہ حدیث میں ہے ❷ (۱۱۷)

((مَا الْكُرْسِيُّ فِي جَنْبِ الْعَرْشِ إِلَّا كَحَلْقَةِ مَلَقَاةٍ فِي أَرْضِ فَلَاةٍ)) کہ عرش کے مقابلہ میں کرسی

❶ المثل فی المیدانی (۲۷۵۲) واللسان (مجد) والمحصص (۲۷/۱۱) والحزانة (۱۵۹:۱) (۸۶:۲) (۴۶:۴) بولاق (والحيوان ۴/۶۶۶) وامالی المرتضى (۲۹/۲) والمثل يضرب في تفضيل بعض الشيء على بعض۔

❷ أخرجه ابن جرير وابن أبي عمير وابن مردويه والبيهقي عن أبي ذر الغفاري (شوکانی)

کے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:  
﴿يَمْحَقُ اللَّهُ الرِّبَا وَيُزِيلُ الصَّدَقَاتِ﴾  
(۲۷۶-۲) خدا سود کو نابود (یعنی بے برکت کرتا) اور  
خیرات (کی برکت) کو بڑھاتا ہے۔  
﴿وَيَمْحَقُ الْكُفْرِينَ﴾ (۱۴۱-۳) اور کافروں کو نابود  
کر دے۔

### (م ح ل)

مَحَلَّ (ن) بِمَحَلٍّ وَمَحَالًا کے معنی  
کسی کے خلاف بری تدبیر کرنے کے ہیں چنانچہ آیت:  
﴿وَهُوَ شَدِيدُ الْمِحَالِ﴾ (۱۳-۱۳) جس کے معنی  
”عقوبت کے ساتھ سختی سے گرفت کرنے والا کے ہیں“  
میں بعض کے نزدیک یہ مَحَلَّ بہ کے محاورہ سے ہی مشتق  
ہے۔ مگر بعض نے کہا ہے کہ اَلْمِحَالُّ میں میم زیادہ ہے  
اور یہ دراصل اَلْحَوْل اور اَلْحِيلَةُ سے مشتق ہے۔<sup>۱</sup>

ابو زید نے کہا ہے کہ مَحَلَّ الزَّمَانِ کے معنی قحط سالی ہونا  
کے ہیں اور قحط زدہ علاقہ کو مَكَانٌ مَاحِلٌ وَمَتَمَاحِلٌ  
کہتے ہیں اور اَمَحَلَّتِ الْأَرْضُ کے معنی بارش نہ ہونے  
کی وجہ سے ملک میں قحط ہونے کے ہیں۔ نیز اَلْمَحَالَةُ  
پیٹھ کے مہرہ کو بھی کہتے ہیں اس کی جمع اَلْمَحَالُّ ہے اور  
جو دو دھ خراب اور ترش ہو جائے اسے مُمَجِّلٌ کہا جاتا  
ہے۔ مَاحِلٌ عَنْهُ کے معنی کسی کی طرف سے جھگڑنے  
کے ہیں اور مَحَلَّ بِہِ إِلَى السُّلْطَانِ کے معنی بادشاہ  
کے پاس کسی چغلی کھانے کے ہیں اور ایک حدیث ہے

مَحَصْتُ الذَّهَبَ وَمَحَصْتُهُ: سونے کو آگ میں گلا  
کر اس کی کھوٹ کر الگ کر دیا۔

چنانچہ آیات کریمہ:  
﴿وَلِيُمَحِّصَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا﴾ (۱۴۱-۳) اور یہ  
بھی مقصود تھا کہ خدا ایمان والوں کو خالص مومن بنادے۔  
﴿وَلِيُمَحِّصَ مَا فِي قُلُوبِكُمْ﴾ (۱۵۴-۳) اور جو  
کچھ تمہارے دلوں میں ہے اس کو خالص اور صاف کر دے۔  
میں دلوں کے پاک کرنے پر تحیص کا استعمال ایسے ہی ہے  
جیسا کہ تَزْكِيَةٌ وَتَطْهِيرٌ اور اس قسم کے دوسرے الفاظ  
استعمال ہوتے ہیں چنانچہ دعا کرتے وقت کہا جاتا ہے۔  
اَللّٰهُمَّ مَحِّصْ عَنَّا ذُنُوبَنَا: اے اللہ! ہمارے گناہوں  
کو جو ہمارے ساتھ لگے ہوئے ہیں دور کر دے۔

مَحَصَّ الثُّوبُ: کپڑے کا رواں استعمال سے گھس گیا  
اور اس کی تازگی چلی گئی۔

مَحَصَّ الْحَبْلُ يَمْحَصُّ: ری پرانی ہوگئی۔ اور اس  
کا رواں صاف ہو گیا۔ مَحَصَّ الصَّبِيُّ: بچہ (طاقت  
ور ہو کر) دوڑنے لگا۔

### (م ح ق)

اَلْمَحَقُّ کے معنی گھٹنے اور کم ہونے کے ہیں  
اور اسی سے اَلْمِحَاقُ قمری مہینہ کی ان آخری راتوں کو  
کہتے ہیں جن میں چاند نمودار نہیں ہوتا۔ اِنْمَحَقَ  
وَأَمْتَحَقَ کے معنی کم ہونا اور مٹ جانا ہیں اور مَحَقَّةُ کے  
معنی کسی چیز کو کم کرنے اور اس سے برکت کو ختم کر دینے

۱۔ قاله القتيبي في غريبه (۲۲۶) وفي اللسان: قال ابو منصور الازهرى قول القتيبي غلط فاحش لان الميه اذا كانت زائدة.  
فى "مفعول" يحىء باظهار (الواو والياء مثل مزود ومحول ومحور و ماشاء كلها ومثل هذا النقد ذكر ايضا فى القرطبي  
(۲۹۹/۹) ولعله اخذ من قول قتادة: شديد المحال اى شديد الحيلة وعن عباس رضى الله عنه اى شديد الحول النظر  
الطبرى (۱۲۶/۱۳-۱۲۸)۔

﴿۱۱۸﴾ اَللّٰهُمَّ لَا تَجْعَلِ الْقُرْآنَ مَا جَلَّ بِنَا اے اللہ! قرآن کو ہمارے عیوب ظاہر کرنے والا نہ بنا کہ تیرے سامنے ہماری بد عملیوں کی شکایت کرے۔

### (م ح ن)

اَلْمَحْنُ وَالْامْتِحَانُ کے معنی آزمانے کے

ہیں۔ جیسے فرمایا:

﴿فَاَمْتَحِنُوْهُمْ﴾ (۱۰-۶۰) تو انکی آزمائش کرو۔ اور

اِمْتِحَانٌ اور اِبْتِلَاءٌ کے تقریباً ایک ہی معنی ہیں چنانچہ

قرآن پاک نے ایک مقام پر:

﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اَمْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوْبُهُمْ لِّيَتَّقُوْا﴾

(۳-۴۹) خدا نے ان کے دل تقویٰ کے لیے آزمائے ہیں۔

کہا ہے اور دوسرے مقام پر ﴿لِيَبْلُوَ الْمُؤْمِنِيْنَ مِنْهُ

بَلَاءٌ حَسَنًا﴾ (۸-۱۷) اس سے غرض تھی کہ مومنوں

کو..... اچھی طرح آزمائے۔ فرمایا ہے اور یہاں بَلَاءٌ

اور اِمْتِحَانٌ کا وہی مفہوم ہے جو کہ آیت:

﴿اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ﴾ الایۃ

(۳۳-۳۳) اہل بیت! خدا چاہتا ہے کہ تم سے ناپاکی (کا

میل پچھل دور کر دے۔ میں جس کے دور کرنے کا معنی ہے۔

### (م ح و)

اَلْمَحْوُ (ن) کے معنی کسی چیز کے اثر اور نشان

کو زائل کرنا اور مٹا دینا کے ہیں۔ اسی سے بادِ شمالی مَحْوَةٌ کہا جاتا ہے۔ ﴿کیونکہ وہ بادل کے آثار اور نشانات کو مٹا دیتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿يَمْحُوْا اللّٰهُ مَا يَشَاءُ وَيُثَبِّتُ﴾ (۱۳-۳۹) خدا

جس کو چاہتا ہے مٹا دیتا ہے۔ اور (جس کو چاہتا ہے) قائم

رکھتا ہے۔

### (م ح ز)

مَحَرَّ الْمَاءِ الْاَرْضِ: پانی کا زمین کو چیرنا

اور اس میں چکر لگانا۔ محاورہ ہے۔

مَحَرَّتِ السَّفِيْنَةُ مَحَرًّا وَمُحَوَّرًا: کشتی کا اپنے

سینہ سے پانی کو چیرنا اور سمندر چیر کر چلنے والی کشتی کو

سَفِيْنَةٌ مَّاخِرَةٌ کہا جاتا ہے۔ اس کی جمع مَوَآخِرُ آتی

ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَتَرَى الْفُلْكَ مَوَآخِرَ فِيْهِ﴾ (۱۶-۱۳) اور تم

دیکھتے ہو کہ کشتیاں دریا میں پانی کو پھاڑتی چلی جاتی ہیں۔

اِسْتَمَحَرَّتِ الرِّیْحُ وَامْتَحَرَّتْهَا: میں ہوا کی طرف

منہ کر کے کھڑا ہو گیا۔ حدیث میں ہے ﴿

((اِسْتَمَحَرُّوا الرِّیْحَ وَاَعِدُّوا النَّبْلَ)) (۱۱۹)

(رفع حاجت کے وقت) ہوا کی طرف پشت کر کے بیٹھو

اور استنجا کے لیے پتھر ساتھ لے جاؤ۔

۱ وفی الکشاف "ولا تجعله ماحلا مصداقاً" وفی ابن حبان عن جابر والحاكم عن معقل بن يسار والطبرانی عن انس وابو عبيد فی فضائل القرآن "القرآن شافع ومشفع وماحل ومصداق" راجع الکافی ۲۲۸ وکنز العمال رقم (۲۳۷ و ۲۳۶)

والفائق (۲۳۸/۲) موقفا علی ابن مسعود وقد مر الحديث فی (ش ف ع) ۱۲

۲ ای غیر مصروفة لكونها علما للشمال انظر الذيل للقالی ۶ وفی السمط (۵-۶) هذا (تفسير محوة) قول الاصمعي

وتبعه، السرد فی الكامل (۴۶۳) وقد انكره علی بن حمزة فی التنبيهات علی اغاليط الرواة علیها ۱۲۔

۳ الحديث فی عب عن سراقه بن مالك مرفوعا انظر كنز العمال (۹ رقم ۳۰۷-۳۰۸) وفی النهاية واللسان (مخر)

والفائق (۲۳۹/۲) قال والنبل حجارة الاستنحاء والحديث فی مجمع البحار (۳/۲۸۵) قال والمراو ههنا من الاستمخار الاستد باروياتی بمعنى الاستقبال ایضا ۱۲۔

﴿وَأَمْدَدْنَاهُمْ بِفَاكِهَةٍ وَلَحْمٍ مِّمَّا يَشْتَهُونَ﴾  
اور جس طرح کے میوے اور گوشت کو ان کا جی چاہے گا ہم  
ان کو عطا کریں گے۔ (۲۲-۵۲)

﴿أَيَحْسَبُونَ أَنَّمَا نُمِدُّهُمْ بِهِ مِنْ مَّالٍ وَبَيْنِينَ﴾  
(۲۳-۵۵) کیا یہ لوگ خیال کرتے ہیں کہ ہم جو دنیا میں  
ان کو مال اور بیٹوں سے مدد دیتے ہیں۔

﴿وَيُمِدُّكُمْ بِأَمْوَالٍ وَبَيْنِينَ﴾ (۱۲-۱۷) اور مال اور  
بیٹوں سے تمہاری مدد فرمائے گا۔

﴿يُمِدُّكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ آلَافٍ﴾ (۳-۱۲۵)  
تمہارا پروردگار پانچ ہزار فرشتے تمہاری مدد کو بھیجے گا۔  
﴿أَتُمِدُّونَنِي بِمَالٍ﴾ (۳۶-۲۷) کیا تم مجھے مال سے  
مدد دینا چاہتے ہو۔

﴿وَنُمِدُّهُ مِنَ الْعَذَابِ مَدًّا﴾ (۱۹-۷۹) اور اس  
کے لیے (آہستہ) عذاب بڑھاتے جاتے ہیں۔ ﴿وَوَيْلٌ  
لِّمُؤْمِنِي فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ﴾ (۲-۱۵) اور  
انہیں مہلت دیئے جاتا ہے کہ شرارت اور سرکشی میں پڑے  
بہک رہے ہیں۔

﴿وَإِخْوَانُهُمْ يَمُدُّونَهُمْ فِي الْغَيِّ﴾ (۷-۲۰۲)  
اور ان (کفار) کے بھائی انہیں گمراہی میں کھینچے جاتے  
ہیں۔ لیکن آیت کریمہ:

﴿وَالْبَحْرُ يَمُدُّهُ مِنْ بَعْدِهِ سَبْعَةُ أَبْحُرٍ﴾  
(۳۱-۲۷) اور سمندر (کا تمام پانی) روشنائی ہو اور سات  
سمندر اور (روشنائی ہو جائیں) میں یَمُدُّہ کا صیغہ مَدَّہ  
نہرُ اُخْرُ کے محاورہ سے ماخوذ ہے۔ اور یہ اَمْدَادُ یا مَدُّ  
سے نہیں ہے جو کسی محبوب یا مکروہ چیز کے متعلق استعمال  
ہوتے ہیں بلکہ یہ مَدَّدَتْ الدَّوَاةُ اَمْدُهَا کے محاورہ

اَلْمَاخَوْرُ: شراب کی دوکان۔ وہ جگہ جہاں شراب  
فروخت ہوتی ہو۔ بَنَاتٌ مَخْرٍ: سفید ابر، موسم گرما میں  
ٹخنے والی بدلیاں۔

### (م د د)

اَلْمَدُّ کے اصل معنی (لمبائی میں) کھینچنے اور  
بڑھانے کے ہیں اسی سے عرصہ دراز کو مَدَّةٌ کہتے ہیں اور  
مَدَّةُ الْجَرْحِ کے معنی زخم کا گندہ مواد کے ہیں۔ مَدُّ  
النَّهْرِ: دریا کا چڑھاؤ۔ مَدَّةُ نَهْرٍ اُخْرٍ: دوسرا دریا اس کا  
معاون بن گیا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿أَلَمْ تَرَ إِلَىٰ رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ﴾ (۲۵-۴۵)  
تم نے نہیں دیکھا کہ تمہارا رب سائے کو کس طرح دراز کر  
کے پھیلا دیتا ہے۔

مَدَّدْتُ عَيْنِي إِلَىٰ كَذَا: کسی کی طرف حریصانہ.....  
اور للچائی ہوئی نظروں سے دیکھنا۔ چنانچہ قرآن پاک میں  
ہے:

﴿لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ﴾ (۱۵-۸۸) تم..... للچائی  
نظروں سے نہ دیکھنا۔

مَدَّدْتُهُ فِي عَيْهِ: گمراہی پر مہلت دینا اور فوراً گرفت نہ کرنا۔  
مَدَّدْتُ الْإِبِلَ: اونٹ کو مدد پلایا۔ اور مدد اس بیچ اور  
آلے کو کہتے ہیں جو پانی میں بھگو کر باہم ملا دیا گیا ہو۔  
أَمَدَّدْتُ الْجَيْشَ يَمَدَّدُ: لشکر مدد دینا۔ مکہ بھیجنا۔  
أَمَدَّدْتُ الْإِنْسَانَ بِطَعَامٍ: کسی کی طعام (غذہ)  
سے مدد کرنا۔

قرآن پاک میں عموماً اَمَدَّ (افعال) اچھی چیز کے لیے اور  
مَدَّ (ثلاثی مجرد) بری چیز کے لیے استعمال ہوا ہے چنانچہ  
فرمایا:

﴿وَإِذَا مَرُّوا بِاللَّغْوِ مَرُّوا كِرَامًا﴾ (۲۵-۷۲) اور جب ان کو یہودہ چیزوں کے پاس سے گزرنے کا اتفاق ہو تو شریفانہ انداز سے گزر جاتے ہیں۔ نیز آیت کریمہ میں اس بات پر بھی متنبہ کیا ہے کہ اگر انہیں یہودہ بات کہنے پر مجبور بھی کیا جائے تو کنایہ سے بات کرتے ہیں اور لغویات سن کر اس سے بہرے بن جاتے ہیں اور مشاہدہ کرتے ہیں تو اعراض کر لیتے ہیں۔ اور آیت کریمہ:

﴿فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ صُورَةَ مَرَّكَانَ لَمْ يَدْعُنَا﴾ (۱۰-۱۲) پھر جب ہم اس تکلیف کو اس سے دور کر دیتے ہیں (تو بے لحاظ ہو جاتا اور) اس طرح گذر جاتا ہے کہ گویا کسی تکلیف پہنچنے پر ہمیں کبھی پکارا ہی نہیں تھا۔ میں مَرَّ بِمَعْنَى آغَرَضَ ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿وَإِذَا أَنْعَمْنَا عَلَى الْإِنْسَانِ أَعْرَضَ وَنَأْبِجَانِيهِ﴾ (۱۷-۸۳) اور جب ہم انسان کو نعمت بخشتے ہیں تو روگردان ہو جاتا اور پہلو پھیر لیتا ہے۔ اَمَرَرْتُ الْحَبْلَ کے معنی رسی بٹنے کے ہیں۔ اور بٹی ہوئی رسی کو مَرِيرٌ یا مَمَرٌ کہا جاتا ہے اس سے فُلَانٌ ذُو مِرَّةٍ کا محاورہ ہے جس کے معنی طاقت ور اور توانا کے ہیں۔ ﴿ذُو مِرَّةٍ﴾ (۵۳-۶) طاقتور نے۔ مَرَّ الشَّيْءُ وَأَمَرٌ: کسی چیز کا تلخ ہونا۔ اسی سے محاورہ ہے۔

فُلَانٌ مَا يَمُرُّ وَمَا يُحْلِي: کہ فلان نہ تو کڑوا ہے اور نہ میٹھا، یعنی نہ تو اس سے کسی کو فائدہ پہنچتا ہے اور نہ ہی

سے ماخوذ ہے جس کے معنی دوات میں روشنائی ڈالنا کے ہیں اسی طرح آیت کریمہ: ﴿وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهِ مَذْدًا﴾ (۱۸-۱۰۹) اگرچہ ہم ویسا اور سمندر اس کی مدد کو لائیں۔

میں بھی مدد سے مَدَّاد یعنی روشنائی کے معنی مراد ہیں۔ اَلْمَدُّ: غلہ ناپنے کا ایک مشہور پیمانہ۔

### (م د ن)

اَلْمَدِينَةُ: بعض کے نزدیک یہ فَعِيلَةٌ کے وزن پر ہے اس کی جمع مَدَنٌ آتی ہے ۱۔ اور مَدَنَتْ مَدِينَةٌ کے معنی شہر آباد ہونے کے ہیں۔ اور بعض کے نزدیک اس میں میم زیادہ (یعنی دین سے مشتق ہے) قرآن پاک میں ہے: ﴿وَمِنْ أَهْلِ الْمَدِينَةِ مَرَدُّوا عَلَى النَّفَاقِ﴾ (۹-۱۰۱) اور بعض مدینے والے بھی نفاق پراڑے ہوئے ہیں۔

﴿وَجَاءَ مِنْ أَقْصَى الْمَدِينَةِ﴾ (۳۶-۲۰) اور شہر کے پرلے کنارے سے ایک آدمی..... آیا۔ ﴿وَدَخَلَ الْمَدِينَةَ﴾ (۲۸-۱۵) اور وہ شہر میں داخل ہوئے۔

### (م ر ر)

اَلْمُرُورُ کے معنی کسی چیز کے پاس سے گذر جانے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَإِذَا مَرُّوا بِهِمْ يَتَغَامَزُونَ﴾ (۸۳-۳۰) اور جب ان کے پاس سے گزرتے تو باہم آنکھوں سے اشارہ کرتے۔

① وايضا؟

② ومنه في الحديث لا تحل الصدقة لغني ولا لذي مرة سوى ان يخرجها النسائي وابن ماجة من حديث ابى هريرة والفائق

(۲/۲۴۴)

جانے کے۔

نقصان اور آیت کریمہ:

﴿حَمَلْتُ حِمْلًا خَفِيفًا فَمَرَّتْ بِهِ﴾ (۷-۱۸۹)

(تو) اسے ہلکا سا حمل رہ جاتا ہے۔ اور وہ اس کے ساتھ چلتی پھرتی ہے۔

میں مَرَّتْ بمعنی اسْتَمَرَّتْ ہے۔ یعنی وہ اسے اٹھائے چلتی پھرتی رہتی ہے۔

مَرَّةً (فَعْلَةً) ایک بار مَرَّتَانِ (تثنیہ) دوبار قرآن پاک میں ہے:

﴿يَنْقُضُونَ عَهْدَهُمْ فِي كُلِّ مَرَّةٍ﴾ (۸-۵۶) پھر ہر بار اپنے عہد کو توڑ ڈالتے ہیں۔<sup>۱</sup>

﴿وَهُمْ بَدَأُوا وُكْمَ أَوَّلِ مَرَّةٍ﴾ (۹-۱۳) اور انہوں نے تم سے پہلی بار (عہد شکنی کی) ابتدا کی۔

﴿إِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِينَ مَرَّةً﴾ (۹-۸۰) اگر آپ ان کے لیے ستر بار بخشش طلب فرمائیں۔ ﴿إِنْ كُنْمْ رَضِيتُمْ بِالْقُعُودِ أَوَّلِ مَرَّةٍ﴾ (۹-۸۳) تم پہلی مرتبہ

بیٹھ رہنے پر رضامند ہو گئے۔

﴿سَنُعَذِّبُهُمْ مَرَّتَيْنِ﴾ (۹-۱۰۱) ہم ان کو دوبار عذاب دیں گے۔

﴿ثَلَاثَ مَرَّاتٍ﴾ (۲۳-۵۸) تین دفعہ (یعنی تین اوقات میں)۔

مَرَجَ أَمْرُهُمْ: ان کا معاملہ ملتیس ہو گیا۔

مَرَجَ الْخَاتَمَ فِي أَصْبُعِي: انگلی انگلی میں ڈھیلی ہو گئی

مَارَجَ (صفت فاعلی) ڈھیلی انگلی۔ اَمْرٌ مَرِيجٌ گڈا اور پیچیدہ معاملہ۔ غَضَنْ مَرِيجٌ: باہم تھپی ہوئی ٹہنی۔

قرآن پاک میں ہے: ﴿فَهُمْ فِي أَمْرٍ مَرِيجٍ﴾ (سو یہ) ایک غیر واضح معاملہ میں ہیں۔

الْمَرْجَانُ: مونگا۔ چھوٹا موتی۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿كَانَهُنَّ الْيَاقُوتُ وَالْمَرْجَانُ﴾ (۵۵-۵۸) اور آیت کریمہ:

﴿مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيَانِ﴾ (۵۵-۱۹) اس نے دو دریا رواں کے جو آپس میں ملتے ہیں۔

میں مَرَجَ کا لفظ مَرَجَ کے محاورہ سے ماخوذ ہے اور جس زمین میں گھاس بکثرت ہو اور جانور اس میں گن ہو کر چرتے رہیں اسے مَرَجَ کہا جاتا ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿مَارِجٍ مِّنْ نَّارٍ﴾ (۵۵-۱۵) آگ کے شعلے سے۔

میں مَارِجَ کے معنی آگ کے (دھوئیں سے) مخلوط شعلے کے ہیں۔

أَمْرَجْتُ الدَّابَّةَ فِي الْمَرْعَى: میں نے جانور کو چراگاہ میں کھلا چھوڑ دیا چنانچہ وہ آزادی سے چرتا رہا۔

## (م ر ج)

## (م ر ج)

الْمَرْحُ کے معنی ہیں: بہت زیادہ اور شدت کی خوشی جس میں انسان اترانے لگ جائے، قرآن پاک میں ہے:

اصل میں الْمَرْجُ کے معنی خلط ملط کرنے اور ملا دینے کے ہیں اور الْمُرُوجُ کے معنی اختلاط اور مل

۱ وفی المطبوع "فی کل عام مرة" زلة من المصحح وهی آية اخرى: یفتنون فی کل عام مرة او مرتین۔ (۹-۲۶) ۱۲۔

۲ وفی الطبعة الاولى كان ههنا بیاض وفی الطبعة الحلیه (تحقیق وضبط محمد سعید کیلانی) من قولهم مرج ولم یترو الفراغ فخلطت علی خلط والصواب من قولهم مرج الدابة اذا اخلاها فی المرج ترعى (راجع الغریب للقبی ۴۳۸) وفی اللسان وهذا لایقوله الا اهل تهامة واما النحویون فبقولهم امرجته ۱۲۔



یہ کہے ہیں کہ وہ ہر قسم کے عیوب سے پاک ہوں گے۔  
جیسے محاورہ ہے:-

مَرَدٌ فُلَانٌ عَنِ الْقَبَائِحِ فُلَانٌ ہر قسم کی قباحت سے پاک ہے۔

مَرَدٌ فُلَانٌ عَنِ الْمَحَاسِنِ وہ محاسن سے عاری ہے

مَرَدٌ عَنِ الطَّاعَةِ سرکشی کرنا۔ پس آیت کریمہ: وَمِنْ أَهْلِ الْمَدِينَةِ مَرَدُّوا عَلَى النَّفَاقِ کے معنی یہ ہیں۔

کہ اہل مدینہ سے بعض لوگ..... نفاق پر اڑ کر ہر قسم کی خیر سے محروم ہو گئے ہیں۔ ۵ اور آیت کریمہ:-

﴿مُمَرَّدٌ مِّنْ قَوَارِيرَ﴾ (۲۷-۳۳) شیشے جڑے ہونے کی وجہ سے ہموار۔

میں مُمَرَّد کے معنی ہموار یا چکنا کیا ہوا کے ہیں۔ اور یہ شَجَرَةٌ مَرْدَاءُ سے ماخوذ ہے۔ گویا مُمَرَّد کے لفظ سے اس کی اس صفت کی طرف اشارہ ہے جسے شاعر نے یوں

بیان کیا ہے ۵ (سرلج) (۲۰۶) فِی مَجْدَلٍ شَيْدٍ بُنْيَانُهُ

يَزِلُّ عَنْهُ ظَفَرُ الطَّائِرِ

ایک مضبوط محل میں جس پر ایسا پلاستر لگایا گیا ہے کہ اس سے پرند کے ناخن بھی پھسل جاتے ہیں۔

﴿وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا﴾ (۱۷-۳۷) اور زمین پر اکڑ کر (اور اٹھلا کر) مت چل۔

اس میں ایک قرأت مَرَحًا بمعنی فَرَحًا بھی ہے۔

مَرَحَى: یہ کلمہ تعجب ہے (اور أَحَسَّنْتَ يَا أَصْبَتْ کی جگہ استعمال ہوتا ہے) یعنی خوب کیا کہنے ہیں!۔

### (م ر د)

الْمَارِدُ وَالْمَرِيدُ: جنوں اور انسانوں سے اس شیطان کو کہا جاتا ہے جو ہر قسم کی خیر سے عاری ہو چکا

ہو۔ قرآن پاک میں ہے:-

﴿وَحِفْظًا مِّنْ كُلِّ شَيْطَانٍ مَّارِدٍ﴾ (۷-۳۷) اور ہر شیطان سرکش سے اس کی حفاظت کے لیے۔

یہ شَجَرٌ أَمْرَدٌ سے ماخوذ ہے۔ جس کے معنی ہیں: وہ درخت جس کے پتے نہ ہوں۔ اور اسی سے رَمْلَةٌ مَرْدَاءُ ہے یعنی ریت کا ٹیلہ جس پر کوئی چیز نہ اگتی ہو اور اس سے

أَمْرَدٌ اس نوجوان کو کہتے ہیں جس کے ہنوز سبزہ نہ اگا ہو۔

حدیث میں ہے ۵ (۱۲۰) ((أَهْلُ الْجَنَّةِ كُلُّهُمْ مُرَدُّ)) کہ اہل جنت سب کے سب امرد ہوں گے۔ چنانچہ بعض نے اس حدیث کو

ظاہری معنی پر ہی حمل کیا ہے۔ اور بعض نے اس کے معنی

① رواہ الدارمی (۲/۳۳۵) والحديث في النهاية (۱/۱۸۱ و ۱۰/۴) الاضداد لابن الطيب (۱۶۲) وفي الكشف: يدخل اهل الجنة الجنة جردا مردا۔ قال الحافظ في الكافي (ص ۱۶۳ رقم ۷۶) رواه احمد وابن ابی شيبة وابو يعلى الطبرانی في الاوسط من رواية سعيد بن المسيب عن ابی هريرة وروى مرسلًا قال الترمذی وفي الباب عن معاذ بن جبل وروى مرسلًا وفي البيهقي موصلاً: ۱۲۔

② "ومرد على" باتی بمعنی التمرن والتعود على الشيء لكن على توجيه المؤلف تكون صلتها، محذوفة وعلى النفاق حال ای ارتكسوا عن الخير وهم على النفاق ۱۲۔

③ البيت من قصيدة لاعشى يهجو علقمة بن علاثة ويمدح عامر بن الطفيل في المنافرة التي جرت بينهما والقصيدة في بوانه (۹۶-۹۷) والبيت فيه ۹۶ واللسان (شيد، جدل) وفي رواية شدد بدل شيد والبلدان (رسم: وسط) وفيه منزل بدل مجدل والمراء حصن الورد وفي المطبوع الظافر بدل الطائر ولعلم زلة من المصحح وما أثبتناه طبقاً للمراجع هو لا نسب ۱۲۔

﴿وَلَيَزِيدَنَّ كَثِيرًا مِّنْهُمْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ طُغْيَانًا وَكُفْرًا﴾ (۵-۶۳) اور یہ (قرآن پاک) جو تمہارے پروردگار کی طرف سے تم پر نازل ہوا ہے اس سے ان میں سے اکثر کی سرکشی اور کفر بڑھے گا۔

اور نفاق، کفر وغیرہ اخلاق رذیلہ و (مجازاً بطور تشبیہ مرض کہا جاتا ہے۔ یا تو اس لیے کہ اس قسم کے اخلاق کسب فضائل سے مانع بن جاتے ہیں۔ جیسا کہ بیماری جسم کو کامل تصرف سے روک دیتی ہے۔ اور یا اس لیے کہ اخروی زندگی سے محرومی کا سبب بنتے ہیں۔

جس قسم کی زندگی کا کہ آیت کریمہ: ﴿وَإِنَّ الدَّارَ الْآخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ﴾ (۲۹-۶۳) اور ہمیشہ کی زندگی کا مقام تو آخرت کا گھر ہے کاش کہ یہ لوگ سمجھتے۔

میں ذکر پایا جاتا ہے۔ اور یا رذائل کو اس لیے مرض کہا جاتا ہے کہ وہ انسانی طبیعت کو رذی اخلاق کی طرف مائل کر دیتے ہیں جیسا کہ بیماری جسم کو مضر اشیاء کے کھانے پر اکساتی ہے اور چونکہ ایسے اخلاق بھی ایک طرح کا مرض ہی ہیں اس لیے قلب و صدر میں کینہ و کدورت پیدا ہونے کے لیے دَوِی صَدْرُ فُلَانٍ وَنَغَلَ قَلْبُهُ وغیرہ محاورات استعمال ہوتے ہیں ایک حدیث میں ہے: ﴿(۱۲۱)

((وَأَيُّ دَاءٍ أَدْوَأُ مِنَ الْبُخْلِ)) اور بخل سے بڑھ کر اور کوئی بیماری ہو سکتی ہے۔

اور شَمْسُ مَرِيضَةٍ اُس وقت کہتے ہیں، جب گردوغبار یا

مَارِدٌ ایک مشہور قلعے کا نام ہے۔ \* مثل مشہور ہے تَمَرَدٌ مَارِدٌ وَعَزَّ لَا بَلَقُ: مارِد (قلعہ) نے سرکشی کی اور ابلق (قلعہ) غالب رہا۔ یعنی یہ دونوں قلعے سر نہ ہو سکے۔ یہ مقولہ ایک بادشاہ کا ہے جو ان دونوں قلعوں کو زیر نہیں کر سکا تھا۔

## (مرض)

الْمَرَضُ کے معنی ہیں انسان کے مزاج خصوصی کا اعتدال اور توازن کی حد سے نکل جانا اور یہ دو قسم پر ہے مرض<sup>(۱)</sup> جسمانی جیسے فرمایا:

﴿وَلَا عَلَى الْمَرِيضِ حَرَجٌ﴾ (۲۳-۹۱) اور نہ بیمار پر کچھ گناہ ہے۔

﴿وَلَا عَلَى الْمَرَضَى﴾ (۹-۹۱) اور نہ بیماروں پر۔ دوم<sup>(۲)</sup> مرض کا لفظ اخلاق کے بگڑنے پر بولا جاتا ہے اور

اس سے جہالت بزدلی، بخل، نفاق وغیرہ جیسے اخلاق رذیلہ مراد ہوتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا: ﴿فَسَى قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ فَزَادَهُمُ اللَّهُ مَرَضًا﴾ ان کے دلوں میں کفر کا مرض تھا۔ خدا نے ان کا مرض اور زیادہ کر دیا۔ (۲-۱۰)

﴿أَفَى قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ أَمْ ارْتَابُوا﴾ (۲۳-۵۰) کیا ان کے دلوں میں بیماری ہے یا یہ شک میں ہیں۔ ﴿وَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا إِلَى رِجْسِهِمْ﴾ (۹-۱۲۵) اور جن کے دلوں میں مرض ہے۔

ان کے حق میں ثبوت پر ثبوت زیادہ کیا۔ جیسا کہ دوسرے مقام پر فرمایا:

① قاله زباء والابلق المارد و كانا حصنين في دومة الحنديل للسمول بن عاديا ليهودي فغرتها زباء فاستصعبا عليها فقالت المثل انظر المثل والحبر الميداني رقم (۲۵۹۶) والبلدان (رسم: مارد) والحيوان (۷۲/۱)

② قاله ابو بكر الصديق مخاطبا جابر بن عبدالله حين عبره بالبخل في حديث طويل اور ده البخاري في كتاب الكفالة والشهادات وفي فرض الخمس وفي المغازی (الفتح ۷۸/۸) ۱۲

تو یہ لوگ جو غیر خدا کی پرستش کرتے ہیں۔ اس سے تم غلجان میں نہ پڑنا۔

﴿فَلَا تَكُنْ فِي مِرْيَةٍ مِّن لِّقَائِهِ﴾ (۲۳-۳۲) تو تم اس کے ملنے سے شک میں نہ ہونا۔

﴿أَلَا إِنَّهُمْ فِي مِرْيَةٍ مِّن لِّقَاءِ رَبِّهِمْ﴾ (۵۴-۴۱) دیکھو! یہ اپنے پروردگار کے روبرو حاضر ہونے سے شک میں ہیں۔

الْأَمْرَاءُ وَالْمُصَارَاةُ کے معنی ایسے کام میں جھگڑا کرنا کے ہیں۔ جس کے تسلیم کرنے میں تردد ہو۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿قَوْلَ الْحَقِّ الَّذِي فِيهِ يَمْتَرُونَ﴾ (۳۴-۱۹) یہ سچی بات ہے جس میں لوگ شک کرتے ہیں۔ ﴿بِمَا كَانُوا فِيهِ يَمْتَرُونَ﴾ (۶۳-۱۵) جس میں لوگ شک کرتے تھے۔

﴿أَفْتَمَارُوهٗ عَلَى مَا يَرَى﴾ (۱۲-۵۳) کیا جو کچھ وہ دیکھتے ہیں تم اس میں ان سے جھگڑتے ہو۔

﴿فَلَا تُمَارِفُهُمْ إِلَّا مِرَّاءَ ظَاهِرًا﴾ (۲۲-۱۸) تو تم ان کے معاملے میں گفتگو نہ کرنا۔ مگر سرسری سی گفتگو۔

در اصل مَرِيْتُ النَّاقَةِ سے ماخوذ ہے۔ جس کے معنی ہیں: اونٹنی کے تھنوں کو سہلانا تاکہ دودھ دے دے۔

(مَرِيْمٌ) علیہا السلام۔ یہ عجمی لفظ ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ کا نام (قرآن پاک نے) ﴿مَرِيْمٌ﴾ (۲۵-۳) بتایا ہے۔

## (م ز ن)

الْمَزْنُ کے معنی سفید چمک دار بادل ہیں۔ اس بادل کے ایک ٹکڑے کو مُزْنَةٌ کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک

کسی اور عاصہ سے اس کی روشنی ماند پڑ جائے۔ أَمْرَضَ فُلَانٌ فِي قَوْلِهِ کے معنی تعریض اور کنایہ سے بات کرنے کے ہیں۔

الْتَمَرِيضُ: تیمارداری کرنا۔ اصل میں تَمَرِيضُ کے معنی مرض کو زائل کرنے کے ہیں اور یہ..... تَفْذِيَّةٌ کی طرح ہے جس کے معنی آنکھ سے خاشاک دور کرنا کے ہیں۔

## (م ر)

مَرءٌ وَأَمْرٌ: مرد اور مَرءٌ وَأَمْرٌ ة کے معنی عورت کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿إِن أَمْرُو هَلَك﴾ (۱۷-۴) اگر کوئی ایسا مرد مر جائے ﴿وَكَانَتِ امْرَأَتِي عَاقِرًا﴾ (۵-۱۹) اور میری بیوی بانجھ ہے۔

اور مُرْوَةٌ کے معنی کمال مردانگی کے ہیں اور یہ لفظ رَجُولِيَّةٌ کے ہم معنی ہے۔ اور الْمَرِيءُ اس نالی کو کہتے ہیں۔ جو معدہ کے سرے سے حلق تک ملی ہوتی ہے۔ اسی سے مَرُو الطَّعَامِ وَأَمْرٌ کے معنی ہیں: کھانا خوشگوار ہو گیا اور طبیعت کے موافق ہونے کی وجہ سے غذا کی نالی میں بہولت اتر گیا۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿فَكُلُّوْهُ هَنِيئًا مَّرِيئًا﴾ (۴-۴) تو اسے کھاؤ لذت اور خوش ہضم۔

## (م ر ی)

الْمِرْيَةُ کے معنی کسی معاملہ میں تردد کرنے کے ہیں اور یہ شک سے خاص ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَلَا يَزَالُ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي مِرْيَةٍ مِّنْهُ﴾ (۵۵-۲۲) اور کافر لوگ ہمیشہ اس سے شک میں رہیں گے۔ ﴿فَلَاتُكْ فِي مِرْيَةٍ مِّمَّا يَعْْبُدُ هُوَ لَاءِ﴾ (۱۰۹-۱۱)



﴿وَأَمْسَحُوا بِرُءُوسِكُمْ وَأَرْجُلُكُمْ﴾ (۶-۵)

اور سر کا مسح کر لیا کرو اور پاؤں دھو لیا کرو۔ اور کبھی مَسِئْتُ کی طرح مَسَحَتُهُ بِالسَّيْفِ کے معنی بھی تلوار سے مارنا کے آجاتے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے: ﴿

فَطَفِقَ مَسْحًا بِالسُّوقِ وَالْأَعْنَاقِ﴾

(۳۸-۳۳) پھر ان کی ٹانگوں اور گردنوں پر ہاتھ پھیرنے لگے۔ بعض نے کہا ہے کہ دجال کا نام مَسِيحُ اس لیے رکھا

گیا ہے کہ اس کے چہرے کی ایک جانب مسخ ہو چکی ہو

گی۔ چنانچہ مروی ہے کہ لا عین له ولا حاجب کہ

اس کے ایک جانب کی آنکھ اور بھوئیں کا نشان تک نہیں

ہوگا۔ اور عیسیٰ علیہ السلام کا نام مسیح اس لیے رکھا گیا ہے کہ وہ

زمین میں سیاحت کرتے تھے۔ اور ان کے زمانہ میں ایک

گروہ تھا۔ جنہیں زمین میں سیاحت کی وجہ سے مَسَائِينِ

اور سَيَّاحِينَ کہا جاتا تھا بعض کہتے ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام کے

مس کرنے سے چونکہ کوڑھی تندرست ہو جاتے تھے۔ اس

لیے آپ ﷺ کو مسیح کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ بعض

نے اس کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام مہن مادر

سے پیدا ہوئے تو یوں معلوم ہوتا تھا کہ ان کے بدن پر تیل

کی مالش کی گئی ہے۔ اس لیے انہیں مسیح کہا گیا ہے۔

بعض کا قول ہے کہ یہ عبرانی لفظ مشوح سے معرب ہے (:-) بعض

جیسا کہ موسیٰ عبرانی لفظ موثی سے معرب ہے (:-) بعض

کا قول ہے کہ مسیح اسے کہتے ہیں جس کی ایک آنکھ مٹی ہوئی

ہو اور مروی ہے ﴿ان الدجال ممسوح الیمنی

اذیت دے رکھی ہے۔

﴿مَسَّتْهُمْ إِذَا لَهُمْ مَكْرٌ فِي آيَاتِنَا﴾ (۲۱-۱۰)

تکلیف پہنچنے کے بعد تو ہماری آیتوں میں حیلے کرنے لگتے ہیں۔

﴿وَإِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ﴾ (۱۷-۶۷) اور جب تم کو

..... تکلیف پہنچتی ہے۔

### (م س ح)

الْمَسْحُ (ف) کے معنی کسی چیز پر ہاتھ

پھیرنے اور اس سے نشان اور آلائش صاف کر دینے کے

ہیں اور کبھی صرف کسی چیز پر ہاتھ پھیرنا اور کبھی ازالہ اثر

کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ مجاورہ ہے:-

مَسَحْتُ يَدِي بِالْمُنْدِيلِ: میں نے رومال سے ہاتھ

پونچھا اور گھسے ہوئے چکنے درہم (سکے) کو مَسِيحُ کہا جاتا

ہے اور ہموار اور چکنی جگہ کو مکان اَمْسَحُ کہہ دیتے ہیں۔

مَسَحَ الْأَرْضَ: اس نے زمین کی پیائش کی۔ پھر جس

طرح (مجازاً) ذَرَعُ (ناپنا) کے معنی چلنا اور مسافت طے

کرنا آجاتے ہیں۔ اسی طرح مَسَحُ کا لفظ بھی چلنے کے

معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے:-

مَسَحَ الْبَعِيرُ الْمَفَازَةَ وَذَرَعَهَا: اونٹ نے بیابان کو

عبور کیا۔ اصطلاح شریعت میں مَسَحُ کے معنی اعضاء پر

پانی گزارنے کے ہیں۔ چنانچہ مجاورہ ہے:-

مَسَحْتُ لِلصَّلَاةِ وَتَمَسَّحْتُ: میں نے نماز کے

لیے مسح کیا۔ قرآن پاک میں ہے:-

① روی ذالک عن ابن عباس وقتادة ومقاتل وغيرهم واختاره الزمخشري لكن الرازي ذهب الى ان المراد منه المسح باليد لا بالسيف وهذا اقرب وقد حقق الألوسي البحث ورد المعنى الاول ردا بليغا (راجع ۱۷۵/۲۳-۱۷۹) وقارن القبتى ۳۷۹ والطبرى ۱۰۰/۲۳ والقرطبي ۱۹۵/۲۳ والبحر ۳۹۶/۷ واللدبر ۲۰۹۔

② قد ذكر هذه الاقوال ابن الاثير في النهاية (مسح) ۱۲۔

کے اندر کتے کی سی شدت حرص پیدا ہو جائے یا خنزیر کی طرح جنسی خواہش میں اندھا ہو جائے یا بیل کی سی حماقت اختیار کرے۔ چنانچہ آیت کریمہ:

﴿وَجَعَلَ مِنْهُمْ الْفِرْدَ وَ الْخَنَازِيرَ﴾ (۵-۶۰)

اور ان میں سے بندر اور سور بنا دیئے۔

کی تفسیر میں ایک قول یہ بھی ہے۔ کہ یہاں بندر اور خنزیر بنا دینے سے ان کے اخلاق و عادات بگاڑ دینا مراد ہے۔

اور آیت کریمہ:

﴿لَمَسْخَنهُمْ عَلَى مَكَائِهِمْ﴾ (۳۶-۶۷) تو ان کی جگہ ان کی صورتیں بدل دیں۔

میں مسخ کے دونوں معنی ہو سکتے ہیں۔ اگرچہ پہلے معنی زیادہ واضح ہیں۔ ۱ اور الْمَسِيخُ وہ کھانا جو بے مزہ ہو۔ چنانچہ شاعر نے کہا ہے۔ ۲ (المقارِب)

(۴۰۸) وَأَنْتَ مَسِيخٌ كَلْحَمِ الْحَوَارِ

اور تو حواری یعنی اونٹ کے نوزائیدہ بچے کے گوشت کی طرح بے مزہ ہے۔

مَسَخْتُ النَّاقَةَ: میں نے ناقہ کو دبلا کر کے اس کی شکل بگاڑ دی۔

الْمَاسِيخِيُّ کے معنی کمان ساز کے ہیں یہ مَاسِيخَةُ قَبِيلہ کی طرف منسوب ہے۔ جو کمانیں بنایا کرتا تھا پھر ہر کمان

وان عیسیٰ مسموح الیسری کہ دجال کی دائیں اور عیسیٰ عَلَیْہِ السَّلَام کی بائیں آنکھ مٹی ہوئی ہوگی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ دجال علم و عقل، حلم اور دیگر اخلاق جمیلہ سے کلیتہً محروم ہوگا اس کے برعکس عیسیٰ عَلَیْہِ السَّلَام کی بائیں آنکھ مٹنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ جہالت، حرص اور دیگر اخلاق مذمومہ سے پاک تھے۔

پھر جس طرح مَسَّ اور لَمَسَّ کے الفاظ کنایۃً مجامعت کے لیے آجاتے ہیں۔ اسی طرح مَسَخٌ بھی مجامعت کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ معمولی پسینے پر بھی مَسِيخٌ کا لفظ بولا جاتا ہے۔ اور مَسَخٌ ٹاٹ کو کہتے ہیں۔ اس کی جمع مَسُوحٌ و اَمْسَاحٌ آتی ہے۔ اَلْتِمْسَاحُ مگر مجھ کو کہتے ہیں اور تشبیہ کے طور پر سرکش آدمی کو بھی تِمْسَاح کہہ دیتے ہیں۔

## (م س خ)

الْمَسَخُ: کے معنی شکل و صورت بگاڑ دینا اور اخلاق و عادات خراب کر دینا کے ہیں۔ بعض حکماء نے کہا ہے کہ مسخ دو قسم پر ہے ایک مسخ خاص یعنی شکل و صورت بگاڑنا یہ خاص قوم کے ساتھ خاص دور میں ہوا تھا دوم مسخ عام یعنی اخلاق و عادات کا بگاڑنا یہ ہر دور میں ہو سکتا ہے کہ انسان جانوروں کے سے اخلاق اختیار کر لے مثلاً اس

① ذهب الى الاول ابن عباس وايضا روى عنه ان المسخ بمعنى الهلاكه (روح المعاني ۲۳/۴۲)

② البيت لاشعر الرقبان الاسدي الجاهلي (اسمه عمرو بن حارثه) يهجو رجلا اسمه رضوان وكان نزل به فلم يقره (ترجمة في المرزباني ۱۹) وتمامه: فلانت حلو ولامر وفي رواية الامالي (۲/۲۱۱) سيلخ ميلخ وفي اللسان مسيخ ميلخ بدل وانت مسيخ راجع اللسان والتاج (ضرر، مسخ) ومحالس ثعلب (۱/۱۹۸) والمسط (۲/۸۳) وما ذكره المؤلف رواية ابي زيد في النوادر (۷۳) والبيت في الميدان (۲/۲۳۴، ۱۸۶، ۲۵۱) والمؤلف (۴۷، ۱۳۳) والجمهرة (۲/۲۱۱، ۲۵۱) والمرزباني ۱۹ والمخصص (۵/۱۱/۳۸) وكتاب الابدال (۳۵۰) ومحاضرات المؤلف (۱/۳۱۳) والحيوان للملاحظ (۱/۳۰۱) وتهذيب الالفاظ والايات سنة وفي المؤلف (۳۰) والمعجم للمرزباني (۳۵) في رواية ثعلب عزاه الى عمرو بن ثعلبة الشيباني وهو شاعر جاهلي خبيث۔

﴿أَمْ آتَيْنَاهُمْ كِتَابًا مِنْ قَبْلِهِمْ فَهُمْ بِهِ مُسْتَمْسِكُونَ﴾  
(۲۱-۲۳) یا ہم نے ان کو اس سے پہلے کوئی کتاب دی تھی تو  
یہ اس سے (سند) پکڑتے ہیں۔

معاورہ ہے۔

تَمَسَّكْتُ بِهِ وَمَسَّكْتُ بِهِ: کسی چیز کو پکڑنا اور تھام  
لینا۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:-  
﴿وَلَا تُمْسِكُوا بِعَصَمِ الْكُوفِرِ﴾ (۶۰-۱۰) اور  
کافر عورتوں کی ناموس قبضے میں نہ رکھو (یعنی کفار کو واپس  
دے دو۔

أَمْسَكْتُ عَنْهُ كَذَا: کسی سے کوئی چیز روک لینا۔  
قرآن پاک میں ہے:-

﴿هَلْ هُنَّ مُّمْسِكٌ رَحْمَتِهِ﴾ (۳۸-۳۹) تو وہ  
اس کی مہربانی کو روک سکتے ہیں۔

اور کنایہ کے طور پر اساک بمعنی بخل بھی آتا ہے اور  
مُسْكَةٌ مِنَ الطَّعَامِ وَالشَّرَابِ: اس قدر کھانے یا  
پینے کو کہتے ہیں جس سے سدرق ہو سکے۔

الْمَسْكُ: (چوڑا) ہاتھی دانت کا بنا ہوا زیور جو عورتیں  
کلائی میں پہنتی ہیں۔ الْمَسْكُ: کھال جو بدن کے  
ڈھانچے کو تھامے رہتی ہے۔

### (م ش ج)

الْمَشِيخُ: مخلوط شے۔ جِ آمَشَاجِ قرآن  
پاک میں ہے ﴿آمَشَاجِ تَبْتَلِيهِ﴾ (۲-۷۶) (نطفہ مخلوط  
سے پیدا کیا تاکہ اسے آزمائیں۔

یعنی خون کی مختلف خلطوں سے اور مختلف خلطوں سے

ساز کو باغی (منسوباً) کہا جانے لگا ہے۔ جیسا کہ ہر آہنگر کو  
ہَالِکِیُّ کہا جاتا ہے۔

### (م س د)

الْمَسْدُ: کھجور کے درخت کی پتے نکالی ہوئی  
شاخوں کا ریشہ، جسے بٹ کر رسی بنائی جاتی ہے ﴿قرآن  
پاک میں ہے:-

﴿حَبْلٌ مِنْ مَّسِدٍ﴾ (۵-۱۱۱) یعنی کھجور کے پتھوں سے  
بنی ہوئی رسی۔

اِمْرَءٌ مَمْسُودَةٌ: بنی ہوئی رسی کی طرح گتھے ہوئے  
گوشت والی (اور معتدل قامت) عورت۔

### (م س ک)

إِمْسَاكَ الشَّيْءِ کے معنی کسی چیز سے چٹ  
جانا اور اس کی حفاظت کرنا کے ہیں۔ قرآن پاک میں  
ہے:- ﴿فَإِمْسَاكَ بِمَعْرُوفٍ أَوْ تَسْرِيعٍ  
بِإِحْسَانٍ﴾ (۲-۲۲۹) پھر (عورت کو) یا تو بطریق  
شائستہ (نکاح میں) رہنے دینا ہے یا بھلائی کے ساتھ  
چھوڑ دینا ہے۔

﴿وَيُمْسِكُ السَّمَاءَ أَنْ تَقَعَ عَلَى الْأَرْضِ﴾  
(۶۵-۲۲) اور وہ آسمان کو تھامے رہتا ہے کہ زمین پر نہ گر  
پڑے۔

إِسْتَمْسَكْتُ الشَّيْءَ کے معنی کسی چیز کو پکڑنے اور  
تھامنے کا ارادہ کرنا کے ہیں۔ جیسے فرمایا: ﴿فَاسْتَمْسِكْ  
بِالَّذِي أُوحِيَ إِلَيْكَ﴾ (۴۳-۴۳) پس تمہاری  
طرف جو وحی کی گئی ہے اسے مضبوط پکڑے رہو۔

۱ کذا ذكره القتيبي في غريبه (۵۴۲) وقال عروة بن الزبير هو السلسلة التي ذكرها الله تعالى في سورة الحاقة (۳۲) انظر الطبري (۳۴۰/۳۰) وروى عن مجاهد سفيان انظر المشكل (۱۲۳-۱۲۲) فيه، كذلك قال ابن عباس۔

شَرِبْتُ مَشِيًّا وَمَشَوًا: میں نے سہل دوپٹی۔ اَلْمَاشِيَّةُ: مویشی یعنی بھیڑ بکری کے ریوڑ کو کہتے ہیں۔ اور اَمْرَاةٌ مَاشِيَّةٌ اس عورت کو کہتے ہیں جس کے بچے بہت ہوں۔

### (م ص ر)

اَلْمِصْرُ: ہر محدود شہر کو (جس کے گرد فصیل ہو) مصر کہتے ہیں۔ اور مِصْرَتٌ مِصْرًا کے معنی شہر آباد کرنے کے ہیں۔ دراصل مِصْرٌ دو چیزوں کے مابین حد کو کہتے ہیں۔ چنانچہ ہجر شہر میں مکانات کے بیچ ناموں کی شروط میں یہ الفاظ خاص طور پر لکھے جاتے تھے۔ اِشْتَرَى فُلَانٌ الدَّارَ بِمِصْرٍ رَہَا: فلاں نے یہ مکان اس کی حدود (ازبجہ) کے ساتھ خرید کیا۔ اور کسی شاعر نے کہا ہے: (البسيط)

(۴۰۹) وَجَاعِلُ الشَّمْسِ مِصْرًا لَاخْفَاءَ بِهِ  
بَيْنَ النَّهَارِ وَبَيْنَ اللَّيْلِ قَدْ فَصَّلَا

(بلاشبہ) اللہ تعالیٰ نے سورج کورات اور دن کے درمیان حد فاصل بنا رکھا ہے۔

اور آیت کریمہ:-

﴿اَدْخُلُوا مِصْرَ﴾ (۱۲-۹۹) مصر میں داخل ہو جاؤ۔

میں مصر سے مشہور شہر مصر مراد ہے۔ اور تخفیف کے طور پر اسے منصرف کر دیا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اس سے کوئی ایک شہر مراد ہے۔<sup>①</sup>

اَلْمَاصِرُ: دو پانیوں کے درمیان حد فاصل۔ مِصْرَتٌ

مختلف قوی مراد ہیں۔ جن کی طرف کہ آیت ﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ سُلَالَةٍ إِلَى قَوْلِهِ خَلَقًا آخَرَ﴾ (۱۲-۲۳) اور ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصہ سے پیدا کیا۔ میں اشارہ پایا جاتا ہے۔

### (م ش ی)

اَلْمَشْيُ: (ض) کے معنی ایک مقام سے دوسرے مقام کی طرف قصد اور ارادہ کے ساتھ منتقل ہونے کے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:- ﴿كُلَّمَا أَصَاءَ لَهُمْ مَشْوًا فِيهِ﴾ (۲۰-۲) جب بجلی چمکتی اور ان پر روشنی ڈالتی ہے تو اس میں چل پڑتے ہیں۔ ﴿وَمِنْهُمْ مَنْ يَمْشِي عَلَى بَطْنِهِ الْآيَةِ﴾ (۲۳-۲۵) ان میں سے بعض ایسے ہیں جو پیٹ کے بل چلتے ہیں۔ ﴿يَمْشُونَ عَلَى الْأَرْضِ هَوْنًا﴾ (۲۵-۶۳) جو زمین پر آہستگی سے چلتے ہیں۔ ﴿فَامْشُوا فِي مَنَاكِبِهَا﴾ (۶۷-۱۵) تو اس کی راہوں میں چلو پھرو۔

اور کنایہ مَشْيٌ کا لفظ کھانے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:-

﴿هَمَّازٌ مَشَاءٌ بِنَمِيمٍ﴾ (۶۸-۱۱) طعن آمیز اشارتیں کرنے والا چنٹلیاں لیے پھرنے والا۔

اور کنایہ کے طور پر مَشْيٌ کے معنی سہل پینا بھی آتے ہیں۔ چنانچہ محاورہ ہے۔

① وفی غریب القبتی (۵۰۲): یرید اختلاط ماء الرجل بماء المرأة وكذا قال قال ابن عباس وغیره علی ما فی الفجر (۲۹۱/۲۹) والطبرانی (۱۲۶/۲۹) وانظر احکام شافعی (۱۸۸/۲-۱۸۹)

② وفی اللسان قال امیہ یذكر حکمة الخالق وقال ابن البری البیت لعدی بن زید العبادی وهو الصواب راجع تفسیر الطبری (۷۱: ۱) والخفاجی شرح الدرة (۹۴) والبیث ایضا فی البحر (۱/۲۲۰: ۴۵۵)

③ والیہ ذهب عامة المفسرين وحکی عن مالک انه مصر مسکن فرعون وفی مصحف عبد الله بن مسعود بلا الف ولام یؤید ذالک (روح المعانی ۱: ۲۵۰)



بوٹی بنا کر جس کی بناوٹ کامل بھی ہوتی ہے اور ناقص بھی۔  
 الْمَصَاعِفُ: چبانے سے جو آخر کار منہ میں باقی رہ جائے۔  
 الْمَصِغَانِ: دونوں جبرے۔ کیونکہ ان سے کھانا چبایا  
 جاتا ہے۔ الْمَصَانِعُ: (واحد مَصِغَةٌ) وہ تانت جو کمان  
 کے دونوں سروں پر کسی ہوتی ہیں۔

### (م ض ی)

الْمُضْيِ وَالْمَضَاءُ: کسی چیز کا گذر جانا اور  
 چلے جانا یہ ایمان واحداث دونوں کے متعلق استعمال ہوتا  
 ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہیں۔  
 ﴿وَمُضْيِ مَثَلُ الْأَوَّلِينَ﴾ (۸۳-۸) اور اگلے  
 لوگوں کی مثال گذر گئی۔  
 ﴿فَقَدْ مَضَتْ سُنَّتُ الْأَوَّلِينَ﴾ (۸-۳۹) تو اگلے  
 لوگوں کی سنت گذر چکی ہے (وہی ان کے حق میں برتی  
 جائے گی)۔

### (م ط ر)

الْمَطَرُ کے معنی بارش کے ہیں اور جس دن  
 بارش برسی ہو اسے یَوْمٌ مَّطِيرٌ وَمَا طَرَّ وَمُطِيرٌ کہتے  
 ہیں۔ وَادٍ مَّطِيرٌ باران رسیدہ وادی۔ مَطَرَتْنَا السَّمَاءُ  
 وَأَمْطَرَتْنَا کے معنی بارش برسا کے ہیں۔  
 مَا مَطَرْتُ مِنْهُ بِخَيْرٍ: مرا ازو خیرے نہ رسید۔ بعض  
 نے کہا ہے کہ مَطَرٌ اچھی اور خوشگوار بارش کے لیے بولتے  
 ہیں اور اَمْطَرٌ عذاب کی بارش کے لیے ۵ چنانچہ قرآن  
 پاک میں ہے۔

النَّاقَةُ کے معنی اونٹنی کو انگلیوں کے اطراف سے دوہنا کے  
 ہیں۔ اسی سے محاورہ ہے۔ لَهُمْ غَلَّةٌ يَمْتَصِرُونَهَا۔  
 ان کے پاس کچھ غلہ ہے۔ جسے وہ تھوڑا تھوڑا کر کے  
 استعمال کرتے ہیں۔ ثوبٌ مُمَصَّرٌ: (گیرو سے رنگا ہوا  
 کپڑا) گہرا رنگا ہوا کپڑا۔

نَاقَةُ مَصُورٌ کم اور بمشکل دودھ دینے والی اونٹنی۔

حسن نے کہا ہے لَا بَأْسَ بِكَسْبِ التِّيَاسِ مَا لَمْ  
 يَمَصَّرْ وَلَمْ يَبْسُرْ: کہ ساند والے کی کمائی میں کچھ  
 مضائقہ نہیں بشرطیکہ وہ انگلیوں سے نہ نچوڑے۔ اور نہ ہی  
 مادہ کی خواہش کے بغیر زسانڈ اس سے جفتی کھائے۔  
 الْمَصِيرُ: آنت۔ ج مَصْرَانٌ۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ  
 صَارَ سے مَفْعَلٌ کے وزن پر اسم ظرف ہے۔ اور آنت کو  
 مَصِيرٌ اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ طعام کی قرار گاہ بنتی ہے۔

### (م ص غ)

الْمُضَغَةُ: گوشت کا چھوٹا سا ٹکڑا جو چبانے  
 کے لیے منہ میں ڈالا جاسکے۔ شاعر نے کہا ہے ۵ (الوافر)  
 (۴۱۰) يَلْجِجُ مُضَغَةً فِيهَا آيْنُضٌ  
 وہ گویا نیم پختہ گوشت کی بوٹی کو منہ میں پھراتا ہے۔ پھر  
 جنین کی اس حالت کو جو علقہ کے بعد ہوتی ہے۔

مضغۃ: کہا جاتا ہے چنانچہ قرآن پاک میں ہے: ﴿فَخَلَقْنَا  
 الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظَامًا﴾  
 (۲۳-۱۳) اور لوتھڑے کی بوٹی کی ہڈیاں بنائیں۔ اور فرمایا:  
 ﴿مِنْ مُضْغَةٍ مُخْلَقَةٍ وَغَيْرِ مُخْلَقَةٍ﴾ (۲۲-۵)

① قاله زبير وقد مر في (لحج)

② الفرق منقول عن أبي عبيدة وعلماء اللغة وذكره الحریری فی الدرة وعزاه الی بعض علماء التفسیر وردہ فی الکشاف  
 والخفاجی فی الدرة (۲۳) اذا لواقع فی القرآن اتفاقا لا وضعا۔

اپنے گھر والوں کے پاس اکڑتا ہوا چل دیا۔  
 اَلْمَطِيَّةُ: وہ اونٹ جس کی اَلْمَطَا یعنی پیٹھ پر سواری کی جاتی ہے اور اَمْتَطِيَّتُهُ: (افتعال) کے معنی ہیں: میں اس کی پیٹھ پر سوار ہوا اسی سے مجازاً اس رفیق کو جس پر انسان کو پورا بھروسہ ہو مَطِيٌّ کہا جاتا ہے جیسے ظہرؑ

### (مَعَ)

مَعَ: اجتماع کے معنی کو چاہتا ہے۔ خواہ وہ اجتماع مکانی، ہو جیسے هُمَا مَعًا فِي الدَّارِ: وہ دونوں ایک مکان میں ہیں۔ اور خواہ (۲) زمانی جیسے: هُمَا وَلِدَا مَعًا وہ دونوں ایک وقت میں پیدا ہوئے۔

اور (۳) خواہ معنوی اعتبار سے ہو جیسے: أَخٌ يَأْتُكَ بِغَيْرِهَا اسمائے اضافی ہیں کہ ایک آدمی کو اسی وقت دوسرے کا بھائی کہا جاسکتا ہے۔ جب وہ بھی اس کا بھائی ہو۔ کبھی (۴) وہ اجتماع رتبہ اور شرف کے لحاظ سے ہوتا ہے۔ جیسے هُمَا مَعًا فِي الْعُلُوِّ وہ دونوں بلند رتبہ ہونے میں برابر ہیں۔

اور کبھی مَعَ کا لفظ معنی نصرت کو چاہتا ہے۔ اس وقت یہ منصور یعنی جس کی مدد کی جاتی ہے۔ اس کا مضاف الیہ بنتا ہے۔ جیسے فرمایا۔

﴿لَا تَخْزَنَ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا﴾ (۹-۳۰) کہ غم نہ کر، خدا ہمارے ساتھ ہے۔

تو یہاں مَعَ کے مضاف الیہ یعنی تاضمیر سے منصور مراد ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ ناصر ہے۔ جس کی معیت تاضمیر کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔ نیز فرمایا ﴿إِنَّ اللَّهَ مَعَ الَّذِينَ اتَّقَوْا﴾ (۱۶-۱۲۸) کچھ شک نہیں کہ جو پرہیزگار ہو..... خدا ان کا مددگار ہے۔

﴿وَأَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَطَرًا فَسَاءَ مَطَرُ الْمُنْذِرِينَ﴾ (۲۶-۱۷۳) اور ان پر ایک بارش برسائی سو جو بارش ان (لوگوں) پر برسی جو ڈرائے گئے تھے بری تھی۔

﴿وَأَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَطَرًا فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِينَ﴾ (۷-۸۴) اور ہم نے ان پر (پتھروں کی) بارش برسائی۔ سو دیکھ لو کہ گنہگاروں کا کیا انجام ہوا۔

﴿وَأَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ حِجَارَةً﴾ (۱۵-۷۴) اور ان پر (کھنگڑی) پتھریاں برسائیں۔

﴿فَأَمْطَرْنَا عَلَيْنا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَاءِ﴾ (۸-۳۲) تو ہم پر آسمان سے پتھر برسائے۔

مَطَرٌ وَتَمَطَّرَ کے معنی بارش کی طرح تیز رفتاری کے ساتھ زمین پر چلے جانے کے ہیں۔ چنانچہ باران کی رفتار گھوڑے کو فَرَسٌ مُتَمَطِّرٌ کہا جاتا ہے: اَلْمُسْتَمَطِّرُ: بارش طلب کرنے والا، کھلا میدان جہاں بارش سے کوئی روک نہ ہو۔ اور کنایہ کے طور پر طالب خیر یعنی سائل کو مُسْتَمَطِّرٌ کہا جاتا ہے۔ شاعر نے کہا ہے (المقارب)

(۲۱۱) فَوَادٍ خِطَاءٌ وَوَادٍ مَطَرٌ

ایک وادی میں وہ قدم یعنی آہستہ چلتا ہے اور دوسری میں بارش کی طرح دوڑتا ہے۔

### (مَطَى)

اَلتَّمَطَّى (تفعّل) اس کے اصل معنی اَلْمَطَا (پیٹھ) کو بڑھانے اور لمبا کرنے کے ہیں (جیسا کہ انگریزی لیتے وقت انسان کرتا ہے۔ اور کنایہ کے طور پر اکڑ کر چلنے کے معنی میں آتا ہے) قرآن پاک میں ہے:-

﴿ثُمَّ ذَهَبَ إِلَىٰ أَهْلِهِ يَتَمَطَّى﴾ (۷۵-۳۳) پھر

الْمَاءُ فَهُوَ مَعِينٌ سے ماخوذ ہے مَمْعَانٌ: پانی بننے کی جگہ اَمْعَنَ الْفَرَسُ: گھوڑے کا دوڑ میں دوڑ نکل جانا۔ اَمْعَنَ بِحَقِّي: اس نے میرے حق کا انکار کر دیا۔ فُلَانٌ مَعْنٌ فِي حَاجَتِهِ اس نے اپنی حاجت میں کوشش کی۔ بعض نے کہا ہے کہ مَاءٌ مَعِينٌ میں مَعِينٌ عین سے مشتق ہے اور اس میں میم زائدہ ہے۔

### (م ق ت)

الْمَقْتُ کے معنی کسی شخص کو فعل قِیح کا ارتکاب کرتے ہوئے دیکھ کر اس سے بہت بغض رکھنے کے ہیں۔ یہ مَقْتُ مَقَاتَةٌ فَهُوَ مَقِيْتُ وَمَقَّتُهُ فَهُوَ مَقِيْتُ وَمَمْقُوتٌ سے اسم ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَمَقْتًا وَّ سَاءَ سَبِيْلًا﴾ (۲۲-۴) یہ نہایت بے حیائی اور (خدا کی) ناخوشی کی بات تھی اور بہت برا دستور تھا۔ جاہلیت میں اپنے باپ کی بیوہ سے شادی کرنے کو ننگساحُ الْمُقِيْتِ کہا جاتا تھا۔ الْمُقِيْتِ کی اصل قُوَّةٌ ہے جس کی تشریح پہلے گزر چکی ہے۔

### (م ک ک)

مَكَّةُ: یہ ایک مشہور شہر کا نام ہے۔ اور تَمَكَّكْتُ الْعَظْمَ سے مشتق ہے۔ جس کے معنی ہڈی سے گوشت اور مغز نکالنے کے ہیں۔ اِمْتَكَّ الْفَصِيْلُ مَا فِي ضَرْعِ اُمِّهِ: اونٹ کے بچے نے اپنی ماں کے پستانوں سے سارا دودھ چوس لیا۔ اسی سے

﴿وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ﴾ (۵۷-۴) اور تم جہاں کہیں ہو وہ تمہارے ساتھ ہے۔ ﴿اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ﴾ (۱۵۳-۲) بے شک خدا صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ ﴿اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (۸-۱۹) اور خدا تو مومنوں کے ساتھ ہے۔

اور موسیٰ علیہ السلام کے قول کی حکایت بیان کرتے ہوئے فرمایا: ﴿اِنَّ مَعِيَ رَبِّي سَيَهْدِيْنِ﴾ (۶۲-۲۶) میرا پروردگار میرے ساتھ ہے۔ وہ مجھے رستہ بتائے گا۔ رَجُلٌ اِمْعَةٌ: اناڑی آدمی جو ہر ایک کے ساتھ ہو جائے۔ اَلْمَعْمَعَةُ: آتشزدگی کی آواز۔ لڑائی میں بہادری کا شور۔ اَلْمَعْمَعَانُ: لڑائی کی شدت۔

### (م ع ن)

اَلْمَعَزُ: بکریاں۔ قرآن پاک میں ہیں: ﴿وَمِنْ اَلْمَعَزِ اَتْنِيْنِ﴾ (۱۴۳-۶) اور دو بکریوں میں سے۔ اَلْمَعِيْرُ: بکریوں کے ریوڑ کو کہتے ہیں جیسا کہ ضَمِيْنٌ۔ بھیڑوں کے ریوڑ پر بولا جاتا ہے۔

رَجُلٌ مَاعِزٌ: سخت جسم والا آدمی۔ اَلْمَاعِزُ وَالْمَعَزَاءُ: سخت جسم والا آدمی۔ اَلْمَاعِزُ وَالْمَعَزَاءُ: سخت زمین استمعز فی امرہ: کسی کام میں کوشش کرنا۔

### (م ع ن)

مَاءٌ مَّعِيْنٌ: جاری پانی کو کہتے ہیں۔ یہ مَعْنٌ

① قاله امرؤ القيس في فرس وصدرة: له وثبات كوثب الطباء. والقصيدا مقيدة انقافيه في ٤٤ بيتا وهي في ديوانه (صنعة السندوبى ٥٢-٥٧) والبيت في آخر القصيدة وبعده المقطع. وتعدو كعد ونجاة الضياء. اخطاها الحادف المقتدر. والبيت في العقد النعمين (١٢٨) والمعاني للقبتي (٢٠) وكتاب الخيل لابي عبيدة (١٤٠) وقال في الآخره: وقد تروى هذه الايات لربيعه بن جشم النمري وراجع للبيت محاضرات الادباء (٤: ٦٤١) واللسان (خطا) وخطا جمع خطوة قال ابن البر معناه اى تخطو مرة فتكف عن العدد وتعد مرة عدوا يشبه المطر وفي رواية ابي عبيدة: فواد خطيط وكذا في المعاني للقبتي ٢٠ مع اختلاف طفيف في رواية وفي روايته كصوب الخريف والمعنى واحدا لان صوب الخريف يقع بموضع ويخطى اخرى ١٢.

چنانچہ آیت کریمہ:-

﴿وَاللَّهُ خَيْرٌ الْمَكْرِينِ﴾ (۵۴-۳) اور خدا خوب

تدبر کرنے والا ہے۔

پہلے معنی پر محمول ہے۔ اور دوسرے معنی کے متعلق فرمایا:-

﴿وَلَا يَحْقِيقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ إِلَّا بِأَهْلِهِ﴾ (۴۵-۳۵)

اور بری چال کا وبال اس کے چلنے والے پر ہی پڑتا ہے۔

﴿وَإِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا﴾ (۸-۳۰) اور

(اے محمدؐ) اس وقت کو یاد کرو۔ جب کافر لوگ تمہارے

بارے میں چال چل رہے تھے۔ اور آیت کریمہ:-

﴿وَمَكْرُؤًا مَكْرًا وَمَكْرُؤًا مَكْرًا﴾ (۵۰-۲۷) اور

وہ ایک چال چلے اور ہم بھی ایک چال چلے۔

میں دونوں معنی مذکور ہیں۔ یعنی مَكْرُؤًا سے مکر مذموم

اور مَكْرُؤًا سے مکر محمود مراد ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ مکر خداوندی کے معنی بندے کو ڈھیل

دے رکھنے اور دنیوی ساز و سامان پر خوب قدرت دینے

کے ہیں اسی لیے امیر المومنینؑ نے فرمایاں۔ (۱۲۳)

مَنْ وَبَّعَ عَلَيْهِ دُنْيَاهُ وَلَمْ يَعْلَمْ أَنَّهُ مَكْرٌ بِهِ فَهُوَ

مَسْخُودٌ فِي عَقْلِهِ۔ کہ جس پر اس کی دنیا فراخ کر

دی گئی ہو اور وہ یہ نہ سمجھا ہو کہ اسے ڈھیل دی گئی ہے۔ تو وہ

فریب خوردہ اور احمق ہے۔

## (م ک ن)

الْمَكَانُ: اہل لغت کے نزدیک مکان اس جگہ

کو کہتے ہیں جو کسی جسم پر حاوی ہو۔ بعض متکلمین کے

ز نزدیک یہ من قبیل عرض ہے اور جسم حاوی و محوی دونوں کے

تَمَكُّكٌ بمعنی استقصاء استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ حدیث

ہے۔ (۱۲۳) ﴿لَا تَمَكُّوْا عَلٰی غُرِّ مَآءٍ كُمْ﴾

اپنے قرضداروں سے مطالبہ میں اصرار نہ کرو۔

اور مَكَّةٌ کو مَكَّةً اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی حدود

کے اندر ظلم کرنے والوں کو ہلاک کر دیتا ہے۔ خلیل کا قول

ہے کہ روئے زمین کے وسط میں واقع ہونے کی وجہ سے

اسے مکہ کہا گیا ہے جیسا کہ مغز ہڈی کے درمیان ہوتا ہے۔

الْمَكْوُكُ: (والجمع مکا کی) صواع کی طرح کا ایک طاس

جو پانی پینے اور غلہ ماپنے کے کام آتا ہے (یہ صاع کا ۱/۴

ہوتا ہے)۔

## (م ک ث)

الْمَكْتُ: کسی چیز کے انتظار میں ٹھہرے

رہنے کے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:-

﴿فَمَكْتُ غَيْرَ بَعِيدٍ﴾ (۲۲-۲۷) ابھی تھوڑی ہی دیر

ہوئی تھی۔

ایک قرأت میں مَكْتُ ہے۔ نیز فرمایا۔

﴿إِنَّكُمْ مَّا كُنْتُمْ﴾ (۷۷-۴۳) تم ہمیشہ (اسی حالت

میں) رہو گے۔

﴿قَالَ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ﴾ (۲۸-۲۹) تو اپنے گھر والوں

سے کہنے لگے کہ تم یہاں ٹھہرو۔

## (م ک ر)

الْمَكْرُ کے معنی کسی شخص کو حیلہ کے ساتھ اس

کے مقصد سے پھیر دینے کے ہیں۔ یہ دو قسم پر ہے (۱) اگر

اس سے کوئی اچھا فعل مقصود ہو تو محمود ہوتا ہے ورنہ مذموم۔

① انظر للحديث في الفائق (۲/۲۵۲) والنهاية وفيه لا تَمَكُّوْا..... وفي رواية لا تَمَكُّوْا (مكلك ۴/۳۴۹) راجع غريب

ابن عبيد (۱۲۳/۳)

اور اَمْكَنْتُمْ فُلَانًا مِّنْ فُلَانٍ کے معنی کسی کو دوسرے پر قدرت دینے کے ہیں۔ مَكَانٌ وَ مَكَانَةٌ جگہ اور حالت کو کہتے ہیں قرآن پاک میں ہے۔ ﴿اَعْمَلُوا عَلٰی مَكَانَتِكُمْ﴾ (۳۹-۳۹) اپنی جگہ پر عمل کیے جاؤ۔

ایک قراءت میں مَكَانَاتِكُمْ بصیغہ جمع ہے۔ اور آیت کریمہ۔

﴿ذِي قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِينٍ﴾ (۸۱-۲۰) جو صاحب قوت، مالک عرش کے ہاں اونچے درجے والا ہے۔ میں مکین بمعنی متمکن یعنی صاحبِ قدر و منزلت ہے۔ مَكَانَاتُ الطَّيْرِ وَ مَكَانَاتُهَا: پرندوں کے گھونسلے۔

الْمَكْنُ: سوسمار وغیرہ کے انڈے۔ آیت کریمہ: ﴿يَبْضُ الْمَكْنُ﴾ (۳۷-۳۹) محفوظ انڈے۔<sup>۱</sup>

خلیل کا قول ہے کہ لفظ مکان (صیغہ ظرف) مفعول کے وزن پر ہے اور یہ کَسُوْنُے مشتق ہے پھر کثیر الاستعمال ہونے کی وجہ سے اسے فعال کا حکم دے کر اس سے تَمَكَّنَ تَمَكَّنَ وغیرہ مشتقات استعمال ہوئی ہیں۔ جیسے مَنَزَلَ سے تَمَنَزَلَ وغیرہ۔

### (م ک و)

مَكَالَ الطَّيْرِ يَمْكُوْا مَكَاءً کے معنی پرندے

سیٹی بجانے کے ہیں۔ چنانچہ آیت کریمہ: ﴿وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ اِلَّا مَكَاءً وَتَصَدِيَةً﴾ (۸-۳۵) میں ان کی نماز کو مکاء کہہ کر تنبیہ کی ہے کہ وہ نماز بے روح ہونے کے اعتبار سے پرندوں کی سیٹی کے بمنزلہ ہے اور مکاء ایک پرند کا نام ہے۔

اجتماع سے عبارت ہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ جسم حاوی کی سطح (باطن) جسم محوی کی سطح پر محیط ہو تو گویا ان کے نزدیک ان دونوں جسموں کے باہم مل جانے کا نام مکان..... ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔ ﴿مَكَانًا سُوًى﴾ (۲۰-۵۸) ایک ہموار مکان میں۔ ﴿وَإِذَا أُلْقُوا مِنْهَا مَكَانًا ضَبِقًا﴾ (۲۵-۱۳) اور جب یہ دوزخ کی کسی جگہ میں (زنجیروں میں جکڑ کر) ڈالے جائیں گے۔

مَكْنَتُهُ وَ مَكْنَتُهُ لَهُ: میں نے اسے تسلط یا قدرت دی قَتَمَكْنَ چنانچہ اس نے قدرت حاصل کر لی۔ قرآن پاک میں ہیں۔

﴿وَلَقَدْ مَكْنَكُمُ فِي الْأَرْضِ﴾ (۷-۱۰) اور ہم نے زمین میں تمہارا ٹھکانا بنایا۔

﴿وَلَقَدْ مَكْنَاهُمْ فِيمَا إِنْ مَكْنَأَكُمْ فِيهِ﴾ (۲۶-۲۶) اور ہم نے ان کو ایسے مقدور دیئے تھے۔ جو تم لوگوں کو نہیں دیئے۔

﴿أَوَلَمْ نُمَكِّنْ لَهُمْ﴾ (۲۸-۵۷) کیا ہم نے ان کو جگہ نہیں دی۔

﴿وَنُمَكِّنْ لَهُمْ فِي الْأَرْضِ﴾ (۲۸-۶) اور ملک میں ان کو قدرت دیں۔

﴿وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَى لَهُمْ﴾ (۲۳-۵۵) اور ان کے دین کو جسے اس نے ان کے لیے پسند کیا ہے۔ مستحکم و پائیدار کرے گا۔

﴿فَنُفِیْ قُرَارٍ مَّكِينٍ﴾ (۲۳-۱۳) ایک مضبوط اور محفوظ جگہ میں۔

۱ وعلیٰ هذا وزنه فعلون والصحيح انه من الكن معناه الحفظ والستر وليس من هذه المادة۔

مکت استہ: گوز مارنا۔

## (م ل ل)

﴿وَلِيُْمِلِلِ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ﴾ (۲-۲۸۲) اور جو شخص قرض لے وہی (دستاویز کا) مضمون بول کر لکھوائے۔

﴿فَإِنْ كَانَ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيهًا أَوْ ضَعِيفًا أَوْ لَا يَسْتَطِيعُ أَنْ يُمِلَّ هُوَ فَلْيُمِلِلْ وَلِيُّهُ بِالْعَدْلِ﴾ (۲-۲۸۲) اور اگر قرض لینے والا بے عقل یا ضعیف ہو یا مضمون لکھوانے کی قابلیت نہ رکھتا ہو تو جو اس کا ولی ہو وہ انصاف کے ساتھ مضمون لکھوائے۔

مِلَّةٌ اور دین میں دوسرا فرق یہ ہے کہ کسی چیز کو اس کے من جانب اللہ شروع ہونے کے لحاظ سے مِلَّةٌ کہا جاتا ہے۔ اور اس کے قائم کرنے اور بجالانے والے کے لحاظ سے دین کہا جاتا ہے۔ کیونکہ دین کے معنی طاعت و فرمانبرداری کے ہیں۔ مَلٌّ خُبْرَةٌ مِلَّةٌ مَلًّا کے معنی گرم راکھ پر روٹی پکانے کے ہیں۔ اور راکھ پر پکی ہوئی روٹی کو خُبْزٌ مِلَّةٌ کہا جاتا ہے اور اَلْمِلِيلُ وہ چیز کہلاتی ہے جسے آگ میں پھینک دیا گیا ہو۔ اور وہ حرارت جو انسان محسوس کرتا ہے۔ اسے مِلِيلَةٌ کہا جاتا ہے۔

مَلِلْتُ الشَّيْءَ اَمَلْتُهُ کے معنی کسی چیز سے بدل ہو کر اس سے اعراض کر لینے کے ہیں۔ اَمَلْتُهُ مِنْ كَذَا۔ کسی کو کسی چیز سے بدل کر دینا۔ حدیث میں ہے ﴿۱۲۳﴾ ((تَكَلَّفُوا مِنَ الْأَعْمَالِ مَا تُطِيقُونَ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يَمَلُّ حَتَّى تَمَلُّوا)) وہ عمل بجالاؤ جن کی طاقت ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ نہیں اکتائے گا۔ آخر کار تم ہی اکتا جاؤ گے۔ اس حدیث سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اللہ تعالیٰ بھی

اَلْمِلَّةُ: دین کی طرح ملت بھی اس دستور کا نام ہے جو اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام کی زبان پر بندوں کے لیے مقرر فرمایا تاکہ اس کے ذریعہ وہ قرب خداوندی حاصل کر سکیں۔

دین (۱) اور ملت میں فرق یہ ہے کہ ملت کی اضافت صرف اس نبی کی طرف ہوتی ہے جس کا وہ دین ہوتا ہے۔ چنانچہ فرمایا۔

﴿فَاتَّبِعُوا مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ﴾ (۳-۹۵) پس دین ابراہیم کی پیروی کرو۔

﴿وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ آبَائِي﴾ (۱۲-۳۸) اور اپنے باپ دادا..... کے مذہب پر چلتا ہوں۔

اور اللہ تعالیٰ یا کسی افراد امت کی طرف اسکی اضافت جائز نہیں ہے۔ بلکہ اس قوم کی طرف بحیثیت مجموعی مضاف ہوتا ہے۔ جو اس کے تابع ہوتی ہے۔ اور افراد امت کی طرف اس کی اضافت نہیں ہوتی۔ اس لیے مِلَّةُ اللَّهِ یا مِلَّتِي اور مِلَّةٌ زَيْدٌ کہنا جائز نہیں۔ جیسا کہ دِينَ اللَّهِ وَ دِينَ زَيْدٍ کا استعمال جائز ہے (اسی طرح کسی فریضہ کی نسبت بھی مِلَّةٌ کی طرف نہیں کی جاتی) لہذا اَلصَّلَاةُ مِلَّةٌ اللہ کہنا جائز نہیں ہے (اس کے برعکس اَلصَّلَاةُ دِينَ اللہ کہنا صحیح ہے)

اصل میں مِلَّةٌ کا لفظ اَمَلْتُ الْكِتَابَ سے مشتق ہے جس کے معنی لکھوانے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔

① والحدث بتغير الالفاظ في البخاري ومسلم والموطأ مالك من حديث عائشة قاله صلى الله عليه وسلم في شأن امرأة لاتنام من الليل (الزرقاني ۲۴۳-۲۴۴) والحدث في المستدرک للحاکم والنسائی (انظر كنز العمال ج ۳ رقم ۱۶۹۔

(۳۰-۱۶) آج کس کی بادشاہت ہے، خدا کی جو اکیلا اور غالب ہے۔

اور مَلِكٌ کا لفظ دو طرح پر استعمال ہوتا ہے عَمَلِکِسی کا متولی اور حکمران ہونے کو کہتے ہیں۔ دوم حکمرانی کی قوت اور قابلیت کے پائے جانے کو کہتے ہیں۔ خواہ بالفعل اس کا متولی ہو یا نہ ہو۔ چنانچہ پہلے معنی کے لحاظ سے فرمایا۔ ﴿إِنَّ الْمُلُوكَ إِذَا دَخَلُوا قَرْيَةً أَفْسَدُوهَا﴾ (۳۲-۲۷) بادشاہ جب کسی ملک میں داخل ہوتے ہیں۔ تو اس کو تباہ کر دیتے ہیں۔

اور دوسرے معنی کے لحاظ سے فرمایا:-

﴿إِذَا جَعَلَ فِيكُمْ أَنْبِيَاءَ وَجَعَلَكُمْ مُلُوكًا﴾ (۵-۲۱) کہ اس نے تم میں پیغمبر کیے اور تمہیں بادشاہ بنایا۔ تو اس آیت میں نبوت کو خاص اور ملوکیت کو عام قرار دیا ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ نبی اسرائیل سارے کے سارے بادشاہ نہیں تھے۔ کیونکہ یہ تو حکمت الہی کے ہی منافی ہے۔ جیسا کہ کہا گیا ہے کہ رؤساء کی کثرت میں خیر نہیں ہوتی لہذا یہاں جَعَلَكُمْ مُلُوكًا کے معنی یہ ہیں کہ تمہیں ملک کا انتظام سنبھالنے کے قابل بنایا۔ تو یہاں ملک کا لفظ سیاست کی قابلیت اور قوت پیدا کر دینے کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ ملک ہر اس شخص کو کہا جاتا ہے جو سیاست کا مالک ہو۔ خواہ وہ اپنے نفس کی سیاست کرے یاں طور پر کہ نفس کو خواہشات سے روک رکھنے پر اسے قدرت ہو۔ یا دوسروں کی سیاست کرے اور عام اس سے کہ بالفعل لوگوں کو بادشاہ ہو یا نہ ہو جیسا کہ گزر چکا ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔ ﴿فَقَدْ آتَيْنَا آلَ إِبْرَاهِيمَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَ

ملول ہو جاتا ہے جیسا کہ لفظ حتی سے وہم ہوتا ہے۔ بلکہ حدیث کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ تو اکتائے گا نہیں آخر کار تم ہی اکتا جاؤ گے۔

## (م ل ج)

الْمَلِئُحُ: اس پانی کو کہتے ہیں جو متغیر ہو کر جم جائے یعنی نمک بن جائے اور صرف متغیر پانی کو بھی مَلِئُحٌ کہہ دیتے ہیں چنانچہ کھاری پانی کو مَاءٌ مَلِئُحٌ کہا جاتا ہے۔ اور مَاءٌ مَالِئٌ بہت کم استعمال ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:-

﴿وَهَذَا مَلِئٌ أَجَاجٌ﴾ (۵۳-۲۵) اور یہ کھاری ہے کڑوا۔ مَلِئُحٌ الْقَدَرُ کے معنی ہڈیاں میں نمک ڈالنے کے ہیں۔ اور اَمْلَحْتُهُا کے معنی زیادہ نمک ڈال کر خراب کر دینے کے۔ اور نمک لگا کر خشک کی ہوئی مچھلی کو سَمْلُكٌ مَلِئُحٌ کہتے ہیں۔ پھر مَلِئُحٌ سے استعارہ کے طور پر مَلَا حَةً بمعنی خوربوی آتا ہے۔ اور رَجُلٌ مَلِئُحٌ اس خوربوا دی کو کہتے ہیں جس کا حسن خوب غور کے بعد محسوس ہو۔

## (م ل ک)

الْمَلِكُ: بادشاہ جو پبلک پر حکمرانی کرتا ہے۔ یہ لفظ صرف انسانوں کے منتظم کے ساتھ خاص ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مَلِكُ النَّاسِ تو کہا جاتا ہے لیکن مَلِكُ الْأَشْيَاءِ کہنا صحیح نہیں ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿مَلِكِ يَوْمِ الدِّينِ﴾ (۳-۱) انصاف کے دن کا حاکم۔ میں ملک کی اضافت یوم کی طرف نہیں ہے۔ بلکہ یہ اصل میں ملک الملک فی یوم الدین ہے۔ یعنی قیامت کے دن اسی کی بادشاہت ہوگی۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا ﴿لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ لِلَّهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ﴾ (۱۸۲)

بے۔ اَلْمَلَكُوتُ یہ مَلِكٌ کا مصدر ہے اور (رَحْمُوتٌ وَرَهْبُوتٌ کی طرح اس میں تاء زائدہ ہے۔ اور یہ لفظ اللہ تعالیٰ کی ملک کے ساتھ مخصوص ہے چنانچہ فرمایا۔

﴿وَكَذَلِكَ نُرِي إِبْرَاهِيمَ مَلَكُوتَ السَّمَوَاتِ وَ الْأَرْضِ﴾ (۷۵-۶) اور ہم اس طرح ابراہیم علیہ السلام کو آسمانوں اور زمین کے عجائبات دکھانے لگے۔

﴿أَوَلَمْ يَنْظُرُوا فِي مَلَكُوتِ السَّمَوَاتِ وَ الْأَرْضِ﴾ (۱۸۵-۷) کیا انہوں نے آسمان اور زمین کی بادشاہت میں نظر نہیں کی۔

اَلْمَمْلِكَةُ کے معنی سلطنت کے ہیں۔ اور مملوک کا لفظ عرف میں غلام مملوک پر بولا جاتا ہے۔ دوسری ملکیت کو مملوک نہیں کہتے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:-

﴿عَبْدًا مَّمْلُوكًا﴾ (۷۵-۱۶) ایک غلام ہے۔ اور کبھی عام املاک پر بولا جاتا ہے۔ چنانچہ محاورہ ہے۔ فُلَانٌ جَوَادٌ بِمَمْلُوكِهِ کہ فلاں اپنے املاک میں بخشنے ہے۔

اَلْمَمْلَكَةُ: خاص کر عبید یعنی غلاموں کا مالک ہونے کو کہتے ہیں۔ چنانچہ محاورہ ہے۔

فُلَانٌ حَسَنُ الْمَمْلَكَةِ: یعنی فلاں اپنے غلاموں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آتا ہے۔ اور قرآن پاک میں غلاموں کے ملک کو یَمِينٌ کے ساتھ مخصوص کیا گیا ہے۔ چنانچہ فرمایا:-

﴿لِيَسْتَأْذِنُكُمُ الَّذِينَ مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ﴾ (۵۸-۲۳) تمہارے غلام لونڈیاں..... اجازت لیا کریں۔

﴿أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ﴾ (۳-۲) یا لونڈی جس کے تم مالک ہو۔

﴿أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُنَّ﴾ (۲۳-۳) یا لونڈی

اَتَيْنَهُمْ مُلْكًا عَظِيمًا ﴿۵۴-۳﴾ ہم نے خاندان ابراہیم علیہم السلام کو کتاب اور دانائی عطا فرمائی تھی اور سلطنت عظیم بخشی تھی۔

حقیقی بادشاہت چونکہ اللہ ہی کے لیے ہے۔ اس لیے فرمایا:-

﴿لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ﴾ (۱-۶۳) اس کی (سچی)

بادشاہی ہے اور اس کی تعریف نامتناہی ہے۔ ﴿قُلْ اَللّٰهُمَّ مَلِكُ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ وَ

تَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاءُ﴾ (۲۶-۳) کہو کہ اے

خدا، اے بادشاہی کے مالک! تو جس کو چاہے بادشاہی بخشے اور جس سے چاہے بادشاہی چھین لے۔

پس ملک کے معنی زیر تصرف چیز پر بذریعہ حکم کنٹرول کرنے کے ہیں۔ اور ملک بمنزلہ جس کے ہیں۔ لہذا ہر

مُلْكٌ کو مِلْكٌ تو کہہ سکتے ہیں لیکن ہر ملک کو مُلْكٌ نہیں

کہہ سکتے۔ قرآن پاک میں ہے:- ﴿وَلَا يَمْلِكُونَ

لَا نَفْسِهِمْ ضَرًّا وَلَا نَفْعًا وَلَا يَمْلِكُونَ مَوْتًا

وَلَا حَيَاةً وَلَا تُشُورًا﴾ (۳-۲۵) اور نہ اپنے نقصان

اور نفع کا کچھ اختیار رکھتے ہیں اور نہ مرنا ان کے اختیار میں

ہے۔ اور نہ جینا اور نہ مر کر اٹھ کھڑے ہونا۔ اور فرمایا۔

﴿أَمَّنْ يَمْلِكُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ﴾ (۳۱-۱۰) یا

تمہارے کانوں اور آنکھوں کا مالک کون ہے۔ ﴿قُلْ لَا

أَمْلِكُ لِنَفْسِي نَفْعًا وَلَا ضَرًّا﴾ (۱۸۸-۷) کہ

میں اپنے فائدے اور نقصان کا کچھ اختیار نہیں رکھتا۔ علیٰ ہذا

القیاس بہت سی آیات ہیں (جن سے ثابت ہے کہ ہر چیز

اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہے) حتیٰ کہ انسان تو اپنے

حواس اور اپنی ذات کے نفع و نقصان پر بھی قدرت نہیں رکھتا چہ جائے کہ۔ دوسروں کو فائدہ پہنچانے کا ذمہ دار



غلاموں (کے سوا)

الْمُلُوكَةُ: یہ بمعنی ملک کے آتا ہے جیسے: مَمْلُوكٌ مُّفْرٌ بِالْمُلُوكَةِ وَالْمَلِكَةِ وَالْمَلِكِ: یعنی ملک کا اقرار کرنے والا غلام۔

مَلَاكُ الْأَمْرِ: کسی چیز کا سرمایہ جس کے سہارے پردہ قائم ہو۔ جیسے کہا جاتا ہے۔

الْقَلْبُ مَلَاكُ الْجَسَدِ: کہ دل پر جسم کا دار و مدار ہے۔ الْمَلَاكُ کے معنی ترویج کے ہیں۔ اور أَمَلَكُوهُ کے معنی ہیں کہ انہوں نے اس کا نکاح کر دیا پھر خاندان کو عورت کا منتظم ہونے کے لحاظ سے اس کا بادشاہ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ اسی معنی کے لحاظ سے کسی نے کہا ہے۔

كَأَدَّ الْعَرُوسُ أَنْ يَكُونَ مَلِكًا كَخَاوند قریب قریب بادشاہ ہی ہوتا ہے۔

مَلِكُ الْإِبِلِ وَالشَّاةِ: اس اونٹ یا بکری کو کہتے ہیں۔ جو دوسروں کے آگے آگے چلتی ہے۔ دوسرے چونکہ اس کے تابع ہوتے ہیں۔ اس لیے تشبیہ کے طور پر اس کو ملک کہا جاتا ہے۔ ایک محاورہ ہے۔

مَالًا حِدٍ فِي هَذَا مَلِكٌ وَمَلِكٌ غَيْرِي کہ میرے سوا اس پر کسی کا اختیار یا قبضہ نہیں ہے۔ قرآن میں ہے:

﴿مَا أَخْلَفْنَا مَوْعِدَكَ بِمَلِكِنَا﴾ (۲۰-۸۷) ہم نے اپنے اختیار سے تم سے وعدہ خلاف نہیں کیا۔ اور ایک

قرأت میں کسرہ میم کے ساتھ ہے۔ مَلِكْتُ الْعَجِيزِ: آٹے کو اچھی طرح سے گوندھا۔

حَايِطٌ لَيْسَ لَهُ مَلَاكٌ: دیوار میں پائیداری نہیں ہے۔ الْمَلِكُ: علمائے نحو اس لفظ کو مَلَايِكَةُ سے ماخوذ مانتے ہیں۔ اور اس کی میم کو زائدہ بناتے ہیں۔ لیکن بعض محققین

نے اسے ملک سے مشتق مانا ہے۔ اور کہا ہے کہ جو فرشتہ کائنات کا انتظام کرتا ہے۔ اسے فتح لام کے ساتھ مَلَكٌ کہا جاتا ہے۔ اور فتح لام کے ساتھ ملک کہا جاتا ہے۔ اور انسان کو مَلِكٌ کہتے ہیں معلوم ہوا کہ مَلِكٌ تو مَلَايِكَةُ میں شامل ہے لیکن کل مَلَايِكَةُ مَلَكٌ نہیں ہوتے۔ بلکہ ملک کا لفظ ان فرشتوں پر بولا جاتا ہے جن کی طرف کہ آیات۔

﴿فَالْمُذْبِرَاتِ أَمْرًا﴾ (۵۹-۵) پھر (دنیا کے) کاموں کا انتظام کرتے۔

﴿فَالْمُقْسِمَاتِ أَمْرًا﴾ (۵۱-۴۰) پھر چیزیں تقسیم کرتے ہیں۔

﴿وَالشَّارِعَاتِ غَرْقًا﴾ (۷۹-۱) ان (فرشتوں) کی قسم جو ڈوب کر کھنچ لیتے ہیں۔

﴿وَالْمَلَكُ عَلَى أَرْجَائِهَا﴾ (۶۹-۱۷) اور فرشتے اس کے کناروں پر (اتر آئیں گے)

﴿وَمَا أُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ﴾ (۲-۱۰۲) اور (ان) باتوں کے بھی پیچھے لگ گئے (جو دو فرشتوں پر اتری تھیں۔

اور ان کے علاوہ دوسری آیات میں اشارہ فرمایا گیا ہے۔ اور اسی سے مَلَكُ الْمَوْتِ (موت کا فرشتہ) ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿قُلْ يَتَوَفَّكُم مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِي وُكِّلَ بِكُمْ﴾ (۳۲-۱۱) کہہ دو کہ موت کا فرشتہ جو تم پر مقرر کیا گیا ہے۔

تمہاری روحیں قبض کر لیتا ہے۔

## (م ل و)

الْمَلَاءُ: وہ جماعت جو کسی امر پر مجتمع ہو تو نظروں کو ظاہری حسن و جمال اور نفوس کو ہیبت و جلال سے پھیر دے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿الَّذِينَ تَرَوْنَ كَاكِبًا مِنْ بَنِي إِسْرَءِيلَ﴾

(۲-۲۴۶) بھلا تم نے بنی اسرائیل کی ایک جماعت کو نہیں دیکھا۔ ﴿وَقَالَ الْمَلَأُ مِنْ قَوْمِهِ﴾ (۷-۲۷) اور قوم فرعون میں جو سردار تھے کہنے لگے۔

﴿إِنَّ الْمَلَأَ يَأْتَمِرُونَ بِكَ﴾ (۲۸-۲۰) کہ (شہر کے) رئیس تمہارے بارے میں صلاحیں کرتے ہیں۔

﴿قَالَتْ يَا أَيُّهَا الْمَلَأُ إِنِّي أُلْقِيَ إِلَيَّ كِتَابٌ كَرِيمٌ﴾ (۲۷-۲۹) وہ کہنے لگی کہ اے اہل دربار! میری طرف ایک نامہ گرامی ڈالا گیا ہے۔

ان کے علاوہ بہت سی آیات ہیں۔ جن میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ محاورہ ہے:-

فَلَانٌ مَلَأٌ الْعَيْوُنُ: یعنی سب اسے عزت کی نظر سے دیکھتے ہیں گویا اس نے ان کی نظروں کو اپنے جلوہ سے بھر دیا ہے۔ اسی سے کہا گیا ہے:-

شَابَّ مَالِي الْعَيْنِ: اپنی خوبصورتی سے آنکھ کو بھر دینے والا نوجوان۔ الْمَلَأُ

اخلاق جو حسن سے بھر پور ہو ❶ کسی شاعر نے کہا ہے۔ ❷ (الوافر)

(۳۱۲) فَقُلْنَا أَحْسِنِي مَلَأٌ جَهَنَّا

تو ہم نے کہا کہ اے جہنم اپنے اخلاق درست کرو۔ مَلَأَتْهُ کے معنی کسی کا معاون بننے اور اس کے گروہ میں شامل ہونے کے ہیں۔ جیسا کہ شَابَّتُہ کے معنی کسی کے طرف داروں میں داخل ہونے کے آتے ہیں۔ محاورہ ہے۔

❶ وفي الحديث "احسنوا املاءكم" قاله صلى الله عليه وسلم لاصحابه حين ضربوا الرجل الذي بال في المسجد (اللسان) والفاق (۲/۲۵۴)۔

❷ قاله الجهنى واوله: تنادوا يا لهنة اذاراونا۔ وبعضهم فسر الملاء ههنا بالظن والبيت في اللسان (ملاء جهن) وابن الانبارى في شرح السبع (۴۶۵) والحماسة بشرح المرزوقى رقم (۱۵۲) فى ۱۵ بيتا والمقطوعة من المنصفات والجهنى هو عبدالشارق بن عبدالعزى الجهنى الجاهلى۔

أَمَلْتُ (مضاعف) ہے۔ دوسرے لام کو تخفیف کے لیے یا (سے) تبدیل کر لیا گیا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:-  
﴿فَلْيَمْلِكْ وَلِيَّهُ بِالْعِزْلِ﴾ (۲۸۲-۲) تو جو اس کا ولی ہو وہ انصاف کے ساتھ مضمون لکھوائے۔

(۴ ن ن)

الْمَنُّ: ایک وزن کا نام ہے اس کا شنیہ مَنَانٌ اور جمع أَمْنَانٌ آتی ہے۔ کبھی ایک نون کو الف سے تبدیل کر کے مَنَا بنا لیتے ہیں اس کی جمع أَمْنَاءٌ ہے۔ اور ہر اندازہ کی ہوئی چیز کو مَمْنُونٌ کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ اسے مَمْنُونٌ کہتے ہیں۔  
الْحِنَّةُ کے معنی بھاری احسان کے ہیں۔ اور یہ دو طرح پر ہوتا ہے۔ ایک منت بالفعل جیسے مَن فُلَانٌ عَلٰی فُلَانٍ۔ یعنی فلاں نے اس پر گرانبار احسان کیا۔ اسی معنی میں فرمایا:- ﴿لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ﴾ (۱۶۳-۳) خدا نے مومنوں پر بڑا احسان کیا ہے۔

﴿كَذَلِكَ كُتِبَ مِنْ قَبْلِ فَمَنْ اللَّهُ عَلَيْهِمْ﴾ (۹۳-۴) تم بھی تو پہلے ایسے ہی تھے پھر خدا نے تم پر احسان کیا۔  
﴿وَلَقَدْ مَنَّا عَلَى مُوسَى وَهَارُونَ﴾ (۱۱۳-۳۷) اور ہم نے موسیٰ اور ہارون علیہما السلام پر بھی احسان کیے۔  
﴿يَمْنٌ عَلَى مَنْ يَشَاءُ﴾ (۱۱-۱۳) خدا اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے (نبت) کا احسان کرتا ہے۔  
﴿وَنُرِيدُ أَنْ نَمُنَّ عَلَى الَّذِينَ اسْتُضِعُوا﴾ (۵-۲۸) اور ہم چاہتے تھے کہ جو لوگ ملک میں کمزور کر دیئے گئے ہیں۔ ان پر احسان کریں۔

پر بولا جاتا ہے۔ کیونکہ لیل و نہار کی طرف اس کی اضافت ہوتی ہے۔ چنانچہ شاعر نے کہا ہے ﴿الطَّوِيلُ﴾ (۴۱۳) نَهَارٌ وَلَيْلٌ دَائِمٌ مَلَوَاهُمَا  
عَلَى كُلِّ حَالٍ الْمَرْءُ يَخْتَلِفَانِ  
رات دن کا تکرار ہمیشہ رہتا ہے اور ہر حالت میں یہ مختلف

ہوتے رہتے ہیں۔ www.KitaboSunnat.com  
اگر مَلَوَانِ کا اصل معنی لیل و نہار ہوتا تو ان کی ضمیر کی طرف مضاف ہو کر استعمال نہ ہوتا اور آیت کریمہ:- ﴿وَأَمْلَى لَهُمْ إِنَّ كَيْدِي مَتِينٌ﴾ (۱۸۳-۷) اور میں ان کو مہلت دیئے جاتا ہوں۔ میری تدبیر (بڑی) مضبوط ہے۔ میں اُمْلَى لَهُمْ کے معنی مہلت دینے کے ہیں۔ نیز فرمایا:-  
﴿أَنَّمَا نُمْلِي لَهُمْ خَيْرٌ لِّأَنفُسِهِمْ﴾ (۱۷۸-۳) کہ ہم ان کو مہلت دیئے جاتے ہیں۔ تو یہ ان کے حق میں اچھا ہے۔ اسی طرح آیت کریمہ:-

﴿الشَّيْطَانُ سَوَّلَ لَهُمْ وَأَمْلَى لَهُمْ﴾ (۲۵-۳۷) شیطان نے یہ کام ان کو مزین کر دکھایا اور انہیں طول (عمر کا وعدہ) دیا۔

میں اَمْلَا کے معنی اَمْهَلَ یعنی مہلت دینے کے ہیں۔  
ایک قراءت میں اَمْلَا لَهُمْ ہے جو اَمْلَيْتُ الْكِتَابَ اُمْلِيهِ اَمْلَاءً سے مشتق ہے اور اس کے معنی تحریر لکھوانے اور املا کروانے کے ہیں۔ چنانچہ فرمایا:-

﴿فَهِيَ تُمْلِي عَلَيْهِ بُكْرَةً وَأَصِيلًا﴾ (۵-۲۵) اور وہ صبح شام اس کو پڑھ پڑھ کر سناتی جاتی ہیں۔ اصل میں اَمْلَيْتُ

۱) قالہ ابی مقل (واسمہ تمیم بن ابی بن مقل) راجع للبيت اللاتى مع السمط (۵۳۳) والاقتضاب (۴۷۲) والخزانة (۲۷۵: ۳) والعينى (۵۴۲: ۴) واللسان (ملاء) وبعضهم نسبة لاعرابى من بنى مقل راجع الحصرى (۶۸: ۴) وفى البندان لاین مقل او ابن احمر والبيت فى الروض (۲۶: ۱) والعينى على ابن هشام وقيله: الا ياد يار الحى بالسبعان۔ امل عليها بالبلوى الملوان راجع ترجمته فى الاصابة رقم ۸۶۲ والخزانة (۱۱۳: ۱)

فِدَاءٌ ﴿۳۷﴾ پھر اس کے بعد یا تو احسان رکھ کر چھوڑ دینا چاہیے یا کچھ مال لے کر۔ میں مَنَّا کے لفظ سے انہیں بلا معاوضہ رہا کر دینے کی طرف اشارہ ہے۔ اور آیت کریمہ: ﴿هَذَا عَطَاؤُنَا فَامْنُنْ أَوْ أَمْسِكْ بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾ (۳۸-۳۹) یہ ہماری بخشش ہے اسے خرچ کرو یا..... رکھ چھوڑو (تم سے) کچھ حساب نہیں ہے۔

میں فَاْمْنُنْ کے معنی خرچ کرنے کے ہیں۔ اور آیت کریمہ: ﴿وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ﴾ (۴۳-۶) اور (اس نیت سے) احسان نہ کرو کہ اس سے زیادہ کے طالب ہو۔

میں بعض نے کہا ہے کہ مَنَّةٌ بالقول مراد ہے یعنی احسان جتلانا اور اسے بہت بڑا خیال کرنا۔ ۱ بعض نے اس کا معنی یہ بیان کیا ہے کہ زیادہ کی طلب کے لیے احسان نہ کر۔ ۲ اور آیت کریمہ: ﴿فَلَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ﴾ (۹۵-۶) ان کے لیے بے انتہا اجر ہے۔

میں بعض نے غیر ممنون کے معنی غیر محدود (یعنی ان گنت) کیے ہیں۔ جیسا کہ دوسری جگہ ”بَغَيْرِ حِسَابٍ“ فرمایا ہے۔ بعض نے اس کے معنی غیر منقطع و لا منقوص کے ہیں۔ ۳ یعنی ان کا اجر نہ منقطع ہوگا اور نہ ہی کم کیا جائے گا۔ اسی سے اَلْمَنْوُن، بمعنی موت ہے۔ ۴ کیونکہ وہ تعداد کو گھٹاتی اور عمر کو قطع کر دیتی ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ مَنَّةٌ بالقول بھی اس سے ہے کیونکہ احسان جتلانا

اور یہ یعنی منت بالفعل درحقیقت اللہ تعالیٰ ہی کی صفت ہے۔ اور دوسرے معنی مَنَّةٌ بِالْقَوْلِ یعنی احسان جتلانا گو انسانی معاشرہ میں معیوب سمجھا جاتا ہے۔ مگر جب کفرانِ نعمت ہو رہا ہو تو اس کے اظہار میں کچھ قباحت نہیں ہے۔ اور چونکہ (بلاوجہ) اس کا اظہار معیوب ہے اس لیے مشہور ہے۔

اَلْمَنَّةُ تَهْدِمُ الصَّنِيعَةَ: منت یعنی احسان رکھنا احسان کو برباد کر دیتا ہے۔ اور کفرانِ نعمت کے وقت چونکہ اس کا تذکرہ مستحسن ہوتا ہے اس لیے کسی نے کہا ہے۔ اِذَا كُفِرَتِ النِّعْمَةُ حَسُنَتِ الْمَنَّةُ۔ جب نعمت کی ناشکری ہو تو احسان رکھنا ہی مستحسن ہے۔ اور آیت کریمہ: ﴿يَمْنُونُ عَلَيْكَ أَنْ أَسْلَمُوا قُلْ لَا تَمْنُونَا عَلَى إِسْلَامِكُمْ بِاللَّهِ يَمُنْ عَلَيْكُمْ أَنْ هَذَا كُمْ لِلْإِيمَانِ﴾ (۴۹-۱۷) یہ لوگ تم پر احسان رکھتے ہیں۔ کہ مسلمان ہو گئے ہیں۔ کہہ دو کہ اپنے مسلمان ہونے کا مجھ پر احسان نہ رکھو۔ بلکہ خدا تم پر احسان رکھتا ہے۔ کہ اس نے تمہیں ایمان کا رستہ دکھایا۔

میں ان کی طرف سے منت بالفعل یعنی احسان جتلانا مراد ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے منت بالفعل یعنی انہیں ایمان کی نعمت سے نوازا مراد ہے جیسا کہ بعد میں اَنْ هَذَا كُمْ لِلْإِيمَانِ کے لفظ سے خود ہی اس کی تشریح کر دی ہے اور آیت کریمہ: ﴿فَأَمَّا مَنْ بَعْدُ وَأَمَّا

① هذا ما ذهب اليه المحسن وابن ابي ليلى وعلى هذا يكون تستكثر محذوما بلا الناهية بدلا من تمنى اى لاتمنى ولا تستكثر وهن شان المان بما يعطى ان يستكثره ويراه كثيرا ۱۲۔

② وهذا هو المنقول عن ابن عباس واكثر اصحاب التفاسير فعلى هذا المعنى يكون تستكثر منصوبا بان المقدره ويؤيده قراءة ابن مسعود ان تستكثر باظهار ان مختصرا من روح المعانى (۱۱۹/۲۹-۱۲۰)۔

③ قارن اضداد ابي الطيب (۶۲۳-۶۲۴)۔

④ وايضا سمي الدهر المنون بهذا المعنى ويكون واحداً وجمعاً (اضداد ابي الطيب (۶۲۳)۔

درجہ کے ہیں۔

”مَنْ“ واحد، جمع، مذکر، مونث سب کے لیے یکساں طور پر استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ آیت ﴿وَمِنْهُمْ مَّنْ يَسْتَمِعُ﴾ (۶-۲۵) اور ان میں بعض ایسے ہیں جو تمہاری باتوں کی طرف کان رکھے ہیں۔ میں مَنْ کے بعد ضمیر واحد مذکر لائی گئی ہے۔ اور آیت ﴿وَمِنْهُمْ مَّنْ يَسْتَمِعُونَ إِلَيْكَ﴾ (۱۰-۴۲) اور ان میں سے بعض ایسے ہیں کہ تمہاری طرف کان لگاتے ہیں۔ میں مَنْ کی طرف ضمیر جمع لوٹ رہی ہے نیز فرمایا: ﴿وَمَنْ يَقْنُتْ مِنْكُنَّ لِلَّهِ﴾ (۳۳-۳۱) اور جو تم میں سے خدا..... کی فرمانبردار رہے گی۔

### (مَنْ)

یہ حرف جار ہے اور یہ ابتدائی<sup>(۱)</sup> غایت<sup>(۲)</sup> تبعیض<sup>(۳)</sup>، تین<sup>(۴)</sup>، کے لیے آتا ہے۔ اور حرف نفی<sup>(۵)</sup> اور استفہام کے ساتھ ہو تو استعراق جنس کے معنی دیتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔

﴿فَمَا مِنْكُمْ مِّنْ أَحَدٍ﴾ (۶۹-۴۷) پھر تم میں سے کوئی۔ اور کبھی (۵) غرض کے لیے ہوتا ہے جیسے خُذْ هَذَا مِنْ ذَلِكَ یعنی اس کے عوض میں یہ لے لو۔ اور آیت کریمہ: ﴿إِنِّي أَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِي بُوَادٍ﴾ (۱۴-۳۷) میں نے اپنی اولاد میدان (مکہ) میں لا بسائی ہے۔

میں میں تبعیض کے لیے ہے۔ کیونکہ وہاں حضرت ابراہیم کی ذریت میں سے بعض آباد ہوئے تھے۔ اور آیت کریمہ: ﴿وَمِنَ السَّمَاءِ مِنْ جِبَالٍ فِيهَا مِنْ بَرَدٍ﴾ (۲۴-۴۳) اور آسمان میں جو (اولوں کے) پہاڑ ہیں ان

نعمت کو قطع کر دیتا ہے اور شکر گزاری کے انقطاع کو مقتضی ہے اور آیت کریمہ: ﴿وَأَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّاءَ وَالسَّلْوَى﴾ (۲-۵۷) اور تمہارے لیے من سلوی اتارتے رہے۔

میں مَنْ سے شبنمی گوند مراد ہے۔ جورات کو درخت کے پتوں پر جم جاتی تھی اور سلوی ایک پرند کا نام ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ مَنْ اور سلوی سے ان احسانات کی طرف اشارہ ہے۔ جو اللہ تعالیٰ نے ان پر کیے تھے اور یہ دونوں اصل میں ایک ہی چیز سے عبارت ہیں۔ لیکن ان پر احسان کرنے کے لحاظ سے اسے مَنْ کہا ہے۔ اور اس لحاظ سے کہ وہ نعمت ان کے لیے باعث اطمینان تھی اسے سلوی فرمایا ہے۔ جو کہ تسلی سے ماخوذ ہے۔

### (مَنْ)

اس سے ذوی العقول مراد ہوتے ہیں۔ اور غیر ذوی العقول پر اس کا اطلاق یا تو اس وقت<sup>(۱)</sup> ہوتا ہے۔ جب وہ ذوی العقول کے بالتبع مراد ہوں مثلاً: رَأَيْتُ مَنْ فِي الدَّارِ کہہ کر گھر کے لوگ اور بہائم دونوں مراد لیے جائیں۔ اور اس<sup>(۲)</sup> وقت جب اہل نطق کے ساتھ شامل کر کے پھر ان کی تفصیل بیان کرنا مقصود ہوتی ہے۔ جیسے فرمایا: ﴿فَمِنْهُمْ مَّنْ يَمْشِي عَلَى بَطْنِهِ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَمْشِي عَلَى رِجْلَيْنِ﴾ آلا یہ تو ان میں سے بعض ایسے ہیں جو پیٹ کے بل چلتے ہیں۔ اور بعض ایسے ہیں جو دو پاؤں پر چلتے ہیں۔ اور یہ تنہا غیر ذوی العقول کے لیے استعمال نہیں ہوتا اسی لیے بعض محدثین نے اغنام (عوام) سے انسانیت کی نفی کرتے ہوئے کہا ہے کہ مَنْ استفہامیہ کے ساتھ ان کے متعلق سوال کرنا غلط ہے۔ پس آیت میں تنبیہ ہے کہ وہ بمنزلہ جانوروں کے ہیں یا ان سے بھی کمتر

ان کے تاول سے شریعت نے منع فرمایا ہے۔

سے اولے نازل کرتا ہے۔

### (م ن ع)

الْمَنْعُ: یہ عطا کی ضد ہے۔ رَجُلٌ مَانِعٌ وَ مَنَاعٌ: بخیل آدمی۔ قرآن پاک میں ہے۔  
﴿وَيَمْنَعُونَ الْمَاعُونَ﴾ (۱۰۷-۷۷) اور برتنے کی چیزیں عاریہ نہیں دیتے۔

﴿مَنَاعٌ لِلْخَيْرِ﴾ (۵۰-۲۵) جو مال میں بخل کرنے والا ہے۔ اور منع کے معنی حمایت اور حفاظت کے بھی آتے ہیں اسی سے مکان منیع کا محاورہ ہے جس کے معنی محفوظ مکان کے ہیں اور منع کے معنی حفاظت کرنے کے فُلْكَانٌ دُومَنْعَةٍ وہ بلند مرتبہ اور محفوظ ہے کہ اس تک دشمنوں کی رسائی ناممکن ہے۔ قرآن پاک میں ہے:-

﴿الَّذِينَ نَسْتَحِذُ عَلَيْكُمْ وَنَمْنَعُكُم مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ﴾ (۴-۱۳۱) کیا ہم تم پر غالب نہیں تھے؟ اور تم کو مسلمانوں کے ہاتھ سے بچایا نہیں؟  
﴿وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَاعِدَ اللَّهِ﴾ (۲-۱۳۲) اور اس سے بڑھ کر کون ظالم ہے۔ جو خدا کی مسجدوں سے منع کرے۔ اور آیت:-

﴿مَا مَنَعَكَ أَلَّا تَسْجُدَ إِذْ أَمَرْتُكَ﴾ (۷-۱۲) میں مَآ مَنَعَكَ کے معنی ہیں کہ کس چیز نے تمہیں اکسایا۔ اور بعض نے اس کا معنی مَا الَّذِي سَدَّكَ وَحَمَلَكَ عَلَى تَرْكِ ذَلِكَ کیا ہے یعنی کس نے تجھے روکا اور ترکِ سجود پر اکسایا۔ اَوْ اِمْرَاةٌ مِّنْ عِفْهِ عَمُورَت۔

میں <sup>(۱)</sup> ہو سکتا ہے کہ مِنْ جِبَالٍ منصوب علی المفعولیۃ ہو ای يُنْزِلُ مِنَ السَّمَاءِ جِبَالًا تَوَمِنْ اولی برائے ظرفیت ہے اور ثانی برائے مفعولیہ اور ثالث برائے تئیین۔ اور اولوں کے جبال اتارنے سے بکثرت اولے نازل کرنا مراد ہے جیسا کہ محاورہ ہے۔ عِنْدَهُ جِبَالٌ مِنْ مَّالٍ یعنی اس کے پاس بہت سامان ہے۔ بعض <sup>(۲)</sup> نے کہا ہے کہ مِنْ جِبَالٍ منصوب علی النظر فیہ بھی ہو سکتا ہے۔ اس بنا پر کہ وہ اولے پہاڑوں سے نازل ہوتے ہیں اور مِنْ بَرَدٍ منصوب علی المفعولیۃ ہو تو معنی یہ ہوں گے۔ کہ وہ آسمان کے پہاڑوں سے اولے نازل کرتا ہے۔

بعض <sup>(۳)</sup> کے نزدیک یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مِنْ بَرَدٍ موضع رفع میں ہو۔ اور مِنْ جِبَالٍ منصوب علی المفعولیۃ ہو۔ تو گویا اصل عبارت یوں ہے۔ وَيُنْزِلُ مِنَ السَّمَاءِ جِبَالًا فِيهَا بَرَدٌ اور جبال کا لفظ مَا نَزَلَ مِنَ السَّمَاءِ کی عظمت اور کثرت کو ظاہر کرتا ہے۔ <sup>(۴)</sup> اور آیت کریمہ:-

﴿فَكُلُوا مِمَّا أَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ﴾ (۵-۴) تو جو شکار وہ تمہارے لیے پکڑ رکھیں اس کو کھا لیا کرو۔ میں ابوالحسن نے کہا ہے۔ <sup>(۵)</sup> کہ مَنْ زَانِدٌ ہے۔ لیکن صحیح یہ ہے کہ مَنْ زَانِدٌ نہیں ہے۔ بلکہ تعبیضیہ ہے کیونکہ بعض مَا أَمْسَكْنَ ایسی چیزیں بھی ہیں جن کا کھانا جائز نہیں ہے۔ جیسے خون، غرودیں اور وہ چیزیں جو قاذورات سے مختلط ہوتی ہیں اور

① ذکر المؤلف ثلاث توجیہات من الاعراب وقد ذکر هذه الثلاثة اصحاب التفاسیر فلا بدع فیہ وقد نسب صاحب الروح احتمال الثالث الى الفراء والاولان بتغییر یسیر الى الاحفش (۱۸/۱۷۲) وانوار التنزیل (۲/۲۵۷)۔

② ای الاحفش وکنی عنه الطبری ببعض نحوی البصرة قال الطبری وخطاؤه البصريون والخلاف فیہ مشہور والحق الحواز ولذا قال علماء التفسیر "وان اکل فلاتا کل (م-۳)

ہے وہ اسے ضرور ملتی ہے۔

﴿فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ﴾ (۹۴-۲) تو موت کی آرزو تو کرو۔ ﴿وَلَا يَتَمَنَّوْنَهُ﴾ (۷۲-۷) اور یہ ہرگز نہیں کریں گے۔

الْأُمْنِيَّةُ: کسی چیز کی تمنا سے جو صورت ذہن میں حاصل ہوتی ہے اسے اُمْنِيَّةُ کہا جاتا ہے اور کذب چونکہ کسی غیر واقعی چیز کا تصور کر کے اسے لفظوں میں بیان کر دینے کو کہتے ہیں۔ تو گویا تمنی جھوٹ کا مبداء ہے۔ لہذا جھوٹ کو تمنی سے تعبیر کرنا بھی صحیح ہے اسی معنی میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔<sup>①</sup>

مَا تَغْنَيْتُ وَلَا تَمْنَيْتُ مُنْذُ اسَلَمْتُ کہ میں جب سے مسلمان ہوا ہوں نہ راگ لگایا ہے اور نہ جھوٹ بولا ہے۔ اور اُمْنِيَّة کی جمع امانی۔ آتی ہے۔<sup>②</sup> چنانچہ فرمایا ز۔

﴿وَمِنْهُمْ أُمِّيُونَ لَا يَعْلَمُونَ الْكِتَابَ إِلَّا أَمَانِي﴾ (۷۸-۲) اور بعض ان میں سے ان پڑھ ہیں کہ اپنے خیالات باطل کے سوا (خدا کی) کتاب سے واقف نہیں ہیں۔

مجاہد نے إِلَّا أَمَانِي کے معنی إِلَّا كَذِبًا یعنی جھوٹ کیے ہیں۔ اور دوسروں نے أَمَانِي سے بے سوچے سمجھے تلاوت کرنا مروا لیا ہے کیونکہ اس قسم کی تلاوت بھی اس اُمْنِيَّة سے زیادہ وقت نہیں رکھتی ہے۔ جس کی بنا تخمینہ پر ہوتی

اور مَنَاع اسم فعل بمعنى اَمْنَع (امر) جیسے نَزَالَ بمعنى اَنْزَلَ۔

## (م ن ی)

الْمَنَى کے معنی اندازہ کرنے کے ہیں۔ چنانچہ محاورہ ہے۔ مَنِ لَكَ الْمَانِي: مقدر کنندہ نے تیرے لیے مقدر کر دیا ہے۔ اسی سے بعض کے نزدیک مَنْ ایک وزن کا نام ہے۔<sup>③</sup>

﴿الْمَ يَكُ نُطْفَةً مِنْ مَنِيٍّ يُمْنِي﴾ (۷۵-۳) کیا وہ منی جو (رحم میں) ڈالی جاتی ہے ایک قطرہ نہ تھا؟ ﴿مِنْ نُطْفَةٍ إِذَا تُمْنِي﴾ (۵۳-۴۶) (یعنی) نطفے سے جو (رحم میں) ڈالا جاتا ہے۔

یعنی نطفہ سے جو قدرت الہی کے ساتھ اس چیز کے لیے مقدر ہوتا ہے۔ جو اس سے پیدا ہونا ہوتا ہے۔ اسی سے مَنِيَّةُ بمعنی اجل مقدر ہے۔ والجمع مَنَايَا۔

الْتَمَنِي کے معنی دل میں کسی خیال کے باندھنے اور اس کی تصویر کھینچ لینے کے ہیں۔ پھر کبھی یہ تقدیر محض ظن و تخمین پر مبنی ہوتی ہے۔ اور کبھی غور و فکر کا نتیجہ اور مبنی بر حقیقت۔ مگر عام طور پر تمنی کی بنا چونکہ ظن و تخمین پر ہی ہوتی ہے اس لیے اس پر جھوٹ کا رنگ غالب ہوتا ہے۔ کیونکہ اکثر طور پر تمنی کا لفظ دل میں غلط آرزوئیں قائم کر لینے پر بولا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے: ﴿إِنَّمَا لِلنَّاسِ مِثَالُ تَمْنِي﴾ (۵۳-۲۴) کیا جس چیز کی انسان آرزو کرتا

① منسوب الى الاخفش كما في الروح (۵۹/۲۷)۔

② انظر لقول عثمان غريب القرآن للقبتي (۵۵) والنهاية لابن الاثير (۱۹: ۴) واللسان (منی) والفائق (۱/ ۱۶۳) وفي كتاب الاشربة للقبتي و"ولا تفتيت" ای ولا تشبهت بالفتيان ولا يصحح۔ ورواه ابو يعلى الموصلي في مجمعه باسناد ضعيف من رواية انس عنه في اثناء حديث (راجع تخريج الاحياء للعراقي (۳/ ۳۱۹) وفي رواية الفائق ايضا في جاهلية ولا اسلام۔

③ بتشديد الياء وتخفيفها و بالثاني قرء ابو جعفر وشيبة (ابن الانباري ۲۴۲)

(۵۵۴)

ہے اور آیت کریمہ:

﴿وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُولٍ وَلَا نَبِيٍّ إِلَّا إِذَا تَمَنَّى أَلْقَى الشَّيْطَانُ فِي أُمْنِيَّتِهِ﴾  
(۵۲-۲۲) اور ہم نے تم سے پہلے کوئی رسول اور نبی نہیں بھیجا۔ مگر (اس کا یہ حال تھا کہ) جب وہ کوئی آرزو کرتا تھا تو شیطان اس کی آرزو میں (دوسرے) ڈال دیتا تھا۔

میں اُمْنِيَّة کے معنی تلاوت کے ہیں اور پہلے بیان ہو چکا ہے کہ تمہی ظن و تخمین سے بھی ہوتی ہے۔ اور بنی برحقیت بھی۔ اور چونکہ آنحضرت ﷺ کے قلب مبارک پر روح الامین جو وحی لے کر اترتے تھے آپ اس کی تلاوت کے لیے مبادرت کرتے تھے۔ حتیٰ کہ آپ کو آیت ﴿لَا تَعْجَلْ بِالْقُرْآنِ﴾ اور ﴿لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ﴾ کے ذریعہ منع فرمادیا گیا۔ الغرض اس وجہ سے آپ کی تلاوت کو تمہی سے موسوم کیا ہے۔ اور متنبہ کیا ہے کہ ایسی تلاوت میں شیطان کا دخل غالب ہو جاتا ہے۔ اسی معنی میں آنحضرت نے بھی فرمایا ہے ﴿۱۲۵﴾ إِنَّ الْعَاجِلَةَ مِنَ الشَّيْطَانِ کہ جلد بازی شیطان کی طرف سے ہوتی ہے۔ مَنِّي كَذًا کے معنی فریب دہی سے جھوٹی امیدیں دلانے کے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک نے شیطان کے قول کی حکایت کرتے ہوئے فرمایا:

﴿وَلَا ضَلَّ عَنْهُمْ وَلَا مِينَهُمْ﴾ (۴-۱۱۹) اور ان کو گمراہ کرتا اور امیدیں دلاتا رہوں گا۔

الْمَهْدُ: گہوارہ۔ جو بچے کے لیے تیار کیا جائے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:-  
﴿كَيْفَ نُنَكِّلُ مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا﴾  
(۱۹-۲۹) کہ ہم اس سے کہ گود کا بچہ ہے، کیونکر بات کریں؟ اور الْمَهْدُ وَالْمِهَادُ: ہموار اور درست کی ہوئی زمین کو بھی کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:-  
﴿الَّذِي جَعَلَ لَكُمْ الْأَرْضَ مَهْدًا﴾ (۲۰-۵۳) وہ (وہی تو ہے) جس نے تم لوگوں کے لیے زمین کو فرش بنایا۔

﴿الَّذِي جَعَلَ الْأَرْضَ مَهْدًا﴾ (۷۸-۶) کیا ہم نے زمین کو کچھونا نہیں بنایا؟  
اور یہ ایسے ہی ہے۔ جیسا کہ دوسری آیت میں زمین کو فراش کہا ہے۔ چنانچہ فرمایا:  
﴿جَعَلَ لَكُمْ الْأَرْضَ فِرَاشًا﴾ (۲-۲۲) جس نے تمہارے لیے زمین کو کچھونا بنایا۔  
مَهَّدْتُ لَكَ کے معنی کسی چیز کو تیار اور ہموار کرنے کے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:-  
﴿وَمَهَّدْتُ لَهُ تَمْهِيدًا﴾ (۴۳-۱۳) اور ہر طرح سامان میں وسعت دی۔

إِمْتَهَدَ السَّانِمُ کے معنی کوہان کے مِهَاد یا مَهْد یعنی فرش کی طرح ہموار ہو جانے کے ہیں۔

① اشارۃ الی قصۃ ذکر ہا بعض علماء التفسیر ای تلك الغرائب العلی وان شفا عتھن لثرتجی۔ ذهب الحافظ بناء علی كثرة الطريق الی ان لها اصلاً الفتح (۳۳۳/۸) لیکن المحققین افکروہ راجع الفخر (۶/۲۴۵-۲۴۶) وقارن ما ذكره القبتی فی غریبه (۵۵-۵۶) و فی اللسان (هنی) قال الازهری والتلاوة سمیت امیة لان تالی القرآن اذ امر بایة رحمة تمنّاها و اذا امر بایة عذاب تمنی ان یوقاه

② انظر لتخريجه (ع ج ل) ۱۲۔



## (م ۵ ل)

الْمَهْلُ: کے معنی حلم و سکون کے ہیں۔ اور  
 مَهْلَ فِیْ فِعْلِهِ کے معنی ہیں اس نے سکون سے کام کیا۔  
 اور مَهْلًا کے معنی رِفْقًا کے ہیں۔ یعنی جلدی مت کرو۔  
 مَهْلَتُهُ: کسی کو مَهْلًا کہنا اور اَمَهْلَتُهُ کے معنی کسی کے  
 ساتھ نرمی سے پیش آنے کے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک  
 میں ہے:-

﴿فَمَهْلُ الْكَافِرِينَ اَمَهْلُهُمْ رُوْنِدًا﴾ (۸۶-۱۷) تو  
 تم کافروں کو مہلت دو، پس چند روز ہی مہلت دو۔  
 اَلْمَهْلُ: تلچھٹ کو کبھی کہتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا:-  
 ﴿كَالْمَهْلِ يَغْلِي فِي الْبُطُونِ﴾ (۵۴-۴۴) جیسے  
 گچھلا ہوا تانبا پیوں میں۔ (اس طرح) کھولے گا۔

## (م و ت)

الْمَوْتُ: یہ حیات کی ضد ہے۔ لہذا حیات کی  
 طرح موت کی بھی کئی قسمیں ہیں۔  
 اول قوت نامیہ (جو کہ انسان، حیوانات اور نباتات (سب  
 میں پائی جاتی ہے) کے زوال کو موت کہتے ہیں جیسے  
 فرمایا:-

﴿يُخِي الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا﴾ (۵۷-۱۷) زمین کو  
 اس کے مرنے کے بعد زندہ کرتا ہے۔  
 ﴿أَحْيَيْنَا بِهِ بَلْدَةً مَّيْتًا﴾ (۵۰-۱۱) اور اس (پانی)  
 سے ہم نے شہر مردہ (یعنی زمین افتادہ) کو زندہ کیا۔  
 دوم (۲) حس و شعور کے زائل ہو جانے کو موت کہتے ہیں۔  
 چنانچہ فرمایا:-

﴿يَلْبِثُنِي مِتٌ قَبْلَ هَذَا﴾ (۱۹-۲۳) کاش میں اس

سے پہلے مر چکتی۔

﴿إِذَا مَاتَ لَسَوْفَ أُخْرَجُ حَيًّا﴾ (۱۹-۲۶)  
 کہ جب میں مرجاؤں گا تو کیا زندہ کر کے نکالا جاؤں گا۔  
 سوم (۳) قوت عاقلہ کا زائل ہو جانا: اور اسی کا نام جہالت  
 ہے۔ چنانچہ فرمایا:-  
 ﴿أَوْ مَنْ كَانَ مَيِّتًا فَأَحْيَيْنَاهُ﴾ (۱۲-۶) بھلا جو پہلے  
 مردہ تھا۔ پھر ہم نے اس کو زندہ کیا۔

اور آیت کریمہ:-

﴿إِنَّكَ لَا تَسْمَعُ الْمَوْتَى﴾ (۲۷-۸۰) کچھ شک  
 نہیں کہ تم مردوں کو (بات) نہیں سنا سکتے۔

میں اسی معنی کے لحاظ سے کفار کو موتی کہا ہے۔

چہارم (۴) غم: جو زندگی کے چشمہ صافی کو مکدر کر دیتا  
 ہے۔ چنانچہ آیت کریمہ:-

﴿وَيَأْتِيهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَمَا هُوَ  
 بِمَيِّتٍ﴾ (۱۴-۱۷) اور ہر طرف سے اسے موت آرہی  
 ہوگی۔ مگر وہ مرنے میں نہیں آئے گا۔ میں موت سے یہی  
 معنی مراد ہیں۔

پنجم (۵) موت بمعنی نیند ہوتا ہے۔ اسی لیے کسی نے کہا ہے  
 کہ السَّوْمُ مَوْتُ خَفِيفٌ وَالْمَوْتُ نَوْمٌ ثَقِيلٌ کہ  
 نیند ہلکی سی موت ہوتی ہے۔ اور موت بھاری نیند کا نام  
 ہے۔ اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو توفی سے تعبیر  
 فرمایا۔ چنانچہ ارشاد ہے:-

﴿وَهُوَ الَّذِي يَتَوَفَّكُم بِاللَّيْلِ﴾ (۶-۲۰) اور وہی تو  
 ہے جو رات کو تمہاری رو میں قبض کر لیتا ہے۔ ﴿اللَّهُ  
 يَتَوَفَّى الْأَنْفُسَ حِينَ مَوْتِهَا وَالَّتِي لَمْ تَمُتْ

اور گھٹنا مراد ہے۔ یعنی انسان جب تک زندہ رہتا ہے۔  
تدریجاً مرتا رہتا ہے۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے۔ ⑤  
يَمُوتُ جُزْءًا أَفْجُزْءًا  
کہ وہ تدریجاً تحلیل ہو جائے گا۔

اور اسی معنی کے لحاظ سے بعض نے انسان کو مَائِتٌ (بصیغہ فاعل) کہا ہے۔ اور انہوں نے میت و مائت میں یہ فرق بیان کیا ہے کہ مَائِتٌ کے معنی تحلیل ہونے والے کے ہیں۔ اور مَيِّتٌ بمعنی مردہ کے۔

قاضی علی ابن عبدالعزیز نے کہا ہے کہ ہماری زبان (یعنی عربی) میں مَائِتٌ بایں معنی ثابت نہیں ہے۔ اَلْمَيِّتُ یہ مَيِّتٌ کا مخفف ہے اور مَوْتُ مَائِتٌ کا محاورہ مبالغہ پر محمول ہے۔ جیسا کہ شاعر شاعرٌ وَسَيِلٌ سَائِلٌ وغیرہا میں۔ اور بَلَدٌ یعنی شہر پر مَيِّتٌ اور مَيِّتٌ دونوں لفظ بولے جاتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا:-

سُقْنَاهُ لِيَلِدَ مَيِّتٌ: ہم اس کو ایک مری ہوئی بستی کی طرف ہانک دیتے ہیں۔ (۷-۵۷)  
﴿بَلَدَةٌ مَيِّتَةٌ﴾ (۲۵-۴۹) شہر مردہ (یعنی زمین افتاد کو)۔

اَلْمَيِّتَةُ: اس حیوان کو کہتے ہیں جس کی روح بغیر تزکیہ کے زائل ہوگئی ہو۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿حُزْرَمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيِّتَةُ﴾ (۵-۳) تم پر مرا ہوا جانور حرام ہے۔ ﴿لَا أَنْ يَكُونُ مَيِّتَةً﴾ (۶-۱۴۵) بجز اس کے کہ وہ

فِي مَنَامِهَا ﴿﴾ (۳۹-۴۲) اور خدا لوگوں کے مرنے کے وقت ان کی روحيں قبض کر لیتا ہے۔ اور جو مرے نہیں ان کی روحيں سوتے میں قبض کر لیتا ہے۔ اور آیت کریمہ:-  
﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتًا بَلْ أَحْيَاءٌ﴾ (۳-۱۶۹) جو لوگ خدا کی راہ میں مارے گئے انہیں مرے ہوئے نہ سمجھنا (وہ مرے ہوئے نہیں ہیں) بلکہ..... زندہ ہیں۔

میں شہداء کی روحوں سے موت کی نفی مراد ہے۔ اور اس میں ان کی روحوں کے عیش و آرام میں ہونے پر متنبہ کیا گیا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ ان سے اس حزن کی نفی ہے۔ جس کا کہ ابھی آیت ﴿وَيَأْتِيهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ﴾ میں ذکر ہو چکا ہے۔ اور آیت کریمہ:-

﴿إِنَّكَ مَيِّتٌ وَأَنْتُمْ مَيِّتُونَ﴾ (۳۹-۳۰) (اے پیغمبر) تم بھی مر جاؤ گے اور یہ بھی مر جائیں گے۔ میں بعض نے مَيِّتٌ کے معنی سَتَمُوتُ کیے ہیں۔ یعنی تم عنقریب فوت ہو جاؤ گے۔ تو اس سے متنبہ کیا ہے کہ موت سے کسی کو بھی چارہ کار نہیں ہے۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے ⑥ (السرلج)

(۴۱۴) اَلْمَوْتُ حَتْمٌ فِي رِقَابِ الْعِبَادِ  
ہر انسان کو حتماً مرنا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ یہاں اَلْمَيِّتُ کے معنی جسم سے روح کے الگ ہونے کے نہیں ہیں۔ بلکہ جسم کا تدریجاً تحلیل ہونا

① و صدره: قد كان له في الموت راحة (مقيد القافية) والبيت في الحصري (۱: ۱۱۷-۱۱۸) في ثلاثة قال ابو اسحاق رُوِيَ لِمُحَمَّدِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ الْحَسَنِ بْنِ الْحُسَيْنِ وَقَدْ رُوِيَ لِأَخِيهِ مُوسَى وَكَانَ زَيْدُ بْنُ عَلِيٍّ كَثِيرًا يَنْشُدُ وَرَوَى فِي الْعَقْدِ (۴: ۴۷۳، ۳۳) ثَلَاثَةً وَغَرَاهُ لَزِيدُ بْنُ عَلِيٍّ وَالْبَيَانُ وَالتَّبْيِينُ (۱: ۱۹۶) وَفِي ذَيْلِ الْأَمَالِيِّ (۱: ۱۴۳) ان ابن الاشعث لما هزم اتى سجستان فولى شاماً فانشد في ثلاثة ۱۲۔

② لم اجدہ ويرجى ۱۲

مرا ہوا جانور ہو۔

الْمَوْتَانُ: یہ حیوان کے مقابلہ میں بولا جاتا ہے۔ اور  
مَوْتَانِ يَمْوَاتُ غَيْرِ زَيْنِ کو کہتے ہیں۔ محاورہ ہے:-  
وَقَعَ فِي الْإِبِلِ مَوْتَانٌ كَثِيرٌ: بہت سے اونٹ مر  
گئے۔

نَاقَةُ مُمَيَّتَةٍ وَ مُمَيَّتٌ: جس ناقہ کا بچہ مر گیا ہو۔ اِمَاتَةُ  
الْحُمْرِ: (کنایہ) شراب کو پکا کر اس کا جوش مارنا۔  
الْمُسْتَمِيَّتُ: موت کا سامنا کرنے والا۔ نثر آدمی۔

شاعر نے کہا ہے ۵ (الوافر)

(۴۱۶) فَأَعْطَيْتُ الْجِعَالَ مُسْتَمِيَّتًا

تو میں نے موت سے نہ ڈرنے والے کو انعام دیا۔  
الْمَوْتَةُ: ایک قسم کا جنون گویا اس سے علم و عقل مردہ ہو  
جاتا ہے اسی سے مردہ دل آدمی کو مَوْتَانُ الْقَلْبِ اور  
عورت کو مَوْتَانَةُ الْقَلْبِ کہا جاتا ہے۔

(۴۱۷) (م و ج)

الْمَوْجُ: سمندر سے پانی کی جولہر مغرب کی طرف  
سے اٹھتی ہے اسے موج کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:-  
﴿فِي مَوْجٍ كَالْجِبَالِ﴾ (۴۲-۱۱) لہروں میں (چلنے

گئی) (لہریں کیا تھیں) گویا پہاڑ (تھے)

﴿يَغْشَاهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهِ مَوْجٌ﴾ (۲۳-۴۰) جس پر  
لہر چلی آتی ہو اور اس کے اوپر اور لہر آ رہی ہو۔ مَاجَ كَذَا  
يَمْوُجُ وَتَمْوُجُ تَمْوُجًا موج کی طرح مضطرب ہونا  
چنانچہ قرآن میں ہے:-

﴿وَتَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَمُوجُ فِي بَعْضٍ﴾  
(۱۸-۹۹) (اس (روز) م ان کو چھوڑ دیں گے۔ کہ  
(روئے زمین پر پھیل کر) ایک دوسرے میں گھس جائیں۔

(م و ر)

الْمَوْرُ: کے معنی تیز رفتاری کے ہیں۔ اور یہ  
مَارِيْمَوْرٌ مَوْرًا سے ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں  
ہے۔ ﴿يَوْمَ تَمُورُ السَّمَاءُ مَوْرًا﴾ (۵۲-۹) جس  
دن آسمان لرزے لگے گا کپکپا کر۔

مَارِ الدَّمُ عَلَى وَجْهِهِ کے معنی چہرہ پر تیزی سے خون  
جاری ہونے کے ہیں۔ اور مَوْرٌ غبار کو بھی کہتے ہیں۔ جو  
ہوا میں ادھر ادھر اڑتا ہے۔ اور نَاقَةُ تَمْوْرٍ فِی مَبْرِهَا  
کے معنی ہیں: اونٹنی کا تیز رفتاری کی وجہ سے غبار اڑاتے  
ہوئے چلے جانا اور تیز روانٹنی کو مَوَارَةٌ کہا جاتا ہے۔



① فی معجم البلدان (۳: ۴۷۴) قاله الاسدی وفي التبریزی: وقال شفيق بن سليل الاسدی وهو شاعر اسلامي قاله  
معتذرا الى الضحاك (ابو انس الضحاك بن قيس بن خالد الشيباني الفهري شهد صفين مع معاوية و غلب على دمشق ودعا  
الى بيعة ابن الزبير ثم دعا الى نفسه فقتل مراج راهط سنة ۶۵ راجع الاصابة ۴: ۶۴ و تمامه: تخفيف الحادهن فتیان جرم“  
والبيت في اللسان والحكم (جعل) والحماسة، مع المرزوقي رقم ۲۶۱ في سنة ۱۲۔

## کتابُ السُّنُونِ

(ن ب ء)

نُوحِيهَا إِلَيْكَ ﴿١١-٣٩﴾ یہ حالات منجملہ غیب کی

خبروں کے ہیں۔ جو ہم تمہاری طرف بھیجتے ہیں۔

﴿تِلْكَ الْقُرَى نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ أَنْبَاءِهَا﴾

(۷-۱۰) یہ بستیاں ہیں جن کے کچھ حالات ہم تم کو

سناتے ہیں۔ ﴿ذَلِكَ مِنْ أَنْبَاءِ الْقُرَى نَقُصُّهُ

عَلَيْكَ﴾ (۱۱-۱۰) یہ (پرانی) بستیوں کے تھوڑے سے

حالات ہیں جو ہم تم سے بیان کرتے ہیں۔ اور آیت

کریمہ: ﴿إِنْ جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَأٍ فَتَبَيَّنُوا﴾

(۲۹-۶) اگر کوئی بدکار تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے

تو خوب تحقیق کر لیا کرو۔

میں متنبہ کیا ہے کہ اگر کوئی خبر کسی اہم واقعہ کی حامل ہو تو

اگرچہ اس کے صحیح ہونے کا یقین یا ظن غالب حاصل ہو

جائے لیکن جب تک اس پر نظر ثانی اور اچھی طرح سے اس

کی جانچ پڑتال نہ ہو جائے اسے بیان کرنے میں توقف

کرنا چاہیے۔

نَبَأُهُ وَأَنْبَاءُهُ کے معنی خبر دینے کے ہیں۔ چنانچہ قرآن

میں ہے:-

﴿أَنْبِئُونِي بِأَسْمَاءِ هَؤُلَاءِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ﴾

(۲-۳۱) اگر تم سچے ہو تو مجھے ان کے نام بتاؤ۔ ﴿أَنْبِئْهُمْ

بِأَسْمَائِهِمْ فَلَمَّا أَنْبَأَهُمْ بِأَسْمَائِهِمْ﴾ (۲-۳۳)

کہ..... تم ان کو ان چیزوں کے نام بتاؤ۔ جب انہوں

نے ان کو ان کے نام بتائے۔ ﴿نَبَأْتُكُمَا بِنَاوِيلِهِ﴾

النَّبَاء: کے معنی خبر مفید کے ہیں جو علم یا غلبہ ظن

کا فائدہ دے۔ اور حقیقی معنی کے لحاظ سے کسی خبر پر نسا کا

لفظ استعمال نہیں ہو سکتا۔ جب تک اس میں تین چیزیں

موجود نہ ہوں۔ یعنی نہایت (۱) مفید (۲) ہونا اور اس سے

علم (۳) یا غلبہ ظن کا حاصل ہونا۔ اور نسا صرف اس خبر کو کہا

جاتا ہے۔ جس میں کذب کا احتمال نہ ہو۔ جیسے خبر متواتر،

خبر الہی، اور خبر نبوی اور لفظ نسا چونکہ معنی خبر کو متضمن ہوتا

ہے۔ اس لیے أَخْبَرْتُهُ بِكَذِّا کی طرح أَنْبَأْتُهُ بِكَذِّا کا

محاورہ بھی استعمال ہوتا ہے۔ اور معنی علم کو متضمن ہونے کی

وجہ سے أَعْلَمْتُهُ كَذِّا کی طرح أَنْبَأْتُهُ كَذِّا بھی کہا جاتا

ہے۔ جیسے فرمایا:-

﴿قُلْ هُوَ نَبَأٌ عَظِيمٌ أَنْتُمْ عَنْهُ مُعْرِضُونَ﴾

(۳۸-۶۸، ۶۷) کہہ دو کہ یہ ایک بڑی (ہولناک چیز کی)

خبر ہے جس کو تم دھیان میں نہیں لاتے۔

﴿عَمَّ يَتَسَاءَلُونَ عَنِ النَّبَاِ الْعَظِيمِ﴾

(۷۸-۲۱) یہ لوگ کس چیز کی نسبت پوچھتے ہیں۔ کیا

بڑی خبر کی نسبت؟

﴿الَمْ يَأْتِكُمْ نَبَأُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ قَبْلُ فَذَاقُوا

وَبَالَ أَمْرِهِمْ﴾ (۶۳-۵) کیا تم کو ان لوگوں کے حال

کی خبر نہیں پہنچی جو پہلے کافر ہوئے تھے۔ تو انہوں نے اپنے

کاموں کی سزا کا مزہ چکھ لیا۔ ﴿تِلْكَ مِنْ أَنْبَاءِ الْغَيْبِ

میں اس خبر کے تحقق اور من جانب اللہ ہونے پر شبہ کرنے کے لیے جواب میں اَنبَاء کی بجائے نَبَأَ کہا ہے۔ کیونکہ یہ اس سے بلغ ہے۔

اسی طرح آیت کریمہ:-

﴿قَدْ نَبَأَنَا اللَّهُ مِنْ أَخْبَارِكُمْ﴾ (۹۴-۹) خدا نے ہمیں تمہارے سب حالات بتا دیئے ہیں۔ اور آیت کریمہ:-

﴿فَيُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ﴾ (۸-۶۳) پھر جو جو کچھ تم کرتے رہے ہو وہ سب تمہیں بتائے گا۔ بھی اس لیے بلغ ہونے پر دال ہیں۔ اَلنَّبُوءَةُ: وہ سفارت جو اللہ تعالیٰ اور اس کے بندوں کے درمیان ان کے امور دنیوی اور اخروی میں خرابیوں کو دور کرنے کے لیے جاری ہوتی ہے اسے نبوت کہا جاتا ہے۔ اور نبی کو نبی اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ ان باتوں کی خبر دیتا ہے۔ جن پر عقول سلیمہ مطمئن ہوتی ہیں۔ اور نَبِیُّ ہو سکتا ہے کہ فعل بمعنی فاعل سے ہو۔ چنانچہ فرمایا: ﴿نَبِیُّ عِبَادِی﴾ (۱۵-۳۹) (اے پیغمبر) میرے بندوں کو بتا دو۔

﴿قُلْ أَوْ نَبِّئُكُمْ﴾ (۱۵-۳) (اے پیغمبر ان سے) کہو کہ بھلا میں تم کو ایسی چیز بتاؤں؟

اور یہ بھی کہ فعل بمعنی مفعول سے ہو یعنی خبر دیا گیا کیونکہ اسے اللہ تعالیٰ کی جانب سے خبر دی جاتی ہے۔ جیسے فرمایا:-

﴿نَبَأَنِيَ الْعَلِیْمُ الْخَبِيرُ﴾ (۳-۶۶) مجھے اس نے بتایا جو جاننے والا خبردار ہے۔

تَنْبَأُ فُلَانٌ کے معنی دعویٰ نبوت کرنے کے ہیں اور وضع لغوی کے اعتبار سے نبی کے متعلق اس کا استعمال صحیح ہونا

(۱۲-۳۷) کہ میں تم کو اس کی تعبیر بتا دوں گا۔

﴿وَبَيَّنَّاهُمْ عَنْ ضَيْفِ إِبْرَاهِيمَ﴾ (۱۵-۵۱) اور ان کو ابراہیم علیہ السلام کے مہمانوں کا حال دو۔

﴿قُلْ أَتَنبِئُونَ اللَّهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمَوَاتِ وَ لَا فِي الْأَرْضِ﴾ (۱۸-۱۹) کہہ دو کیا تم خدا کو ایسی چیز بتاتے ہو جس کا وجود اسے نہ آسمانوں میں معلوم ہوتا ہے اور نہ زمین میں۔

﴿أَمْ تَنبِئُونَهُ بِمَا لَا يَعْلَمُ﴾ (۱۳-۳۳) کیا تم اسے ایسی چیزیں بتاتے ہو جن کو وہ ..... معلوم نہیں کرتا۔ ﴿تَنبِئُونِي بِعِلْمٍ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ﴾ (۶-۱۳۳) اگر سچ ہو تو مجھے سند سے بتاؤ۔

﴿قَدْ نَبَأْنَا اللَّهُ مِنْ أَخْبَارِكُمْ﴾ (۹۴-۹) خدا نے ہمیں تمہارے سب حالات بتا دیئے ہیں۔

اور نَبَأْتُهُ میں اَنبَأْتُهُ کی نسبت زیادہ مبالغہ پایا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:-

﴿فَلَنُنَبِّئَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِمَا عَمِلُوا﴾ (۴۱-۵۰) پس کافر جو عمل کرتے ہیں۔ وہ ہم ان کو ضرور جتائیں گے۔

﴿يُنَبِّأُ الْإِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ بِمَا قَدَّمَ وَآخَرَ﴾ (۵-۱۳) اس دن انسان نے جو عمل آگے بھیجے۔ اور جو پیچھے چھوڑے ہوں گے۔ سب بتا دیئے جائیں گے۔

اور اس سے بلغ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ آیت کریمہ:- ﴿فَلَمَّا نَبَاَهَا بِهِ قَالَتْ مَنْ أَنْبَاكَ هَذَا قَالَ نَبَانِي الْعَلِیْمُ الْخَبِيرُ﴾ (۳-۶۶) تو جب وہ ان کو جتائی تو پوچھنے لگیں گے کہ آپ کو یہ کس نے بتایا۔ انہوں نے کہا کہ مجھے اس نے بتایا جو جاننے والا خبردار ہے۔

متعلق استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَأَنْبَتْنَا فِيهَا حَبًّا وَعِنَبًا وَقَضْبًا وَزَيْتُونًا وَنَخْلًا  
وَحَدَائِقَ غُلْبًا وَفَاكِهَةً وَأَبًّا﴾ (۸۰-۳۱۲) پھر  
ہم ہی نے اس میں اناج اگایا۔ اور انگور اور ترکاری۔ اور  
زیتون اور کھجوریں، اور گھنے گھنے باغ اور میوے اور چارہ۔

﴿فَأَنْبَتْنَا بِهِ حَدَائِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ مَا كَانَ لَكُمْ  
أَنْ تُنْبِتُوا شَجَرَهَا﴾ (۶۲-۶) (ہم نے) پھر اس  
سے سرسبز باغ اگائے تمہارا کام تو نہ تھا۔ کہ تم ان کے  
درختوں کو اگاتے۔

﴿يُنْبِتُ لَكُمْ بِهِ الزَّرْعَ وَالزَّيْتُونَ﴾ (۱۶-۱۱) اسی  
پانی سے وہ تمہارے لیے کھیتی اور زیتون اگاتا ہے۔ اور  
آیت کریمہ:

﴿وَاللَّهُ أَنْبَتَكُمْ مِنَ الْأَرْضِ نَبَاتًا﴾ (۷۱-۱۷)  
اور خدا ہی نے تم کو زمین سے پیدا کیا۔

کی تفسیر میں علمائے نحو نے لکھا ہے کہ یہاں نَبَاتٌ مصدر  
من غیر بَا بِہ ہے اور انبأتا کی جگہ پر استعمال ہوا  
ہے۔ ❶ دوسرے علماء کے نزدیک نَبَاتٌ حال ہے۔ مصدر  
نہیں ہے۔ اور اس سے متنبہ کیا ہے کہ انسان بھی ایک  
طرح سے نبات میں داخل ہے کیونکہ اس کی ابتدائی نشأت  
بھی تراب ہی سے ہے۔ اور پھر وہ نبات ہی کی طرح بڑھتا  
ہے اگرچہ اس میں نبات سے کچھ زائد اوصاف پائے  
جاتے ہیں۔ چنانچہ اسی پر تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا:

﴿هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ تَرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُطْفَةٍ﴾  
(۴۰-۶) وہی تو ہے جس نے تم کو پہلے مٹی سے پیدا کیا

چاہیے تھا۔ کیونکہ یہ باب تفعیل کا مطاوع ہوتا ہے، جیسے: زَيْنَةٌ  
فَتَزَيْنُ وَحَلَاةٌ فَتَحْلِي وَجَمَلَةٌ فَتَجْمَلُ وغیرہ۔

لیکن جھوٹا دعویٰ نبوت کرنے والے کے حق میں متعارف  
ہونے کی وجہ سے سچے نبی کے حق میں اس کے استعمال  
سے گریز کیا گیا ہے اور صرف مدعی کاذب کے متعلق اس کا  
استعمال ہوتا ہے۔ جیسے تَبَاءٌ مُسَيَّلَةٌ یعنی مُسَيَّلَمَہ  
نے جھوٹا دعویٰ نبوت کیا۔ پھر اس بات پر متنبہ کرنے کے  
لیے کہ اس کی خبریں منجانب اللہ نہیں ہوتی تھیں نبی کی تصغیر  
کر کے مُسَيَّلَمَہ نَبِیُّہ سَوَّءُ کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ کسی  
نے اس کا کلام سن کر کہا تھا۔ وَاللَّهِ مَا خَرَجَ هَذَا  
الْكَلَامُ مِنْ آلٍ: کہ اللہ کی قسم: یہ ال یعنی اللہ کا کلام نہیں  
ہے۔ اَلنَّبَاُ: پست اور خفی آواز۔

## (ن ب ت)

النَّبْتُ وَالنَّبَاتُ: ہر وہ چیز جو زمین سے اُگتی  
ہے۔ اسے نَبْتُ یا نَبَاتُ کہا جاتا ہے۔ خواہ وہ تندہ دار ہو  
جیسے درخت۔ یا بے تندہ جیسے جڑی بوٹیاں لیکن عرف میں  
خاص کر نبات اسے کہتے ہیں جس کے تندہ نہ ہو۔ بلکہ عوام تو  
جانوروں کے چارہ پر ہی نبات کا لفظ بولتے ہیں۔ چنانچہ  
آیت کریمہ: ﴿لَنُخْرِجَ بِهِ حَبًّا وَنَبَاتًا﴾  
(۷۸-۱۵) تاکہ اس سے اناج اور سبزہ پیدا کریں۔

میں نبات سے مراد چارہ ہی ہے۔ لیکن یہ اپنے حقیقی معنی  
کے اعتبار سے ہر بڑھنے والی چیز کے متعلق استعمال ہوتا  
ہے۔ اور نباتات، حیوانات اور انسان سب پر بولا جاتا  
ہے۔ اور انبأت (افعال) کا لفظ ان سب چیزوں کے

❶ نسب اللولوسی هذا القول الى ابي حيان النحوى و جماعة من العلماء وعلى هذا يكون نباتا مصدراً منصوباً لا بنات  
روح المعانی (۲۸-۷۵) ۱۲۔

فراخ میدان میں ڈال دیا۔

﴿لَسْبُدَّ بِالْعَرَاءِ﴾ (۶۸-۴۹) تو وہ چٹیل میدان میں

ڈال دیئے جاتے۔

اور آیت کریمہ:-

﴿فَانْبِذْ إِلَيْهِمْ عَلَى سَوَاءٍ﴾ (۵۸-۸) تو ان کا

عہد انہی کی طرف پھینک دو (اور برابر کا جواب دو) میں

فَانْبِذْ عَلَى سَوَاءٍ کے معنی یہ ہیں کہ معاہدہ صلح سے

دستبردار ہو جاؤ لہذا یہاں معاہدہ صلح سے دستبردار ہونے

کے لیے مجازاً انْبِذْ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ جیسا کہ آیت

کریمہ:- ﴿فَالْقَوْلُ إِلَيْهِمُ الْقَوْلُ إِنكُم لَكَاذِبُونَ وَ

الْقَوْلُ إِلَى اللَّهِ يَوْمَئِذٍ السَّلَامُ﴾ (۱۶-۸۶-۸۷)

تو ان کے کلام کو مسترد کر دیں گے اور ان سے کہیں گے کہ تم

جھوٹے ہو۔ اور اس دن خدا کے سامنے سرگرم ہو جائیں

گے۔

میں قول (اور متکلم) کے متعلق الْقَاء کا لفظ استعمال ہوا

ہے۔ اور آیت:-

﴿فَانْبِذْ إِلَىٰ مَن مِّنْكُمْ﴾ (اس صورت میں) ان کے

معاہدہ کو مزید مؤکد نہ کیا جائے۔ بلکہ حسن معاملہ سے اسے

فسخ کر دیا جائے اور ان کے رویہ کے مطابق ان سے

سلوک کیا جائے۔ یعنی جب تک وہ معاہدہ کو قائم رکھیں

اس کا احترام کیا جائے۔ فَاَنْتَبَذَ فُلَانٌ کے معنی اس شخص

کی طرح یکسو ہو جانے کے ہیں جو اپنے آپ کو ناقابل

اعتبار سمجھتا ہو۔ قرآن پاک میں ہے:-

﴿فَحَمَلَتْهُ فَانْتَبَذَتْ بِهِ مَكَانًا قَصِيًّا﴾ (۱۹-۲۲)

اور وہ اس بچے کے ساتھ حاملہ ہو گئیں اور اسے لے کر ایک

دور جگہ چلی گئیں۔

پھر نطفہ بنا کر۔ اور آیت کریمہ:- ﴿وَأَنْتَبَهَّا نَبَاتًا

حَسَنًا﴾ (۳-۳۷) اور اسے اچھی طرح پرورش کیا۔

بھی اس معنی پر محمول ہے۔ اور آیت کریمہ:- ﴿تَنْبِثُ

بِالذُّهْنِ﴾ (۲۳-۲۰) (یعنی زیتون کا درخت کہ).....

روغن..... لیے ہوئے آگتا ہے۔

میں باء تعدیہ کے لیے نہیں ہے کیونکہ نَبَتْ: خود فعل متعدی

ہے۔ بلکہ حال کے لیے ہے: اور تقدیر یہ ہے تَنْبِثُ

حَامِلَةً لِلذُّهْنِ: یعنی وہ درخت اس حال میں آگتا ہے کہ

روغن اس میں بالقوة موجود ہوتا ہے۔ مشہور محاورہ ہے: إِنَّ

بَسْنَىٰ فُلَانٍ لَّنَابِتَةٍ شَرٍّ کہ فلاں لوگ فساد کی جڑ ہیں۔

تَبَّتْ فِيهِمْ نَابِتَةٌ: یعنی ان کی نئی پود جوان ہو گئی۔

## (ن ب ذ)

الْتَبَذَ کے معنی کسی چیز کو درخود اعتناء نہ سمجھ کر

پھینک دینے کے ہیں۔ اسی سے محاورہ مشہور ہے۔

نَبَذَتْهُ نَبَذَ التَّعَلُّ الْخَلْقِ: میں نے اسے پرانے جوتے

کی طرح پھینک دیا۔ قرآن پاک میں ہے:-

﴿لَيَنْبِذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ﴾ (۴-۱۰۴) وہ ضرور حطمہ

میں ڈالا جائے گا۔

﴿فَنَبَذُوهُ وَرَاءَ ظُهُورِهِمْ﴾ (۳-۱۷۸) تو انہوں

نے اسے پس پشت پھینک دیا۔

یعنی انہوں نے اسے قابل التفات نہ سمجھا۔ نیز فرمایا:

﴿نَبَذَهُ فَرِيقٌ مِّنْهُمْ﴾ (۲-۱۰۰) تو ان میں ایک فریق

نے اس کو بے قدر چیز کی طرح پھینک دیا۔ ﴿فَأَخَذَتْهُ

وَجُنُودُهُ فَنَبَذْنَاهُمْ فِي الْيَمِّ﴾ (۲۸-۴۰) تو ہم نے

ان کو اور ان کے لشکر کو پکڑ لیا۔ اور دریا میں ڈال دیا۔

﴿فَنَبَذْنَاهُ بِالْعَرَاءِ﴾ (۳۷-۱۳۵) پھر ہم نے ان کو

قوم کا نام ہے۔

### (ن ب ع)

النَّبْعُ کے معنی چشمہ سے پانی پھوٹنے کے ہیں۔ اور یہ نَبْعَ الْمَاءِ يَنْبُعُ (ن) نَبُوْعًا وَنَبْعًا مصدر ہے اور اَلْيَنْبُوعُ اس چشمہ کو کہتے ہیں جس سے پانی اُبل رہا ہو اس کی جمع یَنَابِيعِ آتی ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:-

﴿الَّذِينَ تَرَوْنَ اللَّهَ أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَسَلَكَهُ يَنَابِيعٌ فِي الْأَرْضِ﴾ (۳۹-۲۱) کیا تم نے نہیں دیکھا۔ کہ خدا آسمان سے پانی نازل کرتا ہے۔ پھر اس کو زمین میں چشمے بنا کر جاری کرتا ہے۔

النَّبْعُ ایک قسم کا درخت جس کی کمانیں بنتی ہیں۔

### (ن ب و)

النَّبِيُّ: (بدون ہمز) کے متعلق بعض علمائے نحو نے کہا ہے کہ یہ اصل میں مہوز ہے لیکن اس میں ہمزہ متروک ہو چکا ہے۔ اور اس پر وہ مُسَيَّلَمَةُ نَبِيٍّ سُوِّءَ کے محاورہ سے استدلال کرتے ہیں۔

مگر بعض علماء نے کہا ہے کہ یہ نَبِوءَةٌ بمعنی رفعت سے مشتق ہے اور نبی کو نبی اس لیے کہا گیا ہے کہ وہ لوگوں کے اندر معزز اور بلند اقدار کا حامل ہوتا ہے۔ جیسا کہ آیت کریمہ:-

﴿وَرَفَعْنَاهُ مَكَانًا عَلِيًّا﴾ (۱۹-۵۷) اور ہم نے ان کو بلند درجات سے نوازا۔

کے مفہوم سے سمجھا جاتا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ نبی بدون

اور قَعَدَ تَبَذَّةً وَتَبَذَّةً کے معنی یکسو ہو کر بیٹھ جانے کے ہیں اور راستہ میں پڑے ہوئے بچے کو صَبِيٍّ مَنبُوذٍ وَتَبِيذٌ کہتے ہیں۔ جیسا کہ اسے مَلْفُوطٌ يَأْتِيْقِيْطُ کہا جاتا ہے لیکن اس لحاظ سے کہ کسی نے اسے پھینک دیا ہے۔ اسے مَنبُوذٌ کہا جاتا ہے۔ اور اٹھائے جانے کے لحاظ سے ”لَقِيْطُ“ کہا جاتا ہے۔ اَلنَّبِيْذُ: اصل میں انگور یا کھجور کو کہتے ہیں۔ جو پانی میں ملائی گئی ہو۔ پھر خاص قسم کی شراب پر بولا جاتا ہے۔

### (ن ب ز)

النَّبَزُ کے معنی کسی کو برے نام کے ساتھ پکارنے کے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:-

﴿وَلَا تَنَابَزُوا بِالْأَلْقَابِ﴾ (۴۹-۱۱) اور نہ ایک دوسرے کا برا نام رکھو۔

### (ن ب ط)

الْأَسْتِنْبَاطُ: کے معنی استخراج کے ہیں۔ جیسے فرمایا:-

﴿وَلَوْ رَدُّوهُ إِلَى الرَّسُولِ وَإِلَى أُولَى الْأَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِينَ يَسْتَنْبِطُونَهُ مِنْهُمْ﴾ (۸۳-۴) اور اس کو پیغمبر اور اپنے سرداروں کے پاس پہنچاتے تو تحقیق کرنے والے اس کی تحقیق کر لیتے۔ اور یہ اَنْبَطْتُ كَذَا سے استعمال کا صیغہ ہے جس کے اصل معنی پانی نکالنے کے ہیں اور کنواں کھودنے کے بعد جو پہلی دفعہ پانی نکالا جاتا ہے اسے بَط کہا جاتا ہے۔

فَرَسٌ اَنْبَطُ: اسب سفید بغل۔ اسی سے نَبَطُ ایک مشہور

① ای لا جماع العرب انه بالهمزة ۱۲۔

② وفی الفائق ومنه (نبوة) زعم ان اشتقاق النبى منه وهو غير متقبل عند محققه اصحابنا ولا يرجع عليه (۲: ۲۶۲)۔



## (ن ث ر)

نَشَرَ الشَّيْءَ کے معنی کسی چیز کو بکھیرنے اور پراگندہ کر دینے کے ہیں۔

یہ نَشَرْتُ (ض) کا مصدر ہے۔ اور اَنْشَرْتُ (انفعال) کے معنی بکھر جانے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:-

﴿وَإِذَا الْكُوفُ أُمْسَتْ أَشْرَتْ﴾ (۸۲-۲) اور جب تارے بجھ پڑیں۔

اور پہنی ہوئی زرہ کو نَشَرْتُ کہا جاتا ہے۔

نَشَرَتِ الشَّاةُ: بکری کا چھینک کر فضلہ باہر پھینکنا اور چھینک سے جو فضلہ ناک سے بہہ نکلتا ہے اسے بھی نَشَرْتُ کہا جاتا ہے کبھی نَشَرْتُ کا لفظ ناک پر بھی بولا جاتا ہے۔

اسی سے نَشَرْتُ ایک ستارے کا نام ہے جسے أَنْفُ الْأَسَدِ کہا جاتا ہے۔ محاورہ ہے۔

طَعَنَهُ فَأَنْشَرْنَا: اسے نیزہ مارا تو وہ ناک کے بل گر پڑا۔

الْأَسْتِثَارُ: ناک میں پانی چڑھا کر جھاڑنا۔

## (ن ج د)

النَّجْدُ کے معنی بلند اور سخت جگہ کے ہیں۔ اور

آیت کریمہ:-

﴿وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ﴾ (۹۰-۱۰) اور اس کو (خیر و شر کے) دونوں رستے بھی دکھا دیئے۔

میں نَجْدَيْنِ کا لفظ حق و باطل، صدق و کذب اور حسن و قبیح، قول و عمل کے لیے بطور مثال ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ دونوں راستے واضح کر دیے ہیں۔ جیسے

ہمزہ (مہوز) سے ابلغ ہے کیونکہ ہر مُنبَأٌ لوگوں میں بلند قدر اور صاحب مرتبہ نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ جب ایک شخص نے آنحضرت ﷺ کو ارزاہ بغضِ یاسا نبی اللہ

کہہ کر پکارا تو آپ نے فرمایا ۵ (۱۲۵)

((لَسْتُ بَنَبِيٍّ ءِ اللّٰهُ وَلَكِنْ نَبِيُّ اللّٰهُ)) کہ میں نبی اللہ نہیں ہوں بلکہ نبی اللہ ہوں۔

الْتَّبَوَةُ وَالنَّبَاوَةُ کے معنی بلندی کے ہیں۔ اسی سے محاورہ ہے۔

نَبَاً بِفُلَانٍ مَّكَانَهُ: کہ اسے یہ جگہ راس نہ آئی۔ جیسا کہ قَضٌ عَلَيْهِ مَضْجَعُهُ کا محاورہ ہے جس کے معنی بے چینی سے کروٹیں لینے کے ہیں۔ نَبَا السَّيْفِ عَنِ الضَّرْبَةِ: تلوار کا اچٹ جانا۔ پھر اس کے ساتھ تشبیہ

دے کر نَبَاً بَصْرُهُ عَنْ كَذَا کا محاورہ بھی استعمال ہوتا ہے جس کے معنی کسی چیز سے کراہت کرنے کے ہیں۔

## (ن ت ق)

نَتَقَّ الشَّيْءَ کے معنی کسی چیز کو کھینچ کر ڈھیلا کر

دینے کے ہیں۔ جیسے نَتَقَّ عُرَى الْجَمَلِ: اس نے بوجھ کی گرہیں کھول دیں۔ قرآن پاک میں ہے:- ﴿وَإِذْ

نَتَفْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ﴾ (۷-۱۷) اور جب ہم نے ان کے سروں پر پہاڑ اٹھا کھڑا کیا۔

اسی سے استعارہ کے طور پر کثیر الاولاد عورت کو امْرَءَةٌ نَاتِقٌ کہا جاتا ہے۔ ۵ اور اس عورت کے ساتھ تشبیہ دے

کر زود آتش افروز چقماق کو بھی زَنْدٌ نَاتِقٌ کہتے ہیں۔

۱ رواہ الحاكم في المستدرک والحديث غير صحيح لان في سنده حمرا من غلاة الشيعة ومما يدل على ان الصحيح انه

بالمهززة قرء مهموزا في السبعة

۲ وفي الحديث عليكم بالابكار فانهم افواها وانتق ارحاما (انظر النهاية ۱۳۱/۴) والفائق (۶۵/۳)۔

فرمایا:- ﴿إِنَّمَا هَدَيْنَهُ السَّبِيلَ﴾ لایہ (۷۶-۳) اور اسے رستہ بھی دکھایا۔

النَّجْدُ: (ایضاً) ایک علاقے کا نام ہے اور اَنْجَدَہ کے معنی نجد کا قصد کرنے کے ہیں۔ اور رَجُلٌ نَجْدٌ وَنَجِيدٌ وَنَجْدٌ کے معنی مشہور طاقت ور اور بہادر آدمی کے ہیں۔ اور اسْتَنْجَدَہ فَاَنْجَدْنِي کے معنی ہیں: میں نے اس سے فریاد کی تو اس نے بہادری اور قوت سے میری مدد کی اور کبھی اسْتَنْجَدَہ فُلَانٌ کے معنی قوی ہونا کے بھی آجاتے ہیں۔ اور تکلیف زدہ اور مغلوب آدمی کو مَنَّجُوْدُ کہا جاتا ہے۔ گویا وہ نَجْدَہ یعنی شدت میں گرفتار ہے۔

النَّجْدُ: (ایضاً) پسینہ۔ نَجْدَہ الدَّهْرُ کے معنی کسی کو قوی کر دینے کے ہیں۔ گویا وہ تجربہ حاصل کر کے قوی ہو گیا۔

اسی سے فُلَانٌ ابْنُ نَجْدَہ کَذَا کا محاورہ ہے یعنی وہ اس کام میں ماہر ہے۔

النَّجَادُ: مکان کی آرائیگی کا سامان یہ (نَجْد) کی جمع ہے۔

نَجَادٌ فرش ساز و آنچہ بستر و بالین و وزد۔ نَجَادُ السَّيْفِ: تلوار لٹکانے کا پر تلہ۔

النَّجُوْدُ: شراب صاف کرنے کی صافی۔ راوْدَق۔

### (ن ج س)

النَّجَاسَةُ کے معنی پلیدی کے ہیں اور یہ دو قسم پر ہے۔ نجاست: (۱) حسی یا مادی جس کا ادراک حس سے ہو سکتا ہو۔ نجاست (۲) معنوی: جس کا ادراک بصیرت

سے ہوتا ہو۔ چنانچہ نجاست معنوی کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ نے مشرکین کے متعلق فرمایا:- ﴿إِنَّمَا الْمُشْرِكُونَ نَجَسٌ﴾ (۹-۲۸) مشرک تو پلید ہیں۔

نَجَسَہ کے معنی: کسی چیز کو نجس کر دینا کے ہیں۔ نیز اس کے معنی ازالہ نجاست بھی آتے ہیں۔ اور اسی سے تَنْجِيسُ الْعَرَبِ ہے یعنی تعویذ گنڈا۔ جوشیطانی نجاست کو دور کرنے کے لیے بچے کے گلہ میں لٹکاتے تھے۔

نَاجِسٌ وَنَجِيسٌ ایک بری اور لا علاج بیماری۔

### (ن ج م)

النَّجْمُ: اصل میں طلوع ہونے والے ستارے کو کہتے ہیں۔ اس کی جمع نُجُومٌ آتی ہے۔ اور نَجَمٌ (ن) نُجُومًا وَنَجْمًا کے معنی طلوع ہونے کے ہیں۔

نَجْم کا لفظ کبھی اسم ہوتا ہے۔ اور کبھی مصدر اسی طرح نَجْم کا لفظ کبھی قُلُوبٌ وَجُيُوبٌ کی طرح جمع ہوتا ہے اور کبھی طُلُوعٌ وَغُرُوبٌ کی طرح مصدر اور تشبیہ کے طور پر سبزہ کے اگنے اور کسی رائے کے ظاہر ہونے پر بھی نَجْمُ النَّبِّتِ أَوِ الْقَرْنِ وَنَجْمٌ لِي رَأَى نَجْمًا کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔

نَجَمٌ فُلَانٌ عَلَى السُّلْطَانِ: بادشاہ سے بغاوت کرنا۔ نَجَمْتُ الْمَالِ عَلَيْهِ: اس کے اصل معنی تو ستاروں کے طلوع کے لحاظ سے قرض کی قسطیں مقرر کرنے کے ہیں۔ مثلاً: فلاں ستارے کے طلوع پر مال کی اتنی قسط ادا کرتا رہوں گا۔ مگر عرف میں مطلق اقساط مقرر کرنے پر

منازل لیے ہیں اور بعض نے نجوم القرآن مراد لیے ہیں۔  
 التَّسْجُمُ: علم نجوم کے حساب سے کوئی پیش گوئی کرنا۔ اور  
 آیت کریمہ:-

﴿وَالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدَانِ﴾ (۵۵-۶) اور  
 بوٹیاں اور درخت سجدے کر رہے ہیں۔

میں نجم سے بے تہہ نباتات یعنی جڑی بوٹیاں مراد ہیں اور  
 بعض نے ستارے مراد لیے ہیں۔

### (ن ج و)

اصل میں نَجَاء کے معنی کسی چیز سے الگ ہونے  
 کے ہیں۔ اسی سے نَجَا فُلَانٌ مِنْ فُلَانٍ کا محاورہ  
 ہے جس کے معنی نجات پانے کے ہیں۔ اور اَنْجَيْتُهُ  
 وَنَجَيْتُهُ کے معنی نجات دینے کے چنانچہ فرمایا:-

﴿وَأَنْجَيْنَا الَّذِينَ آمَنُوا﴾ (۲۷-۵۳) اور جو لوگ  
 ایمان لائے..... ان کو ہم نے نجات دی۔ ﴿إِنَّا  
 مُنْجِيُكَ وَآهْلَكَ﴾ (۲۹-۳۳) ہم آپ کو اور آپ  
 کے گھروالوں کو بچالیں گے۔

﴿وَإِذْ نَجَّيْنُكُمْ مِنَ آلِ فِرْعَوْنَ﴾ (۲-۲۹) جب  
 ہم نے تم کو قوم فرعون سے خلاصی بخشی۔

﴿فَلَمَّا أَنْجَاهُمْ إِذَا هُمْ يَبْغَوْنَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ  
 الْحَقِّ﴾ (۱۰-۲۳) لیکن جب وہ ان کو نجات دے دیتا  
 ہے تو ملک میں ناحق شرارت کرنے لگتے ہیں۔ ﴿فَأَنْجَيْنَاهُ

وَآهْلَهُ إِلَّا أَمْرًا تَهُ﴾ (۷-۸۳) تو ہم نے ان کو اور ان  
 کے گھروالوں کو بچالیا۔ مگر ان کی بی بی۔ ﴿فَأَنْجَيْنَاهُ وَ

الَّذِينَ مَعَهُ بِرَحْمَةٍ مِنَّا﴾ (۷-۷۲) پھر ہم نے  
 ہود علیہ السلام اور جو لوگ ان کے ساتھ تھے۔ ان کو نجات بخشی۔

بولا جاتا ہے قرآن پاک میں ہے: ﴿وَبِالنَّجْمِ هُمْ  
 يَهْتَدُونَ﴾ (۱۶-۱۶) اور لوگ ستاروں سے بھی رستے  
 معلوم کرتے ہیں۔

﴿فَنَظَرْنَا نَظْرَةً فِي النُّجُومِ﴾ (۳۷-۸۸) تب  
 انہوں نے ستاروں کی طرف ایک نظر کی۔

یعنی علم نجوم سے حساب نکالا۔ اور آیت کریمہ:-  
 ﴿وَالنَّجْمُ إِذَا هَوَىٰ﴾ (۵۳-۱) تارے کی قسم جب  
 غائب ہونے لگے۔

کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ نجم سے مراد ستارہ ہے اور  
 طَلَعَ کی بجائے هَوَى کا لفظ لانے کی وجہ یہ ہے کہ طلوع  
 کے معنی پر تو لفظ نجم ہی دلالت کر رہا ہے۔ اور بعض نے کہا  
 ہے کہ نجم سے مراد ثریا یعنی پروین ہے۔ کیونکہ اہل عرب  
 جب مطلق النجم کا لفظ بولتے ہیں تو پروین ہی مراد ہوتی  
 ہے۔ جیسا کہ مقولہ ہے ﴿الرمل﴾

طَلَعَ النَّجْمُ غَدِيَّةً

وَابْتَغَى الرَّاعِي شُكْبَةً

صبح کا ستارہ طلوع ہوا اور چرواہے نے اپنا مشکیزہ سنبھالا۔

بعض نے کہا ہے کہ آیت مذکورہ میں النجم سے  
 مراد نجوم القرآن ہیں۔ کیونکہ وہ بھی تدریجاً معین مقدار  
 میں نازل ہوتا رہا ہے اور ہسوی سے اس کا نزول مراد  
 ہے۔ اسی طرح آیت کریمہ:-

﴿فَلَا أُقْسِمُ بِمَوَاقِعِ النُّجُومِ﴾ (۵۶-۷۵) ہمیں  
 تاروں کی منزلوں کی قسم۔

میں بھی مواقع النجوم..... کی دو طرح تفسیر بیان کی گئی  
 ہے۔ یعنی بعض نے مواقع النجوم سے مراد ستاروں کے

① انظر للكلمة الميداني والبحر (۱۵۷/۸) والمرزوقی (۴۷۹) اوفی المعانی اللقبی عشاء و كساء بدل غدیه وشكیه بغیر عزو۔

آتے ہیں۔ اور چونکہ یہ لفظ ان دونوں معنی میں مشترک ہے۔ اس لیے شاعر نے کہا ہے ﴿الطویل﴾

(۴۱۸) فَقُلْتُ أَتَجَوَّعُنَا نَجَا الْجِلْدِ إِنَّهُ  
سَيُرْضِيكُمَا مِنْهَا سَنَامٌ وَعَارِيَةٌ

میں نے کہا کہ اس کا پوست اتار لو بے شک اس کی کوہان اور کندھے تمہارے لیے کافی ہوں گے۔ نَاجِيَّتْہ کے معنی سرگوشی کرنے کے ہیں۔ مگر اس کے اصل معنی بلند زمین پر کسی کے ساتھ تہا ہونے کے ہیں۔ بعض نے اسے نَجَاة سے لیا ہے۔ لہذا نَاجِيَّتْہ کے اصل معنی کسی معاملہ میں دوسرے کی رہائی کے لیے اس کی مدد کرنے کے ہیں۔ یا اپنے بھید کو دوسروں پر افشا ہونے سے بچانے کے ہیں۔ تَنَاجَى الْقَوْمُ لوگوں کا باہم سرگوشی کرنا۔

چنانچہ فرمایا:-

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَنَاجَيْتُمْ فَلَا تَتَنَاجَوْا بِالْأَلَامِ وَالْعُدْوَانِ وَمَنْعِصَةِ الرَّسُولِ وَتَنَاجَوْا بِالْبَيِّنِ وَالتَّقْوَى﴾ (۵۸-۹) مومنو! جب تم آپس میں سرگوشیاں کرنے لگو تو گناہ اور زیادتی، پیغمبر کی نافرمانی کی باتیں نہ کرنا۔ بلکہ نیکو کاری اور پرہیزگاری کی باتیں کرنا۔ ﴿إِذَا نَاجَيْتُمُ الرَّسُولَ فَقَدِّمُوا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوَاكُمْ صَدَقَةٌ﴾ (۵۸-۱۲) جب تم پیغمبروں کے کانوں میں کوئی بات کہو تو بات کہنے سے پہلے (مساکین

﴿نَجَّيْنَاهُمَا وَقَوْمَهُمَا﴾ (۱۱۵-۳۷) اور ان کو اور ان کی قوم کو..... نجات بخشی۔

﴿نَجَّيْنَاهُمْ بِسَحَرٍ نَّعْمَةٍ﴾ (۵۴-۳۴) ان کو بچھلی رات ہی سے بچالیا اپنے فضل سے۔

﴿وَنَجَّيْنَا الَّذِينَ آمَنُوا﴾ (۴۱-۱۸) اور جو ایمان لائے..... ان کو ہم نے بچالیا۔

﴿نَجَّيْنَا هُودًا وَالَّذِينَ آمَنُوا﴾ (۱۱-۵۸) اور انہیں عذاب شدید سے نجات دی۔

﴿ثُمَّ نُنَجِّي رُسُلَنَا﴾ (۱۰-۱۰۳) اور ہم اپنے پیغمبروں کو..... نجات دیتے رہے ہیں۔

﴿ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِينَ اتَّقَوْا﴾ (۱۹-۷۲) پھر ہم پرہیزگاروں کو نجات دیں گے۔

النَّجْوَةُ وَالنَّجَاةُ: بلند جگہ، جو بلندی کی وجہ سے اپنے ماحول سے الگ معلوم ہو۔ بعض نے کہا ہے کہ سیلاب کی زد سے محفوظ ہونے کی وجہ سے اسے نَجْوَةُ یا نَجَاة کہا جاتا ہے۔ اسی سے نَجِيَّتْہ کا محاورہ ہے جس کے معنی کسی کو نَجْوَةُ یعنی علیحدہ بلند جگہ پر چھوڑنے کے ہیں۔ چنانچہ اسی معنی میں فرمایا: ﴿فَالْيَوْمَ نُنَجِّيكَ بِبَدَنِكَ﴾ (۱۰-۹۲) تو آج ہم تیرے بدن کو دریا سے نکال لیں گے۔

اور نَجَوْتُ کے معنی درخت یا بکری کا پوست اتارنا بھی

① البيت في اللسان (نجا، جمع) غير منسوب والخزانة (۴: ۲۷۰/۲۷۲) والبيت من شواهد سيبويه في الكتاب والتنبيهات للبكري على القالي في اصلاح المنطق ۹۴ ونسبه ابن البري بعيد الرحمن بن حصان بن ثابت لكنه لا يبي الغمر الكلابي (كذا قال العيني ونسبه ابي العباب للصاغاني ولكن نقد عليه صاحب الخزانة والبيت مما اورده العلماء شاهدا على انه يحوز اضافة الشيء الى نفسه اذا اختلف اللفظان فان النجا والجلد مترادفان وقد تضايقا راجع الخزانة (۴: ۲۷۰-۲۷۲) وابن ولاد ۱۱۲ وذهب السيراني في شرح ابيات الاصلاح: ان النجا ههنا بمعنى النجو منصوب على انه مفعول مطلق والبيت ايضا في امالي الزجاجي والتنبيهات لابن القاسم البصري (علي بن حمزة) ۱۲۔

(کو) کچھ دے دیا کرو۔

النَّجْوَى: یہ اصل میں مصدر ہے جیسے فرمایا:-

﴿إِنَّمَا النَّجْوَى مِنَ الشَّيْطَانِ﴾ (۵۸-۱۰)

(کافروں کی) سرگوشیاں تو شیطان (کی حرکات) سے

ہیں۔

﴿أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ نُهُوا عَنِ النَّجْوَى﴾

(۵۸-۸) کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن کو

سرگوشیاں کرنے سے منع کیا گیا تھا۔ اور آیت کریمہ:-

﴿وَأَسْرُوا النَّجْوَى الَّذِينَ ظَلَمُوا﴾

(۳۲۱-۳) اور ظالم لوگ آپس میں چپکے چپکے باتیں کرتے

ہیں۔ میں نجوی کے ساتھ اسرُوا کا لفظ لا کر متنبہ کیا

ہے کہ انہوں نے ہر طرح سے اسے خفیہ رکھنے کی کوشش کی

تھی۔ کیوں کہ نجوی اگرچہ خفیہ ہوتا ہے لیکن کبھی قبل از

وقت افشاء ہو جاتا ہے۔ نیز فرمایا:- ﴿مَا يَكُونُ مِنْ

نَجْوَى ثَلَاثَةٍ إِلَّا هُوَ رَاسِعُهُمْ﴾ (۵۸-۷)

(کسی جگہ) تین (شخصوں) کا (مجمع اور) کانوں میں

صلاح مشورہ نہیں ہوتا۔ مگر وہ ان میں چوتھا ہوتا ہے۔

اور لفظ نجوی کبھی بطور وصف کے بھی آ جاتا ہے اور

واحد و جمع دونوں کے لیے یکساں استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً:

هُوَ نَجْوَى وَهُمْ نَجْوَى قرآن پاک میں ہے:-

﴿وَإِذْهُمْ نَجْوَى﴾ (۷۷-۱۷) اور جب یہ

سرگوشیاں کرتے ہیں۔

النَّجْوَى کے معنی سرگوشی کرنے والے کے ہیں یہ بھی واحد

جمع دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ فرمایا۔

﴿وَقَرَّبْنَاهُ نَجِيًّا﴾ (۵۲-۱۹) اور باتیں کرنے کے

لیے نزدیک بلایا۔

﴿فَلَمَّا اسْتَيْسَسُوا مِنْهُ خَلَصُوا نَجِيًّا﴾ (۸۰-۱۲)

جب وہ اس سے ناامید ہو گئے تو الگ ہو کر صلاح کرنے

لگے۔

إِنْتَجَيْتُمْ فُلَانًا: کسی کو رازدار بنانا۔

أَنْجَى فُلَانٌ: بلند زمین پر جانا۔

هُمْ فِي أَرْضٍ نَجَاةٍ: وہ ایسی سرزمین میں ہیں جس

کے درختوں سے لائٹھیاں اور کمائیں بنائی جاتی ہیں۔ اور

النَّجَا اس لکڑی کو کہتے ہیں۔ جس کا پوست اتار دیا گیا

ہو۔ بعض نے کہا ہے کہ نَجَوْتُ فُلَانًا کے معنی کسی کے

منہ کی بدبو سونگھنے کے ہیں۔ اور شعر سے استدلال کیا

ہے (الوافر)

(۴۱۹) نَجَوْتُ مُجَالِدًا فَوَجَدْتُ مِنْهُ

كَرْبِجِ الْكَلْبِ مَاتَ حَدِيثٌ عَهْدٌ

تو بقول بعض اس کے معنی یہ ہیں کہ میں نے مجالد کے منہ کی

بدبو سونگھی تو اس سے تازہ مرے ہوئے کتے کی سی بدبو پائی۔

میں کہتا ہوں کہ اگر وہ محض اس شعر کی بنا پر نَجَوْتُ کے یہ

معنی بیان کرتے ہیں تو یہ شعر ان کی دلیل نہیں بن سکتا۔

کیونکہ شاعر کی مراد تو یہ ہے کہ میں نے مجالد سے سرگوشی کی

تو مرض بخر کی وجہ سے اس کے منہ سے مجھے مردہ کتے کی

سی بدبو آئی۔ اور کناسیہ کے طور پر نَجَوْتُ کے معنی پانچخانہ

① فی اللسان (نجا) غیر منسوب والبییت لحکم بن عدل فی قصیدہ ۴۴ بیتا یھجو فیہا محمد بن حسان بن سعد کما فی الاغانی (۴۱۲:۲) و عیون الاخبار (۶۲:۴) وفی البییت تحریف دان نقلہ ایضاً صاحب اللسان والصواب فی الروایۃ نجوت محمداً بدل نجوت محالداً کما فی الحیوان (۲۵۱:۱) فعلی هذا لا شاهد ۱۲۔

## (ن ح ت)

نَحَتْ (ض) کے معنی نکڑی، پتھر یا اس قسم کی سخت چیزوں کو تراشنے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:-  
﴿وَتَنْحِتُونَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوتًا فَارِهِينَ﴾  
(۲۶-۲۹) اور تکلیف سے پہاڑوں میں تراش تراش کر..... گھر بناتے ہو۔

نُحَاتَةٌ: تراشہ۔ وہ ریزے جو کاٹنے سے گریں اور انسانی فطرت کو اس لحاظ سے کہ انسان کی ساخت اس کے مطابق بنائی گئی ہے نَحِيْتَةٌ کہا جاتا ہے۔ اور اس لحاظ سے کہ وہ انسان کے اندر پیوست کی گئی ہے غریزہ کہلاتی ہے۔

## (ن ح د)

النَّحْرُ: سینہ کا بالائی حصہ جہاں پر ہار پڑا رہتا ہے۔ نَحْرَتُهُ: کسی کے سینہ پر مارنا۔ اسی سے نَحْرُ البَعِيرِ ہے جس کے معنی اونٹ کے سینہ پر بر چھما مار کر اسے زخ کرنے کے ہیں۔

اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت میں ہے۔  
﴿فَنَحَرُوهَا وَمَا كَادُوا يَفْعَلُونَ﴾ (۲-۷۱)  
انہوں نے اس بیل کو زخ کیا۔ اور وہ ایسا کرنے والے تھے نہیں۔ پھر نَحْرُ البَعِيرِ کی تشبیہ سے اَنْتَحَرُوا عَلٰی كَذَا کا محاورہ استعمال ہوتا ہے جس کے معنی کسی چیز پر باہم لڑائی کرنے کے ہیں۔  
نَحْرَةُ الشَّهْرِ وَنَحِيرُهُ: مہینہ کے پہلے دودن اور تیسری رات کی مجموعی مدت۔

اور بقول بعض، مہینے کے آخری دن کو بھی نَحِيرَةُ کہا جاتا ہے۔ گویا وہ اپنے سے پہلے دنوں کو تحریر کر ڈالتا ہے۔

کے بھی آتے ہیں۔ محاورہ ہے: شَرِبَ دَوَاءً فَمَا اَنْجَاهُ: اس نے دوا لی لیکن ٹی نہ آئی۔

اَلْاِسْتِنْجَاءُ کے معنی استنجاء کرنے اور رفع حاجت کے لیے علیحدہ جگہ تلاش کرنے کے ہیں۔ جیسا کہ تَغَوَّطُ کے معنی پست جگہ تلاش کرنے کے آ جاتے ہیں کبھی استنجاء کے معنی ازالہ نجاست کے لیے مٹی کا ڈھیلا تلاش کرنا بھی ہوتے ہیں۔ جیسے اِسْتَجْمَرَ: پتھر تلاش کرنا۔

اَلنَّجَاةُ (مہوز) نظر بد لگانا۔ حدیث میں ہے۔  
اِذْفَعُوا نَجَاةَ السَّائِلِ بِاللُّقْمَةِ: یعنی سائل کی حریصانہ نظر کو لقمہ سے دور کرو۔

## (ن ح ب)

النَّحْبُ: اس نذر کو کہتے ہیں جس کا پورا کرنا واجب ہو۔ محاورہ ہے۔

قَضَى فُلَانٌ نَّحْبَهُ یعنی فلاں نے اپنی نذر پوری کی قرآن میں ہے:-

﴿فَمِنْهُمْ مَنْ قَضَى نَحْبَهُ وَمِنْهُمْ مَنْ يَنْتَظِرُ﴾  
ان میں سے بعض ایسے ہیں جو اپنی نذر سے فارغ ہو گئے ہیں اور بعض ایسے ہیں کہ انتظار کر رہے ہیں۔ (۳۳-۲۳)

مجازاً اس سے موت مراد لی جاتی ہے۔ جیسا کہ قَضَى اَجَلَهُ اَوْ اسْتَوْفَى اَكْلَهُ اَوْ قَضَى مِنَ الدُّنْيَا حَاجَتَهُ وغیرہ محاورات استعمال ہوتے ہیں۔ اور ان سے موت مراد ہوتی ہے۔

النَّحِيبُ کے معنی گریہ زاری اور آواز کے ساتھ رونے کے ہیں۔ اور نَحَابٌ کھانسی کو کہتے ہیں۔

① انظر للحديث الفائق (۲/۲۶۵) وفيه رُدُّوا بَدَل اَدْفَعُوا۔

نَحْسَاتٍ ﴿۱۶-۱۷﴾ ہم نے ان پر نحوست کے دنوں میں زور کی ہوا چلائی۔

اور ایک قرأت میں نَحْسَاتٍ بِفَتْحِ الْخَاءِ ہے۔ جس کے معنی بعض نے منخوس اور بعض نے سخت سردی والے دنوں کے کیے ہیں۔ اصل میں نَحْس کے معنی افق آسمان کے سرخ ہو کر نحاس کی طرح ہو جانے کے ہیں۔ اور یہ نحوست کے لیے ضرب المثل ہے۔

### (ن ح ل)

النَّحْلُ: شہد کی مکھی۔ قرآن پاک میں ہے:- ﴿وَأَوْحَىٰ رَبُّكَ إِلَى النَّحْلِ﴾ (۱۲-۶۸) اور تمہارے پروردگار نے شہد کی مکھیوں کو ارشاد فرمایا۔ النَّحْلَةُ وَالنَّحْلَةُ: اس عطیہ کو کہتے ہیں جو تمبر عا دیا جائے۔ یہ بہہ سے خاص ہے۔ کیونکہ ہر بہہ کو نحلۃ تو کہہ سکتے ہیں لیکن ہر نحلۃ کو بہہ نہیں کہتے۔ میرے خیال میں یہ نحل سے مشتق ہے۔ اور اس میں مکھی کے فعل کے معنی ملحوظ ہیں۔ تو گویا نحلۃ کے معنی نحل کی طرح عطیہ دینے کے ہیں جس پر کہ آیت:- ﴿وَأَوْحَىٰ رَبُّكَ إِلَى النَّحْلِ﴾ الْآیۃ میں متنب کیا ہے۔ حکماء کا بیان ہے کہ نحل جن پودوں سے غذا لیتی ہے۔ انہیں کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچاتی بلکہ الطافانہ پہنچاتی ہے۔ اور شہد جیسی شفا بخش چیز لوگوں کو حاصل کر کے دیتی ہے۔ جیسا کہ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے اس کے متعلق بیان فرمایا ہے۔

اور نَحْلۃ وَنَحْلۃ: صدق یعنی عورتوں کے مہر کو بھی کہتے ہیں۔ کیونکہ اس کے مقابلہ میں سوائے لذت اندوزی کے

﴿فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ﴾ (۲-۱۰۸) اپنے پروردگار کے لیے نماز پڑھا کرو اور قربانی کیا کرو۔ میں خاص کر ان ہر دو ارکان یعنی نماز اور قربانی ادا کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔ کیونکہ یہ دونوں عبادتیں ضروری ہیں۔ اور ہر دین اور ہر دور میں یہ واجب رہی ہیں۔ بعض نے کہا ہے یہاں وَانْحَرْ کے معنی سینہ پر ہاتھ باندھنے کے ہیں۔ ﴿۱۲۶﴾

اور بعض نے کہا ہے کہ ریاضت کے ذریعہ نفس کشی مراد ہے۔

النَّخْرِيزُ: کسی چیز کا ماہر و حاذق۔

### (ن ح س)

النَّحَّاسُ: دھواں، بغیر شعلہ کے آگ کی

لپٹ۔ قرآن پاک میں ہے:-

﴿يُرْسَلُ عَلَيْكُمَا شُوَاظٌ مِّن نَّارٍ وَنُحَّاسٌ﴾ (۳۵-۵۷) تم پر آگ کے شعلے اور دھواں چھوڑ دیا جائے گا۔

تو یہاں نُحَّاس کے معنی آگ کی لپٹ کے ہیں۔ اور لپٹ کا رنگ چونکہ تانبے جیسا ہوتا ہے لہذا تسمیہا نُحَّاس کے معنی تانبا بھی آجاتے ہیں۔

النَّحْسُ: (منخوس) یہ سعد کی ضد ہے۔ قرآن پاک میں ہے:- ﴿فِي يَوْمٍ نَّحْسٍ مُّسْتَوِيرٍ﴾ (۱۹-۵۴) سخت منخوس دن میں۔

﴿فَارْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيحًا صَرْصَرًا فِي أَيَّامٍ

① وفي السنن للبيهقي والتاريخ للبخاري منسوب الى علي بن ابي طالب قال صاحب الجوهرى النقى ان هذه الرواية مضطربة ورواية انس غير صحيحة وقال ابن كثير والصحيح ان المراد منه الزبيحة وقال الحصص هو معناه الحقيقي الذي يفهم عند الاطلاق (احكام القرآن ۳/ ۵۱۵)

سرا انجام پاتے ہیں تو نَحْنُ سے مراد اللہ تعالیٰ اور وہ فرشتے یا اولیاء کرام ہوتے ہیں۔ جن کے ذریعہ وحی، موتین کی نصرت کفار کی ہلاکت اور اس قسم کے دیگر افعال سرا انجام پاتے ہیں۔ جن کا ذکر کہ آیت:-  
﴿فَالْمَذَبُوتِ أَمْرًا﴾ (۵-۷۹) پھر دنیا کے کاموں کا انتظام کرتے ہیں۔

میں پایا جاتا ہے۔ اس بنا پر آیت کریمہ:-  
﴿وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْكُمْ﴾ (۸۵-۵۷) اور ہم اس مرنے والے سے تم سے بھی زیادہ تر نزدیک ہوتے ہیں۔

میں نَحْنُ سے حالت نزاع کے وقت حاضر ہونے والے فرشتے مراد ہوں گے۔ جن کا ذکر کہ آیت:-

﴿تَتَوَفَّيْهُمْ الْمَلَائِكَةُ﴾ (۲۸-۱۶) میں پایا جاتا ہے۔ اور چونکہ قرآن پاک کا نزول بھی قلم، لوح محفوظ اور جبریل علیہ السلام کی وساطت سے ہوا ہے۔ لہذا آیت کریمہ:-  
﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ﴾ (۹-۱۵) بے شک یہ (کتاب) نصیحت ہم ہی نے اتاری ہے۔ میں بھی تنزیل کو بصیغہ جمع ذکر فرمایا ہے۔

## (ن خ ر)

نَخْرَةٌ بوسیدہ: قرآن پاک میں ہے:-

﴿وَإِذَا كُنَّا عِظَامًا نَّخْرَةً﴾ (۱۱-۷۹) بھلا جب ہم کھوکھلی ہڈیاں ہو جائیں گے۔

یہ نَخْرَتِ الشَّجَرَةِ کے محاورہ سے ماخوذ ہے۔ جس کے معنی تیز ہوا چلنے سے بوسیدہ درخت میں آواز پیدا ہونے کے ہیں۔

اور النَّخْوِيُّ: خراٹے کی آواز جو نیند کی حالت میں ناک

اور کوئی مالی معاوضہ حاصل نہیں ہوتا۔ اسی سے اولاد کو عطیہ دینے پر نَحْلَ ابْنَهُ كَذًا وَأَنَحَلَهُ بولتے ہیں۔ اور اسی سے نَحَلْتُ الْمَرْءَةَ ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔ ﴿وَأَتُوا النِّسَاءَ صَدُقَتِهِنَّ نِحْلَةً﴾ (۴-۴) اور عورتوں کو ان کے مہر خوشی سے دے دیا کرو۔ اور نَحْلَ جِسْمُهُ کے معنی دبلا ہو کر مکھی کی طرح باریک ہو جانے کے ہیں۔ اور اسی سے تیز تلواروں کو ان کی دھاروں کے باریک ہونے کی وجہ سے نَوَاجِلُ کہا جاتا ہے۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ نَحْلَةً کو اصل قرار دے کر نَحْلَ کو اس سے مشتق مانا جائے۔ کیونکہ مکھی سے جو شہد حاصل ہوتا ہے وہ بھی فائدہ بخش ہونے کے لحاظ سے ایک قسم کی عطا ہی ہوتی ہے۔

الْأَنْتِحَالُ کے معنی کسی چیز کا اداء کرنے اور لینے کے ہیں اسی سے فُلَانٌ يَنْتَحِلُ الشَّيْءَ کا محاورہ ہے جس کے معنی شعری سرقت کرنے کے ہیں۔ واللہ اعلم۔

## نحن

نَحْنُ: (ہم) اے ضمیر متکلم مع الغیر کہتے ہیں۔ قرآن پاک میں جہاں کہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کے متعلق نَحْنُ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ جیسے فرمایا:-

﴿نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ أَحْسَنَ الْقَصَصِ﴾

(۳-۱۲) اے پیغمبر ﷺ ہم تمہیں ایک اچھا قصہ سناتے ہیں۔ اس کی تاویل میں بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد تو

ذات باری تعالیٰ ہی ہے۔ لیکن شاہی خطابات کی طرح صیغہ جمع استعمال کیا گیا ہے۔ اور بعض نے کہا ہے ذات!

باری تعالیٰ اپنے متعلق اس قسم کے الفاظ ان افعال کے ساتھ استعمال کرتی ہے۔ جو بواسطہ ملائکہ یا اولیاء اللہ کے



اور نَدَّ، نَدِيدٌ، نَدِيدَةٌ تینوں ہم معنی ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:-

﴿فَلَا تَجْعَلُوا لِلّٰهِ اَنْدَادًا﴾ (۲۲-۲) پس کسی کو خدا کا ہمسرہ بناؤ۔

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَتَّخِذُ مِنْ دُونِ اللّٰهِ اَنْدَادًا﴾ (۱۶۵-۲) اور بعض لوگ ایسے ہیں جو غیر اللہ کو شریک خدا بناتے ہیں۔

﴿وَتَجْعَلُوْنَ لَهُ اَنْدَادًا﴾ (۹-۴۱) اور بتوں کو اس کا مد مقابل بناتے ہو۔

اور ایک قراءت میں ﴿يَوْمَ التَّنَادِ﴾ (۳۲-۴۰) تشدید وال کے ساتھ ہے۔ اور نَدَّ يَنْدُ سے مشتق ہے۔ جس کے معنی دور بھاگنے کے ہیں اور قیامت کے روز بھی چونکہ لوگ اپنے قرائنداروں سے دور بھاگیں گے جیسا کہ آیت کریمہ: ﴿يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيهِ﴾ مذکور ہے اس لیے روز قیامت کو يَوْمَ التَّنَادِ بتشدید الدال کہا گیا ہے۔

### (ن د م)

النَّدْمُ وَالنَّدَامَةُ کے معنی فوت شدہ امر پر حسرت کھانے کے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:-

﴿فَاَصْبَحَ مِنَ النَّادِمِينَ﴾ (۳۱-۵) پھر وہ پشیمان ہوا۔

﴿عَمَّا قَلِيلٍ لَّيُصْبِحُنَّ نَادِمِينَ﴾ (۴۰-۲۳) تھوڑے ہی عرصے میں پشیمان ہو کر رہ جائیں گے۔ اس کے اصل معنی حزن کا ندیم بن جانے کے ہیں۔ اور نَدِيمٌ نُدْمَانٌ اور مُنَادِمٌ تینوں قریب المعنی ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ مُنَادِمَةٌ اور مُدَاوِمَةٌ دونوں قریب المعنی ہیں۔ اور بقول بعض اور ہم پیالہ (شراب نوش) کو ندیمان اس لیے

سے نکلتی ہے۔ اور ناک کے دونوں نٹھوں کو جن سے آواز نکلتی ہے نُخْرَتَانِ یا مَنْخَرَيْنِ کہتے ہیں۔

النَّحُورُ: وہ اونٹنی کہ جب تک اس کے نٹھوں میں انگلی ڈال کر سہلایا نہ جائے۔ دودھ نہ دے۔

النَّاخِرُ خراٹے بھرنے والے آدمی کو نَاخِرُ کہا جاتا ہے۔ اسی سے محاورہ ہے۔

مَا بِالْذَّارِ نَاخِرٌ: گھر میں کوئی نہیں رہا۔

### (ن خ ل)

النَّخْلُ: کھجور کا درخت۔ یہ واحد جمع دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے چنانچہ قرآن پاک میں ہے:-

﴿كَانَتْهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ﴾ (۷۶-۷۷) جیسے کھجوروں کے کھوکھلے تنے۔

﴿كَانَتْهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ مُّثْقَرٍ﴾ (۱۲۸-۲۶) اور کھجوریں جن کے خوشے لطیف اور نازک ہوتے ہیں۔

﴿وَالنَّخْلُ بَاسِقَاتٍ لِّهَا طَلْعٌ نَّضِيدٌ﴾ (۱۰-۵۰) اور لمبی لمبی کھجوریں جن کا گاہاتہ بہتہ ہوتا ہے۔

اس کی جمع نخیل آتی ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:-

﴿وَمِنْ ثَمَرَاتِ النَّخِيلِ﴾ (۱۶-۶۷) اور کھجور کے میووں سے بھی۔

النَّخْلُ (مصدر کے معنی چھلنی سے آنا چھاننے کے ہیں)۔ اور اِنْتَخَلْتُ الشَّيْءَ کے معنی عمدہ چیز منتخب کر لینے کے۔

### (ن د د)

نَدِيدُ الشَّيْءِ: وہ کسی چیز کی ذات یا جوہر میں اس کا شریک ہو اور یہ مماثلت کی ایک قسم ہے کیونکہ مثل کا لفظ ہر قسم کی مشارکت پر بولا جاتا ہے۔ اس بنا پر ہر نَدُّ کو مِثْلُ کہہ سکتے ہیں۔ لیکن ہر مِثْلٌ نَدٌّ نہیں ہوتا۔

شریعت میں **نِدَاءُ الصَّلَاةِ** (اذان) کے لیے مخصوص اور مشہور کلمات ہیں اور آیت کریمہ: ﴿وَأُولَٰئِكَ يُنَادُونَ مِنْ مَّكَانٍ بَعِيدٍ﴾ (۴۱-۴۲) ان کو گویا دور جگہ سے آواز دی جاتی ہے۔ میں ان کے متعلق نداء کا لفظ استعمال کر کے متنبہ کیا ہے کہ وہ حق سے بہت دور جا چکے ہیں۔ نیز فرمایا۔

﴿وَأَسْمِعْ يَوْمَ يُنَادِ الْمُنَادِ مِنْ مَّكَانٍ قَرِيبٍ﴾ (۵۰-۵۱) اور سنو! جس دن پکارنے والا نزدیک کی جگہ سے پکارے گا۔

﴿وَنَادَيْنَاهُ مِنْ جَانِبِ الطُّورِ الْأَيْمَنِ﴾ (۱۹-۵۲) اور ہم نے ان کو طور کی داہنی جانب سے پکارا۔ ﴿فَلَمَّا جَاءَهُمْ نُودِيَ﴾ (۲۷-۸) جب موسیٰ علیہ السلام ان کے پاس آئے تو ندا آئی۔ اور آیت کریمہ ﴿إِذْ نَادَى رَبُّهُ نِدَاءً خَفِيًّا﴾ (۱۹-۳) جب انہوں نے اپنے پروردگار کو دبی آواز سے پکارا۔ میں اللہ تعالیٰ کے متعلق نَادَى کا لفظ استعمال کرنے سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ زکریا علیہ السلام نے اپنے گناہ اور احوال سیدہ کے باعث اس وقت اپنے آپ کو حق اللہ تعالیٰ سے دور تصور کیا تھا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرنے والے کی حالت ہوتی ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿رَبَّنَا إِنَّا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُنَادِي لِلْإِيمَانِ﴾ (۳-۱۹۳) اے پروردگار! ہم نے ایک ندا کرنے والے کو سنا۔ جو ایمان کے لیے پکار رہا تھا۔ میں منادی کا لفظ عقل، کتاب منزل، رسول مرسل اور ان آیات الہیہ کو شامل ہے۔ جو ایمان باللہ کے وجوب پر دلالت کرتی ہیں۔ اور ان چیزوں کو مُنَادِي لِلْإِيمَانِ اس لئے کہا گیا ہے کہ وہ

کہا جاتا ہے۔ کہ انجام کار وہ اپنے فعل پر پشیمان ہوتے ہیں۔

## (ن د ی)

**النِّدَاءُ** کے معنی آواز بلند کرنے کے ہیں اور کبھی نفس آواز پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ چنانچہ آیت کریمہ:

﴿مَثَلُ الَّذِينَ كَفَرُوا كَمَثَلِ الَّذِي يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ إِلَّا دُعَاءً وَنِدَاءً﴾ (۲-۱۷۱) جو لوگ کافر ہیں ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جو کسی ایسی چیز کو آواز دے جو پکار اور آواز کے سوا کچھ نہ سن سکے۔

میں نداء سے مراد آواز اور پکار ہے۔ یعنی وہ چوپائے صرف آواز کو سنتے ہیں۔ اور اس کلام سے جو مفہوم ہوتا ہے۔ اسے ہرگز نہیں سمجھتے۔ اور کبھی اس کلام کو، جس سے کوئی معنی مفہوم ہوتا ہو اسے نِدَاءُ کہہ دیتے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَإِذْ نَادَى رَبُّكَ مُوسَى﴾ (۲۶-۱۰) اور جب تمہارے پروردگار نے موسیٰ علیہ السلام کو پکارا۔

اور آیت کریمہ:

﴿وَإِذَا نَادَيْتُمْ إِلَى الصَّلَاةِ﴾ (۵-۵۸) اور جب تم لوگ نماز کے لیے اذان دیتے ہو۔

میں نماز کے لیے اذان دینا مراد ہے۔ اسی طرح آیت کریمہ:

﴿إِذَا نُودِيَ لِلصَّلَاةِ مِنْ يَوْمِ الْجُمُعَةِ﴾ (۲۲-۹) جب جمعے کے دن نماز کے لیے اذان دی جائے۔

میں بھی نداء کے معنی نماز کی اذان دینے کے ہیں۔ اور

هُوَ يَتَنَذَّرُ عَلَى أَصْحَابِهِ: وہ اپنے ساتھیوں پر بڑا فیاض ہے۔

مَا نَذَرْتُ بِشَيْءٍ مِّنْ فُلَانٍ: میں نے فلاں سے کچھ سخاوت حاصل نہ کی۔  
مُنْذِيَاتُ الْكَلِمِ: رواکن باتیں جو مشہور ہو جائیں۔

### (ن ذ ر)

النَّذْرُ: کے معنی کسی حادثہ کی وجہ سے غیر واجب

چیز کو اپنے اوپر واجب کر لینے کے ہیں۔ چنانچہ محاورہ ہے۔  
نَذَرْتُ لِلّٰهِ نَذْرًا: میں نے اللہ کے لیے نذر مانی قرآن پاک میں ہے:-

﴿إِنِّي نَذَرْتُ لِلرَّحْمَنِ صَوْمًا﴾ (۱۹-۲۶) میں نے خدا کے لیے روزے کی نذر مانی ہے۔

﴿وَمَا أَنفَقْتُمْ مِّنْ نَّفَقَةٍ أَوْ نَذَرْتُمْ مِّنْ نَّذْرٍ﴾ (۲-۲۷) اور تم خدا کی راہ میں جس طرح کا خرچ کرو یا کوئی نذر مانو۔

الْإِنذَارُ کے معنی کسی خوفناک چیز سے آگاہ کرنے کے ہیں۔ اور اس کے بالمقابل تَبَشِيرُ کے معنی کسی اچھی بات کی خوشخبری سننے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:-

﴿فَأَنذَرْتُكُمْ نَارًا تَلَظَّى﴾ (۹۲-۱۳) سو میں نے تم کو بھڑکتی آگ سے متنبہ کر دیا۔

﴿أَنذَرْتُكُمْ صَاعِقَةً مِّثْلَ صَاعِقَةِ عَادٍ وَثَمُودَ﴾ (۳۱-۱۳) میں تم کو کیسے چنگھاڑ (کے عذاب) سے آگاہ کرتا ہوں۔ جیسے عاد اور ثمود پر چنگاڑ (کا عذاب) آیا تھا۔

﴿وَأَذْكُرُ أَخَا عَادٍ إِذْ أَنذَرَ قَوْمَهُ بِالْأَحْقَافِ﴾ (۳۶-۲۱) اور (قوم) عاد کے بھائی (ہود علیہ السلام) کو یاد کرو

نذا کی طرح ظاہر ہوتی ہیں۔ اور وہ پکارنے والے کی طرح ایمان لانے کی طرف دعوت دے رہی ہیں۔

اصل میں نَذَاءُ نَذَى سے ہے جس کے معنی رطوبت نمی کے ہیں۔ اور صَوْتُ نَذَى کے معنی بلند آواز کے ہیں۔

اور آواز کے لیے نداء کا استعارہ اس بنا پر ہے کہ جس کے منہ میں رطوبت زیادہ ہوگی اس کی آواز بھی بلند اور حسین ہوگی اس سے فصیح شخص کو کثرت ریق کے ساتھ متصف کرتے ہیں اور نَذَى کے معنی مجلس کے بھی آتے ہیں اس کی جمع اَنْذَاءُ وَأَنْذِيَّةٌ آتی ہے۔ اور درخت کو بھی نَذَى کہا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ بھی سے پیدا ہوتا ہے اور یہ تَسْمِيَّةُ الْمُسَبِّحِ بِاسْمِ السَّبَبِ کے قبیل سے ہے۔ شاعر نے

کہا ہے (لرجز)

(۴۰) كَالْكُرِّ إِذَا نَادَى مِنَ الْكَافُورِ

جیسا کہ انگوڑ کا خوشہ غلاف (پردہ) سے ظاہر ہوتا ہے۔ جیسا کہ باوی کر کے والے کی آواز ہوتی ہے۔

کبھی نداء سے مراد محالست بھی ہوتی ہے۔ اس لیے مجلس کو اَلنَّادِي وَالْمُسَدِّي وَالنَّدِي کہا جاتا ہے۔ اور نادی کے معنی ہم نشین کے بھی آتے ہیں قرآن پاک میں ہے:-

﴿فَالْمَدْعُ نَادِي﴾ (۹۶-۱۷) تو وہ اپنے یاران مجلس کو بلائے۔

اور اسی سے شہر مکہ میں ایک مقام کا نام دَارُ النَّدْوَةِ ہے۔ کیونکہ اس میں مکہ کے لوگ جمع ہو کر باہم مشورہ کیا کرتے تھے۔ اور کبھی نَذَى سے مراد سخاوت بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ

محاورہ ہے:-

فُلَانٌ أَذَى كَمَا مِّنْ فُلَانٍ وہ فلاں سے زیادہ نڈی ہے۔

﴿هَذَا نَذِيرٌ مِّنَ النَّذْرِ الْأُولَى﴾ (۵۳-۵۶) یہ (محمد ﷺ) بھی اگلے ڈرسانے والوں میں سے ایک ڈر سانے والے ہیں۔

یعنی انہی کی جنس سے ہے جن کے ساتھ پہلے لوگوں کو ڈرایا گیا۔ نیز فرمایا۔

﴿كَذَبْتَ ثُمُودُ بِالنَّذْرِ﴾ (۵۴-۲۳) قوم ثمود نے بھی ہدایت کرنے والوں کو جھٹلایا۔

﴿وَلَقَدْ جَاءَ آلَ فِرْعَوْنَ النَّذْرُ﴾ (۵۴-۴۱) اور قوم فرعون کے پاس بھی ڈر سانے والے آئے۔

﴿فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِي وَنُذْرِي﴾ (۵۴-۱۶) سو (دیکھ لو کہ) میرا عذاب اور ڈرانا کیسا ہوا۔

نُذِرْتُ: کسی چیز کو جان کر اس سے چوکس رہنے کے معنی ہیں۔

### (ن ذ ع)

نَزَعَ الشَّيْءَ کے معنی کسی چیز کو اس کی قرار گاہ سے کھینچنے کے ہیں۔ جیسا کہ کمان کو درمیان سے کھینچا جاتا ہے اور کبھی یہ لفظ اعراض کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور محبت یا عداوت کے دل سے کھینچ لینے کو بھی نَزَعَ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:-

﴿وَنَزَعْنَا مَا فِي صُفُوفِهِمْ مِّنْ غِلٍّ﴾ (۴-۴۳) اور جو کہنے ان کے دلوں میں ہوں گے ہم سب نکال ڈالیں گے۔

إِنْتَزَعْتُ آيَةً مِّنَ الْقُرْآنِ فِي كَذَّاءٍ: آیت کو کسی واقعہ میں بطور مثال کے پیش کرنا۔

تَنَزَّعُ فُلَانٌ كَذَّاءً: کے معنی کسی چیز کو چھین لینے کے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:-

﴿تَنَزَّعُ الْمُلْكُ مِمَّنْ تَشَاءُ﴾ (۳-۲۶) اور جس سے چاہے بادشاہی چھین لے۔ اور آیت کریمہ:-

کہ جب انہوں نے اپنی قوم کو سرزمین احقاف میں (ہدایت کی) اور اللہ کے (عذاب) سے ڈرایا۔

﴿وَالَّذِينَ كَفَرُوا عَمَّا أُنذِرُوا مُعْرِضُونَ﴾ (۴۶-۳)

اور کافروں کو جس چیز کی نصیحت کی جاتی ہے اس سے منہ پھیر لیتے ہیں۔

﴿لِنُنْذِرَ أُمَّ الْقُرَىٰ وَمَنْ حَوْلَهَا﴾ (۴۲-۷) یعنی مکے کے رہنے والوں اور جو لوگ اس کے ارد گرد رہتے ہیں ان کو راستہ دکھاؤ۔

﴿وَتُنْذِرَ يَوْمَ الْجَمْعِ﴾ (۴۲-۷) اور انہیں قیامت کے دن کا بھی..... خوف دلاؤ۔

﴿لِنُنْذِرَ قَوْمًا مَّا أُنْذِرَ آبَاؤُهُمْ﴾ (۳۶-۶) تاکہ تم ان لوگوں کو جن کے باپ دادا کو متنبہ نہ کیا گیا تھا۔ متنبہ کر دو۔

النَّذِيرُ کے معنی مُنْذِر یعنی ڈرانے والا ہیں۔ اور اس کا اطلاق ہر اس چیز پر ہوتا ہے۔ جس میں خوف پایا جائے۔ خواہ وہ انسان ہو یا کوئی اور چیز۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:-

﴿وَمَا أَنَا إِلَّا نَذِيرٌ مُّبِينٌ﴾ (۴۶-۹) اور میرا کام تو علانیہ ہدایت کرنا ہے۔

﴿وَجَاءَ كُمْ النَّذِيرُ﴾ (۳۵-۳۷) اور تمہارے پاس ڈرانے والا بھی آیا۔

﴿نَذِيرًا لِلْبَشَرِ﴾ (۴۴-۳۶) اور بنی آدم علیہ السلام کے لیے موجب خوف ہے۔

﴿إِنِّي لَكُمْ نَذِيرٌ مُّبِينٌ﴾ (۱۱-۲۵) میں تم کو کھول کھول کر ڈر سانے والا آیا ہوں۔

﴿إِنِّي أَنَا النَّذِيرُ الْمُبِينُ﴾ (۱۵-۸۹) کہ میں تو علانیہ ڈر سانے والا ہوں۔

اور نَذِيرُ کی جمع نَذْر آتی ہے جیسے فرمایا:

محکم دلائل وبراہین سے مزین، متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

جائیں۔ اور تانیث کے لیے نَزَعَاء کی بجائے زَعَاء کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔

بَشْرٌ نَزُوعٌ: کم گہرا کنواں جس سے ہاتھ کے ذریعہ بغیر رسی کے پانی نکالا جاسکے۔

شَرَابٌ طَيِّبٌ الْمَنْزَعَةِ: لذیذ شراب کو کہتے ہیں۔ جیسا کہ اس معنی میں قرآن پاک خِتَامُهُ مِسْكٌ کا محاورہ استعمال کیا ہے۔

### (ن ز غ)

النَّزْعُ کے معنی کسی کام کو بگاڑنے کے لیے اس میں دخل انداز ہونے کے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:-

﴿وَمِنْ بَعْدِ أَنْ نَزَعَ الشَّيْطَانُ بَيْنِي وَبَيْنَ إِخْوَتِي﴾ (۱۲-۱۰۰) اور اس کے بعد کہ شیطان نے مجھ میں اور میرے بھائیوں میں فساد ڈال دیا تھا۔

### (ن ز ف)

نَزَفَ الْمَاءَ کے معنی کنویں سے تدریجاً سارا پانی کھینچ لینے کے ہیں۔ اور بَشْرٌ نَزُوفٌ اس کنویں کو کہتے ہیں جس کا پانی خشک ہو گیا ہو۔

نُزْفَةٌ چلو بھر پانی۔ اس کی جمع نُزْفٌ آتی ہے۔

نُزِفَ دَمُهُ أَوْ دَمْعُهُ: خون یا آنسوؤں کا کلیتہً نکل جانا۔ اسی سے سَكْرَانٌ نَزِيفٌ ہے جس کے معنی بدست کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:-

﴿لَا يَصْدَعُونَ عَنْهَا وَلَا يَنْزِفُونَ﴾ (۵۶-۱۹) اس سے نہ تو سر میں درد ہوگا اور نہ ان کی عقلیں ضائع ہوں گی۔

ایک قراءت میں يَنْزِفُونَ ہے جو کہ أَنْزَفُوا (افعال) سے ہے۔ جس کے معنی شراب کے ختم ہونے یا عقل کے ضائع ہو جانے کے ہیں۔ اصل میں یہ أَنْزَفُوا سے ہے جس کے

﴿وَالنَّزْعُ غَرْقًا﴾ (۷۹-۱) ان فرشتوں کی قسم جو ڈوب کر کھینچ لیتے ہیں۔

کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ نَزَاعَات سے مراد فرشتے ہیں جو روجوں کو جسوں سے کھینچتے ہیں۔ اور آیت کریمہ:-

﴿إِنَّا أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيحًا صَرْصَرًا فِي يَوْمِ نَحْسٍ مُسْتَمِرٍّ تَنْزِعُ النَّاسَ﴾ (۵۴-۲۰، ۱۹) ہم نے ان پر سخت منہوس دن میں آندھی چلائی وہ لوگوں کو اس طرح اکھیڑ ڈالتی تھی۔

میں تَنْزِعُ النَّاسَ کے معنی یہ ہیں کہ وہ ہوا اپنی تیزی کی وجہ سے لوگوں کو ان کے ٹھکانوں سے نکال باہر پھینک دیتی تھی بعض نے کہا ہے کہ لوگوں کی روجوں کو ان کے بدنوں سے کھینچ لینا مراد ہے۔

التَّنَازُعُ وَالْمُنَازَعَةُ: باہم ایک دوسرے کو کھینچنا اس سے محاصمت اور مجادلہ یعنی باہم جھگڑا کرنا مراد ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے: ﴿فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ﴾ (۴-۵۹) اور اگر کسی بات میں تم میں اختلاف واقعہ ہو تو رجوع کرو۔

﴿فَتَنَازَعُوا أَمْرَهُم بَيْنَهُمْ﴾ (۲۰-۶۲) تو وہ باہم اپنے معاملے میں جھگڑنے لگے۔

النَّزْعُ عَنِ الشَّيْءِ کے معنی کسی چیز سے رک جانے کے ہیں۔ اور النَّزُوعُ: سخت اشتیاق کو کہتے ہیں۔

وَنَازَ عَنِّي نَفْسِي إِلَى كَذَا: نفس کا کسی طرف کھینچ کر لے جانا۔ کسی کا اشتیاق غالب آ جانا۔ أَنْزَعَ الْقَوْمُ:

اونٹوں کا اپنے وطن کا مشتاق ہونا۔

رَجُلٌ أَنْزَعَ کے معنی سر کے بال جھڑ جانا کے ہیں۔ اور نَزْعَةٌ: سر کے اس حصہ کو کہتے ہیں جہاں سے بال جھڑ

ہی تو ہے جس نے سچائی کے ساتھ کتاب نازل فرمائی۔  
﴿وَأَنْزَلْنَا الْحَدِيدَ﴾ (۵۷-۲۵) اور لوہا پیدا کیا۔  
﴿وَأَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ﴾ (۵۷-۲۵) اور  
ان پر کتابیں نازل کیں اور ترازو (یعنی قواعد عدل) ﴿وَأَنْزَلْ  
لَكُمْ مِنْ الْأَنْعَامِ ثَمَانِيَةَ أَزْوَاجٍ﴾ (۳۹-۶) اور اسی  
نے چار پایوں میں سے آٹھ جوڑے بنائے۔

﴿أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً طَهُورًا﴾ (۲۵-۲۸) اور  
ہم آسمان سے پاک اور (تھرا ہوا) پانی برساتے ہیں۔  
﴿وَأَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرَاتِ مَاءً ثَجَّاجًا﴾ (۲۸-۱۳)  
اور نچرے بادلوں سے موسلا دھار مینہ برسایا۔  
﴿قَدْ أَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُؤَارِي سِوَاكُمْ﴾  
(۷-۲۶) ہم نے تم پر پوشاک اتاری کہ تمہارا ستر ڈھانکے۔  
﴿أَنْزَلَ عَلَيْنَا مَائِدَةً مِنَ السَّمَاءِ﴾ (۵-۱۱۳) ہم پر  
آسمان سے خوان نازل فرما۔

﴿أَنْ يُنَزِّلَ اللَّهُ مِنْ فُضْلِهِ عَلَى مَنْ يَشَاءُ﴾  
(۲-۹۰) خدا جس پر چاہتا ہے اپنی مہربانی سے نازل فرماتا  
ہے۔ اور آیت کریمہ:-

﴿إِنَّا مُنْزِلُونَ عَلَى أَهْلِ هَذِهِ الْقَرْيَةِ رِجْزًا مِنَ  
السَّمَاءِ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ﴾ (۲۹-۳۳) ہم اس  
بستی کے رہنے والوں پر اس سبب سے کہ یہ بدکاری کرتے  
ہیں۔ آسمان سے عذاب نازل کرنے والے ہیں۔

عذاب کے متعلق اَنْزَالَ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ قرآن  
پاک اور فرشتوں کے نازل کرنے کے متعلق اَنْزَالَ اور  
تَنْزِيلُ دونوں لفظ استعمال ہوئے ہیں۔ ان دونوں میں  
معنوی فرق یہ ہے کہ تَنْزِيلُ کے معنی ایک چیز کو مرتبہ بعد  
آخری اور متفرق طور پر نازل کرنے کے ہوتے ہیں۔ اور

معنی کنویں کا پانی ختم ہو جانے کے ہیں اور اَنْزَفْتُ  
الشَّيْءَ میں نَزَفْتُ سے زیادہ مبالغہ پایا جاتا ہے۔  
نَزَفَ الرَّجُلُ فِي الْخُصُومَةِ: جھگڑے میں دلیل  
سے خاموش ہو جانا۔ مثل مشہور ہے۔  
هُوَ أَجْبَنُ مِنَ الْمَنْزُوفِ ضَرْطًا: وہ منزوف سے  
بھی زیادہ بزدل ہے۔

## (ن زل)

النَّزْوُ: (ض) اصل میں اس کے معنی بلند  
جگہ سے نیچے اترنا کے ہیں۔ چنانچہ محاورہ ہے۔ نَزَلَ عَنْ  
دَابَّتِهِ: وہ سواری سے اتر پڑا۔  
نَزَلَ فِي مَكَانٍ كَذَا: کسی جگہ پر ٹھہرنا۔  
أَنْزَلَ (افعال) اُتارنا۔ قرآن پاک میں ہے:  
﴿أَنْزِلْنِي مُنْزَلًا مُبَارَكًا وَأَنْتَ خَيْرُ الْمُنْزِلِينَ﴾  
(۲۳-۲۹) ہم کو مبارک جگہ اتاریو اور تو سب سے بہتر  
اتارنے والا ہے۔

نَزَلَ بِكَذَا وَأَنْزَلَهُ کے ایک ہی معنی ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے  
مخلوق پر عذاب یا نعمتوں کے نازل کرنے سے ان کا وقوع یا  
عطا کرنا مراد ہوتا ہے اور یہ یا تو بعینہ اس چیز کے نازل کرنے  
کے ذریعہ ہوتا ہے، مثلاً قرآن پاک کا نازل فرمانا اور یا ان  
چیزوں کے اسباب پیدا کر کے ان کی طرف ہدایت کر دینے  
کے ذریعہ ہوتا ہے۔ جیسا کہ لوہا، لباس اور اس قسم کی دوسری  
چیزوں کو اتارنا مراد ہے چنانچہ انعامات کے نازل کرنے کے  
متعلق فرمایا:- ﴿الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي أَنْزَلَ عَلَى عَبْدِهِ  
الْكِتَابَ﴾ (۱۸-۱) سب تعریف خدا ہی کو ہے۔ جس نے  
اپنے بندے (محمدؐ) پر یہ کتاب نازل کی۔

﴿اللَّهُ الَّذِي أَنْزَلَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ﴾ (۳۲-۱۷) خدا

کہ یکے بعد دیگرے جہاد کے احکام نازل ہوں تاکہ وہ انہیں سرانجام دے سکیں۔ لیکن جب انہیں صرف ایک مرتبہ ہی جہاد کا حکم دیا گیا۔ تو وہ کنارہ کش ہو گئے۔ اور اس کی تعمیل نہ کی پس آیت میں بتایا گیا ہے کہ مطالبہ تو بہت سے احکام کے نازل ہونے کا کرتے تھے۔ مگر ایک حکم بھی بجا نہیں لاتے۔ اور آیت کریمہ:-

﴿إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ مُبْرَكَةٍ﴾ (۲۳-۲) ہم نے اس کو مبارک رات میں نازل فرمایا۔

﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ﴾ (۲) (۱۸۵) روزوں کا مہینہ رمضان کا مہینہ ہے۔ جس میں قرآن پاک اول اول نازل ہوا۔

﴿إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ﴾ (۹۷-۱) ہم نے اس قرآن کو شب قدر میں نازل کرنا شروع کیا۔ میں تنزیل کا لفظ ترک کر کے خاص کر انزال کا لفظ لانے کی وجہ یہ ہے کہ جیسا کہ حدیث میں ہے ﴿(۱۷۷) (إِنَّ الْقُرْآنَ نَزَلَ دَفْعَةً وَاحِدَةً إِلَى سَّمَاءِ الدُّنْيَا ثُمَّ نَزَلَ نَجْمًا تَنَجَّمَ)﴾ کہ قرآن پاک ایک ہی دفعہ آسمان دنیا پر نازل کیا گیا۔ پھر رفتہ رفتہ حسب ضرورت نازل ہوتا رہا۔ اور آیت کریمہ:

﴿الْأَعْرَابُ أَشَدُّ كُفْرًا وَنِفَاقًا وَأَجْدَرُ أَلَّا يَعْلَمُوا حُدُودَ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ﴾ (۹-۹۸) دیہاتی لوگ سخت کافر اور سخت منافق اور اس قابل ہیں کہ جو احکام شریعت خدا نے اپنے رسول ﷺ پر نازل فرمائے ہیں۔ ان سے واقف ہی نہ ہوں۔ میں عام معنی لینے کی غرض سے خاص کر انزال کا لفظ لایا گیا ہے۔ جیسا کہ ہم بیان کر

انزال کا لفظ عام ہے۔ جو ایک ہی دفعہ مکمل طور پر کسی چیز کو نازل کرنے پر بھی بولا جاتا ہے۔ چنانچہ وہ آیات ملاحظہ ہو جہاں تنزیل کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

﴿نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ﴾ (۲۶-۱۹۳) اس کو امانت دار فرشتہ لے کر اترا۔

ایک قراءت میں نزل ہے۔

﴿نَزَلْنَاهُ تَنْزِيلًا﴾ (۱۷-۳۱) اور ہم نے اس کو آہستہ آہستہ اتارا۔

﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ﴾ (۱۵-۱۹) بے شک یہ (کتاب) نصیحت ہم ہی نے اتاری ہے۔

﴿لَوْ لَا نَزَّلَ عَلَيْهِ هَذَا الْقُرْآنُ.....﴾ (۲۵-۲۳) کہ اس پر قرآن پاک ایک ہی بار کیوں نہیں اتارا گیا۔

﴿وَلَوْ نَزَّلْنَاهُ عَلَى بَعْضِ الْأَعْجَمِينَ﴾ (۲۶-۱۹۸) اور اگر ہم اس کو کسی غیر اہل زبان پر اتارتے۔

اور انزال کے متعلق فرمایا: ﴿ثُمَّ أَنْزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَى رَسُولِهِ وَعَلَى الْمُؤْمِنِينَ﴾ (۹-۲۶) پھر خدا نے اپنے پیغمبر اور مومنوں پر اپنی طرف سے تسلی نازل فرمائی۔ اور (تمہاری مدد کو فرشتوں کے) لشکر جو تمہیں نظر

نہیں آتے تھے آسمان سے اتارے۔ اور آیت کریمہ:-

﴿لَوْ لَا نَزَّلَتْ سُورَةٌ فَإِذَا أُنْزِلَتْ سُورَةٌ مُّحْكَمَةٌ﴾ (۲۷-۲۰) کہ جہاد کی کوئی سورت کیوں نازل نہیں ہوئی؟ لیکن جب کوئی صاف معنوں کی سورت نازل ہو۔

میں پہلی بار نزل اور دوسری بار انزل کا لفظ ذکر کرنے سے اس بات پر تنبیہ کرنا مقصود ہے کہ منافقین کا مطالبہ تو یہ تھا

① رواہ ابن ابی حاتم وابن مردويه عن ابن عباس (ابن کثیر ۲/۲۱۶) وفي مجمع الزوائد (۷/۱۴۰)۔ ورجال البزار رجال الصحيح في اسناد الطبراني عمرو بن عبد الغفار وهو ضعيف لكن لفظه انزل القرآن جملة واحدة حتى وضع في بيت العزة في السماء الدنيا ونزله جبريل على محمد ﷺ بحواب كلام العباد واعمالهم ۱۲۔

﴿وَمَا نَنْزِلُ إِلَّا بِأَمْرِ رَبِّكَ﴾ (۱۹-۶۳) کہ ہم تمہارے پروردگار کے حکم کے سوا اتر نہیں سکتے۔

﴿يَنْزِلُ الْأَمْرُ بَيْنَهُمْ﴾ (۲۵-۱۲) ان میں خدا کے حکم اترتے رہتے ہیں۔

اور جو کلام افتراء اور جھوٹ ہو یا شیاطین کی طرف سے القاء کیا گیا ہو اس کے متعلق صرف نَزْلُ کالفاظ استعمال ہوتا ہے۔

چنانچہ فرمایا: ﴿وَمَا تَنْزَلْتُ بِهِ الشَّيَاطِينُ﴾ (۲۶-۲۱۰)

اور اس قرآن کو شیطان لے کر نازل نہیں ہوا۔ ﴿عَلَى مَنْ تَنْزِلُ الشَّيَاطِينُ﴾ (۲۶-۲۲۱) کہ شیطان کس پر اترتے ہیں (ہر گنہگار جھوٹے پر)

النَّزْلُ: (طعام مہمانی) وہ کھانا جو آنے والے مہمان کے لیے تیار کیا جائے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔

﴿فَلَهُمْ جَنَّاتُ الْمَأْوَىٰ نُزُلًا﴾ (۳۲-۱۹) ان کے رہنے کے لیے باغ میں یہ مہمانی۔

﴿نُزُلًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ﴾ (۳-۱۹۸) یہ خدا کے ہاں سے ان کی مہمانی ہے۔

اور روزخوں کے متعلق فرمایا:

﴿لَا يَكُونُ مِنْ شَجَرٍ مِّنْ رَّقُومٍ إِلَىٰ قَوْلِهِ هَذَا نُزْلُهُمْ يَوْمَ الدِّينِ﴾ (۵۶-۵۶) جزا کے دن یہ ان کی ضیافت ہوگی۔

﴿فَنُزُلٌ مِّنْ حَمِيمٍ﴾ (۵۶-۹۳) (تو اس کے لیے) کھولتے پانی کی ضیافت ہے۔

آنزَلْتُ فَلَانَا کے معنی کسی کی مہمانی کرنے کے ہیں اور نازِلَةٌ مصیبت اور سختی کو کہتے ہیں۔ اس کی جمع نَوَازِلُ آتی ہے۔

النَّزَالُ: (مصدر: غامض) کے معنی دوگرو ہوں کا باہم لڑنے

چکے ہیں کہ انزال تنزیل سے عام ہے۔ اور آیت کریمہ: ﴿لَوْ أَنزَلْنَا هَذَا الْقُرْآنَ عَلَىٰ جَبَلٍ﴾ (۵۹-۲۱)

اگر ہم یہ قرآن پاک کسی پہاڑ پر نازل کرتے ہیں۔ میں نَزْلَتْنَا کی بجائے آنزَلْنَا کا لفظ لا کر متنبہ کیا ہے کہ جو

کتاب ہم نے تم پر رات میں نازل کی ہے۔ اگر اسے پہاڑ پر ایک دفعہ بھی نازل کر دیتے تو تم اس کو دیکھتے کہ خدا کے

خوف سے وہ دبا جاتا ہے اور وہ آیت کریمہ: ﴿قَدْ أَنزَلَ اللَّهُ إِلَيْكُمْ ذِكْرًا رَسُولًا يَتْلُو عَلَيْكُمْ آيَاتِ

اللّٰهِ﴾ (۶۵-۱۱۰) خدا نے تمہارے پاس نصیحت کی کتاب بھیجی ہے۔ اور اپنے پیغمبر بھی بھیجے ہیں۔ جو

تمہارے سامنے..... پڑھتے ہیں۔

کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ انزال ذکر سے آنحضرت کی بعثت مراد ہے۔ اور آپ ﷺ کو لفظ ”ذکر“ سے

موسوم کرنا ایسے ہی ہے جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کلمۃ سے موسوم کیا گیا ہے لہذا اس تفسیر کی بنا پر رسول کا لفظ ذکرًا سے بدل الکل ہوگا۔ بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد رسول کا

ذکر ہے۔ تو اس صورت میں رسول کا لفظ ذکرًا کا مفعول ہوگا۔ اور تَنْزِيلُ کالفظ بھی نَزْلُ بہ کی طرح (صلہ بار کے

ساتھ) استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ محاورہ ہے۔ نَزَلَ الْمَلِكُ بِكَذَا وَتَنَزَّلَ بِهِ: فرشتہ اسے لے کر اتر ا۔ مگر یہ محاورہ باری

تعالیٰ کے متعلق استعمال نہیں ہوتا۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ﴾ (۲۶-۱۳۹) اس کو

امانت دار فرشتہ لے کر اتر ا۔ نیز فرمایا: ﴿تَنْزِيلُ الْمَلٰٓئِكَةِ وَالرُّوحُ فِيهَا بِإِذْنِ رَبِّهِمْ﴾ (۹۷-۳)

اس میں روح الامین اور فرشتے ہر کام کے انتظام کے لیے اپنے پروردگار کے حکم سے اترتے ہیں۔



الْكُفْرِ ﴿٩-٣٤﴾ اس کے کسی مہینہ کو ہٹا کر آگے پیچھے کر دینا کفر میں اضافہ کرتا ہے۔ اور آیت کریمہ:

﴿مَا نَنْسَخْ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنسِهَا﴾ ﴿٢-١٠٦﴾ ہم جس آیت کو منسوخ کر دیتے ہیں یا اسے فراموش کرا دیتے ہیں۔ میں ایک قراءت نَسَسَا ہا بھی ہے جس کے معنی کسی چیز کو بھلا دینے یا ابطال حکم کے ذریعہ مؤخر کر دینے کے ہیں۔

الْمِنْسَاءُ: عصا جس کے ذریعہ کسی چیز کو پیچھے ہٹایا جائے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿تَاكُلْ مِنْسَأَتَهُ﴾ ﴿٣٣-١٣﴾ جو ان کے عصا کو کھاتا رہا۔

نَسَاءَتِ الْإِبْلِ فِی ظَمِئِهَا یَوْمًا أَوْ یَوْمَیْنِ: اونٹوں کے پانی پلانے کے دن کو ایک یا دو روز مؤخر کر دینا شاعر نے کہا ہے ﴿(الطویل)﴾

(٣٣٢) وَعَنَسَ كَأَلْوَا حِ الْإِرَانِ نَسَاتُهَا  
إِذَا قِيلَ لِلْمَشْبُوبَتَيْنِ هُمَا هُمَا  
اور تابوت کے تختوں جیسے سفید اونٹوں کو میں نے ہٹا یا جب یہ کہا گیا کہ زہرہ اور مشتری دونوں طلوع ہو گئے۔  
النَّسْوُ: (ایضاً) تازہ دودھ جو زیادہ دیر تک پڑا رہنے سے کھٹا ہو جائے۔ اور اس میں پانی ملا لیا جائے۔

### (ن س ب)

النَّسَبُ وَالنَّسَبَةُ کے معنی آبوین میں سے کسی ایک کی طرف سے رشتہ داری کے ہیں اور نسب دو قسم

کے لیے میدان جنگ میں اترنے کے ہیں۔ اور نَزَلَ فُلَانٌ کے معنی مقام منیٰ میں اترنا بھی آتے ہیں چنانچہ شاعر نے کہا ہے ﴿(الطویل)﴾

(٢٣١) أَنَا زِلَةُ أَسْمَاءَ أَمْ غَيْرُ نَا زِلَةٍ  
کیا اسماء میدان منیٰ میں فروکش ہوگی یا نہیں۔  
النُّزَالَةُ وَالنُّزُلُ: کنایہ مرد کے مادہ منویہ کو کہتے ہیں جب کہ وہ خارج ہو چکا ہو اور طَعَامُ نُزُلٍ یا ذُو نُزُلٍ کے معنی پاکیزہ اور بابرکت طعام کے ہیں۔ پھر طعام نُزُلٍ کے ساتھ تشبیہ کے طور پر نَزَلَ کے معنی جمع ہونے کی جگہ فروگاہ کے بھی آتے ہیں۔

### (ن س و)

النَّسْنُءُ کے معنی کسی چیز کو اس کے وقت سے مؤخر کر دینے کے ہیں۔ اور اسی سے نُسِيتِ الْمَرْءَةُ کا محاورہ ہے۔ جس کے معنی عورت کے حیض میں مقررہ ایام میں تاخیر کے ہیں۔ جس سے اس کے حاملہ ہونے کی امید کی جاسکے۔ اور ایسی عورت کو نَسُوءٌ کہا جاتا ہے۔  
اور نَسَاءُ اللَّهِ فِیْ أَجْلِكَ اور نَسَاءُ اللَّهِ بَعْلِكَ کا محاورہ دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ جو کہ دراز یے عمر کی دعا کے لیے بولتے ہیں۔

النَّسِیئَةُ: اس کے معنی کسی چیز کو ادھار پر فروخت کرنے کے ہیں۔ اسی سے وہ نَسِیءٌ ہے۔ جس کا جاہلیت میں رواج تھا۔ یعنی وہ کسی ماہ حرام کو ہٹا کر آگے پیچھے کر دیتے تھے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے: ﴿إِنَّمَا النَّسِیءُ زِيَادَةٌ فِی

① قاله عامر بن الطفيل الغنوي وتماحه..... ابني لنا يا اسم ما انت فاعله والبيت في النقااض (٢٨٨) واللسان والمقاييس (نزل) وملحقات ديوانه (١٥٨) واصلاح يعقوب (٣٠٩) وذيلي الامالي (١١٤) والخزانة (٤٤:٣) وشرح السبع (ابن الانباري (٥٣٦)۔

② قَالَةُ شِمَاخُ فِی قِصْدِيَةِ رَاجِعِ دِيَاوَانِهِ (٨٩) والبيت في محاليس ثعلب (٢٥٤) واللسان (ارن، خشب) غير منسوب وغريب القرآن للقبتي (٣٥٥) والفرطبي (٢٨٠)۔

﴿مَا نَسَخْ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنسِهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِنْهَا أَوْ مِثْلَهَا﴾ (۱۰۶-۲) ہم جس آیت کو منسوخ کر دیتے ہیں یا اسے فراموش کر دیتے ہیں۔ تو اس سے بہتر یا ویسی ہی اور آیت بھیج دیتے ہیں۔ کی تفسیر میں بعض نے نسخ اور انشاء کے معنی اس پر عمل سے منع کرنے یا لوگوں کے دلوں سے فراموش کر دینے کے لیے ہیں۔ اور بعض نے کہا ہے کہ یہ نسخ الکتاب کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ جو آیت بھی ہم نازل کرتے ہیں یا اس کے نزول کو ایک وقت تک کے لیے ملتوی رکھتے ہیں تو اس سے بہتر یا ویسی ہی اور آیت بھیج دیتے ہیں۔

نسخ الکتاب کے معنی کتاب کی کاپی کرنے کے ہیں۔ یہ پہلی صورت کے ازالہ کو مقتضی نہیں ہے۔ بلکہ کسی دوسرے مادہ میں اس جیسی دوسری صورت کے اثبات کو چاہتا ہے جیسا کہ بہت سی شمعوں میں انگٹھی کا نقش بنا دیا جاتا ہے۔

الاستنساخ: کسی چیز کے لکھنے کو طلب کرنے یا لکھنے کے لیے تیار ہونے کے ہیں کبھی الاستنساخ بمعنی نسخ بھی آ جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے: ﴿إِنَّا كُنَّا نَسْتَنسِخُ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ﴾ (۲۹-۴۵) جو کچھ تم کیا کرتے تھے، ہم لکھواتے جاتے تھے۔ اور علم وراثت میں ”مناسخۃ“ کی صورت یہ ہوتی ہے کہ وارث کے بعد دیگرے مرتے رہیں اور میراث تقسیم نہ ہوئی ہو۔

تناسخ الآزمینۃ والقرآن: ایک قوم کا گزر جانا اور دوسری کا اس کے قائم مقام ہونا۔

اور تناسخ حنیۃ اس فرقے کو کہتے ہیں جو شریعت کے ثابت کردہ حشر و نشر کا انکار کرتے ہیں۔ اور ارواح کے مختلف

پر ہے۔ نسب بالطول: یعنی وہ رشتہ جو آباء اور ابناء کے درمیان پایا جاتا ہے: دوم نسب بالعرض یعنی وہ رشتہ جو بنوا الأعمام یعنی عم زاد بھائیوں کے درمیان ہوتا ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿فَجَعَلَهُ نَسَبًا وَصِهْرًا﴾ (۵۴-۲۵) پھر اس کو صاحب نسب اور صاحب قرابت دامادی بنایا۔ قُلَانٌ نَسِيبٌ قُلَانٌ وہ فلاں کا قریبی رشتہ دار ہے۔ اور نسبۃ کے معنی ان دو مقداروں کے درمیان باہمی مناسبت کے بھی آتے ہیں۔ جن میں کسی قسم کی مجانست ہو اسی سے نسیب کا لفظ ہے۔ جس کے معنی اشعار میں عورت کے محاسن ذکر کر کے اس کے ساتھ عشق کا اظہار کرنے کے ہیں۔ اور یہ نسب الشاعِرِ بِالْمَرْءَةِ نَسَبًا وَنَسِيبًا کا مصدر ہے۔

## (ن س خ)

النسخ: اس کے اصل معنی ایک چیز کو زائل کر کے دوسری کو اس کی جگہ پر لانے کے ہیں۔

جیسے۔ دھوپ کا سائے کو..... اور سائے کا دھوپ کو زائل کر کے اس کی جگہ لے لینا یا جوانی کے بعد بڑھاپے کا آنا وَغَيْرُ ذَلِكَ پھر کبھی اس سے صرف ازالہ کے معنی مراد ہوتے ہیں جیسے فرمایا۔ ﴿فَيَنْسَخُ اللَّهُ مَا يُلْفِي الشَّيْطَانُ﴾ (۵۲-۲۲) تو جو (دوسرے) شیطان ڈالتا ہے خدا اس کو دور کر دیتا ہے۔

اور کبھی صرف اثبات کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اور کبھی اس سے معاً دونوں معنی مفہوم ہوتے ہیں۔ لہذا نسخ الکتاب یعنی کتاب اللہ کے منسوخ ہونے سے ایک حکم کو زائل کر کے پھر اس کی بجائے دوسرا حکم نازل کرنا مراد ہوتا ہے۔ اور آیت کریمہ:-

اجسام میں منتقل ہونے کا اعتقاد رکھتے ہیں۔

### (ن ن ر)

النَّسْرُ: گدھ۔ اور آیت کریمہ:

﴿وَلَا يَغُوثٌ وَيَعُوقٌ وَنَسْرٌ﴾ (۷۱-۷۳) اور

یغوث اور یعوق اور نسر کو بھی ترک نہ کرنا۔

میں نسر ایک بت کا نام ہے اور النَّسْرُ نَسْرًا الطَّائِرُ الشَّيْءَ بِمَنْسِرِهِ: کا مصدر بھی آتا ہے جس کے معنی پرند کا چونچ سے کوئی چیز اٹھانا یا اسے ٹھوکنے کے ہیں۔

نَسْرُ الْحَافِرِ گھوڑے کے سم کے درمیان کا ابھرا ہوا گوشت۔

النَّسْرَان: دو ستارے ہیں جن میں سے ایک کو نَسْرِ

(طائر) اور دوسرے کو نَسْرِ (واقع) کہا جاتا ہے۔

نَسْرَتٌ كَذَا: کسی چیز کو تھوڑا تھوڑا کر کے تناول کرنا جیسا کہ پرند چونچ بھرتا ہے۔

### (ن ن ف)

نَسَفَتِ الرِّيحُ الشَّيْءَ کے معنی ہوا کے کسی

چیز کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دینے کے ہیں۔ اور نَسَفْتُهُ

وَأَنْتَسَفْتُهُ ایک ہی معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔ قرآن

پاک میں ہے:-

﴿فَقُلْ يَنْسِفُهَا رَبِّي نَسْفًا﴾ (۲۰-۱۰۵) خدا ان کو

اڑا کر بکھیر دے گا۔

اور نَسَفَ الْبَعِيرُ الْأَرْضَ بِمَقْدَمِ رَجُلِهِ کے معنی

اونٹ کا اپنے اگلے پاؤں کے ساتھ مٹی کو پھینکنا کے ہیں۔

اور گھاس کو جڑ سے اکھاڑ کر چرنے والی اونٹنی کو نَسَافَةٌ

نَسُوفٌ کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:-

﴿ثُمَّ لَنَنْسِفَنَّهُ فِي الْيَمِّ نَسْفًا﴾ (۲۰-۹۷) پھر اس

کی راسخ کو اڑا کر دریا میں بکھیر دیں گے۔

یعنی ہم نَسَافَهُ کی طرح اسے پھینک دیں گے اور نَسَافَةٌ

کے معنی اڑتی ہوئی غبار کے ہیں اور تشبیہ کے طور پر جھاگ

کو بھی نَسَافَهُ کہتے ہیں۔ اور نَسَاءُ نَسْفَانُ، بھرے

ہوئے برتن کو کہتے ہیں۔ جس پر جھاگ غالب ہو۔

أَنْتَسِفَ لَوْنُهُ: غبار آلود ہونے کی وجہ سے کسی شخص کی

رنگت کا متغیر ہو جانا۔ جیسا کہ اِغْبَرَّ وَجْهَهُ کا محاورہ

ہے

النَّسْفَةُ: سبک پائے خار۔

كَلَامٌ نَسِيفٌ: سخن پنہاں۔ جو متغیر اور بودا ہو۔

### (ن ن ك)

النَّسْكُ کے معنی عبادت کے ہیں۔ اور

نَاسِكٌ عابد کو کہا جاتا ہے۔ مگر یہ لفظ ارکان کے ادا کرنے

کے ساتھ مخصوص ہو چکا ہے۔ اَلْمَنَاسِكُ اعمال حج ادا

کرنے کے مقامات النَّسِيكَةُ خاص کر ذبیحہ یعنی قربانی کو

کہتے ہیں قرآن پاک میں ہے:-

﴿فَقَدِيَّةٌ مِّنْ صَيَّامٍ أَوْ صَدَقَةٍ أَوْ نُسْكَ﴾ (۲-۱۹۶) تو

اس کے بدلے روزے رکھے یا صدقہ دے یا قربانی کرے۔

﴿فَإِذَا قَضَيْتُمْ مَنَاسِكَكُمْ﴾ (۲-۲۰۰) پھر جب حج

کے تمام ارکان پورے کر چکو۔

﴿مَنْسَكًا هُمْ نَاسِكُوهُ﴾ (۲۲-۶۷) ایک شریعت

مقرر کر دی جس پر وہ چلتے ہیں۔

### (ن ن ل)

النَّسْلُ کے معنی کسی چیز سے الگ ہو جانے

کے ہیں۔ چنانچہ محاورہ ہے:-

نَسَلَ الْوَبْرُ عَنِ الْبَعِيرِ: اون اونٹ سے الگ ہو گئی۔

اس کے معنی کسی چیز کو ضبط میں نہ رکھنے کے ہیں۔ خواہ یہ ترک ضبط ضعف قلب کی وجہ سے ہو یا ازراہ غفلت ہو۔ یا قصداً کسی چیز کی یاد بھلا دی جائے حتیٰ کہ وہ دل سے محو ہو جائے۔ قرآن پاک میں ہے:-

﴿وَلَقَدْ عَهِدْنَا إِلَىٰ آدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهُ عَزْمًا﴾ (۲۰-۱۱۵) ہم نے پہلے آدم علیہ السلام سے عہد لیا تھا مگر وہ اسے بھول گئے اور ہم نے ان میں صبر و ثبات نہ دیکھا۔

﴿فَذُوقُوا بِمَا نَسِيتُمْ﴾ (۳۲-۱۴) سواب آگ کے مزے چکھو۔ اس لیے کہ تم نے اس دن کے آنے کو بھلا رکھا تھا۔

﴿فَلَنَأْتِيَنَّكَ الْحُوتُ وَبِمَا تَسِيتُ إِلَّا الشَّيْطَانُ﴾ (۱۸-۶۳) تو میں مچھلی وہیں بھول گیا۔ اور مجھے آپ سے اس کا ذکر کرنا شیطان نے بھلا دیا۔

﴿لَا تُؤَاخِذْنِي بِمَا نَسِيتُ﴾ (۱۸-۷۳) کہ جو بھول مجھ سے ہوئی اس پر مواخذہ نہ کیجیے۔

﴿فَنَسُوا حَظًّا مِمَّا ذُكِّرُوا بِهِ﴾ (۵-۱۴) مگر انہوں نے بھی اس نصیحت کو جو ان کو کی گئی تھی۔ ایک حصہ فراموش کر دیا۔

﴿ثُمَّ إِذَا خَوَّلَهُ نِعْمَةً مِّنْ نَّبِيِّ مَا كَانَ يَدْعُو إِلَيْهِ مِنْ قَبْلُ﴾ (۳۹-۸) پھر جب وہ اس کو اپنی طرف سے کوئی نعمت دے دیتا ہے۔ تو جس کام کے لیے پہلے اس کو پکارتا ہے۔ اسے بھول جاتا ہے۔ اور آیت

اور نَسَلِ الْقَمِيصُ عَنِ الْإِنْسَانِ کے معنی قمیص کے بدن سے الگ ہو جانے کے ہیں۔ چنانچہ شاعر نے کہا ہے ۵ (الطویل)

(۲۲۲) فَسَلَى ثِيَابِي عَنْ ثِيَابِكَ تَنَسَلِي  
تو اپنے کپڑوں کو میرے کپڑوں سے کھینچ لے تاکہ جدا ہو جائیں۔

النَّسَاءُ: (داڑھی سے) گرے ہوئے بال یا پرند کے پر جو جھڑ کر گر پڑتے ہیں۔

أَنَسَلَتِ الْإِبِلُ: اونٹوں کی اون جھڑنے کا وقت آ گیا۔ اسی سے نَسَلٌ يَنْسِلُ نَسَلًا ہے جس کے معنی تیز دوڑنے کے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:-

﴿وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَنْسِلُونَ﴾ (۲۱-۹۶) اور وہ ہر بلندی سے دوڑ رہے ہوں گے۔

النَّسْلُ: اولاد کو کہتے ہیں کیونکہ وہ بھی اپنے باپ سے جدا ہوئی ہوتی ہے۔ چنانچہ فرمایا:-

﴿يَهْلِكُ الْحَرْتُ وَالنَّسْلُ﴾ (۲-۲۰۵) اور کھیتی کو (برباد) اور (انسانوں اور حیوانوں) کی نسل کو نابود کر دے۔

اور تَنَاسَلُوا کے معنی تَوَالَدُوا کے ہیں۔ نیز جب کوئی انسان دوسرے سے خیرات طلب کرے۔ تو کہا جاتا ہے۔ فَخَذَّ مَا نَسَلَ لَكَ مِنْهُ عَفْوًا کہ جو کچھ ملے وہی لے لو۔

## (ن ن ی)

النَّسِيَانُ یہ نَسِيْتَهُ نَسِيَانًا کا مصدر ہے اور

① والبيت لامرى القيس واوله: وان تك قد ساء لك منى خليقة. والبيت فى المعلقة مع التبريزى ۲۱ والسيوطى ۷ واللسان (ثوب) ومختار الشعر الجاهلى (۱: ۱۰) والحميرة (۹۷) والعقد الثمين (۴۷) والمعانى للقبتي (۴۸۲) وديوانه بشرح ابن الانبارى رقم ۲۱۔

طرح آج ہم بھی انہیں بھلا دیں گے۔

﴿نَسُوا اللَّهَ فَنَسِيَهُمْ﴾ (۶-۹) انہوں نے خدا کو بھلایا تو خدا نے بھی ان کو بھلا دیا۔

﴿وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللَّهَ فَأَنْسَاهُمْ أَنْفُسَهُمْ﴾ (۱۹-۵۹) اور ان لوگوں جیسے نہ ہونا جنہوں نے خدا کو بھلا دیا تو خدا نے انہیں ایسا کر دیا کہ خود اپنے تئیں بھول گئے۔

میں متنبہ کیا ہے کہ انسان اپنے نفس کی معرفت حاصل کرنے سے ہی معرفت الہی حاصل کر سکتا ہے۔ لہذا انسان کا اللہ تعالیٰ کو بھلا دینا خود اپنے آپ کو بھلا دینے کے مترادف ہے۔ اور آیت کریمہ:-

﴿وَإِذْ كُنَّا رَبَّكَ إِذَا نَسِيتَ﴾ (۱۸-۲۳) اور جب خدا کا نام لینا بھول جاؤ تو یاد آنے پر لے لو۔

کے ابن عباسؓ نے یہ معنی کیے ہیں کہ جب تم کوئی بات کہو اور اس کے ساتھ ان شاء اللہ کہنا بھول جاؤ تو یاد آنے پر ان شاء اللہ کہہ لیا کرو۔ اسی لیے ابن عباسؓ کے نزدیک حلف میں کچھ مدت کے بعد بھی انشاء اللہ کہنا جائز ہے۔ اور عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نَسِيتَ بمعنی اِنْ تَكَبَّتَ ذَنْبًا کے ہے۔ اور آیت کے معنی یہ ہیں کہ جب تمہیں کسی گناہ کے ارتکاب کا خیال آئے تو اس وسوسہ کو دفع کرنے کے لیے خدا کے ذکر میں مشغول ہو جایا کرو تا کہ وہ وسوسہ دفع ہو جائے۔<sup>①</sup>

النَّسِيُّ کے اصل معنی مَا يَنْسِي یعنی فراموش شدہ چیز کے ہیں جیسے: نَقَضُ بمعنی مَا يَنْقُضُ آتا ہے۔ مگر عرف میں

﴿سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسَى﴾ (۶-۸۷) ہم تمہیں پڑھائیں گے۔ کہ تم فراموش نہ کرو گے۔ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس بات کی ضمانت دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ تجھے ایسا بنا دے گا کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے سنو گے اسے بھولنے نہیں پاؤ گے۔ پھر ہر وہ نسیان جو انسان کے قصد اور ارادہ سے ہو۔ وہ مذموم ہے اور جو بغیر قصد اور ارادہ کے ہو اس میں انسان معذور ہے۔ اور حدیث میں جو مروی ہے<sup>②</sup> (۱۲۸)

((رُفِعَ عَنْ أُمَّتِي الْخَطَا وَالنِّسْيَانُ)) کہ میری امت کو خطا اور نسیان معاف ہے تو اس سے یہی دوسری قسم کا نسیان مراد ہے۔ یعنی وہ جس میں انسان کے ارادہ کو دخل نہ ہو۔ اور آیت کریمہ:-

﴿فَذُوقُوا بِمَا نَسِيتُمْ لِقَاءَ يَوْمِكُمْ هَذَا إِنَّا نَسِينَاكُمْ﴾ (۱۳-۳۲) سوا ب آگ کے مزے چکھو اس لیے کہ تم نے اس دن کے آنے کو بھلا رکھا تھا۔

میں نسیان بمعنی اول ہے یعنی وہ جس میں انسان کے قصد اور ارادہ کو دخل ہو اور کسی چیز کو حقیر سمجھ کر اسے چھوڑ دیا جائے۔

پھر جب نسیان کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو اس سے ازراہ اہانت انسان کو چھوڑ دینے اور احکام الہی کے ترک کرنے کی وجہ سے اسے سزا دینے کے معنی مراد ہوتے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:- ﴿فَالْيَوْمَ نَنْسَاهُمْ كَمَا نَسُوا لِقَاءَ يَوْمِهِمْ هَذَا﴾ (۵۱-۷) تو جس طرح یہ لوگ اس دن کے آنے کو بھولے ہوئے تھے اس

① رواہ الطبرانی عن ثوبان وفيه وما استكرهوا عليه (راجع الفتح للنبيهانی (۱۳۵/۲))

② راجع الفتح للشوكاني (۳: ۲۸۰) انه كان يرى الاستثناء ولو بعد سنة ولقول عكرمة راجع الطبري۔

النِّسَاءُ وَالنِّسَوَانُ وَالنِّسْوَةُ: یہ تینوں امراء کی جمع من غیر لفظہ ہیں۔ جیسے مرء کی جمع قوم آ جاتی ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:-

﴿لَا يَسْخَرُ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسَىٰ أَن يَكُونُوا خَيْرًا مِنْهُمْ وَلَا نِسَاءٌ مِّنْ نِّسَاءٍ﴾ (۱۱-۳۹) اور نہ عورتیں عورتوں سے تمسخر کریں۔

﴿نِسَاءَ كُنتُمْ حَرَّتْ لَّكُم﴾ (۲-۲۹۳) تمہاری عورتیں تمہاری بھیتیں ہیں۔

﴿نِسَاءَ النَّبِيِّ﴾ (۳۰-۳۳) اے پیغمبر کی بیویو!۔  
﴿وَقَالَ نِسْوَةٌ فِي الْمَدِينَةِ﴾ (۱۲-۳۰) اور شہر میں عورتیں گفتگوئیں کرنے لگیں۔

﴿مَا بَالُ النِّسْرِۃِ الَّتِي قَطَّعْنَ أَيْدِيَهُنَّ﴾ (۱۲-۵۰) کہ ان عورتوں کا کیا حال ہے جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے تھے۔

النِّسَاءُ (عرق النساء) ایک رنگ کا نام ہے اس کا تشبیہ نسیان اور جمع انسَاء آتی ہے۔

### (ن ش ۵)

النِّشَاءُ وَالنِّشَاءُ: کسی چیز کو پیدا کرنا اور اس کی پرورش کرنا۔ قرآن پاک میں ہے:-  
﴿وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ النَّشْأَةَ الْأُولَىٰ﴾ (۶۲-۵۶) اور تم نے پہلی پیدائش تو جان ہی لی ہے۔

نِسْیُ اس معمولی چیز کو کہتے ہیں جو درخور اعتناء نہ سمجھی جائے اور اسی سے اہل عرب کا مقولہ ہے:- اِحْفَظُوا اَنْسَاءَكُمْ (کوچ کے وقت اپنی معمولی چیزوں کا خیال رکھو جو عموماً بھول جاتی ہیں۔ شاعر نے کہا ہے ﴿الطَّوِيلُ﴾ (۴۳۳) كَانَتْ لَهُ فِي الْأَرْضِ نِسْيًا تَقْصُهُ۔

گویا زمین میں اس کی کوئی چیز گری ہوئی ہے۔ جسے وہ تلاش کر رہا ہے۔ اور آیت کریمہ:- ﴿وَكُنْتَ نَسِيًّا مِّنِّي﴾ (۱۹-۲۳) اور میں بھولی بسری ہو گئی ہوتی۔

میں نَسِيًّا کے معنی ہیں کہ میں اس حقیر چیز کے بمنزلہ ہوتی۔ جس کی طرف کوئی دھیان نہیں دیتا اگرچہ وہ بھولی ہوئی نہ ہو۔ پھر بھولی بسری ہوئی چیز کے معنی کو ظاہر کرنے کے لیے مَنَسِيًّا کا لفظ لایا گیا ہے۔ کیونکہ نَسْیُ کے معنی اس معمولی چیز کے ہیں۔ جو درخور اعتناء نہ ہو۔ اور اس کا فراموش ہونا ضروری ہے۔

اور ایک قراءت میں نَسِيًّا ہے جو کہ مصدر بمعنی مفعول کے ہیں۔ جیسے:- عَصَى عَصِيًّا وَعَصِيَانًا اور آیت کریمہ:-

﴿مَا نَنْسَخْ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنسِهَا﴾ (۱۰۶-۲) ہم جس آیت کو منسوخ کر دیتے ہیں یا فراموش کر دیتے ہیں۔ میں انسَا کے معنی قوت الہیہ کے ذریعہ دلوں سے محو کرنے اور فراموش کرا دینے کے ہیں۔

① قالہ عمرو بن عامر الشفیری الأزدی وتعامہ علی امہاوان تخاطبک تبلیت قال ابن البری وبلت (بافتح) اذ قطع وبالكسر اذ سکن والبيت فی الکامل (۴۹۷) والاعتضاب (۴۱۷) واللسان ونساء، بلت) والمفضليات (۱۰۷: ۱) والطبری (۶۶: ۱۶) والطبرسی (۹۳: ۲۹) وفي رواية اذ ماغدت بدل علی امہاوان تحدثک بدل ان تخاطبک وکذا رواية الکامل (۸۳۹) وفي رواية وان تکلمک والبيت فی محالس ثعلب (۳۵۳) وفيه علی وجهها بدل علی امہا والقصيدة مفضلية وهي فی منتهی الطلب (۲۰۵: ۲-۲۰۷) والاعانی (۹۰: ۲۱-۹۱) وبعضها فی الخزنة (۱۸: ۲) والبيت ايضا فی تهذيب الالفاظ (۵۰۸) والمحاضرات للمؤلف (۲۳۱: ۳) والمرزوقی (۱۳۵۸) وغریب القرآن (۲۷۳)۔

خدا ہی پچھلی پیدائش پیدا کرے گا۔

ان تمام آیات میں انشاء بمعنی ایجاد استعمال ہوا ہے جو ذات باری تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے۔ اور آیت کریمہ:-

﴿أَفَرَأَيْتُمُ النَّارَ الَّتِي تُورُونَ ۚ أَنْتُمْ أَنشَأْتُمْ شَجَرَتَهَا ۖ أَمْ نَحْنُ الْمُنشِئُونَ﴾ (۵۶-۷۱، ۷۲)

بھلا دیکھو جو آگ تم درخت سے نکالتے ہو کیا تم نے اس کے درخت کو پیدا کیا ہے یا ہم پیدا کرتے ہیں۔

میں آگ کا درخت اگانے پر بطور تشبیہ انشاء کا لفظ بولا گیا ہے۔ اور آیت کریمہ:-

﴿أَوْ مَنْ يُنشِئُ فِي الْحِلْيَةِ﴾ (۴۳-۱۸) کیا وہ جو زیور میں پرورش پائے۔

میں یَنْشِئُ کے معنی تربیت پانے کے ہیں۔ یعنی عورت جو زیور میں تربیت پاتی ہے۔ ایک قراءت میں یَنْشِئُ ہے یعنی پھلے پھولے۔

## (ن ش ر)

النَّشْرُ: کے معنی کسی چیز کو پھیلانے کے ہیں۔

یہ کپڑے اور صحیفے کے پھیلانے، بارش اور نعمت کے عام کرنے اور کسی بات کے مشہور کر دینے پر بولا جاتا ہے۔

چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔ ﴿وَإِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ﴾ (۸۱-۱۰) اور جب علموں کے دفتر کھولے جائیں گے۔

﴿وَهُوَ الَّذِي يَنْزِلُ الْغَيْثَ مِنْ مَّ بَعْدَ مَا قَطَطُوا وَيَنْشُرُ رَحْمَتَهُ﴾ (۲۲-۲۸) اور وہی تو ہے جو لوگوں کے نامہ امید ہو جانے کے بعد مینہ برساتا اور اپنی رحمت (یعنی بارش کی برکت) کو پھیلا دیتا ہے۔ اور آیت کریمہ:-

﴿وَالنَّشِيرِ نَشْرًا﴾ (۷۷-۳) اور بادلوں کو (پھاڑ

نَشَأَ قُلَانٌ کے معنی بچہ کے جوان ہونے کے ہیں۔ اور نو جوان کو ناشی کہا جاتا ہے۔ اور آیت کریمہ:-

﴿إِنَّ نَاشِئَةَ اللَّيْلِ هِيَ أَشَدُّ وَطْأً﴾ (۷۳-۶) کچھ شک نہیں کہ رات کا اٹھنا (نفس بھیمی کو) سخت پامال کرتا ہے۔

میں ناشِئَةُ کے معنی نماز کے لیے اٹھنے کے ہیں۔ اسی سے نَشَأَ السَّحَابُ کا محاورہ ہے جس کے معنی فضا میں بادل کے رونما ہونے اور آہستہ آہستہ بڑھنے کے ہیں۔ قرآن

میں ہے:- ﴿وَيُنشِئُ السَّحَابَ الثِّقَالَ﴾ (۱۳-۱۲) اور بھاری بھاری بادل پیدا کرتا ہے۔

الْإِنْشَاءُ: (افعال) اس کے معنی کسی چیز کی ایجاد اور تربیت کے ہیں۔ عموماً یہ لفظ زندہ چیز..... کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:-

﴿قُلْ هُوَ الَّذِي أَنشَأَكُمْ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ﴾ (۶۷-۲۳) وہ خدا ہی تو ہے جس نے تمہیں پیدا کیا۔ اور تمہارے کان اور آنکھیں اور

دل بنائے۔ نیز فرمایا:-

﴿هُوَ أَعْلَمُ بِكُمْ إِذْ أَنشَأَكُمْ مِنَ الْأَرْضِ﴾ (۵۳-۲۲) وہ تم کو خوب جانتا ہے۔ جب اس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا۔

﴿ثُمَّ أَنشَأْنَا مِنْ بَعْدِهِمْ قَرْنًا آخَرِينَ﴾ (۲۳-۳۱) پھر ان کے بعد ہم نے ایک اور جماعت پیدا کی۔

﴿وَنُنَشِّئُكُمْ فِي مَا لَا تَعْلَمُونَ﴾ (۵۶-۶۱) اور تم کو ایسے جہان میں جس کو تم نہیں جانتے پیدا کر دیں۔

﴿ثُمَّ أَنشَأْنَاهُ خَلْقًا آخَرَ﴾ (۲۳-۱۳) پھر اس کو نئی صورت میں بنا دیا۔

﴿ثُمَّ اللَّهُ يُنشِئُ النَّشْأَةَ الْآخِرَةَ﴾ (۲۹-۲۰) پھر

نَشَرُ النَّوْبِ کے محاورہ سے ماخوذ ہے شاعر نے کہا ہے ۵ (الوافر)

(۴۲۵) طَوْنَكَ خُطُوبُ ذَهْرِكَ بَعْدَ نَشْرِ كَذَاكَ خُطُوبُهُ طَيًّا وَنَشْرًا

تجھے پھیلانے کے بعد حوادثِ زمانہ نے لپیٹ لیا اسی طرح حوادثِ زمانہ لپیٹے اور نشر کرتے رہتے ہیں۔ اور آیت کریمہ۔ ﴿وَجَعَلَ النَّهَارَ نُشُورًا﴾ (۲۵-۴۷) اور دن کو اٹھ کھڑا ہونے کا وقت ٹھہرایا۔

میں دن کے نشور بنانے سے مراد یہ ہے کہ اس کو کاروبار کے پھیلانے اور روزی کمانے کے لیے بنایا ہے۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا:-

﴿وَمِنْ رَّحْمَتِهِ جَعَلَ لَكُمُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ لِتَسْكُنُوا فِيهِ وَلِتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ﴾ (۲۸-۷۳) اور اس نے اپنی رحمت سے تمہارے لیے رات اور دن کو بنایا۔ تاکہ تم اس میں آرام کرو اور اس میں اس کا فضل تلاش کرو۔ اور اَنْتِشَارُ النَّاسِ کے معنی لوگوں کے اپنے کاروبار میں لگ جانے کے ہیں۔ چنانچہ فرمایا:-

﴿ثُمَّ إِذَا أَنْتُمْ بَشَرٌ تَنْتَشِرُونَ﴾ (۳۰-۲۰) پھر اب تم انسان ہو کر جا بجا پھیل رہے ہو۔ ﴿فَإِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوا﴾ (۳۳-۵۳) تو جب کھانا کھا چکو تو چل دو۔

﴿فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلَاةُ فَانْتَشِرُوا فِي الْأَرْضِ﴾ (۶۲-۱۰) پھر جب نماز ہو چکے تو اپنی اپنی راہ لو۔ اور بعض نے کہا ہے کہ نَشَرُوا بمعنی اَنْتَشَرُوا کے آتا ہے۔ چنانچہ آیت کریمہ:-

کر) پھیلا دیتی ہے۔

میں نَاشِرَات سے مراد وہ فرشتے ہیں جو ہواؤں کو پھیلاتے ہیں یا اس سے وہ ہوائیں مراد ہیں جو بادلوں کو بکھیرتی پھرتی ہیں۔

اور نَاشِر کی جمع نَشْرٌ آتی ہے۔ چنانچہ ایک قراءت میں نَشْرًا بَيْنَ يَدَي رَحْمَتِهِ بھی ہے جو کہ وَالنَّاشِرَاتِ کے ہم معنی ہے اور اسی سے سَمِعْتُ نَشْرًا حَسَنًا کا محاورہ ہے۔ جس کے معنی ہیں: میں نے اچھی شہرت سنی۔

نَشْرَ الْمَيِّتِ نُشُورًا کے معنی میت کے (از سر نو زندہ ہونے کے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:-

﴿وَالْبَاقِيَ نُشُورًا﴾ (۶۷-۱۵) اسی کے پاس قبروں سے نکل کر جانا ہے۔

﴿بَلْ كَانُوا لَا يَرْجُونَ نُشُورًا﴾ (۲۵-۴) بلکہ ان کو مرنے کے بعد جی اٹھنے کی امید ہی نہیں تھی۔

﴿وَلَا يَمْلِكُونَ مَوْتًا وَلَا حَيَاةً وَلَا نُشُورًا﴾ (۲۵-۳) اور نہ مرنا ان کے اختیار میں ہے۔ اور نہ جینا اور نہ مرنے کا اٹھ کھڑے ہونا۔

اَنْشَرَ اللَّهُ الْمَيِّتَ کے معنی میت کو زندہ کرنے کے ہیں۔ اور نُشِرَ اس کا مطاوع آتا ہے۔ جس کے معنی زندہ ہو جانے کے ہیں چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔ ﴿ثُمَّ إِذَا شَاءَ اَنْشَرَهُ﴾ (۸۰-۲۲) پھر جب چاہے گا اسے اٹھا کھڑا کرے گا۔

﴿فَانْشَرْنَا بِهِ بَلْدَةً مَيِّتًا﴾ (۴۳-۱۱) پھر ہم نے اس سے شہر مردہ کو زندہ کر دیا۔

بعض نے کہا ہے کہ نَشَرَ اللَّهُ الْمَيِّتَ وَاَنْشَرَهُ کے ایک ہی معنی ہیں۔ لیکن درحقیقت نَشَرَ اللَّهُ الْمَيِّتَ



کے معنی بلند زمین کا قصد کرنے کے ہیں۔ اسی سے نَشَرُ  
فُلَانٌ عَنْ مَقَرِّہ کا محاورہ ہے جس کے معنی کسی کے اپنی  
قرار گاہ سے اوپر ابھر آنے کے ہیں۔ اور ہر اوپر اٹھنے والی  
چیز کو نَاشِرٌ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:-

﴿وَإِذَا قِيلَ انشُرُوا فَانشُرُوا﴾ (۵۸-۱۱) اور جب  
کہا جائے کہ اٹھ کھڑے ہو تو اٹھ کھڑے ہوا کرو۔

اور نَشَرٌ وَانْشَارٌ کے معنی زندہ کرنا..... بھی آتے ہیں۔ کیونکہ

زندگی میں بھی ایک طرح کا ابھار پایا جاتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:-

﴿وَانْظُرْ إِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِرُهَا ثُمَّ  
نَكْسُوها لَحْمًا﴾ (۲۵۹-۲) اور (وہاں) گدھے کی

ہڈیوں کو دیکھو کہ ہم ان کو کیونکر جوڑ دیتے ہیں اور ان پر

(کس طرح) گوشت (پوست) چڑھا دیتے ہیں۔ اور

نُشِرُهَا کے نون پر ضمہ اور فتح دونوں جائز ہیں۔ اور

نُشُوزُ الْمَرْءَةِ کے معنی عورت اپنے شوہر کو برا سمجھے اور

سرکشی کرنے اور کسی دوسرے مرد پر نظر رکھنے کے ہیں۔

چنانچہ قرآن پاک میں ہے:-

﴿وَالَّتِي تَخَافُونَ نُشُوزَهُنَّ﴾ (۳۳-۳) اور جن

عورتوں کی نسبت تمہیں معلوم ہو کہ سرکشی (اور بد خوئی)

کرنے لگی ہیں۔

چنانچہ اس معنی کے پیش نظر شاعر نے کہا ہے ۵ (الطویل)

(۴۲۶) إِذَا جَلَسْتَ عِنْدَ الْإِمَامِ كَأَنَّهَا

تَرَى رُفْقَةً مِّنْ سَاعَةِ تَسْتَحِيلُهَا

اور عِرْقُ نَاشِرٌ کے معنی پھولی ہوئی رگ کے ہیں۔

﴿وَإِذَا قِيلَ انشُرُوا فَانشُرُوا﴾ (۵۸-۱۱) اور

جب کہا جائے کہ اٹھ کھڑے ہو تو اٹھ کھڑے ہوا کرو۔ میں

ایک قراءت فِإِذَا قِيلَ انشُرُوا فَانْتَشِرُوا بھی ہے۔

یعنی کہا جائے کہ منتشر ہو جاؤ تو منتشر ہو جایا کرو۔

الْإِنْتِشَارُ کے معنی چوپایہ کی رگوں کا پھول جانا..... بھی

آتے ہیں۔ اور نَسَاوِشِرٌ باطن ذراع کی رگوں کو کہا جاتا

ہے۔ کیونکہ وہ بدن میں منتشر ہیں۔

النَّشْرُ: (ایضاً) پھیلنے والے بادل کو کہتے ہیں۔ اور یہ بمعنی

مَنْشُورٌ بھی آتا ہے۔ جیسا کہ نَقْضٌ بمعنی منقوض آ جاتا

ہے۔ اسی سے محاورہ ہے:- اِكْتَسَى الْبَارِئُ رِيشًا نَشْرًا:

یعنی باز نے لمبے چوڑے پھیلنے والے پروں کا لباس پہن لیا۔

النَّشْرُ (ایضاً) خشک گھاس کو کہتے ہیں۔ جو بارش کے بعد

سرسبز ہو کر پھیل جائے اور اس سے سرپستان کی سی کوئلیں

پھوٹ نکلیں یہ گھاس بکریوں کے لیے سخت مضر ہوتی ہے۔

اسی سے نَشَرَتِ الْأَرْضُ فَهِيَ نَاشِرَةٌ کا محاورہ ہے

جس کے معنی زمین میں نشر گھاس پھونے کے ہیں۔

نَشَرْتُ الْحَشَبَ بِالْمُنْشَارِ کے معنی آرے سے

لکڑی چیرنے کے ہیں۔ اور لکڑی چیرنے کو نشر اس لیے

کہتے ہیں کہ اس سے چیرتے وقت نشارہ یعنی برادہ پھیلتا

ہے۔ اور نَشْرَةٌ کے معنی افسوس کے ہیں جس سے مریض

کا علاج کیا جاتا ہے۔

## (ن ش ز)

النَّشْرُ: بلند زمین کو کہتے ہیں۔ اور نَشَرٌ فُلَانٌ

① البيت للفرزدق في نشوز المرأة النوارينة اعين بن ضبعة المحاشعي في قصيدة (۲۸) بينا راجع ديوانه (۲: ۶۲) وفيه قعدت بدل جلست وكانما بدل كانها في المعاني للقبتي (۸۱۵، ۸۴۵) صدره: تراها اذا صطلك الخصوم كانها..... وقبله: وما خاصم الاقوام من ذي خصومة- كورها مشوء اليها حليلها-

## (ن ص ب)

## (ن ش ط)

نَصَبُ الشَّيْءِ کے معنی کسی چیز کو کھڑا کرنے یا گاڑ دینے کے ہیں۔ مثلاً: نیزے کے گاڑنے اور عمارت یا پتھر کو کھڑا کرنے پر نَصَبُ کا لفظ بولا جاتا ہے۔ اور نَصِيبُ اس پتھر کو کہتے ہیں جو کسی مقام پر (بطور نشان کے) گاڑ دیا جاتا ہے۔ اس کی جمع نَصَائِبُ وَنَصَبٌ آتی ہے۔ جاہلیت میں عرب جن پتھروں کی پوجا کیا کرتے اور ان پر جانوروں کو بھینٹ چڑھایا کرتے تھے۔ انہیں نَصَبُ کہا جاتا تھا۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔ ﴿كَانَهُمْ إِلَىٰ نَصَبٍ يُوفَّضُونَ﴾ (۷۰-۴۳) جیسے وہ عبادت کے پتھروں کی طرف دوڑتے ہیں۔ نیز فرمایا:

﴿وَمَا ذُبِحَ عَلَىٰ النَّصَبِ﴾ (۵-۴) اور وہ جانور بھی جو تھان پر ذبح کیا جائے۔

اس کی جمع أَنْصَابٌ بھی آتی ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ﴾ (۵-۹۰) اور بت اور پائے (یہ سب) ناپاک کام اعمالِ شیطانی ہیں۔

اور نَصَبٌ وَنَصَبٌ کے معنی تکلیف و مشقت کے ہیں۔ اور آیت کریمہ۔

﴿بِنَصَبٍ وَعَذَابٍ﴾ (۳۸-۴۱) ایذا اور تکلیف میں ایک قراءت نَصَبٌ بھی ہے اور یہ بُخْلٌ وَبَخْلٌ کی طرح ہے قرآن پاک میں ہے:-

﴿لَا يَمَسُّنَا فِيهَا نَصَبٌ﴾ (۳۵-۳۵) یہاں نہ ہم کو رنج پہنچے گا۔

النَّشْطُ (ض) کے اصل معنی گرہ کھولنے کے ہیں۔ اور آیت کریمہ:-

﴿وَالنَّشِيطَةُ نَشْطًا﴾ (۹-۲) اور ان کی قسم جو آسانی سے کھول دیتے ہیں۔

میں بعض نے کہا ہے کہ نَاشِطَاتٌ سے مراد ستارے ہیں جو مشرق سے نکل کر حرکتِ فلک سے مغرب کی طرف جاتے ہیں۔ یا خود مشرق سے مغرب کو چلے جاتے ہیں۔ یا خود مشرق سے مغرب کو چلتے ہیں اور یہ ”نَوْرٌ نَّاشِطٌ“ کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی ایک علاقہ سے نکل کر دوسرے علاقہ میں جانے والے نیل کے ہیں۔

بعض نے کہا ہے کہ نَاشِطَاتٌ سے مراد وہ فرشتے ہیں جو امور کو طے کرتے ہیں۔ اور یہ نَشْطُتُ الْعُقَدَةِ سے ماخوذ ہے۔ جس کے معنی گرہ لگانے کے ہیں اور یہاں خاص کر نَشْطُ کے لفظ سے جس کے معنی آسانی سے کھلنے والی گرہ کے ہیں۔ اس بات پر تنبیہ کی ہے کہ فرشتے نہایت آسانی سے ان امور کو سرانجام دے رہے ہیں جن پر کہ وہ مامور ہیں۔

بَشَرٌ أَنْشَاطٌ: کم گہرا کنواں جس سے پانی کا ڈول ایک ہی جھٹکے میں باہر آ جائے۔

النَّشِيطَةُ: اس مال کو کہتے ہیں جو رئیس قوم تقسیمِ غنیمت سے قبل اپنے لیے مخصوص کر لیتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ نَشِيطَةٌ ان اذخوں کو کہا جاتا ہے جو بلا قصد ہاتھ لگ جائیں اور حدی خواں کے بغیر ہی نشاط سے چلتے ہوں۔

نَشْطَتُهُ الْحَيَّةُ اسے سانپ نے کاٹ کھایا۔

① فارن الطبری (۲۹: ۵۵-۵۶) والقرطبی (۲۹/۲۹۶) والشوکانی (۲۸۶) والغریب للہنّی (۴۸۶)

کسی کے خلاف اعلان جنگ یا دشمنی ظاہر کرنے کے ہیں۔  
اس میں لفظ حَرْبٌ یا عِدَاوَةٌ کا حذف کرنا بھی جائز  
ہے۔ تَيْسٌ أَنْصَبُ وَشَاةٌ أَوْ عَنَزَةٌ نَصَبَاءُ کھڑے  
سینگوں والا مینڈھایا بکری۔

نَاقَةٌ نَصَبَاءُ: ابھرے ہوئے سینہ والی اونٹنی  
نِصَابُ السَّيِّئِينَ وَنَصَبُهُ کے معنی چھری کے دستہ  
ہیں۔ اور اسی سے نَصَابُ الشَّيْءِ کا محاورہ ہے جس کے  
معنی أَصْلُ الشَّيْءِ ہیں۔ تَنْصَبُ الغبارُ۔ غبار کا اڑنا۔  
نَصَبُ السِّتْرِ: پردہ اٹھانا۔ نَصَبُ (اعراب) زیر کو  
کہتے ہیں۔ اور نَصَبُ ایک قسم کا راگ بھی ہے۔

### (ن ص ح)

النُّصْحُ: کسی ایسے قول یا فعل کا قصد کرنے کو  
کہتے ہیں۔ جس میں دوسرے کی خیر خواہی ہو۔ قرآن  
پاک میں ہے۔

﴿لَقَدْ أَرْسَلْنَاكَ رِسَالَةَ رَبِّي وَنَصَحْتُ لَكُمْ وَ  
لَكِنْ لَا تُحِبُّونَ النَّصِيحِينَ﴾ (۷۹-۷۰) میں نے  
تم کو خدا کا پیغام سنا دیا۔ اور تمہاری خیر خواہی کی مگر تم ایسے  
ہو کہ خیر خواہوں کو دوست ہی نہیں رکھتے۔

﴿وَقَاسَمَهُمَا إِنِّي لَكُمَا لِنَصِيحِينَ﴾  
(۲۱-۲۰) اور ان سے قسم کھا کر کہا کہ میں تو تمہارا خیر خواہ  
ہوں۔ ﴿وَلَا يَنْفَعُكُمُ النَّصِيحَىٰ إِنَّ آرَدْتُ أَنْ  
أَنْصَحَ لَكُمْ﴾ (۳۳-۱۱) اور اگر میں یہ چاہوں کہ  
تمہاری خیر خواہی کروں تو میری خیر خواہی تم کو کچھ فائدہ  
نہیں دے سکتی۔

وَأَنْصَبْنِي كَذَا کے معنی کسی کو مشقت میں ڈالنے اور بے  
چین کرنے کے ہیں۔ شاعر نے کہا ہے (۱)  
(۲۲۷) تَأْوَيْنِي هُمْ مَعَ اللَّيْلِ مُنْصَبٌ  
میرے پاس رات کو تکلیف دہ غم بار بار لوٹ کر آتا ہے۔  
اور عَيْشَةُ رَاضِيَةٌ کی طرح ہم نَاصِبٌ کا محاورہ بھی  
بولا جاتا ہے۔

النَّصَبُ کے معنی مشقت کے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک  
میں ہے۔  
﴿لَقَدْ لَقِينَا مِنْ سَفَرِنَا هَذَا نَصَبًا﴾ (۱۸-۲۲)  
اس سفر سے ہم کو بہت تھکان ہو گئی ہے۔

اور نَصَبٌ (س) فَهُوَ نَصَبٌ وَنَاصِبٌ کے معنی  
تھک جانے یا کسی کام میں سخت محنت کرنے کے ہیں۔  
چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔

﴿عَامِلَةٌ نَاصِبَةٌ﴾ (۸۸-۳) سخت محنت کرنے  
والے، تھکے ماندے۔

﴿فَإِذَا فَرَغْتَ فَانصَبْ﴾ (۹۳-۷) تو جب فارغ  
ہوا کرو۔ تو (عبادت میں) محنت کیا کرو۔ النَّصِيبُ کے  
معنی معین حصہ کے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔

﴿أَمْ لَهُمْ نَصِيبٌ مِنَ الْمُلْكِ﴾ (۴-۵۳) کیا ان  
کے پاس بادشاہی کا کچھ حصہ ہے۔

﴿أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ أَوْتُوا نَصِيبًا مِنَ الْكِتَابِ﴾  
(۳-۵۱) بھلا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن کو کتاب  
سے حصہ دیا گیا۔

اور نَاصِبَةُ الْحَرْبِ وَالْعِدَاوَةِ وَنَصَبَ لَهُ کے معنی

① البیت مطلع قصیلة قالها ابو قران طفیل بن کعب الغنوی فی فرسان قومه وعجزه..... وجاء من الاخبار مالا اکذب  
والقصیلة فی دیوانه (۱۷-۲۷) والبیت فی اللسان (عقب) والطفیل جاهلی مشہور بالحر لحسن وصفه للخیل راجع  
لترجمته الشعراء (۴۲۲-۴۲۴) والاشتقاق (۲۷۰)۔

اور (الشکر) کفار پر فتح یاب کر۔  
﴿وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِينَ﴾ (۳۰-۳۷)  
اور مومنوں کی مدد ہم پر لازم تھی۔  
﴿إِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا﴾ (۴۰-۵۱) ہم اپنے پیغمبروں کی مدد کرتے ہیں۔

﴿وَمَا لَهُمْ فِي الْأَرْضِ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ﴾ (۹-۷۴)  
اور زمین میں ان کا کوئی دوست اور مددگار نہ ہوگا۔

﴿وَكَفَى بِاللّٰهِ وَلِيًّا وَكَفَى بِاللّٰهِ نَصِيرًا﴾ (۴-۳۵)  
اور خدا ہی کافی کارساز اور کافی مددگار ہے۔  
﴿وَمَا لَكُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ﴾ (۲-۱۰۷)  
اور خدا کے سوا تمہارا کوئی دوست اور مددگار نہیں۔

﴿فَلَوْلَا نَصْرُهُمُ الَّذِينَ اتَّخَذُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ﴾ (۳۶-۲۸)  
تو جن کو ان لوگوں نے..... خدا کے سوا معبود بنایا تھا۔ انہوں نے ان کی کیوں مدد نہ کی۔

یہ اور ان کے علاوہ اور بھی بہت سی آیات ہیں جن میں (نَصَرَ) کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے اپنے بندے کی مدد کرنا کے معنی تو ظاہر ہیں۔ اور بندہ کے اللہ تعالیٰ کی مدد کرنے سے اس کے بندوں کی مدد، حدود الہی کی حفاظت، اس کے عہدہ کی رعایت، احکام شریعت کی بجا آوری اور اس کے نواہی سے اجتناب کرنا مراد ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:-

﴿وَلِيَعْلَمَ اللَّهُ مَنْ يَنْصُرُهُ﴾ (۵۷-۲۵) اور اس لیے کہ جو اس کی مدد کرتے ہیں خدا ان کو معلوم کر لے

یہ یا تو نَصَحْتُ لَهُ الْوَدَّ کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی کسی سے خالص محبت کرنے کے ہیں۔ اور نَصِيحُ الْعَسَلِ خالص شہد کو کہتے ہیں۔ اور یا یہ نَصَحْتُ الْجِلْدَ سے ماخوذ ہے جس کے معنی چمڑے کو سینے کے ہیں۔ اور نَصِيحُ کے معنی درزی اور نَصَاحُ کے معنی سلائی کا دھاگہ کے ہیں۔ اور آیت کریمہ:-

﴿تَوْبُوا إِلَى اللَّهِ تَوْبَةً نَّصُوحًا﴾ (۶۶-۸) خدا کے آگے صاف دل سے توبہ کرو۔

میں نَصُوحًا کا لفظ بھی مذکورہ دونوں محاوروں میں سے ایک سے ماخوذ ہے۔ اور اس کے معنی خالص یا محکم توبہ کے ہیں۔ اس میں نَصُوحٌ وَنَصَاحٌ دو لغت ہیں جیسے ذُھُوبٌ وَذَهَابٌ کسی شاعر نے کہا ہے ﴿۵﴾  
(۳۲۸) أَحَبِّتْ حُبًّا خَالَطَتْهُ نَصَاحَةٌ  
میں اس سے خالص محبت رکھتا ہوں۔

### (ن ص ر)

النَّصْرُ وَالنُّصْرَةُ کے معنی کسی کی مدد کرنے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:-

﴿نَصْرٌ مِنَ اللَّهِ وَفَتْحٌ قَرِيبٌ﴾ (۲۱-۱۳) خدا کی طرف سے مدد نصیب ہوگی اور فتح عنقریب ہوگی۔ ﴿إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ﴾ (۱۱۰-۱) جب اللہ کی مدد آ پہنچی۔ ﴿وَإِنْصُرُوا إِلَهُتَكُمْ﴾ (۲۱-۶۸) اور اپنے معبودوں کی مدد کرو۔

﴿إِنْ يَنْصُرْكُمُ اللَّهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ﴾ (۴-۶۰)  
اگر خدا تمہارا مددگار ہے تو کوئی تم پر غالب نہیں آ سکتا۔  
﴿وَإِنْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ﴾ (۲-۲۵۰)

تھا۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے: ﴿كَمَا قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيِّينَ مَنْ أَنْصَارِي إِلَى اللَّهِ﴾ (۶۱-۴) جیسے عیسیٰ بن مریم نے حواریوں سے کہا، بھلا کون ہیں جو خدا کی طرف بلانے میں میرے مددگار ہوں؟ تو حواریوں نے کہا ہم خدا کے مددگار ہیں۔

اور بعض نے کہا ہے کہ یہ نصرانی کی جمع ہے جو نصران (قریہ کا نام) کی طرف منسوب ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَقَالَتِ الْيَهُودُ لَيْسَتِ النَّصْرَىٰ عَلَىٰ شَيْءٍ﴾ (۲-۱۱۳) یہود کہتے ہیں کہ عیسائی رستے پر نہیں۔  
نُصِرَ آرَضُ بَنِي فُلَانٍ کے معنی بارش برسنے کے ہیں۔ کیونکہ بارش سے بھی زمین کی مدد ہوتی ہے اور نَصْرَتْ فُلَانًا: جس کے معنی کسی کو کچھ دینے کے ہیں یہ یا تو نَصْرُ الْأَرْضِ سے مشتق ہے اور یا نَصْرٌ بمعنی عَوْن سے

### (ن ص ف)

نِصْفُ الشَّيْءِ کے معنی ۱/۲ حصہ کے ہیں۔

قرآن پاک میں ہے:-

﴿وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ أَزْوَاجُكُمْ إِنْ لَمْ يَكُنْ لَهُنَّ وَلَدٌ﴾ (۴-۱۲) اور جو مال تمہاری عورتیں چھوڑیں اگر ان کے اولاد نہ ہو تو اس میں نصف حصہ تمہارا ہے۔  
﴿وَإِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ﴾ (۴-۱۱) اور اگر صرف ایک لڑکی ہو تو اس کا حصہ نصف۔

﴿فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ﴾ (۴-۱۷) تو اس کو بھائی کے ترکہ میں سے آدھا حصہ ملے گا۔

إِنَاءٌ نِصْفَانُ: آدھا بھرا ہوا برتن۔

نَصَفَ النَّهَارُ وَانْتَصَفَ: دن کا نصف ہو جانا دوپہر کا

﴿إِنْ تَنْصُرُوا اللَّهَ يَنْصُرْكُمْ﴾ (۷۷-۷۸) اگر تم خدا کی مدد کرو گے تو وہ بھی تمہاری مدد کرے گا۔

﴿كُونُوا أَنْصَارَ اللَّهِ﴾ (۶۱-۱۳) خدا کے مددگار بن جاؤ۔  
الْأَنْصَارُ وَالْأَسْتَنْصَارُ کے معنی طلب نصرت کے ہیں قرآن پاک میں ہے:-

﴿وَالَّذِينَ إِذَا أَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُونَ﴾ (۳۲-۳۹) اور جو ایسے ہیں کہ جب ان پر ظلم و تعدی ہو تو مناسب طریقے سے بدلہ لیتے ہیں۔

﴿وَإِنْ اسْتَنْصَرُواكَ فِي الدِّينِ فَعَلَيْكَُمُ النَّصْرُ﴾ (۸-۷۲) اور اگر وہ تم سے دین کے معاملات میں مدد طلب کریں۔ تو تم کو مدد کرنا لازم ہے۔

﴿وَلَمَنِ أَنْصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهِ﴾ (۴۲-۴۱) اور جس پر ظلم ہوا ہو وہ اگر اس کے بعد انتقام لے۔

﴿فَدَعَا رَبَّهُ أَنِّي مَغْلُوبٌ فَانْتَصِرْ﴾ (۵۳-۱۰) تو انہوں نے اپنے پروردگار سے دعا کی کہ (باری تعالیٰ) میں ان کے مقابلے میں کمزور ہوں تو (ان سے) بدلہ لے۔

میں اُنْصُر کی بجائے اِنْتَصِر کہنے سے اس بات پر متنبہ کیا ہے کہ جو تکلیف مجھے پہنچ رہی ہے وہ گویا تجھے (ذات باری تعالیٰ) پہنچ رہی ہے کیونکہ میں تیرے حکم سے ان کے پاس گیا تھا لہذا میری مدد فرمانا گویا تیرا اپنی ذات کے لیے انتقام لینا ہے۔ اَلْتَنَاصُرُ کے معنی باہم تعاون کرنے کے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:-

﴿مَا لَكُمْ لَا تَنْصُرُونَ﴾ (۳۷-۲۵) تم کو کیا ہوا کہ ایک دوسرے کی مدد نہیں کرتے۔

اور بعض کے نزدیک عیسائیوں کو بھی نَصَارِی اس لیے کہا گیا ہے کہ انہوں نے نَحْنُ أَنْصَارُ اللَّهِ کا نعرہ لگایا

الْإِنْصَافُ وَالْإِسْتِصَافُ: طلب خدمت کرنا۔

وَقَدْ نَصَفَ الْإِزَارُ سَاقَهُ: ازار کا نصف پٹلی تک ہونا۔

### (ن ص ی)

النَّاصِيَةُ کے معنی پیشانی یا پیشانی کے بالوں کے ہیں کہا جاتا ہے۔

نَصَوْتُ فُلَانًا وَأَنْصَيْتُهُ وَأَنْصَيْتُهُ: میں نے اسے پیشانی کے بالوں سے پکڑا۔ اور آیت کریمہ: ﴿مَا مِنْ دَابَّةٍ إِلَّا هُوَ آخِذٌ بِنَاصِيَتِهَا﴾ (۱۱-۵۶) جو چلنے پھرنے والا ہے وہ اس کو چوٹی سے پکڑے ہوئے ہے۔

میں "اخذ ناصية" سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ہر چلنے پھرنے والی چیز پر پوری قدرت حاصل ہے۔

﴿لَنْسَفَعًا بِالنَّاصِيَةِ نَاصِيَةً﴾ (۱۵-۵۶) تو ہم اس کی پیشانی کے بال پکڑ کر گھسیٹیں گے۔

حضرت عائشہؓ سے مروی ہے ﴿۱۲۹﴾ کہ انہوں نے فرمایا۔ مَا لَكُمْ تَنْصَوْنَ مَيْتَكُمْ تَمِيتُ كِ نَاصِيَةٍ كِیوں باندھتے ہو اور فُلَانٌ رَأْسُهُمْ وَعَيْنُهُمْ كِی طرح فُلَانٌ نَاصِيَةُ قَوْمِهِ کا محاورہ بھی استعمال ہوتا ہے۔ جس کے معنی سردار کے ہیں۔

إِنْصَى الشَّعْرُ: بالوں کا بڑھ جانا۔

النَّصِيُّ: ایک قسم کا عمدہ چارہ۔

پھر اس کے ساتھ تشبیہ کے طور پر کہا جاتا ہے: فُلَانٌ نَصِيَةُ الْقَوْمِ کہ فلاں ان میں بہتر ہے۔

نَصِيفٌ: غلہ ٹاپنے کے ایک پیمانے کا نام ہے گویا وہ مِخْيَالِ أَكْبَرِ (بڑے پیمانے) کا نصف ہے اور اس کے معنی عورتوں کی اوڑھنی یا دوپٹہ بھی آتے ہیں۔ چنانچہ شاعر نے کہا ہے ﴿الکامل﴾

(۳۲۹) سَقَطَ النَّصِيفُ وَلَمْ تُرْذِ اسْقَاطُهُ

فَتَنَاوَلْتَهُ وَأَتَقْتَنَا بِالْبَيْدِ

اوڑھنی سر سے گری اور اس نے عمدہ انہیں گرائی تھی پھر اس نے (بدحواسی میں) اسے سنبھالا اور ہاتھ کے ذریعہ ہم سے پردہ کیا۔

بَلَعْنَا مَنَصِفَ الطَّرِيقِ: ہم نے آدھا سفر طے کر لیا۔

الْمُنَصَّفُ: شراب جو آگ پر پکانے کے بعد آدھا رہ گیا ہو۔

الْإِنْصَافُ کے معنی کسی معاملہ میں عدل سے کام لینے کے ہیں۔ یعنی دوسرے سے صرف اسی قدر فائدہ حاصل کرے جتنا کہ اسے پہنچا ہے۔

اور نَصْفَةٌ کے معنی خدمت بھی آتے ہیں۔ اور خادم کو نَاصِفٌ کہا جاتا ہے۔ اس کی جمع نَصَفٌ آتی ہے۔ اس نام میں اشارہ ہے کہ خادم کو حق خدمت پورا پورا ملنا چاہیے۔

① قاله النابغة الذبياني (٤٦٠) في وصف "متجردة" زوجة نعمان بن المنذر ولا جل هذا الشعر قال صالح بن حسان المديني: ان الشاعر كان مخنثا (شرح ديوان نابغة ٣٠) وراجع للقصة ايضا الشعراء والاغانى والبيت في ديوانه ٣٠ وامالى المرتضى (٤٤٦: ١) ومختار الشعر الجاهلى (١١٢: ١) والعقد الثمين ١٠ (في ٣٣) بيتا والبحر (٤٢٤: ٢٢٩: ٧) والحصرى (٢٦٥: ١) والعينى (٨٣: ١) والفائق (٢٧٥: ٢) والعمدة (٢٦٣: ١) وادروہ فی العمدة فی امثله الاختراع وهو مغاير عند العلماء والسرقة والتوحيد بوجوه وانظر الاول في المحاضرات للمؤلف (٨٧: ١)۔

② وفي غريب ابى عبيد (٣١٤/٤): علام بدل مالكم والحدث في الفائق (٢٧٨/٢) ولفظه كما في ابى عبيد ١٢۔

## (ن ض ج)

﴿تَعْرِفُ فِي وُجُوهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِيمِ﴾  
(۸۳-۲۳) تم ان کے چہروں سے راحت کی تازگی معلوم کر لو گے۔

﴿وَلَقُفُّهُمْ نَضْرَةً وَسُرُورًا﴾ (۷۶-۱۱) اور تازگی اور خوشدلی عنایت فرمائے گا۔

اور نَضْرَ وَجْهَهُ يَنْضَرُ فَهُوَ نَاضِرٌ (نَصْرَ) سے آتا ہے۔ اور بعض نے نَضْرَ يَنْضَرُ یعنی باب عَلِمَ سے مانا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:-

﴿وُجُوهُ يَوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ إِلَى رَبِّهَا نَاطِرَةٌ﴾ اس روز بہت سے منہ رونق دار ہوں گے اور اپنے پروردگار کے

موجودہ دار ہوں گے۔ (۷۵-۳۲) نَضْرَ اللَّهُ وَجْهَهُ: اللہ تعالیٰ اس کے چہرہ کو تروتازہ (یعنی خوش و خرم) رکھے۔

غُصْنٌ أَخْضَرٌ وَ نَاضِرٌ تروتازہ ٹہنی۔ اور سونے کو بھی اس کی تروتازگی اور حسن کے باعث نَضْرٌ وَ نَضِيرٌ کہا جاتا ہے۔ وَقَدْحٌ نَضَارٍ: (راضافت کے

ساتھ) پیالہ کو کہتے ہیں۔ جو عمدہ لکڑی سے بنا ہوا ہو۔

## (ن ط ح)

النَّطِيطَةُ: سینگ لگنے سے مری ہوئی بکری۔ قرآن پاک میں ہے:-

﴿وَالْمُتَرَدِّيةُ وَالنَّطِيطَةُ﴾ (۵-۳) اور جو جانور گر کر مرجائے اور جو سینگ لگ کر مرجائے۔

النَّطِيطُ وَالنَّاطِطُ: اس آہو یا پرند کو کہتے ہیں۔ جو شکاری کی طرف سیدھا آئے۔ گویا وہ سینگ سے مارنا

چاہتا ہے۔ ایسے شکار کو منحوس خیال کیا جاتا ہے۔ اسی سے نَوَاطِطُ الدَّهْرِ ہے جس کے معنی شدائد زمانہ کے ہیں۔ اور فَرَسٌ (نَطِيطٌ) اس گھوڑے کو کہتے ہیں جس کی

نَضِجَ اللَّحْمُ (ض) نَضَجًا وَنَضَجًا کے معنی گوشت کے پوری طرح پک جانے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:-

﴿كُلَّمَا نَضَجَتْ جُلُودُهُمْ بَدَّلْنَاهُمْ جُلُودًا غَيْرَهَا﴾ (۴-۵۶) جب ان کی کھالیں گل اور جل جائیں گی تو ہم اور کھالیں بدل دیں گے۔

اسی سے نَافَةٌ مُنْضَجَةٌ کا محاورہ ہے جس کے معنی حاملہ اونٹنی کے مدت ولادت سے تجاوز کر جانے کے ہیں۔ اور پختہ رائے آدمی کو نَضِيجُ الرَّأْيِ کہا جاتا ہے۔

## (ن ض د)

نَضَدْتُ الْمَتَاعَ بَعْضُهُ عَلَى بَعْضٍ کے معنی سامان کو قرینے سے اوپر نیچے رکھنے کے ہیں۔ اور

قرینے سے رکھے ہوئے سامان کو مَنَضُودٌ یا نَضِيدٌ کہا جاتا ہے۔ اور جس تحت پر سامان جوڑ کر رکھا جائے اسے

بھی نَضِيدٌ کہتے ہیں..... اسی سے استعارہ فرمایا:- ﴿طَلَعُ نَضِيدٌ﴾ (۵۰-۱۰) جن کا گاہاتہ برتہ ہوتا

ہے۔ اور دوسرے مقام پر فرمایا:- ﴿وَطَلَحَ مَنَضُودٌ﴾ (۵۶-۲۹) اور تہ بہ تہ کیلوں۔

اور مجازاً اگر بے بادل کو بھی نَضَدٌ کہا جاتا ہے۔ اور اَنْضَادُ الْقَوْمِ کے معنی لوگوں کی مختلف جماعتوں کے ہیں۔ اور

نَضْدُ الرَّجُلِ کے معنی آدمی کے اعمام و احوال کے ہیں جن کی مدد سے وہ مضبوط ہوتا ہے۔

## (ن ض ر)

النَّضْرَةُ وَالنَّضَارَةُ کے معنی حسن اور تروتازگی کے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:-

پیشانی کے دونوں طرف سفید ہوں۔

## (ن ط ف)

النُّطْفَةُ: (ضم نون) اصل میں تو آب صافی

کو کہتے ہیں مگر اس سے مرد کی منی مراد لی جاتی ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:-

﴿ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نُطْفَةً فِي قَرَارٍ مَّكِينٍ﴾ (۲۳-۱۳)

پھر اس کو ایک مضبوط اور محفوظ جگہ میں نطفہ بنا کر رکھا۔

﴿مِنْ نُّطْفَةٍ آمْشَاجٍ﴾ (۶-۲) نطفہ مخلوط سے

﴿أَلَمْ يَكُنْ نُطْفَةً مِنْ مَنًى يُمْنًى﴾ (۵-۳۷) کیا

وہ منی کا، جو رحم میں ڈالی جاتی ہے ایک قطرہ نہ تھا۔

اور کنایہ کے طور پر موتی کو بھی نُطْفَةُ کہا جاتا ہے۔ اسی

سے صَبِيٌّ مُنْطَفٌ ہے یعنی وہ لڑکا جس نے کانوں میں

موتی پہنے ہوئے ہوں۔

النُّطْفُ كُتُّ کے معنی ڈول کے ہیں اس کا واحد بھی نُطْفَةُ ہی

آتا ہے اور لَيْلَةُ نَطُوفٍ کے معنی برسات کی رات کے

ہیں جس میں صبح تک متواتر بارش ہوتی رہے۔

النَّاطِفُ: سیال چیز کو کہتے ہیں۔ اسی سے نَاطِفٌ بمعنی

شکرینہ ہے اور فُلَانٌ مُنْطَفٌ الْمَعْرُوفُ کے معنی

ہیں۔ فلاں اچھی شہرت کا مالک ہے۔ اور فُلَانٌ يَنْطِفُ

بِسُوءٍ کے معنی برائی کے ساتھ آلودہ ہونے کے ہیں۔

جیسا کہ فُلَانٌ يَنْدِي بِهٖ کا محاورہ ہے۔

## (ن ط ق)

عرف میں نُطْقُ ان أصوات مَقْطَعَةٌ: کو کہا

اور آیت کریمہ:

جاتا ہے۔ جو زبان سے نکلتی ہیں۔ اور کان انہیں سن کر محفوظ

کر لیتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:- ﴿مَا لَكُمْ لَا

تَنْطَفُونَ﴾ (۳۷-۹۲) تمہیں کیا ہوا کہ تم بولتے نہیں۔

یہ لفظ بالذات صرف انسان کے متعلق بولا جاتا ہے

دوسرے حیوانات کے لیے بالبعث استعمال ہوتا ہے۔ جیسے

أَلْمَالُ النَّاطِقُ وَالصَّامِتُ کا محاورہ ہے جس میں

ناطق سے حیوان اور صامت سے سونا چاندی مراد ہے۔

ان کے علاوہ دیگر حیوانات پر ناطق کا لفظ مقید یا بطور تشبیہ

استعمال ہوتا ہے۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے ﴿

(۳۰-۴) عَجِبْتُ لَهَا أَنِّي يَكُونُ غِنَاؤُهَا

فَصِيحًا وَلَمْ تَفْخَرْ لِمَنْطِقِهَا فَمَا

مجھے تعجب ہوا کہ وہ کتنا فصیح گانا گاتی ہے حالانکہ اس نے

گویائی کے لیے منہ نہیں کھولا۔

اہل منطق قوتِ گویائی کو نطق کہتے ہیں۔ جب وہ انسان کی

تعریف کرتے ہوئے الْحَيُّ النَّاطِقُ ..... کہتے ہیں تو

ناطق سے ان کی یہی مراد ہوتی ہے۔

معلوم ہوا کہ نطق کا لفظ مشترک ہے جو قوتِ نطقیہ اور کلام

ملفوظ دونوں پر بولا جاتا ہے۔ کبھی نَاطِقُ کے معنی الدَّالُّ

عَلَى الشَّيْءِ کے بھی آتے ہیں اسی بنا پر ایک حکیم سے

پوچھا گیا کہ النَّاطِقُ الصَّامِتُ کے کہتے ہیں؟ تو اس

نے جواب دیا: الدَّلَائِلُ الْمُخْبِرَةُ وَالْعَبْرُ

الْوَاعِظَةُ۔

① قاله حميد بن ثور يصف حمامة وفي لسان العرب (فخر) بمنطقها بدل لمنطقها والبيت من شواهد الكشف (۱۱۹)

والكامل (۸۴۹) في ثمانية أبيات والحصري (۱: ۲۷۱) في عشرة والبلداني (۱: ۱۱۱) في

۱۳۸ بيت والوسيط (۱۲۸-۱۲۹) والسمط (۳۸۲) في خمسة والامالي (۱: ۱۳۹) والوحشيات (۳۱۷) في سبعة

والمحاضرات للمؤلف (۲: ۲۶۶) وادب الكتاب (۲۳) ونزار الازهار ۷۸ والخزانة (۱: ۱۷/۴/۲۹۹) والحيوان (۳: ۱۹۸)



کریمہ:- ﴿وَقَالُوا لَجُودُوهُمْ لَمْ شَهِدْتُمْ عَلَيْنَا قَالُوا أَنْطَقَنَا اللَّهُ الَّذِي أَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ﴾ (۲۱-۲۲) اور وہ اپنے چڑوں یعنی اعضاء سے کہیں گے کہ تم نے ہمارے خلاف کیوں شہادت دی؟ وہ کہیں گے: جس خدا نے سب چیزوں کو نطق بخشا اسی نے ہم کو بھی گویائی دی۔

کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ نطق صوتی مراد ہے اور بعض نے نطق اعتباری مراد لیا ہے۔ اور عالم آخرت کی اصل حقیقت تو خدا ہی جانتا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ نطق درحقیقت لفظ کو کہتے ہیں۔ کیونکہ وہ معنی کو لپیٹنے اور محصور کرنے میں بمنزلہ نطق کے ہوتا ہے۔

الْمُنْطَقُ وَالْمُنْطَقَةُ: کمر بند کو کہتے ہیں اور شاعر کے قول

(۴۳۱) وَأَبْرَحُ مَا آدَامَ اللَّهُ قَوْمِي

بِحَمْدِ اللَّهِ مُنْطَقًا مُجِيدًا

جب تک میری قوم زندہ ہے، میں بحمد اللہ عمدہ گو شاعر رہوں گا۔ میں بعض نے کہا ہے مُنْطَقًا کے معنی جابجا کے ہیں یعنی گھوڑے کو آگے سے پکڑ کر کھینچتا رہوں گا اور اس پر سوار نہیں ہوں گا۔ ہاں اگر اس معنی میں کوئی دوسرا شعر نہ آیا ہو تو یہاں مغطق سے مراد وہ شخص بھی ہو سکتا ہے جس نے کمر پر نطق باندھا ہوا ہو۔ جیسا کہ مقلہ مشہور ہے

وَمَنْ يَطْلُ ذَيْلُ أَبِيهِ يَنْطَقُ بِهِ لَعْنِي جَسَدِي

﴿لَقَدْ عَلِمْتَ مَا هُوَ إِلَّا يَنْطِقُونَ﴾ (۲۱-۲۲) کہ تم جانتے ہو یہ بولتے نہیں۔

میں اس بات کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے۔ کہ وہ ذوی النطق اور ذوی العقول کی جنس سے نہیں ہیں۔ اور آیت کریمہ:-

﴿أَنْطَقَنَا اللَّهُ الَّذِي أَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ﴾ (۲۱-۲۲) جس خدا نے سب چیزوں کو نطق بخشا اس نے ہم کو بھی گویائی دی۔

کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ نطق اعتباری مراد ہے کیونکہ یہ بات بالکل بدیہی ہے کہ تمام چیزیں حقیقتاً ناطق نہیں ہیں۔ اور آیت کریمہ:- ﴿عَلِمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ﴾ (۱۶-۲۷) ہمیں (خدا کی طرف سے)

جانوروں کی بولی سکھائی گئی ہے۔ میں پرندوں کی آواز کو شخص حضرت سلیمان علیہ السلام کے لحاظ سے نطق کہا ہے کیونکہ وہ ان کی آوازوں کو سمجھتے تھے اور جو شخص کسی چیز سے کوئی معنی سمجھتا ہو تو وہ چیز خواہ صامت ہی کیوں نہ ہو۔ اس کے لحاظ سے تو ناطق کا حکم رکھتی ہے۔ اور آیت کریمہ:-

﴿هَذَا كِتَابُنَا يَنْطِقُ عَلَيْكُمْ بِالْحَقِّ﴾ (۲۹-۳۵) یہ ہماری کتاب تمہارے بارے میں سچ سچ بیان کر دے گی۔

میں کتاب کو ناطق کہا ہے لیکن اس کے نطق کا ادراک صرف آنکھ ہی کر سکتی ہے۔ جیسا کہ کلام بھی ایک کتاب ہے۔ لیکن اس کا ادراک حاسہ سماعت سے ہوتا ہے۔ اور آیت

① قاله خدش بن زهير وفي اللسان (نطق) على الاعداد بدل بحمد الله وفي ديوانه رهطى بدل قومي والبيت من شواهد ابى عبيدة في مجازة (۳۱۶: ۱) رقم ۳۶ والعينى (۶۴: ۲)

② وفي رواية "هن ابية" بدل ذيل ابية (نطق) وفي اللسان (ابى) ابراهيم وانظر للمثل للسان (نطق) وجمهرة الامثال (۱۸۷) ومجمع الامثال (۲۵۶: ۲) والفاقي (۳۱: ۱) والمشكل للقبتي ۶۴ والحيوان للحافظ (۴۲: ۳) والعيون في مقدمته ۱۲۔

نَظَرْتُ فِي كَذَا کے معنی کسی چیز میں غور کرنے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:-

﴿فَنَظَرَ نَظْرَةً فِي النُّجُومِ فَقَالَ إِنِّي سَقِيمٌ﴾ (۳۷-۸۸، ۸۹) تب انہوں نے ستاروں کی طرف ایک

نظر کی اور کہا میں تو بیمار ہوں۔ اور آیت کریمہ:-  
﴿أَوَلَمْ يَنْظُرُوا فِي مَلَكُوتِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ﴾ (۷-۱۸۵) کیا انہوں نے آسمان اور زمین کی بادشاہت میں..... نظر نہیں کی۔

میں آسمان و زمین کی خلقت میں جو جو حکمتیں مضمحل ہیں۔ ان پر فکر و تامل کی ترغیب دی گئی ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں کی طرف نظر کرنے سے ان پر احسان اور لطف کرنا مراد ہوتا ہے۔ اور کفار کی طرف نظر نہ کرنے کے معنی ان سے لطف و کرم اور افاضہ انعامات کو روک لینے کے ہوتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا:-

﴿وَلَا يَكْلَمُهُمُ اللَّهُ وَلَا يَنْظُرُ إِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيَمَةِ﴾ (۳-۷۷) ان سے خدا نہ تو کلام کرے گا اور نہ قیامت کے روز ان کی طرف دیکھے گا اور آیت کریمہ:-

﴿كَأَلَا إِنَّهُمْ عَنْ رَبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَمَحْجُوبُونَ﴾ (۸۳-۱۵) بے شک یہ لوگ اس روز اپنے پروردگار کے

دیدار سے اوٹ میں ہوں گے۔ بھی اس معنی پر محمول ہے۔ اور اَلنَّظَرُ بمعنی انتظار بھی آجاتا ہے۔ چنانچہ نَظَرْتُهُ وَاَنْتَظَرْتُهُ دونوں کے معنی انتظار کرنے کے ہیں۔ جیسے فرمایا:-

﴿وَاَنْتَظِرُوا إِنَّا مُنْتَظِرُونَ﴾ (۱۱-۱۲۲) اور (نتیجہ اعمال کا) تم بھی انتظار کرو۔ ہم بھی انتظار کرتے ہیں۔

﴿فَهَلْ يَسْتَظِرُونَ إِلَّا مِثْلَ أَيَّامِ الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ

کے فرزند زیادہ ہوں گے۔ تو وہ ان کی وجہ سے طاقت ور اور توانا ہو جائے گا۔

اور بعض نے کہا ہے کہ مُنْتَظِقُ کے معنی عہدگو کے ہیں۔

## (ن ظ ر)

اَلنَّظَرُ کے معنی کسی چیز کو دیکھنے یا اس کا ادراک کرنے کے لیے آنکھ یا فکر کو جولانی دینے کے ہیں۔ پھر کبھی اس سے محض غور و فکر کرنے کا معنی مراد لیا جاتا ہے اور کبھی اس معرفت کو کہتے ہیں۔ جو غور و فکر کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ محاورہ ہے: نَظَرْتُ فَلَمْ تَنْظُرْ تو نے دیکھا لیکن غور نہیں کیا۔ چنانچہ آیت کریمہ:-

﴿قُلْ اَنْظُرُوا مَا ذَا فِي السَّمَوَاتِ﴾ (۱۰-۱۱) ان کفار سے کہو کہ دیکھو تو آسمانوں اور زمین میں کیا کیا کچھ ہے۔ میں اَنْظَرُوا کے معنی غور کرنے کے ہیں۔ اگرچہ کچھ عوام کے نزدیک زیادہ تر نظر کا لفظ روایت بصری کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ لیکن خواص کے نزدیک یہ عام طور پر بصیرت کے معنی میں آتا ہے۔ جیسے فرمایا:-

﴿وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ اِلَى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ﴾ (۷۵-۲۲، ۲۳) اس روز بہت سے منہ رونق دار ہوں گے

اور اپنے پروردگار کے محو دیدار ہوں گے۔

نَظَرْتُ اِلَى كَذَا کے معنی کسی چیز کی طرف نظر اٹھانے کے ہیں۔ خواہ وہ نظر آئے یا نہ آئے۔ اور نَظَرْتُ فِيْهِ کا معنی کسی چیز کو دیکھ کر اس میں غور کرنے کے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔

﴿اَفَلَا يَنْظُرُونَ اِلَى الْاِبْلِ كَيْفَ خُلِقَتْ﴾ (۸۸-۱۷) کیا یہ لوگ اونٹوں کی طرف نہیں دیکھتے کہ

کیسے (عجیب) پیدا کیے گئے ہیں۔

مہلت نہیں ملتی۔

﴿قَالَ أَنْظِرْنِي إِلَى يَوْمٍ يُبْعَثُونَ قَالَ إِنَّكَ مِنَ الْمُنظَرِينَ﴾ (۸۵، ۸۴، ۸۳) اس نے کہا کہ مجھے اس دن تک مہلت عطا فرماؤ جس دن لوگ قبروں سے اٹھائے جائیں گے۔ فرمایا (اچھا) ﴿فَكَيِّدُونِي جَمِيعًا ثُمَّ لَا تُنْظَرُونَ﴾ (۵۵-۱۱) تجھ کو مہلت دی جاتی ہے میرے بارے میں جو تدبیر (کرنی چاہو) کر لو اور مجھے مہلت نہ دو۔ ﴿لَا يَنْفَعُ الَّذِينَ كَفَرُوا إِيْمَانُهُمْ وَلَا هُمْ يُنْظَرُونَ﴾ (۲۹-۳۲) کہ کافروں کو ان کا ایمان لانا کچھ فائدہ نہیں دے گا اور نہ ان کو مہلت دی جائے گی۔

﴿فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَاءُ وَالْأَرْضُ وَمَا كَانُوا مُنْظَرِينَ﴾ (۲۹-۳۲) پھر ان پر نہ تو آسمان و زمین کو رونا آیا اور نہ ان کو مہلت ہی دی گئی۔ یہاں ان سے انظار کی نفی کر کے اس معنی کی طرف اشارہ فرمایا ہے جس پر کہ آیت کریمہ: ﴿فَإِذَا جَاءَ أَجْلُهُمْ لَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ﴾ (۲۳-۴) جب وہ وقت آ جاتا ہے تو نہ تو ایک گھڑی دیر کر سکتے ہیں اور نہ جلدی۔ میں متنبہ کیا ہے۔ اور آیت کریمہ:-

﴿رَبِّ ارْنِي أَنْظِرَ إِلَيْكَ﴾ (۱۳۳-۴) اے میرے پروردگار! مجھے جلوہ دکھا کہ میں تیرا دیدار (بھی) کروں۔ کی کچھ تشریح پہلے گزر چکی ہے۔ اور اس کے حقائق پر مفصل بحث اس کے بعد دوسری کتاب (تفسیر القرآن) میں بیان ہوگی۔

اور انظر کا لفظ کسی معاملہ میں متحیر ہونے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا:-

﴿فَاخَذْتُكُمُ الصُّعِقَةَ وَأَنْتُمْ تَنْظَرُونَ﴾

﴿قَبْلَهُمْ قُلٌ فَانْتَظِرُوا إِنِّي مَعَكُمْ مِنَ الْمُنْتَظَرِينَ﴾ (۱۰۲-۱۰) سو جیسے برے دن ان سے پہلے لوگوں پر گزر چکے ہیں اسی طرح کے دنوں کے یہ منتظر ہیں۔ کہہ دو کہ تم بھی انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتا ہوں۔

﴿انْظَرُونَا نَقْتَسِبْ مِنْ نُورِكُمْ﴾ (۱۳-۵۷) کہ ہماری طرف نظر شفقت کیجیے۔ کہ ہم بھی تمہارے نور سے روشنی حاصل کریں۔

﴿إِلَى طَعَامٍ غَيْرَ نَظِيرٍ إِنَاهُ﴾ (۵۳-۳۳) کھانے کے لیے..... اور اس کے کپنے کا انتظار بھی نہ کرنا پڑے۔

﴿فَنَاطِرَةٌ بِمَ يَرْجِعُ الْمُرْسَلُونَ﴾ (۳۵-۲۷) اور دیکھتی ہوں کہ قاصد کیا جواب لاتے ہیں۔ ﴿هَلْ يَنْظَرُونَ إِلَّا السَّاعَةَ أَنْ تَأْتِيَهُمْ بَغْتَةً وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ﴾ (۶۶-۳۳) یہ صرف اس بات کے منتظر ہیں کہ قیامت ان پر ناگہاں آ موجود ہو۔ اور ان کو خبر تک

نہ ہو۔ [www.KitaboSunnat.com](http://www.KitaboSunnat.com)

﴿هَلْ يَنْظَرُونَ إِلَّا أَنْ يَأْتِيَهُمُ اللَّهُ فِي ظُلَلٍ مِنَ الْغَمَامِ وَالْمَلَائِكَةُ﴾ (۲۱-۷۲) کیا یہ لوگ اس بات کے منتظر ہیں کہ ان پر خدا (کا عذاب) بادل کے سائبانوں میں آ نازل ہو اور فرشتے بھی (اتر آئیں)

﴿وَمَا يَنْظَرُ هُوَ إِلَّا صَيْحَةً وَاحِدَةً﴾ (۱۵-۵۸) اور یہ لوگ تو صرف ایک آواز کا انتظار کرتے

ہیں۔

اور انظر تہ کے معنی آخرتہ یعنی مؤخر کرنے اور مہلت دینے کے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:- ﴿وَمَا كَانُوا إِذَا مُنْظَرِينَ﴾ (۸-۱۵) اور اس وقت ان کو

قول ﴿الرل﴾

(۴۲۳) نَظَرَ الدَّهْرُ إِلَيْهِمْ فَابْتَهَلَ

میں اشارہ پایا جاتا ہے کہ زمانہ نے خیانت کی اور انہیں ہلاک کر ڈالا۔

اور حَسْبُ نَظَرٍ اس قوم کو کہتے ہیں۔ جو ایک دوسرے کے اس قدر قریب فروکش ہوں کہ ان کے خیمے آمنے سامنے نظر آتے ہوں۔ اور آبادی میں اسی قسم کے قرب سے حدیث میں کفار سے دور رہنے کا حکم دیتے ہیں فرمایا ﴿

(۱۳۰)

لَا يُتْرَأُ نَارَاهُمَا کہ مسلمان کفار سے اتنی دور ہوں کہ ایک دوسرے کی آگ نظر نہ آئے۔ اور نظیر کے معنی ہم مثل کے ہیں۔ اصل میں نظیر بمعنی مُنَظَّرٌ ہے گویا ایک دوسرے کو دیکھ کر باہم موازنہ کرتے ہیں۔

وَبِهَ نَظْرَةٍ (وہ آسیب زدہ ہے) شاعر نے اسی معنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے ﴿

(۴۲۳) وَقَالُوا بِهِ مِنْ أَعْيُنِ الْجِنِّ نَظْرَةٌ

اور لوگوں نے کہا ہے کہ یہ آسیب زدہ ہے۔ اور اسے کسی جن کی نظر لگی ہوئی ہے۔

الْمُنَظَّرَةُ کے معنی مباحثہ یعنی بحث و نظر میں باہم مقابلہ کرنے اور ہر ایک کے اپنی رائے علی وجہ البصيرة ظاہر کرنے کے ہیں۔ اور نَظَرٌ کے معنی بحث کرنا بھی آتے ہیں۔ اور قیاس سے عام ہے کیونکہ ہر قیاس کو نَظَرٌ کہہ

(۵۵-۲) تَوْتَمَّ كَوْنُكِي نِي آگھیر اور تم دیکھ رہے تھے۔

﴿وَتَرَاهُمْ يَنْظُرُونَ إِلَيْكَ وَهُمْ لَا يُبْصِرُونَ﴾

(۱۹۸-۷) آنکھیں کھولے تمہاری طرف دیکھ رہے ہیں۔ مگر (در اصل) کچھ نہیں دیکھتے۔ نیز فرمایا: ﴿وَتَرَاهُمْ يُعْرَضُونَ عَلَيْهَا خَاشِعِينَ مِنَ الدَّلِيلِ يَنْظُرُونَ مِنْ طَرْفٍ خَفِيٍّ﴾ (۴۵-۲۲) اور تم ان کو دیکھو گے کہ دوزخ کے سامنے لائے جائیں گے۔ ذلت سے عاجزی کرتے ہوئے چھپی (اور نیچی) نگاہ سے دیکھ رہے ہوں گے۔

﴿وَمِنْهُمْ مَّنْ يَنْظُرُ إِلَيْكَ أَفَأَنْتَ تَهْدِي الْعُمْىَ وَلَوْ كَانُوا لَا يُبْصِرُونَ﴾ (۴۳-۱۰) اور بعض ایسے ہیں کہ تمہاری طرف دیکھتے ہیں۔ تو کیا تم اندھوں کو راستہ دکھاؤ گے۔ اگر کچھ بھی دیکھتے (بھالتے) نہ ہوں۔

ان تمام آیات میں نَظَرٌ کے معنی حیرت زدہ ہو کر دیکھنے کے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ اس طرح دیکھنا بے معنی ہوتا ہے۔ اور آیت کریمہ:-

﴿وَأَعْرَفْنَا آلَ فِرْعَوْنَ وَأَنْتُمْ تَنْظُرُونَ﴾ (۵۰-۲) اور فرعون کی قوم کو غرق کر دیا اور تم دیکھ ہی تو رہے تھے۔

میں بعض نے تَنْظُرُونَ کے معنی مشاہدہ کے لکھے ہیں۔ اور بعض نے عبرت حاصل کرنے کے۔ اور شاعر کے

① قاله لييد وصدرة۔ "فی قروم سادة من قومه" انظر ديوانه، ۱۷ (طبعة ليدن (۱۸۹۱ء) والطبرسي (۲۸۰۳) وقد مر في ابهل)

② اخبرجه النسائي وابوداؤد وقد مر تخريجه، في (راءى)

③ نسبہ صاحب مصارع العاشق (۱۲۹-۱۳۰) برواية ابن الاعرابي الى مجنون بنی عامر وتمامه..... ولو عقلا قالوا به اعين الانس وفي محاضرات المؤلف (۸۶:۳) عجزه: ولو صدقوا قالوا به نظرة الانس وقيله: وجاء اليه بالتعاويد والرقى وصوبا عليه الماء من الم النكس۔

سکتے ہیں لیکن ہر نظر قیاس نہیں ہوتی۔

### (ن ۴ ج)

النَّعْجَةُ کی جمع نَعَجَاتُ آتی ہے اور اس کا اطلاق بھیڑ، نیل گاؤ اور پہاڑی بکریوں میں سے مادینہ پر ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے۔

﴿إِنَّ هَذَا أَخِي لَهُ تِسْعٌ وَتِسْعُونَ نَعْجَةً وَلِيَّ نَعْجَةً وَاحِدَةً﴾ (۲۳-۳۸) یہ میرا بھائی ہے اس کے ہاں ننانوے دنبیاں ہیں اور میرے پاس ایک دنبی ہے۔ نَعَجَ الرَّجُلُ: بھیڑ کا گوشت کھانے سے بد بڑھی ہونا۔ أَنْعَجَ الرَّجُلُ: موٹی بھیڑوں کا مالک ہونا۔ النَّعْجُ کے معنی سپیدی یا سپید ہونے کے ہیں اور أَرْضٌ نَاعِجَةٌ نرم زمین کو کہتے ہیں۔

### (ن ۴ س)

النُّعَاسُ کے معنی اونگھ یا ہلکی سی نیند کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿إِذْ يُغَشِّبُكُمُ النُّعَاسُ﴾ (۸-۱۱) جب اس نے..... تمہیں نیند کی چادر اڑھا دی۔

﴿أَمْسَنَ نُّعَاسًا﴾ (۱۵۳-۳) تسلی..... یعنی نیند بعض نے کہا ہے کہ یہاں نُعَاسُ سے مراد سکون اور اطمینان ہے اور یہ آنحضرت ﷺ کے قول مبارک کی طرف اشارہ ہے

① (۱۳۱)

((طَوْبَى لِكُلِّ عَبْدٍ نَوْمًا)) کہ ہر باسکون آدمی کے لیے خوشخبری ہے۔

### (ن ۴ ق)

نَعَقَ الرَّاعِي بِصَوْتِهِ کے معنی چرواہے کے

چلانے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:-

﴿كَمَثَلِ الَّذِينَ يَنْتَعِقُونَ بِمَا لَا يَسْمَعُونَ إِلَّا دُعَاءَ وَتَدَاً﴾ اس کی مثال اس شخص کی سی ہے۔ جو کسی ایسی چیز کو آواز دے جو پکار اور آواز کے سوا کچھ نہ سن سکے۔

### (ن ۴ ل)

النَّعْلُ کے معنی جوتا کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:-

﴿فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ إِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طَوًى﴾ (۱۲-۲۰) تو اپنا جوتا..... اتار دو تم یہاں پاک میدان یعنی طویٰ میں ہو۔

اور تشبیہ کے طور پر گھوڑے کے سم کی حفاظت کے لیے جو چڑایا لوہا لگایا جاتا ہے اسے بھی نعل الفرس کہتے ہیں۔ اسی طرح نیام ششیر کے بائیں جانب جو لوہا لگایا جاتا ہے اسے نعل السیف کہا جاتا ہے۔ فَرَسٌ مُنْعَلٌ وہ گھوڑا جس کے رُسغ کے نیچے بالوں پر سفید نشان ہو۔

اور پاپوش پوش کو نَاعِلٌ وَ مُنْعَلٌ کہا جاتا ہے اور کبھی اس سے مالدار آدمی بھی مراد لیا جاتا ہے۔ جیسا کہ الْحَافِي سے مراد فقیر ہوتا ہے۔

### (ن ۴ م)

النِّعْمَةُ: اچھی حالت کو کہتے ہیں۔ اور یہ فِعْلَةٌ کے وزن پر ہے جو کسی حالت کے معنی کو ظاہر کرنے کے لیے آتا ہے۔ جیسے جِلْسَةٌ وَ رِجْبَةٌ۔ وغیر ذالک اور نِعْمَةٌ کے معنی تَنَعُّم یعنی آرام آسائش ہیں اور یہ فِعْلَةٌ کے وزن پر ہے۔ جو مرۃ لیے استعمال ہوتا ہے جیسے ضَرْبَةٌ وَ شَتْمَةٌ اور نِعْمَةٌ کا لفظ اسم جنس سے جو قلیل و کثیر کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں

﴿وَفِي جَنَّتِ النَّعِيمِ﴾ (۱۲-۵۶) نعمتوں کی بہشت میں۔

﴿جَنَّتِ النَّعِيمِ﴾ (۸-۲۱) نعمت کے باغ میں۔  
تَنَعَّمَ کے معنی خوش حال ہونے اور عیش و عشرت کی زندگی بسر کرنے کے ہیں اور نَعْمَہ کے معنی کسی کو آسودہ حال بنانے کے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿فَاكْرَمَهُ وَنَعَّمَهُ﴾

(۵-۸۹) اسے عزت دیتا اور نعمت بخشتا ہے۔

طَعَامٌ نَّاعِمٌ: (عمدہ کھانا) جَارِيَةٌ نَّاعِمَةٌ: نازک اندام لڑکی۔ اور النَّعَمُ کا لفظ خاص کر اونٹوں پر بولا جاتا ہے۔ اور اونٹوں کو نَعَمٌ اس لیے کہا گیا ہے کہ وہ عرب کے لیے سب سے بڑی نعمت تھے اس کی جمع اَنْعَامٌ آتی ہے۔ لیکن اَنْعَام کا لفظ بھیڑ بکری اونٹ اور گائے سب پر بولا جاتا ہے۔ مگر ان جانوروں پر اَنْعَامٌ کا لفظ اس وقت بولا جاتا ہے۔

جب اونٹ بھی ان میں شامل ہوں۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿جَعَلَ لَكُم مِّنَ الْفُلْكِ وَالْأَنْعَامِ﴾ (۱۲-۴۳) اور تمہارے لیے کشتیاں اور چار پائے بنائے۔ ﴿وَمِنَ الْأَنْعَامِ حَمُولَةٌ وَفَرَشَاتٌ﴾ (۶-۱۴۱) اور چار پایوں میں بوجھ اٹھانے والے (یعنی بڑے بڑے بھی) پیدا کیے اور زمین سے لگے ہوئے (یعنی چھوٹے چھوٹے بھی)۔ اور آیت کریمہ: ﴿فَاخْتَلَطَ بِهِ نَبَاتُ الْأَرْضِ مِمَّا يَأْكُلُ النَّاسُ وَالْأَنْعَامُ﴾ (۱۰-۲۴) پھر اس کے ساتھ سبزہ جسے آدمی اور جانور کھاتے ہیں۔ مل کر نکلا۔

میں اَنْعَام کا لفظ عام ہے۔ جو تمام جانوروں کو شامل ہے۔ نَعَامی۔ جنوبی ہوا جو زمی سے چل رہی ہو۔ اور شتر مرغ

ہے: ﴿وَإِنْ تَعُدُّوا نِعْمَتَ اللَّهِ لَا تَحْصُوهَا﴾ (۳۴-۱۳) اور اگر خدا کے احسان گننے لگو تو شمار نہ کر سکو۔ ﴿اذْكُرُوا نِعْمَتِيَ الَّتِي أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ﴾ (۲-۴۰) میرے وہ احسان یاد کرو جو میں نے تم پر کیے ﴿وَأَتَمَّمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي﴾ (۵-۴) اور میں نے اپنی نعمتیں تم پر پوری کر دیں۔

﴿فَانْقَلَبُوا بِنِعْمَةِ اللَّهِ﴾ (۳-۷۱) پھر خدا کی نعمتوں کے ساتھ واپس آئے۔ وَغَيْرَ ذَلِكَ الْأَنْعَامِ (افعال) کے معنی دوسروں پر احسان کرنے کے ہیں۔ اور یہ لفظ صرف اسی وقت استعمال ہوتا ہے۔ جب مُنْعَمٌ علیہ ذوی العقول سے ہو لہذا اَنْعَمَ فُلَانٌ عَلَى فَرَسِهِ کہنا درست نہیں ہے۔ قرآن پاک میں ہے:-

﴿أَنْعَمْتُ عَلَيْهِمْ﴾ (۶-۱) جن پر تو اپنا فضل و کرم کرتا رہا۔

﴿وَإِذْ تَقُولُ لِلَّذِي أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِ وَأَنْعَمْتَ عَلَيْهِ﴾ (۳۳-۳۷) اور جب تم اس شخص سے جس پر خدا نے احسان کیا اور تم نے بھی احسان کیا یہ کہتے تھے۔ ﴿إِنْ هُوَ إِلَّا عَبْدٌ أَنْعَمْنَا عَلَيْهِ﴾ (۴۳-۵۹) وہ تو ہمارے ایسے بندے تھے جن پر ہم نے فضل کیا تھا۔ اَللَّعْمَاءُ یہ ضراء کے مقابلہ میں آتا ہے۔

چنانچہ قرآن پاک میں ہے:-

﴿وَلَئِنْ أَذَقْنَاهُ نِعْمَاءَ بَعْدَ ضَرَاءٍ مَّسْتَةٍ﴾ (۱۱-۱۰) اور اگر تکلیف پہنچنے کے بعد آسائش کا مزہ چکھائیں۔

اور نَعْمی بوسنی کے مقابلہ میں استعمال ہوتا ہے اور نَعِيم کے معنی نِعْمَةٌ کَثِيرَةٌ کے ہیں۔ چنانچہ فرمایا:

کرنے والوں کا بدلہ بہت اچھا ہے۔  
﴿وَنِعْمَ الْمَوْلَىٰ وَنِعْمَ النَّصِيرُ﴾ (۸-۳۰) وہ خوب  
حمایتی اور خوب مددگار ہے۔  
﴿وَالْأَرْضُ قَرَشْنَهَا فَنِعْمَ الْمِهْدُونَ﴾  
(۵۱-۲۸) اور زمین کو ہم ہی نے بچھایا تو (دیکھو ہم) کیا  
خوب بچھانے والے ہیں۔  
﴿إِنْ تُبْدُوا الصَّدَقَاتِ فَنِعِمَّا هِيَ﴾ (۲-۲۷۱) اگر  
تم خیرات ظاہر دو تو وہ بھی خوب ہے۔

اور محاورہ ہے:-  
إِنْ فَعَلْتَ كَذَا فِيهَا وَنِعِمَّتْ: اگر تم نے ایسا کیا تو  
خوب کیا اور یہ اچھی عادت ہے۔  
غَسَلْتُهُ غَسْلًا نَعِيمًا: میں نے اسے اچھی طرح دھویا۔  
فَعَلَ كَذَا وَآنَعَمَ: اس نے فلاں کام کیا اور خوب کیا۔ نَعَمَ  
اللَّهُ بِكَ عَيْنًا: اللہ تعالیٰ تمہاری آنکھیں ٹھنڈی کرے یا  
تمہاری وجہ سے دوسروں کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں۔  
نَعَمَ: یہ کلمہ ایجاب ہے اور لفظ نعمت سے مشتق ہے۔  
اور نَعَمَ وَنُعْمَةً عَيْنٍ وَنُعْمَى عَيْنٍ وَنُعَامَ عَيْنٍ  
وغیرہ (ان سب کا ماخذ نعمت ہی ہے) اور یہ بھی ہو سکتا ہے  
کہ یہ تمام مرکبات آنَعَمَ سے ماخوذ ہوں جس کے معنی نرم  
اور سہل بنانے کے ہیں۔

کو ”نِعَامَةٌ“ کہا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ خلقت میں اونٹ  
کے مشابہ ہوتا ہے۔ اور پہاڑ یا کنوئیں کے اوپر سائباں کے  
مانند بنی ہوئی عمارت جو کہ دور سے شتر مرغ کی طرح  
دکھائی دیتی ہو۔ اس کو بھی نِعَامَةٌ کہا جاتا ہے ❶ نَعَائِمُ  
منازل قمر سے ایک منزل کا نام ہے۔ ❷ جو شتر مرغ کی ہم  
شکل فرض کی گئی ہے..... اور شاعر کے قول ❸ (الکامل)  
(۴۳۴) وَأَبْنُ النَّعَامَةِ عِنْدَ ذَلِكَ مَرَكَبِي  
اور میری سواری میرا گھوڑا ابن نعامة ہوگا۔

میں بعض نے کہا ہے کہ ابن نعامة سے شاعر نے خود اپنے  
پاؤں مراد لیے ہیں۔ اور سرعت رفتاری میں انہیں ابْنِ  
نِعَامَةٍ کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔ کیونکہ نعامة کے معنی باطن  
قدم کے بھی آتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اہل عرب نے  
یہ معنی بھی ابْنِ النِّعَامَةِ کے محاورہ سے ہی اخذ کیا ہے۔  
اور تَنَعَّمَ فُلَانٌ جس کے معنی آہستہ آہستہ چلنے کے ہیں،  
نِعْمَةً سے مشتق ہے۔

نِعْمَ کلمہ مدح ہے جو بِنَسْ فِعْلِ ذِم کے مقابلہ میں  
استعمال ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:-  
﴿وَنِعْمَ الْعَبْدُ إِنَّهُ أَوَّابٌ﴾ (۳۸-۳۰) بہت خوب  
بندے تھے اور (خدا کی طرف) رجوع کرنے والے تھے۔  
﴿فَنِعْمَ أَجْرُ الْعَامِلِينَ﴾ (۳-۱۳۶) اور اچھے کام

❶ انظر المخصص ۱۳۰/۵

❷ ”ہی“ منزلة من منازل القمر بثمانية نجوم أربعة في المجرة وتسمى الواردة وأربعة خارجة تسمى الصادرة (الحيوان ۳۵۱/۴)  
❸ اختلفت الروايات في صدره ونسبته ففي الصحاح (نعم) ومختار الشعر الجاهلي (۳۰۴: ۱) قاله عنترة في سبعة أبيات  
وصدره: فيكون مركب القعود ورحله وكذا في المخصص (۳۰۶/۱۳) والحكم والعقد ۳۵ وابن الشجري في حما  
رتبه ۸ واماليه (۲۶۱: ۱) والمعاني للقبتي ۹۰ وفي ذيل الصحاح انه لخززين لوزان وكذا في اللسان (عنتق) وابن خالويه  
والحيوان (۴: ۳۶۳-۳۶۴) مع أربعة آخر وفيه حد جه بدل رحله ويوم ذاك بدل عند ذاك وكتاب الخيل لابن زياد الاعرابي  
(۹۲) يعنى بابن النعمانة فرسا يقال له غراف بن نعامة كانت له كما في الخزانة البغدادية (۱/۳) والبيان للمحافظ  
(۱۷۹/۳) وامالي ابن الشجري (۱: ۳۶۰) والشاعر جاهلي قديم راجع الخزانة والموتلف (۱۰۲) والمعنى البيت انظر  
لمعاني للقبتي ۹۰

## (ن غ ض)

الْإِنْفَاضُ کے معنی دوسرے کے سامنے تعجب

سے سر ہلانے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:-

﴿فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ رُءُوسَهُمْ﴾ (۱۷۱-۱۵۱) تو

تعجب سے تمہارے آگے سر ہلائیں گے۔

نَعَضُ نَعَضَاتًا: کپکپی کے ساتھ سر اور دانت ہلانا۔

الْنَعَضُ: بہت سر ہلانے والا زختر مرغ۔

الْنَعَضُ: کندھے کے کنارے کی پتلی ہڈی

## (ن ف ث)

الْنَفَثُ - کے معنی تھوڑا سا تھوکنے یا تھکانے

کے ہیں۔ اور یہ ثقل (تھوکنے) سے کم درجہ ہوتا ہے۔ اور

افسوس یا جادو کرنے والے کے گندوں پر پڑھ کر پھونکنے کو

بھی نَفَثٌ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:-

﴿وَمِنْ شَرِّ النَّفَثِ فِي الْعُقَدِ﴾ (۱۱۳-۱۲) اور

گندوں پر پڑھ کر پھونکنے والیوں کی برائی سے۔

اور اسی سے الْحَيَّةُ تَنْفُثُ السُّمَّ (سانپ زہر اگلتا ہے)

کا محاورہ ہے مثل مشہور ہے ①

لَوْ سَأَلْتَهُ نَفَاثَةَ سِوَاكَ مَا أَعْطَاكَ اگر تو اس سے

مساواں کا ایک ریزہ بھی طلب کرے تو نہ دے (یعنی وہ

نہایت بخیل ہے) اور نَفَاثَةُ سِوَاكَ اس ریزہ کو کہا جاتا

ہے جو مساواں کرنے سے دانتوں میں رہ جاتا ہے۔ اور

اسے پھینک دیا جاتا ہے۔

① كذا في المعاجم۔

دَمٌ نَفِثٌ: خون جو زخم سے بہہ نکلے۔ مثل مشہور ہے ②۔

لَا بُدَّ لِلْمَصْدُورِ أَنْ يَنْفُثَ درو سینہ کے مریض کو

تھوکنے سے چارہ نہیں۔

## (ن ف ح)

نَفَحَ (ن) نَفْحًا الرِّيحُ: ہوا کا چلنا۔

لَهُ نَفْحَةٌ طَيِّبَةٌ: وہ نچی ہے۔

اور کبھی بطور استعارہ شر کے لیے بھی نَفْحَةٌ کا لفظ استعمال

ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:-

﴿وَلِئِنْ مَسَّتْهُمْ نَفْحَةٌ مِنْ عَذَابِ رَبِّكَ﴾

(۲۱-۲۶) اور اگر ان کو تمہارے پروردگار کا تھوڑا سا

عذاب بھی پہنچے۔

نَفَحَتِ الدَّابَّةُ: جانور کا سم سے مارنا۔

نَفَحَهُ بِالسَّيْفِ: ہلکی سی تلوار مارنا۔

الْنَفْوَخُ (من النوق): وہ اونٹنی جس کے تھنوں سے بغیر

دوہنے کے دودھ نکل پڑے (من النقيس) دور تک تیر

پھینکنے والی کمان۔

أَنْفَحَةُ الْجَدْيِ: بکری کے شیر خوار بچے کے پیٹ سے

ایک زردی چیز نکالتے ہیں۔ اور ایسے پشم کے لٹ میں لپیٹ

کر بکیر کی طرح خشک کر لیتے ہیں عوام اسے مَجَبَّةٌ کہتے

ہیں۔

## (ن ف خ)

الْنَفْخُ کے معنی کسی چیز میں پھونکنے کے ہیں۔

② الا ولى ان يكون بالف الاشباع اى ان ينفثا وقرينه، وللذى فى الصدر ان يبعثا (رسالة ابن القارح الى ابي العلاء المعمرى

الذى احبب عنها فى رسالة خاصة سماها "الغفران" انظر رسائل البلقاء نشر كرد على معرض (٢٦٥) ومثله فى الفائق

(٩: ٢) قال عمر بن عبدالعزيز لعبيد الله بن عبد الله بن عتبة حتى متى تقول الشعر فقال: لا بد للمصدوران بسبلا - وللذى

فى الصدر ان يبعثا ١٢ -



جیسے فرمایا:-

﴿وَيَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّورِ﴾ (۲۷-۸۷) اور جس

دن صور پھونکا جائے گا۔

﴿وَيُنْفَخُ فِي الصُّورِ﴾ (۳۶-۵۱) اور (جس وقت)

صور پھونکا جائے گا۔

﴿ثُمَّ يُنْفَخُ فِيهِ أُخْرَى﴾ (۳۹-۶۸) پھر دوسری دفعہ

پھونکا جائے گا۔

اور یہ ایسے ہی ہے۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا:-

﴿فَإِذَا نُفِرَ فِي النَّاقُورِ﴾ (۷۴-۸) جب صور پھونکا

جائے گا۔

اور اسی سے نَفَخُ الرُّوحِ ہے جس کے معنی اس دنیا میں

کسی کے اندر روح پھونکنے کے ہیں چنانچہ آدم علیہ السلام کے

متعلق فرمایا:-

﴿وَنَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُوحِي﴾ (۱۵-۲۹) اور اس میں

(اپنی بے بہا چیز یعنی) روح پھونک دوں۔ محاورہ ہے:-

إِنْفَخَ بَطْنُهُ: کا پیٹ پھول گیا۔

اور اسی سے بطور استعارہ اِنْفَخَ النَّهَارُ کا محاورہ ہے

جس کے معنی دن کے بلند ہونے کے ہیں۔ اور نَفَخَهُ

الرَّيْبُوعِ کے معنی موسم بہار کی تروتازگی کے ہیں۔ اور

موئے آدمی کو رَجُلٌ مَنفُوحٌ کہا جاتا ہے۔

(ن ف د)

الْإِنْفَادُ: (س) ختم ہو جانا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿إِنَّ هَذَا لَرِزْقُنَا مَا لَهُ مِنْ نَفَادٍ﴾ (۳۸-۵۴) یہ

ہمارا رزق ہے جو کبھی ختم نہیں ہوگا۔

اور اس معنی میں فعل نَفَدَ (س) استعمال ہوتا ہے۔ جیسے

① من حملة وصاياه صلى الله عليه وسلم في مرض موته راجع البخاری۔

مومن سب کے سب نکل آئیں۔ تو یوں کیوں نہیں کیا کہ ہر ایک جماعت میں سے چند اشخاص نکل جاتے۔

نَفَذُوا جَيْشَ أُسَامَةَ کہ جیش اسامہ کو روانہ کر دو۔  
الْمَنْفَذُ باہر نکلنے کا راستہ۔

## (ن ف ر)

الْأَسْتِنْفَارُ: (۱) جنگ کے لیے نکلنے کی ترغیب دینا  
(۲) لوگوں کو لڑائی سے بھاگ جانے پر اکسانا (۳) ڈر کر بھاگ جانا۔ اور آیت کریمہ: ﴿كَانَهُمْ حُمُرٌ مُّسْتَنْفِرَةٌ﴾ (۵۰-۷۴) گویا گدھے ہیں کہ بدک جاتے ہیں۔

النَّفَرُ: (عن) کے معنی کسی چیز سے روگردانی کرنے اور (الی کے ساتھ) کسی کی طرف دوڑنے کے ہیں۔ جیسا کہ فَرَجَ کا لفظ الی اور عن دونوں کے ساتھ استعمال ہوتا ہے۔ محاورہ ہے۔

میں مُسْتَنْفِرَةٌ: اگر کسرہ فاء کے ساتھ پڑھا جائے تو اس کے معنی نَافِرَةٌ یعنی ڈر کر بھاگنے والا کے ہوں گے۔ اور فتح فاء کے ساتھ ہو تو مُنْفَرَةٌ: کے ہم معنی ہوگا یعنی بھگایا ہوا۔  
النَّفَرُ وَالنَّفِيرُ وَالنَّفْرَةُ: بھاگنے والے آدمیوں کا گروہ۔  
الْمُنْفَارَةُ مفاخرۃ میں محاکمہ کرنا۔ اسی سے اُنْفَرَفُ فُلَانٌ ہے جس کے معنی مفاخرۃ میں غالب ہونے کا فیصلہ دیے گئے ہیں۔ مشہور مقولہ ہے۔

نَفَرَ عَنِ الشَّيْءِ نُفُورًا: کسی چیز سے دور بھاگنا۔  
قرآن پاک میں ہے:-

﴿مَا زَادَهُمْ إِلَّا نُفُورًا﴾ (۳۵-۴۲) تو اس سے ان کی نفرت ہی بڑھی۔

﴿وَمَا يَزِيدُهُمْ إِلَّا نُفُورًا﴾ (۱۷-۴۱) مگر وہ اس سے اور بدک جاتے ہیں۔

نَفَرَ إِلَى الْحَرْبِ (ض ن) نَفَرًا: لڑائی کے لیے نکلنا اور اسی سے ذی الحجہ کی بارہویں تاریخ کو یَوْمَ النَّفَرِ کہا جاتا ہے۔ کیوں کہ اس روز حجاج منیٰ سے مکہ معظمہ کو واپس ہوتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:- ﴿انْفِرُوا خِفَافًا وَثِقَالًا﴾ (۹-۴۱) تم سبساہر ہو یا گراں بار (یعنی مال و اسباب تھوڑا رکھتے ہو یا بہت) گھروں سے نکل آؤ۔

﴿لَا تَنْفِرُوا يَعْذِبُكُمْ عَذَابًا أَلِيمًا﴾ (۹-۳۹) اگر نہ نکلو گے تو خدا تم کو بڑی تکلیف کا عذاب دے گا۔  
﴿مَا لَكُمْ إِذَا قِيلَ لَكُمْ انْفِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ﴾ (۹-۳۸) تمہیں کیا ہوا کہ جب تم سے کہا جاتا ہے کہ خدا کی راہ میں (جہاد) کے لیے نکلو۔ ﴿وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُونَ لِيَنْفِرُوا كَافَّةً فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِنْهُمْ طَائِفَةٌ﴾ (۹-۱۲۲) اور یہ تو نہیں سکتا کہ

نَفَرَ الْجَلْدُ: جلد میں ورم ہو جانا۔  
ابو عبید کا قول ہے کہ یہ نَفَارُ الشَّيْءِ عَنِ الشَّيْءِ ہے جس کے معنی ایک چیز کے دوسری سے دور اور الگ ہونے کے ہیں۔

## (ن ف س)

النَّفْسُ کے معنی روح کے آتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا۔ ﴿اٰخِرُ جُؤَا۟نَفْسِكُمْ﴾ (۶۱-۹۳) کہ نکال لو اپنی جانیں۔ ﴿وَاعْلَمُو۟ا۟ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي۟

الْمُؤْمِنُونَ لِيَنْفِرُوا كَافَّةً فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِنْهُمْ طَائِفَةٌ﴾ (۹-۱۲۲) اور یہ تو نہیں سکتا کہ

کو چاہیے کہ اس سے رغبت کریں۔

جیسا کہ دوسرے مقام پر فرمایا:

﴿سَابِقُوا إِلَى مَغْفِرَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ﴾ (۲۱-۵۷)

بندو! اپنے پروردگار کی بخشش کی طرف لپکو۔

النَّفْسُ کے معنی سانس کے ہیں۔ جو منہ اور ناک کے تھنوں

کے ذریعہ بدن کے اندر جاتا اور باہر نکلتا ہے۔ اور یہ روح

کے لیے بمنزلہ غذا کے ہے۔ جس کے انقطاع سے روح

زائل ہو جاتی ہے۔ اور نَفْسُ کے معنی کشائش اور فراخی کے

بھی آتے ہیں اور اسی سے ایک روایت میں ہے۔ ﴿(۱۳۰)

((إِنِّي لَا جِدُّ نَفْسَ رَبِّكُمْ مِّن قَبْلِ الْيَمِينِ)) کہ

میں یمن کی جانب سے کشائش اور فراخی یعنی نصرت الہی

پاتا ہوں (انصار کا یمنی ہونا اس احساس کی تصدیق کے

لیے کافی ہے) اور آنحضرت ﷺ نے فرمایا ﴿(۱۳۱)

((لَا تَسُبُّوا الرِّيحَ فَإِنَّهَا مِّنْ نَّفْسِ الرَّحْمَنِ))

ہوا کو برا بھلا مت کہو۔ بے شک یہ خدائے رحمن کے نفس

سے ہے یعنی اس سے غم دور ہوتا ہے۔ اور دعا میں ہے

﴿(۱۳۲) اَللّٰهُمَّ نَفْسَ عَيْنِيْ اے اللہ! میری تکلیف

دور فرما۔ تَنَفَّسَتِ الرِّيحُ: عمدہ ہوا چلنا۔ شاعر نے کہا

ہے ﴿(الطویل)

﴿(۴۳۵) فَإِنَّ الصَّبَّارِ يَنْحُ إِذَا مَا تَنَفَّسَتْ

أَنفُسِكُمْ فَاحْذَرُوهُ﴾ (۲-۲۳۵) اور جان رکھو جو کچھ

تمہارے دلوں میں ہے خدا کو سب معلوم ہے۔ اور ذیل کی

دونوں آیتوں۔

﴿تَعْلَمُ مَا فِي نَفْسِيْ وَلَا أَعْلَمُ مَا فِي نَفْسِكَ﴾

﴿(۵-۱۱۶) اور جو بات میرے دل میں ہے تو اسے جانتا

ہے۔ اور جو تیرے ضمیر میں ہے میں اسے نہیں جانتا ہوں۔

﴿وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهُ﴾ (۳-۳۰) اور خدا تم کو

اپنے (غضب) سے ڈراتا ہے۔

میں نفس بمعنی ذات ہے اور یہاں نَفْسَهُ کی اضافت

اگرچہ لفظی لحاظ سے مضاف اور مضاف الیہ مغایرہ کو چاہتی

ہے لیکن من حیث المعنی دونوں سے ایک ہی ذات مراد

ہے۔ کیونکہ ذات باری تعالیٰ ہر قسم کی دوئی سے پاک

ہے۔ بعض کا قول ہے کہ ذات باری تعالیٰ کی طرف نفس کی

اضافت اضافتِ ملک ہے۔ اور اس سے ہمارے نفوس

امارہ مراد ہیں، جو ہر وقت برائی پر ابھارتے رہتے ہیں۔

الْمُتَنَافِسَةُ کے معنی نفوسِ فاضلہ کے ساتھ اتصال اور تشبیہ

حاصل کرنے کے لیے..... مجاہدہ نفسانی (نفس کشی) کے

ہیں۔ بدوں اس کے کہ دوسروں کو اس سے ضرر پہنچے۔

قرآن پاک میں ہے: ﴿وَفِيْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ

الْمُتَنَافِسُوْنَ﴾ (۲۶-۸۳) تو (نعمتوں کے) شائقین

① الحديث في الفائق وفي الطبرانی غير ربكم وبهذا اللفظ ذكره صاحب الكشاف وفي رواية نفس الرحمن انظر اللسان (نفس) والمشكل للفتي والغزالي في الاحياء (۲۲۲/۳) قال العراقي في تحريجه اشار به الى اويس القرني ولم اجده اصلا وفي مناقب اهل اليمن احاديث ۱۲۔

② قطعة من الحديث اخرجه، الترمذی فی جامعہ والبيهقي في سننه۔

③ قطعة من الدعاء ابن السني في اليوم والليله (تحفة الذاكرين)۔

④ قالته امرأة نجدية في ثلاثة ابيات ولشعرها قصة راجع القالي (۲: ۱۷۷) وفي محاضرات المؤلف (ر: ۵۵۰) انشده المحسنون في الريح المستطابة وقبله: اجذب ردها او تشف مني حرارة على كبد لم يبق الا رسوما والبيت في اللسان (نسم) بغير عزو۔

إِلَّا بِلِ النَّوْفِشِ: رات کو بغیر چرواہے کے چرنے والے اونٹ۔

### (ن ف ع)

النَّفْعُ: ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس سے خیرات تک رسائی کے لیے استعانت حاصل کی جائے۔ یا وسیلہ بنایا جائے پس نفع خیر کا نام ہے۔ اور اس کی ضد ضرر ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَلَا يَمْلِكُونَ لِنَفْسِهِمْ ضَرًّا وَلَا نَفْعًا﴾ (۳-۲۵) اور نہ اپنے نقصان اور نفع کا کچھ اختیار رکھتے ہیں۔ ﴿قُلْ لَا أَمْلِكُ لِنَفْسِي نَفْعًا وَلَا ضَرًّا﴾ (۷-۱۸۸) کہہ دو کہ میں اپنے فائدے اور نقصان کا کچھ بھی اختیار نہیں رکھتا۔

﴿لَنْ تَنفَعَكُمْ أَرْحَامُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ﴾ (۳-۶۰) نہ تمہارے رشتے ناتے کام آئیں گے اور نہ اولاد۔ ﴿وَلَا تَنفَعُ الشَّفَاعَةُ﴾ (۳۲-۲۳) اور خدا کے ہاں (کسی کے لیے) سفارش فائدہ نہیں دے گی۔ ﴿وَلَا يَنْفَعُكُمْ نُصْحِي﴾ (۱۱-۳۲) تو میری خیر خواہی تم کو کچھ فائدہ نہیں دے سکتی۔ وَغَيْرَ ذَلِكَ مِنْ الْآيَاتِ یعنی اس قسم کی متعدد آیات ہیں۔

### (ن ف ق)

نَفَقَ (ن س) الشَّيْءُ کے معنی کسی چیز کے ختم ہونے یا چلے جانے کے ہیں۔ اور چلے جانے کی مختلف صورتیں ہیں۔ (۱) خوب فروخت ہونے سے جیسے نَفَقَ التَّبَعُ: (سامان) خوب فروخت ہونا۔ اسی سے نَفَاقُ الْآيِسِ ہے جس کے معنی بیوہ عورت سے نکاح کے طلب گاروں کا بکثرت ہونا کے ہیں۔ نفق الْقَوْمُ: بازار کا پر رونق ہونا۔

عَلَى نَفْسٍ مَحْزُونٍ تَجَلَّتْ هُمُومُهَا بے شک باد صبا ایسی ہوا ہے کہ اس کے چلنے سے مغموم دلوں کے تمام غم دور ہو جاتے ہیں۔ اَلنَّفَاسُ کے معنی عورت کے بچہ جننے یا حالت زچگی میں ہونے کے ہیں۔ اور اس عورت کو جو حالت نفاس میں ہو نَفَسَاءُ کہا جاتا ہے اس کی جمع نَفَاسٌ آتی ہے۔ اور صَبِيٌّ مَنفُوسٌ کے معنی نوزائیدہ بچہ کے ہیں۔

تَنَفَّسَ النَّهَارُ: دن کا چڑھنا، دوپہر ہونا۔ قرآن پاک میں ہے۔ ﴿وَالصُّبْحُ إِذَا تَنَفَّسَ﴾ (۸۱-۱۸) اور صبح کی قسم جب نمودار ہوتی ہے۔

اور نَفِيسَتٌ بِكَذَا کے معنی کسی چیز کو عزیز سمجھنے اور اس پر بخل کرنے کے ہیں۔ اور اسی سے نَفِيسٌ وَمَنفُوسٌ بہ اور مُنْفِيسٌ ہے جس کے معنی قیمتی چیز کے ہیں۔

### (ن ف ش)

النَّفْسُ (ن) کے معنی اون دھنکے اور پھیلانے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔ ﴿كَالْعِهْنِ الْمَنفُوسِ﴾ (۵-۱۰۲) جیسے دھنکی ہوئی ہوئی رنگ برنگ کی اون۔

نَفْسُ الْغَنَمِ: (رات کے وقت) بکریوں کا بغیر چرواہے کے (چرنے کے لیے) منتشر ہونا۔ اَلنَّفْسُ: (فتح الفاء اسم) وہ بکریاں جو رات کو بغیر چرواہے کے چرنے کے لیے منتشر ہو گئی ہوں۔ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿إِذْ نَفَسْتُمْ فِيهِ غَمَمُ الْقَوْمِ﴾ (۲۱-۷۸) جس میں کچھ لوگوں کی بکریاں رات کو چر گئیں۔

(۲) بذریعہ مر جانے کے، جیسے نَفَقَتِ الدَّابَّةُ نَفْقًا: جانور کا مرجانا۔

(۳) بذریعہ فنا ہو جانے کے جیسے نَفَقَتِ الدَّرَاهِمُ: درہم خرچ ہو گئے۔ اَنَفَقْتُمَا: ان کو خرچ کر دیا۔

الْاِنْفَاقِ کے معنی مال وغیرہ صرف کرنا کے ہیں۔ اور یہ کبھی واجب ہوتا ہے۔ اور کبھی مستحب اور مال اور غیر مال یعنی علم وغیرہ کے متعلق استعمال ہوتا ہے جیسے فرمایا۔

﴿اَنْفِقُوا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ﴾ (۱۹۳-۲) اور خدا کی راہ میں مال خرچ کرو۔

﴿وَاَنْفِقُوا مِنْ مَّا رَزَقْنَاكُمْ﴾ (۱۰-۶۳) اور جو (مال) ہم نے تم کو دیا ہے اس میں سے..... خرچ کر لو۔

﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ وَ مِمَّا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ﴾ (۹۲-۳)

مومنو! جب تک تم ان چیزوں میں سے جو تمہیں عزیز ہیں (راہ خدا میں) صرف نہ کرو گے کبھی نیکی حاصل نہیں کر سکو

گے۔ اور جو چیز تم صرف کرتے ہو۔ خدا اس کو جانتا ہے۔ ﴿وَمِمَّا اَنْفَقْتُمْ مِنْ شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهُ﴾

(۳۹-۳۴) اور تم جو چیز خرچ کرو گے۔ وہ اس کا (تمہیں) عوض دے گا۔

﴿لَا يَسْتَوِي مِنْكُمْ مَنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ﴾ (۱۰-۵۷) جس شخص نے تم میں سے فتح (مکہ) سے پہلے

خرچ کیا۔ وہ..... برابر نہیں۔ علیٰ ہذا القیاس اس قسم کی بہت سی آیات ہیں۔ اور آیت کریمہ:-

﴿قُلْ لَوْ اَنْتُمْ تَمْلِكُوْنَ خَزَائِنَ رَحْمَةِ رَبِّیْ اِذَا لَا مَسْکُتُمْ خَشِیَةَ الْاِنْفَاقِ﴾ (۱۰۰-۱۷) کہو اگر

میرے پروردگار کی رحمت کے خزانے تمہارے ہاتھ میں ہوتے تو تم خرچ ہو جانے کے خوف سے ان کو بند کر رکھتے۔

میں خَشِیَةُ الْاِنْفَاقِ کے معنی مفلس ہونے کا خوف کے ہیں اور یہ اَنَفَقَ فُلَانٌ کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس

کے معنی مال کے خرچ ہو جانے کے بعد قلاش ہو جانے کے ہیں۔ یہاں اِنْفَاقِ بمعنی اِمْلَاقِ ہے۔ جیسے فرمایا: ﴿وَلَا تَقْتُلُوا اَوْلَادَكُمْ خَشِیَةَ اِمْلَاقٍ﴾ (۳۱-۱۷)

اور اپنی اولاد کو مفلسی کے خوف سے قتل نہ کرو۔ نَفَقَہ (اسم) جو چیز خرچ کی جائے۔ فرمایا:-

﴿وَمَا اَنْفَقْتُمْ مِنْ نَفَقَةٍ﴾ (۲-۲۷۰) اور تم خدا کی راہ میں جس طرح کا خرچ کرو۔

﴿وَلَا يُنْفِقُوْنَ نَفَقَةً﴾ (۱۲۱-۹) اور (اسی طرح) وہ جو خرچ کرتے ہیں۔

اَلنَّفَقُ: آر پار ہونے والا کوچہ یا سرنگ جس کے دونوں منہ کھلے ہوں۔ فرمایا:-

﴿فَاِنْ اَسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِی الْاَرْضِ﴾ (۳۵-۶) اور اگر طاقت، ہو تو زمین میں کوئی سرنگ

ڈھونڈ نکالو۔ اور اسی سے نَافِقَاءُ الْبِرِّ بُوع ہے یعنی جنگلی چوہے کا بل جس کے دودھانے ہوں۔ نَافِقُ الْبِرِّ بُوعُ وَنَفَقَ: جنگلی چوہا اپنے بل کے دہانے سے داخل ہو کر دوسرے سے نکل گئی اور اسی سے نَفَاقٌ ہے۔ جس کے معنی شریعت میں دورخی اختیار کرنے (یعنی شریعت میں ایک دروازے سے داخل ہو کر دوسرے سے نکل جانا) کے ہیں چنانچہ اسی

معنی پر تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا: ﴿اِنَّ الْمُنَافِقِیْنَ فِی الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ﴾ (۱۴۴۰-۳) کچھ شک

کرو۔ (یہ شب خیزی) تمہارے لیے (سبب زیادت  
ثواب اور نماز تہجد تم پر نفل ہے اور آیت کریمہ:-

﴿وَوَهَبْنَا لَهُ إِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ نَافِلَةً﴾ (۷۲-۲۱)

اور ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو اسحاق علیہ السلام عطا کیے اور مستزاد و  
برآں یعقوب علیہ السلام۔

میں نَافِلَةٌ کذا: بھی اسی معنی پر محمول ہے۔ اور یہاں اس سے  
مراد اولاد کی اولاد ہے۔ محاورہ ہے۔

نَفَلْتُهُ كَذَا: میں نے اسے بطور نفل کے دیا۔

نَفَلَهُ السُّلْطَانُ: بادشاہ نے اسے تبرع کے طور پر قتل کا  
سامان وے دیا۔ اَلْتَوَفَّلُ: عطاءے کثیر۔ اِنْتَفَلْتُ مَنْ  
كَذَا: میں نے اس سے چن لیا اِنْتَفَيْتُ مِنْهُ۔

## (ن ق ب)

اَلنَّقَبُ کے معنی دیوار یا چمڑے میں سوراخ  
کرنے کے ہیں اور نَقَبُ کے معنی لکڑی میں سوراخ  
کرنے کے..... محاورہ ہے۔ نَقَبَ الْبَيْتَ سُرَّةَ  
الدَّابَّةِ: بیطار نے جانور کی ناف میں مِنْقَبُ (نشر) کے  
ساتھ سوراخ کر دیا۔

مَنْقَبُ: سوراخ کرنے کی جگہ۔

نَقَبَ الْحَائِطُ: دیوار میں نقب لگائی گئی۔

نَقَبَ الْقَوْمُ: قوم کا چلنا پھرنا۔ قرآن پاک میں ہے:-

﴿فَنَقَّبُوا فِي الْبِلَادِ هَلْ مِنْ مَّجْنُونٍ﴾

(۵۰-۳۶) وہ شہروں میں گشت کرنے لگے کیا کہیں

بھاگنے کی جگہ ہے، كَتَبْتُ نَقِيبُ: کتابت جس کے گلے میں

آواز کمزور کرنے کے لیے سوراخ کر دیا گیا ہو۔

اَلنَّقَبَةُ: ابتدائی خارش۔ ج۔ نَقَبُ

اَلسَّاقِبَةُ: ناسور۔ زخم جو کئی روز تک ایک پہلو پر لیٹے رہنے

نہیں کہ منافق لوگ دوزخ کے سب سے نیچے کے درجہ  
میں ہوں گے۔

نَيَّقُ السَّرَّاءِ نَيْلًا: پا جائے کا نیفہ۔

## (ن ف ل)

اَلنَّفْلُ: بعض کے نزدیک نفل اور غنیمت ایک  
ہی چیز کے دو نام ہیں ان میں صرف اعتباری فرق ہے۔  
اس لحاظ سے کہ وہ فتح کے بعد چھینا ہوا مال ہوتا ہے، اسے  
غنیمت کہا جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا غیر لازم  
ہونے کے لحاظ سے نفل کہلاتا ہے۔

بعض کے نزدیک ان میں نسبت عموم و خصوص مطلق ہے۔  
یعنی غنیمت عام ہے اور ہر اس مال کو کہتے ہیں۔ جو لوٹ  
سے حاصل ہو خواہ مشقت سے ہو یا بلا مشقت کے، فتح  
سے قبل حاصل ہو یا بعد میں استحقاق سے حاصل ہو یا بغیر  
استحقاق کے اور نفل خاص کر اس مال کو کہتے ہیں۔ جو  
غنیمت سے قبل از تقسیم حاصل ہوا ہو۔

بعض کے نزدیک نَفْلٌ وہ مال ہے جو بغیر جنگ کے  
مسلمانوں کے ہاتھ لگ جائے اور اسے فے بھی کہتے  
ہیں۔ اور بعض نے کہا ہے جو سامان وغیرہ تقسیم غنائم کے  
بعد بائنا جاتا ہے۔ اسے نفل کہا جاتا ہے جیسے فرمایا:-

﴿يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْأَنْفَالِ قُلِ الْأَنْفَالُ لِلَّهِ وَالرَّسُولِ﴾ (۸-۱)

(اے محمد ﷺ! مجاہد لوگ) آپ سے غنیمت کے مال کے  
بارے میں دریافت کرتے ہیں۔ (کہ کیا حکم ہے) اصل میں  
اَنْفَالٌ نَفْلٌ سے ہے جس کے معنی واجب پر زیادتی کے ہیں  
اور اسے نَافِلَةٌ بھی کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَمِنْ أَلْيَلٍ فَتَهِجَدُ بِهِ نَافِلَةً لَّكَ﴾ (۷۹-۱۷)

اور بعض حصہ شب میں بیدار ہوا کرو۔ اور تہجد کی نماز پڑھا

نے اپنے خاوند سے کہا۔ مُرْسِي عَلَى بَنِي نَظَرٍ وَلَا  
تَمْرِي عَلَى بَنَاتِ نَقِرٍ۔ کہ مجھے مردوں کے پاس  
لے کر گزرنا جو نظر ڈالتے ہیں۔ اور عورتوں کے پاس سے  
لے کر نہ گزرنا جو عیب لگاتی اور غیبت کرتی ہیں۔

النَّفَرَةُ: (۱) گڑھا جس میں سیلان کا پانی باقی رہ جاتا ہے۔  
(۲) گردن کے پچھلے حصے کے گڑھے کو نَفَرَةُ الْقَفَا کہا  
جاتا ہے۔

النَّفِيرُ: کھجور کی سمٹھلی کے گڑھے کو کہتے ہیں۔ اور یہ حقیر  
چیز کے لیے ضرب المثل ہے چنانچہ قرآن پاک میں ہے:  
﴿وَلَا يَظْلَمُونَ نَقِيرًا﴾ (۱۲۳-۴) اور تل برابر بھی  
حق تلفی نہ کی جائے گی۔

اور النَفِيرُ اس لکڑی کو بھی کہتے ہیں جس میں گڑھا کر کے  
اس میں نیبڈ ڈالتے ہیں کہا جاتا ہے هُوَ كَرِيمُ النَّفِيرِ:  
فلاں شریف الاصل ہے یعنی بعد از تفتیش۔

النَّاقُورُ کے معنی صور یعنی بگل کے ہیں۔ قرآن پاک میں  
ہے: ﴿فَإِذَا نُفِرَ فِي النَّاقُورِ﴾ (۷۴-۸) جب  
صور پھونکا جائے گا۔

نَقَرْتُ الرَّجُلَ: زبان کو تالو سے لگا کر آواز نکال کر کسی  
آدمی کو بلانا۔

نَقَرْتُ الرَّجُلَ: کسی شخص کو جماعت سے خاص کر  
علیحدہ بلانا گویا زبان کے ذریعہ آواز نکال کر خاص کر اس  
کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اور اس طور سے بلانے کو  
نَقَرِي کہا جاتا ہے۔ (دَعَوْتُهُمُ النَّقَرِي: میں نے  
خاص طور پر انہیں بلایا۔

### (ن ق ص)

النَّقْصُ: (اسم) حق تلفی اور یہ نَقَصْتُ: (ن)

کی وجہ سے پیدا ہو جاتا ہے۔  
النَّفْبَةُ: ازار کی مثل ایک قسم کا کپڑا۔ جس میں سوراخ  
ہونے کی وجہ سے تکہ لگایا جاتا ہے۔

الْمُنْقَبَةُ: اصل میں پہاڑ کی درہ کے کہتے ہیں۔ اور بطور  
استعارہ شریفانہ کارنامہ کو مُنْقَبَةُ کہا جاتا ہے۔ یا تو اس  
لیے کہ اس کا اچھا اثر باقی رہ جاتا ہے۔ اور یا اس لیے کہ وہ  
بھی اسی کی رفعت کے لیے بمنزلہ منہاج کے ہے۔

النَّقِيبُ: کسی قوم کے حالات جاننے والا۔

ج نُبَاءُ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيبًا﴾ (۱۲-۱۵) اور ان  
میں ہم نے بارہ سردار مقرر کیے۔

### (ن ق ذ)

الْإِنْقَادُ: کسی خطرہ یا ہلاکت سے خلاصی

دینا۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَكُنْتُمْ عَلَى شَفَا حُفْرَةٍ مِنَ النَّارِ فَأَنْقَذَكُمْ  
مِنْهَا﴾ (۱۰۲-۳) اور تم آگ کے گڑھے کے کنارے

تک پہنچ چکے تھے۔ تو خدا نے تم کو اس سے بچالیا۔ النِّقْدُ:

بمعنی چھڑایا ہوا۔ فَرَسٌ نَقِيدٌ: دشمن کے ہاتھ سے چھینا  
ہوا گھوڑا گویا وہ ان سے بچایا گیا ہے ج نَقَانِدُ:

### (ن ق ر)

النَّقَرُ: (ن) کسی چیز کو کھٹکھٹانا حتیٰ کہ اس میں

سوراخ ہو جائے۔

الْمِنْقَارُ: کھٹکھٹانے کا آلہ جیسے پرند کی چونچ یا چکی کو کندہ  
کرنے کے اوزار وغیرہ۔

نَقَبْتُ عَنِ الْأَمْرِ: کسی معاملہ کی چھان بین کرنا۔

نَقَرْتُهُ: بطور استعارہ بمعنی غیبت کرنا۔ جیسا کہ ایک عورت

اقرار کرو..... توڑ دیتے ہیں۔

﴿وَلَا تَنْقُضُوا الْأَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيدِهَا﴾  
(۱۶-۹۱) اور جب پکی قسمیں کھاؤ تو ان کو نہ توڑو۔

اور اسی طرح کلام و شعر میں مُناقَضَہ ہے جیسا کہ جریر اور  
فرزدق کے نقائص شعر یہ مشہور ہیں۔ اَلنَّقِیْضَانِ: وہ تظییے  
جن میں سے ایک کا صدق دوسرے کے کذب کو مستلزم  
ہو جیسے ایک ہی چیز کے متعلق ایک ہی حالت میں ھُوَ کَذَا  
وَلَیْسَ بِکَذَا کا حکم لگانا۔

اِنْتَقَاضٌ: (اعتقال) اِنْتِقَاضًا کے معنی عمارت مسمار  
ہونے یا رسی کھل جانا کے ہیں۔ اور اسی سے اِنْتَقَضَتِ  
الْقَرْحَةُ ہے یعنی زخم کا اچھا ہونے کے بعد خراب ہو جانا۔  
اِنْقَضَتِ الدَّجَاجَةُ: مرغی کا اندادیتے وقت کڑکڑانا۔  
اَلْاِنْتِقَاضُ کے اصل معنی آواز کے نہیں ہیں۔ بلکہ کسی چیز  
کے اس طرح ٹوٹنے کے ہیں۔ کہ اس سے آواز پیدا ہو۔  
پھر اس کا اطلاق آواز پر ہونے لگا ہے۔ اور آیت کریمہ:-  
﴿الَّذِي اَنْقَضَ ظَهْرُكَ﴾ (۹۳-۳) جس نے تمہاری  
پیٹھ توڑ رکھی تھی۔

میں اِنْقَاضُ کے معنی کمر کو اس طرح توڑنا کے ہیں کہ اس  
سے کڑکڑانے کی آواز سنائی دے۔

اَلْاِنْقَاضُ: بیٹھے ہوئے جانور کو لالکارنے کی آواز۔ شاعر  
نے کہا ہے ۵ (الرجز)

(۴۳۶) اَعْلَمْتُهَا الْاِنْقَاضَ بَعْدَ الْقَرْقَرَةِ

یعنی میں نے اسے انقاض کے بعد قرقرہ کی آواز سنائی۔

فَهُوَ مَنْقُوضٌ کا مصدر بھی ہے جس کے معنی گھٹانے اور  
حق تلفی کرنے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:-  
﴿وَنَقْصٍ مِنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ﴾ (۲-۱۵۵) اور  
جانوں اور مالوں..... کے نقصان سے۔ ﴿وَأَنَا لَمُوقُّوهُمْ  
نَصِيهِهُمْ غَيْرَ مَنْقُوضٍ﴾ (۱۱-۱۹) اور ہم ان کو ان کا  
حصہ پورا پورا مالک و کاست دینے والے ہیں۔

﴿ثُمَّ لَمْ يَنْقُضُوا كُمْ شَيْئًا﴾ (۹-۴) اور انہوں نے  
تمہارا کسی طرح کا قصور نہ کیا۔

## (ن ق ض)

اَلنَّقْصُ: یہ ابرام کی ضد ہے اور اس کے معنی  
کسی چیز کا شیرازہ کھیرنے کے ہیں جیسے نَقَضْتُ  
الْبِنَاءَ: عمارت کو ڈھانا۔ اَلْحَبْلُ: رسی کے بل اتارنا۔  
اَلْعَقْدُ: گرہ کھولنا۔

اَلْيَقْضُ وَالنَّقْضُ: یہ دونوں بمعنی منقوض آتے ہیں۔ لیکن  
بکسر النون زیادہ تر عمارت کے لیے آتا ہے۔ اور بفتح النون  
کا عام استعمال اشعار کے متعلق ہوتا ہے۔ اسی سے دبلے  
اونٹ اور زمین کی پرت کو جو کھمبی وغیرہ کے ٹکٹے سے پھٹ  
جاتی ہے، نَقْضُ کہا جاتا ہے۔ پھر نَقْضُ الْحَبْلِ  
وَالْعَقْدِ سے استعارہ کے طور پر عہد شکنی کے لیے بھی نقض  
کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿الَّذِينَ يَنْقُضُونَ عَهْدَهُمْ﴾ (۸-۵۶) ہر بار  
اپنے عہد کو توڑ ڈالتے ہیں۔

﴿الَّذِينَ يَنْقُضُونَ عَهْدَ اللَّهِ﴾ (۲-۲۷) جو خدا کے

۱ وفي اللسان (نقض شهيرة) قاله شطاظ اللص الغبي وقبله: "رب عحوز من نمير شهيرة" وفي اللسان (قرقر) علمتها بدل اعلمتها وفي الاشتقاق لبس دريد (۵۴۴) اناس بدل نمير راجع للبيت ومعناه ايضا المعاني الكبير للقيتي قال الانقاض والقرقرة صوتان من اصوات الابل ومعنى البيت انها كانت لها بعير مسن يقرقر فَرَكِبَهُ وذهب به وترك لها بكرا تنقض به وفي الاشتقاق خلاف ذلك۔



﴿عَنِ الصِّرَاطِ لَنَّا كِبُونَ﴾ (۷۴-۲۳) وہ رستے سے الگ ہو رہے ہیں۔

الْمَنْكِبُ: کندھا۔ ج: مَنَاجِبُ۔ اور اسی سے بطور استعارہ زمین کے راستوں پر بولا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:-

﴿فَأَمْسُوا فِي مَنَاجِبَهَا﴾ (۱۵-۶۷) تو اس کی راہوں میں چلو پھرو۔

اور یہ زمین کے لیے بطور استعارہ ایسے ہی استعمال ہوا جیسا کہ آیت کریمہ:-

﴿مَا تَرَكَ عَلَى ظَهْرِهَا مِنْ دَابَّةٍ﴾ (۳۵-۳۵) تو روئے زمین پر ایک چلنے پھرنے والے کو نہ چھوڑتا۔ میں ظہر کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

مَنْكِبُ الْقَوْمِ: قوم کا کندھا یعنی رئیس جیسا کہ راس بمعنی رئیس اور يَدٌ بمعنی ناصبر آ جاتا ہے۔ يَفْلَانِ السَّكَابَةِ فِي قَوْمِهِ: فلاں کے پاس قوم کی ریاست ہے۔

الْأَنْكَبُ (۱) ٹیڑھے شانے والا (۲) اونٹ جو ایک جانب جھک کر چلے۔

الْأَنْكَبُ: ایک قسم کی بیماری جو شانے میں ہوتی ہے (ترکی میں اسے قولاً غو کہا جاتا ہے)۔

الْأَنْكَبَاءُ: اپنی سمت سے پھر کر چلنے والی ہوا۔ نَكَبَتْهُ حَوَادِثُ الدَّهْرِ: مصیبت پہنچانا۔

## (ن ک ث)

الْأَنْكَبُ: کے معنی کبل یا سوت ادھیڑنے کے ہیں۔ اور یہ قریب قریب نَقْضُ کے ہم معنی ہے۔ اور بطور استعارہ عہد شکنی کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

نَقِضُ الْمَفَاصِلِ: جوڑوں کے کڑکڑانے کی آواز۔

## (ن ق م)

نَقِمْتُ الشَّيْءَ وَنَقَمْتُهُ: کسی چیز کو برا سمجھنا۔ یہ کبھی زبان کے ساتھ عیب لگانے اور کبھی عقوبت (سزا دینے) پر بولا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:-

﴿وَمَا نَقَمُوا مِنْهُمْ إِلَّا أَنْ يُؤْمِنُوا بِاللَّهِ﴾ (۸۵-۸) ان کو مومنوں کی یہی بات بری لگتی تھی۔ کہ خدا پر ایمان لائے ہوئے تھے۔

﴿وَمَا نَقَمُوا إِلَّا أَنْ أَغْنَاهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ﴾ (۹-۷) اور انہوں نے (مسلمانوں میں) عیب ہی کونسا دیکھا ہے سوا اس کے کہ خدا نے اپنے فضل سے..... ان کو دولت مند کر دیا۔

﴿هَلْ تَنْقِمُونَ مِنَّا﴾ (۵-۵۹) تم ہم میں برائی ہی کیا دیکھتے ہو۔

اور اسی سے نَقَمَةٌ بمعنی عذاب ہے قرآن پاک میں ہے:-

﴿فَأَنْتَقِمْنَا مِنْهُمْ فَأَغْرَقْنَاهُمْ فِي الْيَمِّ﴾ (۷-۳۶) تو ہم نے ان سے بدلہ لے کر ہی چھوڑا۔ کہ ان کو دریا میں غرق کر دیا۔

﴿فَأَنْتَقِمْنَا مِنَ الَّذِينَ أَجْرَمُوا﴾ (۳۰-۳۷) سو جو لوگ نافرمانی کرتے تھے ہم نے ان سے بدلہ لے کر چھوڑا۔

﴿فَأَنْتَقِمْنَا مِنْهُمْ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكْذِبِينَ﴾ (۲۸-۲۳) تو ہم نے ان سے انتقام لیا۔

سودیکھ لو کہ جھٹلانے والوں کا انجام کیسا ہوا۔

## (ن ک ب)

نَكَبَ عَنْ كَذَا: کسی چیز سے پھر جانا۔

قرآن پاک میں ہے:-

﴿فَأَنكِحُوهُنَّ بِأَذْنِ أَهْلِهِنَّ﴾ (۳-۲۵) تو اس

لوہڈیوں کے ساتھ ان کے مالکوں سے اجازت حاصل کر کے نکاح کرلو۔

علیٰ ہذا القیاس متعدد آیات ہیں جن میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔

### (ن ک د)

النَّكَدُ: ہر وہ چیز جو صوبت سے حاصل ہو۔ اسی سے سخت خوکو جو سائل کو بمشکل کچھ دینے پر راضی ہو۔ نَكَدٌ وَنَكَدٌ کہا جاتا ہے۔ اور کم زدودہ والی اونٹنی کو جو بمشکل دوہی جاسکے، نَاقَةٌ نَكَدَاءُ کہتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:-

﴿وَالَّذِي خَبَتْ لَا يُخْرِجُ إِلَّا نَكَدًا﴾ (۷-۸۵) اور جو خراب ہے اس میں سے جو کچھ نکلتا ہے۔ ناقص ہوتا ہے۔

### (ن ک ر)

الْإِنْكَارُ: ضد عرفان اور أَنْكَرْتُ كَذَا کے معنی کسی چیز کی عدم معرفت کے ہیں اس کے اصل معنی انسان کے دل پر کسی ایسی چیز کے وارد ہونے کے ہیں جسے وہ تصور میں نہ لاسکتا ہو۔ لہذا یہ ایک درجہ کی جہالت ہی ہوتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:-

﴿فَلَمَّا رَأَىٰ أَيْدِيَهُمْ لَا تَصِلُ إِلَيْهِ نَكِرَهُمْ﴾ (۱۱-۷۰) جب دیکھا کہ ان کے ہاتھ کھانے کی طرف نہیں جاتے (یعنی وہ کھانا نہیں کھاتے) تو ان کو اجنبی سمجھ کر دل میں خوف کیا۔

﴿فَدَخَلُوا عَلَيْهِ فَعَرَفَهُمْ وَهُمْ لَهُ مُنْكَرُونَ﴾

قرآن پاک میں ہیں:-

﴿وَإِنْ تَكُونُوا أَيْمَانَهُمْ﴾ (۹-۱۲) اور اگر اپنی قسمیں توڑ ڈالیں۔

﴿إِذَا هُمْ يَنْكُتُونَ﴾ (۷-۱۳۵) تو وہ عہد توڑ ڈالتے ہیں۔

النَّكْتُ وَالنَّكِيَّةُ ..... مِثْلُ النِّقْصِ وَالنَّقِيْصَةِ اور نَكِيَّةٌ ہر اس مشکل معاملہ کو کہتے ہیں جس میں لوگ عہد و پیمان توڑ ڈالیں۔ شاعر نے کہا: (الطویل)

(۳۷-۴۳) مَتَى يَكُ أَمْرٌ لِلنَّكِيَّةِ أَشْهَدُ جب کوئی معاملہ عہد شکنی کی حد تک پہنچ جائے تو میں حاضر ہوتا ہوں۔

### (ن ک ح)

اصل میں نکاح بمعنی عقد آتا ہے۔ اور بطور استعارہ جماع کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ یہ اصل میں بمعنی جماع ہو اور پھر عقد میں بطور استعارہ ہوا ہو۔ کیوں کہ عربی زبان میں جماع کے معنی میں تمام الفاظ کنائی ہیں۔ کیونکہ نفس فعل کی طرح صراحتاً اس کا تذکرہ بھی مکروہ سمجھا جاتا ہے۔ لہذا یہ نہیں ہو سکتا کہ جو زبان ذکر نفس سے اس قدر گریزاں ہو وہ ایک مستحسن امر کے لیے قبیح لفظ استعمال کرے۔ قرآن پاک میں ہے:- ﴿وَإِنْ كُنْتُمْ لَا تَرْضَوْنَ النِّكَاحَ﴾ (۲۴-۳۲) اور اپنی قوم کی بیوہ عورتوں کے نکاح کر دیا کرو۔

﴿إِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنَاتِ﴾ (۳۳-۳۹) جب تم مومن عورتوں سے نکاح کر کے۔

① قاله طرفه اوله و قربت بالقربى و جدك انه و فى اللسان (نكت) عقد بدل امر و البيت فى العقد الثمين ۵۸ و فى روايته عہد بدل امر۔

﴿وَتَأْتُونَ فِي نَادِيكُمْ الْمُنْكَرَ﴾ (۲۹-۲۹) اور اپنی مجلسوں میں ناپسندیدہ کام کرتے ہو۔

تَنْكِيرُ الشَّيْءِ کے معنی کسی چیز کو بے پہچان کر دینے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:-

﴿نَكِّرُوا لَهَا عَرْشَهَا﴾ (۲۰-۴) اس کے تخت کی صورت بدل دو۔

اور اس کے بالمقابل تعریف کے معنی کسی چیز کو معروف بنانے کے ہیں۔ اور علمائے نحو کے نزدیک کسی اسم کو مخصوص صیغہ پر بنانے کے ہوتے ہیں۔ نَكَّرْتُ عَلَى فُلَانٍ وَأَنْكَرْتُ: کسی کو عملاً کسی کام سے روک دینا۔ قرآن پاک میں ہے:-

﴿فَكَيْفَ كَانَتْ نَكِيرٍ﴾ (۲۲-۴۴) میرا عذاب کیسا سخت تھا۔

النُّكْرُ: مکاری یا مشکل امر جو سمجھ میں نہ آ سکے۔ اور نَكْرَ نِكَارَةً: کسی معاملہ کا دشوار ہونا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿يَوْمَ يَدْعُ الدَّاعِ إِلَى شَيْءٍ نُّكْرٍ﴾ (۵۴-۶) جس دن بلانے والا ان کو ایک ناخوش چیز کی طرف بلائے گا۔ اور حدیث میں ہے۔ ❶ (۱۳۲) ((إِذَا وُضِعَ الْمِيتُ فِي الْقَبْرِ أَتَاهُ مَلَكَانُ مُنْكَرٌ وَنَكِيرٌ)) کہ جب میت قبر میں اتار دی جاتی ہے۔ تو اس کے پاس مُنْكَرٌ وَنَكِيرٌ دو فرشتے آتے ہیں۔ اور استعارۃ مُنَاكَرَةٌ بمعنی مُحَارَبَةٌ استعمال ہوتا ہے۔

### (ن ک س)

النَّكْسُ: (ن) کے معنی کسی چیز کو الٹا کر دینے کے ہیں اور اسی سے نَكَسَ الْوَلَدُ ہے..... یعنی ولادت

(۱۲-۵۸) تو یوسفؑ کے پاس گئے تو یوسفؑ نے ان کو پہچان لیا۔ اور وہ اس کو نہ پہچان سکے۔

اور کبھی یہ دل سے انکار کرنے پر بولا جاتا ہے۔ اور انکار لسانی کا اصل سبب گوا انکار قلب ہی ہوتا ہے۔ لیکن بعض اوقات انسان ایسی چیز کا بھی انکار کر دیتا ہے جسے دل میں ٹھیک سمجھتا ہے۔ ایسے انکار کو کذب کہتے ہیں۔ جیسے فرمایا۔

﴿يَعْرِفُونَ نِعْمَتَ اللَّهِ ثُمَّ يُنْكِرُونَهَا﴾ (۱۰۱-۸۳) یہ خدا کی نعمتوں سے واقف ہیں۔ مگر واقف ہو کر ان سے انکار کرتے ہیں۔

﴿فَهُمْ لَهُ مُنْكَرُونَ﴾ (۲۳-۶۹) اس وجہ سے ان کو نہیں مانتے۔

﴿فَأَيُّ آيَةِ اللَّهِ تُنْكِرُونَ﴾ (۴۰-۸۱) تو خدا کی کن کن نشانیوں کو نہ مانو گے۔ اور الْمُنْكَرُ ہر اس فعل کو کہتے ہیں جسے عقول سلیمہ قبیح خیال کریں یا عقل کو اس کے حسن و قبح میں توقف ہو۔ مگر شریعت نے اس کے قبیح ہونے کا حکم دیا ہو۔ چنانچہ آیات:-

﴿الْأَمْرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَالنَّاهُونَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ (۹-۱۱۲) نیک کاموں کا امر کرنے والے اور بری باتوں سے منع کرنے والے۔

﴿كَأُولَآئِكَ نَسْأَلُ اللَّهَ عَنْ مُنْكَرٍ فَعَلُوهُ﴾ (۵-۷۹) اور برے کاموں سے جو وہ کرتے تھے۔ ایک

دوسرے کو روکتے نہیں تھے۔

﴿وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ (۳-۱۱۲) اور بری باتوں سے منع کرتے۔

﴿لَنْ يَسْتَنْكِفَ الْمَسِيحُ أَنْ يَكُونَ عَبْدًا لِلَّهِ﴾ (۱۷۲-۴) مسیح علیہ السلام اس بات سے عار نہیں رکھتے کہ خدا کے بندے ہوں۔

﴿وَأَمَّا الَّذِينَ اسْتَنَكَفُوا﴾ (۱۷۳-۴) اور جنہوں نے (بندہ ہونے سے) عار و انکار اور تکبر کیا۔

اصل میں یہ نَكَفْتُ الشَّيْءِ سے ہے جس کے معنی کسی چیز کو دور ہٹا دینے کے ہیں اور اسی سے نَكَفْتُ ہے یعنی رخسار سے ہاتھ کے ساتھ آنسو پونچھنا اور بَسْحَرُ لَا يَنْكُفُ بے پایاں سمندر کو کہتے ہیں۔

الْإِنْتِكَافُ: ایک ملک سے دوسرے ملک میں چلا جانا۔

### (ن ک ل)

نَكَلَ عَنِ الشَّيْءِ: کسی کام سے کمزور اور عاجز ہو جانا۔

نَكَلْتُهُ: کسی کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دینا۔ اور نَكَلُ جانور کی بیڑی اور لگام کے لوہے کو کہتے ہیں۔ کیوں کہ یہ بھی چلنے سے مانع ہوتے ہیں۔ اس کی جمع آنکَالُ ہے۔ قرآن پاک میں ہے:-

﴿إِنَّ لَدَيْنَا أَنْكَالًا وَجَحِيمًا﴾ (۱۲-۷۳) کچھ شک

نہیں کہ ہمارے پاس بیڑیاں ہیں اور بھڑکتی آگ ہے۔ نَكَلْتُهُ: کسی کو عبرت ناک سزا دینا۔ اس سے اسم نَكَالُ ہے جس کے معنی عبرت ناک سزا کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:-

﴿فَجَعَلْنَاهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا﴾

(۶۶-۲) اور اس قصے کو اس وقت کے لوگوں کے لیے اور جو ان کے بعد آنے والے تھے۔ عبرت بنا دیا۔ ﴿جَزَاءً بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللَّهِ﴾ (۳۸-۵) ان کے فعلوں

کے وقت بچے کا پاؤں کا سر سے پہلے باہر نکالنا۔ ﴿ثُمَّ نَكْسُوا عَلَى رُءُوسِهِمْ﴾ (۶۵-۲۱) پھر شرمندہ ہو کر سر نیچا کر لیا۔

النَّكْسُ: صحت یابی کے بعد مرض کا عود کر آنا۔ اور نَكْسٌ فِي الْعُمُرِ کے متعلق فرمایا:-

﴿وَمَنْ نَعِمَ عُمْرُهُ فَتُكْسِهِ فِي الْخَلْقِ﴾ (۶۸-۳۶) اور جس کو ہم بڑی عمر دیتے ہیں۔ اسے خلقت میں اوندھا کر دیتے ہیں۔

جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا:-

﴿وَمِنْكُمْ مَنْ يَرُدُّ إِلَى أَرْدَلِ الْعُمُرِ﴾ (۷۰-۱۶) اور تم میں بعض ایسے ہوتے ہیں کہ نہایت خراب عمر کو پہنچ جاتے ہیں۔

اور ایک قراءت میں نُنْكِسُهُ ہے۔

انْخَسَ کا قول ہے کہ نُنْكِسُهُ (بشددید الکاف) کے معنی کسی چیز کو سرنگوں کر دینے کے ہوتے ہیں۔ اور نَكْسُ اس تیر کو کہتے ہیں جس کا فوٹہ ٹوٹ گیا ہو اور اس کے اوپر کے حصہ کو نیچے لگا دیا گیا ہو۔ ایسا تیر چونکہ ردی ہو جاتا ہے۔ اس لیے تشبیہ کے طور پر کہنے آدمی کو بھی نَكْسُ کہا جاتا ہے۔

### (ن ک ص)

النَّكُوصُ: (ن ض) کسی چیز سے پیچھے ہٹنا۔ قرآن پاک میں ہے:-

﴿نَكَصَ عَلَى عَقَبَيْهِ﴾ (۲۸-۸) تو پسپا ہو کر چل دیا۔

### (ن ک ف)

نَكَفْتُ مِنْ كَذَا وَاسْتَنَكَفْتُ مِنْهُ کے معنی کسی چیز کو اپنے لیے باعث عار سمجھنے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:-

اور اسی سے فَرَسٌ نَمْلُ الْقَوَائِمِ کا محاورہ ہے یعنی سبک پاؤں والا گھوڑا جو ایک جگہ پر سکون سے کھڑا نہ ہو اور مجازاً النَّمْلُ بمعنی نَمِيمَةٌ بھی آتا ہے۔ اور یہ معنی چیونٹی کی چال سے ماخوذ ہے۔ هُوَ نَمْلٌ وَذُو نَمْلَةٍ وَنَمَّالٌ کے معنی چغل خور کے ہیں۔

تَنَمَّلُ الْقَوْمُ: مال جمع کرنے کے لیے چیونٹیوں کی طرح پھیل گئے۔ اسی سے هُوَ أَجْمَعُ مِنْ نَمْلَةٍ کا محاورہ ہے۔ یعنی وہ چیونٹی سے بھی زیادہ ذخیرہ اندوز ہے۔

آلَا نَمْلَةٌ: انگلیوں کے اطراف۔ ج۔ انال

### (ن ۵ ج)

النَّهْجُ کے معنی سہلے راستہ کے ہیں۔ اور نَهَجَ الْأَمْرُ وَأَنْهَجَ کے معنی ہیں: کسی امر کا واضح ہونا۔  
الْمَنْهَجُ وَالْمِنْهَاجُ: کشادہ راہ۔ قرآن پاک میں ہے:-

﴿لِكُلِّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَمِنْهَاجًا﴾ (۵-۲۸) ہم نے تم میں سے ہر ایک فرقے کے لیے ایک دستور اور طریقہ مقرر کیا ہے۔

اور اسی سے نَهَجَ الشُّوبُ وَأَنْهَجَ ہے۔ جس کے معنی کپڑے میں بوسیدگی کے آثار ظاہر ہونے کے ہیں۔  
أَنْهَجَهُ الْبَلَى: کپڑے کو بوسیدگی نے جھرجھرا کر دیا۔

### (ن ۵ ن)

النَّهْرُ: بافراط پانی بننے کے مجری کو کہتے ہیں۔  
کی جمع اَنْهَارٌ آتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:-  
﴿وَفَجَّرْنَا خِلْفَهُمَا نَهْرًا﴾ (۱۸-۳۳) اور دونوں میں ہم نے ایک نہر بھی جاری کر رکھی تھی۔ ﴿وَالْفُی فی شُكَّافٍ۔

کی سزا اور خدا کی طرف سے عبرت ہے۔  
اور حدیث میں ہے۔ ﴿إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ النَّكَلَ عَلَى النَّكْلِ﴾ کہ قوی آدمی جو طاقت ور گھوڑے پر سوار ہو اللہ تعالیٰ کو پیارا لگتا ہے۔

### (ن م م)

النَّمُّ (ن) کے معنی چغلی کھانے کے ہیں۔ اور چغلی خوری کو نَمِيمَةٌ کہا جاتا ہے۔ نَمَامٌ: چغل خور۔ قرآن پاک میں ہے۔

هَمَّازٌ مَشَاءٌ بِنَمِيمٍ: طعن آمیز اشارتیں کرنے والا۔ چغلیاں لئے پھرنے والا (۶۸-۱۱)

اصل میں نَمِيمَةٌ کے معنی هَمْسٌ (پاؤں کی آہٹ) اور حرکت خفیہ کے ہیں۔ اسی سے محاورہ ہے:- أَسْكَتَ اللَّهَ نَامَتَهُ: خدا اس کی حرکت کو بند کر دے یعنی وہ مر جائے۔

النَّمَامُ: گھاس جس کی خوشبو اس کے وجود پر دلالت کرے۔  
النَّمَمَةُ: قریب قریب خطوط گویا کتابت میں قلت حرکت پر دال ہیں۔

### (ن م ل)

نَمْلَةٌ: چیونٹی (ج۔ نمل) قرآن پاک میں ہے:- ﴿قَالَتْ نَمْلَةٌ يَا أَيُّهَا النَّمْلُ﴾ (۲۷-۱۸) تو ایک چیونٹی نے کہا اے چیونٹیو!

طَعَامٌ مَنْمُولٌ: طعام جس میں چیونٹیاں پڑ گئی ہوں۔  
نَمْلَةٌ: (۱) ایک قسم کا پھوڑا۔ جو پہلو میں نکلتا ہے۔ اور اس کی شکل چیونٹی جیسی ہوتی ہے۔ (۲) جانور کے کھر کا شگاف۔

خِلْفَةً ﴿۲۵-۶۲﴾ اور وہی تو ہے جس نے رات اور دن کو ایک دوسرے کے پیچھے آنے جانے والا بنایا۔

﴿اِنَّهَا اَمْرُنَا لَيْسَ اَوْ نَهَارًا﴾ ﴿۱۰-۲۳﴾ ناگہاں رات کو یا دن کو ہمارا حکم عذاب آپہنچا۔

اور کبھی بَيَاتٌ کے مقابلہ میں استعمال ہوتا ہے۔ جیسے ﴿اِنَّ اَنْتُمْ عَذَابُهُ بَيَاتًا اَوْ نَهَارًا﴾ ﴿۱۰-۵۰﴾ تو اگر اس کا عذاب تم پر ناگہاں آ جائے رات کو یا دن کو۔

رَجُلٌ نَّهَرَ: دن کو لوٹ مارنے والا۔  
النَّهَارُ: جباری کا بچہ۔

الْمَنْهَرَةُ: آبادی کے درمیان کھلی جگہ کو کہتے ہیں جیسے وہ جگہ جہاں کوڑا کرکٹ ڈالا جاتا ہے۔

النَّهْرُ وَالْاِنْتِهَارُ: سختی سے جھڑکنا۔ قرآن پاک میں ہے:-

﴿فَلَا تَقُلْ لَهُمَا اُفٍّ وَّ لَا تَنْهَرُهُمَا﴾ ﴿۱۷-۲۳﴾ تو ان کو اف تک نہ کہنا اور نہ انہیں جھڑکنا۔

﴿وَاَمَّا السَّائِلَ فَلَا تَنْهَرْ﴾ ﴿۹۳-۱۰﴾ اور مانگنے والے کو جھڑکی نہ دینا۔

## (ن ۵ ی)

النَّهْيُ: کسی چیز سے منع کر دینا۔ قرآن پاک میں ہے:-

﴿اَرَأَيْتَ الَّذِي يَنْهَى عَبْدًا اِذَا صَلَّى﴾ ﴿۹۶-۱۰﴾ بھلا تم نے اس شخص کو دیکھا جو منع کرتا ہے (یعنی) ایک بندے کو جب وہ نماز پڑھنے لگتا ہے۔

معنوی لحاظ سے نہی بالقول اور بالفعل میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اور نہی بالقول عام ہے کہ صیغہ اَفْعَلْ کے ذریعہ ہو جیسے اِجْتَنِبْ كَذَا (اس سے دور رہو) یا صیغہ لَا تَفْعَلْ

الْاَرْضِ رَوَّاسِي اَنْ تَمِيدَ بِكُمْ وَاَنْهَرَا وَّ سُبُلًا ﴿۱۶-۱۵﴾ اور اس نے زمین پر پہاڑ بنا کر رکھ دیے کہ تم کو لے کر کہیں جھک نہ جائے اور نہریں اور رستے بنادے۔ اور جنت میں لوگوں پر جو فیض اور فضل الہی جاری ہوگا اسے بھی بطور مثال کے اَنْهَارٌ سے تعبیر فرمایا ہے۔

جیسے:

﴿اِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي جَنَّتٍ وَنَهَرٍ﴾ ﴿۵۳-۵۴﴾ جو پرہیز گار ہیں وہ باغوں اور نہروں میں ہوں گے۔

﴿وَيَجْعَلُ لَكُمْ جَنَّتٍ وَيَجْعَلُ لَكُمْ اَنْهَارًا﴾ ﴿۷۱-۱۲﴾ اور تمہیں باغ عطا کرے گا۔ اور (ان میں) تمہارے لیے نہریں بہا دے گا۔

﴿جَنَّتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهَارُ﴾ ﴿۲-۲۵﴾ (نعمت کے) باغ ہیں۔ جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں۔

النَّهْرُ کے معنی وسعت اور فراخی کے بھی آتے ہیں۔ (تَشْبِيْهَا بِنَهْرِ الْمَاءِ) اور اسی سے اَنْهَرْتُ الْمَاءَ (پانی بہانا) ہے۔

اور اَنْهَرُ الْمَاءَ کے معنی پانی کے جاری ہونے کے ہیں۔ نَهْرٌ وَ نَهْرٌ نہر جس میں پانی فراوانی سے بہہ رہا ہو۔

ابو ذؤب نے کہا ہے ①

(۳۳۸) اَقَامَتْ بِهٖ فَاَبْتَنَّتْ خَيْمَةً عَلٰی قَصَبٍ وَفُرَاتٍ نَّهْرٍ

النَّهَارُ: (ن) شرعاً طلوع فجر سے لے کر غروب آفتاب کے وقت کو نَهَارٌ کہا جاتا ہے۔ لیکن لغوی لحاظ سے اس کی حد طلوع شمس سے لے کر غروب آفتاب تک ہے۔ قرآن پاک میں ہے:-

﴿وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ

میں اللہ تعالیٰ کے امر و نہی سے امر خیر کی ترغیب دینا اور شر سے روکنا مراد ہے۔ اور یہ ممانعت بعض امور سے عقل کے ذریعہ کی ہے جو اللہ تعالیٰ نے ہم میں ودیعت کی ہے۔ جو اللہ تعالیٰ نے ہم میں ودیعت کی ہے۔ اور بعض کاموں سے بذریعہ شریعت کے منع فرما دیا ہے جو ہمارے لیے مقرر فرمائی ہے۔

الْأَنْتِهَاءُ: کسی ممنوع کام سے رک جانا قرآن پاک میں ہے۔ ﴿قُلْ لِّلَّذِينَ كَفَرُوا إِنِّي يَتَّبِعُهُمُ الْغَيْفُ إِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ مَّا قَدْ سَلَفَ﴾ (۸-۳۸) (۱-پیغمبر) کفار سے کہہ دو کہ اگر وہ اپنے افعال سے باز آ جائیں تو جو ہو چکا وہ انہیں معاف کر دیا جائے گا۔ ﴿لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَأَرْجُمَنَّكَ وَ أَهْجُرُنِي مَلِيًّا﴾ (۱۹-۲۶) اگر تو باز نہ آئے گا۔ تو میں تجھے سنگسار کر دوں گا اور تو ہمیشہ کے لیے مجھ سے دور ہو جا۔ ﴿لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ يَأْنُوحُ لَتَكُونَنَّ مِنَ الْمَرْجُومِينَ﴾ (۲۶-۱۱۶) کہ نوح علیہ السلام اگر تم باز نہ آؤ گے تو سنگسار کر دیے جاؤ گے۔ اور آیت کریمہ:-

﴿فَهَلْ أَنْتُمْ مُنْتَهُونَ﴾ (۵-۹۱) تو تم کو (ان کاموں سے) باز رہنا چاہیے۔

﴿فَمَنْ جَاءَهُ مَوْعِظَةٌ مِّن رَّبِّهِ فَانْتَهَىٰ فَلَهُ مَا سَلَفَ﴾ (۲-۲۷) تو جس شخص کے پاس خدا کی نصیحت پہنچی اور وہ سود لینے سے باز آ گیا تو جو پہلے ہو چکا وہ اس کا۔

میں فانتہی کے معنی اس کی نہایت کو پہنچنے یعنی رک جانے کے ہیں۔

الْإِنْهَاءُ: اصل میں اس کے معنی نہایت کو پہنچا دینے کے ہیں۔ پھر عرف میں مطلقا کسی خبر کے پہنچا دینے پر بولا جاتا

کے ذریعہ ہو۔ لیکن لفظی لحاظ سے صرف ”لَا تَفْعَلْ“ کو نہیں ہے۔ پس صیغہ لَا تَفْعَلْ لفظاً و معنی دونوں لحاظ سے نہی ہوگا۔ جیسے فرمایا:-

﴿لَا تَقْرَبَا هَذِهِ الشَّجَرَةَ﴾ (۲-۳۵) لیکن اس درخت کے..... پاس نہ جانا۔

اسی بنا پر شیطان نے کہا تھا۔ ﴿مَا نَهَكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هَذِهِ الشَّجَرَةَ﴾ (۷-۲۰) کہ تم کو تمہارے پروردگار نے اس درخت سے صرف اس لیے منع کیا ہے۔ اور آیت کریمہ:-

﴿وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوَىٰ﴾ (۹-۴۰) اور جو اپنے پروردگار کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرتا اور جی کو خواہشوں سے روکتا رہا۔

میں نہی سے نفس کو شہوات سے روکنا اور ان کے قصد سے دفع کرنا مراد ہے نہ کہ زبان سے صرف لَا تَفْعَلْ کہہ دینا۔ اسی طرح نہی عَنِ الْمُتَنَكَّرِ بھی عام ہے۔ جو کہ ہاتھ اور زبان کے ساتھ روکنے اور دل سے برا سمجھنے کو شامل ہے۔ قرآن پاک میں ہے:-

﴿أَتَنْهَأْنَ أَنْ نَعْبُدَ مَا يَعْبُدُ آبَاؤُنَا﴾ (۱۱-۶۲) کیا تم ہم کو ان چیزوں کے پوجنے سے منع کرتے ہو جن کو ہمارے بزرگ پوجتے آئے ہیں؟ اور آیت کریمہ:-

﴿إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَايَ ذِي الْقُرْبَىٰ وَيَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ﴾ (۱۶-۹۰)

خدا تم کو انصاف اور احسان کرنے اور رشتہ داروں کو (خرچ سے مدد) دینے کا حکم دیتا ہے۔ اور بے حیائی اور نامعقول کاموں سے منع کرتا ہے۔

﴿وَالَيْكَ آتَبْنَا﴾ (۶۰-۴۰) اور تیری ہی طرف ہم رجوع کرتے ہیں۔

﴿وَأَنبِئُوا إِلَىٰ رَبِّكُمْ﴾ (۵۴-۳۹) اپنے پروردگار کی طرف رجوع کرو۔

﴿مُنِيبِينَ إِلَيْهِ﴾ (۳۱-۳۰) (مومنو!) اس (خدا) کی طرف رجوع کیے رہو۔

فَلَا تَتَّبِعُوا فُلَانًا: وہ اس کے پاس آتا جاتا ہے۔

### (ن و ح)

نُوحٌ: یہ ایک نبی کا نام ہے دراصل یہ نَسَاحٌ يَنْوُحُ کا مصدر ہے جس کے معنی بلند آواز کے ساتھ گریہ کرنے کے ہیں۔ محاورہ ہے۔ نَاحَتِ الْحَمَامَةِ نُوحًا: فاختہ کا نوحہ کرنا۔ نوح کے اصل معنی عورتوں کے ماتم کدہ میں جمع ہونے کے ہیں۔ اور یہ تَنَاحٌ سے مشتق ہے جس کے معنی تَقَابُلُ کے ہیں۔ جیسے جَبَلَانِ مُتَنَاحَانِ دو متقابل پہاڑ۔ رِيحَانِ يَتَنَانِ دَحَانِ دو متقابل ہوائیں۔

النَّوَائِحُ: نوح گزرتیں۔ الْمَنُوحُ: مجلس گریہ۔

### (ن و و)

النُّورُ: وہ پھیلنے والی روشنی جو اشیاء کے دیکھنے میں مدد دیتی ہے۔ اور یہ دو قسم پر ہے۔ دنیوی اور اخروی۔ نور دنیوی پھر دو قسم پر ہے۔ معقول (۱) جس کا ادراک بصیرت سے ہوتا ہے یعنی امور الہیہ کی روشنی جیسے عقل یا قرآن پاک کی روشنی۔ دوم (۲) محسوس جس کا تعلق بصر سے ہے جیسے چاند، سورج، ستارے اور دیگر اجسام نیرہ۔ چنانچہ نور الہی کے متعلق فرمایا ﴿قَدْ جَاءَكُمْ مِنَ اللَّهِ نُورٌ وَكِتَابٌ مُبِينٌ﴾ (۵-۱۵) بے شک تمہارے خدا

ہے جیسے: أَنَهَيْتُ إِلَىٰ فُلَانٍ خَيْرَ كَذَا: میں نے اس کے پاس فلاں خبر پہنچادی۔

نَاصِيئِكَ مِنْ رَجُلٍ: فلاں آدمی تجھے کافی ہے۔ یعنی وہ تیرے مطلوب کی غایت ہے گویا کسی دوسرے کی طلب سے تجھے منع کرتا ہے۔ نَاقَةُ نَهْيَةٍ: انتہائی موٹی اونٹنی۔

النَّهْيَةُ: عقل جو انسان کو قبیح باتوں سے روکتی ہو اس کی جمع نہی آتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:-

﴿إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّأُولِي النُّهَى﴾ (۵۴-۲۰)

بے شک ان (باتوں) میں عقل والوں کے لیے (بہت سی) نشانیاں ہیں۔

تَنْهِيَةُ الْوَادِي: وادی کا آخری کنارہ جہاں کہ سیلان رک جاتا ہے۔

نِهَآيَةُ النَّهَارِ دن کا بلند ہونا۔

طَلَبَ الْحَاجَّةَ حَتَّىٰ نَهَىٰ عَنْهَا: اس نے اپنی حاجت کو طلب کیا حتیٰ کہ اس کی طلب کرنے کے بعد اس سے رک گیا اور اس میں کامیاب ہونا شرط نہیں ہے۔

### (ن و ب)

النَّبُوءُ: کسی چیز کا بار بار لوٹ کر آنا۔ یہ نَابَ (ن) نَوْبَةً وَنَوْبًا کا مصدر ہے۔ اور شہد کی مکھی کو نَوْبُ کہا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ اپنی قرار گاہ کی طرف لوٹ کر جاتی ہے۔ نَابَتْهُ نَابِيَةٌ: یعنی اسے ایسی مصیبت پہنچی جس کے دوبارہ آنے کا بھی امکان ہے۔

أَلَا نَابَتْهُ إِلَى اللَّهِ: توبہ اور اخلاص عمل کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹنا۔ قرآن پاک میں ہے:- ﴿وَاخْشَرُوا رَاكِعًا وَأَنَابًا﴾ (۲۴-۳۸) اور جھک کر گر پڑے اور (خدا کی طرف رجوع کیا۔)



یعنی روشنی بنایا۔ اور بعض آیات میں نور عام معنی میں استعمال ہوا ہے۔ جیسے فرمایا:-

﴿وَجَعَلَ الظُّلُمَاتِ وَ النُّورَ﴾ (۱-۶) اور اندھیرا اور روشنی بنائی۔

﴿وَيَجْعَلُ لَكُمْ نُورًا تَمْشُونَ بِهِ﴾ (۲۸-۵۷) اور تمہارے لیے روشنی کر دے گا۔ جس میں چلو گے ﴿وَأَشْرَقَتِ الْأَرْضُ بِنُورِ رَبِّهَا﴾ (۲۹-۳۹) اور زمین اپنے پروردگار کے نور سے جگمگا اٹھے گی۔ اور نور اخروی کے متعلق فرمایا:-

﴿نُورُهُمْ يَسْعَىٰ بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَبِأَيْمَانِهِمْ يَقُولُونَ رَبَّنَا آتِنَا نُورَنَا﴾ (۸-۶۲) ان کا نور ایمان ان کے آگے اور داہنی طرف (روشنی کرتا ہوا) چل رہا ہوگا۔ اور وہ خدا سے التجا کریں گے کہ اے پروردگار! ہمارا نور ہمارے لیے پورا کر۔ ﴿انْظُرُونَا نَقْتِسِمْ مِنْ نُورِكُمْ﴾ (۱۳-۵۷) کہ ہماری طرف نظر شفقت کیجیے کہ ہم بھی تمہارے نور سے روشنی حاصل کریں۔

﴿فَالْتَمِسُوا نُورًا﴾ (۱۳-۵۷) اور وہاں نور تلاش کرو۔ محاورہ ہے۔

(أَنَارَ اللَّهُ كَذَا وَنُورَهُ) اللہ تعالیٰ اس کی قبر کو روشن کرے۔ اور اللہ تعالیٰ کا اپنی ذات کو نور کہنا مُنُورٌ ہونے کے لحاظ سے ہے۔

چنانچہ قرآن پاک میں ہے:- ﴿أَللَّهُ نُورُ السَّمُوتِ وَالْأَرْضِ﴾ (۲۳-۲۵) خدا آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔

نیز اس کا اپنی ذات کو نور کہنا روشنی میں مبالغہ کی وجہ سے ہے۔

کی طرف سے نور اور روشن کتاب آچکی ہے۔

﴿وَجَعَلْنَا لَهُ نُورًا يَمْشِي بِهِ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَثَلُهُ فِي الظُّلُمَاتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِنْهَا﴾ (۱۲۴-۶) اور اس کے لیے روشنی کر دی جس کے ذریعہ سے وہ لوگوں میں چلتا پھرتا ہے۔ کہیں اس شخص جیسا ہو سکتا ہے۔ جو اندھیرے میں پڑا ہو اور اس سے نکل نہ سکے۔

﴿مَا كُنْتَ تَدْرِي مَا الْكِتَابُ وَلَا الْإِيمَانُ وَلَكِنْ جَعَلْنَاهُ نُورًا نَهْدِي بِهِ مَنْ نَشَاءُ مِنْ عِبَادِنَا﴾ (۵۲-۴۲) تم نہ تو کتاب کو جانتے تھے اور نہ ایمان کو لیکن ہم نے اس کو نور بنایا کہ اس سے ہم اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں ہدایت کرتے ہیں۔

﴿أَقَمْنِ شَرَحَ اللَّهُ صَدْرَهُ لِلْإِسْلَامِ فَهُوَ عَلَى نُورٍ مِنْ رَبِّهِ﴾ (۲۲-۳۹) بھلا جس شخص کا سینہ خدا نے اسلام کے لیے کھول دیا ہو اور وہ اپنے پروردگار کی طرف سے روشنی پر ہو۔ ﴿نُورٌ عَلَى نُورٍ يَهْدِي اللَّهُ لِنُورِهِ مَنْ يَشَاءُ﴾ (۳۵-۲۴) روشنی پر روشنی ہو رہی ہے۔ خدا اپنے نور سے جس کو چاہتا ہے۔ سیدھی راہ دکھاتا ہے۔

اور نور حسی کے متعلق فرمایا:-

﴿هُوَ الَّذِي جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَاءً وَالْقَمَرَ نُورًا﴾ (۱۵-۱۰) وہی تو ہے جس نے سورج کو روشن اور چاند کو مُنُور بنایا۔

یہاں خاص کر سورج کو ضیاء اور قمر کو نور کہنے کی وجہ یہ ہے کہ ضوئے نور سے اخص ہے۔

﴿وَقَمَرًا مُنِيرًا﴾ (۶۱-۲۵) اور چمکتا ہوا چاند بھی بنایا۔

تمہارے نور سے روشنی حاصل کریں۔  
تَنَوَّرْتُ نَارًا میں نے آگ دیکھی۔

الْمَنَارَةُ: یہ یا تو نور سے مفعلة کے وزن پر ہے اور یا نار سے جیسے مَنَارَةُ السَّرَاج (چراغ پایہ) یا وہ جس پر کہ اذان دی جاتی ہے اور مَنَارُ الْأَرْضِ: راستہ معلوم کرنے کے نشانات کو کہتے ہیں۔ ❶

النَّوَارُ: جائے تہمت سے نفرت کرنا۔  
نَارَتِ الْمَرْأَةُ (ن) نُورًا وَنَوَارًا: عورت کا تہمت سے دور رہنا

نُورًا الشَّجَرَةَ وَنَوَارُهُ: درخت کی کلیاں کیونکہ وہ سفیدی میں نور کے مشابہ ہوتی ہیں۔ نُورٌ گودنے کا پوڈر۔ اور اسی سے محاورہ ہے: نَوَّرَتِ الْمَرْءُ يَدَهَا: عورت کا ہاتھ پر گودنا اور گودنے سے چونکہ عضو کی خوبصورتی بڑھ جاتی ہے اس لیے اسے تَنَوَّيْرٌ سے تعبیر کر لیتے ہیں۔

### (ن و س)

النَّاسُ: بعض نے کہا ہے کہ اس کی اصل أنسٌ ہے۔ ہمزہ کو حذف کر کے اس کے عوض الف لام لایا گیا ہے۔ اور بعض کے نزدیک نَسِی سے مقلوب ہے اور اس کی اصل اِنْسِيَانٌ بروزن اِفْعِلَانٌ ہے اور بعض کہتے ہیں کہ یہ اصل میں نَاسٌ یَنُوسُ سے ہے جس کے معنی مضطرب ہونے کے ہیں۔ اور نُسْتُ الْإِبِلِ کے معنی اونٹ ہٹکانے کے ہیں۔ بعض کا قول ہے کہ ذنواس بادشاہ کی وجہ تلیق بھی یہی تھی کہ اس کے دراز گیسو اس کی پشت پر لہرایا کرتے تھے۔ اس صورت میں اس کی تصغیر نُوسٌ ہوگئی۔ قرآن پاک میں ہے:-

النَّارُ: اس شعلہ کو کہتے ہیں جو آنکھوں کے سامنے ظاہر ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿أَفَرَأَيْتُمُ النَّارَ الَّتِي تُورُونَ﴾ (۵۶-۷۱) بھٹا دیکھو کہ جو آگ تم درخت سے نکالتے ہو۔ ﴿مَثَلُهَا كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا﴾ (۲-۱۷) ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جس نے آگ جلائی۔ اور نار کا اطلاق صرف حرارت اور نار جہنم پر بھی ہوتا ہے جیسے فرمایا:-

﴿النَّارُ وَعَدَهَا اللَّهُ الَّذِينَ كَفَرُوا﴾ (۲۲-۷۲) وہ دوزخ کی آگ جس کا خدا نے کافروں سے وعدہ کیا ہے۔ ﴿فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ﴾ (۲-۲۴) تو اس آگ سے ڈرو جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہوں گے۔

﴿نَارُ اللَّهِ الْمُوقَدَةُ﴾ (۱۰۴-۶) وہ خدا کی بھڑکائی ہوئی آگ ہے۔

الغرض اس قسم کی بہت سی آیات ہیں جن میں نَار کا لفظ جہنم پر بولا گیا ہے اور نار بمعنی نارِ حرب بھی آتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:-

﴿كُلَّمَا أَوْقَدُوا نَارًا لِلْحَرْبِ﴾ (۵-۶۴) یہ جب لڑائی کی آگ جلاتے ہیں۔

بعض نے کہا ہے کہ نار اور نور کی اصل ایک ہی ہے اور عام طور پر یہ لازم ملزوم ہوتے ہیں۔ لیکن نار کو مُقْشَوِينَ کے لیے متاعِ دنیوی قرار دیا ہے۔ اور نور کو متاعِ اخروی ہے۔ اسی کے لیے نور کے متعلق اِفْتِيسَاسٌ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ فرمایا:-

﴿نَقْتَبِسُ مِنْ نُورِكُمْ﴾ (۵۷-۱۳) کہ ہم بھی

❶ وفي الحديث لعن الله من غير منار الارض (الفائق ۲/۲۹۳)۔

شاعر نے کہا ہے ﴿(الطویل)

(۴۳۹) تَنَوُّشُ الْبَرِيرِ حَيْثُ طَابَ اهْتِصَارُهَا۔

وہ وہاں سے پیلو کھاتی ہے جہاں سے خوب چمکی ہوئی ہوں۔

بَرِيرُ کے معنی پیلو کے ہیں اور اهْتِصَارُ کے معنی مائل کرنے اور جھکانے کے۔ چنانچہ محاورہ ہے۔

هَصَرْتُ الْغُصْنَ: میں نے ٹہنی کو جھکایا۔

تَنَوُّشُ الْقَوْمِ: کسی چیز کو پکڑنا قرآن پاک میں ہے:-

﴿أَتَى لَهُمُ التَّنَاطُشُ﴾ (۵۲-۳۳) (اب)..... ان

کا ہاتھ ایمان کے لینے کو کیونکر پہنچ سکتا ہے؟ یعنی وہ دور جگہ

سے ایمان کو کیسے حاصل کر سکتے ہیں۔ جب کہ انہوں نے

قریب جگہ سے اسے حاصل نہیں کیا جس وقت کہ ایمان لانا

اور اسی سے انتفاع حاصل کرنا ان کے اختیار میں تھا۔ تو یہ

آیت کریمہ:- ﴿يَوْمَ يَأْتِي بَعْضُ آيَاتِ رَبِّكَ لَا

يَنْفَعُ نَفْسًا إِيْمَانُهَا﴾ (۱۵۹-۶) مگر جس روز

تمہارے پروردگار کی کچھ نشانیاں آجائیں گی تو..... اس

وقت اسے ایمان لانا کچھ فائدہ نہ دے گا۔

کے مضمون کی طرف اشارہ ہے۔ پھر ایک قراءت میں

التَّنَاطُشُ ہمزہ کے ساتھ ہے تو اس صورت میں یا تو یہ

نَاشُ سے مشتق ہوگا جس کے معنی طلب کے ہیں اور یا

اس کا ہمزہ واؤ سے مبدل ہوگا جیسے أُقِتْتُ وَأَدُوْرُ میں

ہے جو کہ اصل میں وُقِتْتُ وَأَدُوْرُ ہے۔

(ن و ص)

نَاصٍ إِلَى كَذَا کے معنی کسی کے پاس پناہ

﴿قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ﴾ (۱۰۴-۱) کہو کہ میں

لوگوں کے پروردگار کی پناہ مانگتا ہوں۔

کبھی مجازاً اناس کا عام معنی مراد نہیں ہوتا بلکہ صرف فضلاء

لوگ مراد ہوتے ہیں اس وقت اس میں انْسَانِيَّة کا معنی

ملفوظ ہوتا ہے۔ یعنی جس میں کہ فضیلت، ذکر، اخلاق حمیدہ

اور خصوصیات انسانی علی وجہ الائم پائی جاتی ہیں کیونکہ جو چیز

اپنے خواص سے عاری ہو وہ اس نام کی مستحق نہیں سمجھی

جاتی۔ مثلاً ہاتھ میں اگر اس کے خصوصی وظیفہ کو ادا کرنے

کی صلاحیت نہ ہو تو اس پر اور سریر کے پایہ پر اس کا اطلاق

کیاں ہوگا۔ پس آیت کریمہ:-

﴿اٰمِنُوْا كَمَا اٰمَنَ النَّاسُ﴾ (۱۳-۲) جس طرح اور

لوگ ایمان لائے تم بھی لے آؤ۔

میں النَّاس سے کوئی خاص انسان مراد نہیں ہے بلکہ معنی یہ

ہیں کہ ان لوگوں کی طرح ایمان لے آؤ جن میں انسانیت

کے اوصاف پائے جاتے ہیں۔ اسی طرح آیت:-

﴿اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰى مَا اٰتٰهُمْ اللّٰهُ مِنْ

فَضْلِهٖ﴾ (۵۴-۳) یا جو خدا نے لوگوں کو اپنے فضل سے

دے رکھا ہے اس پر حسد کرتے ہیں۔

میں بھی النَّاس سے خاص لوگ مراد نہیں ہیں۔ بلکہ وہ

لوگ مراد ہیں جن میں انسانیت کے اوصاف پائے جاتے

ہیں اور کبھی اس سے نوع انسانی مراد لی جاتی ہے اور بعض

نے آیت مذکورہ کو بھی اسی معنی پر محمول کیا ہے۔

(ن و ش)

النَّوْشُ: کے معنی کسی چیز کو پکڑنا کے ہیں۔

① قاله ابو ذؤيب الهذلي وصدره: فما ام حشف بالعلايه شادن۔ والبيت في اللسان (نوش، علا) وديوان الهذليين (۲۲: ۱) ومعجم البلدان (رسم: علايه) والمعاني الكبير (۷۲۱) والمحکم (علو) وفي روايتهما نال بدل طاب واهتصارها اي جذبها۔

اعتبارات سے تمام وجہ صحیح ہو سکتی ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ بخارات کی رطوبت سے اعصاب دماغ کے ڈھیلا ہونے کا نام نوم ہے۔ اور بعض کے نزدیک اللہ تعالیٰ کا بغیر موت کے روح کو قبض کر لینے کا نام نوم ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے: ﴿اللَّهُ يَتَوَفَّى الْأَنفُسَ حِينَ مَوْتِهَا وَالَّتِي لَمْ تَمُتْ فِي مَنَامِهَا﴾ (۳۹-۴۲) خدا لوگوں کے مرنے کے وقت ان کی روہیں قبض کر لیتا ہے اور جو مرے نہیں ان کی (روہیں) سوتے میں (قبض کر لیتا ہے)۔

اور بعض نوم کو موت خفیف اور موت کولوم کہتے ہیں رَجُلٌ نَوُومٌ وَنَوْمُهُ: بہت زیادہ سونے والا۔ اور مَنَامٌ بمعنی نوم آتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَمِنَ الْآيَاتِ مَنَامُكُمْ بِاللَّيْلِ﴾ (۳۰-۲۳) اور اسی کے نشانات (اور تصرفات) میں سے ہے تمہارا رات میں..... سونا۔

﴿وَجَعَلْنَا رَمَكُم مِّنكُمْ سُبَاتًا﴾ (۷۸-۹) اور نیند کو تمہارے لیے موجب آرام بنایا۔ ﴿لَا تَأْخُذْهُ سِنَّةٌ وَلَا نَوْمٌ﴾ (۲-۱۵۵) نہ اوگھ آتی ہے اور نہ نیند۔

نیز النَوْمَةُ کے معنی خال الذکر یعنی گم نام بھی آتے ہیں۔ کہا جاتا ہے۔

إِسْتَنَامَ فُلَانٌ إِلَى كَذَا: کسی چیز سے اطمینان حاصل کرنا۔ مَنَامَةٌ: لباس خواب۔ نَسَامَتِ السُّوقُ: کساد بازاری ہونا۔

نَامَ الثَّوْبُ: (لازم و متعدی) کپڑے کا پرانا ہونا یا کرنا۔

لینے کے ہیں۔ اور نَاصٍ عَنْهُ يَنْوُصُ نَوْصًا کے معنی کسی کام سے پیچھے ہٹ جانا اور اس سے پھر جانا کے ہیں۔ اور مَنَاصٌ جائے پناہ کو کہتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَلَا تَحِينَ مَنَاصٍ﴾ (۳۸-۳) اور وہاں کہیں پناہ لینے کا وقت نہیں رہا تھا۔

## (ن و ل)

النَّوْلُ کے معنی تناول کے ہیں اور یہ نَسْلْتُ كَذَا اَنْوَلْتُ نَوَلًا سے آتا ہے۔ اور اَنْلَيْتُهُ (افعال) کے معنی کسی چیز کے عطا کرنے کے ہیں۔ اور یہ عَطَوْتُ كَذَا بمعنی تَنَاوَلْتُ اور اَعْطَيْتُهُ بمعنی اَنْلَيْتُهُ کی طرح ہے۔ پھر نَسْلْتُ اصل میں نَوَلْتُ ہے اور محاورہ ہے: وَمَا كَانَ نَوْلُكَ اَنْ تَفْعَلَ كَذَا: یعنی ایسا کرنے میں تمہاری بہتری نہیں ہے۔ شاعر نے کہا ہے ﴿(الوافر) (۳۴۰) جَزَعْتَ وَلَيْسَ ذَلِكَ بِالنَّوَالِ تم گھبرا گئے ہو اور یہ درست نہیں ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ نوال بمعنی صواب ہے اصل میں نوال اس عطا کو کہتے ہیں جو انسان حاصل کرتا ہے۔ لہذا معنی یہ ہیں کہ اس سے تیری مراد حاصل نہیں ہو سکتی۔ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿لَنْ يَنَالَ اللَّهُ لُحُومُهَا وَلَا دِمَاؤُهَا وَلَكِنْ يَنَالُهُ التَّقْوَىٰ مِنْكُمْ﴾ (۳۲-۳۷) خدا تک نہ ان کا گوشت پہنچتا ہے اور نہ خون بلکہ اس تک تمہاری پرہیز گاری پہنچتی ہے۔

## (ن و م)

النَّوْمُ: اس کی تفسیر کی گئی ہے اور مختلف

سے کنایا ہوتا ہے جیسا کہ شَمَخَ بِأَنْفِهِمْ وَأَزَّ وَرَجَانِيَهُ کا محاورہ ہے۔

ان دونوں معنی میں نَامَ کا لفظ تشبیہ کے طور پر مجازاً استعمال ہوتا ہے۔

## (ن و ن)

النُّونُ: حرفِ ہجاء میں سے ایک حرف کا نام

ہے۔ قرآن پاک میں ہے:-

﴿وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُونَ﴾ (۱-۶۸) ن، قلم اور جو (اہل قلم) لکھتے ہیں اس کی قسم۔

اور نون بڑی مچھلی کو بھی کہتے ہیں۔ اور آیت کریمہ:-

﴿وَذَا النُّونِ إِذْ ذَهَبَ﴾ (۲۱-۸۷) اور ذالنون کو یاد کرو جب وہ اپنی قوم سے ناراض ہو کر چل دیئے۔

میں یونس علیہ السلام کو ذالنون کہا ہے۔ کیونکہ انہیں مچھلی نے نگل لیا تھا۔ اور حارث بن ظالم کی تلوار کا نام بھی ذالنون تھا۔

## (ن و ء)

نَاءَ بِجَانِبِهِ يَنْوُءُ وَيَنْأُ کے معنی پہلو پھیر

لینے کے ہیں۔

ابو عبیدہ کے نزدیک نَاءَ مثل نَاعَ کے ہیں جس کے معنی اٹھنے

کے ہیں اور اِنَاءُ تہ کے معنی اٹھانے کے ہیں۔ قرآن پاک

میں ہے:-

﴿مَا إِنَّ مَقَاتِحَهُ لَتَنُوءَ بِالْعُصْبَةِ أُولَى الْقُوَّةِ﴾

(۲۸-۷۶) کہ ان کی کھنیاں ایک طاقت ور جماعت کو

اٹھانی مشکل ہوتیں۔ اور آیت کریمہ:- ﴿نَابِجَانِيَهُ﴾

(۱۷-۸۳) اور پہلو پھیر لیتا ہے۔ میں ایک قراءت نَاءَ

بروزن نَاعَ ہے جس کے معنی پہلو اٹھانا کے ہیں اور یہ تکبر

ابو عمر کا قول ہے کہ نَائِ بروزن نَعِ کے ہے جس کے معنی اعراض کرنے کے ہیں اور ابو عبیدہ کے نزدیک نَسَائِ یسنای کے معنی دور ہونے کے ہیں اور اسی سے اِنْتَائِ بروزن اِفْتَعَلَ ہے اور مُنْتَائِ کے معنی مکان بعید کے ہیں۔ اور اسی سے نُؤِی ہے جس کے معنی خیمے کے گرد گرد گڑھے کے ہیں جو بارش کے پانی کو اس سے دور رکھتا ہے۔ اور نَائِ بِجَانِبِهِ کے معنی پہلو چھو کرنے کے ہیں۔ اَلْنِيَّةُ: یہ نَوَيْت کا مصدر ہے اور کبھی بطور اسم بھی استعمال ہوتا ہے اور اس کے معنی کسی کام کی جانب دل سے متوجہ ہونے کے ہیں۔ یہ نَائِ کے باب سے قطعاً نہیں ہے۔

## (ن ی ل)

اَلنَّيْلُ: ہر اس چیز کو کہتے ہیں جسے انسان اپنے

ہاتھ سے پکڑ لیتا ہے۔ اور یہ نَلْتُهُ اَنَالَهُ نَيْلًا کا مصدر

ہے۔ قرآن پاک میں ہے:-

﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ﴾ (۳-۹۲) تم کبھی نیکی حاصل نہیں کر

سکو گے۔

﴿وَلَا يَنَالُونَ مِنْ عَدُوِّ نَيْلًا﴾ (۹-۱۲۰) یا دشمنوں

سے کوئی چیز لیتے۔

﴿لَمْ يَنَالُوا خَيْرًا﴾ (۳۳-۲۵) کچھ بھلائی حاصل نہ

کر سکے۔



① ہو ابو عمر وبن العلاء بن عمار التیمیسی المازنی عالم البصرة المشہور ۱۵۴ تراجمه فی مراتب النحویین ۱۳-۲۰ و اخبار النحویین (۲۲-۲۵) و طبقات النحویین للزبیدی (۲۸-۳۴) والمزهر (۳۹۸-۳۹۹) والبغیہ (۳۶۷) و طبقات القراء (۱۸۸: ۱-۲۹۲)

## کتاب النّواو

### (و ب ر)

الْوَبْرُ کے معنی بہری اور اون کے ہیں اس کی جمع اَوْبَارُ ہے۔ قرآن پاک میں ہے:-  
﴿وَمِنْ أَصْوَابِهَا وَأَوْبَارِهَا﴾ (۸۰-۱۶) اور ان کی اون اور پشم ہے۔

اور جولوگ پشم کے خیموں میں زندگی بسر کرتے ہیں انہیں سَنَّانُ الْوَبْرِ (بادیہ نشین) کہا جاتا ہے۔  
بَنَاتُ اَوْبَرٍ: ردی قسم کے گھرمے جن پر بہری کی طرح کا مادہ ہوتا ہے۔ چھوٹی اور ردی قسم کی سانپ کی چھتری۔  
وَبَرَّتِ الْأَرْزَبُ: خرگوش کا اپنے پاؤں کے پچھلے حصہ کے لٹکے ہوئے بالوں سے اپنے قدموں کے نشانات کو مٹانا۔ وَبَرًا الرَّجُلُ فِي مَنْزِلِهِ: اپنے مکان سے باہر نہ نکلتا۔ یہ وَبَرٌ یعنی پشم کے ساتھ تشبیہ دے کر کہا جاتا ہے گویا وہ اپنے گھر کے اندر پشم کی طرح پڑا ہوا ہے، جیسا کہ تَلَبَّدَ بِمَكَانٍ كَذَا کا محاورہ ہے یعنی وہ اپنے مکان کا لبدہ بنا ہوا ہے۔  
وَبَارٍ بَعْضُ نَمَلٍ کہے کہ قوم عاد کے ایک علاقہ کا نام ہے۔

### (و ب ق)

وَبَقَ (ض) وَبَقَا وَمَوْبِقًا ..... کے معنی ضعیف اور گراں بار ہو کر ہلاک ہو جانے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:-  
﴿وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ مَّوْبِقًا﴾ (۵۲-۱۸) اور ہم ان کے

بیچ میں ہلاکت کی جگہ بنادیں گے۔  
أَوْبَقَهُ: کڈا ہلاک کرنا۔

﴿أَوْ يُؤْبِقُهُنَّ بِمَا كَسَبُوا﴾ (۳۲-۳۳) یا ان کے اعمال کے سبب ان کو تباہ کر دے۔

### (و ب ل)

الْوَبْلُ وَالْوَابِلُ کے معنی بڑی اور بھاری بوندوں والی بارش کے ہیں۔ چنانچہ فرمایا:-  
﴿فَأَصَابَهُ وَابِلٌ فَتَرَكَهُ صَلْدًا﴾ (۲-۲۶۵) مثال ایک باغ کی سی ہے جو اونچی جگہ پر واقع ہو (جب) اس پر بارش ہو۔

پھر معنی نقل کے لحاظ سے ہر اس چیز کو وِبَالٌ کہا جاتا ہے۔ جس سے ضرر پہنچنے کا اندیشہ ہو۔ قرآن پاک میں ہے:-  
﴿ذَاقُوا وَبَالَ أَمْرِكُمْ﴾ (۵۹-۱۵) اپنے کاموں کی سزا کا مزہ چکھ چکے ہیں۔

وَبَيْلٌ: وہ طعام یا گھاس جس کے کھانے سے بد بھمی اور ضرر کا اندیشہ ہو۔ قرآن پاک میں ہے۔  
﴿فَاخْذُنَاْ أَخْذًا وَبِيلًا﴾ (۳-۱۶) تو ہم نے اس کو بڑے وبال میں پکڑ لیا۔

### (و ت د)

الْوَتْدُ وَالْوَتْدُ (ج اَوْتَادًا) کے معنی میخ کے ہیں۔ وَتْدَتُهُ اِتْدَتُهُ وَتْدَا کے معنی کسی چیز میں میخ لگا کر اسے مضبوط کرنے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:-

عقلی کمزوری یا کوئی دوسرا عیب نہیں ہے اور تَوَاتُر سے  
وَتِيرَة ہے جس کے معنی سَجِيَّة (طبعی عادت کے) بھی  
آتے ہیں۔ نیز وَتِيرَة کا لفظ حسب ذیل معانی میں  
استعمال ہوتا ہے۔

(۱) وہ حلقہ جس پر بچے تیر اندازی کی مشق کرتے ہیں۔

(۲) نرم زمین

(۳) تاک کے نختوں کا درمیانی پردہ۔

### (وَتَن)

الْوَتَيْنُ: (رگ جان) اس رگ کو کہتے ہیں جو جگر کو خون  
پہنچاتی ہے۔ اور اس کے کٹ جانے سے انسان مر جاتا  
ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ  
الْوَتَيْنِ﴾ (۶۹-۷۶) پھر اس کی رگ گردن کاٹ ڈالتے۔  
الْمُؤَاتِنَةُ: (مقابلہ) کے معنی شاہ رگ کی طرح قریب  
ہونے کے ہیں گویا آیت:

﴿وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ﴾

(۵۰-۱۶) اور ہم اس کی رگ جان سے بھی اس کے زیادہ  
قریب ہیں۔ میں بھی اسی معنی کی طرف اشارہ ہے۔

اِسْتَوْتَنَ الْاِبِلُ: موٹاپے کی وجہ سے اونٹ کی رگ  
گردن کا غلیظ اور موٹا ہو جانا۔

### (وَتَق)

وَتَقْتُ بِهِ اَبْقُ رَقَّةً: کسی پر اعتماد کرنا اور

مطمئن ہونا۔

اَوْتَقَهُ..... (افعال) زنجیر میں جکڑنا، رسی سے کس کر

﴿وَالْجِبَالِ اَوْ تَادَا﴾ (۷۸-۷۷) اور پہاڑوں کو (اس  
کی) میخیں نہیں ٹھہرایا۔ اور پہاڑوں کو زمین کی میخیں  
ٹھہرانے کی کیفیت اس کے بعد بیان ہوگی۔ \* اور کبھی  
وَتَدُّ کی تاء کو ساکن اور پھر دال میں ادغام کر کے وَدَّعِی  
پڑھ لیتے ہیں۔

الْوَتْدَانِ: دونوں کانوں کے سامنے کے حصے جو میخ کی  
طرح ابھرے ہوئے ہوتے ہیں۔

### (وَتَر)

الْوَتْرُ: (طاق) یہ اعدا و شفع کی ضد ہے جس کی  
بحث آیت ﴿وَالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ﴾ (۸۹-۳) اور جفت  
اور طاق کی (قسم) کے تحت گزر چکی ہے۔ \* اَوْتَرَ- وتر  
نماز پڑھنا۔ اَلْوَتْرُ وَالْوَتْرُ وَالْوَتْرُ کے معنی کینہ کے ہیں  
اور اسی سے وَتْرَتُهُ (ض) ہے جس کے معنی کسی کو تکلیف  
پہنچانے یا اس کا حق کم کرنے کے ہیں۔ قرآن پاک میں  
ہے۔

﴿وَلَنْ يَّتْرِكُمْ اَعْمَالُكُمْ﴾ (۳۷-۳۵) وہ ہرگز  
تمہارے اعمال کو کم (اور کم) نہیں کرے گا۔

اَلتَّوَاتُرُ: کسی چیز کا یکے بعد دیگرے آنا۔ محاورہ ہے  
جَاءَ وَتَتَرَى (وہ یکے بعد دیگرے کچھ وقفہ کے بعد  
آئے) قرآن پاک میں ہے:-

﴿ثُمَّ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرَى﴾ (۲۳-۴۳) پھر ہم نے  
درپے درپے پیغمبر بھیجتے رہے۔

لَا وَتِيرَةً فِیْ كَذَا وَلَا عَمِيْرَةً وَلَا غَيْرُ: اس میں

۱ وفی القرآن: وفرعون ذی الاتاد (۳۸-۱۲) قال البیضاوی معناه ذوالجموع الکثیرة وفی الکتاب ذوالملک الثابت

(کذا فی الروح ۲۳-۱۵۵)

۲ ملاحظہ ہو عنوان (ش ف ع)

باندھنا۔ نَاقَةٌ مَوْثِقَةٌ الْخَلْقِ: مضبوط بناوٹ کی اونٹنی۔

### (و ث ن)

الْوَثْنُ: (بت) اس کی جمع اَوَثَانٌ ہے اور اَوَثَانٌ ان پتھروں کو کہا گیا ہے جن کی جاہلیت میں پرستش کی جاتی تھی۔ قرآن پاک میں ہے:-

﴿إِنَّمَا اتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُونِ اللَّهِ أَوْثَانًا﴾ (۲۹-۲۵) کہ تم جو خدا کو چھوڑ کر بتوں کو لے بیٹھے ہو۔  
اَوَثْنْتُ فُلَانًا: کسی کو بڑا عطیہ دینا۔  
اَوَثْنْتُ مِنْ كَذَا: کسی کام کو کثرت سے کرنا۔

### (و ج ب)

الْوَجُوبُ: (ض) کے معنی ثبوت کے ہیں اور واجب کا لفظ کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

(۱) ممکن کے بالمقابل۔ یعنی وہ چیز جو ضروری الثبوت ہو اور اس کا ارتقاع فرض کرنے سے محال لازم آئے جیسے کہا جاتا ہے۔

وُجُودُ الْوَاحِدِ مَعَ وُجُودِ الْاِثْنَيْنِ وَاجِبٌ: دو کے ساتھ ایک کا پایا جانا ضروری ہے۔

(۲) وہ کام جس کے نہ کرنے سے انسان قابل ملامت سمجھا جائے یہ دو قسم پر ہے۔ (الف) واجب مِنْ جِهَةِ الْعَقْلِ،

جیسے اللہ کی وحدانیت اور نبوت کہ ان کی معرفت عقلاً واجب ہے۔ (ب) واجب مِنْ جِهَةِ الشَّرْعِ، یعنی وہ فعل جس

کا وجوب شریعت سے ثابت ہو جیسے: وَجُوبُ الْعِبَادَاتِ الْمُوظَّفَةِ یعنی فرضی عبادات کا وجوب

وَجَبَتِ الشَّمْسُ سُرُجُهَا یعنی سورج کے گرنے یعنی غروب ہونے کے ہیں۔ چنانچہ معنی سقوط کے لحاظ سے فرمایا۔

الْوَثَاقُ وَالْوَثَاقُ اس زنجیر یاری کو کہتے ہیں۔ جس سے کسی چیز کو کس کر باندھ دیا جائے۔ قرآن پاک میں ہے۔  
﴿وَلَا يُوثِقُ وَثَاقَهُ أَحَدٌ﴾ (۸۹-۲۶) اور نہ کوئی ایسا جکڑنا جکڑے گا۔

﴿حَتَّىٰ إِذَا انْخَسَمْتُمْوهُمْ فَشَدُّوا الْوَثَاقَ﴾ (۳۷-۴۷) یہاں تک کہ جب ان کو خوب قتل کر چکوتو (جو زندہ پکڑے جائیں ان کو) قید کرلو۔

الْوَيْثَاقُ کے معنی پختہ عہد و پیمان کے ہیں۔ جو قسموں کے ساتھ مؤکد کیا گیا ہو۔ قرآن پاک میں ہے:-

﴿وَإِذْ أَخَذْنَا مِنَ النَّبِيِّينَ﴾ (۳۳-۷) اور جب ہم نے پیغمبروں سے عہد لیا۔

﴿وَإِذْ أَخَذْنَا مِنْهُمْ مِيثَاقًا غَلِيظًا﴾ (۳۳-۷) اور عہد بھی ان سے پکا لیا۔

الْمَوْثِقُ: (اسم) پختہ عہد و پیمان کو کہتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:-

﴿حَتَّىٰ تَوَثُّوْنَ مَوْثِقًا مِّنَ اللَّهِ..... مَوْثِقَهُمْ﴾ (۱۲-۶۶) کہ جب تک تم خدا کا عہد نہ دو۔

الْوُثْقَى: یہ اَوْثَقُ (فعل) کی مؤنث ہے اور قریب قریب مَوْثِقُ کے ہم معنی ہے قرآن پاک میں ہے:-

﴿فَقَدْ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَى﴾ (۲-۲۵۶) اس نے ایسی مضبوط رسی ہاتھ میں پکڑ لی۔

ثِقَّةٌ: قابل بھروسہ آدمی، مفرد اور جمع دونوں پر بولا جاتا ہے۔ جیسے رَجُلٌ ثِقَّةٌ وَقَوْمٌ ثِقَّةٌ اور بطور استعارہ

مَوْثِقٌ (معتمد) کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔



قوت شہویہ کے ساتھ ہے۔

وَجَدْتُ الْحُزْنَ أَوْ السَّخَطَ (میں نے غصہ یا غم کو پایا) اس کا تعلق قوت غصبیہ کے ساتھ ہے اور بذریعہ عقل کے کسی چیز کو پالینا جیسے اللہ تعالیٰ یا نبوت کی معرفت کہ اسے بھی وجدان کہا جاتا ہے۔ جب وجود (پالینا) کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی جائے تو اس کے معنی محض کسی چیز کا علم حاصل کر لینا کے ہوتے ہیں۔ کیونکہ ذات باری تعالیٰ جوارح اور آلات کے ذریعہ کسی چیز کو حاصل کرنے سے منزہ اور پاک ہے۔ چنانچہ فرمایا:-

﴿وَمَا وَجَدْنَا لِأَكْثَرِهِمْ مِنْ عَهْدٍ وَإِن وَجَدْنَا أَكْثَرَهُمْ لَفَاسِقِينَ﴾ (۷-۱۰۱) اور ہم نے ان میں سے اکثروں میں عہد (کا نباہ) نہیں دیکھا اور ان میں اکثروں کو (دیکھا تو) ..... بد عہد دیکھا اس کے بالمقابل معدوم کے بھی کئی معنی آتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کا کسی چیز کو پالینا کسی ایسے طریق سے ہوتا ہے جو تمام مذکورہ وجوہ سے بالا ہو۔ اور کبھی کسی چیز پر تمکن (قدرت) حاصل کر لینے کو بھی وجود سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدْتُمُوهُمْ﴾ (۵-۹) تم مشرکوں پر جہاں قدرت پاؤ قتل کرو اور آیت کریمہ:-

﴿فَوَجَدَ فِيهَا رَجُلَيْنِ يَقْتَتِلَانِ﴾ (۲۸-۱۵) تو دیکھا کہ وہاں دو شخص لڑ رہے ہیں۔ میں بھی وجد بمعنی تمکن ہے۔ اور آیت کریمہ:-

﴿وَجَدْتُ امْرَأَةً.....يَسْجُدُونَ لِلشَّمْسِ﴾

(۲۷-۲۳-۲۲) میں نے ایک عورت دیکھی ..... (وہ اور اس کی قوم) آفتاب کو سجدہ کرتے ہیں، میں وجود بلحاظ بصر

﴿فَإِذَا وَجَبَتْ جُنُوبُهَا﴾ (۲۳-۳۶) تو جب وہ اپنے پہلوں پر گر پڑیں۔

وَجَبَ الْقَلْبُ وَجُوبًا: دل کا دھڑکنا، اس میں بھی معنی سقوط معتبر ہے اور اَوْجَبَ (افعال) بھی ان تمام معانی میں استعمال ہوتا ہے اور کبار گناہ کو مُوجِبَات کہا گیا ہے کیونکہ ان کے ارتکاب سے دوزخ کا عذاب واجب ہو جاتا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ واجب کا استعمال دو طرح پر ہوتا ہے۔ ایک وہ چیز جس کا عدم ناممکن ہو جیسے کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ واجب الوجود ہے۔ دوسرے واجب اسے کہتے ہیں جس میں موجود ہونے کی صلاحیت پیدا ہو چکی ہو اور فقہاء کا یہ کہنا کہ واجب وہ ہے جس کے نہ کرنے سے انسان عقوبت کا مستحق ہو تو یہ تَعْرِيفُ الشَّيْءِ بِالْعَوَارِضِ کے قبیل سے ہے۔ کیونکہ استحقاق عقوبت اس کا وصف لازم نہیں ہے۔ اور یہ ایسے ہی ہے۔ جس طرح کہ انسان کی تعریف میں کہا جائے: مُسْتَقِيمُ الْقَامَةِ وَالْمَاشِي عَلَى الرَّجْلَيْنِ۔

### (وَجَدَ)

الْوُجُودُ (ض) کے معنی کسی چیز کو پالینا کے

ہیں اور یہ کئی طرح پر استعمال ہوتا ہے۔

(۱) حواس غصہ میں سے کسی ایک حاسہ کے ساتھ ادراک کرنا جیسے وَجَدْتُ زَيْدًا (حاسہ بصر) وَجَدْتُ طَعْمَهُ (حاسہ ذوق) وَجَدْتُ سَمْعَهُ (حاسہ سمع) وَجَدْتُ خَشَوْنَتَهُ (حاسہ لمس)

(۲) ثَوْبِی بِلِطْنِہ کے ساتھ کسی چیز کا ادراک کرنا جیسے وَجَدْتُ الشَّيْعَ (میں نے سیری کو پایا) کہ اس کا تعلق

کرنے کے ہیں۔ چنانچہ فرمایا۔

﴿فَأَوْجَسَ فِي نَفْسِهِ خِيفَةً مُّوسَى﴾ (۲۰-۶۰)  
(اس وقت) موسیٰ علیہ السلام نے اپنے دل میں خوف معلوم کیا۔  
لہذا اوجس اس حالت کو کہتے ہیں جو کسی (خطرہ) کے بعد  
دل میں پیدا ہوتی ہے اور جو چیز مبداء بنتی ہے اسے  
ہاجس اور اس کے بعد کی حالت کو واجس کہا جاتا  
ہے۔

### (و ج ف)

الْوَجِيفُ کے معنی تیز رفتاری کے ہیں اور  
أَوْجِفْتُ الْبَعِيرَ کے معنی ہیں: میں نے اونٹ کو تیز  
دوڑایا۔ قرآن پاک میں ہے۔  
﴿فَمَا أَوْجِفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ وَلَا رِكَابٍ﴾  
(۵۹-۶) کیونکہ اس کے لیے نہ تم نے گھوڑے دوڑائے  
نہ اونٹ۔ مثل مشہور ہے۔

أَدَلَّ فَاَمَلَّ وَأَوْجَفَ فَأَعْجَفَ: یعنی گھوڑے کو تیز  
دوڑا کر دبا کر دیا۔ وَجَفَ الشَّيْءُ: کسی چیز کا مضطرب  
ہونا۔ قَلْبٌ وَاجِفٌ: مضطرب دل جیسے فرمایا:۔  
﴿قُلُوبٌ يَوْمَئِذٍ وَاجِفَةٌ﴾ (۷۹-۸) اس دن  
(لوگوں کے) دل خائف ہو رہے ہوں گے۔  
یعنی مضطرب اور پریشان ہوں گے جیسا کہ قلوب کے  
اضطراب کے لیے طَائِرَةٌ يَا خَافِقَةٌ وغیرہ الفاظ بطور  
استعارہ ہوتے ہیں۔

### (و ج ل)

الْوَجَلُ کے معنی دل ہی دل میں خوف محسوس  
کرنے کے ہیں اور یہ باب وَجَلَ يَوْجَلُ کا مصدر ہے۔  
جس کے معنی ڈرنے یا گھبرانے کے ہیں۔ چنانچہ فرمایا:۔

اور بصیرت مراد ہے کیونکہ ہد ہد نے آنکھوں سے ان کو  
دیکھا بھی تھا اور پھر بصیرت سے ان کی حالت کا اندازہ بھی  
لگایا تھا۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو اس کا وَجَدْتُهَا وَقَوْمَهَا  
الایۃ کہنا صحیح نہیں ہو سکتا (کیونکہ تمام قوم کو تو اس نے  
سورج کی پرستش کرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا بلکہ کچھ اعتبار  
اور قیاس سے بھی کام لیا تھا) اور آیت:

﴿فَلَمْ تَجِدُوا مَاءً﴾ (۴-۴۳) اور تمہیں پانی نہ ملے  
میں لَمْ تَجِدُوا بمعنی لَمْ تَقْدِرُوا ہے یعنی اگر تمہیں پانی  
پر قدرت نہ ہو۔ اور آیت:۔  
﴿مِنْ وَجْدِكُمْ﴾ (۶۵-۶) مقدور کے مطابق۔

میں وَجَدَ سے مقدور یا مالی حالت مراد ہے۔ اور غنی  
(تو نگری) کو وَجْدٌ اور جِدَّةٌ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور  
وَجْدٌ میں وَجْدٌ اور وَجْدٌ (بفتح واو و کسرہ آں) بھی  
حکایت کیا گیا ہے۔ اور وَجْدٌ کے معنی غم اور محبت کے بھی  
آتے ہیں۔ اور مَوْجِدَةٌ غصہ کو کہتے ہیں۔ اور وجود کے  
معنی گشدہ چیز کو پالینا بھی آتے ہیں۔  
بعض نے کہا ہے کہ موجودات تین قسم پر ہیں۔ ایک وہ جو  
ازلی اور ابدی ہو۔ یعنی اس کی ابتداء اور انتہا نہ ہو اور یہ  
صرف ذات باری تعالیٰ ہی ہے۔ دوم وہ ہے جو مبداء اور  
منتہی رکھتی ہو جیسے اس دنیا میں انسان اور عالم دنیا کے دیگر  
جواہر۔ تیسری قسم موجودات کی وہ ہے جن کا مبداء تو ہے  
لیکن منتہی نہیں ہے۔ جیسے عالم آخرت کا انسان۔

### (و ج س)

الْوَجَسُ کے معنی صورت خفی کے ہیں اور  
تَوَجَّسَ (تفعل) خفی آواز سننے کی کوشش کرنے کو کہتے  
ہیں۔ اور اِنْجَسَ کے معنی دل میں کوئی بات محسوس

ہیں۔ جن سے ذات باری تعالیٰ کی رضا جوئی مقصود ہوتی ہے۔ نیز فرمایا:-

﴿فَإَيْنَمَا تَوَلَّوْا فَثَمَّ وَجْهَ اللَّهِ﴾ (۲-۱۱۵) تو جہدہ تم رخ کرو ادھر اللہ کی ذات ہے۔

﴿كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ﴾ (۲۸-۸۸) اس کی ذات پاک کے سوا ہر چیز فنا ہونے والی ہے۔  
﴿يُرِيدُونَ وَجْهَ اللَّهِ﴾ (۳۰-۳۸) جو لوگ رضائے خدا کے طالب ہیں۔

﴿إِنَّمَا نَطْعُمُكُمْ لِيُوجِبَ اللَّهُ﴾ (۷۶-۹) اور کہتے ہیں کہ ہم تو خالص خدا کے لیے کھلاتے ہیں۔

ان تمام آیات میں بعض نے کہا ہے کہ وجہ اللہ سے اللہ تعالیٰ کی ذات مراد ہے لہذا آیت کُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ کے معنی یہ ہیں کہ باستثناء ذات باری تعالیٰ ہر چیز نابود ہونے والی ہے۔ اور اسی قسم کی دوسری آیات میں بھی یہی معنی مراد ہیں۔ مروی ہے کہ ابی عبد اللہ بن الرضا نے کہا ہے کہ سبحان اللہ لوگ بہت بڑا کلمہ کہتے ہیں۔

آیت هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ میں توجہ کے معنی جہت قصد کے ہیں۔ اور مطلب یہ ہے کہ بقا صرف انہیں اعمال کو حاصل ہوگی۔ جن سے ذات باری تعالیٰ کا قصد کیا جائے اور دیگر آیات بھی اسی معنی پر محمول ہیں۔ اور یہی معنی آیت ﴿يُرِيدُونَ وَجْهَ اللَّهِ﴾ (۳۰-۳۸) جو لوگ رضائے خدا کے طالب ہیں۔ اور

﴿يُرِيدُونَ وَجْهَهُ﴾ (۱۸-۳۸) اس کی خوشنودی کے طالب ہیں۔ میں مراد ہیں۔ اور آیت:-

﴿وَأَقِيمُوا وُجُوهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ﴾ (۷-۲۹) اور ہر نماز کے وقت سیدھا (قبلہ کی طرف)

﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ﴾ (۲-۸) مومن تو وہ ہیں کہ جب خدا کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں۔

﴿إِنَّا مِنْكُمْ وَاجِلُونَ﴾ (۱۵-۵۲) (انہوں نے کہا) ہمیں تو تم سے ڈر لگتا ہے۔ یہ وجہ کی جمع ہے جس کے

معنی ہیں: ڈرنے والا۔

﴿وَقُلُوبُهُمْ وَجِلَةٌ﴾ (۲۳-۶۰) اور ان کے دل ..... ڈرتے رہتے ہیں۔

## (وجہ)

الْوَجْهُ کے اصل معنی چہرہ کے ہیں۔ ج وَجُوۃً جیسے فرمایا:-

﴿فَاغْسِلُوا وُجُوهَكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ﴾ (۵-۶) تو اپنے منہ اور ہاتھ دھو لیا کرو۔

﴿وَتَغْسِلُوا وَجُوهَهُمُ النَّارَ﴾ (۱۳-۵۰) اور ان کے چہروں پر آگ لپٹ رہی ہوگی۔

اور چونکہ کہ استقبال کے وقت سب سے پہلے انسان کا چہرہ سامنے آتا ہے۔ اس لیے کسی چیز کا وہ حصہ جو سب سے پہلے سامنے آئے اسے وجہ کہہ لیتے ہیں۔ نیز ہر چیز کے اشرف حصہ اور مبداء پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ جیسے وَجْهٌ كَذَا اس کا اول حصہ۔

وَجْهَ النَّهَارِ دن کا اول حصہ اور آیت کریمہ:-

﴿وَيَبْقَى وَجْهَ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ﴾ (۵۵-۲۷) اور تمہارے پروردگار ہی کی ذات (بابرکت)

جو صاحب جلال و عظمت ہے۔ ..... باقی رہ جائے گی۔

میں بعض نے وجہ سے ذات باری تعالیٰ مراد لی ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ وَجْهٌ رَبِّكَ سے اعمال صالحہ مراد

رخ کیا کرو۔ نہیں (دیتا کہ) اس پر کسی کا احسان ہے جس کا وہ بدلہ

اتارتا ہے۔ بلکہ اپنے خداوند اعلیٰ کی رضا مندی حاصل کرنے کے لیے دیتا ہے۔ اور آیت:-

﴿اٰمِنُوْا بِالَّذِيْ اَنْزَلَ عَلٰى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ﴾ (۳-۷۲) کہ جو کتاب مومنوں پر نازل ہوئی

اس پر دن کے شروع میں تو ایمان لے آیا کرو۔ میں وجہ النہار کے معنی دن کے شروع حصہ کے ہیں۔ وَاجْهَتُ

فُلَانًا کے معنی کسی کے آگے سامنے ہونے کے ہیں۔ اور وَجْهٌ کے معنی قصد بھی آتے ہیں اور جِہۃ اور وَجْهۃ کے

معنی مقصد کے ہیں یعنی کسی چیز کی طرف متوجہ ہونے کی جگہ۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَلِكُلِّ وَجْهَةٌ مِّنْهُ مَوْلٰیہَا﴾ (۲-۱۳۸) اور ہر ایک فرقے کے لیے ایک سمت مقرر ہے۔ تو وَجْهۃ سے

شریعت کی طرف اشارہ ہے جیسا کہ دوسری آیت میں فرمایا:-

﴿لِكُلِّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَمِنْهَاجًا﴾ (۵-۲۸) ہم نے تم میں سے ہر ایک (فرقے) کے لیے

ایک دستور اور طریقہ مقرر کیا ہے۔

الْجَاهُ: مرتبہ۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ وجہ سے مقلوب ہے لیکن وجہ کا لفظ عزت مرتبہ اور چہرہ دونوں معنی میں استعمال

ہوتا ہے۔ اور جَاہ کے معنی صرف مرتبہ کے آتے ہیں۔ وَجْهَتُ الشَّيْءَ کے معنی کسی چیز کو ایک جانب بھیجنے کے

ہیں اور تَوَجَّهَ کے معنی از خود جانے کے۔ فُلَانٌ وَجْهَ الْقَوْمِ کے معنی رئیس قوم کے ہیں۔ جیسا کہ قوم کے رئیس اور سردار کو رَأْسُهُمْ وَعَيْنُهُمْ اور اسی

قسم کے دیگر الفاظ سے تعبیر کر لیتے ہیں۔ فُلَانٌ وَجْهٌ

میں بعض نے کہا ہے کہ وجہ سے مراد چہرے ہیں۔ اور یہ فَعَلْتُ كَذَا بِيَدِي کی طرح بطور استعارہ کے استعمال

ہوتا ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ وجہ کے معنی متوجہ ہونے کے ہیں اور اقامت کے معنی استقامت کا قصد کرنے کے

ہیں اور مطلب یہ ہے کہ نماز میں خالص رضا الہی کا قصد کرو۔ (یعنی ریا کاری وغیرہ سے کام نہ لو) چنانچہ آیات

﴿فَاِنْ حَاجُّوْكَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ﴾ (۳-۲۰) (اے پیغمبر) اگر لوگ تم سے جھگڑنے لگیں تو

کہہ دو کہ میں اور میرے پیروکار تو اللہ کے فرمانبردار ہو چکے ہیں۔

﴿وَمَنْ يُسْلِمْ وَجْهَهُ اِلَى اللّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَقَدْ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰی﴾ (۳۱-۲۲) اور

جو اپنے تئیں خدا کا فرمانبردار کر دے اور نیکو کار بھی ہو تو اس نے مضبوط دستاویز ہاتھ میں لے لی۔ ﴿وَمَنْ اَحْسَنُ

دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهُ﴾ (۴-۱۲۵) اور اس شخص سے کس کا دین اچھا ہو سکتا ہے۔ جس نے حکم خدا کو قبول

کیا۔

﴿فَاقْمْ وَّجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِیْفًا﴾ (۳۰-۳۰) تو تم ایک طرف ہو کر دین (خدا کے رستے) پر سیدھا منہ کیے

چلے جاؤ۔ میں وجہ سے خدا کی رضا جوئی اور اس کی جانب متوجہ ہونا

بھی مراد ہو سکتا ہے۔ اور استعارہ کے طور پر مذہب یا طریقہ بھی مراد لے سکتے ہیں۔ اسی طرح فرمایا:-

﴿وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهُ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰی اِلَّا اِبْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّہٖ اَلَا عَلٰی﴾ (۹۲-۲۰، ۱۹) اور (اس لیے)

ہو جیسے: جَرَفَةٌ وَاحِدَةٌ۔

(۳) یکتا اور بے نظیر خواہ وہ یکتائی بلحاظ خلقت کے ہو جیسے الشَّمْسُ وَاحِدَةٌ یا بلحاظ دعوے فضیلت کے ہو جیسے فُلَانٌ وَاحِدٌ عَصْرُهُ: فلاں یکتائے روزگار ہے۔ یا هُوَ نَسِيجٌ وَاحِدٌ: (وہ اپنی طرز کا) ایک ہے یعنی صاحب الرائے ہونے میں اس کا کوئی شبہ نہیں۔<sup>①</sup>  
(۴) وہ جس میں تجزی متنع ہو خواہ وہ امتناع صفر حجم کی وجہ سے ہو، جیسے ذرہ یا صلابت کی وجہ سے، جیسے الماس یعنی ہیرا۔

(۵) بمعنی مبدا آتا ہے۔ خواہ وہ مبداۓ اعداد ہو جیسے وَاحِدٌ اِثْنَانٌ یا مبداۓ خط جیسے نقطہ۔

الحاصل: ان سب اقسام کو وحدۃ کے معنی عارض ہوتے ہیں لیکن۔ (۶) جب واحد کا لفظ باری تعالیٰ پر بولا جاتا ہے۔ جیسے اَللّٰهُ وَاحِدٌ تو اس سے مراد وہ ذات ہوتی ہے جس میں تجزی یا تکثر ناممکن ہو اور اس قسم کی وحدت چونکہ بمشکل ہی سمجھ میں آ سکتی ہے۔ اس لیے فرمایا:

﴿وَإِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَأَزَّتْ قُلُوبُ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ﴾ (۳۹-۴۸) اور جب تنہا خدا کا ذکر کیا جاتا ہے۔ تو جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ان کے دل منقبض ہو جاتے ہیں۔

اَلْوَحْدُ کے معنی اکیلا کے ہیں اور غیر اللہ کی صفت بھی واقع ہوتا ہے۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے (البسيط)

(۴۴۱) عَلٰی مُسْتَأْنِسٍ وَحْدٌ

لیکن اَحَدٌ کا لفظ صرف اللہ تعالیٰ پر ہی بولا جاتا ہے۔ جیسا

أَوْ ذُو جَاہٍ: فلاں صاحب وجاہت ہے۔ قرآن پاک میں ہے:-

﴿وَجِيهًا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ﴾ (۳-۴۴) اور جو دنیا اور آخرت میں با آبرو ہوگا۔

ایک محاورہ ہے۔  
أَحْمَقُ مَا يَتَوَجَّهُ بِهِ: یعنی وہ انتہائی درجہ کا احمق ہے اور کبھی یہ کو حذف کر کے بھی بولتے ہیں۔ اور مطلب یہ ہے کہ حماقت کی وجہ سے وہ کوئی کام بھی صحیح طور پر نہیں کر سکتا۔

اَلتَّوَجُّهُ: علم عروض میں اس حرف کو کہتے ہیں۔ جو الف تائیس اور حرف روی کے درمیان ہو۔

## (و ح د)

اَلْوَحْدَةُ کے معنی یگانگت کے ہیں اور واحدۃ در حقیقت وہ چیز ہے جس کا قطعاً کوئی جزء نہ ہو پھر اس کا اطلاق ہر موجود پر ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ ہر اسم عدد اس کے ساتھ متصف ہو سکتا ہے۔ جیسے عَشْرَةٌ وَاحِدَةٌ (ایک عشرہ) مِائَةٌ وَاحِدَةٌ (ایک سو) اَلْفٌ وَاحِدٌ (ایک ہزار) پس وَاحِدٌ کا لفظ مشترک ہے جو چھ طرح پر استعمال ہوتا ہے۔

(۱) واحد بلحاظ جنس یا نوع کے، جیسے کہا جاتا ہے کہ انسان اور فرس دونوں ایک ہی ہیں یعنی بلحاظ جنس ایک ہی ہیں۔ یا زید اور عمر و ایک ہیں یعنی بلحاظ نوع کے ایک ہیں۔

(۲) واحد بالا اتصال۔ یعنی کئی اجزاء مل کر ایک ہو جائیں عام اس سے کہ وہ اتصال۔ خلقتی ہو جیسے شخص واحد یا صناعی

① و قالت عائشة في عمرّ كان والله احوذ يا نسيج وحده اللسان (وحد ان س)

② قاله النابغة "وتكملة البيت۔ كان رحلى وقد زال النهار بنا۔ هزی الجليل على مستانس وحده وقد مر تخريجه في (ان س)

اور اس کے معنی سرعت کو متضمن ہونے کی وجہ سے ہر تیز رفتار معاملہ کو اَمْرٌ وَحِیٌ کہا جاتا ہے۔ اور یہ (وحی) کبھی رمز و تعریض کے طور پر بذریعہ کلام کے ہوتی ہے۔ اور کبھی (۲) صوت مجزئ کی صورت میں ہوتی ہے۔ یعنی اس میں ترکیب الفاظ نہیں ہوتی۔ اور کبھی (۳) بذریعہ جوارح کے اور کبھی (۴) بذریعہ کتابت کے۔ اس بنا پر آیت۔

﴿فَخَرَجَ عَلَى قَوْمِهِ مِنَ الْمِحْرَابِ فَأَوْحَى إِلَيْهِمْ أَنْ سَبِّحُوا بُكْرَةً وَعَشِيًّا﴾ (۱۹-۱۱) پھر وہ (عبادت کے) حجرے سے نکل کر اپنی قوم کے پاس آئے تو ان سے اشارے سے کہا کہ صبح و شام خدا کو یاد کرتے رہو۔

میں بعض نے اَوْحَى کے معنی رمز اور بعض نے كَتَبَ (لکھنا) اور بعض نے اعتبار کر لینا کیے ہیں اور آیت: ﴿وَكَذَلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيْطَانِ الْإِنْسِ وَالْجِنِّ يُوحِي بَعْضُهُمْ إِلَى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُورًا﴾ (۶-۱۱۳) اور اسی طرح ہم نے شیاطین (سیرت) جنوں اور انسانوں کو ہر پیغمبر کا دشمن بنا دیا تھا۔ وہ دھوکہ دینے کے لیے ایک دوسرے کے دل میں طمع کی باتیں ڈالتے رہتے تھے۔

میں بھی وحی کا لفظ مذکورہ بالا وجہ پر حمل کیا جاسکتا ہے۔ اور آیت:

﴿وَإِنَّ الشَّيَاطِينَ لَيُوحُونَ إِلَى أَوْلِيَائِهِمْ﴾ (۶-۱۲۲) اور شیطان (لوگ) اپنے رفیقوں کے دلوں پر یہ بات ڈالتے ہیں۔

میں بعض نے کہا ہے کہ اِنْصَاءٌ بمعنی وسوسہ اندازی کے

کہ پہلے گزر چکا ہے اور هُوَ نَسِيبٌ وَاحِدٌ کی طرح فُلَانٌ لَا وَاحِدَ لَهُ کا محاورہ بھی مشہور ہے اور زم کے لیے هُوَ عَيْبَرٌ وَاحِدٌ يَا حُجَيْشٌ وَاحِدٌ کہا جاتا ہے یعنی وہ کمزور رائے ہے اور جب معمولی سی مذمت کرنا مقصود ہوتی ہے تَوْرَجِلُ وَاحِدٌ کہہ دیتے ہیں۔

## (و ح ش)

الْوَحْشُ: یہ الْإِنْسُ کی ضد ہے اور وہ جانور جو انسان سے مانوس نہیں ہوتے، انہیں وَحْشٌ کہا جاتا ہے۔ اس کی جمع وَحُوشٌ ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔ ﴿وَإِذَا الْوُحُوشُ حُشِرَتْ﴾ (۵-۸۱) اور جب وحش جانور جمع کیے جائیں گے۔

اور مَكَانٌ وَحْشٌ: اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں کوئی آبادی نہ ہو۔ جیسے کہا جاتا ہے۔

لَقَيْتُهُ بِوَحْشٍ اِصْمِتَ یعنی میں نے ویران جگہ میں اس سے ملاقات کی۔ ①

بَاتَ فُلَانٌ وَحْشًا: اس نے بھوکے رات گزاری اس کی جمع اَوْحَاشٌ آتی ہے۔

اور وَحْشٌ سے اَرْضٌ مُوَحِّشَةٌ (ویران جگہ) کا محاورہ ہے اور اس کی طرف نسبت کے وقت وَحْشِيٌّ کہا جاتا ہے۔ اور وَحْشِيٌّ اِنْسِيٌّ کے بالمقابل آتا ہے۔ اور کسی شے کی ہر وہ جہت جو انسان کی طرف ہو اسے اِنْسِيٌّ اور دوسری جانب وحش کہا جاتا ہے۔ چنانچہ اسی معنی میں وَحْشِيُّ الْقَوْسِ وَاِنْسِيُّہُ کا محاورہ آتا ہے۔

## (و ح ی)

الْوَحْيُ کے اصل معنی اشارہ شریعہ کے ہیں۔

ہے جس کی طرف کہ آیت:

﴿وَمِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ﴾ (۴-۱۱۳)

(شیطان) وسوسہ انداز کی برائی سے جو (خدا کا نام سن کر) پیچھے ہٹ جاتا ہے۔

میں اشارہ پایا جاتا ہے۔

نیز حدیث میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

(۱۳۴) ((وَأَنَّ لِلشَّيْطَانِ لِمَةً)) کہ شیطان وسوسہ اندازی کرتا ہے۔ اور شریعت میں کلمہ الہیہ کو وحی کہا جاتا ہے۔ جو انبیاء و اولیاء کی طرف القاء کیا جاتا ہے جو انبیاء و اولیاء کی طرف القاء کیا جاتا ہے اس کی چند صورتیں ہیں۔

جیسا کہ آیت:-

﴿مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُكَلِّمَهُ اللَّهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِنْ وَرَاءِ حِجَابٍ أَوْ يُرْسِلَ رَسُولًا فَيُوحِيَ بآذُنِهِ مَا يَشَاءُ﴾ (۵۱-۴۲) اور کسی آدمی کے لیے ممکن نہیں ہے کہ خدا اس سے بات کرے۔ مگر الہام (کے ذریعہ) سے یا پردے کے پیچھے سے یا کوئی فرشتہ بھیج دے تو وہ خدا کے حکم سے جو خدا چاہے القا کرے۔

سے معلوم ہوتا ہے کہ وحی<sup>(۱)</sup> یا تو فرشتہ کے ذریعہ ہوتی ہے۔ جو ظاہری آنکھوں سے نظر آتا ہے اور اس کا کلام سنائی دیتا ہے۔ جیسا کہ حضرت جبریل علیہ السلام ایک معین شکل میں آکر آنحضرت ﷺ تک پیام رسالت پہنچایا کرتے تھے۔ چنانچہ جملہ اُوُرْسِلَ رَسُولًا میں اس معنی کو بیان فرمایا ہے۔

وحی کی دوسری صورت یہ ہے کہ پردے کے پیچھے سے کلام سنائی دے۔ جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام نے کوہ طور پر اللہ تعالیٰ کا کلام سنا اور یہی معنی مِنْ وَرَاءِ حِجَابٍ کے ہیں وحی کی یہ دونوں قسمیں انبیاء کے ساتھ مخصوص ہیں۔

وحی کی تیسری صورت القاء فی الرُّوْع کی ہے یعنی دل میں کسی بات کا ڈال دینا۔ جیسا کہ آنحضرت نے فرمایا: ﴿(۱۳۵) ((إِنَّ رُوحَ الْقُدُسِ نَفَثَ فِي رَوْعِي))﴾ کہ روح القدس نے میرے دل میں یہ بات ڈال دی۔

اور کبھی<sup>(۲)</sup> وحی بذریعہ الہام ہوتی ہے جیسے فرمایا:-

﴿وَإِذَا حِينًا إِلَىٰ أُمِّ مُوسَىٰ أَنْ أَرْضِعِيهِ﴾ (۲۸-۷)

اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام کی ماں کی طرف وحی بھیجی کہ اس کو دودھ پلاؤ۔ اور کبھی وحی تسخیری ہوتی ہے یعنی کسی چیز کو اس کے کام پر مامور کرنا جیسے فرمایا:-

﴿وَإِذَا حَسَىٰ رَبُّكَ إِلَى النَّحْلِ﴾ (۶۸-۱۶) اور تمہارے پروردگار نے شہد کی مکھیوں کو ارشاد فرمایا:

اور کبھی نیند میں خواب کے ذریعے جیسا کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ﴿(۱۳۶) ((انْقَطَعَ الْوَحْيُ وَبَقِيَتِ الْمُبَشِّرَاتُ رُؤْيَا الْمُؤْمِنِ))﴾ کہ وحی تو منقطع ہو چکی ہے مگر مبشرات یعنی رویا مومن باقی رہ گئے ہیں۔ اور وحی کی ان ہر سہ اقسام یعنی الہام تسخیر اور رویا پر آیت إِلَّا وَحْيًا دلالت کرتی ہے۔ اور آیت کریمہ:-

﴿وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا أَوْ قَالَ أُوحِيَ إِلَيَّ وَلَمْ يُوحَ إِلَيْهِ شَيْءٌ﴾ (۶-۹۴)

① وتامه وللملك لمة فاما لمة الشيطان فايعد بالشرو تكذيب بالحق الحديث رواه ابن حبان في (زوائد ص ۴۰)۔

② الحديث في الفائق (۲/۲۸۵) وانظر لتخريجه في وروع) و (نفث)

③ قد مر تخريجه ف (ب ش ر) ۱۲

میں بھی لوگوں کی طرف وحی کرنے سے انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ انہیں ان باتوں کا حکم دینا مراد ہے۔ اور آیات -

﴿اتَّبِعْ مَا أَوْحَىٰ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ﴾ (۶-۱۰۶) اور جو حکم تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارے پاس آتا ہے اس کی پیروی کرو۔

﴿إِنْ أَتَّبِعْ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ﴾ (۱۰-۱۵) میں تو اسی حکم کا تابع ہوں جو میری طرف آتا ہے۔

﴿قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰ إِلَيَّ﴾ (۱۸-۱۱۰) کہہ دو کہ میں تمہاری طرح کا ایک بشر ہوں (البتہ) میری طرف وحی آتی ہے۔

میں خاص وہ وحی مراد ہے جو آنحضرت ﷺ کے ساتھ مخصوص تھی۔ اور آیت :-

﴿وَ أَوْحَيْنَا إِلَىٰ مُوسَىٰ وَأَخِيهِ﴾ (۱۰-۸۷) اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام اور ان کے بھائی کی طرف وحی بھیجی۔

میں موسیٰ اور ان کے بھائی کی طرف یکساں قسم کی وحی بھیجنا مراد نہیں ہے۔ بلکہ موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی تو حضرت

جبریل کی وساطت سے آتی تھی مگر ہارون علیہ السلام کی طرف حضرت موسیٰ علیہ السلام اور جبریل علیہ السلام دونوں کی وساطت سے

وحی کی جاتی ہے۔ اور آیت :-

﴿إِذْ يُوحَىٰ رَبُّكَ إِلَى الْمَلَكَةِ أَنِّي مَعَكُمْ﴾ (۸-۱۲) جب تمہارا پروردگار فرشتوں کو ارشاد فرماتا تھا کہ

میں تمہارے ساتھ ہوں۔

میں بعض نے کہا ہے کہ لوح و قلم کی وساطت سے وحی بھیجنا مراد ہے۔ اور آیت کریمہ :-

﴿وَأَوْحَىٰ فِي كُلِّ سَمَاءٍ أَمْرَهَا﴾ (۳۱-۱۲) اور ہر آسمان میں اس کے کام کا حکم بھیجا۔

اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو خدا پر جھوٹ، افترا کرے یا یہ کہے کہ مجھ پر وحی آئی ہے حالانکہ اس پر کچھ بھی وحی نہ آئی ہو۔

عام ہے اور ہر اس شخص پر چسپاں ہو سکتی ہے جو مذکورہ بالا اقسام وحی میں سے کسی ایک قسم کی وحی کا جھوٹا دعویٰ کرے۔ اور آیت :-

﴿وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَسُولٍ إِلَّا نُوحِيَ إِلَيْهِ﴾ (۲۱-۱۵) اور جو پیغمبر ہم نے تم سے پہلے

بھیجے ان کی طرف یہی وحی بھیجی..... میں بھی وحی کا لفظ جمع انواع وحی کو شامل ہے۔ کیونکہ اس آیت میں وحی کے تحت

اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور اس کی عبادت کا ذکر ہے اور ان دونوں چیزوں کی معرفت اولوالعزم پیغمبروں کے ساتھ ہی

مخصوص نہیں ہے بلکہ یہ چیز جس طرح شارع علیہ السلام سے بذریعہ سماعت کے حاصل ہو سکتی ہے۔ ایسے ہی عقل و

الہام سے بھی حاصل ہو سکتی ہے..... پس اس میں صرف اس بات پر تنبیہ کرنا مقصود ہے کہ وہ شخص کبھی بھی اللہ تعالیٰ

کا سچا پیغمبر نہیں ہو سکتا۔ جسے باری تعالیٰ کی وحدانیت اور اس کی وجوب عبادت کے متعلق معرفت حاصل نہ ہو۔ اور

آیت :-

﴿وَإِذْ أَوْحَيْنَا إِلَى الْحَوَارِيِّينَ﴾ (۵-۱۱۱) اور جب میں نے حواریوں کو حکم بھیجا۔

میں حضرت عیسیٰ کے حواریوں کی طرف وحی بھیجنے سے حضرت عیسیٰ کی وساطت سے ان کو حکم دینا مراد ہے۔ اور

آیت :-

﴿وَ أَوْحَيْنَا إِلَيْهِمْ فَعَلِ الْخَيْرَاتِ﴾ (۲۱-۷۳) اور ان کو نیک کام کرنے..... کا حکم بھیجا۔



الگ الگ بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس لیے کہ کسی چیز کی تمنا اس کی محبت کے معنی کو متضمن ہوتی ہے۔ کیونکہ تمنا کے معنی کسی محبوب چیز کی آرزو کرنا کے ہوتے ہیں۔ اور آیت۔  
﴿وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً وَرَحْمَةً﴾ (۲۱-۳۰) اور  
تم میں محبت اور مہربانی پیدا کر دی۔ اور نیز آیت۔

﴿سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمَنُ وُدًّا﴾ (۱۹-۹۶) خدا ان کی محبت (مخلوقات کے دل میں) پیدا کر دے گا۔ میں اس الفت کی طرف اشارہ ہے جس کا کہ آیت ﴿لَوْ أَنفَقْتَ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مَّا أَلْفَتْ بَيْنَ قُلُوبِهِمْ﴾ (۸-۶۳) اور اگر تم دنیا بھر کی دولت خرچ کرتے تب بھی ان کے دلوں میں الفت پیدا نہ کر سکتے۔

میں ذکر پایا جاتا ہے۔ اور آیت  
﴿قُلْ لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا إِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبَىٰ﴾ (۲۲-۳۲) کہہ دو کہ میں اس کا تم سے صلہ نہیں مانگتا مگر (تم کو) قرابت کی محبت (تو چاہیے) میں مودت کے معنی محض محبت کے ہیں ﴿اور آیت ﴿وَهُوَ الْعَفْوَ الْوَدُودُ﴾ (۸۵-۱۳) اور وہ بخشنے والا اور محبت کرنے والا ہے۔

اور نیز۔ ﴿إِنَّ رَبِّي رَحِيمٌ وَدُودٌ﴾ (۱۱-۹۰) میں بے شک میرا پروردگار رحم والا اور محبت والا ہے۔ میں وَدُودُ اسمائے حسنی سے ہے اور اس میں محبت کے ان معنوں کی طرف اشارہ ہے جو کہ آیت: ﴿فَسَوْفَ يَأْتِي اللَّهُ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ﴾ (۵-۵۴) تو خدا ایسے لوگ پیدا کر دے گا جن کو وہ دوست رکھے۔ اور جسے

میں آسمان سے مراد اہل سماء ہیں تو یہاں الْمُوَحِّی الْيَهُم (یعنی جن کی طرف وحی کی تھی) محذوف ہے اور اہل سماء سے مراد چونکہ فرشتے ہی ہیں اس لیے اصل میں ﴿وَأَوْحَىٰ إِلَى الْمَلَائِكَةِ﴾ (۸-۱۲) ہے کہ ہم نے فرشتوں کی طرف وحی بھیجی۔ پس یہ مذکورہ بالا آیت کے ہم معنی ہوگی۔

اور اگر مُوَحِّی الْيَهُم سے آسمان ہی مراد لیے جائیں تو لوگ آسمانوں کے غیر جاندار ہونے کے قائل ہیں۔ ان کے نزدیک اس سے وحی تسخیری مراد ہوگی۔ اور جن کے نزدیک آسمان زندہ اور جاندار مخلوق ہیں۔ ان کے نزدیک وحی بذریعہ کلام مراد ہوگی۔ اور آیت:-

﴿يَا أَيُّهَا رَبَّنَا أَوْحِ لَهَا﴾ (۵-۹۹) کیونکہ تمہارے پروردگار نے اس کا حکم بھیجا ہوگا۔

میں وحی کے پہلے معنی یعنی وحی تسخیری مراد لینا اقرب معلوم ہوتا ہے۔ اور آیت:

﴿لَا تَعْجَلْ بِالْقُرْآنِ مِنْ قَبْلِ أَنْ يُقْضَىٰ إِلَيْكَ وَحْيُهُ﴾ (۲۰-۱۱۳) اور قرآن پاک کی وحی جو تمہاری طرف بھیجی جاتی ہے۔ اسکے پورا ہونے سے پہلے قرآن پاک کے (پڑھنے) کے لیے جلدی نہ کرو۔ میں آنحضرت ﷺ کو تبت کے ساتھ وحی کو سننے اور اس کی تلقین میں عجلت کو ترک کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔

## (ودد)

الْوُدُّ: کے معنی کسی چیز سے محبت اور اس کے ہونے کی تمنا کرنا کے ہیں۔ یہ لفظ ان دونوں معنوں میں

① الاستثناء منقطع لان القرابة ليست من جنس الاجر فالقاء للبيتة وهي بمعنى اللام ومعناه الا ان تو دو نی لقرابتی منکم والفتوحات (ص ۷۲ جو ۱۴)

لَوْ تَكْفُرُونَ كَمَا كَفَرُوا ﴿﴾ (وہ تو یہ چاہتے ہیں کہ جس طرح وہ خود کافر ہیں (اسی طرح) تم بھی کافر ہو کر (سب برابر ہو جاؤ)

﴿يَوْمَ الْمُجْرِمِ لَوْ يَفْتَدِي مِنْ عَذَابِ يَوْمِئِذٍ بِبَنِيهِ﴾ (۷۰-۱۱) (اس روز) گنہگار خواہش کرے گا کہ کسی طرح اس دن کے عذاب کے بدلے میں (سب کچھ) دے دے (یعنی) اپنے بیٹے۔

﴿لَا تَجِدُ قَوْمًا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ يُوَادُّونَ مَنْ حَادَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ﴾ (۵۸-۲۲) جو خدا پر اور روز قیامت پر ایمان رکھتے ہیں تم ان کو خدا اور اس کے رسول کے دشمنوں سے دوستی کرتے ہوئے نہ دیکھو گے۔

نیز اس آیت میں کفار سے موالات اور انکی پشت پناہی سے بھی منع فرمایا گیا ہے۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا عَدُوِّي وَعَدُوَّكُمْ أَوْلِيَاءَ تُلْقُونَ إِلَيْهِم بِالْمَوَدَّةِ﴾ (۶۰-۱) مومنو! (اگر تم میری راہ میں لڑنے اور میری خوشنودی حاصل کرنے کے لیے مکے سے نکلے ہو) تو میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ تم ان کو دوستی کے پیغام بھیجتے ہو۔

تو یہاں مَوَدَّة سے تعلقات محبت یعنی خیر خواہی وغیرہ مراد ہے۔

﴿كَأَن لَّمْ تَكُنْ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُ مَوَدَّةٌ﴾ (۳-۷۳) گویا تم میں اور اس میں دوستی تھی ہی نہیں۔

فُلَانٌ وَذِيْدُ فُلَانٍ وہ فلاں کا دوست ہے۔ اَلْوُدُّ ایک بت کا نام تھا۔ اس کی وجہ تسمیہ میں اختلاف

وہ دوست رکھیں۔ میں پائے جاتے ہیں۔

اور اللہ تعالیٰ کے بندوں سے محبت کرنے اور بندوں کے اللہ تعالیٰ سے محبت کرنے کے معنی پہلے بیان ہو چکے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے اپنے بندوں سے مودت کے معنی ان کی نگہداشت کرنے کے ہیں۔ مردی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا کہ میں کبھی بھی چھوٹے سے اس کے چھوٹا پن اور کسی بڑے سے اس کی بڑائی کے سبب غافل نہیں ہوتا اور میں دود اور شکور ہوں لہذا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آیت:

﴿سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمَنُ وُدًّا﴾ (۱۹-۹۷) کے بھی وہی معنی ہوں جو کہ آیت: ﴿سَوْفَ يَأْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهُ﴾ ہیں۔

اور مَوَدَّة بمعنی تمنا کے متعلق فرمایا:

﴿وَدَّتْ طَائِفَةٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يُضِلُّوكُمْ﴾ (۳-۹۶) (اے اہل اسلام) بعضے اہل کتاب اس بات کی خواہش رکھتے ہیں کہ تم کو گمراہ کرویں۔ ﴿رُبَّمَا يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْ كَانُوا مُسْلِمِينَ﴾ (۱۵-۳) کسی وقت کافر لوگ آرزو کریں گے اسے کاش وہ مسلمان ہوتے۔

﴿وَدُّوا مَا عَنِتُّمْ﴾ (۳-۱۱۸) اور چاہتے ہیں کہ جس طرح ہو تمہیں تکلیف پہنچے۔

﴿وَدَّ كَثِيرٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ﴾ (۲-۱۰۹) بہت سے اہل کتاب (اپنے دل کی جلن سے) یہ چاہتے ہیں: ﴿وَتَوَدُّونَ أَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشُّوْكَةِ تَكُونُ لَكُمْ﴾

(۸-۷) اور تم چاہتے تھے کہ جو قافلہ بے شان و شوکت (یعنی بے ہتھیار) ہے وہ تمہارے ہاتھ آجائے۔ ﴿وَدُّوا

(۴۴۲) لَيْتَ شِعْرِي عَنْ خَلِيلِي مَا الَّذِي

غَالَهُ فِي الْحُبِّ حَتَّى وَدَّعَهُ

کاش! مجھے میرے دوست کے متعلق معلوم ہوتا ہے کہ اسے محبت سے کس چیز نے روک دیا کہ وہ اسے چھوڑ بیٹھا ہے۔

الْتَوَدُّعُ کے معنی تن آسان ہونے کے ہیں۔ اور فُلَانٌ

مُتَدِّعٌ وَمُتَوَدِّعٌ وَفِي دَعَايَ کے معنی ہیں کہ فلاں آسودہ

حال اور عیش و آرام میں ہے۔ اصل میں یہ معنی ودع بمعنی

تَرَكَ سے ماخوذ ہیں۔ یعنی اس نے مشقت اور تکلیف کے

سبب طلب معاش کے لیے جدوجہد کرنا چھوڑ دیا ہے۔

الْتَوَدِّعُ: یہ بھی دَعَا (سکون) سے مشتق ہے اور تودیع

کے اصل معنی مسافر کو الوداع کہنے کے ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ

اسے سفر کی تکالیف سے محفوظ رکھے اور اسے آرام کی

حالت میں پہنچا دے پھر یہ لفظ مسافر کو رخصت کرنے کے

معنی میں استعمال ہونے لگا ہے۔ جیسا کہ لفظ تسلیم، اصل

میں اس کے معنی سلامتی کی دعا کے ہیں کہا جاتا ہے

وَدَّعْتُ فُلَانًا (میں نے فلاں کو چھوڑ دیا) چنانچہ

آیت: ﴿مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلَى﴾ (۹۳-۳)

(اے محمد!) تمہارے پروردگار نے نہ تو تم کو چھوڑا اور نہ تم

سے ناراض ہوا۔

ہے بعض نے کہا ہے کہ اس بت کو انتہائی محبوب سمجھنے کی وجہ

سے اسے وُد کہتے تھے اور یا ان کے اس اعتقاد کی بنا پر کہ

اللہ تعالیٰ اور اس بت کے درمیان رابطہ محبت پایا جاتا ہے،

اسے وُد کہا گیا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ کی ذات اس قسم کی

قباحتوں سے پاک ہے۔

الْوُدُّ کے معنی وِتْد یعنی میخ کے ہیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ

اصل میں وَتْد ہوتا دال میں مدغم ہو کر وُد ہو گیا ہو۔ اور ہو

سکتا ہے کہ میخ کے ایک جگہ پر جھے رہنے یا جس چیز میں لگائی

جائے اس میں مضبوطی کے ساتھ لگ جانے کی وجہ سے اس

سے محبت کے معنی لے کر (اسے وُد کہہ دیا گیا ہو)۔

## (وَدَّعَ)

الدَّعَا کے معنی آرام اور فراخی عیش کے ہیں

اور وَدَّعْتُ كَذَا أَدَّعُهُ وَدَّعَا (ب) کے معنی ہیں:

تَرَكَتُهُ وَإِدَّعَا۔ یعنی پرسکون طریقہ سے کسی چیز کو چھوڑ

دینا بعض کا قول ہے کہ اس کا فعل ماضی اور اسم فاعل

استعمال نہیں ہوتا صرف يَدَّعُ اور دَعَّعُ یعنی فعل مضارع اور

امر کا صیغہ استعمال ہوتا ہے۔ ۱ اور آیت ﴿مَا وَدَّعَكَ

رَبُّكَ﴾ (۹۳-۳) میں ایک قرأت تخفیف دال کے

ساتھ بھی مقول ہے۔ ۲ شاعر نے کہا ہے۔ ۳ (۱)

① هذا قول علماء النحو وفي الحديث ودعوا الحيشة ودعوكم وفي المستوفى ان كل ذلك وارد في كلام العرب ولا عبرة بكلام النحاة (روح المعاني) (۱۰۶/۳۰)

② قال ابن جنى وهي قراءة النبي صلى الله عليه وسلم وفيه تفصيل ذكره صاحب الروح (۱۰۶/۳۰)۔

③ والبيت مما اختلف في نسبته وروايته ففي اللسان والمحکم (ودع) في الود بدل في الحب۔ قال الازهری: روى ابن

احیى الاصمعی ان هذا الشعر لانس بن زبیم الليثی الصحابی وفيه عن امیری موضع عن خلیلی وفي الطبرسی (۱۶۳:۳۰)

وروح المعانی (۵۶:۳۰) والاشباه النحویة (۲۱۵:۱) والبحر (۴۸۵:۸) وابن خالویه (۱۱۷) او العیون (۱۰۶:۳)

معز والی ابی الاسود الدثلی وفي الاصابة رقم (۲۶۷) فی ثلاثة قالها فی عبدالله بن عامر حین ابطاء علیه عطاءه والبيت فی

البلدان (رسم: ودعان) بغير عزو (فی حماسة البحری ۳۷۳) بروایة اخرى ایضا لانس بن انس الليثی وابته سل امیری

مالذی غیر لی۔ وده والنفع حتی ودعه

(۴۴۳) تَعَفَّى بِذِيلِ الْمَرِطِ إِذَا جَنَّتْ مُوَدَّقِي  
تَعَفَّى کے معنی نشان مٹانے کے ہیں اور مرط بڑی چادر کو  
کہتے ہیں جو ستر کے لیے عورتیں اوپر اوڑھتی ہیں یہاں  
شاعر نے قدم کے پڑنے کی جگہ کو موضعِ مرط کے ساتھ تشبیہ  
دی ہے اور شعر کے معنی یہ ہیں کہ جب میں اپنی محبوبہ کے  
پاس آتا ہوں تو وہ اپنی چادر سے میرے قدموں کے نشان  
مٹا دیتی ہے۔

### (وَدِی)

الْوَادِي: اصل میں اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں  
پانی بہتا ہو اسی سے دو پہاڑوں کے درمیان کشادہ زمین کو  
وادی کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:-  
﴿إِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى﴾ (۱۲-۲۰) تم  
(یہاں) پاک میدان (یعنی طوی) میں ہو۔  
اس کی جمع اَوْدِيَّةٌ آتی ہے جیسے نادی کی جمع اَنْدِيَّةٌ اور نَاجِ  
کی جمع اَنْجِيَّةٌ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:-  
﴿فَسَالَتْ اَوْدِيَةٌ بِقَدَرِهَا﴾ (۱۳-۱۷) پھر اس سے  
اپنے اپنے انداز کے مطابق نالے بہہ نکلے۔  
اور حدیث میں ہے ﴿(۱۳۷)  
((لَوْ كَانَ لِابْنِ آدَمَ وَادِيَانِ مِنْ ذَهَبٍ لَابْتَغَى  
ثَالِثًا)) کہ اگر ابن آدم کے پاس سونے کی دو وادیاں  
ہوں تو وہ تیسری کا خواہش مند ہوگا۔

میں وَدَعْتُ فَلَانًا (میں نے فلان کو چھوڑ دیا) کی طرح  
صرف چھوڑ دینے کے معنی میں استعمال ہوا ہے اور کنایہ کے  
طور پر میت کو مُوَدَّقٌ کہا جاتا ہے اور اسی سے  
اِسْتَوْدَعْتُكَ غَيْرَ مُوَدَّقٍ کا محاورہ ہے جس کے معنی  
درازی عمر کی دعا کے ہیں۔ اور اسی سے شاعر کا قول ہے۔  
(۴۴۳) وَدَعْتُ نَفْسِي سَاعَةَ التَّوَدُّعِ  
کہ الوداع کے وقت میری جان ہوا ہو گئی۔

### (وَدُق)

الْوَدُقُ: بعض نے کہا ہے کہ بارش میں جو غبار  
سا نظر آتا ہے اسے وَدُقٌ کہا جاتا ہے۔ اور کبھی اس  
سے مراد بارش بھی ہوتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:-  
﴿فَتَسْرَى الْوَدُقُ بِخُرُجٍ مِنْ خِلَالِهِ﴾ (۴۳-۲۴)  
پھر تم دیکھتے ہو کہ بادل میں سے مینہ نکل کر (برس) رہا  
ہے۔  
اور گرمی کی شدت سے ہوا میں جو لہریں نظر آتی ہیں انہیں  
وَدِيقَةٌ کہتے ہیں۔ اور وَدَقَتِ الدَّابَّةُ وَاسْتَوْدَقَتْ  
کے معنی ہیں: مادہ چوپایہ کا زکری خواہش کے وقت، رطوبت  
نکالنا چنانچہ اس مادہ (چوپایہ) کو جو زکری خواہش میں  
رطوبت نکال رہی ہو، وَدِيقٌ يَأْ وَدُوقٌ کہتے ہیں۔  
اور جہاں بارش ہوئی ہو اس جگہ کو مُوَدَّقٌ (ظرف) کہا  
جاتا ہے۔ شاعر نے کہا ہے ﴿(الطَّوِيل)

① لم اجده ۱۲۔

- ② قاله امرئ القيس وصدره: دخلت على بيضاء جم عظامها وفي ديوانه ۹۰ (السند وبی) بذيل الدعر بدن بذيل المرط  
راجع ديوانه و للسان (ودق) والعقد الثمين (۱۴۱) ومختار الشعر الجاهلي (۶۰:۱)  
③ رواه الترمذی (۵۷:۲) عن انس بن مالك واحمد والشيخان عن ابن عباس و مسلم في صحيحه عن ابن الزبير وابن  
مساجة عن ابي هريرة والبخاري في التاريخ عن بريرة وفي كنز العمال (ج ۳ رقم ۱۱۱۶-۱۱۲۰) باختلاف الفاظه وفي  
محاضرات الادباء (۴/۴۳۳): كان في مصحف عبدالله بن مسعود رضي الله عنه۔

کہتے ہیں جو مقتول کی جان کے عوض قاتل کی طرف سے دیا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَدِيَةٌ مُسَلَّمَةٌ إِلَىٰ أَهْلِهِ﴾ (۹۲-۳) تو وارثان مقتول کو خون بہا دینا۔

### وَذِي

يَذَرُ الشَّيْءَ کے معنی کسی چیز کو قلت اعتداد کی وجہ سے پھینک دینے کے ہیں۔ (پھر صرف چھوڑ دینا کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے)۔ اس کا فعل ماضی استعمال نہیں ہوتا چنانچہ فرمایا:

﴿قَالُوا أَجِئْنَا لِنُعْبُدَ اللَّهَ وَحْدَهُ وَنَذَرَ مَا كَانَ يَعْبُدُ آبَاؤُنَا﴾ (۷۰-۷) وہ کہنے لگے کیا تم ہمارے پاس اس لیے آئے ہو کہ ہم اکیلے خدا ہی کی عبادت کریں اور جن کو ہمارے باپ دادا پوجتے چلے آئے ہیں ان کو چھوڑ دیں؟

﴿وَيَذَرُكَ وَالْهَتَّكَ﴾ (۱۲۷-۷) اور آپ سے اور آپ کے معبودوں سے دست کش ہو جائیں۔

﴿فَذَرُهُمْ وَمَا يَفْتَرُونَ﴾ (۱۳۷-۶) تو ان کو چھوڑ دو کہ وہ جائیں اور ان کا جھوٹ۔

ان کے علاوہ اور بھی بہت سی آیات ہیں جن میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ اور آیت: ﴿وَيَذَرُونَ أَزْوَاجًا﴾ (۲۳۳-۲) اور عورتیں چھوڑ جائیں۔

میں يَتْرُكُونَ يَا يَخْلُقُونَ کی بجائے يَذَرُونَ کا صیغہ اختیار کرنے میں جو خوبی ہے وہ اس کے بعد دوسری کتاب میں بیان کریں گے۔

الْوَذْرَةُ: گوشت کی چھوٹی سی بوٹی کو کہتے ہیں اور قلت

اور استعارہ کے طور پر مذہب، طریقہ اور اسلوب بیان کو وادی کہا جاتا ہے۔ چنانچہ محاورہ ہے۔

فُلَانٌ فِي وَادٍ غَيْرِ وَادِيكَ کہ فلاں کا مسلک تجھ سے جدا گانہ ہے اور قرآن پاک نے شعراء کی مذمت کرتے ہوئے ان کے متعلق کہا ہے۔

﴿أَلَمْ تَرَ أَنَّهُمْ فِي كُلِّ وَادٍ يَهِيمُونَ﴾ (۲۲۵-۲۶) کیا تم نے نہیں دیکھا کہ وہ ہر وادی میں سرمارتے پھرتے ہیں۔

تو یہاں فِی كُلِّ وَادٍ سے مختلف اسالیب سخن مراد ہیں جیسے، مدح، جہو، جدل، غزل وغیرہ چنانچہ شاعر نے کہا ہے ۱)۔

(۳۳۵) إِذَا مَا قَطَعْنَا وَادِيًا مِنْ حَدِيثِنَا إِلَىٰ غَيْرِهِ زِدْنَا الْأَحَادِيثَ وَادِيًا

جب ہم موضوع سخن کی ایک وادی کو قطع کر لیتے ہیں تو دوسری وادی میں داخل ہو جاتے ہیں۔ اور کنایہ کے طور پر مرد کی اس رطوبت کو وَدِيٌّ کہا جاتا ہے جو عورت سے لذت اندوزی کے وقت یا پیشاب کے بعد خارج ہوتی ہے اور آمُدِيٌّ وَ آمُنِيٌّ کی طرح اودی (افعال) کے معنی زکا و دی (رطوبت) خارج کرنے کے ہیں اور یہ مَنَّسِيٌّ وَ آمُنِيٌّ کی طرح مجرد و مزید فیہ دونوں طرح بولا جاتا ہے۔

السُّودِيٌّ: چھوٹے پودے کو کہتے ہیں کیونکہ وہ بھی پانی کی طرح طول میں بڑھتا چلا جاتا ہے۔

أَوْدَاهُ کے معنی ہلاک کرنے کے ہیں گویا اس کے خون کو بہا دیا اسی سے وَدِيْتُ الْقَتِيلِ کا محاورہ ہے جس کے معنی مقتول کا خون بہا ادا کرنے کے ہیں اور دِيَّةُ اس مال کو

جن میں کہ مٹی ہوئی کتابت کا بقیہ ہے۔ اور محاورہ میں وَرِثْتُ مَا لَا عَنْ زَيْدٍ وَوَرِثْتُ زَيْدًا (میں زید کا وارث بنا) دونوں طرح بولا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:-

﴿وَوَرِثَ سُلَيْمَانُ دَاوُودَ﴾ (۱۶-۲۷) اور سلیمان داؤد علیہ السلام کے قائم مقام ہوئے۔  
﴿وَوَرِثَهُ أَبَوُهُ﴾ (۱۱-۴) اور صرف ماں باپ ہی اس کے وارث ہوں۔

﴿وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذَلِكَ﴾ (۲۳۳-۲) اور اسی طرح نان و نفقہ بچے کے دارث کے ذمہ ہے۔ ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَحِلُّ لَكُمْ أَنْ تَرِثُوا النِّسَاءَ كَرِهًا﴾ (۱۸-۴) مومنو! تم کو جائز نہیں ہے کہ زبردستی عورتوں کے دارث بن جاؤ۔

اور اَوْرَثْنِي الْمَمِيْتُ كَذَا کے معنی ہیں میت نے مجھے اتنے مال کا وارث بنایا۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:-  
﴿وَإِنْ كَانَ رَجُلٌ يُورَثُ كَلَّةً﴾ (۱۱-۴) اور اگر ایسے مرد یا عورت کی میراث ہو جس کا نہ باپ ہو نہ بیٹا۔  
اور اَوْرَثْنِي اللَّهُ كَذَا کے معنی کسی چیز کا وارث بنادینے کے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:-

﴿وَأَوْرَثْنَا بَنِي إِسْرَآئِيلَ الْكِتَابَ﴾ (۵۳-۴۰) اور بنی اسرائیل کو کتاب کا وارث بنایا۔  
﴿وَأَوْرَثْنَاهَا قَوْمًا آخَرِينَ﴾ (۲۸-۴۴) اور ہم نے

اختناء کے سبب اسے اس کا نام سے پکارتے ہیں جیسا کہ حقیر شخص کے متعلق هُوَ لَحْمٌ عَلٰی وَضَمِّ یعنی وہ ذلیل ہے) محاورہ استعمال ہوتا ہے۔

## (ورث)

اَلْوَرَاثَةُ وَالْإِرْثُ کے معنی عقد شرعی۔ یا جو عقد کے قائم مقام ہے کے بغیر کسی چیز کے ایک شخص کی ملکیت سے نکل کر دوسرے کی ملکیت میں چلے جانا کے ہیں۔ اسی سے میت کی جانب سے جو مال ورثاء کی طرف منتقل ہوتا ہے اسے اِرْثٌ ثَرَاثٌ اور مِيرَاثٌ کہا جاتا ہے اور ثَرَاثِ اَصْلٌ میں وُراث ہے داؤ (مضموم) کے شروع میں آنے کی وجہ سے اسے تاء سے تبدیل کر لیا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:-

﴿وَتَاكُلُونَ التَّرَاثَ أَكْلًا لِّمَاءٍ﴾ (۱۹-۸۹) اور میراث کے مال کو سمیٹ کر کھا جاتے ہو۔

اور حج کے موقع پر آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ﴿۱۳۸﴾ ((اَتَّبِعُوا عَلٰی مَشَاعِرِكُمْ فَانْتَكُمُ عَلٰی اِرْثِ اَبِيكُمْ)) کہ اپنے مشاعر (مواضع نسک) پر پھیرے رہو تم اپنے باپ (ابراہیم علیہ السلام) کے ورثہ پر ہو۔ تو یہاں ارث کے معنی اصل اور بقیہ نشان کے ہیں۔ شاعر نے کہا ہے ﴿۱﴾

(۲۴۶) فَيَنْظُرُ فِي صُحُفٍ كَالرِّيَا  
فِيهِنَّ اِرْثٌ كِتَابٍ مُّجِي

وہ صحیفوں میں تانت باندھنے والے کی طرح غور کرتا ہے

① الحدیث باختلاف الفاظ فی ابوداؤد والترمذی (۱۰۰-۹۹/۲) مع تحفة الاحوری والنسائی (۴۵/۲) وابن ماجہ (۱۲۳/۲) والحاکم (۴۶۲/۱) والبیہقی فی سنن الکبری (۱۱۵/۵) والشافعی فی رسالته (رقم ۱۳۲) من طریق سفیان ابن عیینہ باسناده وقال الترمذی حدیث سریع حدیث حسن لا تعرفه الامن حدیث ابن عیینہ عن عمرو بن دینار وانظر لتخریجه ایضاً (الفتح الکبیر ۳۳۴/۲)

دوسرے لوگوں کو ان کا مالک بنادیا۔

﴿وَأَوْرَثْنَاكُمْ آبَاءَهُمْ﴾ (۳۳-۲۷) اور ان کی زمین ..... کا تم کو وارث بنایا۔

﴿وَأَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِينَ﴾ (۷-۱۳۶) اور جو لوگ (کمزور سمجھے جاتے تھے) ان کو ..... وارث کر دیا۔ ہر وہ چیز جو بلا محنت و مشقت حاصل ہو جائے اس کے متعلق وَرَثَ كَذَا کہتے ہیں اور جب کسی کو خوشگوار چیز بطور عطیہ دی جائے تو اُوْرَثَ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔ ﴿وَرَسَلْنَاكَ الْجَنَّةَ الَّتِي أُورِثْتُمُوهَا﴾ (۴۲-۷۲) اور یہ جنت جس کے تم مالک کر دیے گئے ہو۔ ﴿أُولَئِكَ هُمُ الْوَارِثُونَ الَّذِينَ يَرِثُونَ﴾ (۲۳-۱۱۰) یہی لوگ میراث حاصل کرنے والے ہیں (یعنی جو ..... میراث حاصل کریں گے)۔

اور آیت: ﴿وَوَسَّيْتُ مِنَ الْإِلِ يَعْقُوبَ﴾ (۱۹-۶) اور اولاد یعقوب کی میراث کا مالک ہو۔

میں وراثت سے مراد مال کا ورثہ نہیں ہے بلکہ علم و فضل اور نبوت کا ورثہ مراد ہے کیونکہ دنیا کے مال کی تو انبیاء کرام کی نظر میں کچھ قدر و قیمت ہی نہیں ہوتی کہ وہ اس کی فکر کریں۔ بلکہ وہ نہ مال کو جمع کرتے ہیں اور نہ ہی اس کے مالک بنتے ہیں۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں۔

• (۱۳۹) ((إِنَّمَا مَعَاشِرَ الْأَنْبِيَاءِ لَا نُورَثُ مَا تَرَكَنَاهُ صَدَقَةٌ)) ہم انبیاء کا گروہ جو چھوڑ جائیں وہ صدقہ ہوتا ہے۔ اور ہمارا کوئی وارث نہیں بن سکتا۔

تو یہاں مَعَاشِرَ الْأَنْبِيَاءِ منصوب علی الاختصاص ہے اور تَرَكَنَاهُ سے مراد علم ہے اور اس صدقہ میں تمام امت برابر کے شریک ہے۔ اور جو حدیث میں آیا ہے • (۱۴۰) ((الْعُلَمَاءُ وَرَثَةُ الْأَنْبِيَاءِ)) (کہ علماء کرام انبیاء عظام کے وارث ہیں) تو اس سے مراد بھی ورثہ علم ہی ہے اور اس پر ورثہ کا اطلاق اس لیے ہوا ہے کہ کسی احسان اور معاوضہ کے بغیر ملتا ہے۔ اور آنحضرت ﷺ نے حضرت علیؓ کو فرمایا • (۱۴۱) ((أَنْتَ أَخِي وَوَارِثِي)) تو میرا بھائی اور وارث ہے لیکن ساتھ ہی فرمایا • (۱۴۲) ((وَيَا وَمَا أَرِثُكَ)) کہ میں تیرا وارث نہیں ہوں گا اسی طرح

فرمایا • (۱۴۳) ((مَا وَرَثَتِ الْأَنْبِيَاءُ قَبْلِي كِتَابَ اللَّهِ وَسِتِّي)) کہ مجھ سے پہلے انبیاء کا ورثہ کتاب اللہ اور میری سنت ہے اور اللہ تعالیٰ نے خود اپنے آپ کو وارث کہا ہے کیونکہ آخر کار تمام اشیاء اسی کی ملک میں جانے والی ہیں چنانچہ ارشاد ہے۔ ﴿وَلِلَّهِ مِيرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ﴾ (۳-۱۸۰) اور آسمانوں اور زمین کا وارث خدا ہی ہے۔

- ① الحديث باختلاف الفاظه في السنن الكبرى للنسائي واصله متفق عليه بطرق من حديث عائشة وانظر لتخريجه كنز العمال (۱۱: رقم ۹۰-۹۳) واللالی المصنوعة ج ۲ ص ۴۴۲
- ② رواه ابوداؤد والترمذی وابن ماجة وزوائد ابن حبان رقم (۸۰) وفيه ان العلماء من حديث ابی الدرداء (حديث واه) وله طرق عند الطبرانی وفي الباب عن البراء بن عمرو بن العاص وراجع تخريج الكشاف للحافظ ابن حجر رقم (۱۱۷ ص ۱۲۴)۔
- ③ وفي رواية انت واثی وعن ابن بريدة عن ابیه مرفوعا ك وصبي و واثی علی بن ابی طالب اللالی المصنوعة (ج ۱ ص ۳۵۹) وفي الخصائص من سنن الكبرى للنسائي حديث طويل في اخوة علی علي قال العراقي في تخريج الاحياء (ج ۲ ص ۱۹۰) وكل ما ورد في اخوته فضعيف لا يصح من شيء۔
- ④ قطعة من حديث سابق ولم اجد بهذا اللفظ ۱۲۔

اور فرمایا:-

((مَنْ حَاسَبَ نَفْسَهُ فِي الدُّنْيَا لَمْ يُحَاسِبْهُ اللَّهُ فِي الْآخِرَةِ)) کہ جو شخص دنیا میں اپنے نفس کا محاسبہ کر لے گا۔ آخرت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پر کسی قسم کا محاسبہ نہیں ہوگا۔

### (ورد)

الْوُرُودُ: یہ اصل میں وَرَدَتْ الْمَاءَ (ض) کا مصدر ہے جس کے معنی پانی کا قصد کرنے کے ہے۔ پھر ہر جگہ کا قصد کرنے پر بولا جاتا ہے اور پانی پر پہنچنے والے کو وارد اور پانی کو موروود کہا جاتا ہے اور اورد الابل: (افعال) على الماء کے معنی اونٹوں کو پانی پر وارد کرنے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:-

﴿وَلَمَّا وَرَدَ مَاءَ مَدْيَنَ﴾ (۲۸-۲۳) اور جب مدین کے پانی کے مقام پر پہنچے۔

الْوُرْدُ: اس پانی کو کہتے ہیں جو وارد ہونے کے لیے تیار کیا گیا ہو۔ اور یہ صَدْرُ (لوٹنا) کی ضد بن کر بھی استعمال ہوتا ہے اور بخار کی باری کے دن کو بھی ورد کہتے ہیں۔ اور تقطیع کے طور پر دوزخ کی آگ میں داخل ہونے پر بھی ورد کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ جیسے فرمایا۔

﴿فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ وَيَنْسُ الْوُرْدُ الْمَوْرُودُ﴾ (۹۸-۱۱) اور ان کو دوزخ میں جاتا تو لے گا اور جس مقام پر وہ اتارے جائیں گے وہ برا ہے۔

﴿الْإِسَى جَهَنَّمَ وَرْدًا﴾ (۱۹-۸) دوزخ کی طرف پیا سے.....

﴿أَنْتُمْ لَهَا وَرِدُونَ﴾ (۲۱-۹۸) تم (سب) اس میں داخل ہو کر ہو گے۔

﴿مَا وَرَدُوْهَا﴾ (۲۱-۹۹) تو اس میں داخل نہ

﴿وَنَحْنُ الْوَارِثُونَ﴾ (۱۵-۲۳) اور ہم ہی (سب کے) وارث (مالک) ہیں۔

اور اللہ تعالیٰ کے وارث ہونے کے متعلق (یہ بھی) امر وہی ہے کہ اللہ تعالیٰ (قیامت کے دن) لِيَمْنِ الْمَلِكُ الْيَوْمَ (کہ آج کس کی بادشاہت ہے) کے ساتھ منادی فرمائیں گے تو جواب میں کہا جائے گا۔ ﴿لِلَّهِ الْوَاحِدِ الْفَقَّارِ﴾ (۴۰-۱۶) خدا کی جو اکیلا اور غالب ہے۔

وَرَدْتُ عِلْمًا مِنْ فُلَانٍ کے معنی کسی سے علم حاصل کرنے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:-

﴿وَرِثُوا الْكِتَابَ﴾ (۷-۱۷۹) جو کتاب کے وارث بنے۔

﴿أَوْرِثُوا الْكِتَابَ مِنْ بَعْدِهِمْ﴾ (۴۲-۱۴) اور جو لوگ ان کے بعد خدا کی کتاب کے وارث ہوئے۔

﴿ثُمَّ أَوْرَثْنَا الْكِتَابَ﴾ (۳۵-۱۳۲) پھر ہم نے ان لوگوں کو کتاب کا وارث ٹھہرایا۔.....

﴿يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ﴾ (۲۱-۱۰۵) میرے نیکو کار بندے ملک کے وارث ہوں گے۔

اور وراثت حقیقی تو یہ ہوتی ہے کہ انسان کو ایسی چیز حاصل ہو جائے جس کے متعلق اس پر نہ کوئی محاسبہ ہو اور نہ کسی قسم کی ذمہ داری عائد ہو۔ اور اللہ تعالیٰ کے نیک بندے چونکہ

دنیا سے بوقت ضرورت قدر کفایت سے زیادہ نہیں لیتے اور پھر اسے جائز طریقہ سے حاصل کرتے ہیں تو جو شخص

دنیا کو ان شرائط کے ماتحت حاصل کرے گا اس پر کسی قسم کا محاسبہ یا عقاب نہیں ہوگا بلکہ وہ مال اس کے لیے عفو و صفو

ہوگا جیسا کہ حدیث میں ہے۔



اور جس شخص کو باری کا بخار چڑھا ہوا ہو اسے بھی مَوْرُوْدُ ہوتے۔  
 کہا جاتا ہے اور شَعْرٌ وَّارِدٌ لِّجَبَلِ بَالُوں کو کہتے ہیں۔ جو عورت کی کمر یا اس کے سرینوں تک دراز ہوں۔  
 الْوَرِيدُ: رگ جس کا تعلق جگر اور دل کے ساتھ ہوتا ہے اور وہ خون اور روح کا مجری بنتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:-

﴿وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ﴾  
 (۵۰-۱۶) اور ہم اس کی رگ جان سے بھی اس سے زیادہ قریب ہیں۔

یعنی اس کی روح سے بھی زیادہ قریب ہیں۔  
 الْوَرْدُ: اصل میں گل سرخ کو کہتے ہیں۔ اور یہ وَّارِدٌ سے ہے جس کے معنی قافلے سے پہلے پانی پر آنے والا ہے ہیں۔ مشہور ہے کہ گلاب کا پھول تمام پھولوں سے پہلے ظاہر ہوتا ہے۔ اس لیے اسے وَرْدٌ کہا جاتا ہے۔ پھر ہر درخت کے پھول کو (جِزَا) وَرْدٌ کہہ دیتے ہیں۔ چنانچہ درخت کے پھولدار ہونے پر وَرْدُ الشَّجَرِ بولا جاتا ہے۔ پھر گھوڑے کے رنگ کو بھی گل سرخ کے ساتھ تشبیہ دے کر فَرَسٌ وَرْدٌ کہا جاتا ہے۔ اور آثار قیامت کے طور پر جب آسمان سرخ ہو جائے گا تو اسے بھی قرآن پاک نے وَرْدَةٌ کہا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

﴿فَكَانَتْ وَرْدَةً كَالدِّهَانِ﴾ (۵۵-۳۷) تلچھٹ کی طرح گلابی ہو جائے گا (تو وہ کیسا ہولناک دن ہوگا)۔

الْوَارِدُ: (ایضاً) اس شخص کو بھی کہا گیا ہے جو قافلے کے آگے جا کر پانی لاتا ہے۔ جیسے فرمایا: ﴿فَارْسُلُوا وَارِدَهُمْ﴾ (۱۲-۱۹) اور انہوں نے (پانی کے لیے) اپنا سقا بھیجا۔

ہر وہ شخص جو پانی پر پہنچ جائے اسے بھی وارد کہا جاتا ہے۔ اور آیت

﴿وَأَنْ مِّنْكُمْ إِلَّا وَارِدُهَا﴾ (۱۹-۱۷) اور تم میں سے کوئی (شخص) نہیں مگر اسے اس پر سے گزرنا ہوگا۔

میں بعض نے وَّارِدُهَا کو وَرَدْتُ مَاءً كَذَّاءً کے محاورہ سے لیا ہے جس کے معنی پانی پر حاضر ہونے کے ہیں اور اس میں اتنا شرط نہیں ہے ۱ اور بعض نے کہا ہے کہ اس میں اتنا بھی شرط ہے اور اولیاء اللہ اور صالحین بھی ایک مرتبہ دوزخ کی آگ میں داخل ہوں گے لیکن ان پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔ بلکہ ان کی حالت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سی ہوگی کہ جب انہیں آگ میں ڈالا گیا۔ تو ان پر آگ کا کچھ بھی اثر نہ ہوا۔ ۲ چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔

﴿قُلْنَا يَبْنَؤُكَ بَرْدًا وَسَلَامًا عَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ﴾  
 (۲۱-۶۹) ہم نے حکم دیا اے آگ! سرد ہو جا اور ابراہیم پر (موجب سلامتی بن جا)

اور اس مسئلہ پر بحث کے لیے ذرا تفصیل درکار ہے۔ جو یہاں پر ہمارا مقصد نہیں۔

① قال فی روح المعانی وارد ہای داخلہا کما ذہب الی ذالک جمع کثیر من سلف المفسرین و اهل السنة و فی معاہ روایۃ جابر بن عبداللہ مرفوعاً اخرجہ احمد و الحکم الترمذی و ابن المنذر و الحاکم و صحیحہ جماعة عن ابی امیہ و قد ذکر الامام الرازی لہذا الدخول عدۃ فوائد فلیراجع و عند الحسن و قتادۃ المروور کما روی ذالک عن عبداللہ بن مسعود کذا فی الروح ۱۱۱/۱۶۔

② و هو قول عبداللہ بن مسعود فی روایۃ ابن ابی حاتم عنہ و اخرجہ عبد بن حمید عن و لید بن نمیر ایضاً و یدل علیہ قولہ تعالیٰ و لما ورد ماء مدین راجع الروح و ابن کثیر ۱۲۔

## (ورق)

الْوَرَقُ: درخت کے پتے۔ اس کی جمع اوراق اور واحد ورقہ آتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَرَقَةٍ إِلَّا يَعْلَمُهَا﴾ (۶-۵۹) اور کوئی پتہ نہیں جھڑتا مگر وہ اس کو جانتا ہے۔

اور وَرَقَتِ الشَّجَرَةُ کے معنی درخت کا پتہ دار ہونا کے ہیں اور سرسبز خوبصورت پتے دار درخت کو وَرَقَةٌ کہا جاتا ہے۔ عَامُ اَوْرَقٍ کے معنی قحط سالی کے ہیں۔ اور اَوْرَقُ فُلَانٌ کے معنی ناکام ہونے کے ہیں گویا وہ پتے دار درخت ہے جو بدون ثمر کے ہے اور اس کے بالمقابل آیت ﴿وَكَانَ لَهُ ثَمَرٌ﴾ (۱۸-۲۳) اور اس کو پیداوار (ملتی رہتی) تھی۔

میں مال کا شر کہا ہے جیسا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے ۱ اور رنگ کی تروتازگی کے لحاظ سے خاکستری رنگ کے اونٹ کو بَعِیرٌ اَوْرَقٌ کہا جاتا ہے اسی طرح حَمَامَةٌ وَرَقَاءُ کا محاورہ ہے جس کے معنی خاکی رنگ کی کبوتری یا فاختہ کے ہیں۔ اَوْرَقٌ: (ایضاً) مال دار ہونا۔ گویا کثرت کے لحاظ سے مال کو درخت سے پتوں کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے جیسا کہ مال کو ثَرٰی ثَرَابٌ یَا سَبِیلُ کے ساتھ تشبیہ دے کر اس معنی میں کہا جاتا ہے۔ چنانچہ محاورہ ہے: لَکَ مَالٌ کَالثَّرَابِ اَوْ السَّبِیلِ اَوْ الثَّرٰی: یعنی وہ بہت زیادہ مالدار ہے۔ شاعر نے کہا ہے ۲ (الرجز)

(۳۷۷) وَاعْفِرْ خَطَايَايَ وَثَمِرْ وَرَقِي

میری خطائیں معاف فرما اور میرا مال بڑھا دے۔ اور اَلْوَرَقُ (بکسر الراء) خصوصیت کے ساتھ دراہم کو کہتے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔

﴿فَابْعَثُوا أَحَدَكُمْ بِوَرِقِكُمْ هَذِهِ﴾ (۱۸-۱۹) تو اپنے میں سے کسی کو یہ سکہ دے کر شہر بھیجو۔

ایک قراءت میں بِوَرِقِكُمْ وَبِوَرِقِكُمْ ہے اور یہ وَرَقٌ وَوَرِقٌ دونوں طرح بولا جاتا ہے۔ جیسے کَبَدٌ وَکَبْدٌ۔

## (وری)

وَارِيتُ كَذَا: کے معنی کسی چیز کو چھپانے کے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:-

﴿قَدْ أَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُورِي سَوَاتِكُمْ﴾ (۷-۲۶) ہم نے تم پر پوشاک اتاری کہ تمہارا ستر ڈھانکے۔

تَوَارِي: (لازم) چھپ جانا۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿حَتَّى تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ﴾ (۳۸-۳۲) یہاں

تک کہ (آفتاب) پردے میں چھپ گیا۔ وَرَى الْخَبْرَ کے معنی تو یہ کرنے کے ہیں۔ یعنی اصل بات کو چھپا کر اسے کسی اور طریقہ سے ظاہر کرنا..... (اس

طور پر کہ جھوٹ بھی نہ ہو۔ اور اصل مقصد بھی ظاہر نہ ہونے پائے) چنانچہ حدیث میں ہے۔ ۳ ((ان النبی

صلی اللہ علیہ وسلم کان اذا اراد غزوا وری بغیره)) کہ آنحضرت ﷺ جب کسی غزوہ پر

تشریف لے جاتے تو تو یہ سے کام لیتے۔

اَلْوَرٰی: بقول خلیل مخلوقات کو کہتے ہیں جو ایک وقت میں

۱ قد مرفی (ث م د) ۱۲

۲ قاله العجاج وقبله: ایاک ادعو فتقبل ملقی والشطرفی اللسان (ورق۔ بلق) او محالس ثعلب وتهذیب الاصلاح (۱۷۵: ۱) ابن خالویه ۲۵ والصاحی (۱۸۷) واضداد ابی الطیب (۲۶۲) والارجوزة فی دیوانه (۳۴-۳۵)۔

۳ رواه البخاری (۴۱۴) وایضا فی مواضع ۱۲۔

میں مرنے کے بعد پیچھے چھوڑ آنا مراد ہے۔ اور اس میں ان کے لیے سرزنش ہے کہ تم نے مال خرچ کر کے ثواب آخرت کیوں نہ حاصل کیا۔

اور آیت:-

﴿فَنَبَذُوهُ وَرَاءَ ظُهُورِهِمْ﴾ (۳-۱۸۷) تو انہوں نے اس کو پس پشت پھینک دیا۔

بھی تنبیک (لامت) پر محمول ہے کہ انہوں نے نہ تو کتاب اللہ پر عمل ہی کیا اور نہ کبھی اس کی آیات پر غور کیا۔ اور آیت ﴿فَمِنْ ابْتِغَىٰ وَرَاءَ ذَلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْعَادُونَ﴾ (۲۳-۷) اور جو ان کے سوا اوروں کے طالب ہوں وہ (خدا کی مقرر کی ہوئی) حد سے نکل جانے والے ہیں۔

میں وِرَاءَ ذَالِكَ کے معنی یہ ہیں کہ جو شخص ان بیان کردہ حلائل کے علاوہ دیگر کا خواہش مند ہو یا ذوات الحارم سے تعرض کرے گا تو اس نے حدود شریعت سے تجاوز کیا اور اس کی حرمت کے پردہ کو چاک کر ڈالا۔ اور آیت:-

﴿وَيَكْفُرُونَ بِمَا وَرَاءَ هُ﴾ (۲-۹۱) (یعنی) یہ اس کے سوا اور (کتاب) کو نہیں مانتے۔

میں وِرَاءَ ہ سے دوسری آسمانی کتابیں مراد ہیں۔ اور وَرَى الزُّنْدِ يَرَى وَرَيَا کے معنی چترماق کے پیچھے سے آگ نکالنے کے ہیں تو گویا اس میں آگ کے پوشیدہ ہونے کے معنی کا لحاظ کیا گیا ہے۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے ﴿(الزل)﴾ (۴۳۸) كَكُمُونِ النَّارِ فِي حَجَرِهِ جیسے پتھر کے اندر آگ پوشیدہ ہوتی ہے۔

زمین پر موجود ہو۔ اس میں ماضی اور مستقبل کی نسل شامل نہیں ہوتی اور ان کو اَلْوَرَى اس لیے کہا جاتا ہے کہ گویا وہ اپنے اشخاص سے زمین کو چھپائے ہوئے ہیں۔

اَلْوَرَاءَ کے معنی خلف یعنی پچھلی جانب کے ہیں۔ مثلاً جو زید کے پیچھے یا بعد میں آئے اس کے متعلق وَرَاءَ زَيْدٍ کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَمِنْ وَرَاءِ اسْحَقَ يَعْقُوبَ﴾ (۱۱-۷۱) اور اسحاق کے بعد یعقوب (کی) خوش خبری دی۔

﴿ارْجِعُوا وَرَائَكُمْ فَالْتَمِسُوا نُورًا﴾ (۵۷-۱۳) پیچھے کو لوٹ جاؤ اور (وہاں) نور تلاش کرو۔

﴿فَلْيَكُونُوا مِنْ وَرَائِكُمْ﴾ (۴-۱۰۲) تو وہ پرے ہو جائیں۔

اور کبھی بمعنی قُدَامَ (سامنے کی طرف) بھی آتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:-

﴿وَكَانَ وَرَاءَ هُمْ مَلِكٌ يَأْخُذُ كُلَّ سَفِيَةٍ غَضَبًا﴾ (۱۸-۷۹) اور ان کے سامنے (کی طرف) ایک بادشاہ تھا جو ہر ایک کشتی کو زبردستی چھین لیتا تھا۔ اور آیت:-

﴿أَوْ مِنْ وَرَاءِ جُدُرٍ﴾ (۵۹-۱۳) یاد دیواروں کی اوٹ میں۔

میں دیوار کی دونوں جانب مراد ہو سکتی ہیں۔ کیونکہ جو شخص کسی ایک جانب میں ہوگا تو دوسری جانب اس کے لیے

وِرَاءَ ہی ہوگی۔ اور آیت: ﴿تَرَكْتُمْ مَّا خَوَّلْنَكُمْ وَرَاءَ ظُهُورِكُمْ﴾ (۶-۹۵) اور جو (مال و متاع) ہم

نے تمہیں عطا فرمایا تھا وہ سب اپنی پیٹھ پیچھے چھوڑ آئے۔

① قاله ابو نواس (الحسن بن هاني) و صدره: يكن الشئان فيه لنا..... والبيت في طرائف الشعراء (۷۳) و مجموعة المعاني (۱۶۷) والعقد (۱: ۲۵۲) وفي الموشح للمرزياني ۲۷۳: اخذ على بن المبارك على ابني نواس في شعره في حرفين احد. هما هذا البيت وقال انما كان ينبغي له ان يقول في حجرها بدل في حجره والثاني في قوله: اسرع من قول قطاة قطا وكان ينبغي له ان يقول قطا بالتخفيف انظر الحيوان للحافظ (۲: ۳۳)

کے پاس جانا ہے۔

الْوَزْرُ: کے معنی بارگراں کے ہیں اور یہ معنی وَزْر سے لیا گیا ہے جس کے معنی پہاڑ میں جانے پناہ کے ہیں اور جس طرح مجازاً اس کے معنی بوجھ کے آتے ہیں اسی طرح وَزْر بمعنی گناہ بھی آتا ہے (اسی کی جمع اَوْزَار ہے) جیسے فرمایا:۔

﴿لِيَحْمِلُوا أَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً يَوْمَ الْقِيَمَةِ﴾ (۱۶-۲۵) (اے پیغمبر! ان کو بکنے دو) یہ قیامت کے دن اپنے (اعمال کے) پورے بوجھ بھی اٹھائیں گے اور جن کو یہ بے تحقیق گمراہ کرتے ہیں ان کے بوجھ بھی (اٹھائیں گے) جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا:۔

﴿وَلِيَحْمِلُنَّ أَثْقَالَهُمْ وَأَثْقَالًا مَعَ أَثْقَالِهِمْ﴾ (۲۹-۱۳) اور یہ اپنے بوجھ بھی اٹھائیں گے اور اپنے بوجھوں کے ساتھ اور بوجھ بھی۔

اور دوسروں کو بوجھ اٹھانے کی حقیقت کی طرف آنحضرتؐ نے اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ﴿(۳۳)

((مَنْ سَنَّ سُنَّةً حَسَنَةً كَانَ لَهُ أَجْرُهَا وَأَجْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا مِنْ غَيْرِ أَنْ يُنْقَصَ مِنْ أَجْرِهِ شَيْءٌ وَمَنْ سَنَّ سُنَّةً سَيِّئَةً كَانَ لَهُ وَزْرُهَا وَوَزْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا)) کہ جس شخص نے اچھا طریقہ جاری کیا اسے اس کا اجر ملے گا اور ان لوگوں کا بھی اجر ملے گا جو اس پر عمل کریں گے بدوں اس کے کہ ان کے اجر میں کسی قسم کی کمی ہو اور جس نے بری رسم جاری کی اس پر اس کا بوجھ ہوگا اور ان لوگوں کا بھی جو اس پر عمل کریں گے۔

چنانچہ قرآن میں ہے:۔

﴿أَفَرَأَيْتُمُ النَّارَ الَّتِي تُورُونَ﴾ (۵۶-۷۱) بھلا دیکھو تو جو آگ تم درخت سے نکالتے ہو۔ اور کامیاب شخص کے متعلق کہا جاتا ہے۔

فُلَانٌ وَارَى الزَّنْدَ: فلاں کا پتھر آگ دینے والا ہے۔ یعنی وہ کامیاب ہے اور اس کے بالمقابل كَسِبَ الزَّنْدَ کے معنی ناکام کے ہیں۔ اور چربی دار گوشت کو اَللَّحْمُ الْوَارِي کہا جاتا ہے۔ اَلْوَرَاءُ: (ایضاً) اولاد کی اولاد یعنی پوتے یا نواسے کو کہا جاتا ہے اور وَرَاءُكَ کسی کام پر ابھارنے کے لیے بولا جاتا ہے۔ یعنی پیچھے ہٹ جاؤ۔ چنانچہ مجاہدہ ہے۔

وَرَاءُكَ أَوْسَعُ لَكَ: اس میں وَرَاءُكَ منصوب بفعل مضر ہے یعنی اَنْتَ وَرَاءُكَ اور بعض نے اس کا اصل یَكُنْ أَوْسَعُ لَكَ بیان کیا ہے اَي تَنَحَّ وَانْتَ مَكَانًا أَوْسَعُ لَكَ۔

التَّوْرَةُ: اس آسمانی کتاب کا نام ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے انہیں ورثہ میں ملی تھی۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ فَوْعَلَةٌ کے وزن پر ہے اور اس میں تاء واو سے مبدل ہے جیسے تَيَقُّورٌ جو قَارٌ سے بنا ہے اصل میں وَيَقُورٌ ہے اور یہ بحث پہلے گزر چکی ہے اور انہوں نے اسے تَفْعَلَةٌ کے وزن پر نہیں بنایا کیونکہ یہ وزن کلام عرب میں قلیل الوجود ہے۔

## (وزن)

الْوَزْرُ: پہاڑ میں جانے پناہ۔ قرآن پاک میں ہے۔ ﴿كَلَّا لَا وَزَرَ إِلَى رَبِّكَ يَوْمَئِذٍ الْمُسْتَقَرُّ﴾ (۷۵-۱۱) بے شک کہیں پناہ نہیں اس روز پروردگار ہی

① الحدیث ذکرہ مسلم فی صحیحہ من حدیث جریر بن عبداللہ والغزالی فی الحیاء (راجع تخریج العراقي ۷۳/۲) اشارٌ الیہ القبتی فی غریبہ، انظر القرطبی (۳۳۱/۱۳) والبحر (۱۴۴/۷)۔

کرنے کے ہیں اور وَاَزْرَتْ فُلَانًا مُّوَاَزَرَةً کے معنی ہیں: میں نے اس کی مدد کی۔

### (وزع)

وَزَعْتُهُ عَنْ كَذَا کے معنی کسی آدمی کو کسی سے کام سے روک دینا کے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَحِشْرَ لِّسُلَيْمَانَ جُؤْدَهُ مِنَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ وَالطَّيْرِ فَهُمْ يُوزَعُونَ﴾ (۱۷-۲۷) اور سلیمان علیہ السلام کے لیے جنوں اور انسانوں کے لشکر جمع کیے گئے اور وہ قسم دار کیے گئے تھے۔

تو یوزَعُونَ میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ عساکر باوجود کثیر التعداد اور متفاوت ہونے کے غیر مرتب اور منتشر نہیں تھے۔ جیسا کہ عام طور پر کثیر التعداد افواج کا حال ہوتا ہے بلکہ وہ نظم و ضبط میں تھے کہ کبھی سرکشی اختیار نہیں کرتے تھے اور بعض نے یوزَعُونَ کے یہ معنی کیے ہیں کہ لشکر کا اگلا حصہ پچھلے کی خاطر رکا رہتا تھا۔ اور آیت:-

﴿وَيَوْمَ يُحْشَرُ أَعْدَاءُ اللَّهِ إِلَى النَّارِ فَهُمْ يُوزَعُونَ﴾ (۱۹-۲۱) جس دن خدا کے دشمن دوزخ کی طرف چلائے جائیں گے تو ترتیب وار کر لیے جائیں گے۔ میں یوزَعُونَ سے انہیں عقوبت کے طور پر روک لینا مراد ہے جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا:

﴿وَلَهُمْ مَّقَامِعٌ مِنْ حَدِيدٍ﴾ (۱۲-۲۱) اور ان کے مارنے ٹھوکنے کے لیے لوہے کے ہتھوڑے ہوں گے۔ محاورہ ہے ﴿لَا بُدَّ لِلسُّلْطَانِ مِنْ وَزَعَةٍ﴾ کہ سلطان کے لیے محافظہ دستہ یا کارندوں کا ہونا ضروری ہے۔

تو یہاں ان لوگوں کے اجرا یا بوجھ سے ان کی مثل اجرا یا بوجھ مراد ہے اور آیت کریمہ میں بھی یہی معنی مراد ہیں۔ اور آیت:-

﴿وَلَا تَزِرْ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَى﴾ (۶-۱۶۵) اور کوئی شخص کسی (کے گناہ) کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ سے مراد یہ ہے کہ کوئی شخص دوسرے کا بوجھ اس طرح نہیں اٹھائے گا کہ مَحْمُولٌ عَنْهُ یعنی وہ دوسرا اس گناہ سے بری ہو جائے (لہذا ان دونوں میں کوئی منافات نہیں ہے) اور آیت:-

﴿وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ﴾ (۲-۹۴) اور تم پر سے بوجھ بھی اتار دیا۔

میں وِزْرٌ سے مراد وہ غزشتیں ہیں جو جاہلی معاشرہ کے رواج کے مطابق قبل از نبوت آنحضرت ﷺ سے سرزد ہوئی تھیں۔

الْوَزِيرُ: وہ ہے جو امیر کا بوجھ اور اس کی ذمہ داریاں اٹھائے ہوئے ہو۔ اور اس کے عہدہ کو وِزَارَةٌ کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:-

﴿وَأَجْعَلْ لِّي وَزِيرًا مِّنْ أَهْلِي﴾ (۲۰-۲۹) اور میرے گھر والوں میں سے (ایک کو) میرا وزیر (یعنی مددگار) مقرر فرما۔

أَوْزَارُ الْحَرْبِ: اس کا مفرد وِزْرٌ ہے اور اس سے مراد اسلحہ جنگ ہے اور آیت کریمہ:-

﴿وَلَكِنَّا حُمَلْنَا أَوْزَارًا مِّنْ زِينَةِ الْقَوْمِ﴾ (۲۰-۸۷) بلکہ ہم لوگوں کے زیوروں کا بوجھ اٹھائے ہوئے تھے۔ میں زیورات کے بوجھ مراد ہیں۔

الْمُوَاَزَرَةُ: (مفاعلة) کے معنی ایک دوسرے کی مدد

① وفي القرآن: ﴿حتى تضع الحرب أوزارها﴾ (۴۰-۴۷)

② قاله الحسن البصري لما ولي القضاء وازدحم الناس عليه فاذوه انظر الميداني (رقم ۲۱۰۴) واللسان (وزع) والنهاية (۲۲۱/۴) والفائض (۳۰/۲) (۱۶۰/۳) وفي حديث أبي بكر وقد شكى اليه بعض عماله ليقتض منه فقال: انا اقيد من وزعة الله (الفائق ۳۸۴/۲ وغريب أبي عبيد ۲۲۸/۳)

کے ساتھ ٹھیک تولو۔ میں اس بات کا حکم دیا ہے کہ اپنے تمام اقوال و افعال میں عدل و انصاف کو مد نظر رکھو۔ اور آیت:-

﴿وَأَنْبَتْنَا فِيهَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَوْزُونٍ﴾ (۱۵-۱۹) اور اس میں ہر ایک بنجیدہ چیز اگائی۔

میں بعض نے کہا ہے کہ شی موزون سے سونا، چاندی وغیرہ معدنیات مراد ہیں۔ اور بعض نے ہر قسم کی موجودات مراد لی ہیں اور آیت کے معنی یہ کیے ہیں۔ کہ اللہ تعالیٰ نے تمام چیزوں کو اعتدال اور تناسب کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ جس طرح کہ آیت:-

﴿إِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنَاهُ بِقَدَرٍ﴾ (۵۴-۵۹) ہم نے ہر چیز اندازہ مقرر کے ساتھ پیدا کی ہے۔

سے مفہوم ہوتا ہے۔ اور آیت:-

﴿وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذٍ الْحَقُّ﴾ (۷-۷) اور اس روز (اعمال کا) تکرار حق ہے۔ میں بتایا ہے۔

کہ قیامت کے دن نہایت عدل و انصاف کے ساتھ حساب لیا جائے گا جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا: ﴿وَنَضَعُ الْمَوَازِينَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيَمَةِ﴾ (۲۱-۲۷) اور ہم قیامت کے دن انصاف کی ترازو کھڑی کریں گے۔

قرآن پاک میں (قیامت کے روز اعمال کی ترازو کے لیے) بعض مقامات پر میزان لفظ واحد آیا ہے۔ اور بعض جگہوں پر موازن لفظ جمع۔ پس جہاں کہیں لفظ واحد کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ وہاں محاسب (حساب لینے والا) کا اعتبار کیا ہے۔ کہ وہ اکیلی ذات الہی ہے اور جہاں لفظ جمع آیا ہے۔ وہاں لوگوں کا اعتبار کیا ہے۔ کیونکہ ہر ایک کے اعمال کی ترازو الگ الگ ہوگی۔

جو لوگوں کو بے قانون ہونے سے روکیں۔ بعض نے کہا ہے کہ وُزُوْع کے معنی کسی چیز پر فریفتہ ہونے کے ہیں اور محاورہ ہے۔

أَوْزَعَ اللَّهُ فُلَانًا: اللہ تعالیٰ نے فلاں کو شکر گزاری کا الہام کیا۔ بعض نے کہا کہ یہ بھی أَوْزَعَ بِالشَّيْءِ سے ماخوذ ہے۔ جس کے معنی کسی چیز کا شیدائی بننے کے ہیں تو أَوْزَعَ اللَّهُ فُلَانًا سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے اپنی شکر گزاری کا شیدائی بنا دیا اور رَجُلٌ وُزُوْعٌ کے معنی کسی چیز پر فریفتہ ہونے والا کے ہیں۔ اس بنا پر آیت کریمہ:-

﴿رَبِّ أَوْزِعْنِي أَنْ أَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِي أَنْعَمْتَ عَلَيَّ﴾ (۲۷-۱۹) اے پروردگار! مجھے توفیق عنایت کر کہ جو احسان تو نے مجھ پر کیے ہیں ان کا شکر کروں۔ میں بعض نے أَوْزِعْنِي کے معنی أَلْهِمْنِي کیے ہیں یعنی مجھے شکر گزاری کا الہام کر مگر اس کے اصل معنی یہ ہیں کہ مجھے شکر گزاری کا اس قدر شیفٹہ بنا کہ میں اپنے نفس کو تیری ناشکری سے روک لوں۔

## (وزن)

الْوَزْنُ: (تولنا) کے معنی کسی چیز کی مقدار معلوم کرنے کے ہیں اور یہ وَزْنُهُ (ض) وَزْنًا وَزِنَةً کا مصدر ہے اور عرف عام میں وزن اس مقدار خاص کو کہتے ہیں جو ترازو یا قبان کے ذریعہ معین کی جاتی ہے اور آیت کریمہ:-

﴿وَوَزِّنُوا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيمِ﴾ (۱۷-۳۵) ترازو سیدھی رکھ کر تولاد کرو۔ اور نیز آیت کریمہ:-

﴿وَأَقِيمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ﴾ (۵۵-۹) اور انصاف

فاصل کو وسط ٹہا جاتا ہے۔ جیسے وَسَطُ الْقَوْمِ کَذَاکَ وہ لوگوں کے درمیان فاصل ہے۔

نیز أَلْوَسَطُ: (فتح السین) اس چیز کو بھی کہتے ہیں جو دو مذموم اطراف کے درمیان واقع ہو یعنی معتدل جو افراط و تفریط کے بالکل درمیان ہوتا ہے۔ مثلاً جو دکہ بخل اور اسراف کے درمیانی درجہ کا نام ہے اور معنی اعتدال کی مناسبت سے یہ لفظ عَدْلٌ - نَصْفَةٌ سَوَاءٌ کی طرح ہر عمدہ اور بہترین چیز کے لیے بولا جاتا ہے مثلاً جو شخص اپنی قوم میں بلحاظ حسب سب سے بہتر اور اونچے درجہ کا ہو اس کے متعلق ”هَذَا أَوْسَطُهُمْ حَسَبًا“ کہا جاتا ہے چنانچہ اسی معنی میں (امت مسلمہ کے متعلق) فرمایا۔

﴿وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا﴾ (۲-۱۲۳) اور اس طرح ہم نے تم کو امت معتدل بنایا۔ اسی طرح آیت:-

﴿قَالَ أَوْسَطُهُمْ﴾ (۶۰-۲۰) ایک جوان جو ان میں فرزانہ تھا بولا۔

میں بھی اوسط کا لفظ اسی معنی پر محمول ہے۔ اور کبھی (۳) کنایہ رذیل چیز پر بھی بولا جاتا ہے۔ جسے کہا جاتا ہے۔

فُلَانٌ وَسَطٌ مِنَ الرِّجَالِ کہ فلاں کم درجے کا آدمی ہے یعنی درجہ خیر سے گرا ہوا ہے۔ اور آیت کریمہ: ﴿حِفْظُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَالصَّلَاةِ الْوُسْطَى﴾ (۲-۲۳۸) مسلمانو! سب نمازیں خصوصاً بیچ کی نماز (یعنی عصر) پورے التزام کے ساتھ ادا کرتے رہو۔

میں بعض نے کہا ہے کہ وسطی سے مراد صلوٰۃ ظہر ہے کیونکہ وہ دن کے درمیانی حصہ میں ادا کی جاتی ہے اور بعض اس

وَزَنْتُ لِفُلَانٍ وَوَزَنْتُهُ کے معنی کسی کو تول کر دینے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَإِذَا كَالُوهُمْ أَوْ وَزَنُوهُمْ يُخْسِرُونَ﴾ (۸۳-۳) اور جب ان کو ناپ کر یا تول کر دیں تو کم کر دیں۔

مخاورہ ہے۔

قَامَ مِيزَانُ النَّهَارِ: یعنی دوپہر ہوگئی۔

## (وَسْوَاس)

أَلْوَسْوَسَةٌ: اس برے خیال کو کہتے ہیں۔ جو دل میں پیدا ہوتا ہے اور اصل میں یہ وَسْوَسَاسٌ سے ماخوذ ہے جس کے معنی زیور کی چھنکار یا ہلکی سی آہٹ کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:-

﴿فَوَسْوَسَ إِلَيْهِ الشَّيْطَانُ﴾ (۲۰-۱۲۰) تو شیطان نے ان کے دل میں وسوسہ ڈالا۔

﴿مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ﴾ (۱۱۳-۴) (شیطان) وسوسہ انداز کی برائی سے جو (خدا کا نام سن کر) پیچھے ہٹ جاتا ہے۔

اور وَسْوَسَاسٌ کے معنی شکاری کے پاؤں کی آہٹ کے بھی آتے ہیں۔

## (وَسْط)

وَسَطُ الشَّيْءِ: ہر چیز کی درمیانی جگہ کو کہتے ہیں۔ جہاں سے اس کے دونوں اطراف کا فاصلہ مساوی ہو۔ اور اس کا استعمال کمبیہ متصل یعنی ایک جسم پر ہوتا ہے۔ جیسے وَسَطُهُ صَلْبٌ (اس کا درمیان سخت ہے)۔

ضَرْبَتُهُ وَسَطٌ رَأْسِهِ: لیکن وَسَطٌ (بالسکون) کیت منفصلہ پر بولا جاتا ہے۔ یعنی دو چیزوں کے درمیان

نے اپنے اہل و عیال اور مال کو برباد کر دیا۔

### (وس ع)

السَّعَةِ کے معنی کشادگی کے ہیں اور یہ املکہ، حالت اور فعل جیسے قدرت، جود وغیرہ کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ وسعت مکانی کے متعلق فرمایا:۔

﴿إِنَّ أَرْضِيَّ وَأَسَعَهُ﴾ (۲۹-۵۶) میری زمین فراخ ہے۔

﴿أَلَمْ تَكُنْ أَرْضُ اللَّهِ وَأَسَعَهُ﴾ (۳-۹۷) کیا خدا کا ملک فراخ نہیں تھا۔

اور وسعت حالت کے متعلق فرمایا:۔

﴿لِيُسْفِقَ دُو سَعَةٍ مِّن سَعَتِهِ﴾ (۶۵-۷۷) صاحب

وسعت کو اپنی وسعت کے مطابق خرچ کرنا چاہیے ﴿عَلَى الْمَوْسِيعِ قَدْرَهُ﴾ (۲-۲۳۶) (یعنی)

مقدور والا اپنے مقدور کے مطابق..... أَلْوَسَعُ: اس

طاقت کو کہتے ہیں جو اس کام سے ذرا زیادہ ہو جو اس کے ذمہ لگایا گیا ہے۔ چنانچہ آیت کریمہ:۔

﴿لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا﴾ (۲-۲۸۶)

خدا کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔

میں تنبیہ فرمائی ہے کہ خدا بندے کے ذمہ اتنا ہی کام لگاتا

ہے جو اس کی طاقت سے ذرا کم ہوتا ہے اور بعض نے اس

کے معنی یہ بیان کیے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جن احکام کا انسان کو

مکلف بناتا ہے۔ ان کا ثمرہ وسعت یعنی وہ جنت ہے جس

سے صلوٰۃ مغرب مراد لیتے ہیں۔ کیونکہ وہ تعداد رکعات کے لحاظ سے ثنائی اور رباعی نمازوں کے درمیان میں ہے اور بعض نے صلوٰۃ فجر مراد لی ہے کیونکہ وہ دن اور رات کی نمازوں کے درمیان میں ہے جیسا کہ دوسری آیت فرمایا:

﴿اقِمِ الصَّلَاةَ لِذِكْرِكَ الشَّمْسِ إِلَى غَسَقِ اللَّيْلِ وَقُرْآنَ الْفَجْرِ﴾ (۱۷-۷۸) (اے محمد ﷺ) سورج

کے ڈھلنے سے رات کے اندھیرے تک (ظہر) عصر،

مغرب عشاء کی نمازیں اور صبح کو قرآن پاک پڑھا کرو۔

اور صلوٰۃ وسطیٰ کو خاص کر الگ ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ صبح

کا وقت سستی اور غفلت کا وقت ہوتا ہے۔ کیونکہ اس وقت

اٹھنے کے لیے نیند کی لذت کو چھوڑنا پڑتا ہے یہی وجہ ہے

کہ صبح کی اذان میں اَلصَّلَاةُ خَيْرٌ مِّنَ النَّوْمِ کا اضافہ

کیا گیا ہے۔ ① (۱۳۵)

اور جو لوگ اس سے صلوٰۃ عصر مراد لیتے ہیں۔ ② جیسا کہ

آنحضرت ﷺ سے ایک حدیث میں بھی مروی ہے تو وہ

اس کے علیحدہ ذکر کرنے کی وجہ سے یہ بیان کرتے ہیں کہ

عصر کا وقت عوام کے کاروبار کا وقت ہوتا ہے اس لیے نماز

میں سستی ہو جاتی ہے بخلاف دوسری نمازوں کے کہ ان

کے اول یا آخر میں فرصت کا وقت مل جاتا ہے۔ یہی وجہ

ہے کہ آنحضرت ﷺ نے زجر فرمایا: ③ (۱۳۶)

((مَنْ فَاتَتْهُ صَلَاةُ الْعَصْرِ فَكَأَنَّمَا وَتَرَ أَهْلَهُ

وَمَسْأَلُهُ)) کہ جس نے عصر کی نماز ضائع کر دی گویا اس

① انظر كنز العمال (۷/ ۴۹۰) (ابو الشيخ في كتاب الاذان عن ابى مجذورة) وعن بلال۔

② كما هو مروى عن الحسن وعلى و ابن عباس وابن مسعود وخلق كثير الحديث الذي اشار اليه المؤلف في ذلك فقد رواه مسلم عن حديث علي في قصه يوم الأحزاب۔ شغلونا عن الصلوة الوسطى صلوة العصر ملاء الله بيوتهم نارا۔ وحديث مصحف عائشة وحفصة مشهور في هذه المسئلة رواه مالك و ابو داود (روح المعاني ص ۱۳۵ ج ۲)

③ متفق عليه من حديث ابن عمر انظر الكافي لابن حجر (۱۸۸) و ۱۵۱ رقم (۴۱۵) و كنز العمال (۷/ ۲۷۱-۲۷۳)۔



ہے۔ اور آیت۔

﴿وَأَنَّا لَمُنُوبِعُونَ﴾ (۵۱-۴۷) اور ہم کو سب مقدور

ہے، میں اللہ تعالیٰ کی اس وسعت کی طرف اشارہ ہے جیسا

کہ آیت:

﴿الَّذِي أَعْطَى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهُ ثُمَّ هَدَى﴾

(۲۰-۵۰) وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی شکل و صورت

بخشی اور پھر راہ دکھائی۔

میں بیان کیا جاتا ہے (یعنی خلق و ہدایت کے فیضان سے

وہ ہر چیز کو اپنے اندر سمائے ہوئے ہے)

وَسِعَ الشَّيْءُ اتَّسَعَ کے معنی کسی چیز کے فراخ ہونا کے

ہیں اور اَلْوُسْعُ کے معنی تو گری اور طاقت کے بھی آتے

ہیں۔ چنانچہ محاورہ مشہور ہے۔ هُوَ يُنْفِقُ عَلَى قَدَرِ

وُسْعِهِ کہ وہ اپنی طاقت کے مطابق خرچ کرتا ہے۔

أَوْسَعَ فُلَانٌ: وہ غنی اور صاحب وسعت ہو گیا۔ فَرَسٌ

وَسَاعُ الْخَطْوِ: وہ گھوڑا جو لمبی لمبی ڈگ بھرتا ہوا نہایت

تیزی سے دوڑے۔<sup>①</sup>

## (وَسَق)

اَلْوَسَقُ کے معنی متفرق چیزوں کو یکجا

اکٹھا کرنے کے ہیں چنانچہ وَسَقْتُ (ض) اَلشَّيْءَ

کے معنی ہیں: میں نے اس شے کے متفرق اجزاء کو اکٹھا کیا

اور بوجھ کی معین مقدار۔ مثلاً ایک اونٹ کے بار کو بھی

وَسَقٌ کہا جاتا ہے اور بعض نے کہا ہے کہ وسق ساٹھ صاع

کے برابر ہوتا ہے۔ اسی سے أَوْسَقْتُ الْبَعِيرَ (افعال)

ہے جس کے معنی اونٹ پر بوجھ لادنے کے ہیں۔

نَسَاقَةٌ وَأَيْسَقٌ: حاملہ اونٹنی۔ اس کی جمع مَوَاسِيقُ آتی

کی پہنائی ارض و سما ہے<sup>②</sup> جیسا کہ اس کی تائید میں دوسری

جگہ فرمایا:۔

﴿يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ﴾

(۲-۱۵۸) خدا تمہارے حق میں آسانی چاہتا ہے اور سختی

نہیں چاہتا۔

اور آیت:۔

﴿وَسِعَ كُلُّ شَيْءٍ عِلْمًا﴾ (۲۰-۹۸) اس کا علم ہر

چیز پر محیط ہے۔

میں اللہ تعالیٰ کے احاطہ علمی کا بیان ہے۔ جیسے دوسری جگہ

اس مفہوم کو:۔ ﴿أَحَاطَ بِكُلِّ شَيْءٍ عِلْمًا﴾

(۶۵-۱۲) خدا اپنے علم سے ہر چیز پر احاطہ کیے ہوئے

ہے، سے تعبیر فرمایا ہے۔

اور آیت کریمہ:۔

﴿وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ﴾ (۳-۷۳) اور خدا کشفائش

والا اور علم والا ہے۔

اور نیز آیت کریمہ:۔

﴿وَكَانَ اللَّهُ وَاسِعًا حَكِيمًا﴾ (۴-۱۳۰) اور خدا

بڑی کشفائش اور حکمت والا ہے۔

میں اللہ تعالیٰ کا بلحاظ علم، قدرت، رحمت و فضل کے وسیع

ہونا مراد ہے۔ جیسا کہ آیت:

﴿وَسِعَ رَبِّي كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا﴾ (۶-۸۱) میرا

پروردگار اپنے علم سے ہر چیز پر احاطہ کیے ہوئے ہے۔

اور آیت کریمہ:۔

﴿وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ﴾ (۷-۱۵۶) اور

جو میری رحمت ہے وہ ہر چیز کو شامل ہے۔ سے معلوم ہوتا

① کما فی آية (۵۷-۲۱)

② وصدره القطوف وقد مر في (ق ط ف) وفي المثل قد يبلغ القطوف الوساع انظر الميداني (رقم ۲۸۴۴)۔

یہی معنی تقرب الی اللہ کے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف رغبت کرنے والے کو واسل کہا جاتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اس کے علاوہ تَوَسَّل کے معنی چوری کرنا بھی آتے ہیں۔ چنانچہ محاورہ ہے:-

أَخَذَ فُلَانٌ إِبِلَ فُلَانٍ تَوَسَّلًا: اس نے فلاں کے اونٹ چوری کر لیے۔

### (وس م)

الْوَسْمُ: (ض) کے معنی نشان اور داغ لگانے کے ہیں اور بِسْمَةٍ علامت اور نشان کو کہتے ہیں۔ چنانچہ محاورہ ہے:-  
وَسَمْتُ الشَّيْءِ وَسَمًا: میں نے اس پر نشان لگایا۔  
قرآن پاک میں ہے:-

﴿سَنَسِمُهُ عَلَى الْخُرُطُومِ﴾ (۶۸-۱۶) ہم عنقریب اس کی ناک پر داغ لگائیں گے۔

یعنی اس کی ناک پر ایسا نشان لگائیں گے جس سے اس کی پہچان ہو سکے گی۔ جیسا کہ مومنین کے متعلق فرمایا:-

﴿تَعْرِفُ فِي وُجُوهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِيمِ﴾ (۸۳-۲۳) تم ان کے چروں ہی سے راحت کی تازگی معلوم کر لو گے۔

﴿سِيمَا هُمْ فِي وُجُوهِهِمْ مِنْ أَثَرِ السُّجُودِ﴾  
کثرت سجد کے اثر سے ان کی پیشانیوں پر نشان پڑے ہوئے ہیں۔

﴿تَعْرِفُهُمْ بِسِيمَاهُمْ﴾ (۲-۲۷۳) اور تم قیامت سے ان کو صاف پہچان لو گے۔

التَّوَسُّمُ کے معنی آثار و قرائن سے کسی چیز کی حقیقت معلوم کرنے کی کوشش کرنا کے ہیں اور اسے علم ذکانت، فراست اور فطانت بھی کہا جاتا ہے حدیث

وَسَفَّتِ الْجَنَّةُ: میں نے گیہوں کا ایک دق بھرا۔  
وَسَفَّتِ الْعَيْنُ الْمَاءَ: آنکھ پانی سے بھر گئی۔ مشہور محاورہ ہے:-

لَا أَفْعَلُهُ مَا وَسَفَّتْ عَيْنِي الْمَاءَ: کہ جب تک میری آنکھ میں پانی ہے (یعنی زندگی بھر) یہ کام نہیں کروں گا۔ قرآن پاک میں ہے:-

﴿وَاللَّيْلُ وَمَا وَسَقَ﴾ (۲۸-۱۷) اور رات کی اور جن چیزوں کو اکٹھا کر لیتی ہے۔ ان کی۔

بعض نے کہا ہے کہ ماوسق سے مراد رات کی تاریکی ہے جبکہ پوری طرح چھا جائے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ ماوسق سے طوارق (رات میں واقع ہونے والے حوادث) مراد ہیں۔

الْوَسِيقَةُ: اونٹوں کے گلہ کو کہتے ہیں جیسے رُفْقَةُ کے معنی انسانوں کی جماعت کے ہیں۔

الْإِتْسَاقُ کے معنی کسی چیز کے اجزاء کے مجتمع اور (پورے طور پر) اکٹھا ہو جانے کے ہیں چنانچہ فرمایا ﴿وَالْقَمَرُ إِذَا اتَّسَقَ﴾ (۸۴-۱۸) اور چاند کی جب وہ کامل ہو جائے۔

### (وس ل)

الْوَسِيلَةُ کے معنی کسی چیز کی طرف رغبت کے ساتھ پہنچنے کے ہیں۔ چنانچہ معنی رغبت کو متضمن ہونے کی وجہ سے یہ وَصِيلَةٌ سے اخذ ہے۔ ﴿وَابْتَغُوا إِلَيْهِ الْوَسِيلَةَ﴾ (۵-۳۵) اور اس کا قرب حاصل کرنے کا ذریعہ تلاش کرو۔

درحقیقت توسل الی اللہ، علم و عبادت اور مکارم شریعت کی بجا آوری سے طریق الہی کی محافظت کرنے کا نام ہے اور

مُحَصَّب اور عید گاہ میں جمع ہونے کے ہیں اور جس جگہ پر حجاج کنکر پھینکتے ہیں اسے مُحَصَّب کہا جاتا ہے۔

### (ن س ن)

الْوَسْنُ وَالسِّنَةُ کے معنی غفلت یا اونگھ کے

ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:-

﴿لَا تَأْخُذْهُ سِنَةٌ وَلَا نَوْمٌ﴾ (۲-۲۵۵) اسے نہ

اونگھ آتی ہے اور نہ نیند۔

رَجُلٌ وَسَنَانٌ: اونگھنے والا مرد۔

تَوَسَّنَ الْمَرْأَةُ: سوئی ہوئی عورت سے مجامعت کرنا۔

وَسِنٌ وَأَسِنَّ کے معنی کنویں کی بدبو سے بے ہوش ہونیکے

ہیں۔ مصنف کی رائے یہ ہے کہ یہ معنی نیند کی مناسبت سے

لیا گیا ہے نہ کہ غشیان یعنی ڈھانپنے کے معنی سے۔

### (و س ی)

مُوسَى: حضرت موسیٰ علیہ السلام۔

جو لوگ اسے عربی مانتے ہیں ان کے نزدیک یہ موسیٰ الحدید سے منقول ہے جس کے معنی استرے..... کے ہیں اور اَوْسَيْتُ رَأْسَهُ کے معنی ہیں: میں نے استرے سے اس کا سر مونڈ ڈالا۔

### (و ش ی)

وَشَيْتٌ (ض) الشَّيْءُ وَشَيْءٌ کے معنی کسی

چیز میں اس کے تمام رنگ کے خلاف اور رنگ لگانا کے ہیں اسی سے وَشِيَّةٌ بروزن فَعْلَةٌ ہے جس کے معنی کسی ایسے رنگ کا نشان یا داغ کے ہیں (جو سارے بدن کے

رنگ کے خلاف ہو)۔ قرآن پاک میں ہے:-

میں ہے۔ (۱۲۷)

((اتَّقُوا فِرَاسَةَ الْمُؤْمِنِينَ فَإِنَّهُ يَنْظُرُ بِنُورِ اللَّهِ))

یعنی مومن کی فراست سے ڈرتے رہو وہ خدا تعالیٰ کے عطا کیے ہوئے نور تو فیق سے دیکھتا ہے۔

قرآن پاک میں ہے:-

﴿إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّلْمُتَوَسِّمِينَ﴾ (۱۵-۷۵)

بے شک اس (قصے) میں اہل فراست کے لیے نشانیاں ہیں۔

یعنی ان کے قصہ میں عبرت اور نصیحت حاصل کرنے کے لیے بہت سے نشانات ہیں۔

الْوَسْمِيُّ: موسم بہار کی ابتدائی بارش کو کہتے ہیں اس لیے کہ اس سے زمین پر گھاس کے نشانات ظاہر ہو جاتے ہیں۔ اور تَوَسَّمْتُ جس کے معنی علامت سے پہچان لینے کے ہیں۔

در اصل یہ لفظ وہی گھاس کے تلاش کر لینے پر بولا جاتا ہے۔  
فُلَانٌ وَسِيمٌ الْوَجْهَ: فلاں خوب رو ہے۔  
هُوَ ذُو وَسَامِيَّةٍ: وہ صاحب جمال ہے۔

فُلَانَةٌ ذَاتُ مَيْسَمٍ: فلاں عورت صاحب حسن و جمال ہے۔  
فُلَانٌ مَوْسُومٌ بِالْخَيْرِ: اس کے چہرہ سے خیر نیکتی ہے۔  
قَوْمٌ وَسَامٌ: خوبصورت لوگ۔

مَوْسِمُ الْحَاجِّ: حجاج کے جمع ہونے کا زمانہ اس کی جمع مَوَاسِمُ ہے اور وَسَمُوا کے معنی موسم میں حاضر ہونے کے ہیں۔

جیسا کہ عَرَفُوا وَحَصَبُوا وَعَبَدُوا کے معنی عرفہ،

① رواہ الترمذی والبخاری فی تاریخہ من حدیث ابی سعید (راجع لطرقہ کنز العمال ۸۵/۱۱) واللالی المصنوعة (۳۲۹-۳۳۰) و تخريج العراقي على الاحياء (۳۹۴/۲)۔

﴿يُؤْمَرُونَ﴾ (۶۶-۶۷) جو ارشاد خدا ان کو فرماتا ہے اس کی نافرمانی نہیں کرتے اور جو حکم انہیں ملتا ہے اسے بجا لاتے ہیں۔

وَصَبَّ وَصُوبًا: کسی چیز کا دائم اور ثابت رہنا۔

وَصَبَّ الدِّينُ: قرض کا واجب اور لازم ہو جانا۔

مَفَازَةٌ وَأَصْبَةٌ: دور تک پھیلا ہوا بیابان جس کی انتہاء ہو۔

### (و ص د)

الْوَصِيدُ: اصل میں اس احاطہ کو کہتے ہیں جو مویشی کے لیے پہاڑ میں بنا لیا جائے اور آیت:

(۱۸-۱۸) میں اس کے معنی غار کا صحن یا دروازے کی

چوکھٹ کے ہیں اسی سے اَوْصَدْتُ الْبَابَ وَأَصْدَتْهُ

کا محاورہ ہے جس کے معنی ہیں: میں نے دروازے کو بند کر

دیا۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔

﴿عَلَيْهِمْ نَارٌ مُّؤَصَّدَةٌ﴾ (۹۰-۲۰) یہ لوگ آگ میں

بند کر دیئے جائیں گے۔

ایک قرأت مُؤَصَّدَةٌ ہمزہ کے ساتھ ہے۔ اور آیت کے

معنی ہیں: اس آگ کو ان پر بند کر دیا جائے گا۔

الْوَصِيدُ (ایضاً) پودا، جس کی جڑیں زیادہ گہری نہ ہوں۔

### (و ص ف)

الْوَصْفُ کے معنی کسی چیز کا حلیہ اور نعت بیان

کرنے کے ہیں اور کسی چیز کی وہ حالت جو حلیہ اور نعت

کے لحاظ سے ہوتی ہے اسے صِفَةٌ کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ

زِنَةٌ ہر چیز کی مقدار پر بولا جاتا ہے۔

اور وصف چونکہ غلط اور صحیح دونوں طرح ہو سکتا ہے۔ چنانچہ

آیت کریمہ:

﴿مُسْلِمَةً لَا شَيْئَ فِيهَا﴾ (۲-۱۷) وہ بالکل صحیح سالم ہو اور اس پر کسی قسم کا داغ نہ ہو۔

اور ثَوْرٌ مُّوَشَّى الْفَوَائِمِ: اس تیل کو کہتے ہیں جس کی

ٹانگوں پر اس کے سارے بدن کے رنگ کے خلاف

نشانات ہوں۔ (یہ تو اس کے اصل معنی ہیں) اس کے بعد

یہ لفظ کلام میں رنگ آمیزی کے معنوں میں استعمال ہونے

لگا ہے چنانچہ مَوْهَهُ وَزَخَرَفَهُ کی طرح کہا جاتا ہے۔

وَشَّى فُلَانٌ كَلَامَةً: اس نے اپنی بات میں جھوٹ

بول کر رنگ آمیزی کی اور اس میں تو یہ سے کام لیا اور اسی

سے اَلْوَأَشْيُ ہے جس کے معنی چغلی خوری کے ہیں۔

### (و ص ب)

الْوَصَبُ کے معنی دائمی مرض کے ہیں اور

وَصَبَ فُلَانٌ (س) فَهُوَ وَصَبٌ کے معنی دائمی

مرض میں مبتلا ہونے کے ہیں۔

أَوْصَبَهُ كَذَا فَهُوَ يَتَوَصَّبُ: اسے فلاں بیماری لگ گئی

چنانچہ وہ بیمار پڑ گیا۔ جیسے أَوْجَعَهُ فَهُوَ يَتَوَجَّعُ قرآن

پاک میں ہے۔

﴿وَلَهُمْ عَذَابٌ وَأَصْبٌ﴾ (۳۷-۹) اور ان کے

لیے عذاب دائمی ہے۔ اور آیت کریمہ: ﴿وَلَهُ الدِّينُ

وَأَصْبًا﴾ (۱۶-۵۲) اور اسی کی عبادت لازم ہے۔

میں اس شخص کے لیے وعید ہے جو اللہ کے ساتھ شریک

ٹھہراتا ہے۔ کہ ایسے شخص کو دائمی عذاب کی سزا ملے گی۔

اور یہاں دین بمعنی طاعت ہے اور واصب بمعنی دائم اور

آیت کے معنی یہ ہیں کہ انسان کو ہر حالت میں ہمیشہ اسی کی

عبادت کرنا چاہیے جیسا کہ فرشتوں کے متعلق فرمایا:

﴿لَا يَعْصُونَ اللَّهَ مَا أَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُونَ مَا

(۲-۲۷) اور جس چیز (یعنی رشتہ قرابت) کے جوڑے رکھنے کا خدا نے حکم دیا ہے اسی کو قطع کیے ڈالتے ہیں۔ اور آیت کریمہ:-

﴿أَلَا الَّذِينَ يَصِلُونَ إِلَى قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِيثَاقٌ﴾ (۳-۹۰) مگر جو لوگ ایسے لوگوں سے تعلق رکھتے ہوں جن میں اور تم میں (صلح کا) عہد ہو۔ میں یَصِلُونَ کے معنی منتسب ہونے کے ہیں۔ چنانچہ اسی سے محاورہ ہے:-

فُلَانٌ مُتَّصِلٌ بِفُلَانٍ: یعنی فلاں اس کے ساتھ تعلق رکھتا ہے۔ اور آیت کریمہ:-

﴿وَلَقَدْ وَصَّلْنَا لَهُمُ الْقَوْلَ﴾ (۲۸-۵۱) اور ہم پے درپے ان لوگوں کے پاس (ہدایت کی) باتیں بھیجتے رہے ہیں۔

میں وَصَّلْنَا الْقَوْلَ کے معنی متواتر بات کہنے کے ہیں یعنی ہم..... ان کے پاس لگاتار اپنا کلام بھیجتے رہے ہیں۔ مُوَصِّلُ الْبَعْثِ: اونٹ کا مفصل، جوڑ جو دو اعضا کے درمیان ہوتا ہے مثلاً ران اور عجز کے درمیان کا جوڑ اور آیت:-

﴿وَلَا وَصِيلَةَ﴾ (۵-۱۰۳) اور نہ وصیلہ ہے۔

میں وصیلہ سے مراد وہ بکری ہے جو (دو دو مادینہ بچے دینے کے بعد ساتویں بطن میں ایک نر اور ایک مادہ بچہ دے)۔ (جاہلیت میں) اس مادہ کی وجہ سے نر بچہ کو بھی ذبح نہ کرتے اور کہتے کہ وَصَلْتُ أَخَاهَا کہ یہ اپنے بھائی سے مل گئی۔

اور بعض نے کہا ہے کہ الْوَصِيلَةُ کے معنی آبادی اور زرخیزی کے ہیں اور وسیع زمین کو بھی الْوَصِيلَةُ کہا

﴿وَلَا تَقُولُوا لِمَا تَصِفُ أَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ﴾ (۱۶-۱۱۶) اور یوں ہی جھوٹ جو تمہاری زبان پر آئے مت کہہ دیا کرو۔ میں تنبیہ کی ہے وہ (یہود) جو کچھ بیان کرتے ہیں سراسر جھوٹ ہے اسی طرح آیت: ﴿رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُونَ﴾ (۲۷-۱۸۰) یہ جو کچھ بیان کرتے ہیں..... صاحب عزت ہے، میں اس بات پر تنبیہ کی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان صفات سے متصف نہیں ہے جن کا کہ اکثر لوگ اعتقاد رکھتے ہیں بلکہ ذات باری تعالیٰ ہر قسم کی تشبیہ و تمثیل اور ان باتوں سے جو کفار اس کی طرف منسوب کرتے ہیں بہت بلند اور دور ہے اسی لیے فرمایا:

﴿وَلَهُ الْمَثَلُ الْأَعْلَى﴾ (۳۰-۲۷) اور اس کی شان نہایت بلند ہے۔

إِتَّصَفَ الشَّيْءُ: کے معنی ہیں کہ بظاہر دیکھنے میں یہ چیز اس صفت کے ساتھ متصف ہو سکتی ہے۔

وَصَفَ الْبَعِيرُ وَصُوفًا اُونْتُ کا عمدہ رفتار ہونا۔  
الْوَصِيفُ: خادم اور خادمہ کو وَصِيفَةً کہا جاتا ہے۔  
اور اسی سے محاورہ ہے:-

وَصَفَّتِ الْجَارِيَةُ: کنیز خدمت کے لائق ہو گئی۔

## (وصل)

الْإِتِّصَالُ کے معنی اشیاء کے باہم اس طرح متحد ہو جانے کے ہیں جس طرح کہ قطر دائرہ کی دونوں طرفیں ملی ہوئی ہوتی ہیں۔ اس کی ضد انفصال آتی ہے۔ اور وَصَلُ کے معنی ملانے کے ہیں اور یہ اسم عین اور معنی دونوں کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ وَصَلْتُ فُلَانًا صُلَّ جی کے معنی میں آتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:-

﴿وَيَقْطَعُونَ مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَنْ يُوصَلَ﴾

جاتا ہے۔

قرآن پاک میں ہے:-

مجاورہ ہے: هَذَا وَصَلُ هَذَا۔

یعنی (یہ اس کی مثل ہے) یہ اس کا صلہ ہے۔

﴿وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ﴾

(۱۰۳-۳) اور آپس میں حق بات کی تلقین اور صبر کی تاکید

کرتے رہے۔

## (وَصِی)

﴿آتَوَاصُوا بِهِ بَلْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُونَ﴾ (۵۱-۵۳)

کیا یہ لوگ ایک دوسرے کو اس بات کی وصیت کرتے آئے ہیں؟ بلکہ یہ شریر لوگ ہیں۔

## (وَضِع)

الْوَضْعُ: (نیچے رکھ دینا) یہ حَطُّ سے عام

ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَآكَوَابٌ مَّوْضُوعَةٌ﴾ (۸۸-۱۴) اور آنخوڑے

(قرینے سے) رکھے ہوئے۔

اور اسی سے مَوْضِعُ ہے جس کی جمع مَوَاضِعُ آتی ہے

جس کے معنی ہیں جگہیں یا موقعے۔ جیسے فرمایا۔

﴿يُحَرِّقُونَ الْكَلِمَ عَنْ مَوَاضِعِهِ﴾ (۵-۱۳) یہ

لوگ کلمات (کتاب) کو ان کے مقامات سے بدل دیتے

ہیں۔

اور وَضْعُ: کا لفظ وضع حمل اور بوجھ اتارنے کے معنی میں

آتا ہے۔ چنانچہ مجاورہ ہے وَضَعَتِ الْمَرْءُ الْحَمْلَ

وَضَعًا: عورت نے بچہ جنا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ انِّي وَضَعْتُهَا أُنْثَىٰ

وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا وَضَعْتَ﴾ (۳۶-۳) جب ان

کے ہاں بچہ پیدا ہوا اور جو کچھ ان کے ہاں پیدا ہوا تھا خدا کو

الْوَصِيَّةُ: واقعہ پیش آنے سے قبل کسی کو

ناصحانہ انداز میں ہدایت کرنے کے معنی میں آتا ہے اور یہ

أَرْضٌ وَأَصِيَّةٌ کے مجاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی

پیوستہ گیاہ یعنی باہم گتھی ہوئی گھاس والی زمین کے ہیں اور

أَوْصَاهُ وَوَصَّاهُ کے معنی کسی کو وصیت کرنے کے ہیں۔

چنانچہ قرآن پاک میں ہے:-

﴿وَوَصَّىٰ بِهَآ إِبْرَاهِيمُ بَنِيهِ وَيَعْقُوبُ﴾

(۲-۱۲۳) اور ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کو اس بات کی

وصیت کی اور یعقوب علیہ السلام نے بھی۔

ایک قرأت میں أَوْصَى ہے۔

نیز فرمایا:

﴿وَلَقَدْ وَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ﴾ (۲۹-۸) اور ہم نے

انسان کو حکم دیا۔

﴿مِّنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصِي بِهَآ أَوْ دِينَ﴾ (۴-۱۰)

وصیت کی تعمیل کے بعد جو اس نے کی ہو یا قرض کے

﴿حِينَ الْوَصِيَّةِ اثْنِ﴾: (۵-۱۰۶) کہ وصیت کے

وقت۔۔۔ تم دو مرد۔

وَصَى: (ایضاً) کسی کی فضیلت بیان کرنا۔

تَوَاصَى الْقَوْمُ: ایک دوسرے کو وصیت کرنا۔

① قاله ابو عبيدة في مجازہ (۱/۱۳۶) وجرى عليه ابن قتيبة (۱۳۳) ولكن نقد عليه الحاس في الماسح والمسوح (۱۰۹۶) والطبري في تفسير (۲۰/۹۵) راجع البحر (۳/۳۱۵) والقرطبي (۵/۳۰۸)۔

② وهي قراءة نافع وابن عمر من اهل المدينة والباقون وصى (تفسير ابی حیان ۱/۳۹۸) وقد ذكر ابو حيان في هذا الموضع ان مصحف اهل المدينة مخالف لمصحف اهل العراق في اثني عشر حرفا فراجع ۱۲۔

(فساد ڈلوانے کی غرض) سے دوڑے دوڑے پھرتے۔ اور وضع کا لفظ سَیَر یعنی چلنے کے معنی میں بطور استعارہ استعمال ہوتا ہے جیسا کہ اَلْفِی بَاعَهُ وَتَفْلَهُ: میں قیام کرنے سے کنایہ ہوتا ہے۔

اَلْوَضِیْعَةُ: (رعایت) کی جو اصل قیمت میں کی جائے۔ وَضَعَ الرَّجُلُ فِی تِجَارَتِهِ: اس نے تجارت میں نقصان اٹھایا۔

رَجُلٌ وَضِیْعٌ: نہایت خیس آدمی۔ (باب کَرَم) یہ رَفِیْع کے مقابلہ میں استعمال ہوتا ہے جس کے معنی بلند قدر کے ہیں۔

### (وَضَن)

اَلْوَضَنُ: اس کے اصل معنی زرہ بانی کے ہیں۔ اور استعارۃً کسی چیز کو مضبوطی کے ساتھ بننے پر بولا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:-

﴿عَلَى سُرُرٍ مَّوْضُونَةٍ﴾ (۵۶-۱۵) (جواہرات) سے مرصع پلنگوں پر.....

اور اسی سے وَضِیْنُ السَّاقَةِ ہے جس کے معنی حزام یعنی پالان کنے کی ری کے ہیں۔ اس کی جمع وَضْنٌ ہے۔

### (وَطَأ)

وَطَأَ الشَّيْءُ فَهُوَ وَطِئٌ: کے معنی کسی چیز کے پامال ہونے کے ہیں۔

اَلْوِطَاءُ: ہر اس شے کو کہتے ہیں جو پاؤں کے نیچے روندی جائے جیسے فراش وغیرہ۔

وَطَأْتُ لَهُ بِفَرَّاشِهِ: کسی کے لیے فراش بچھانا۔ وَطَأْتُهُ (ف) بِرِجْلِي وَطَأَ وَوَطَاءَةً وَتَوَطَّأْتُہُ کسی چیز کو پاؤں سے روندنا قرآن پاک میں

خوب معلوم تھا تو کہنے لگیں کہ پروردگار میرے تو لڑکی ہی ہوئی ہے۔

لیکن اَلْوَضْعُ وَالتَّضَعُّ کے معنی عورت کے آخر طہر میں حاملہ ہونے کے ہیں۔ وَضَعْتُ الْحَمْلَ: میں نے بوجھ اتار دیا اور اتارے ہوئے بوجھ کو مَوْضُوعُ کہا جاتا ہے۔ اور آیت:-

﴿وَالْأَرْضَ وَضَعَهَا لِلْأَنَامِ﴾ (۱۰-۵۵) اور اسی نے خلقت کے لیے زمین بچھائی۔

میں وضع سے مراد خلق و ایجاد (یعنی پیدا کرنا) ہے۔ اور وَضَعُ الْبَيْتِ کے معنی مکان بنانے کے آتے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:-

﴿إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ﴾ (۳-۹۵) پہلا گھر جو لوگوں کے عبادت کرنے کے لیے بنایا گیا تھا۔ اور آیت کریمہ:-

﴿وَوَضِعَ الْكِتَابَ فَتَرَى الْمُجْرِمِينَ﴾ (۱۸-۴۹) اور علموں کی کتاب کھول کر رکھی جائے گی۔

میں وضع کتاب سے قیامت کے دن اعمال کے دفتر کھولنا اور ان کی جزا دینا مراد ہے۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا:-

﴿وَنُخْرِجُ لَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ كِتَابًا يَلْقَاهُ مَنشُورًا﴾ (۱۸-۱۳) اور قیامت کے دن وہ کتاب اسے نکال دکھائیں گے جسے وہ کھلا ہوا دیکھے گا۔

وَضَعَتِ (ف) الدَّابَّةُ فِی سَبِيلِهَا: سواری تیز رفتاری سے چلی۔ اور تیز رفتار سواری کو حَسَنَةً

اَلْمَوْضُوعِ (وَحَسَنُ الْمَوَاضِعِ) کہا جاتا ہے۔ اَوْضَعْتُهَا میں نے اسے دوڑایا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَلَا أَوْضَعُوا خِلَافَكُمْ﴾ (۷۴-۹) اور تم میں

ہے:- ﴿إِنَّ نَاشِئَةَ اللَّيْلِ هِيَ أَشَدُّ وَطْأً﴾ (۶۷-۶۸) کچھ شک نہیں کہ رات کا اٹھنا (نفس بیکہ کو) سخت پامال کرتا ہے۔

ایک قرأت میں وطاء ہے۔ اور حدیث میں ہے۔ ﴿اللَّهُمَّ اشْدُدْ وَطْأَتَكَ عَلَى مُضَرٍّ﴾ (۱۳۸) اے اللہ! مضر پر اپنی گرفت کو سخت کر یعنی انہیں ذلیل کر۔ وَطِئَ امْرَأَتُهُ عورت سے ہمستری کرنا۔ یہ لفظ اگرچہ اپنے اصل معنی کے لحاظ سے جماع کے معنی میں بطور کنایہ استعمال ہوتا ہے۔ لیکن عرف میں بمنزلہ لفظ صریح کے ہے۔

الْمُوَاطَاةُ: اس کے معنی موافقت کے آتے ہیں۔ اور اصل معنی دوسرے کے نشان قدم پر اپنا قدم رکھنے کے ہیں۔ چنانچہ آیت إِنَّمَا النَّسِيءُ کے آخر میں فرمایا ﴿لِيُؤْاطُوا عِدَّةَ مَا حَرَّمَ اللَّهُ﴾ (۹-۳۷) تاکہ ادب کے مہینوں کو، جو خدا نے مقرر کیے ہیں۔ گنتی پوری کر لیں۔

## و ط ر

الْوَعْدُ: (وعدہ کرنا) کا لفظ خیر و شر (یعنی اچھے اور برے) دونوں پر بولا جاتا ہے۔ اور اس معنی میں وَعْدٌ يَعِدُ وَعْدًا وَمَوْعِدًا وَمِيعَادًا استعمال ہوتا ہے۔ مگر الْوَعِيدُ کا لفظ خاص کر شر (یعنی دھمکی اور تہدید) کے لیے بولا جاتا ہے۔ اور اس معنی میں باب أَوْعَدَ (تَوَعَّدَ) استعمال ہوتا ہے۔ اور وَاعِدْتُهُ (مُفَاعَلَةٌ) وَتَوَاعَدْنَا (تفاعل) کے معنی باہم عہد و پیمان کرنا کے ہیں (قرآن کریم میں وَعْدًا کا لفظ خیر و شر دونوں کے لیے

استعمال ہوا ہے) چنانچہ وعدہ خیر کے متعلق فرمایا ﴿إِنَّ اللَّهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ﴾ (۱۴-۲۲) جو وعدہ خدا نے تم سے کیا تھا وہ تو سچا تھا۔ ﴿أَفَمَنْ وَعَدْنَاهُ وَعْدًا حَسَنًا﴾ (۲۸-۶۱) بھلا جس شخص سے ہم نے نیک وعدہ کیا۔

﴿وَعَدَكُمْ اللَّهُ مَغَانِمَ كَثِيرَةً﴾ (۲۸-۲۰) خدا نے تم سے بہت سی غنیمتوں کا وعدہ فرمایا:- ﴿وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا﴾ (۲۴-۵۵) جو لوگ تم میں سے ایمان لائے ان سے خدا کا وعدہ ہے۔ الغرض اس قسم کی بہت سی آیات ہیں جن میں وَعَدَ کا لفظ خیر کے متعلق استعمال ہوا ہے اور وعدہ شر یعنی وعید کے معنی میں فرمایا۔

﴿وَيَسْتَعْجِلُونَكَ بِالْعَذَابِ وَلَنْ يُخْلِفَ اللَّهُ وَعْدَهُ﴾ (۲۲-۳۷) اور یہ لوگ تم سے عذاب کے لیے جلدی کر رہے ہیں۔ اور خدا اپنا وعدہ ہرگز خلاف نہیں کرے گا۔

کفار چونکہ آنحضرت ﷺ سے عذاب کے جلد آنے کا مطالبہ کرتے تھے اس لیے لَنْ يُخْلِفَ اللَّهُ وَعْدَهُ میں وَعَدٌ بمعنی وَعِيدٌ ہوگا نیز فرمایا:- ﴿قُلْ أَفَأَنْتُمْ كُفِرْتُمْ مِنْ ذَلِكَمُ الْنَارُ وَعَدَهَا اللَّهُ الَّذِينَ كَفَرُوا﴾ (۲۲-۷۲) کہہ دو کہ میں تم کو اس سے بھی بری چیز بتاؤں؟ وہ دوزخ کی آگ ہے جس کا خدا نے کافروں سے وعدہ کیا ہے۔ ﴿إِنَّ مَوْعِدَهُمُ الصُّبْحُ﴾ (۱۱-۸۱) ان کے عذاب کے وعدے کا وقت صبح ہے۔

① متفق علیہ من حدیث ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ فی قصۃ القنوت فی الصبح و مسند احمد (۲۵۰/۱۲) بتحقیق احمد شاکر و ابن سعد فی طبقاتہ راجع تخریج الکشاف (۱۱۱-۱۱۲)



ہمارے اور اپنے درمیان ایک وقت مقرر کر لو۔ ﴿بَلْ زَعَمْتُمْ اَللّٰہُ نَجْعَلْ لَّکُمْ مَّوْعِدًا﴾ (۱۸-۳۸) لیکن تم نے یہ خیال کر رکھا تھا کہ ہم نے تمہارے لئے قیامت کا کوئی وقت مقرر ہی نہیں کیا۔ ﴿مَّوْعِدُکُمْ یَوْمَ الزَّیْنَةِ﴾ (۲۰-۵۹) (موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ) آپ کے لیے یوم زینت کا وعدہ ہے۔

﴿بَلْ لَّہُمْ مَّوْعِدٌ لَّنْ یَّجِدُوْا مِنْ دُوْنِہٖ مَّوْعِدًا﴾ (۱۸-۵۸) مگر ان کے لئے ایک وقت مقرر کر رکھا ہے کہ اس کے عذاب سے کوئی پناہ کی جگہ نہ پائیں گے۔ ﴿قُلْ لَّکُمْ مِّیْعَادٌ﴾ (۳۲-۳۰) کہہ دو کہ تم سے ایک دن کا وعدہ ہے۔

﴿وَلَوْ تَوَاعَدْتُمْ لَا خْتَلَفْتُمْ فِی الْمِیْعَادِ﴾ (۸-۲۲) اگر تم جنگ کے لیے آپس میں قرار داد کر لیتے تو وقت معین پر جمع ہونے میں تقدیم و تاخیر ہو جاتی..... اور لفظ مَوَاعِدَہ (مفاعلة) کے متعلق فرمایا: ﴿وَلٰکِنْ لَا تُوَاعِدُوْہُمْ سِرًّا﴾ (۲-۲۳۵) مگر پوشیدہ طور پر ان سے قول و قرار نہ کرنا۔

﴿وَعَدْنَا مُوْسٰی ثَلٰثِیْنَ لَیْلَةً﴾ (۷-۱۴۲) اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام سے تیس رات کی میعاد مقرر کی۔

﴿وَ اِذْ وُعِدْنَا مُوْسٰی اَرْبَعِیْنَ لَیْلَةً﴾ (۲-۱۵۱) اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام سے چالیس رات کی میعاد مقرر کی۔

ان دونوں آیتوں میں ثَلَاثِیْنَ وَاَرْبَعِیْنَ وَاَعَدْنَا کی ظرف نہیں ہیں۔ بلکہ مفعول بہ ہیں اور ان کا مضاف مخذوف ہے یعنی اِنْقِصَاء ثَلَاثِیْنَ وَاَرْبَعِیْنَ یعنی تیس اور چالیس رات کے گزرنے کا وعدہ کیا۔ اور آیت۔

﴿فَاَتٰنَا بِمَا وَعَدْنَا﴾ (۷-۷) تو جس چیز سے ہمیں ڈراتے ہو اسے لے آؤ۔

﴿وَ اِمَّا نُرِیْنٰکَ بَعْضَ الَّذِیْ نَعِدُہُمْ﴾ (۱۰-۴۶) اگر ہم کوئی عذاب جس کا ان لوگوں سے وعدہ کرتے ہیں تمہاری آنکھوں کے سامنے (نازل) کریں۔

﴿فَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰہَ مُخْلِیْفًا وَعِدِہٖ رُسُلُہٗ﴾ (۱۴-۴۷) تو ایسا خیال نہ کرنا کہ خدا نے جو اپنے پیغمبروں سے وعدہ کیا ہے۔ اس کے خلاف کرے گا۔

﴿الشَّیْطٰنُ یَعِدُّکُمْ الْفَقْرَ﴾ (۲-۲۶۸) (اور دیکھنا) شیطان (کا کہنا ماننا وہ) تمہیں تنگدستی کا خوف دلاتا ہے۔

اور کبھی وعدہ کا لفظ عام معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ یعنی بیک وقت خیر و شر دونوں معنی مراد ہوتے ہیں۔ چنانچہ آیت کریمہ:-

﴿اَلَا اِنَّ وَّعْدَ اللّٰہِ حَقٌّ﴾ (۱۰-۵۵) اور یہ بھی سُن رکھو کہ خدا کا وعدہ سچا ہے۔

﴿اِنَّ مَا تُوعَدُوْنَ لَا یَآتِ﴾ (۶-۱۳۵) کچھ شک نہیں کہ جو وعدہ تم سے کیا جاتا ہے۔ وہ وقوع میں آنے والا ہے۔

میں قیامت کے روز جزائے اعمال کا وعدہ مراد ہے کہ اگر اعمال اچھے ہوں گے تو نتائج بھی خوشگوار ہوں گے اگر برے ہوں گے تو نتائج بھی تباہ کن ہوں گے۔

اَلْمَوْعِدُ وَالْمِیْعَادُ: یہ دونوں لفظ کبھی مصدر اور کبھی اسم ظرف بن کر استعمال ہوتے ہیں۔ (اور اسم ظرف ہونے کی صورت میں ان سے وعدہ کا زمانہ یا مقدم وعدہ مراد ہے) چنانچہ فرمایا:

﴿فَاَجْعَلْ بَیْنَنَا وَبَیْنَکَ مَّوْعِدًا﴾ (۲۰-۵۸) تو

ہم تمہارے پاس پہلے ہی عذاب کی وعید بھیج چکے تھے۔  
اور محاورہ ہے۔

رَأَيْتُ أَرْضَهُمْ وَاعِدَةً: یعنی ان کی زمین سے اچھی  
پیداوار کی امید ہے۔

يَوْمٌ وَاعِدٌ: بہت گرم یا بہت سرد دن۔

وَعِيدُ الْفَحْل: حملہ کے وقت نراونٹ کا بڑبڑانا اور  
آیت:-

﴿وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ﴾ (۲۳-۵۵) اور جو  
لوگ تم سے ایمان لائے اور نیک کام کرتے رہے ان سے  
خدا کا وعدہ ہے کہ ان کو ملک کا حاکم بنا دے گا جیسا ان  
سے پہلے لوگوں کو حاکم بنایا تھا، میں لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ  
..... اس وعدہ کی تفسیر ہے۔ جیسا کہ آیت:-

﴿يُؤْصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ لِلَّذِ كَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيْنِ﴾ (۴-۱۰) خدا تمہاری اولاد کے بارے  
میں تم کو ارشاد فرماتا ہے۔ کہ ایک لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں  
کے حصے کے برابر ہے۔

میں جملہ لِلَّذِ كَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيْنِ: وصیت کی تفسیر  
واقع ہوا ہے۔ اور آیت:-

﴿وَإِذْ يَعِدُّكُمْ اللَّهُ إِحْدَى الطَّائِفَتَيْنِ أَنَّهَا لَكُمْ﴾ (۸-۷) اس وقت کو یاد کرو جب تم سے خدا وعدہ  
کرتا تھا کہ دو گروہوں میں سے ایک گروہ تمہارا مسخر ہو  
جائے گا۔ میں أَنَّهَا لَكُمْ إِحْدَى الطَّائِفَتَيْنِ سے بدل  
ہے۔ اور اصل عبارت یوں ہے۔ وَعَدَكُمْ اللَّهُ أَنَّ  
إِحْدَى الطَّائِفَتَيْنِ لَكُمْ یعنی یا تو قافلہ ہاتھ لگے گا اور

﴿وَوَعَدْنَكُمْ جَانِبَ الطُّورِ الْأَيْمَنِ﴾ (۲۰-۸۰) اور (تورات دینے کے لیے) تم سے کوہ طور کی  
دائیں طرف مقرر کی۔

میں بھی یہی تاویل ہوگی یعنی یہاں جَانِبَ الطُّورِ  
الْأَيْمَنِ ظرف نہیں ہے بلکہ مفعول بہ ہے اور اس کا  
مضاف محذوف ہے۔ یعنی إِنِّانَ جَانِبِ الطُّورِ  
الْأَيْمَنِ۔ اور آیت:-

﴿وَالْيَوْمِ الْمَوْعُودِ﴾ (۸۵-۲) اور اس دن کی جس کا  
وعدہ ہے۔ میں یوم موعود سے قیامت مراد ہے جیسا کہ  
آیت۔ ﴿مِيقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُومٍ﴾ (۶۵-۵۰)  
(سب) ایک روز مقرر کے وقت پر جمع کیے جائیں گے۔  
میں میقات یوم معلوم قیامت کا دن مراد ہے۔

اور أَلَا يَعْزُدُ (افعال) بمعنی تہدید کے متعلق فرمایا: ﴿وَلَا تَفْعُدُوا بِكُلِّ صِرَاطٍ تُوعِدُونَ وَتَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ﴾ (۷-۸۶) اور ہر راستے پر مت بیٹھا  
کر کہو کہ تم ڈراتے اور راہ خدا سے روکتے ہو۔  
اور لفظ وعید کے متعلق ارشاد ہے۔

﴿ذَلِكَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِي وَخَافَ وَعِيدِ﴾ (۱۴-۱۲) یہ اس شخص کے لیے ہے جو قیامت کے روز  
میرے سامنے کھڑے ہوئے سے ڈرے اور میرے  
عذاب سے خوف کرے۔

﴿فَذَكِّرْ بِالْقُرْآنِ مَنْ يَخَافُ وَعِيدِ﴾ (۵۰-۳۵)  
پس جو ہمارے عذاب کی وعید سے ڈرے۔ اس کو قرآن  
پاک سے نصیحت کرتے رہو۔

﴿لَا تَخْصِمُوا لَدَيَّ وَقَدْ قَدَّمْتُ إِلَيْكُمْ بِالْوَعِيدِ﴾ (۵۰-۲۸) ہمارے حضور میں روڈو کد نہ کرو۔

تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے نصیحت آ پہنچی۔

﴿وَجَاءَكَ فِي هَذِهِ الْحَقُّ وَمَوْعِظَةٌ وَذِكْرٌ﴾ (۱۱-۱۲) اور ان قصص میں تمہارے پاس حق پہنچ گیا اور نصیحت اور عبرت ہے۔

﴿وَهُدًى وَمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِينَ﴾ (۳-۱۳۸) اور اہل تقویٰ کے لیے ہدایت اور نصیحت ہے۔

﴿وَكَتَبْنَا لَهُ فِي الْأَلْوَابِ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْعِظَةً وَ تَفْصِيلًا﴾ (۷-۲۵) اور ہم نے (توراة کی) تختیوں میں ان کے لیے ہر قسم کی نصیحت اور ہر چیز کی تفصیل لکھ دی۔

﴿فَاعْرِضْ عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ﴾ (۴-۶۳) تم ان کی باتوں کا کچھ خیال نہ کرو اور انہیں نصیحت کرو۔

### (و ع ی)

الْوَعَى: (ض) کے معنی (عموماً) بات وغیرہ کو یاد کر لینا کے ہوتے ہیں۔ جیسے وَعَيْتُهُ فِي نَفْسِي: میں نے اسے یاد کر لیا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿لَنَجْجِعَهَا لَكُمْ تَذْكِرَةً وَتَعِيَهَا أَذُنٌ وَاعِيَةٌ﴾ (۲۹-۱۲) تاکہ اس کو تمہارے لیے یادگار بنائیں اور یاد رکھنے والے کان اسے یاد رکھیں۔

الْإِيْعَاءُ: (افعال) کے معنی ساز و سامان کو و عاء (ظرف) میں محفوظ کرنا کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔ جَمَعَ فَأَوْعَى: مال جمع کیا اور بند رکھا (۷۰-۱۸) شاعر نے کہا ہے ﴿البيط﴾

(۴۴۹) وَالشَّرُّ أَخْبَثُ مَا أَوْعَيْتَ مِنْ زَادٍ

یا لشکر سے مقابلہ ہوگا اور مال غنیمت حاصل ہوگا۔

الْعِدَّة: یہ وَعَد سے اسم ہے اور اس کی جمع عِدَاتِ آتی ہے اور وعدہ کا لفظ مصدر ہے جس کی جمع نہیں آتی اور وَعَدْتُ دُومَفْعُول کو چاہتا ہے..... اور دوسرا مفعول ظرف زمان، مکان یا کوئی اور چیز ہوتی ہے۔ جیسے۔

وَعَدْتُ زَيْدًا يَوْمَ الْجُمُعَةِ أَوْ مَكَانًا كَذَا أَوْ أَنْ أَفْعَلَ كَذَا وغیرہ۔

پس آیت وَاعِدْنَا مُوسَى أَرْبَعِينَ لَيْلَةً میں وَاعِدْنَا کا دوسرا مفعول أَرْبَعِينَ لَيْلَةً نہیں ہو سکتا کیونکہ وعدہ کا وقوع اربعین کے اندر نہیں ہوا بلکہ اس کے بعد ہوا ہے لہذا اس کا دوسرا مفعول انْقِضَاءُ الْأَرْبَعِينَ يَأْتِمَامُ الْأَرْبَعِينَ ہوگا۔ ورنہ اس کے بغیر کلام صحیح نہیں ہو سکتا۔

### (و ع ظ)

الْوَعْظُ: کے معنی ایسی زجر و توبخ کے ہیں جس میں خوف کی آمیزش ہو خلیل نے اس کے معنی کئے ہیں ”خیر کا اس طرح تذکرہ کرنا جس سے دل میں رقت پیدا ہو اور عِظَةٌ وَمَوْعِظَةٌ دونوں اسم ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔ ﴿يَعْظُّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ﴾ (۱۲-۹۰) تمہیں نصیحت کرتا ہے۔ تاکہ تم یاد رکھو۔

﴿قُلْ إِنَّمَا آعَظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ﴾ (۳۴-۴۶) کہدو کہ میں تمہیں صرف ایک بات کی نصیحت کرتا ہوں۔ ﴿ذَلِكُمْ تُوَعِّظُونَ بِهِ﴾ (۵۸-۳) مومنو! اس حکم سے تم کو نصیحت کی جاتی ہے۔

﴿قَدْ جَاءَكُمْ مَوْعِظَةٌ مِنْ رَبِّكُمْ﴾ (۱۰-۵۷)

① قاله عبيد بن الأبرص وصدره: والخير وإن طال الزمان به۔ والبيت في التاج واللسان (وعی) وذیل کتاب الابدال لابی الطیب اللغوی (۱: ۹۳) والکامل للمبرد (۹۷) وفي مجمع الامثال للميداني رقم ۱۹۵۴ وزعموا ان هذا البيت قالته الجن وقيل بل هو لعبيد بن الأبرص وادرج في العقد الثمين (۱۸۴) في ملحقات ديوان طرفة۔

إِلَى الرَّحْمَنِ وَقَدْ أَكَلَتْ (۱۹-۱۵) جس روز ہم پر بہیز گاروں کو خدا کے سامنے بطور مہمان جمع کریں گے۔

## (و ف ر)

الْوَفْرُ: مال کثیر کو کہتے ہیں جس میں کسی چیز کی کمی نہ ہو اور وَقْرَتُهُ (س) وَقْرًا وَوَفُورًا وَفْرَةً کے معنی کسی چیز کو پورا کرنے کے ہیں۔ اور وَقْرَتُهُ (تفعیل) تکثیر کے لیے آیا ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿فَإِنَّ جَهَنَّمَ جَزَاءُكُمْ جَزَاءً مَّوْفُورًا﴾ (۱۷-۶۳) تو تم سب کی سزا جہنم ہے (اور وہ) پوری پوری (سزا دے)

وَقَرْتُ عِرْضَهُ: میں نے اس کی عزت کو کم نہیں کیا۔

أَرْضٌ فِي نَبْتِهَا وَفْرَةٌ: وہ زمین جس میں پوری طرح گھاس جمی ہوئی ہو۔

رَأَيْتُ فُلَانًا ذَا وَفَارَةٍ: میں نے فلان کو عقل و مروت میں کامل پایا۔

الْوَاْفِرُ: علم عروض کی اصطلاح میں ایک بحر کا نام ہے (جس میں مفاعلتین چھ بار آتا ہے)

## (و ف ض)

الْإِفْضَاضُ: (افعال) کے معنی تیز روی کے ہیں اور اصل میں اس کے معنی کسی کے وَفْضَةً کو اٹھا کر اس طرح تیزی سے بھاگنے کے ہیں کہ اس سے شخص کی آواز پیدا ہو اور وَفْضَةً چڑی کے ترش کو کہتے ہیں اس کی جمع وَفَاضٌ آتی ہے۔

قرآن پاک میں ہے:-

﴿كَأَنَّهُمْ إِلَى نُصْبٍ يُؤْفُضُونَ﴾ جیسے شکاری شکار کے جال کی طرف دوڑتے ہیں۔ (۷۰-۶۳) بعض نے

اور شرب سے برا زاد ہے جو انسان جمع کرتا ہے۔

الْوِعَاءُ: کے معنی پوری یا تھیلہ کے ہیں جس میں دوسری چیزیں اکٹھی کر کے رکھی جائیں اس کی جمع أَوْعِيَةٌ آتی ہے قرآن پاک میں ہے۔

﴿قَبْدًا بِأَوْعِيَّتِهِمْ قَبْلَ وَعَاءِ أَخِيهِ ثُمَّ اسْتَخْرَجَهَا مِنْ وَعَاءِ أَخِيهِ﴾ (۱۲-۷۶) پھر یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائی کے شلیچے سے پہلے ان کے شلیچوں کو دیکھنا شروع کیا پھر اپنے بھائی کے شلیچے میں سے اس کو نکال لیا۔

وَلَا وَعَى عَنْ كَذَا: اس کے بغیر طبیعت کو سکون نہیں اور اسی سے محاورہ ہے۔

مَالِي عَنْهُ وَعَى: مجھے اس سے چارہ کار نہیں۔

وَعَى الْجَرْحُ يَعْنِي وَعْيًا: زخم میں مِدَّة یعنی گندہ مواد بھر گیا۔

وَعَى الْعَظْمُ: ہڈی کا (ٹوٹنے کے بعد) مضبوط ہو جانا اور قوت کو جمع کر لینا۔

الْوَاعِيَةُ: (ایضاً) چیخنے والی۔

سَمِعْتُ وَعَى الْقَوْمِ: میں نے قوم کی چیخ و پکار کی آواز سنی۔

## (و ف د)

وَفَدَّ الْقَوْمُ (ض) وَفَادَةً: لوگوں کا وفد بن کر بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہونا اور وفد یا وفد ان لوگوں کو کہا جاتا ہے جو اپنی ضروریات پورا کرنے کے لیے بادشاہوں کی خدمت میں حاضر ہوں۔ اور اسی سے وَافِدٌ اس اونٹ کو کہتے ہیں جو سب سے آگے نکل جانے والا ہو۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿يَوْمَ نَحْشُرُ الْمُتَّقِينَ﴾

قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَأَوْفُوا الْكَيْلَ إِذَا كَلْتُمْ﴾ (۱۷-۳۵) اور جب

کوئی چیز ناپ کر دینے لگو تو پیمانہ پورا بھرا کرو۔

وَفِي بَعْثِهِ (ض) وَقَاءً وَأَوْفَى: اس نے عہد و

پیمان پورا کیا۔ یعنی اس کی خلاف ورزی نہیں کی اس کی ضد

غَضْرُہ ہے۔ جو نقص عہد اور عدم وفا کے معنی پر دلالت کرتا

ہے۔ لیکن قرآن پاک میں اَوْفَى (افعال) استعمال ہوا

ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿وَأَوْفُوا بِعَهْدِي أُوفِ بِعَهْدِكُمْ﴾ (۲-۴۰) اور

اس اقرار کو پورا کرو جو تم نے مجھ سے کیا تھا اور میں اس

اقرار کو پورا کروں گا جو میں نے تم سے کیا تھا۔

﴿وَأَوْفُوا بِعَهْدِ اللَّهِ إِذَا عَاهَدْتُمْ﴾ (۱۶-۹۱) اور

جب خدا سے عہد واثق کرو تو اس کو پورا کرو۔ ﴿بَلَىٰ مَنْ

أَوْفَىٰ بِعَهْدِهِ وَاتَّقَىٰ﴾ (۳-۷۶) ہاں جو شخص اپنے

اقرار کو پورا کرے اور خدا سے ڈرے۔

﴿وَالْمُؤْفُونَ بِعَهْدِهِمْ إِذَا عَاهَدُوا﴾ (۳-۱۷۶)

اور جب عہد کر لیں تو اس کو پورا کریں۔

﴿يُؤْفُونَ بِالْأَمْرِ﴾ (۷۶-۷۷) یہ لوگ نذریں پوری

کرتے ہیں۔ ﴿وَمَنْ أَوْفَىٰ بِعَهْدِهِ مِنَ اللَّهِ﴾

(۹-۱۱۱) اور خدا سے زیادہ وعدہ پورا کرنے والا کون ہے۔

اور آیت۔

﴿وَأَبْرَاهِيمَ الَّذِي وَفَّى﴾ (۵۳-۳۷) اور

ابراہیم علیہ السلام کی جنہوں نے (حق طاعت و رسالت) پورا

کیا۔ میں وفی سے مراد یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام

نے ان مطالبات کو پورا کرنے میں اپنی پوری کوشش صرف

کر ڈالی جن کی طرف کہ اللہ تعالیٰ نے آیت کریمہ:

کہا ہے کہ اَوْفَا ضَمَّ تِيز رُجَمَاتُہٗنَّ کو کہتے ہیں۔ چنانچہ

محاورہ ہے۔

لَقِيْتُهُ عَلَىٰ اَوْفَا ضَمَّ: میں اسے غلت میں ملا۔ اس کا

واحد و فُضَّ ہے جس کے معنی جلدی کے ہیں۔

## (وَفَق)

اَلْوَفَقُ: دو چیزوں کے درمیان مطابقت اور ہم

آہنگی ہونے کو کہتے ہیں قرآن نے اعمال کے نتائج کو.....

﴿جَزَاءً وَفَقًا﴾ (۲۶-۷۸) (یہ) بدلہ ہے پورا پورا۔

کہا ہے اور یہ وَافَقْتُ فُلَانًا وَوَافَقْتُ الْآمَرَ

(میں نے اسکی موافقت کی یا اسے پالیا) کے محاورہ سے

ماخوذ ہے۔

اَلْوَفَاقُ: انسان کے کسی کام کا تقدیر کے مطابق ہو جانا

اور یہ خیر و شر دونوں میں بولا جاتا ہے جیسے اَتَّفَقَ لِفُلَانٍ

خَيْرٌ: فلاں کو اتفاق سے خیر حاصل ہو گئی۔

اَتَّفَقَ لَهُ شَرٌّ اسے اتفاق سے برائی پہنچی یہی مفہوم توفیق

کا ہے (مگر یہ متعدی ہے) اور عرف میں یہ خیر کے ساتھ

مخصوص ہو چکا ہے (یعنی اسباب کا مقصد کے مطابق مہیا

کر دینا) اور شر میں استعمال نہیں ہوتا۔ چنانچہ قرآن پاک

میں ہے۔ ﴿وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللَّهِ﴾ (۱۱-۸۸) اور

مجھے توفیق کا ملنا خدا ہی کے فضل سے ہے۔ محاورہ ہے:

اَتَانَا لِيَتَّفِقَ الْهَلَالُ وَمِيقَاتُہٗ: میرے پاس رویت

ہلال کے موقع پر آیا۔

## (وَفِي)

اَلْوَفَى: مکمل اور پوری چیز کو کہتے ہیں جیسے:

دَرَّهَمٌ وَافٍ، كَيْلٌ وَافٍ وَغَيْرُ ذَٰلِكَ اَوْفِيْتُ

اَلْكَيْلَ وَالْوَزْنَ: میں نے ناپ یا تول کر پورا پورا دیا۔

زندگی اور اس کی زیب و زینت کے طالب ہوں ہم ان کے اعمال کا بدلہ انہیں دنیا ہی میں پورا پورا دے دیتے ہیں۔

﴿وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ شَيْءٍ فِي سَبِيلِ اللَّهِ يُوَفَّ إِلَيْكُمْ﴾ (۸-۶۰) اور تم جو کچھ راہ خدا میں خرچ کرو گے اس کا ثواب تم کو پورا پورا دیا جائے گا۔

﴿فَوْقَاهُ حِسَابَهُ﴾ (۲۳-۳۹) تو اس سے اس کا حساب پورا پورا چکا دے۔

اور کبھی توفی کے معنی موت اور نیند کے بھی آتے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:-

﴿اللَّهُ يَتَوَفَّى الْأَنفُسَ حِينَ مَوْتِهَا﴾ (۳۹-۴۲) خدا لوگوں کے مرنے کے وقت ان کی روہیں قبض کر لیتا ہے۔

﴿وَهُوَ الَّذِي يَتَوَفَّكُم بِاللَّيْلِ﴾ (۶-۶۰) اور وہی تو ہے جو رات کو (سونے کی حالت میں) تمہاری روح قبض کر لیتا ہے۔

﴿قُلْ يَتَوَفَّكُم مَّلَكُ الْمَوْتِ﴾ (۳۲-۱۱) کہہ دو کہ موت کا فرشتہ تمہاری روہیں قبض کر لیتا ہے۔

﴿وَاللَّهُ خَلَقَكُمْ ثُمَّ يَتَوَفَّكُم﴾ (۱۶-۷۰) اور خدا ہی نے تم کو پیدا کیا پھر وہی تم کو موت دیتا ہے۔

﴿الَّذِينَ تَتَوَفَّيهِمُ الْمَلَائِكَةُ﴾ (۱۶-۲۸) (ان کا حال یہ ہے کہ جب فرشتے ان کی روہیں قبض کرنے لگتے ہیں۔

﴿تَوَفَّيْتَهُمُ﴾ (۶-۶۱) (تو) ہمارے فرشتے ان کی روح قبض کر لیتے ہیں۔

﴿أَوْ تَتَوَفَّيَنَّكَ﴾ (۱۳-۴۰) یا تمہاری مدت حیات پوری کر دیں۔

﴿وَتَوْفَقْنَا مَعَ الْآبِرَارِ﴾ (۳-۱۹۳) اور ہم کو دنیا سے

﴿إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِأَنْ لَهُمُ الْجَنَّةُ﴾ (۹-۱۱۱) خدا نے مومنوں سے ان کی جانیں اور ان کے مال خرید لیے ہیں اور اس کے عوض میں ان کے لیے بہشت تیار کی ہے۔

میں ارشاد فرمایا ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اگر ایک طرف اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں مال صرف کیا تو دوسری طرف لڑکے کی قربانی پیش کرنے میں بھی کچھ دریغ نہ کیا حالانکہ وہ انہیں ان کی جان سے بھی زیادہ عزیز تھا۔ اور وفی سے جن باتوں کے پورا کرنے پر متنبہ کیا ہے وہ وہی ہیں جن کی طرف کہ آیت:-

﴿وَإِذْ ابْتَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ رَبُّهُ بِكَلِمَاتٍ فَأَتَمَّهُنَّ﴾ (۲-۱۲۴) اور جب پروردگار نے چند باتوں میں حضرت ابراہیم کی آزمائش کی تو وہ ان میں پورے اترے۔ میں ارشاد فرمایا ہے۔

اور تَوْفِيَةُ الشَّيْءِ کے معنی بلا کسی قسم کی کمی کے پورا پورا دے دینے کے ہیں۔ اور اسْتِيفَاء کے معنی (اپنا حق) پورا لے لینے کے۔ قرآن پاک میں ہے:-

﴿وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ﴾ (۳-۲۵) اور ہر شخص اپنے اعمال کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔

﴿وَإِنَّمَا تُوفَّقُونَ لِأَجْوَرِكُمْ﴾ (۳-۱۵۸) اور تم کو تمہارے اعمال کا پورا پورا بدلہ ملے گا۔

﴿إِنَّمَا يُوفَّى الصَّابِرُونَ أَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾ (۳۹-۱۰) جو صبر کرنے والے ہیں ان کو بے شمار ثواب ملے گا۔

﴿مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا وَزِينَتَهَا نُوفِّ إِلَيْهِمْ أَعْمَالَهُمْ فِيهَا﴾ (۱۱-۱۵) جو لوگ دنیا کی

آنکری حد کو کہتے ہیں۔ اس لیے یہ لفظ معین عرصہ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ جیسے۔

وَقَتَّ كَذَا: میں نے اس کے لیے اتنا عرصہ مقرر کیا۔ اور ہر وہ چیز جس کے لیے عرصہ متعین کر دیا جائے موت کہلاتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿إِنَّ الصَّلَاةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ كِتَابًا مَوْقُوتًا﴾ (۱۰۳-۴) بے شک نماز کا مومنوں پر اوقات (مقررہ) میں ادا کرنا فرض ہے۔

﴿وَإِذَا السُّرُّسُلُ أُقْتَتَ﴾ (۷۷-۱۱) اور جب پیغمبر اکٹھے کئے جائیں گے۔

الْمِيقَاتُ: کسی شے کے مقررہ وقت یا اس وعدہ کے ہیں جس کے لیے کوئی وقت متعین کیا گیا ہو۔ قرآن پاک میں ہے۔ ﴿إِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ كَانَ مِيقَاتًا﴾ (۷۸-۱۷) بے شک فیصلہ کا دن مقرر ہے۔

﴿إِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ مِيقَاتُهُمْ﴾ (۴۳-۴۰) کچھ شک نہیں کہ فیصلہ کا دن..... اٹھنے کا وقت ہے۔ ﴿إِلَى مِيقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُومٍ﴾ (۵۶-۵۰) سب ایک روز مقرر کے وقت پر جمع کیے جائیں گے۔

اور کبھی مِيقَاتُ کا لفظ کسی کام کے لیے مقرر کردہ مقام پر بھی بولا جاتا ہے۔ جیسے مَوَاقِيتُ الْحَجِّ یعنی مواضع (جو احرام باندھنے کے لیے مقرر کیے گئے ہیں)۔

### (وقد)

وَقَدَّتِ النَّارُ (ض) وَفُودًا وَفَدًا: آگ روشن ہونا۔ الْوُفُودُ: ایندھن کی لکڑیاں جن سے آگ جلائی جائے۔ اور آگ کے شعلہ کو بھی وَفُودٌ کہتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔ ﴿وَفُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ﴾ (۲۲-۲۳) جس کا

نیک بندوں کے ساتھ اٹھا۔

﴿وَتَوْفَّنَا مُسْلِمِينَ﴾ (۷-۱۲۶) اور ہمیں ماریو تو مسلمان ہی ماریو۔

﴿تَوْفَنِي مُسْلِمًا﴾ (۱۲-۱۰۱) مجھے اپنی اطاعت کی حالت میں اٹھائیو۔

اور آیت:

﴿يَعِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ قُلُوبُكَ وَارْفَعَكَ إِلَى﴾ (۳-۵۵) عیسیٰ علیہ السلام! میں تمہاری دنیا میں رہنے کی مدت پوری کر کے تم کو اپنی طرف اٹھا لوں گا۔

میں بعض نے کہا ہے کہ توفی بمعنی موت نہیں ہے۔ بلکہ اس سے مدارج کو بلند کرنا مراد ہے۔ مگر حضرت ابن عباسؓ نے توفی کے معنی موت کیے ہیں۔ چنانچہ ان کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ کو فوت کر کے پھر زندہ کر دیا تھا۔

### (وقب)

الْوَقْبُ کے اصل معنی چٹان، پتھر وغیرہ میں گڑھا کے ہیں۔ اور وَقَبَ (ض) کے معنی گڑھے وغیرہ میں داخل ہو کر غائب ہو جانے کے ہیں اسی سے وَقَبَتِ الشَّمْسُ ہے جس کے معنی آفتاب غروب ہونے کے ہیں۔ اور وَقَبَ الظُّلَامِ کے معنی تاریکی چھا گئی اور اشیاء اس کے اندر غائب ہو گئیں۔ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ إِذَا وَقَبَ﴾ (۱۱۳-۳) اور شرب تاریکی کی برائی سے جب اس کا اندھیرا چھا جائے۔

الْوَقْبُ: گھوڑے کے ذکر کے ایستادہ ہونے کی آواز۔ وَقَبَهُ وَقَبَةً: اس نے اسے اٹھا کر لیا۔

### (وقت)

الْوَقْتُ: کسی کام کے لیے مقررہ زمانہ کی

ایندھن آدی اور پتھر ہوں گے۔

﴿وَأُولَٰئِكَ هُمْ وَقُودُ النَّارِ﴾ (۳-۱۰) اور یہ لوگ آتش جہنم کا ایندھن ہوں گے۔ النَّارِ ذَاتِ الْوَقُودِ (۸۵-۵) آگ کی خندقیں جن میں ایندھن جھونک رکھا تھا۔ اسْتَوَوْا قَذْتُ النَّارِ: آگ جلانے کی تیاری کرنا اور کبھی معنی اَوْ قَذْتَهَا میں نے آگ جلانی بھی آ جاتا ہے قرآن پاک میں ہے۔

﴿مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا﴾ (۲-۱۷) ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جس نے شب تاریک میں آگ روشن کی۔ ﴿وَمِمَّا يُوقِدُونَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ﴾ (۱۳-۱۷) اور جس چیز کو زیور یا کوئی اور سامان بنانے کے لیے آگ میں تپاتے ہیں۔

﴿فَأَوْقَدَ لِي بِهِامُنْ﴾ (۲۸-۳۸) تو ہامان! میرے لیے (گاسے کو) آگ لگا (کرائیٹیں پکا) دو۔ ﴿نَارُ اللَّهِ الْمَوْقَدَةُ﴾ (۱۰۳-۶) خدا کی بھڑکائی ہوئی آگ ہے۔ اور اسی سے وَقْلَةُ الصَّنِيفِ کا محاورہ ہے جس کے معنی گرمی کی شدت کے ہیں۔

إِتَّقَدَ فُلَانٌ غَضَبًا فُلَانٌ غَضَبًا سے بھڑک اٹھا اور استعارہ کے طور پر وَقَدَ وَاتَّقَدَ لِرَأْيِي بھڑکنے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ جیسا کہ الْإِسْتِعْجَالُ وَالْإِسْتِعَارَةُ وغیرہ الفاظ اس معنی میں بطور مجاز استعمال ہوتے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔

﴿كُلَّمَا أَوْقَدُوا نَارًا لِلْحَرْبِ أَطْفَأَهَا اللَّهُ﴾ (۵-۶۳) یہ جب لڑائی کے لیے آگ جلاتے ہیں تو خدا

اس کو بجھا دیتا ہے۔

اور کبھی استعارہ کے طور پر چمک دمک کے معنی میں آتا ہے۔ اِتَّقَدَ الْجَوْهَرُ وَاللَّهَبُ: جوہر یا سونے کا چمکانا۔

### (وَقْدُ)

الْوَقْدُ: (ض) کے معنی شدت ضرب کے ہیں اور جس جانور کو لاشی یا پتھر سے مار دیا جائے اسے موقودہ کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:-

﴿وَالْمَوْقُودَةُ﴾ (۵-۳) اور جو چوٹ لگ کر مر جائے۔

### (وَقْرُ)

الْوَقْرُ: کان میں بھاری پن۔ وَقَرْتُ أُذُنَهُ تَقَرُّ وَتَوْقَرُ: کان میں ثقل ہونا (یعنی باب ضَرْبٍ وَفَتْحٍ سے آتا ہے۔ لیکن ابوزید نے اسے سَمِعَ سے مانا ہے۔ اور اس سے مَوْقُورَةٌ صفت مفعولی..... ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَفِي آذَانِنَا وَقْرٌ﴾ (۶-۳۵) اور کانوں میں ثقل پیدا کر دیا۔ نیز وَقْرٌ کا لفظ گدھے یا خچر کے ایک بوجھ پر بھی بولا جاتا ہے۔ جیسا کہ وَسَقٌ کا لفظ اونٹ کے بوجھ کے ساتھ مخصوص ہے اور اَوْقَرْتُهُ کے معنی بوجھ لادنے کے ہیں۔ نَخَلَةٌ مَوْقَرَةٌ وَمَوْقَرَةٌ پھل سے لدی ہوئی کھجور۔

الْوَقَارُ: کے معنی خجیدی اور حلم کے ہیں۔ ۱۰ بادقار اور حلیم آدمی کو وَقُورٌ، وَقَارٌ اور مُسَوِّقَرٌ کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:-

﴿مَا لَكُمْ لَا تَرْجُونَ لِلَّهِ وَقَارًا﴾ (۷۱-۱۳) تم کو کیا ہوا کہ تم خدا کی عظمت کا اعتقاد نہیں رکھتے۔

فُلَانٌ ذُو وَقَرَةٍ: فلاں بردبار ہے۔ اور آیت:-

۱ وفی القرآن ﴿فَالْحَامِلَاتِ وَقَرًا﴾

۲ وقد وقر الرجل فهو وقور



واقع ہو جانا مراد ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:-  
﴿وَوَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ بِمَا ظَلَمُوا﴾ (۸۵-۲۷)  
اور ان کے ظلم کے سبب ان کے حق میں وعدہ عذاب پورا  
ہو کر رہے گا۔

یعنی ان پر وہ عذاب اتر پڑا جس کا کہ ان کے ظلم کے سبب  
ان سے وعدہ کیا گیا تھا۔ نیز فرمایا: ﴿وَإِذَا وَقَعَ  
الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ أَخْرَجْنَا لَهُمْ دَابَّةً مِّنَ الْأَرْضِ﴾  
(۸۲-۲۷) اور جب ان کے بارے میں عذاب کا وعدہ پورا  
ہو جائے گا۔ تو ہم ان کے لیے زمین سے ایک جانور  
نکالیں گے۔

یعنی جب ان علامات قیامت کا ظہور ہو جائے گا۔ جو پہلے  
بیان ہو چکی ہیں۔  
﴿قَالَ قَدْ وَقَعَ عَلَيْكُمْ مِّن رَّبِّكُمْ رَجْسٌ وَ  
عَظْبٌ﴾ (۷۱-۷۰) (ہود علیہ السلام نے کہا کہ تمہارے  
پر دروگر کی طرف سے تم پر عذاب اور غضب کا نازل ہونا  
مقرر ہو چکا ہے۔

نیز فرمایا:-  
﴿أَتُمَّ إِذَا مَا وَقَعَ أَمْنْتُمْ بِهِ﴾ (۵۱-۱۰) کیا جب وہ  
آ واقع ہوگا۔ تب اس پر ایمان لاؤ گے۔

﴿فَقَدْ وَقَعَ أَجْرُهُ عَلَى اللَّهِ﴾ (۱۰-۴) تو اس کا  
ثواب خدا کے ذمے ہو چکا۔

یہاں لفظ وقوع کا استعمال محض تاکید وجوب کے لیے  
ہے۔ (معنی اس کے بغیر ہی صحیح ہو سکتے تھے) جیسا کہ

آیت

﴿وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ﴾ (۳۲-۳۳) اور اپنے گھروں  
میں پڑی رہو۔

میں بعض نے کہا ہے کہ یہاں قَرْنَ، وَقَارَ بمعنی سکون  
سے ہے اور بعض نے کہا ہے۔ کہ یہ وَقَرْتُ، أَقَرُّ،  
وَقَرَّأَ سے ہے۔ جس کے معنی بیٹھ رہنا کے ہیں۔ ❶

الْوَقِيرُ: بھیڑ بکری کا بہت بڑا ریوڑ۔  
یہ بھی وقار سے ہے گویا کثرت تعداد اور ست رفتاری کی  
وجہ سے اس میں وقار یعنی سکون پایا جاتا ہے۔

### (وقوع)

الْوُقُوعُ: کے معنی کسی چیز کے ثابت ہونے اور  
نیچے گرنے کے ہیں۔ چنانچہ محاورہ ہے۔

وَقَعَ الطَّيْرُ وَقُوعًا: پرند نیچے گر پڑا۔

الْوَاقِعَةُ: اس واقعہ کو کہتے ہیں جس میں سختی ہو۔ اور قرآن  
پاک میں اس مادہ سے جس قدر مشتقات استعمال ہوئے  
ہیں۔ وہ زیادہ تر عذاب اور شدائد کے واقع ہونے کے  
متعلق استعمال ہوئے ہیں۔ چنانچہ فرمایا: ﴿وَإِذَا وَقَعَتْ  
الْوَاقِعَةُ لَئِيسَ لَوْفَعَتِهَا كَاذِبَةٌ﴾ (۲۹-۵۶) جب  
واقع ہونے والی واقع ہو جائے اس کے واقع ہونے میں  
کچھ جھوٹ نہیں۔

﴿سَأَلَ سَائِلٌ بِعَذَابٍ وَاقِعٍ﴾ (۲-۷۰) ایک طلب  
کرنے والے نے عذاب طلب کیا۔ جو نازل ہو کر رہے گا۔  
﴿فَيَوْمَئِذٍ وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ﴾ (۱۵-۲۹) تو اس روز  
ہو پڑنے والی (یعنی قیامت) ہو پڑے گی۔

اور کسی قول کے وقوع سے اس کے مضمین (مفہوم) کا

❶ وفي الروح (۲۲/۶)۔ قرء الاكثر وقرن بكسر القاف من وقربقر وقارا اذا ثبت وسكن واصله وقرن فضيل به مافعل بعيد من وعد۔

اور الْحَافِرُ الْوَاقِعُ: اس گھوڑے کو کہتے ہیں۔ جس کے سم سستان میں چلنے سے گھس گئے ہوں۔

الْوَقِيعَةُ: (ایضاً) وہ جگہ جہاں بارش کا پانی ٹھہر جاتا ہو (والجمع الوقائع) مَوْقِعٌ: پرند کا مستقر (ج مَوَاقِعُ) التَّوْقِيعُ: سواری کی پیٹھ میں زخم کے نشان کو کہتے ہیں اسی طرح کتاب پر نشان لگانے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ اور اسی سے التَّوْقِيعُ کے معنی کسی چیز کا گمان کرنا بھی آتے ہیں۔

### (وقف)

وَقَفْتُ الْقَوْمَ (ض) وَقَفًا (متعدی)

لوگوں کو ٹھہراتا اور وَقَفُوا۔ وَقُوفًا (لازم) ٹھہرا۔

قرآن پاک میں ہے:-

﴿وَقَفُّهُمْ إِنَّهُمْ مَسْئُونُونَ﴾ (۲۳-۲۷) اور ان کو ٹھہرائے رکھو کہ ان سے کچھ پوچھنا ہے۔

اور اسی سے بطور استعارہ وَقَفْتُ الدَّارَ آتا ہے جس کے معنی مکان کو وقف کر دینے کے ہیں۔ نیز الْوَقْفُ کے معنی ہاتھی دانت کا نکلن بھی آتے ہیں اور حِمَارٌ مَوْقِفٌ اس گدھے کو کہتے ہیں جس کی کلائیوں پر نکلن جیسے سفید نشان ہوں جیسا کہ فرس مُحَجَّلٌ اس گھوڑے کو کہا جاتا ہے۔ جس کے پاؤں میں تجل کی طرح سفیدی ہو۔

مَوْقِفُ الْإِنْسَانِ: انسان کے ٹھہرنے کی جگہ کو کہتے ہیں اور الْمَوْاقِفَةُ کا مفہوم یہ ہے کہ ہر آدمی اپنے معاملہ کو اسی چیز پر روک دے جس پر کہ دوسرے نے روکا ہے۔ (ایک دوسرے کے بالمقابل کھڑا ہونا)

﴿وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِينَ﴾ (۳۰-۳۷) اور مومنوں کی مدد ہم پر لازم تھی۔

اور آیت:-

﴿كَذَلِكَ حَقًّا عَلَيْنَا نُنْجِ الْمُؤْمِنِينَ﴾ (۱۰-۱۰۳)

اس طرح ہمارا ذمہ ہے کہ مسلمانوں کو نجات دیں۔ میں حَقُّ کا لفظ محض توکید کے لیے استعمال ہوا ہے ورنہ یہ معنی علینا سے بھی مفہوم ہو سکتا تھا۔ اور آیت:-

﴿فَقَعُوا لَهُ سِجْدِينَ﴾ (۱۵-۲۹) تو اس کے آگے

سجدے میں گر پڑنا۔

میں قَعُوا کا لفظ مبادرت الی السُّجُود کے معنی کو ظاہر کرتا ہے۔

وَقَعَ الْمَطَرُ: بارش ہونا۔ مَوَاقِعُ الْغَيْثِ: جن مقامات پر بارش برسی ہو۔ ❶

الْمَوَاقِعَةُ: باہم جنگ کرنا۔ نیز کنایہ کے طور پر اس کے معنی عورت سے مجامعت کے بھی آتے ہیں۔ اَلْإِنْقَاعُ: (افعال) واقع کرنا۔ سخت معرکہ قائم کرنا۔ اور کنایہ وَقَعَةُ کے معنی جنگ بھی آتے ہیں۔ (والجمع وقائع)

وَقَعَ الْحَدِيدُ: لوہے کی آواز (تکواروں کے کھٹکھٹانے کی آواز) محاورہ ہے۔

وَقَعْتُ الْحَدِيدَةَ (ف) وَقَعًا مِيقَعَةً: یعنی سان پر تکوار وغیرہ کا تیز کرنا۔ نیز وقع کا لفظ سقوط شدید یعنی دھاکہ پر بھی بولا جاتا ہے اور اسی سے الْوَقِيعَةُ (فی الانسان) ہے جس کے معنی کسی کی غیبت کرنے کے ہیں۔

❶ وفى القرآن ﴿فلا أقسم بمواقع النجوم﴾ (۵-۵۶) فالمراد من المواقع ههنا المغارب كما جاء فى رواية ابن جرير عن قتادة وعند البعض نجوم القرآن راجع الروح (۱۳۲/۲۷) وقد مر البحث فى حرف النون۔

شخص چراگاہ کے ارد گرد چرائے گا تو ہو سکتا ہے کہ وہ اس میں داخل ہو جائے۔“ (یعنی مشتبہ چیزیں اگرچہ درجہ اباحت میں ہوتی ہیں لیکن ورع کا تقاضا یہ ہے کہ انہیں بھی چھوڑ دیا جائے) قرآن پاک میں ہے۔

﴿فَمَنْ أَتَقَىٰ وَ أَصْلَحَ فَلَا خَوْفَ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ﴾ (۷-۳۵) جو شخص (ان پر ایمان لا کر) خدا سے ڈرتا رہے گا اور اپنی حالت درست رکھے گا۔ ایسے لوگوں کو نہ کچھ خوف ہوگا اور نہ وہ غمناک ہوں گے۔

﴿إِنَّ اللَّهَ مَعَ الَّذِينَ اتَّقَوْا﴾ (۱۶-۱۲۸) کچھ شک نہیں کہ جو پرہیزگار ہیں اللہ ان کا مددگار ہے

﴿وَيَسِيَ الَّذِينَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ إِلَىٰ الْجَنَّةِ زُمَرًا﴾ (۳۹-۷۳) اور جو لوگ اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں ان کو گروہ گروہ بنا کر بہشت کی طرف لے جائیں گے۔

پھر تقویٰ کے چونکہ بہت سے مدارج ہیں اس لیے آیت ﴿وَاتَّقُوا يَوْمًا تُرْجَعُونَ فِيهِ إِلَى اللَّهِ﴾ (۲-۲۸۱) اور اس دن سے ڈرو جب کہ تم خدا کے حضور میں لوٹ کر جاؤ گے۔

﴿اتَّقُوا رَبَّكُمُ﴾ (لوگو) اپنے پروردگار سے ڈرو۔ (۳۱-۳۳)

﴿وَيَخْشَ اللَّهَ وَيَتَّقِهِ﴾ (۲۴-۵۲) اور اس سے ڈرے گا۔

﴿وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي تَسَاءَلُونَ بِهِ وَالْأَرْحَامَ﴾ (۴-۱) اور خدا سے جس کے نام کو تم اپنی حاجت برآری کا ذریعہ بناتے ہو ڈرو۔ اور قطع مودت ارحام سے۔

﴿وَاتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تَقَاتِهِ﴾ (۳-۱۰۲) خدا سے ڈرو جیسا

الْوَقِيفَةُ: بھگایا ہوا شکار جو شکاری کے تعاقب سے عاجز ہو کر ٹھہر جائے۔ یہاں تک کہ وہ اسے شکار کر لے۔

## (وقی)

وَقَيْتُ الشَّيْءَ (ض) وَقَايَةً وَوَقَاءً کے معنی کسی چیز کو مضر اور نقصان پہنچانے والی چیزوں سے بچانا کے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔ ﴿فَوَقَّهُمْ اللَّهُ﴾ (۶-۱۱) تو خدا ان کو دوزخ کے عذاب سے بچالے گا۔

﴿وَمَا لَهُمْ مِنَ اللَّهِ مِنْ وَّاقٍ﴾ (۱۳-۳۴) اور ان کو خدا کے عذاب سے کوئی بھی بچانے والا نہیں۔

﴿مَالِكَ مِنَ اللَّهِ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا وَاقٍ﴾ (۱۳-۳۷) تو خدا کے سامنے نہ کوئی تمہارا مددگار ہوگا اور نہ کوئی بچانے والا۔

﴿فَوَا أَنْفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا﴾ (۶-۶۲) اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو آتش جہنم سے بچاؤ۔

التَّقْوَىٰ: اس کے اصل معنی نفس کو ہر اس چیز سے بچانے کے ہیں جس سے گزند پہنچنے کا اندیشہ ہو لیکن کبھی کبھی لفظ تقویٰ اور خوف ایک دوسرے کے معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔ جس طرح کہ سبب بول کر مسبب اور مسبب بول کر سبب مراد لیا جاتا ہے۔ اور اصطلاح شریعت میں نفس کو ہر اس چیز سے بچانے کا نام تقویٰ ہے جو گناہ کا موجب ہو۔

اور یہ بات محظورات شرعیہ کے ترک کرنے سے حاصل ہو جاتی ہے۔ مگر اس میں درجہ کمال حاصل کرنے کے لیے بعض مباحات کو بھی ترک کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ آنحضرتؐ

سے مروی ہے ① ((الْحَلَالُ بَيْنَ وَالْحَرَامِ بَيْنٌ وَمَنْ وَقَعَ حَوْلَ الْحِمَىٰ فَحَقِيقٌ أَنْ يَقَعَ فِيهِ)) ”حلال بھی بین ہے اور حرام بھی بین ہے اور جو

کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے۔

میں ہر جگہ تقویٰ کا ایک خاص معنی مراد ہے جس کی تفصیل اس کتاب کے بعد بیان ہوگی۔<sup>①</sup>

إِنَّمَا فُلَانٌ بِكَذَا کے معنی کسی چیز کے ذریعہ بچاؤ حاصل کرنے کے ہیں۔ اور آیت:-

﴿أَفَمَنْ يَتَّقِ بُرْهَانَ سُوءِ الْعَذَابِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ﴾ (۳۹-۳۴) بھلا جو شخص قیامت کے دن اپنے منہ سے برے عذاب کو روکتا ہوا۔

میں اس عذاب شدید پر تنبیہ کی ہے جو قیامت کے دن ان پر نازل ہوگا اور یہ کہ سب سے بڑی چیز جس کے ذریعہ وہ عذاب سے بچنے کی کوشش کریں گے وہ ان کے چہرے ہی ہوں گے تو یہ ایسے ہی ہے جیسے دوسری جگہ فرمایا:

﴿وَتَغْشَىٰ وَجُوهَهُمُ النَّارُ﴾ (۴-۵۰) اور ان کے مونہوں کو آگ لپٹ رہی ہوگی۔

﴿يَوْمَ يُسْحَبُونَ فِي النَّارِ عَلَىٰ وَجُوهِهِمْ﴾ (۵۴-۵۸) اس روز منہ کے بل دوزخ میں گھسیٹے جائیں گے۔

## (وکء)

الْوَكَاءُ کے معنی کسی چیز کا سر بند کے ہیں۔<sup>②</sup> اور کبھی وکاء اس ظرف کو بھی کہہ دیا جاتا ہے جس میں کوئی چیز ڈال کر اس کا منہ باندھ دیا گیا ہو۔ اسی سے اَوَكَّأْتُ فُلَانًا ہے جس کے معنی کسی کے لیے تکیہ لگا دینے کے

ہیں۔

تَوَكَّأَ عَلَى الْعَصَا: اس نے عصا پر ٹیک لگائی اور اس سے قوت حاصل کی۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:- ﴿هِيَ عَصَايَ أَتَوَكَّأُ عَلَيْهَا﴾ (۲۰-۱۸) (انہوں نے کہا) یہ میری لاٹھی ہے اس پر میں سہارا لگاتا ہوں۔

اور حدیث میں ہے<sup>③</sup> (۱۵۰)

((كَانَ يُوَكِّي بَيْنَ الصَّفَا وَالْمَرْوَةِ)) (یعنی بالکل خاموش یا نہایت تیزی سے طواف کرتے تھے) اس کے معنی یہ ہیں کہ سعی سے ان کے مابین کو اس طرح پر کر دیتے تھے جیسا کہ مثکیزہ کو بھرنے کے بعد اس کا منہ باندھ دیا جاتا ہے۔ اور یہ یاد رہے کہ مشک کا منہ باندھنے کے لیے اَوَكَّيْتُ السَّقَاءَ (یعنی پاء کے ساتھ) بولتے ہیں اور اوکات (ہمزہ کے ساتھ) اس معنی میں استعمال نہیں ہوتا۔

## (وکد)

وَكَّدْتُ وَآكَّدْتُ (تفعلیل) کے معنی کسی بات یا معاملہ کو محکم اور پختہ کرنے کے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:- ﴿وَلَا تَنْقُضُوا الْاِيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيدِهَا﴾ (۱۲-۹۱) اور جب پکی قسمیں کھاؤ تو ان کو مت توڑو۔

اور وہ قسم جس سے زین کے اگلے حصہ کو کس کر باندھ دیتے ہیں اسے (بھی) تاکید یا توكيد کہا جاتا ہے۔ اور اَلْوَكَادُ اس رسی کو کہتے ہیں جس کے ساتھ دودھ دوہتے

① وفي المطبوع ومن يحش الله مصحف ۱۲

② وفي الحديث: ان العين وكاء المسه فاذا نامت العين ان استطلق الوكاء (الفائق ۲/۳۱۴)

③ والحديث في الفائق (۲/۳۱۴) موقوف على الزبير قال ابو عبيد في غريبه (۸/۴) وهو عندى من امساك الكلام وفيه تفسير آخر انه يروى عنه قال كان يوكى مابين الصفا والمراوة سعيا فان كان هذا محفوظا فوجه ان يملأ ما بينهما سعيا لا يمشى على هبته فى شىء من ذلك شبه بالسقاء وغيره يملأ ثم يوكاء عليه حيث انتهى امتلاء ها وايضا انظر مجمع البحار الانوار (۳/۴۶۱-)

ہو۔ جیسے دوسری جگہ فرمایا:-

﴿لَسْتُ عَلَيْهِمْ بِمُسْطَرٍ إِلَّا مَنْ تَوَلَّى﴾  
(۲۳-۲۲-۸۸) تم ان پر داروغہ نہیں ہو، ہاں جس شخص  
نے منہ پھیرا۔۔۔۔۔

اور اسی معنی میں فرمایا:-

﴿قُلْ لَسْتُ عَلَيْكُمْ بِوَكِيلٍ﴾ (۶-۲۶) کہہ دو کہ  
میں تمہارا داروغہ نہیں ہوں۔

﴿أَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَهَهُ هَوَاهُ أَفَأَنْتَ تَكُونُ  
عَلَيْهِ وَكِيلًا﴾ (۲۵-۲۳) کیا تم نے اس شخص کو دیکھا  
جس نے خواہش نفس کو معبود بنا رکھا ہے۔ تو کیا تم اس پر  
نگہبان ہو سکتے ہو۔

﴿أَمْ مَنْ يَكُونُ عَلَيْهِمْ وَكِيلًا﴾ (۴-۱۰۹) اور کون  
ان کا وکیل بنے گا۔

یعنی ان کی طرف سے کون ذمہ داری اٹھائے گا۔

الَّتَوَكَّلُ: (تفعل) اس کا استعمال دو طرح ہوتا ہے۔  
اول (صلہ لام کے ساتھ) تَوَكَّلْتُ لِفُلَانٍ یعنی میں  
فلاں کی ذمہ داری لیتا ہوں چنانچہ وَكَلْتُهُ فَتَوَكَّلَ لِي  
کے معنی ہیں: میں نے اسے وکیل مقرر کیا۔ تو اس نے  
میری طرف سے ذمہ داری قبول کر لی۔

(علی<sup>(۲)</sup> کے ساتھ) تَوَكَّلْتُ عَلَيْهِ کے معنی کسی پر  
بھروسہ کرنے کے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:-  
﴿عَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ﴾ (۱۱-۱۱۲) اور  
خدا ہی پر مومنوں کو بھروسہ رکھنا چاہیے

﴿وَمَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ فَهُوَ حَسْبُهُ﴾  
(۲۵-۳) اور جو خدا پر بھروسہ رکھے گا تو وہ اس کو کفایت  
کرے گا۔ ﴿رَبَّنَا عَلَيْكَ تَوَكَّلْنَا﴾ (۲۰-۲۰۱) اے

وقت گائے (کی ٹانگیں) باندھ دیتے ہیں۔

خلیل نے کہا ہے کہ اَيْمَانُ (یعنی قسموں) کی چٹنگی کے  
لیے اَكْذَبْتُ زیادہ مناسب ہے اور باقی اقوال کے متعلق  
وَكَذَبْتُ زیادہ صحیح ہے۔ لہذا عقد ایمان کے لیے اَكْذَبْتُ  
اور حلف وغیرہ کے لیے وَكَذَبْتُ کہا جائے گا۔ اور وَكَذَّبَ  
وَكَذَّبَهُ کے معنی کسی کی طرح قصد کرنے اور اس جیسے  
اخلاق اختیار کرنے کے ہیں۔

## وَكَن

الْوَكْزُ: (س ض) کے معنی کچوکا لگانے، دھکا دینے اور مکا  
مارنے کے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔  
﴿فَوَكَزَهُ مُوسَى﴾ (۲۸-۱۵) تو موسیٰ (علیہ السلام) نے  
اس کو مکا مارا۔

## وَكَل

الْوَكِيلُ کے معنی کسی پر اعتماد کر کے اسے اپنا  
نائب مقرر کرنے کے ہیں اور وَكَيْلٌ فَعِيلٌ (بمعنی  
مفعول) کے وزن پر ہے۔ قرآن میں پاک ہے:- ﴿وَوَكَّلْنَاهُ  
بِاللَّهِ وَكَيْلًا﴾ (۸۱-۳) اور خدا ہی کافی کار  
ساز ہے۔ یعنی اپنے تمام کام اسی کے سپرد کار ساز ہے۔  
یعنی اپنے تمام کام اسی کے سپرد کر دیجیے اور کار سازی کے  
لیے اسی کو کافی سمجھیے اور آیت کریمہ:-

﴿حَسْبُنَا اللَّهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ﴾ (۳-۱۷۳) ہم کو  
خدا کافی ہے۔ اور وہ بہت اچھا کار ساز ہے۔  
بھی اسی معنی پر محمول ہے۔ اور آیت کریمہ:-

﴿وَمَا أَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيلٍ﴾ (۳۹-۴۱) اور اے  
پیغمبر! تم ان کے ذمہ دار نہیں ہو۔

کے معنی یہ ہیں کہ تم ان کے اعمال کے ذمہ دار اور محافظ نہیں

الَّيْلُ ﴿٢٢-٢١﴾ (کہ خدا) رات کودن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے۔

میں اس نظام کائنات پر متنبہ کیا گیا ہے جو اس عالم میں رات کے دن میں اور دن کے رات میں داخل ہونے کی صورت میں قائم ہے اور مطالعہ شمسی کے حساب سے رونما ہوتا رہتا ہے۔

الْوَيْجَةُ: وہ شخص ہے جو دوسری قوم سے ہو لیکن تم اسے اپنا معتمد بنا لو اور یہ فُلَانٌ وَلَيْجَةٌ فِى الْقَوْمِ کے محاورہ سے لیا گیا ہے یعنی وہ جو قوم میں داخل ہو جائے اور ان میں سے نہ ہو عام اس سے کہ انسان ہو یا کوئی دوسری چیز قرآن پاک میں ہے: ﴿وَلَمْ يَتَّخِذُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلَا رَسُولِهِ وَلَا الْمُؤْمِنِينَ وَلِيجَةً﴾ (٩-١٦) اور انہوں نے خدا اور اس کے رسول اور مومنوں کے سوا کسی کو دلی دوست نہیں بنایا۔

جیسا کہ مومنین کے متعلق دوسری جگہ فرمایا:۔

﴿النَّصْرَىٰ أَوْلِيَآءَ﴾ (٥-٥١) اے ایمان والو! یہود اور نصاریٰ کو دوست نہ بناؤ۔

رَجُلٌ خُرَجَتْ وَلَيْجَةٌ: بہت زیادہ اندر اور باہر آنے جانے والا آدمی۔

## (ول د)

الْوَلَدُ: جو جنا گیا ہو۔ یہ لفظ واحد (مذکر مؤنث) چھوٹے بڑے سب پر بولا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:۔

﴿فَإِنْ لَّمْ يَكُنْ لَهُ وَلَدٌ﴾ (٣-١١) اور اگر اولاد نہ ہو۔

﴿أَنْتَى يَكُونُ لَهُ وَلَدٌ﴾ (٦-١٠١) اس کے اولاد کہاں سے ہو۔

ہمارے پروردگار! تجھ ہی پر ہمارا بھروسہ ہے۔

﴿وَعَلَى اللَّهِ تَوَكَّلُوا﴾ (٥-٢٣) اور خدا ہی پر بھروسہ رکھو۔

﴿وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ وَكِيلًا﴾

(٣-٨١) اور خدا پر بھروسہ رکھو اور خدا ہی کافی کارساز ہے

﴿تَوَكَّلْ عَلَيْهِ﴾ (١١-١٢٣) اور اسی پر بھروسہ رکھو۔

﴿وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِي لَا يَمُوتُ﴾

(٢٥-٥٨) اور اس خدائے زندہ پر بھروسہ رکھو جو کبھی نہیں

مرے گا۔ وَاكْلٌ فُلَانٌ: دوسرے شخص پر اعتماد کر کے اپنا

کام ضائع کر دینا۔

تَوَاكَلِ الْقَوْمُ: لوگوں نے اپنے کام ایک دوسرے پر

ڈالنا شروع کر دیئے۔

رَجُلٌ وَكَلَّةٌ: وہ آدمی جو خود کمزور ہو اور ہر کام

میں دوسروں کا سہارا تلاش کرے۔

الْوَكَالُ: چوپایہ، جانور میں عیب کو کہتے ہیں یعنی یہ کہ وہ

دوسرے جانور کے چلنے کے بغیر تہا نہ چلے۔

بعض نے وکیل کی تفسیر کفیل کے ساتھ کی ہے کہ وکیل کفیل

کو کہتے ہیں۔ مگر وکیل کفیل سے اعم ہے کیونکہ ہر کفیل وکیل

بھی ہوتا ہے لیکن ہر وکیل کا کفیل ہونا ضروری نہیں ہے۔

## (ول ج)

الْوُلُوجُ: (ض) کے معنی کسی جگہ میں

داخل ہونے کے ہیں۔

﴿حَتَّىٰ يَلِجَ الْجَمَلُ فِي سَمِّ الْخِيَاطِ﴾

(٤-٣٠) یہاں تک کہ اونٹ سوئی کے ناکے میں سے نہ

نکل جائے۔ اور آیت:

﴿يُؤَلِّجُ اللَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُؤَلِّجُ النَّهَارَ فِي

فُلَانٌ لِّدَّةٍ فُلَانٌ وَتَرْبُهُ: فلاں اس کا ہم عمر ہے یہ اصل میں وَلَدٌ تَخْفِيف کے لیے واو ساقط ہوگئی ہے۔  
تَوَلَّدَ الشَّيْءُ مِنَ الشَّيْءِ: ایک چیز کا دوسری سے پیدا ہونا۔  
اور وَلَدٌ کی جمع اولاد آتی ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔

﴿أَتَمَّ أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةً﴾ (۸-۲۸)  
تمہارا مال اور اولاد بڑی آزمائش ہے۔  
﴿إِنَّ مِنْ أَزْوَاجِكُمْ وَأَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ﴾ (۶۳-۱۳)  
تمہاری عورتوں اور اولاد میں سے بعض تمہارے دشمن بھی ہیں۔

ان ہر دو آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اولاد انسان کے لیے آزمائش ہے۔ مگر بعض اولاد دشمن ثابت ہوتی ہے پہلی آیت میں سب کو فتنہ قرار دیا ہے۔ لیکن دوسری آیت میں بعض کو دشمن قرار دیا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ وَلَدٌ کی جمع وَلَدٌ بھی آتی ہے جیسے اَسَدٌ کی جمع اَسَدٌ مگر ہو سکتا ہے کہ ولد کا لفظ مفرد ہو جیسے بُخْلٌ وَبَخْلٌ اور عَرَبٌ وَ عَرَبٌ کہ یہ دونوں مفرد ہیں۔ ..... مثل مشہور ہے۔  
وَلَدُكَ مِنْ دَمِي عَقِيبِي: یعنی تیرا لڑکا تو وہی ہے جو تیری ایزبوں کو خون آلود کرے یعنی جو تمہارے بطن سے پیدا ہوا ہو اور ایک قرأت میں ہے۔

﴿مَنْ لَّمْ يَزِدْهُ مَالَهُ وَوَلَدُهُ﴾ (۷۱-۲۱) جن کو ان کے مال اور اولاد نے ..... کچھ فائدہ نہیں دیا۔<sup>۱</sup>

## (وَلَقَ)

الْوَلَقُ کے معنی تیز روی کے ہیں اور وَلَقَ الرَّجُلُ: (ض) کے معنی جھوٹ بولنا کے ہیں۔

اور وَلَدٌ کا لفظ متنی پر بھی بولا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔  
﴿أَوْ نَتَّخِذْهُ وَلَدًا﴾ (۱۲-۲۱) یا ہم اسے بیٹا بنالیں۔  
﴿وَالْوَلَدُ وَمَا وَلَدَ﴾ (۹۰-۳) اور باپ (یعنی آدم علیہ السلام) اور اس کی اولاد کی قسم۔

ابو الحسن کا قول ہے کہ وَلَدٌ کا لفظ بیٹے اور بیٹی دونوں پر بولا جاتا ہے اور وَلَدٌ وَلَدٌ کے معنی اہل و عیال کے ہیں۔ محاورہ ہے: وَلَدٌ فُلَانٌ فلاں پیدا ہوا۔ ..... قرآن پاک میں ہے۔  
﴿وَالسَّلَامُ عَلَيَّ يَوْمَ وُلِدْتُ﴾ (۱۹-۳۳) اور جس دن میں پیدا ہوا مجھ پر سلام (ورحمت) ہے۔  
﴿وَسَلَامٌ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ﴾ (۱۹-۱۵) اور جس دن وہ پیدا ہوئے ان پر سلام ورحمت ہے۔

اور باپ کو والد اور ماں کو والدہ کہتے ہیں اور دونوں کو الدین کہا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔  
﴿رَبِّ اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ﴾ (۷۱-۲۸) اے میرے پروردگار! مجھ کو اور میرے ماں باپ کو معاف کرنا۔  
الْوَلِيدُ: عرف میں نوزائیدہ بچے پر بولا جاتا ہے۔ اگرچہ نعمت کے لحاظ سے ہر چھوٹے بڑے کو ولید کہنا صحیح ہے۔ جیسا کہ تازہ چنے ہوئے پھل کو جَسْنٌ کہا جاتا ہے۔ پھر جب بچہ بڑا (یعنی بالغ) ہو جائے تو اسے وَلِيدٌ نہیں کہتے ہیں۔ اس کی جمع وَلَدَانٌ ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔

﴿بِمَا يَجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيبًا﴾ (۷۴-۱۷) (اس دن سے) (کیونکر بچو گے) جو بچوں کو بوڑھا کر دے گا۔

الْوَلِيدَةُ: عرف عام میں کنیز کے ساتھ مختص ہے اور لِدَةٌ خاص کر تَرْبٌ (لنگوٹیا) کو کہتے ہیں۔ چنانچہ محاورہ ہے۔

معنی میں استعمال ہوتے ہیں اور کبھی اسم مفعول یعنی مَوَالِیٰ کے معنی میں آتے ہیں۔ اور مومن کو ولی اللہ تو کہہ سکتے ہیں۔ لیکن مولی اللہ کہنا ثابت نہیں ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کے متعلق وَلِیُّ الْمُؤْمِنِیْنَ وَمَوْلَاهُمْ دونوں طرح بول سکتے ہیں۔ چنانچہ معنی اول یعنی اسم فاعل کے متعلق فرمایا: ﴿اللَّهُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ (۲-۲۵۷) جو لوگ ایمان لائے ان کا دوست خدا ہے۔

﴿اِنَّ وَلِیَّیَّ اللّٰهُ﴾ (۷-۱۹۶) میرا مددگار تو خدا ہی ہے۔ ﴿وَاللّٰهُ وَلِیُّ الْمُؤْمِنِیْنَ﴾ (۳-۲۸) اور خدا مومنوں کا کارساز ہے۔

﴿ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ مَوْلٰی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ (۴-۱۱) یہ اس لیے کہ جو مومن ہیں ان کا خدا کارساز ہے۔

﴿زَعَمَ الْمَوْلٰی وَنِعَمَ النَّصِیْرُ﴾ (۸-۴۰) خوب حمایتی اور خوب مددگار ہے۔

﴿وَاعْتَصِمُوا بِاللّٰهِ هُوَ مَوْلٰکُمْ فَنِعَمَ الْمَوْلٰی﴾ (۲۲-۷۸) اور خدا (کے دین کی رسی) کو مضبوط پکڑے رہو وہی تمہارا دوست ہے اور خوب دوست ہے۔ اور دوسرے معنی یعنی اسم مفعول کے متعلق فرمایا: ﴿قُلْ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ هَادُوْا اِنْ زَعَمْتُمْ اَنْکُمْ اَوْلِیَآءُ لِلّٰهِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ﴾ (۲۲-۶۱) کہہ دو کہ اے یہود! اگر تم کو یہ دعویٰ ہو کہ تم ہی خدا کے دوست ہو اور لوگ نہیں۔

﴿وَ اِنْ تَظْهَرَا عَلَیْهِ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰهُ﴾ (۶۶-۴) اور پیغمبر (کی ایذا) پر باہم اعانت کرو گی تو خدا ان کے

اور آیت: ﴿اِذْ تَلَقَّوْنَهٗ بِالْیَسْتِیْکُمْ﴾ (۲۴-۱۵) جب تم اپنی زبانوں سے اس کا ایک دوسرے سے ذکر کرتے تھے۔ میں ایک قرأت تَلَقَّوْنَهٗ بھی ہے ۱ یعنی کذب بیانی کے لیے جلدی کرتے تھے اور یہ جَاءَتْ الْاِبِلُ تَلِقُ کے محاورہ سے ماخوذ ہے۔ جس کے معنی اونٹوں کے تیز رفتاری کے ساتھ آنے کے ہیں۔ اَلَا وَلَقُ: جس کی عقل میں فتور ہو۔

رَجُلٌ مَّالُوْقٌ وَمُوْلُقٌ: پاگل اور دیوانہ آدمی۔ نَاقَةٌ وَلَقِی: تیز روانی۔ اَلْوَلِیْقَةُ: ایک قسم کا کھانا جو گھی سے تیار ہوتا ہے۔ اَلْوَلُقُ: نیزے کا بہت ہلکا زخم۔

## (ولی)

اَلْوِلَآءُ وَالتَّوَالِیُّ کے اصل معنی دو یا دو سے زیادہ چیزوں کا اس طرح کیے بعد دیگرے آنا کہ ان کے درمیان کوئی ایسی چیز نہ آئے جو ان میں سے نہ ہو۔ پھر استعارہ کے طور پر قرب کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے۔ خواہ وہ قرب بلحاظ مکان یا نسب اور یا بلحاظ دین اور دوستی یا نصرت کے ہو اور یا بلحاظ اعتقاد کے۔ اَلْوِلَآئَةُ (بکسر الواو) کے معنی نصرت اور وِلَآئَةُ (فتح الواو) کے معنی کسی کام کا متولی ہونے کے ہیں۔ ۲ بغض نے کہا ہے کہ یہ دَلَالَةٌ وَدَلَالَةٌ کی طرح ہے یعنی اس میں دو لغت ہیں۔ اور اس کے اصل معنی کسی کام کا متولی ہونے کے ہیں۔

اَلْوَلِیُّ وَالمَوْلٰی: یہ دونوں کبھی اسم فاعل یعنی مَوَالِیٰ کے

۱ مروی عن عائشة والآية فی شان حدیث الافک (اللسان و لوق) والنوادر لابی مسهل (۱/۳۱۶) وابدال ابی الطیب (۲/۳۱۲) والمشکل للقبنی (۱۹) والقرءات الشاذة (۱۰۰) لابن خالویه ۱۲۔

۲ کذا قال ابو عبیدة فی محاذرة (۱/۴۰۵) ومنه اخذ البحاری تفسیر هذه الکلمة (فتح الباری ۸/۳۲۹)



حامی اور دوست وار ہیں۔

دشمنوں کو دوست نہ بناؤ۔

اور آیت:

﴿تَرَىٰ كَثِيرًا مِّنْهُمْ يَتَوَلَّوْنَ الَّذِينَ كَفَرُوا﴾ کے آخر میں فرمایا۔

﴿وَلَوْ كَانُوا يُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَالنَّبِيِّ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِ مَا اتَّخَذُواْهُمْ أَوْلِيَاءَ﴾ (۵-۸۱) اور اگر وہ خدا پر اور پیغمبر پر اور جو کتاب ان پر نازل ہوئی تھی اس پر یقین رکھتے تو ان لوگوں کو دوست نہ بناتے۔ اور کفار اور شیاطین کے درمیان دنیا میں مولات تو ثابت ہے۔ لیکن آخرت

میں ان کے درمیان دوستی کی نفی کی گئی ہے چنانچہ دنیا میں ان کی باہم مولات کے متعلق فرمایا۔

﴿الْمُنَافِقُونَ وَالْمُنَافِقَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ﴾ (۹-۶۶) منافق مرد اور منافق عورتیں ایک دوسرے کے ہم جنس (یعنی) ایک ہی طرح کے ہیں۔

نیز فرمایا:

﴿إِنَّهُمْ اتَّخَذُوا الشَّيْطٰنِينَ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ اللّٰهِ﴾ (۷-۲۷) ان لوگوں نے خدا کو چھوڑ کر شیطانوں کو رفیق بنالیا۔

﴿إِنَّا جَعَلْنَا الشَّيْطٰنِينَ أَوْلِيَاءَ لِلَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ﴾ (۷-۲۷) ہم نے شیطانوں کو ان ہی لوگوں کا رفیق بنایا ہے جو ایمان نہیں رکھتے۔

﴿فَقَاتِلُواْ أَوْلِيَاءَ الشَّيْطٰنِ﴾ (۳-۷۶) سو تم شیطان کے مددگاروں سے لڑو۔

پھر جس طرح ان کے درمیان باہم دوستی کو ثابت کیا ہے اسی طرح دنیا میں کفار پر شیاطین کو تسلط بھی دے رکھا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿ثُمَّ رُدُّوْا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰهُمُ الْحَقُّ﴾ (۶-۶۲) پھر قیامت کے دن تمام لوگ اپنے مالک برحق خدائے تعالیٰ کے پاس بلائے جائیں گے اور آیت:

﴿وَمَا لَهُمْ مِنْ دُونِهِ مِنْ اٰلٍ﴾ (۱۳-۱۱) اور خدا کے سوا ان کا کوئی مددگار نہیں ہوتا۔ میں وَال کے معنی ولی کے ہے۔ اور متعدد آیات میں اللہ تعالیٰ نے مومنوں اور کافروں کے درمیان دلیلی کی نفی کی ہے۔ چنانچہ فرمایا۔

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصٰرَى اَوْلِيَاءَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاءُ بَعْضٍ وَ مَن يَتَوَلَّهٖمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ﴾ (۵-۵۱) اے ایمان والو! یہود اور نصاریٰ کو دوست نہ بناؤ۔ یہ ایک دوسرے کے دوست ہیں اور جو شخص تم میں سے ان کو دوست بنائے گا وہ بھی انہی میں سے ہوگا۔

﴿لَا تَتَّخِذُوا اٰبَاءَكُمْ وَاِخْوَانَكُمْ اَوْلِيَاءَ اِنْ اسْتَحَبُّوْا الْكُفْرَ عَلٰى الْاِيْمَانِ﴾ (۹-۲۳) اگر تمہارے ماں باپ اور بہن بھائی ایمان کے مقابل کفر کو پسند کریں (تو ان سے دوستی نہ رکھو۔

﴿وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖ اَوْلِيَاءَ﴾ (۷-۳) اور اس کے سوا اور رفیقوں کی پیروی نہ کرو۔

﴿مَا لَكُمْ مِّنْ وَّلَايَتِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ حَتّٰى يُهَاجَرُوْا﴾ (۸-۷۲) تو جب تک وہ ہجرت نہ کریں تم کو ان کی رفاقت سے کچھ سروکار نہیں۔

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا عَدُوِّ وِعَدُوْكُمْ اَوْلِيَاءَ﴾ (۲۰-۱) مومنو! میرے اور اپنے

گے۔ اب اپنا چہرہ مسجد حرام (یعنی خانہ کعبہ) کی طرف پھیر لو اور تم لوگ جہاں ہوا کرو (نماز پڑھنے کے وقت) اسی مسجد کی طرف منہ کر لیا کرو۔

اور جب بذریعہ عن کے متعدی ہو تو خواہ وہ عن لفظوں میں مذکور ہو یا مقدر، اس کے معنی اعراض اور دور ہونا کے ہوتے ہیں۔ چنانچہ تعدیہ بذاتہ کے متعلق فرمایا:

﴿وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ مِنْكُمْ فَإِنَّهُ مِنْهُمْ﴾ (۵۱-۵) اور جو شخص تم میں سے ان کو دوست بنائے گا۔ وہ بھی انہی میں سے ہوگا۔

﴿وَمَنْ يَتَوَلَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ﴾ (۵۶-۵) اور جو شخص خدا اور اس کے پیغمبر سے دوستی کرے گا۔ اور تعدیہ عن کے متعلق فرمایا:

﴿فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِالْمُفْسِدِينَ﴾ (۶۳-۳) تو اگر یہ لوگ پھر جائیں تو خدا مفسدوں کو خوب جانتا ہے۔

﴿إِلَّا مَنْ تَوَلَّى وَكَفَرَ﴾ (۲۳-۸۸) ہاں جس نے منہ پھیرا اور نہ مانا۔

﴿فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُولُوا اشْهَدُوا﴾ (۶۳-۳) اگر یہ لوگ اس بات کو نہ مانیں تو ان سے کہہ دو کہ تم گواہ رہو۔

﴿وَإِنْ تَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ﴾ (۳۸-۴۷) اگر تم منہ پھیرو گے تو وہ تمہاری جگہ اور لوگوں کو لے آئے گا۔

﴿فَإِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَإِنَّمَا عَلَى رَسُولِنَا الْبَلَاغُ الْمُبِينُ﴾ (۱۲-۶۳) اور اگر تم منہ پھیر لو گے تو ہمارے پیغمبر کے ذمے تو صرف پیغام کا کھول کر پہنچا دینا ہے۔

﴿وَإِنْ تَوَلَّوْا فاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَوْلَكُمْ﴾ (۸-۳۰)

﴿إِنَّمَا سُلْطَنُهُ عَلَى الَّذِينَ يَتَوَلَّوْنَهُ﴾ (۱۶-۱۰۰) اس کا زور انہیں لوگوں پر چلتا ہے جو اس کو رفیق بناتے ہیں۔

اور آخرت میں ان کی باہم دوستی کی نفی کرتے ہوئے فرمایا:

﴿يَوْمَ لَا يُغْنِي مَوْلَى عَنْ مَوْلَى شَيْئًا﴾ (۴۱-۴۲) جس دن کوئی دوست کسی دوست کے کچھ کام نہیں آئے گا۔

﴿ثُمَّ يَوْمَ الْقِيَمَةِ يَكْفُرُ بَعْضُكُم بِبَعْضٍ﴾ (۲۹-۲۵) پھر قیامت کے دن ایک دوسرے (کی دوستی) سے انکار کرو گے۔

﴿قَالَ الَّذِينَ حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ رَبَّنَا هَؤُلَاءِ الَّذِينَ أَغْوَيْنَا﴾ (۲۸-۶۳) اور جن لوگوں پر عذاب کا حکم ثابت ہو چکا ہوگا۔ وہ کہیں گے کہ ہمارے پروردگار! یہ وہ لوگ ہیں جن کو ہم نے گمراہ کیا تھا۔

اور تَوَلَّى کا لفظ جب متعدی بنفسہ ہوتا ہے۔

تو معنی ولایت اور قریب ترین موضع سے اس کے حصول کو چاہتا ہے۔ چنانچہ اسی سے کہا جاتا ہے۔ وَلَيْتُ سَمْعِي كَذَا وَلَيْتُ عَيْنِي كَذَا: میں نے اپنے کان یا آنکھ کو فلاں چیز پر لگایا۔

وَلَيْتُ وَجْهِي كَذَا: میں اپنے چہرے کے ساتھ اس پر متوجہ ہوا۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:-

﴿فَلَنَوَلِّيَنَّكَ قَبْلَةً تَرْضَاهَا فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ﴾ (۲-۱۴۲) سو ہم تم کو اسی قبلے کی طرف جس کو تم پسند کرتے ہو۔ چہرہ پھیرنے کا حکم دیں

میں ولی سے ایسا لڑکا مراد ہے جو اولیاء اللہ سے ہو۔ اور  
آیت

﴿خَفِضْتُ الْمَوَالِيَ مِنْ وَرَائِي﴾ (۱۹-۵) اور  
میں اپنے بعد اپنے بھائی بندوں سے ڈرتا ہوں۔

میں بعض نے کہا ہے کہ موالی سے عم زاد بھائی مراد ہیں۔  
۱ اور بعض نے دور کے رشتہ دار مراد لیے ہیں۔ ۲ اور

آیت کریمہ:-

﴿وَلَمْ يَكُنْ لَهُ وَلِيٌّ مِنَ الذَّلِيلِ﴾ (۱۷-۱۷) اور نہ  
اس وجہ سے کہ وہ عاجز و ناتواں ہے کوئی اس کا مددگار نہیں  
ہے۔

میں مطلق ولی کی نفی نہیں ہے بلکہ وَلِيٌّ مِنَ الذَّلِيلِ کی نفی  
ہے یعنی اس وجہ سے کہ وہ عاجز و ناتواں ہے اس کا کوئی  
ولی نہیں ہے۔ ویسے اللہ تعالیٰ کے سب نیک بندے اس  
کے اولیاء سے ہیں۔ لیکن وہ اولیاء من الذل نہیں ہیں کہ کسی  
پر غلبہ حاصل کر کے لیے اللہ تعالیٰ کو ان سے امداد کی  
ضرورت ہو۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَمَنْ يَضِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهُ وَلِيًّا مُرْشِدًا﴾  
(۱۸-۱۷) اور جس کو گمراہ کرے تو تم اس کے لیے کوئی  
دوست راہ بتانے والا نہ پاؤ گے۔

الْوَلِيُّ: (ایضاً) وہ بارش جو رسی یعنی موسم بہار کی پہلی  
بارش کے بعد متصل بر سے اسے وَلِيٌّ کہا جاتا ہے۔  
الْمَوْلَى کا لفظ کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

(۱) غلام کو آزاد کرنے والا (۲) آزاد شدہ غلام  
(۳) حلیف (۴) عم زاد بھائی (۵) پڑوسی۔

اور اگر روگردانی کریں تو جان رکھو کہ خدا تمہارا حمایتی ہے۔  
﴿فَمَنْ تَوَلَّى بَعْدَ ذَلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ﴾

(۸۲-۳) تو جو اس کے بعد پھر جائیں وہ بدکردار ہیں اور  
تَوَلَّى (بمعنی اعراض) کے معنی کبھی پیٹھ پھیرنا کے ہوتے  
ہیں اور کبھی توجہ نہ کرنے اور ترک قرب۔ کے چنانچہ فرمایا۔  
﴿وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَأَنْتُمْ تَسْمَعُونَ﴾ (۸-۲۰)

اور اس سے روگردانی نہ کرو اور تم سنتے ہو۔

یعنی ان لوگوں کا کردار ادا نہ کرو جن کی صفت یہ تھی کہ:  
﴿وَأَسْتَغْشَوْا ثِيَابَهُمْ وَأَصْرُوا وَاسْتَكْبَرُوا  
اسْتِكْبَارًا﴾ (۷۱-۷۱) اور کپڑے اوڑھ لیے اور اڑ گئے  
اور اکڑ بیٹھے۔ اور نہ ہی ان لوگوں کے قول کی نقالی کرو۔  
جن کے متعلق فرمایا:-

﴿وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَا تَسْمَعُوا لِهَٰذَا الْقُرْآنِ  
وَالْغَوْا فِيهِ﴾ (۲۶-۳۱) اور کافر کہنے لگے کہ اس قرآن  
کو سنا ہی نہ کرو۔ اور (جب پڑھے لگیں تو) شور مچا دیا کرو۔

محاورہ ہے۔  
وَلَاهُ دُبْرَةٌ: یعنی ہزیمت کھا کر بھاگ جانا۔ قرآن پاک  
میں ہے:-

﴿وَإِنْ يَفْقَهُ تِلْكَ لَئِنْ يُوَلَّوْكُمْ الْأَدْبَارَ﴾ (۳-۱۱۱)  
اور اگر تم سے لڑیں گے تو پیٹھ پھیر کر بھاگ جائیں گے۔  
﴿وَمَنْ يُوَلِّيهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبْرَةٌ﴾ (۸-۱۶) اور جو شخص  
جنگ کے روز ان سے پیٹھ پھیرے گا۔ اور آیت کریمہ:-  
﴿هَبْ لِي مِنْ لَدُنْكَ وَلِيًّا﴾ (۵-۱۵) مجھے اپنے  
پاس سے ایک وارث عطا فرما۔

۱ ہذا هو المروى عن الاصم ۱۲۔

۲ علی ماروی عن ابن عباس ومجاهد روح المعانی (ص ۵۷ ج ۱۶)

فصل ہوتا

أَوَلَيْتُ الشَّيْءَ الشَّيْءَ: دوسری چیز کو پہلی چیز کے ساتھ ملانا۔

أَلْوَلَاءُ: میراث جو آزاد کردہ غلام سے حاصل ہوتی ہے اور احادیث میں ولاء کی بیع اور اسکے ہمہ سے منع کیا گیا ہے۔ (۱۵۳)

أَلْمَوَالِیُّہُ کے معنی متابعت کے ہیں یعنی اشیاء کا یکے بعد دیگرے واقع ہونا۔

### (وہب)

وَهْبَتْهُ (ف) هَبَةً وَمَوْهَبَةً وَمَوْهَبًا: بلا عوض کوئی چیز دے دینا یا کچھ بخش دینا۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَوَهَبْنَا لَهُ إِسْحَاقَ﴾ (۶۵-۶۶) اور ہم نے ان کو اسحاق (اور یعقوب علیہ السلام) بخشے۔

﴿الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي وَهَبَ لِي عَلَى الْكِبَرِ إِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ﴾ (۱۲-۳۹) خدا کا شکر ہے۔ جس نے مجھے بڑی عمر میں اسماعیل اور اسحاق علیہ السلام بخشے۔

﴿إِنَّمَا أَنَا رَسُولُ رَبِّكِ لِأَهَبَ لَكِ غُلَامًا زَكِيًّا﴾ (۱۸-۱۹) انہوں نے کہا کہ میں تو تمہارے پروردگار کا بھیجا ہوا یعنی فرشتہ ہوں اور اس لیے آیا ہوں کہ تمہیں پاکیزہ لڑکا بخشوں۔

یہاں فرشتے کا لڑکا بخشنے کو اپنی ذات کی طرف منسوب کرنا محض سبب ہونے کی بنا پر ہے (ورنہ حقیقت میں بخشنے والا تو اللہ تعالیٰ ہی ہے)

اور ہر وہ شخص جو دوسرے کے معاملہ کا والی ہو وہ بھی اس کا مولا کہلاتا ہے۔

فَلَا نَ أَوْلَىٰ بِكَذَا: فلاں اس کا زیادہ حق دار ہے قرآن میں ہے:-

﴿الْأَنبِیُّ أَوْلَىٰ بِالْمُؤْمِنِينَ مِنْ أَنفُسِهِمْ﴾ (۲۳-۶) پیغمبروں مومنوں پر ان کی جانوں سے زیادہ حق رکھتے ہیں۔ ﴿إِنَّ أَوْلَى النَّاسِ بِإِبْرَاهِيمَ لَلَّذِينَ اتَّبَعُوهُ﴾ (۳-۶۸) ابراہیم سے قرب رکھنے والے تو وہ لوگ ہیں۔ جو ان کی پیروی کرتے ہیں۔

﴿قَالَ لَهُ أَوْلَىٰ بِهِمَا﴾ (۲-۱۳۵) تو خدا ان کا خیر خواہ ہے۔ ﴿وَأُولُوا الْأَرْحَامِ بَعْضُهُمْ أَوْلَىٰ بِبَعْضٍ﴾ (۳۳-۶) اور رشتہ دار آپس میں زیادہ حق دار ہیں۔

اور بعض نے کہا ہے کہ آیت ﴿أَوْلَىٰ لَكَ فَأَوْلَىٰ﴾ (۵-۳۲) افسوس ہے تم پر پھر افسوس ہے۔

میں بھی اولیٰ اسی محاورہ سے ماخوذ ہے اور اولیٰ لَكَ وَبِكَ دونوں طرح بولا جاتا ہے۔ اور معنی یہ ہیں کہ عذاب تیرے لیے اولیٰ ہے یعنی تو عذاب کا زیادہ سزاوار ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ یہ فعل متعدی بمعنی قرب کے ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ اولیٰ بمعنی انزجر سے یعنی اب بھی باز آ جا۔

وَلِیَ الشَّيْءِ الشَّيْءَ: دوسری چیز کا پہلی چیز کے بعد بلا

① قاله محی السنۃ وذهب صاحب غرۃ التنزیل انه من الولی بمعنی القرب ویفہم من کلام المحلی ان الاول اسم فعل

بمعنی التهذید والثانی افعل التفضیل والصحیح مافی الفائق (۲/۳۱۶) انه کلمۃ لہف و وعید۔

② رواہ الجماعة "من حدیث ابن عمرو بمعناه عند الحاکم وابن حبان والبیہقی وجمع ابونعیم طرقہ فرواہ عن خمسمین رجلا من اصحاب عبداللہ بن دینار عنہ (النبیل ۵/۷۴-۷۵) وایضا کنز العمال ۱۲۔

(۳۵-۳۸) اور مجھ کو ایسی بادشاہی عطا کر کہ میرے بعد کسی کا شایان نہ ہو۔

اور وَهَبٌ وَوَهَّابٌ دونوں اسمائے حسنیٰ سے ہیں۔  
 ۱ اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کو بقدر استحقاق بخشا ہے اس لیے خدا تعالیٰ کو الْوَهَّابُ کہا جاتا ہے۔ اَلَا تَهَابُ: (اتعال)  
 ہدیہ قبول کرنا۔ حدیث ہے۔ ۱ (۱۵۳)

((لَقَدْ هَمَمْتُ أَنْ لَا أَتَهَبَ إِلَّا مِنْ قُرْشِيِّ أَوْ أَنْصَارِيٍّ أَوْ ثَقَفِيٍّ)) میں نے عزم کر لیا ہے کہ قرشی یا انصاری یا ثقفی قبیلہ کے سوا کسی کا ہدیہ قبول نہیں کروں گا۔

### (و ه ج)

الْوَهْجُ کے معنی گرمی کی حرارت یا روشنی کے ہیں اور یہی معنی وَهَجَانٌ کے ہیں۔ چنانچہ آیت:-  
 ((وَجَعَلْنَا سِرَاجًا وَهَّاجًا)) (اور آفتاب کو روشن چراغ بنایا۔

میں وَهَّاجُ کے معنی (بافراط) روشنی کرنے والا کے ہیں۔  
 وَهَجَتِ النَّارُ: (ف ض س) آگ روشن ہونا۔  
 تَوَهَّجَ الْجَوْهَرُ: جوہر چمک اٹھا۔

### (و ه ن)

الْوَهْنُ کے معنی (کسی معاملہ میں جسمانی طور پر کمزور ہونے یا اخلاقی کمزوری ظاہر کرنے کے ہیں۔  
 قرآن پاک میں ہے:-

((رَبِّ اِنِّیْ وَهْنٌ الْعَظْمُ مِیْنِیْ)) (۱۹-۱۷) اے میرے پروردگار! میری ہڈیاں بڑھاپے کے سبب کمزور ہو گئی ہیں۔

اور ایک قرأت میں لِيَهَبَ بھی ہے جو اللہ کی طرف منسوب ہے۔ تو یہ نسبت حقیقی ہوگی اور پہلی یعنی فرشتے کی طرف مجازی۔ قرآن پاک میں ہے۔

((فَوَهَّبَ لِیْ رَبِّیْ حُكْمًا)) (۲۶-۲۱) خدا نے مجھ کو نبوت و علم بخشا۔

((وَوَهَبْنَا لِداوُدَ سُلَيْمَانَ)) (۳۸-۳۰) اور ہم نے داؤد کو سلیمان علیہ السلام عطا کیے۔

((وَوَهَبْنَا لَهُ اَهْلًا)) (۳۸-۲۳) اور ہم نے ان کو اہل و عیال بخشے۔

((وَوَهَبْنَا لَهُ مِنْ رَحْمَتِنَا اَخَاهُ هَارُونَ نَبِيًّا)) (۱۹-۵۳) اور اپنی مہربانی سے ان کو ان کا بھائی ہارون پیغمبر عطا کیا۔

((فَهَبَ لِیْ مِنْ لَدُنْكَ وَلِيًّا يَرْثِیْنِیْ)) (۱۹-۵) تو مجھے اپنے پاس سے ایک وارث عطا فرما۔

((اِنْ وَهَبْتَ نَفْسَهَا)) (۳۳-۵۰) اگر اپنے تئیں پیغمبر کو بخش دے (یعنی مہر لینے کے بغیر نکاح میں آنا چاہتی ہے۔)

((رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيَّاتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ)) (۲۵-۷۴) ہمارے پروردگار! ہم کو ہماری بیویوں کی طرف سے دل کو چین اور اولاد کی طرف سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما۔

((وَهَبْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ رَحْمَةً)) (۳-۸) ہمیں اپنے ہاں سے نعمت عطا فرما۔

((وَهَبْ لِیْ مُلْكًا لَا يَنْبَغِیْ لِاَحَدٍ مِنْ بَعْدِیْ))

۱ انظر الآية (۷-۳)

۲ قطعة من الحديث انظر الفائق (۲/۳۱۷) وفي النسائي عن ابی هريرة: اودوسی۔

## (و ی)

وَي (اسم صورت) یہ کلمہ حسرت و ندامت اور اظہار تعجب کے موقع پر بولا جاتا ہے۔ جیسے۔  
 وَي لِعَبْدِ اللَّهِ: عبد اللہ پر انفسوس یا تعجب ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔  
 ﴿وَيَكَاَنَ اللَّهُ يَسْطُرُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَشَاءُ﴾ (۸۲-۲۸) ہائے شامت! خدا ہی تو..... جس کے لیے چاہتا ہے رزق فراخ کر دیتا ہے۔  
 ﴿وَيَكَاَنَ لَا يُفْلِحُ الْكَافِرُونَ﴾ (۸۲-۲۸) ہائے خرابی! کافر نجات نہیں پاسکتے۔  
 بعض وَي لَزَيْدٍ (بصلہ لام) اور بعض وَي زَيْدٍ (بغیر لام) بولتے ہیں۔ اور بعض نے کہا ہے کہ وَيْلٌ اصل میں وَيْلَكَ ہی ہے لام حذف ہونے کے بعد وَيْلَكَ رہ گیا ہے۔

## (و ی ل)

الْوَيْلُ اصمعی نے کہا ہے کہ وَيْلٌ برے معنوں میں استعمال ہوتا ہے اور حسرت کے موقع پر ویل اور تحقیر کے لیے ویس اور ترحم کے لئے وِی کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔  
 اور جن لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ وَيْلٌ جہنم میں ایک وادی کا نام ہے تو ان کا یہ مقصد نہیں کہ یہ اس کے وضعی معنی ہیں۔ بلکہ ان کی مراد یہ ہے کہ جن لوگوں کے متعلق قرآن پاک نے یہ کلمہ استعمال کیا ہے۔ ان کا ٹھکانا جہنم ہوگا اور وہ اس میں ضرور داخل ہوں گے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿فَمَا وَهَنُوا لِمَا أَصَابَهُمْ﴾ (۱۳۶-۳) تو جو مصیبتیں ان پر واقع ہوئیں ان کے سبب انہوں نے نہ تو ہمت ہاری۔

﴿وَهَنَّا عَلَى وَهْنٍ﴾ (۱۴-۳۱) تکلیف پر تکلیف سہہ کر۔ یعنی جوں جوں پیٹ میں حمل کا بوجھ بڑھتا ہے کمزوری پر کمزوری بڑھتی چلی جاتی ہے۔

﴿وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا﴾ (۱۳۸-۳) اور دیکھو بدل نہ ہونا اور نہ کسی طرح کا غم کرنا۔

﴿وَلَا تَهِنُوا فِي ابْتِغَاءِ الْقَوْمِ﴾ (۱۰۴-۴) اور کفار کا پیچھا کرنے میں سستی نہ کرنا۔

﴿ذَلِكُمْ وَأَنَّ اللَّهَ مُوهِنُ كَيْدِ الْكَافِرِينَ﴾ (۱۸-۸) (بات یہ ہے) کچھ شک نہیں کہ خدا کافروں کی تدبیر کو کمزور کر دینے والا ہے۔

## (و ہ ی)

الْوَهْيُ: کے معنی چڑے کے کپڑے یا اس قسم کی دوسری چیزوں کا شگاف ہو جانا کے ہیں۔ اسی سے محاورہ ہے:-

وَهَتْ عَزَا إِلَى السَّحَابِ بِمَائِهَا: بادل کے دھانے پر پانی کے زور سے ڈھیلے ہو گئے۔ یعنی خوب بارش ہوئی۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَأَنشَقَّتِ السَّمَاءُ فَهِيَ يَوْمَئِذٍ وَاهِيَةٌ﴾ (۱۶-۶۹) اور آسمان پھٹ جائے گا اور اسکی بندش ڈھیلی پڑ جائے گی۔ اور وَهَى الشَّيْءُ کے معنی بندش کا ڈھیلا پڑ جانا کے ہیں۔

① قال السيد الآلوسی (؟) وجاء في الحديث بطريق صحيح الفاظ عن رسول الله الويل واذا في جهنم الخ واطلاقه على ذلك اما حقيقه شرعية واما مجاز لغوي من اطلاق لفظ الحال على المحل ولا يمكن ان يكون حقيقه لغويه لان العرب تكلمت به في نظمها ونثرها قبل ان يحيى القرآن ولم تطلقه على ذلك (۲۷۴/۱) فهذا يؤيد ما قال المؤلف انه معمول على المجاز ۱۲۔

کرنے والوں کے لیے خرابی ہے۔

﴿وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ﴾ (۱-۱۰۳) ہر طعن آمیز

اشارتیں کرنے والے چغل خور کی خرابی ہے۔

﴿يُؤْيَلْنَا مِنْ بَعَثْنَا مِنْ مَّرْقِدِنَا﴾ (۵۲-۳۶) (اے

ہے) ہمیں ہماری خواب گاہوں سے کس نے (جگا) اٹھایا۔

﴿يُؤْيَلْنَا إِنَّا كُنَّا ظَلِمِينَ﴾ (۱۴-۲۱) ہائے شامت

بے شک ہم ظالم تھے۔

﴿يُؤْيَلْنَا إِنَّا كُنَّا طَاغِينَ﴾ (۳۱-۶۸) ہائے شامت

ہم ہی حد سے بڑھ گئے تھے۔



﴿فَوَيْلٌ لَهُمْ مِمَّا كَتَبَتْ أَيْدِيهِمْ وَوَيْلٌ لَهُمْ

مِمَّا يَكْسِبُونَ﴾ (۷۹-۲) ان پر افسوس ہے اس لیے

کہ (بے اصل باتیں) اپنے ہاتھ سے لکھتے ہیں اور پھر ان

پر افسوس ہے، اس لیے کہ ایسے کام کرتے ہیں ﴿وَوَيْلٌ

لِّلْكَافِرِينَ﴾ (۲-۱۴) اور کافروں کے لیے (سخت

عذاب کی جگہ) خرابی ہے۔

﴿وَيْلٌ لِّكُلِّ أَفَّاكٍ أَثِيمٍ﴾ (۷-۴۵) ہر جھوٹے

گنہگار پر افسوس ہے۔

﴿فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ كَفَرُوا﴾ (۳۷-۱۹) سو جو لوگ کافر

ہوئے ان کو خرابی ہے۔

﴿وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِينَ﴾ (۱-۸۳) ناپ تول میں کمی

## کتابُ الْهَاءِ

### (ه ب ط)

(۷-۱۳) تو بہشت سے نیچے اتر کیونکہ تیری ہستی نہیں کہ تو بہشت میں رہ کر شیخی مارے۔

﴿وَاهْبِطُوا مِصْرًا فَإِنَّ لَكُمْ مَّا سَأَلْتُمْ﴾ (۲-۶۱) (اچھا تو) کسی شہر میں اتر پڑو۔ کہ جو مانگتے ہو (وہاں) تم کو ملے گا۔

یہاں یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ فَإِنَّ لَكُمْ مَّا سَأَلْتُمْ سے ان کا شرف ظاہر ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کے مابعد کی آیت۔

﴿وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَاءَ وَ بَغْضَبٍ مِّنَ اللَّهِ﴾ (۲-۶۱) اور ان پر ذلت اور محتاجی لیس دی گئی اور وہ خدا کے غضب میں آ گئے۔ اس وہم کو دور کرنے کے لیے کافی ہے۔

﴿قُلْنَا اهْبِطُوا مِنْهَا جَمِيعًا﴾ (۲-۳۸) ہم نے حکم دیا کہ تم سب (کے سب) یہاں سے اتر جاؤ۔ محاورہ ہے۔ هَبَطَ الْمَرَضُ لَحْمَ الْعَلِيلِ: بیماری نے اس کے گوشت کو کم کر دیا یعنی (لاغر کر دیا) اور الْهَيْبَةُ: اونٹ وغیرہ کو کہتے ہیں۔ جو غذا کے ناقص اور مالک کی بے اعتنائی کی وجہ سے لاغر ہو جائے۔

### (ه ب و)

هَبَا (ن) الْغَبَارُ کے معنی غبار کے اڑنے اور فضا میں پھیل جانے کے ہیں اور هَبْرَةٌ (بروزن) عَبْرَةٌ اور هَبَاءُ کے معنی غبار یا ان کے باریک ذرات کے ہیں جو کمرے کے اندر روشندان سے دھوپ کی کرنیں اندر

الْهَبْطُ (ض) کے معنی کسی چیز کے قہر یعنی بے اختیاری کی حالت میں نیچے اتر آنا کے ہیں۔ جیسا کہ پتھر بلندی سے نیچے گر پڑتا ہے اور الْهَبْطُ (فتح الہاء) صینہ صفت ہے یعنی نیچے گرنے والی چیز۔

هَبَطَ: (فعل لازم اور متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے جیسے هَبَطْتُ أَنَا: میں نیچے اتر پڑاؤ هَبَطْتُ غَيْرِي دوسرے کو نیچے اتار دیا۔ قرآن میں ہے۔

﴿وَإِنَّ مِنْهَا لَمَّا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللَّهِ﴾ (۲-۷۴) اور بعض پتھر ایسے بھی (ہوتے ہیں) جو اللہ کے ڈر سے گر پڑتے ہیں۔

اور جب لفظ هَبَطَ انسان کے لیے بولا جاتا ہے تو اس میں استخفاف اور حقارت کا پہلو پایا جاتا ہے بخلاف لفظ انْزَالَ (الافعال) کے کہ اسے اللہ تعالیٰ نے بہت سے موقعوں پر با شرف چیزوں کے لیے استعمال کیا ہے جیسے ملائکہ، قرآن، بارش وغیرہ اور جہاں کہیں کسی چیز کے حقیر ہونے پر تنبیہ مقصود ہے۔ وہاں لفظ هَبَطَ استعمال کیا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿وَقُلْنَا اهْبِطُوا بَعْضُكُم لِبَعْضٍ عَدُوٌّ﴾ (۲-۳۶) اور ہم نے حکم دیا کہ تم (سب) اتر جاؤ تم ایک کے دشمن ایک۔

﴿وَأَهْبِطُ مِنْهَا فَمَا يَكُونُ لَكَ أَنْ تَتَكَبَّرَ فِيهَا﴾



دوسرے سے جدا ہونے کے ہیں عام اس سے کہ یہ جدائی بدنی ہو یا زبان سے ہو یا دل سے۔ چنانچہ آیت کریمہ:-  
﴿وَأَهْجُرُوهُمْ فِي الْمَصَاجِعِ﴾ (۳۲-۳) پھر ان کے ساتھ سونا ترک کرو۔

میں مفارقت بدنی مراد ہے اور کنایاً ان سے مجامعت ترک کر دینے کا حکم دیا۔ اور آیت ﴿إِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوا هَذَا الْقُرْآنَ مَهْجُورًا﴾ (۳۵-۳۰) کہ میری قوم نے اس قرآن کو چھوڑ رکھا تھا۔

میں دل یا دل اور زبان دونوں کے ذریعہ جدا ہونا مراد ہے (یعنی نہ تو انہوں نے اس کی تلاوت کی اور نہ ہی اس کی تعلیمات کی طرف دھیان دیا) اور آیت:-  
﴿وَأَهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيلًا﴾ (۴۳-۱۰) اور وضع داری کے ساتھ ان سے الگ تھلگ رہو۔

میں تینوں طرح الگ رہنے کا حکم دیا گیا ہے لیکن ساتھ ہی جمیلہ کی قید لگا کر اس طرف اشارہ کر دیا ہے کہ حسن سلوک اور مجالست کسی صورت میں بھی ترک نہ ہونے پائے۔ اس طرح آیت ﴿وَأَهْجُرْنِي مَلِيًّا﴾ (۱۹-۴۶) اور تو ہمیشہ کے لیے مجھ سے دور ہو جا۔ میں بھی ترک بوجہ عداوت مراد ہے۔ اور آیت:- ﴿وَالرُّجُزَ فَاهْجُرْ﴾ (۴۳-۵) اور ناپاکی سے دور رہو میں بھی ہر لحاظ سے رجز کو ترک کر دینے کی ترغیب ہے۔

الْمُهَاجِرَةُ کے اصل معنی تو ایک کے دوسرے سے کٹ جانے اور چھوڑ دینے کے ہیں جیسے فرمایا:- ﴿وَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَجْهَهُدُوا﴾ (۲-۲۱۸) اور خدا کے لیے وطن

پرنے سے اڑتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔  
﴿فَجَعَلْنَاهُ هَبَاءً مَنْثُورًا﴾ (۲۵-۲۳) اور ان کو اس طرح رائیگاں کر دیں گے۔ جیسے بکھری ہوئی دھول۔  
﴿فَكَانَتْ هَبَاءً مُنْبَثًا﴾ (۵۶-۶) تو (پہاڑ ایسے) ہو جائیں گے (جیسے) ذرے پڑے ہوئے اڑ رہے ہیں۔

### (ہج د)

الْهَجُودُ کے معنی نیند کے ہیں اور نائم (سوئے ہوئے) آدمی کو هَاجِدٌ کہا جاتا ہے اور هَجْدَتُهُ فَتَهَجَّدُ (ازالہ ماخذ) کے معنی ہیں: میں نے اس کی نیند کو دور کیا تو وہ جاگ گیا جیسا کہ مَرَضَتُهُ کے معنی ہوتے ہیں: میں نے اس کے مرض کو دور کیا قرآن پاک میں ہے:-  
﴿وَمِنَ اللَّيْلِ فَتَهَجَّدُ بِهِ﴾ (۱۷-۷۹) اور رات کے وقت میں نماز تہجد بھی پڑھا کرو۔<sup>①</sup>

اس آیت میں رات کے قیام میں قرآن پڑھنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ جیسے دوسری جگہ اسی کو ﴿قَسَمَ اللَّيْلِ إِلَّا قَلِيلًا نَّصْفُهُ﴾ (۳-۲) رات (کے وقت نماز) میں کھڑے رہا کرو ساری رات سے کم یعنی آدھی رات۔ قیام کے ساتھ تعبیر فرمایا ہے۔

الْمُتَهَجِّدُ کے معنی رات کو نیند سے اٹھ کر نماز پڑھنے والا کے ہیں۔

أَهْجَدَ الْبَعِيرُ: کے معنی اونٹ کا خواب کے وقت اپنا سینہ زمین پر رکھ دینے کے ہیں۔

### (ہج ر)

الْهَجْرُ وَالْهَجْرَانُ کے معنی ایک انسان کے

① من الاضداد ياتى بمعنى النوم واليقظة (ابو الطيب ۶۷۸-۶۸۱) وفيه اكثر ما يقال فى النائم الهاجدو فى المستيقظ المتجهد وكذا قال ابن الاعرابى راجع اللسان (هجد) ۱۲۔

کی طرف (جہاں کہیں اس کو منظور ہوگا) نکل جاؤں گا۔ کے  
معنی یہ ہیں کہ میں اپنی قوم کو خیر باد کہہ کر اللہ تعالیٰ کی طرف  
چلا جاؤں گا۔ اور فرمایا:۔

﴿أَلَمْ تَكُنْ أَرْضُ اللَّهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوا فِيهَا﴾  
(۴-۹۷) کیا اللہ تعالیٰ کی (اتنی بسی چوڑی) زمین (اس  
قدر) گنجائش نہیں رکھتی تھی کہ تم اس میں (کسی طرف کو)  
ہجرت کر کے چلے جاتے۔

ہاں جس طرح ظاہری ہجرت کا اقتضایہ ہے کہ انسان  
خواہشات نفسانی کو خیر باد کہہ دے۔ اس طرح دشمنوں  
کے ساتھ جہاد کرنے میں بھی مجاہدہ بالنفس کے معنی پائے  
جاتے ہیں۔ چنانچہ ایک حدیث میں مروی ہے کہ  
آنحضرت ﷺ نے ایک جہاد سے واپسی کے موقع پر صحابہ  
کرام سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: ﴿(۱۵۵)

﴾ (رَجَعْتُمْ مِّنَ الْجِهَادِ الْأَصْغَرِ إِلَى الْجِهَادِ  
الْأَكْبَرِ)) کہ تم جہاد اصغر سے جہاد اکبر کی طرف لوٹ  
رہے ہو۔ یعنی دشمن کے ساتھ جہاد کے بعد اب نفس کے  
ساتھ جہاد کرنا ہے۔ ایک اور حدیث میں ہے: ﴿(۱۵۶)  
﴾ (هَاجِرُوا وَلَا تَهَاجِرُوا)) یعنی صحیح طور پر مہاجر ہو  
اور عمل کو ترک کر کے محض زبان سے مہاجر ہونے کے  
جھوٹے دعاوی نہ کرو۔

الْهَجْر کے معنی ہڈیان کے ہیں جس کے براہونے کی وجہ

چھوڑ گئے اور (کفار سے) جنگ کرتے رہے۔  
اور آیات قرآنیہ۔

﴿لِّلْفُقَرَاءِ الْمُهَاجِرِينَ الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِنْ  
دِيَارِهِمْ وَأَمْوَالِهِمْ﴾ (۵۹-۸) (نے کے مال میں)  
محتاج مہاجرین کا (بھی) حق ہے۔ جو (کافروں کے ظلم  
سے) اپنے گھر اور مال سے بے دخل کر دیئے گئے۔  
﴿وَمَنْ يَخْرُجْ مِنْ بَيْتِهِ مُهَاجِرًا إِلَى اللَّهِ﴾  
(۴-۱۰۰) اور جو شخص خدا اور اس کے رسول کی طرف  
ہجرت کر کے گھر سے نکل جائے۔

﴿فَلَا تَتَّخِذُوا مِنْهُمْ أَوْلِيَاءَ حَتَّىٰ يُهَاجِرُوا فِي  
سَبِيلِ اللَّهِ﴾ (۴-۸۹) تو جب تک (یہ لوگ) خدا کی  
راہ میں (یعنی خدا کے لیے) ہجرت نہ کر آئیں ان میں  
سے (کسی کو بھی اپنا) دوست نہ بنانا۔

میں مہاجرت کے ظاہر معنی تو دار الکفر سے نکل کر  
دار الاسلام کی طرف چلے آنے کے ہیں۔ جیسا کہ صحابہ  
کرام نے مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کی تھی  
لیکن بعض نے کہا ہے۔ کہ ہجرت کا حقیقی اقتضایہ یہ ہے کہ  
انسان شہوت نفسانی، اخلاق ذمیرہ اور دیگر گناہوں کو کلیتہً  
ترک کر دے اور آیت:-

﴿إِنِّي مُهَاجِرٌ إِلَىٰ رَبِّي﴾ (۲۹-۲۶) اور  
ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ) میں تو دیس چھوڑ کر اپنے پروردگار

۱ وفی البیہقی فی الزہدو الدیلمی فی مسندہ من حدیث جابر قَدْ مُتَّمْ بِدَل رَجَعْتُمْ وَزَاد قَبْلَ وَمَا الْجِهَادُ الْاَكْبَرُ قَالَ  
مُحَاضِدَةُ الْعَبْدِ هَوَاهُ وَفِيهِ ضَعْفٌ وَاوردہ النسائی فی الکنی من قول ابراہیم بن عبلۃ احد التابعین وفی الکشاف ان  
النبی ﷺ رجع من بعض غزواتہ فقال رجعت الحدیث قال الحافظ فی تحریرہ ہکذا ذکرہ الثعلبی بغیر سند (راجع تحریر  
الکشاف ص ۱۱۴ رقم ۳۳) وکنز العمال (۴/۲۸۶)۔

۲ موقوف علی عمرؓ والمستدرک للحاکم (۸/۳) غریب ابی عبید (۳/۳۱۱) والحدیث فی الفائق (۲/۲۱۶) بطولہ عن  
زربین حبیب ۱۲۔

جاتا ہے جب کوئی آدمی کسی چیز کا کثرت سے ذکر کرے اور مریض کی طرح اس کے متعلق ہر وقت بڑاتا رہے اور ہَجِیْر کا لفظ اصل میں تو عادات ذمہ کے متعلق بولا جاتا ہے۔ مگر جو لوگ اسکے صحیح معنوی استعمال کا لحاظ نہیں کرتے وہ اسے اس کی ضد (یعنی اچھی عادت کے معنی) میں بھی استعمال کر لیتے ہیں۔

الْهَجِيرُ وَالْهَجِيرَةُ کے معنی دوپہر کا وقت، کے ہیں۔ کیونکہ عموماً مسافر سخت گرمی کی وجہ سے اس وقت سفر کو ترک کر کے راحت حاصل کرتا ہے تو گویا اسے لوگوں نے چھوڑ دیا اور اس وقت نے لوگوں کو چھوڑ دیا۔

الْهَجَارُ: یہ عقاب و زمام کے وزن پر ہے اور اسکے معنی اونٹ کا پاؤں باندھنے کی رسی، کے ہیں وہ رسی چونکہ دوسرے اونٹوں سے علیحدگی کا سبب بنتی ہے اس لیے اسے هَجَار بھی کہتے ہیں۔ اور مَهْجُور اُس اونٹ کو کہتے ہیں۔ جو هَجَار (رسی) کے ساتھ باندھ دیا گیا ہو۔ اور پھر اونٹ کی اس رسی کے ساتھ تشبیہ دے کر کمان کی تانت کو بھی هَجَار الْقَوْس کہہ دیا جاتا ہے۔

### (ح ج ع)

الْهَجُوعُ کے معنی رات کو سونا کے ہیں۔

قرآن میں ہے۔

﴿كَانُوا قَلِيلًا مِّنَ اللَّيْلِ مَا يَهْجَعُونَ﴾ (۵۱-۱۷)

① وتمام الحديث زوروا القبور ولا تقولوا هجراره عن زيد بن ثابت، الفتح الكبير للنبيهاني (۱۴۴/۲) والنهية (۲۵۵/۴) واللسان والمجمع (هجر) وازداد ابی الطیب (۶۸۵) والطبرانی فی الصغير (۱۸۳) او الفائق (۳۲۱/۲)۔

② قاله شماخ بن ضرار الغطفاني يصف سير ناقته ويشبه ذراعها في مشيها بذراع امرأة صفتها كذا وفي رواية ديوانه مسجلة الاعراق بدل كما حدة الاعراق والبيت في اللسان (هجر) وامالي المرتضى (۵۵۶: ۱) وفي ديوانه من قصيدة طولية (۲۶-۳۴)۔

③ وفي الفائق (۳۲۱/۲)۔ كان عمر يطوف بالبيت وهو يقول ربنا اننا الخ..... ماله هجيري سواه وراجع ايضا غريب ابی عبيد (۳۱۸/۳) وفيه (۳۱۸/۳) وفيه غيرها) وفي (ج) مسند عمر (۱۵۱۴)۔

سے اسے ترک کر دینا چاہیے اور حدیث میں ہے۔ ① (۱۵۷)

(( لَا تَقُولُوا هُجْرًا )) فحش کلامی نہ کرو۔ اور اَهْجَرَ فُلَانٌ کے معنی ہی اس نے قصد فحش کلامی کی اور هَجَرَ الْمَرِيضُ کے معنی مریض کے بے ہوشی میں بڑبڑانے کے ہیں۔ اور آیت:۔

﴿مُسْتَكْبِرِينَ بِهِ سَامِرًا تَهْجَرُونَ﴾ (۲۳-۱۷)

(تو تم) اکڑ اکڑ کر شغل بناتے ہو بیہودہ بکواس کرتے (الٹے پاؤں بھاگتے)

میں ایک قرأت تَهْجَرُونَ (باب افعال سے) بھی ہے۔ اور کبھی ہجر (بکواس) میں مباغہ کرنے والے کو بھی مَهْجِر کے ساتھ تشبیہ دی جاتی ہے تو اس لحاظ سے هَجَرَ کے معنی قصد اکواس کرنا بھی آجاتے ہیں۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے ② (الطویل)

(۴۷۰) كَمَا حِدَّةُ الْأَعْرَاقِ قَالَ ابْنُ ضَرَّةٍ  
عَلَيْهَا كَلَامًا جَارَ فِيهِ وَاهْجَرَ  
شریف النسل عورت کی طرح جس کی سوکن کے لڑکے نے اس کے بارے میں بے انصافی اور فحش کلامی کی ہو (اور وہ اپنی براءت کے لیے بار بار ہاتھ اٹھا رہی ہو)

اور محاورہ ہے: رَمَاهُ بِهَجْرَةٍ كَلَامِهِ: یعنی فلاں نے اس کو فحش گالیاں دیں۔ اور فُلَانٌ هَجِيرَاهُ کے معنی ہیں۔ ③ کہ فلاں کا یہ شیوہ بن چکا ہے اور یہ اس وقت کہا

ایک محاورہ ہے۔

مَرَزْتُ بِرَجُلٍ هَذَّكَ مِنْ رَجُلٍ: میں ایسے آدمی کے پاس سے گزرا جو تیرے لیے فلاں سے کافی ہے اصل میں اس کے معنی ہیں کہ جس کا وجود تجھے بے چین اور مضطرب کرتا ہے۔

هَذَّذْتُ فُلَانًا وَتَهَذَّ ذُنُّهُ: میں نے اسے دھمکایا اور ڈرایا۔

الْهَذَّ هَذَّةٌ: بچے کو سسلانے کے لیے تھکی دینا اور ہلانا۔  
الْهَذُّ هُذٌّ: ایک پرندے کا نام ہے۔ قرآن پاک میں ہے:-

﴿مَا لِي لَا أَرَى الْهَذَّ هَذًّا﴾ (۲۷-۲۰) کیا سبب ہے کہ ہد نظر نہیں آتا۔

اس کی جمع هَذَا هَذٌّ آتی ہے۔ اور هَذُّ هَذْمَةٍ کے ساتھ واحد ہے۔ شاعر نے کہا ہے ﴿(الکامل)

(۳۱۵) كِهَذَا هَذَا كَسَرَ الرُّمَاءُ جَنَاحَهُ

يَذْعُو لِقَارَعَةِ الطَّرِيقِ هَذِيلاً

وہ اس حمام کی طرح پریشان تھا جس کے بازو شکاریوں نے توڑ دیئے ہوں اور وہ راستے میں کھڑا اوپلا کر رہا ہو۔

(هذم)

الْهَذْمُ (ض) کے اصل معنی عمارت کو گرا دینا

اور وہ (عبادت) میں مشغول رہنے کے سبب رات کو بہت کم سوتے تھے۔

اس کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ رات کو بہت کم سوتے تھے اور یہ بھی کہ وہ رات کو سوتے ہی نہیں تھے۔“

کیونکہ قلیل کا لفظ جس طرح نہایت تھوڑی چیز کے معنی میں آتا ہے جو نہ ہونے کے برابر ہو اس طرح کبھی نفی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ محاورہ ہے۔ لَقِيْتُهُ بَعْدَ هُجْعَةٍ میں اسے رات کو کچھ دیر سولینے کے بعد ملا اور هُجْعٌ (مثل قَوْمٌ) مدہوش اور بے خود آدمی کو کہتے ہیں۔ جو ہر چیز سے غافل ہو۔

(هذد)

الْهَذُّ کے معنی کسی چیز کو زور کی آواز کے ساتھ گرا دینے یا کسی بھاری چیز کے گر پڑنے کے ہیں اور کسی چیز کے گرنے کی آواز کو هَسَّةٌ کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:- ﴿وَتَنْشَقُّ الْأَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَذًّا﴾ (۱۹-۹۰) زمین شق ہو جائے اور پہاڑ ریزہ ریزہ ہو کر گر پڑیں۔

اور وَهَذَوْتُ الْبَقَرَةَ: کے معنی گائے کو ذبح کرنے کے لیے زمین پر گرانے کے ہیں اور هَذٌّ بمعنی مَهْدُوذٌ (یعنی) گرائی ہوئی چیز کے، آتا ہے جیسے ذَبْحٌ بمعنی مَذْبُوحٌ اور کمزور بزدل آدمی کو بھی هَذٌّ کہا جاتا ہے۔

① قاله الراعي النميري اعبيد بن حصين من فحول الشعراء (والبيت من قصيدة جمهرية (۳۳۱-۳۳۷) في نحو ۸۵ بيتا يمدح فيها عبد الملك بن مروان ويشكو السعاة مطلعها: ما بال وفك بالفراش رحلا اقدى بينك ام اردت رحلا - وبعد البيت: وقع الربيع وقد تقارب خطوه - وراى لعقوته ته ازل نسولا - البيت في الحمرة (۳۳۵) والبلدان (رسم: بغيفة او اللسان والصحاح (هدد. هذل) والحيوان (۲۴۳: ۳) والحمرة لابن دريد ۷۲ او امالي الزجاجي ۵۴ والمعاني للقبتي ۱۸۸، ۳۰۰ والشاعر شيبه رجلا اخذ المصدق ابله بهد هذل كسر جناحه وقبل البيت: اخذوا حمولته فاصبح قاعدا لا يستطيع عن الديار حويلا تدعى امير المؤمنين و دونه خرق تجربه الرياح ذبولا - والراعي ممن ذكر الجمع في الطبقة الاولى من الشعراء لاسلاميين وكان يقدم الفرزدق على الحرير فاسكتفه فهجاه بقصيدته البائية اولها: اقل اللوم عادل والعتاب - وقولي ان اصبحت لقدرا اصابا - راجع الحمحي ۱۷۳ والاغانى (۱۶۸/۳۰) (۱۷۳)

تو اس کا جواب یہ ہے کہ بے شک ہدایت کے اصل معنی تو لطف و کرم کے ساتھ رہنمائی کے ہی ہیں۔ لیکن یہاں کفار کے متعلق مبالغہ کے لیے بطور تہکم یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ جیسا کہ آیت۔ ﴿فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ﴾ (۸۴-۲۴) تو (اے پیغمبر! انہیں عذاب الیم کی خوشخبری سنا دو۔

میں عذاب کے متعلق لفظ بشارت استعمال کیا ہے اور شاعر نے اپنے کلام ۵۰ (۱)

نَحِيَّةٌ بَيْنَهُمْ ضَرْبٌ وَجِيعٌ

ان کا باہمی تحیہ تلوار کی دردناک ضرب ہے

میں ضرب و جیع کے متعلق تحیہ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ انسان کو اللہ تعالیٰ نے چار طرف سے ہدایت کی ہے۔

(۱) وہ ہدایت ہے جو عقل و فطانت اور معارف ضروریہ کے عطا کرنے سے کی ہے اور اسی معنی میں ہدایت اپنی جنس کے لحاظ سے جمع مکلفین کو شامل ہے بلکہ ہر جاندار چیز کو حسب ضرورت اس سے بہرہ ملا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

﴿رَبُّنَا الَّذِي أَعْطَى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهُ ثُمَّ

هَدَى﴾ (۲۰-۵۰) ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر مخلوق کو اس کی (خاص طرح کی) بناوٹ عطا فرمائی پھر (ان کی خاص اغراض پورا کرنے کی) راہ دکھائی۔

(۲) دوسری قسم ہدایت کی وہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے پیغمبر بھیج کر اور کتابیں نازل فرما کر تمام انسانوں کو راہ نجات کی طرف دعوت دی ہے چنانچہ آیت: ﴿وَجَعَلْنَاهُمْ أُمَّةً يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوا﴾ (۳۱-۲۴) اور ہم نے

کے ہیں اس سے فعل هَدَمَ آتا ہے اور گری ہوئی چیز کو هَدَمَ کہا جاتا ہے۔ اور اسی سے استعارہ کے طور پر رائیگاں خون کو دَمَ هَدَمَ کہا جاتا ہے اور یہی معنی هَدَمَ بکسر الہا کے ہیں لیکن یہ خاص کر بوسیدہ کپڑے پر بولا جاتا ہے اور اس کی جمع اَهْدَامُ آتی ہے۔ اور هَدَمْتُ الْبِنَاءَ کے معنی بھی عمارت کو گرا دینے کے ہیں مگر اس میں تکثیر کے معنی پائے جاتے ہیں قرآن پاک میں ہے: ﴿لَهُدَمْتُ صَوَامِعُ﴾ (۲۲-۲۰) تو (نصاری) کے صومعے کبھی کے ڈھائے جا چکے ہوتے۔

## (ہدی)

الْهِدَايَةُ کے معنی لطف و کرم کے ساتھ کسی کی رہنمائی کرنے کے ہیں اور اسی سے هِدْيَةٌ (فعلة) ہے جس کے معنی اس تحفہ کے ہیں۔ جو بغیر معاوضہ کے دیا جائے۔ اور هَوَادِي الْوَحْشِ جنگلی جانوروں کے پیش رو دستے کو کہتے ہیں جو گلے کا رہنما ہوتا ہے۔ عرف میں دلالت اور رہنمائی کے لیے هَدَيْتُ (افعال) استعمال ہوتا ہے۔ جیسے اَهْدَيْتُ الْهَدِيَّةَ: میں نے ہدیہ بھیجا اور اَهْدَيْتُ إِلَى الْبَيْتِ: میں نے بیت اللہ کی طرف ہدی بھیجی۔ یہاں پر شبہ ہو سکتا ہے۔ کہ اگر هَدَايَہ کے معنی لطف و کرم کے ساتھ رہنمائی کرنے کے ہیں تو پھر کفار کو دوزخ کی طرف دھکیلنے کے لیے یہ لفظ کیوں استعمال ہوا ہے جیسا کہ ارشاد ہے۔ ﴿فَاهْدُوهُمْ إِلَى صِرَاطِ الْجَحِيمِ﴾ (۳۷-۲۳) پھر ان کو جہنم کے راستے پر چلا دو۔ ﴿وَيَهْدِيهِ إِلَى عَذَابِ السَّعِيرِ﴾ (۲۲-۴) اور دوزخ کے عذاب کا رستہ دکھائے گا۔

(۴) ہدایت سے آخرت میں جنت کی طرف راہنمائی کرنا مراد ہوتا ہے۔ چنانچہ فرمایا۔

﴿سَيَهْدِيهِمْ وَيُصْلِحُ بَالَهُمْ﴾ (۵۴-۵) (بلکہ) وہ انہیں (منزل) مقصود تک پہنچا دے گا۔ اور آیت ﴿وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِمْ﴾ میں فرمایا: ﴿الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي هَدَانَا لِهَذَا وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَا أَنَّ هَدَيْنَا اللَّهُ﴾ (۴۳-۴۲) خدا کا شکر ہے جس نے ہم کو یہاں کا رستہ دکھایا اور اگر خدا ہم کو رستہ نہ دکھاتا تو ہم رستہ نہ پاسکتے۔

ہدایت کے یہ چاروں اقسام تربیتی درجات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یعنی جسے پہلے درجہ کی ہدایت حاصل نہ ہو۔ وہ دوسرے درجہ ہدایت پر فائز نہیں ہو سکتا۔ بلکہ وہ تو شرعاً مکلف ہی نہیں رہتا۔ علی ہذا القیاس جسے دوسرے درجہ کی ہدایت حاصل نہ ہو وہ تیسرے اور چوتھے درجہ کی ہدایت سے بہرہ یاب نہیں ہو سکتا اور جسے چوتھے درجہ کی ہدایت حاصل ہو تو اسے پہلے تینوں درجات لازماً حاصل ہوں گے۔ اسی طرح تیسرے درجہ کی ہدایت کا حصول پہلے دو درجوں کی ہدایت کو مستلزم ہے اور اس کے برعکس درجہ اولیٰ کا حصول درجہ ثانیہ کو اور ثانیہ کا حصول ثالثہ کو مستلزم نہیں ہے۔ ایک انسان کسی دوسرے کو صرف دعوت الی الخیر اور رہنمائی کے ذریعہ ہی ہدایت کر سکتا ہے باقی اقسام ہدایت اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہیں۔ لہذا جن آیات میں ہدایت کی نسبت پیغمبر یا کتاب یا دوسرے انسانوں کی طرف کی گئی ہے وہاں صرف راہ حق کی طرف رہنمائی کرنا مراد ہے۔ چنانچہ فرمایا۔

﴿وَإِنَّكَ لَتَهْدِي إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ﴾ (۵۲-۴۲)

بنی اسرائیل میں سے (دین کے) پیشوا بنائے تھے جو ہمارے حکم سے (لوگوں کو) ہدایت کرتے تھے، میں ہدایت کے یہی معنی مراد ہیں۔

(۳) سوم ہدایت بمعنی توفیق خاص آیا ہے جو ہدایت یافتہ لوگوں کو عطا کی جاتی ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔

﴿وَالَّذِينَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى﴾ (۱۷-۱۷) جو لوگ روبراہ ہیں (قرآن کے سننے سے) خدا ان کو زیادہ ہدایت دیتا ہے۔

﴿مَنْ يُؤْمِنْ بِاللَّهِ يَهْدِ قَلْبَهُ﴾ (۱۱-۶۳) اور جو شخص خدا پر ایمان لاتا ہے وہ اس کے دل کو ہدایت دیتا ہے۔ ﴿إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ يَهْدِيهِمْ رَبُّهُمْ بِإِيمَانِهِمْ﴾ (۹-۱۰) جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل (بھی) کیے ان کے ایمان کی برکت سے ان کو ان کا پروردگار (نجات کا) رستہ دکھائے گا۔ ﴿وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا﴾ (۲۹-۲۹) اور جن لوگوں نے ہمارے دین (کے کام) میں کوشش کی۔ ہم (بھی) ان کو ضرور اپنے رستے دکھائیں گے۔

﴿وَيَزِيدُ اللَّهُ الَّذِينَ اهْتَدَوْا هُدًى﴾ (۱۹-۷۶) اور جو لوگ راہ راست پر ہیں اللہ ان کو (روز بروز) زیادہ ہدایت دیتا چلا جاتا ہے۔

﴿فَهَدَى اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا﴾ (۲-۳۳) تو خدا نے (اپنی عنایت سے) مسلمانوں کو راہ دکھا دی۔

﴿يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ﴾ (۲-۹۰) جس کو چاہتا ہے (دین کا) سیدھا راستہ دکھاتا ہے۔

ہدایت خدا تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہے۔ تو وہاں دعوت الی الحق اور صحیح رہنمائی کے علاوہ باقی اقسام ہدایت مراد ہیں یعنی کسی کو عقل اور توفیق بخشنا یا جنت میں داخل کرنا اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی قدرت میں نہیں ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿لَيْسَ عَلَيْكَ هُدَاهُمْ وَلَكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ﴾ (۲-۲۷۷) (۱) محمد ﷺ تم ان لوگوں کو ہدایت کے ذمہ دار نہیں ہو۔ بلکہ خدا ہی جس کو چاہتا ہے۔ ہدایت بخشتا ہے۔

﴿وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدَى﴾ (۶-۳۵) اور اگر خدا چاہتا تو سب کو ہدایت پر جمع کر دیتا۔ ﴿وَمَا أَنْتَ بِهَادِي الْعُمَىٰ عَنْ ضَلَالَتِهِمْ﴾ (۲۷-۸۱) اور نہ اندھوں کو گمراہی سے (نکال کر) رستہ دکھا سکتے ہو۔

﴿إِنْ تَحَرَّصَ عَلَىٰ هُدَاهُمْ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي مَنْ يُضِلُّ﴾ (۱۶-۳۷) اگر تم ان (کفار) کی ہدایت کے لیے لچاؤ تو جس کو خدا گمراہ کر دیتا ہے اس کو وہ ہدایت نہیں دیا کرتا۔

﴿وَمَنْ يُضِلِّلِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِنْ هَادٍ﴾ (۳۹-۳۶) اور جس کو خدا گمراہ کرے اسے کوئی ہدایت دینے والا نہیں۔

﴿وَمَنْ يَهْدِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِنْ مُضِلٍّ﴾ (۳۹-۳۷) اور جس کو خدا ہدایت دے اس کو کوئی گمراہ کرنے والا نہیں۔

﴿إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ وَلَكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ﴾ (۲۸-۵۶) (۱) محمد ﷺ تم جس کو دوست رکھتے ہو اس کو ہدایت نہیں کر سکتے۔ بلکہ خدا ہی جس کو

چاہتا ہے۔ ہدایت کرتا ہے۔

اور اسی معنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

اور بے شک (محمد ﷺ) سیدھا رستہ دکھاتے ہیں۔ ﴿يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا﴾ (۳۲-۲۴) جو ہمارے حکم سے ہدایت کیا کرتے تھے۔

﴿وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ﴾ (۱۳-۷) اور ہر ایک قوم کے لیے رہنما ہوا کرتے ہیں۔

اور جن آیات میں پیغمبروں یا دوسرے لوگوں سے ہدایت کی نفی کی گئی ہے وہاں باقی اقسام ہدایت مراد ہیں۔ چنانچہ فرمایا:

﴿إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ﴾ (۲۸-۵۶) (۱) محمد ﷺ تم جس کو دوست رکھتے ہو اسے ہدایت نہیں کر سکتے۔

اور قرآن پاک میں جہاں کہیں ظالموں اور کافروں کو ہدایت سے روک دینے کا ذکر آیا ہے۔ وہاں یا تو ہدایت بمعنی ثالث ہے یعنی وہ توفیق خاص جو ہدایت یافتہ لوگوں کو عطا ہوتی ہے ان سے سلب کر لی جاتی ہے اور یا ہدایت بمعنی رابع ہے کہ اللہ انہیں آخرت میں ثواب کی طرف ہدایت نہیں دے گا اور نہ ہی انہیں جنت میں داخل کرے گا۔ چنانچہ آیت یٰٰہْدِي اللّٰہ قَوْمًا کے آخر میں فرمایا۔

﴿وَاللّٰہ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ﴾ (۹-۱۱۹) اور خدا ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔

﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ اسْتَحَبُّوا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلٰی الْآخِرَةِ وَ اَنَّ السّٰلَةَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْکٰفِرِیْنَ﴾ (۱۶-۱۰۷) یہ اس لیے کہ انہوں نے دنیا کی زندگی کو آخرت کے مقابلہ میں عزیز رکھا اور اس لیے کہ خدا کافر

لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔

جہاں کہیں اللہ تعالیٰ نے پیغمبر یا کسی انسان کے متعلق یہ کہا ہے کہ وہ کسی کو ہدایت دینے پر قدرت نہیں رکھتے بلکہ

ضرورت نہیں پس آیت۔ ﴿وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ﴾ (۲۵-۲) اور خدا بے انصافوں کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔

اور دوسری آیت میں اَلْفَاسِقِينَ بھی اسی معنی پر محمول ہے۔ اور آیت

﴿أَفَمَنْ يَهْدِي إِلَى الْحَقِّ أَحَقُّ أَنْ يُتَّبَعَ أَمَّنْ لَا يَهْدِي إِلَّا أَنْ يُهْدَى﴾ (۱۰-۳۵) بھلا جو حق کا رستہ دکھائے وہ اس قابل ہے کہ اس کی پیروی کی جائے۔ یا وہ کہ جب تک کوئی اسے رستہ نہ بتائے رستہ نہ پائے۔

میں ایک قرأت لَا يَهْدِي إِلَّا أَنْ يُهْدَى ہے۔ یعنی وہ دوسرے کی رہنمائی نہیں کر سکتا بلکہ وہ خود رہنمائی کا محتاج ہے مطلب یہ ہے کہ ان میں علم و معرفت حاصل کرنے اور ہدایت پانے کی صلاحیت ہی نہیں ہے اور اگر انہیں کوئی شخص ہدایت دے بھی تو بیکار ہے۔ کیونکہ وہ بت (پتھر وغیرہ کی) بے جان مورتیاں ہیں پس إِلَّا أَنْ يُهْدَى سے بظاہر اگرچہ یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہدایت دینے سے وہ ہدایت پا سکتے ہیں۔ لیکن یہ مجاز پر محمول ہے۔ جیسا کہ محض صوری مشابہت کی وجہ سے ان بتوں کو آیت:-

﴿إِنَّ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ عِبَادٌ أَمْثَلُكُمْ﴾ (۱۹۴-۷) (مشکوٰۃ) جن کو تم خدا کے سوا پکارتے ہو، تمہاری طرح کے بندے ہی ہیں۔ میں عِبَادٌ أَمْثَلُكُمْ کہہ دیا ہے حالانکہ وہ بے جان مجسمے ہیں۔ جیسا کہ دوسری جگہ ان کے متعلق فرمایا: ﴿وَيَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَهُمْ رِزْقًا مِنَ السَّمَوَاتِ

﴿أَفَأَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتَّى يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ﴾ (۱۰-۹۹) تو کیا تم لوگوں پر زبردستی کرنا چاہتے ہو کہ وہ مومن ہو جائیں۔

اور آیت: ﴿مَنْ يَهْدِ اللَّهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ﴾ (۱۸-۱۷) جس کو خدا ہدایت دے وہ ہدایت یاب ہے۔

کے معنی یہ ہیں کہ جو شخص ہدایت کا طلبگار اور متلاشی ہو اسی کو اللہ تعالیٰ ہدایت یاب ہونے کی توفیق بخشتا۔ اور راہ جنت کی طرف رہنمائی کرتا ہے اس کے برعکس جو شخص کفر و ضلالت کا خواہاں رہتا ہے وہ توفیق الہی سے محروم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ﴾ (۲۰۴-۲) اور خدا ایسے ناشکروں کو ہدایت نہیں کرتا۔

اور دوسری آیت میں کُفِرِينَ کی جگہ ظَلِمِينَ ہے۔ اور آیت:-

﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي مَنْ هُوَ كَاذِبٌ كَفَّارٌ﴾ (۳۹-۳) بے شک خدا اس شخص کو جو جھوٹا ناشکرا ہے۔ ہدایت نہیں دیتا۔

میں كَاذِبٌ كَفَّارٌ سے مراد وہ شخص ہے جو ہدایت الہی کے قبول کرنے سے انکار کر دیتا ہے اور یہ اگرچہ اس کے وضعی معنی نہیں ہیں لیکن حاصل مطلب یہی ہے۔ لہذا آیت کے معنی یہ ہیں کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی ہدایت قبول نہیں کرتا اسے اللہ تعالیٰ بھی ہدایت نہیں بخشتا جیسے محاورہ ہے۔ مَنْ لَمْ يَقْبَلْ هِدْيَتِي لَمْ أُهْدِلْهُ وَمَنْ لَمْ يَقْبَلْ عَطِيَّتِي لَمْ أُعْطِهِ..... یعنی جو شخص میرے ہدیہ یا عطیہ کو قبول نہیں کرے گا میں بھی اسے ہدیہ نہیں دوں گا۔ یا آپ کہیں: مَنْ رَغِبَ عَنِّي لَمْ أَرْغَبْ فِيهِ کہ جو شخص مجھ سے اعراض کرتا ہے مجھے بھی اس کی



فرمایا: ﴿فَقَدْ هَدَىٰ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ﴾ (۱۰۱-۳) اور جس نے خدا (کی ہدایت کی رسی) کو مضبوط پکڑ لیا وہ سیدھے رستے لگ گیا۔  
 ﴿وَأَجْتَبَيْنَاهُمْ وَهَدَيْنَاهُمْ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ﴾ (۸۰-۶) اور ان کو برگزیدہ بھی کیا تھا اور سیدھا رستہ بھی دکھایا تھا۔

اور نیز فرمایا:

﴿أَفَمَنْ يَهْدِي إِلَىٰ الْحَقِّ أَحَقُّ أَنْ يُتَّبَعَ﴾ (۳۵-۱۰) بھلا جو شخص حق کا رستہ دکھائے وہ اس قابل ہے کہ اس کی پیروی کی جائے۔

﴿فَقُلْ هَلْ لَكَ إِلَىٰ أَنْ تَزْكَىٰ ..... وَأَهْدِيكَ إِلَىٰ رَبِّكَ فَتَخْشَىٰ﴾ (۱۹-۱۸-۷۹) کیا تو چاہتا ہے کہ پاک ہو جائے اور میں تمہیں تمہارے پروردگار کا رستہ بتاؤں تاکہ تجھ میں خوف پیدا ہو۔ اور تعدیہ بنفسہ کے متعلق فرمایا:

﴿وَلَهَدَيْنَاهُمْ صِرَاطًا مُسْتَقِيمًا﴾ (۶۸-۳) اور سیدھا رستہ بھی دکھاتے۔

﴿وَهَدَيْنَاهُمَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ﴾ (۳-۷۶) اور ہم نے انہیں سیدھا رستہ دکھایا۔

﴿إِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ﴾ (۵-۱) ہم کو سیدھے رستے پر چلا۔

﴿أَتَرِيدُونَ أَنْ تَهْدُوا مَنْ أَضَلَّ اللَّهُ﴾ (۸۸-۳) کیا تم چاہتے ہو کہ جس شخص کو خدا نے گمراہ کر دیا اس کو رستے پر لے آؤ۔

﴿وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ طَرِيقًا﴾ (۱۶۸-۳) اور نہ انہیں رستہ ہی دکھائے گا۔

وَالْأَرْضِ شَيْئًا وَلَا يَسْتَطِيعُونَ﴾ (۷۳-۱۶) اور خدا کے سوا ان کو پوجتے ہیں جو ان کو آسمانوں اور زمینوں میں روزی دینے کا ذرہ بھر بھی اختیار نہیں رکھتے اور نہ (کسی اور طرح کا) مقدور رکھتے ہیں۔  
 اور آیات کریمہ: ﴿إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ﴾ (۳-۷۶) اور اسے رستہ بھی دکھادیا۔

﴿وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ﴾ (۱۰-۹۰) اور اس کو (خیر، شر کے) دونوں رستے بھی دکھادیئے۔

﴿وَهَدَيْنَاهُمَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ﴾ (۱۰۸-۳۷) اور ان کو سیدھا رستہ دکھایا۔

میں خیر و شر اور ثواب و عقاب کا رستہ مراد ہے۔ جس کی طرف اللہ تعالیٰ نے عقل و شریعت کے ذریعہ انسان کو ہدایت فرمائی ہے اور یہی معنی آیت: ﴿فَرِيقًا هَدَىٰ وَفَرِيقًا حَقَّ عَلَيْهِمُ الضَّلَالَةُ﴾ (۳۰-۷) ایک فریق کو تو اس نے ہدایت دی اور ایک فریق پر گمراہی ثابت ہو چکی۔

میں مراد ہیں اور آیت: ﴿وَمَنْ يُؤْمِنْ بِاللَّهِ يَهْدِ قَلْبَهُ﴾ (۱۱-۶۳) اور جو شخص خدا پر ایمان لاتا ہے۔ وہ اس کے دل کو ہدایت دیتا ہے۔

میں ہدایت سے توفیق الہی مراد ہے جو کہ مومن کے دل میں القاء کی جاتی ہے اور وہ اپنے مشاغل میں اس سے رہنمائی حاصل کرتا ہے۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا:

﴿وَالَّذِينَ اهْتَدَوْا زَادْهُمْ هُدًى﴾ (۱۷-۴۷) اور جو لوگ ہدایت یافتہ ہیں ان کو وہ ہدایت مزید بخشا ہے۔

لفظ ہدایت کبھی متعدی بنفسہ ہوتا ہے اور کبھی بواسطہ لام یا الی کے متعدی ہوتا ہے، چنانچہ تعدیہ بواسطہ الی کے متعلق

کرنے کے لحاظ سے ہوگا۔ لیکن جہاں قبولیت حاصل نہ ہو وہاں یہ کہنا زیادہ اولیٰ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے ہدایت کی لیکن اس نے ہدایت الہی کو قبول نہ کیا۔ جیسا کہ آیت ﴿وَأَمَّا ثَمُودُ الْأَيَّةُ﴾ میں ہے اور آیت: ﴿لَهُ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ إِلَى قَوْلِهِ وَإِنْ كَانَتْ لَكَبِيرَةٌ إِلَّا عَلَى الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ﴾ (۱۳۲-۲) (تم کہہ دو) کہ مشرق اور مغرب سب خدا ہی کا ہے وہ جس کو چاہتا ہے۔

سیدھے رستے پر چلاتا ہے۔ الخ..... اور یہ بات (یعنی تحویل قبلہ لوگوں کو) گراں معلوم ہوئی مگر جن کو خدا نے ہدایت بخشی۔ میں الا علی الذین ہدی اللہ وہ لوگ مراد ہیں جنہوں نے ہدایت الہی کو قبول کیا اور اس سے رہنمائی حاصل کی اور آیت۔

﴿وَهَدَيْنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ﴾ (۵-۱) ہم کو سیدھے رستے پر چلا۔

اور آیت: ﴿وَلَهَدَيْنَاهُمْ صِرَاطًا مُسْتَقِيمًا﴾ (۶۸-۳) اور سیدھا رستہ بھی دکھا دیا۔

میں بعض نے کہا ہے کہ ہدایت سے ہدایت عامہ یعنی قرآن پاک اور انبیاء کرام کے ذریعہ ہدایت کرنا مراد ہے۔ اور یہ اگرچہ ہمیں حاصل ہے۔ لیکن ہمیں حصول ثواب کے لیے ان کلمات کے زبان سے ادا کرنے کا حکم فرمایا گیا ہے۔ جس طرح کہ اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلَى مُحَمَّدٍ الْخ پڑھنے یعنی آپ پر درود بھیجنے کے ہم مکلف ہیں۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ اور ملائکہ آپ پر رحمت بھیجتے اور آپ کے لیے دعا اور استغفار کرتے ہیں۔ جیسا کہ آیت: ﴿إِنَّ اللَّهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ﴾

﴿أَفَأَنْتَ تَهْدِي الْعُمْيَ﴾ (۱۰-۴۳) تو کیا تم اندھوں کو رستہ دکھاؤ گے۔

﴿وَيَهْدِيهِمُ إِلَيْهِ صِرَاطًا مُسْتَقِيمًا﴾ (۳-۱۷۶) اور اپنی طرف (پہنچنے کا) سیدھا رستہ دکھائے گا۔ پھر ہدایت و تعلیم دو باتوں کے بغیر نتیجہ خیز نہیں ہو سکتی ایک یہ کہ معلم اپنی طرف سے کما حقہ سمجھانے کی کوشش کرے اور دوسرے یہ کہ متعلم استفادہ کرنے کی کوتاہی سے کام نہ لے اگر ہادی یا معلم اپنی طرف سے تعلیم میں پوری کوشش کرے لیکن متعلم میں قبولیت کی صلاحیت نہ ہو تو اس کے عدم قبول کے لحاظ سے آپ (مجازاً) یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس نے ہدایت نہیں کی اور ہادی کے اپنی کوشش صرف کرنے کے لحاظ سے یہ کہنا بھی صحیح ہے کہ اس نے ہدایت اور تعلیم دی پس جب عدم قبولیت کی صورت میں (نفی اور اثبات کے ساتھ) دونوں طرح کہنا صحیح ہے تو کفار کے ہدایت الہی کو قبول نہ کرنے کے لحاظ سے یہ کہنا بھی بجا ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ہدایت نہیں دی کیونکہ ہدایت و تعلیم پر قبولیت کا ثمرہ مرتب نہیں ہوا اور یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ہدایت دی۔ کیونکہ انہی مبداء ہدایت یعنی (عقل و حواس) عطا فرمائے۔ پس آیت: ﴿وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ﴾ (۹-۱۹) اور خدا ظالم یا ناشکروں کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔

میں نفی معنی اول (یعنی عدم قبولیت) پر محمول ہوگی اور آیت: ﴿وَأَمَّا ثَمُودُ فَهَدَيْنَاهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمَىٰ عَلَى الْهُدَىٰ﴾ (۴۱-۱۷) اور جو ثمود تھے ان کو ہم نے سیدھا رستہ دکھا دیا تھا۔ مگر انہوں نے ہدایت کے مقابلہ میں اندھا رہنا پسند کیا۔

میں اثبات ہدایت دوسرے معنی بَذَلُ السَّعْيِ یعنی کوشش

تمہارے پاس میری طرف سے ہدایت پہنچے (تو اس کی پیروی کرنا کہ) جنہوں نے میری ہدایت کی پیروی کی۔

﴿قُلْ إِنَّ هُدَى اللَّهِ هُوَ الْهُدَى﴾ (۲-۱۲۰) کہدو کہ خدا کی ہدایت (یعنی دین اسلام) ہی ہدایت ہے۔ ﴿إِنْ تَحِرَّصْ عَلَى هُدَاهُمْ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي مَنْ يُضِلُّ﴾ (۱۶-۳۷) اگر تم ان (کفار) کی ہدایت کے لیے لپچاؤ تو جس کو خدا گمراہ کر دیتا ہے۔ اس کو وہ ہدایت نہیں دیا کرتا۔

﴿أُولَئِكَ الَّذِينَ اشْتَرُوا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَى﴾ (۲-۱۶) یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت چھوڑ کر گمراہی خریدی۔

﴿أَلَا هُدًى﴾ (ہدایت پانا) کا لفظ خاص کر اس ہدایت پر بولا جاتا ہے جو امور دنیوی یا اخروی کے متعلق انسان اپنے اختیار سے حاصل کرتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمْ النُّجُومَ لِتَهْتَدُوا بِهَا﴾ (۶-۹۸) اور وہی تو ہے جس نے تمہارے لیے ستارے بنائے تاکہ (جنگلوں اور دریاؤں کے اندھروں میں) ان سے رستہ معلوم کرو۔

﴿أَلَا الْمُسْتَضْعِفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيعُونَ حِيلَةً وَلَا يَهْتَدُونَ سَبِيلًا﴾ (۳-۹۸) اور عورتیں اور بچے بے بس ہیں۔ کہ نہ تو کوئی چارہ کر سکتے ہیں اور نہ رستہ جانتے ہیں۔

لیکن کبھی اہتداء کے معنی طلبِ ہدایت بھی آتے ہیں چنانچہ فرمایا:۔

﴿وَإِذْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ﴾ (۲-۵۱) اور جب ہم نے موسیٰ کو کتاب

(۳۳-۵۶) خدا اور اس کے فرشتے پیغمبر پر درود گار پر درود بھیجتے ہیں۔ سے ثابت ہوتا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ یہ ﴿أَهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ﴾ گمراہی اور شہواتِ نفسانیہ کے پتھ میں گرفتار ہونے سے حفاظت کی دعا ہے اور بعض نے کہا ہے کہ اس میں توفیقِ الہی کی طلب کی طرف اشارہ ہے جس کا کہ آیت:

﴿وَالَّذِينَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى﴾ (۴۷-۱۷) اور جو ہدایت یافتہ ہیں وہ ان کو مزید ہدایت بخشتا ہے۔ میں وعدہ فرمایا ہے۔ اور بعض نے آخرت میں ہدایت الی الجنتہ مراد لی ہے۔ اسی طرح آیت

﴿وَإِنْ كُنَّا لَكَبِيرَةً إِلَّا عَلَى الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ﴾ (۲-۱۴۳) اور یہ بات (یعنی تحویلِ قبلہ لوگوں کو) گراں معلوم ہوئی مگر جن کو خدا نے ہدایت بخشی۔

میں بھی ہدایت سے توفیقِ الہی مراد ہے۔ جس کا ذکر کہ آیت۔ ﴿وَالَّذِينَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى﴾ میں پایا جاتا ہے۔

الْهُدَى اور هِدَايَةً اگرچہ لغتاً ہم معنی ہیں۔ لیکن قرآن پاک نے هُدًى کا لفظ خاص کر ہدایتِ الہی کے لیے استعمال کیا ہے اور کسی انسان کی طرف اس کی نسبت نہیں کی چنانچہ فرمایا: ﴿هُدًى لِلْمُتَّقِينَ﴾ (۲-۱) خدا سے ڈرنے والوں کی رہنما ہے۔ ﴿أُولَئِكَ عَلَى هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ﴾ (۲-۵) یہی لوگ اپنے پروردگار (کی طرف) سے ہدایت پر ہیں۔ ﴿هُدًى لِلنَّاسِ﴾

(۲-۱۵۸) لوگوں کے لیے رہنما ہے۔ ﴿فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِّنْ هُدًى فَمَنْ تَبَعَ هُدَايَ﴾ (۲-۳۸) جب

الشَّيْطَانُ أَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيلِ فَهُمْ لَا يَهْتَدُونَ ﴿٣٤﴾ اور شیطان نے ان کے اعمال انہیں آراستہ کر کے دکھائے ہیں۔ اور ان کو رستے سے روک رکھا ہے پس وہ رستے پر نہیں آتے۔

میں بھی لَا يَهْتَدُونَ سے تینوں قسم کی ہدایت کی نفی کی گئی ہے اور آیت :- ﴿وَإِنِّي لَعَفَّارٌ لِّمَن تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدَىٰ﴾ (۲۰-۸۲) اور جو توبہ کر لے اور ایمان لائے اور عمل نیک کرے۔ پھر سیدھے راستے پر چلے اس کو میں بخش دینے والا ہوں۔

میں اِهْتَدَىٰ کے معنی لگا تار ہدایت طلب کرنے اور اس میں سستی نہ کرنے اور دوبارہ معصیت کی طرف رجوع نہ کرنے کے ہیں۔ اور آیت :-

الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُمْ مُصِيبَةٌ قَالُوا هَذَا الَّذِي كُنَّا نَعْتَدُ ﴿٢﴾ اور یہی سیدھے راستے پر ہیں۔

میں مُهْتَدُونَ سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت الہی کو قبول کیا اور اس کے حصول کے لیے کوشش کی اور اس کے مطابق عمل بھی کیا چنانچہ انہی لوگوں کے متعلق فرمایا۔

﴿يَا أَيُّهَا السَّاجِرُ ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ إِنَّنَا لَمُهْتَدُونَ﴾ (۳۳-۳۹) اے جاوگر! اس عہد کے مطابق جو تیرے پروردگار نے تجھ سے کر رکھا ہے، اس سے دعا کر۔ بے شک ہم ہدایت یاب ہوں گے۔ اور

هٰذِي كَالْفَصْلِ خَاصَّ كَرَّاسِ جَانُورِ پر بولا جاتا ہے جو بیت اللہ کی طرف (ذبح کے لیے) بھیجا جائے۔ انخس نے اس کا واحد هَذِيَّةً لکھا ہے نہ کی طرح مادہ جانور پر بھی ہدی کا لفظ بولا جاتا ہے کیونکہ یہ مصدر ہے۔ جو بطور صفت کے

اور معجزے عنایت کیے تاکہ تم ہدایت حاصل کرو۔ ﴿فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِي وَلَا تَمْنَعْنِي عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ﴾ (۲-۱۵۰) سوان سے مت ڈرنا اور مجھ ہی سے ڈرتے رہنا اور یہ بھی مقصود ہے کہ میں تم کو اپنی تمام نعمتیں بخشوں اور یہ بھی کہ تم راہ راست پر چلو۔

﴿فَإِنْ أَسْلَمُوا فَقَدِ اهْتَدَوْا﴾ (۳-۲۰) اگر یہ لوگ اسلام لے آئیں تو بے شک ہدایت پالیں۔

﴿فَإِنْ أَمَنُوا بِمِثْلِ مَا آمَنْتُمْ بِهِ فَقَدِ اهْتَدَوْا﴾ (۲-۳۷) تو اگر یہ لوگ بھی اسی طرح ایمان لے آئیں جس طرح تم ایمان لے آئے ہو تو ہدایت یاب ہو جائیں۔

الْمُهْتَدَىٰ: اس شخص کو کہا جاتا ہے جو کسی عالم کی اقتداء کر رہا ہو چنانچہ آیت:

﴿أَوْ لَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ﴾ (۵-۱۰۴) بھلا اگر ان کے باپ دادا نہ تو کچھ جانتے ہوں اور نہ کسی کی پیروی کرتے ہوں۔ میں تنبیہ کی گئی ہے کہ نہ وہ خود عالم تھے اور نہ ہی کسی عالم کی اقتداء کرتے تھے۔ اور آیت:

﴿فَمَنْ اهْتَدَىٰ فَإِنَّمَا يَهْتَدِي لِنَفْسِهِ وَمَنْ ضَلَّ فَإِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا﴾ (۱۰-۱۰۸) تو جو کوئی ہدایت حاصل کرے تو ہدایت سے اپنے ہی حق میں بھلائی کرتا ہے اور جو گمراہی اختیار کرتا ہے تو گمراہی سے اپنا ہی نقصان کرتا ہے۔

میں اِهْتَدَاءَ کا لفظ طلب ہدایت، اقتداء اور تحری ہدایت تینوں کو شامل ہے۔ اسی طرح آیت: ﴿وَزَيَّنَّا لَهُمْ

آتے ہیں۔ چنانچہ اسی سے محاورہ ہے۔  
 هَدَيْتُ الْعُرْوَسَ إِلَى زَوْجِهَا: دلہن کو شوہر کے پاس  
 بھیجا۔ مَا أَحْسَنَ هَدِيَّةَ فُلَانٍ وَهَدِيَّةٌ: یعنی اس کی  
 سیرت کتنی اچھی ہے۔ فُلَانٌ يُهَادِي بَيْنَ اثْنَيْنِ:  
 فلاں دو آدمیوں پر سہارا لے کر ان کے درمیان چلتا ہے۔  
 تَهَادَتِ الْمَرْءَةُ: عورت کا قربانی کے جانور کی طرح  
 لڑکھڑا کر چلنا۔

### (ہارت)

آیت کریمہ: ﴿وَمَا أَنزَلَ بِبَابِلَ هَارُوتَ  
 وَمَارُوتَ﴾ (۱۰۲-۲) اور ان باتوں کے بھی (پیچھے لگ  
 گئے)۔ جو شہر بابل میں دو فرشتوں (یعنی) ہاروت ماروت  
 پر اترتی تھیں۔  
 کی تفسیر میں بعض مفسرین نے کہا ہے کہ ہاروت ماروت دو  
 فرشتوں کے نام ہیں اور بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ انسانوں  
 یا جنوں میں سے دو شیطانوں کے نام ہیں۔ اور یہ وَلَسَكَنَّ  
 الشَّيْطَانِينَ سے بدل البعض ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔  
 جیسا کہ الْقَوْمُ قَالُوا كَذَّابًا زَيْدٌ وَعَمْرُوٌّ زَيْدٌ اور عمرو قوم  
 سے بدل البعض ہونے کی بناء پر مرفوع ہیں۔

لغت میں الْهَرْتُ کے معنی منہ کی باجھوں کا کشادہ ہونا  
 کے ہیں اور اسی سے فَرَسٌ هَرِيْتُ الْبَيْدِ کا محاورہ  
 ہے یعنی وہ گھوڑا جس کی باجھیں وسیع ہوں اور اصل میں یہ  
 لفظ هَرَتْ (ض ن) ثَوْبُهُ سے مشتق ہے جس کے معنی  
 کپڑا پھاڑنے کے ہیں اور جس عورت کی شرمگاہ کثرت

استعمال ہوتا ہے۔ جو بطور صفت کے استعمال ہوتا ہے۔  
 قرآن پاک میں ہے۔  
 ﴿فَإِنْ أَحْصَرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ﴾  
 (۱۹۲-۲) اور اگر (رستے میں) روک لیے جاؤ۔ تو جیسی  
 قربانی میسر ہو (کر دو)  
 ﴿هَذَا بِلَغِ الْكَعْبَةِ﴾ (۹۵-۵) قربانی کعبہ پہنچائی  
 جائے ﴿وَالْهَدْيُ وَالْقَلَادُ﴾ (۹۷-۵) اور قربانی  
 کو اور ان جانوروں کو جن کے گلے میں پٹے بندھے  
 ہوں۔

﴿وَالْهَدْيُ مَعْكُوفًا﴾ (۲۸-۲۵) اور قربانیوں کو بھی  
 کہ اپنی جگہ پینچنے سے رکی رہیں۔  
 الْهَدِيَّةُ: ان تحائف کو کہا جاتا ہے جو ہم ایک دوسرے  
 کو پیش کرتے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔  
 ﴿وَإِنِّي مُرْسِلَةٌ إِلَيْهِمْ بِهَدِيَّةٍ﴾ (۳۵-۲۷) اور میں  
 ان کی طرف کچھ تحفہ بھیجتی ہوں۔  
 ﴿بَلْ أَنْتُمْ بِهَدِيَّتِكُمْ تَفْرَحُونَ﴾ (۳۶-۲۷) بلکہ  
 اپنے تحفے سے تم ہی خوش ہوتے ہو گے۔

الْمَهْدَى: طباق وغیرہ جس میں ہدیہ بھیجا جاتا ہے۔ اور  
 اس شخص کو جو بہت زیادہ تحائف پیش کرنے کا عادی ہو  
 اسے مَهْدَاءٌ کہا جاتا ہے۔ شاعر نے کہا ہے ﴿الطَّوِيلُ﴾  
 وَأَنْتَ مَهْدَاءُ الْخَنَانِ تَطْفُ الْحَشَا  
 بے شک تو فحش گو اور بد باطن ہے۔

الْهَدْيُ کے معنی قربانی کا جانور اور دلہن اور سیرت کے

① قاله حسیل بن عرفطہ بن فضلۃ الاسدی مخضرمی وای رسول اللہ ﷺ وروی عنه وهو ممن غیر علیہ السلام اسماء  
 هم فسماء حسینا (الاصابة رقم ۱۷۱۷) وعده ابو زید فی نوادره من شعراء الجاهلیة وذكره عنهم (کما فی لیبیا ۱۶۶:۳) هذا  
 الاسم حسنا وهو تحریف والبيت وجدته بعد الکلال فی الحيوان (۱۰۲:۳-۱۰۳) (ثم فی ۴۹۴) فی اربعة آيات وعجزة:  
 شديد السباب رافع الصوت غالبه۔ وفي المطبوع تطف الحشا بدل تطف النشا محرف والتصويب من المراجع ۱۲۔

قرآن پاک میں ہے:-

﴿فَإِذَا أَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَاءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ﴾

(۵۰۲) پھر جب ہم اس پر بارش برساتے ہیں۔ تو وہ

شاداب ہو جاتی ہے اور ابھر نکلتی ہے۔

﴿اِهْتَزَّتْ الْكُوكُوبُ فِيْ اِنْقِصَاصِهِ﴾: ستارے کا تیزی کے

ساتھ ٹوٹنا اور سِفِّ هَزْ هَازْ کے معنی پکدار تلوار کے ہیں

اور شفاف پانی کو مَاءُ هَزْ هَازْ کہا جاتا ہے اسی طرح هَزْ

هَزْ کے معنی سبک اور ہلکے پھلکے آدمی کے بھی آتے ہیں۔

### (هَزَع)

الْهَزْعُ کے معنی اندرونی طور پر کسی کا مذاق اڑانا

کے ہیں۔ اور کبھی یہ مذاق کی طرح گفتگو پر بھی بولا جاتا

ہے چنانچہ قصد مذاق اڑانے کے معنی میں فرمایا:-

﴿اتَّخَذُوْهَا هُزُوًا وَلِْعِبَابٍ﴾ (۵۸-۵) یہ اسے بھی

ہنسی اور کھیل بناتے ہیں۔

﴿وَإِذَا عَلِمَ مِنْ آيَاتِنَا شَيْئًا اتَّخَذَهَا هُزُوًا﴾

(۹۰-۳۵) اور جب ہماری کچھ آیتیں اسے معلوم ہوتی ہیں

تو ان کی ہنسی اڑاتا ہے۔

﴿وَإِذَا رَأَوْا الَّذِينَ كَفَرُوا انَّ يَتَّخِذُونَكَ إِلَّا

هُزُوًا﴾ (۱۳۶-۲۱) اور جب کافر تم کو دیکھتے ہیں تو تم

سے استہزاء کرتے ہیں۔

﴿اتَّخِذْنَا هُزُوًا﴾ (۶۷-۲) کیا تم ہم سے ہنسی کرتے

ہو۔ ﴿وَلَا تَتَّخِذُوا آيَاتِ اللَّهِ هُزُوًا﴾ (۲۳۱-۲)

اور خدا کے احکام کو ہنسی (اور کھیل) نہ بناؤ۔

اس آیت میں انہیں سخت سرزنش کی گئی ہے۔ اور ان کی

خباثت پر متنبہ کیا گیا ہے کہ آیات الہی کا علم اور ان کی

صداقت سے آگاہ ہونے کے بعد ان کا مذاق اڑاتے

جماع سے کشادہ ہو گئی ہو اسے اَلْهَرِيْتُ کہا جاتا ہے۔

### (هَرَعَ)

هَرَعَ وَآهَرَ کے معنی سختی اور خوف سے

ہانکنے اور (اور چلانے کے ہیں چنانچہ قرآن پاک میں

ہے: ﴿وَجَاءَ هَ قَوْمُهُ يُهَرِّعُونَ إِلَيْهِ﴾ (۷۸-۱۱)

اور لوط علیہ السلام کی قوم کے لوگ ان کے پاس بے تحاشہ

دوڑتے ہوئے آئے۔

اور هَرَعَ بِرُوحِهِ فَهَرَّعَ کے معنی نیزے کو سرعت کے

ساتھ کسی کی طرف سیدھا کرنے کے ہیں اور هَرِيعٌ تیز

اور چلا کر رونے والے کو کہتے ہیں۔

اَلْهَرِيعُ (ایضاً) وَالْهَرَعَةُ: چھوٹی جوں کو کہتے ہیں۔

### (هَرُونَ)

هَرُونَ: (موسیٰ علیہ السلام) کے بڑے بھائی کا نام

ہے (یہ اسم عجی ہے اور کلام عرب میں مادہ مستعمل نہیں ہے۔

### (هَزَن)

اَلْهَزَنُ کے معنی کسی چیز کو زور سے ہلانے کے

ہیں۔ جیسے هَزَزْتُ الرُّمَحَ: میں نے نیزہ زور سے ہلایا

اِهْتَزَّ: اعتعال اس کا مطاوع ہے۔ اس طرح هَزَزْتُ

فُلَانًا لِلْعَطَاءِ کے معنی ہیں ”میں نے فلاں کو بخشش کے

لیے حرکت دی“ یعنی وہ خوشی سے جھومنے لگا۔ قرآن میں

ہے:-

﴿وَهُزِّي إِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ﴾ (۲۵-۱۹) اور

کھجور کے تنے کو پکڑ کر اپنی طرف ہلاؤ۔

﴿فَلَمَّا رَأَاهَا تَهْتَزُّ كَأَنَّهَا جَانٌّ﴾ (۱۰-۲۷) جب

اسے دیکھا تو (اس طرح) ہل رہی تھی گویا سانپ ہے

اِهْتَزَّتِ النَّبَاتُ: نباتات (سبزے) کا ہلہلانا چنانچہ

يَعْمَهُونَ ﴿٢٠﴾ (ان) منافقوں سے خدا ہنسی کرتا ہے اور انہیں مہلت دیے جاتا ہے کہ شرارت و سرکشی میں پڑے بہک رہے ہیں۔

میں يَسْتَهْزِئُ کے معنی یا تو استہزاء کی سزا دینے کے ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے انہیں کچھ دیر تک مہلت دی اور پھر انہیں دفعۃً پکڑ لیا یہاں امہال کو استہزاء سے تعبیر کیا ہے۔ کیونکہ اس سے انہوں نے ہُزء کی طرح دھوکا کھایا پس یہ استدرج کے ہم معنی ہے جیسے فرمایا:

﴿سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُونَ﴾ (١٨٢-٤) ان کو بتدریج اس طرح سے پکڑیں گے کہ ان کو معلوم ہی نہ ہوگا۔

اور آیت کے معنی یہ ہیں کہ جس قدر وہ استہزاء اڑا رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے استہزاء سے باخبر ہے۔ تو گویا اللہ تعالیٰ بھی ان کا مذاق اڑا رہا ہے۔ مثلاً ایک شخص کسی کو دھوکا دے اور وہ اس کے دھوکے سے باخبر ہو کر اسے اطلاع دیے بغیر اس سے احتراز کرنے تو کہا جاتا ہے۔ خَدَعَهُ یعنی وہ اس کے دھوکے سے باخبر ہے۔

ایک حدیث میں ہے:- ﴿١٥٨﴾ (ان) المستهزئين في الدنيا يفتح لهم باب من الجنة فيسرعون نحوه فاذا انتهوا اليه سد عليهم) کہ جو لوگ دنیا میں دین الہی کا مذاق اڑاتے ہیں قیامت کے دن ان کے لیے جنت کا دروازہ کھولا جائے گا جب یہ لوگ اس میں داخل ہونے کے لیے سرپٹ دوڑ کر وہاں پہنچیں گے تو وہ دروازہ بند کر دیا جائے گا۔

ہیں۔ هَزِئْتُ بِهِ وَاسْتَهْزَأْتُ کے معنی کسی کا مذاق اڑانے کے ہیں اور اَلَا سْتَهْزِءُ: اصل میں طلب ہزاء کو کہتے ہیں۔ اگرچہ کبھی اس کے معنی مذاق اڑانا بھی آجاتے ہیں۔ جیسے اسْتِجَابَةُ کے اصل معنی طلب جواب کے ہیں۔ اور یہ اِجَابَةُ جواب دینا کے معنی میں استعمال ہوتا ہے) چنانچہ قرآن پاک میں ہے:-

﴿قُلْ اَبَالِلُكُمْ وَاٰتِيَهُمْ وَرَسُولُهُمْ كُنتُمْ تَسْتَهْزِءُ وَنَ﴾ (٩-٦٥) کہو کیا تم خدا اور اسکی آیتوں اور اس کے رسول سے ہنسی کرتے تھے۔

﴿وَحَاقَ بِهِمْ مَا كَانُوا بِهٖ يَسْتَهْزِءُ وَنَ﴾ (٨-١١) اور جس چیز کے ساتھ یہ استہزاء کیا کرتے تھے وہ ان کو گھیر لے گی۔

﴿وَمَا يَأْتِيهِمْ مِّنْ رَّسُولٍ اِلَّا كَانُوا بِهٖ يَسْتَهْزِءُ وَنَ﴾ (١١-١٥) اور ان کے پاس کوئی پیغمبر نہیں آتا تھا مگر اس کے ساتھ مذاق کرتے تھے۔

﴿اَنۡ اِذَا سَمِعْتُمۡ اٰیٰتِ اللّٰهِ يُخَفَّرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَءُ بِهَا﴾ (٣-١٣٠) کہ جب تم (کہیں) سنو کہ خدا کی آیتوں سے انکار ہو رہا ہے اور ان کی ہنسی اڑائی جاتی ہے۔ ﴿وَلَقَدْ اَسْتَهْزِئُ بِرُسُلِيۡ مِّنۡ قَبْلِكَ﴾ (٦-١٠) اور تم سے پہلے بھی پیغمبروں کے ساتھ تمخر ہوتے رہے۔ حقیقی معنی کے لحاظ سے استہزاء کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف صحیح نہیں ہے جیسا کہ لہو و لعب کا استعمال باری تعالیٰ کے حق میں جائز نہیں ہے لہذا آیت:

﴿اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهٖمْ وَيَمُدُّهُمْ فِی طُغْيَانِهِمْ

① مروی عن ابن عباس رضی اللہ عنہ وغیرہ من التابعین تحت تفسیر الآیة ﴿فَضْرَبَ بَيْنَهُمۡ بِسُوءِ بَاطِنِهِ فِیہِ الرَّحْمَۃُ وَظَآہِرِهِ مِّنۡ قَبْلِہِ الْعَذَابِ﴾ (الحدید)

اور فَاَقْرَءَ کی طرح هَاَزِمَةٌ بھی بڑی مصیبت کو کہتے ہیں۔ چنانچہ محاورہ ہے۔ اَصَابَتْهُ هَاَزِمَةُ الدَّهْرِ: اسے بڑی مصیبت پہنچی۔

هَزَمَ الرَّعْدُ: گرج کی آواز کا شکستہ ہونا۔

الْمِهْزَامُ: ایک لکڑی جس کے سرے پر آگ لگا کر بچے کھیلے ہیں۔ گویا وہ اس سے دوسرے لڑکوں کو ہزیمت دیتے ہیں اور کہنے (وئی) فُحْصَ کے متعلق هَزَمَ وَاهْتَزَمَ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔

### (هَشَش)

الْهَشَشُ: (ض) کے معنی بھی هَزَّ کی طرح کسی چیز کو حرکت دینے کے ہیں۔ لیکن یہ کسی نرم چیز کو حرکت دینے پر بولا جاتا ہے۔ جیسے هَشَّ الْوَرَقُ: درخت سے پتے جھاڑنا قرآن پاک میں ہیں۔

﴿وَأَهَشُّ بِهَا عَلَى عَنَمِي﴾ (۲۰-۱۸) اور اپنی بکریوں کے لیے پتے جھاڑتا ہوں۔

هَشَّ الرَّغِيفُ فِي التَّنَوُّرِ: روٹی کا تنور میں پھول کر نرم ہو جانا۔

نَاقَةٌ هَشُوشٌ: نرم مزاج اور بہت دودھ دینے والی اونٹنی اور وہ گھوڑا جسے بہت زیادہ پسینہ آئے۔ اسے بھی هَشُوشٌ کہا جاتا ہے۔ اس کے بالقابل جس گھوڑے سے پسینہ نہ آئے اسے صَلُودٌ کہا جاتا ہے۔ رَجُلٌ هَشُّ الْوَجْهِ: ہشاش بشاش آدمی۔

اور هَشَشْتُ وَهَشَّ لِلْمَعْرُوفِ (ض): سخاوت کے وقت خوش ہونا۔

فُلَانٌ ذُو هَشَاشٍ: نیک خواورنجی مرد۔

چنانچہ آیت: ﴿فَالْيَوْمَ الَّذِينَ آمَنُوا مِنَ الْكُفَّارِ يَضْحَكُونَ﴾ (۸۳-۸۴) تو آج مومن کافروں سے ہنسی کریں گے۔

میں بعض کے نزدیک خشک سے یہی معنی مراد ہیں اور آیت ﴿سَخَّرَ اللَّهُ مِنْهُمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ﴾ (۹-۷۹) خدا ان پر ہنستا ہے اور ان کے لیے تکلیف دینے والا عذاب تیار ہے۔ میں بھی اس قسم کی تاویل ہو سکتی ہے۔

### (هَزَل)

الْهَزَلُ کے معنی لا حاصل اور بے نتیجہ بات کے ہیں گویا وہ هُزَال (لاغری) ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔ ﴿إِنَّهُ لَقَوْلٌ فَضْلٌ وَمَا هُوَ بِالْهَزَلِ﴾ (۸۶-۱۳۱) کہ یہ کلام (حق کو باطل سے) جدا کرنے والی ہے اور بیہودہ بات نہیں۔

### (هَزَم)

الْهَزَمُ کے اصل معنی کسی خشک چیز کو دبا کر توڑ دینے کے ہیں۔ خشک اور پرانے مشکیزہ کو دبا کر توڑ ڈالنے یا تربوز، گکڑی وغیرہ کے توڑنے پر هَزَم کا لفظ بولا جاتا ہے اور اسی سے ہزیمت (بمعنی شکست) ہے جس طرح حَطْمٌ يَأْكُسِرُ کا لفظ (مجازاً) شکست کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اسی طرح هَزَم کا لفظ بھی اس معنی میں بولا جاتا ہے۔

قرآن پاک میں ہے۔ ﴿فَهَزَمُوهُمْ بِإِذْنِ اللَّهِ﴾ تو طاووت علیہ السلام کی فوج نے خدا کے حکم سے ان کو ہزیمت دی۔ (۲-۲۵۱) ﴿جُنِدُمْ مَا هُنَالِكَ مَهْزُومٌ مِنَ الْأَحْزَابِ﴾ (۳۸-۱۱) یہاں شکست کھائے ہوئے گروہوں میں سے یہ بھی ایک لشکر ہے۔ ❶



## (۵ ش م)

الْهَشْمُ: اصل میں سوکھی یا نرم چیز کے توڑنے پر بولا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:-

﴿فَأَصْبَحَ هَشِيمًا تَذَرُوهُ الرِّيحُ﴾ (۱۸-۲۵) پھر وہ چورا چورا ہو گئی کہ ہوائیں اسے اڑاتی پھرتی ہیں۔

﴿فَكَانُوا كَهَشِيمِ الْمُحْتَظِرِ﴾ (۵۳-۳۱) تو وہ ایسے ہو گئی جیسے ہار والے کی سوکھی اور ٹوٹی ہوئی ہار۔ اور ہڈی وغیرہ

(سخت چیز) کے توڑنے پر ہَشْمُ بولا جاتا ہے۔ اور اسی سے هَشْمَتُ الْخَبَزِ کا محاورہ ہے۔ جس کے معنی سوکھی روٹی کو

توڑ کر تھینے کے ہیں۔ شاعر نے کہا ہے ❶

(۲۵۳) عَمَرُو الْعَلَاءَ هَشْمَ الثَّرِيدِ لِقَوْمِهِ  
وَرِجَالٌ مَكَّةَ مُسْتِنُونَ عِجَافٌ

عمر و العلا نے خشک سالی کے زمانہ میں اپنی قوم کو تھین کھلایا جب کہ مکہ مکرمہ کے سردار قحط سالی کی وجہ سے دبلے ہو رہے تھے۔

هَاشِمَةٌ: سر کا زخم جس سے کھوپڑی کی ہڈی ٹوٹ جائے۔ اِهْتَشَمَ كُلُّ مَا فِي صَدْعِ النَّاقَةِ اونٹنی کے پستانوں سے تمام دودھ نچوڑ لیا۔ محاورہ ہے۔

تَهَشَّمَ فُلَانٌ عَلَى فُلَانٍ: کسی پر مہربان ہونا۔

## (۵ ض م)

الْهَضْمُ: (ض) کے اصلی معنی کسی نرم چیز کو

کچلنا کے ہیں۔ محاورہ ہے۔ هَضَمْتُهُ فَأَنْهَضَمَ میں نے اسے توڑا چنانچہ وہ ٹوٹ گیا۔ اور باریک سر کنڈا جسے بانسری کی طرح بجایا جاتا ہے اسے مَهْزُومَةٌ کہتے ہیں اور اسی سے نازک بانسری کو مِزْ مَارٌ مَهْضَمٌ کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

وَنَخْلٍ طَلَعَهَا هَضِيمٌ: اور کھجوریں جن کے خوشے لطیف اور نازک ہونے کی وجہ سے کچلے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔

الْهَاضُومُ: کھانا ہضم کرنے کا چورن بَطْنٌ هَضُومٌ پیکا ہوا پیٹ۔ كَشَحٌ مَهْضَمٌ: تیلی کمر۔

إِمْرَأَةٌ هَضِيمَةٌ الْكُشْحَيْنِ: تیلی کمر والی عورت اور استعارہ کے طور پر هَضْمٌ: بمعنی ظلم بھی آتا ہے۔ چنانچہ

قرآن پاک میں ہے۔  
﴿فَلَا يَخَافُونَ ظُلْمًا وَلَا هَضْمًا﴾ (۲۰-۱۱۲) تو ان کو ظلم کا خوف ہوگا اور نہ نقصان کا۔

## (۵ ط ع)

هَطَعَ الرَّجُلُ بَبْصَرِهِ کے معنی ہیں: اس نے نظر جما کر دیکھا اور گردن اٹھا کر چلنے والے اونٹ کو بَعِيرٌ مَهْطَعٌ کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿مُهْطَعِينَ مَقْبَعِي رُؤْسِهِمْ لَا يَرْتَدُّ إِلَيْهِمْ طَرْفُهُمْ﴾ (۱۳-۲۳) (اور لوگ) سر اٹھائے ہوئے

❶ عمرو العلاء ہاشم بن مناف جد رسول اللہ ﷺ ویکنی ابانضلة راجع الطبقات (۱: ۴۳) والاشتقاق والبدایہ والنہایہ (۲: ۳۵۲) ورسائل جاحظ ۶۸ ونوادری زید (۱۶۷) وصبح الاعشی (۱: ۱۵۸) والبخلۃ (۲۳۰) والخلاف فی القاتل نسبہ بعضهم الی ابن الزبیری۔ راجع السیرۃ (۱: ۹۴) والعینی (۱: ۱۴۰) وابن ابی الحدید (۳۰/۴۵۳) وامالی المرتضیٰ (۱: ۱۵۸/۲۶۹) وفی اللسان (هشم) منسوب الی بنت ہاشم وفی الکامل (۲۱۶) بغير عزو وفیہ وعمر والذی بدل عمر والعلاء وقال الصواب عمرو العلی والشرط الثانی فی البحر (۵: ۳۰۰) وفی تاریخ الطبری (۲: ۱۲) والمرزبانۃ ۳ قالہ مطرو وبن کعب الخزاعی ۱۲۔

کے پاس فرشتے آئیں۔

﴿هَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا السَّاعَةَ﴾ (۲۶-۲۳) یہ صرف

اس بات کے منتظر ہیں کہ قیامت.....

﴿هَلْ يُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ﴾ (۷-۱۳۷)

یہ جیسے عمل کرتے ہیں ویسا ہی ان کو بدلہ ملے گا۔

﴿هَلْ هَذَا إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ﴾ (۳۱-۳) یہ شخص (کچھ

بھی) نہیں ہے مگر تمہارے جیسا آدمی ہے۔

میں اللہ تعالیٰ کی قدرت پر تنبیہ اور اس کی سطوت سے

تخویف کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے۔

## (هَلْ)

الْهَلَالُ: مہینے کی پہلی اور دوسری تاریخ کے

چاند کو کہتے ہیں۔ پھر اس کے بعد اسے قمر کہا جاتا ہے اس

کی جمع اہلۃ ہے چنانچہ قرآن پاک میں ہے:-

﴿يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْاِهْلَةِ قُلْ هِيَ مَوَاقِيتُ

لِلنَّاسِ وَالْحَجَّ﴾ (۲-۱۸۹) (۱-۷) محمدؐ لوگ تم سے

نئے چاند کے بارے میں دریافت کرتے ہیں (کہ گھنٹا

بڑھتا کیوں ہے) کہدو کہ وہ لوگوں کے (کاموں کی)

میعادیں اور حج کے وقت معلوم ہونے کا ذریعہ ہے۔ یعنی

ہلال کے طلوع ہونے اور اس کے کم و بیش ہونے کی حکمت

پوچھتے ہیں۔

تشبیہ کے طور پر ہلال کا لفظ مختلف معنوں میں استعمال

ہوتا ہے۔ (۱) شکار کرنے کا نیزہ جو ہلال کی طرح دو شاخ

کا ہوتا ہے۔ (۲) ایک قسم کا زہریلا سانپ (۳) کنویں

کے تلے میں تھوڑا سا پانی جو گول دائرے کی شکل پر ہوتا

ہے۔ (۴) چکی کا کنارہ۔ (جب کہ ٹوٹ جائے)

أَهْلُ الْهَلَالِ کے معنی چاند نظر آنے کے ہیں۔ اور

(میدان قیامت کی طرف) دوڑ رہے ہوں گے۔ ان کی

نگاہیں ان کی طرف لوٹ نہ سکیں گی۔

﴿مُهْطِعِينَ إِلَى الدَّاعِ﴾ (۵۴-۸) اس بلانے

والے کی طرف دوڑتے جاتے ہوں گے۔

## (هَلْ)

هَلْ: یہ حرف استخبار اور کبھی استفہام کے

لیے آتا ہے۔ جیسے قرآن پاک میں ہے:-

﴿قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوهُ لَنَا﴾

(۲-۱۳۹) کہدو کہ تمہارے پاس کوئی سند ہے (اگر ہے)

تو اسے ہمارے سامنے نکالو۔

اور کبھی تنبیہ، تکلیف یا نفی کے لیے چنانچہ آیات:- ﴿هَلْ

نُحِسُّ مِنْهُمْ مِنْ أَحَدٍ أَوْ تَسْمَعُ لَهُمْ رِكْزًا﴾

(۱۹-۹۸) بھلا تم ان میں سے کسی کو دیکھتے ہو یا (کہیں)

ان کی بھگت سنتے ہو۔

﴿هَلْ تَعْلَمُ لَهُ سَمِيًّا﴾ (۱۹-۶۵) بھلا تم اس کا کوئی

ہم نام جانتے ہو۔

﴿فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرَى مِنْ فُطُورٍ﴾

(۶۷-۳) ذرا آنکھ اٹھا کر دیکھو کیا تجھے (آسمان میں)

کوئی شگاف نظر آتا ہے؟

میں نفی کے معنی پائے جاتے ہیں۔ اور آیات:-

﴿هَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا أَنْ يَأْتِيَهُمُ اللَّهُ فُجْئًا ظُلُمٌ مِّنَ

الْغَمَامِ وَالْمَلَائِكَةُ﴾ (۲-۲۱) کیا یہ لوگ اسی بات

کے منتظر ہیں کہ ان پر خدا (کا عذاب) بادل کے

ساتھ انوں میں نازل ہو۔ اور فرشتے بھی اتر آئیں۔

﴿هَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا أَنْ تَأْتِيَهُمُ الْمَلَائِكَةُ﴾

(۲-۱۵۸) یہ اس کے سوا اور کس بات کے منتظر ہیں کہ ان

جیسا کہ طعام (کھانا) کے خراب ہونے پر هَلَالٌ الطَّعَامُ بولا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَيُهْلِكُ النَّحْرَ وَالنَّسْلَ﴾ (۲-۲۰۵) اور کھیتی کو (برباد) اور (انسانوں اور حیوانوں کی نسل کو نابود کر دے۔ موت<sup>(۲)</sup> کے معنی میں جیسے فرمایا: ﴿إِنْ أَمَرُوا هَلْكَ﴾ (۳-۱۷۷) اگر کوئی ایسا مرد مرجائے۔

اور قرآن پاک نے کفار کے قول کی حکایت بیان کرتے ہوئے فرمایا: ﴿وَمَا يُهْلِكُنَا إِلَّا الدَّهْرُ﴾ (۳۵-۲۳) اور ہمیں تو زمانہ ماردیتا ہے۔

قرآن پاک میں ہلاکت کا لفظ بری موت کے لیے استعمال ہوا ہے صرف آیت (۲-۲۵) اور آیت ﴿وَلَقَدْ جَاءَكُمْ يُوسُفُ مِنْ قَبْلِ الْبَيِّنَاتِ فَمَا زِلْتُمْ فِي شَكٍّ مِمَّا جَاءَكُمْ بِهِ حَتَّىٰ إِذَا هَلَكَ قُلْتُمْ لَن يَبْعَثَ اللَّهُ مِنْ بَعْدِهِ رَسُولًا﴾ (۳۰-۳۳) اور پہلے یوسف (علیہ السلام) بھی تمہارے پاس نشانیاں لے کر آئے تھے۔ تو جو وہ لائے تھے اس سے تم ہمیشہ شک ہی میں رہے۔ یہاں تک کہ جب وہ فوت ہو گئے تو تم کہنے لگے کہ خدا اس کے بعد کوئی پیغمبر نہیں بھیجے گا۔

میں موت کے معنی مراد ہیں۔ چہارم<sup>(۴)</sup> یہ کہ کسی چیز کا اس دنیا سے کلی طور پر معدوم ہو جانا۔ اور یہی معنی فنا کے ہیں جس کی طرف کہ آیت: ﴿كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ﴾ (۲۸-۸۸) اس کی ذات (پاک) کے سوا ہر چیز فنا ہونے والی ہے۔

میں اشارہ پایا جاتا ہے۔ عذاب، خوف اور فقر پر بھی ہلاکت کا لفظ بولا جاتا ہے۔ چنانچہ آیات:-

﴿وَمَا يُهْلِكُونَ إِلَّا أَنْفُسُهُمْ وَمَا يَشْعُرُونَ﴾

اِسْتَهْلَ کے معنی روت ہلال ہیں۔ لیکن کبھی استعمال بمعنی ہلال بھی آ جاتا ہے جیسے اِسْتَجَابَ بمعنی اَجَابَ اِلَهَالٌ کے معنی چاند کے نظر آنے پر آواز بلند کرنے کے ہیں۔ پھر یہ لفظ عام آواز بلند کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور اسی سے تشبیہاً اَهْلَ الصَّبِيِّ کا محاورہ ہے جس کے معنی ہیں بچے نے آواز بلند کی اور آیت۔

﴿وَمَا اِهْلٌ لِّغَيْرِ اللَّهِ﴾ (۲-۱۷۳) اور جس چیز پر خدا کے سوا کسی اور کا نام پکارا جائے۔

کے معنی ہیں کہ جس پر غیر اللہ کا نام پکارا جائے یعنی جو بتوں کے نام پر ذبح کیا گیا ہو۔

بعض نے کہا ہے کہ اِهْلَالٌ اور تَهْلِيلٌ کے معنی لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ کہنے کے ہیں۔ اور یہ لفظ جملہ مخفف ہے۔ جیسے کہ تَبَسَّمَلْ وَبَسْمَلَةٌ اور نَحْوُ قُلْ وَحَوَّلَهُ کے معنی بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ اور لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ کہنے کے ہیں اور اسی سے اِهْلَالٌ بِالْحَجِّ ہے جس کے معنی بلند آواز سے تلبیہ کہنے کے ہیں اور باریک جھر جھرے کپڑے کو ثواب مُهْلَهْلٌ کہا جاتا ہے اور اسی سے شعر مُهْلَهْلٌ ہے جس کے معنی عمدہ شعر کے ہیں۔

## (ہل ک)

اَلْهَلَكَ: یہ کئی طرح پر استعمال ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ کسی چیز کا اپنے پاس سے جاتے رہنا خواہ وہ دوسرے کے پاس موجود ہو جیسے فرمایا:-

﴿هَلَكَ عَنِّي سُلْطَانِيَّةٌ﴾ (۶۹-۲۹) ہائے! میری سلطنت خاک میں مل گئی۔

دوسرے<sup>(۲)</sup> یہ کہ کسی چیز میں خرابی اور تعبیر پیدا ہو جانا۔

﴿وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ﴾ (۲-۱۹۵)

اور اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔

اور امراءٌ ؕ هَلُوكَ کے معنی نازک خرام عورت کے ہیں۔  
گویا وہ چلتے وقت زمین پر گری پڑتی ہے شاعر نے کہا ہے  
﴿الطویل﴾

(۲۵۴) مَرِيضَاتُ أَوْيَاتِ التَّهَادِي كَأَنَّمَا

تَحَافٌ عَلَى أَحْسَانِهَا أَنْ تَقْطَعَا

وہ عورتوں کے درمیان مریض کی طرح لڑکھڑا کر اس انداز  
سے چلتی ہے گویا اسے اپنی کمریا امتزویوں کے کٹ جانے کا  
اندیشہ ہے۔

اور کنایہ کے طور پر هَلُوكَ کا بدکار عورت کو کبھی کہتے ہیں  
کیونکہ وہ مائل ہو کر خراماں خراماں چلتی ہے۔

الْهَالِكِيُّ اصل میں یہ هَالِكَةُ قبیلہ کے ایک آہنگر کا نام تھا  
پھر اس مناسبت سے ہر آہنگر کو هَالِكِيُّ کہا جانے لگا ہے۔

الْهَلُكُ: (ایضاً) برباد ہونے والی چیز۔

### (ه ل م)

هَلَمَّ: (اسم فعل) کے معنی کسی چیز کی طرف

بلانے کے ہیں۔ بعض کے نزدیک اس کی اصل هَالَمَّ

ہے۔ اور یہ لَمَمْتُ الشَّيْءَ سے مشتق ہے۔ جس کے

معنی اصلاح کرنے کے ہیں۔ هَا کا الف حذف ہونے

کے بعد هَلَمَّ بن گیا ہے اور بعض کہتے ہیں کہ اس کی اصل

هَلَّ اَلَمْ ہے گویا یہ اصل میں هَلَّ لَكَ فِی كَذَا اَمَةٌ.....

(بمعنی قصہ) کا مخفف ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

(۲۶-۶) مگر (ان باتوں سے) اپنے آپ ہی کو ہلاک

کرتے ہیں اور (اس سے) بے خبر ہیں۔

﴿وَكَمْ أَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ﴾ (۱۹-۷۴) اور ہم

نے ان سے پہلے بہت سی امتیں ہلاک کر دیں۔ ﴿وَكَمْ

مِّنْ قَرْنٍ أَهْلَكْنَاهَا﴾ (۷۴-۴) اور کتنی ہی بستیاں ہیں

کہ ہم نے تباہ کر ڈالیں۔

﴿فَكَأَيِّنْ مِّنْ قَرْنٍ أَهْلَكْنَاهَا﴾ (۴۳-۴۵) اور

بہت سی بستیاں ہیں کہ ہم نے ان کو تباہ کر ڈالا۔

﴿أَتَهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَهَاءُ مِنَّا﴾ (۷-۱۵۵) کیا

تو اس فعل کی سزا میں جو ہم سے بے عقل لوگوں نے کیا ہے

ہمیں ہلاک کر دے گا؟

میں بھی یہی معنی مراد ہیں۔ اور آیت:-

﴿فَهَلْ يُهْلِكُ إِلَّا الْقَوْمَ الْفَاسِقُونَ﴾ (۴۶-۵)

سوا ب وہی ہلاک ہوں گے۔ جو نافرمان تھے۔

میں ہلاکت سے ہلاکت کبریٰ یعنی عذاب مراد ہے۔ جس

کے متعلق آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا (۱۵۹)

لَا شَرَّ كَشَرٍ بَعْدَهُ النَّارُ کہ اس شر کے برابر کوئی شر

نہیں ہے جس کے بعد دوزخ کا سامنا ہو۔ اور فرمایا:-

﴿وَمَا شَهِدْنَا مَهْلِكَ أَهْلِهِ﴾ (۲۷-۴۹) اور ہم تو

اس کے گھر والوں کے موقع ہلاکت پر گئے ہی نہیں۔

الْهَلُكُ کے معنی ہلاک کرنے کے ہیں اور جو چیز مُودِي

إِلَى الْهَلَاكِ یعنی موجب ہلاکت ہو اسے تَهْلُكَةٌ کہا

جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:-

① فی الحماصة لابی تمام (۲: ۹۳) قاله مسلم بن الوليد وفي المزوقي رقم (۸۴۹۸) "آخر" وفي المحاضرات للمؤلف

(۲: ۱۳۹) ويستحق للسعدی ای لرجل من بنی سعد وبعده: تسبب انسياب الايم اخصره الندي۔ نرفع من اعطافه ماتر

فعما۔ والبيتان في الحيوان (۴: ۲۵۹) وفي روايته مريضة اثناء التهادي ويرفع من اطرافه بدل نرفع من اعطافه والبيت في

مجموعة المعاني (۲۵۹)۔

نے پیغمبر (خدا کے جلاوطن کرنے کا عزم مصمم کر لیا)  
 ﴿وَهَمَّتْ كُلُّ أُمَّةٍ بِرَسُولِهِمْ﴾ (۵-۴۰) اور ہر  
 امت نے اپنے پیغمبر کے بارے میں یہی قصد کیا کہ.....  
 أَهْمَنِي كَذَا: مجھے فلاں چیز نے بے چین کر دیا۔ چنانچہ  
 قرآن پاک میں ہے: ﴿وَطَائِفَةٌ قَدْ أَهَمَّتْهُمْ  
 أَنْفُسُهُمْ﴾ (۱۵۴-۳) اور کچھ لوگ جن کو جان کے لالے  
 پڑ رہے تھے۔ محاورہ ہے: هَذَا رَجُلٌ هَمُّكَ مِنْ رَجُلٍ  
 أَوْ هَمَّتْكَ مِنْ رَجُلٍ: وہ آدمی تجھے بس کرتا ہے (بمعنی  
 نَاهِيكَ) الْهَوَامُ حشرات الارض یعنی کیڑے مکوڑے۔  
 رَجُلٌ هَمٌّ: بیز فروت، مونٹِ ہِمَّةٌ گویا کبرئی نے  
 اسے پکھلا دیا ہے۔

### (۵۵ د)

هَمَدَتِ النَّارُ کے معنی آگ کا بجھ جانا کے  
 ہیں۔ اور خشک اور بجز زمین کو اَرْضٌ هَامِدَةٌ کہتے ہیں  
 اور نَبَاتٌ هَامِدَةٌ کے معنی خشک گھاس کے ہیں۔ قرآن  
 پاک میں ہے: ﴿وَتَرَى الْأَرْضَ هَامِدَةً﴾  
 (۵-۲۲) اور (اے دیکھنے والے) تو دیکھتا ہے (کہ ایک  
 وقت میں) زمین خشک (پڑی ہوئی ہے)  
 الْإِهْمَادُ (افعال) کے معنی کسی جگہ اقامت کرنے کے ہیں  
 گویا وہ سکونت پذیر ہو کر بجھ گیا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اہماد  
 کے معنی سرعت رفتاری کے بھی آتے ہیں۔ اگر یہ قول صحیح ہو تو  
 یہ لفظ اشکاء کی طرح (اضداد سے) ہوگا۔ جو کبھی شکایت  
 کرنے اور کبھی ازالہ شکایت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

### (۵۵ ر)

الْهَمْرُ (ض) کے معنی آنسو یا پانی بہا دینے

﴿وَالْفَآئِلِينَ لَا خَوَانِهِمْ هَلُمَّ إِلَيْنَا﴾ (۱۸-۳۳)  
 اور اپنے بھائیوں سے کہتے ہیں کہ ہمارے پاس چلے آؤ۔  
 بعض اسے فعل غیر متصرف مانتے ہیں اور شنیع، جمع (نیز  
 تذکیر و تانیث) میں اسے ایک ہی حالت پر رہنے دیتے ہیں  
 اور قرآن پاک بھی اسی کے مطابق نازل ہوا ہے۔ اور بعض  
 فعل متصرف مانتے ہیں (اور آخر میں ضمائر کا الحاق کرتے  
 ہیں جیسے) هَلُمَّا، هَلُمَّوَا، هَلِّمِي، هَلِّمُنَّ۔

### (۵۵ م)

الْهَمُّ کے معنی پکھلا دینے والے غم کے ہیں اور  
 یہ هَمَمْتُ الشَّخْمَ فَإِنَّهُمْ کے محاورہ سے ماخوذ ہے  
 جس کے معنی ہیں: میں نے چربی کو پکھلایا چنانچہ وہ پکھل  
 گئی اصل میں هَمَّ کے معنی اس ارادہ کے ہیں جو ابھی دل  
 ہی میں ہو۔ شاعر نے کہا ہے۔ ❶

(۲۵۵) وَهَمُّكَ مَا لَمْ تُمْضِهِ لَكَ مُنْصِبٌ  
 اور جب تک تو اپنے ارادے کو پورا نہ کرے وہ تجھے بے  
 چین رکھے گا۔ قرآن پاک میں ہے:۔  
 ﴿إِذْ هَمَّ قَوْمٌ أَنْ يَنْسُطُوا﴾ (۱۱-۵) جب ایک  
 جماعت نے ارادہ لیا کہ تم پر دست درازی کریں۔

﴿وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهِ وَهَمَّ بِهَا﴾ (۲۴-۱۲) اور اس  
 عورت نے ان کا قصد کیا اور وہ اس کا قصد کر لیتے (اگر)  
 ﴿إِذْ هَمَّتْ طَائِفَتٌ مِنْكُمْ أَنْ تَفْشَلَا﴾ (۱۲۲-۳)  
 اس وقت تم میں سے دو جماعتوں نے جی چھوڑ دینا چاہا۔  
 ﴿لَهَمَّتْ طَائِفَةٌ مِنْهُمْ﴾ (۱۱۳-۴) تو ان میں سے  
 ایک جماعت..... قصد کر ہی چکی تھی۔

﴿وَهُمُّوا بِإِخْرَاجِ الرَّسُولِ﴾ (۱۳-۹) اور انہوں

اشارتیں کرنے والے مغلخور کی خرابی ہے۔

شاعر نے کہا ہے ۵ (البسط)

(۳۵۶) وَإِنْ اغْتَبْتُ فَأَنْتَ الْهَامِزُ اللَّمَزَةُ

اگر غیبت کی جائے تو تو طعن آمیز اشارتیں کرنے والا بدگو ہے۔

قرآن میں ہے۔ ﴿وَمِنْ هَمَزَاتِ الشَّيْطَانِ﴾ (۲۳-۹۷) کہو اے پروردگار میں شیاطین کے وساوس سے پناہ مانگتا ہوں۔

### (ہ م س)

الْهَمْسُ کے معنی خفی آواز کے ہیں اور  
هَمْسُ الْأَقْدَامِ کے معنی ہیں پاؤں کی ہلکی سی آہٹ۔  
قرآن میں ہے: ﴿فَلَا تَسْمَعْ إِلَّا هَمْسًا﴾  
(۲۰-۱۰۸) تو تم خفی آواز کے سوا کوئی آواز نہ سنو گے۔

### (هنا)

هنا (یہاں) یہ زمانہ اور جگہ قریب کی طرف  
اشارہ کرنے کے آتا ہے۔ لیکن عموماً جگہ کی طرف اشارہ  
کے لیے استعمال ہوتا ہے اور ذا، ذاك، ذالك، کی طرح  
هنا هناك وهناك تینوں طرح بولا جاتا ہے۔ قرآن  
میں ہے: ﴿جُنْدًا مَا هُنَا لِكَ مَهْزُومٍ مِنَ الْآحْزَابِ﴾  
(۳۸-۱۱) یہاں شکست کھائے ہوئے گروہوں میں سے  
یہ بھی ایک لشکر ہے۔

﴿إِنَّا هُنَا فُجِدُونَ﴾ (۵-۲۳) ہم یہیں بیٹھے رہیں

کے ہیں۔ جیسے هَمْرَةٌ فَانْهَمَرَا: اس نے پانی بہایا چنانچہ  
وہ بہہ پڑا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿فَفَتَحْنَا أَبْوَابَ السَّمَاءِ بِمَاءٍ مُنْهَمِرٍ﴾ (۵۳-۱۱)

پس ہم نے زور کے مینہ سے آسمان کے دہانے کھول دیے۔

هَمْرٌ مَا فِي الضَّرْعِ: تھنوں سے تمام دودھ دودھ لینا۔  
هَمْرَ الرَّجُلِ فِي الْكَلَامِ: باتوں میں یہ جانا (یعنی  
بکواس کرنا) فَلَانِ يُهَامِرُ الشَّيْءَ کوئی چیز مقدار سے  
زیادہ لے لینا۔ چٹ کر جانا اور اسی سے محاورہ ہے۔

هَمْرَ لَهُ مِنْ مَالِهِ: اس نے اسے بہت زیادہ مال دیا۔  
الْهَمِيرَةُ: بہت بوڑھی عورت۔

### (ن م ن)

الْهَمْزُ کے اصل معنی کسی چیز کو دبا کر نچوڑنے  
کے ہیں۔ چنانچہ محاورہ ہے: هَمَزْتُ الشَّيْءَ فِي كَيْفِي  
میں نے فلاں چیز کو اپنی پھیلی میں دبا کر نچوڑا اور اس سے  
حرف ہمزہ ہے جو کہ زبان کو جھٹکا دے کر پڑھا جاتا ہے  
اور همز کے معنی غیبت کرنا بھی آتے ہیں۔ قرآن پاک  
میں ہے: ﴿هَمَازٌ مَّشَاءً بَنِينٍ﴾ (۶۸-۱۱) طعن  
آمیز اشارتیں کرنے والا، چغلیاں لئے پھرنے والا۔ اور  
هَامِزٌ وَهَمْزَةٌ وَهَمَازٌ کے معنی عیب چینی کرنے والا  
کے ہیں جو قرآن پاک میں ہے:-

﴿وَيُلْ لِكُلِّ هُمْزَةٍ لُّمَزَةٍ﴾ (۱۰۴-۱) ہر طعن آمیز

① البیت لریباد الاعجم و صدره: وقدنی بودی اذا الاقتنی..... وفی رواية وان اغیب علی البناء للمجهول وفی رواية اللسان (همز) والطبری (۲۹۹:۳۰) وان تعنیبت وکت بدل فانت والبیبت من شواهد ابی عبیدہ فی مجازہ رقم (۲۹۴) وفی روايتہ۔ اذا لقیبتک نبیدی لسی مکاشرہ۔ وان اغیت فانت العائب الممزہ۔ راجع ایضا شواہد الکشاف (۴۰) واللسان (همز) والطبری (۱۰۶-۱۰) (۲۹۹/۳۰) والسجواندی (۲۰۱:۱) واصلاح یعقوب (۴۲۸) واعراب ثلاثین (۱۸۰) وزیاد الاعجم هو زیاد بن سلیمان الاعجم ویکنی ابا امامہ له ترجمۃ فی المؤلف (۱۳۱) والاعغانی (۹۸-۱۴)

﴿۷۷-۷۳﴾ جو (عمل) تم کرتے رہے تھے اس کے صلے میں مزے سے کھاؤ اور پیو۔

الْهِنَاءُ: ایک قسم کا تارکول جو (خارش) اونٹ پر (ملا جاتا ہے۔ چنانچہ محاورہ ہے: هَنَاتُ الْإِبِلِ فَهِيَ مَهْنُوَّةٌ یعنی میں نے اونٹ پر تارکول ملا۔

### (ه و د)

الْهُودُ کے معنی نرمی کے ساتھ رجوع کرنا کے ہیں اور اسی سے التَّهْوِيدُ (تفصیل) ہے جس کے معنی رنگینے کے ہیں۔ لیکن عرف میں هُودٌ بمعنی تَوْبَةٌ استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے: ﴿إِنَّا هُذَنَّا إِلَيْكَ﴾ (۷-۱۵۶) ہم تیری طرف رجوع کر چکے۔ بعض نے کہا ہے لفظ یہودی بھی إِنَّا هُذَنَّا إِلَيْكَ سے ماخوذ ہے۔ یہ اصل میں ان کا تعریفی لقب تھا۔ لیکن ان کی شریعت کے منسوخ ہونے کے بعد ان پر بطور علم جنس کے بولا جاتا ہے نہ کہ تعریف کے لیے جیسا کہ لفظ نصاریٰ اصل

میں مِّنْ أَنْصَارِيٍّ إِلَى اللَّهِ سے ماخوذ ہے۔ پھر ان کی شریعت کے منسوخ ہونے کے بعد انہیں اسی نام سے اب تک پکارا جاتا ہے۔ هَادٍ قُلَانٌ کے معنی یہودی ہو جانے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا﴾ (۲-۶۲) جو لوگ مسلمان ہیں یا یہودی۔ کیونکہ کبھی اسم علم سے بھی مسکنی کے اخلاق و عادات کا لحاظ کر کے فعل کا اشتقاق کر لیتے ہیں۔ مثلاً ایک شخص فرعون کی طرح ظلم و تعدی کرتا ہے تو اس کے متعلق تَفَرَّعَ عَنْ قُلَانٌ (کہ فلاں فرعون بنا ہوا ہے) کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔ اسی طرح تَطَفَّلَ قُلَانٌ کے معنی طفیلی یعنی طفیل نامی شخص کی طرح بن بلائے کسی کا مہمان بننے کے ہیں۔

گے۔ ﴿هُنَالِكَ تَبْلُوا كُلُّ نَفْسٍ مَّا أَسْلَفَتْ﴾ (۱۰-۳۰) وہاں ہر شخص (اپنے اعمال کی) جو اس نے آگے بھیجے ہوں گے آزمائش کرے گا۔

﴿هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُونَ﴾ (۱۱-۳۳) وہاں مومن آزمائے گئے۔

﴿هُنَالِكَ الْوَلَايَةُ لِلَّهِ الْحَقِّ﴾ (۱۸-۴۴) یہاں (سے ثابت ہوا کہ) حکومت سب خدائے برحق کی ہے۔ ﴿فَعَلَبُوا هُنَالِكَ﴾ (۷-۱۱۹) اور وہ مغلوب ہو گئے۔

### (ه ن)

هُنٌ: شرمگاہ یا اس قسم کی قبیح الذکر چیزوں سے کنایہ ہوتا ہے۔ محاورہ ہے: فَنِي فُلَانٌ هَنَاتٌ: فلاں میں بری خصلتیں ہیں اور روایت (۱۶۰) سَتَكُونُ هَنَاتٌ (عنقریب فتنہ و فساد ظاہر ہوں گے) میں بھی هَنَاتٍ اسی معنی پر محمول ہے۔

### (ه ن ع)

الْهَنِيُّ: ہر وہ چیز جو بغیر مشقت کے حاصل ہو جائے اور نتائج کے اعتبار سے بھی خوش کن ہو اصل میں یہ لفظ طعام کے متعلق استعمال ہوتا ہے اور هَنِىءَ الطَّعَامُ فَهُوَ هَنِىءٌ کے معنی طعام کے خوشگوار ہونے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔ ﴿فَكُلُوْهُ هَنِيْئًا مَّرِيْنًا﴾ (۴-۴) تو اسے ذوق شوق سے کھا لو۔

﴿كُلُوا وَاشْرَبُوا هَنِيْئًا بِمَا أَسْلَفْتُمْ فِي الْأَيَّامِ الْخَالِيَةِ﴾ (۲۹-۲۴) اور جو (عمل) تم ایام گزشتہ میں آگے بھیج چکے ہو۔ اس کے صلے میں مزے سے کھاؤ اور پیو۔ ﴿كُلُوا وَاشْرَبُوا هَنِيْئًا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ﴾

﴿وَعِبَادُ الرَّحْمَنِ الَّذِينَ يَمْشُونَ عَلَى الْأَرْضِ هَوْنًا﴾ (۲۵-۶۳) اور خدا کے بندے تو وہ ہیں جو زمین پر متواضع ہو کر چلتے ہیں۔

اور آنحضرت ﷺ سے مروی ہے۔ (۱۶۱) اَلْمُؤْمِنُ هَيِّنٌ لِّينٌ: کہ مومن متواضع اور نرم مزاج ہوتا ہے۔ دوم هَانٌ بمعنی ذلت اور رسوائی کے آتا ہے یعنی دوسرا انسان اس پر مسلط ہو کر اسے سبکا کرے تو یہ قابل مذمت ہے چنانچہ اس معنی میں فرمایا: ﴿فَالْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُونِ﴾ (۳۶-۲۰) سو آج تم کو ذلت کا عذاب ہے ﴿فَاخَذَتْهُمْ سَاعِقَةُ الْعَذَابِ الْهُونِ﴾ (۳۱-۱۷) تو..... کڑک نے ان کو آ پکڑا اور وہ ذلت کا عذاب تھا۔

﴿وَاللَّكَفْرِينَ عَذَابٌ مُّهِينٌ﴾ (۲-۹۰) اور کافروں کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب ہے۔ ﴿وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِينٌ﴾ (۳-۱۷۸) اور آخر کار ان کو ذلیل کرنے والا عذاب ہوگا۔ ﴿فَاُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِينٌ﴾ (۲۲-۵۷) انکے لیے ذلیل کرنے والا عذاب ہوگا۔

﴿وَمَنْ يُهِنِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِنْ مُّكْرِمٍ﴾ (۲۲-۱۸) اور جس کو خدا ذلیل کرے اس کو کوئی عزت دینے والا نہیں۔ هَانٌ اَلْأَمْرُ عَلَى فُلَانٍ (علی کے ساتھ) کے معنی کسی معاملہ کے آسان ہونے کے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔

﴿هُوَ عَلَىٰ هَيْنٍ﴾ (۱۹-۲۱) کہ یہ مجھے آسان ہے۔

تَهَوَّدَ فِي مَشْيِهِ کے معنی نرم رفتاری سے چلنے کے ہیں۔ اور یہود کے تَوَرَّاة کی تلاوت کے وقت آہستہ آہستہ جھومنے سے یہ معنی لیے گئے ہیں۔

هَوْدَ الرَّائِضِ الدَّابَّةِ: راض کا سواری کو نرمی سے چلانا هَوْدَ: اصل میں ہائڈگی جمع ہے جس کے معنی تائب کے ہیں اور یہ اللہ تعالیٰ کے ایک پیغمبر کا نام ہے<sup>①</sup>

## (هَوْر)

هَارَ الْبِنَاءُ تَهَوَّرَ: کے معنی ہیں عمارت منہدم ہوگئی اور یہی معنی اِنْهَارَ کے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے: ﴿عَلَىٰ شَفَا جُرُفٍ هَارٍ فَانْهَارَ بِهِ فِي نَارِ جَهَنَّمَ﴾ (۹-۱۰۹) گر جانے والی کھائی کے کنارے پر رکھی کہ وہ اس کو دوزخ کی آگ میں لے گری۔

ایک قرأت میں هَار ہے اور يَسْرٌ هَائِرٌ وَهَارٌ وَهَارٍ وَمُهَارٍ: ویران کنویں کو کہتے ہیں پھر ویران کنویں کی مناسبت سے..... کمزور اور عاجز آدمی کو بھی هَارٍ یا هَائِرٌ کہا جاتا ہے۔

تَهَوَّرَ اللَّيْلُ: رات کا سخت تاریک ہونا۔ تَهَوَّرَ اللَّيْتَاءُ: کے معنی جاڑے کا اکثر موسم گزر جانے کے ہیں اور بعض نے تَهَيَّرَ: کہا ہے جو اجوف یا کی (ہی رس) ہے کیونکہ اگر یہ وادی ہوتا تو تَهَيَّرَ کی بجائے تَهَوَّرَ کہا جاتا۔

## (هَوْن)

اَلْهُوَانُ: اس کا استعمال دو طرح پر ہوتا ہے۔<sup>(۱)</sup> انسان کا کسی ایسے موقع پر نرمی کا اظہار کرنا جس میں اس کی سبکی نہ ہو یہ قابل ستائش ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔

① ہود بن عبداللہ متصل نسبہ الی نوح ﷺ بسبع وسائط ارسل الی قوم عاد انظر لقصته فی القرآن (۷-۶۵ تا ۷۲)

(۲۶-۱۳۲ تا ۴۰) (۴۶-۲۱ تا ۲۶)



اور اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں خواہشات انسانی کی اتباع کی سخت مذمت کی ہے۔ چنانچہ فرمایا:-

﴿أَفَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَهَهُ هَوَاهُ﴾ (۲۳-۳۵) بھلا تم نے اس شخص کو دیکھا جس نے اپنی خواہش کو معبود بنا رکھا ہے۔ ﴿وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوَىٰ﴾ (۲۶-۳۸) اور خواہش کی پیروی نہ کرنا۔ ﴿وَاتَّبَعَ هَوَاهُ﴾ (۱۸-۲۸) اور وہ اپنی خواہش کی پیروی نہ کرتا ہے۔ اور آیت: ﴿وَلَسِنِ اتَّبَعْتَ أَهْوَاءَهُمْ﴾ (۲-۱۲۰) اگر تم ان کی خواہشوں پر چلو گے۔

میں آہواء جمع لاکر اس بات پر تنبیہ کی ہے کہ ان سے ہر ایک کی خواہش دوسرے سے مختلف اور جدا ہے۔ اور یہ کہ ایک کی خواہش غیر متناہی ہونے میں آہواء کا حکم رکھتی ہے لہذا ایسی خواہشات کی پیروی کرنا سراسر ضلالت اور اپنے آپ کو درہ حیرت میں ڈالنے کے مترادف ہے نیز فرمایا: ﴿وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ﴾ (۱۸-۳۵) اور نادانوں کی خواہشوں کے پیچھے نہ چلنا۔ ﴿وَلَا تَتَّبِعُوا أَهْوَاءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوا﴾ (۵-۷۷) اور اس قوم کی خواہشوں پر مت چلو (جو تم سے پہلے) گمراہ ہو چکے ہیں۔ ﴿قُلْ لَا أَتَّبِعُ أَهْوَاءَكُمْ قَدْ ضَلَلْتُ﴾ (۶-۵۶) (ان لوگوں سے) کہہ دو کہ میں تمہاری خواہشوں پر نہیں چلتا۔ ایسا کروں تو میں گمراہ ہو ہوں گے۔

﴿وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ﴾ (۱۵-۳۲) اور ان (یہود و نصاریٰ کی خواہشوں پر مت چلو اور ان سے (صاف) کہہ دو کہ میرا تو اس پر ایمان ہے۔ جو خدا نے اتارا۔

﴿وَهُوَ أَهْوَىٰ عَلَيْهِ﴾ (۳۰-۳۷) اور یہ اس پر بہت آسان ہے۔

﴿وَتَحْسَبُونَهُ هَيِّنًا﴾ (۱۵-۲۳) اور تم اسے ایک ہلکی بات سمجھتے ہو۔

ہاؤون: کمزوریہ ہونے سے ہے اور چونکہ فاعل کا وزن کلام عرب میں نہیں پایا اس لیے ہاؤون کی بجائے ہاؤون (بروزن فاعول) کہا جاتا ہے۔

## (ہوی)

الہوی: (س) اس کے معنی خواہشات نفسانی کی طرف مائل ہونے کے ہیں۔ اور جو نفسانی خواہشات میں مبتلا ہو اسے بھی ہوی کہہ دیتے ہیں کیونکہ خواہشات نفسانی انسان کو اس کے شرف و منزلت سے گرا کر مصائب میں مبتلا کر دیتی ہیں۔ اور آخرت میں اسے ہاویۃ (دوزخ) میں لے جا کر ڈال دیں گی۔

الہوی: (ض) کے معنی اوپر سے نیچے گرنے کے ہیں۔ اور آیت کریمہ: ﴿فَأُتِمَّتْ هَاوِيَّةٌ﴾ (۹-۱۰۱) اسکا مرجع ہادیہ ہے۔ میں بعض نے کہا ہے کہ یہ ہوت اُمہ کی طرح ایک محاورہ ہے اور بعض کے نزدیک دوزخ کے ایک طبقے کا نام ہے اور آیت کے معنی یہ ہیں کہ اس کا ٹھکانا جہنم ہے۔ اور بعض نے آیت: ﴿وَأَفْرَدَتْهُمْ هَوَاهُمْ﴾ (۱۳-۳۳) اور ان کے دل مارے خوف کے (ہوا ہو رہے

ہوں گے۔ میں ہوا کے معنی خالی یعنی بے قرار کے ہیں۔ جیسے دوسری جگہ فرمایا: ﴿وَأَصْبَحَ فُؤَادُ أُمِّ مُوسَىٰ فَرِغًا﴾ (۱۰-۲۸) موسیٰ علیہ السلام کی ماں کا دل بے قرار ہو گیا۔

## (ہیات)

ہِیْت اور هَلَمَّ کے قریب قریب ایک ہی معنی ہیں اور آیت: ﴿وَقَالَتْ هَيْت لَكَ﴾ (۲۳-۱۲) کہنے لگی (یوسف علیہ السلام) چلے آؤ۔ میں ایک قرأت ہِیْت لَكَ بھی ہے۔ جس کے معنی تَهَيَّات لَكَ کے ہیں یعنی میں تیرے لیے تیار ہوں اور هَيْت بِہِ وَتَهَيْت کے معنی هَيْت لَكَ کہنے کے ہیں۔

هَات: (اسم فعل) لاؤ۔ حثنیہ اور جمع کے لیے هَاتِيَا وَهَاتُوا آتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے ﴿قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ﴾ (۲-۱۱۱) (اے پیغمبر علیہ السلام) ان سے تم کہہ دو کہ..... دلیل پیش کرو۔ فراء کا کہنا ہے کہ کلام عرب میں هَاتِيَتْ مُسْتَعْمَل نہیں ہے یہ صرف اہل حیرہ کی لغت ہے اور اس سے لاهَاتِ (فعل نہی) استعمال نہیں ہوتا۔ غلیل نے کہا ہے کہ اَلْمُهَاتَاءُ وَالْهِتَاءُ (مفاعلہ) حات صیغہ امر ہے

هَيْهَاتَ یہ کلمہ کسی چیز کے بعید از قیاس ہونے کو بتانے کے لیے استعمال ہوتا ہے اور اس میں هَيْهَاتَ هَيْهَاتِ اور هَيْهَاتَاتِ لغت ہیں اور اسی سے قرآن پاک میں ہے۔ ﴿هَيْهَاتَ هَيْهَاتَ لِمَا تُوعَدُونَ﴾ (۲۳-۳۶) جس بات کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے (بہت) (بعید اور) (بہت) (بعید) ہے۔

زجاج نے هَيْهَاتَ کے معنی اَلْبُعْدَ کیے ہیں دوسرے

﴿وَمَنْ أَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوَاهُ بِغَيْرِ هُدًى مِنَ اللَّهِ﴾ (۵۰-۲۸) اور اس سے زیادہ کون گمراہ ہوگا جو خدا کی ہدایت کو چھوڑ کر اپنی خواہش کے پیچھے چلے۔

اَلْهُوَى: (فتح الہا) کے معنی پستی کی طرف اترنے کے ہیں۔ اور اس کے بالمقابل هَوًى (بضم الہا) کے معنی بلندی پر چڑھنے کے ہیں۔<sup>①</sup> شاعر نے کہا ہے ﴿الکامل﴾

(۴۵۷) يَهْوِي مَحَارِمَهَا هَوًى اَلْاَجْدَلِ اس کی تنگ گھاٹیوں میں ضرفہ کی طرح تیز چلتا ہے۔ اَلْهُوَاءُ: آسمان وزمین کے مابین فضا کو کہتے ہیں۔ اور بعض نے آیت: ﴿وَافْتَدَتْهُمْ هَوَاءٌ﴾ (۴۳-۱۴) اور ان کے دل (مارے خوف کے) ہوا ہو رہے ہوں گے۔ کو بھی اسی معنی پر محمول کیا ہے یعنی بے قرار ہونے میں هَوَاء کی طرح ہوں گے۔

تَهَاوَى: (تفاعل) کے معنی ایک دوسرے کے پیچھے مَهْوَاة (یعنی گڑھے) میں گرنے کے ہیں۔

اَهْوَاهُ: اسے فضا میں لے جا کر نیچے دے مارا۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿وَالْمُؤْتَفِكَةَ اَهْوَى﴾ (۵۳-۵۳) اور اسی نے الٹی بستیوں کو دے پٹکا۔

اِسْتَهْوَى کے معنی عقل کو لے کر اڑنے اور پھسلادینے کے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔ ﴿كَالَّذِي اسْتَهْوَتْهُ الشَّيْطَانُ﴾ (۷۱-۷۱) جیسے کسی کو شیطان (جنات) نے..... بھلا دیا ہو۔

① قال الخنجاہی فی شرح الدرۃ (۲۵۲) لیس هذا مما اتفقوا علیہ بل هو قول لبعض اهل اللغة (انظر ایضاً شرح اشعار صفیدل للمرزوقی ۱۲۔)

② لابی کبیر الہذلی عامر بن الحلہب) یصف تابط شرابا لشجاعة ومسدرا واذا رمیت به الفحاح رأیتہ..... والبیہ فی الحماسة (مع المرزوقی ۹۱-۱۲) وقبہ غوار بها بدل محارمها واللسان (حرم) وشواہد الکشاف ۹۶ والبحر (۵: ۴۲۹) والسیوطی ۸۱۔

پھرنا۔ قرآن پاک میں ہے:-

﴿الَمْ تَرَ أَنَّهُمْ فِي كُلِّ وَادٍ يَهِيمُونَ﴾ (۲۵-۲۶) کیا تم نے نہیں دیکھا کہ وہ ہر وادی میں سرمارتے پھرتے ہیں۔

یعنی مدح، ذم وغیرہ ہر قسم کے موضوعِ سخن میں وہ مبالغہ آمیزی سے کام لیتے ہیں اور اسی سے اَلْهَيْمُ عَلٰی وَجْهِہ ہے جس کے معنی سرگردان پھرنے کے بھی آتے ہیں۔ اور شوریدہ عشق اور پیاسا ہونے کے بھی اور هَيْمُ کے معنی پیاسے اونٹوں کے ہیں اور خشک ریت بھی چونکہ پیاسے اونٹوں کی طرح پانی نگل لیتی ہے اس لیے خشک ریت کو اَلْهَيْامُ کہا جاتا ہے۔

### (ہ ی و)

اَلْهَيْئَةُ: اصل میں کسی چیز کی حالت کو کہتے ہیں اس سے کہ وہ حالت محسوس ہو یا معقولہ، لیکن عموماً یہ لفظ حالت محسوسہ یعنی شکل و صورت پر بولا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:- ﴿إِنِّي أَخْلَقْتُ لَكُمْ مِنَ الطِّينِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ﴾ (۳-۲۹) کہ تمہارے سامنے مٹی کی مورت بہ شکل پرند بناتا ہوں۔

اَلْمُهَيَّاءُ: (مہموز) جس کے لیے لوگ تیار ہوں۔ اور اس پر موافقت کا اظہار کریں۔

هَيَاءُ کے معنی کسی معاملہ کے لیے اسباب مہیا کرنے کے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:- ﴿وَهَيَّئْ لَنَا مِنْ أَمْرِنَا رَشَدًا﴾ (۱۸-۱۰) اور ہمارے کام میں درستی (کے سامان) مہیا کر۔

﴿وَهَيَّئْ لَكُمْ مِنْ أَمْرِكُمْ مِرْفَقًا﴾ (۱۸-۱۶) اور تمہارے کاموں میں آسانی (کے سامان) مہیا کرے گا۔ اور اِيَّاكَ اَنْ تَفْعَلَ كَذَا، میں ایک لغت هِيَاكَ اَنْ

اہل لغت نے کہا ہے کہ زجاج کو (لَمَّا) کے نام کی وجہ سے غلط فہمی ہوئی ہے کیونکہ اس کی اصل بَعْدَ الْأَمْرِ وَالْوَعْدِ لَمَّا تَوَعَّدُونَ ہے اور اس میں ایک لغت هِيَهَا بھی ہے۔ اَلْفَسْوَى نے کہا ہے کہ هِيَهَاتِ كسرہ تا کے ساتھ هِيَهَاتِ (بفتح تاء) کی جمع ہے۔

### (ہ ی ج)

هَاجَ الْبَقْلُ: (ض) کے معنی بقول کے پک کر زور پڑ جانے کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔ ﴿ثُمَّ يَهِيْجُ فِتْرَهُ مُضْفَرًا﴾ (۳۹-۲۱) پھر وہ (پک کر) خشک ہو جاتی ہے تو تم اس کو دیکھتے ہو (کہ) زرد ہو گئی ہے۔

اور اَهْيَجَتِ الْأَرْضُ کے معنی زمین کے خشک گھاس والی ہونے کے ہیں۔ هَاجَ الدَّمُ وَالْفَحْلُ هَيْجًا وَهَيْجًا کے معنی خون یا زراونٹ کے جوش مارنے کے ہیں اور هَيَّجَتِ الشَّرَّ وَالْحَرْبَ کے معنی شریا لڑائی بھڑکانے کے اسی سے اَلْهَيْجَاءُ (بالمد والقصر) ہے جس کے معنی لڑائی کے ہیں۔ اور هَيَّجَتِ الْبُعَيْرَ کے معنی اونٹ کو برا بھختہ کرنے کے ہیں۔

### (ہ ی م)

رَجُلٌ هَيْمَانٌ وَهَائِمٌ: سخت پیاسا آدمی۔ هَائِمٌ کی جمع هَيْمٌ آتی ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:- ﴿فَشَارِبُونَ شُرْبَ الْهَيْمِ﴾ (۵۶-۵۵) اور پیو گے بھی تو اس طرح جیسے پیاسے اونٹ پیتے ہیں۔

اَلْهَيْامُ: اونٹ کی ایک بیماری ہے جس کی وجہ سے اسے اتنی پیاس لگتی ہے کہ سیر نہیں ہوتا۔ اور شوریدگی عشق کے لیے یہ کلمہ ضرب النثل ہے۔ هَامَ عَلٰی وَجْهِہ سرگردان

﴿لَا إِلَىٰ هَؤُلَاءِ وَلَا إِلَىٰ هَؤُلَاءِ﴾ (۱۳۳-۴)

نہ ان کی طرف (ہوتے ہو) نہ ان کی طرف  
ہَؤُلَاءُ (اسم فعل) بمعنی خُذْ بھی آتا ہے اور هَاتِ (لاؤ)  
کی ضد ہے اور اس کی گردان یوں ہے۔

هَؤُلَاءُ، هَؤُلَاءُ، هَؤُلَاءُ۔ قرآن پاک میں ہے:-  
﴿هَؤُلَاءُ أَفْرَتُوا كِتَابِيهِ﴾ (۶۹-۱۹) لیجیہ میرا اعمال نامہ  
پڑھیے۔ اور اس میں ایک لغت بغیر میم کے بھی ہے۔ جیسے  
هَآ، هَآآ، هَآوْ، هَآئِي، هَآنْ بروزن خِفْنِ بعض  
اس کے آخر میں ک ضمیر کا اضافہ کر کے تثنیہ جمع اور تذکیر و  
تانیث کے لیے ضمیر میں تبدیلی کرتے ہیں۔ جیسے هَاكَ،  
هَآكُمَا لُحْ

اور بعض اسم فعل بنا کر اسے هَآ يَهَآ بروزن خَافِ  
يَخَافِ کہتے ہیں اور بعض کے نزدیک هَآئِي يَهَآئِي  
مثل نَادِي يُنَادِي ہے اور بقول بعض متکلم مضارع کا  
صيغه آهَآ بروزن أَخَالُ آتا ہے۔



تَفْعَلْ كَذَا بھی ہے۔ چنانچہ شاعر نے کہا ہے ❶

(۲۵۸) هِيَآكَ هِيَآكَ وَحَنَوَاءَ الْعَنَقِ

گردن مروڑنے یعنی تکبر سے دور رہو۔

(هَآ)

هَآ: یہ حرف تنبیہ ہے اور ذَا، ذَهْ، أُولَآءِ اسم  
اشارہ کے شروع میں آتا ہے اور اس کے لئے بمنزلہ جز  
سمجھا جاتا ہے مگر هَآ أَنْتُمْ میں حرف هَآ استفہام کے لیے  
ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔

﴿هَآ أَنْتُمْ هَؤُلَاءِ حَآجِبْتُمْ﴾ (۳-۶۶) دیکھو ایسی

بات میں تو تم نے جھگڑا کیا ہی تھا۔

﴿هَآ أَنْتُمْ أُولَآءِ تُحِبُّونَهُمْ﴾ (۳-۱۱۹) دیکھو تم ایسے

(صاف دل) لوگ ہو کہ ان لوگوں سے دوستی رکھتے ہو۔

﴿هَآ أَنْتُمْ هَؤُلَاءِ جِدَلْتُمْ﴾ (۳-۱۰۹) بھلا تم

لوگ..... ان کی طرف سے بحث کر لیتے ہو۔

﴿ثُمَّ أَنْتُمْ هَؤُلَاءِ تَقْتُلُونَ أَنْفُسَكُمْ﴾ (۲-۸۵)

پھر تم وہی ہو کہ اپنوں کو قتل بھی کر دیتے ہو۔

❶ وفى اللسان (حنو) انشده اللحياني عن الكسائي وصدره: يا خال هلا قلت إِذَا عَطَيْتَنِي - وايضا اللسان (هيا) والبيت فى ابدال ابى الطيب ۵۷۰/۲ وبعده - اعطيتها فاتيا اضراسها - لوتلف البيض به لم ينفلق قال صاحب الابدال وعند الفراء انما يقال هياك فى موضع زجر ولا يقولون هياك اكرمت ۱۲ -

## کتابُ الْيَاءِ

### (ی ب س)

الَّذِينَ يَأْكُلُونَ أَمْوَالَ الْيَتَامَى ﴿٣-١٠﴾ جو لوگ یتیموں کا مال (نا جائز طور پر) کھاتے ہیں۔ ﴿وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْيَتَامَى﴾ (۲-۲۲۰) اور تم سے یتیموں کے بارے میں دریافت کرتے ہیں۔

محازا ہر یکتا اور بے مثل چیز کو عربی میں یتیم کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ گوہر یکتا کو ذرۃ یتیمہ کہہ دیتے ہیں۔ اور اس میں اس کے مادہ کے منقطع ہونے پر تشبیہ کرنا مقصود ہوتا ہے اور ذرۃ کے ساتھ تشبیہ دے کر یکتا مکان کو بھی یتیم کہہ دیا جاتا ہے۔

### (ی د ی)

الْيَدِ کے اصل معنی تو ہاتھ کے ہیں یہ اصل میں يَدَيُّ (ناقص یائی) ہے کیونکہ اس کی جمع آید وَيَدَيُّ اور تشبیہ يَدَيَّان اور فعل يَدَيْتُهُ آتا ہے جس کے معنی ہاتھ مارنے کے ہیں۔

عام طور پر اس کی جمع آید (افعل) آتی ہے کیونکہ اکثر طور پر فعل (سکون عین) کی جمع افعل استعمال ہوتی ہے۔ جیسے فَلَسْ وَأَفْلَسْ وَكَلَبٌ وَأَكْلَبٌ لیکن کبھی اس کی جمع يَدَيُّ (فعلیل) بھی آ جاتی ہے جیسے عَبْدٌ وَعَبِيدٌ اور کبھی فَعْلٌ (فتح العین) کی جمع بھی أَفْعَلُ کے وزن پر آ جاتی ہے جیسے زَمَنٌ، أَزْمُنٌ وَجَبَلٌ، أَجْبَلٌ قرآن پاک میں ہے۔

﴿إِذْ هُمْ قَوْمٌ أَنْ يَسْطُوا إِلَيْكُمْ أَيْدِيَهُمْ فَكَفَّ أَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ﴾ (۵-۱۱) جب ایک جماعت نے

يَيْسَسَ (س) الشَّيْءُ کے معنی کسی چیز کا خشک ہو جانا کے ہیں۔ اور تر گھاس جب خشک ہو جائے تو اسے يَيْسَسَ (سکون الباء) کہا جاتا ہے اور جس جگہ پر پانی ہو اور پھر خشک ہو جائے اسے يَيْسَسَ (فتح الباء) کہتے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے: ﴿فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيقًا فِي الْبَحْرِ يَبَسًا﴾ (۲۰-۷۷) تو ان کے لیے دریا میں لٹھی مار کر خشک راستہ بنا دو۔

اور پنڈلیوں کے جن حصوں پر گوشت نہیں ہوتا ان کو آيِسَانِ (تشبیہ) کہا جاتا ہے۔

### (ی ت م)

الْيَتِيمُ کے معنی نابالغ بچہ کے شفقت پداری سے محروم ہو جانے کے ہیں۔ انسان کے علاوہ دیگر حیوانات میں یتیم کا اعتبار ماں کی طرف سے ہوتا ہے اور جانور کے چھوٹے بچے کے بن ماں کے رہ جانے کو یتیم کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿الَّذِينَ يَبْغِضُونَكَ يَتِيمًا فَآوَى﴾ (۹۳-۶) بھلا اس نے تمہیں یتیم یا کر جگہ نہیں دی۔

﴿يَتِيمًا وَأَسِيرًا﴾ (۷۶-۸) یتیموں اور قیدیوں کو۔ یتیم کی جمع یتامی ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَأَتُوا الْيَتَامَى أَمْوَالَهُمْ﴾ (۴-۲) اور یتیموں کا مال (جو تمہاری تحویل میں ہو) ان کے حوالے کر دو۔ ﴿إِنَّ

اَوْ مَالِيْ بِهٖ يَدَانِ: یہ میری قدرت سے باہر ہے۔ شاعر نے کہا ہے ﴿الْاَكْل﴾

(۳۶۰) فَاَعْمَدُ لِمَا تَعْلُوْا فَمَا لَكَ بِالَّذِي

لَا تَسْتَطِيْعُ مِنَ الْاُمُوْر يَدَانِ

جو کام تو کر سکتا ہے اس کا قصد کیجیے اور جو امور تیری استطاعت سے بالا ہیں ان سے تعلق مت رکھیے۔ اس معنی کے لحاظ سے تشبیہ کے طور پر دھڑر کی طرف بھی ید کی اضافت ہوتی ہے۔ جیسے يَدْ الدَّهْرِ اَوْ يَدْ الْمُسْنَدِ اور شاعر نے ہوا کی طرف ید کی نسبت کرتے ہوئے کہا ہے ﴿الْاَكْل﴾

(۳۶۱) يَبِيْدُ الشَّمَالُ زِمَامُهَا

جب کہ اس کی باگ ڈور شمالی ہوا کے ہاتھ میں تھی کیونکہ ہوا میں زور اور قوت ہوتی ہے۔

وَضَعَ يَدَهُ فِیْ كَذَا کے معنی کسی کام کو شروع کرنے کے ہیں اور اطلاق اَلْيَدِ وَاَمْسَاكُهَا: سخاوت اور بخل سے کیا ہوتا ہے جیسا کہ نخی کے متعلق يَدُهُ مُطْلَقَةٌ اور بخیل کے متعلق يَدُهُ مَغْلُوْلَةٌ کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:-

ارادہ کیا کہ تم پر دست درازی کریں تو اس نے ان کے ہاتھ روک دیئے۔

﴿اَمْ لَهُمْ اَيْدٍ يَّتِيْطُشُوْنَ بِهَا﴾ (۷-۱۹۵) یا ہاتھ ہیں جن سے پکڑیں۔

استعارہ کے طور پر يَدْ کا لفظ متعدد معانی میں استعمال ہوتا ہے بمعنی نعمت، اور اسی سے يَدِيْتُ اِلَيْهِ کا محاورہ ہے جس کے معنی کسی پر احسان کرنے کے ہیں۔ اس کی جمع آیات آتی ہے اور کبھی يَدِي بھی آجاتی ہے۔ شاعر نے کہا ہے ﴿﴾ (۹۵۹) فَاِنَّ لَهُ عِنْدِيْ يَدِيًّا وَاَنْعَمًا کیونکہ اس کے مجھ پر بہت سے احسانات ہیں۔

(۲) کسی چیز پر قبضہ یا ملک جیسے هَذَا فِیْ يَدِ فُلَانٍ (یہ فلاں کے اختیار میں ہے) قرآن پاک میں ہے:- ﴿اَلَا اَنْ يَّعْمُوْنَ اَوْ يَعْصُوْا الَّذِيْ بِيَدِهِ عَقْدَةُ النِّكَاحِ﴾ (۲-۲۳۷) ہاں اگر عورتیں مہر بخش دیں یا مرد، جن کے قبضہ قدرت میں عقد نکاح ہے (اپنا حق) چھوڑ دیں۔

نیز محاورہ:- وَقَعَ فِیْ يَدِيْ عَدْلٍ: وہ عدل کے ہاتھوں میں چلا گیا۔ (۳) بمعنی قوت جیسے لِفُلَانٍ يَدٌ عَلٰی كَذَا فلاں کو اس پر قدرت حاصل ہے مَالِيٌّ لِّكَذَا يَدٌ

① لاعشى القيسى الجاهلى يمدح نعان بن المنذر و صدره : فلن اذكر النعمان الابصالح ..... ولم اجد فى ديوانه والبيت فى اللسان (يدى سود، نعم) وشواهد الكشف والمحكم (نعم) ونسبه الى النابغة وابن البرى نسبة بضمرة بن ضمرة النهشلى

② لكعب بن سعد الغنوى كما فى اللسان (وعلا) والقالى (۲: ۳۱۴) وهو الصواب لان فى اول الايات خطاب لابنه على بن كعب وقيل لعلى بن عدى الغنوى وقال بعضهم لعلى بن العذير الغنوى كما فى البيان (۳: ۸۰) والاضداد للاصمعى ۷ السجستاني ۱۰۸ وابن الانبارى ۴۳، ۵۷ والسمط (۱: ۸۳) وتهذيب الالفاظ (۴: ۴۵۴) واضداد ابن السكيت (۱۶۶) وابى الطيب (۴۰۱) والبحر (۵: ۱۵۸) (۳: ۵۲۴)

③ قطعة بيت للبيد فى معلقته (۱۵۸) والبيت يتماهم وغداة ربح قد كشفت وقرة..... والبيت فى اللسان (يد) والانصاف (۱۴۴) والصناعتين (۲۸۵) والعمدة (۱: ۲۶۹) الحصرى (۴: ۱۲۳) وشرح السبع لابن الانبارى ۵۷۸ وشرح العشر للبريزى (۱۵۸) وفى رواية قدوزعت بدل قد كشفت ۱۲۔

﴿وَأَذْكُرْ عَبْدَنَا دَاوُدَ إِذَا الْآيِدُ﴾ (۳۸-۱۷) اور  
ہمارے بندے داؤد علیہ السلام کو یاد کرو جو صاحب قوت تھے۔  
اور آیت کریمہ:

﴿حَتَّىٰ يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَدٍ وَهُمْ صَاغِرُونَ﴾  
(۲۹-۹) یہاں تک کہ ذلیل ہو کر اپنے ہاتھ سے جزیہ  
دیں۔

میں عَنْ يَدٍ سے مراد یہ ہے کہ اس نعمت کے عوض جو ان کی  
سکونت گاہوں میں برقرار رکھے جانے سے انہیں حاصل  
ہوئی ہے، جزیہ ادا کریں تو عَنْ يَدٍ موضع حال میں ہے۔

اور بعض نے یہ معنی کیے ہیں کہ تمہاری حاکمیت اور اپنی  
محکومی کا اقرار کرتے ہوئے جزیہ ادا کریں۔ محاورہ ہے:

خُذْ كَذَا أَثَرَ ذِي يَدَيْنِ (۴) يَدٌ بمعنی حای اور مددگار  
کے آتا ہے جیسے أَنَا يَدُكَ (میں تمہارا مددگار ہوں)  
فُلَانٌ يَدُ فُلَانٍ (وہ فلاں کا مددگار ہے) اسی معنی میں

اولیاء اللہ کو یَدُ اللہ کہا جاتا ہے۔ اسی بنا پر آیت کریمہ:-  
﴿إِنَّ الَّذِينَ يُبَايِعُونَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُونَ اللَّهَ يَدُ  
اللَّهِ فَوْقَ أَيْدِيهِمْ﴾ (۳۸-۱۰) جو لوگ تم سے بیعت  
کرتے ہیں۔ خدا کا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر ہے۔

میں آنحضرت ﷺ کے ہاتھ کو اللہ کا ہاتھ قرار دیا ہے۔  
یعنی جب آپ کا ہاتھ ان کے ہاتھ پر ہے تو گویا اللہ کا  
ہاتھ ان پر ہے۔ اس کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی

ہے جس میں اللہ عز و جل فرماتے ہیں۔ ﴿وَلَا  
يَزَالُ الْعَبْدُ يَتَقَرَّبُ إِلَىٰ النَّوَافِلِ حَتَّىٰ أَحْبَبَهُ  
فَإِذَا أَحْبَبْتَهُ كُنْتَ سَمْعَهُ الَّذِي يَسْمَعُ بِهِ

﴿وَقَالَتِ الْيَهُودُ يَدُ اللَّهِ مَغْلُولَةٌ غُلَّتْ أَيْدِيهِمْ  
وَلَبِغُوا بِمَا قَالُوا بَلْ يَدُهُ مَبْسُوتَةٌ﴾ (۶۳-۵) اور  
یہود کہتے ہیں کہ خدا کا ہاتھ (گردن سے) بندھا ہوا ہے (یعنی  
اللہ بخیل ہے) انہی کے ہاتھ بندھے جائیں اور ایسا کہنے کے  
سبب ان پر لعنت ہو، بلکہ اس کے دونوں ہاتھ کھلے ہیں۔

محاورہ ہے: نَفَضْتُ يَدِي عَنْ كَذَا: میں نے فلاں چیز  
سے ہاتھ جھاڑ لیا یعنی اسے چھوڑ دیا۔

أَيْدٍ (تفعیل) کے معنی کسی کی تائید یا اس کی مدد کرنے  
کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿وَإِذْ يَدُكَ بِرُوحِ الْقُدُسِ﴾ (۵-۱۱) جب میں نے  
روح القدس (یعنی جبریل) سے تمہاری مدد کی۔ اور آیت  
کریمہ۔

﴿فَوَيْلٌ لِلَّذِينَ يَكْتُمُونَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ﴾  
(۲-۷۹) ان پر افسوس ہے اس لیے کہ (بے اصل  
باتیں) اپنے ہاتھ سے لکھتے ہیں۔

میں کتابت کو ہاتھوں کی طرف نسبت کر کے ان تحریروں کے  
بنادئی ہونے پر تنبیہ کی ہے جس طرح کہ آیت کریمہ: ذَلِكَ  
قَوْلُهُمْ بِأَفْوَاهِهِمْ (یہ ان کے منہ کی باتیں ہیں ان کی  
دروغ بیانی پر تنبیہ کرنے کے لیے قول کی نسبت آفواہ کی  
طرف کی ہے اور آیت کریمہ:- ﴿أَمْ لَهُمْ أَيْدٍ يَبِطْشُونَ  
بِهَا﴾ (۷۵-۹۵) یا ان کے ہاتھ ہیں جن سے پکڑیں۔

میں أَيْدٍ (ہاتھ) سے مراد قوت ہے اسی معنی میں فرمایا:  
﴿أُولَٰئِیَ الْأَيْدِیَ وَالْأَبْصَارِ﴾ (۳۸-۲۵) جو قوت  
والے اور صاحب نظر تھے۔

① الحدیث باختلاف الفاظ فی الطب عن ابی امامۃ وابن عساکر عن انس وعائشۃ والحکیم ع طس ابونعیم فی الطب ق  
فی الزهد (انظر کنز العمال رقم ۱۱۰۶-۶۱)

﴿وَلَمَّا سَقَطَ فِي أَيْدِيهِمْ﴾ (۷-۱۴۹) اور جب وہ نادم ہوئے۔

میں سَقَطَ فِیْ اَیْدِیْہِمْ معنی نادم ہونے کے ہیں۔ چنانچہ محاورہ ہے: - فُلَانٌ سَقَطَ فِیْ یَدِہِ وَأَسْقَطَ وہ پشیمان ہوا یا اس کے معنی حسرت سے ہاتھ ملنے کے ہیں۔ جسے فرمایا:

﴿فَأَصْبَحَ يُقَلِّبُ كَفَّيْہِ عَلٰی مَا آتَفَقَ فِیْہَا﴾ (۱۸-۴۲) تو جو مال اس نے اس پر خرچ کیا تھا اس پر حسرت سے ہاتھ ملنے لگا۔

اور آیت کریمہ:-

﴿فَرَدُّواْ اَیْدِیْہِمْ فِیْ اَفْوَاهِہِمْ﴾ (۱۴-۹) تو انہوں نے اپنے ہاتھ ان کے مونہوں پر رکھ دیئے۔

کے معنی یہ ہیں کہ انہوں نے حق بات کو قبول نہ کیا جس کے قبول کرنے کا انہیں حکم دیا گیا تھا جیسا کہ محاورہ ہے: - رَدُّ يَدِہُ فِیْ فَمِہِ یعنی اس کی بات نہ مانی۔

بعض نے اس کے معنی یہ کہے ہیں کہ انہوں نے انبیاء کرام کے ہاتھوں کو ان کے مونہوں کی طرف لوٹا دیا یعنی ان سے کہنے لگے کہ اپنے مونہوں پر ہاتھ رکھ کر خاموش رہو اور بعض نے اَیْدِیْہِمْ سے مراد انعامات لیے ہیں یعنی انہوں نے پیغمبروں تک کی تکذیب کر کے ان کے احسانات کو ان کے مونہوں پر دے مارا یعنی ان کے نصائح اور مواعظ پر کان نہ دھرا جو ان کے لئے بہت بڑی نعمت ہے۔

### (ی س ر)

اَلْیُسْرُ کے معنی آسانی اور سہولت کے ہیں۔ عُسْرُ کی ضد ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿يُرِيدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ

وَبَصْرَہ الذی یبصرہ ویدہ التی یبطش بہا)) ”بندہ نوافل کے ذریعہ برابر میرا قرب حاصل کرتا رہتا ہے۔ حتیٰ کہ میں اسے اپنا محبوب بنالیتا ہوں پھر جب وہ میرا محبوب بن جاتا ہے تو میں ہی اس کا کان ہوتا ہوں جس سے سنتا ہے اور میں ہی اس کی آنکھ ہوتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اور میں ہی اس کا ہاتھ ہوتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے۔“

﴿مِمَّا عَمِلَتْ اَیْدِیْنَا﴾ (۳۶-۷۱) جو چیزیں ہم نے اپنے ہاتھ سے بنائیں۔

اسی طرح آیت:

﴿لَمَّا خَلَفْتُ بِیْدَیَّ﴾ (۳۸-۷۵) جس شخص کو میں نے اپنے ہاتھوں سے بنایا۔

میں اللہ کے اپنے ہاتھ کے ساتھ پیدا کرنے سے وہ خصوصی تولیت مراد ہے جو اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ مختص ہے اور اس عنایت ربانی کے معنی کو ظاہر کرنے کے لیے لفظ بَدُّ کو اس لیے اختیار کیا ہے کہ وہ اعضاء انسانی میں سب سے اعلیٰ عضو ہے جس کے ذریعہ انسان کوئی کام سرانجام دیتا ہے لہذا یہاں لفظ ید سے تشبیہ کا وہم نہیں ہونا چاہیے۔ بعض نے کہا ہے کہ بِیْدَیَّ کے معنی بِنِعْمَتِہ ہے اور قَطَعَتْہُ بِالْیَمِیْنِ کی طرح یہاں باء آلہ کے لیے نہیں ہے بلکہ خَرَجَ بِسِیْفِہ کی طرح باء جمعنی مع کے ہے پس آیت کے معنی یہ ہیں کہ میں نے اسے پیدا کیا درآں حالانکہ ہمارے دنیوی اور اخروی انعامات اس کے شامل حال تھے جن کی رعایت کر کے وہ سعادت کبریٰ حاصل کر سکتا ہے۔

رَجُلٌ یَدِیْ وَأَمْرَءٌ یَدِیَّةٌ: ماہر کار گیر مرد و عورت۔ اور آیت کریمہ:-



﴿فَسَيَسِّرُهُ لِّلْعُسْرَى﴾ (۱۲-۱۰) اسے سختی میں پہنچائیں گے۔ میں عُسْرَى کے ساتھ تیسیر کا لفظ بطور تنہم لایا گیا ہے۔ جس طرح کہ آیت۔

﴿قَبَسْرُهُ بَعْدَ اِلْيَمٍ﴾ (۳۵-۸) میں عذاب کے متعلق بشارت کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اَلْيَسِيرُ وَالْمَيْسُورُ سہل اور آسان۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿فَقُلْ لَهُمْ قَوْلًا مَّيْسُورًا﴾ (۱۷-۲۸) تو ان سے نرمی سے بات کہہ دیا کرو۔

اور کبھی تیسیر کے معنی حقیر چیز بھی آتے ہیں۔ چنانچہ آیت کریمہ:-

﴿يُضْعَفُ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ وَكَانَ ذَلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيرًا﴾ (۳۳-۳۰) اس کو دوگنی سزا دی جائے گی اور یہ (بات) خدا کو آسان ہے۔

میں لفظ تیسیر کے معنی آسان اور سہل کے ہیں اور آیت ﴿وَمَا تَلَبَّثُوا بِهِآ اِلَّا يَسِيرًا﴾ (۳۳-۱۳) اور اس کے لیے بہت کم توقف کریں۔

میں اس کے معنی بہت کم عرصہ کے ہیں۔ اَلْمَيْسِرَةُ وَالْيَسَارُ کے معنی غنا اور مالی وسعت کے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:-

﴿فَنَظَرُوْهُ اِلَى مَيْسِرَةٍ﴾ (۲-۲۸۰) تو (اے) کشائش (کے حاصل ہونے) تک مہلت (دو)

اور یَسَارُ کا لفظ کبھی یَمِيْن کے بالمقابل استعمال ہوتا ہے بعض اس کو یَسَارُ بکسر الیا پڑھتے ہیں۔ اَلْيَسَارَاتُ: پاپائے سبک

اَلْمَيْسِرُ: (تما بازی) یہ بھی یُسْر سے مشتق ہے (کیونکہ تما بازی میں بھی بلا تکلف مال حاصل ہو جاتا ہے۔

اَلْعُسْرُ ﴿۲-۸۵﴾ خدا تمہارے حق میں آسانی چاہتا ہے۔ اور سختی نہیں چاہتا۔

﴿سَيَجْعَلُ اللّٰهُ بَعْدَ عُسْرٍ يُسْرًا﴾ (۶۵-۷) خدا عنقریب تنگی کے بعد کشائش بخشنے گا۔

﴿وَسَقُوْلٌ لَّهٗ مِنْ اَمْرِنَا يُسْرًا﴾ (۱۸-۸۸) بلکہ اس سے نرم بات کہیں گے۔

﴿فَاَلْجَرِيْتُ يُسْرًا﴾ (۵۱-۳) پھر نرمی سے چلتی ہیں۔ تَبَسَّرَ كَذًا وَاسْتَيْسَرَ کے معنی آسان ہونے کے ہیں۔

قرآن پاک میں ہے:-

﴿فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدٰى﴾ (۲-۱۹۶) اگر رستے میں روک لیے جاؤ تو جیسی قربانی میسر ہو، کرو۔

﴿فَاَقْرَبُوا مَا تَبَسَّرَ مِنْهُ﴾ (۷۳-۲۰) تو جتنا آسانی سے ہو سکے پڑھ لیا کرو۔

اسی سے اَيْسَرَتِ الْمَرْءَةُ کا محاورہ ہے جس کے معنی عورت کے سہولت سے بچ جانے کے ہیں۔

يَسَّرْتُ كَذًا کے معنی کسی کام کو آسان اور سہل کر دینے کے ہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:-

﴿وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ﴾ (۵-۱۷) اور ہم نے قرآن پاک کو سمجھنے کے لیے آسان کر دیا۔

﴿فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ﴾ (۱۹-۹۷) (اے پیغمبر) یہ (قرآن) تمہاری زبان میں آسان (نازل) کیا ہے۔

اَلْيُسْرَى: (اسم) بمعنی یُسْر قرآن پاک میں ہے۔ ﴿فَسَيَسِّرُهُ لِّلْيُسْرَى﴾ (۹۲-۷) اس کو ہم آسان

طریقے کی توفیق دیں گے۔ اور آیت کریمہ:-

## (ی ق ن)

دینا۔ يَمَّمْتُ كَذَا وَتَيَمَّمْتُ: قصد کرنا قرآن میں ہے۔ ﴿فَتَيَمَّمُوا صَعِيدًا طَيِّبًا﴾ (۶-۵) تو پاک مٹی لو۔ يَمَّمْتُهُ بِرُفْجَى میں نے اسے نیزے کا نشانہ بنایا اَلْيَمَامُ: جنگلی کبوتر کو کہتے ہیں اور يَمَامَةٌ ایک عورت کا نام تھا جس کے نام پر (صوبہ یمن کے ایک) شہر کا نام اَلْيَمَامَةُ رکھا گیا تھا۔

## (ی م ن)

اَلْيَمِينُ کے اصل معنی دایاں ہاتھ یا دائیں جانب کے ہیں۔ اور آیت کریمہ: ﴿وَالسَّمُوتُ مَطْوِيَّاتٍ بِيَمِينِهِ﴾ (۳۹-۶۷) اور آسمان اس کے داہنے ہاتھ میں لپٹے ہوں گے۔

میں حق تعالیٰ کی طرف یمن کی نسبت مجازی ہے۔ جیسا کہ یہ وغیرہا کے الفاظ باری تعالیٰ کے متعلق استعمال ہوتے ہیں۔ یہاں آسمان کے لیے یمن اور بعد میں آیت:-

﴿وَالْأَرْضُ جَمِيعًا قَبْضَتُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ﴾ (۳۹-۶۷) (اور قیامت کے دن) تمام زمین اس کی مٹھی میں ہوگی۔ ارض کے متعلق قَبْضَةُ کا لفظ لانے میں (ایک) باریک نکتہ کی طرف اشارہ ہے) جو اس کتاب کے بعد بیان ہوگا۔ اور آیت کریمہ:-

﴿إِنَّكُمْ كُنْتُمْ تَأْتُونَنَا عَنِ الْيَمِينِ﴾ (۳۷-۲۸) تم ہی ہمارے پاس دائیں (اور بائیں) سے آتے تھے۔ میں یمن سے مراد جانب حق ہے یعنی تم جانب حق سے ہمیں پھیرتے تھے اور آیت کریمہ:-

﴿أَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِينِ﴾ (۶۹-۳۵) تو ہم ان کا دایاں ہاتھ پکڑ لیتے۔

میں دایاں ہاتھ پکڑ لینے سے مراد روک دینا ہے۔ جیسے

اَلْيَقِينُ کے معنی کسی امر کو پوری طرح سمجھ لینے کے ساتھ اس کے پایہ ثبوت تک پہنچ جانے کے ہیں۔ اسی لیے یہ صفات علم سے ہے اور معرفت، درایت وغیرہ سے اس کا درجہ اوپر ہے یہی وجہ ہے کہ عِلْمُ اَلْيَقِينِ کا محاورہ تو استعمال ہوتا ہے۔ لیکن مَعْرِفَةُ اَلْيَقِينِ نہیں بولتے۔

اور علم الیقین، وعین الیقین، وحق الیقین میں قدرے معنوی فرق پایا جاتا ہے۔ جسے ہم اس کتاب کے بعد بیان کریں گے۔ اِسْتَيْقَنَ وَآيَقَنَ یقین کرنا۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿إِنْ نَّظُنُّ إِلَّا ظَنًّا وَمَا نَحْنُ بِمُستَيْقِنِينَ﴾ (۳۲-۳۵) ہم اس کو محض ظن ہی خیال کرتے ہیں اور ہمیں یقین نہیں آتا۔

﴿وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ﴾ (۵۱-۲۰) اور یقین کرنے والوں کے لیے زمین میں بہت سی نشانیاں ہیں۔

﴿لَقَوْمٌ يُؤْفِكُونَ﴾ (۴۵-۴) یقین کرنے والوں کے لیے اور آیت کریمہ:-

﴿وَمَا قَتَلُوهُ يَقِينًا﴾ (۳-۱۵۷) اور انہوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو یقیناً قتل نہیں کیا۔

کے معنی یہ ہیں کہ انہیں ان کے قتل ہو جانے کا یقین نہیں ہے بلکہ ظن و تخمین سے ان کے قتل ہو جانے کا حکم لگاتے ہیں۔

## (ی م م)

اَلْيَمُّ کے معنی دریا اور سمندر کے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿فَالْقِيَّةِ فِي الْيَمِّ﴾ (۲۸-۷) تو اسے دریا میں ڈال

محاورہ ہے۔ خُذْ يَمِينِي فُلَانٍ عَنْ تَعَاطِيْ  
الْهَجَاءِ: یعنی فلاں کو بھجوں سے روک دو۔

بعض نے کہا ہے کہ انسان کا داہنا ہاتھ چونکہ اعضا میں  
افضل سمجھا جاتا ہے اس لیے معنی یہ ہونگے کہ ہم بہتر حال  
میں بھی اسے بائیں اعضا سے پکڑ کر منع کر دیتے۔ اور  
آیت کریمہ: ﴿وَاصْصَبْ الْيَمِينِ﴾ (۵۶-۲۷) اور  
ذہنے ہاتھ والے۔

میں داہنی سمت والوں سے مراد اہل سعادت ہیں کیونکہ  
عرف میں میامن (بابرکت) کو یمین اور مشائم (منحوس)  
کو شال کے لفظ سے یاد کیا جاتا ہے اور استعارہ کے طور پر  
یمین کا لفظ برکت و سعادت کے لیے استعمال ہوتا ہے۔  
جیسے فرمایا:۔

﴿فَمَا إِنْ كَانَ مِنْ أَصْحَابِ الْيَمِينِ فَسَلِّمْ لَكَ  
مِنْ أَصْحَابِ الْيَمِينِ﴾ (۵۶-۹۰) اگر وہ دائیں  
ہاتھ والوں (یعنی اصحاب خیر و برکت) سے ہے تو (کہا  
جائے گا کہ) تجھ پر داہنے ہاتھ والوں کی طرف سے  
سلام۔ اور اسی معنی میں شاعر نے کہا ہے۔ (الوافر)

(۴۶۲) إِذَا مَا رَأَيْتُ رُفِعَتْ لِمَجْدٍ  
تَلَقَّاَهَا عَرَابَةً بِالْيَمِينِ

جب کبھی فضل و مجد کے کاموں کے لیے جھنڈا بلند کیا جاتا  
ہے تو عَرَابَةُ اسے خیر و برکت کے ہاتھ سے پکڑ لیتا ہے۔

نِزَالِ الْيَمِينِ بمعنی دایاں ہاتھ سے استعارہ کے طور پر لفظ  
يَمِينٌ قسم کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس لیے کہ  
(عرب) قسم کھاتے یا عہد کرتے وقت اپنا دایاں ہاتھ  
دوسرے کے دائیں ہاتھ پر مارتے تھے۔ چنانچہ فرمایا:۔

﴿أَمْ لَكُمْ أَيْمَانٌ عَلَيْنَا بِاللَّعْنَةِ إِلَى يَوْمِ الْقِيَمَةِ﴾  
(۲۸-۳۹) یا تم نے ہم سے قسمیں لے رکھی ہیں جو  
قیامت کے دن تک چلی جائیں گی۔

﴿وَأَقْسَمُوا بِاللَّهِ جَهْدَ أَيْمَانِهِمْ﴾ (۶-۱۰۹) اور  
یہ لوگ خدا کی سخت سخت قسمیں کھاتے ہیں۔

﴿لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللَّهُ بِاللَّغْوِ فِي أَيْمَانِكُمْ﴾  
(۲-۲۴۵) خدا تمہاری لغو قسموں پر تم سے مواخذہ نہیں  
کرے گا۔

﴿وَإِنْ تَكُونُوا أَيْمَانُهُمْ مِنْ بَعْدِ عَهْدِهِمْ إِنْهُمْ لَا  
أَيْمَانَ لَهُمْ﴾ (۹-۱۲) اگر عہد کرنے کے بعد اپنی قسموں  
کو توڑ ڈالیں۔ ان کی قسموں کا کچھ اعتبار نہیں۔ اور عربی  
محاورہ وَيَمِينُ اللَّهِ (اللہ کی قسم) میں يَمِينِ کی اضافت  
اللہ تعالیٰ کی طرف اس لیے کی جاتی ہے۔ کہ قسم کھانے والا  
اللہ کے نام کی قسم کھاتا ہے۔ اور جب ایک شخص دوسرے

سے عہد و پیمان باندھتا ہے تو وہ اس کا مَوْالِیِ الْيَمِينِ  
کہلاتا ہے اور کسی چیز پر ملک اور قبضہ ظاہر کرنے کے لیے  
فِي يَدِي کی نسبت مِلْكُ يَمِينِي کا محاورہ زیادہ بلیغ

① قاله شماخ بن ضرار النهشلي يمدح عرابة الاوس، فيما بذل له وسق بعير تمرا وكان مدحه سببا لاشتهار الاوسى  
الصحابي والبيت في الشعراء (۲۷۸: ۱) والاصابة (۲۳۴: ۴) والخزاة (۲۲۳: ۲/۴۵۳) والبحر المحيط  
(۱۶۰: ۱) والعملية (۱۳۱: ۲/۴۱۱) وامالى القائل (۲۷۱: ۱) واسد الغابة (۳۹۹: ۳) ونقد الشعر ۲۵ وهو غير  
منسوب في الطبري (۳۲: ۲۳) واللسان (يمن والسمط (۶۰۷) وابن الشجرى (۱۶۵: ۲) والكمال (۱۳۳، ۱۶۵)  
والمشكل للقبتي (۱۸۸) وقبانه: رايه عزابة الاوسى يسمو الى الخيرات منقطع القرين والبيتان في تاريخ الطبري  
(۱۹۱: ۲) والمتنبح ۳۸۴ ونقد الشعر (۱۹۰: ۱) وابن الانباري (۵۷۵) والمقد (۲۸۸: ۲)۔

دونوں ہم معنی ہیں جیسے عَجَبَ فَاسْتَعْجَبَ وَسَخِرَ  
وَأَسْتَسَخَرَ قرآن پاک میں ہے:-

﴿فَلَمَّا اسْتِئْذِنُوا مِنْهُ خَلَصُوا نَجِيًّا﴾ (۸۰-۱۲)  
جب وہ اس سے ناامید ہو گئے تو الگ ہو کر صلاح کرنے  
لگے۔

﴿حَتَّىٰ إِذَا اسْتَيْسَرَ الرُّسُلُ﴾ (۱۱۰-۱۲) یہاں تک  
کہ جب پیغمبر ناامید ہو گئے۔

﴿قَدْ يَشْهَرُونَ مِنَ الْآخِرَةِ كَمَا يَبْشُرُونَ الْكُفَّارُ مِنَ  
أَصْحَابِ الْقُبُورِ﴾ (۱۳-۶۰) جس طرح کافروں کو  
مردوں (کے جی اٹھنے) کی امید نہیں اسی طرح ان لوگوں  
کو بھی آخرت (کے آنے) کی امید نہیں۔

إِنَّهُ لَيْسُوا كَفُورًا: تو ناامید (اور) ناشکرا (ہو جاتا)  
ہے۔ اور آیت کریمہ:-

﴿أَفَلَمْ يَأْتِئِشِ الَّذِينَ آمَنُوا﴾ (۳۱-۱۳) تو کیا  
مومنوں کو اس سے اطمینان نہیں ہے۔

کی تفسیر میں بعض نے لکھا ہے کہ یہاں اس کے معنی أَفَلَمْ  
يَعْلَمُ کے ہیں یعنی کیا انہوں نے اس بات کو جان نہیں لیا  
مگر اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ یہ اس کے حقیقی معنی ہیں  
بلکہ یہ اس کے لازم معنی ہیں کیونکہ کسی چیز کے انقضاء کا علم  
اس سے ناامید ہونے کو مستلزم ہوتا ہے لہذا یہاں بھی (بملاحظہ  
قرآن) یہ کہہ سکتے ہیں۔ کہ یَسْتَيْشُ بِمَعْنَى يَعْلَمُ ہے۔

### (ی و م)

الْيَوْمَ: (ن) یہ طلوع آفتاب سے غروب  
آفتاب تک کی مدت اور وقت پر بولا جاتا ہے۔ اور عربی  
زبان میں مطلقاً وقت اور زمانہ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

ہے۔ اسی بنا پر غلام اور لونڈیوں کے بارے میں قرآن  
پاک نے اس محاورہ کو اختیار کیا ہے۔ چنانچہ فرمایا:-

﴿مِمَّا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ﴾ (۲۵-۴) جو تمہارے قبضے  
میں آگئی ہوں۔

اور حدیث میں حجر اسود کو یمن اللہ کہا گیا ہے۔ (۱۶۳)  
کیونکہ اس کے ذریعہ قرب الہی کی سعادت حاصل کی جاتی  
ہے۔

يَمِينٌ سے يُمْنٌ کا لفظ ماخوذ ہے جو خیر و برکت کے معنی  
میں استعمال ہوتا ہے۔ محاورہ ہے:- هُوَ يَمِينٌ  
النَّقِيَّةُ: وہ سعادت مند ہے اور مِيْمَنَةٌ کے معنی دائیں  
جانب بھی آتے ہیں۔

### (ی ن ع)

يَنْعَتِ (ف) الْكُثْمَرَةُ يَنْعًا وَيَنْعًا وَابْنَعَتْ  
(افعال) ابْنَاعًا کے معنی پھل کے پک کر بالکل تیار ہو  
جانے کے ہیں اور پختہ پھل کو يَابِنَعَةً یا مُوْنَعَةً کہا جاتا  
ہے۔ قرآن پاک میں ہے:-

﴿أَنْظُرُوا إِلَى ثَمَرِهِ إِذَا أَثْمَرَ وَابْنَعَهُ﴾ (۱۰۰-۶)  
یہ چیزیں جب پھلتی ہیں تو ان کے پھلنے کو اور جب پک کر  
تیار ہو جاتی ہیں تو ان کے پکنے پر نظر کرو۔

ابن ابی اسحاق کی قراءت میں وَيَنْعُهُ (ضمہ یاء کے  
ساتھ) ہے۔ جو کہ يَابِنَعٌ کی جمع ہے اور يَابِنَعٌ کے معنی  
نہایت پختہ پھل کے ہیں۔

### (ی و س)

الْيَأْسُ: (مصدر) کے معنی ناامید ہونے  
کے ہیں۔ اور يَأْسٌ (مجرد) وَاسْتَيْسَسَ (استفعال)

﴿وَذَكَّرْهُمْ بِآيَمِ اللَّهِ﴾ (۵-۱۳) اور ان کو خدا کے دن یاد دلاؤ۔ میں ایام کی لفظِ جلال کی طرف اضافت تشریفی ہے اور ایام سے وہ زمانہ مراد ہے جب کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنے فضل و انعام کے سمندر بہا دیئے تھے۔

### (یَس)

یَس: (۱-۳۶) بعض نے کہا ہے کہ اس کے معنی اے انسان کے ہیں مگر صحیح یہ ہے کہ دوسرے اوائل سُوَر کی طرح یہ بھی حروفِ مقطعات سے ہے۔

### (الْيَا)

یہ حروفِ ندا میں سے ہے اور دور سے کسی کو آواز دینے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ مگر جب ذات باری تعالیٰ کو دعا کے وقت یا رب کہا جاتا ہے تو اس کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ بہت دور ہے بلکہ اس امر پر تنبیہ کے لیے ہے کہ دعا کنندہ اپنے آپ کو اللہ کی مدد اور اس کی توفیق سے دور خیال کرتا ہے۔



وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ  
فَقَدْ تَمَّتْ بِفَضْلِ اللَّهِ تَعَالَى

www.KitaboSunnat.com

خواہ وہ زمانہ (ایک دن کا ہو یا ایک سال اور صدی کا یا ہزار سال کا ہو) کتنا ہی دراز کیوں نہ ہو۔ قرآن پاک میں ہے ﴿إِنَّ الَّذِينَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعَيْنِ﴾ (۱۵۵-۳) جو لوگ تم سے (احد کے دن) جب کہ ..... دو جماعتیں ایک دوسرے سے گٹھ ہو گئیں (جگ سے بھاگ گئے۔

﴿قُلْ أَنتُمْ لَكُمْ تَكْفُرُونَ بِالَّذِي خَلَقَ الْأَرْضَ فِى يَوْمَيْنِ﴾ (۹-۴۱) کیا تم اس سے انکار کرتے ہو جس نے زمین کو دو دن میں پیدا کیا۔

میں زمین کو دو دن میں پیدا کرنے کے معنی اور اس کی تحقیق اس کے بعد دوسری کتاب میں بیان کی جائے گی اور کبھی یَوْم کے بعد ”اذ“ بڑھا دیا جاتا ہے اور (اضافت کے ساتھ) يَوْمَيْنِ پڑھا جاتا ہے اور یہ کسی معین زمانہ کی طرف اشارہ کے لیے آتا ہے اس صورت میں یہ معرب بھی ہو سکتا ہے۔ اور ”اذ“ کی طرف مضاف ہونے کی وجہ سے مثنیٰ بھی۔ جیسے فرمایا:۔

﴿وَأَلْقُوا إِلَى اللَّهِ يَوْمَئِذٍ السَّلَامَ﴾ (۸۷-۱۶) اور اس روز خدا کے سامنے سرگوں ہوں جائیں گے۔

﴿فَذَلِكَ يَوْمَئِذٍ عَسِيرٌ﴾ (۹-۷۴) وہ دن بڑی مشکل کا دن ہوگا۔ اور آیت کریمہ:۔







